حیاتِ طیب رحمہ اللہ

بیسویں صدی میں قرون اولیٰ کے علمی کمالات، دینی افکار اور مثالی سیرت و اخلاق کی حامل ایک ممتاز دینی شخصیت، ایشیا کی مثالی دینی دانش گاہ دارالعلوم دیوبند کے طویل المیعاد اور مثالی مہتمم، فکر ولی اللہی کے نقیب، حکمت قاسمیہ کے شارح، مسلک دیوبند کے ترجمان

حکیم الاسلام حضرت مولانا

محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

کی حیات مبارکہ و خدمات جلیلہ کا مفصل جائزہ

حسب ایماء

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہ

مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

نگرانی

حضرت مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی

مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

ترتیب

غلام نبی قاسمی

استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند

محمد شکیب قاسمی

استاذ تفسیر و ناظم حجۃ الاسلام اکیڈمی

دارالعلوم وقف دیوبند

باہتمام

حجۃ الاسلام اکیڈمی

دارالعلوم وقف دیوبند

تفصیلات

نام کتاب

حیاتِ طیب (جلداوّل)

ترتیب

- غلام نبی قاسمی، استاذ دارالعلوم وقف دیوبند
- محمد شکیب قاسمی، استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

صفحات : ۶۰۸

اشاعت

رجب المرجب ۱۴۳۵ھ مطابق مئی ۲۰۱۴ء

پروف ریڈنگ

حجۃ الاسلام اکیڈمی اسٹاف

کمپوزنگ

عمرالٰہی، دارالعلوم وقف دیوبند

باھتمام

حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ*

حیات تیری نئے جہاں میں وقار بخشِ علومِ نو ہے
تری جبیں پر جبینِ قاسم کی دل نواز و حسین ضو ہے

تری صدا کو بصیرتوں کی فضا کا الہام کردیا ہے
حکیم الامت نے اک نظر میں حکیم الاسلام کردیا ہے

خدا کے فضل و کرم سے دیں کا مقامِ محمود مل گیا ہے
تو ہے وہ غنچہ جو زندگی کی خزاں سے ٹکرا کے کھل گیا ہے

ترے تفکر میں قرنِ اوّل کی عظمتوں کا نشاں ملے گا
تری خطابت میں عبرتوں کا تصور جاوداں ملے گا

مری نظر میں نئے زمانے کا فخرِ مصر و حجاز تو ہے
کیا جسے منکشف مشیت نے وہ حقیقت کا راز تو ہے

رشید کے باغِ آرزو کا نگاہ افروز پھول تو ہے
ملا دوامِ بہار جس کو گلِ ریاضِ رسول تو ہے

جہاں گیا تو وہیں اکابر کا رنگِ اعزاز دیں بڑھایا
رہے گا تا عمر تیرے سر پر خدا کی رحمت کا خاص سایا

حوادث دہر تیری شہرت نہ زندگی بھر مٹا سکیں گے
ترے قدم کی بلندیوں کو عروج والے نہ پا سکیں گے

............❖............

* از: علامہ انور صابریؒ

فہرست مضامین حیاتِ طیبؒ

باب دوم

❖

باب اوّل

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پیدائش، نشو ونما، تعلیم وتربیت، اساتذہ ومشائخ،
بیعت وسلوک، دارالعلوم کی خدمات وترقیات،
اجلاس صدسالہ، مسلم پرسنل لاء بورڈ، مقدراتِ الٰہیہ،
قیام دارالعلوم وقف دیوبند، وفات
اولاد واحفاد، تعزیتی پیغامات

تقدیم

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم
مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

حق تعالیٰ شانہٗ اپنے ہدایت آفریں علوم بیکراں کو جہاں عادۃً ''علمی طبقات'' میں تقسیم فرما کر ظاہر فرماتے ہیں، وہیں کبھی کبھی خرقِ عادت کے طور پر کسی تکوینی مصلحت کی تکمیل اس طرح بھی فرمائی جاتی ہے کہ کسی ایک شخصیت کے قلب و دماغ کو کمال ایمان، اعمال اور مکارم اخلاق و اخلاص کے ساتھ شرعی علوم کا خزانہ بنا کر اس کی تنہا ایک ذات سے بے حساب علمی شخصیات اور لاتعداد علمی طبقات کے برابر کام لے لیا جاتا ہے اور اس کی روحانیت و معرفت اور اصلاح و ہدایت کے دائرہ افادیت کو لوگوں کی افرادی تعداد اور زمین کی جغرافیائی حد بندیوں کا پابند نہ رکھ کر اس کی خدمات کو آفاقی اثر آفرینی عطاء کر دی جاتی ہے جس سے اس کا فیضان تمام انسانی برادری تک عام ہو جاتا ہے۔

حق تعالیٰ نے شیخ العرب والعجم عارف باللہ جامع علوم و معرفت قطب ارشاد حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہٗ العزیز سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی ذات گرامی کو لاتعداد علمی طبقات کے برابر لافانی و لاثانی دینی خدمات کے شرف سے مشرف فرمایا۔ حضرت والاؒ نے اپنے زبان و قلم سے کتاب و سنت کی روشنی میں تعلیمات اسلام کے عالم گیر و آفاقی حقائق کی وہ صحیح اور مؤثر ترین ترجمانی فرمائی ہے کہ جس نے ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ کے ایک سو سے زائد ممالک کے کروڑوں سے متجاوز افراد کو دین کا صحیح فہم اور اس پر استقامت عطاء کی ہے اور مسلک حق دارالعلوم دیوبند کو فکر ولی اللٰہی و قاسمی پر اس جامعیت کے ساتھ پیش فرمایا ہے کہ جو بقول علامہ اقبالؒ ''ہر صحیح العقل مسلمان کا مسلک'' قرار پا گیا۔ حضرت والا اپنے وقیع و وسیع علم و معرفت اور مؤثر ترین اصلاح و ہدایت کے لحاظ سے گذشتہ صدی کی وہ تاریخ ساز و عہد آفرین شخصیت ثابت ہوئے کہ جن کی عالمی دینی رہنمائی، بیکراں علم و معرفت، روحانی انقلاب آفریں اصلاح و ہدایت، مثالی دیانت و امانت، بین الاقوامی فکر قاسمی پر دارالعلوم کا نظم و اہتمام، مردم ساز تعلیم و تدریس عالمی مرجعیت و مرکزیت، مدلل ترین تحریر و کتاب، مؤثر ترین تقریر و خطاب، ملت اسلامیہ کی دینی نشأۃ ثانیہ اور دارالعلوم دیوبند کو عالمی دینی دانش گاہ بنا دینے والی بے مثال خدمات اور کارناموں کے حوالے سے انیسویں صدی کی ایک مثالی شخصیت تھے۔

عنداللہ مقبول فکر قاسمی پر دارالعلوم دیو بند کی عمر کے ابتدائی انسٹھ سال میں پانچ مہتممین نے اپنی مخلصانہ عظیم خدمات کے ذریعہ اس ''مدرسہ عربی'' کو ملک گیر ''دارالعلوم'' کے مقام رفیع تک پہنچایا اور اس کی عمر کے مابعد کے انسٹھ سال میں تن تنہا قطب ارشاد حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی جامع الصفات عظیم المرتبت عالمی شخصیت نے بلاشرکت غیرے اس ''دارالعلوم'' کو ''عالمی مرکز علوم اسلامیہ'' بنایا۔

حکیم الاسلامؒ کے حالات زندگی کے مختلف گوشوں پر حضرتؒ کی وفات سے لے کر اب تک اہل علم بہ تسلسل لکھتے آرہے ہیں تاہم ایسی عظیم المرتبت دینی شخصیت کی باضابطہ سوانح حیات کی ضرورت طبقاتِ علماء میں بہ شدت محسوس کی جارہی تھی جس میں ایک خاص ترتیب اور علمی دیانت کے ساتھ حضرت کے سیرت واخلاق اور کمالاتِ علمیہ کو سامنا لاکر قابل استفادات بنایا جائے۔

باعث مسرت ہے کہ یہ دیرینہ خواب حضرت حکیم الاسلامؒ کی ایک مفصل سوانح ''حیاتِ طیب'' زیرنگرانی عزیزم مولانا محمد سفیان قاسمی نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیو بند، باہتمام حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیو بند منصۂ شہود پر آرہی ہے۔ ''حیاتِ طیب'' کی ترتیب عزیز گرامی جناب مولانا غلام نبی قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیو بند و عزیزم مولانا محمد شکیب قاسمی، استاذ و ناظم حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیو بند کی فاضلانہ ومخلصانہ مساعی کے نتیجہ میں عمل میں آئی ہے۔

جناب مولانا غلام نبی قاسمی ایک باوقار، بااستعداد اور علمی وتحقیقی کاموں کے تعلق سے طلباء و علماء میں یکساں طور پر مشہور و مقبول ہیں اور عزیزم مولانا محمد شکیب قاسمی ممتاز علمی صلاحیتوں کے ساتھ علوم عصریہ سے مرصع اور عصری اسلوب میں علمی تحقیقات کا مخصوص ذوق رکھتے ہیں۔ حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیو بند انہیں کی خاص دلچسپیوں اور علمی سرگرمیوں کے نتیجہ میں وجود میں آئی اور بحمد اللہ روز افزوں ترقی کی منزلیں طے کررہی ہے۔

''حیاتِ طیب'' کی مثالی ترتیب، معیاری اشاعت و جاذب نظر سرورق، کتابت وطباعت جہاں حجۃ الاسلامؒ کے علمی وتحقیقی کاموں کے لئے نیک فال کی حیثیت رکھتی ہے وہاں عزیز موصوف کی محنت، ذوق وشوق اور اکیڈمی کو اپنے بلند تر معیار و مقاصد سے ہم آہنگ کرنے کی سعی پیہم کی بھی ایک زندہ شہادت ہے۔

دعاء ہے کہ رب کریم ''حیاتِ طیب'' کو شرف قبولیت سے نوازے اور حکیم الاسلامؒ کی حیات وخدمات پر مشتمل یہ مفصل سوانح علمی حلقوں میں مقبول عام ہو اور استفادہ کا ذریعہ بنے۔

محمد سالم قاسمی

مہتمم دارالعلوم وقف دیو بند

رائے گرامی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب مدظلہٗ

ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اپنے عہد کی بڑی مایۂ ناز علمی و دینی شخصیت تھی، علم دین اور حکمت و دانش کے بلند پایہ حامل تھے۔ انہوں نے اپنے عظیم مورث اور علوم دینیہ میں مقام بلند رکھنے والے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے علمی گہرائی اور وسعت کی وراثت پائی تھی، اس کو ان کی تقریروں، تحریروں اور درس میں محسوس کیا جاتا رہا ہے۔

انہوں نے اپنے اس بلند علمی مقام کے ساتھ ساتھ دارالعلوم دیوبند جیسی عظیم درس گاہ کو جو اُن کے اسلاف کی کوششوں کا مرکز رہی تھی، اپنے آغاز جوانی میں سنبھالا اور اس کی خدمت میں اپنی پوری عمر لگا دی۔ ان کی کوششوں کا مظہر صرف دارالعلوم دیوبند کی ترقی اور مضبوطی میں ہی نمایاں اور محدود نہیں تھا، بلکہ اس کے نمائندۂ خاص ہونے کے تعلق سے ہندوستانی مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ بھی اثر پذیری کے ساتھ انجام دیا، مسلمانوں میں جو دینی انحراف یا عقائد کی خرابی پائی جاتی تھی، اس کے ازالہ میں بھی خصوصی حصہ لیا۔ خاص طور پر بمبئی وغیرہ کے علاقہ میں بہت سے لوگوں کی اصلاح میں ان کا نمایاں حصہ رہا۔

وہ ایک دل نواز اسلوب کے حامل خطیب تھے۔ ان کی کئی کئی گھنٹے کی تقریریں سامعین اس طرح سنتے تھے کہ ان کا نہ جی اکتاتا تھا اور نہ وہ تھکتے تھے۔ ان کی محبت بھی دل نواز تھی، جس سے ان کے ملنے والے اور ان کے سننے والے متاثر ہوتے تھے، وہ اپنی باطنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ، صاف ستھرے مظہر کے اور دل نواز طرز و انداز کے مالک تھے، طبیعت میں نرم مزاجی اور خوش اخلاقی تھی، اُن سے مل کر مسرت حاصل ہوتی تھی اور طبیعت ان کی طرف مائل ہوتی تھی۔

گفتگو اور اندازِ کلام دل کو متاثر کرنے والا اور ذہنوں کو مطمئن کرنے والا ہوتا تھا۔ اپنی بات کو علمی و تاریخی حوالوں اور مثالوں سے واضح کرتے تھے۔ بعض اہم ترین موقعوں پر علماء کی طرف اُن کی نمائندگی بڑی مؤثر ثابت ہوئی، خصوصاً جب مولانا ابوالکلام آزاد نے علماء کا ایک مشاورتی اجتماع لکھنؤ میں بلایا تھا اور یہ وہ وقت تھا کہ ہندوستان آزاد ہونے پر مدارس دینیہ کے مستقبل کے بارے میں سوالات اٹھ رہے تھے اور

علماء کی طرف سے صحیح نمائندگی کی بڑی ضرورت تھی، اس اجتماع میں علماء نے مولانا محمد طیب صاحبؒ ہی کو ترجمان بنایا اور انہوں نے بڑے علمی انداز سے اپنی بات کو بہت اچھے اسلوب میں پیش کیا جس سے مدارس اسلامیہ اور علماء کے کردار سے متعلق صحیح رخ سامنے آیا اور ملک کے ذمہ داروں کے ذہنوں نے اس کو قبول کیا۔ اس طریقہ سے دراصل دیوبند جو علوم دینیہ کا ایک موقر ترین ادارہ رہا ہے اور ہے اس کی صحیح نمائندگی کا مولاناؒ نے حق ادا کیا اور اس کے مہتمم کے منصب پر فائز ہونے سے جو ذمہ داری اُن پر عائد ہوتی تھی اس کو پورا کیا۔

دارالعلوم دیوبند کی نمائندگی مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اپنی پوری زندگی میں اس طرح انجام دی کہ بہت سے ذہنوں میں اُن کا نام دارالعلوم دیوبند کے نام کے ساتھ وابستہ رہا اور اس طریقہ سے ان کی کوششوں کا فائدہ ایک طرف دارالعلوم دیوبند کو خصوصی طور پر پہونچا اور دوسری طرف ان کی باتوں کا وزن لوگوں کی اصلاح اور دینی رہنمائی کے کام میں مؤثر رہا اور دارالعلوم دیوبند میں موقر استاذ بھی تھے اور درس گاہ کے منتظم وسربراہ بھی تھے۔

ایسی عظیم دینی ہستی کے حالاتِ زندگی، علمی کمالات اور روشن کارناموں پر مشتمل ایک مفصل ومعیاری سوانح ''حیات طیب'' زیر اہتمام حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند معیاری ترتیب کے ساتھ اشاعت علمی حلقوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔ ''حیات طیب'' حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند کے علمی کاموں کی ایک خوش آئند پہل اور حجۃ الاسلام اکیڈمی کے ناظم ونوجوان فاضل مولانا محمد شکیب قاسمی کی محنت اور علمی لگن کی زندہ شہادت ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو علمی حلقوں میں مقبولیت عطا فرمائے اور حجۃ الاسلام اکیڈمی کو اپنے علمی اور تحقیقی کاموں میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین

محمد رابع حسنی ندوی

ناظم: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

............❖............

رائے عالی

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ

نائب رئیس الجامعہ، دارالعلوم، کراچی

حضرت حکیم الاسلامؒ کی ذاتِ گرامی دارالعلوم دیوبند کے اس بابرکت دَور کی دل کش یادگار تھی جس نے حضرت شیخ الہندؒ، حضرت تھانویؒ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ اوران جیسے دوسرے حضرات کا جلوۂ جہاں آرا دیکھا تھا۔ جس ہستی کی تعلیم وتربیت میں علم وعمل کے ان مجسم پیکروں نے حصہ لیا ہو۔ اس کے اوصاف و کمالات کا ٹھیک ٹھیک ادراک بھی ہم جیسوں کے لیے مشکل ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے پیکر میں معصومیت حسنِ اخلاق اور علم وعمل کے جونمونے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں ان کے نقوش دل ودماغ سے محو نہیں ہوسکتے۔

احقر کے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان قدس سرہ اور حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ اور زندگی کے ہر مرحلے میں ایک دوسرے کے رفیق رہے۔ دونوں نے دارالعلوم دیوبند میں ایک ساتھ پڑھا۔ ساتھ فارغ ہوئے۔ ساتھ ہی پڑھانا شروع کیا۔ دونوں ایک ہی وقت میں حضرت شیخ الہندؒ کے دستِ مبارک پر بیعت ہوئے اور پھر حضرت کی وفات کے بعد ایک ہی ساتھ تھانہ بھون حاضر ہوکر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور تقریباً ساتھ ہی ساتھ دونوں کو حضرت تھانویؒ کی طرف سے خلافت عطا ہوئی۔

۱۳۴۵ھ میں سب سے پہلا حج بھی دونوں نے ساتھ کیا، غرض ظاہری تعلیم اور باطنی تربیت سے لے کر سیر وتفریح تک ہر چیز میں دونوں کی رفاقت مثالی تھی۔ پھر جب قیامِ پاکستان کی تحریک شروع ہوئی اور آزادیٔ ہند کے طریقِ کار سے متعلق علماء دیوبند کے درمیان اختلاف رونما ہوا تو حضرت والد صاحبؒ کی طرح حضرت حکیم الاسلامؒ کا نقطہ نظر بھی حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کی رائے کی طرف مائل تھا۔ لیکن حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے آپ کو عملی سیاست سے بالکلیہ یکسو کرکے ہمہ تن دارالعلوم دیوبند کی خدمت کے لیے وقف کیا ہوا تھا۔ اس لیے یہ نقطہ نظر اسٹیج پر نہ آسکا۔ حضرت والد صاحبؒ قیامِ پاکستان کے بعد یہاں تشریف لے آئے اور حضرت حکیم الاسلامؒ کے لیے دارالعلوم دیوبند کی گراں بار

ذمہ داری کے پیشِ نظر دیوبند چھوڑنے کا سوال ہی نہ تھا، لیکن یہ بات میں نے حضرت حکیم الاسلامؒ سے بارہا سنی کہ جس روز حضرت مفتی صاحب دیوبند سے پاکستان کے لیے روانہ ہوئے اس روز میں دن بھر روتا رہا۔

آپ نے حضرت والد صاحب کی وفات پر جو تعزیتی مکتوب ارسال فرمایا اس میں بھی لکھا تھا کہ:

''تقسیم ملک کے بعد جب آپ نے پاکستانی قومیت اختیار فرمائی اور یہاں سے ہجرت فرما کر پاکستان تشریف لے گئے تو میں مرنے والے کے لیے بھی اتنا کبھی نہیں رویا تھا جتنا آپ کے فراق پر رویا۔ یہ حالت دیکھ کر سب گھر والے بھی پریشان ہوگئے تھے کہ آخر کیا حادثہ پیش آ گیا جو اتنا گریہ طاری ہے۔ یہ تعلق کی بناء پر تھا کہ ابتدائے عہد سے ہم رفیق رہے تھے''۔

اس کے بعد وہ ہمہ وقتی رفاقت چھوٹ گئی۔ لیکن قلب وروح کا رشتہ کسی مرحلہ پر نہ ٹوٹا۔ قیام پاکستان کے بعد بارہا حضرت حکیم الاسلامؒ کراچی تشریف لائے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ کراچی تشریف لانے کے بعد آپ دارالعلوم تشریف نہ لائیں۔ چناں چہ ہر بار خدام دارالعلوم کراچی کو اپنی شفقتوں سے بہرہ ور فرماتے۔ طلباء اور اساتذہ سے خطاب بھی ہوتا اور پھر حضرت والد صاحبؒ اور ان کے درمیان جو باغ و بہار مجلس ہوتی اس میں علمی تبادلۂ خیال کے علاوہ ماضی کے تذکرے، زمانہ طالب علمی کی یادیں، اساتذہ کے واقعات اور نہ جانے کتنے موضوعات پر گفتگو ہوتی اور ہم خدام کو افادات کا نہ جانے کتنا خزانہ ہاتھ آ جاتا۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ حضرتؒ کی حیات وخدمات پر دارالعلوم وقف دیوبند کے ایک فعال علمی اور تحقیقی شعبہ حجۃ الاسلام اکیڈمی سے ایک مفصل سوانح ''حیاتِ طیب'' شائع ہو رہی ہے، جس میں آپؒ کی شخصیت اور خدمات کو سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے، جس کے لئے مولانا غلام نبی قاسمی (استاذ دارالعلوم وقف دیوبند) اور حجۃ الاسلام اکیڈمی کے ناظم، نوجوان فاضل عزیز گرامی مولانا محمد شکیب قاسمی سلمہٗ استاذ دارالعلوم وقف دیوبند قابل مبارکباد ہیں۔

اللہ تعالیٰ ''حیاتِ طیب'' کو علمی حلقوں میں قبولیت سے نوازے اور اس کے نفع کو عام فرمائے۔

محمد تقی عثمانی

نائب رئیس الجامعہ، دارالعلوم کراچی

............❖............

تقریظ

حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی صاحب مدظلہٗ

صدرالمدرسین و ناظم تعلیمات، دارالعلوم وقف دیوبند

والد ماجد حضرت حکیم الاسلامؒ کی حیات اور خدمات جلیلہ کا کوئی گوشہ مخفی نہیں، علمی حلقوں میں تو حضرتؒ کی شخصیت معروف ومشور ہے، عامۃ المسلمین میں بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں مقبولیت عطا فرمائی تھی۔ پھر ہندوستان ہی میں نہیں بیرونی ممالک میں اسی طرح آپ کی شہرت ہے، علوم وکمالات کا ایک خزانہ عامرہ حکیم الاسلامؒ کی تصنیفات اور خطبات میں موجود ہے۔ ضرورت تھی کہ منتشر مواد کو تاریخی لحاظ سے ایک خاص ترتیب اور علمی ڈھنگ سے یکجا کر کے باضابطہ سوانح حیات کی شکل دی جائے، جس میں آپ کی شخصیت کے متعلق ایک ایک بات نکھر کر آجائے اور عام وخواص سب ہی کے لئے استفادہ کا ذریعہ بن جائے۔ حسن اتفاق سے سالِ رواں فاضل نوجوان مولانا محمد شکیب قاسمی سلمہٗ استاذ و ناظم حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند کی تحریک پر دارالعلوم وقف دیوبند کے ذمہ داران نے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نام پر ''حجۃ الاسلام اکیڈمی'' قائم کر کے علمی وتحقیقی کاموں کی بنیاد ڈالی، جس میں اکیڈمی کے مقاصد میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ودیگر اکابر کے علوم وافکار پر تحقیق اور عصری اسلوب میں تعلیمات کی اشاعت ہے۔

عزیز القدر مولانا محمد شکیب قاسمی حجۃ الاسلام اکیڈمی کے ناظم ہیں، انہیں اپنے آباء واجداد کے علوم سے ماشاء اللہ مناسبت بھی ہے، ہونہار اور نوجوان فاضل ہیں، علوم عصریہ سے بھی آراستہ ہیں، علمی وتحقیقی کاموں کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔ ادھر مولانا غلام نبی کشمیری دارالعلوم وقف دیوبند کے با استعداد مدرس اور خالص علمی ذوق رکھنے والے انسان ہیں۔ دونوں حضرات کی محنت اور لگن کے نتیجہ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی یہ مفصل سوانح ''حیات طیب'' بہترین کتابت، عمدہ طباعت اور معیاری کاغذ کے ساتھ عزیزم مولانا محمد سفیان قاسمی نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کی نگرانی میں حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند کے زیر اہتمام زیور طبع سے آراستہ ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ مرتبین کو جزاء خیر عطا فرمائے اور کتاب کو قبولیت عامہ نصیب کرے۔ آمین

محمد اسلم قاسمی

صدر المدرسین وناظم تعلیمات دارالعلوم وقف دیوبند

تأثرگرامی

حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہٗ

مهتمم دارالعلوم ندوة العلماء، لکھنؤ

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو ہندوستان کے سب سے ممتاز اور عظیم الشان علمی اور دینی ادارے دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کی ذمہ داری ایام شباب ہی میں مجلس شوریٰ کی طرف سے عطا کر دی گئی تھی، اس وقت ان کی عمر ۲۵-۲۶ رسال کے درمیان تھی، اس لئے کہ آپ کا سنہ ولادت ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء ہے، اس وقت ہندوستان میں انگریزی سامراج کے قدمِ اقتدار پوری طرح جم چکے تھے، اس نے سب سے زیادہ دینی تعلیم کے پہلو کو نا کام بنانے میں اپنا زور صرف کیا اور علوم اسلامیہ کی اہمیت کو کم کرنے اور کتاب وسنت کے علوم کی ہیبت کو خود مسلمانوں کے دلوں سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی، اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے عصری تعلیم کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرنے پر اکتفاء کیا بلکہ دیوبند کی مرکزیت کو ختم کرنے کے لئے عصری تعلیم کا ایک بڑا مرکز جو پہلے انگریزوں کی نگرانی میں علی گڑھ میں قائم ہو چکا تھا، اس کو زیادہ سے زیادہ تقویت پہنچانے کے لئے ہر طرح کے مادی وسائل واسباب کو فراہم کرنے میں حصہ لیا تا کہ اس کے تعلیمی اور زمینی رقبہ کو وسیع کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ قوم مسلم کے دینی مزاج کو بدل کر ایسا مزاج پیدا کیا جائے جو دین اسلام سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے، صورت حال نہایت فکر انگیز تھی اور دینی نشر واشاعت کا کام متاثر ہو رہا تھا، اس خطرے کو علمائے دیوبند نے پوری طرح محسوس کیا اور دارالعلوم کو ایک عظیم اسلامی مرکز اور علوم اسلامیہ کے مضبوط قلعہ کی حیثیت سے تیار کرنے میں وہ پوری طرح مشغول ہو گئے اور انگریزی سامراج کے خلاف ایک ایسا محاذ کھولنے میں کامیاب ہوئے جہاں سے ملک کو اس سامراج کی غلامی سے آزاد کرانے اور امت مسلمہ کے علم وعقیدہ اور ایمان ویقین کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی قربانیاں دینے کے لئے علماء ومجاہدین کی ایک نسل تیار کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی۔

اب دارالعلوم دیوبند ایک طرف علوم اسلامیہ کی نشر واشاعت، ایمان وعقیدہ کی حفاظت کا ایک عظیم مرکز تھا، تو دوسری طرف انگریزی سامراج کا مقابلہ کرنے اور اس راستہ میں ہر طرح کی قربانی دینے کا

جذبہ ایک حقیقت منتظر بن گیا تھا، دارالعلوم کے مؤسس اول حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے گرد اس وقت کے تمام علمائے کرام جمع ہوگئے، علوم اسلامیہ کا یہ قلعہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، انگریزوں کی نفرت دلوں میں پیوست ہوتی گئی اوران کے ہر حملے کا جواب دینے کے لئے علماء کرام کی فوج تیار ہی تھی کہ اچانک شاملی کے میدان میں علماء نے مقابلہ کیا اور انگریز پسپا ہو رہا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے دورِ اہتمام میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام پائے اور بیرون ملک سے بہت سے موقر حضرات دارالعلوم دیکھنے اور وہاں کے تعلیمی نظام کو قریب سے سمجھنے کی غرض سے آئے، انہیں کے دور اہتمام میں مصر کی نمایاں شخصیت جناب انورالسادات دارالعلوم دیکھنے آئے اور انہوں نے آپ ہی کے دورِ مبارک میں بحیثیت مہتمم ان کو دورۂ مصر کی دعوت پیش کی، انہیں کے دورِ اہتمام میں ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد حضرت مہتمم صاحبؒ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے دارالعلوم تشریف لے گئے اور افغانستان کے محمد ظاہر شاہ نے بھی دارالعلوم کی زیارت کی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کا تعارف کرانے اور اس کے پیغام کو دور دور تک پہنچانے میں مختلف ممالک کا سفر کیا، افریقہ کے مختلف ملکوں کا سفر کیا، برما تشریف لیگئے اور ۱۹۶۳ء میں جنوبی افریقہ اور جمہوریہ مصر کا سفر فرمایا اور مؤتمر اسلامی کی دعوت پر مہتمم صاحب نے یورپ کے مختلف ممالک کا سفر کیا اور ہر جگہ دارالعلوم کے تعارفی اجتماعات منعقد کرائے۔

حکیم الاسلامؒ نے اپنی پوری زندگی دارالعلوم کے لئے وقف کردی تھی اور دنیا کے گوشے گوشے میں دارالعلوم کا تعارف کرانے کے لئے ہر طرح کے سفر کی مشقتیں برداشت کیں اور جان و مال کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کیا۔

مجھے اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت مسرت ہورہی ہے کہ میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد ایوب صاحب، سابق ناظم جامعہ مفتاح العلوم مئو اور سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل نے طالب علمی کا ایک طویل زمانہ دارالعلوم میں بحیثیت طالب علم کے گزارا، وہ محدّثِ کبیر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے قریبی تلامذہ میں شمار ہوتے تھے اور کئی کتابوں میں حکیم الاسلامؒ کے رفیقِ درس بھی رہے، اس طرح حکیم الاسلامؒ کے خاندان سے ہمیشہ قریبی وابستگی رہی، چنانچہ ہمارے برادر معظم حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی صاحب جنہوں نے دارالعلوم کے طبیہ کالج کے ایک اہم استاذ کی حیثیت سے تقریباً ستائیس سال دارالعلوم میں گزارے، اس دوران ان کا قلبی اور مخلصانہ تعلق حکیم الاسلامؒ اور ان کے فرزندگانِ کرام سے

بہت قریبی رہا اور حضرت محدّث کشمیری علامہ انور شاہؒ کے صاحبزادگان عظام سے بہت بے تکلفانہ تعلق قائم رہا، جو بحمد اللہ آج بھی اس خاندان کے افراد سے ہمارا تعلق قائم ہے۔ مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب کا دارالعلوم میں قیام حکیم الاسلامؒ کے دور اہتمام میں رہا اور اختلافات وخلفشار کے زمانہ میں ان کو اس کی سزا بھی ملی اور ان کی قیام گاہ پر دھاوا بول کر نا معلوم لوگوں نے ان کی بہت سی کتابوں کے مسودات جو طباعت کے لئے بالکل تیار تھے، لوٹ لیا اور ان کو ہمیشہ کے لئے ان مسودات کی طباعت سے محروم کر دیا۔

حکیم الاسلامؒ نے متعدد بیش قیمت تصنیفات اپنے ایک علمی ورثے کے طور پر امت کو عطا فرمائیں، ان میں اسلام میں اخلاق کا نظام، حدیث کا قرآنی معیار، قوموں کی ترقی وزوال کے اسباب، اسلامی مساوات، دعوت اسلامی کے اصول، سائنس اور اسلام، انتہائی قابل استفادہ کتابیں ہیں۔ سائنس اور اسلام ان مقالات کا مجموعہ ہے جن کو آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی میں طلباء اور اساتذہ کے سامنے پیش کیا۔

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ خانوادۂ قاسمی کے فاضل نوجوان مولانا محمد شکیب قاسمی ناظم حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند کی محنت اور جدوجہد کے نتیجہ میں حکیم الاسلامؒ کے مفصل حالاتِ زندگی اور علمی کارناموں پر مشتمل ''حیاتِ طیب'' منظر عام پر آ رہی ہے، جس سے انشاء اللہ علمی حلقے مستفید ہوں گے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ''حیاتِ طیب'' کو قبولیتِ عامہ سے نوازے۔ آمین

سعید الرحمٰن اعظمی

مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

............❖............

تقریب

مولانا محمد سفیان قاسمی

نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیو بند

رجال کار خدائی نظام ہدایت کا حصہ ہوتے ہیں، جو اپنی تعلمات، سیرت و کردار، اخلاق و عمل، اپنی ظاہری و باطنی قوتوں اور ذہنی وفکری صلاحیتوں سے انسانی تہذیب و تمدن کو اس نظامِ ہدایت کے سانچہ میں ڈھلانے اور اس کی مرضی و منشاء کی ترویج و تطبیق کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، یہ رجال کار اپنے آپ میں ایک عہد کی دینی تاریخ اور اپنی ذات میں ایک مستقل امت کی حیثیت رکھتے ہیں، ان سے ایک تاریخ بنتی ہے، ایک زمانے کے دینی تصورات اور فکری ارتقاء کی ایک اجلی تصویر اور تجدید دین کی ایک صاف ستھری تفسیر خود ان کی ذات ہوتی ہے۔ آنے والے ان کی کتابِ زندگی کے جب اوراق پلٹتے ہیں تو لفظ لفظ ان کے تقویٰ وطہارت کی شہادت فراہم کرتا ہے، سطر سطر ان کی دینی عظمت، ایمانی قوت اور سیرت و کردار کی پاکیزگی کی سند پیش کرتی ہے۔ قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کے پاکیزہ قصوں کے ضمن میں جگہ جگہ ان مقدس ہستیوں کی صلاح وتقویٰ سے معمور زندگیوں اور ان کے ایمان افروز تذکروں کو بار بار دوہرا کر یہ سبق دیا ہے کہ رجال دین کے حالاتِ زندگی انسانی سیرت و اخلاق کی درست نہج پر تعمیر کا ایک پراثر اور طاقتور پیغام اپنے اندر رکھتے ہیں، ان کی زندگی کے قیمتی لمحات، کتنی ہی زندگیوں میں صالح انقلاب کا ذریعہ، ان کی سیرت و کردار کی روشنی مخلوقِ خدا کے لئے قندیل ربانی اور ان کی للّٰہیت اور حسن نیت کے سچے واقعات پژمردہ دلوں کے لئے حیات نو کا سامان بنتے ہیں۔

انہیں پاکیزہ مقاصد کو سامنے رکھ کر سلفِ صالحین کی سوانح عمریاں مرتب ہوئیں اور تراجم رجال کا ایک خزانہ عامرہ امت کے سامنے آیا، اسے حکمت الٰہیہ کی کارفرمائی کہئے کہ دین اسلام کی تعلیمات، عباداتِ نظام اخلاق اور شرائع واحکام کے تحفظ کا ذریعہ جب رجال دین کو بنایا تو خود رجالِ دین کے نقوش زندگی اور ان کے ذکر خیر کی حفاظت کا بھی تکوینی طور پر اس طرح بندوبست فرما دیا کہ تراجم رجال اور شخصیات دین کی سوانح حیات کو منضبط و محفوظ کر دینے کا داعیہ امت مسلمہ میں پیدا فرمایا۔ اس تکوینی نظام کے تحت امت مسلمہ کے پاس اپنے آخری پیغمبر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا ایک ایک گوشہ اور آپؐ

کے مقدس ارشادات کے الفاظ اور جملے ہی نہیں، ایک ایک حرف اور ایک ایک شوشہ محفوظ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ امتیاز اور شرف صرف امت ہی کو حاصل ہے کہ اس کے پاس نہ صرف اللہ کی آخری کتاب اور آخری پیغمبرؐ کی سنت محفوظ ہے بلکہ اللہ کے آخری نبیؐ کی حیات طیبہ کے ایک ایک لمحہ کے اعمال، طور طریقے اور احوال تک محفوظ ہیں، حتیٰ کہ جن نفوس کو آپؐ کی پاکیزہ صحبت میں ایک لمحہ بھی گزارنے کی سعادت میسر آئی، ان کے حالاتِ زندگی بھی محفوظ بلکہ دین کا حصہ بن گئے۔ ابتدائی دینیات کے ایک معصوم اور سادہ لوح بچہ سے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے بارے میں کوئی سوال کیجئے، یقین ہے کہ وہ بھی انشاء اللہ بے خبر نہ ہوگا، اس کے برخلاف کسی عیسائی یا یہودی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں ان کے ماننے والوں میں سے کسی بڑے سے بڑے عالم سے بھی سوال کریں گے تو سکتہ میں آجائیں گے، ان تک اولاً تو کچھ پہنچا ہی نہیں اور بدقسمتی سے پہنچا بھی تو وہ تحریف وتصرف کا ایسا ملغوبہ ہیکہ جس کو پڑھ کر کسی صحیح بات کا پتہ لگانا تو دور، یہ بھی پتہ نہیں چل سکتا کہ آخر یہ ہے کیا چیز؟

جد امجد حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہٗ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں، آپ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے علوم وافکار، ان کے امین اور ترجمان تھے۔ امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسی عظیم الشان ہستیوں سے انہوں نے کسب فیض کیا اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ جیسے شیخ کامل سے روحانی تربیت پائی۔ گھر کا ماحول خالص علمی اور دینی، تقریباً ساٹھ سال تک اپنے جد امجد کے قائم کردہ سرچشمہ فیض دارالعلوم دیوبند کے بے مثال مہتمم، اپنے دور میں ملت اسلامیہ ہند کے متفق علیہ، دینی قائد، عظیم داعی دین، بلند پایہ خطیب، بہترین متکلم، شاندار مصنف اور مدرس، ایک دانشور، مفکر اور تقویٰ وطہارت اور اخلاص وللّٰہیت کے پیکر تھے۔ راقم السطور کو اپنے بچپن سے حضرت حکیم الاسلامؒ کے آخری وقت تک ان کے معمولات، معاملات، معاشرت، سیرت واخلاق اور عادات واطوار کو دیکھنے اور سمجھنے کی سعادت میسر آئی، بعض اسفار میں بھی حضرت کی معیت نصیب ہوئی، گھر میں بچوں کے ساتھ گھلے ملے رہتے اور شفقت کے ساتھ پیش آتے، تربیت کا انداز بھی حکیمانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا، ڈانٹ ڈپٹ اور سخت سست کا کوئی لفظ ان کے لغت میں تھا ہی نہیں، ان کے ہوتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گھر میں ایک روشنی، سکنیت، طمانیت کی بارش ہو رہی ہے۔ اعزہ واقرباء کی خبر گیری، بیمار پرسی، خوشی وغم میں شرکت، ہمدردی، مہمان نوازی، فیاضی، اتباع سنت، نفاست، لطافت، احتیاط، دیانت، شرافت یہ سب اوصاف حکیم الاسلامؒ کی شخصیت سے نمایاں ہوتے تھے۔

دار العلوم دیوبند جیسے عالمی ادارہ کے مہتمم تھے۔ صرف ہندوستان ہی نہیں ایک دنیا انہیں جانتی تھی، ان کی عظمت اور بزرگی کا اعتراف کرتی تھی، بڑے بڑے لوگ ان کی جوتیاں سیدھی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے، بایں ہمہ انکساری اور خاکساری کا پیکر معلوم ہوتے، قول وعمل اور برتاؤ میں کبر اور غرور کا شائبہ تک نہ تھا، ایک اجنبی بھی اپنائیت محسوس کرتا، بیگانہ بھی محبت کرتا، صبر و برداشت کے تو پہاڑ تھے۔ عمر کی آخری منزل میں جن آزمائشوں سے گزرے ان میں مومنانہ صفات کھل کر سامنے آئیں، اف تک نہیں کیا اور سب برداشت کر گئے۔ دار العلوم دیوبند کے اہتمام کی مصروفیات اور پیہم اسفار، دعوتی مشاغل اور جسمانی عوارض وضعف کے باوجود مطالعہ وکتب بینی، تصنیف وتالیف، وعظ وخطابت اور تلاوت اور ذکر وفکر کے ہی معمولات جاری رہے جو ان کی زندگی کا جزء لاینفک تھے۔ عہد طفولیت سے لے کر تعلیم سے فراغت تک کے تقریباً بائیس برس اگر نکال لئے جائیں تب بھی نصف عمر ایسی گزرتی ہے جس کے شب وروز علم وعمل، خدمت دین میں گزرتے ہیں اور ایک لمحہ بھی ایسا نہیں کہ جس میں آرام سے بیٹھے ہوں یا قلب ودماغ علمی مشاغل سے فارغ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اکابر دیوبند میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بعد دین کے ہر موضوع پر سب زیادہ تصانیف آپ ہی کی ملتی ہیں۔

ہر مسئلہ کو حکمت قاسمیہ کے رنگ میں حل کرتے اور مخاطب کے ذہن میں نقش کر دیتے۔ تحریر وتقریر، مجلس وگفتگو ہر ایک میں یہی حکیمانہ اسلوب ان کا امتیاز تھا۔ بعض ادق علمی مسائل کو انہوں نے اپنے انداز میں امثال وواقعات اور نئے نئے مقدمات کے ذریعہ اس طرح حل کیا ہے کہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوتی۔

حکیم الاسلامؒ کی وفات کو تقریباً اکتیس برس ہو چکے ہیں ہماری دلی خواہش تھی اور کوشش بھی کہ آپؒ کی ایک مفصل سوانح حیات سامنے آنی چاہئے جس میں آپ کی حیاتِ مبارکہ اور علمی کارناموں کا ایک ایک گوشہ آجائے مگر ایسی عظیم شخصیت پر قلم اٹھانا کوئی آسان کام نہیں تھا، اس عرصہ میں حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کے بعض گوشوں پر مفید تحریریں بھی سامنے آئیں، بالخصوص ۲۰۰۷ء میں جب آپ کی حیات ووفات پر ایک عالمی سیمینار کا اعلان کیا گیا، اس وقت مقالات ومضامین کی صورت میں مشاہر اہل علم کی معیاری تحریریں ہمیں موصول ہوئیں، جنہیں سیمینار کے بعد شائع کرنے کا عزم تھا، مگر تاخیر ہوتی چلی گئی۔ بالآخر قدرت کو یہی منظور تھا کہ یہ تحریریں حکیم الاسلامؒ کی سوانح کا حصہ بنیں۔

رب کریم کا احسان ہے کہ آج ہمارے اس دیرینہ خواب کی تعبیر ''حیاتِ طیب'' کی صورت میں سامنے آرہی ہے۔

''حیاتِ طیب'' کی ترتیب میں جناب مولانا غلام نبی قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند و عزیزم مولانا محمد شکیب قاسمی سلمہٗ ناظم حجۃ الاسلام اکیڈمی واستاذ دارالعلوم وقف دیوبند نے جس محنت، صلاحیت اور سلیقہ کا ثبوت دیا ہے وہ حقیقت میں قابل ستائش ہے۔

جدید طرز تصنیف کے ساتھ ترتیب، کتابت، تصحیح، طباعت، سرورق اور کاغذ کا جو بہتر سے بہتر معیار ہوسکتا تھا اس کے لئے امکانی کوشش کا یہ نمونہ آپ کے سامنے ہے، اس کے لئے عزیزم مولانا محمد شکیب قاسمی ناظم حجۃ الاسلام اکیڈمی واستاذ دارالعلوم وقف دیوبند بطور خاص مبارکباد کے مستحق ہیں۔ حجۃ الاسلام اکیڈمی کا قیام سالِ رواں میں عزیز موصوف ہی کی تحریک سے عمل میں آیا اور اس مختصر عرصہ میں اکیڈمی نے جو علمی و تحقیقی کام کیا ہے اس میں ایک عالمی سطح کا مجلّہ محکمہ ''وحدۃ الامہ'' جس کا اجراء گزشتہ دنوں ساؤتھ افریقہ (جوہانسبرگ) میں منعقدہ سہ روزہ امام محمد قاسم نانوتوی سیمینار کے موقع پر عالمی سطح کے مشاہیر علماء و دانشوران دین کی موجودگی میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے شیخ الحدیث جناب ڈاکٹر محمد عوامہ کے ہاتھوں عمل میں آیا ہے اور دوسرا عظیم الشان کارنامہ ''حیاتِ طیب'' کی ترتیب واشاعت ہے، جس کے لئے بشمول ناظم اکیڈمی عزیزم مولانا محمد شکیب قاسمی، جملہ ارکان حجۃ الاسلام اکیڈمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور اس کی افادیت کو عام فرمائے۔

محمد سفیان قاسمی

نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

............❖............

تقریظ

مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی

شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہ کی شخصیت علم وکمال کی ایک انجمن تھی، اسی شخصیت کے حالات زندگی کو ایک خاص سلیقہ اور ترتیب سے کے ساتھ پیش کرنا واقعی بڑا اہم کام تھا اور شاید اسی لئے اس میں تاخیر بھی ہوئی۔

میرے والد مرحوم حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کشمیریؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''کاش حضرت حکیم الاسلامؒ اپنی سوانح حیات اپنے قلم سے ہی مرتب فرمادیتے تو علم وتحقیق اور حکمت ومعرفت کی ایک نئی کائنات سامنے آجاتی۔''

یہ حقیقت بھی ہے کہ حکیم الاسلامؒ اپنی سوانح حیات خود لکھتے تو حکمت قاسمیہ کی عملی تفسیر دیکھنے میں آتی، یا پھر آپ کے فرزند جلیل خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی صاحب دامت برکاتہم کے گوہر بار قلم سے کچھ سامنے آتا تو دیدنی وشدنی ہوتا مگر اسے حرماں نصیبی ہی تصور کرتے ہیں کہ حکیم الاسلامؒ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام جس آزمائش اور ابتلاء میں گزرے اس نے پوری ملتِ اسلامیہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ خانوادۂ قاسمی کی ان دو بزرگ ہستیوں پر کیا گزری ہوگی، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے میں خود کو اور خاندانی شرافتوں وروایتوں کو سنبھالے رکھنا ہی بہت بڑا کام تھا، پھر ان حضرات نے تو اس سے بڑھ کر دارالعلوم وقف دیوبند کی صورت میں ازسرنو ایک عظیم الشان دینی دانش گاہ قائم کرکے مسلک دیوبند کی شاندار روایتوں کے تحفظ کا وہ سروسامان کیا جو اپنے آپ میں بیسویں صدی کا ایک عظیم الشان دینی کارنامہ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

حکیم الاسلامؒ کو میرے جد امجد حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ سے تلمذ کی جو نسبت حاصل تھی اور جس درجہ کا خاندانی تعلق تھا، میرے والد مرحوم کی کوئی تحریر، گفتگو، مجلس اس کے تذکروں سے خالی نہ تھی۔ راقم السطور نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا ہے کہ جب والد مرحوم حضرت حکیم الاسلامؒ کا ذکر کرتے ہوئے تو آنکھیں بھر آتیں، آواز بھرّا جاتیں، انہیں حضرت حکیم الاسلامؒ سے تعلق ہی نہیں بلکہ عشق تھا، اس

ادب و احترام اور عقیدت و محبت سے ان کا ذکر فرماتے تھے کہ سننے والوں کے دلوں میں بھی حضرت حکیم الاسلامؒ کی محبت اور عقیدت نقش ہو جاتی تھی، جب انہوں نے اپنے والد گرامی حضرت علامہ کشمیریؒ کی سوانح حیات ''نقش دوام''، لکھی تو حضرت حکیم الاسلامؒ سے اس پر مقدمہ لکھوایا، اس وقیع مقدمہ کے آخر میں میرے والد مرحوم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہیکہ خود حضرت حکیم الاسلامؒ کو بھی اپنے استاذ گرامی حضرت علامہ کشمیریؒ کی نسبت کا کتنا خیال تھا اور والد مرحوم سے کس درجہ کا تعلق۔

ہمارے لئے اور تمام ابنائے دارالعلوم کے لئے مقام مسرت ہے کہ ایسی عظیم شخصیت کی ایک مفصل اور معیاری سوانح ''حیاتِ طیب'' حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند کے زیر اہتمام منصۂ شہود پر آرہی ہے۔

کتاب کی ترتیب، سرورق، کتابت، طباعت اور کاغذ ہندوستان میں چھپنے والی کتابوں سے درجہا معیاری اور مثالی ہے اور مندرجات سبحان اللہ و ماشاء اللہ، ہر عنوان پر سیر حاصل گفتگو، ہر موضوع کے مناسب چشم کشا معلومات کا ایک چمن صدرنگ سجایا گیا ہے۔

کتاب کی ترتیب میں جناب مولانا غلام نبی قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند وعزیزم مولانا محمد شکیب قاسمی سلمہٗ ناظم حجۃ الاسلام اکیڈمی واستاذ دارالعلوم وقف دیوبند نے حصہ لیا ہے اور معیاری اشاعت ناظم اکیڈمی سلمہٗ کے سلیقہ اور جہد مسلسل کا نتیجہ ہے، جس کے لئے عزیز موصوف کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ بے شک یہ حجۃ الاسلام اکیڈمی کے علمی کاموں کا نقش اوّل ہے جو اس کے بہتر مستقبل کی غماز اور اس کے پاکیزہ مقاصد کا ایک خوبصورت اشاریہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ''حیاتِ طیب کو قبولیت عطا فرمائے اور قارئین کو استفادہ کی توفیق بخشے۔

سید احمد خضر شاہ مسعودی

شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند

............❖............

حرف آغاز

تیرے فردوس تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشت فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ زار

حضرت اقدس حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند علم وکمال، حکمت و بصیرت، فہم وفراست، اخلاق وعمل، پاکیزگی وتقدس کی ایک خوبصورت تصویر، مسلک دیوبند کے ترجمان، حکمت قاسمیہ کے شارح اور سلفِ صالحین کے سیرت وکردار کا عکسِ جمیل تھے۔

ازشرق تاغرب اسفار کا سلسلہ بھی اور دارالعلوم کے اہتمام کی ذمہ داریاں بھی انجام، نہ اسفار سے انتظامی امور میں خلل نہ انتظامی امور دیگر مصروفیات سے متاثر۔ ہر موضوع پر معرکۃ الآراء تصانیف کا ایک خزانہ عامرہ، ہر عنوان پر مواعظ وخطابات کا ایک بیش بہا ذخیرہ۔ درسگاہ ہو یا خانقاہ، مجلس ہو یا جلسہ، تحریر ہو یا تقریر ہر جگہ دارالعلوم کا تعارف، مسلک کی ترجمانی، اکابر دیوبند کا تذکرہ علم اور علماء کی باتیں، کتابوں کا ذکر احیاء دین کی فکر، معمولی بات کو اتنے حسین پیرایہ میں ادا کرتے کہ غیر معمولی بن جاتی، معمولی لباس میں جچتے، شیروانی زیب تن فرماتے تو طیب سیرت، طیب مقال اور طیب احوال کی شعاعیں طول وعرض سے عکس ریز ہوتیں، چلتے تو داعیانہ کمال، عالمانہ جمال اور عارفانہ جلال، راہوں میں قوس وقزح کے رنگ بکھیرتے، مجلس میں علم وحکمت کے موتی بکھیرتے، مہمات مسائل کو سہل و عام فہم اسلوب اور دلنشیں انداز میں حل کرنے کا ملکہ، اللہ اکبر! موضوع کی پابندی، سیاق وسباق کا احاطہ، عقلی اور نقلی دلائل کا التزام سبحان اللہ!

حقائق کے ساتھ امثال، دقائق کے ساتھ لطائف اور مسائل کے ساتھ تحقیقات کی بارش، حکمت حکیم الاسلامؒ کے کلام کی نقیب، سہل بیانی دیوانِ حکمت کی جنس نایاب، بیان وخطابت کے شیشے میں شراب طہور، الفاظ کو خاتم کلام پر نگینہ بنا کر جڑ دینے کا ہنر، لب ولہجہ میں مٹھاس، صوتی حسن کا زیر و بم دلوں کو زیروزبر کردینے والا، تسلسل کے ساتھ ٹھہراو، جماؤ، استقامت، دماغ مضامین ڈھالنے کی خدائی مشین جس

طرح بولنا چاہتے پوری قدرت، لب کشا ہوتے تو موج رواں، خاموش ہوتے تو بحرِ بیکراں، جو کچھ کہتے خون جگر سے گزار کر کہتے، پورے اعتماد، یقین اور بصیرت کیساتھ بولتے، مشترک مضامین کو اپنی طرح سوچتے اپنے انداز سے کہتے اپنی وضع سے برتتے، اقلیم سخن کے بادشاہ، طرز بیان کے تاجدار خطابت کی روایتی اچھل کود سے دور، تصنع کاریوں سے نا آشنا، لہجہ کی مقناطیسیت، زبان کی شیرینیت اوراور گفتار کی حلاوت میں بڑے سے بڑا آپریشن اور بڑی سے بڑی صداقت کا اظہار، مثبت اور تعمیری انداز میں بات کیسے کہی جاتی ہے، حکیم الاسلامؒ اس فن کے امام، علم بحرِ بیکراں، قوت حافظہ مدہش، وسعت مطالعہ حیرت انگیز، بااختصاص اساتذہ شیوخ کا فیضان مستزاد اور علوم قاسمیہ کا اضافہ ''نور علی نور'' بولتے ہوئے تو جملہ الوان دل ودماغ پر عکس ریز۔ تقریر عالمانہ حکیمانہ محققانہ، بات جہاں سے شروع ہوتی وہیں پر لاکر ختم کی جاتی، طویل سے طویل تقریر میں استقامت نہ پہلو بدلنا نہ موضوع سے انحراف، لب ولہجہ اور حلاوت ملاحت کا امتزاج، آواز دھیمی مگر دل کی گہرائیوں میں اترتی اور ذہن وفکر کے دریچوں کو دستک دیتی ہوئی۔

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی سحر بیانی مشہور، اپنے دور میں ان کی خطابت کے چرچے اور خطیبانہ سحر طرازیوں کے غلغلے، اس کے باوصف لاہور کے ایک جلسہ میں حکیم الاسلامؒ کی تقریر سن کر اتنے متأثر کہ حکیم الاسلام کی شانِ خطابت میں فی البدیہہ ایک قصیدہ ہی کہہ ڈالا ؎

بخت اگر رسا شود، دست دہد سبوئے خوش
از نگہ سمن برے، لالہ رخے نکوئے خوش (۱)

گویا بخاری ایسے شعلہ بیان وسحر طراز خطیب سے بڑھ کر آسمان خطابت پر ایک روشن ستارہ، اس وقت بھی آپ ہی کی شکل میں، عروس البلاد ممبئی کی وہ تاریخی تقریر جس نے رفیقوں سے ہی نہیں فریقوں سے بھی ''فاتح بمبئی'' کا خطاب دلایا؟ عجب نہیں کہ اس کی صدائے بازگشت قریب میں بہتے ہوئے سمندر کی لہروں اور بمبئی کی فضاء میں اب بھی گشت کر رہی ہو۔

بزرگان امت کے واقعات سے خوبصورت نتائج کا استنباط ان کے مخزن خطابت کا گنج گرانمایہ، سادہ بیانی میں پری کا حسن پیدا کرنے کی قدرت، دقت نظری گویا معانی ومطالب کے بحر بیکراں میں سرچ لائٹ کا نمونہ، سطحی معنی سے آگے بڑھ کر جو ہر مقصود تک رسائی کی صلاحیت، معنی آفرینی کے ساتھ نکتہ سنجی، مضامین کے تسلسل کے ساتھ دقائق کا بحر قلزم موجزن، ایک واقعہ کو کئی رخ سے جانچنے، ایک حقیقت کو کئی زاویوں سے پرکھنے ایک شئی کو چار آنکھوں سے دیکھنے اور ایک کیفیت کو کئی ذہنوں سے محسوس کرنے کی حیرت انگیز

قدرت نے ان کی شخصیت کو شہر کی فصیلوں تک محدود نہیں رہنے دیا، شہرۂ آفاق بنایا کرۂ ارضی کے ان بر اعظموں تک پہنچایا، جن کو لوگ جغرافیہ کی کتابوں میں یا دنیا کی نقشوں میں صرف دیکھتے اور پڑھتے تھے ''بقول سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ دار العلوم کے باقی مہتمم ثوابت تھے، مولانا محمد طیب صاحب سیّارہ ہیں'' جب اکثر لوگ اپنے شہروں میں بھی قدم نہیں رکھ سکے تھے، انہوں نے اتنے اسفار کئے کہ بقول: شخصے اگر ان کو دنیا کی گولائی پر لپیٹا جائے تو کئی بار لپیٹا جا سکتا ہے، ان کی بے مثال خطابت اس کونے سے اس کونے میں بانگ درا بن کر پہنچی، اذان سحر بن کر دلوں میں اتری اور ایمان ویقین کی روح پھونکتی چلی گئی اور چمنستان خطابت کی اس عندلیب خوشنوا کی ہر صدا نغمہ لطیف بن کر ہزاروں دلوں کی دھڑکن اور حرارت ایمانی کا سبب بنی۔

لاریب کہ حکیم الاسلامؒ نے نئے افکار، نئے عنوانات، نئے مضامین، کے فلک بوس نظریوں تک رسائی کو ممکن بنایا، ان کے افکار تازہ ہوا کے جھونکوں کے مانند، تو ان کے نظریات چودھویں شب کی چاندنی میں ڈھلے اور دھلے ہوئے، خوش دماغ، خوش فکر، تحریر شگفتہ ودلکش، مضامین عالی، انداز مثالی، اسلوب منفرد اور نتائج اخذ کرنے کا طریقہ حیرت انگیز۔

خورد نوازی وخورد پروری ان کا شعار، مروت، نرم مزاجی خوش اخلاقی ان کا دثار، انتظامی صلاحیتیں زبردست، مگر حاکمانہ انداز اور اہل انتظام کی روایتی طمطراقیوں کا شائبہ تک نہیں، حسد، کینہ، انتقام، ایذارسانی، دل آزاری، طنز وتنقید، اکھاڑ پچھاڑ سے ناآشنا اور فنِ فساد سے قطعاً ناواقف ''المؤمن غِرٌّ کریم'' کے پیکر ''اهل الجنة اُهلُ بُهلُ'' کی تصویر، معصومیت اور سادگی کی تفسیر، رہن سہن، نشست و برخاست خورد ونوش، برتاؤ، گفتگو، معاملات اور طرز زندگی ''و ما انا من المتكلفين'' کی حسین تعبیر، معمولات کی پابندی، زبان پر ذکر، دل میں فکر، سیرت وسراپا میں اتباع سنت کی جھلکیاں، رفتار، گفتار، عبادات، عادات، معاملات، اخلاقیات سب میں نظر آتیں۔

اجلاسِ صد سالہ کے بعد حکیم الاسلامؒ جس درد وکرب اور آزمائش سے گزرے وہ اگر چہ کوئی اتفاقی سانحہ نہیں تھا۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں　　　حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

قدرت کو یوں ہی منظور تھا کہ حکیم الاسلامؒ کے سوانح حیات کے بابِ عزیمت کی تکمیل ایک ایسے سانحہ اور آزمائش سے ہو جو ارباب عزیمت کی آپ بیتیوں میں عزیمت کے واقعات سے بڑھ کر یا ان کے ہم پلہ نہ سہی کم بھی نہ ہو، اب اس داستانِ دلخراش کو دہرانے سے حاصل ہی کیا جو اس وقت موجود تھے ان میں سے

بیشتر نے یہ داستان سنی تو درمیاں سے سنی اور جنہوں نے نہیں سنی وہ درمیاں اور انتہا دونوں سے بے خبر۔

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی   نہ ابتداء کی خبر نہ انتہاء معلوم

حکیم الاسلامؒ نے تقریباً ساٹھ سال تک اپنے جدامجد کے گلشنِ دین ودانش کی آبیاری کی، اس کی ترقی وتعمیر اور نیک نامی کے اسباب پیدا کیے، دارالعلوم کواس مقام تک پہنچادیا کہ آنے والے اگراس کے مسلک ومزاج اور روایات کا تحفظ ہی کرلیں تو غنیمت ہے۔اس حقیقت کا انکار کرہی کون سکتا ہے کہ حکیم الاسلامؒ کے جدامجد حضرت نانوتویؒ دارالعلوم دیوبند کے ہی نہیں فکر دیوبند کے بھی بانی تھے اور حکیم الاسلامؒ کی پوری زندگی دارالعلوم دیوبنداور فکر دیوبند کی ترویج، تحفظ اور اکابر دیوبند کے تعارف وتذکروں میں گزری۔دارالعلوم ان کی شخصیت کا جزوِلازم اوران کی شخصیت دارالعلوم کی مفادومصالح کے لئے وقف رہی۔دیوبندی مکتبۂ فکر کوان کے دور میں فرقِ ضالہ کی جن یورشوں کا سامنا تھا اور عقیدہ وفکر کے جومعرکے انہیں درپیش تھے وہ اب کہاں؟

حکیم الاسلامؒ نے کانٹوں کے فرش پر چل کر آنے والوں کے لئے راہیں ہموار اور خوشگوار بنائیں، اب چلنے والے پُرخار راہوں پرنہیں، پھولوں کے سیج پر چلیں گے۔

خارہےازاثر گرمیٔ رفتار سوخت   منت برقدم رہ رواست مرا

گویا اب صورت حال یوں ہوئی کہ

بہار میں تو زمیں سے بہار اگلتی ہے   جو مرد ہے تو خزاں میں بہار پیدا کر

اور سازگاریٔ ماحول کا تقاضہ اور نصیحت آموزی کا مطالبہ یہ ہوا کہ

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز   جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا   جس کی ہوا میں تند نہیں وہ کیسا طوفان

اس روح فرسا واقعہ سے براہِ راست دوچار ہونے والی شخصیت کے حصہ میں عزیمت، صبر وضبط، شرافت وکرامت اور عفو ودرگزر کی ایک ایک سنت آئی اور ہر اذیت عنداللہ بلندیٔ درجات کا سبب بنی ہوگی۔انشاءاللہ!

اس قصہ کے تعلق سے جو کچھ اور جب کبھی زبان وقلم پر آسکتا ہے تو وہ کسی تأثر اور تأسف کے طور پر نہیں، نوشتۂ تقدیر کی حکایت کے طور پر آسکتا ہے۔

حافظ ازبادِخزاں درچمن مرنج   فکرِ معقول بہ فرماگلِ بے خار کجا است

مسلکی وحدت کی خاطر آخر میں خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم،

مہتمم دارالعلوم وقف نے جس وسعتِ ظرفی کا معاملہ فرمایا وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہی نہیں بلکہ برصغیر میں بیسویں صدی کی تاریخ کا ایک انقلاب آفریں واقعہ بھی ہے۔

کاش کہ ملّی خانہ جنگیوں کے اس ماحول میں اس واقعہ سے عبرت پکڑنے والی کچھ روحیں بیدار ہوجائیں کہ جہاں کچھ حقائق بظاہر دوری کا بھی جواز بن سکتے ہوں وہاں اگر فاصلے کم ہی نہیں، سرے سے مٹا ہی دیئے گئے ہوں تو کیا یہ واقعہ اپنے آپ میں ایسا درس آموز اور نصیحت آمیز نہیں ہوسکتا کہ جہاں کوئی جواز نہیں وہاں اختلافات کی فلک بوس عمارتیں کیوں کھڑی ہیں؟ **فھل من مدّکر.**

حکیم الاسلامؒ جیسی عظیم شخصیت کی حیات وخدمات کی ترتیب وتالیف کی خدمت کو ہم اپنے لئے باعث سعادت تصور کرتے ہیں اور ہمارا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ یہ کاوش اپنے آپ میں معیاری کاوش کہلائے جانے کی مستحق ہے، البتہ اس سے ایک باب ضرور مفتوح ہوا ہے جو انشاء اللہ بہتر سے بہتر کام کرنے والوں کے لئے مہمیز ثابت ہوگا۔

''حیات طیب'' کی ترتیب میں مخدوم مکرم خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم، مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کی علمی سرپرستی وگراں قدر آراء اور حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کی نگرانی اور معاونت کے لئے ممنون اور حجۃ الاسلام اکیڈمی کے رفقائے کار کے مخلصانہ علمی تعاون کے لئے بھی شکرگزار ہیں۔

فجزاھم اللہ احسن الجزاء

غلام نبی قاسمی ــــــــــــ محمد شکیب قاسمی

۱۱/جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ

مطابق ۱۲/اپریل ۲۰۱۴ء

............❖............

ولادت، طفولیت، تعلیم وتربیت

ولادت

محرم الحرام ۱۳۱۵ھ؍مطابق ۱۸۹۷ء بروز یکشنبہ سرزمین دیوبند میں یہ آفتاب علم وحکمت طلوع ہوا، تاریخی نام مظفرالدین رکھا گیا۔

اسمِ گرامی

ایک روایت کے مطابق آپ کے جدامجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے تلمیذ رشید حضرت مولانا عبدالغنی پھلاودیؒ نے آپ کا تاریخی نام ''خورشید قاسم'' رکھا، مگراصل نام ''محمد طیب'' تجویز ہوا اوراسی نام نے شہرت پائی، شہرت بھی ایسی کہ شہرتوں کواس پر ناز، ناموریوں کوفخر، نیک نامیوں اور عظمتوں کو رشک، یہ نامِ طیب خالص کی طرح پھیلا اوراس کے بعد ایک عالم کومشکبار کیا، مسمیٰؒ کی نفاستوں اورنظافتوں نے ''اسم طیب'' کی لطافتوں، پاکیزگیوں اورنزاکتوں کوالم نشرح کیا۔ خورشید بن کرعلوم قاسم کواپنی کرنوں سے مخلوقِ خدا میں تقسیم کیا، علم وحکمت کے جس میدان میں قدم رکھا فتح ونصرت نے بڑھ کر قدم چومے، کامیابیوں نے بلائیں لیں کہ آخر تاریخی نام مظفر دین بھی تو تھا، مستقبل کے ''حکیم الاسلام'' کی ان فیروزمندیوں اورسرفرازیوں کودیکھ کرہی توقدرت نے یہ دونوں مبارک نام والدگرامی کے قلب صافی میں القا کئے تھے۔ سیرت وسراپا، قد وقامت جسم وجاں، قلب وقالب، علم وعمل، ذہن وفکر، حرکت وسکون، سکوت وبیاں، لباس وپوشاک، وضع قطع، عادات واطوار، خصائص وخصائل پر پاکیزگی کا سایۂ نفاست کا اثر، نظافت کا غلبہ اورلطافت کا جلوہ، اولاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ''طیب وقاسم'' کے بعد تاریخ میں ان دو ناموں کوقدرت نے جوشہرت عطا فرمائی تھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ مستقبل کے ''حکیم الاسلام'' اورحال کے ملکوتی پیکر پر محمد طیب کا نام ایسا منطبق کہ دو لفظی نام میں جہانِ معنی پوشیدہ، معنی بھی وہ جو معانی کی روح یا

روح المعانی، جو حیات طیبہ کے جزو کل پر عکس ریز، ادائیگی میں خفیف تو وزن میں ثقیل، سامع کے لئے لذت نواز تو باصرہ کے لئے ''قرۃ العین'' یا ''کحل الحرمین'' یہ حکیم الاسلامؒ کے قلم اعجاز رقم یا خامۂ عنبر شمامہ سے بصورت دستخط مثل ہلالِ عید یا ختمۂ مسک کی خوبصورت تصویر۔

شجرۂ نسب

مولوی محمد ہاشم
شیخ عبدالسمیع
شیخ محمد مفتی
شیخ ابوالفتح

شیخ محمد عاقل — شیخ علاء الدین — حکیم عبداللہ

شیخ علی محمد — شیخ محمد بخش — حکیم غلام اشرف

خادم حسین — تفضّل حسین
حبیب حسین — ابوالحسن امام محمد حسن

شیخ غلام بخش
شیخ اسعد علی
حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی
حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب
حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ

حکیم ولی محمد — مولوی احمد علی — حافظ محمد حسن

حکیم امانت علی — مولانا مملوک علی — حافظ لطف علی

مولانا محمد یعقوب
صدر المدرسین دار العلوم دیوبند

مولوی مظہر — مولوی احسن — مولوی منیر

آیۂ اخلاق کامل طیب و پاکیزہ رُو　　زینتِ گلزارِ قاسمؒ جامعِ صد رنگ و بُو
فخرِ ملت ، شمعِ حکمت، مقتدائے ما امام　　لائق مدح و ستائش صاحبِ حسنِ نظام

بسم اللہ

تسمیہ خوانی کی رسم جن خصوصیتوں کے ساتھ آج ہم پا رہے ہیں بجنسہٖ اپنے انہی لوازم کے ساتھ یہ رسم اسی ملک میں آج سے پانچ چھ سو سال پیشتر بھی ادا ہو رہی تھی، فوائد الفؤاد میں امیر حسن علا سنجری ناقل ہیں کہ:

شنبہ شانزدہم ماہ محرم ۷۱۶ھ سعادت دست بوسی حاصل شد، بندہ آں روز خرد کہ را از اعزہ پیش برد، عرض داشت کرد کہ ایں را بہ قرآن خواندن فرستادہ شود، اول بخدمت مخدوم آورشدہ است تا بہ برکت نظر مخدوم ونفس پاک خدائے تعالیٰ وزی کند۔(۲)

۱۶؍محرم الحرام ۷۱۶ھ روز شنبہ دست بوسی کی سعادت حاصل ہوئی، بندہ اس دن ایک عزیز بچہ کو خدمت میں لے گیا، عرض کیا کہ اس کو قرآن پڑھانے کے لیے بھیجا گیا ہے، پہلے آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے کہ مخدوم کی نظر کیمیا صفت کے صدقے میں اس کو قرآن ارزانی ہو۔

اور یہی رواج مسلمانوں میں بحمد اللہ اب تک جاری ہے کہ شہر یا قصبہ وگاؤں میں نسبتاً جو زیادہ صاحب دین وعلم ہو، بچوں کا مکتب ان ہی سے کراتے ہیں، امیر حسن اس کے بعد لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے یہ سن کر ''دعاءِ خیر ارزانی داشت''

جب دعا ہو چکی:

بعد ازاں تختہ بدست مبارک گرفت ونوشت ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''

''اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی یاد تو ہر کام سے پیشتر مسلمانوں کا دستور ہی ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ آج بھی بچوں کے مکتب کا آغاز ہوتا ہے، سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں بھی آغاز کے وہی الفاظ مروج تھے، حسن لکھتے ہیں کہ بسم اللہ کے بعد حضرت والا نے رقم فرمایا:

''رب یسر ولا تعسر''

(اے اللہ علم کو آسان کر اسے دشوار نہ بنا)

''ا ب ت ث ج''

ہجا کے یہ حروف سلطان المشائخ نے اپنے دست مبارک سے لکھے، خرف آگے بڑھایا گیا اور حضرت والا نے:

آں گاہ ایں حروف راز بان مبارک خود تلقین کرد۔ اس وقت حضرت نے خود اپنی زبان مبارک سے بچہ کو یہ حروف کہلوائے۔ (۳)

اس سے معلوم ہوا کہ مکتبی زندگی کا آغاز اکابر وقت کے ذریعہ ہونا کوئی بدعت یا امر محدث نہیں ہے، بلکہ تعلیم و تعلم کی دنیا کا ایک ایسا پاکیزہ معمول ہے کہ جس کی برکتوں کی شہادت قرنوں اور صدیوں نے دی ہے، اسی معمول کے مطابق حکیم الاسلام کی مکتبی زندگی کا آغاز ہوا۔

اسلامی علوم وفنون کی دنیا میں کسی سچے اور حقیقی طالب علم کی طلب وجستجو کی کوئی منزل آخری منزل نہیں ہوتی، ہر منزل اپنی جگہ پر ایک نئی منزل کی تمہید ہوتی ہے، تاہم درسِ نظامی کی تکمیل کی جو میعاد شروع سے چلی آرہی ہے اسکو ایک انتظامی معاملہ کہا جاسکتا ہے، اس کی رو سے نصاب تعلیمی کی تکمیل اسی میعاد میں ہوتی ہے تو آگے ذاتی مطالعہ سے بہت سے ان رخنوں کو پورا کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ طالب علم میں اکتسابِ تلقی کے بعد انتخاب کیساتھ، مطالعہ اس کے استحضار اور بروقت اس کو کام میں لانے کے جوہر موجود ہوں۔

اسلاف کی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر نے نہ صرف یہ کہ نصاب تعلیم کو کم سے کم وقت کے اندر پورا کیا ہے بلکہ کم عمری میں ہی تکمیل کردی، حکیم الاسلامؒ بھی انہیں شخصیات میں ہیں آپ کو ۱۳۲۲ھ میں تعلیم وتربیت کے لیے مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی آغوش میں دے دیا گیا، وقت کے اساطین علم اور شیوخ کی موجودگی میں مکتب نشینی کی مبارک تقریب عمل میں آئی۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ، شیخ طریقت مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ اور آپؒ کے والد محترم حضرت مولانا محمد احمد صاحب قاسمیؒ جیسے اساطین علم نے بسم اللہ شروع کرائی۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ نے اس مبارک مجلس کی تاریخ ذیل کے قطعہ سے نکالی۔

حبذا مکتبِ طیب کی مبارک تقریب ۔۔۔ کہ نئی طرح کا جلسہ تھا نئی طرح کی سیر

فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ **تمم باالخیر** ۔۔۔ ربِّ یسّر جو کہا اس نے تو بروئے ابا

دو سال کی مدت میں آپ نے پورا قرآن مجید حفظ کیا اور اس کے ساتھ قرائت وتجوید میں مہارت تامہ حاصل کی۔ حفظِ قرآن شریف سے فراغت کے بعد درجۂ فارسی میں داخل کیے گئے اور وہاں سے پانچ سال میں پورا نصاب مکمل کر کے سندِ فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد شعبہ عربی میں داخلہ لے لیا چونکہ بچپن ہی سے خدا تعالیٰ نے بے حد قوت حافظہ بطور خاص ودیعت فرمائی تھی، جس مقدس شخصیت کے ساتھ حضرتؒ کا

نسبی انتساب تھا، ان ہی کی نسبتِ روحانی نے مخفی صلاحیتوں کی روحانی تربیت ونگہداشت فرمائی۔ آٹھ سال کی مدت میں آپؒ نے دارالعلوم دیوبند کی تمام نصابی تعلیم سے ۱۳۳۷ھ میں فراغت پاکر سندِ فضیلت حاصل کی۔ حدیث میں آپؒ کو خصوصی تلمذ امام العصر محدّثِ عصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ سے حاصل رہا۔

اس کے علاوہ حدیث کی خصوصی سند آپ کو وقت کے مشاہیر علماء واساتذہ سے بھی حاصل ہوئی۔ چنانچہ مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ نے بطور خود آپ کو سہارنپور طلب فرما کر اوراوائل حدیث پڑھوا کر اپنی خصوصی سند خود اپنے دست مبارک سے لکھ کر عطا فرمائی۔ اسی طرح حضرت مولانا عبداللہ صاحب انصاریؒ اور اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد احمدؒ سے بھی سندِ حدیث حاصل کی، آپؒ کے دوسرے اساتذہ ومشائخ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مفتیٔ اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں دیوبندیؒ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہیؒ، حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ اور حضرت مولانا رسول خانؒ جیسے مشاہیر اساتذہ شامل ہیں۔ جنھوں نے آپ کی تعلیم وتربیت میں حصہ لیا اور آپ پر ہمیشہ شفقت فرماتے رہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ اپنی تعلیم وتربیت اور اساتذہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

’’چودھویں صدی ہجری کے شروع اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر میں میری پیدائش ایسے ماحول میں ہوئی کہ ہندوستان کی قدیم تہذیب وتمدن کے سانچے ٹوٹ رہے تھے اور ایک نئی تہذیب وتعلیم کا غلغلہ تھا۔ میری پیدائش میرے جدِ امجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے گھرانہ میں ہوئی ہے۔ جو اپنے وقت میں علم ودین کے مجدد تھے اور ان کی زندگی سادہ، توکل پسندی، کم سے کم اسبابِ معیشت اور جفاکشی کا نمونہ تھی۔ ان کی اہلیہ محترمہ میری دادی صاحبہ حضرت نانوتویؒ کے فیضانِ صحبت اور رفاقت سے براہِ راست مستفید تھیں۔ دادی صاحبہ اپنی عبادت وریاضت سخاوت، کشادہ دلی، شعائرِ دین پر پختگی، نماز روزہ ذکر واوراد کی پابندی میں اپنی مثال آپ تھیں‘‘ میرے والد محترم مرحوم ومغفور حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ اور ان کی والدہ صاحبہ میری دادی مرحومہ کے زیر سایہ مجھے تعلیم وتربیت نصیب ہوئی۔ ان کی ساری ضروریات زندگی میں بے حد سادگی، مزاجوں میں انکساری اور تواضع کے ساتھ ان سینکڑوں طلباء دارالعلوم کے لیے جو ملک و بیرون ملک سے لمبی لمبی مسافتیں طے کر کے آتے اور دارالعلوم میں جمع ہوتے تھے۔ میری دادی صاحبہ والد مرحوم اور سارے گھرانہ کی طرف سے غیر معمولی

شفقت اور ہر وقت ان کی تعلیمی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی دھن تھی۔ بس یہی ماحول تھا جس میں میں نے آنکھ کھولی، والد مرحوم کا یہ ایک قصہ ضرور قابلِ ذکر ہے کہ دارالعلوم کے ایک طالب علم نے دُھلے ہوئے گیلے کپڑے سکھانے کے لیے دارالعلوم کی مسجد میں ڈالے۔ والد صاحب مرحوم نے دیکھا تو خفا ہوئے اور ڈانٹ ڈپٹ کی مگر بعد میں آپ نے جذبۂ ترحم سے اپنی سخت گیری پر جو صرف مسجد کی حرمت کے لیے تھی اتنے متاسف ہوئے کہ اس طالب علم کو بلا کر اس سے معذرت کی اور کئی ہفتے اپنے ساتھ کھانے میں شریک رکھا۔ یہ گویا طلبائے دارالعلوم کے حق میں ان کی پدرانہ شفقت کا ایک بے اختیارانہ جذبہ تھا۔ جو طلبہ میں معروف تھا۔

حضرت مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہیؒ تشریف فرما تھے۔ وہ امروہہ ہی کے باشندے تھے۔ حضرت مولانا امروہی، مرحومہ دادی اماں کو اسٹیشن سے پالکی میں اس شان سے گھر لائے کہ کہاروں کے ساتھ پالکی کو اٹھانے والوں میں خود بھی شریک تھے۔ یہ تھا اس دَور میں اپنے اساتذہ اور ان کے متعلقین کے ساتھ اور ان کی اولاد کے ساتھ شاگردوں کا ادب و احترام۔ میرا تعلق ایک ایسے ماحول سے رہا ہے جس میں دین کے سب ہی شعبوں بالخصوص دینی تعلیم اور دین کے نادار طلبہ سے محبت و شفقت زندگی کا ایک بہت بڑا فرض سمجھا جاتا تھا۔ میرے آباؤ اجداد نے طلبۂ علوم دینیہ کو اپنی اولاد کی طرح پالا ہے اور یہاں تک کہ بعضوں کی شادی کی تقریبات بھی خود ہی انجام دیں۔ کتنے ہی علماء و فضلاء ہیں جن کی مجالس نکاح ہمارے گھر پر آراستہ ہوئیں۔ حضرت قبلہ علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی شادی بھی میرے والد صاحبؒ کے زیرِ انتظام ہوئی۔

حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ مدنی مہتمم مدرسہ شاہی مراد آباد خود دیوبند کے ایک اونچے خاندان کے فرد تھے ان کی تقریب شادی بھی میرے والد صاحبؒ نے کی۔ غرض کہ میرا گھرانہ علماء و فضلاء عصر کا مورد تھا۔ دوسرے متعدد علماء و فضلاء نے سالہا سال تک میری دادی صاحبہ اور والدہ صاحبہ کے زیر سایہ راحت و آرام سے وقت گذارا۔ تعلیمی زندگی میں مجھے وقت کے یگانۂ روزگار علماء اور فضلاء کرام سے استفادہ کا موقع ملا۔

حفظِ قرآن اور تجوید قرأت میں مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ فارسی میں حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ (والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ) فنون میں ابوالاساتذہ حضرت مولانا غلام رسول ہزارویؒ اور علوم کتاب و سنت میں علامہ دہر، یگانہ روزگار الاستاذ الاکبر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن

صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا سید میاں اصغر حسینؒ، مولانا اعزاز علی اور مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ میرے اساتذہ رہے۔اسی طرح اپنے رفقاء درس میں بڑے بڑے فضلاء کو جمع پاتا ہوں۔لیکن جن رفقاء کے ساتھ تعلیمی دور کا اکثر وقت گذرا، ان میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ مفتیٔ اعظم پاکستان، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا سید بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنیؒ اور مولانا میرک شاہ کشمیریؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات بھی اپنے علم وفضل میں بے نظیر ہیں۔

اساتذہ نے کس قدر غیر معمولی شفقت کا ثبوت دیا۔اس کے بارے میں ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے:

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ حدیث شریف کے استاذ اعلیٰ تھے مگر بے حد نازک مزاج اور حساس طبیعت کے بزرگ تھے۔طلباء کی ذراسی غفلت پر خفا ہو جاتے۔ایک دفعہ طلباء کی کسی غلطی پر خفا ہو کر گھر میں بیٹھ گئے اور دارالعلوم میں سبق پڑھانا موقوف کر دیا۔طلباء پر استاد کی خفگی کا بہت بڑا اثر ہوا۔مشوروں کی مجلس منعقد ہوئی اور طلباء نے یہ طے کیا کہ حضرت مولانا عثمانیؒ کو منانے کے لیے ان کے سامنے مجھے پیش کیا جائے۔حالاں کہ میں خود بھی اس سال حضرت کے ہاں ایک طالب علم ہی تھا۔چنانچہ میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں جاکر عرض معروض اور طلباء کی طرف سے ندامت کا اظہار کیا تو حضرت مولانا نے خندہ پیشانی سے میری سفارش قبول فرمائی اور فوراً ہی مدرسہ تشریف لے آئے اور اسباق کا سلسلہ شروع کر دیا۔

میرے ساتھ بزرگوں کی یہ شفقت وعنایت دیکھ کر اکابر کی کشیدگیوں کو دور کرنے کے لیے اساتذہ کی طرف سے مجھے ہی منتخب کیا جاتا تھا۔(۴)

حفظ قرآن وتجوید

آپ کے والد محترم کا جذبہ یہ تھا کہ بچہ کو شروع سے ایسے حافظ کے پاس بٹھایا جائے، جو اچھا قاری بھی ہو تا کہ ابتداء ہی سے حروف کے مخارج صحیح طور پر ادا ہوں اور قرآن کو اس کے پورے حقوق کے ساتھ پڑھا جا سکے، چنانچہ اس خدمت کے لیے حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے غالباً حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے مشورہ سے مولانا قاری عبدالوحید خاں صاحبؒ الٰہ آبادی (م ۱۳۲۶ھ) کو منتخب فرمایا اور ان کو بطور خاص ذاتی طور پر بلاکر اپنے گھر پر رکھا۔تا کہ وہ بچہ کی تعلیم وتربیت کا فریضہ ادا کریں۔قاری صاحبؒ کا قیام وطعام اور مشاہرہ سب اپنے ذمہ لیا۔(۵)

حفظِ قرآن مجید

روودادِ دارالعلوم میں آپ کا نام درجہ حفظ میں شروع سے درج ہے اور ہر سال کی مقدار خواندگی بھی ۱۳۲۶ھ کی روداد میں ''درجہ حفظ قرآن'' کے اندر آپ کا نام اس طرح درج ہے۔

''مولانا محمد طیب پسر مہتمم مدرسہ ہذا''

اور اس کے آگے صراحت ہے۔''قرآن شریف تمام''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ شعبان ۱۳۲۶ھ میں آپؒ نے قرآن پاک تجوید کے ساتھ حفظ کر لیا تھا اور گیارہ بارہ سال کی عمر میں آپ حافظ قرآن ہو گئے تھے۔

تجوید

قاری صاحبؒ موصوف تشریف لے آئے تو حضرت شیخ الہند نے حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سے فرمایا کہ جب قاری صاحب آ ہی گئے ہیں۔تو ایسا کیوں نہ کیا جائے، کہ جناب قاری عبدالوحید صاحبؒ دارالعلوم ہی میں مدرس رکھ لیے جائیں اور یہاں درجہ تجوید کھول دیا جائے تو ان کا افادہ عام ہو جائے گا۔ اس طرح دارالعلوم میں بھی ایک کمی ہے کہ یہاں شعبۂ تجوید نہیں ہے۔ وہ بھی پوری ہو جائے گی اور دوسرے طلباء بھی قرآن پاک تجوید کے ساتھ پڑھنے کی مشق کر لیں گے۔ چنانچہ حضرت ممدوح نے اسے بخوشی منظور فرمایا اور دارالعلوم میں شعبۂ تجوید قائم کر کے قاری صاحب موصوف دارالعلوم کے مجوّد قرار پائے اور حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے اپنے اسی بچہ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو اس شعبۂ دارالعلوم دیوبند میں داخل فرما دیا۔ جو آپؒ کے والد ماجد حضرت نانوتویؒ کی دلی تمناؤں اور دعاءِ سحر گاہی کا ثمرہ ہے اور جس سے ساری دنیا مستفید رہی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت حکیم الاسلامؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ تجوید قائم ہونے کا سبب میں ہوا اور میں ہی اس شعبہ کا سب سے پہلا شاگرد ہوں۔''

اس طرح ابتداء سے لے کر انتہا تک آپ کی تمام تر تعلیم دارالعلوم دیوبند کی آغوش میں ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند کی یہ کرامت ہے کہ ابتداء قیام سے لے کر اب تک تمام رسالوں کی رودادیں چھپی ہوئی اس کے محافظ خانہ میں موجود ہیں، جن میں اور چیزوں کے ساتھ تمام طلبہ کے درجہ وار نام اور ان کے سالانہ امتحانات کے نتائج بھی درج ہوتے ہیں۔ بلکہ ہر سال طلبہ کو جو کتب انعام میں ملتی ہیں۔ ان کے نام بھی محفوظ ہیں۔

دارالعلوم میں درجہ تجوید کا اجراء

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنی مجلسوں میں بارہا فرمایا ''جیسا کہ اوپر نقل کیا گیا کہ میری تعلیم سے پہلے دارالعلوم میں تجوید کا درجہ نہیں تھا۔ اس کارِ خیر کا ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مجھ ہی کو بنایا، پھر اس شعبہ نے ترقی کی اور آج ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم از کم ایک سال روزانہ ایک گھنٹہ تجوید میں صرف کرے اور قرآن پاک کو تجوید کے ساتھ پڑھنے کی مشق کرے، بحمد اللہ اس شعبہ سے ہزاروں طلبہ نے استفادہ کیا اور آج بھی یہ شعبہ موجود ہے اور متعدد اساتذہ اس خدمت کے لیے مقرر ہیں اور سینکڑوں طلبہ ہر سال اس شعبہ سے مستفید ہوتے رہتے ہیں اور پھر وہ ملک کے مختلف گوشوں میں پھیل کر تجوید کی خدمت انجام دیتے ہیں۔''

خوش الحانی

حکیم الاسلامؒ کیمعاصرین کا بیان ہے ابتداءِ عمر سے ہی آپؒ کی آواز بہت بہتر اور بلند تھی اور اول درجہ کے خوش آواز شمار ہوتے تھے اس وقت کے اکابر اور اساتذہ بہت شوق کے ساتھ آپؒ سے قرآن پاک کا رکوع پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔ خود سرپرست مدرسہ فقیہ الامت حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (م ۱۳۲۳ھ) جب کبھی تشریف لاتے یا آپ گنگوہ جاتے تو حضرت آپ کو بلاتے اور قرآن پڑھوا کر سنتے تھے۔ اس وقت آپ کی عمر سات آٹھ برس کی ہوگی۔ سن کر بہت خوش ہوتے اور دعائیں دیتے تھے اور حکیم الاسلامؒ کی وضاحت ہے کہ وہ اکثر حضرت کے سامنے اللہ نور السّمٰوٰت والارض کا رکوع پڑھا کرتے تھے۔

فارسی میں داخلہ

۱۳۲۷ھ کی روداد میں آپ کا نام درجہ فارسی میں ملتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حفظ ختم کرنے کے معاً بعد آپ کا داخلہ درجہ فارسی میں ہو گیا مگر روداد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ درجہ فارسی کے سالوں میں بھی تجوید کی کتابیں آپؒ قاری عبدالوحید صاحبؒ سے برابر پڑھتے رہے اور ان کتابوں کا امتحان بھی دیتے رہے۔ گویا آپؒ نے قرآت سبعہ اور عشرہ کی کتابیں بھی باضابطہ پڑھیں۔

۱۳۲۷ھ سے لے کر ۱۳۲۹ھ تک مسلسل تین سال آپ نے درجہ فارسی میں رہ کر فارسی کتابیں پڑھیں

اور شعبان ۱۳۲۹ھ میں فارسی کا نصاب ختم کرلیا۔ روداد میں ان تمام کتابوں کے نام بھی درج ہیں۔ جو آپ نے ان تین سالوں میں پڑھی ہیں۔ فارسی کے ابتدائی درجہ سے لے کر درجہ انتہا تک فارسی کی وہ تمام کتابیں آ گئی ہیں جو عام طور پر اس زمانہ میں پڑھائی جاتی تھیں اور اسی کے ساتھ ریاضی، حساب اور جیومیٹری وغیرہ بھی۔

فارسی کے اساتذہ

فارسی کی تمام کتابیں آپؒ نے مولانا محمد یٰسین صاحبؒ (م ۱۳۳۵ھ) سے پڑھی ہیں جو اس وقت دارالعلوم میں درجہ فارسی کے استاذ تھے اور فارسی زبان دانی میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ مولانا موصوفؒ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ مفتی اعظم پاکستان کے والد بزرگوار تھے، آپ دارالعلوم میں ۱۳۰۸ھ سے لے کر ۱۳۳۵ھ تک فارسی کے استاذ رہے۔

ریاضی اور حساب وغیرہ آپ نے منشی منظور احمد صاحبؒ برادر خورد مولانا محمد یٰسین صاحبؒ سے پڑھی یہ دارالعلوم میں درجہ فارسی میں حساب و ریاضی کے استاذ تھے اور ۱۳۱۰ھ سے لے کر ۱۳۵۰ھ تک بحیثیت استاذ دارالعلوم سے متعلق رہے۔

زبان فارسی کی استعداد

جس طرح اللہ تعالیٰ نے حفظ وقراءت میں آپ کو اپنے دور میں ممتاز حیثیت عطا کی تھی۔ اسی طرح فارسی زبان دانی میں بھی آپ کو مہارت تامہ حاصل تھی، کیوں کہ ابتداء طالب علمی سے آپ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں اشعار کہنے لگے تھے۔

فارسی زبان دانی کا فائدہ

یہ فارسی آپؒ کو اس وقت بہت کام آئی۔ جب آپ نے ۱۳۵۸ھ میں افغانستان کا سفر کیا تھا اور دارالعلوم دیوبند کے ایک نمائندے کی حیثیت سے وہاں کے اہل علم اور ارباب حکومت کے مہمان ہوئے تھے۔ اس سفر کی روداد سے ظاہر ہے کہ آپؒ نے وہاں فارسی زبان ہی میں عام طور پر تقریریں فرمائیں اور لوگوں سے اسی زبان میں گفتگو بھی کی۔

افغانستان کے زمانہ قیام میں متعدد مواقع میں مختلف موضوع پر برجستہ اہل علم کے مجمع میں تقریریں

کیں اور مختلف سوالات کے جوابات دیئے۔ جمعیۃ العلماء افغانستان کی طرف سے آپ کی خدمت میں جو سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ وہ فارسی ہی میں تھا اور آپؒ نے اس کا جواب بھی شستہ فارسی ہی میں دیا تھا اور وہاں کے اہل علم آپ کے علم وفضل سے کافی متاثر ہوئے تھے۔

درجہ عربی میں داخلہ

یہ ایک ضمنی بحث فارسی دانی کے سلسلہ میں آ گئی تھی، اس کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی۔ عرض یہ کیا جارہا تھا کہ ۱۳۲۹ھ میں آپ نے درجہ فارسی سے فراغت حاصل کرلی اور ۱۳۳۰ھ سے درجہ عربی میں داخل ہوئے۔

عربی کے اساتذہ

اساتذہ کے سلسلہ میں خود حکیم الاسلامؒ کا بیان ہے کہ صغریٰ، کبریٰ مکمل اور مرقات کا ابتدائی حصہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے خود خواہش کر کے بطور خاص پڑھایا اور اس کے بعد منطق کی کتابوں میں بقیہ مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، سلم العلوم اور اس کی شرح ملا حسن حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ (م ۱۳۸۷ھ) کے پاس ہوئی اور حمد اللہ، قاضی مبارک حضرت مولانا رسول خاںؒ کے یہاں، جو معقولات کے جید استاذ تھے اور مسائل کے سمجھانے میں مہارت تامہ رکھتے تھے، کافیہ حضرت شیخ الہندؒ نے خود شروع کرائی اور اس کا کچھ حصہ سبقاً سبقاً خود پڑھایا بھی اور اس کے بعد بقیہ کافیہ اور شرح جامی حضرت مولانا نبیہ حسنؒ استاذ دارالعلوم کے یہاں ہوئی، جن کو فن نحو سے بڑی گہری مناسبت تھی۔

آپؒ نے شرح وقایہ حضرت مولانا گل محمد خاںؒ کے پاس پڑھی اور اس کے بعد ہدایہ اوّلین شرح عقائد نسفی، عروض المفتاح اور میبذی استاذ الاساتذہ حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ کی خدمت میں اور ہدایہ آخرین حضرت مولانا اعزاز علیؒ سے جو دارالعلوم کے حلقہ میں حضرت شیخ الادب سے یاد کیے جاتے تھے۔

مشکوٰۃ شریف اور مسلم شریف آپؒ نے اپنے والد محترم حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سے پڑھی، جنھوں نے اپنے صاحبزادہ ہی کی خاطر ضعف ونقاہت کے باوجود اپنے پاس رکھیں اور پوری کرائیں اور سنن ابوداؤد حضرت مولانا محمد میاں اصغر حسین دیوبندیؒ سے نسائی حضرت علامہ بلیاویؒ کے یہاں ہوئی اور ابن ماجہ حضرت مولانا غلام رسول خاںؒ کے پاس اور بخاری شریف، ترمذی شریف محدث العصر حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ (م ۱۳۵۲ھ) نے پڑھائیں، جو اس وقت دارالعلوم کی مسند صدارت تدریس پر فائز تھے اور جن کے علم وفضل اور وسعتِ مطالعہ اور قوت حافظہ کا عرب وعجم میں شہرہ تھا۔ جلالین شریف، مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد اور

طحاوی شریف مفتی اعظم عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ (م ۱۳۴۷ھ) سے پڑھی۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حکیم الاسلامؒ کے اساتذہ کس پایہ کے ماہرین فن تھے اور اپنے دور کے کیسے ممتاز علماءِ دین اور مشاہیر اربابِ تدریس سے مستفید ہوکر جامع کمالات بن کر نکلے۔

فراغت

شعبان ۱۳۳۷ھ میں آپ نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کری جس سے قاسم العلوم والخیرات حضرت نانوتویؒ کی روح کو بے حد مسرت ہوئی ہوگی کہ علم وفضل کا یہ سلسلہ خاندان قاسمی میں قائم رہا بلکہ آئندہ نسلوں میں اس کے منتقل ہونے کی صورت پیدا ہوگئی۔

............❖............

تعلیمی ریکارڈ ۱۳۲۲ھ تا ۱۳۳۷ھ (۶)

(۱) ۱۳۲۲ھ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے مشق لہجۂ مصری میں سالانہ امتحان دیا اور ۴۵ر نمبر حاصل کئے اور سوانح قاسمی اور تصفیۃ العقائد دو کتابیں انعام میں ملیں۔

(۲) ۱۳۲۳ھ میں حکیم الاسلامؒ نے قرآن شریف اور تجوید میں سالانہ امتحان دیا اور حسبِ ذیل نمبرات اور حسبِ ذیل کتابیں انعام میں حاصل کیں۔

نمبر شمار	نام کتاب ممتحنہ	نام استاذ جن سے پڑھا	حاصل کردہ نمبر	انعامی کتب
۱	قرآن پ ۶ حفظ	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۰	قرآن شریف
۲	بمشق لہجۂ عربی و مصری	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۱	تعلیم الدین
۳	زبانی قواعدِ تجوید	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۰	جزاء الاعمال جمال قاسمی لطائف قاسمی

(۳) ۱۳۲۴ھ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے قرآن شریف اور تجوید میں سالانہ امتحان دیا اور حسبِ ذیل نمبرات اور حسبِ ذیل کتابیں انعام میں حاصل کیں۔

نمبر شمار	نام کتاب ممتحنہ	نام استاذ جن سے پڑھا	نمبر حاصل کردہ	انعامی کتب
۱	قرآن پ ۱۴ حفظ	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۰	قرآن شریف
۲	عمل بالتجوید مع ترتیل پانچ رکوع مختلف	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۸	شرح مائۃ عامل کلاں

۳	عمل بالتجوید مع الترتیل از سورۂ یٰسین تا سورۂ حجرات از سورۂ ملک تا سورۂ مرسلات	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۵	شرح مائۃ عامل کلاں

(۴) ۱۳۲۵ھ میں حکیم الاسلامؒ نے قرآن شریف اور تجوید میں سالانہ امتحان دیا مندرجہ ذیل نمبرات اور درجِ ذیل کتب انعام میں حاصل کیں۔

نمبر شمار	نام کتاب ممتحنہ	نام استاذ جن سے پڑھا	نمبر حاصل کردہ	انعامی کتب
۱	قرآن پ ۱۸ حفظ	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۰	قرآن شریف
۲	رکوع ۵ مختلف مع الترتیل	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۸	بہشتی زیور حصہ ۱۰
۳	زبانی قواعدِ تجوید	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۷	دستور المبتدی

(۵) ۱۳۲۶ھ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے قرآن شریف اور تجوید میں سالانہ امتحان دیا مندرجہ ذیل نمبرات اور درج ذیل کتب انعام میں حاصل کیں۔

نمبر شمار	نام کتاب ممتحنہ	نام استاذ جن سے پڑھا	نمبر حاصل کردہ	انعامی کتب
۱	قرآن تمام حفظ	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۸	قرآن شریف
۲	رکوع ۹ مختلف مع الترتیل	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۱	تجوید القرآن صرف میر
۳	زبانی قواعد تجوید شریف	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۰	قال اقول ہدایۃ النحو میزان الصرف

(۶) ۱۳۲۷ھ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے قرآن شریف اور تجوید میں سالانہ امتحان دیا مندرجہ ذیل نمبرات اور درج ذیل کتب انعام میں حاصل کیں۔

نمبر شمار	نام کتاب ممتحنہ	نام استاذ جن سے پڑھا	نمبر حاصل کردہ	انعامی کتب
۱	رکوع ۵ مختلف مع سبعہ قرأۃ مع التدویر	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۱	بہشتی گوہر
۲	رکوع ۴ مختلف مسلسل التدویر	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۱	پنج گنج
۳	قواعدِ تجوید شریف	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۵	محمود نامہ، فرہنگ انوار سہیلی
۴	مفید نامہ	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۲	مالا بدمنہ
۵	صفوۃ المصادر	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۱	بوستاں
۶	گفتگو نامہ	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۱	انشائے بہار عجم
۷	مفید الانشاء	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۱	قواعد فارسی
۸	حمد باری	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۱	
۹	کریما	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۱	
۱۰	تشریح الحروف	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۱	
۱۱	حکایاتِ لطیف	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۰	
۱۲	حساب تقسیم بسیط تک	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۰	

(۷) ۱۳۲۸ھ میں حکیم الاسلامؒ نے قرآن شریف، تجوید اور درجہ فارسی میں سالانہ امتحان دیا اور درج ذیل نمبرات اور درج ذیل کتابیں انعام میں حاصل کیں۔

نمبر شمار	نام کتاب ممتحنہ	نام استاذ جن سے پڑھا	نمبر حاصل کردہ	انعامی کتب
۱	از سورۂ نبا تا سورۂ شمس ترتیلاً	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۱	کافیہ

۲	رکوع۴ مختلف تدویراً	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۰	ابواب الصرف جدید
۳	رکوع۳ مختلف درسبعہ قراءۃ	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۰	جمال قاسمی
۴	زبانی قواعد تجویدِ شریف	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۵	
۵	پندسودمند	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۲	فصول اکبری
۶	مصدر فیوض	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۱	صرف میر
۷	رقعاتِ نظامیہ	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۰	ہدایۃ النحو
۸	گلستان سعدیؒ	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۴۹	تحفۂ لحمیّہ
۹	حساب کسور عام	منشی منظور احمد صاحبؒ	۵۰	-----

(۸) ۱۳۲۹ھ میں حکیم الاسلامؒ تجوید اور فارسی کی درج ذیل کتب اور میزان ومنشعب میں سالانہ امتحان دیا اور درج ذیل کتابیں انعام میں حاصل کیں۔

نمبر شمار	نام کتاب ممتحنہ	نام استاذ جن سے پڑھا	نمبر حاصل کردہ	انعامی کتب
۱	میزان الصرف	مولانا سید مرتضٰی حسن صاحبؒ	۵۰	صرف میر
۲	منشعب	مولانا سید مرتضٰی حسن صاحبؒ	۵۰	تحفۂ لحمیّہ
۳	ازسورۂ نبا تاسورۂ ناس مسلسل	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۱	اصلاح الرسوم، اصلاح الخیال، چہل حدیث، حیات خضرؑ، فرحت الصائمین، القول المتین، وظیفۂ کریمہ،
۴	ترتیلاً	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۱	
۵	تدویراً	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۱	
۶	حدراً	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۱	

۷	زبانی قواعد تجوید	مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ	۵۰	رقعات امان اللہ حسینی
۸	مالابدمنہ	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۱	
۹	بوستان سعدیؒ	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۰	تذکرۃ الرشید حصہ اوّل
۱۰	رقعات عالمگیری	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۰	
۱۱	احسن القواعد	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۰	
۱۲	حساب کسور اعشاریہ وغیرہ	منشی منظور احمد صاحبؒ	۵۱	

(۹) ۱۳۳۰ھ میں حکیم الاسلامؒ نے درجہ عربی کی ابتدائی کتب اور فارسی کی اعلیٰ کتابوں میں سالانہ امتحان دیا اور درج ذیل نمبرات اور کتابیں انعام میں حاصل کیں۔

نمبر شمار	نام کتاب ممتحنہ	نام استاذ جن سے پڑھا	نمبر حاصل کردہ	انعامی کتب
۱	صرف میر	مولانا علی اظہر صاحب بلیاویؒ	۵۵	
۲	علم الصیغہ	مولانا علی اظہر صاحب بلیاویؒ	۵۱	
۳	پنج گنج	مولانا علی اظہر صاحب بلیاویؒ	۵۱	
۴	رقعات امان اللہ حسینی	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۴۹	
۵	احسن القواعد	مولانا محمد یٰسین صاحبؒ	۵۲	
۶	انوار سہیلی	مولانا محمد یٰسین صاحب	۴۸	
۷	تحریر اقلیدس مقالہ اوّل	منشی منظور احمد صاحبؒ	۵۱	
۸	حساب اربعہ سے شراکت تک	منشی منظور احمد صاحبؒ	۴۹	

(۱۰) ۱۳۳۱ھ میں حکیم الاسلامؒ نے درجہ عربی کی ابتدائی کتب اور تجوید میں سالانہ امتحان دیا اور درج ذیل نمبرات اور درج ذیل کتابیں انعام میں حاصل کیں۔

نمبر شمار	نام کتاب ممتحنہ	نام استاذ جن سے پڑھا	نمبر حاصل کردہ	انعامی کتب
۱	صغریٰ کبریٰ	مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ	۵۲	شریفیہ

۲	فصول اکبری	مولانا علی اظہر صاحب بلیاویؒ	۵۱	
۳	شرح مائۃ عامل	مولانا عبدالسمیع صاحبؒ	۵۱	
۴	مفید الطالبین	مولانا عبدالسمیع صاحبؒ	۵۰	
۵	نحومیر	مولانا عبدالسمیع صاحبؒ	۵۰	
۶	ہدایۃ النحو	مولانا عبدالسمیع صاحبؒ	۴۹	
۷	مرقات	مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ	۵۰	
۸	از سورۂ مطففین تا سورۂ ناس	قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۸	ہزالفصاحت ضریری
۹	رکوع ۴ مختلف دراجرائے سبعہ	قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۵	مصباح الحل الکافی
۱۰	زبانی قواعد تجوید	قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۰	ایساغوجی

(۱۱) ۱۳۳۲ھ میں حکیم الاسلامؒ نے درجہ عربی کی ابتدائی درج ذیل کتب اور تجوید میں سالانہ امتحان دیا اور درج ذیل نمبرات اور درج ذیل کتابیں انعام میں حاصل کیں۔

نمبر شمار	نام کتاب ممتحنہ	نام استاذ جن سے پڑھا	نمبر حاصل کردہ	انعامی کتب
۱	کافیہ	مولانا نبیہ حسن صاحبؒ	۶۶	مجموعہ عجیبہ
۲	شرح جامی بحث فعل	مولانا نبیہ حسن صاحبؒ	۶۰	اصلاح الرسوم
۳	منیۃ المصلّی	مولانا نبیہ حسن صاحبؒ	۵۳	خط امام غزالیؒ
۴	قدوری	مولانا نبیہ حسن صاحبؒ	۴۹	القول الفصیح فی مکائد المسیح
۵	کنز الدقائق	مولانا عبدالسمیع صاحبؒ	۵۳	
۶	نفحۃ الیمن	مولانا عبدالسمیع صاحبؒ	۵۰	
۷	کفایۃ المتحفظ	مولانا عبدالسمیع صاحبؒ	۵۰	

۸	شرح تہذیب	مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ	۵۴	
۹	سوئرہ ملک تا سورۂ مرسلات	قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۸	وردنامہ، ادلہ کاملہ
۱۰	وقال ارکبوا بروایت قالونؒ	قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۷	قصیدۂ مدحیہ
۱۱	سورۂ طٰہٰ بروایت خلادؒ	قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۷	حقوق العلم ہدیۃ الوحید

(۱۲) ۱۳۳۳ھ میں حکیم الاسلامؒ نے درج ذیل کتابوں اور تجوید میں سالانہ امتحان دیا اور درج ذیل نمبرات اور درج ذیل کتابیں انعام میں حاصل کیں۔

نمبر شمار	نام کتاب ممتحنہ	نام استاذ جن سے پڑھا	نمبر حاصل کردہ	انعامی کتب
۱	شرح جامی بحث اسم	مولانا عبدالسمیع صاحبؒ	۵۷	
۲	قطبی تصدیقات	مولانا عبدالسمیع صاحبؒ	۵۲	
۳	میر قطبی	مولانا عبدالسمیع صاحبؒ	۵۱	
۴	نورالانوار	مولانا عبدالسمیع صاحبؒ	۵۰	
۵	اُصول الشاشی	مولانا عبدالسمیع صاحبؒ	۵۰	
۶	شرح وقایہ	مولانا گل محمد خاں صاحبؒ	۴۰	
۷	سورۂ قٓ تا سورۂ حدید ترتیلاً	قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۶	مناجات مقبول
۸	تدویراً	قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۶	مناجات مقبول
۹	حدراً	قاری عبدالوحید صاحبؒ	۴۶	جمال القرآن

(۱۳) ۱۳۳۴ھ میں حکیم الاسلامؒ نے مندرجہ ذیل کتابوں میں سالانہ امتحان دیا اور درج ذیل نمبرات اور درج ذیل کتابیں انعام میں حاصل کیں۔

نمبرشمار	نام کتاب ممتحنہ	نام استاذ جن سے پڑھا	نمبر حاصل کردہ	انعامی کتب
۱	میبذی	مولانا غلام رسول صاحبؒ	۵۳	جامع الآثار
۲	ہدایہ اوّلین	مولانا غلام رسول صاحبؒ	۴۶	مباحثہ شاہجہانپور
۳	شرح عقائد نسفی	مولانا غلام رسول صاحبؒ	۴۰	
۴	تلخیص المفتاح	مولانا عبدالسمیع صاحبؒ	۵۱	
۵	مختصر المعانی	مولانا عبدالسمیع صاحبؒ	۴۲	
۶	ملاحسن	مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ	۳۵	
۷	سلم العلوم	مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ	۱۷	

(۱۴) ۱۳۳۵ھ میں حکیم الاسلامؒ نے مندرجہ ذیل کتابوں میں سالانہ امتحان دیا اور درج ذیل نمبرات اور درج ذیل کتابیں انعام میں حاصل کیں۔

نمبرشمار	نام کتاب ممتحنہ	نام استاذ جن سے پڑھا	نمبر حاصل کردہ	انعامی کتب
۱	جلالین شریف	مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ	۵۱	مطوّل
۲	میرزاہد ملا جلال	مولانا غلام رسولؒ	۵۰	الفاظ مترادفہ
۳	رسالہ میرزاہد مع غلام یحییٰ	مولانا غلام رسولؒ	۵۰	فیوض قاسمیہ
۴	مقامات حریری	مولانا حبیب الرحمٰنؒ	۴۶	
۵	صدرا	مولانا ابراہیم صاحبؒ	۴۶	
۶	شمس بازغہ	مولانا ابراہیم صاحبؒ	۴۳	

(۱۵) ۱۳۳۶ھ میں حکیم الاسلامؒ نے مندرجہ ذیل کتابوں میں سالانہ امتحان دیا اور درج ذیل نمبرات اور درج ذیل کتابیں انعام میں حاصل کیں۔

نمبرشمار	نام کتاب ممتحنہ	نام استاذ جن سے پڑھا	نمبر حاصل کردہ	انعامی کتب
۱	مشکوٰۃ شریف	مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ	۵۱	نفحۃ الیمن
۲	نخبۃ الفکر	مولانا سراج احمد صاحبؒ	۵۱	قصیدۂ مناجاتیہ

٣	عروض المفتاح	مولانا غلام رسول صاحبؒ	٥١	
٤	حمداللہ	مولانا غلام رسول صاحبؒ	٤٦	
٥	رشیدیہ	مولانا احمد شبیر صاحبؒ	٥٠	
٦	حسامی	مولانا احمد شبیر صاحبؒ	٤٥	

(١٦) ١٣٣٧ھ میں حکیم الاسلامؒ نے دورۂ حدیث شریف کی مندرجہ ذیل کتابوں میں سالانہ امتحان دیا اور مندرجہ ذیل نمبرات اور مندرجہ ذیل کتابیں انعام میں حاصل کیں۔

نمبر شمار	نام کتاب ممتحنہ	نام استاذ جن سے پڑھا	نمبر حاصل کردہ	انعامی کتب
١	بخاری شریف	علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ	٤٠	مسلم الثبوت، سراجی، براہین قاطعہ، فتاویٰ رشیدیہ حصہ دوم
٢	ترمذی شریف	علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ	٤٥	
٣	مسلم شریف	مولانا محمد احمد صاحبؒ	٥٠	
٤	موطأ امام محمدؒ	مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب	٤٥	
٥	موطأ امام مالکؒ	مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب	٤٠	
٦	ابوداؤد شریف	مولانا سید اصغر حسینؒ	٤٠	
٧	طحاوی شریف	مولانا سید اصغر حسینؒ	٤٢	
٨	نسائی شریف	مولانا شبیر احمد عثمانیؒ	٤٤	
٩	ابن ماجہ شریف	مولانا غلام رسول خاںؒ	٤٢	
١٠	شمائل ترمذی شریف	مولانا غلام رسول خاںؒ	٤٥	
١١	بیضاوی شریف سورۂ بقرہ	مولانا غلام رسول خاںؒ	٤٥	

فراغت

١٣٣٧ھ میں حکیم الاسلامؒ نے دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کی، جیسا کہ نقشہ سے ظاہر ہے، فراغت کے وقت آپ کی عمر ٢٢ر سال تھی اور کل مدت تعلیم ١٥ر سال ٢٢ر سال کی عمر میں بسم اللہ سے لے کر حفظ و قراءت و تجوید، فارسی، عربی اور جملہ علوم و فنون سے کامل دسترس کے ساتھ فراغت کی یہ مدت حیرت انگیز ہے، جس کو

ہم حکیم الاسلامؒ کی خاندانی ذہانت وذکاوت شوق وذوق اورفہم وفراست کی علامت کہہ سکتے ہیں۔

اساتذہ وشیوخ

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے اساتذہ وشیوخ اپنے دور میں علم وعمل کا نمونہ، عوام وخواص کا مرجع، ورع وتقویٰ میں بے مثال، علوم وفنون میں راسخ اوراخلاص وللّٰہیت کی تصویر تھے۔ جیسا کہ خود حضرت حکیم الاسلامؒ نے تحریر فرمایا:

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

”آپ حضرت نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور دارالعلوم دیوبند کے صدرالمدرسین تھے۔ حضرت نانوتویؒ کے بعد قاسمی علوم کا جو فیضان عالم میں آپ کی ذات سے ہوااس کی نظیر دوسرے تلامذہ میں نہیں ملتی۔ اپنے استاذ پر فانی اوران کے علم میں غریق تھے۔ دین کے ہر دائرے میں آپ کی خدمات نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ درس وتصنیف ارشاد وتلقین اور جذبۂ جہاد وحریت میں آپ کی خاموش خدمتیں زبانِ حال سے گویا ہیں۔

آپؒ اپنے استاذ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے علوم کے امین اورخزینہ دار تھے۔ آپؒ نے ان علوم کی ایضاح وتفصیل اور تفہیم وتیسیر میں نمایاں حصہ لیا اور عظیم خدمت انجام دی۔ حضرت نانوتویؒ کی تصانیف کی اعلیٰ ترین طباعت وتزئین حواشی وعنوانات آپؒ ہی نے شروع فرمائی اور حجۃ الاسلام پر آپ ہی نے سب سے پہلے عنوانات قائم کیے۔ قرآن شریف کا ترجمہ فرمایا۔ بخاری شریف کے ابواب وتراجم پر ایک جامع اور دبیز رسالہ تصنیف فرمایا۔ متعدد مناظرانہ تصانیف بھی تالیف فرمائیں اور مناظرے بھی کیے۔ دارالعلوم دیوبند میں چالیس برس تک مسلسل درسِ حدیث دے کر (۸۶۰) اعلیٰ استعداد کے صاحب طرز عالم دین فاضل علوم اور ماہرین فنون پیدا کیے۔ آپؒ کا درسِ حدیث اس دور میں امتیازی شان رکھتا تھااور مرجع علماء تھا۔

آپؒ کوعلماء عصر نے محدثِ عصر تسلیم کیا۔ بیعت وارشاد کے راستہ سے ہزارہا تشنگان معرفت کو عارف باللہ بنایااور آپ کا سلسلۂ طریقت ہندوستان سے گذر کرافغانستان اورعرب تک پہنچا۔ متعدد علمی تصانیف آپؒ نے ترکہ میں چھوڑیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کو غیر ملکیوں سے آزاد کرانے کے لیے ایک زبردست

انقلابی تحریک چلائی جس کو کمیٹی کی رپورٹ میں ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ تحریک بہت زیادہ مؤثر تھی مگر راز میں نہ رہ سکی اور ناکام ہوگئی۔ پھر بھی اس کی آگ جن کے دلوں میں لگی ہوئی تھی انھوں نے آئندہ کام کر کے ہندوستان کو آزاد کرایا۔

آپ تقریباً پانچ برس مالٹا میں قید رہے۔ ۱۳۳۸ھ میں رہا ہوئے۔ ۱۳۳۹ھ میں دیوبند میں رحلت فرمائی۔ قبرستانِ قاسمی میں اپنے استاذ کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔(۷)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

''دارالعلوم دیوبند نے جتنی عظیم شخصیات پیدا کیں۔ اتنی شخصیتیں کم ہی کسی علمی درسگاہ کے حصے میں آتی ہیں۔ شیخ العرب والعجم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ جنھوں نے تقریباً چالیس سال دارالعلوم میں درسِ حدیث وغیرہ کی خدمات انجام دیں، اس کے ساتھ ہی اصلاح وتربیت کا بڑا سلسلہ قائم فرمایا۔ ہزاروں علماء صلحا اور مشائخ طریقت کی صورت میں ہندوستان اور دیگر ممالک میں پھیلا۔

آپؒ کا معمول تھا کہ سارا دن تعلیم وتدریس کی محنت اٹھانے کے باوجود رات کو دو بجے بیدار ہو جاتے اور فجر تک نوافل وذکر میں مشغول رہتے اور رمضان المبارک میں تو تمام رات جاگنے کا معمول تھا۔ حضرتؒ حضرتؒ کے یہاں تراویح سحری سے ذرا پہلے تک جاری رہتیں اور مختلف حفاظ کئی کئی پارے سناتے تھے یہاں تک کہ حضرت کے پاؤں پر ورم آ جاتا۔

اتنے علم وفضل کے باوجود سادگی اور تواضع وتقویٰ کا پہاڑ تھے۔ ایک مرتبہ خوراک اور نیند کی کمی اور طویل قیام کے اثر سے حضرتؒ کا ضعف بہت زیادہ ہوگیا۔ اس کے باوجود رات بھر کی تراویح کا یہ معمول ترک نہیں فرمایا۔ آخر مجبور ہو کر گھر کی خواتین نے تراویح کے امام مولوی کفایت اللہ صاحبؒ سے کہلایا کہ آج کسی بہانے سے تھوڑا سا پڑھ کر اپنی طبیعت کے کسل اور گرانی کا عذر کر دیجئے۔ حضرتؒ کو دوسروں کی راحت کا بہت خیال رہتا تھا اس لیے خوشی سے منظور کرلیا۔ تراویح ختم ہوگئی اور حافظ صاحب اندر لیٹ گئے اور باہر حضرت شیخ الہندؒ۔ تھوڑی دیر بعد حافظ صاحب نے محسوس کیا کہ کوئی شخص آہستہ آہستہ پاؤں دبا رہا ہے۔ انھوں نے ہوشیار ہو کر دیکھا تو خود حضرت شیخ الہندؒ تھے۔

ان کی حیرت وندامت کا کچھ ٹھکانہ نہ رہا وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ لیکن حضرتؒ فرمانے لگے کہ:

''نہیں بھائی کیا حرج ہے۔ تمہاری طبیعت اچھی نہیں ذرا راحت آ جائے گی۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ

حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ دارالعلوم دیوبند کے قدیم فضلاء میں سے تھے۔ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ کے نواسے اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کے بھانجے تھے۔ ۱۲۸۹ھ میں دارالعلوم دیوبند سے تکمیل علوم کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں مدرس مقرر ہوئے۔ پھر اپنے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے حکم پر کچھ عرصہ کے لیے بھوپال چلے گئے اور وہیں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ پھر وہیں سے حج کے لیے چلے گئے۔ واپسی پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ نے آپ کو بھاولپور بھیج دیا۔

۱۲۹۷ھ میں آپ نے دوبارہ حج کا ارادہ فرمایا۔ اس موقع پر حضرت گنگوہیؒ نے جن سے آپ کو شرف بیعت حاصل تھا، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو لکھا کہ مولوی خلیل احمد حاضر خدمت ہو رہے ہیں آپ ان کی حالت پر مطلع ہو کر مسرور ہوں گے۔

حضرت حاجی صاحبؒ نے جب آپ کی باطنی حالت دیکھی تو بہت خوش ہوئے اور سر سے دستار مبارک اتار کر آپ کے سر پر رکھ دی اور اس کے ساتھ اپنی جانب سے تحریری خلافت عطا فرمائی۔ بعد میں اس اجازت نامہ پر حضرت گنگوہیؒ نے بھی دستخط ثبت فرمائے۔

حج سے واپسی کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے آپؒ کو مدرسہ مصباح العلوم بریلی کا صدر مدرس مقرر فرمایا۔ ۱۳۰۸ھ میں آپ کو دارالعلوم دیوبند میں مدرس مقرر کیا گیا۔ ۱۳۱۴ھ میں یہاں سے بحیثیت صدر مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور تشریف لے گئے۔ ۱۳۲۵ھ میں آپؒ کو مظاہر العلوم کا ناظم منتخب کیا گیا اور آخر عمر میں ۱۳۴۴ھ میں بقصد ہجرت مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے۔ آپؒ کو اگرچہ تمام علوم پر مکمل عبور اور مہارت تامہ حاصل تھی لیکن حدیث سے بہت زیادہ شغف تھا۔ اسی شغف کے سبب آپؒ نے ابوداؤد کی شرح فرمائی۔ جو ''بذل المجہود'' کے نام سے پانچ جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔ بذل المجہود علم حدیث میں آپ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپؒ نے کئی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔

۱۵ / ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ کو بمرض فالج مدینہ منورہ میں رحلت فرمائی اور حضرت عثمان غنیؓ کے جوار میں آسودۂ خواب ہیں۔ (۸)

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:

''میں حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی خدمت میں چھ سال رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ حضرتؒ کی تکبیر تحریمہ کبھی فوت ہوئی ہو۔ البتہ ایک دن صبح کو وضو کرتے ہوئے آپؒ کے دانتوں سے خون آنے لگا اور دیر تک اس کا سلسلہ چلتا رہا۔ تو مسجد میں خادم کو بھیجا کہ نماز میں میری وجہ سے دیر نہ کی جائے۔ میرے دانتوں سے خون جاری ہے جو بند نہیں ہوتا۔ اس روز بے شک عذر کی وجہ سے حضرتؒ کی تکبیر تحریمہ فوت ہوئی مگر رکعت اس روز بھی فوت نہیں ہوئی، احقر کو اِن چھ سالوں میں حضرتؒ کے ساتھ سفر و حضر کا بارہا اتفاق ہوا مگر میں نے حضرتؒ کا تہجد ناغہ ہوتے کبھی نہیں دیکھا۔''

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ فرماتے ہیں:

''حضرت سہارنپوریؒ اتنے علم و فضل کے باوجود سادگی اور تقویٰ کا پہاڑ تھے۔ جب ۱۳۱۴ھ میں آپؒ مظاہر علوم میں مدرس ہو کر آئے تو مدرسہ کے متصل کرایہ پر ایک مکان لیا تھا، ۲/روپیہ ماہوار اس کا کرایہ تھا اور جب ۱۳۴۴ھ میں مستقل مدینہ پاک میں قیام کی نیت سے گئے اس وقت تک اسی میں قیام رہا۔ دروازہ کے متصل ایک چھوٹی سی چھپریہ تھی۔ یہ باورچی خانہ تھا۔ اس کے بعد ایک اور کوٹھری تھی۔ اس کے سامنے ایک کوٹھا تھا۔ اس پر بھی ایک چھپر پڑا ہوا تھا۔ ہمیشہ اسی میں گذر فرمائی۔ چار پانچ برس میں وہ چھپر گل جاتا تو اسے بدل دیا جاتا، لوگوں نے کہا بھی حضرتؒ اس کی جگہ ایک ٹین ڈلوا دیں۔ حضرتؒ نے فرمایا:

''ارے کاہے کے واسطے، کتنے دن کی زندگی ہے، سب ٹھیک ہے۔''

الغرض ساری زندگی قناعت کی حالت میں گزار دی۔ آپؒ نے سات حج کیے اور آخری عمر مدینہ منورہ ہی میں بسر کی اور وہیں جنت البقیع میں آرام فرما رہے ہیں۔ (۹)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں:

''حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ مشہور محدث، عارف باللہ، فقیہ اور بزرگ تھے۔ آپؒ دین کے ہر شعبہ کے کاموں کے لیے من اللہ موفق تھے۔ پینتیس برس کانپور کے مدرسہ جامع العلوم میں درس قرآن و حدیث دیا، جس سے آپؒ کے تلامذہ ملک کے ہر طبقہ اور ہر خطے میں پھیل گئے۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا کہ سفر کر کے وعظ و تبلیغ نہ فرمائی ہو۔ تصنیف کے میدان میں قدم رکھا تو ہر علم و فن میں ہزار سے اوپر تصانیف ورثہ میں چھوڑیں آخر میں خانقاہِ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون میں مقیم ہوئے تو ہند اور بیرون ہند کے ہزارہا انسانوں کو بیعت و ارشاد کے سلسلہ سے واصل فرمایا، بڑی تعداد میں آپؒ کے خلفاء ہیں

جنھوں نے مختلف خطّوں میں اصلاح وتربیت کا کام مختلف رنگوں سے انجام دیا، آپؒ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ اولین صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند سے زیادہ مستفید ہیں۔ جو حدیث و تفسیر میں حضرت نانوتویؒ سے مستفید ہیں۔ نیز آپؒ حضرت نانوتویؒ سے براہِ راست بھی بعض تفسیری درسوں میں مستفید ہوئے، حکیم الامتؒ کا لقب آپ کے لیے اسم با مسمّٰی تھا۔ بہر حال آپؒ کی تقریر، تحریر، تصنیف اور تبلیغ سے لاکھوں مسلمانوں کو علمی و عملی فیض پہنچا اور ہزاروں مسلمانوں کی باطنی اصلاح ہوئی۔ آپؒ دارالعلوم دیوبند میں اس سال بغرض حصول تعلیم تشریف لائے جس سال حضرت نانوتویؒ کا وصال ہوا۔ اسی لیے حضرت نانوتوی سے مزید استفادہ نہیں فرما سکے مگر حضرت کے تلامذہ مثلاً حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مولانا عبدالعلی صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے استفادۂ کمالات کیا۔ حق تعالیٰ حضرتؒ کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ (۱۰)

مفتیِ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جنہیں آج دنیا اس صدی کے عظیم رہنما کی حیثیت سے جانتی ہے جو دارالعلوم دیوبند کے فضلاء میں ایک بے نظیر شخصیت ہیں۔ آپؒ ایک امیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن دارالعلوم میں طالب علمی کی زندگی اس طرح بسر کی کہ مدرسے کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد میں رہتے اور طالب علمی ہی کے زمانے سے اوقات نظم وضبط کا یہ عالم تھا کہ ان کی مصروفایت کو دیکھ کر وقت معلوم کیا جاسکتا تھا۔ زمانہ امتحان کا ہو یا عام تعلیم کا، ہمیشہ عشاء کی نماز کے بعد سو جاتے اور آخر شب میں تہجد کے لیے بیدار ہوتے۔ کبھی اس معمول میں فرق نہیں آیا۔ دین اور علم دین کی خدمات کے لیے جتنے شعبے ہیں سب میں آپ کے مآثر بے شمار ہیں۔ ایک ہزار سے زائد آپؒ کی وہ مقبول تصانیف ہیں جن سے لاکھوں مسلمانوں کی زندگیوں میں انقلاب آیا اور آپؒ کے سلسلۂ ارشاد سے بھی لاکھوں مسلمانوں کی زندگی بنی اور سینکڑوں مشائخ طریقت پیدا ہوئے۔ (۱۱)

مفتیِ اعظم مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں:

''مفتیِ اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی نور اللہ مرقدہٗ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے باضابطہ مفتی بلکہ دارالعلوم میں دارالافتاء کا نقطۂ آغاز ہیں۔ دارالعلوم میں دارالافتاء کی منضبط صورت آپؒ ہی کے وجود سے معرض وجود میں آئی۔ آپؒ عارف باللہ، صاحب درس و تدریس، صاحب بیعت وارشاد

اور مربی اخلاق بزرگ تھے۔ آپ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی قدس سرہٗ کے خلیفۂ مجاز تھے۔ جو حضرت مولانا شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔ آپؒ سے دارالعلوم کے حلقوں نے ظاہری و باطنی فیوض و برکات کافی حد تک حاصل کیے۔ افتاء کی خدمات کے ساتھ ساتھ حدیث فقہ اور تفسیر کے اونچے اسباق بھی آپؒ پڑھاتے تھے۔ جلالین شریف میں احقر ناکارہ کو بھی حضرت مفتیِ اعظم ہی سے تلمذ حاصل ہے۔ آپؒ کا بیعت و ارشاد کا سلسلہ کافی پھیلا۔ آپؒ ہی کے خلیفۂ اعظم حضرت مولانا قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھیؒ تھے۔ جن کے خلیفۂ مجاز حضرت مولانا سید بدر عالم صاحب میرٹھیؒ مہاجر مدنی تھے۔ جن سے عرب اور افریقہ میں نقشبندیہ طریق کا کافی شیوع ہوا اور سینکڑوں کی اصلاح ہوئی۔ ساؤتھ افریقہ اور ایسٹ افریقہ کے لوگ جب حج کے لیے حاضر ہوتے تو اکثر و بیشتر مولانا بدر عالم صاحبؒ کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو کر جاتے تھے۔ ابتداء میں حضرت مفتی اعظم ہی حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ (احقر کے والد ماجد) کی غیوبت میں نیابت اہتمام کے فرائض انجام دیتے تھے۔ بہرحال دارالعلوم دیوبند آپ کے علم و سلوک، فتاویٰ اور انتظام وغیرہ سے سارے ہی شعبوں میں مستفید ہوتا رہا ہے۔ (۱۲)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ کے علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ آج ان کی تصنیف ''عزیز الفتاویٰ'' عہد حاضر کے تمام مفتیوں کے لیے ماخذ بنی ہوئی ہے اور فتاویٰ کے ساتھ شغف کا یہ حال تھا کہ وفات کے وقت بھی ایک استفتاء ہاتھ میں تھا جسے موت ہی نے ہاتھ سے چھڑا کر سینے پر ڈال دیا لیکن سادگی و تواضع اور خدمت خلق کا یہ مقام تھا کہ یہ کوئی کیسے سمجھے کہ یہ بھی کوئی بڑے عالم یا صاحب کرامت صوفی اور صاحب نسبت شیخ ہیں۔ جب کہ غایت تواضع کا یہ عالم ہو کہ بازار سے سودا سلف نہ صرف اپنے گھر کا بلکہ محلے کی بیواؤں اور ضرورت مندوں کا سودا بھی خود لاتے بوجھ زیادہ ہو جاتا تو بغل میں گٹھڑی دبا لیتے اور پھر ہر ایک کے گھر کا سودا مع حساب کے اس کے گھر پہنچاتے تھے۔ کبھی تو اس سودا سلف لانے میں ایسا بھی ہوتا کہ جب آپؒ کسی عورت کو سودا دینے کے لیے جاتے تو وہ دیکھ کر کہتی کہ مولوی صاحب یہ تو سودا آپ غلط لے آئے ہیں۔ میں نے تو یہ چیز اتنی نہیں منگائی تھی۔ چناں چہ یہ فرشتہ صفت انسان دوبارہ بازار جاتا اور اس عورت کی شکایت دور کرتا۔ بہرحال آپ اپنے ظاہری اور باطنی علمی و روحانی کمالات میں اپنی نظیر آپ تھے ساری زندگی درس و تدریس تبلیغ و ارشاد اور خدمتِ افتاء میں مصروف رہے۔ ۱۷ر جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ کو آپ نے دیوبند میں رحلت فرمائی۔ (۱۳)

محدّثِ عصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ

حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیو بند حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص شاگردوں میں سے ہیں۔ علم کا چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ آپؒ تمام علوم منقولات و معقولات میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ قوت حافظہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ کئی مشہور محققانہ کتابوں کے مصنف تھے۔ آپؒ کا درس حدیث اپنے دَور کا مشہور درس تھا۔ جو ایک خاص امتیازی طرز لیے ہوئے تھا۔ آپؒ کے تبحر علمی نے درس حدیث کو جامع علوم وفنون بنا دیا تھا۔ آپؒ کے درس نے نقل و روایت کی راہ سے آنے والے فتنوں کے لیے آنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

کتنی معرکۃ الآراء کتابیں خود بھی تصنیف فرمائیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے تلامذہ سے بھی لکھوائیں۔ اس بارے میں بڑے شغف کے ساتھ لکھنے والوں کو علمی مدد دیتے تھے اور کوئی بھی اپنا نوشتہ لاکر سناتا تو غیر معمولی خوشی کا اظہار فرما کر دعائیں دیتے تھے۔

۱۳۲۷ھ سے آپؒ نے دارالعلوم دیو بند میں درس کا آغاز فرمایا۔ ۱۳۳۴ھ سے ۱۳۴۵ھ تک آپؒ دارالعلوم کے صدر مدرس رہے اس دوران تقریباً ایک ہزار طلباء نے آپ سے استفادہ کیا جن میں سے آپؒ کے دور مدرسی میں ۸۰۹ طلباء نے درس حدیث لیا اور اس فن پاک کو تقریراً وتحریراً اور درساً وتدریساً دور دور تک پھیلایا۔ (۱۴)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

''امام العصر نمونۂ سلف حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اپنے علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا کہ اس زمانہ میں مولانا انور شاہؒ کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے۔''

آپؒ کو اللہ تعالیٰ نے تمام علوم وفنون میں ایک بے نظیر جامع عالم بنایا تھا۔ خصوصاً حدیث میں تو اپنے زمانے کے امام زہریؒ اور حافظ ابن حجر سمجھے جاتے تھے۔ آپؒ کا درس حدیث ایک مثالی درس تھا۔ اپنے استاذ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی وفات کے بعد دارالعلوم میں بحیثیت صدر مدرس گیارہ سال درسِ حدیث کی خدمات انجام دیں۔ جس میں ایک ہزار سے زائد طلبہ نے آپؒ سے درس حدیث لیا اور سینکڑوں علماء و محدثین پیدا ہوئے۔ (۱۵)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے ہندوستان، حجاز، عراق، مصر، شام

اور دوسرے ممالک میں علماء وفضلاء سے ملاقات کی اور مسائل علمیہ میں ان سے گفتگو کی۔ لیکن تبحرِ علمی وسعت معلومات اور علوم عقلیہ ونقلیہ کے احاطہ میں حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ کا کوئی نظیر نہیں پایا۔‘‘ (۱۶)

بہر حال آپؒ کی شخصیت ایک جامع شخصیت تھی اور علمی اشغال میں غیر معمولی انہاک اور شغف کے باوجود عمل بالکتاب والسنۃ اور اتباعِ سلف کے اہتمام میں ذرہ بھر بھی کوتاہی نہیں ہوتی تھی۔ ملنے والے بہت سی سنتوں کو حضرت شاہ صاحبؒ کے عمل کو دیکھ کر معلوم کرلیا کرتے تھے۔ سنت نبویؐ کے متعلق کھانا اُکڑوں بیٹھ کر کھاتے تھے اور کھانے میں ہمیشہ تین انگلیاں استعمال کرتے اور دونوں ہاتھ مشغول رکھتے۔ بائیں ہاتھ میں روٹی اور دائیں ہاتھ سے اسے توڑ توڑ کر استعمال کرتے تھے۔ لقمے ہمیشہ چھوٹے چھوٹے استعمال کرتے۔ زہد وتقویٰ حضرت ممدوح کے روشن اور کھلے ہوئے چہرہ پر برستا تھا۔ ایک غیر مسلم شخص نے کسی موقع پر آپ کا سرخ وسفید رنگ، کشادہ پیشانی اور ہنس مکھ چہرہ، نیز چہرہ کی مجموعی عظمت ووجاہت دیکھ کر کہا تھا کہ:

’’اسلام کے حق ہونے کی ایک دلیل یہ نورانی چہرہ ہے۔‘‘

حضرت علامہ کشمیریؒ اپنی جلالت قدر اور رفع منزلت کے باوجود اکابر دیوبند کے متعلق کیا خیال رکھتے تھے اس کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ایک دفعہ فرمایا ہم یہاں آئے یعنی کشمیر سے ہندوستان تو دین حضرت گنگوہیؒ کے یہاں دیکھا۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت رائپوری کے یہاں دیکھا اور اب جو دیکھنا ہے تو وہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے یہاں دیکھئے۔ (۱۷)

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ

آپؒ دار العلوم دیوبند کے قدیم ممتاز فضلاء میں بلند مقام پر فائز تھے آپؒ کے والد ماجد حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ ایک جیّد عالم دین اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ بنائے دار العلوم دیوبند میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کے رفیق اور معاون تھے۔ تعلیم وتربیت دار العلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے زیرِ سایہ حاصل کی اور سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد حضرت مولانا محمد احمد قاسمیؒ مہتمم دار العلوم دیوبند کے نائب مہتمم مقرر ہوئے۔ آپ اپنی دانش وبینش اور فہم وفراست میں یگانۂ ہند تسلیم کیے جاتے تھے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

''حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کا اسم گرامی ہمارے بزرگوں میں بہت نمایاں ہے۔ آپؒ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو علمی و عملی طور پر عجیب کمالات عطا فرمائے تھے۔ آپؒ کو عربی ادب کا بڑا اصاف ستھرا ذوق تھا اور آپؒ کی عربی تحریریں بڑی چست اور ادیبانہ ہوتی تھیں۔ آج کل دارالعلوم کے فضلاء کو جو سند دی جاتی ہے اس کا پورا مضمون حضرت مولانا ہی کا مرتب فرمایا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا قدس سرہٗ کو انتظامی صلاحیت اور سیاسی سوجھ بوجھ اس قدر غیر معمولی عطا فرمائی تھی کہ درحقیقت وہ وزیر بننے کے لائق تھے۔

دارالعلوم دیوبند پر سخت سے سخت وقت بھی آئے، بڑی بڑی شورشیں اٹھیں لیکن میں نے اس بندۂ خدا کو کبھی ہراساں یا پریشان نہیں دیکھا، سنگین سے سنگین حالات میں بھی ان کے اطمینان اور خود اعتمادی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ انھوں نے دارالعلوم میں خلاف معمول باتوں کو کبھی برداشت نہیں کیا اور اپنے حسن تدبر سے مدرسے کو بڑے بڑے فتنوں سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی۔

ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ کے خلاف ایک شدید طوفان کھڑا ہوا جس میں بعض لوگ حضرت مولاناؒ کی جان تک کے دشمن ہوگئے۔ ان حالات میں بھی مولاناؒ کھلی چھت پر تن تنہا سوتے تھے۔

میں نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت! ایسے حالات میں آپؒ کا اس طرح سونا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ آپؒ کم از کم کمرے کے اندر ہی سوجایا کریں۔ لیکن حضرت مولاناؒ نے بڑی بے نیازی کے ساتھ ہنس کر فرمایا۔

''میں تو اس باپ یعنی سیدنا حضرت عثمان غنیؓ کا بیٹا ہوں جس کے جنازے کو چار آدمی اٹھانے والے بھی میسر نہ آئے اور جسے رات کے اندھیرے میں بقیع کی نذر کیا گیا، لہٰذا مجھے بھی کیا پرواہ ہوسکتی ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندیؒ دارالعلوم دیوبند کے چھٹے مہتمم تھے۔ حق تعالیٰ نے آپؒ کو دین کا خاص فہم عطا فرمایا تھا۔ آپؒ کی دانش وتدبر مشہور زمانہ تھی۔ ادبیات کے ماہر تھے۔ عربی نظم ونثر دونوں پر کمال قدرت رکھتے تھے۔ دارالعلوم کے نظم ونسق نے آپؒ کے تدبر و دانش سے عظیم استفادہ کیا۔ آپؒ کی اس دانش وبینش اور عظیم علمی شخصیت کی بناء پر حکومت حیدرآباد کا عہدۂ افتاء مولانا محمد احمد صاحبؒ کے بعد آپؒ ہی کو تفویض کیا گیا تھا۔ آپؒ کا علم، تواضع، مروت اور تحمل مشہور زمانہ تھا۔ آپؒ حضرت گنگوہیؒ کے متوسل اور طریقت کے معمولات کے نہایت پابند تھے۔

وفات کے دن مجھ سے حسرت کے ساتھ فرمایا کہ میرا بارہ ہزار اسم ذات افسوس کہ آج پورا نہ ہوسکا۔

شب بیدار اور ہمہ وقت مشغول کار رہتے تھے۔ ان کی مجلس پر شکوہ اور موجب طمانیت ہوتی تھی۔ کئی عربی قصیدے اور کئی مفید ترین تصانیف آپؒ کا ورثہ ہیں، جو امت کو ملیں۔

ان میں ''اشاعت اسلام'' ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے جو مقبول خواص و عام ہے۔ اس کے علاوہ ''اسلام میں مشورہ کی اہمیت'' قرآنی آیات احادیث نبویؐ اور علماء و فقہاء کے اقوال کی روشنی میں مشورہ کی اہمیت اور فضیلت پر ایک مدلل تالیف ہے۔ آپ عربی زبان کے بہترین ادیب اور شاعر تھے۔ ''قصیدہ لامیۃ والمعجز ات'' اور متعدد قصائد آپ کے طبع شدہ ہیں، جو قصائد الحبیب کے نام سے مشہور ہیں۔ بہرحال آپؒ ایک جیّد ترین عالم، محدث فقیہ اور بہترین مدبر و منتظم تھے۔ ۱۹۳۰ء میں رحلت فرمائی، حق تعالیٰ درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ (۱۹)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ آسمانِ شریعت کے درخشندہ آفتاب، عظیم محدث، جلیل القدر مفسر، متکلم فقیہ، سحر بیان خطیب، اعلیٰ درجے کے انشا پرداز، بلند پایہ سیاست داں اور آپ علم و عمل کا سرچشمہ تھے:

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے شیخ الاسلام علامۂ زماں، محققِ دوراں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو دنیائے اسلام کا درخشندہ آفتاب بنایا تھا۔ ان کی بے مثل ذکاوت، بے مثل تقریر، عجیب و غریب حافظہ، عجیب و غریب تبحر کمالاتِ علمیہ ایسے نمایاں اوصاف ہیں۔ کہ کوئی شخص منصف مزاج انکار نہیں کرسکتا۔''

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں:

''علامہ عثمانیؒ اپنے وقت کے زبردست متکلم، نہایت خوش بیان مقرر، محدث و مفسّر، محقق و مدبر تھے۔ حلقۂ علماء میں ایسا قادر الکلام مقرر اور ایسا بلیغ البیان خطیب شاید اب تک میسّر نہ ہوا ہوگا۔ جب آپؒ تقریر کے لیے کھڑے ہوتے تو یوں معلوم ہوتا کہ علم و کمال کا سمندر موجیں مار رہا ہے اور علم و عرفان کی سوتیں رہ رہ کر ابل رہی ہیں۔ وہ تحریر و تقریر میں اپنے وقت کے امام تھے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں:

''شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کے معتمد علیہ تلامذہ میں سے تھے غیر معمولی ذہانت و ذکاوت کے حامل تھے۔ علم مستحضر تھا اور بڑا منقّح علم تھا۔ علوم عقلیہ سے خاص ذوق تھا۔ منطق و فلسفہ اور علم کلام میں غیر معمولی دسترس تھی۔ حکمتِ قاسمیہ کے بہترین شارح

تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مسجد فتح پوری دہلی کے مدرسہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے تدریس علوم میں مشغول ہوئے۔ پھر دارالعلوم میں بحیثیت استاذ حدیث بلائے گئے۔ حدیث و تفسیر کے اونچے طبقہ کے اساتذہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ پھر ڈابھیل میں ایک عرصہ تک شیخ التفسیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور اپنے آخری دور میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم رہے۔ صحیح مسلم کی بہترین شرح متکلمانہ انداز میں لکھی اور حکمتِ قاسمیہ کو اس میں نمایاں رکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے تفسیری فوائد جو حضرتؒ نے ترجمہ کے ساتھ شروع فرمائے تھے آپ نے پایۂ تکمیل کو پہنچائے، بے مثال خطیب تھے اور خطبات میں قاسمی علوم بکثرت بیان کرتے تھے۔ تحریر و تقریر میں انہی علوم کا غلبہ تھا۔ سیاسی شعور اونچے درجہ کا تھا۔ ملکی معاملات کے اُتار چڑھاؤ کا پورا نقشہ ذہن کے سامنے رہتا تھا اور اس بارے میں جچی تلی رائے قائم کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال میں شریک رہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ آخر میں مسلم لیگ کی تحریک میں شامل ہو گئے اور جمعیۃ علماء اسلام کی بنیاد ڈالی، تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستان پہنچ کر ترکِ وطن کر دیا۔ پاکستانی پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے، پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا۔ قرارداد مقاصد پاس کرائی۔ پاکستانی قوم نے آپ کو ''شیخ الاسلام'' کے لقب سے نوازا۔ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم، پاک باز محدث، بہترین مفسر، خوش بیان اور ایک جیّد عالم ہی نہیں بلکہ ایک صاحب الرائے مفکر بھی تھے۔ فہم و فراست اور فقہ نفس بے نظیر تھا۔

ایک سفر کے دوران بہاولپور میں وفات پائی اور کراچی میں دفن ہوئے۔ پورا ملک اور حکومت سوگوار ہوئی۔ عرصہ دراز تک آپ کا غم منایا جاتا رہا۔ دولاکھ سے زائد افراد نے نماز جنازہ پڑھی رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃ۔ (۲۰)

حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

حضرت الاستاذ مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ جو دیوبند میں حضرت میاں صاحب کے لقب سے معروف تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے اور دارالعلوم دیوبند کے درجہ علیاء کے استاذ تھے ان سے ابوداؤد پڑھنے والے اب بھی برصغیر نیز ہندوپاک میں ہزاروں افراد ہوں گے علم قرآن و حدیث کے بہت بڑے ماہر اور جملہ علوم و فنون کے کامل محقق مگر بہت کم گو، حدیث کے درس میں نہایت مختصر مگر جامع تقریر ایسی ہوتی تھی کہ حدیث کا مفہوم دل میں اتر جائے اور شبہات خود بخود کافور ہو جائیں، دیوبند میں

آپ کا مکان اور نشست گاہ کچی مٹی کی بنی ہوئی تھیں۔ ہر سال برسات کے موقع پر اس کی لپائی پتائی ناگزیر تھی جس میں کافی روپیہ اور وقت خرچ ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ احقر نے حضرتؒ سے عرض کیا کہ حضرتؒ جتنا خرچہ سالانہ اس کی لپائی پر کرتے ہیں اگر ایک مرتبہ پختہ انیٹوں سے بنانے میں خرچ کر دیں تو دو تین سال میں خرچ برابر ہو جائے اور ہمیشہ کے لیے اس محنت سے نجات مل جائے۔

یہ سن کر پہلے تو فرمایا ''ماشاء اللہ بات تو بہت عقل کی کہی ہے ہم بوڑھے ہوگئے ادھر دھیان ہی نہ آیا'' پھر کچھ توقف کے بعد جو حقیقت حال تھی وہ بتائی۔ تب پتہ چلا کہ یہ حضرات کس مقام سے سوچتے ہیں۔ فرمایا کہ:

''میرے پڑوس میں سب غریبوں کے مکان کچے ہیں اگر میں اپنا مکان پکا بنوالوں تو غریب پڑوسیوں کو حسرت ہوگی اور اتنی وسعت نہیں کہ سب کے سب مکان پکے بنواؤں''۔

آپؒ ایک عظیم محدّث فقیہ اور عارف کامل تھے۔ ساری زندگی درس وتدریس اور تبلیغ واصلاح میں گزاری۔ اپنی حیات مبارکہ میں تین حج کیے اور ۱۳۲۰ھ میں علوم عربیہ کی تکمیل سے فارغ ہو کر دارالعلوم دیوبند میں استاذ حدیث مقرر ہوئے۔ تدریس کے ساتھ تصنیف کا بھی مشغلہ رہا۔ فتاویٰ محمدیہ، دستِ غیب، اذان واقامت، حیاتِ خضر، فقہ الحدیث، نیک بیبیاں اور حیات شیخ الہندؒ آپ کے علمی شاہکار ہیں۔

۱۳۶۴ھ میں دیوبند میں رحلت فرمائی اور اپنے اکابر کے ساتھ آسودۂ خواب ہوئے۔

شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علیؒ

شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علیؒ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور شیخ الہندؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ ۱۳۲۰ھ میں دارالعلوم سے سندِ فراغ حاصل کی اور ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم میں مدرس مقرر ہوئے اور تادمِ آخر ۱۳۷۴ھ تک دارالعلوم ہی میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ تدریسی وعلمی خدمات کے ساتھ تصوف وسلوک کے منازل بھی طے کرتے رہے اور قطب الارشاد حضرت گنگوہیؒ سے بیعت کی۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے تھے:

''حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ ہمارے ان اساتذہ میں سے ہیں جن کی تعلیم وتربیت ہماری تعلیم کا اصل قوام تھی۔ دارالعلوم میں درس وتدریس کی والہانہ خدمت آپ کا شب وروز کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کے ساتھ ادب اور فقہ کی بہت سی کتابوں پر حواشی لکھے جو اہل علم میں نہایت مقبول ہوئے''۔ (۲۱)

حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں:

آپؒ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس رہ چکے ہیں اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ معقولات میں خصوصی مہارت حاصل تھی اور درسِ حدیث میں ایک خاص امتیاز رکھتے تھے۔ (۲۲)

حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ فرماتے ہیں:

حضرت مولانا بلیاویؒ دارالعلوم کے مایۂ ناز محقق عالم تھے۔ درسیات کی مشکل ترین کتابوں کے اعلیٰ ترین استاد تھے۔ اپنی حیات کا بہت بڑا حصہ علوم نقلیہ وعقلیہ کی تعلیم وتدریس میں صرف کیا اور پورے ساٹھ برس تک تدریس علوم دینیہ کی خدمت انجام دی۔ ذکاوت وقوتِ حافظہ اور حسنِ تعبیر میں خصوصاً معقول ومنقول کے مشکلات کے حل کرنے میں یکتائے روزگار تھے۔ ہندو پاک کے ہزاروں علماء کے استاد تھے اور اپنے علمی کمالات اور جامعیت کے اعتبار سے قدماء سلف کی یادگار تھے۔ (۲۳)

دو خواب

خود حکیم الاسلامؒ کا بیان ہے کہ جس سال میں نے عربی شروع کی، اس سال ایک رات یہ خواب دیکھا کہ ہاپوڑ سے جو ریلوے لائن مرادآباد جاتی ہے۔ اس ٹرین میں تمام اکابر موجود ہیں، حضرت اقدس نانوتویؒ بھی سوار ہیں۔ امروہہ سے پہلے گنگا کا پل آتا ہے، ریل گاڑی اس پر آکر ٹھہر گئی، رات کا وقت ہے۔ میں چھوٹا بچہ تھا کھیلتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ میں نے دیکھا کہ گنگا کے اندر سینکڑوں دیواریں پانی میں پھیلی ہوئی ہیں، کوئی ادھر جاری ہے اور کوئی اُدھر اور ان کے نیچے پانی بہہ رہا ہے۔ میں ان دیواروں پر ٹہلتے ٹہلتے دور نکل گیا۔ اس وقت میری عمر کوئی دس سال یا گیارہ سال کی تھی۔ میزان منشعب شروع ہو چکی تھیں۔ حضرت نانوتویؒ نے جب مجھے اپنے پاس نہیں پایا تو پوچھا طیب کہاں گیا؟ کہیں باہر تو نہیں نکل گیا۔ رات کا وقت ہے اور نیچے بڑا دریا ہے۔ اسے تلاش کر کے لاؤ بعض حضرات میری تلاش میں نکلے میرے پاس پہنچ کر کہنے لگے تم کہاں چلے آئے۔ حضرت خفا ہو رہے ہیں اور تم پانی میں دیواروں پر گھوم رہے ہو۔ میں ان کے ساتھ ریل کے ڈبہ میں آیا، دیکھا کہ پورا ڈبہ اکابر سے بھرا ہوا ہے۔ حضرتؒ بھی تشریف فرما ہیں اور آپ کے سامنے حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ (متوفی ۱۳۳۰ھ) اور حضرت شیخ الہند دونوں مخصوص تلامذہ باادب بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے حضرت کے سامنے لایا گیا تو حضرت نے فرمایا تو کہاں گیا تھا۔ میں نے کہا

دریا کی سیر کرنے گیا تھا۔ فرمایا ''یہ دریا کی سیر کا وقت ہے'' پھر پوچھا جو کچھ پڑھا ہے ''کچھ یاد بھی ہے؟'' میں نے کہا خوب یاد ہے، پھر تو حضرت نے میرا امتحان لیا مگر میں ہر سوال کا جواب پورے طور پر نہیں دے سکا، فرمایا ''کیا اسی کو یاد کہتے ہیں؟'' اس کے بعد محبت سے مجھے اپنے سینہ سے لگایا اور زور سے دبایا اور فرمایا اچھا ''امکان نظیر پر تقریر کرو۔'' میں بہت تیزی سے فرفر تقریر کرنے لگا۔ حضرت اس وقت اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھے ہوئے تھے، جب اس موضوع پر تقریر پوری ہو چکی تو فرمایا۔ اب ''امکان کذب'' پر تقریر کرو۔ میں نے اس عنوان پر بھی بڑی تیزی سے تقریر کی۔

حضرت مہتمم صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے جب یہ خواب اپنے اکابر سے بیان کیا تو انھوں نے یہی تعبیر دی کہ خواب بہت مبارک ہے اللہ تعالیٰ تم کو علم دین عنایت فرمائیں گے اور حضرت نانوتویؒ کی طرف سے علم کا فیضان ہوگا۔

دوسرا خواب اس سال دیکھا جس سال آپؒ دورۂ حدیث پڑھ رہے تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ دارالعلوم میں بڑی ہمہ ہمی ہے اور ایک جشن کی صورت ہے۔ میں نے طلبہ سے دریافت کیا آج کیا بات ہے جس کی یہ دھوم دھام ہے اور جشن کی تیاری؟ طلبہ نے بتایا آج بخاری شریف کا ختم ہے اور ختم کرانے حضرت نانوتویؒ تشریف لا رہے ہیں۔ میں بہت خوش ہوا کہ چلوں حضرت کی زیارت کرونگا۔ میں نے دیکھا کہ حضرت نانوتویؒ دارالحدیث کے شمالی زینے سے نیچے اتر رہے ہیں اور نیچے کی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ ایک چھوٹا سا سفید عمامہ باندھے ہوئے ہیں اور عمامہ کے اوپر ایک سفید چادر اس طرح اوڑھے ہوئے ہیں کہ چہرہ کچھ تھوڑا کھلا ہوا ہے مگر پورا کھلا ہوا نہیں ہے۔ البتہ داڑھی کے بال کچھ نظر آ رہے ہیں۔ حضرت تیزی سے مولسری کے کنویں کی طرف آ رہے ہیں، اس موقع سے حضرت کی زیارت ہوئی۔

بعض اساتذہ کے خصوصی اثرات

حکیم الاسلامؒ نے اپنی بعض مجلسوں میں صراحت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ:

''مجھے علم حدیث سے لگاؤ اور مناسبت حضرت والد محترم (مولانا محمد احمد صاحبؒ) کے درس سے حاصل ہوئی ان کا بیان بہت دلنشین اور مؤثر ہوتا تھا اور حدیث کی تشریحات اور اس کے معانی پر دسترس حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ (مولانا انور شاہ صاحبؒ) کے ذریعہ حصہ میں آیا اور مسائل کی تعبیر اور تفہیم کا انداز حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ سے سیکھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی علم حدیث پر نظر بہت گہری اور

وسیع تھی، اس کے معانی پر پورا عبور رکھتے تھے اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی فصیح و بلیغ زبان عطا کی تھی اور اپنی بات دوسروں کے ذہن نشین کر دینے پر پوری قدرت حاصل تھی۔"

فن سپہ گری

علم وفن میں مہارت کے ساتھ حضرت والا فن سپہ گری کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں یہ فن میں نے اور سعید بھائی گنگوہیؒ نے امیر شاہ خاں صاحب خورجویؒ سے حاصل کیا۔ جو حضرت نانوتویؒ کے متوسلین میں سے تھے اور نہایت متقی اور پارسا بزرگوں میں سے تھے یہ لاٹھی اور بنوٹ وغیرہ ہم لوگوں کو سکھایا کرتے تھے اور اس سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔

علمی مناسبت

علمی مناسبت طالب علمی کے زمانہ سے حاصل رہی۔ تقریر وتحریر دونوں کا ذوق تھا۔ زیادہ محنت سے طبیعت گھبراتی نہیں تھی اور علم کی ایک دُھن تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خداداد ذہانت، علمی فراست، علمی ذوق، وسعت مطالعہ اور کتب بینی سے دلچسپی شروع سے تھی۔ قوت حافظہ بھی قابل رشک عطا ہوا تھا، پھر جن اکابر اساتذہ سے جو فن حاصل کیا تھا وہ اس فن میں کامل تھے۔ اسی کے ساتھ جو ماحول آپ کو میسر تھا وہ کم لوگوں کے حصہ میں آتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی مسائل وحقائق کو دلائل عقلیہ سے اس طرح عام فہم بنا کر بیان کرتے تھے کہ ہر دل و دماغ بڑی خوشی سے قبول کر لیتا اور بے حد خوشی محسوس کرتا تھا۔ جس مسئلہ پر گفتگو کرتے تھے۔ اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہنے پاتا تھا۔

دیگر علماء سے اجازت حدیث

دارالعلوم دیو بند سے تو آپؒ نے فراغت حاصل کی ہی تھی، دوسرے مشاہیر علماء وقت سے بھی آپؒ کو اجازت حدیث حاصل ہے۔ مثلاً حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ (م ۱۳۴۶ھ) نے آپ کو بطور خود سہارنپور بلایا اور صحاح ستہ کی اوائل کی حدیثیں پڑھوا کر سنیں اور اجازت عطا فرمائی اور اپنے دست خاص سے خصوصی سند حدیث لکھوا کر مرحمت فرمائی۔ اسی طرح حضرت مولانا عبداللہ انبیٹھوی یعنی آپ کے حقیقی بڑے پھوپھا اور آپ کے والد ماجد نے بھی اپنی طرف سے خصوصی اجازت حدیث عطا فرمائی۔

نسبت قاسمی خداداد متانت وسنجیدگی اور علمی ذوق کی وجہ سے اس وقت کے تمام قابل ذکر علماء اور اہل اللہ

نے آپ کے لیے علم وعمل کی خصوصی دعائیں کیں۔ اپنی شفقت ومحبت اور خصوصی توجہات سے نوازا، حوصلہ افزائی فرمائی، اس کے نتیجہ میں جوشِ عمل، جدوجہد اور محنت کے جذبات ابھرے اور مطالعہ کا ذوق راسخ ہوتا چلا گیا اور وہ آگے چل کر رنگ لایا اور دنیا مستفید ہوئی اور انشاء اللہ بہت زمانہ تک ہوتی رہے گی۔

حکیم الامتؒ سے بیعت وخلافت

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی رہنمائی میں سلوک وتصوف کا جو سفر نئے ولولوں کے ساتھ شروع کیا گیا تھا جلد ہی راستہ میں رک گیا۔ حضرت شیخ الہند کی وفات کا بہت زیادہ غم ہوا اور کئی سال اسی حالت میں گذرے اور ساری دلچسپیاں تدریس وتصنیف تک محدود رہیں۔ بالآخر پھر وہی تشنگی آپ کو تھانہ بھون لے گئی اور تربیت باطنی اور تکمیل سیرت کے لیے خانقاہِ اشرفیہ امدادیہ کو منتخب کیا۔ جہاں حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ مسندِ ارشاد پر جلوہ افروز تھے۔ جہاں انسان سازی کا کام بڑی باقاعدگی اور سلیقہ سے ہو رہا تھا اور اس زمانہ میں حضرت حکیم الامتؒ کی ذات بابرکات سے خانقاہِ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون کو وہ مرجعیت حاصل تھی جو گیارھویں صدی کے آغاز میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی ذاتِ اقدس سے سرہند کو حاصل تھی۔ اس چودھویں صدی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت حکیم الامتؒ سے تجدید دین کا کام جس عظیم الشان طریقہ پر لیا وہ اہلِ نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ اس تجدیدی و اصلاحی خدمات کے لیے ضروری تھا کہ وقت کے علماء وفضلاء اس مجدد اعظم کی طرف رجوع کرتے تا کہ اصلاحی مساعی عام ہو جائیں اور ہر مقام میں اس کا شیوع ہو جائے، چناں چہ یہی ہوا کہ غیر منقسم ہندوستان کے علماء کبار کی اکثریت خوانِ اشرفیہ ہی کی زلّہ ربا رہی، بڑے بڑے اصحابِ بصیرت اور اربابِ فکر یہیں سے اپنے دامنوں کو علم ومعرفت کے جواہرات سے بھر کر لے جاتے یہ ایک ایسی جامعیت تھی جو اس دَور میں اللہ تعالیٰ نے حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے خاص کر دی تھی۔ علماء ہوں کہ فضلا، صحافی ہوں کہ شعراء، اہلِ قلم ہوں کہ اربابِ معرفت، سب اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس مخزن سے اپنے نہاں خانوں کو پُر کرتے اور بامراد واپس ہوتے تھے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ بھی ایسے ہی جامع شیخ کی تلاش میں تھے قلب ونظر نے حضرت شیخ الہندؒ کے بعد حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی طرف ایسی جاذبیت اور کشش محسوس کی جو بعد میں رجوع پر منتج ہوئی، اسی باطنی جاذبیت اور عقیدت ومحبت نے ۱۳۴۳ھ میں حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت اقدس میں تھانہ بھون پہنچا دیا۔

حکیم الاسلامؒ اپنے شیخ عالی مقام کے بارے میں خود تحریر فرماتے ہیں کہ:

میری زندگی کی ساخت و پرداخت میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ عمر کا ایک بڑا حصہ حضرت حکیم الامتؒ کے ہاں آتے جاتے گذرا۔ مسائل دینیہ میں ان کی فقیہہ سنجی، بیدار مغزی، حکیمانہ تنقیحات معاشرتی معاملات میں غیر معمولی ضبط و نظم ان کا وسیع عمیق علم ان کی سینکڑوں تصانیف ان کی محبت و بابرکت اور حکیمانہ اندازِ تربیت نے زندگی کے بہت بڑے سبق سکھائے، حضرت حکیم الامتؒ کو اللہ رب العزت نے مرجع خلائق بنایا تھا۔ آج بھی ان کی تصانیف اور ان کے خلفاء کرام شریعت وطریقت کے میدان میں بڑی بڑی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس دور میں حرام وحلال اور جائز و ناجائز کا اہتمام کم ہی ملتا ہے۔ جتنا کہ حضرت کے یہاں تھا۔ آپ کو اپنے والد مرحوم کے انتقال کے بعد جائیداد ملی اس کے متعلق آپ نے سرکاری کاغذات ودستاویزات ترکہ سے اپنے ازسرِ نو تحقیقات فرمائی اور اپنے شہر اور دوسرے شہر کے رہنے والے جس شخص کے متعلق ذراسا بھی معلوم ہوا کہ اس کا ذراسا بھی کوئی حق اس جائیداد میں ہے پورے اہتمام کے ساتھ اس کا حق اسے پہنچایا۔ میرا تعلق حضرت حکیم الامتؒ سے عرصہ دراز تک رہا، حضرتؒ احقر سے بے حد شفقت ومحبت فرماتے، میرے دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کے زمانے میں دل میں انتہائی زیادہ تکبر پیدا ہوا۔ میں نے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی خدمت میں مکتوب لکھا کہ میں تو تکبر میں مبتلا ہو چکا ہوں اس کا علاج تجویز فرمایا جائے، حکیم الامت قدس سرہٗ کو اللہ تعالیٰ نے اصلاح میں اجتہاد کا مرتبہ عطا فرمایا تھا مکتوب کا جواب لکھا کہ ''اہتمام کو چھوڑ کر ابھی تھانہ بھون پہنچو''

مکتوب ملتے ہی میں حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوا، تو فرمایا کہ خانقاہ میں رہائش رکھو اور آپ کے ذمہ کام یہ ہے کہ خانقاہ کی مسجد میں نمازیوں کے جوتے آپ کو درست کرنے ہیں۔

میں نے یہ کام شروع کیا ہی تھا لیکن بقول مولانا رومیؒ

نفس مارا کمتر از فرعون نیست لیکن او را عون مارا عون نیست

اور تمام نمازیوں کی جوتیاں درست کرتا لیکن نفس نے یہ سکھایا کہ جو جوتیاں نئی ہوتیں ان کو درست کر دیتا تھا اور پرانی جوتیاں درست نہ کرتا تھا۔ حضرت حکیم الامتؒ نے ایک مرتبہ دیکھ لیا تو فرمایا کہ:

''محمد طیب کیا وجہ ہے، پرانی جوتیاں بھی تو جوتیاں ہیں ان کو کیوں درست نہیں کرتے'' اور یہ بھی فرمایا کہ:

''تکبر اتنا بڑا مرض ہے کہ یہ اہل اللہ سے بھی بڑی مشکل سے جاتا ہے اور سب سے آخر میں یہ ختم ہوتا ہے۔ اس نے کئی آدمیوں کو ذلیل کیا ہے اور شیطان کو لعنت کے قید خانہ میں گرفتار کیا ہے''

حضرتؒ کے یہ الفاظ سن کر تو میں مر مٹا یعنی ایسی فنائیت حضرت حکیم الامتؒ کی تربیت سے حاصل ہوئی کہ اپنی فنائیت سے بھی بے خبری ہوگئی۔ بقول خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کہ:

مقامِ فناء ہے الفنا چاہتا ہوں میں مٹنے کو بھی مٹانا چاہتا ہوں (۲۴)

مولانا مفتی غلام مرتضیٰ صاحب لکھتے ہیں کہ:

''حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ علوم ظاہریہ سے فارغ ہوئے اور ۱۳۳۷ھ کے بعد باطنی علوم کا آغاز اس طرح ہوا کہ آپ نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کے دستِ کرامت پر بیعت کا شرف حاصل کیا اور حضرت شیخ کے وصال کے بعد قطب العالم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس سرہٗ کے دربار کی طرف رجوع کیا اور چند سال کے بعد ۱۳۵۰ھ میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے آپ کو حکیم الاسلام کا لقب عطا فرما کر خلیفہ مجاز قرار دیا۔ پھر آپ علوم ظاہر کے ساتھ علوم باطن کے بھی شہسوار بنے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں آپ کو ایک خاص مقام حاصل تھا، حضرت تھانوی آپ پر خاص توجہ فرمایا کرتے تھے اور آپ پر حضرتؒ کی خاص نظر عنایت تھی۔ آپ تقریباً بیس سال تک حضرت حکیم الامتؒ کی صحبت میں رہے اور صحیح علمی وروحانی جانشین ثابت ہوئے۔ جس طرح آپ نے علمی ودینی خدمات انجام دیں اسی طرح سلوک وتصوف میں بھی آپ کی بے مثال خدمات ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی عوام کی اصلاح وفلاح کے لیے وقف کی ہوئی تھی اور عام مسلمانوں کو وعظ ونصیحت کرتے ہوئے خدا کی رضا اور شریعتِ نبویؐ کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے اور اپنی زندگی میں بیشمار لوگوں کی اصلاح فرمائی۔ ملک و بیرون ملک میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ آپ سے فیضیاب ہوئے اور بہت سے خوش نصیبوں نے آپ سے خلافت واجازت کا شرف حاصل کیا جو آج خود بھی عوام وخواص کی اصلاح میں مصروف ہیں۔'' (۲۵)

مولانا اخلاق احمد عثمانی خلیفۂ مجاز حضرت حکیم الاسلامؒ لکھتے ہیں کہ:

''حکیم الاسلامؒ غزالئ دوراں، جامع شریعت وطریقت، مرشد کامل، خطیب بے مثل، مفکر اسلام حضرت علامہ محمد طیب صاحبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند حضرت حکیم الامت تھانوی کے علمی وروحانی عظیم ترجمان تھے اور حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی وفات کے بعد نصف صدی سے زائد تک حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ صحیح معنوں میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی نیابت وخلافت کے فرائض احسن طور پر انجام دیتے رہے۔ جس سے پورا عالم اسلام بخوبی واقف ہے۔ آپ اپنے چشمۂ ہدایت سے تشنگانِ قلب وروح کو

سیراب فرماتے رہے اور راہِ حق کے طلب گار اپنی امیدوں اور آرزؤوں کی جھولی اس خزانۂ معرفت سے بھرتے رہے۔ ملک اور بیرونِ ملک میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے مریدین اور مسترشدین کی تعداد ہزاروں سے تجاوز ہے۔ جو براہِ راست آپ کے دستِ حق پر بیعت ہو کر آپ کی روحانی تربیت اور ہدایت و اصلاح سے اپنی زندگی کو منور کیے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک بہت بڑا طبقہ ایسا بھی تھا جو راہِ حق کے طلب گار ہوتے اور بذریعہ خط و کتابت آپؒ کی روحانی و عرفانی ہدایتوں سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ اس طرح سے برّ اعظم ہندو پاکستان کے گوشہ گوشہ میں آپ کے بے شمار مریدین و منتسبین اور خلفاء مجازین موجود ہیں اور حضرتؒ کا یہ سلسلۂ روحانی جاری و ساری ہے۔

بیعت وسلوک

مالٹا سے جب حضرت شیخ الہندؒ دیوبند پہنچے تو ایک دن بعد نماز عصر حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیبؒ نے بیعت کرنے کی درخواست کی اس پر حضرت اقدسؒ نے فرمایا:

’’اس وقت اپنی جماعت میں دو ہی صاحبزادے ہیں، جن کا پوری جماعت احترام کرتی ہے۔ ایک مولانا محمد احمد صاحبؒ (ابن حضرت نانوتوی قدس سرہٗ) اور ایک مولانا حافظ مسعود احمد صاحبؒ (ابن حضرت گنگوہیؒ) لوگوں کا مجھ پر الزام یہ ہے کہ اس نے دونوں صاحبزادوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اگر میں نے تم دونوں بھائیوں کو بیعت کر لیا، تو لوگ کہیں گے کہ اب تو یہ قبضہ موروثی ہو گیا۔ پھر فرمایا کہ بھائی مالٹا سے میں کوئی بدل کر تھوڑا ہی آیا ہوں میں تو وہی کا وہی ہوں جو مالٹا جانے سے پہلے تھا۔ آپ نے عرض کیا حضرت ہم وہ نہیں ہیں۔ جو پہلے تھے۔ پہلے ہمیں حضرت کے بارے میں کچھ شعور نہ تھا، اب ہو گیا ہے۔ بہرحال یہ باتیں آپ نے مزاحی رنگ میں فرمائیں اور اس کے بعد سکوت فرمایا۔ نماز مغرب کا وقت آ گیا اور سب اٹھ کھڑے ہوئے یہ دونوں بھائی بھی چلے آئے۔

مگر پھر اسی دن بعد نماز مغرب ایک طالب علم کو بھیجا مولوی طیب کو دارالعلوم میں بلا کر لاؤ۔ چناں چہ حضرتؒ کی طلب پر حاضر ہو گیا آپ کو دیکھ کر فرمایا۔ مولوی طاہر کہاں ہے؟ ان کو بھی بلا لو، چناں چہ ان کے پاس آدمی گیا اور وہ بھی آ گئے۔ جب دونوں صاحبزادگانِ محترم حاضر ہو گئے تو حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے عرض کیا حضرت! کیسے یاد فرمایا؟ بھائی مرید کرنے کو، تم دونوں وضو کر لو، چونکہ یہ دونوں بھائی باوضو تھے۔ لہٰذا عرض کیا حضرت ہم دونوں باوضو ہیں۔

اب حضرت نے دونوں صاحبزادوں کو اپنے پاس بٹھایا اور باضابطہ دونوں کو بیعت فرمایا اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک مختلف نصیحتیں فرماتے رہے، ان نصیحتوں کا خلاصہ یہ تھا :

حضرت مرشد کے نصائح

بیعت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس سے کوئی دنیاوی عزت یا دولت مل جائے گی، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ نفس اور باطن کی اصلاح ہو جائے اور وہ پاکیزہ و مہذب ہو جائے، کیوں کہ انسان کے نفس کے ساتھ ہزاروں روگ لگے ہوئے ہیں، جیسے تکبر، حرص، حسد، کینہ، بغض، عداوت اور عناد وغیرہ دنیاوی فسادات بھی انہی سے پیدا ہوتے ہیں اور انسان کی آخرت بھی انہیں سے برباد ہوتی ہیں۔ بیعت کا منشا یہ ہے کہ اخلاق ذمیمہ مغلوب ہو جائیں اور اخلاق فاضلہ غالب آ جائیں۔ جیسے انابت الی اللہ صبر و شکر، حیا و سخا، غیرت وحمیت اور توکل وغیرہ اور یہ چیزیں کثرت ذکر سے پیدا ہوتی ہیں۔ جس قدر ذکر کیا جائے گا اخلاق فاضلہ اسی انداز سے قوی ہوں گے اور طاعت کی رغبت پیدا ہوگی اور اسی کے ساتھ معصیت سے نفرت بڑھتی جائے گی۔

اس تقریر کے بعد حضرت اقدسؒ نے صاحبزادوں کو اذکار بھی بتائے اور یہ دونوں بھائی ان اذکار کو پابندی سے بجالاتے رہے، مگر اسکے بعد حضرت شیخ الہندؒ بہت کم دن تقریباً چھ ماہ بقید حیات رہے، کوئی چھ ماہ بعد آپؒ کی وفات ہوگئی، جس سے پورے ہندوستان میں صف ماتم بچھ گئی۔

حضرت کشمیریؒ کی طرف رُجوع

آپ کی وفات کے بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے لیے سوال پیدا ہوا کہ اذکار کی تعلیم کس سے حاصل کریں؟ چناں چہ آپؒ نے اپنا یہ رشتہ اپنے استاذ محدث عصر حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ سے جوڑا، انھوں نے باضابطہ بیعت تو نہیں فرمایا، مگر تعلیم دیتے رہے۔

حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مجاز تھے۔ یہ سلسلہ بہت دنوں تک قائم رہا مگر جب حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ دیوبند چھوڑ کر ڈابھیل تشریف لے گئے۔ تو آپ کی خدمت میں حاضری کی نوبت کہاں آتی یا آتی تو بہت کم۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی خدمت میں

درگہِ اشرف علیؒ کے فیض سے احمدؒ کا لال — قاسمِ ثانی بنا وہ صاحبِ فضل و کمال
بن گیا فخر الاماثل علم و فن کا آفتاب — راہِ عرفان وتصوف کا درخشاں ماہتاب

اسی اثناء میں حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ دونوں بزرگوں کو حیدرآباد کا سفر پیش آیا۔ یہ سردی کا زمانہ تھا۔ ان بزرگوں کے ساتھ سفر میں حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ بھی تھے۔ دیوبند سے چل کر درمیان میں بھوپال ایک رات قیام رہا۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا بیان ہے کہ:

جس کمرہ میں ان حضرات کی چار پائی تھی، اس کی پائنتی میں میرے لیے بھی چار پائی بچھا دی گئی۔ تہجد کا جب وقت آیا۔ تو یہ دونوں بزرگ اور مولانا سعید الدین صاحبؒ ممبر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند ریاست بھوپال اٹھے اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ میں اس وقت جاگ رہا تھا مگر بستر پر پڑا رہا۔ اٹھا نہیں، مولانا سعید الدین صاحب رامپوریؒ جو حضرت گنگوہیؒ کے خاص لوگوں میں تھے۔ مجھے سوتا ہوا دیکھ کر ان حضرات سے فرمایا کہ اس کو کسی بزرگ کی طرف رجوع کرانا ضروری ہے اور اس سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ ہماری جماعت میں اس وقت حکیم الامت حضرت تھانویؒ بڑے لوگوں میں ہیں، ان سے وابستہ کرنا مناسب رہے گا۔

یہ مشورہ ان برزگوں کی سمجھ میں آ گیا، جب یہ حضرات حیدرآباد کے سفر سے دیوبند واپس آئے۔ تو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نے حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی خدمت میں خط لکھا کہ ہم لوگوں کی خواہش یہ ہے کہ مولوی محمد طیبؒ کو بسلسلہ تربیت باطن آپ کے سپرد کریں اور آپ اس کی اصلاح فرمائیں۔

اس کے جواب میں حضرت تھانویؒ نے تحریر فرمایا کہ ''وہ میری اولاد ہے جب چاہے آ جائے۔ لیکن اصول کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں خود لکھے۔ آپ اس سے فرمادیں کہ وہ خود براہ راست میرے نام خط لکھے، چناں چہ ان حضرات کا ایما ہوا تو میں نے حضرت والا کی خدمت میں ایک خط لکھا اور اس میں وابستگی کی درخواست کی، حضرت والا نے جواب میں تحریر فرمایا۔ تو میری اولاد ہے کسی کی سفارش کی ضرورت نہیں ہے۔ جب بھی فرصت ہو فوراً آ جاؤ۔

تھانہ بھون حاضری

اتنے میں رمضان المبارک کا مہینہ آ گیا۔ میں نے دارالعلوم کی مسجد میں تراویح سنانا شروع کر دی۔ ڈیڑھ پارہ سنا کر بیس دنوں میں قرآن پاک ختم کیا اور بیس رمضان کو تھانہ بھون حاضر ہو گیا اور اخیر عشرہ تھانہ بھون میں حضرت کے پاس گذارنے کے ارادے سے حاضر ہو گیا۔ حاضر ہونے کی اطلاع پہلے دے چکا تھا۔ جس دن میں پہنچا وہ جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کا قت ہو چکا تھا۔ مسجد نمازیوں سے بھری پڑی تھی۔ میرے پہنچتے ہی

خانقاہ کے دروازہ پر مولوی شبیر علی صاحبؒ برادرزادہ حضرت تھانویؒ میرے منتظر تھے۔ ان سے مصافحہ ہوا۔ دیوبند سے میرے ہمراہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ بھی تھے۔ ہم لوگوں کے پہنچتے ہی بھائی شبیر علی نے فرمایا کہ حضرت (تھانویؒ) نے سلام فرمایا ہے اور تین باتیں کہی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ خانقاہ کے حجرہ نمبر ۱۶/ میں آپ کا قیام ہوگا۔ وہاں سامان پہنچا دیا گیا ہے، دوسری بات یہ کہ اگر کوئی تکلیف وتکلف نہ ہو تو ان دس دنوں میں ایک کلام پاک تراویح میں تین تین پارے یومیہ ہمیں سنا دو اور تیسری بات یہ ہے کہ آپ تین دن تک میرے مہمان رہیں گے۔ اس کے بعد آپ اپنے کھانے پینے وغیرہ کا بندوبست خود کریں گے۔ اس تیسری بات سے قدرے گرانی کا میرے دل پر اثر ہوا کہ اتنے قریبی روابط (قرابت داری) بزرگوں سے علاقہ اور خود مجھ پر اولاد جیسی شفقت کے ہوتے ہوئے حضرتؒ نے یہ غیریت کی بات کیوں اختیار فرمائی؟

نماز تراویح

مگر چونکہ حاضری اصلاح کے لیے ہوئی تھی۔ اس لیے سب باتیں بخوشی منظور کرلیں اور حکم کے مطابق نامزد کمرہ میں قیام کیا۔ اس وقت تک میری آواز بہت بلند تھی اور خوش آوازوں میں شمار تھا۔ اس کی شہرت بھی تھی۔ روزانہ تراویح میں تین پارے سنانے لگا تمام مساجد سے بکثرت عوام وخواص ذوق وشوق سے خانقاہ کی مسجد میں قرآن سننے کی غرض سے آنے لگے اور مسجد سے باہر حوض اور مدرسہ کا صحن لوگوں سے بھرا ہوتا تھا۔

جب تین دن پورے ہوگئے۔ تو (حضرت تھانویؒ) نے یاد فرمایا اور بلا کر کہا کہ میں نے میزبانی میں تین دن کی شرط لگائی تھی، وہ ایک ضابطہ اور اصول کی بات تھی۔ تو میری اولاد ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تھانہ بھون آ کر تو اپنے کھانے کا بندوبست کرے۔ تیرا کھانا وغیرہ میرے ساتھ ہی ہوگا۔ میں نے دس دن اسی شان سے قیام کیا۔ قرآن شریف پورا ہوگیا اور حضرت نے تعلیم وتربیت شروع فرمادی اور ذکر وشغل کے طریقے بتائے۔ اس کے بعد میرا تعلق حضرت سے مضبوط ہوتا گیا اور آپ کی تعلیم کے مطابق عمل کرتا رہا۔ کئی سال کے بعد میں نے عرض کیا کہ حضرت بیعت بھی فرمالیں۔ فرمایا ضرورت تو ہے نہیں مگر جب دل کی خواہش ہے تو بہتر ہے اور یہ کہہ کر بیعت بھی فرمالیا۔

خرقۂ خلافت

شیخِ وقت وہم مجازِ تھانوی صوفیٔ حق کیش راہِ حق نما

حکیم الامت حضرت مرشد تھانویؒ کی تعلیم رنگ لائی اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد آپ کا شمار حضرت والا

کے ممتاز لوگوں میں ہونے لگا۔ خط وکتابت اور آمد ورفت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ جو کچھ ادھر سے ہدایتیں ہوتی تھیں۔ ان پر آپ پورا عمل فرماتے۔

آپ کا ہی بیان ہے کہ ایک دن حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا ایک گرامی نامہ ملا، اس میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ:

''بے ساختہ میرے دل پر یہ وارد ہوا ہے کہ میں تجھے خلافت دوں اس لیے میں تم کو خلافت دیتا ہوں۔ جو کوئی بہ نیت اصلاح وتربیت آئے اسے توبہ کرادیا کرو اور مشائخ کے معمولات تلقین کردیا کرو۔ اصلاحی باتیں پوچھے بتادیا کرو اور جو کوئی بیعت ہونا چاہے اسے بیعت کرلیا کرو۔ یہ تمہارے لیے بھی نافع ہوگا اور مستفدین کے لیے بھی''۔

بیعت وارشاد

اس اجازت نامہ کے بعد جو کوئی آپ سے بیعت ہونے کی درخواست کرتا آپ قبول فرمالیتے اور اپنے سلسلہ میں بخوشی داخل فرمالیتے۔ آج بھی ملک کا کوئی گوشہ اور حصہ ایسا نہیں ہے جہاں آپ کے متوسلین کی بڑی تعداد نہ ہو۔ بیعت ہونے والوں کی زیادہ تعداد جنوبی ہند میں ہے۔ بمبئی، مدراس، حیدرآباد، بنگلور، میسور اور گجرات کے متعدد شہروں اور قصبات میں آپ سے وابستہ ہونے والے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں حتیٰ کہ یہ سلسلہ غیر ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ سعودی عرب، افریقہ، پاکستان، بنگلہ دیش، انگلستان، ساؤتھ افریقہ، سری لنکا، برما اور ایران میں بھی بکثرت لوگ داخل سلسلہ ہوئے اور بہت سے لوگوں کو آپ سے اجازت بیعت بھی حاصل ہوئی۔

بہت سے وہ افراد واشخاص جن کو علماء دیوبند سے دور رکھنے کی ان کے حلقہ کے علماء نے برسہا برس سے سعی کر رکھی تھی۔ آپ کے مواعظ حسنہ سننے کے بعد ایسے تمام افراد خاندان بھی جو دور رہنے کی وجہ سے غلط فہمیوں میں مبتلا رکھے گئے تھے۔ یا مبتلا تھے۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے دست حق پر بیعت ہوگئے اور اس طرح ان کے عقائد اور اخلاق واعمال کی آپ کے ذریعہ اصلاح ہوئی۔

حکیم الاسلامؒ کی شادی خانہ آبادی

زندگی کے مراحل میں ایک اہم مرحلہ شادی خانہ آبادی بھی ہے۔ آپ کے پدر بزرگوار نے آپ کے درسیات سے فراغت کے بعد آپ کی شادی کی فکر کی، اساتذہ دارالعلوم دیوبند اور دوسرے رشتہ داروں کے مشورہ سے آپ کا رشتہ رامپور منیہاران ضلع سہارنپور میں طے پایا۔

مولانا حکیم ضیاء الدین صاحبؒ

اس قصبہ رامپور میں مولانا حکیم ضیاء الدین صاحبؒ کا خاندان ممتاز شمار ہوتا رہا ہے۔ اس خاندان کے اہل علم اور اہل دل کافی شہرت رکھتے تھے۔ خود مولانا حکیم ضیاء الدین صاحبؒ، حضرت محمد ضامن شہیدؒ کے ہاتھ پر بیعت تھے اور آپ کے ارشد خلفاء میں شمار ہوتے تھے۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت شیخ سالار بندگی تھے جن کا رام پور میں مزار موجود ہے۔ بسلسلہ نسب حضرت ابوایوب انصاریؓ صحابی رسول ﷺ تک پہنچتا ہے۔ جو مدینہ منورہ کے قبیلہ خزرج سے تھے اور جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً قیام فرمایا تھا۔

مولانا حکیم ضیاء الدین صاحبؒ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی ان کے حقیقی بھائی جناب حاجی علاؤالدین صاحب تھے اس خاندان کی نسل انہی سے چلی، ان کے تین صاحبزادے تھے۔ مولانا حافظ حکیم احمد صاحبؒ رئیس رامپور، مولوی محمد صاحب مرحوم اور مولانا حافظ محمود صاحبؒ فاضل دیوبند و وزیر ریاست اندر گڑھ (راجپوتانہ) مولانا محمود صاحب نے یہیں دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی تھی اور آپ کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود صاحبؒ اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ سے خصوصی شرف تلمذ حاصل تھا اور ربط وعلاقہ قوی تھا۔

مولانا محمود صاحبؒ

مولانا محمود صاحبؒ کی شادی مشہور بزرگ حضرت شاہ ابوالمعالی قدس سرہٗ انبیہٹہ ضلع سہارنپور کے خاندان میں حضرت شاہ صادق احمد صاحب انبیٹھویؒ کی دختر نیک اختر سے ہوئی تھی۔ حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کا خاندان انبیہٹہ میں اہل علم وفضل اور اہل دل کا ممتاز خانوادہ رہا ہے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ محدث سہارنپوری خلیفہ حضرت گنگوہیؒ اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

انہی مولانا حافظ محمود صاحب رامپوریؒ کی صاحبزادی حنیفہ خاتون سے حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا رشتہ طے پایا جوان کی اکبر اولاد تھی۔ یہ رشتہ اس وقت کے صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ لے کر رامپور پہنچے، چونکہ حضرت شیخ الہندؒ کا تعلق بھی وہاں سے گہرا تھا اور مولانا محمود کے بھائی حکیم احمد صاحب سے فرمایا کہ بھائی، میں اس وقت نائی کی حیثیت سے طیب کا رشتہ آپ کی بھتیجی سے لے کر آرہا ہوں یہ رشتہ ان حضرات نے بڑی خوش دلی کے ساتھ منظور کرلیا، بلکہ دلی مسرت کا اظہار بھی کیا۔ بات طے پانے کے بعد یہ رشتہ تین چار سال لگا رہا۔

نکاح

۱۳۳۴ھ میں جب حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی عمر بیس سال ہوچکی تھی نکاح کی تاریخ طے پائی اور متعینہ تاریخ میں سو، سوا سو، علماء کرام اور صلحاء عظام بصورت بارات آپ کو لے کر رام پور پہنچے۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے آپ کا نکاح پڑھا اور سبھی نے دعائیں کیں۔ بارات کے سلسلہ میں خود حکیم الاسلامؒ لکھتے ہیں:

''بارات کی واپسی ایک شب قیام بعد اگلے دن عصر کے بعد ہوئی اور رات کو تقریباً گیارہ بجے دیوبند پہنچنا ہوا، سردی کا زمانہ تھا، عشاء کے بعد دیوبند میں اس غیر معمولی تاخیر سے تشویش محسوس کی گئی بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ مولانا محمود صاحبؒ نے کافی اور بہت قیمتی جہیز دیا تھا۔ جس کی شہرت تھی، حتیٰ کہ علاوہ ہمہ قسم سامانوں کے دلہن کے لیے نفیس پالکی اور دولہا کے لیے گھوڑا بھی جہیز میں دیا۔ جو سر سے پیر تک چاندی سے آراستہ تھا اور ذین مخملی تھا۔ جس پر زری کا کارچوب کا کام تھا۔ یہی نوعیت دوسرے قیمتی سامانوں کی بھی تھی۔ رات کا وقت کچی پکی سڑک اور درمیان میں دیہات کا سلسلہ اس لیے دیوبند میں تاخیر سے تشویش محسوس کی گئی، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ شادی کے سلسلہ میں مقامی نظم کے ذمہ دار تھے۔ انھوں نے اس تشویش کا طلبہ سے اظہار کیا، جس پر ڈھائی تین سو طلبہ دیوبند سے رامپور کی سڑک پر روانہ ہوگئے۔ دیوبند سے چھ میل آگے پہنچ کر طلبہ کا مجمع بارات سے جا ملا اور بارات کے ساتھ لوٹا۔ طلبہ نے اپنی محبت و تعلق سے پالکی والے کہاروں کو ہٹا کر خود پالکی اپنے کندھوں پر اٹھائی اور نوبت بنوبت پالکی لے کر چلے، وہ سماں عجیب تھا کہ مختلف وطنوں کے طلبہ بنگالی، پنجابی، آسامی، سرحدی اور گجراتی وغیرہ اپنی اپنی زبانوں میں گیت گاتے جاتے تھے اور پالکی اٹھائے جا رہے تھے۔ یہ مرحومہ کی خوش قسمتی تھی کہ رشتہ سرتاج علماء شیخ الہندؒ لے کر گئے، نکاح سرخیل علماء حضرت تھانویؒ نے پڑھایا۔ بارات میں وقت کے تمام علماء صلحاء اور اکابر وقت شریک ہوئے اور پالکی اٹھانے والے طلبہ علم دین تھے جو اپنے سروں پر مرحومہ کو لائے اور آخر جنازہ بھی جب اٹھا تو وہ بھی انہی طلبہ اور علماء کے کندھوں پر اٹھا''۔ (۲۶)

اہلیہ کے اوصاف

اس وقت یہ شادی بڑے اہتمام سے ہوئی اور ان علماء ربانیین کی دعاؤں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جوڑے کو بڑی عزت اور عظمت عطاء ہوئی اور خواص وعوام میں قبول عام حاصل ہوا، حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت جلیلہ

کی تفصیل آپ اس کتاب میں اپنی جگہ پڑھیں گے۔آپ کی اہلیہ بھی ماشاء اللہ دین میں ممتاز حیثیت کی مالک تھیں، اس سلسلہ میں تفصیل حضرت حکیم الاسلامؒ کے ہی قلم سے ملاحظہ فرمائیں۔اپنی اہلیہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''خود اپنی ذات سے بھی نہایت صالحہ، پابند اوقات اور اپنے معمولات پر مستقیم تھیں۔ میں ان کے معمولات غبط کی نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا اور بسا اوقات ذہن میں یہ تصور بندھ جاتا ہے کہ شاید یہی خاتون میرے لیے بھی نجات کا ذریعہ بن جائے، مرحومہ کو فرائض کی ادائیگی کا حد درجہ اہتمام تھا۔ گھر کے کیسے ہی اہم کام میں مصروف ہوں۔ اذان کی آواز سنتے ہی ہر کام سے بیگانہ وار اٹھکر اول اوقات میں نماز ادا کیے بغیر مطمئن نہ ہوتی تھیں۔ ایک ہزار دانے کی تسبیح ہمیشہ ان کے سرہانے رہا کرتی تھی، نماز عشاء کے بعد ایک ہزار بار کلمہ طیبہ اور وقت خواب ادعیہ ماثورہ پڑھنے کا معمول تھا۔ جو سفر و حضر میں جاری رہتا تھا۔ نماز صبح کے بعد تلاوت قرآن کریم اور حضر میں بغیر کسی شدید اور غیر اختیاری مجبوری کے ناغہ نہیں ہوتا تھا۔

حج کا بھی ایک شغف دل میں تھا۔ میری معیت میں سات بار حج و زیارت روضۂ اقدس سے مشرف ہوئیں۔ حضرت مولانا محمد سلیم صاحب کیرانوی ثم المکیؒ مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ سے عزیز داری تھی، مکہ میں قیام انہیں کے دولت خانہ پر ہوتا تھا۔ مولانا کے گھرانے کے ہر بچے اور بڑے کو ان سے ایک خاص انس اور علاقہ تھا۔ ہر سال حج کے موقع پر ادھر سے برابر یاد ہوتی اور یاد دہانی کہ ہم سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اسی علاقہ خاص سے حضرت مولانا سلیم صاحب کا مقولہ تھا کہ:

''جو شخص یہ ثابت کر دے کہ مکہ مکرمہ میں (مولانا) محمد طیب صاحبؒ کا گھر نہیں ہے تو میں اسے ایک ہزار روپیہ انعام دینے کے لیے تیار ہوں، بہر حال مولانا کا سارا گھرانہ ان سے حد درجہ مانوس تھا اور وہ ان سے مانوس تھیں بالخصوص عزیز محترم مولوی محمد شمیم سلمہٗ ابن حضرت مولانا محمد سلیم صاحب تو خاص طور پر ان کی خاطر داری اور مدارات میں لگے رہتے تھے اور ان سے مرحومہ کو خاص انس تھا اور کہا کرتی تھیں کہ مجھے شمیم پر ایسا ہی پیار آتا ہے جیسے سالم پر''۔ (۲۷)

زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام

ان خوبیوں کیساتھ مرحومہ میں داد و دہش کی خوبی بھی بدرجہ اتم تھی، خود حضرت حکیم الاسلامؒ لکھتے ہیں۔

''حج و نماز اور اوقات کی پابندی کے ساتھ ان میں ادائے زکوٰۃ کا شغف یہ تھا کہ پائی پائی کا حساب کر کے عموماً ماہ رمضان میں زکوٰۃ ادا کیا کرتی تھیں۔ شہر کے عزیزوں میں سے غرباء اور بالخصوص غریب بیواؤں کی فہرست ان کے سامنے رہتی تھی۔ (۲۸)

تراویح کا اہتمام

آپ کی اہلیہ کو رمضان شریف میں تراویح کا خاص اہتمام تھا اور یہی وجہ تھی کہ حضرت حکیم الاسلامؒ آخر کے چند سال سے تراویح اپنی بیٹھک میں پڑھا کرتے تھے دالان میں پردہ ہوتا تھا۔ پس پردہ اہلیہ محترمہ اور گھر اور محلّہ کی دوسری عورتیں ہوتی تھیں اور پردہ کے باہر جانب قبلہ بیٹھک میں مردوں کی جماعت ہوتی تھی۔

جب کبھی رمضان میں حضرت والا کا قیام گھر پر نہیں ہوتا تو یہ فرض آپ کے لائق فرزند حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی انجام دیتے تھے۔

اس طرح اہلیہ محترمہ اذکار واوراد، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ سب کی نہایت پابند تھیں اور اسی رنگ میں اپنے پورے خاندان اور گھرانے کو رنگنے کی سعی کرتی رہتی تھیں۔

ذمہ داریوں کا احساس

حضرت والا کو اہلیہ کی وجہ سے بڑا ذہنی سکون حاصل تھا، بچوں کی پرورش، تعلیم و تربیت اور دیکھ بھال سب اہلیہ نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ حضرت کو اس طرف سے بالکل آزاد کر رکھا تھا۔ چوں کہ ذہین و ذکی تھیں۔ اس لیے آپ کی راحت رسانی کا پورا خیال اور لحاظ و پاس تھا۔ گجراتی اور ہندی زبان بھی لکھنا اور بولنا جانتی تھیں، دارالعلوم میں گجراتی اور ہندی خطوط آتے تھے تو ان کا ترجمہ آپ اکثر ان ہی سے کراتے تھے۔

جذبہ راحت رسانی

آپ کے ساتھ انھوں نے ہند و بیرون ہند کے بہت سے مقامات کا سفر بھی کیا تھا اور جہاں جاتیں عورتوں میں رہ کر ان کو دین کی باتیں بتاتی تھیں اور ان کی اصلاح کرتی تھیں۔ حضرت اقدسؒ نے لکھا ہے کہ:

’’ان کے ساتھ میری رفاقت ساٹھ سال رہی ہے، اس پوری مدت میں اہلیہ ہونے کے رشتہ سے ان سے اتنا متاثر نہیں تھا۔ جتنا کہ ان کی ذاتی صلاحیت و استقامت اور جذبۂ راحت رسانی واطاعت وغیرہ سے متاثر رہا۔ خدمت واطاعت میں مزاج شناسی اور نفسیات کی رعایت کا انہیں خاص ملکہ تھا۔ بات سن کر فوراً اس کی تہہ میں پہنچ جانا اور اصولی جواب ان کا خاص رنگ تھا۔ یہی ذہانت تھی کہ عمر کا ایک بڑا حصہ راجپوتانہ میں گذارنے کے سبب گجراتی زبان اور ہندی لکھنے پڑھنے کا خاص ملکہ پیدا کرلیا تھا۔ اکثر دارالعلوم کے ہندی اور گجراتی زبانوں کے خطوط انہیں سے پڑھواتا اور ترجمہ کراتا تھا۔ گجرات کے سفروں بڑودہ، سورت، راندیر اور بمبئی وغیرہ میں وہ گجراتی عورتوں کی باتیں بے تکلف سمجھ کر ان سے گجراتی میں بات چیت

کرلیتی تھیں۔اسی ذہانت کا اثر تھا کہ حجاز کے متعدد سفروں میں معمولی عربی سمجھنے اورٹوٹی پھوٹی بول لینے میں انہیں تکلف نہیں ہوتا تھا۔حجاز میں اکثر عرب اور مصری عورتوں سےٹوٹی پھوٹی عربی میں گھنٹوں بات چیت کرتی رہتی تھیں۔'' (۲۹)

حضرت کی اہلیہ شعر بھی کہہ لیا کرتی تھیں اوران کے اشعار رواں ہوتے تھے،ان کے کچھ اشعار بھی چھپ گئے ہیں، غیر ممالک کے سفر میں بھی حضرت کے ساتھ جانا ہوااوراچھے اثرات چھوڑ کر آئیں اس رفیقۂ حیات نے یوم عاشورہ ۱۰رمحرم ۱۳۹۴ھ کوداغِ مفارقت دی۔

رفیقۂ حیات سے آپ کوئی اولاد ہوئیں، پھر بحمد اللہ ان اولاد کی اولاد کا سلسلہ بھی ہے۔حضرت حکیم الاسلامؒ لکھتے ہیں اولاد کی طرف سے بھی حق تعالیٰ نے انہیں خوش نصیب بنایا تھا۔انھوں نے اپنی تین پشتیں اپنی زندگی میں پروان چڑھتے دیکھیں، بیٹے، بیٹیاں، پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں اوران کی اولادیں ملاکر مجموعی تعداد ۵۱رتک پہنچ گئی ہے اور بعد میں بھی اضافہ ہوا۔انھوں نے خوشیوں اور مسرتوں کی فضائیں دیکھیں خود اپنی ساری اولاد کی شادی بیاہ اور کافی حد تک اولاد کی اولاد کی تقریبات وغیرہ سے اپنی زندگی میں ہی فراغت پالی تھی اور یہ کم خوش نصیبی نہیں کہ ان کے انتقال تک ان کی اولاد اور اولاد در اولاد کا عدد ماشاءاللہ ۵۱رتک پہنچا ہوا تھا۔(۳۰)

............❖............

مسندِ اہتمام اور دارالعلوم دیوبند کی ترقیات

اس کے شایاں تھا یقیناً دیو بند کا اہتمام — اس کی ابرو کا اشارہ بس تھا بہرِ انتظام
فیضِ طیبؒ سے ہوا سیراب جب وہ گلستاں — ہوگئی ہر شاخ اس کی پر بہار وگلفشاں
دیوبند کا مدرسہ تھا بن گیا دارالعلوم — تشنگانِ علم وفن کا ہو گیا اس پر ہجوم
باغباں نے ہر روش اس کی سجائی خوب تر — بھر دیے دامن میں اس کے بے بہا لعل وگہر
اس کا اٹھاون برس چمکا ہے دور اہتمام — لائقِ صد آفریں تھا اس کا حسنِ انتظام

اواخر ۱۳۳۹ھ میں دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے رکن مولانا سعید الدین صاحب رامپوری نے مجلس میں یہ تحریک پیش کی تھی کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم اپنی کبرسنی کے سبب سے ضعیف ہوگئے ہیں۔ ہر چندان حضرات نے اب تک خدمات دارالعلوم میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ تاہم مجلس شوریٰ کا یہ فرض ہے کہ وہ اس امر کا احساس کرتے ہوئے ایسے وسائل اختیار کرے جس سے ان حضرات کو فی الجملہ اپنے کاموں میں امداد مل سکے۔ تجویز کا متن یہ تھا:

''حضرت مہتمم صاحب (مولانا محمد احمد صاحبؒ) اور نائب مہتمم صاحب (مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ) کی جو کچھ خدمات ہیں وہ اظہر من الشّمس ہیں۔ اب یہ دونوں حضرات بوجہ تقاضائے عمر و نیز بسبب امراض گوناگوں ضعیف ہوگئے ہیں۔ اگرچہ خدمات دارالعلوم میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیتے، لیکن مجلس شوریٰ کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا احساس کر کے ایسے وسائل پیدا کرے جس میں ہر دو حضرات کو خاص طور سے اپنے کاموں میں امداد ملے۔ لہٰذا ایک عہدہ نائب دوم کا تجویز کرنا ضروری ہے اور اس خدمت پر ایسا شخص تجویز کرنا ضروری ہوگا۔ جو صاحب علم عالی خاندان اور با اثر ہو۔ دارالعلوم کے ساتھ سچی اور دلی ہمدردی مثل ان ہر دو حضرات کے رکھتا ہو۔ پس میں اپنی رائے میں اس عہدہ کے لیے مولانا محمد طیب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کو تجویز کرتا ہوں۔

مولانا موصوف نوجوان صالح، صاحب علم اور عالی خاندان اور دارالعلوم کے ساتھ بحیثیت آبائی نسلاً بعد نسل سچی و دلی ہمدردی رکھنے والے ہیں۔ حضرت مہتمم صاحب حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے فرزند اکبر ہیں اور مولانا محمد طیب صاحب سلمہٗ ان کے پوتے ہیں۔

حضرت مہتمم صاحبؒ کے زمانے میں دارالعلوم کو جس قدر ترقیات آمدنی میں ہوئیں اور جس قدر تعلیمی معیار بلند ہوا جس قدر طلباء کی تعداد بڑھی اور جس قدر ہندوستان سے باہر دور دراز اقالیم وممالک میں اس دارالعلوم کی قدر ومنزلت قلوب میں عامۃً روزافزوں پیدا ہوئی اس کے ثبوت میں خود دارالعلوم ایک مجسم شہادت موجود ہے لہٰذا تمام مسلمانان بہی خواہان دارالعلوم پر عموماً اور مجلس شوریٰ پر خصوصاً روحانی طور سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس خاندان کے کسی فرد کے ہاتھ میں بشرط قابلیت وصلاحیت نظام دارالعلوم تجویز کر دیا جائے تاکہ وہ روحانی فیض جو ترقیات دارالعلوم میں باطنی طور پر ممد ومعاون ہے برابر جاری رہے۔

مجلس کی اس تجویز کی رو سے ۱۳۴۱ھ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو نائب مہتمم بنایا گیا مگر یہ عہدہ آپ کے طبعی رجحان کے خلاف تھا، آپ انتظامی اُمور سے علیحدہ رہ کر یکسوئی کے ساتھ علمی اور تدریسی مشاغل کو پسند فرماتے تھے، چناں چہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اپنی خواہش واصرار سے اپنے آپ کو شعبۂ تعلیم میں منتقل کرا لیا مگر بالآخر اکابر کے اصرار نے مجبور کیا اور پھر آپ کو نیابت اہتمام کا عہدہ سنبھالنا پڑا جس پر اوائل رجب ۱۳۴۸ھ تک فائز رہے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کی وفات کے بعد مجلس شوریٰ نے پہلے تجربے کے طور پر قائم مقام مہتمم بنایا اور جب اس امر کا یقین ہو گیا کہ اس اہم منصب کے سنبھالنے کی آپ میں بدرجہ اتم صلاحیت موجود ہے تو مندرجہ فیصلے کے ساتھ آپ کو مستقل طور پر مہتمم مقرر کر دیا گیا۔ مجلس کی تجویز یہ ہے:

”ہم سب ممبران مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے ۱۸ر شوال ۱۳۴۸ھ سے ۲۱ر شوال ۱۳۴۸ھ تک دارالعلوم میں رہ کر دارالعلوم کے تمام شعبوں کا غور سے معائنہ کیا۔ جو اُمور بحث طلب مہتمم صاحب نے مجلس شوریٰ میں پیش کیے۔ ان کا بلا رورعایت تصفیہ کیا۔ ہم ممبران اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ جب سے حکیم الاسلامؒ مولانا محمد طیب صاحب نے زمام اہتمام اپنے ہاتھ میں لی ہے۔ ان کے ہر طریق عمل سے صدق واخلاص نیت حب وبغض فی اللہ اور ادائے حقوق اور فرضِ شناسی میں عزم قوی اور ثبات واستقلال بوجہ احسن ثابت ہوتا ہے۔ **وللّٰه حمداً کثیرا طیباً مبارکاً فیه.**

ہم سب حق تعالیٰ کے فضل وکرم سے قوی امید رکھتے ہیں کہ اس تھوڑی سی مدت میں جن خوبیوں کا مہتمم

صاحب سے ظہور ہوا ہے انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ اس سے اضعافاً مضاعفۃً ظاہر ہوگا و ما ذٰلک علی اللہ بعزیز.

یہ الفاظ بے اختیار قلب سے نکلے ہیں۔ اس میں نہ تصنّع کو دخل ہے اور نہ مہتمم صاحب کی خدمات کی داد ہے۔"

۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں آپ مستقل مہتمم بنائے گئے اور دارالعلوم نے آپ کے زمانۂ اہتمام میں نمایاں ترقی کی۔ ۱۳۴۸ھ میں جب آپ نے انتظام دارالعلوم کی باگ ڈور ہاتھ میں لی تو اس کے انتظامی شعبے آٹھ تھے۔ جن کی تعداد اب تیس تک پہنچ چکی تھی۔ اس وقت دارالعلوم کی آمدنی کا بجٹ پچاس ہزار دوسو باسٹھ روپے سالانہ تھا اور آپ کے زمانے میں ساٹھ لاکھ تک پہنچ گیا تھا۔

اس وقت دارالعلوم کے عملے میں صرف ۴۵/افراد تھے اور آپ کے زمانے میں عملے کی تعداد ۲۵۰ تھی اور آپ کے آخری دور تک طلباء کی تعداد دو ہزار سے زائد تھی۔ اسی طرح عمارتوں میں نمایاں اضافہ ہوا۔ دارالتفسیر، دارالافتاء، دارالقرآن، مطبخ جدید، فوقانی دارالحدیث، بالائی مسجد، باب الظاہر، جامعہ طبیہ، دارالاقامہ جدید دومنزلہ، مہمان خانہ اور کتب خانہ کے دو جدید ہال وغیرہ جیسی عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر و تکمیل حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ہی کے دورِ اہتمام کی یادگار ہیں۔

دارالعلوم کی نمایاں ترقیات

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب (اکوڑخٹک) تحریر فرماتے ہیں:

"دارالعلوم دیوبند کو جو خدا تعالیٰ نے علمی لحاظ سے، طلباء کے لحاظ سے اساتذہ اور علماء کے لحاظ سے، اقتصادیات اور تعمیرات کے لحاظ سے اور دوسرے ہر لحاظ سے جو خوبیاں عطا فرمائی ہیں اور ترقیات سے نوازا ہے۔ یہ سب کچھ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے دورِ اہتمام میں اور ان کے زیرِ نگرانی انجام کو پہنچا ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے نیابت اہتمام کے دور میں حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس رہ چکے ہیں۔ پھر ان کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت حکیم الاسلامؒ ہی کے زمانہ اہتمام میں صدارتِ تدریس کے عہدے پر فائز رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے اس زمانہ میں جو عروج اور ترقی حاصل کی، یہ تاج اور اس کا سہرا حضرت مہتمم صاحب مرحوم کی مساعی جمیلہ کے سر ہے اور یہ ان ہی کی مخلصانہ شبانہ روز مساعی کا ثمرہ ہے۔ آج شہر شہر، بستی بستی اور قریہ قریہ جو آپ کو یہ دینی علوم کے مدارس و مراکز نظر آتے ہیں اور ہر گاؤں اور ہر بستی میں جو آپ کو دارالعلوم دیوبند کے فاضل، اکابر اساتذہ کے تلمیذ یا تلمیذ التلمیذ آپ کو جو نظر آتے ہیں۔ یہ سب حضرت

مولانا محمد طیب صاحبؒ کی اور ان کے خاندان کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے اور یہ سب دارالعلوم دیوبند ہی کی برکات ہیں۔ ایشیا بھر میں پھیلے ہوئے مدارس ان کے اساتذہ اور منتظمین کا تعلق بغیر واسطہ کے یا بالواسطہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہے، اللہ تعالیٰ حکیم الاسلام حضرت مہتمم صاحبؒ کے اہلِ خاندان اخلاف رشید میں بھی ان ہی جیسے اوصاف وکمالات پیدا فرمادے اور اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے اس خلاء کو پورا فرمادے۔ آمین۔ (۳۱)

مولانا قاری فیوض الرحمٰن صاحب ایم۔اے۔ فرماتے ہیں:

''حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ نے دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کی حیثیت سے عالمِ اسلام خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں میں علم دین کی جو شمع روشن رکھی اور ہندوستانی مسلمانوں کے بزرگ قائد کی حیثیت سے جو خدمات انجام دیں تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ تقریباً ساٹھ سال دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اعلیٰ رہے اور ان کے دور میں دارالعلوم نے ہر شعبہ میں ترقی کی جس کا سہرا بلاشبہ انہی کے سر ہے اسے دلچسپ اتفاق ہی کہہ لیں کہ آپ کے جدامجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند نے ۳۳ سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ ۳۳ سال کی عمر ہی میں حضرت مہتمم صاحبؒ کے والد گرامی مولانا محمد احمد صاحبؒ دارالعلوم کے مہتمم مقرر ہوئے اور حضرت مہتمم صاحب کی عمر بھی ۳۳ سال ہی کی تھی جب دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کی حیثیت سے فرائض سنبھالے تھے۔ آپ ۱۳۴۱ھ سے ۱۳۴۸ھ تک اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد احمد صاحب قاسمیؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کے زمانۂ اہتمام میں نائب مہتمم رہے اور ۱۳۴۸ھ سے آخر دم تک دارالعلوم کے مہتمم اعلیٰ رہے۔

آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم نے غیر معمولی ترقی کی۔ تعلیمی اور تعمیری سلسلہ کافی بڑھا۔ کاموں اور شعبوں میں اضافہ ہوا۔ اساتذہ وطلباء اور عملہ کی تعداد بھی کافی بڑھ گئی، آمدنی کی رفتار غیر معمولی طور پر ترقی پذیر ہوئی۔

حضرت مولانا حامد الانصاری غازیؒ رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کے دور اہتمام میں دارالعلوم باعتبار شہرت وعظمت دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچا ہے اور بچہ بچہ آپ کے خلق، مروّت، علم وعمل، فرض شناسی امانت و دیانت سے واقف ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس پایہ کا مہتمم دارالعلوم دیوبند کو آئندہ شاید نہ مل سکے گا۔ سارے مدرسین وملازمین اور کارکنانِ دفاتر آپ کے اخلاق اور حوصلہ پر مکمل یقین رکھتے تھے۔

آپ کی شخصیت علمی گہرائیوں، تحقیق وتصنیف کی خدمات وعظ وتذکیر تقویٰ وطہارت اور

تنظیمی صلاحیت کی ایک بہترین مثال تھی۔ آپ کے ساٹھ سالہ دورِ اہتمام میں دارالعلوم نے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کی ہیں۔''

دورِ اہتمام کی ترقیات

حضرت حکیم الاسلامؒ دارالعلوم دیوبند کی مسندِ اہتمام پر باقاعدہ اور مستقل طور پر ۱۳۴۸ھ میں فائز ہوئے اور یہیں سے آپ کا مستقل دورِ اہتمام شروع ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے دورِ اہتمام میں دارالعلوم کے لیے جو خدمات انجام دیں ان کا مختصر طور پر سن وار جائزہ لیا جاتا ہے۔

مسجد دارالعلوم کی بالائی منزل کی تعمیر

۱۳۴۹ھ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ نے سب سے پہلے جو اقدامی تجویز اپنے قلم سے لکھی وہ مسجد کی بالائی منزل کی تعمیر سے متعلق تھی۔ نیز صحن مسجد کو بھی مشرق کی جانب بڑھایا گیا اور اس تعمیر کے تمام مصارف سید زین العابدین حیدرآبادی نے ادا فرمائے۔ دارالحدیث کی پرشکوہ عمارت جو عرصے سے زیرِ تعمیر تھی۔ بحمد اللہ تعالیٰ آپ ہی کے دورِ اہتمام میں تکمیل کو پہنچی۔ اسی طرح اس سال مسجد میں اضافہ اور دارالحدیث کی تکمیل ہوئی۔

دورۂ تفسیر کا اجراء

۱۳۵۰ھ و ۱۳۵۱ھ میں حضرت حکیم الاسلامؒ ہی کی تجویز سے دورۂ تفسیر کا اجراء کیا گیا۔ دورۂ تفسیر کے اجراء کے ساتھ مزید دو کتابیں داخل نصاب کی گئیں۔ ایک تفسیر بیضاوی مکمل، دوسری تفسیر ابن کثیر، یہ دونوں کتابیں فہم قرآن کے لیے علم تفسیر میں نہایت اہم سمجھی جاتی ہیں۔ دورۂ تفسیر کے اجراء سے دارالعلوم میں علم حدیث کی طرح علم تفسیر کا معیار بھی بہت بلند ہوگیا۔ اس کے ساتھ ساتھ تجوید کو بھی لازمی قرار دیا گیا۔ اس سے پہلے یہ مضمون غیر اختیاری تھا۔

دارالحدیث کی تعمیر

۱۳۵۲ھ میں درسِ حدیث کے لیے نو درے پر ایک عظیم الشان ہال دارالحدیث فوقانی کی تعمیر کا آغاز کیا گیا جو چند سالوں میں بحمد اللہ مکمل ہوگیا۔ اسی سال قواعد داخلہ میں اصلاح کی گئی اور طلباء کے لیے کھانے کے ٹکٹ جاری کرنے کا سلسلہ قائم کیا گیا۔ جس سے طلباء کے لیے راحت و سہولت پیدا ہوگئی۔

پنشن کا اجراء

۱۳۵۳ھ ماہِ شوال میں حضرت حکیم الاسلامؒ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ مکہ مکرمہ میں حضرت شاہ نیاز احمد صاحب خلیفہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ نے چھ ہزار روپے دارالعلوم کے لیے عطا فرمائے۔ اس گراں قدر رقم کو دارالعلوم کے لیے ایک صاحب نسبت بزرگ کا متبرک عطیہ ہونے کے علاوہ سرزمین بیت اللہ کی موہبت عظیم سے اگر تعبیر کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ ارضِ بیت اللہ سے کسی بعید ترین ادارے کی امداد کا غالبًا یہ پہلا موقع تھا حج سے واپسی پر حضرت مہتمم صاحب نے مدرسین دارالعلوم کے لیے پنشن کا اجرا کیا تھا۔ جس سے ضعیف اور ریٹائرڈ مدرسین کے لیے سہولت پیدا ہوگئی۔

۱۳۵۴ھ میں حضرت مہتمم صاحبؒ کے زمانۂ سفرِ حج کی وجہ سے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو مجلس شوریٰ نے صدارت اہتمام کیلیے منتخب کیا جو دارالعلوم کے لیے بہت مفید دور رہا۔

تین شعبوں کا قیام

۱۳۵۵ھ میں دارالعلوم میں تین شعبوں کے قیام کی منظوری دی۔

پہلا شعبہ تنظیم و ترقی، دوسرا شعبہ محافظ خانہ اور تیسرا شعبہ ورزش کا تھا۔ اسی سال علماء مصر کا ایک وفد دارالعلوم آیا اور دارالعلوم کی خدمات کو دیکھتے ہوئے جامعہ ازہر اور دارالعلوم کے مابین ارتباط باہمی کے رشتے کو زیادہ سے زیادہ مستحکم بنانے کیلیے خواہش کا پرزور الفاظ میں اظہار فرمایا۔

فارسی خانہ، محافظ خانہ اور دارالاقامہ کی تعمیر

۱۳۵۶ھ میں چند جدید عمارتیں قائم کی گئیں۔ پہلی عمارت درجۂ فارسی کی تھی۔ یہ وہ درسگاہ ہے جو اس درجے کی قدیم درسگاہوں کے قریب شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی یادگار کے طور پر ''یادگارِ سعدی'' کے نام سے موسوم ہوتی۔

دوسری عمارت محافظ خانے کی دومنزلہ عمارت تھی جو دارالاہتمام کی جنوبی سمت میں واقع ہے۔ تیسرا سلسلہ دارالاقامہ کی تعمیر کا تھا جس کے ۵۲/ کمرے تعمیر کرنے تجویز کیے گئے تھے۔ اس کے لیے حضرت مہتمم صاحبؒ نے حیدرآباد دکن کا سفر اختیار فرمایا۔ اس کے بعد مدراس تشریف لے گئے۔ جس کے چندہ کے لیے اہل مدراس نے رمضان المبارک کے ایک ہی عشرہ میں ۴۷/ ہزار روپے حضرت مہتمم صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیے۔ اس طرح حق تعالیٰ نے ان تجویز شدہ کمروں کی تعمیر کا کام پورا فرمایا۔

عطیہ سعودی عرب

۱۳۵۷ھ میں جب حضرت مولانا مدنیؒ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ تو سلطان ابن سعود نے حضرت مدنیؒ سے ملاقات فرما کر خلعتِ شاہی سے نوازا اور کتب خانہ دارالعلوم کے لیے حکومت حجاز کی جانب سے طبع شدہ کتابیں عنایت فرمائیں۔

سلطان کا یہ علمی ہدیہ کتب خانہ میں ''عطیۂ سعودیہ'' کے عنوان سے ایک ممتاز جگہ رکھا ہوا ہے۔

سفر افغانستان

اسی سال حضرت مہتمم صاحبؒ نے افغانستان کا سفر اختیار فرمایا۔ حضرت کا بڑا شاندار استقبال کیا گیا۔ علماء افغانستان نے حضرتؒ کے لیے آنکھیں فرش راہ کیں۔ افغانی سرحد میں داخل ہوتے ہی شاہی مدارات شروع ہو گئیں۔ غایت تعظیم و احترام سے نہایت شاندار استقبال کیا گیا۔ کابل پہنچنے پر اولاً وزیر خارجہ سردار علی محمد خان سے ملاقات ہوئی۔

حضرت مہتمم صاحبؒ نے ایک طویل فارسی تقریر کے ذریعے دارالعلوم کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد صدر اعظم سردار محمد ہاشم خان سے ملاقات ہوئی۔ جنھوں نے انتہائی مدارات اور شفقت آمیز انداز سے حضرت مہتمم صاحبؒ کا خیر مقدم کیا۔ پھر اعلیٰ حضرت امیر افغانستان سے ملاقات ہوئی جو اپنی کرسی سے اٹھ کر دروازہ تک آ کر بغل گیر ہوئے۔

روداد سفر افغانستان

''آج جبکہ دارالعلوم کے روابط کا سلسلہ مشرق و مغرب تک پھیل چکا ہے ممالک اسلامیہ میں اس کے تلامذہ منتشر ہو چکے ہیں اور ساتھ ہی حالات کے اچانک کروٹ بدل لینے سے پوری دنیائے اسلام کو ارتباط باہمی کا شدید احساس ہو رہا ہے، دارالعلوم کو بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنی علمی رو کو زیادہ سے زیادہ پھیلائے اور اپنے علمی و تعلیمی اثرات کو عالم اسلام میں بیش طریق پر عام کرنے کے لئے دول اسلامیہ کی طرف اپنے خصوصی روابط کا ہاتھ بڑھائے اور ایسے وسائل پر غور کرے جس سے وہ بجائے خود دنیائے اسلام کی علمی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

تمام دول اسلامیہ میں چونکہ دولت افغانستان ہندوستان کی ہم جوار اور قابل فخر اسلامی دولت ہے نیز خاندان شاہی کے سربرآوردہ بزرگوں کو دارالعلوم کے مؤسسین اور اکابر سے براہ راست مخصوص ربط و تعلق رہا

ہے چنانچہ حضرت والا کو سب سے زیادہ علم ہے کہ اس مبارک خاندان کو علاوہ اپنی مادی اور ظاہری قوتوں اور اپنے خاندانی جاذب قلوب اخلاق وشرافت کے بزرگان دیوبند کی قوی روحانی توجہات اور مقبول ومستجاب دعاؤں سے پوری پوری امداد ملی ہے جس کا ظہور آج لیل ونہار میں روز روشن کی طرح واضح ہے اس لئے ہر واقف حال ''آلِ قاسم'' اپنے آپکو موجودہ شاہی خاندان سے مربوط تصور کیا کرتا ہے اور یہ امر واقعہ ہے کی خدام جامعۂ قاسمیہ اس قدیم خاندانی اتحاد کی وجہ سے دولت عالیہ اسلامیہ کے ساتھ پہلے سے زیادہ وابستہ ہوگئے ہیں اس لئے دارالعلوم کی مجلس عالیہ انتظامیہ نے مجھے اختیار دیا ہے کہ میں بطور خود حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہو کر تبادلۂ افکار کی سعادت حاصل کروں، میرا مخلصانہ نقطۂ نظر ذیل کی چار دفعات میں یہ ہے کہ:

(۱) اس قدیم اتحاد کو بے لوث اور بے غرضانہ طریقے اور عرفانی اساس پر ترقی پذیر صورت میں باقی رکھا جائے۔

(۲) والاحضرت معظم اور دولت عالیہ کے عرفان مآب اور اولیاء امور کیلئے ایسا موقع فراہم کیا جائے کہ وہ دارالعلوم جیسے مرکزی اور علمی ادارہ سے براہ راست تعارف حاصل کرسکیں۔

(۳) دارالعلوم افغانستان اور دارالعلوم دیوبند کے عرفانی روابط کو محض تعلیمی مقاصد کے لئے اس طرح ترقی دی جائے جس سے دارالعلوم کے اولیاء امور افغانستان اور دنیائے اسلام کی تازہ ترین علمی ضروریات کا براہ راست اندازہ کرسکیں اور اس اندازے کی روشنی میں آج کے تبدیل شدہ حالات میں ایسے علماء تیار کر سکیں جو وقت کے مقتضیات کو پیدا کرنے میں دنیائے اسلام کی آزاد حکومتوں کے مقصد ومنشا کے ساتھ پورا پورا تعاون کرسکیں اور سلطنت کے مخلص رجال کار ثابت ہوں۔

(۴) اس سلسلے میں ضروری ہے کہ والاحضرت کی رسمی رہنمائی اور توجہات کے زیر اثر مجھے افغانستان کی جدید علمی ترقیات، متوقعہ ضروریات اور مکاتب عرفانی کے معائنہ اور اکتساب نظر وفکر کا موقع دیا جائے تا کہ ملت افغانیہ کے عرفانی تصورات کا اصلی خاکہ میرے سامنے آجائے اور دارالعلوم دیوبند کے آئندہ پروگرام اور بالخصوص افغانی طلباء کی تربیت میں مشعل راہ بن سکے۔

مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی تأمل نہیں کہ ایک طرف دنیائے اسلام کی آزاد اور مستقل حکومتوں میں افغانستان ہی وہ دولت ہے جس نے اپنے پورے حلقہ اثر مین اسلامی شوکت اور اثر ونفوذ کو باقی رکھا ہے اور دوسری طرف دارالعلوم دیوبند ہی وہ مہم ادارہ ہے جس میں اسلامی روح کی حفاظت کرنے میں پوری تنظیم اور جرأت سے کام لیا ہے اس لئے ان دونوں اسلامی مرکزوں میں باہمی روابط کا استحکام جس درجے ضروری

ہے اسی درجے میں تمام عالم اسلام کیلئے بہر صورت مفید اور نتیجہ خیز بھی ہے اور جس کا نفع مآل کار افغانستان کے اذکیاء امت اور روشن ضمیر علماء کی صورت میں خود افغانستان ہی کی طرف لوٹ آئے گا۔

اس جدید ارتباط کے ماتحت جہاں دار العلوم دولت عالیہ کے مشورے کی روشنی میں ملت افغانیہ کے لئے خدمات پیش کرے گا وہیں دولت عالیہ کی طرف سے اس کے مناسب شان اگر دار العلوم پر ایسی خصوصی اور اخلاقی توجہات مبذول ہوں جو ان عرفانی روابط کے اظہار و بیان اور اس قسم کے روابط حسنہ کے دوامی تحفظ کی پرشرف اساس ہو سکیں تو دار العلوم نہ صرف انھیں قبول ہی کرے گا بلکہ اپنے لئے باعث شرف و اعزاز اور ان روابط کے بقاء واستحکام کے لئے ضروری اور موزوں سمجھے گا۔

دار التفسیر کی تعمیر

اسی سال ۱۳۵۸ھ میں دار الحدیث کی بالائی منزل پر ۳۰/۳۰ مربع فٹ ہال کی درسگاہ دار التفسیر کے نام سے تعمیر کی گئی۔ اس وقت تک دورۂ تفسیر کے لیے کوئی مستقل درسگاہ موجود نہ تھی۔ دار التفسیر کے اوپر ایک پرشکوہ گنبد بنایا گیا۔ جو اپنی رفعت و عظمت کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ گویا دار العلوم کے سر پر تاج رکھا ہوا ہے۔ دار الحدیث والتفسیر کی یہ عظیم الشان عمارت بہیئت مجموعی بڑی پرشوکت ہے۔ جسے دیکھنے والا محوِ حیرت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حضرت مہتمم صاحبؒ کی عظیم یادگار ہے۔

باب الظاہر کی تعمیر

۱۳۵۹ھ میں باب الظاہر کی تعمیر افغانی عطیہ سے ہوئی۔ اس کا نام شاہِ افغانستان کے نام پر ”باب الظاہر“ رکھا گیا، اس کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کو دعوت دی گئی۔ باب الظاہر دار العلوم میں ایک عظیم الشان اور پرشوکت سہ منزلہ عمارت ہے جس میں متعدد کمرے اور بڑی بڑی درسگاہیں ہیں۔ جن میں شعبہ خوشنویسی کے اساتذہ طلبہ کو فنِ کتابت سکھاتے تھے۔ اسی سال ایک مفید تعلیمی اسکیم کی تدوین کے لیے حضرت مہتمم صاحبؒ نے ریاست قلات کا دورہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسی سال حضرت مہتمم صاحبؒ نے مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کا معائنہ کیا اور اسلام و سائنس کے عنوان پر ایک معرکۃ الآراء عالمانہ وفلسفیانہ تقریر فرمائی۔ جو کتابی شکل میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ یونیورسٹی میں علماء کے خلاف جو بدظنی پھیلی ہوئی تھی وہ دور ہوگئی اور دار العلوم دیوبند اور یونیورسٹی علیگڑھ میں تعلق روز بروز بڑھتا گیا اور آج یہ بدظنی بہت کم ہوگئی ہے۔

دارالاقامہ کی تکمیل

۱۳۶۰ھ میں حضرت مہتمم صاحبؒ مدراس تشریف لے گئے اور پھر کلکتہ کے راستے واپسی ہوئی، جس میں مخیرّ حضرات نے دارالاقامہ کے لیے کھل کر عطیات دئے اور اس کی تکمیل کا مرحلہ طے ہوا۔

رسالہ دارالعلوم کا اجراء

اسی سال جمادی الثانی ۱۳۶۰ھ میں ''دارالعلوم'' کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ کا اجراء عمل میں آیا۔ جو حضرت مہتمم صاحبؒ کی نگرانی میں اسلام اور مسلمانوں کی مفید خدمات انجام دیتا رہا۔ جس کے ایڈیٹر مولانا سید محمد از ہر شاہ قیصرؒ تھے۔

حضرت مدنی کی گرفتاری

۱۳۶۱ھ میں حضرت مولانا مدنیؒ کی گرفتاری عمل میں آئی تو دارالعلوم میں ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت حضرت مہتمم صاحبؒ نے کی اور مہتمم صاحبؒ نے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ:

''اگر حکومت حضرت مولانا مدنیؒ کو گرفتار کر کے دارالعلوم اور جماعت دارالعلوم کو چیلنج کرنا چاہتی ہے تو میں پوری جماعت کی طرف سے اس چیلنج کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' جس کا اثر یہ ہوا کہ مولانا مدنیؒ جلد ہی رہا ہو گئے۔

ایک سیاسی اختلاف

۱۳۶۲ھ میں تحریک پاکستان اور ملکی سیاسیات کا اثر دارالعلوم پر بھی پڑا۔ ایک طرف تو ملک میں یہ ہنگامہ برپا تھا تو دوسری طرف دارالعلوم کے ارباب حل وعقد کا سیاسی اختلاف کی بنا پر کشیدگی اور مخالفت کا شدید خلفشار رونما ہو گیا۔ جو بالآخر دارالعلوم کے صدر مہتمم حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ اور مولانا ظہور احمد صاحبؒ اور دوسرے اساتذہ کے استعفاء اور علیحدگی پر منتج ہوا۔ ان کے ساتھ ساٹھ طلباء بھی دارالعلوم سے علیحدہ ہو گئے۔ البتہ کچھ مدت کے بعد حضرت مہتمم صاحبؒ کی سعی وکوشش سے مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ اور مولانا ظہور احمد صاحبؒ دارالعلوم میں واپس تشریف لے آئے۔ آخر پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ پاکستان چلے گئے۔

حضرت مدنیؒ کی رہائی

۱۳۶۳ھ میں حضرت مدنیؒ کی رہائی عمل میں آئی تو مہتمم صاحبؒ نے ایک عظیم الشان جلسہ میں جو دارالعلوم دیوبند میں منعقد ہوا تھا۔ ایک اہم مفید فارسی میں قصیدہ لکھ کر سنایا۔

شعبۂ خوشخطی کا اجراء

۱۳۶۴ھ میں دارالعلوم میں شعبۂ خوشخطی کا اجراء ہوا۔

دارالصنائع کا اجراء

۱۳۶۵ھ میں دارالصنائع کا قیام عمل میں آیا۔

فسادزدہ مسلمانوں کی امداد اور پراویڈنٹ فنڈ کا اجراء

۱۳۶۶ھ میں دارالعلوم کی طرف سے بہار اور گڑھ مکتیشور کے فسادزدہ مسلمانوں کی امداد واعانت کی گئی۔ اسی سال دارالعلوم میں پراویڈنٹ فنڈ کا اجرا کیا گیا تاکہ ملازمین کی شدید ضرورتوں یا سبکدوشی کے مواقع پر بسہولت امداد میسر آ سکے۔

دارالاقامہ کی جدید عمارت کی بنیاد

۱۳۶۷ھ میں دارالافتاء کی جدید عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ عمارت متعدد کمروں پر مشتمل ہے ان میں ایک کمرہ دارالافتاء کے کتب خانہ کے لیے مخصوص ہے۔ پہلے کوئی ایسی عمارت نہ تھی۔ ۱۹/ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ سے دارالافتاء کو جدید عمارت میں منتقل کیا گیا۔

حکیم الاسلامؒ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے رکن بنے

۱۳۶۸ھ میں مسلم یونیورسٹی کورٹ کے لیے علماء دیوبند کا انتخاب عمل میں آیا، جس میں حضرت مہتمم صاحبؒ کو کورٹ کی رکنیت کے لیے منتخب کیا گیا اور اس طرح دونوں علمی اداروں میں تعاون کی راہیں کھل گئیں۔

پاکستانی طلباء کے داخلہ پر سے پابندی اٹھائی گئی

۱۳۶۹ھ میں حضرت مہتمم صاحبؒ کی درخواست پر دارالعلوم دیوبند میں پاکستانی طلبہ کے داخلے سے

حکومت ہند نے پابندی اٹھالی جس سے دارالعلوم کی ترقی میں نمایاں اضافہ ہوا۔ اسی سال حکومت ہند نے دارالعلوم کا تعارف کرانے کے لیے پروگرام بنایا اور دارالعلوم کے فوٹو اتارے گئے اور آل انڈیا ریڈیو کے ذریعے بیرون ہند میں دارالعلوم کا تعارف کرایا، پھر اسی سال سفیر افغانستان سردار نجیب سرکاری حیثیت سے دارالعلوم تشریف لائے اور دارالعلوم کو دیکھ کر مہتمم صاحبؒ کی خدمات کو سراہا۔

سفیر افغانستان کی دارالعلوم میں آمد

جس طرح دارالعلوم کا علمی فیضان عام ہے اس طرح اس کے ہمدردوں کا حلقہ بھی وسیع ہے، آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ مسلمانان ہند کے علاوہ دوسرے ممالک کے مسلمان بھی اس کی تعمیر و ترقی میں کم و بیش شریک رہے ہیں، خصوصا افغانستان نے دارالعلوم کی دینی خدمات کو ہمیشہ اہمیت کی نظر سے دیکھا ہے، چنانچہ ان ہی قدیم روابط کے پیش نظر سفیر افغانستان مقیم دہلی سردار نجیب ۷/رجب کو دارالعلوم میں سرکاری حیثیت سے تشریف لائے اور کئی گھنٹوں تک اکابر دارالعلوم سے علمی مسائل پر تبادلۂ خیال فرمایا۔ دارالعلوم کے شعبہ جات اور درسگاہوں کا معائنہ کیا، سفیر موصوف ''باب الظاہر'' کی بالائی منزل میں قیام پذیر ہوئے ''باب الظاہر'' افغانستان کے بادشاہ محمد ظاہر شاہ کی علم دوستی کی شاندار یادگار ہے، ممدوح کے اعزاز میں دارالحدیث کے بڑے ہال میں جلسہ منعقد کیا گیا، تہنیتی قصائد کے بعد حضرت مہتمم صاحبؒ نے خیر مقدم کی تقریر میں دارالعلوم اور افغانستان کے تاریخی تعلقات پر تفصیلی روشنی ڈالی اور دارالعلوم کے مسلک کی وضاحت فرمائی، آخر میں سردار نجیب اللہ خاں نے اپنی جوابی تقریر میں ملت افغانستان کے دارالعلوم سے شغف و تعلق اور دارالعلوم کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا:

''دارالعلوم دیوبند افغانستان کے عوام کی نظر میں ایک علمی درسگاہ ہے، مگر میں اپنے مشاہدے کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ صرف ایک علمی درسگاہ ہی نہیں ہے، بلکہ اسلامی ثقافت کا مرکز بھی ہے، دارالعلوم نے اس زمانے میں جبکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت باقی نہیں رہی تھی دین اور اسلامی علوم کی حفاظت کی اور مجھے اُمید ہے کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح علوم وفنون کی خدمت میں مصروف رہیگا، افغانستان کے عوام اور علماء اور علم دوست اس کے قدردان ہی نہیں بلکہ علماء کے مددگار اور بہی خواہ بھی ہیں۔

ثقافت اسلامی کی بنیاد سچائی، محبت، مساوات اور حقیقت شناسی پر مبنی ہے، اور یہ دارالعلوم ان اجزاء پر مشتمل ہے۔

دارالعلوم کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس نے ہمیشہ راست کردار اور راست گفتار فرزند پیدا کئے ہیں جن پر دارالعلوم صحیح طور پر فخر کرسکتا ہے، دارالعلوم تنہا ہندوستان کا ورثہ نہیں ہے بلکہ تمام عالم اسلامی کی میراث ہے، اسلئے خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس دارالعلوم کو ترقیوں کے ساتھ باقی رکھے اور عالم اسلامی کے لئے مفید بنائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی دارالعلوم میں آمد

۱۳۷۰ھ میں حکومت ہند کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزادؒ دارالعلوم تشریف لائے۔ حضرت مہتمم صاحبؒ نے دارالعلوم کا مفصل تعارف کرایا۔ مولانا آزاد نے ایک جلسۂ عام میں نہایت فصیح و بلیغ انداز میں تقریر کی اور بانی دارالعلوم کی مثالی زندگی کی خصوصیات دارالعلوم کی علمی اہمیت و عظمت پر مفصل روشنی ڈالی اور اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

اچاریہ ونوبا بھاوے کی آمد

۱۳۷۱ھ میں اچاریہ ونوبا بھاوے اپنی بھومی دان کی تحریک کے سلسلہ میں دیوبند وارد ہوئے۔ حضرت مہتمم صاحبؒ سے ملاقات کی اور خوشی کا اظہار کیا اور اپنی تقریر میں کہا۔

"یہ یونیورسٹی ہمارے ملک کا بہترین سرمایہ ہے۔ اس نے انگریزی اقتدار کے دورِ غلامی میں عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔"

دارالعلوم کی اعانت کے لئے اپیل

اسی سال حضرت مہتمم صاحبؒ نے مسلمانانِ عالم کے لیے ایک اپیل شائع کی جس کا مقصد دارالعلوم کی اعانت تھا۔ الحمدللہ حضرت کی اپیل کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ خصوصاً پاکستان اور جنوبی افریقہ نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور لاکھوں روپیہ جمع ہوا۔ ہزاروں من گندم جمع ہوا اور دارالعلوم کو اس نازک موقع پر بڑی تقویت ملی۔

شعبۂ طب و دارالشفاء کا قیام

۱۳۷۲ھ میں شعبۂ طب اور دارالشفاء کا قیام عمل میں آیا۔ جس میں مفرد مرکب اور پیٹنٹ ادویہ کے ذخیرے کے ساتھ چارپائیوں، بستروں اور تیمارداری کا بھی ضروری سامان مہیا کیا گیا۔ ہمدرد دواخانہ دہلی تین چار ہزار روپے کی سالانہ دوائیں بھیجتا رہا۔ یہ سب حضرت مہتمم صاحبؒ کے خلوص اور سعی و کاوش کا نتیجہ تھا۔

مملکت سعودیہ و مصر کے سربراہان کی آمد

۱۳۷۳/۷۴ھ میں ملک حجاز کی طرف سے حضرت مہتمم صاحبؒ کو پیغام تبریک ملا اور جب اسی سال جلالۃ الملک ہندوستان تشریف لائے تو دارالعلوم پر شاہانہ توجہ مبذول فرمائی اور ۲۵/ ہزار روپے کا عطیہ دارالعلوم کو عطا فرمایا اسی سال جمہوریہ عربیہ مصر کے صدر انورالسادات دارالعلوم تشریف لائے اور دارالعلوم کے بارے میں اپنے حسنِ ظن کا اظہار فرمایا اور حضرت مہتمم صاحبؒ کی خدمات جلیلہ کو سراہا۔

مصر کے صدر انورالسادات جو اس وقت مؤتمر اسلامی کے جنرل سکریٹری تھے دارالعلوم میں تشریف لائے، موصوف نے حسبِ ذیل الفاظ میں اپنے تأثرات رقم فرمائے۔

''اس عظیم دینی اور تاریخی درس گاہ کی زیارت نے مجھے مجبور کیا کہ میں بصمیم قلب اپنے بھائیوں کی خدمت میں مبارک باد پیش کروں جو اس ادارے کو چلا رہے ہیں، میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس ادارے کو علم و معرفت کا منارہ بنائے اور ہمیشہ ہمیشہ مسلمانوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقع عطا فرمائے۔

دارالعلوم کے مصر سے روابط

۱۳۷۵ھ میں مصر سے دارالعلوم کے روابط قائم ہوئے اور حضرت مہتمم صاحبؒ کی خواہش پر وہاں کے دو جلیل القدر استاذ شیخ عبدالمنعم النمر اور شیخ عبدالعالی جامعہ ازہر مصر سے دو سال کے لیے تشریف لائے اور دارالعلوم میں عربی ادب اور عربی زبان میں تقریر و تحریر کا ایک خاص ذوق پیدا ہوا اور دارالعلوم اور جامعہ ازہر مصر کے تعلقات مضبوط ہو گئے۔

مسجد کی توسیع اور فتاویٰ دارالعلوم کی تدوین

اسی سال دارالعلوم کی مسجد میں توسیع کی گئی اور اسی سال فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی تدوین کا کام حضرت مہتمم صاحبؒ کی زیرنگرانی جاری کیا گیا جس کی کئی جلدیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور آج تک بحمداللہ یہ سلسلہ جاری ہے، یہ حضرت مہتمم صاحبؒ کا عظیم علمی کارنامہ ہے۔ اس میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے فتاویٰ کثرت سے ہیں۔

صدر جمہوریۂ ہند کی دارالعلوم آمد، سفر برما اور کتب خانہ دارالعلوم کی تعمیر

۱۳۷۶ھ میں صدر جمہوریۂ ہند دارالعلوم آئے اور دارالعلوم کی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش

کیا۔ پھر اسی سال حضرت مہتمم صاحبؒ برما کے سفر پر روانہ ہوئے۔ عوام اور حکومت حضرت مہتمم صاحبؒ کی جامع صفات شخصیت سے بہت متاثر ہوئے اور عوام و حکام نے دو لاکھ سے زائد رقم دارالعلوم کے لیے عطیہ دیا۔ اس رقم سے حضرت مہتمم صاحبؒ نے کتب خانہ دارالعلوم کے لیے ایک بڑا ہال تعمیر کرایا۔ جس میں ایک لاکھ سے زائد قدیم اکابرین کی کتب موجود ہیں۔ یہ مسلمانانِ برما کی ایک عظیم یادگار ہے تفصیلات کے لیے سفر نامہ برما جو کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

(یہ سفر نامہ خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم نے مرتب فرمایا ہے)

شاہ افغانستان کی دارالعلوم آمد

۱۳۷۷ھ کے اہم واقعات میں شاہ افغانستان محمد ظاہر شاہ کا دارالعلوم میں ورود مسعود ہے جو دارالعلوم کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ دارالعلوم کی تاریخ کا ایسا باب ہے جو نہ صرف دارالعلوم کے زرین ماضی پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے، بلکہ اس کے شاندار مستقبل کی بھی نشاندہی کرتا ہے، شاہ افغانستان نے ازراہِ علم نوازی دارالعلوم کی دعوت کو شرفِ قبول بخشا اور پروگرام کے مطابق ۵/شعبان ۱۳۷۷ھ ۲۵/فروری ۱۹۵۸ء کو بذریعۂ کار تشریف لائے، دارالعلوم کی جانب سے شاہ کا شاندار استقبال کیا گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ افغانستان سے ہمیشہ دارالعلوم کے مخلصانہ تعلقات رہے ہیں، جس میں دونوں طرف خیر سگالی کا جذبہ پایا جاتا ہے، احاطۂ دارالعلوم کا عظیم الشان دروازہ ''باب الظاہر'' دارالعلوم اور افغانستان کے گہرے باہمی ربط و تعلق کی ایک ایسی یادگار ہے کہ ہر وارد و صادر کے ذہن کو بے ساختہ، افغانستان کی ''دولت خداداد'' کی جانب منتقل کر دیتی ہے۔

ہندوستان و افغانستان کا تعلق جغرافی اور تاریخی اعتبار سے اتنا ہی پرانا ہے، جتنا دو ہمسایہ ملکوں کا قدرتی طور پر ہوسکتا ہے، دونوں ملک نہ صرف ثقافتی رشتے میں منسلک ہیں بلکہ زبان کے لحاظ سے بھی ہندوستان و افغانستان ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں، افغانستان کی زبان فارسی ہندوستان پر چھ سو سال کے قریب حکمراں رہی ہے اور آج بھی ہندوستان کے بہت سے لوگ اس کو سمجھتے اور پڑھتے ہیں، ہندوستان کی مشکل ہی سے کوئی زبان ایسی ہوگی جس میں تھوڑے بہت فارسی کے الفاظ موجود نہ ہوں، ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں جب دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تو بیرونی ممالک میں افغانستان ہی وہ ملک ہے جس نے سب سے پہلے دارالعلوم کا خیر مقدم کیا اور اپنے نونہالوں کو دارالعلوم کے آغوش تعلیم و تربیت کے سپرد کر دیا، یہ وہ زمانہ تھا جس میں سفر کی موجودہ سہولتیں میسر نہ تھیں، شمالی ہند کی نارتھ ویسٹرن ریلوے جو

بعد میں افغانستان اور ہندوستان کے درمیان آمدورفت کا سب سے بڑا ذریعہ رہی ہے اس وقت تک جاری نہیں ہوئی تھی، اس چیز سے جہاں ملت افغانستان کے غیر معمولی دینی جذبے اور علم دوستی کا ثبوت ملتا ہے، وہیں دارالعلوم کو روزِ اول سے مقبولیت کا پتہ بھی چلتا ہے، اس وقت سے لیکر ۱۹۴۷ء تک دارالعلوم کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں افغانستان کے طالب علم کی تعلیمی سرگرمیاں دارالعلوم کی رونق کا باعث نہ رہی ہوں اور ادھر افغانستان میں بھی فضلائے دارالعلوم کے لئے ملک کے اہم کلیدی عہدوں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے ہیں۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہٗ نے جب بیسوی صدی کے دوسرے عشرے میں ہندوستان کے لئے ایک عارضی حکومت کا خاکہ تیار کیا تو اس کا مرکز افغانستان ہی کے دارالسلطنت کابل میں بنایا گیا تھا، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور حضرت مولانا محمد میاں انبیٹھوی عرف مولانا منصور انصاری کو اس مقصد کے لئے بطور خاص افغانستان بھیجا گیا، یہ دونوں حضرات حضرت شیخ الہندؒ کی انقلابی تحریک کے سرگرم کارکن تھے، کابل میں ان کی جدوجہد دارالعلوم اور افغانستان کے درمیان مخلصانہ روابط کے استحکام میں ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔

غرض کہ افغانستان کے ہندوستان اور بالخصوص دیوبند سے ہر زمانے میں گوناگوں تعلقات قائم رہے، چنانچہ ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے سفر افغانستان کے موقع پر ان دیرینہ تعلقات کا خاص طور پر اظہار رہا، جس کی قدرے تفصیل گزر چکی ہے، دارالعلوم میں ''باب الظاہر'' کی تعمیر اسی سفر کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی۔

جلسہ خیر مقدم میں شرکت کے لئے اعلیٰ حضرت اور ان کے رفقاء حضرت مہتمم صاحبؒ اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی معیت میں احاطۂ مولسری کے شمالی زینے سے اوپر تشریف لے گئے اور ''رسالہ دارالعلوم'' کے دفتر سے گزرتے ہوئے ادارہ اہتمام میں رونق افروز ہوئے، بعد ازاں اعلیٰ حضرت نے محافظ خانہ دارالعلوم کا معائنہ کیا اور ''بسیار خوب است'' کے الفاظ سے اپنی پسندیدگی اظہار فرما کر کتب خانے میں تشریف لے گئے، یہاں نادر و نایاب مخطوطات، مختلف عہد کے لکھے ہوئے قرآن شریف کے قلمی نسخے اور شاہی عطیات میں سعودی عرب، ترکی، مصر، ایران اور نظام دکن کی عطا کی ہوئی کتابیں نہایت قرینے کے ساتھ سجائی گئی تھیں، حکومت افغانستان کی عطا کی ہوئی کتابیں نمایاں طور پر رکھی ہوئی تھیں ان میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نوراللہ مرقدہٗ کا ترجمہ قرآن مجید بحواشی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا وہ

نسخہ بھی شامل تھا جس کو حکومت افغانستان نے سردار محمد ہاشم خاں مرحوم سابق وزیر اعظم کی نگرانی میں سرکاری طور پر اردو سے فارسی میں منتقل کرایا ہے، اس کا اردو ایڈیشن حضرت مہتمم صاحبؒ دارالعلوم نے شاہ افغانستان کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا تھا اور اسی وقت سے اس کے فارسی ترجمے کی داغ بیل پڑ گئی تھی، ہر کتاب پر خوشنما کارڈ لگا ہوا تھا، جس میں کتاب کا تعارف درج تھا، شاہ نے غایت توجہ اور پسندیدگی سے ان سب چیزوں کو ملاحظہ فرمایا۔

شعبہ جات دارالعلوم اور کتب خانہ کے معائنہ کے بعد شاہ دارالحدیث کے مشرقی برآمدے سے گزرتے ہوئے اور دفتر تعلیمات کو ملاحظہ فرماتے ہوئے دار جدید کے شمالی صحن میں تشریف لائے یہاں انھوں نے سامنے سے ''باب الظاہر'' کو ملاحظہ کیا اور بعد ازاں جلسہ گاہ میں تشریف لے گئے۔

دار جدید کے جنوبی صحن میں باب الظاہر کے نیچے ایک وسیع وعریض پنڈال تیار کیا گیا تھا، یہ عظیم الشان پنڈال جو حسن وسادگی اور شوکت کا ایک عجیب دل کش منظر پیش کررہا تھا، مختلف قطعوں میں تقسیم تھا، ڈائس کی داہنی جانب دارالعلوم کے اساتذہ، شعبہ جات کے نظماء اور دوسرے کارکنوں، پریس اور آل انڈیا ریڈیو کے نمائندوں کی نشستیں تھیں اور بائیں جانب اعلیٰ حضرت کے رفقاء مقامی حکام اور معزز مہمان تشریف فرما تھے، سامنے کے حصے کو دو قطعوں میں تقسیم کیا گیا تھا، پہلا قطعہ طلبائے دارالعلوم اور دوسرا حصہ عوام کے لئے مخصوص تھا، یہ مجمع تقریباً بیس/۲۰۰۰۰ ہزار افراد پر مشتمل تھا۔

ڈائس کے سامنے دارالعلوم زندہ باد اور داہنے بائیں دولت خداداد افغانستان اور جمہوریۂ ہند زندہ باد کے خوشنما کتبے آویزاں تھے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ رکن شوریٰ دارالعلوم نے فارسی میں افتتاحی تقریر فرمائی جس میں اعلیٰ حضرت کی تشریف آوری پر دارالعلوم کی جانب سے شکریہ ادا کرتے ہوئے دارالعلوم کی علمی وعرفانی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی تھی، حضرت ممدوح نے فرمایا:

''اعلیٰ حضرت ہمایونی! دارالعلوم میں آپ کی تشریف آوری کا ہم پرخلوص خیر مقدم کرتے ہوئے ہزار ہا ہزار جذباتِ تشکر وامتنان پیش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے آپ کا ورود مسعود ہمارے لئے فخر ومباہات کا موجب ہے۔

اعلیٰ حضرت! جس جگہ آپ اس وقت رونق افروز ہیں یہ مقام دین حنیف کا مرکز اور مسلک حق کا محور ہے، یہ صرف ایک مدرسہ اور جامعہ نہیں ہے بلکہ دین وایمان کا ستون اور طریقت وشریعت کی اساس اور

معرفت الٰہی کے خزانے بھی اپنی آغوش میں رکھتا ہے اور مادیت والحاد کی اس گرم بازاری کے زمانے میں حق وصداقت کا روشن مینارہ اور انجمن حق کی شمع فروزاں ہے۔

اعلیٰ حضرت! اس تشریف آوری کے موقع پر آپ ہندوستان میں بہت سی قدیم عمارتیں اور تاریخی مقامات ملاحظہ فرمائیں گے اور یہاں کی اونچی شخصیتوں سے مل کر یقیناً مسرور ہوں گے مگر یہ سب مادی اور دینوی ترقی کے مظاہر ہیں۔

لیکن یہ دارالعلوم تمام اسلامی دنیا میں اپنی روحانی اور اخلاقی عظمت کے لحاظ سے ایک بلند واعلیٰ مقام رکھتا ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ادارہ رشد و ہدایت کا آفتاب اور صراط مستقیم و دین قویم کا مظہر ہے" ذلک فضل اللّٰہ یو تیہ من یشاء و اللّٰہ ذو الفضل العظیم."

اعلیٰ حضرت! ہر چند یہ ادارہ دینوی طمطراق اور تمدنی شان وشکوہ سے تہی دامن ہے مگر اس کا ذرہ ذرہ حق وصداقت کی تابانی اور علم ومعرفت کی درخشانی کا مظہر ہے اور اس ادارے کی ماضی وحال کی تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ یہاں کے اکابر وعلماء ہمیشہ علم ومعرفت کے علَم بردار رہے ہیں اور سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے کوئی چیز ان کے لئے نمونہ عمل نہیں رہا۔

جلسۂ خیر مقدم میں حضرت مہتمم صاحبؒ دارالعلوم نے اعلیٰ حضرت کو سپاس نامہ پیش کیا، آخر میں اعلیٰ حضرت پر جوش نعرہ ہائے تکبیر کے درمیان تقریر کے لئے کھڑے ہوئے، اعلیٰ حضرت نے فارسی میں تقریر فرمائی جس میں دارالعلوم کی علمی وعرفانی خدمات کا اعتراف اور دارالعلوم کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اپنے شاندار استقبال پر اظہار مسرت کیا۔

شعبۂ تنظیم فضلاء کا قیام

۱۳۷۸ھ میں حضرت مہتمم صاحبؒ کی تجویز سے شعبۂ تنظیم فضلاء دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔ سبھی اکابر کی ایک دیرینہ آرزو تھی جو حضرت مہتمم صاحبؒ کے ذریعے پوری ہوئی۔

۱۳۷۹ھ میں حضرت مہتمم صاحبؒ نے افریقہ کا سفر اختیار فرمایا اس سفر سے دارالعلوم کو مادّی فائدہ بھی کافی پہنچا اور تقریباً سوا لاکھ روپیہ دارالعلوم کو بلا طلب وتحریک حاصل ہو گئے۔ اسی سال دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد کی جوبلی میں دارالعلوم کے نمائندہ کی حیثیت سے خطیب الاسلام مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہ مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند نے شرکت فرمائی اور حضرت مہتمم صاحبؒ کا پیغام اور ایک علمی مقالہ جوبلی کے

اجتماع میں پڑھ کر سنایا۔ جس سے ان دونوں اداروں میں گہرے روابطہ قائم ہوئے۔

علی امیر معزناظم نشریات فارسی نے بیان کیا کہ:

''یہ وہ جگہ ہے جہاں میں نے اسلام کی حقیقی عظمت اور قدروں کا احساس کیا، میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی صفیں نماز میں خالی نہیں اور ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے، آخر کار ایک دن آئے گا کہ اسلام کے اتحاد وسادگی کے سائے اور مسلمانوں کی بے ریائی اور بے لوثی کے نتیجے میں اسلام تمام جہان پر چھا جائے گا''۔

اسلام کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق خدا کی عبادت جس سے ہم مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں دور ہو گئے تھے اور دنیوی مال و دولت اور جاہ وجلال نے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا اس کو ہم نے اس مقدس مقام میں پایا، اس طرح پایا کہ اسلام کی عظمت سے ہم دوبارہ آگاہ ہوئے۔

جمال عبدالناصر کی ہندوستان آمد اور حکیم الاسلامؒ کا علمی ہدایا پیش کرنا

اسی دوران مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ حضرت مہتمم صاحبؒ نے دہلی جا کر صدر ناصر سے ملاقات کی اور دارالعلوم کی جانب سے فیض الباری شرح بخاری، فتح الملہم شرح مسلم اور سوانح قاسمی کے نسخے علمی ہدیے کے طور پر صدر عبدالناصر کو پیش فرمائے۔ صدر ناصر نے کھڑے ہو کر بڑی عقیدت سے حضرت مہتمم صاحبؒ سے اس ہدیہ کو قبول کیا اور وقیع الفاظ میں حضرت مہتمم صاحبؒ اور دارالعلوم کا شکریہ ادا کیا۔ پھر مصر پہنچ کر قرآن شریف کا ایک حسین نسخہ صدر ناصر نے حضرت مہتمم صاحبؒ کے لیے ارسال کیا۔

جامعہ طبیہ کا قیام

۱۳۸۰ھ میں دارالعلوم میں جامعہ طبیہ کا اجراء کیا گیا اور احاطۂ دارالعلوم کے شمال میں جامعہ طبیہ کی ایک وسیع اور شاندار عمارت کا قیام عمل میں آیا۔

حکیم الاسلامؒ کی ڈاکٹر پی ہارڈی سے ملاقات وگفتگو

اسی سال لندن یونیورسٹی شعبہ تعلیم اسلام کے پروفیسر ڈاکٹر پی ہارڈی اپنی تاریخی تحقیق کے سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند آئے اور حضرت مہتمم صاحبؒ سے علم وتحقیق کے بارے میں طویل گفتگو ہوئی اور ڈاکٹر پی ہارڈی کا یہ تأثر قابل ذکر ہے کہ:

’’جس اسلام کو ہم کتابوں میں پڑھتے تھے اور جس اسلام کو پیغمبر اسلام نے دور اوّل میں پیش فرمایا تھا سچ یہ ہے کہ وہ اسلام ہم نے دیوبند اور علماء دیوبند میں موجود پایا ہے۔‘‘

ہمایوں کبیر کی دارالعلوم آمد

۱۳۸۱ھ میں حکومت ہند کے وزیر ثقافت و سائنس ہمایوں کبیر دارالعلوم تشریف لائے اور دارالعلوم سے بے حد متاثر ہوئے۔ ایک جلسہ سے خطاب کے دوران کہا کہ:

’’دارالعلوم دیوبند نے علم کی جو عظیم خدمت انجام دی ہے وہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ ساری دنیا کے لیے قابل قدر ہے۔‘‘

حکیم الاسلامؒ کو حکومت مصر کا علمی تحفہ

اسی سال حکومت مصر نے قرآن مجید کے چوالیس ریکارڈوں کا سیٹ جن میں پورے قرآن مجید کی قرأت موجود ہے حضرت مہتمم صاحبؒ کے لیے تحفہ بھیجا۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی دارالعلوم آمد

جامعۂ حلب (شام) کے استاذ شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے دارالعلوم کو دیکھ کر اپنے تأثرات کا اظہار فرمایا ان کا یہ پہلو بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ان کے نزدیک یہاں کے علماء کی تصانیف میں ایسے علمی مباحث ملتے ہیں جو علمائے متقدمین، مفسرین، محدثین اور حکماء کے یہاں دست یاب نہیں ہیں، مگر یہ نادر کتابیں چونکہ اردو زبان میں ہیں اس لئے ممالک عربیہ ان کے استفادے سے محروم ہیں، ضرورت ہے کہ ان کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا جائے تاکہ وسیع پیمانے پر ان سے استفادے کے مواقع فراہم ہوں، شیخ ابوغدہؒ کے تاثرات کا ترجمہ یہ ہے۔

’’اس عاجز و ناتواں راقم سطور کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا افضل وانعام ہے کہ اس نے ہندوستان کے شہروں کی سیاحت و زیارت کا موقع بہم پہنچایا، بالخصوص ان شہروں میں سرفہرست دیوبند اور اس کی دینی درسگاہ ’’دارالعلوم‘‘ کا درجہ ہے، جو درحقیقت ہندوستان کا علم و تقویٰ سے بھرپور زندہ قلب، علماء و مولفین کا مرکز اور دین و معرفت کے طلباء کی آماجگاہ ہے، اس مرکز کی زیارت عمر بھر کی تمناؤں اور لیل و نہار کے خوابوں میں سے ایک خواب و تمنا تھی، خدا کا شکر ہے کہ آج دارالعلوم کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور پرانا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔

دور رہتے ہوئے جو کچھ دار العلوم کے بارے میں سنا تھا اسکا جو کچھ ذہن میں خاکہ و تصور تھا قریب سے دیکھ کر اس کو اس سے کہیں زیادہ اچھا اور بہتر پایا، اس مقدس ادارے کے گوشے گوشے سے انوار علم کا فیضان ہوتا ہے، اس کی درسگاہوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی تعلیم دی جاتی ہے اور تشنگان علم اور طالبان رشد و ہدایت کے لئے مثالی نظم و نسق، سلیقہ شعاری اور روشن دماغی کے ساتھ اس اسلوب سے احکام دین و شریعت بیان کئے جاتے ہیں جس میں اہل روحانیت اور اصحاب علم و تحقیق کے آثار و فیوض نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ کمال فضل و احسان ہے کہ مجھے سیدی الشیخ المحدث السید فخر الدین احمد المراد آبادیؒ کے درس حدیث شریف کچھ حصے کی سماعت کا شرف حاصل ہوا، حضرت موصوف نے طلباء محبین کرام کی درخواست پر احقر کی رعایت کرتے ہوئے حدیث بنی سلمہ پر عربی میں تقریر فرمائی، جس میں ذکر ہے کہ بنی سلمہ کی خواہش ہو یہ کہ وہ اپنے مکانوں کو چھوڑ کر مسجد نبویؐ کے جوار میں منتقل ہو جائیں، رسول اللہ ﷺ کو ان کے اس ارادے کا علم ہوا تو ارشاد فرمایا: ''**دیا رکم تکتب لکم آثا رکم**'' موصوف کی تقریر بیش بہا موتیوں اور تابناک ستاروں کا مجموعہ اور فیض الباری اور عمدۃ القاری کا مصداق تھی، اسی کے ساتھ شیخ موصوف کی طرف سے ان طلباء کو جو گوش بر آواز تھے اپنے خصوصی ارشادات سے نوازنے کا سلسلہ جاری تھا جو ان تلامذہ کے نفوس میں اس طرح سرایت کرتے تھے جس طرح عطر ہوا میں اور پانی زندگی میں کرتا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کو سنت مطہرہ اور اس کے متبعین کی طرف سے جزائے خیر دے اور اس ادارے کو سماحۃ الشیخ صدر المدرسین مولانا العلامہ ابراہیم البلیاویؒ اور مولانا محمد طیب صاحبؒ جیسے ارکان و اساطین ائمہ اجلہ بدر الہدیٰ (بدر ہائے ہدایت) اور مصابیح دجیٰ (شمعہائے ظلمت) کے زیر سایہ ہمیشہ پھلتا پھولتا قائم رکھے اور ان بزرگوں کے نفع بخش اوقات اور انفاس طاہرہ میں برکت عطا فرمائے۔

ذمہ داران مدرسہ نے میرے ساتھ مزید اکرام و احسان یہ کیا کہ احقر کو اپنا خصوصی مہمان بنایا اس طرح بسہولت علمائے اکابر سے علمی استفادے کا موقع ملا، **فللّٰہ الحمد** نیز وہ چیز جس کے لئے آج ہم سب اللہ تعالیٰ کے مرہونِ منت اور احسان مند ہیں وہ یہ ادارہ ہے جو مع اساتذہ و تلامذہ کے دین کا گھنا سایہ دار درخت، علم و تقویٰ کا مرکز اور جسم اسلامی کی بقاء کا ضامن وہ پھیپھڑا ہے جس میں حیات روحانی کے آثار رواں دواں ہیں، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اس ادارے کی بقا و ترقی اور اس کے علماء کو طول حیات سے زیادہ سے زیادہ مستفیض فرمائے ''**و اللّٰہ یجیب ولا یخیب رجاء الراجین فضلاً منہ و کرماً**''

علم وتقویٰ کے اساطین سے مالا مال اس عظیم الشان ادارے کے علماء عظام کی خدمات جلیلہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں بلکہ اگر ذرا جرأت کردوں تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارا ایک واجبی حق ہے جس کا مطالبہ کررہا ہوں، وہ یہ ہے کہ ان علمائے کرام کا فریضہ ہے کہ اپنے متفردانہ عقول کے نتائج فکر اور بیش بہا علمی فیوض وتحقیقات کو عربی زبان کا جامہ پہنا کر عالم اسلام کے دوسرے علماء کے لئے استفادہ کا موقع فراہم کریں یہ فریضہ ان حضرات پر اس لئے عائد ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص ہندوستان کے علمائے محققین کی کوئی تصنیف پڑھتا ہے تو اس میں اس کو وہ نئی متفردانہ تحقیقات ملتی ہیں جن کا مدار علیہ گہرے علم اور وسیع مطالعے کے علاوہ تقویٰ وصلاح اور روحانیت ہوتے ہیں اور چونکہ ہندوستان کے علماء وشیوخ کرام نیکی وصلاح اور روحانیت اور استغراق فی العلم جیسی شرائط پر نہ صرف یہ کہ پورے اترتے ہیں بلکہ سلف صالحین کے صحیح وارث اور ان کے نمونے ہیں اس لئے ان کی کتابیں نئی اور کارآمد چیزوں سے خالی نہیں ہوتیں ''وذلک فضل اللہ یو تیہ من یشاءُ'' بلکہ ان حضرات کی بعض کتابیں تو وہ ہیں جن میں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو متقدمین علمائے اکابر، مفسرین ومحدثین اور حکماء کے یہاں بھی دستیاب نہیں ہوتیں، لیکن افسوس اور قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان نادر تالیفات میں سے اکثر بلکہ سب کی سب اردو زبان میں لکھی گئی ہیں، جو گو ہندوستان کی عام اسلامی زبان سہی لیکن عربی کو کثیر الاستعمال اور علوم اسلام کی خاص زبان ہونے کا جو شرف حاصل ہے کہ وہ اردو کو حاصل نہیں، لہذا یہ علوم اور بیش قیمت تحقیقات جو ہمارے برادران اسلام علمائے ہند کا خصوصی حصہ اور کارنامہ ہیں اگر اردو ہی کے قالب میں محبوس رکھی گئیں تو ہم عربی زبان بولنے والوں سے مخفی اور پوشیدہ رہ کر ہماری محرومی کا باعث رہیں گی، اس طرح نہ صرف ہمارے ساتھ ہی ناانصافی ہوگی بلکہ علم ودین کے حق کا بھی ایک بہت بڑا نقصان ہوگا، اس لئے فریضہ معرفت اور امانت علم کی ادائیگی کیلئے یہ بات اولین واجبات میں سے ہے کہ ان نفیس شاہکار اور عمدہ کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے تاکہ ان سے وہ آنکھیں روشنی حاصل کریں جو ایسی چیزوں کے لئے بیتاب، تشنہ اور مشتاق ہیں اور جیسا کہ میرا خیال ہے اس اہم ذمہ داری اور کٹھن فریضہ کی ادائیگی کا کام اسی ادارہ عامرہ کے افراد کرسکتے ہیں جو علمائے کرام اور طلبائے نجباء کا گہوارہ وسرچشمہ ہے۔

اس موقع پر جبکہ میں ذمہ داران ادارے کے مشفقانہ طرز عمل، نوازشات بزرگانہ اور طلبائے عزیز کے جذبات محبت واخوت کے لئے کلمات شکریہ تحریر میں لارہا ہوں اپنے مذکورہ بالا حق اور مطالبے کو دہرانے کی ایک بار پھر پر امید ہوکر جرأت کرنا ضروری سمجھتا ہوں اس لئے کہ اگر ان حضرات نے اس فریضے کی ادائیگی کی طرف

توجہ مبذول فرمائی تو اس طرح جہاں وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوں گے ساتھ ہی یہ دین وثقاوت کی ایک عظیم الشان خدمت اور قابل ذکر کارنامہ ہوگا، کیونکہ یہ علوم دنیا کے تمام مسلمانوں ہی کی ملک نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان مساوی طور پر ان سے استفادے کے مستحق ہیں چہ جائیکہ صرف ہندوستان ہی کے مسلمان ان کے اجارہ دار قرار پائیں، اس لئے ازبس ضروری ہے کہ اردو کتابوں کے عربی میں تراجم کئے جائیں تا کہ ان کی زیادہ سے زیادہ ترویج واشاعت ہو اور وسیع پیمانے پر ان سے استفادے کے مواقع فراہم کئے جاسکیں۔

مجھے یہ سن کر کسی حد تک اطمینان اور مسرت ہوئی کہ یہ اہم مسئلہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے زیر غور ہے اور وہ عنقریب اس اہم بار اور ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے قدم اٹھانے والی ہے، جو درحقیقت اس ادارے کے علماء کا اور بالخصوص طلباء کا واجبی فرض ہے، میں اس خوشخبری کے بعد تمام علمائے اکابر کا ان کے اس مبارک عزم اور اقدام پر تہ دل سے پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس کار عظیم میں اس کی خصوصی مدد ومعاونت ان کے شامل حال ہو تا کہ بسہولت وہ اس فریضے کو مرحلۂ تکمیل تک پہنچا سکیں، باری تعالیٰ کے لئے یہ کوئی دشوار امر نہیں ”**وما ذلک علی اللہ بعزیز**“ اور نہ ہی ان علمائے اماجد کے لئے ان کے پختہ عزائم کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی ایسا کٹھن اور دشوار گزار مرحلہ ہے جو ناقابل عبور ہو۔“

جنوبی افریقہ اور مصر کا سفر

۱۳۸۳ھ میں حکیم الاسلام صاحبؒ نے دو سفر فرمائے ایک سفر جنوبی افریقہ کا اور دوسرا سفر مصر کا تھا۔ یہ دونوں سفر مختلف حیثیتوں سے دارالعلوم کے لیے مفید ترین ثابت ہوئے۔ اسی دوران سفر ۱۹ رشوال ۱۳۸۳ھ کو عالمی مؤتمر اسلامی قاہرہ کی دعوت پر عالمی کانفرنس میں شرکت کی جس میں دنیائے اسلام کے ممتاز علماء کو دعوت دی گئی تھی۔ حکیم الاسلامؒ ہندوستانی علماء کے وفد کے سربراہ تھے۔ آپ نے ایک علمی مقالہ پڑھا جسے بے حد پسند کیا گیا اور عالم اسلام کے علماء بے حد متاثر ہوئے۔

عالمی مؤتمر اسلامی قاہرہ (مصر) اور حجاز مقدس سے واپسی پر حکیم الاسلامؒ نے دارالعلوم میں خطاب فرمایا، جس میں آپ نے موتمر کی تفصیلات اور اپنے موقر خطاب اور حجازِ مقدس حاضری کی تفصیلات کو بیان فرمایا۔

حج بیت اللہ

مؤتمر کے اختتام پر حج بیت اللہ کے لیے حجاز مقدس تشریف لے گئے۔ اولاً مدینہ منورہ میں قیام رہا۔ اس کے بعد حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ قیام مدینہ منورہ کے دوران جامعہ اسلامیہ مدینہ یونیورسٹی کی دعوت پر

جامعہ میں ایک تاریخی خطاب فرمایا! آپ کے یہ دونوں سفر نہایت مفید ثابت ہوئے، براعظم افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی دارالعلوم کے تعارف کا حلقہ وسیع ہوگیا۔ چونکہ قاہرہ کی عالمی کانفرنس میں تمام دنیائے اسلام کے نمائندے موجود تھے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ پورے عالم اسلام میں دارالعلوم متعارف ہوگیا، جسکا ذریعہ آپ کی ہی شخصیت بنی۔

سفر حج سے مراجعت پر ''مبارکبادِ حج'' کے عنوان سے ہندوستان کے مشہور شاعر علامہ انور صابریؒ نے یہ منظوم کلام آپ کی خدمت میں پیش کیا۔

نور چشمانِ اکابر اے امامِ علم دیں — اے حکیم الامتِ فخر امم کے جانشیں
صاحب نورِ بصیرت پاک دل، روشن ضمیر — دانشِ حاضر کی منزل میں نہیں تیرا نظیر
عارضِ ایماں کی خاطر وجہِ تابانی ہے تو — واقعہ یہ ہے کہ چراغِ بزم عرفانی ہے تو
صاف خواب دیدۂ اسلاف کی تعبیر ہے — تو علوم قاسم الخیرات کی تفسیر ہے
تیری تقریروں میں ملتا ہے حقیقت کا شعور — تو بزرگوں کا ہے بے شک جوہر مافی الصدور
تیرا فیضِ حکمت قرآں جہانگیرانہ ہے — سارا عالم تیری زلف عشق کا دیوانہ ہے
تیری ہستی پیکر تعمیل ارشادِ رسول — تیرے درس زیست کے قائل ہیں اربابِ عقول
آج کا ہر فلسفہ تیری نظر کی حد میں ہے — ارتقاء کے تازہ ذہن کامراں کی زد میں ہے
تو نے افریقہ کے صحراء کو کیا شادابِ علم — مصر کو بخشا خرد کا گوہر نایاب علم
جامعیت تیری ہر شعبے میں ہے مانی ہوئی — غایتِ ادراک کی صورت ہے پہچانی ہوئی
دین کی تبلیغ کا ہر اک قرینہ تجھ میں ہے — جذبِ احکامِ الٰہی کا مدینہ تجھ میں ہے
پیش آئیں دوسروں کو جب بھی فقہی مشکلات — تو نے سلجھائے جو تھے الجھے ہوئے دیں کے نکات
تیرا ''سالم'' باپ دادا کا امینِ راز ہے — کائنات علم کو اس کی سمجھ پرناز ہے
تیرے ''اسلم'' میں فراست کا مکمل بانکپن — تیرا ''اعظم'' وقت کی محفل میں شمعِ انجمن
حج بیت اللہ کا تازہ مبارک یہ شرف — رحمتیں لائیں فرشتے تیری جانب صف بہ صف
عرش پیما زندگی کا تیری یوں اقبال ہو — حاضری باب رسالت تک تری ہر سال ہو

کاش اک ایسا سفر تیری رفاقت میں ڈھلے
نعت انورؔ صابری ہر گام پر پڑھتا چلے

عربی مجلّہ دعوۃ الحق کا اجراء

۸۵/۱۳۸۴ھ میں حضرت مہتمم صاحبؒ کی نگرانی میں ایک رسالہ عربی ''دعوۃ الحق'' کے نام سے دارالعلوم کی طرف سے جاری کیا گیا اسی وجہ سے اتر پردیش کے گورنر کی دارالعلوم میں آمد ہوئی اور اسی دوران حکومت ہند نے ایک کتابچہ ''ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی ادارے'' کے عنوان سے شائع کیا۔ جس میں دارالعلوم دیوبند کا تعارف بڑے اچھے الفاظ میں کیا گیا تھا اور اس میں دارالعلوم کو دنیا کی بہترین تعلیمی یونیورسٹی قرار دیا گیا تھا۔

کتب خانہ کی توسیع

۸۷/۱۳۸۶ھ میں دارالعلوم کی عمارتوں میں کتب خانہ کی توسیع کے لیے ایک جدید ہال اور دو کمروں کا اضافہ ہوا۔ یہ ہال عربی زبان کی کتابوں کے لیے مخصوص کیا گیا یہ بھی آپ ہی کی سعی سے ہوا۔

مسجد چھتہ کی تعمیر جدید اور عرب زائرین کی دارالعلوم آمد

۸۹/۱۳۸۸ھ میں عرب ممالک کے زائرین دارالعلوم تشریف لائے جن میں مراکش، الجزائر اور اُردن وغیرہ کے حضرات شامل تھے دارالعلوم کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ اسی سال مسجد چھتہ کی شمالی جانب ایک حجرہ قدیم تھا جس میں حضرت نانوتویؒ اور دیگر اکابر قیام فرمایا کرتے تھے۔ وہ بہت بوسیدہ ہو چکا تھا۔ اس کو بھی حضرت مہتمم صاحبؒ کے حکم سے از سرِ نو تعمیر کیا گیا اور اس تاریخی جگہ کو محفوظ کیا۔

نصاب میں کچھ تبدیلیاں

۱۳۹۰ھ میں دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں اور دارالعلوم کا کچھ بیرون ملک سے رابطہ قائم ہوا۔ سعودی عرب، مصر، کویت، شام، لبنان، لیبیا، عراق، اردن، سوڈان، مراکش، تیونس، یمن، ترکی، نائیجیریا، الجزائر، ایران، انڈونیشیا، تاشقند، حبش، امریکہ، جرمن، سیلون، ڈنمارک اور افریقہ وغیرہ حکیم الاسلام صاحبؒ نے مختلف اوقات میں ان ممالک سے روابط قائم کیے اور مختلف اوقات میں ان تمام ملکوں کے دورے بھی کیے۔ دارالعلوم کا تعارف ان ممالک میں کرایا۔ تبلیغی اجتماعات کیے اور دارالعلوم کا عربی ترجمان رسالہ ''دعوۃ الحق'' کے ذریعے دارالعلوم کی علمی و دینی خدمات کا تعارف کرایا۔

کچھ جدید عمارتوں کا اضافہ

۱۳۹۱ھ میں جب دارالعلوم کی کچھ جدید عمارتوں میں اضافہ کیا گیا اور دارالشفاء جامعہ طبیہ کی نامکمل

عمارتوں کو مکمل کیا گیا تو طلباء کے لیے دارالاقامہ کا بڑا حصہ افریقی بلڈنگ کے نام سے تیار ہوا جس میں ۱۱/وسیع کمرے تیار ہوئے۔ اسی سال آپ نے یورپ، انگلستان، فرانس اور مغربی جرمنی کا سفر اختیار فرمایا اور ان ممالک کے متعدد شہروں میں اسلام کی حقانیت پر اثر انگیز تقریریں فرمائیں، جن سے وہاں کے باشندے نہایت متاثر ہوئے اور حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

ان ممالک کے سفر کے بعد آپ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور عمرہ کے بعد روضۂ اقدس کی زیارت کیلیے مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور پھر کویت میں مختصر قیام کے بعد ہندوستان واپس تشریف لائے۔ اس دورے کی روئداد اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی اور دارالعلوم کے رسالہ ماہنامہ ''دارالعلوم'' میں بھی کئی قسطوں میں تفصیلات شائع ہوتی رہیں۔

حافظ محمد ابراہیم وزیر مواصلات اتر پردیش کی آمد

۱۳۵۷ھ دارالعلوم کو ریلوے اسٹیشن سے لانے کے لئے عرصے سے ایک مستقل سڑک کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی ۱۹۳۷ء میں جبکہ ہندوستان کے سات صوبوں میں قومی حکومت قائم ہو گئی تھی یوپی کی صوبائی حکومت کو اس طرف توجہ دلائی گئی، اس سلسلے میں وزیر رسل ورسائل حافظ محمد ابراہیم صاحب کو دعوت دی گئی تاکہ وہ بچشم خود دارالعلوم کی اس اہم ضرورت کا معائنہ فرمالیں، چناں چہ ۳۱/مئی ۱۹۳۸ء کو موصوف دیوبند تشریف لائے، اسٹیشن پر اکابر دارالعلوم اور طلباء کے علاوہ عمائدین شہر و ضلع سہارنپور، حکام محکمہ نہر اور ممبران میونسپل بورڈ معزز مہمان کے استقبال کے لئے موجود تھے، حافظ صاحب کا شاندار جلوس اسٹیشن سے روانہ ہو کر شہر کے آراستہ بازاروں سے گزرتا ہوا ۹/بجے دارالعلوم میں پہنچا۔

دارالعلوم کی تاریخ میں ارکان دارالعلوم کے لئے ایسے مسرت انگیز شاندار استقبال کا یہ پہلا موقع تھا، یہاں یہ بتلانا ضروری نہیں کہ یہ جوش وخروش اور مسرت دارالعلوم کی دیرینہ حرّیت طلبی کا نتیجہ تھا، اس کی عمر میں اراکین حکومت کے قومی ہونے کا یہ پہلا اتفاق تھا، دارالعلوم نے عرصہ ہوا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر کا سماں دارالعلوم کی آنکھوں کے سامنے تھا اس لئے جس قدر بھی جوش ومست کا اظہار ہوتا وہ کم تھا، خیر مقدم کے جلسے میں سپاس نامہ اور جذبات تشکر سے لبریز قصائد پڑھے گئے، اکابر دارالعلوم نے معزز مہمان کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا، سپاس نامہ میں دارالعلوم کے نام سے ایک سڑک تعمیر کئے جانے پر توجہ دلائی گئی تھی، جو اسٹیشن دیوبند سے سیدھی دارالعلوم تک پہنچتی ہو، آخر میں حافظ صاحب نے جوابی تقریر فرمائی جس کے ایک ایک لفظ سے والہانہ خلوص وعقیدت اور محبت مترشح ہوتی تھی، موصوف نے فرمایا کہ:

''میں جب سے وزارت پر مامور ہوا ہوں بہت سے مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا اور بہت سی بستیوں میں سپاس نامے بھی پیش کیئے گئے، ان میں اگر کوئی سپاس نامہ میرے لئے باعثِ فخر ہو سکتا ہے تو میں کہوں گا کہ وہ آج کا سپاس نامہ ہے جو دارالعلوم میں دیا گیا، یہ سپاس نامہ ایسی قابل قدر یادگار ہو گا جس کا بھول جانا مشکل ہے، میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے میں عزت افزائی کے احساس کو بیان کرسکوں، علمائے کرام کی بدولت ہندوستان میں اسلام کا نام باقی ہے اور اسکی صحیح تعلیم باقی ہے، وہ جماعت جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کو الحاد و دہریت کے حملوں سے بچایا، مسلمانوں میں ان ہی علماء کی بدولت برطانیہ کی حکومت پر اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا، ایسے علماء کی جماعت کسی کو اپنی طرف سے عزت دے تو میں سمجھتا ہوں کہ ایک مسلمان کے لئے اس سے زیادہ خوش نصیبی نہیں ہوسکتی، یہ آپ کی عزت افزائی ایسی چیز ہے کہ میرے نزدیک اس پر ایک وزارت کیا ہزاروں وزاتیں قربان کی جاسکتی ہیں، میں باوجود اس صوبہ کا وزیر ہو جانے کے اور باوجود آپ کے اس احترام کے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو طالب علم آپ کے مدرسہ میں چھوٹے سے چھوٹا ہے میں اس سے بھی اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتا ہوں اور اس کی خدمت کرنا میری سعادت ہے، مجھ سے جو کچھ بھی اس دارالعلوم کے لئے ہوسکتا ہے چاہے میں گورنمنٹ میں ہوں یا نہ ہوں اس کے انجام دینے کے لئے میں ہر وقت تیار ہوں۔

سڑک کے متعلق سپاس نامہ میں ذکر کیا گیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی ایسی خدمت نہیں جس کے انجام دینے کو کوئی خدمت سمجھا جائے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ سڑک بن جانی چاہیئے، موجودہ حکومت اپنے حدود کے اندر رہ کر جو خدمت انجام دے سکتی ہے اس کے لئے ہر وقت تیار ہے، یہاں کے مدرسین اور طلباء کی خدمت کے لئے میں موجودہ حکومت کی طرف سے یقین دلاتا ہوں۔''

عالم عرب کے وفود

١٣٩٣/٩٤ھ میں سعودی عرب سے دو وفد دارالعلوم میں آئے۔ ایک وفد جو رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی جانب سے دنیا کے مختلف ملکوں کا دورہ کر رہا تھا وسط سال میں آیا۔ سید ابراہیم ثقاف رئیس الوفد تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد دوسرا وفد آیا۔ اس میں وزارتِ معارف کے ڈائریکٹر اور ادارہ مباحث علمیہ کے نمائندے شامل تھے۔ ان حضرات نے دارالعلوم کو دیکھنے کے بعد اسے علم کا روشن مینار، عرفان و معرفت کا مرجع اور طالبین ہدایت کی پناہ گاہ قرار دیا اور حکیم الاسلامؒ کی خدمات کا اعتراف کیا۔

دار القضاء کا قیام

اسی سال حضرت حکیم الاسلام صاحبؒ کی جد و جہد سے دار العلوم میں دار القضاء کا قیام عمل میں آیا جس میں مسلم پرسنل لاء اور قوانین شریعت کے تحفظ اور بقا کے لیے عملی طور پر محکمہ قضا قائم کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ملک میں متعدد مقامات پر دار القضاء قائم کیے گئے اور نکاح و طلاق وغیرہ عائلی مسائل کا شرعی طور پر فیصلہ ہونے لگا۔ اسی سال آپ حج کے لیے تشریف لے گئے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں دینی مدارس کے اجتماعات سے خطاب فرمایا۔

افریقہ حجاز اور یورپ کا سفر

۱۳۹۵ھ میں آپ نے افریقہ و حجاز اور یورپ کا سفر اختیار فرمایا۔ دوران سفر عمرہ ادا کیا اور مکہ مکرمہ میں بہت سی جگہوں پر خطاب فرمایا۔ اس کے بعد پیرس (فرانس) ہوتے ہوئے مسلمانانِ انگلستان کی دعوت پر لندن تشریف لے گئے۔ وہاں کے متعدد شہروں کے اجتماعات سے خطاب فرمایا اور انگلستان میں مقیم بہت سے مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کا موقع ملا۔

شیخ الازہر و مفتی اعظم مصر کی آمد

اسی سال شیخ الازہر مصر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود، وکیل الازہر شیخ عبد الرحمٰن بیطار، مفتی اعظم مصر محمد خاطر اور سابق شیخ الازہر محمد الفحام دار العلوم دیوبند تشریف لائے اور دار العلوم سے متاثر ہو کر ان حضرات نے فرمایا کہ:

''ہم یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مہتمم دار العلوم کے زہد و تقویٰ، رفعت علم اور اخلاص و للّٰہیت ہی کے یہ آثار ہیں جو اس ادارے میں دیکھے جا رہے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ فضلاء دار العلوم تمام شہروں اور ملکوں میں کامیابی کے ساتھ دینی کاموں میں مشغول ہیں۔''

صدر جمہوریہ ہند کی آمد

۱۳۷۶ھ میں دار العلوم میں صدر ڈاکٹر راجندر پرساد کی آمد ہوئی۔

صدر جمہوریہ ۱۴/ ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ ۱۳/ جولائی ۱۹۵۷ء کو دار العلوم میں وارد ہوئے، یہ کسی سربراہ مملکت کے دار العلوم میں آنے کا پہلا موقع تھا، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دار العلوم اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کے

علاوہ مؤتمر اسلامی کے نمائندے شیخ عبدالمنعم النمر اور شیخ عبدالعال العقبادی وغیرہ حضرات نے ریلوے اسٹیشن پر صدر جمہوریہ ہند کا خیر مقدم کیا، صدر جمہوریہ کی کار جب دارالعلوم کے لئے روانہ ہوئی تو دیوبند اور قرب و جوار کے ہزاروں آدمی سڑک پر دورویہ صدر کے استقبال کے لئے کھڑے ہوئے تھے، دارالعلوم کی تاریخ میں اس نوعیت کا استقبال اس سے قبل دیکھنے میں نہیں آیا، پورا راستہ رنگ برنگ جھنڈیوں سے آراستہ تھا، اسٹیشن کے قریب سب سے پہلے دروازے پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی،

''دیدۂ ودل فرش راہ''

احاطہ دارالعلوم کے باہر طلبائے دارالعلوم کی دورویہ قطاریں کھڑی ہوئی تھیں، اس موقع پر ہندو بیرون ہند کے طلباء کے علیحدہ علیحدہ گروپ تھے، طلباء دارالعلوم ہندوستان کی تقریباً سبھی ریاستوں کی نمائندگی کررہے تھے۔

صدر جمہوریہ نے دارالعلوم کا تفصیلی معائنہ فرمایا، عمارتیں دیکھیں، کتب خانہ کے نوادر اور مخطوطات ملاحظہ فرمائے، آزادیٔ وطن کی راہ میں علمائے دیوبند کی قربانیوں کی داستان سنی، اساتذہ اور طلباء کا سادہ طرز معاشرت دیکھا، قرآن مجید کے ایک فارسی ترجمے کو بڑی توجہ سے ملاحظہ فرمایا اور اس میں سے چند آیتوں کا ترجمہ پڑھوا کر سنا، معائنہ دارالعلوم کے بعد خیر مقدم کے ایک عظیم الشان جلسہ میں حضرت مہتمم صاحبؒ نے سپاس نامہ پیش کیا، صدر نے اس کے جواب میں دارالعلوم کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''دارالعلوم کے بزرگوں نے صرف اس ملک میں رہنے والوں ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ آپ نے اپنی خدمات سے اتنی شہرت حاصل کرلی ہے کہ غیر ملک کے طالب علم بھی آپ کے یہاں آتے ہیں اور یہاں سے تعلیم پاکر اور جو کچھ یہاں انھوں نے سیکھا ہے اپنے ملکوں میں واپس جاکر اس کی اشاعت کرتے ہیں، یہ بات اس ملک کے سبھی باشندوں کے لئے قابل فخر ہے، میں امید کرتا ہوں کہ آپ جس خلوص، نیک نیتی اور جس عزم وارادے کے ساتھ اس کام کو آج تک کرتے آئے ہیں آئندہ بھی اس کو جاری رکھیں گے، مجھے امید ہے کہ یہ دارالعلوم دن بدن ترقی کرتا جائے گا اور صرف اس ملک ہی کی نہیں بلکہ غیروں کی بھی خدمت کرتا رہے گا۔

سہ پہر میں عصرانے کے موقع پر صدر جمہوریۂ ہند نے اراکین دارالعلوم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا:

''دارالعلوم کے بزرگ علم کو علم کے لئے پڑھتے پڑھاتے رہے ہیں، ایسے لوگ پہلے بھی ہوئے ہیں، مگر کم جنھوں نے علم کو محض علم کی خدمت کے لئے سیکھا اور سکھایا، ان لوگوں کی عزت بادشاہوں سے بھی زیادہ ہوتی تھی، آج دارالعلوم کے بزرگ اسی طرز پر چل رہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف دارالعلوم یا

مسلمانوں کی خدمت نہیں بلکہ پورے ملک اور دنیا کی خدمت ہے۔

آج دنیا میں مادیت کے فروغ سے بے چینی پھیلی ہوئی ہے، دلوں کا اطمینان اور چین مفقود ہے، اس کا صحیح علاج روحانیت ہے، میں دیکھتا ہوں کہ سکون اور اطمینان کا وہ سامان یہاں کے بزرگ دنیا کے لئے مہیا فرمارہے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اگر خدا کو اس دنیا کو رکھنا منظور ہے تو دنیا کو بالآخر اسی لائن پر آنا ہے اس لئے دارالعلوم کے بزرگ جو اہم علمی خدمت انجام دے رہے ہیں وہ آگے بڑھے گی اور کام اسی طرح جاری رہے گا میں دارالعلوم میں آکر بہت زیادہ مسرور ہوا اور یہاں سے کچھ لیکر جارہا ہوں، میں تمام ذمہ داران دارالعلوم کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔‘‘

حضرت مہتمم صاحبؒ نے صدر جمہوریہ ہند کی نسبت اپنے تاثرات کا حسب ذیل الفاظ میں اظہار فرمایا:

’’صدر جمہوریۂ ہند کو میں نے نہ صرف ایک عظیم عہدے کا پروقار مسند نشین دیکھا، بلکہ انھیں ایک نہایت ہی صوفی منش اور بزرگانہ انداز کا مشفق اور پابند مذہب و اخلاق انسان بھی پایا۔‘‘

بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں شرکت

حضرت حکیم الاسلامؒ اسی سال پاکستان کی بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں شرکت کے لیے پاکستان تشریف لے گئے۔ جہاں دنیائے اسلام کی نامور شخصیتوں نے کانفرنس میں شرکت کی۔ حضرت مہتمم صاحبؒ نے سیرت کے موضوع پر ایک زبردست تقریر فرمائی۔ جس سے عوام و حکام بیحد متاثر ہوئے۔ سیرت کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں سیرت کمیٹی کی طرف سے حضرت مہتمم صاحبؒ کو چاندی کے منقش خول میں جو ایک مخملی بکس کے اندر تھا۔ ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا۔ جس میں دارالعلوم دیوبند کی اور حکیم الاسلامؒ کی دینی علمی اور اصلاحی خدمات کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے وضاحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی تھی کہ ’’یوں تو تمام پاکستان ہی مہمانوں کا شکر گذار ہے لیکن اہل پاکستان کو سب سے زیادہ دو شخصیتوں نے متاثر کیا ہے۔ ایک حرم مکہ کے مہمان شیخ عبداللہ بن السبیل اور دوسرے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب شیخ الجامعہ دارالعلوم دیوبند نے۔‘‘

اس کے بعد حضرت مہتمم صاحبؒ نے ساٹھ ستر ہزار کے عظیم اجتماع سے خطاب فرمایا۔ کانفرنس کے بعد حکومت کی طرف سے آپ کے اعزاز میں ایک پر تکلف دعوت دی گئی۔ اس سفر میں کراچی، لاہور، راولپنڈی اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں عظیم اجتماعات سے بھی خطاب فرمایا۔

سفر پاکستان

مولانا اکبر شاہ بخاریؒ حکیم الاسلامؒ کے سفر پاکستان اور خطبات و دینی مصروفیات کے بارے میں تفصیل سے لکھتے ہیں:

''حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ کے لیے پاکستان کوئی اجنبی اور نیا ملک نہیں تھا۔ انھوں نے تو اس کے لیے قربانیاں دی ہیں اور وہ اپنے شیخ و مربی حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ اپنے استاذ مکرم شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور ہم عصر علماء کرام حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسریؒ، حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ، حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ، حضرت مولانا اطہر علی صاحب سلہٹیؒ اور دیگر حضرات کی طرح قیام پاکستان کے لیے کوشاں رہے۔ تحریک پاکستان میں اپنے شیخ اور استاذ کے حکم پر سرگرم حصہ لیتے رہے۔ انہیں پاکستان سے محبت تھی۔ ان کے عزیز و اقارب یہاں کثرت سے موجود ہیں یہ ان کا اپنا گھر تھا وہ یہاں بارہا تشریف لائے اور پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کراچی، لاہور، راولپنڈی، پشاور، ملتان اور فیصل آباد کے دینی مدارس میں عوام و خواص کو اپنے سحر انگیز خطابات سے محظوظ فرماتے رہے۔ ہزاروں افراد یہاں آپ کے فیضِ علمی و روحانی سے مالا مال ہوئے۔

جب بھی آپ پاکستان تشریف لاتے تو خاص طور پر اپنے رفیقِ خاص مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے ہاں دار العلوم کراچی حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ کے مدرسہ جامعہ اشرفیہ لاہور اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ کے مدرسہ خیر المدارس ملتان ضرور تشریف لے جاتے۔

فرمایا کرتے تھے کہ: ''پاکستان میں مولانا مفتی محمد حسنؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا خیر محمد صاحبؒ اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ صاحب کی طرف نظریں اٹھتی تھیں اب یہ سب حضرات چل بسے۔ اب یہاں آنے اور رہنے کا مزہ نہ رہا''۔

ان حضرات سے آپ کے گہرے روابط تھے اور یہ حضرات آپس میں ایک دوسرے کا بے حد احترام فرماتے تھے۔ ایک بار لاہور کے قیام میں فرمایا کہ:

''ہمارا مدرسوں میں جن سے زیادہ ملنا جلنا تھا اور جن کی کشش ہمیں یہاں لے آتی تھی وہ نہ رہے ان میں ایک تو مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ تھے جن کا حال ہی میں انتقال ہوگیا۔ دوسرے مولانا بدر عالمؒ

تھے۔جنھوں نے پاکستان سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ کو اپنا گھر بنایا اور رشد و ہدایت کا سلسلہ دور دور تک پھیلایا۔تیسرے مفتی محمد شفیع صاحبؒ ہیں جن کے ساتھ ہر معاملے میں قریبی تعلق رہا۔اٹھنا بیٹھنا۔کھانا پینا، لکھنا پڑھنا سفر وحضر سب میں ساتھ رہا۔بہر حال ان حضرات سے حضرت حکیم الاسلامؒ کے گہرے تعلقات رہے۔پاکستان میں جب بھی تشریف لاتے انہی حضرات کے یہاں قیام فرماتے تھے۔

ذیل میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے پاکستان میں آخری چند دوروں کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔جن میں آپ نے مختلف بڑے شہروں کے دینی مدارس کے اجتماعات اور چند اہم کانفرنسوں اور جلسوں سے خطاب فرمایا، یہاں انہی چند اہم خطابات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

جناب سجاد میر حضرت حکیم الاسلامؒ کی ۱۹۷۵ء میں لاہور میں آمد کا مختصراً آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں۔لکھتے ہیں کہ:

''پاک سرزمین میں ایک طیب ہستی کی آمد آمد کا شہرہ تھا۔دارالعلوم دیوبند برصغیر میں علوم اسلامی کی نامور درسگاہ ہے۔کوئی گذشتہ نصف صدی سے اس درسگاہ کا اہتمام جس خوش بخت انسان کے سپرد ہے وہ یہی حکیم الاسلام مولانا محمد طیب قاسمی ہی تو ہیں۔جو جنگ کے بعد پہلی بار پاکستان تشریف لا رہے ہیں۔خاندان نانوتہ کا یہ چشم و چراغ اپنے جد امجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھنے کے لیے اس پیرانہ سالی میں بھی جوانوں کی طرح سرگرم عمل ہے۔یہ ۱۳۴۷ھ کا واقعہ ہے کہ دارالعلوم کے اہتمام کی ذمہ داری حضرت حکیم الاسلام کے سپرد کی گئی۔اس سے پہلے ان کے والد مولانا محمد احمد صاحبؒ چالیس برس تک اس فریضے کو انجام دیتے رہے۔وہ دارالعلوم کے پانچویں مہتمم تھے۔ان کی وفات کے بعد کوئی ۱۱/ماہ تک مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ اہتمام کے ذمہ دار رہے اور پھر جو یہ ذمہ داری حضرت حکیم الاسلام کے سپرد ہوئی تو آج تک وہ اس کٹھن مرحلے سے گذر رہے ہیں۔

یہ نصف صدی کا واقعہ ہے کوئی دو چار دن کی بات نہیں۔اس نصف صدی میں ہزاروں طالبان علم اس شمع علم سے اپنی مشعلیں جلا جلا کر دنیا کے اندھیروں میں دور دور تک پھیل گئے۔پاکستان میں بھی اسی مردِ جلیل کا فیض خیبر سے کیماڑی تک پھیلا ہے۔ان کی آمد ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کے لیے ایک خوشگوار حیرت تھی۔حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب پاکستان آرہے ہیں مگر کیسے؟ فاصلوں کی فصیلیں تو خیر سدِ راہ نہیں مگر سرحدوں پر ضابطوں کی جو حدیں قائم ہیں اور انہیں پھلانگنا اس عہد میں آسان نہیں رہا۔پاکستان اور بھارت کے درمیان سفارتی تعلقات تک نہیں ہیں۔تاہم خدا نے وسیلہ پیدا کیا اور حکیم الاسلام

مولانا محمد طیب صاحب کئی سال بعد ایک بار پھر اہلِ پاکستان کے درمیان موجود تھے۔ یہاں لاہور میں ان کا قیام تین دن تک رہا۔ اس دوران ایک درس قرآن دینے کے علاوہ حضرت حکیم الاسلام نے دو اجتماعات سے بھی خطاب کیا۔ ایک جامعہ اشرفیہ اور دوسرا دار العلوم الاسلامیہ کی رسم دستار بندی کی تقریب تھی۔ ہمیں بھی ان اجتماعات میں ان کی باتیں سننے، ان سے الگ باتیں کرنے اور انہیں دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ نہ کبر ونخوت، سراپا انکسار، دھیرے دھیرے رواں رواں جب یہ شخص علم کے گہرے سمندروں سے پایاب گذرتا ہے تو لہروں کا سکوت دیدنی ہوتا ہے۔ کتنے خوبصورت، کتنے نستعلیق ہیں یہ لوگ جن کی باتوں سے ملی ہے سینکڑوں کو زندگی اور یہ سینکڑوں لوگ اس روز جمعۃ المبارک کی نماز کے لیے جامعہ اشرفیہ کی مسجد کا رخ کر رہے تھے۔

شہر کی دیواروں پر پوسٹر اور فضاؤں میں لاؤڈ سپیکر کی صدائیں یہ اعلان کر رہی تھیں کہ جمعہ کے فوراً بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب جامعہ کے فارغ التحصیل طلباء کے جلسۂ تقسیم اسناد سے خطاب فرمائیں گے۔ اس اجتماع میں جہاں دور دراز سے خلقت کھنچی چلی آتی تھی وہاں مسلک دیوبند کے جیّد اور نامور علماء بھی موجود تھے۔ حضرت حکیم الاسلام نے خطاب شروع کیا:

''میں آپ سے چند کلمات مختصر وقت میں گذارش کرونگا۔ مختصر اس لیے کہ ضعیف وعلیل ہوں اور بیان طویل ہوتا نہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بچپن کی بات ہے ہمارے استاذ اکبر علامہ انور شاہ کشمیریؒ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے ملنے تھانہ بھون جایا کرتے تھے۔ میں بھی ہمراہ ہوتا مجھے یاد ہے حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے کہ شاہ صاحب کے آنے سے میرے قلب پر ان کی عظمت کا بوجھ پڑتا ہے۔ ذرا تصور کیجئے کہ اتنا بڑا عارف کامل یہ بات کہہ رہا ہے اور اس وقت تو یہاں اتنے علماء موجود ہیں۔ اندازہ کیجئے مجھ ناتواں کے دل پر کس قدر بوجھ پڑ رہا ہوگا۔ سو کچھ ضعف اور علالت اور کچھ علماء کی موجودگی میں کلام کو مختصر کروں گا۔

مگر پھر جو بات چلی تو اس وقت تک جاری رہی جب مؤذن نمازِ عصر کے لیے پکار رہا تھا اور بادلوں سے پھوار بھی پڑ رہی تھی۔ اندر ٹیپ ریکارڈوں کی قطاریں پڑی تھیں اور باہر لاؤڈ سپیکروں کا نظام متعین تھا۔

بہر حال حضرت حکیم الاسلام نازک اور باریک نکتے سمجھا رہے تھے۔ وہ فارغ التحصیل ہونے والے طلباء کو نصیحت کر رہے تھے کہ وہ اپنی صورت اور وضع ایسی بنائیں جو دوسروں کے دلوں میں ان کے لیے محبت پیدا کرے۔

وہ کہہ رہے تھے ''ہم ذرا اپنے اردگرد نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے ہر شے مرکب پیدا کی ہے۔ اس کا

ایک حصہ خفی ہے جسے روح کہتے ہیں اور دوسرا جلی ہے جسے جسم کہتے ہیں۔ جسم محض کی بات کریں تو اس کا انجام تو گلنا سڑنا ہے اور روح بغیر جسم کے نمایاں نہیں ہوسکتی۔ یوں سمجھئے کہ جب بھی کوئی غیبی حقیقت ظاہر ہوگی۔ تو اس کا کوئی نہ کوئی پیرایہ کوئی نہ کوئی صورت ہوگی۔ جیسے گلاب کی خوشبو پتی اور پھول میں نمایاں ہوتی ہے۔ ذائقہ بغیر کسی شکل کے ظاہر نہیں ہوتا۔ اللہ ہر صورت کو مناسب حقیقت اور ہر حقیقت کو مناسب صورت دیتا ہے۔''

ادھر حضرت حکیم الاسلام کی تقریر جاری تھی۔ اُدھر ہمارے فوٹو گرافر محفوظ شاہد صاحب اس تاک میں تھے کہ نظریں بچا کر تصویریں اتار لوں، فلیش گن کی لائٹ چمکی اور مائک سے حضرت حکیم الاسلام کی ملتجانہ آواز سنائی دی۔

''کیوں بھائی! تصویریں بنا کر ہمیں رسوا کرتے ہو۔''

مگر وہ خاصی رسوائی کا انتظام کر چکے تھے اور اس کے بعد کرتے رہے یہاں لاؤڈ سپیکروں نے خاصی خرابی پیدا کی۔ حضرت مہتمم صاحب کو اتوار کی صبح ایک دوسرے اجتماع سے بھی خطاب کرنا تھا۔ یہ اجتماع دارالعلوم اسلامیہ کا جلسہ تقسیم اسناد تھا۔ جہاں شہر کی ابتداء ہوتی ہے۔ وحدت روڈ اور ملتان روڈ آپس میں ملتی ہیں۔ وہیں دارالعلوم کی عمارت ہے۔ یہ دارالعلوم شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کے ایماء پر فنِ تجوید وقرأت کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ چناں چہ حضرت حکیم الاسلام نے دو گھنٹے سے بھی طویل خطاب میں قرآن کے موضوع پر گفتگو کی۔ اتنی دور افتادہ جگہ تھی مگر یہاں بھی دور دور سے لوگ کافی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔

یہ دورہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے جنوری ۱۹۷۵ء میں فرمایا۔ اسی دورۂ پاکستان میں آپ نے اپنے رفیقِ خاص حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کی وفات کے سلسلے میں مولانا کاندھلویؒ کے صاحب زادگان سے تعزیت کی۔ جوان کے دورہ سے چند ماہ قبل لاہور میں فوت ہوگئے تھے۔ اسی طرح حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کی رحلت پر بھی آپ نے تعزیت کی۔ اسی دوران ۱۹۷۵ء میں کراچی بھی اپنے قدیم رفیق مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحبؒ سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ اس موقع پر آپؒ نے دارالعلوم کے اساتذہ اور طلباء سے ''علم اور زیارت علم'' کے موضوع پر ایک اہم خطاب فرمایا جو علم و معرفت کا مرقع اور حکمتوں کا گنجینہ تھا۔ ایک گھنٹہ کے اس خطاب نے سامعین کو نہال کر دیا۔ اس خطاب کی رپورٹ اور جامعہ اشرفیہ لاہور کی رپورٹ ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی اور ''ترجمانِ اسلام'' لاہور میں مفصل شائع ہوئی ہیں۔ بعد میں یہ اہم تقریریں ''خطبات حکیم الاسلام'' اور ''اخلاص فی الدین'' نامی کتابوں میں

بھی من وعن شائع کردی گئی ہیں۔

مارچ ۱۹۷۶ء میں حکومت پاکستان کی دعوت پر پھر پاکستان تشریف لائے۔ حکومت پاکستان نے ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس کے انعقاد کا پروگرام بنایا تھا اور اس میں دنیائے اسلام کی نامور علمی شخصیتوں کو دعوت دی گئی تھی۔ ہندوستان سے اس پروگرام میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ اور مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی پاکستان تشریف لائے۔ پاسپورٹ وغیرہ کے مراحل میں تاخیر کی وجہ سے حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ وزیراعظم پاکستان کی طرف سے دئے گئے استقبالیہ اور سیرت کانفرنس کے اختتامی اجلاس ہی میں شریک ہو سکے۔ جب کہ کانفرنس کا افتتاح حضرت حکیم الاسلامؒ ہی کے عظیم الشان خطاب سے ہونا تھا۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے سیرت کانفرنس کے اختتامی اجلاس سے خطاب فرمایا اور آپ نے اپنے خطاب میں ارشاد فرمایا:

''پاکستان نے جو یہ بین الاقوامی سیرت کانفرنس منعقد کی ہے میں پاکستان کو توجہ دلاتا ہوں کہ اس بین المللکی کانفرنس کے پیشِ نظر اتحاد باہمی کے جو مبارک اور خوش آئند اثرات ونتائج ہیں۔ ان میں اس بات کو ضرور ملحوظ رکھا جائے کہ پڑوسی ممالک کا زیادہ حق ہے۔ کہ ان کو اتحاد کے جذبہ سے پاکستان زیادہ سے زیادہ اپنے سے قریب کرے اور ان پڑوسی ممالک میں اس کا سب سے زیادہ حقدار ہندوستان ہے۔''

حضرتؒ نے اپنی تقریر کے دوران یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ''پاکستان نے عالمی اتحاد کے سلسلے میں دو عظیم الشان اقدامات کیے ہیں۔ ایک سربراہ کانفرنس اور دوسری سیرت کانفرنس جو عالمی اتحاد کا موجب ہوگی۔''

۲۰/مارچ ۱۹۷۶ء کو کراچی میں منعقد کیے گئے سیرت کانفرنس کے استقبالیہ میں جو شہر کراچی کی طرف سے دیا گیا تھا۔ انتظام کرنے والی سیرت کمیٹی نے حضرت حکیم الاسلامؒ سے درخواست کی کہ وہ مہمانوں کا شکریہ ادا کریں۔ حضرت نے کلمات ترحیب وتشکر پیش کرتے ہوئے یہ دلچسپ بات ارشاد فرمائی کہ اس کانفرنس کے مہمان خصوصی عرب ممالک کی مؤقر شخصیتیں ہیں۔ جن کی مہمانی کا شرف عجمیوں کو حاصل ہے اور عجم ہونے کے رشتہ سے پاکستان اور ہندوستان دونوں برابر ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت میں مہمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک میزبان کی حیثیت سے ہندو پاکستان دونوں کی طرف سے خیر مقدم کرتا ہوں اور عرب مہمانوں کے لیے سپاس گزار ہوں۔''

سیرت کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں سیرت کمیٹی کی طرف سے حکیم الاسلامؒ کو چاندی کے منقش خول میں جو ایک مخملی بکس کے اندر تھا ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ جس میں دارالعلوم دیوبند اور حضرت کی دینی

علمی اور اصلاحی خدمات کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے وضاحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ یوں تو تمام پاکستان ہی مہمانوں کا شکر گذار ہے۔ لیکن اہل پاکستان کو سب سے زیادہ دو شخصیتوں نے متاثر کیا ہے ایک حرم مکہ کے امام شیخ عبداللہ بن السبیل اور دوسرے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب شیخ الجامعہ دارالعلوم دیوبند۔

جب حضرت اقدس اس اختتامی اجلاس سے باہر تشریف لانے لگے تو عوام کے زبردست ہجوم نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ چونکہ عوام حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر سننے آئے تھے۔ جس سے اب تک محروم رہے ہیں۔ اس لیے ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہوسکتے۔ جب تک اس جلسہ میں حضرت ممدوح کی کوئی مفصل تقریر نہ ہو۔

چناں چہ قاری ظاہر قاسمی صاحب نے لوگوں کو اطمینان دلایا اور جلسہ دوبارہ جمایا گیا اور ساٹھ ستّر ہزار افراد کے ایک زبردست اجتماع میں حضرت کی تقریر ہوئی۔ جو ایک تاریخی اہمیت کی تقریر تھی۔

۲۵ / مارچ ۱۹۷۶ء کو حضرت حکیم الاسلامؒ لاہور روانہ ہوئے۔ لاہور میں ۲۷ / مارچ کو شب میں ایک عام شہری جلسہ ہوا۔ جس میں ایک اہم تقریر ہوئی اور ۲۸ / مارچ ماہنامہ الرشید و دارالعلوم دیوبند نمبر کے افتتاح کے لیے دوسرا جلسہ عام جامعہ اشرفیہ لاہور میں ادارہ الرشید کی طرف سے منعقد کیا گیا جس میں ابتدائی تقریر حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ کی ہوئی۔ جو دارالعلوم کی عظمت وشان پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد مولانا محمد مالک کاندھلوی صاحب شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور کی تقریر ہوئی اور آخری تقریر دارالعلوم دیوبند کے موضوع پر حضرت حکیم الاسلامؒ کی ہوئی جس میں یہ نمبر تجلید شدہ حضرت کو مع سپاسنامہ پیش کیا گیا اور پانچ نسخے دارالعلوم کے لیے دئے گئے۔ اس تقریب میں حضرت کی خدمت میں جو سپاسنامہ پیش کیا گیا اس کے چند جملے ملاحظہ فرمائیے:

یہ سپاس نامہ عبدالرشید ارشد نے پیش کیا:

عالی مقام حکیم الاسلام! علم وعمل کے تاجدار! آپ کے دارالعلوم دیوبند نے صرف علمی خدمات ہی سرانجام نہیں دیں بلکہ ایسے عملی انسان پیدا کیے جو اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں حضور اقدسؐ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھتے تھے اور جنھوں نے عملی طور پر سنن رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا احیاء کیا۔ جس کا اثر یہ نکلا کہ علی گڑھ، ندوۃ اور دیگر اداروں کے ممتاز افراد اور سربراہ ان کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے۔

معزز مہمان! آپ کے شیخ اور سرپرست دارالعلوم حضرت حکیم الامت تھانویؒ، آپ کے استاذِ مکرم شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند، آپ کے رفیقِ خاص دارالعلوم دیوبند کے صدر

مفتی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ شیخ الحدیث دارالعلوم اور آپ نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کا قائدانہ ساتھ دیا۔ جس سے پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ ورنہ شاید پاکستان کا قیام عمل میں نہ آتا۔"

اسی دوران اسلام آباد اور راولپنڈی وغیرہ شہروں میں بھی تشریف لے گئے۔ جہاں دوسرے کئی اجتماعات سے خطاب فرمایا۔ اسلام آباد میں جناب مولانا کوثر نیازی سابق وزیر مذہبی امور نے حضرت کو ایک پرتکلف دعوت دی اور راولپنڈی میں مولانا غلام صاحبؒ نے اپنے مدرسہ میں ایک عظیم الشان جلسے کا اہتمام کیا۔ جس میں حضرت نے خطاب فرمایا۔ بعد میں حضرت نے اہل شہر کی طرف سے دئے گئے ایک استقبالیہ میں شرکت کی اور مختصر خطاب کیا۔

اس کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ کراچی تشریف لے گئے۔ جہاں ۳۰/مارچ ۱۹۷۶ء کو دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ تقریبات کے سلسلہ میں مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی صدارت میں ان ہی کے دارالعلوم کراچی کورنگی میں پاکستان کے دینی مدارس کے سربراہان کا ایک اہم اجلاس ہو رہا تھا۔ آپ بھی اس میں شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں ملک بھر کے جیّد علماء تشریف لائے تھے۔ اس اہم اجلاس سے مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا عبید اللہ مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی وغیرہ حضرات نے خطاب کیا اور آخر میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کی تقریبات کی تیاری کے بارے میں مفصل روشنی ڈالی اور اس سلسلے میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جس کے کنوینر مولانا عبید اللہ صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور اور ناظم مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مہتمم دارالعلوم کراچی منتخب کیے گئے۔

۳۱/مارچ ۱۹۷۶ء کو آپ واپس دیوبند روانہ ہو گئے۔"

حضرت حکیم الاسلامؒ آخری عشرہ اپریل ۱۹۷۸ء میں دیوبند (انڈیا) سے کراچی تشریف لائے۔ مستقل قیام اپنے برادر زادہ قاری طاہر قاسمی صاحب کے ہاں تھا۔ سب سے پہلے اپنے رفیق قدیم مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی وفات پر تعزیت کے لیے حضرت مفتی اعظمؒ کے صاحبزادگان مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اور مولانا محمد تقی عثمانی کے ہاں دارالعلوم کورنگی تشریف لے گئے۔ جہاں دارالعلوم کراچی کے اساتذہ طلباء اور منتظمین حضرات سے حضرت مفتی اعظم کی رحلت پر تعزیتی خطاب فرمایا۔ جس میں حضرت مفتی اعظم کے اوصاف وکمالات دینی وعلمی خدمات اور اپنے قدیم تعلقات کا ذکر فرمایا۔

اس کے بعد ۲۹/اپریل بروز شنبہ حضرت حکیم الاسلامؒ صبح قریباً ۸/بجے جامعۃ العلوم الاسلامیہ نیوٹاؤن

کراچی گئے اور وہاں کے اساتذہ وطلباء سے حضرت علامہ محمد یوسف بنوریؒ کی وفات پر تعزیت کی اور اسی سلسلہ میں خطاب بابرکت سے بھی اساتذہ وطلباء کو مشرف فرمایا، ان دونوں حضرات مرحومین کی تعزیت کے سلسلے میں جو کلمات ارشاد فرمائے اس کے چند جملے ملاحظہ فرمائیے۔

ارشاد فرمایا کہ: ''ان حضرات کی رحلت کی دو حیثیتیں ہیں ایک تو نفس وصال کی جس کا تعلق ان حضرات کی ذات سے ہے۔ دوسرے فراق کی۔ جس کا تعلق ان حضرات کے پس ماندوں سے ہے۔ جہاں تک نفس وصال کا تعلق ہے اس میں رنج وغم کی کوئی وجہ نہیں۔؛ کیوں کہ یہ حضرات بوجہ علم واخلاق اور زہد و تقویٰ کے فائز المرام تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یقیناً ان کو بخش دیا ہوگا۔ بلکہ مراتب عالیہ کا معاملہ فرمایا ہوگا اور جہاں تک تعلق پس ماندوں کا ہے وہ واقعی قابلِ رنج وغم ہے مگر اس میں بھی قول خداوندی اِنَّ مع العسر یسرا. ایک وجہ تسلی کی نکل سکتی ہے۔

امام محمدؒ کی وفات کے بعد بعض عارفین نے پوچھا کہ آپ پر کیا گزری؟

پہلی بات تو یہ فرمائی کہ علماء نے سن رکھا تھا کہ موت بڑی کٹھن چیز ہے، بڑی سخت چیز ہے، بڑی ہی دردو کرب کی چیز ہے مجھے تو کچھ معلوم نہیں ہوا۔ میں تو فقہ کا ایک مسئلہ سوچ رہا تھا سوچتے سوچتے آخرت میں پہنچ گیا۔ مجھے خبر نہیں گذری، یہ ایک جملہ ہوا اور دوسرا جملہ یہ فرمایا کہ حق تعالیٰ نے مجھے بخش دیا اور یہ فرمایا کہ اے محمد! اگر ہمیں بخشنا نہ ہوتا تو ہم اپنا علم تیرے سینے کے اندر کیوں ڈالتے، علم تو تقویٰ کی چیز ہے۔ تو یہی صورت ان حضرات کی بھی ہے۔ کہ حق تعالیٰ نے ان کے سینے میں علم ڈالا اور علم بھی ایک امتیازی درجہ کا۔

اپنے اساتذہ وشیوخ بالخصوص حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور استاذ الاکبر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے علوم ومعارف کی جتنی امانت ان حضرات کے سینے میں تھی اور ان علوم ومعارف پر جتنا افادہ ان حضرات نے فرمایا یہ بھی امتیازی چیزیں تھیں جو انہیں حاصل تھیں۔ اتنا بڑا علم کتاب وسنت کا جب ان حضرات کے دل میں اللہ تعالیٰ نے ڈالا تھا تو انشاء اللہ ثم انشاء اللہ یہ یقین ہے کہ ان کے مراتب بھی بلند ہوں گے۔ ویسے تو غیب کی خبر اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے مگر اللہ ہی نے جن علامات کی اطلاعات دی ہیں ان کی بنا پر ہم امید رکھ سکتے ہیں کہ انشاء اللہ ان حضرات کے مراتب بلند ہیں اور وہ درجات قرب میں ہیں اور بہت اونچے مقام پر ہیں انشاء اللہ ثم انشاء اللہ۔ تو ان کے لیے کوئی رنج کی چیز نہیں ہے۔ کیوں کہ انھوں نے تو اپنا مقصد پا لیا۔ رنج اور صدمہ تو پسماندوں کا ہے۔ کہ جن سے ایک نعمت چھن گئی۔ ایک دولت چھن گئی۔ اس واسطے رنج اور صدمہ اپنے فراق کا ہے۔ ان کے وصال کا نہیں ہے۔

جب میں نے حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے انتقال کی خبر سنی تو دارالعلوم دیوبند میں اس حادثۂ فاجعہ کا سب سے زیادہ اثر مجھ ناتواں پر ہوا۔ وہ میرے تعلیمی زمانے کے ساتھی تھے ایک ساتھ دونوں نے پڑھا، ایک ہی ساتھ حج کیا، ایک ہی ادارہ میں رہے اور ایک ہی وقت درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ مدتوں دارالعلوم دیوبند میں حدیث وفقہ کے استاذ اور صدر مفتی کے منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ سینکڑوں کتابوں کے مصنف تھے۔ تفسیر میں تفسیر معارف القرآن ان کا عظیم کارنامہ ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ پاکستان میں مسلک دیوبند کے عظیم داعی اور ترجمان تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ اور حضرت بنوریؒ صاحب اگرچہ آج ہم میں نہیں ہیں مگر ان کا علم اور ان کی دینی خدمات زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی۔ حضرت مولانا بنوری صاحب مرحوم ایک بڑے عالم اور محدث تھے۔ مولانا مرحوم کا جو برتاؤ میرے ساتھ تھا وہ ایک خصوصی برتاؤ تھا۔ وہ بڑی محبت کرتے تھے اور محبت سے گزر کر ایسی نیاز مندی سے پیش آتے تھے۔ جیسے کوئی شاگرد، یہ تواضع للہ کی بات تھی ورنہ وہ علم وفضل میں ہم لوگوں سے کہیں بڑے تھے مگر جتنا علم بڑھتا ہے اتنی ہی تواضع بڑھتی ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ آپ سب کو اور ہمیں صبر بھی دے اور اجر بھی عطا فرمائے اور توفیق بھی دے کہ آئندہ ان کے کاموں کو چلائیں اور ان کے یہ مدارس خدا کرے ہمیشہ جاری وساری رہیں۔“

کراچی میں چند اجتماعات سے خطاب فرمانے کے بعد آپ بذریعہ طیارہ ۳۰ رمئی ۱۹۷۸ء کو ملتان تشریف لائے۔ آپ کے ہمراہ مولانا عبید اللہ صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور اور شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی صاحب بھی تشریف لائے۔ جو حضرت کے مجازین خصوصی بھی ہیں۔ ملتان میں آپ مولانا محمد شریف جالندھری مرحوم مہتمم جامعہ خیر المدارس کی دعوت پر تشریف لائے تھے۔ مولانا محمد شریف صاحب مرحوم بھی حضرت کے مجاز بیعت تھے۔

۳ رمئی کو جامعہ خیر المدارس ملتان میں ایک عظیم الشان جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں پورے پنجاب سے ہزاروں لوگ حضرت کی زیارت اور تقریر سننے کی غرض سے جمع ہوئے تھے جلسے کا پروگرام نماز مغرب کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ جلسہ میں علماء صلحاء اور طلبہ کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے خیر المدارس کے فارغ التحصیل علماء کی دستار بندی بھی کی اور ہزاروں افراد کے اس اجتماع سے ایک بصیرت افروز علمی خطاب بھی فرمایا۔ حضرت کی تقریر کے چند جملے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ جو حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری بانی مدرسہ خیر المدارس کی وفات کے بارے میں تعزیتی کلمات ہیں۔ ویسے یہ تقریر ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک بڑے علمی انداز میں جاری رہی۔ جو ماہنامہ الرشید ستمبر

۱۹۸۳ء میں مکمل شائع بھی ہو چکی ہے۔ ارشاد فرمایا کہ:

''میری اس وقت حاضری کا مقصد ملتان میں نہ کوئی جلسہ تھا نہ کوئی مجلس تھی۔ نہ کوئی تقریب اور نہ وعظ کا تخیّل ذہن میں تھا۔ میری حاضری کا مقصد حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ بانی مدرسہ خیر المدارس ملتان کی وفات کے بعد یہ پہلی حاضری تھی تاکہ تعزیت ادا کروں اور تعزیت کے لیے ہجوم اور مجمع نہیں ہوتا۔ اگر مجھے پہلے سے علم ہوتا کہ جلسہ کا اعلان کیا گیا ہے تو میں روک دیتا اور مجھے امید تھی کہ مولانا محمد شریف صاحب مہتمم مدرسہ خیر المدارس، فرزندار جمند حضرت مولانا خیر محمد صاحب مان بھی لیتے۔ لیکن اچانک آ کر معلوم ہوا کہ کوئی جلسہ بھی ہے اور اجتماع بھی۔ جلسہ اور تقریریں ان سب کے لیے ضرورت پڑتی ہے نشاط کی، طبیعت میں انشراح ہو، نشاط ہو، یہ ساری چیزیں مل جاتی ہیں مگر میں اس وقت حاضر ہوا ہوں ایک بجھے ہوئے دل کے ساتھ مولانا خیر محمد صاحب کا غم ستائے ہوئے ہے مگر یہاں آ کر تازہ ہو گیا حالاں کہ ان کی وفات کو ایک عرصہ گذر چکا ہے مگر میرا تعلق اتنا قوی تھا ان سے اور قلبی رابطہ برسہا برس سے تھا۔ مولانا مرحوم جب جالندھر میں مقیم تھے، پنجاب کا جو بھی میرا سفر ہوتا تو اس جگہ اترنا لازمی ہوتا تھا۔ جالندھر میں مولانا مرحوم کی وجہ سے اور امرتسر میں مولانا مفتی محمد حسن صاحب مرحوم کی وجہ سے، پاکستان بننے کے بعد مولانا مرحوم کا قیام ملتان میں ہوا، یہاں بھی ایک دو مرتبہ ان کی حیات میں حاضری ہوئی۔ اس وقت ان کی وفات کے بعد یہ پہلا موقعہ ہے حاضری کا۔ تو وہ سارے تعلقات بھی سامنے آ گئے۔ وہ ساری تاریخ سامنے آ گئی۔ اس وجہ سے دل پر غم کا ایک بوجھ ہے تو اس بجھے ہوئے دل سے میں کیا تقریر کروں اور کیا جلسے کا حق ادا کروں؟ اور خود میرا بھی اب ضعیفی کا عالم ہے قوت بھی وہ نہیں ہے۔ جو پہلے تھی۔ جذبات بھی سرد پڑ چکے ہیں تو ایسی حالت میں تقریر ہو تو کیا ہو؟ بہر حال اب غم کے سلسلے میں ہی ایک تعزیتی تقریر ہو گی۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی ذات مقناطیسی ذات تھی جو قلوب کا رجحان تھا اور دل کھنچتے تھے اور ان کی وفات جیسا کہ مقولہ مشہور ہے۔ موت العالِم موت العالَم، اس لیے کہ عالم کے ذریعے حیات پھیلتی ہے وہ حیات یہ نہیں ہے جو کھانے پینے کی ہے۔ وہ حیات روحانی ہوتی ہے اور وہی حقیقی حیات ہے اور وہی حقیقی روح ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن کریم کو اپنی روح فرمایا ہے۔ اسی روح سے اقوام زندہ ہوں گی اور اسی روح کے نکل جانے سے پژمردگی طاری ہو گی''۔

حضرتؒ کی یہ عالمانہ و بصیرت افروز تقریر ''روح اور جسم کی حقیقت'' کے بارے میں مدلل انداز سے ہوتی رہی اور لوگوں کا عظیم الشان ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بڑے پرسکون ماحول میں حضرت کی یہ تقریر سنتا

رہا۔ آگے حضرت نے علماء ربّانی کی شان بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''علماء ربّانی کی شان یہ بتائی گئی ہے۔ کہ ان کا دل، روح اور دماغ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہتا ہے۔ یہ اثر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور ان کا صدقہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں فرمایا گیا ہے کہ **کان یذکر اللہ علی کل احیانہ.**

کوئی لمحہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اللہ سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ زبان سے ذکر کریں، قلب سے ذکر کریں۔ جس کو ذکر کہتے ہیں۔ روح سے ذکر کریں۔ جس کو توجہ کہتے ہیں اور معرفت کہتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طریق پر ذکر میں مصروف رہتے ہیں۔ تو جب کوئی عالم ربانی اٹھتا ہے جس کے لیے کہا گیا ہے کہ **موت العالِم موت العالَم**، تو ایسے عالم کا اٹھ جانا تو پورے عالم کا اٹھ جانا ہے۔ کیوں کہ وہ روح نکل جاتی ہے تو پورے عالم پر ایک پژمردگی چھا جاتی ہے۔

تو میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ مولانا خیر محمد صاحبؒ جیسے ان کے نام میں خیر ہے۔ ان کے مسمّٰی میں بھی اللہ نے خیریت ہی رکھی تھیں اور واقعۃً خیر ہی خیر تھے۔

حدیث کا پڑھنا پڑھانا، قرآن پاک کا درس دینا۔ مواعظ سے تبلیغ و تلقین کرنا۔ اپنے پروردوں کی تربیت کرنا۔ غرض ذکر اللہ ہی ان کا مشغلہ تھا۔ چاہے کسی بھی انداز سے ہو تو ایسے عالم ربّانی کا اٹھ جانا یقیناً پورے عالم کے لیے موت کا بھی اور علامات موت کا یقیناً اشارہ ہے۔ جب کوئی عالم ربانی اٹھتا ہے تو قلوب محسوس کرتے ہیں کہ ایک قسم کی ظلمت طاری ہوگئی ہے پورے عالم پر روحانیت میں کمی آ گئی ہے۔ ہر شخص محسوس نہیں کرتا۔ صاحبِ دل جانتا ہے کہ نورانیت میں کتنی کمی آئی ہے''۔

الغرض حضرتؒ نے جامعہ خیر المدارس ملتان میں یہ ایک نہایت نصیحت آمیز تقریر فرمائی۔ اس کے علاوہ مدرسہ قاسم العلوم اور تعلیم الابرار وغیرہ مدارس کا بھی معائنہ فرمایا۔ خیر المدارس میں حضرتؒ کی تقریر کے بعد حضرت مولانا محمد مالک کاندھلویؒ صاحب نے بھی خطاب فرمایا اور دعا حضرت نے فرمائی۔ شب کا قیام خیر المدارس ہی میں فرمایا۔

۴ رمئی ۱۹۷۸ء کو مع رفقاء ساہیوال تشریف لے گئے۔ اس کی مختصر رپورٹ حضرت مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدی صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔

فرماتے ہیں کہ: ''۲۵ رجمادی الاولیٰ ۱۳۹۸ھ جمعرات کی صبح جامعہ رشیدیہ کے لیے ایک عجیب صبح تھی کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند جامعہ رشیدیہ نمبر ۲ کی جدید

عمارت کے افتتاح کے لیے تشریف لائے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے ملتان تا لاہور کار کے ذریعے صرف اس لیے سفر کی تکلیف فرمائی کہ راستہ میں ''دیوبندی مکاتب فکر'' کے احباب سے ملاقات ہو جائے۔ چناں چہ حضرتؒ ۹ ربجے کے قریب جامعہ رشیدیہ تشریف لائے۔ جامعہ کے اکیس علماء فارغ التحصیل کی دستار ہائے فضیلت، سندات، انعامی کتب آپ کے سامنے رکھی تھیں اور ۲۲ رطلباء حفاظِ قرآن، قرآن حکیم ختم کر چکے تھے۔

حضرتؒ کی تشریف آوری پر احقر ناظم ادارہ نے مختصر سا زبانی سپاسنامہ پیش کیا اور جامعہ رشیدیہ کا دارالعلوم دیوبند اور اکابر دیوبند سے تعلق اور رابطہ بیان کیا۔

حضرتؒ نے جامع خطاب فرماتے ہوئے (کتب خانہ رشیدیہ) میں دعا فرمائی اس تقریب سعید میں ساہیوال، بھاولپور، بھاول نگر، ملتان، فیصل آباد، سرگودھا اور لاہور کے اضلاع سے لوگ حضرت حکیم الاسلامؒ کی زیارت کے لیے اور خطاب سے مستفید ہونے کے لیے کثیر تعداد میں شریک ہوئے تھے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے مختصر مگر جامع خطاب میں فرمایا کہ:

''پاکستان میں میری حاضری محدود وقت کے لیے ہوتی ہے۔ وقت بہت کم ہے اور پروگرام طے پایا کہ ملتان سے لاہور تک سفر سڑک کے راستے بذریعہ کار کیا جائے تا کہ راستے میں دوستوں سے ملاقات ہوتی چلی جائے اور زیارت سے ہم مستفید ہوتے چلیں گے اگر چہ گرمی کا موسم ہے اور سفر گو دشوار تھا مگر دوستوں اور احباب کی گرمیٔ محبت گرمیٔ آفتاب پر غالب آ گئی۔ جامعہ رشیدیہ میں حاضری ہو گئی۔ کیوں کہ اس کا تعلق اکابر دارالعلوم دیوبند سے ہے نیز جہاں بھی کوئی فاضل دارالعلوم بیٹھا ہے اس سے تعلق ہے یہ خطہ تو ایک ہی تھا مگر تقسیم نے جدا کر دیا۔

یورپ میں، میں نے دیکھا ہے کہ بہت زیادہ مدارس قائم ہیں اور فضلاء دارالعلوم اپنی اپنی جگہوں پر اشاعت دین میں بذریعہ تدریس مصروف ہیں۔ تقریباً بیس رپچیس گرجے خرید کر وہاں مدارس اور مساجد قائم کر دی گئی ہیں اور فضیلت کی بات یہ ہے کہ ان گرجوں کو خریدنے میں غیر مسلموں نے بھی انتہائی کوشش کی مگر فروخت کرنے والوں نے مسلمانوں کے ہاتھ بیچنے کو ترجیح دی۔ کیوں کہ وہ کہتے تھے کہ یہ اللہ کا نام لیں گے۔ اب وہاں عقیدۂ تثلیث کی جگہ عقیدہ توحید کی تعلیم دی جا رہی ہے اور یورپین نوجوان نسل اپنے نظریات واعمال سے دل برداشتہ ہو چکے ہیں۔ وہ اب سکون حاصل کرنے کی سعی میں مصروف ہیں۔ جس کے نتیجے میں فضلاء دارالعلوم دیوبند نے نوجوان نسل کے ذہنوں میں تبدیلی کے لیے محنت کی اور کر رہے ہیں

اور اس میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں اور اس لیے میں کہتا ہوں کہ آپ ہی (فضلاء دارالعلوم) فاتح انگلستان بن سکتے ہیں۔ یہی صورت برما وغیرہ دوسرے ممالک میں ہے۔ کہ وہاں بھی مدارس قائم ہیں اور اشاعت اسلام میں مصروف ہیں۔ بہر حال اکابر دارالعلوم دیوبند نے ایسا شجرہ طیبہ قائم کیا ہے کہ دنیا میں کہیں شاخیں ہیں، کہیں پھول اور کہیں پتیاں''۔

حضرت نے فرمایا کہ: ''میں تو ایک طالب علم ہوں اور یہاں آ کر سکون محسوس کر رہا ہوں؛ کیوں کہ مچھلی جس طرح پانی میں خوش ہوتی ہے اور وہاں اسے آرام ملتا ہے۔ اپنی برادری میں آ کر مجھے قلبی سکون و آرام میسّر ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس مدرسہ کو ہمیشہ قائم رکھے۔ یہاں میری حاضری میرے لیے باعثِ سعادت ہے کہ اتنے احباب، دوستوں اور بزرگوں کی زیارت ہوگئی۔ بزرگوں و احباب کی زیارت کرنا اسلام کی روایت ہے۔''

آپ نے مزید ارشاد فرمایا کہ: ''ہم میں سے کوئی پنجابی ہے۔ کوئی پٹھان ہے اور کوئی کسی خاندان اور علاقہ سے تعلق رکھتا ہے مگر اسلام کے ایک رشتہ نے سب تفاوت اور فرق ختم کر دئے۔ ہم میں گو بُعد زمان و مکان ہے مگر رشتہ اسلام کی وجہ سے دلوں میں قرب ہے اور دلوں کے اس تعلق اور محبت کو بُعد زمانی یا مکانی ختم نہیں کر دیتا کیوں کہ عمر کی آخری منزل ہے۔ دل چاہتا ہے کہ جتنے احباب سے ملاقات ہو جائے اتنا ہی کم ہے۔'' اس کے بعد حضرت نے دعا فرمائی اور مجلس ختم ہوگئی۔

جامعہ رشیدیہ ساہیوال سے بذریعہ کار لاہور تشریف لے گئے جہاں جامعہ اشرفیہ میں آپؒ نے قیام فرمایا۔ یہ وہ عظیم درسگاہ ہے جس میں حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی متعدد بار تشریف آوری ہوئی ہے اور یہاں بڑے بڑے عظیم الشان جلسوں سے آپ نے خطاب فرمایا ہے۔ جامعہ اشرفیہ کے بانی حضرت اقدس مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ حضرت حکیم الاسلامؒ کے خاص رفیق و بزرگ ساتھی تھے۔ جامعہ اشرفیہ کے موجودہ مہتمم اور حضرت مفتی صاحب کے صاحبزادے حضرت مولانا عبیداللہ صاحب اور نائب مہتمم حضرت مولانا صاحبزادہ عبدالرحمٰن صاحب حضرت حکیم الاسلامؒ کے خلفاء و مجازین میں سے ہیں اور حضرت حکیم الاسلامؒ کے خاص عشاق میں سے ہیں۔

پاکستان میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے فیض یافتہ حضرات کی بہت بڑی تعداد موجود ہے اور حضرتؒ کے ہزاروں مریدین و تلامذہ ملک بھر میں دینی علمی اور تبلیغی خدمات میں مصروف ہیں۔ پاکستان میں حضرتؒ کا یہ آخری دورہ تھا۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس ۱۹۸۰ء میں دیوبند میں منعقد ہوا جس کی مختصر رپورٹ آگے آ رہی ہے۔

پاکستان ہجرت اور واپسی

حضرت حکیم الاسلامؒ جب اپنے اعزاء سے ملنے کے لئے پاکستان تشریف لے گئے تو ارباب حکومت حضرتؒ کو پاکستان میں روکنے کے لئے نہ صرف کوشاں ہوئے بلکہ ان کی طرف سے وزارت امور مذہبیہ کی بھی بہ قوت و بہ اصرار بار بار پیش کش کی گئی تھی، لیکن حضرت کا جواب صرف یہ تھا کہ ''میرے بزرگ میری زندگی کا مقصد میرے حسب تقاضائے فطرت ''دارالعلوم دیوبند'' کی خدمت قرار دے گئے ہیں، میں اپنے اس موقف حیات سے ہٹنے کے لئے قطعاً تیار نہیں ہوں۔''

دوسری طرف عوامی طور پر حضرتؒ کے قیام پاکستان کے لئے جلسے اور جلوسوں کا راستہ اختیار کیا گیا جس کے سب سے بڑے قائد کراچی کے ایک معزز بڑے تاجر جناب یوسف سیٹھی صاحب تھے، ان کے ساتھ اہم معاونین میں بعض علماء کرام بھی تھے، حضرتؒ کو یقین دہانی کی کوشش کی گئی کہ حضرت آپ کے اہل خانہ پاکستان آنا چاہتے ہیں، حالاں کہ یہ خلاف واقعہ تھا، خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند فرماتے ہیں کہ:

''حضرتؒ کے خطوط مجھ راقم الحروف تک اور میرے خطوط حضرتؒ تک اس لئے پہنچنے نہیں دیئے جاتے تھے تاکہ یہ حقیقت کھل کر سامنے نہ آجائے کہ نہ حضرت پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں اور نہ حضرت کے اہل خانہ پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ پاسپورٹ ختم کردینے کی وجہ سے حضرت کی واپسی میں زبردست پریشانی پیدا ہوگئی، جس کا اظہار حضرتؒ نے یوسف سیٹھی صاحب سے کیا، نیز انہوں نے پہلی مرتبہ مجھ سے فون پر رابطہ قائم کیا اور حضرت کو وہاں روکنے کی جدوجہد کے تحت کہا کہ ''پاکستان کو حضرت جیسے عالم کی ضرورت ہے، اس لئے آپ تمام بھی پاکستان کا ارادہ کرلیں'' میں نے کہا کہ: سیٹھی صاحب! میں حضرت والد صاحب مدظلہ، کے بارے میں سو فیصد یقین رکھتا ہوں کہ وہ کسی قیمت پر پاکستان میں نہیں رہیں گے اور فوراً ہی مدینہ طیبہ ہجرت کا ارادہ فرمالیں گے، اس کا ہونا چوں کہ میرے نزدیک یقینی ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دارالعلوم سے وابستگی اور خود حضرت والا کی دینی، علمی شخصیت سے جو عالمی پیمانے پر دینی فیضان دنیا بھر کے مسلمانوں کو پہنچ رہا ہے اس کو ختم کرنے کے اور اس عظیم دینی فیض سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو محروم کرنے کے ذمہ دار آپ ہوں گے، سیٹھی صاحب براہِ راست حضرت کے پاس پہنچے اور پہلا سوال احقر کے بارے میں کیا کہ محمد سالم کی عمر کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ تیس سے کم ہی ہے، اس وقت میری عمر یہی

تھی، یہ سن کر سیٹھی صاحب نے کہا کہ عمر تو بہت تھوڑی ہے مگر بات انہوں نے بڑے تجربہ کاروں کی سی کہی، پھر اس کے بعد انہوں نے حضرت کو میری گفتگو سنائی، حضرت نے فرمایا کہ:

''جو کچھ محمد سالم نے کہا ہے وہی قطعی طور پر میرے دل میں ہے۔'' اس پر سیٹھی صاحب نے کہا کہ:

''محمد سالم کی بات سن کر میں تو ڈر گیا ہوں اور اب میری رائے بالکل بدل گئی ہے۔ اب اگر حضرت پاکستان میں ٹھہریں تو سر آنکھوں پر اور واپس انڈیا جانا چاہیں تو اس کے لئے ہر ممکن تعاون دینے کے لئے تیار ہوں۔''

اس کے بعد پھر حضرتؒ نے مجھ سے فون پر بات کی اور فرمایا کہ سیٹھی صاحب نے تمہاری گفتگو مجھ سے نقل کی، یہ میرے دل کی وہ آواز تھی جسے تم نے بڑے سلیقے سے ان تک پہنچا دیا اور سیٹھی صاحب اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ میری واپسی کے مؤید بن گئے، اس کی وجہ سے الحمد للہ صورت حال قطعاً بدل گئی لیکن ہمارے پاس پاسپورٹ نہیں ہے، میں اس کے لئے بھی کوشش کرتا ہوں، میرا کافی دیرینہ تعلق حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ (ناظم جمعیۃ علماء ہند) سے تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہی تن تنہا حضرت حکیم الاسلامؒ کی ہندوستان واپسی کے بہ خلوصِ تمام متمنی تھے، میں فوراً دہلی پہنچا اور مولانا مرحوم کو صورتِ حال سے آگاہ کیا، وہ اسی وقت مجھے ساتھ لے کر مولانا ابوالکلام آزاد، وزیر تعلیم حکومت ہند کے پاس پہنچے اور صورت حال بتائی۔ مولانا نے جواب دیا کہ:

''مولانا طیب صاحب ملک کے قیمتی افراد میں سے ہیں اور ان کا آنا ضروری ہے۔'' اور نیا پاسپورٹ بنوانے کے لئے مولانا آزاد نے وعدہ فرمایا۔ تین روز بعد میں خود مولانا کے پاس حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ:

''کراچی میں انڈین ہائی کمیشن کو کہہ دیا گیا ہے۔ آپ والد صاحب سے کہئے کہ وہ انڈیا ہائی کمیشن کراچی تشریف لے جا کر پاسپورٹ وصول کرلیں۔ احقر نے دہلی سے حضرت کو فون کیا، حضرت کو لے کر یوسف سیٹھی صاحب ہی انڈین ہائی کمیشن گئے مگر وہاں سے جواب ملا کہ ہمارے پاس کوئی ہدایت نہیں آئی ہے۔ غرض دو مرتبہ ایسا ہی ہوا، پھر مولانا آزاد نے وزارت خارجہ سے خصوصی رابطہ قائم کر کے ہائی کمیشن کو ہدایت بھجوائی اور بحمد اللہ مولانا حفظ الرحمٰنؒ کے تعاون اور مسلسل ایک ماہ کی میری کوشش کے بعد حضرت کو اور حضرت کے ساتھ حضرت کے چھوٹے بھائی مولانا محمد طاہر صاحب دونوں حضرات کو نئے پاسپورٹ دیدیئے گئے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ چند روز بعد پانی کے جہاز سے کراچی سے بمبئی کے لئے روانہ ہوگئے، ہم لوگ کافی تعداد میں ایک روز قبل استقبال کے لئے بمبئی پہنچ چکے تھے، وہاں سے فوراً ہی بذریعہ ریل دیوبند کے لئے روانہ ہوگئے، یہاں بھی طلبہ اور اہل شہر نے پُر خلوص استقبال کیا، پھر دار العلوم میں جلسہ ہوا، جس میں

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی آمد پر خوش آمدید فرمایا، غرض حضرت کو ہندوستان واپس لانے میں میرا اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے علاوہ کسی کی جدوجہد کو دخل نہیں تھا۔

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب دامت برکاتہم کی اس وضاحت کے بعد حکیم الاسلامؒ کی پاکستان سے واپسی کے بارے میں جو کہانیاں عوام وخواص میں ایک خاص مقصد اور مصلحت کے پیش نظر مشہور کی گئیں وہ قطعاً بے حقیقت اور خود ساختہ ہو جاتی ہیں۔ فتدبّر

روئیدادِ سفر کشمیر بخامۂ عنبر شمامہ حضرت حکیم الاسلامؒ

حکیم الاسلامؒ نے ۱۹۷۳ء میں وادیٔ کشمیر کا سفر فرمایا، جس کی روئیداد حضرتؒ نے اپنے قلم سے یوں تحریر فرمائی:

''اوائل جون ۷۳ء میں عالی جناب حاجی حافظ انوار الاسلام صاحب مالک ''برش فیکٹری سہارنپور'' کے ایک دیرینہ منصوبہ کے تحت سفر کشمیر کا اچانک پروگرام بنا۔ ۱۳/ جون ۷۳ء کو حافظ صاحب ممدوح کی ذاتی کاروں سے روانگی عمل میں آئی اور ۱۵ سے ۲۵/ جون ۷۳ء تک کشمیر کے دارالحکومت سری نگر میں قیام رہا۔

رفقاء سفر میں حضرت مولانا سید فخر الدین صاحبؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور محترم قاری عبدالرحمٰن صاحبؒ سابق امام جامع مسجد سہارنپور، خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کی وجہ سے یہ سفر باغ وبہار بنا رہا، بالخصوص قاری صاحب ممدوح کی بذلہ سنجیوں کی بدولت اس کی بہار، بہار کشمیر سے کم نہیں رہی اور جناب حافظ صاحب ممدوح تو امیر سفر بلکہ سربراہ سفر تھے، جن کی مدارات، مہمان نوازی اور فراخدلی کے ساتھ مسافر نوازی تمام شکریوں سے بالاتر ہے۔ گو سری نگر میں چھوٹے بڑے اجتماعات بھی ہوتے رہے، تقریریں بھی ہوتی رہیں، دعوتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا لیکن ذاتی کاریں ساتھ ہونے کی وجہ سے سیر و سیاحت میں کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ رات دن کشمیر کی گلگشت ہوتی رہی جس سے کشمیر کی کوئی قابل ذکر سیرگاہ یا حسین وجمیل سبزی ایسی نہیں رہی جس میں گزر نہ ہوا ہو۔

کشمیر کے مناظر جمیلہ اور قدرتی سبزہ زار، کوہسار، آبشار اور مرغزار وغیرہ آنکھوں کے راستہ سے دل میں اترتے رہے اور بلاکسی سابقہ تصور یا خیال کے محض جذباتی طور پر دل سے نکل کر کاغذ کی سطح پر بھی آتے رہے اور عجیب تر یہ کہ نظم کا روپ بھی اختیار کرتے رہے اور وہ بھی اس طرح کے مناظر قدرت کو دیکھا جاتا تھا اور کار ہی میں بیٹھے بیٹھے کرم کانٹے کھینچتا جاتا تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ میں نہ شاعر ہوں، نہ کسی شاعر کا تلمیذ اور نہ ہی شاعری اپنا مشغلہ ہے اور نہ شاعری کے ماحول میں زندگی گزری لیکن زمانہ طالب علمی ہی سے یہ عارضہ ضرور لگا رہا کہ غیر معمولی واقعات وسوانح بالخصوص خاص حوادث کے پیش آنے پر جذبات وتأثرات کی ترجمانی کبھی کبھی شعر کی صورت اختیار کرتی رہتی تھی۔ کشمیر کے قدرتی مناظر، ان کی موزونیت اور ساتھ ہی اہل کشمیر کے حالات وکیفیات سامنے آنے پر یہ پرانا روگ خود بخود ہی اُبھر آیا اور جذبات وتأثرات نے محض طبع زاد طریق پر شعر کا لباس پہن لیا۔ البتہ اس طبعی جذبہ کے بعد عقلی داعیہ ضرور ابھرا کہ محض جنگلوں، پہاڑوں اور ندی نالوں کی نقشہ کشی نہ کوئی معتد بہ مقصد ہے اور نہ ہی اپنے اندر کوئی افادیت رکھتی ہے۔ البتہ اسے تمہید کے طور پر رکھ کر اہل کشمیر کے حالات پر تبصرہ ان پر گزرنے والے حوادث کا تذکرہ اور اس کے تحت انہیں کوئی مفید مشورہ دیا جائے تو ممکن ہے کہ یہ کرم کانٹے کسی افادیت کا پہلو اختیار کرلیں۔ اس لئے اس غیر اختیاری جذبہ نظم نویسی کو ارادہ واختیار سے روکا نہیں گیا بلکہ طبعی رفتار پر چھوڑ دیا گیا، جس سے نظم طویل ہوتی گئی اور تقریباً سوا پانچ سو شعر تک پہنچ گئی۔ چنانچہ اسی تخیل کے تحت اس نظم کی ابتدا میں بطور تمہید مناظر کشمیر کا خاکہ پیش کرتے ہوئے کشمیر کی تاریخی اہمیت، ان کی قدیم تہذیب، اہل کشمیر کی موجودہ حالت، ان میں بیداری پیدا ہونے کی صورت وغیرہ کے تذکرہ کے بعد انہیں ذہنی تبدیلی اور اصلاح حال کے طرف توجہ دلائی گئی ہے جس کے ضمن میں متعدد شرعی حقائق، اصول اصلاح، انسانی قدروں کے احیاء کی تدابیر، مذہبی اور تمدنی صلاح وفلاح کے طریقے اور اہل کشمیر کی دینی اور سیاسی ذمہ داریوں کو ان کے سامنے ایک پیغام کی صورت سے پیش کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک اس نظم اور بدنظمی کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ ایک غیر شاعر بلکہ بیگانۂ شاعری کی نظم کو شعر گوئی یا شاعری سے نسبت ہی کیا ہوسکتی ہے کہ اسے نظم کہا جائے؟ اور پھر بھی کہا جائے تو اس سے زیادہ شاعری کی توہین اور شاعری کی دل آزاری اور کیا ہوسکتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ نثر کا ایک طالب علمانہ مضمون ہے جسے قافیوں کے اضافہ سے نظم کا روپ دیدیا گیا ہے جو طالب علمانہ انداز سے شرعی تعلیمات اور احکام پر مشتمل ہے۔ شاعرانہ انداز نہ اپنے بس کا تھا اور نہ ہی اس کی طرف توجہ ہی کی گئی محض افادۂ احکام ہی پیش نظر رہا، جس میں شاعری کی گنجائش بھی نہیں تھی، اس لئے وہ تخیل آفرینی، محاسن تعبیر اور شعر کی فنی خوبیوں سے کورا ہے، جن کا اول تو اپنے اندر سلیقہ نہیں اور ساتھ ہی التفات خاطر صرف مضمون اور مقصد کو مصرعوں میں کھپا دینے تک محدود رہا، شعر گوئی یا نظم نویسی کا نہ سلیقہ تھا نہ جذبہ، اس لئے اسے نظم کہنے کے بجائے تک بندی کہا جانا ہی ایک واقعی

حقیقت کا اظہار ہوگا اور اس لئے اگر یہ درخواست کی جائے تو بے محل نہ ہوگی کہ دیکھنے والے اسے شعر گوئی یا فن شاعری کے نقطۂ نظر سے ملاحظہ ہی نہ فرمائیں کہ انہیں ہنسنے کا موقع ملے بلکہ صرف مقصد مضمون اور شرعی پیغام کے نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تا کہ کچھ بات بنی رہے۔

عادتاً ناظم و ناشر حضرات اپنے رشحاتِ قلم کے آخر میں بطور انکسار یا بطرز اعتذار یہ لکھ دیا کرتے ہیں کہ اگر اس میں کوئی فروگزاشت یا قابل اصلاح چیز نظر آئے تو ناظرین مسامحت سے کام لیں اور مؤلف کو اپنے اصلاحی مشوروں سے نواز کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ لیکن میں اس کے برعکس یہ عرض کروں گا کہ اس تک بندی میں اگر اتفاق سے کوئی ایک آدھ شعری خوبی یا موزوں تعبیر نظر آ جائے تو مہربانی فرما کر اخفاء سے کام لیا جائے ورنہ ایک دو خوبیاں متعین کر کے سامنے لانے کے معنی ان ساری چھپی ہوئی خرابیوں کی نشاندہی کے ہوں گے جو اس تک بندی میں بطور جوہر کے بھری ہوئی ہیں اور اس سے خواہ مخواہ بھی تک بندی کی رسوائی ہوگی جس کی ناظرین سے توقع نہیں ہوتی۔

بہر حال کشمیر کے سلسلے میں مکان اور مکین دونوں کی کوائف کا ایک اجمالی موقع ہے، جو مقفّٰی نثر میں پیش کر دیا گیا ہے جس میں نہ کوئی سیاست کارفرما ہے نہ رسمی مصلحت اور جب کہ یہ ناکارہ اپنی افتاد طبع ہی سے سیاسی ہے بھی نہیں بلکہ ایک تعلیمی آدمی اور ہر حادثہ کو مذہب کے نقطۂ نگاہ سے سوچنے کا عادی ہے تو اس کے بارے میں کسی سیاسی تخیل کا اتہام محض سیاسی ہی تخیل ہوگا۔ یہ نظم صرف ایک دینی اور مذہبی پیغام ہے جس میں کشمیر کے حالات کو دینی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے دیکھ کر دل میں جو جذبات اُبھرے انہیں سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ مخلصانہ انداز میں پیش کر دیا گیا ہے جس کا منشاء محض اصلاحی جذبہ ہے، کوئی سیاست نہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ اسلام چونکہ جامع دیانت و سیاست دین ہے اس لئے اس کا کوئی حکم، کوئی اصول اور کوئی عقیدہ و عمل عبادت ہونے کے ساتھ سیاست و اجتماعیت سے خالی نہیں اور جب بھی اس کا کوئی جزو یا کل وہ خواہ اخلاقی ہو یا عباداتی اس کے صحیح روپ میں سامنے لایا جائے گا تو وہ بہر حال اپنے اندر کوئی نہ کوئی فطری نظام سیاست لئے ہوئے ہوگا۔ جس کا آج کی گندی اور متعفن سیاست سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اس لئے اس تک بندی میں اگر کچھ سیاسی اصول نظر پڑیں تو وہ فطری اور اسلامی سیاست کے اجزا ہوں گے نہ کہ آج کی فاسد اور ناپاک سیاست کے اعضا اور جوارح اور اس لحاظ سے اگر میں یہ عرض کروں کہ اس نظم کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تو یہ ایک حق بجانب دعویٰ ہوگا۔

آخر میں یہ ناکارہ اپنی اور اپنے رفقاءِ سفر کی جانب سے تمام بزرگان کشمیر بالخصوص شیر کشمیر عالی جاہ

شیخ محمد عبداللہ، عالی قدر مولانا محمد فاروق میر واعظ کشمیر، عالی مرتبت چودھری محمد شفیع صاحب ایم، ایل، اے کشمیر وممبر پارلیمنٹ، بزرگ محترم مولانا مسعودی صاحب، جناب محترم غلام جیلانی صاحب سکریٹری اوقاف کشمیر اور حضرت اقدس مولانا عبدالکریم الکبیر صاحب، صدر جامعہ مدینۃ العلوم ''حضرت بل'' کی مہمان نوازی کا ممنون اور شکر گزار ہے جن کی بدولت ہمارے لئے کشمیر جنت نظیر کا یہ سفر فردوس بریں بنا رہا اور ہم کشمیر کے باغ و بہار اور اہل کشمیر کی اخلاقی اقدار سے مستفید ہوتے رہے۔ حق تعالیٰ ان بزرگوں کو جزاءِ خیر عطا فرمائیں اور ان کے تمام نیک منصوبوں میں انہیں کامیاب فرمائیں''۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین آباد

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۳۰؍جون ۱۹۷۳ء

اس سفر میں حضرتؒ نے منظوم سفر نامہ ''عرفانی گل گشتِ کشمیر'' کے نام سے تحریر فرمایا، جس میں اپنے مشاہدات، کشمیر کے حسن و جمال اور اہل کشمیر کے بارے میں اپنے تاثرات کا ذکر فرمایا ہے۔

ذیل میں اس منظوم سفر نامہ کی چند نظمیں ملاحظہ فرمائیے:

کشمیر اور اہل کشمیر

ایک دردمندانہ پیغام کشمیریوں کے نام

فطرت کے منظروں کا ہے کشمیر ایک چمن — جس کی روش روش میں ہے ایک خاص بانکپن

قدرت کی صنعتوں کی عجب دِلستان زمیں — سوز و تپش کا جس میں نشان تک کہیں نہیں

وادی ہر ایک وادئ جنت نظیر ہے — جوہر سے زعفراں کے جب اس کا خمیر ہے

ہے کشتِ زعفراں سے معطر یہ خاکِ پاک — ہے بوئے زعفراں سے ہر ایک کھیت سینہ چاک

سبزہ زار

میوؤں کے اور پھلوں کے خزانے بھرے ہوئے — رنگیں گلوں کے ڈھیر بہر جا لگے ہوئے

سبزے کا مخملیں بہر خطہ فرش ہے — رنگینیوں کا روئے زمین پر یہ عرش ہے

ہر ہر شجر ہے پھولوں کے آنچل میں ایک دلہن — ہے حجلہ عروس ہر اک تختۂ چمن

سڑکوں پہ ہیں دو رُویہ صنوبر جمے ہوئے
یا سروقد نہیں سرو کے پودے کھڑے ہوئے
اشجار کی قطار ہے دیوار سبزہ زار
دیوار ہائے سبز سے سڑکیں ہیں صد بہار
جن منظروں کی راہ بھی ہو منظر جمیل
ان منظروں کا کیا ہی ملے گا کہیں مثیل
سرو اور صنوبروں کی یہ دیوار سبزہ زار
خود راہ بھی ہے خود ہی ہے منزل بھی پر بہار
بنگلے کنار آب ہیں باغات میں نہاں
ہے جنتوں میں تحتہا الانہار کا سماں

آب وہوا

آب رواں کے چشمے نہروں کے روپ میں
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہیں سورج کی دھوپ میں
برفانی آب اور ہوا مشک بیز ہے
بردو سلام کی یہ فضا لطف خیز ہے
آب وہوا کا اس کی ہے صحت سے ساز باز
آپس میں جیسے دونوں ہوں ہمزاد وہم نزاد
مشّاطۂ بہار ہے یا زعفراں بعطر
مہکتی ہے رات دن جو ہوا کے بدن پر عطر
ہر ایک اس ہوا سے ہے گل اور گلبدن
روئیں تنی کا نام نہیں سب ہیں سیم تن
آب خضر کا چشمۂ حیواں ہوا لقب
وادی اگر یہ گلشن حیواں ہو کیا عجب؟
آسودگی وعیش رواں یاں کا ہر مزاج
ہر غم کا ہر الم کا نہاں جس میں ہے علاج
ہر اک ادا نے حسن سے پایا ہے امتزاج
اک اک ادا نگہ سے طلب کرتی ہے خراج

نہریں، ندیاں اور چشمے

سینہ سے ہر پہاڑ کے چشمہ رواں دواں
جیسا کہ دودھ سینۂ مادر سے ہو رواں
اس دودھ ہی سے پلتے ہیں اطفال کوہ ودشت
کونپل سے شاخ شاخ سے بنتے ہیں پھر درخت
ہر چشمہ ابتدا میں ہے نالی کا ایک نشاں
بنتا ہے بڑھ کے پھر وہی دریائے بیکراں
جھیلیں عمیق شیشہ کی مانند ندیاں
محسوس ہوتی ہیں جو سمندر کی بیٹیاں

آبشار

گرتے ہوئے زمیں پہ چاندی سے آبشار
موتی سے قطرے جن پہ ہیں ہر سمت سے نثار
سیمیں ردا پہ حاشیۂ دُرِّ شاہوار
چادر بھی آبدار ہے موتی بھی آبدار

کوہسار

فطرت کی عظمتوں کا نمائندہ ہر پہاڑ
ہیں گھاٹیاں عمیق تو میلوں کے ہیں دراز
سارے پہاڑ شدت ورفعت میں ہیں عجیب
رہتے ہوئے زمین پہ فلک سے ہیں پھر قریب
میخیں زمین کی ہیں ستون آسمان کے ہیں
یا آسماں پہ چڑھنے کو مثل آستان کے ہیں
گویا سروں پہ اپنے لئے آسمان کے ہیں
گھٹنے تلے دبائے ہوئے اس سرزمیں کو ہیں
اس ڈولتی زمیں کے لئے پاسباں ہیں یہ
ٹھہرے ہوئے فلک کے لئے نردباں ہیں یہ
ارض وسماں کو ایک انہوں نے بنادیا
گویا کھڑا ہے رفعت وعظمت کا اک گروہ
وہ کون ہے جو ان کی بلندیوں کو پاسکے
یا ان کی چوٹیوں کے کوئی پاس جاسکے
بلڈنگ ہو کہ اس کی زمینِ کرخت ہو
پانی ہو سبزہ ہو کہ تناور درخت ہو
قدموں میں ان کے پستی سے سب ہیں پڑے ہوئے
دامان کوہ کی ہیں تہوں میں جمے ہوئے
گویا یہی پہاڑ یہاں کررہے ہیں راج
تخت ان کا ہے زمیں تو سروں پر فلک کا تاج
سبزے کا ہے لباس تو چادر ہے برف کی
قدرت نے کیا ہی اس پر عنایت ہے صرف کی
اشجاران کی فوج زُمرّد کی دردیاں
سر پر ہیں رنگ رنگ کے پھولوں کی پگڑیاں
ہتھیاران کی شاخیں ہیں رفعت ہے ان کی ڈھال
جو چڑھ کے آنے والوں کو کردیتی ہے نڈھال
جس نے چڑھائی کی وہ وہیں زیر ہوگیا
اکڑا اگر کوئی تو وہیں ڈھیر ہوگیا
چشمے ہیں ان کی جود وسخاوت کا اک نشاں
ان کی یہ ذرّیت ہیں انہی کی ہیں یہ نمود
ورنہ کہاں تھی ان میں یہ ہستی کی ہست وبود
مردہ زمین اُن سے ہی پاتی ہے پھر حیات
لیتے جنم پھر اُن سے ہیں حیوان اور نبات
اشجار ان کی دین سے سب نونہال ہیں
خطے چمن کے منظر حسن وجمال ہیں
احجار کا نمو ہے انہیں کے نَما کی شاخ
پھر ان کے واسطے سے ہیں سنگین قصر وکاخ
ان کے طفیل ہی سے ہے سب میں یہ انبساط

کشمیر کے تاریخی باغ

ان منظروں میں ان کے ہیں آثار مرتسم
جنت نشاں ہے ان کے جہاں بھی پڑے قدم
اک سمت اگر ہے چشمہ شاہی کا سبز باغ
سمتِ دِگر میں روح فزا ہے نشاط باغ

گلکاریوں کا ایک نمونہ ہے شالیمار　　ہر ہر شجرہ پہ جس کے ہے پھولوں کی اک پھوار
کتنے ہی منظر ان کے ہیں قدموں کی یادگار　　اُبھری ہے جن سے وادیٔ کشمیر کی بہار

جموں وکشمیر (پونچھ) کا سفر

۱۹۷۶ء میں حضرت حکیم الاسلامؒ مدرسہ ضیاء العلوم پونچھ، جموں وکشمیر کے بانی ومہتمم جناب مولانا غلام قادر صاحب کی دعوت پر ادارہ میں تشریف لے گئے، آپ کے استقبال کے لئے شہر کی حدود سے لے کر مدرسہ تک ہزاروں اہل اسلام قطار در قطار کھڑے تھے اور اللہ اکبر کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی، آپ کے ہمراہ دہلی سے مفتی ضیاء الحق صاحبؒ اور آل انڈیا ریڈیو کے مشہور نعت خواں قاری فرید احمد صاحبؒ بھی تھے، اس سفر کے نشیب وفراز اور احوال کو حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے قلم سے نظم میں قلم بند فرمایا۔ یہ منظوم سفرنامہ حسنِ محاکات، نادر تشبیہات، خوبصورت استعارات اور بلند پایہ افکار کا ایسا بحر بیکراں ہے جس سے شعری صنائع کی سینکڑوں نہریں نکلتی ہیں، اسے پڑھ کر انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی ان جمالیاتی کیفیات اور احساسات کا نظارہ کرتا ہے جو اس میں سمو دیئے گئے ہیں۔ اس منظوم سفرنامہ کو اپنی گوناگوں شاعرانہ محاسن کی بنا پر بلا حذف وترمیم بعینہ نذرِ قارئین کیا جا رہا ہے۔

منظوم سفرنامہ

چلے جو پونچھ پہنچنے کو دیوبند سے ہم
تو ابتدائے سفر میں چھیانوے سن تھا

جو آئے پونچھ تو ستانوے کا تھا آغاز
لگا سفر میں برس دن بلا کا یہ دن تھا

سفر کا طول، مسافت کا طول، وقت کا طول
ہر ایک طول طوالت میں طول مربن تھا

پہاڑوں اور پہاڑوں کے دروں کا یہ سفر
عجب قسم کے مصائب کا ایک معدن تھا

نہ ریل تھی، نہ ایئر تھا، تھی ایک کار فقط
اور اس میں قید کا عرصہ مکمل ایک دن تھا

پھر اسیر راہ خطرناک ساتھ میں پرخار
ہر ایک خار بھلا ٹائروں کا دشمن تھا

ہر ایک کار نشیں ٹائروں کے سرکار سوار
میان راہ کے خطروں سے لرزہ برتن تھا

جگہ جگہ تھی سڑک خام، پختہ کار تھی دگر
رفیقِ راہ غبار اور گرد کا دھن تھا

سڑک پہ بکھرے ہوئے پتھروں کے تھے ٹکڑے
جن سے کار کا مجروح رنگ و روغن تھا

اچھل کر آتے تھے پتھر ہی خیر مقدم کو
کہ جن سے خطرہ میں ہر لمحہ ڈھانچہ تن تھا

یہ تھے تو راہ کے ٹکڑے مگر تھے سنگِ راہ
کہ رہ کہ راہ پہ ہر ایک ان میں رہزن تھا

سڑک تھی کوہِ شکن اور رستم افگن تھی
اور ہم ہوا کی طرح تھے ضعیف سا تن تھا

سڑک یہاں کی مناسبت تھی کوہِ کن کے لئے
اور ہم تھے شیریں ہمارا کچھ اور ہی من تھا

رواں تھے ہم تو سڑک پہ سڑک تھی ہم پر
سوار لباس گرد کا تھا اور غبار مسکن تھا

سفر تو اپنی صعوبت سے تھا ہی مشکل سفر پھر
اس پر راہ کی تنگی سے غم کا مخزن تھا

وہ راستہ تھا کہ تھا پل صراط کا نقشہ
جو دو طرف سے نشیب و فراز کا بن تھا

کہ ایک طرف تھے پہاڑ، ایک طرف تھے گھرے غبار
جب ان سے گزرو تو جنت کا آگے گلشن تھا

خلاصہ یہ کہ خاکی لباس میں ہم تھے
ردا بھی خاک تھی جیسے خاک کا تن تھا

مگر کشش تھی محبتوں کی باخلوص تام
کہ تھا یہ سہل سب ہی، گو سفر اجیرن تھا

جوں ہی کہ پونچھ کی آئی فصیل زیر نظر
تو دل کا غار برنگِ بہار گلشن تھا

ہجوم تھا درِ بلدۃ پہ منتظر پر شوق
جو دل کے جذبۂ الفت سے نعرۂ برزن تھا

زباں پہ نعرۂ تکبیر زندہ باد کا شور
ہر ایک کے دل میں نہاں گویا طور ایمن تھا

بصد نیاز و بصد ناز و صد عقیدت و جوش
ہر ایک سینہ فراز و خمیدہ گردن تھا

عجب مسرت و فرحت، عجب سرور و نشاط
خوشی کی لہر تھی، الفت کا ایک سیزن تھا

پولیس تھی نظم میں آگے بانتظام حسیں
ہر ایک جواں تحفظ میں ماہرِ فن تھا

فضا بدل گئی سب ڈھل گیا وہ گرد و غبار
کہ تھا جو خار مغیلاں تو اب وہ گلشن تھا

پڑا جو پونچھ کی الفت کے آب کا چھینٹا
تو ڈھل کے صاف تھا شیشہ جو رنگِ آہن تھا

یہ پونچھ والوں کے اخلاص و دین کا تھا اثر
چمک اٹھا رخ شیشہ جو زنگِ برتن تھا

پہنچ کے پونچھ پر وہاں ہوگئے برحال
اگر چہ مرغ کباب اور سوختہ تن تھا

یہ پونچھ یوں تو ہے قریہ مگر حقیقت میں
وداد و لطف و محبت کا اک نشیمن تھا

کرشمے تھے یہ ضیاء العلوم کے سارے
کہ وہی ان کے مظاہر میں جلوہ اَفگن تھا

اس کا علم نمایاں تھا، اس کے ہی اخلاق
اسی کے ذوق کا غماز سب یہ تن من تھا

یہ مدرسہ ہے بلاشک سکون کی دولت
کہ پونچھ اس کے بغیر الجھنوں کا مخزن تھا

یہ مدرسہ کی ہی برکت ہے علم کی حرکت
نہیں جمود جو قومی بقاء میں قدغن تھا

بناء سے اس کی بتدریج بڑھ رہا ہے شعور
وگر نہ یاں تو فقط جہل سایہ اَفگن تھا

یہ بن گئی تھی خصوصیت اس علاقے کی
کہ سنتوں کا نبیؐ کی وہ ایک مدفن تھا

ہے آج پونچھ ضیاء العلوم سے روشن
جو کل تلک کہ جہالت کا خاص مؤطن تھا

ضیاء علم سے ہے آج مرکز توحید
جو کل تلک کہ نہاں خانۂ برہمن تھا

غلام قادؔر برحق ہے پونچھ کا ہر فرد جو
آپ سے پہلے اسیر ہوائے ان بن تھا

زبانیں حق کے تکلم پہ کھل گئیں اتنی
کہ آج وہ بھی ہے ناطق جو کل تک الکن تھا

طفیل ہے یہ ''ضیاء العلوم'' کا یہ پونچھ
ہدیٰ بدست ہے کل تک ہویٰ بد امن تھا

یہ مدرسہ رہے دائم بایں افادۂ عام
سفر میں وجہ سکوں تھا حضر میں مأمن تھا
خدا بحفظ و اماں رکھے پونچھ والوں کو
کہ جن کے لطف کا مورد یہ خاک سا تن تھا

صد سالہ اجلاس کا اعلان اور اسفار کا سلسلہ

۱۳۹۷ھ میں دار العلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا جس کے لئے حضرت حکیم الاسلامؒ نے متعدد ممالک کا دورہ کیا۔

۱۳۹۸ھ میں حضرت حکیم الاسلامؒ پھر پاکستان تشریف لے گئے اور کراچی میں اپنے رفیقِ خاص حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی تعزیت کے لئے ان کے مکان پر تشریف لے گئے اور دار العلوم کراچی میں تعزیتی خطاب فرمایا۔ اس کے بعد جامعہ اشرفیہ لاہور تشریف لے گئے۔ جامعہ خیر المدارس ملتان میں حضرت مولانا خیر محمد جالندھری کی تعزیت میں ایک مفصل خطاب فرمایا۔ اس کے علاوہ دار العلوم راولپنڈی۔ جامعہ رشیدیہ ساہیوال، دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور اور دوسرے شہروں میں خطابات ہوئے اور پاکستانی عوام اور علماء کرام کو مارچ ۱۹۸۰ء میں ہونے والے اجلاس صد سالہ میں دیوبند آنے کی دعوت دی۔ یہاں سے آپ امریکہ اور افریقہ اور دوسرے ممالک کے دورے پر روانہ ہوگئے اور وہاں بھی اجلاس صد سالہ کے پروگراموں کا اعلان فرمایا اور اس میں شرکت کی دعوت دی۔

۱۳۹۹ھ میں حضرت مہتمم صاحبؒ نے کئی ممالک کا دورہ فرمایا اور اجلاس صد سالہ کے انتظامات کے سلسلے میں شبانہ روز مصروف رہے اور پاکستانی عوام و علماء اور دوسرے اسلامی ممالک کے عوام سے اپیل کی کہ:

”اجلاس صد سالہ کا مرحلہ بالکل سامنے ہے اور اس عظیم منصوبے کو پورا کرنے کے لئے لاکھوں روپئے کی ضرورت ہے۔ مسلمانان ہند و پاکستان اپنے سب سے بڑے دینی ادارے کی اس تقریب کی قدر و قیمت کو پہچانیں اور فوری طور پر اپنے گراں قدر عطیہ سے دار العلوم کی امداد فرمائیں۔“

اس اعلان و اپیل پر متعلقین دار العلوم نے دل کھول کر امداد کی اور اجلاس صد سالہ کی بڑے جوش و خروش سے تیاریاں شروع ہوگئیں۔

۱۴۰۰ھ میں دار العلوم کا صد سالہ اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں پوری دنیائے اسلام کے علماء، زعماء اور

دوسرے مسلمانوں نے چالیس پچاس لاکھ کی تعداد میں دارالعلوم دیوبند کے اجلاس میں شرکت کی۔ افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے دارالعلوم کے ۱۱۷/سالہ دور کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ خطبہ استقبالیہ، اخبارات ورسائل میں مفصل شائع ہوا ہے۔

اجلاسِ صد سالہ

دارالعلوم دیوبند کے قیام کو اس وقت تقریباً ڈیڑھ سو سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے۔ مدارس دینیہ عربیہ کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے کہ وہ ہر سال اپنے فضلاء کو ڈگری دینے کے ساتھ ان کی دستار بندی یعنی ان کے سر پر پگڑی باندھتے ہیں۔ جو اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ طالب علم اب پڑھانے کے قابل ہو گیا ہے اور اس کے اساتذہ اس طالب علم کی نیک چلنی پر مطمئن ہیں۔ دارالعلوم میں پچھلے ڈیڑھ سو سال میں تین دفعہ اس قسم کی تقریبات منعقد ہوئی ہیں۔ جن میں فضلاء دارالعلوم کی دستار بندی کی گئی۔

سب سے پہلے جلسہ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ اور دیگر اکابر علماء کرام کی دستار بندی کی گئی تھی اور دوسرے جلسے میں جو کہ اس کے ۲۵/سال بعد ہوا تھا حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جیسے مشاہیر علماء کی دستار بندی کی گئی تھی۔ ان دو جلسوں کے بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مرحوم کی سعی و کاوش سے ان کے آخری دور اہتمام میں مارچ ۱۹۸۰ء میں فضلاء دارالعلوم دیوبند کی دستار بندی کے لیے یہ صد سالہ تقریبات منعقد کی گئی تھیں۔ جس میں تقریباً ۱۷/ہزار افراد کو سندِ فضیلت دی گئی اور ان کی دستار بندی کی گئی۔ یہ تقریبات ۲۱/مارچ تا ۲۳/مارچ تین روز تک جاری رہیں اور ان صد سالہ تقریبات دارالعلوم دیوبند میں تمام ممالک اسلامیہ سے فضلاء دیوبند اور دیگر معزز حضرات اور علماء کرام، نمائندگانِ حکومت اور سفراء عالم اسلام نے شرکت کی اور بڑے بڑے ممالک اسلامیہ کے سربراہوں کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔ تقریبات کی ابتداء پاکستان سے اسپیشل ٹرین کے پہنچنے پر ہوئی۔ پاکستان سے ایک ہزار سے زائد افراد پر مشتمل ایک اسپیشل ٹرین جس کی قیادت حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور، حضرت مولانا عبد القادر آزاد صاحب، حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی وغیرہ حضرات علماء نے کی۔

صبح ۶/بجے دیوبند کے اس نئے اسٹیشن پر پہنچی جو پنڈال کے سامنے ان تقریبات کے لیے بنایا گیا تھا۔

اسپیشل ٹرین کو لاہور میں کسٹم اور امیگریشن اور محکمہ صحت کے عملے نے بہت گرم جوشی کے ساتھ رخصت کیا تھا اس اسپیشل ٹرین کا استقبال دارالعلوم دیوبند کے منتظمین اور اہل دیوبند نے بڑے پُرتپاک انداز میں کیا۔

۲۰؍مارچ کو ہندوستان کے مختلف شہروں اور علاقوں سے اسپیشل ٹرینیں آدھ آدھ گھنٹہ بعد دیوبند آتی رہیں اور شام تک دیوبند کا ہر حصہ علماء کرام اور دوسرے لوگوں سے بھر چکا تھا۔ ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ لوگوں کی رہائش کے لیے پنڈال کے اردگرد خیمے لگائے گئے تھے اور ہر ملک کے لیے الگ الگ خیمے تھے اور وہاں پر رہائش کا اچھا انتظام کیا گیا تھا۔

۲۱؍مارچ تقریبات کے پہلے روز سب سے پہلے صبح نو بجے ہندوستان کے محکمے ڈاک نے اسی صد سالہ تقریبات کے لیے جو ٹکٹ جاری کیا تھا اس کی خریداری کا افتتاح کیا اور ڈاک خانے کے بڑے افسر نے دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے لیے ٹکٹوں کا پیکٹ بطور تحفہ پیش کیا اور اس کے بعد اس ٹکٹ کی فروخت دارالعلوم دیوبند اور پنڈال کے قریب بنے ہوئے ڈاک خانہ میں شروع کی گئی اور چند ہی گھنٹوں میں اس ٹکٹ کا اسٹال مکمل طور پر ختم ہو گیا۔

۲۱؍مارچ بروز جمعہ پنڈال ہی میں نماز جمعہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پنڈال اتنا بڑا بنایا گیا تھا کہ اس میں تقریباً دس لاکھ افراد بیٹھ سکتے تھے۔ اسٹیج بھی بہت بڑا بنایا جس میں تقریباً تین ہزار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اسٹیج پر کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ پنڈال میں سب سے آگے صحافیوں کے لیے میز کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ نماز جمعہ میں تقریباً انیس بیس لاکھ افراد نے شرکت کی اور اتنا بڑا ہجوم تھا کہ تمام پنڈال اور اس کے اردگرد اور تمام وہ شامیانے جو لوگوں کے قیام کے لیے بنائے گئے تھے نمازیوں سے بھر گئے تھے اور پھر بھی بہت سارے لوگ رہ گئے جنھوں نے اپنی نماز کا الگ انتظام کیا۔

واضح رہے کہ دیوبند کی تمام مساجد اور دارالعلوم کی بڑی مسجد میں بھی جمعہ کا انتظام حسبِ سابق تھا۔ پنڈال میں جمعہ کی نماز کی امامت کے فرائض حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے انجام دئے اور نماز کے بعد اتنے بڑے اجتماع نے اسلام کی سربلندی اور عالم اسلام کی خوشحالی اور اجتماع کی کامیابی کے لیے دعا کی۔

عجیب منظر تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، علماء، مشائخ، صوفیا اور عوام ہر قسم کے لوگ خدا تعالیٰ کے سامنے آہ وزاری کر رہے تھے اور اپنے عجز کا اظہار کر رہے تھے۔ اسی عاجزی اور آہ وزاری کا ثمرہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سہ روزہ اجتماع کامیاب کیا اور اتنے بڑے ہجوم میں کسی قسم کا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا اور نہ ہی کسی شخص

کوکسی قسم کی پریشانی ہوئی۔

نماز جمعہ کے بعد پہلے اجلاس کا آغاز مصر کے مشہور قاری عبدالباسط عبدالصمدؒ کی تلاوتِ پاک سے ہوا۔ اس کے بعد حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے خطبۂ استقبالیہ پیش فرمایا۔ ذیل کا خطبہ اردو کے ساتھ عربی متن بھی پیش کیا جاتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ:

خطبہ کا ترجمہ

الحمد لله و سلام علیٰ عباده الذین اصطفیٰ و بعد.

صدر محترم! حضرات گرامی علمائے کرام، مہمانان عظام ومعزز حاضرین!

ہم اس ایمانی اور تاریخی اجتماع کے موقع پر جو برصغیر کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی بین الاقوامی تعلیم گاہ ''جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند'' میں بین الاقوامی انداز میں منعقد ہو رہا ہے جس میں تقریباً تمام اسلامی ملکوں کے فضلاء اور اربابِ دانش جمع ہیں سب سے پہلے حق جل مجدہٗ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اسنے اس چھوٹی سی بستی میں ایسی بڑی بڑی ہستیوں کو یکجا کر کے ایک دوسرے کی زیارت و ملاقات، ربطِ باہمی اور اسلامی اخوت ومودت کو تازہ بتازہ کرنے کا موقع عطا فرمایا۔ ہم اس موقع پر غیر معمولی مسرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آئے ہوئے یہ کبرائے ملت ہم غربائے امت کے کندھوں سے کندھا ملائے بیٹھے ہوئے نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ دلوں سے دل ملا کر اسلامی اخوت مساوات اور مودتِ باہمی کا عملی ثبوت پیش کر رہے ہیں جو محض فضل خداوندی اور انعام ربانی ہے۔

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ. اس پر جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ **فللّٰه الحمد.**

ہم بصمیم قلب دعا گو ہیں کہ اہل علم کی ہمت افزائی اور ملّت اسلامیہ کی عزت افزائی کے لئے آپ حضرات اس سرزمین علم پر بار بار قدم رنجہ فرمائیں۔ آمین

شکر وسپاس

اس کے بعد میرا سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ خوشگوار فریضہ یہ ہے کہ میں بحیثیت خادم جامعہ اپنی مجلس شوریٰ، اپنے ادارہ کے اساتذہ، شیوخ، طلبۂ عزیز، فضلاء گرامی، مسلمانانِ ہند، جمیع کارکنان ادارہ اور بالخصوص اجلاس صد سالہ کے مخلص کارکنوں کی طرف سے آنے والے مہمانانِ کرام کا شکریہ ادا

کروں، جنہوں نے مشرق و مغرب کے دور دراز سفروں کی صعوبتیں جھیل کر محض اللہ کے لئے اس بین الملّی اجتماع میں شرکت فرمائی۔

بلاشبہ یہ اسلام ہی کی جامعیت اور اجتماعیت کا کرشمہ ہے کہ ہم جیسے غرباء ان کبرائے قوم اور عظمائے ممالک کو اپنے درمیان دیکھ رہے ہیں اور ان کے پُر از مودت و اخوت چہروں کی چمک دمک سے اپنی آنکھوں کا نور اور دلوں کا سرور بڑھا رہے ہیں جس میں علماء و عرفاء بھی ہیں اور اصحابِ حدیث و تفسیر بھی، اربابِ فقہ و اصول بھی ہیں اور دانایانِ فلسفہ و کلام بھی، علومِ شریعت کے شیوخ بھی ہیں اور علومِ جدیدہ کے دانشور بھی، عمائدین ملک و ملت بھی ہیں اور زعماء ممالک و اقوام بھی جن میں سے ایک ایک فرد ایک مستقل یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے اور اپنی مؤقر خدمات سے انسانیت کے لئے رہنما تسلیم کیا گیا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ کس زبان سے اور کن الفاظ میں ان جلیل القدر ہستیوں کا شکریہ ادا کریں جس کہ الفاظ تو جذبۂ امتنان و منت پذیری سے اوپر چڑھنا چاہتے ہیں لیکن ان ہستیوں کی بلند مکانی تک صد ہزار کوششوں کے باوجود نہیں پہنچ سکتے۔

دامانِ نگہ و تنگ گلِ حسن تو بسیار

ہم زبان و بیان بلکہ زمین و آسمان سے بھی زیادہ وسعت رکھنے والے اور ایمانی تقاضوں اور روح اسلامی سے مملو پرخلوص جذباتِ تشکر کو دعائیہ تعبیر میں آپ حضرات کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں ہے کہ: **"جزاکم اللہ فی الدارین خیرا" و ابقاکم فی عز علی الدوام" آمین**

دیوبند ایک تاریخی اور مرکزی بستی

حضراتِ محترم!

یہ بستی (دیوبند) جس میں آپ سب حضرات جمع ہیں، بہت پرانی اور قدیم الایام بستی ہے، تاریخوں سے تقریباً ڈھائی تین ہزار سال تک اس کی آبادکاری کا پتہ چلتا ہے، قدیم زمانہ سے یہ بستی برادرانِ وطن کی ایک زبردست تیرتھ گاہ ہونے کی وجہ سے (جو "دیوی کنڈ" کے نام سے معروف ہے اور اس پر آج بھی سالانہ میلہ لگتا ہے) مرکزیت کی حامل ہے، اس دیوی کنڈ ہی کے نام پر اس بستی کا قدیم نام "دیبی بن" تھا جو کثرت استعمال سے "دیوبند" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اس چھوٹی سی بستی میں جس میں مسلمانوں کی تعداد و مساجد شاہی زمانوں کی یادگاریں ہیں، آدینی مسجد (یعنی قدیم جامع مسجد) پانچ سو سال اور ایک روایت کے مطابق آٹھ سو سال پرانی ہے، جس کے

سنگین کتبہ پر بہلول شاہ ثبت ہے۔ مسجد خانقاہ عہد اکبری کی یادگار ہے، مسجد سرائے پیرزادگان عہدِ جہاں گیری کے آثار میں سے ہے۔

یہ بستی شمالی ہند میں ۲۹ درجہ ۵۸ دقیقہ عرض البلد اور ۷۷ درجہ ۳۵ دقیقہ طول البلد دہلی سے ۹۲ میل شمالی جانب صوبۂ یوپی میں واقع ہے، شیر شاہی شاہراہ اعظم جو پشاور سے کلکتہ تک چلی گئی ہے، اس بستی سے ہو کر گزرتی ہے اس بستی میں قدامت کے ساتھ مرکزیت کی شان بھی پہلے ہی سے موجود تھی، لیکن قدرت کو اس رسمی مرکزیت سے شرعی مرکزیت کا کام لینا تھا اور اس جگہ سے علم کا ایک ہمہ گیر چشمہ جاری کرنا تھا جو نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک کو بھی علوم نبوت سے سیراب کرے۔

روشن ضمیر، اہل دل اس کی پیشین گوئیاں پہلے سے کرتے آرہے تھے (جس کی تفصیل ''تاریخ دارالعلوم'' میں دی گئی ہے) ان پیشین گوئیوں کے مطابق یہ بستی عالموں، فاضلوں، قادر الکلام ادیبوں، آزادی کے جاں باز مجاہدوں اور دینی میدان کے سرفروشوں کی بستی بننے والی تھی، یا بہ اسباب ظاہرہ یہاں کی قدیم مساجد کی اذانوں اور تکبیروں، ذکر و تلاوت کی محفلوں اور نمازیوں کے جمگھٹوں کی برکات کا ظہور دینی رنگ میں ہونے والا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کا پس منظر اور اسبابِ تاسیس

وقت آیا تو ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ رست و خیز کے بعد اس بستی کا نیا دور شروع ہوا اور یہاں علمی و عرفانی زندگی کا ستارہ طلوع ہوا، جبکہ ہندوستان کی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ میں جا چکی تھی، اسلامی شوکت کے چراغ میں صرف دھواں اٹھتا ہوا رہ گیا تھا جو چراغ کے بجھ جانے کا اعلان تھا، دہلی کا تختِ مغل اقتدار سے خالی ہو چکا تھا، اسلامی شعائر رفتہ رفتہ رو بہ زوال تھے، دینی تعلیم گاہیں اور علمی خانوادے اجڑ چکے تھے، دینی شعور رخصت ہو رہا تھا، جہالت و ضلالت کی گھٹائیں اُفقِ ہند پر چھا چکی تھیں، سننِ انبیاء کی جگہ جاہلانہ رسوم و رواجات مشرکانہ بدعات و خرافات اور ہوا پرستی زور پکڑتی جا رہی تھی جس سے دہریت و الحاد، فطرت پرستی، آزاد فکری، بے قیدی نفس اور فضولیت کی وبا پھوٹ پڑی تھی، چمنِ اسلام میں خوش آواز پرندوں کے زمزموں کی جگہ زاغ و زغن کی مکروہ آوازوں نے لے لی تھی، مسلمان مضطرب و بے چین اور مایوسی کا شکار تھے، علماء کے لئے پھانسیوں کے پھندے تھے یا جلا وطنی کے مصائب، اس وقت چند نفوسِ قدسیہ نے منور قلوب میں یہ خلش اور کسک محسوس کی کہ ستم رسیدہ مسلمانوں کے ملّی وجود کے تحفظ اور علوم نبوت اور اسلامی معاشرے کو بچانے کی کیا صورت اختیار کی جائے اور ان میں شعور اور ایمان دارانہ سیاسی فکر کو حیاتِ نو کس

طرح بخشی جائے تو یہ صلحائے امت کمر ہمت باندھ کر میدان میں آئے جو رسمی قسم کے لیڈر نہ تھے بلکہ خدارسیدہ بزرگ اور اولیاءِ وقت تھے جو غیبی اشارے کے تحت کھڑے ہوئے اور آگے بڑھے جن کے سربراہ حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے جنہوں نے اس غیبی اشارے کو سمجھ کر اسے اس تجویز کی صورت دی کہ ایک دینی درسگاہ قائم کی جائے اور اس کی تعلیم وتربیت اور علم وعمل کے ذریعہ ڈوبتے ہوئے مسلمانوں کو سہارا دے کر دلوں کی مردہ زمینوں کو زندہ کیا جائے۔

چنانچہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو تعلیمی رنگ میں عالمگیر احیاءِ دین کی تحریک کا یہ پودا چھتہ مسجد میں (جو آپ حضرات کی نگاہ میں آچکی ہے) ایک انار کے درخت کے نیچے صرف دو آدمیوں کے ذریعہ نصب کیا گیا، دونوں کا نام محمود تھا، ایک محمود معلّم تھا اور ایک محمود متعلّم جو بعد میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے نام سے معروفِ زمانہ ہوا۔ اس وقت نہ اس گمنام مدرسہ کے پاس اپنا کوئی مکان تھا نہ مکان بنانے کا سرمایہ نہ پروپیگنڈہ تھا نہ اشتہار واعلان کا تخیل، صرف توکل علی اللہ کا سرمایہ تھا جس کی تلقین اور تاکید خود بانیٔ اعظم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کے ہشت گانہ اساسی اصول میں بار بار بشد ومد کی گئی ہے۔

دار العلوم دیوبند احیائے دین کی عالمگیر تحریک

غور کرنے کی بات ہے کہ جس طرح ہندوستان سے اسلامی شوکت ختم ہو جانے کا حادثہ محض مقامی یا محض ملکی قسم کا نہ تھا بلکہ عالمی رنگ کا تھا، جس کے دور رس اثرات دوسرے اسلامی ملکوں پر بھی پڑے، چنانچہ تھوڑی ہی مدت کے بعد ہندوستان کی غلامی کتنے ہی ملکوں اور ریاستوں کی غلامی پر منتج ہوئی، اسی طرح ایمانی اور علمی رنگ میں احیاءِ دین کی یہ تحریک جو ''محمود دین'' سے شروع ہوئی، ابتداء محض ایک ضعیف کونپل کی صورت میں نمودار ہوئی مگر اہلِ نظر کی نظر میں اس کونپل بلکہ اس کے تخم ہی میں ایک تناور درخت شجرۂ طیبہ لپٹا ہوا محسوس ہو چکا تھا، جس کے شیریں ثمرات سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک بھی بہرہ مند ہونے والے تھے اور وہ دین کی نشأۃِ ثانیہ کا مصدر ومنشاء بننے والا تھا۔

اس لئے جہاں غلامی کے رنگ میں اس ملک کی تخریب عالمی تھی وہیں تعلیمی رنگ میں تعمیری تحریک بھی بانیٔ اعظم کے فکر پر عالمی ہی رنگ سے اٹھی، جو نہ صرف علم دین کے لحاظ سے ہی عالمگیر ہوتی چلی گئی بلکہ قومی اور ملکی مفادات کے لحاظ سے بھی ہمہ گیر ثابت ہوئی تا آں کہ اسی تحریک کے پروردوں نے جہاں سو برس بعد غلام ہندوستان کو آزاد کرایا وہیں اس کے طبعی نتیجہ کے طور پر جو ممالک اور ریاستیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے وہ بھی رفتہ رفتہ آزادی کا سانس لینے لگے، تخریب اگر عالمی انداز کی تو اس کے ردعمل کے

طور پر یہ تعمیر بھی عالمی ہی انداز سے ابھری، جس کا علمی و عملی فیضان چند ہی سال میں ایشیاء سے آگے بڑھ کر افریقہ تک پھیل گیا اور آج یورپ و امریکہ تک بھی اس کی شعاعیں پہنچ چکی ہیں۔ ان ساری آزادیوں کا خاموش رہنما بھی جامعہ دارالعلوم دیو بند تھا، جس کے فضلاء نے درس و تدریس کے ساتھ مختلف قومی سیاسی اور اجتماعی میدانوں میں اتر کر تحریکات کے ذریعہ اس ملک میں آزادی کی روح پھونکی اور ۱۸۵۷ء ہی سے پھونکنی شروع کر دی تھی، جبکہ ملک کے دوسرے حلقے سراسیم اور خاموش تھے یا خوشامد میں لگے ہوئے تھے، ان بزرگوں نے غاصب انگریز کا مقابلہ ابتداءً آہنی تلوار سے کیا، پھر امن اور علم کی ناقابلِ شکست طاقت سے نبرد آزما ہوئے اور علمی رنگ سے یہ جذبات دوررس ثابت ہوئے اور آزادی کی لہریں دور دور تک پھیلیں جس سے اس جامعہ کے مؤسسین، فضلاء اور روشن ضمیر حلقوں کی سنہری تاریخ بھری ہوئی ہے۔

جامعہ دارالعلوم کا بنیادی اور ہمہ گیر مقصد

اس مرکزی جامعہ کی تعلیم کا اساسی مقصد کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کی تعلیم و ترویج اس کی علمی تمرین اور عمومی اشاعت و تبلیغ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تعصب آمیز منافرتوں کا استیصال کر کے مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے، تاریخ اس پر شاہد ہے کہ بحیثیت مکتبِ فکر اس درسگاہ نے ہر اسلامی طبقہ کی طرف موانست ومحبت کا ہاتھ بڑھایا اور بحیثیت جامعہ اس نے اپنا تعلیمی نصاب ایسا جامع رکھا کہ کوئی بھی اسلامی طبقہ اس سے باہر نہ رہ سکے، نصاب میں حفظ قرآن سے لے کر تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، کلام، بلاغت و بیان، حقائق و اسرار اور ان منقولات کے ساتھ علوم معقولہ منطق فلسفہ، ریاضی ہیئت، عوارض و قافیہ مناظرہ اور اختیاری فنون، مبادی سائنس معلومات عامہ، علم طب، صنعت و حرفت اور خوشخطی وغیرہ نصاب درس میں شامل کیں تا کہ کوئی بھی علمی، عملی، اخلاقی اور صنعتی طبقہ اس اجنبیت کو محسوس نہ کرے اور نہ صرف یہی بلکہ علم دین کے ہر بنیادی شعبے کو اس جامعہ میں ایک مستقل مدرسہ و کلیہ کی حیثیت و صورت دی گئی ہے جیسے مدرسۃ القرآن، مدرسۃ التجوید، مدرسۂ فارسی و ریاضی، کلیۃ الطب، کلیۃ الصنائع، کلیۃ اللغۃ العربیہ اور کلیۃ الفقہ والافتاء وغیرہ۔ اس طرح اس درسگاہ نے ایک مذہبی یونیورسٹی اور جامعہ کی صورت اختیار کر لی اور الحمد للہ ہر ہر فن کے متخصص تا حال اس سے ۱۶ر ہزار تیار ہو چکے ہیں اور جامعہ سال بہ سال مائل بہ ترقی ہے۔ ان ۱۶ر ہزار فضلاء کی تعداد میں مدرسین بھی ہیں اور مبلّغین بھی، خطباء بھی ہیں اور مقررین بھی، زعماء بھی ہیں اور مصلحانِ روحانی بھی، فضلاء دارالعلوم کی مذکورہ ۱۶ر ہزار تعداد بلا واسطہ ہے اور بالوسائط ان فضلاء کو بھی شمار کیا جائے جو فضلائے دیو بند کے تیار کردہ ہیں تو یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے

اور اس علمی گہوارہ کے لاکھوں لاکھ مستفیدین نہ صرف برِّ صغیر میں بلکہ ایشیاء، افریقہ، یورپ اور امریکہ تک میں بیش بہا دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد حضرت بانیٔ دارالعلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ العزیز اور جملہ بزرگانِ دیوبند کی سب سے بڑی سیاست ہی یہ تھی کہ دینی تعلیم گاہیں قائم کر کے مسلمانوں کو سنبھالا جائے، چنانچہ حضرت الامامؒ بانی دارالعلوم نے دیوبند کے علاوہ بھی جگہ جگہ بنفس نفیس پہنچ کر دینی درسگاہیں قائم کیں اور اپنے متوسلین کو خطوط بھیج بھیج کر بڑی تعداد میں مدارس قائم کرائے، دارالعلوم دیوبند کے منہاج پر اور قاسمی فکر سے وابستہ معاہد و مدارس دینیہ ہی برصغیر میں درحقیقت دین کی بقاء وتحفظ کا ذریعہ ثابت ہوئے اور ہو رہے ہیں، اس طرزِ فکر کی کامیابی پر گزشتہ صدی کے ایک ایک دن اور ایک ایک رات نے مہر تصدیق ثبت کی ہے اور آج بحمد اللہ ایشیاء، افریقہ اور یورپ میں دیوبند مکتب فکر کے ہزاروں مدارس موجود ہیں جن میں یہی علماء دیوبند علمی، تعلیمی، تبلیغی اور تصنیفی خدمات انجام دے رہے ہیں کہ تعلیم وتربیت کے بغیر تحفظ دین اور اتباعِ سنتِ نبوی کے راستے پر مسلمانوں کو چلانے اور قائم رکھنے کی اور کوئی صورت نہیں، نبی کریم ﷺ نے اپنی بعثت کا بنیادی مقصد تعلیم اور تربیت اخلاق ہی ظاہر فرمایا ہے۔

انما بعثت معلما اوربعثت لاتمم مکارم الاخلاق. او کما قال علیه الصلوٰة و السلام.

یعنی احکام کا تعلق تعلیم سے ہے جو حدیث اوّل کا مفاد ہے اور احکام کے مطابق زندگی گزارنے کا تعلق تربیت اور تزکیۂ اخلاق سے ہے جو دوسری حدیث کا مفاد ہے، اس لئے علمائے دارالعلوم نے انہی دونوں چیزوں کو اپنی زندگی کا بنیادی مقصد ٹھہرایا اور کامیابی کے ساتھ یہ منازل طے کیں۔ **ترکت فیکم الذین لن تضلوا ما تمسکتم بهما کتاب اللّٰه و سنة رسوله.** (ابن ماجہ شریف)

دارالعلوم کی تصنیفی خدمات

اس مکتب فکر کا دوسرا سلسلہ تصنیف وتالیف کا ہے تو اس سلسلے میں بھی علمائے دیوبند کے قلم حقیقت رقم نے پانچ ہزار سے زائد تصانیف کا عظیم الشان ذخیرہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں جمع کیا جو برّ صغیر کے ہر اسلامی مکتب فکر سے بدرجہا زائد اور وقیع ہے۔

تصنیف وتالیف کا سلسلہ آغازِ دارالعلوم ہی سے شروع ہو گیا تھا، خود حجۃ الاسلام حضرت بانیٔ اعظم مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی تصانیف ۲۵/ سے زائد ہیں، جن میں علم کلام، عقائد اور فقہیات وغیرہ کو عقلی اور حسی

دلائل سے مبرہن کیا ہے اوران کے بعدان کے تلامذہ نے اس سلسلے کو نہر سے بحر بنا دیا۔ دارالعلوم کے مشہور مصنفین جنہوں نے فنون دینیہ، حدیث، تفسیر، فقہ، کلام، احسان، اجتماعیات، سیاسیات، تاریخ اور سیرت وغیرہ میں تصنیفی خزانہ جمع کیا ہے ان میں سرِ فہرست نام حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا آتا ہے جن کی تصانیف کا عدد ایک ہزار تک پہنچا ہوا ہے جو موصوف نے ہر علم وفن میں، نثر ونظم میں، عربی فارسی اور اردو میں مدوّن فرمائیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا عبدالعزیز صاحبؒ محدث گوجرانوالہ پاکستان، حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحبؒ سابق مدرس دارالعلوم دیوبند و محدّث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، حضرت علامہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ محدّث دارالعلوم دیوبند، پھر ان کے تلامذہ میں حضرت شیخ الاسلام، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ''صاحبِ فتح الملہم'' حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ محدّث مدرسہ امینیہ دہلی وصدر جمعیۃ علماء ہند، حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ مدیر رسالہ ''القاسم'' و''الرشید'' دیوبند، حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ شیخ الادب والفقہ دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحبؒ سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ محدّث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ محدّث دارالعلوم دیوبند، پھر حضرت علامہ کشمیریؒ کے تلامذہ میں مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی ثم المدنیؒ، مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ مفتی اعظم پاکستان، مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادیؒ، مدیر برہان دہلی، مولانا منظور نعمانی صاحب مدیر ''الفرقان'' لکھنؤ، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور، مولانا حامد الانصاری غازی صاحب، نیز حضرت شاہ صاحبؒ کے حقیر ترین تلامذہ میں یہ احقر راقم السطور بھی شامل ہے، جس کی تصنیفات سو سے اوپر ہیں، اس کے بعد حضرت مولانا مدنیؒ کے تلامذہ میں مولانا عبدالحق صاحب بانی دارالعلوم اکوڑہ خٹک پاکستان، مولانا سید محمد میاں صاحبؒ محدّث مدرسہ امینیہ دہلی، مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ، سربراہ مدرسہ رحمانیہ مونگیر، بہار وغیرہ اور ہزاروں وہ فضلاء ہیں جن کے قلم سے ہزار ہا تصانیف وجود میں آئیں اور اس طرح تصنیف کے سلسلہ میں بھی یہ مکتبِ فکر برصغیر کے تمام مکاتبِ فکر سے آگے اور ممتاز ہے، جس نے دین کے ہر ہر گوشے کو اجاگر کیا اور وقت کے تقاضوں کے مطابق مسائل کو علمی رنگ میں دنیا کے سامنے رکھا۔

ساتھ ہی دارالعلوم محض ایک تعلیم گاہ ہی نہیں بلکہ ایک عملی تربیت گاہ بھی ہے جہاں علم کے ساتھ عملِ

صالح، اخلاقِ فاضلہ اور کثرتِ ذکر کی روح بھی طلبہ میں پھونکی اور پیوست کی جاتی ہے، اس ادارہ میں حسن سلوک واحسان کے تحت شخصی تربیت کے علاوہ اصولی اور علمی طور پر بھی فن کے مسائل کو کتاب وسنت سے واشگاف کر کے اس مصنوعی تصوف پر کاری ضرب لگائی ہے جو فی زمانہ بنام تصوف چند بندھی جڑی رسوم و بدعات ومحدثات کا مجموعہ ہو کر رہ گیا ہے، اس لئے یہاں سے پڑھ کر نکلنے والوں میں علم کے ساتھ عزتِ نفس، وقار، استغناء اور خودداری کے ساتھ خاکساری، تواضع، زہد وتقویٰ اور صلاح ورشد کی روشنی بھی راسخ ہوتی ہے، جو اس کے فروعی مدارس میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ دارالعلوم دیوبند برصغیر کے مدارس و جامعات میں ام الجامعات ہے، اس لئے اسے ازہر الہند بھی کہا جاتا ہے، جس کے فیضان سے ہزارہا مدارس ومعاہد چل رہے ہیں اور لاکھوں کے قلوب میں ایمانوں کی حفاظت ہو رہی ہے اور بے شمار افراد طریقِ سنت پر لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس دور کی عقلیت پسندی اور خوگری محسوسات چوں کہ نقلیات دین کے ماننے میں حارج ہوتی تھی، اس لئے انہی فضلائے دارالعلوم دیوبند نے قاسمی رنگ سے متکلمانہ انداز کی بھی سینکڑوں تصنیفی سطح پر لا رکھیں، جس سے نام نہاد عقلی شکوک وشبہات، تمدنی تاویلات اور معاشی تحریکات کا پردہ یکسر چاک ہو گیا، ان فضلاء گرامی کو اگر چہ دستار وسند تو آج دی جا رہی ہے لیکن بہت پہلے سے اپنی خدمات و تعلیمات سے خود سند ومستند ثابت ہو چکے ہیں۔

جامعہ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی امتیاز

اس دارالعلوم میں خصوصیت سے تدریس حدیث پر غیر معمولی توجہ دی جاتی ہے، جو قرآن حکیم کی اوّلین تفسیر اور فقہ اسلامی کا اوّلین سرچشمہ ہے، اس لئے فن حدیث کی تکمیل سے قرآن مبین اور فقہ فی الدین دونوں کے سمجھنے کی صحیح استعداد پیدا ہو جاتی ہے، اس کے نصاب کا اساسی حصہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، بلاغت ومعانی، ادب عربی اور صرف ونحو ہے، بقیہ فنون بطور مبادی اسباب یا بطور آثار ونتائج پڑھائے جاتے ہیں۔

دارالعلوم کا سلسلۂ سند

اس دارالعلوم کا سلسلۂ سند اساتذۂ دارالعلوم سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ تک اور ان سے سند متصل کے ساتھ نبی کریم ﷺ تک پہنچتا ہے، دارالعلوم کی جماعت خالصۃً اہل سنت والجماعت ہے، جس کی بنیاد کتاب وسنت اور فقہ ائمہ پر قائم ہے، اس کا اصلِ اصول توحید اور عظمتِ رسالت ہے جو تمام

انبیاء کا دین رہا ہے، اس کے ذوق پر تمام مسائل میں اوّلین درجہ نقل و روایت اور آثار سلف کو حاصل ہے، اس لئے فضلائے ادارہ کتاب وسنت کی مرادات اقوال سلف سے، ان کے متوارث تعامل و ذوق کی معرفت کے ساتھ اساتذہ وشیوخ کی تربیت وصحبت اور معیت و ملازمت سے حاصل کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ مکتبِ فکر عقل ودرایت اور تفقہ فی الدین کو بھی فہم کتاب وسنت کا ایک اہم ترین رکن قرار دیتا ہے۔

جامعہ دارالعلوم کا انتظامی طریقۂ کار

انتظامی حیثیت سے اس دارالعلوم کی تعلیمات وانتظامات کی نگران اعلیٰ ایک مؤقر مجلس شوریٰ ہے جس میں ملک کے مقتدر علماء وارباب فکر ونظر فضلاء شامل ہیں، جن میں بعض بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، ادارۂ اہتمام مجلس شوریٰ کا نمائندہ اور معتمد ہے جو ادارہ کا انتظام سنبھالتا ہے، اس مرکزی ادارۂ اہتمام کے تحت چوبیس انتظامی شعبے ہیں، ساٹھ اساتذہ اور دوسو سے اوپر شعبہ جاتی عملہ ہے جو تقسیم کار کے اصول پر کام کرتا ہے، ان تمام شعبوں کا حقیقی مقصد اساتذہ اور طلبہ کی ضروریات کی تکمیل اور نظام تعلیم کی استواری ہے، جس پر سالانہ تیس لاکھ روپیہ صرف ہوتا ہے، جس کی تکمیل کا شعبۂ محاسبی ذمہ دار ہے، اس کے ذریعہ ہر سال میزانیہ تیار ہو کر مجلس شوریٰ سے منظور کرایا جاتا ہے اور اسے باضابطہ آڈٹ بھی کرایا جاتا ہے۔

ملّی اور اجتماعی دائروں میں جامعہ دارالعلوم کی تاریخی خدمات

اسی کے ساتھ دارالعلوم کی سرگرمیاں محض درس وتدریس تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس نے قومی اور سیاسی معاملات میں بھی اندرون حدودِ شرعیہ بڑھ چڑھ کر قائدانہ حصہ لیا اور لے رہا ہے اور اس کے اکابر کے کارنامے بھی تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اور حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلویؒ نے جہاد اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جو نقش اپنے پاکیزہ لہو سے کھینچا تھا وہ ہر وقت علماء دیوبند کے سامنے ہے۔

۱۸۵۷ء میں حضرت نانوتویؒ بانی اعظم دارالعلوم اور حضرت قطب وقت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سرپرست اعظم دارالعلوم نے شاملی کے میدان میں تلوار اٹھائی اور انگریزوں سے جنگ کی۔ حضرت نانوتویؒ مجاہدین کے قائد تھے، پھر ان کے تلمیذ رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اسی قیادت کو لے کر اٹھے اور آزادیٔ ہند کے لئے وہی ۱۹۱۵ء کی ریشمی خط کی انقلابی تحریک کے قائد تھے جس کا مرکز افغانستان تھا اور کثیر التعداد سینٹر مختلف ملکوں میں قائم تھے، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور انصاریؒ، مولانا سید احمد صاحب مدنیؒ جیسے سرفروش مجاہد ان کے دست راست تھے، اس

راہ میں ہزاروں شہید ہوئے، ہزاروں غازی بنے، خود حضرت شیخ الہندؒ پانچ سال تک فرنگی قید میں مالٹا رہے اور رہا ہونے کے بعد ہندوستان پہنچ کر اسی جوش جہاد سے جمعیۃ علماء ہند کی سرپرستی فرمائی اور آپ کے بعد یہ جماعت فضلاء دارالعلوم ہی کے تحت مصروف خدمت رہی۔ ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت اور پھر ۱۹۳۰ء کی تحریک آزادی میں دیوبند کے کتنے ہی علماء نے قائدانہ حصہ لیا، یہ اسی موروثی جذبہ اور عمل کا اثر تھا کہ جب ملک معظم عبدالعزیز آل سعود نے جزیرۂ عرب میں اسلامی حکومت کا پرداز ڈالا تو علماء دیوبند نے سب سے پہلے اس کی حمایت کی اور دیوبند سے متعدد علماء اس کی تائید کے لئے سفر کر کے حجاز پہنچے، اسی طرح ماضی قریب میں جب بیت المقدس اور فلسطین کی آزادی کی تحریک اٹھی تو صہیونی اور برطانوی سامراج کے خلاف علماء دیوبند ہی کا فتویٰ سب سے پہلے صادر ہوا اور ان مسائل میں دارالعلوم ہی نے تمام مسلمانوں کو اختلافات سے بالاتر ہو کر ایک محاذ پر جمع کیا اور اجتماعی احتجاج عمل میں آیا۔

اس طرح ہندوستان میں مسلمانوں پر مظالم اور انہیں پسماندہ و متفرق کرنے کے لئے جب نزاعی مسائل کھڑے کئے گئے تو ان کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے بھی فضلاء دیوبند آگے بڑھے، چنانچہ مسلمانوں میں تنظیمی اور طبقاتی اتحاد پیدا کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم مشاورت قائم کی گئی جس کی سربراہی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ فاضل دیوبند رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کر رہے ہیں، اس لئے اگر دارالعلوم کی یہ خواہش ہو کہ عالم اسلام کے رہنما، تعلیمی، علمی، تمدنی اور اجتماعی میدانوں میں علماء دیوبند اور مسلمانانِ ہند سے تعاون کریں تو اس کی ہمہ جہت روشن تاریخ کی روشنی میں یہ خواہش یقیناً بجا اور برمحل ہوگی۔ حاصل یہ کہ جب بھی کوئی سیاسی فتنہ اٹھا جس سے مسلمانوں کے اجتماعی یا مذہبی معاملات کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہوا تو علماء دیوبند نے بیرون ملک بھی اس کے سدباب میں وہی پامردی دکھلائی جو اندرون ملک ہمیشہ کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔

جامعہ دارالعلوم اور باطل تحریکات کا مقابلہ

انگریزی حکومت کے ایماء سے اس ملک میں بہت سی گمراہ کن سیاسی اور مذہبی تحریکیں اٹھیں جن کے ذریعہ یہاں کے باشندوں اور خصوصیت سے مسلمانوں کو راہِ راست سے ڈگمگانے کی کوششیں کی گئیں مگر دارالعلوم دیوبند اور اس کے فضلاء نے پامردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور بحمد اللہ ان کوششوں کی بدولت مسلمان انگریزی حکومت کی دسیسہ کاریوں سے بہت حد تک محفوظ رہے، بعض باطل پسندانہ تحریکات

حضرت بانی اعظمؒ کی حیات میں بڑے طمطراق کے ساتھ میدان میں آئیں اور ان کی جانب سے اسلامی احکام و مسائل پر جاہلانہ اور غلط اعتراضات کی بوچھار کی گئی، لیکن حضرت بانی دارالعلوم اور پھر ان کے تلامذہ نے مناظروں اور تصانیف کے ذریعہ ان کے برخلاف ایک مضبوط بندھ باندھ کر انہیں ختم کر دیا۔

انکار حدیث کا فتنہ ابھرا تو انہیں فضلائے دیوبند نے جیسے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی اور راقم الحروف نے نہایت مدلل کتابیں تالیف کر کے اس کا سدّ باب کیا، اسی طرح قادیانیت اور دوسرے طریقوں سے مسلمانوں کو مرتد بنانے کی اسکیم تیار ہوئی تو دارالعلوم دیوبند نے پچاس سے زیادہ فضلاء اس کے مقابلہ کے لئے میدان میں اتار کر ان مکروہ سازشوں کا قلع قمع کیا، فقہیات اسلامی میں مداخلت کا فتنہ اٹھا تو دارالعلوم ہی نے قضاء شرعی قائم کرنے کی تحریک اٹھائی اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس دارالعلوم نے پانچ سو علماء کے دستخطوں سے برطانوی حکومت کے سامنے محکمہ قضاء شرعی کا مطالبہ پیش کر دیا، جس سے یہ باطل تحریک مضمحل ہوگئی، ابھی ماضی قریب میں دوبارہ اس تحریک نے ترمیم فقہ کا روپ اختیار کیا اور عائلی قوانین اور فقہ میں ترمیم کرنے کی آوازیں بلند ہوئیں تو دارالعلوم ہی کی تحریک پر بمبئی میں تمام مسلم فرقوں کا کنونشن بلایا گیا اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ قائم ہوا، جس کی صدارت بالاتفاق مہتمم حال دارالعلوم دیوبند کے سپرد کی اور بورڈ کی متحدہ احتجاجی آواز پر حکومت نے اعلان کیا کہ وہ خود مسلم پرسنل لاء میں کوئی ترمیم نہیں کرے گی۔

غرض برصغیر میں جامعہ دیوبند کے ان علماء ربانیین اور فضلاء صالحین نے درس و تدریس کے مشاغل کے ساتھ مذہبی اور دینی فضاء کو مکدر اور زہر آلود نہیں ہونے دیا بلکہ قلوب اور دماغوں کو جلا بخشنے کے لئے مدلل تحریر و کتاب اور تقریر و خطاب کے ذریعہ ایک زبردست پشتہ بنا کر ان سیلابوں پر بند باندھ کیا۔ اس طرح برصغیر کے مشرکانہ ماحول میں اس نے دین توحید کو اس کی اصلی صورت میں قائم و برقرار رکھا ہے اور آج یہ جامعہ اس بین الاوطانی اجتماع میں اپنی خدمات پر ایک بڑی حسی دلیل کے طور پر اپنے ان ہزاروں فضلاء کو پیش کرنے میں شکر آمیز فخر محسوس کر رہا ہے جن کی خدمات سے اطرافِ عالم میں دین پھیلا اور پھیل رہا ہے۔

عصری بین الاقوامیت کے تقاضے

یہ علمی اور عملی ثمرات اس وقت کے ہیں جب کہ دنیا پھیلی ہوئی تھی اور ہر ملک کا دائرہ عمل اپنی ہی حدود تک محدود رہتا تھا، لیکن آج وسائل نقل و حمل اور ذرائع علم و خبر کے وسیع تر ہو جانے کے سبب یہ پوری دنیا

سمٹ کر ایک عائلہ اور قبیلہ بن چکی ہے اور کوئی بھی ملک محض اپنی داخلی سیاست سے اپنا کام نہیں چلا سکتا، جب تک کہ اس کے روابط دوسرے تمام ممالک سے مستحکم نہ ہوں، اسی لحاظ سے آج دنیا کے سارے ممالک ملک واحد بن چکے ہیں اور پوری دنیا ایک نقطہ پر آ گئی ہے، اس لئے سیاسی امور ہوں یا انتظامی، سب بین الاقوامی رنگ ہی میں نمایاں ہو رہے ہیں، اس لئے ہمیں بھی مقامیت سے آگے بڑھ کر بین الاقوامیت کے دائرہ میں قدم رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، گو دارالعلوم کا مزاج ابتداء ہی سے بین الاقوامی ہے، اس نے قومی اور بین الاقوامی اسلامی تحریکات و اجتماعات میں بھی شرکت سے کبھی گریز نہیں کیا، مؤتمر عالم اسلامی مصر، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ، مؤتمر السیرت والسنہ، دوحہ وقطر، مؤتمر الجغرافی فی ریاض، ریاض میں اس کے نمائندگان نے شرکت کی اور اب اس اجلاس صد سالہ کے تعارف کے سلسلہ میں بھی دارالعلوم نے اپنا وفد کویت، سعودی عرب اور امارات متحدہ بھیجا نیز رابطہ عالم اسلامی کی فرمائش پر یہاں سے تربیت الاطفال کے سلسلہ میں متعدد اہل قلم نے مقالات ارسال کئے اور آج بھی دارالعلوم کا یہی جذبہ ہے کہ اس کے ان علمی اور ثقافتی مقاصد کو اجتماعی رنگ سے عالمگیر بنایا جائے اور اسلامی تعلیمات کو اجتماعی قوت سے عالم آشکارا کیا جائے نیز اسلام پر وارد کئے جانے والے شکوک وشبہات کا پردہ اجتماعی رنگ سے چاک کیا جائے۔

بلاشبہ اس کے لئے ضرورت تھی کہ بین الاوطانی اشتراک کے ساتھ اسلامی منطقوں کے رجال علم وفضل کو تکلیف دی جائے اور دارالعلوم کی خدمات پیش کر کے ان کی آراء گرامی سے استفادہ کیا جائے، ان خدمات کے پیش کرنے کا منشاء ہرگز ہرگز اس جامعہ کا کوئی تفوق جتانا یا جماعتی خودستائی کرنا نہیں، حاشا وکلّا بلکہ یہ ہے کہ ماضی کا جائزہ لے کر مستقبل کے لئے آپ حضرات کے مشورہ وتعاون سے ان تبلیغی، تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی مقاصد کی تعمیم کا کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے جس کی پشت پر سارے اسلامی منطقوں کی اجتماعی قوت کارفرما ہو، جس سے یہ دینی مقاصد اجتماعی انداز سے دنیا کے سامنے آسکیں اور عام مسلمانوں کی زندگیوں پر کوئی عملی اثر ڈال سکیں اور وہ ایمانی اخوت، باہمی تعاون، علمی اشتراک اور فکری یکسانیت ہمت کے ساتھ اجتماعی عزائم وخدمات کو بروئے کار لا سکیں اور ان میں دینی دعوت کا وہ جذبہ ابھر آئے جو قرن اول کا نصب العین تھا کہ اس کے بغیر ان کی وہ پستی اور پست ہمتی دور نہیں ہوسکتی جو آج ان پر چھائی ہوئی ہے، اگر اسلام کا مقصد واقعی اقوام دنیا کی اصلاح اور انہیں خدا پرستی پر لانا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کے نام لیواؤں کا یہ مقصد نہ ہو اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد آج اجتماعی آواز، اجتماعی شعور، اجتماعی فکر اور اجتماعی تعاون کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، کیوں کہ یہ حقیقت آج کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ آج کوئی آواز بھی اس وقت تک وقیع

نہیں بنتی جب تک کہ اس میں ہمہ گیری اور عالمیت نہ ہو، اس لئے آج کی سیاست ہے تو بین الاقوامی، تمدن و معاشرت ہے تو بین الاقوامی، تجارت وصنعت ہے تو بین الاقوامی، صلح و جنگ ہے تو بین الاقوامی، حتی کہ کھیل کود بھی ہیں تو بین الاقوامی۔

اس لئے قدرتی طور پر طبائع ہیں یہ جذبہ آنا ہی چاہئے کہ دین کی دعوت اور اصلاحی آواز ہو تو وہ بھی بین الاقوامی ہی ہو، بالخصوص جبکہ اسلام خود ہی اپنی ذات سے بین الاقوامی بن کر دنیا میں آیا ہے جو ساری دنیا کی اقوام کے لئے پیغام ہے بلکہ اس نے دنیا میں بین الاقوامیت کا پرداز ڈالا ہے، اس لئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ "لیظھرہٗ علی الدین کلہ" کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آچکا ہے اور وہ یہی وقت ہے کہ جس میں فطرت اسلام پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ بین الاقوامی دین اور اس کے انسانی صلاح وفلاح کے ضامن بین الاقوامی مقاصد اور اس کی ہمہ گیر ثقافت بھی عالمی رنگ سے دنیا کے سامنے آئے۔

توحید وسنت کی حامل جماعت تیار کرنے کے بعد حالاتِ وقت کے پیش نظر جامعہ دارالعلوم کی یہ خواہش بجا اور برمحل ہے کہ اس نئی صدی میں امت مسلمہ اسلام کے عالمی مقاصد کو باہمی تعاون سے آگے بڑھائے اور جو کام اب تک شخصی یا انفرادی یا تن تنہا اداری قوتوں سے ہوا ہے اسے اجتماعی بنائیں تا کہ پوری دنیا اسلام کے صحیح خدوخال سے واقف ہو۔

عالمی دعوت کے لئے تعلیمی جامعات میں ارتباط کی ضرورت

ہمارے نزدیک قابل غور ضروری مسائل میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ عالمی دعوت اسلام اور مسلمانوں کے بگڑے ہوئے معاشرے کو درست کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اس میں کن کن راستوں سے بگاڑ آرہا ہے اور اس کے انسداد کی کیا صورت ہے؟ عموماً بے پڑھے لوگوں کا بگاڑ رسوم ورواجات اور کورانہ تقلید سے نشو ونما پارہا ہے، جس کا انسداد تعلیم ہی سے ممکن ہے، پڑھے لکھوں کا بگاڑ شکوک وشبہات اور تخیلات سے پرورش پاتا ہے، جس کا انسداد تبلیغی ذریعہ سے ممکن ہے اور برسرِ اقتدار طبقوں کا بگاڑ جاہ پسندی اور ہوائے نفسانی سے بھرا ہوا ہے جس کا حل ان سے ہمدردانہ رابطہ کر کے انہیں راہ پر لگانا ہے اس لئے ان سب کے لئے نفسیات شناس ایسے مخلص فکری مصلحوں کی ضرورت ہے جو ہر ملک کے برسر اقتدار طبقہ کو اس کے اقتدار کی برقراری کا یقین دلا کر ان کی شخصی اصلاح کے ساتھ ان عمومی مقاصد دعوت کے لئے انہیں آمادہ بھی کرسکیں اور ان سے کام بھی لے سکیں۔

بہر حال! تقسیم عمل کے اصول پر ہر طبقہ میں اسی مناسب حال اصلاح افراد کی تشخیص عمل میں لانے کا مسئلہ آپ کے غور وفکر کا محتاج ہے، ساتھ ہی ان مسائل سے متعلق مالیاتی مصارف اور ایک بین الملی مشترک فنڈ کا وجود بھی اپنی طبعی اہمیت کے ساتھ محتاجِ اعتناء ہے، اس عظیم دینی وملی مقصد وخدمت کے لئے یہ مرکزی جامعہ اپنی تمام تر علمی اور عملی خدمات پیش کرنے کے لئے تیار ہے، ہم اس کے آرزومند ہیں کہ ارباب علم وفضل ہمیں اس باب میں بھی اپنے مؤقر مشوروں سے نوازیں کہ اس مرکزی جامعہ کا عالم اسلام کے تعلیمی جامعات ومعاہد سے ممکن حد تک تعلیمی یکسانی کے ساتھ اس طرح قریبی رابطہ قائم ہو کہ جس سے طلبہ کے بین الجامعاتی تبادلے اور سندات کے معادلے کے مسائل سہل ہو جائیں گے اور عالمگیر سطح پر دینی خدمات کی راہیں ہموار ہو جائیں۔ غور کیا جائے تو فی زمانہ اداری قوت ایک بڑی قوت ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے تعلیمی، تہذیبی اور تبلیغی معیار سے جوڑ سکتی ہے، اس کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ادارے جہاں ایک دوسرے کی خدمات سے باخبر رہنے کے ذرائع مہیا کریں وہیں معاندین اسلام کی لٹریری راہوں سے آنے والی دسیسہ کاریوں سے ایک دوسرے کو باخبر رکھنے اور بروقت اس کا سدباب کرنے کے لئے اپنے ذرائع ابلاغ کو مکمل طور پر استعمال کریں۔

اس ناچیز نے دارالعلوم کی ماضی کی خدمات کے اجمالی تذکرہ اور مستقبل کے منصوبوں کی پیشکش کے ساتھ چند مشورہ طلب نکات بھی درپیش کر دینے ضروری سمجھے تاکہ اس بامقصد اجلاس کے اثرات آئندہ نسلوں کے لئے دیرپا اور خوش آئند ثابت ہوں۔

اس کے بعد اس سمع خراشی پر معذرت خواہی کے ساتھ صدر معظم، مہمانانِ کرام اور معزز حاضرین کے تہہ دل سے مکرر شکریہ، تشریف آوری پر ان افتتاحی اور خیر مقدمی کلمات کو ختم کرتا ہوں۔

والحمد للّٰہ کثیراً اوّلاً وآخراً

دعا گو

محمد طیب

رئیس جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند

۲۵/ربیع الاوّل ۱۴۰۰ھ

مطابق ۱۳/فروری ۱۹۸۰ء

خطبہ کا متن

الحمد للّٰه رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين و على آله و اصحابه اجمعين.

سماحة الرئيس والسادة المشاركين فى الاحتفال! نحن نشكر اللّٰه عز و جل أولا على أنه أتاح لنا فى هذه البلدة المتواضعة فرصة سعيدة للاجتماع مع العلماء الأعلام، و أقطاب الفكر الاسلامى، و رجال التربية والتعليم، والشخصيات البارزة، حيث تتمثل لنا روح التضامن الاسلامى والأخوة القوية الايمانية بمناسبة هذا الاحتفال الدينى العظيم الذى يقام فى أكبر و أقدم الجامعات الاسلامية فى شبه القارة الهندية "دارالعلوم بديوبند"

اننا نشعر ببالغ الفرح و كامل السرور والابتهاج بأن هؤلاء الكبار من العلماء والسادة لبّوا دعوة أمثالنا الصغار وهم يقدمون اليوم أروع صورة التضامن الاسلامى فى قوالب مادية ملموسة مع رفض جميع فوارق الجنس والوطن و امتيازات اللون والعنصر فنراهم جالسين معنا فى جو المودة والاخاء، هذا من فضل اللّٰه العميم و رحمته الواسعة، و صدق اللّٰه العظيم" لو أنفقت ما فى الأرض جميعا ما ألفت بين قلوبهم، ولكن اللّٰه ألف بينهم انهٔ عزيز حكيم" الآية.

نسأل اللّٰه سبحانهٔ أن لايكون هذا آخر عهدنا بكم، بل لا تزال تتكرر زياراتكم و دائما تحصل لنا فرصة الاجتماع بكم والاستفادة منكم.

عواطف الشكر والامتنان

اعتبروا واجبى العظيم و مسؤليتى اللازمة أن أقدم الى جميع الوافدين الذين تحملوا صعوبات السفر و شاركوا فى هذا الاحتفال الدينى الدولى لوجه اللّٰه عواطف الشكر والامتنان اصالة عن نفسى و نيابة عن أصحاب الفضيلة أعضاء المجلس الاستشارى للجامعة و جميع أساتذتها المخلصين و طلابها الطموحين و رجال العمل والادارة و جميع مسلمى الهند و خاصة عن الذين واصلوا العمل لعقد هذا الاحتفال

ليلا و نهارا و ساهموا فى انجاحه.

ان هذا الاجتماع الرائع دليل على خلود الاسلام و رسالته العامة الشاملة حيث نرى اليوم بيننا اعلام الأمة وأقطاب الدول جالسين معنا فى صف كالأخوة المتحابين المخلصين، فمنهم العلماء والأتقياء، والمحدثون والمفسرون والفقهاء، والأصوليون والمرهوبون والأذكياء و مشيخة الأمة والزعماء الى جانب الكتاب والمثقفين والقادة والباحثين، بل شخصيات عديدة تعتبر جامعة مستقلة بسبب خدماتها الجليلة نحو الاسلام والمسلمين والبيان يقصر عن تعبير ما يجيش فى نفوسنا من عواطف الشكر والتقدير فلا نستطيع أن نؤدى واجب الاحتفاء والتكريم، فنكتفى بالدعاء من اللّٰه سبحانهٗ بقلوب مليئة بالروح الايمانية والاخلاص الموفور والعواطف الأخوية الاسلامية التى هى أعلى و أسمى من حدود البيان والتعبير بأن يجازيكم اللّٰه خيراً فى الدنيا والآخرة.

بلدة تاريخية مركزية

أيها السادة الكرام! ان بلدة ديوبند التى تشهدونها اليوم بلدة قديمة، يخبرنا التاريخ بعمرانها منذ زمن عريق من نحو ثلاثة آلاف سنة، و منذ ذلک الوقت تحظى هذه البلدة الصغيرة بالقداسة لأن مركزاً عظيماً للدين الهندوكى باسم ”ديوى كند“ يوجد ههنا، و يقام الموسم الكبير السنوى حتى اليوم، كان اسم هذه البلدة ”ديبى بند“ نسبة الى مركز الدين الهندوكى ”ديوى كند“ و نقل هذا الاسم كابراً عن كابر و جرى فيه التغير حتى صار ”ديوبند“ .

يبلغ عدد المسلمين فى هذه البلدة نحوعشرين ألفا و يوجد فيها أكثر من مأة مسجد، كثير منها تذكار لعصور الأباطرة المغول، والمسجد الجامع يوجد منذ خمس مأئة عام أو ثمانى مائة عام، مكتوب فى لوحته الحجرية اسم ”الشاه بهلول“ و ”مسجد حى خانقاه“ تذكار لعهد الامبراطور ”أكبر“ و مسجد ”سرائے پير زادگان“ من آثار عهد الملک جهانگير.

تقع هذه البلدة من خطى عرض ۲۹-۵۸ و خطى طول ۷۷-۳۵ على بعد اثنين

و تسعين ميلا فی جانب الشمال من دلهی فی ولاية أترابراديش، و الشارع الكبير الذی رصفه الملک شير شاه السوری من فشاور الی كلكتة يمر بجانب من هذه البلدة.

ان بلدة ديوبند العريقة كانت تحمل المركزية والقداسة منذ أقدم العصور فشائت قدرة اللّٰه أن تحولها الی قداسة اسلامية و يجعلها مصدر اشعاع اسلامی، فأجرت نبعاً صافياً متدفقاً بالعلوم الشرعية وسع ربوع الهند وانتشر فی دول العالم المختلفة و سقی الأمكنة القاحلة الجرداء و جعلها صالحة للتنمية والانبات.

قد تفرس الربانيون والصلحاء بنورهم الايمانی أن هذه البلدة ستكون مركزا للعلماء الربانيين و فحول الأدباء والمجاهدين والابطال المكافحين للحرية والاستقلال، وستعلو كلمة اللّٰه المباركة بالأذان وحلقات الذكر والتلاوة و جموع المقيمين الصلاة.

نشأة الجامعة و تأسيسها

بعد ثورة عام ١٨٥٧م بدأت نهضة جديدة فی تاريخ هذه البلدة و طلع فجر للحياة العلمية والروحية حينما كانت الهند فی براثن الانجليز و كانت سيطرتهم قائمة فی سائر أنحاء البلاد ولم تبق من دولة الاسلام والمسلمين سوی الآثار الدالة علی مجدهم السالف، و كانت الحكومة المغولية قد لفظت أنفاسها الأخيرة وانقرضت سلطة المسلمين نهائيا، و أوشكت شعائر الاسلام علی المحو والدثور و صارت المدارس الدينية والمراكز الاسلامية العامرة خراباً خالياً عن طلاب علوم الدين، ولم يبق الوعی الاسلامی فی نفوس المسلمين و غشيتهم الظلمة والجهالة و تسربت فی المجتمع البدع والخرافات التی قامت باسم الاسلام و تركت سنن الأنبياء والرسل عليهم السلام، تسمم الجو بالالحاد والوثنية، و أصاب المسلمون بالقنوط والاضطراب، و أما العلماء فأقيمت لهم المشانق أو واجهوا مشاكل الجلاء والتشريد، فشعر عديد من العلماء الربانيين بهذا الموقف الحرج و قاموا بحفظ كيان الأمة المسلمة المضطهدة و انقاذ المجتمع الاسلامی من اللادينية والفوضوية، و انشاء الوعی الدينی والفكرة السياسية الصحيحه فی نفوس المسلمين، فاهتدوا و ساروا فی

نور اللّٰه قوى الذى سايرهم و رافقهم فى هذه اليقظة الدينية الجديدة والشعور بالمسؤلية، و كان أول من وضع خطة انقاذ مجتمع المسلمين من الوثنية واللادينية والقنوط والاضطراب هو الامام الأكبر الشيخ محمد قاسم النانوتوى رحمه الله تعالىٰ من حيث انه اقترح انشاء مدرسة دينية تقوم بنشر تعاليم الكتاب والسنة فى ربوع الهند بطريق القاء الدروس والتصنيف والتاليف، والتربية والتثقيف و تعيد الى المسلمين مجدهم السالف و تحافظ على دينهم السماوى الحنيف و تحى قلوبهم الميتة، و تشعل الغيرة الدينية فى نفوسهم فألقيت نواة الحركة الاسلامية التعليمية، ذات رسالة خالدة و شاملة فى مسجد "تشته" تحت شجرة الرمان بتاريخ ۱۵/محرم عام ۱۲۸۳ھ/الموافق ۳۰/من مايو عام ۱۸۶۶م وأقيم معهد بمعلم واحد وهو الملا محمود و طالب و احد وهو محمود حسن، و هذا هو الطالب الذى نبغ و عرف بشيخ الهند، لم تكن حين ذاک بناية خاصة لهذا المعهد الخامل الذكر ولا ثروة ضخمة يعتمد عليها، ولا وسائل النشر والدعاية الا أنه كان يملک ثروة التوكل على اللّٰه عز و جل و الثقة به، و هذا هو هدف مؤسس الجامعة، الامام الأكبر الشيخ محمد قاسم النانوتوى رحمه الله -تعالىٰ- حيث انه وضع المبادئ الثمانية الأساسية لادارتها، و أكد تاكيدا شديدا على الاحتفاظ بالتوكل على اللّٰه فى جميع الأمور دون الاعتماد على غيره.

الجامعة حركة عالمية لإحياء الدين القيم

جدير بالاعتناء أن كارثة انقراض حكومة المسلمين فى الهند و انتهاء آثارهم العلمية والدينية لم تكن كارثة محلية ذات أبعاد محدودة و انما كانت كارثة دولية. حيث تأثرت بها دول العالم الاسلامى كلها، فأصبحت فريسة الاستعمار و حرمت من الحرية، هكذا لم تكن حركة هؤلاء العلماء فى ديوبند حركة محلية محدودة و انما اتسعت رقعتها حتى انتشرت فى جميع انحاء العالم. و كان العلماء أحسوا بعالمية هذه الحركة فى بداية الأمر و أدركوا ما تؤدى مجهوداتهم الى الأثمار الناضجة الحلوة فى صورة الرسالة المحمدية المنتشرة فى أقصى بلاد الأرض، فكما كانت كارثة الهند عالمية، كانت هذه النهضة العلمية واليقظة الدينية أيضا ذات صبغة عالمية و نطاقها

لم ينحصر فى اطار الدين و الشريعة و انما تجاوز حتى وسع جميع العالم وانتفعت بها الأقوام والشعوب والدول والحكومات، ولما استقلت الهند و تحررت بعد مرور مائة عام من مجهودات علماء دارالعلوم بديوبند بدأت تتحطم أغلال الاستعباد عن الدول الاسلامية الأخرى التى كانت تكبلت و تقيدت بها و زال حجر عثرة عن طريق دين الاسلام و رسالته الخالدة ثم انتشرت أشعة هذه الجامعة العلمية المستمدة من نور اللّٰه تعالىٰ فى جميع قارة آسيا بل فى افريقيا و أوربا و أمريكا أيضا.

الحقيقة أن فضل استقلال البلاد المختلفة يرجع الى الجامعة الاسلامية دارالعلوم بديوبند لأن علماء ها و مشيختها قد لعبوا دوراً طليعيا فى مطاردة الاستعمار البريطانى و قاموا بخدمات غالية فى شتى مجالات الحياة السياسية والثقافة والاجتماعية للمسلمين، كما ساهموا فى النشاطات العلمية والدراسية والأخلاقية والتربوية و بدأوا ينفخون فى نفوس الشعب المسلم الهندى روح الحرية منذ عام ۱۸۵۷م و من سواهم من المواطنين الهندوكيين فهم كانوا فى سبات عميق أو فى خوف وذعر أو فى التجاء و تملق، ولكن علماء الجامعة الربانيين كافحوا ضد الانجليز الغاصب أو لا بالسيف والأسلحة الحربية، و قامت معركة شاملى المعروفة، و بالأسلحة المعنوية والعلمية ثانيا، فهذه الأسلحة العلمية والمعنوية كانت اشد نفاذاً و أكثر تاثيراً قد أقضت مضجع العدو المستعمر فلم يسعه الا أن يهرب من هذه البلاد ومن الدول الأخرى.

ان تاريخ هذه الجامعة حافل بمثل هذه المآثر والخدمات الجليلة والانجازات الرائعة.

الأهداف الأساسية التى تبنتها الجامعة

يهدف المنهج الدراسى لهذه الجامعة الى نشر تعاليم الكتاب والسنة و تطبيقها فى مجتمع المسلمين و انقاذهم من التنافر والتباغض والعصبية و جعلهم فى صف واحد متمسكين بالتضامن والوحدة والأخوة والمحبة، فيشهد التاريخ على أن هذه الجامعة فتحت أبوابها لجميع طبقات المسلمين و أنشأت العلاقات الأخوية والودية معهم فوضعت منهجها الدراسى جامعا شاملا لا تخرج من اطاره أى طبقة من المسلمين، فهو يضم المبادى الشريعة والفنون المختلفة من القرآن الكريم الى علم التفسير و أصوله و

علم الحديث و اصوله، و علم الفقه الاسلامى و أصوله، و علم العقائد الدينية الصحيحة، واللغة، والأدب، والبلاغة، والبيان، والمنطق، والفسلفة، والحساب، والجغرافيا، و مبادئ العلوم العصرية، و علم الطب و فنون الصناعة المختلفة و فن الخط والنسخ، واعتبر كل قسم دينى، كلية مستقلة مثل كلية القرآن، و كلية أصول الدين و الشريعة، كلية الدعوة والارشاد الدينى، كلية أصول الفقه، كلية اللغة والأدب، كلية الطب، حتى صارت هذه المدرسة جامعه اسلامية بمعنى الحقيقى، فأنجبت لحد الآن المتخصصين فى الفنون المختلفة نحو ستة عشر ألف متخرج منهم المعلمون والدعاة والخطباء البارعون، والزعماء والباحثون، والكتاب والمؤرخون، والأطباء الماهرون، و هذا العدد الكبير للذين تخرجوا فى الجامعة و حصلوا على شهادة الفضيلة، و أما الفضيلة، و أما الذين درسوا واستفادوا بواسطة أبناء الجامعة فيبلغ عددهم مئات الألوف و يقوم هؤلاء المتخرجون اليوم بخدمات غالية للاسلام والمسلمين فى شبه القارة الهندية بل فى سائر أنحاء قارة آسيا و افريقيا و أوربا و أمريكا.

ولما كان الامام الأكبر الشيخ محمد قاسم النانوتویؒ يهدف الى اقامة المدارس الاسلامية و يحمل فكرة انشاء المراكز العلمية الدينية التى تقوم بنشر تعاليم الكتاب والسنة و تحتفظ بالكيان الاسلامى و توقظ المسلمين المنغمسين فى الجهل والتقاليد الخرافية أنشأ عديداً من المعاهد الاسلامية فى البلاد المختلفة ثم أقام تلاميذه الكبار شبكة المدارس الدينية فى شبه القارة الهندية، والحقيقة أن هذه المدارس الاسلامية والمعاهد الدينيه وسيلة وحيدة لبقاء الدين الاسلامى والشريعة الاسلامية فى الهند، يشهد التاريخ على أن هذه الفكرة نجحت نجاحا ملبوسا حتى توجد آلاف من المدارس والمعاهد التى تتصل بمدرسة فكر ديوبند، و تنتهج مناهج الجامعة، و هى منبثة فى قارة آسيا و افريقيا و أوربا. يقوم بها متخرجوا الجامعة بالخدمات العلمية والدراسية والدعوية، فان للتعليم والتربية أهمية بالغة فى ريادة المسلمين ريادة دينية و تثقيفهم ثقافة اسلامية، و ان النبى العربى محمدا ﷺ أخبرنا عن رسالته و دعوته بأنه

بعث متمما لمكارم الأخلاق، حيث ورد فى الخبر "انما بعثت معلما" أو "انما بعثت لأتمم مكارم الأخلاق" نظرا الى ذلك ركز علماء الجامعة جهودهم بصفة خاصة على التعليم والتربية و قاموا بدور بناء.

خدمات الجامعة فى مجال التصنيف و التأليف

كما قام علماء الجامعة بخدمة الاسلام والمسلمين بالتربية والتعليم والدرس والتدريس، قاموا بالتصنيف والتأليف أحسن قيام حيث يبلغ عدد مصنفاتهم أكثر من خمس آلاف من الكتب الأردية والعربية والفارسية والانكليزية، ولا تدرك عدد ذخيرتهم الكتابية أية مدرسة فكرية اسلامية فى شبه القارة الهندية.

فمنذ بداية الأمر بدأ علماء الجامعة يؤلفون له الكتب الدينيه العلمية فالامام الأكبر الشيخ محمد قاسم النانوتویؒ وضع أكثر من خمسة و عشرين كتابا، تتدفق مؤلفاته بالمعارف والعلوم النادرة، أثبت فيها المبادئ الأساسية العقائدية والفقهيه و أقام عليها دلائل عقلية و حسية فى أسلوب بارع، و بعد ذلك قام تلاميذه باعداد المؤلفات الضخمة فى علم التفسير والحديث النبوى، والفقه والكلام، والانشاء والأدب، والاجتماع والسياسة، والتاريخ والجغرافيا، وغيرها من العلوم المختلفة، ففى طليعة علماء الجامعة الكتاب، حكيم الأمة الشيخ أشرف على التهانویؒ، فهو أكثر الناس تاليفا ترك خلفه نحو ألف كتاب مطبوع مابين صغير و كبير، و ليس موضوع دينى يحتاج اليه المسلمون فى هذا العصر الا وله فيه كتاب أو رسالة أو موعظة مطبوعة، و غيره من العلماء الأفذاذ الذين صنفوا المؤلفات أمثال العلامة الشيخ حبيب الرحمن العثمانیؒ رئيس الجامعة الخامس والمحدث الشيخ عبدالعزيزؒ غوجرانواله بباكستان، والمحدث الشهير الشيخ خليل أحمد السهارنفوریؒ والعلامة الجليل شيخ الهند محمود حسنؒ، و من تلاميذه شيخ الاسلام بباكستان العلامة المحدث الشيخ شبير احمد العثمانیؒ صاحب كتاب "فتح الملهم" والعلامة المفتى الشيخ كفاية اللّٰہؒ "رئيس جمعية علماء الهند" السابق، والكاتب البارع العلامة الشيخ مناظر أحسن الكيلانیؒ رئيس تحرير مجلة "القاسم" و "الرشيد" و صاحب المؤلفات النادرة، و شيخ الأدب

والفقه محمد اعزاز علیؒ، والمفتی الشیخ مهدی حسنؒ، رئیس قسم الافتاء السابق "التابع للجامعة" والعلامة المحدث البارع الشیخ محمد أنور شاه الکشمیریؒ، والبطل المکافح المحدث حسین احمد المدنیؒ، ومن تلامیذ الشیخ الکشمیری، المحدث الشهیر الشیخ محمد یوسف البنوریؒ، والشیخ بدر عالم المیرتهیؒ، والعلامة المفتی محمد شفیع الدیوبندی، المفتی الأکبر فی باکستان سابقاً، والباحث الاسلامی الشیخ سعید أحمد الأکبرآبادیؒ رئیس تحریر مجلة "برهان" الراقبة و رئیس القسم الدینی فی جامعة علی گڑھ سابقا، والمحدث الشیخ محمد منظور النعمانیؒ رئیس تحریر مجلة "الفرقان" لکناؤ، والمحدث الشیخ محمد ادریس الکاندهلویؒ، و أنا أیضا تلمذت علی العلامة الکشمیری، و یبلغ عدد مؤلفاتی أکثر من مأة، و من تلامیذ الشیخ حسین احمد المدنیؒ، الشیخ عبدالحقؒ مؤسس الجامعة دارالعلوم باکروة ختک فی باکستان، والکاتب الاسلامی الشیخ محمد میان الدیوبندیؒ المحدث بالمدرسة الأمینیة دلهی، الشیخ منت اللّٰه الرحمانیؒ، سکریتری هیئة قوانین الأحوال الشخصیة للمسلمین، والشیخ حامد الأنصاری غازیؒ، و غیرهم من الکتاب البارعین.

تمتاز الجامعة بین الجامعات الهندیة الأخری بالمصنفات الزاخرة التی تعرض الشریعة الاسلامیة عرضا یتطابق مع مقتضیات العصر الراهن، کما أن الجامعة مرکز للدعوة والارشاد الدینی والتعلیم والتربیة، فهی توفر لطلاب الجو الصالح الایمانی، والمجتمع الأخلاقی الثقافی، و تهدم بناء البدع والرسوم التی حدثت فی المسلمین باسم التصوف، و تربی الطلاب تربیة روحیة فی ضوء تعالیم الکتاب والسنة، فیتمتع خریجوها بالتواضع و انکار الذات والصبر والقناعة والتطوع والاخلاصکما یتمتعون بالغیرة الاسلامیة وغنی النفس والوقار والاتزان والهدوء.

ان الجامعة ام الجامعات الاسلامیة فی شبه القارة الهندیة تلقب بـ "أزهر الهند" انبثقت منها آلاف من المدارس والمعاهد الاسلامیة، ویهتدی الیوم آلاف من الناس بعلومها، ویحافظون بما فی الهند علی ایمانهم متمسکین بالسنة النبویة والمعتقدات الصحیحة .

جدير بالذكر أن الفكرة الراهنة لا تقتنع الا بالمحسوسات ولا تكاد تؤمن بالمعقولات والمنقولات، و هذا أمر يعرقل نشر الاسلام، فوضع علماء الجامعة مئات من مؤلفات فى العقائد مستمدين بمدرسة فكر الجامعة، وردوا على جميع الشكوك والشبهات من المدنية والاقتصاد، فهؤلاء العلماء و ان كانت تناط بهم العمائم اليوم، و تمنح لهم الشهادات ولكن خدماتهم أجازتهم و شهدت لهم بالفضيلة من قبل.

امتياز الجامعة فى الدراسة

تصرف الجامعة أكبر عنايتها الى دراسة الحديث النبوى بناء على أنه مصدر أساسى للتشريع الاسلامى و تفسير للقرآن الكريم و ان التضلع من علم الحديث يسهل على الانسان العلوم القرآنية و يفتح الطريق الى الفقه و علم التشريع.

يشتمل منهج الجامعة الدراسى على علم التفسير و أصوله والحديث و أصوله، والفقه والكلام والأدب العربى، والمعانى والبلاغة، وما عداها من العلوم الأخرى العقلية و غيرها فهى لا تعتبر أساسا و انما تدرس كالعلوم الآلية.

نسب الجامعة العلمى

تنتمى الجامعة بواسطة علمائها الكبار الى الامام الأكبر ولى اللّٰه ابن عبدالرحيم الدهلویؒ ومنه الى الرسول العربى محمد ﷺ بالسند المتصل، تعرف الجامعة بشدة التمسک بعقائد أهل السنة والجماعة المأخوذة من الكتاب والسنة.

ان هدف الجامعة الأساسى غرس التوحيد وعظمة الرسالة المحمدية. وللنقل والرواية أهمية بالغة لدى علماء الجامعة، فهم يأخذون معانى الكتاب والسنة و مراداتهما من أقوال السلف مع أنهم يعتبرون الدراية والتفقه فى الدين جزءاً هاما فى فهم معانى الكتاب والسنة.

يشرف على ميع أعمال الجامعة الادارية والدراسية مجلس أعلى مكون من شخصيات الهند البارزة والعلماء الأعلام و أقطاب الفكر الاسلامى، يحظى بعضهم بالشهرة العالمية، يسمى هذا المجلس بالمجلس الاستشارى.

يتولى رئيس الجامعة تنفيذ جميع الشئون الادارية. و تجرى تحت اشرافه أربعة و عشرون قسما للادارة، و ستون أستاذا و أكثر من مأتى موظف يمارسون العمل وفق النظام المقرر. تهدف هذه الأقسام الى تحقيق ما يحتاج اليه الأساتذة والطلاب و اصلاح ادارة التعليم، تبلغ ميزانية الجامعة ثلاثة ملايين روبية هندية، و أمرها يرجع الى "قسم الحساب" فهو يتمها و يعرضها على مجلس الشورى للموافقة عليها، ثم يفتش حساب الميزانية رسمياً، ولا تقبل الجامعة أى اعانة من الحكومة المحلية، و تبرعات عامة المسملين هى التى تغطى ميزانيتها.

خدمات الجامعة الاجتماعية والسياسية

هذا الى أن الجامعة لم تجرنشاطاتها فى مجال الدرس والتدريس. فحسب بل ساهمت ولا تزال تساهم فى الأمور السياسية والاجتماعية مساهمة فعالة بدون خروج من نطاق الشريعة.

ان مآثر علماء الجامعة فى السياسية معالم الطريق للآخرين، فانهم اقتفوا آثار المجاهدين فى سبيل اللّٰه السيد أحمد شهيد البريلوىؒ، والشيخ اسماعيل شهيد الدهلوىؒ، و كان الامام الاكبر الشيخ محمد قاسم النانوتوىؒ فى طليعة المجاهدين فى سبيل اللّٰه عام ١٨٥٧م جاهد بالسيف هو والعالم الربانى الشيخ رشيد احمد الكنكوهىؒ ضد قوات الانكليز فى معركة شاملى، ثم قام بهذه الحركة النضالية ضد الانكليز تلميذ الامام الأكبر، شيخ الهند محمود حسنؒ، رئيس هيئة التدريس السابق للجامعة و قام بحركة سياسية معروفة بخطة "الرسائل الحريرية" عام ١٩١٥م و أنشا مركزها فى افغانستان وفى شتى الدول، فرافقه الشيخ عبيداللّٰه السندهىؒ، والشيخ محمد ميانؒ المعروف بالشيخ منصور الأنصارى، والبطل المكافح الشيخ حسين احمد المدنىؒ، واستشهد آلاف من الناس فى هذا الجهاد الباسل، و بقى كثير منهم غزاة فى سبيل اللّٰه، و أما قائد هذه الثورة شيخ الهندؒ، فهو ذاق بنفسه مرائر الحبس والاعتقال فى جزيرة "مالطة"، و بعد الاطلاق أقام جمعية علماء الهند لتحقيق هذا الهدف السامى، فأشرف عليها مدة والآن تقوم هذه الجمعية بخدمات الاسلام والمسلمين و

تجری أمور ادارتها تحت اشراف علماء الجامعة.

كما ساهم هؤلاء العلماء فی حركة الخلافة عام ١٩٢٠م ثم فی حركة تحرير الهند عام ١٩٣٠م و بفضل هذه الحركة و هذه العواطف الايمانية التی تدفقت بها شخصيات علماء الجامعة أيدوا مملكة جلالة الملك عبدالعزيز آل سعود لما أسسها فی جزيرة العرب، فوصل عديد من علماء الجامعة الی الحجاز، ولما ثارت حركة تحرير فلسطين أصدرت الجامعة الفتوى أولا ضد الصهيونية والاستعمار البريطانی، و احتجت احتجاجا صارخا ضده، و جمعت جماعات المسلمين المختلفة علی رصيف واحد و وحدت كلمتهم، فجعلتهم متحابين كلما ثارت النزاعات والاختلافات فی المسائل الفرعية لتشتيت شملهم و تمزيق جمعهم، و أنشئت لاجراء الشئون الادارية للمسلمين جمعية باسم "المجلس الاستشاری لمسلمی الهند" يرأسها الآن المفتی الشيخ عتيق الرحمن العثمانیؒ المجاز من الجامعة وعضو مجلس الشوریٰ.

تستحق الجامعة فی ضوء تاريخها الذهبی المجيد الحافل بالبطولات والأمجاد عناية علماء العالم الاسلامی و قادة الدول فی مجال العلم والدراسة، والمدنية و الحضارة، والاجتماعية والثقافة، فان علماء الجامعة قاموا مع علماء البلاد الأخری ضد كل حركة مست كرامة الدين الحنيف و كدرت صفو حياة المسلمين الاجتماعية، لا سيما قام علماء الجامعة فی وجه الحركات الهدامة التی بدأت فی العالم الاسلامی كما قاموا لمواجهة الفتن والحركات المعادية للاسلام فی الهند.

الجامعة تواجه الحركات الهدامة

لما احتل الانكليز الهند أنشئت كثير من الحركات المعادية للدين باسم الدين أو السياسة و كانت تهدف هذه الحركات استئصال المسلمين و بذر الحقد والنفرة فيما بينهم، فقام علماء الجامعة ضد الانكليز و أنقذوا المسلمين من مكر هذا العدو اللدود حسب امكانياتهم، والحمد للّٰه تحققت مساعيهم، فلما حدثت فی عصر الامام الاكبر الشيخ محمد قاسم النانوتویؒ حركات كانت تهدف القضاء علی تعاليم الكتاب والسنة وهی نشأت عن الجهالة قاوم الامام الأكبر وتلاميذه الأعلام بالمباحثة والمناظرة

والتصنيف والتاليف و دافعوا عن الاسلام والمسلمين، ولما حدثت فتنة انكار الحديث كافحها علماء الجامعة بتاليف المؤلفات المتدفقة بالشواهد والأدلة، أمثال الشيخ العلامة مناظر أحسن الكيلانیؒ، والمحدث الشيخ حبيب الرحمن الأعظمیؒ و أنا ايضا أسهمت بالتاليف فی هذا الموضوع كما أن الجامعة خصصت أكثر من خمسين كاتباً و باحثاً لمقاومة فتنة القاديانية التی كانت تهدف الی ارتداد المسلمين عن الدين، ولما أقيمت حركة تعديل قوانين التشريع الاسلامی أنشأت الجامعة حركة انشاء المحاكم الشرعية، و طالب رئيس الجامعة السابق الشيخ محمد أحمدؒ حكومة بريطانيا باقماة محكمة القضاء الشرعی بعد موافقة خمس مائة عالم عليه، فخمدت نيران هذه الفتنة ثم أرادت الحكومة قبل أعوام تعديل قوانين الأحوال الشخصية للمسلمين فعقد مؤتمر عظيم و ضمت كافة جماعات المسلمين و منظماتهم و كنت رئيس المؤتمر، فاحتج المؤتمر احتجاجاً صارخاً أكيدا علی هذه الظاهرة و أنشئت هيئة مستقلة للمحافظة علی قوانين الأحوال الشخصية للمسلمين وهی دائبة فی أعمالها، نشيطة لتحقيق اهدافها.

تفتخر الجامعة اليوم بهؤلاء المتخرجين بمناسبة هذا الاحتفال المئوی العالمی علی أنهم خدموا الاسلام والمسلمين بانقاذهم عن الوثنية والبدع والخرافات، و دحض الحركات المعادية والأضاليل باستخدام أساليب مختلفة، و بوضع المؤلفات العلمية القيمة، و القاء المواعظ والخطب النافعة.

عالمية العصر الراهن و مقتضياته

هذه خدمات العصر الذی كان نطاق أعمال كل دولة فيه ضيقاً، و كانت تجری جميع النشاطات و الممارسات فی حدودها واليوم اتسعت علاقات الدول فيما بينها و توفرت وسائل الحمل والنقل والمواصلات، و صارت الدنيا كأسرة واحدة حيث لا تبقی اية دولة فی غنی عن الدول الأخری معتمدة علی سياستها الداخلية من غير أن تنشئ العلاقات الودية القوية مع الدول الأخری، فان الامور السياسية أوالادارية تجری اليوم علی المستوی العالمی، و أما رسالة الجامعة و أهدافها فانها ساهمت فی

الحركات التى حدثت و أقيمت فى العالم الاسلامى على صعيد دولى و شاركت علماؤها فى المؤتمرات العالمية فى العالم الاسلامى العربى كمؤتمر البحوث الاسلامية بمصر، مؤتمر رابطة العالم الاسلامى بمكة المكرمة، و مؤتمر السيرة والسنة النبوية بالدوحة، والمؤتمر الجغرافى الاسلامى الأول بالرياض كما زار وفد الجامعة دولة الكويت والمملكة العربية السعودية والامارات العربية المتحدة لتوجيه دعوة مشاركة الاحتفال المئوى الى اقطاب الفكر الاسلامى، والعلماء الأفذاذ، و رجال التربية والتعليم، و بحث سبيل التعاون بين الجامعات الاسلامية والمنظمات الدينية، ولما طلبت رابطة العالم الاسلامى من الجامعة أن تقوم باعداد بحوث عن تربية الأطفال بمناسبة الاحتفال بعام الطفل العالمى، لبت الجامعة طلبها و وفرت المواد الغزيرة القيمة لها، و نحن اليوم نسعى لنشر أهدافها العلمية والثقافية فى العالم، ولمقاومة الحركات المعادية للاسلام على المستوى العالمى بالتعاون مع الجهات الأخرى فكنا فى أشد الاحتياج الى توجيه دعوة مشاركة اجتماع الى علماء دول العالم، و تعريف خدمات الجامعة أمامهم والاستفادة بهم عن تشكيل هيئة عالمية تنشر هذه الأهداف الدعوية والعلمية والثقافية فى العالم، و تثير ثورة صالحة فى حياة المسلمين حتى يستطيعوا أن يقوموا بالخدمات الدينية على نطاق دولى مع الاخوة والمحبة والمواخاة والمواساة فيما بينهم، والتعاون والتضامن، وتتدفق حياتهم بالعواطف الاسلامية السالفة، فانهم لايكادون أن يصعدوا بدونها من قعر المذلة الى قمة الرقى والمجد.

ان دين الاسلام يهدف الى اصلاح جميع الانس و تزويدهم بنعمة الايمان والتوحيد فلم لم يبذل من يعتنقونه الجهود المتواصلة الى تعميم رسالة الاسلام فى جميع العالم و وضع خطط له على صعيد دولى، فان العصر الحديث لايقبل أمراً ينحصر فى حدود دولة أو منطقة الا اذا انتشر فى العالم واعتبر دوليا قبله العصر الجديد، و اذا نظرنا وجدنا السياسة والحضاره، والصناعة والتجارة كلها أصبحت عالمية بل الألعاب الرياضية أيضا صارت عالمية، فلا بد لنا من تعميم الدعوة والارشاد الدينى فى جميع العالم لأن الاسلام دين عالمى و أتى به الينا الرسول ﷺ كرسالة هادية لجميع الأمم

والشعوب و هذا دين واحد جعل رسالته عالمية.

نقول : ان وقت اظهار الاسلام على الأديان كلها قد هان كما قال تعالىٰ : ’’ليظهره على الدين كله‘‘ فينادينا الاسلام بأن نسعى ثقافته و رسالته الشاملة فى العالم على سطح عالمى.

تؤكد الجامعة الآن على أن يقوم العلماء بنشر تعاليم الكتاب والسنة فى العالم بالتعاون والتعاضد فيما بينهم دون أن يكونوا متفرقين فى فئات متحاربة، و انما يجتمعون لهذا الهدف السامى كاجتماع القلب والروح حيث لا يمكن لأحد البقاء بدون الآخر ولا يمكن له القيام بوظيفته الا معه. لتتعرف شعوب العالم على محاسن الاسلام و ميزات الدين الاسلامى الحنيف.

حاجة توطيد العلاقات بين الجامعات الاسلامية

إن القضية التى تحمل أهمية بين سائر القضايا اليوم هى قضية اصلاح المجتمع الاسلامى والقضاء على ماتسرب فى مجتمع المسلمين من الجراثيم الفاسدة الفتاكة، فعلينا أن نعرف أسباب الفساد و نسعى فى ابعادها عن طريق الدعوة الاسلامية.

تسرى عناصر الفساد فى جماهير الناس و عامتهم بالأعمال الخرافية والبدع والتقليد الأعمى، و هى لا تستأصل الا بالتعليم و يتسرب الى جماعة العلماء الفساد بسبب الشكوك والشبهات، وهى تزول بالدعوة والارشاد الدينى، و أما أصحاب السلطة والنفوذ فهم يتأثرون بمرض الجرى وراء الشهوات، اذن يجب علينا أن ننشئ العلاقات الأخويه الصالحة معهم ثم نرشدهم الى الصراط المستقيم، و هذا لا يتحقق الا بمجهودات الذين يعرفون نفسيات الناس فهم يقومون أولا باصلاح أنفسهم ثم يحرضونهم على تعميم رسالة الاسلام و يستخدمونهم لنشر أهداف الدعوة، فيلزم علينا أن نفكر فى موضوع اصلاح ما فسد من حياة المسلمين.

و تجدر الاشارة الى أننا مستعدون للقيام بالخدمات العلمية والدعوية لهذا الهدف الدينى السامى حسب الامكانيات والوسائل و نرجو من اصحاب العلم والفضل و ذوى الفكر و الرأى أن يفيدونا بآرائهم الحصيفة المثمرة نحو توطيد علاقات الجامعة

العلمية والثقافية مع الجامعات الاسلامية فى العالم الاسلامى مع توحيد المناهج الدراسية حتى تسهل معادلة الشهادات فيما بينها و تفسح طرق الدعوة والارشاد الدينى على صعيد عالمى، و نقترح لتحقيق هذا الهدف انشاء اعتماد مالى مشترك على نطاق دولى و اقامة العلاقات المتبادلة بين الجهات الاسلامية لنشر الدعوة الاسلامية و مواجهة الحركات الهدامة والأفكار اللادينية.

والواقع أن العلاقات المتبادلة الوثيقة بين الجامعات سيكون لها تاثير فى تحقيق ما نهدف اليه من تعيم الدعوة على أوسع نطاق والوقوف فى وجه الجهود المعادية للاسلام فى سائر أقطار العالم.

هذه لمحة خاطفة عن الجامعة و انجازاتها و اشارة الى بعض ما نتمنى تحقيقه فى المستقبل وهى أمور تقتضى العناية والمشورة الصالحة ليكون هذا الاحتفال الدينى المئوى هادفاً بعيد الأثر، يبقى صداه فى الأجيال القادمة.

و أخيرا أكرر الشكر والتقدير لسماحة الرئيس و أصحاب الفضيلة العلماء و أقطاب الفكر الاسلامى و كافة المشاركين فى الاحتفال و أقدم اليهم أخلص التحيات.

و كل عام و انتم بخير.

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

محمد طيب

رئيس الجامعة الاسلامية دارالعلوم بديوبند–الهند

ان کے بعد دوسرے اسلامی ملکوں کے سربراہوں کے پیغامات بھی پڑھ کر سنائے گئے۔ جن میں اُردن کے شاہ حسین اور پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق کے پیغامات قابل ذکر ہیں۔ ان پیغامات میں کہا گیا کہ دارالعلوم دیوبند نے جنوبی ایشیاء اور پورے عالم اسلام میں جو عظیم علمی، دینی، تبلیغی اور اصلاحی خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ اسلام میں سنہری حروف کے ساتھ محفوظ ہیں۔

اس تین روزہ عظیم الشان صدسالہ تقریبات میں عالم اسلام کی جن نامور شخصیتوں نے خطاب فرمایا۔ ان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا مفتی محمود صاحبؒ، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ اور مولانا عبدالقادر آزاد وغیرہ حضرات کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔

یہ سہ روزہ صد سالہ تقریبات بڑے جوش وخروش سے تین روز تک جاری رہیں اور ۲۳/ مارچ کو یہ صد سالہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

اجلاس صد سالہ کے موقع پر آپؒ نے سرزمین دیوبند، دارالعلوم دیوبند کی اساسی شخصیات، مشاہیر فضلائے دارالعلوم دیوبند، ممالک اسلامیہ میں ممتاز فضلائے دارالعلوم دیوبند، مسلک دارالعلوم دیوبند، اجلاسِ صد سالہ، کے منتظمین، ان کی خدمات، معاونین اور تنظیم ابنائے دارالعلوم دیوبند کا منظوم تعارف ''ارمغانِ صد سالہ'' کے نام سے قلم بند فرمایا جس کو ''حیات طیب'' میں شامل کیا گیا ہے۔ (۳۲)

............❖............

مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تاسیس اور صدارت

ہندوستان ایک تہذیبی رنگا نگی، لسانی بوقلمونی اور مختلف مذہبی نظریات اور عقائد کی سرزمین ہے، ایک جمہوری اور سیکولر ملک ہونے کے ناطہ جو قانونی حقوق اپنے مذہبی افکار کی ترویج اور تہذیبی اقدار کی پابندی کے یہاں کی غالب اکثریت اور دوسری اقلیتوں کو حاصل ہے وہ مسلمانوں کو بھی حاصل ہے مگر افسوس کہ آزادی کے بعد سے اب تک مسلمان نہ صرف اپنے بعض جائز شہری حقوق سے محروم ہیں بلکہ بعض اوقات مذہبی افکار اور تہذیبی قدروں کی پابندی وترویج کی راہ میں روڑے اٹکانے کی مذموم کوششیں بھی سامنے آتی رہتی ہیں، جس میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے بجائے یکساں سول کوڈ کے جبراً نفاذ کا مطالبہ سرِ فہرست رہتا ہے۔

غیر مسلم ابنائے وطن جو غالب اکثریت کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں کچھ شدت پسند عناصر ہمیشہ سے ''ہندوتو'' کا نعرہ بلند کرتے رہے ہیں اور پورے ہندوستان کو اسی رنگ میں رنگنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے پاکستان کا راستہ لیا، جو درحقیقت فرقہ پسند عناصر کی دیرینہ آرزو کے عین مطابق تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اور زیادہ اقلیت میں آ گئے اور فرقہ پرستوں کو کُھل کھیلنے کا سنہری موقع ہاتھ آ گیا۔ اس فضا میں فرقہ وارانہ فسادات کے ساتھ مذہبی منافرت کی تخم ریزی اور یکساں سول کوڈ کے انتہائی مہمل مطالبہ نے زور پکڑا، اہل اسلام کے لئے یہ بڑا نازک مرحلہ تھا، جس کے لئے عامۃ المسلمین کی صدائے احتجاج کوئی مفید نتیجہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی، اس وقت اگر کوئی قدم زوردار اور بار آور نتیجہ پیدا کر سکتا تھا تو وہ صرف علماء ہی کا ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ معاملہ محض ایک معاشرتی اور تہذیبی بگاڑ کے امکانات ہی کا نہیں تھا، عقیدہ وفکر کے بگاڑ کا بھی تھا۔ جس کا صحیح ادراک علماء ہی کر سکتے تھے اور علماء میں بھی بالخصوص وہ طبقہ جو اپنی علمی صلاحیتوں کے ساتھ قائدانہ بصیرت سے متصف ہوتا، ان حالات میں حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے ہندوستان کے ہر طبقہ فکر کے چیدہ علماء کو اعتماد میں لے کر مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل کا عہد آفریں کارنامہ انجام دیا اور اس کے مؤسس ہونے کے ساتھ تاحیات اس کے صدر بھی رہے۔

ذیل میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تعارف، اس کی ضرورت، کردار اور دائرۂ کار کے سلسلہ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے خطبہ کا صرف ایک اقتباس بطور نمونہ ملاحظہ کیجئے:

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

''اسلام کا قالب جن قانونی دستاویزوں اور فطری اصولوں سے مشیت خداوندی نے تیار کیا ہے ان میں تمام ہنگامی اور دوامی اصلاحات اور ان کے اصول وقوانین جمع کر کے ان میں سے ان تمام سماجی برائیوں کو نکال دیا ہے جن کا نام جاہلیت تھا، اس میں کسی تغیر اور تبدیلی کے معنی اسی جاہلیت کو دوبارہ لے آنے کے سوا دوسرے نہیں ہو سکتے، جس سے مالک مطلق نے انسان کو پاک کر کے درجۂ کمال پر پہنچایا تھا۔

آج پرسنل لاء بورڈ کے نام پر ان تبدیلیوں کا مواد بنام ''اصلاح وترمیم'' پیش کیا جا رہا ہے۔ کیا حقیقتاً یہ اصلاح اور کوئی اصلاحی تحریک ہے؟ یہ اصلاح اسی قسم کی ہے جسے قرنِ اوّل کے منافقین **انما نحن مصلحون** کے نعرے کے ساتھ لے کر کھڑے ہوئے تھے لیکن عالم الغیب والشہادۃ نے کھلا اعلان فرما دیا تھا کہ **اَلآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ.**

ہم اپنے دین ودانش کے لحاظ سے یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی تحریک کوئی اصلاحی تحریک ہے جو ہندو کوڈ بل سے پیدا ہوئی ہے۔ سو یہ آپ کی سیاست ہے، آپ اسے اپنے پاس رکھئے۔

ہندوستان کا دستور مذہب وسیاست کو الگ الگ قرار دیتا ہے تو آپ ہمارے مذہب کے معاملہ میں اپنی سیاست ملا کر حکومت اور عوام کو ناراض کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟

آپ کا دعویٰ ہے کہ حکومت ریفارمس چاہتی ہے اور ہم مصلح ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ملک میں سماجی برائیوں، اخلاقی گراوٹوں اور غلاظتوں کے جو ڈھیر لگے ہوئے ہیں، حکومتوں کے قانون، حکام کی طاقت اور نام نہاد مصلحین کی اصلاحی مہم کا رخ اس طرف کیوں نہیں؟

مجھے اس وقت ایک سخت لفظ کہنے پر معاف کیجئے کہ وہ سماج کتنا دیوث ہے جو لاکھوں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو بازار میں بیٹھنے کی اجازت دیتا ہے اور چار شادیوں کی محض اجازت اور وہ بھی خاص شرائط وعدل ودیانت سے مشروط اجازت پر اعتراض کرتا ہے اور اس غلاظت پر ان مظلوم، قسمت کی ماری، بازاری گناہگار عورتوں پر کتنے مرد ظلم توڑتے ہیں، نہ کوئی پابندی عائد کرتا ہے اور نہ کوئی داروگیر کا روادار ہے، سماج نے گناہوں کے بازار لگا رکھے ہیں۔ آج بھی اس ملک میں ایسے فرقے ہیں جو اسّی اسّی بیویاں رکھتے ہیں اور سماج ان کے بارے میں چوں تک نہیں کرتا۔

بقول بابو ابھے چندر اور بابو گریندر ناتھ دت ''اس ملک میں کامن برہمن بھی ہیں، جن کی پچاس پچاس اور سو سو بیویاں ہیں، ان میں سے ہر شخص کے پاس ایک نوٹ بک رہتی ہے، جس میں وہ اپنی بیویوں کی ولدیت اور گاؤں کا نام لکھتے ہیں اور پھر بھی انہیں پشیمانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ جسے وہ ایک اجنبی سمجھ کر ملتے ہیں وہ ان کی بیوی یا لڑکا ہوتا ہے۔ (۳۳)

............❖............

مقدراتِ الٰہیہ

جہانِ فانی کے کل کوائف اُسی کی قدرت کے ہیں لطائف
اُسی کی رحمت سے کوئی غافل، اُسی کی عظمت سے کوئی خائف

حکیم الاسلامؒ کے عہد اہتمام کی مثالی ترقیات، انقلاب آفریں خدمات اور زریں کارناموں کے ضمن میں وہ تمام سوانح، حوادث اور مشکلات بھی آپ کی حیاتِ مبارکہ کا حصہ ہیں جن سے ہر دور کی بہ عزیمت، تاریخ ساز اور انقلابی شخصیات کو گزرنا پڑا، اجلاس صد سالہ کے بعد احاطہ دارالعلوم میں جو ناخوشگوار سانحہ پیش آیا وہ ہر طرح افسوس ناک والمناک تھا کہ اس سے دارالعلوم کی شاندار ماضی پر حرف آیا، علماء دیوبند کا وقار مجروح ہوا، ملت میں انتشار اور تشتت نے جنم لیا اور خود مسلک دیوبند بدنام ہوا۔ ایسی ایسی ثقہ باعتبار اور قدآور دینی شخصیات پر سے عامۃ الناس کا اعتماد اٹھا جن کی زبان سے نکلا ہوا ایک حرف شرعی امور میں ملت اسلامیہ ہند کے لئے حرفِ آخر اور ان کا ایک اشارہ حکم آخر کا درجہ رکھتا تھا۔ ان کے تقویٰ، طہارت، زہد وقناعت، دیانت وامانت، خداترسی اور خداپرستی کی لوگ قسم کھاتے تھے۔ ان کا اتحاد مثالی، اعتدال ضرب المثل اور ادب واحترام کی روایتیں زبان زد خاص وعام تھیں، ان کے اخلاص وایثار، بے نفسی اور خوف خشیت کو خیر القرون کے اخیار وابرار کے اخلاص وللّٰہیت سے ملایا جاتا تھا۔ ان کی سیرت وکردار کے آئینے میں اسوۂ رسول ﷺ کی جھلکیاں، اصحابِ رسولؐ کی پاکیزہ سیرتوں کا مشاہدہ ہوتا تھا، اس نقطہ نظر سے یہ سانحہ اپنی ذات میں ملت کے لئے واقعی ایک سانحہ کبریٰ تھا مگر اس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے کہ یہ سانحہ حکیم الاسلامؒ جیسی باعزیمت شخصیت کی قوتِ ایمانی، صبر وتحمل اور عزیمت واستقامت کا ایک امتحان تھا، جس میں آپ نہ صرف ثابت قدم رہے بلکہ ایک مثالی کردار کا مظاہرہ کیا۔

وسعتِ ظرفی اور خاندانی شرافت کی ایک اعلیٰ مثال

دارالعلوم دیوبند اپنے مثالی نظامِ تعلیم، اعلیٰ اصول، پاکیزہ نصب العین، صالح فکر اور تعمیری افکار کے

حوالے سے برصغیر کے مسلمانوں کا دھڑکتا ہوا دل اور عالم انسان کی ایک مسلّم دینی دانش گاہ کی حیثیت کا حامل رہا ہے۔اس لئے اس عظیم دانش گاہ کے حرکت وعمل اور نرم گرم کا اثر اس کی چہار دیواری تک ہی محدود نہ رہا۔ بلکہ پوری ملت اس سے متاثر ہوتی رہی ہے۔قضیۂ دارالعلوم کے نتیجے میں خود دارالعلوم کی شاندار روایات پر جو حرف آیا اس سے بڑھ کر ملت میں انتشار اور فکر دیو بند سے وابستہ حلقوں میں جن بدگمانیوں اور بے اعتمادیوں نے جنم لیا وہ قضیۂ دارالعلوم کا سب سے اندوہناک باب ہے، جس کو طریق عمل کے سینکڑوں اختلافات کے باوجود فریقین نے بھی محسوس کیا۔

حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہٗ بالعموم اپنے خوردوں کو اور بالخصوص اپنے اہل خانہ کو نصیحت (جو کہ بعد میں وصیت بن گئی) فرمائی کہ ''یاد رکھو اختلاف بات سے ہوتا ہے اور خلاف ذات سے ہوتا ہے، قضیۂ دارالعلوم کے اختلاف کا تعلق اول الذکر بات سے ہے، رائے سے ہے، طریقۂ عمل سے ہے، جہاں تک ذوات کا تعلق ہے سبھی حضرات جماعت کا معتبر حصہ ہیں، اس قضیہ کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جماعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی یا بایں طور کر دی گئی کہ ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں ادا کرنے میں بھی تکلف پیدا ہو گیا ہے، لہٰذا جماعت کی شیرازہ بندی کے لئے مساعی جاری رہنی چاہئیں، جب بھی اور جس قیمت پر بھی ہو اس کی تکمیل اولین مقصد کے طور پر بہر طور مقدم رکھی جائے اور قضیۂ دارالعلوم کو کبھی بھی عوامی موضوع نہ بنایا جائے، بالخاص اس نصیحت کا مخاطب حضرت خطیب الاسلام مولانا محمد سالم قاسمی صاحب کو بنایا گیا۔''

حضرت خطیب الاسلام جماعت کی تفریق سے ہمیشہ رنجور ومحزون رہتے تھے۔ اگر مقصد نیک ہو اور یقین کامل ہو تو للّٰہیت پر مبنی اخلاص نیت اور مساعی جمیلہ پر نصرت خداوندی کا ترتب امر موعود ہے، مختلف جوانب سے باہمہ وجوہ مصالحانہ کاوشیں افراط وتفریط کا شکار ہو کر ٹھنڈے بستہ میں جاتی رہیں، مگر قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا، آنے والی نسلوں کے الجھے ہوئے مسائل کو حل ہونے میں تیئیس منٹ بھی نہیں لگتے ہیں۔

صورتِ واقعہ یہ پیش آئی کہ حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحبؒ صدر جمعیۃ علماء ہند کی شدید بیماری کی اطلاع اخبار میں شائع ہوئی، اس خبر کے معاً بعد حضرت خطیب الاسلام نے تمام تر اختلافات اور تلخیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مدینہ منورہ میں مولانا اخلد رشیدی صاحب کو فون کر کے عیادت کی، اس اقدام سے یکساں طور پر دوطرفہ خوشگوار اثرات مرتب ہوئے، اگلے ہفتہ حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحبؒ دیو بند تشریف لائے اور ملاقات کی خواہش ظاہر فرمائی، بوقت ملاقات حضرت خطیب الاسلام نے فرمایا کہ ہم دونوں عمر کی اس منزل میں پہنچ گئے ہیں کہ اگر مختلف فیہ مسائل کو من وعن چھوڑ دیا گیا تو یہ نظریاتی

اختلافات اگلی نسلوں تک مستمر رہیں گے اور جماعت کا یہ موجودہ انتشار اگر ہماری زندگیوں میں ختم نہ ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اپنے سے آگے آنے والی نسلوں و جماعت کو اختلافات کی وراثت دے کر جائیں گے۔ مرحوم ومغفور حضرت مولانا نے نہایت خوش دلی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ اسی جذبہ کا اظہار فرمایا۔ جزئیاتی تفاصیل سے صرف نظر کرتے ہوئے بلا کسی شرط وقید دوطرفہ مقدمات ختم کئے گئے، بینکوں میں منجمد سرمایہ سے دارالعلوم دیوبند کے حق میں حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہٗ کی جانب سے ایک تحریر حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ اور اراکین مجلس شوریٰ کے نام تحریر کردی گئی، جو کچھ پیش آیا وہ امر تقدیری تھا، آج دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم وقف دیوبند اپنی اپنی جگہ شہرت وعظمت کے لحاظ سے ایک مسلّم حقیقت ہیں۔

اس طرح ان دونوں بزرگوں نے اپنی آخرت کا مسئلہ درست کرلیا، جس سے تاریخ دارالعلوم کا ایک افسوسناک باب بند ہوگیا، اسے صرف اور صرف خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی کے کمال درجہ کے اخلاص، ایثار اور وسعتِ ظرفی کا نتیجہ ہی کہا جاسکتا ہے ورنہ دارالعلوم وقف دیوبند کے باضابطہ قیام اور استحکام کے بعد بظاہر اس کا بھی جواز تھا کہ اس سے صرف نظر کرلیا جاتا۔ دارالعلوم وقف دیوبند پوری دنیا میں متعارف ہوچکا تھا اور متعارف کرانے والی دوقد آور شخصیات (خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ) عالمی سطح پر اپنا ایک مقام رکھتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑے بڑے ہی ہوتے ہیں، یہاں بڑوں نے اپنی بزرگانہ عظمت کا ثبوت ایک ایسے مرحلہ پر پیش کیا جہاں چھوٹے اپنی فتح مندیوں کے نشے میں انہیں سلام ودعا کا روادار بھی نہیں سمجھتے جن کی بدولت ترقی کے زینے طے کرکے وہ اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سے ان کو اپنا وہ فروتر مقام یاد بھی نہیں رہتا جس کے صحیح معنی میں وہ مستحق ہوتے ہیں۔ قدرت کے اس فیصلہ کو کوئی کہاں تک اور کب تک جھٹلا سکتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ **فاعتبروا یاولی الابصار.**

ہم بھی اس یقین کے ساتھ اس تکلیف دہ باب کو ہمیشہ کے لئے بند کرتے ہیں کہ جو کچھ ہوا تقدیر الٰہی کا حصہ تھا اور جس طرح سے اس دلخراش داستان کا اختتام ہوا وہ بھی اسی کا حصہ ہے. **وما تشاء ون الا ان یشاء اللّٰہ**

ذیل میں دونوں بزرگوں کے وہ موقر مکتوبات ملاحظہ فرمایئے جو اس انقلابی پیش رفت کا تتمہ ثابت ہوئے۔

............❖............

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجامعۃ الاسلامیۃ دار العلوم دیوبند "وقف" الھند

AL-JAMIATUL-ISLAMIA

DARUL-ULOOM, DEOBAND (WAQF) - 247554 (U.P.) INDIA

الرقم ——————— التاریخ ———————

محترم ومکرم جناب مولانا اسعد مدنی صاحب زیدۃ عنایتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

جواباً مکتوب گرامی نے ممنون بھی فرمایا اور مسرور بھی، جماعت کی ایک اہم ترین ضرورت کو محسوس فرماتے ہوئے آپ نے اختلافات کو ختم کرنے کے بارے میں تائیدی کلمات تحریر فرمائے اور احقر کی قدیم آرزو کی تکمیل کو متوقع بنا کر مسرت کو المضاعف فرمادیا ہے۔ جماعتی وقار اور مسلک روایات اکابر کی مجروحیت کا سدّ باب، اختلافات کو یکسر ختم کردینے میں ہی مضمر ہے، احقر کے خیال میں عمر کے مراحل نہائی میں پہونچ جانے پر ہماری مشترک خواہش وکوشش یہ ہی ہے، اور یہی ہونی چاہئے کہ ہم اپنے آجانے والی نئی نسل علماء کو اختلافات کی یہ نامبارک وراثت دیکرنہ جائیں، بلکہ حسب روایات اسلاف کرام ہم اتحاد واتفاق، فکری اور عملی وحدت اور مخلصانہ مشترک جذبات خدمت علم ودین دیکر بتوفیق الٰہی ایک اہم ترین جماعتی فریضے سے سبکدوش ہوکر بارگاہ رب العزت میں حاضر ہوں۔ آپ کی صحت کے لئے دعاء گو ہوں اور دعاء کا خواستگار ہوں۔

والسلام

(محمد سالم قاسمی)

بتاریخ ۲۹ر۱۲ر۱۴۲۵ھ
۹ر فروری ۲۰۰۵ء

DIAL! +91-1336-222452 - 222552 - EMAIL: sufyanqasmi @ yahoo.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Phone : 23311455
23317729
Fax : 23316173
Jamiat-Ulama-i-Hind
1-BAHADUR SHAH ZAFAR MARG, NEW DELHI-110 002

۲۰ر ذی الحجہ ۱۴۲۵ھ

Ref. No. JUH/ 2005 Date Jan 31, 2005

محترم المقام! زید مجدکم

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے خاکسار کی صحت وعافیت اور خیریت پوچھی۔ حج سے فراغت کے بعد طبیعت حد سے زیادہ ناساز ہونے کی وجہ سے کنگ فہد ہسپتال کے آئی سی یو میں داخل ہو گیا، جہاں ڈاکٹروں کی خصوصی توجہ رہی۔ اللہ رب العزت کے فضل وکرم اور آپ حضرات کی دعاؤں سے طبیعت سنبھل گئی۔ تین دن ہسپتال میں رہ کر کل ۳۰ر جنوری ۲۰۰۵ء کو بخیر وعافیت مدینہ منورہ سے دہلی واپسی ہوئی۔ الحمدللہ رفتہ رفتہ روبہ صحت ہو رہا ہوں۔ خصوصی دعاؤں کی درخواست ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ العزیز جماعت کی بنیاد ہیں ہم تو ان کی خاک پا کے برابر بھی نہیں۔ ماضی میں جو اختلافات ہوئے وہ بدنصیبی تھے اور ہیں۔ اس لیے جو کہا، کیا اور ہوا، اس کو معاف کرنا چاہیے اور آخرت کے لیے نہیں رکھنا چاہیے۔

دعوات صالحہ میں فراموش نہ فرمائیں۔

والسلام

اسعد مدنی

اسعد مدنی

صدر جمعیۃ علماء ہند

Ph. (01336) 222429-Fax: 222768

بسم اللہ الرحمن الرحیم

E-mail: darululoom_deoband@yahoo.com

دار العلوم دیوبند

Darul-Uloom, Deoband U. P. India

حوالہ .... باسمہ تعالیٰ التاریخ: ....

حضرت المخدوم جناب مولانا محمد سالم صاحب قاسمی۔ زید مجدکم السامی!

مہتمم دارالعلوم دیوبند (وقف)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہوں۔ نامہ گرامی شرف صدور لایا۔ جناب کے بلا تکلف اور براہ راست خطاب و کتاب سے بے حد مسرت ہوئی۔

خدام دارالعلوم دیوبند اور معزز ارکان مجلس شوریٰ، ان جذبات میں قدم بقدم جناب کے ہم آہنگ ہیں کہ دونوں اداروں کے درمیان پرخلوص یگانگت اور ہم آہنگی فکر کی بنیاد پر مقدمات کو ختم کرنے کے سلسلہ میں جو اقدامات اٹھائے جا رہے ہیں، ان میں زیادہ پیش رفت ہو۔ اور یہ تعاون و تفاہم دونوں اداروں کے قدیم وارثین اور ساتھ ہی ساتھ ملک و بیرون ملک میں پھیلے ہوئے لاکھوں وابستگان جماعت کیلئے سکون قلب اور قرۃ العیون کا ذریعہ بنے۔

جناب نے پنجاب نیشنل بینک میں موجود کل رقم مع جملہ حقوق ملکیت بحساب دارالعلوم دیوبند جمع کرانے کی جو پیشکش فرمائی ہے، ارکان عاملہ دارالعلوم دیوبند نے اس کو انتہائی مستحسن قدم قرار دیتے ہوئے اس پیشکش کو منظور کر لیا ہے اور مجلس نے محسوس کیا کہ جناب کا یہ اقدام جناب کی خاندانی علمی و فکری وراثت اور جذبات ایثار کا آئینہ دار ہے۔ اور اس اقدام کیلئے جناب والا بجا طور پر مستحق شکریہ و تحسین ہیں۔

ان شاء اللہ اس خط کو مقدمات کے آئینی اختتام کیلئے شامل کاروائی مقدمہ کر لیا جائیگا۔

مرغوب الرحمن عفی عنہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۹/۶/۱۴۲۷ھ

وفات

موت اس کی ہے کرے جس پہ زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سب ہی آئے ہیں مرنے کے لئے

دنیا آنی جانی ہے اور اس کی ہر شئے فانی ہے۔ دائم، لافانی اور جاودانی صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذاتِ معلّٰی صفات ہے۔ **کلّ من علیھا فان و یبقٰی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام** اس خاک دان ارضی سے روزانہ نہ معلوم کتنے انسان عالم آخرت کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں، جن میں کچھ وہ ہستیاں بھی ہوتی ہیں جن کی زندگی عالم انسانیت کی زندگی اور جن کی موت ایک عالم کی موت ہوتی ہے ایک دور اور ایک عہد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ان کی موت پر ایک فرد، ایک خاندان، ایک جماعت اور مخصوص خطہ ماتم کناں نہیں ہوتا بلکہ زمانہ افسوس کرتا ہے، تاریخ اشک بار اور عالم سوگوار ہوتا ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہٗ کی ذات گرامی بھی ان شخصیات میں سے ایک تھی، حکیم الاسلامؒ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علمی وانتظامی معمولات کی پابندی، دینی ودعوتی اسفار کی مصروفیت اور تقویٰ وطہارت کی بدولت جسمانی تندرستی سے بھی نوازا تھا۔ معمولی عوارض کے علاوہ کبھی کسی تشویشناک عارضہ میں مبتلا نہیں ہوئے، جب کہ عمر مبارک کی ۸۵ر منزلیں طے کر چکے تھے، آخری وقت تک چلتے پھرتے اور اپنے سارے معمولات ہشاش بشاش انجام دیتے رہے۔ عمر مبارک میں کبھی معذوری کی صورت سے دوچار نہیں ہوئے، انتقال سے پہلے طبیعت کچھ ناساز چل رہی تھی اور دیوبند کے مشہور حکیم جناب سید محمود علی صاحب ابن سید محفوظ علی صاحبؒ کا علاج چل رہا تھا۔

۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء بروز اتوار وفات سے ٹھیک تین گھنٹے قبل اپنے پوتے مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب مدظلہٗ، نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند جن سے حضرتؒ کو بے حد خصوصی تعلق تھا اور اکثر و بیشتر اپنے ہمراہ سفر میں بھی لے کر جاتے تھے ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۵ء تواتر کے ساتھ رمضان المبارک میں تراویح میں

قرآن کریم بھی سنا، اس روز صبح ۸ر بجے حسب معمول اپنے ساتھ ناشتہ کے لئے بلایا اور ناشتہ کے بعد فرمایا کہ سفیان! آج میں تمہیں ایک ہدیہ دے رہا ہوں، اس کے بعد اپنی الماری سے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک کاپی عنایت فرمائی جس میں اہل خاندان واہل قرابت کے متعلق نظموں کے ساتھ مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب سے متعلق دعائیہ نظم ''میاں سفیان اور مالشِ سر'' بھی درج ہے، اس کے علاوہ ''سفر نامۂ کشمیر اور قاسمیت'' کے عنوان سے طویل ترین نظمیں بھی ہیں۔ فرمایا کہ یہ خاص تمہارے لئے ہی رکھی تھیں، پتہ نہیں اس کے بعد موقع ملے یا نہ ملے۔

آخری لمحات میں حکیم صاحب کے آنے سے پہلے آپ آرام سے سوئے ہوئے تھے، جب حکیم صاحب آئے تو فرمایا: ''آپ مقامی ہو کر بھی غیر مقامی ہوئے'' چوں کہ حکیم صاحب کئی روز کے بعد آئے تھے، اس لئے یہ جملہ فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے حکیم صاحب کو اپنی بیماری کی کیفیت بتلائی، حکیم صاحب نے آپ کی باتیں سننے کے بعد آپ کے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔ حکیم الاسلامؒ نے چند سانس لئے، چند منٹ تنفس کا سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد عالم فانی سے عالم جاودانی میں پہنچ گئے جہاں **لھم مایشاؤن عند ربھم** کے مرتبہ پر فائز **راضیۃً مرضیۃ** کے خلعت سے سرفراز اور **لھم مایشاؤن فیھا و لدینا مزید** کے انعامات سے مالا مال۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

نہ کسی قسم کی گھبراہٹ، نہ بے چینی، نہ تکلیف کا اظہار ع

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں

آخری وقت میں خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم، مولانا مفتی سید احمد علی سعیدؒ، مولانا محمد اسحاق صاحبؒ مالک کتب خانہ رحیمیہ دیوبند، جناب ڈاکٹر شمیم احمد سعیدی صاحبؒ بانی جامعہ طبیہ دیوبند اور حفیدِ حکیم الاسلامؒ حافظ محمد عاصم قاسمی صاحب موجود تھے۔

۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء صبح ۱۱ر بج کر ۱۰ر منٹ کا واقعہ ہے، ساڑھے گیارہ بجے دن میں دیوبند کی جامع مسجد سے انتقال کا اعلان ہوا، تھوڑی ہی دیر میں ہر جگہ خبر پھیل گئی اور مقامی و غیر مقامی لوگوں کا سیلِ رواں دولت خانہ کا رخ کرنے لگا۔ آل انڈیا ریڈیو کے کئی نشریوں میں وقفہ وقفہ سے انتقال پر ملال کی خبر دی جاتی رہی، جس کی وجہ سے ملک و بیرون ملک آپ کے سانحہ وفات کی اطلاع ہوتی چلی گئی، گرمی شباب پر تھی، اچانک موسم خوشگوار ہوتا چلا گیا، ہلکی پھلکی ہوا اور ٹھنڈی ہوا کا سلسلہ شروع ہو گیا، بعد نمازِ عشاء احاطۂ دارالعلوم میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ نمازِ جنازہ آپ کے صاحبزادے محترم خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم نے

پڑھائی۔ دیوبند میں نماز جنازہ میں شریک ہونے والوں کی اتنی بڑی تعداد شاید کسی نے دیکھی نہ سنی۔ احاطۂ مولسری سے لے کر دیوان دروازہ تک تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، جنازہ کو کاندھا دینے کے لئے بندگانِ خدا کا سیلاب امنڈ پڑا، چارپائی میں لمبی لمبی بلیاں باندھی گئیں تھیں اور ایک ساتھ کئی کئی آدمی کاندھا دے رہے تھے، اس کے باوجود بھیڑ کے ہاتھوں قبرستان قاسمی تک پہنچتے پہنچتے خاصا وقت لگ گیا۔ تدفین تک موسم میں اتنی خنکی آ گئی تھی کہ رات کے وقت رضائیاں اوڑھنے کی نوبت آئی، جس کو اہلِ دیوبند کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔

قبرستانِ قاسمی

سبحان اللہ! کیسے کیسے اساطینِ علم اور اقلیمِ معرفت و کمال کے شاہانِ بے کلاہ، اس فردوسِ ارضی میں آسودۂ خواب ہیں۔ حکیم الاسلامؒ کی آخری فرودگاہ بھی یہی ''قبرستان قاسمی'' ہے۔ سوانح قاسمی کے مؤلف مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ بزرگانِ دیوبند کی اسی آخری آرام گاہ کی منظر کشی کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''سچ تو یہ ہے کہ سہ پہر پیما گنبدوں، فلک بوس قبوں میں بھی آج شاید سکینت و طمانیت کی خنکیاں مشکل ہی سے میسر آ سکتی ہیں، جو اِن پکی، خام اور سادہ قبروں والوں کو اس قبرستان میں میسر ہے۔''

اس خطہ صالحین میں سب سے پہلے حکیم الاسلامؒ کے جدامجد، دارالعلوم دیوبند اور فکرِ دیوبند کے مؤسس، حجۃ الاسلام حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی قدس سرہٗ آسودۂ خواب ہوئے، انہیں کی وجہ سے سرزمینِ دیوبند کی نامی گرامی شخصیت اور حضرت نانوتویؒ کے عقیدت مند و معالج جناب حکیم مشتاق احمد صاحبؒ نے یہ خطۂ زمین بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے خانوادہ کے لئے وقف کیا۔ خانوادۂ قاسمی کے اسلاف نے اپنی خاندانی وسعتِ فکری کی بنیاد پر اس قطعۂ اراضی کو عمومیت عطا کر کے سلاطین علم و عمل کی آخری آماجگاہ بنا دیا، آج بھی اس ''قاسمی قبرستان'' کی تولیت اسی خاندان کے فردِ فرید مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب کے پاس ہے۔

پھر یکے بعد دیگرے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، امام المنقول والمعقول حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ جیسی بلند پایہ علمی شخصیات حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ کے جوار میں مدفون ہوتی رہیں، خدا معلوم کہ اس خاک میں اب تک کیسے کیسے جبالِ علوم سما چکے ہیں، کتنے ہی اہلِ کمال کو جوارِ قاسمی کی سعادت میسر آئے گی اور کتنے ہی اس شہر خموشاں سے حشر میں اٹھیں گے؟ یہاں لوحِ مزار کے سوا کوئی نشان نظر نہیں آتا اور نظر بھی کیوں آئے؟ یہاں خاکساری و

تواضع کے پیکر اور عبودیت وتقویٰ کے مجسّم، زمین کی چادر اوڑھے محوِ خواب ہیں۔ سیکڑوں، ہزاروں کی تعداد میں ان بزرگوں کی علمی وروحانی ذریت صبح وشام حاضری اور دعا کو اپنے لئے سعادتِ روحانی اور سکون کا ذریعہ تصور کرتی ہے، ہر وقت نور کی بارش اور اللہ کی رحمت برستی ہے۔ فلک بوس گنبدوں، پختہ قبروں اور حریر و دیباج کی ہری چادروں میں ملفوف اونچی اونچی قبروں کا کیا کام؟

حکیم الاسلامؒ اپنے جدامجد حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پہلو میں مدفون ہیں۔

الفاظِ مزار پر نگاہ ڈالتے ہی ہر زائر وصادر کی زبان پر بے اختیار آجاتا ہے: اللہ اکبر! کیا لوگ تھے، کیا علمی دبدبہ، جاہ وجلال، کیا فضل وکمال، کیا تقویٰ وطہارت کے پیکر زیر خاک ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ اپنے عہد کی ایک زریں تاریخ، ایک پاکیزہ نظریہ کے بانی، ایک نسل کے مربی، مصلح محسن، فضل وکمال کی ایک وسیع کائنات کے تاجدار اور علم ومعرفت کی اقلیم کے یہ شہنشاہ، دوگز زمین کو بچھونا بنائے ہوئے محوخواب ہیں اور پس مرگ بھی خود زندہ اور زندوں کے لئے روحانی طمانیت اور قلبی سکینت کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

دن کے اجالوں میں جایئے یا شب کے اندھیروں میں، نہ وحشت، نہ دہشت، سکون ہی سکون، راحت ہی راحت، قبرستان قاسمی میں میسر آتا ہے۔

اپنے اُن جدامجد کے پہلو میں جن کے مزارِ مبارک پر پُرنم آنکھوں سے مشتِ خاک ڈالتے ہوئے نامی گرامی اور وقت کے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے بے اختیار یہ شعر پڑھا تھا ؎

مٹی میں کیا سمجھ کے چھپاتے ہو دوستو
گنجینۂ علوم ہے یہ گنجِ زر نہیں

اپنے دور میں مرزا غالبؔ نے سرزمینِ دہلی کے بارے میں یہ شعر کہا تھا، جواب یہاں پر اپنی پوری صداقتوں کے ساتھ منطبق ہو رہا ہے ؎

چپہ چپہ پہ ہیں یہاں گوہرِ غلطاں تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

حکیم الاسلامؒ دنیا کی تمام رعنائیوں، برنائیوں اور عارضی رونقوں کو چھوڑ کر یہاں آسودۂ خواب ہیں ؎

وسعت جہاں کی چھوڑ جو آرام چاہئے
آسودگی رکھے ہے بہت گوشۂ مزار

............❖............

منظوم و منثور تعزیتی پیغامات

حکیم الاسلامؒ کی وفات حسرت آیات پر ملک بھر سے علمی حلقوں، ملّی اداروں، مشاہیر شخصیات اور نامور علماء کے تعزیتی خطوط اور پیغامات کا سلسلہ طویل عرصہ تک جاری رہا، ان تمام پیغامات کو اگر جمع کیا جائے تو ایک دفتر بن جاتا۔ تاہم کچھ اہم پیغامات اتفاق سے محفوظ رہے، جن میں سے چند اہم منظوم و منثور پیغامات کو نذر قارئین کیا جارہے ہیں۔

آہ! مولانا محمد طیب صاحبؒ

پیکرِ صدق و صداقت تھے حکیم الاسلامؒ
آئینہ دارِ بصیرت تھے حکیم الاسلامؒ

منبعِ رشد و ہدایت تھے حکیم الاسلامؒ
عاشقِ نورِ رسالت تھے حکیم الاسلامؒ

فائق و نکتہ رس و نکتہ شناس و حق بیں
مخزنِ گوہرِ حکمت تھے حکیم الاسلامؒ

بٹتی جاتی تھی تو اور بڑھ جاتی تھی
ایسی اک علم کی دولت تھے حکیم الاسلامؒ

آپ سے مل کے ہر اک دل کو قرار آتا تھا
نیک دل نیک طبیعت تھے حکیم الاسلامؒ

اہلِ ہند آپ کی ہستی پہ کریں ناز نہ کیوں
صاحب فہم و فراست تھے حکیم الاسلامؒ

نیّرؔ خستہ نوا حلقہ بگوش آپ کا تھا
اس پہ مائل بہ عنایت تھے حکیم الاسلامؒ

مولانا نیر ربانی مدرسہ دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور

تاریخ وفات منظوم

قطعہ بتواریخ

۳ ۰ ۴ ۱ ھ

قاریٔ طیبؒ زعیم با صفا — عالمِ دیں ہادیٔ راہِ خدا
مہتمم دار العلوم دیو بند — رشد و تقویٰ را امینِ با وفا
سنگ میلِ مدر سہ دارالعلوم — ماہرِ اسرارِ دینِ مصطفیٰ
شیخِ وقت و ہم مجازِ تھانویؒ — صوفیٔ حق کیش راہِ حق نما
ماہِ تاباں بود در ہر انجمن — تشنگانِ علم را بحرِ سخا
ہند را سحباں، امیرِ کارواں — واعظِ شیریں بیاں شیریں نوا
بود ذاتش منفرد در انجمن — اہلِ علم و فضل را ہم مقتدا
ما ہِ انور داخلِ جنت بود — از دلم سالِ وفات آید ندا

۳ ۰ ۴ ۱ ھ

ہاتف ازعثماں سراجِ دین گفت — رحلتش ہم طیّب و ہم پُر ضیا

۳ ۸ ۹ ۱ ء

(مولانا محمد عثمان صاحب معروفی)

قطعات تاریخ

واعظ شیریں بیاں کی گم ہوئی آواز خوش — بجھ گئے ممتاز اندازِ خطابت کے دیئے
دینِ حق ،قرآن وسنت کی اشاعت کے طفیل — ’’آج آغوشِ محمد‘‘ واہے طیب کے لیے(۵۸)

۳ ۰ ۴ ۱ ھ

(مولانا مفتی کفیل الرحمٰن نشاطؔ عثمانیؒ، نائب مفتی دارالعلوم دیو بند)

بڑے پاکیزہ رُو پاکیزہ سیرت صاحبِ باطن — رشیؔدو قاسؔم و محمؔود کے جلووں کی تا با نی
تواضع ،حلم ،شفقت اور ثبات وصبر کے پیکر — کریں گے یاد ہر دم مظہرِ ’’اخلاقِ عثمانی‘‘

۳ ۰ ۴ ۱ ھ

اُف یہ فرقت عظیم عالم کی — دل پہ گذری ہے کیا دمِ رحلت
حادثوں کی اذیتوں میں نشاطؔ — "سب پہ بھاری ہے اب غمِ رحلت"

۱۹۸۳ء

ذکرِ طیب

ملائک آسماں سے بہر استقبال آتے ہیں — فلک کی راہ پر وہ جنتی قالین بچھاتے ہیں
عجب انداز سے وہ ہشت جنت کو سجاتے ہیں — کھڑی ہے کہکشاں اور ماہ وانجم مسکراتے ہیں
یہ فخرِ خاندانِ قاسمی دنیا سے جاتے ہیں
ملائک آسماں سے بہر استقبال آتے ہیں

کہا قاسمؔ نے آکر اے مرے نورِ نظر آجا — وہ آئی روح والد اور کہا لختِ جگر آجا
کہا محمودؔ و اشرفؔ نے ہمارے لال ادھر آجا — شبِ رنج و محن کا ہو گیا وقتِ سحر آجا
تجھے اب گردشِ ایام سے ہم لینے آتے ہیں
ملائک آسماں سے بہر استقبال آتے ہیں

ہمارے باغ کو تم نے کیا ہے ہر طرح شاداب — بڑی محنت سے تاعمرِ دراز اس کو کیا سیراب
جوارِ رحمتِ حق میں رہے گا اب سے محوِ خواب — دلِ اسلاف تیرے درد و غم سے ہیں بڑے بیتاب
اسے کیا فکر جس کا غم جہاں کے لوگ کھاتے ہیں
ملائک آسماں سے بہر استقبال آتے ہیں

دلِ مسلم سے تا عرش الٰہی آہ جاتی ہے — صدائے نالۂ وفریاد ہر مسکن سے آتی ہے
زمینِ ہند و پاکستان و بنگلہ تھرتھراتی ہے — بگڑ کر ہم سے میرِ کارواں کی روح جاتی ہے
خدا خود اپنے قربِ خاص میں ان کو بلاتے ہیں
ملائک آسماں سے بہر استقبال آتے ہیں

مدیرِ جامعہ دار العلوم و جانِ جاں طیبؒ — وہ فخرِ دیو بند و یوسفِ ہندوستاں طیبؒ
وہ مردِ با خدا شیریں سخن جادو بیاں طیبؒ — علومِ قاسمی کے وہ امین و ترجماں طیبؒ

وہ جس کو دیکھ کر ہر غنچۂ و گل مسکراتے ہیں
ملائک آسماں سے بہر استقبال آتے ہیں

زباں پر جس کی بہتا ہوا حکمت کا دریا تھا وہ جس کی ذات سے اسلام کا بھی بول بالا تھا
جہاں میں ہر طرف جس کی ضیاؤں کا اجالا تھا صحابی تو نہیں لیکن صحابہ کا نمونہ تھا
وہ جس کی نقل و حرکت میں درسِ عشق پاتے ہیں
ملائک آسماں سے بہر استقبال آتے ہیں

ولایت کو شرف ہے تاجدارِ اولیا تم تھے لباسِ زہد نازاں ہے کہ زاہد با صفا تم تھے
یہ ملت فخر کرتی ہے کہ اس کے مقتدا تم تھے ہے ناز اپنی جماعت کو مبصّر رہنما تم تھے
تری اِک اِک ادا پر ہم یہ اشکِ خوں بہاتے ہیں
ملائک آسماں سے بہر استقبال آتے ہیں

کہوں اب الوداع اے زینتِ ہر بزم ایمانی ہمیں رہ رہ کے یاد آئی تری اک ایک قربانی
کرے خود ربِّ عالم تیرے گلشن کی نگہبانی ترے مرقد پہ دائم ہو فلک کی شبنم افشانی
خدا رحمت کا دریا ایسے پیاروں پر بہاتے ہیں
ملائک آسماں سے بہر استقبال آتے ہیں

الٰہی اس جماعت کا نہ شیرازہ بکھر جائے نہ جانے قافلہ جنگل میں ٹکرا کر کدھر جائے
تری رحمت سے رفتہ رفتہ حال اس کا سدھر جائے بڑھا دستِ کرم زلف پریشاں اب سنور جائے
غضب ہے آج ہم کیا گوہر یکتا گنواتے ہیں
ملائک آسماں سے بہر استقبال آتے ہیں

یہ کیسے شیرِ ملت آج زیرِ خاک سوتے ہیں یہ کیسے بلبلِ نغمہ سرا خاموش ہوتے ہیں
نہ ہوگا حق ادا خونِ جگر سے بھی جو روتے ہیں سفینہ علم و حکمت کا بھنور میں آج کھوتے ہیں
غلط ہے ذوقؔ اس دنیا سے جو ہم لو لگاتے ہیں
ملائک آسماں سے بہرِ استقبال آتے ہیں

(مولانا محمد سلطان ذوقؔ صاحب
استاذ حدیث و ادب جامعہ اسلامیہ چاٹگام بنگلہ دیش)

ہدیۂ عقیدت

ہادیٔ دیں، شیخ دوراں، صاحبِ فضل و کمال
آنکہ در ذاتِ رفیعش بے نظیر و بے مثال

در تصانیف و خطابت شہرۂ آفاق گشت
رتبۂ ممدوح با لا از حدِ اوراق گشت

مرکزِ ارباب ِ تقویٰ، مرجعِ اہلِ ضمیر
آفتابِ علم ودانش صاحبِ خیر کثیر

بحرِ شفقت، جوئے رافت، حاملِ فیضِ عظیم
وارثِ علم نبوت، پر توِ خلقِ عظیم

آیۂ اخلاق کامل طیب و پاکیزہ رو
زینتِ گلزارِ قاسمؒ جامعِ صد رنگ و بو

فخرِ ملت، شمعِ حکمت، مقتدائے ما، امام
لائق مدح و ستائش صاحبِ حسنِ نظام

جانشینِ شیخ انورؒ شاہ، تلمیذِ رشید
حاملِ انوارِ اشرفؒ در جہاں دُرِّ فرید

آں کہ از اوصافِ عالی نازشِ دوراں شدہ
دعوتِ آں باعثِ عزّ و نشاطِ جاں شدہ

(مولانا مفتی کفیل الرحمٰن نشاطؔ عثمانیؒ، نائب مفتی دارالعلوم دیو بند)

جابسا خلدِ بریں میں تاجدارِ دیو بند

آج تاریکی میں کیوں ڈوبا ہے شہرِ دیو بند
چھپ گیا اے دوستو! شاید کہ مہرِ دیو بند

چھپ گیا ہاں آج وہ خورشید تاباں چھپ گیا
جس کی کرنوں سے درخشاں تھا گلستاں چھپ گیا

جس کی نورانی شُعاعوں سے منور تھا چمن
ہو گیا ہے حکمتوں کا مہرِ تاباں وہ گہن

جس نے خونِ دل سے سینچا تھا گلستانِ علوم
آسمانِ علم پر جس نے سجائے تھے نجوم

جس نے سکھلائے زمانے کو شریعت کے رموز
نیز اسرارِ طریقت اور حقیقت کے رموز

جس کے آگے دم بخود رہتے زباں آور تمام
دل سے ہر چھوٹا بڑا کرتا تھا جس کا احترام

جس کی گفتارِ مسلسل موتیوں کی تھی لڑی
حکمتوں سے پُر تھی جس کی بات ہر چھوٹی بڑی

غازیٔ گفتار تھا اور صاحبِ کردار بھی
شاہ بے تاج و نگیں، دیں کا علم بردار بھی

ترجمانِ مسلکِ حق آہ! رخصت ہو گیا
پاسبانِ مسلکِ حق آہ! رخصت ہو گیا

"حجۃ اللہ" کا وہ یکتا ترجماں جاتا رہا
حجۃ الاسلامؒ و احمدؒ کا نشاں جاتا رہا

جس کے نیک اوصاف دنیا میں رہے ضرب المثل
علم وعرفاں تھی سراپا جس کی ذاتِ بے بدل

جس نے سلجھائیں ہمیشہ علم و فن کی گتھیاں
جس نے سمجھائیں جہاں کو دینِ حق کی خوبیاں

جس کی اخلاقِ معلّی سے مجلّی تھی سرشت
عاجزی کے نور سے تاباں تھیں گفتارنشست

جس کا شیوہ پاک دامانی و خودداری تھی خو
قاسمؒ واحمدؒ کے وارث میں تھے ان کے رنگ و بو

پیکرِ صبر و رضا تھا، خوگرِ تسلیم تھا
وہ امام علم و حکمت رہبرِ تعلیم تھا

صاحب حلم وحیا تھا زاہد و اہلِ غنا
وہ امین و باصفا تھا ، صاحبِ صدق و وفا

عشقِ حق کی آگ تھی سینے میں جس کے مشتعل
عشقِ پیغمبر سے تھے لبریز جس کے جان و دل

جس کی صورت بھی حسیں تھی اور سیرت بھی حسیں
اہلِ دل کا دلبر و دلدار تھا وہ مہ جبیں

ہو گیا رخصت جہاں سے وہ نگارِ دیوبند
جا بسا خلدِ بریں میں تاجدارِ دیوبند

آہ دنیا سے ہوا رخصت امامِ روزگار
وہ سراپا حلم و بحر علم اور کوہِ وقار

فیض شیخ الہندؒ سے معمور جب سینہ ہوا
نورِ انور شاہؒ سے پرنور جب سینہ ہوا

درگہِ اشرف علیؒ کے فیض سے احمدؒ کا لال
قاسمِ ثانی بنا وہ صاحبِ فضل و کمال

بن گیا فخرِ الاماثل علم و فن کا آفتاب
راہِ عرفان وتصوف کا درخشاں ماہتاب

ہو گیا مشہور وہ اسلام کا یکتا حکیم
ہو گیا صدر الافاضل قوم مسلم کا زعیم

اہلِ حق نے اس کو مانا اپنے مسلک کا امام
کر دیا اس کے حوالہ دیوبند کا اہتمام

اس کے شایاں تھا یقیناً دیوبند کا اہتمام
اس کی ابرو کا اشارہ بس تھا بہرِ انتظام

فیض طیبؔ سے ہوا سیراب جب وہ گلستاں
ہوگئی ہر شاخ اس کی پُر بہار وگل فشاں

دیوبند کا مدرسہ تھا بن گیا دارالعلوم
تشنگانِ علم و فن کا ہو گیا اس پر ہجوم

باغباں نے ہر روش اس کی سجائی خوب تر
بھر دیے دامن میں اس کے بے بہا لعل و گہر

اس کا اٹھاون برس چمکا ہے دور اہتمام
لائقِ صد آفریں تھا اس کا حسنِ انتظام

جس نے چمکایا جہاں میں خوب نامِ دیوبند
زخمی دل لے کر گیا ہے وہ امام دیوبند

شکر و صبرِ بیکراں کے لوٹ کر سب مرتبے
سو گیا وہ رحمتِ رحمٰن کے سائے تلے

رحمتِ حق نے بلایا اس کو باغِ خلد میں
مل گیا رحمت کا سایہ اس کو باغِ خلد میں

جب چلا خلدِ بریں کو نازنینِ دیوبند
بن گئی ماتم کدہ اُف سر زمینِ دیوبند

گلستانِ علم و فن کی ہیں بہاریں سوگوار
اب کہاں ہے ایسا یکتا باغبانِ نامدار

جس کا سب خورد وکلاں کرتے تھے دل سے احترام
وہ حکیم اسلام کا تھا دلربائے خاص و عام
صاحبِ اوصافِ گونا گوں، زعیم نیک نام
پاک طینت، پاک دامن، پارساؤں کا امام
عابد و زاہد خطیبِ نکتہ دان و خوش کلام
علم و عرفاں کا پلا تا تھا زمانے کو وہ جام
پیکرِ صبر و رضا وہ اہل دل کا دلربا
حق پہ جو ثابت رہا وہ راہ حق کا پیشوا

مولانا نسیم احمد صاحب غازیؔ مظاہری، شیخ الحدیث جامع الہدیٰ مراد آباد (یوپی)

تجویز تعزیت مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند

۷/۸/۹ رصفر ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۳/۱۴/۱۵ رنومبر ۱۹۸۳ء: دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس دار العلوم کے سابق مہتمم اور عالم اسلام کے ممتاز و بلند پایہ عالم حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے حادثۂ وفات پر انتہائی رنج وغم اور درد والم کا اظہار کرتا ہے، مرحوم ومغفور کو اللہ تعالیٰ نے لاتعداد محاسن ومناقب اور فضائل ومکارم سے نوازا تھا، علوم ظاہری میں وہ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بلند پایہ مایہ ناز تلمیذ رشید تھے اور علوم باطنی میں ان کو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے عظیم المرتبت شیخ کی خلافت حاصل تھی، انہوں نے اپنے سرچشمۂ فیض سے درس وتدریس، موعظت ودعوت اور رشد وصحبت کے مختلف ذرائع سے اپنی طویل عمر میں نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کو سیراب کیا۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں حسن تقریر کی بے بہا دولت سے نوازا تھا اپنے جدامجد حضرت نانوتویؒ کے علوم حکمیہ پر ان کی گہری نظر تھی، اسی لیے وہ جب بڑے بڑے اجتماعات میں علم وحکمت کے موتی بکھیرتے تو ”کان علیٰ رؤسھم الطیور“ کا منظر سامنے آجاتا اور سامعین مسحور ہوکر رہ جاتے۔

علوم ظاہری وباطنی کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حسن صورت اور حسن سیرت کے محاسن سے بھی نوازا تھا، محبت وشفقت، شیریں زبانی، ہمدردی، دل جوئی، انسانیت ومروت کے جذبات ان کو قدرت نے فراخ دلی سے عطا کیے تھے، ہر شخص کے کام آنا اور ہر ایک کی ضرورت کو پورا کرنا ان کا مزاج بن گیا تھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کا انتقال ملت اسلامیہ کا عموماً، اس عظیم ادارہ کا خصوصاً ناقابل تلافی نقصان ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں مقام عالی عطا فرمائے، انبیاء وشہداوصالحین کے زمرے میں شامل کرے اور ان کے اہل خاندان خصوصاً ان کے تینوں صاحبزادوں مولانا محمد سالم، مولانا محمد اسلم اور مولوی محمد اعظم قاسمی اور صاحبزادیوں کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین

”رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃٌ واسعۃٌ کاملۃٌ شاملۃٌ“

............❖............

عالی جناب گیانی ذیل سنگھ صاحب صدر جمہوریۂ ہند:

حضرت حکیم الاسلامؒ کی وفات حسرت آیات پر صدر جمہوریۂ ہند نے اپنے غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا، کہ ہندوستان نے ایک مسلمان عالم دین اور محقق کھودیا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی پیغام نبویؐ اور حضورؐ کی تعلیمات عام کرنے میں ایک خطیب اور مبلغ کی حیثیت سے گذاری۔

............❖............

محترمہ اندرا گاندھی صاحبہ، وزیراعظم ہند:

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اسلامی علوم کے میدان کی ایک نمایاں علامت تھے ان کی یادگار ان کے زیر اہتمام دارالعلوم دیوبند خود ہے۔

............❖............

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ / بانی ندوۃ المصنّفین دہلی:

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ممتاز عالم دین اور خطیب تھے، انھوں نے اسلامی دعوت اور تعلیمات کو منبر ومحراب سے عام کرنے میں اپنی زندگی وقف کردی اور دارالعلوم دیوبند کو ترقیات کے اعلیٰ درجات تک پہنچا دیا۔

............❖............

امیر جماعت اسلامی ہند:

امیر جماعت اسلامی حضرت مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی نے تعزیتی ٹیلی گرام میں حکیم الاسلامؒ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے دعا کی کہ اللہ ان کے درجات جنت میں بلند فرمائے۔

............❖............

میر واعظ مولوی محمد فاروقؒ، سرینگر کشمیر:

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ عالم دین اور اسلاف کے نمونہ تھے، ان کی وفات سے ہندوستانی مسلمانوں کا ایک نمایاں عہد ختم ہوگیا۔

نصف صدی سے زائد عرصے تک دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کی حیثیت سے انھوں نے دعوت وتبلیغ، اصلاح معاشرہ اور اسلامی تعلیمات عام کرنے کی نمایاں خدمات انجام دیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو علم وبردباری، زہد وتقویٰ اور قوت گویائی وحکمت کی بہت سی خصوصیات سے نوازا تھا۔

............❖............

حکیم عبدالحمید صاحب ہمدرد نگر، دہلی:

مکرمی مولانا محمد سالم صاحب قاسمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت مولانا طیب صاحبؒ کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی وہ پر ہونی مشکل ہے، ان کی بعد کی علالت کی مجھے خبر نہیں ہوئی، انہوں نے مسلمانوں کی اور دارالعلوم کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ دعا ہے خدا ان کے درجات کو وہاں بھی بلند فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل دے۔

............❖............

حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ، بانی جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ:

مکرم جناب مولانا محمد سالم صاحب...............................دام کرمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آج چوتھا دن ہے احقر اہلیہ کے علاج کے لیے بمبئی حاضر ہوا ہے، کل اچانک حادثۂ جانکاہ کی اطلاع ملی لیکن یقین نہیں آیا اس لیے کہ شام ہی کو جناب غازی صاحب سے حضرت کی خیریت معلوم ہوئی تھی اور اطمینان تھا بارش بہت تیز ہو رہی تھی آمد ورفت کے راستے بند تھے کئی جگہ ٹیلیفون ملایا سب جگہ لاعلمی کا جواب آیا محمد بھائی سے رابطہ قائم کیا مگر وہ دوسری جگہ تھے بعد میں خبر ملی اور ریڈیو سے بھی معلوم ہوا کہ خبر صحیح ہے دلی صدمہ پہنچا جس نے بھی سنا سب پر ایک سکتہ طاری رہا۔

ہائے افسوس کہ اللہ پاک نے ایک نایاب موتی عطا کیا تھا لیکن امت نے قدر نہ کی جس کا وبال ہے کہ اللہ نے یہ نعمت چھین لی اب ہاتھ ملنے سے کیا ہوتا ہے، اللہ پاک حضرتؒ کے درجات بلند فرما کر اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے اور تمام پسماندگان ومتوسلین کو صبر جمیل اور امت پر رحم فرما کر اپنی قدرت کاملہ سے صحیح رہنما مرحمت فرمائے۔

آج ایک تار بھی کیا ہے یہاں سے فراغت کے بعد انشاء اللہ احقر حضرتؒ کے مزار پر حاضری دے گا۔

............❖............

مولانا مظفر حسین مظاہری، ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور:

جناب مولانا محمد اسلم صاحب اور جناب محمد اعظم صاحب کی خدمت میں سلام مسنون ۶ر شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء یک شنبہ کو تمام عالم اسلام پر عموماً اور ملت اسلامیہ ہند پر خصوصاً اک ایسا عظیم سانحہ گذر گیا کہ عوام وخواص سب ہی گہرے رنج وغم میں ڈوب گئے وہ حادثہ اسلام کے مفکر عظیم، ممتاز ونمایاں عالم علوم دینیہ کی بین الاقوامی درسگاہ کے معمار وتزئین کار حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے وصال کا ہے۔

حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین ومنتسبین کی کیفیات نا قابل بیان ہیں اور مستقبل میں بہت دور تک ایک عمیق اور تاریک خلا مزید گھیرا دے رہا ہے، یقیناً اس اندوہناک حادثہ پر ان کا غیر معمولی تاثر ایک فطری امر ہے، ہم خدام بھی اس روح فرسا سانحہ فاجعہ پر غم والم کی سخت وشدید مضطربانہ کیفیات محسوس کرتے ہیں اور تعزیت کناں ہیں، یہ الفاظ ہمارے تاثرات کا شکستہ اظہار ہیں ہم بارگاہ خداوندی میں بصمیم قلب دعا گو ہیں کہ حق تعالیٰ حضرتؒ کے درجات بلند فرمائیں اور متعلقین و منتسبین کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائیں، یہ تاثرات صاحبزادہ محترم حضرت مولانا محمد سالم صاحب کی خدمت میں اوران کے حسن توسط سے سب ہی متلقین کی خدمت میں پیش ہیں۔

............❖............

(حضرت مولانا) سعید احمد اکبرآبادی:

محبّ ومکرم، محترم مولانا محمد سالم صاحب! السلام علیکم

میں سفر میں تھا، کل دہلی پہنچا تو حادثہ فاجعہ کا علم ہوا، سن کر سخت صدمہ اور رنج ہوا، یہ حادثہ صرف ایک خاندان یا ایک ادارہ، یا کسی ایک ملک کا حادثہ نہیں ہے، بلکہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی وفات کے بعد تمام عالم اسلام کا سب سے بڑا المیہ ہے، حضرتؒ کی وفات پر دیوبندی مکتبۂ فکر کا ایک اہم دور ختم ہوگیا، انا للّٰہ و انا الیہ راجعون .

''ماہنامہ برہان'' اس سلسلہ میں اپنا فرض ادا کرے گا، چار پانچ دن میں میں خود ہی حاضر ہوں گا، سردست آپ مولانا محمد اسلم، میاں اعظم اور دوسرے اعزا واقربا میری طرف سے تعزیت قبول فرمائیں، دعا ہے اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کو جنت الفردوس میں مقام جلیل عطا فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل کی توفیق عطا ہو۔ آمین

............❖............

مولانا ابرارالحق صاحب ہردوئی یوپی:

مکرم ومحترم جناب مولانا محمد سالم صاحب زید مجدہٗ السامی
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے انتقال کی خبر اخبار کے ذریعہ ملی بہت ہی افسوس ہوا، خبر ملتے ہی خدام مدرسہ کو حضرت موصوف کے لیے دعائے مغفرت وترقی درجات اور آپ سب کے لیے صبر جمیل کی توفیق ملی، ایصال ثواب کے لیے تلقین کی گئی ہے کہ اپنے اپنے حلقہ میں کریں احقر کو بھی یہ سعادت ملی۔

جس قدر صدمہ وغم اس حادثۂ جانکاہ پر ہو کم ہے اس نوع کے جانکاہ حوادث میں ہم سب کا امتحان ہوتا ہے صبر وتحمل واستقامت ہی سے کامیابی نصیب ہوتی ہے، رزقنا اللہ و ایاکم بذالک.

محض تعمیلاً للحکم و تحصیلاً للثواب چند کلمات عرض کرنے کا داعیہ پیدا ہوا چنانچہ عرض ہے۔

(۱)انا للّٰہ و انا الیہ راجعون (۲)ان للّٰہ ما اخذ و للّٰہ ما اعطیٰ و کل عندہ باجلٍ مسمیٰ فلتصبر و لتحتسب .

(۳) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک بدوی بزرگ نے جو کلمات تعزیت پیش کیے تھے ان کے عرض کرنے کا بھی داعیہ ہو رہا ہے

وخیر من العباس اجرک بعدہٗ والله خیر منک للعباس

............❖............

مولانا محمد انعام الحسن، بنگلہ والی مسجد، دہلی:

مکرم ومحترم مولانا محمد سالم صاحب، مولانا محمد اسلم صاحب وعزیزی اعظم صاحب
زیدت عنایاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کل ظہر کے وقت بعض احباب کے فون سے سانحہ کا علم ہوا، دفعۃً خبر ملنے سے جو اثر ہونا چاہیے تھا وہ ہوا، تدفین میں شرکت کی غرض سے مغرب تک سواری کی کوشش و انتظار میں وقت گذر گیا، لیکن مقدر کہ مہیا نہ ہوسکی اور تدفین میں شرکت سے محرومی رہی۔

یہ سانحہ صرف کسی ایک خاندان ہی کا نقصان نہیں پوری امت کا نقصان ہے، لیکن تقدیر خداوندی پر راضی برضا کے علاوہ چارہ کیا ہے، بس اب سوائے **انا للہ وانا الیہ راجعون، اللّٰهم أجر نی فی مصیبتی و اخلف لی خیراً منها** کے اور کیا کہیں۔

متعلقین کی خدمات میں بعد سلام مسنون تعزیت فرمائیں، عزیزان مولانا محمد طلحہ و مولوی شاہد بھی کل سے یہیں آئے ہوئے ہیں وہ بھی سلام مسنون فرماتے ہیں، ان کو حادثہ کا علم یہاں پہونچ کر ہی ہوا۔

............❖............

خوید مسلم عبدالجبار الاعظمی، مدرس جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد:

ذوالمجد والکرم مولانا محمد سالم قاسمی صاحب زید مجدکم السامی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت حکیم الاسلامؒ کے وصال سے بے حد صدمہ ہوا، خبر بہت تاخیر سے ہوئی اس لیے جنازہ میں شرکت سے محرومی رہی جس کا بے حد افسوس ہے، بیشک یہ حادثہ فاجعہ نہایت اندوہناک ہے اس پر جتنا صدمہ ہو کم ہے، حضرت مرحوم کے کمالات اظہر من الشّمس ہیں، اس وقت ان کی وفات سے اتنا بڑا عظیم نقصان ہوا جس کی تلافی بظاہر دشوار ہے لیکن **للہ ماأخذ و له ما اعطی** صبر سے بہتر کوئی دوا نہیں، تسلیم و رضا سے اچھا کوئی نسخہ نہیں، ایک مومن کا یہی شیوہ ہے اور اسی پر **نعم العد لان و نعم العلاوۃ** کی بشارت ہے زیادہ غم سے اپنی صحت کو نقصان ہوتا ہے اس لیے اس کا علاج صرف **انا للہ و انا الیہ راجعون** ہے خبر ملتے ہی مدرسہ شاہی میں دو روز دعائے مغفرت ہوئی ایصال ثواب کیا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائیں اور اپنے شایان شان ہر طرح کی نعمتوں سے سرفراز فرمائیں۔ **نور اللہ مرقدہٗ و برد مضجعہٗ طاب ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ .**

لوگ کہتے ہیں بڑی ہی خوبیاں تھیں مرنے والے میں لیکن ناکارہ کہتا ہے بڑی ہی خوبیاں تھیں جانے والے میں ایسے لوگ مرتے کہاں ہیں، زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں اس کے نام پر، اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا۔

بوقت نزع آئی تجلی روئے جاناں کی نظر موت سمجھے تھے جسے وہ شربت دیدار تھا

بس اسی پر بات ختم کرتا ہوں مادح خورشید مداح خود است

اللہ تعالیٰ ہم سب پسماندگان کو عموماً اور اہل خاندان کو خصوصاً صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائیں۔

پہلے خیال تھا کہ کیا لکھوں آپ کو خط دیکھنے کی بھی فرصت نہ ہوگی مگر بے اختیار یہ چند سطور لکھی گئیں۔

............❖............

ضیاءالدین اصلاحی، دارالمصنّفین شبلی اکادمی، اعظم گڑھ:

مکرمی ومحترمی جناب مولانا محمد سالم صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

والد بزرگوار کے حادثہ فاجعہ کی خبر نے پورے دارالمصنّفین کی فضا کو سوگوار اور مغموم بنا دیا ہے اطلاع ملنے کے بعد ہی ناظم دارالمصنّفین جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے آپ کے نام ایک تعزیتی پیغام ارسال کیا تھا، وہ باہر تشریف لے گئے ہیں۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی موت نے پوری قوم وملت کی عمارت متزلزل کردی ہے۔

وماکان قیس هلكه هلك واحد و لكنه بنيان قوم تهدما

یہ سچ دارالعلوم دیوبند کی جو بے مثال اور عظیم الشان خدمات عمر بھر انجام دی ہیں اس کا انجام اتنا ہی شاندار ہونا چاہیے تھا مگر ان کے ساتھ آخر میں جو ہوا اس کے لیے کس کی اور کس سے شکایت کی جائے: **والى الله المشتكى .**

آپ حضرات کے والد محترم تھے اور بڑے ہی شفیق والد محترم تھے، آپ لوگوں کے غم و اندوہ کا کون اندازہ کرسکتا ہے، یہ تنہا آپ کے لیے سانحہ نہیں ہے، ہم سب کے لیے اور پوری ملت اسلامیہ کے لیے سانحہ ہے، میں اپنی طرف سے اور دارالمصنفین کے ایک ایک فرد کی طرف سے تعزیت پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو اور تمام متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے برائے کرم میری جانب سے پورے اہل خانہ کو بھی تعزیت پیش کریں اللہ تعالیٰ اس علم و دین کے خادم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین۔

............❖............

حضرت مولانا عبداللہ عباس الندوی، جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ:

فاضل گرامی مولانا محمد سالم صاحب قاسمی حفظہ اللہ وجعلہ خیر خلف لخیر سلف، آمین

عالم اسلام کی مخدوم ومتبرک شخصیت کے روپوش ہو جانے کی خبر باعث صدرنج والم ہوئی طیب الله ثراه ، وبرد مضجعه و حشر مع الصالحين من انه سيد نا محمدصلى الله عليه و سلم .

حضرت مغفور کی وفات صرف آپ کے خاندان کا حادثہ نہیں ہے، یہ پورے برصغیر کی علمی دنیا کا المیہ ہے، ہر عالم دین تعزیت کا مستحق ہے، ہر دینی مدرسہ اپنے روحانی سرپرست سے محروم ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ جناب کو قدرت وعزیمت عطا فرمائے اور آپ کے تمام افراد خاندان کو صبر جمیل کا اجر حسن عطا فرمائے، بے شک آپ کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں اب حضرت مرحوم کے وابستگانِ دامن کے لیے آپ مصدر خیر اور مرجع برکات ہیں۔

برائے کرم میری تعزیت قبول فرمائیں اور جناب مولانا محمد اسلم صاحب، مولانا غازی حامد الانصاری صاحب اور صاحبزادوں کی خدمت میں پیش فرمائیں۔

............❖............

محمد تقی امینی، ناظم سنی دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ:

مخلصم ومکرم زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حادثہ فاجعہ کی خبر ''قومی آواز'' سے ابھی ملی، کل ریڈیو سے نہ معلوم ہوسکی تھی ورنہ بہت ممکن تھا کہ تجہیز وتکفین میں شریک ہوجاتا، اس محرومی کا غم ہمیشہ رہے گا، کن الفاظ میں تعزیتی کلمات کی تعبیر کروں جو بھی الفاظ منتخب کروں گا وہ اس کے لیے کم تر درجہ کے ہوں گے، مذہبی شخصیت بڑی مشکل اور قربانیوں سے وجود میں آتی ہے جس کے بعد عرصہ تک انتظار کرنا پڑتا ہے، بس اللہ ہی بدل عطا فرمائے آمین، مسئلہ آپ حضرات کا نہیں ہے بلکہ پوری ملت کا ہے، مجھے ہمیشہ ان کے مذہبی تشخص کے تحفظ کی فکر رہی، الگ تھلگ رہنے کے باوجود لوگوں سے ہمیشہ اصرار کرتا رہا کہ شخصیت نہ مجروح ہونے پائے اللہ ہی نے محفوظ رکھا۔

آپ حضرات خوش نصیب تھے کہ اتنے دنوں تک ایسے عظیم باپ کا سایہ قائم رہا، آہ! اب اس سایہ سے ہمیشہ کے لیے محرومی ہوگی، مدتوں امت ان کی خوبیوں کو یاد کر کے روتی رہے گی، اللہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپ حضرات کو صبر جمیل کی توفیق دے، آمین۔

............❖............

سید عبدالرحیم لاجپوری ثم راندیری، گجرات:

مکرم ومحترم جناب مولانا محمد سالم صاحب ومولانا محمد اسلم صاحب

الھمک اللہ صبراً جمیلاً و أجراً جزیلاً

بعد سلام مسنون ! رمضان المبارک میں عشرہ اخیرہ سے بیمار ہوں، سورتی موٹا کے یہاں آتے ہوئے فون سے حضرت والا بزرگوار رحمۃ اللہ تعالیٰ کی وفات کا علم ہوا، انا للّٰہ و انا الیہ راجعون، ما شاء اللّٰہ کان و ما لا یشاء لا یکون، اس عظیم حادثہ سے طبیعت بہت زیادہ متاثر ہوئی بہت زیادہ صدمہ ہوا سب ہی متعلقین و منتسبین غمگین ہیں اور دست بدعا ہیں، حق تعالیٰ حضرت اقدسؒ کو غریق رحمت کرے اور جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرماوے۔

مو ت التقی حیاۃ لا نغادلھا قد ما ت قوم و ھم فی الناس احیاء

وفات کی اطلاع ظہر کے وقت ملی، نماز کے بعد راندیر کی تمام مساجد میں دعاء مغفرت کی گئی اور احقر نے اپنے ''مدرسہ رحیمیہ تجوید القرآن'' اور اپنے زیر اہتمام چلنے والے مدرسے، مدرسہ انجمن اسلام راندیر اور مدرسہ دینیات کنارہ اسٹریٹ میں قرآن خوانی کے بعد دعاء مغفرت اور ایصال ثواب کے بعد تعطیل کردی حق تعالیٰ قبول فرماوے اور حضرت اقدس نوراللہ مرقدہٗ کے درجات بلند فرماوے اور پسماندوں کو خصوصاً جناب کو اور برادر عزیز مولانا اسلم صاحب اور مولانا غازی انصاری صاحب وغیرہ جملہ چھوٹے بڑے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرماوے اور اجر جزیل سے نوازے اور حضرت اقدسؒ کے صدقہ میں احقر کو حسن عمل وحسن خاتمہ نصیب فرماوے آمین بحرمت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

............❖............

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، استاذ تفسیر والحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ:

" ان ما تحذریت قد وقع "

مخدوم گرامی جناب مولا محمد سالم صاحب دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل قبیل عصر ایک ندوہ کے طالب علم نے وہ روح فرسا خبر ریڈیو کے حوالہ سے سنائی جو اگر چہ غیر متوقع تو نہ تھی مگر ابھی کان اس کے سننے کے لیے تیار نہ تھے اور دل وزبان برابر دعائیں کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس متاع گراں مایہ کو تا دیر امت کی فیض رسانی کے لیے باقی رکھے اور اس کے دریائے فیض سے مستفیض ہوتے رہنے کا مزید مدت مدید تک موقع عنایت فرماتا رہے، مگر قضا نے ان دعاؤں کو بار آور ہونے کا اور قبولیت کا شرف حاصل کرنے کی مہلت نہ دی، فانا للہ وانا الیہ راجعون، اب تو اس موقع پر وہی کہنے اور کرنے کی سعادت کی توفیق خداوند سے مانگنے کی دعا کیجئے جو اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جیسے مواقع کے لے بیان فرمائی ہے، **"ان القلب یحزن و العین تد مع و ما نقول الا ما یر ضیٰ به ربنا"**

آپ جیسے فاضل کو اس بارے میں کچھ لکھنا گویا سورج کو چراغ دکھانے یا لقمان کو حکمت سکھانے کے مترادف ہے، بس شدت تاثر سے یہ چند سطریں قلم سے نکل گئیں، اللہ سے دعا ہے کہ آپ سب کو خاص طور پر اور پوری امت مسلمہ، بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کو صبر جمیل کی دولت ارزاں کرے کہ یہ غم تنہا کسی ایک فرد یا خاندان کا نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کا ہے اور یقیناً ہر ہوشمند سوگوار ہوگا۔ نیز دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان عالی مقام کو اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے، برادر محترم ورفیق معظم مولوی محمد اسلم صاحب ودیگر اخوان ذوی الاحترام اور اعزہ کی خدمت میں بھی سلام تعزیت عرض ہے۔

............❖............

مولانا محمد برہان الدین، خادم تدریس دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ:

برادر محترم ورفیق معظم مولوی محمد اسلم صاحب زید کرمکم وادام اللہ مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل اچانک عصر کی نماز سے تھوڑی دیر قبل ندوۃ العلماء کے ایک طالب علم نے وہ ہوش ربا اور روح فرسا خبر سنائی جس کے سننے کے لیے طبیعت کسی طرح آمادہ نہ تھی کہ ان کی زندگی میں برکت اور فیض رسانی کے وصف کے تادیر باقی رہنے کی برابر زبان ودل دعاء کررہے تھے اور طبیعت کے بگڑ بگڑ کر سنبھل جانے کی اطلاعیں یہ مژدہ سنا رہی تھیں کہ یہ دریائے فیض ابھی اور سیراب کرتا رہے گا، مگر قضاء وقدر کے فیصلے نہ تمناؤں سے بدلتے نہ دعاؤں سے وہ تو "**یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید**" جس کی صفت ہے اسی کے پابند احکام ہیں اس لیے ہم جو سب کے سب اسی کے بندے ہیں اس کے فیصلہ پر راضی ہونے کا اظہار چاہے بادل ناخواستہ سہی کر کے بندگی کا ثبوت کیوں نہ دیں کہ اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہ مفید ہے نہ مؤثر اور وہی کہیں جو صاحب اسوۂ حسنہ، نے ہمیں بتایا اور سنایا ہے یعنی "**ان العین و القلب یحزن و ما نقول الا ما یرضی به ربنا**" اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آں عالی مقام کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور سب کو صبر جمیل کی دولت ارزانی ہو۔

برادر محترم! یہ غم تنہا آپ کا یا آپ کے نسبی اقرباء کا نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ اور اس کے ہر باشعور فرد کا ہے اس لیے تعزیت کا مستحق اس وقت ہر ایسا شخص ہے جسے نور ایمان اور بصیرت سے کچھ بھی حصہ ملا ہو، خبر سنتے ہی جی چاہا کہ خط کے ذریعہ تعزیت کرنے کے بجائے خود حاضر ہو کر اپنے قلبی سکون کا سامان کروں مگر آج ہی رات میں "الجزائر" کا طویل سفر درپیش ہے جہاں کل سے شروع ہونے والی ایک علمی اسلامی کانفرنس میں شرکت کرنا ہے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ بخیر وعافیت یہ سفر پورا کرائے۔ اسی سفر کی وجہ سے رات ہی لکھنؤ سے چل کر آج صبح دہلی پہنچا اور دہلی سے یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔

............❖............

حضرت مولانا عبدالحلیم جونپوریؒ

حامداً و مصلیاً و مسلماً

برادر گرامی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حادثۂ جانکاہ کی اطلاع نے نہ پوچھئے دل ودماغ پر کیا اثر کیا، حضرت مہتمم صاحبؒ سے آپ کا تو خیر روحانی وجسمانی رشتہ تھا، اس کا بیان ہی غیر ضروری ہے، لیکن ان کی جو شفقتیں اور عنایتیں تا حال اس حقیر پر رہیں ان کے پیش نظر میں اسے سمجھنے میں بالکل حق بجانب ہوں کہ میں بھی اپنے باپ کے ظل عاطفت سے محروم ہو گیا، ابھی لکھنؤ کے آخری سفر میں محرم الحرام ۱۴۰۳ھ میں میری درخواست پر غریب خانہ بھی تشریف لائے تھے اور اس طرح کہ کئی دوسرے قریبی لوگ بھی حضرتؒ کے اس وقت کے خواہش مند تھے مگر سب کو نظر انداز کر کے حضرت والا نے اس حقیر ہی کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

دارالعلوم کے کربناک حالات نے حضرتؒ کو بے چین کر دیا تھا جس کے نمایاں اثرات ان کی صحت پر بھی پڑے تھے، افسوس ہے کہ آخری دنوں میں ان کو ایسی ذہنی اذیتوں سے گذرنا پڑا جس سے خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے، انشاء اللہ یہ سب کچھ ان کے لیے ذخیرۂ آخرت ہوگا، حسرت تو ہم خوردوں پر ہے کہ حضرت مہتمم صاحبؒ کے بعد کوئی بھی تو ایسا نہ بچا جسے اپنا سرمایہ اور اپنے مسلک کا نقیب قرار دے سکیں۔

میری طرف سے برادران عزیز و محترم مولانا محمد اسلم صاحب و مولوی محمد اعظم صاحب نیز دیگر متعلقین خاندان کی خدمت میں بھی تعزیت مسنونہ پیش کر دیں، نور چشم مولوی عبدالولی سلمہ بھی رمضان المبارک سے مسلسل بیمار ہیں بلکہ رمضان میں تو ان کی علالت نے بڑی پیچیدگی اختیار کر لی تھی وہ بھی خدمت والا میں سلام گذار ہیں وہ علیحدہ خط بھی لکھ رہے ہیں، نیز اپنے رسالہ ''البدر'' میں بھی حضرت مہتممؒ کے سلسلہ میں لکھ رہے ہیں، ان کی صحت و عافیت کے لیے آپ سے خصوصی دعا کی درخواست ہے، خدا کرے مزاج سامی مع جملہ متعلقین بعافیت ہو۔

............❖............

مولانا قاضی سجاد حسین صاحب مدرسہ عالیہ فتح پوری، دہلی:

مکرمی حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی السلام علیکم

میں سفر سے واپس آیا تو دہلی پہونچ کر حضرت مخدوم کی وفات کی خبر سنی دلی قلق اور صدمہ پہنچا، آخری شمع تھی جو گل ہوگئی، یادگار سلف تھے اور علماء کے سرخیل، دعا ہے کہ حضرت حق جل مجدہ ان کے مراتب بلند فرمائے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے، میری طرف سے جملہ خاندان کی تعزیت فرمادیں۔

............❖............

مولانا احمد علی قاسمی رجنرل سکریٹری کل ہند مسلم مجلس مشاورت:

مکرم ومحترم جناب مولانا محمد سالم قاسمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ صبر وطمانیت نصیب فرمائے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے، میں رات ہی وطن سے واپس ہوا، حضرت حکیم الاسلامؒ کے وصال کی اطلاع ملی اور ساتھ ہی یہ بھی اطلاع ملی کہ تجہیز وتکفین بعد نماز عشاء ہوگی، یقیناً پہنچنے کی کوئی شکل تھی ہی نہیں۔

انشاء اللہ حاضر ہو کر تعزیت کی سعی کروں گا، اللہ ہم سبھوں کو صبر وسکون نصیب فرمائے اور حضرتؒ کی روح کو راحت اور درجات بلند فرمائے۔ آمین، مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی کی خدمت میں بھی سلام عرض اور تمام پسماندگان کی خدمت میں بھی، نیز سبھوں سے اظہار تعزیت، دعا کی درخواست۔

............❖............

مولانا حکیم محمد زماں حسینی، سابق رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند:

گرامی قدر مولانا محمد سالم صاحب اور مولانا محمد اسلم صاحب　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ
اخبارات سے علم ہوا کہ مخدوم ومطاع حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ مالک حقیقی سے جا ملے۔
ان کی جدائی پوری ملت اسلامیہ اور نیازمندوں اور گھر والوں کے لیے کس قدر جاں گسل ہے وہ بیان سے باہر ہے اللہ ہی صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے، آمین! میری جانب سے اور میرے اہل خانہ کی طرف سے کلمات تعزیت قبول فرمائیے، اللہ تعالیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائیں، آمین!

............❖............

سید احمد ہاشمی ممبر پارلیمنٹ (راجیہ سبھا):

مکرمی گرامی قدر حضرت مولانا محمد سالم صاحب　　سلام مسنون!
میں ان دنوں اپنے وطن غازی پور ہوں، رات میں ریڈیو سے حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سانحۂ ارتحال کی اطلاع ملی۔ انتہائی صدمہ ہوا حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد علم و فضل کی آغوش خالی ہوگئی اور اب بظاہر اس دور محرومی میں اس کی تلافی ممکن نہیں معلوم ہوتی، اللہ تعالیٰ آپ سب کو، پورے خاندان کو اور ہندوستان اور عالم اسلام کو اس جانکاہی کے تحمل کی توفیق عطا کرے۔ میری طرف سے تمام پسماندگان تک تعزیت پہونچا دیجئے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس عطا کرے۔ آمین

............❖............

سید احمد ہاشمی:

مکرمی گرامی قدر حضرت مولانا محمد اسلم صاحب زید مجدکم   سلام مسنون!

رات ریڈیو کے ذریعہ اس سانحۂ المناک کی اطلاع ملی، جو حضرت حکیم الاسلامؒ کی طویل علالت کی بنا پر متوقع تو تھا لیکن امید کی شعاعیں روشن تھیں۔

یقیناً حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا انتقال ملت کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ اور دل خراش المیہ ہے، دل ودماغ پر اس المناک سانحہ کا برا اثر ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی ذات صرف برصغیر کے لیے ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے علم وفضل کی ایک علامت تھی۔ آج وہ شخصیت، وہ ذات ہم میں نہیں رہی۔

غم بے پناہ ہے، مگر صبر وشکر ہی اس بے پناہی میں ہمارے لیے زادِ راہ ہے۔

میں آپ کے تمام برادران، پسماندگان اور غازی صاحب کے غم میں اپنے کو شریک کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد اور عالم اسلام کے اس دینی مفکر کی قبر کو نور سے بھر دے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین۔

میں نے ایک ٹیلی گرام بھی ارسال کیا ہے مل گیا ہوگا۔ افسوس رہے گا کہ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی تدفین میں مسافت کی دوری کے باعث شریک نہ ہوسکا۔

............❖............

مولانا عبدالقدوس رومی مفتی شہر شاہی مسجد، آگرہ یوپی

مکرمی ومحترمی مولانا محمد سالم صاحب زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۴؍شوال جمعہ کو بخار میں مبتلا ہوگیا، صاحب فراش ہی تھا کہ اتوار کو قومی آواز سے حضرت مہتمم صاحبؒ کی وفات حسرت آیات کے سانحہ کا علم ہوا، اپنی طبیعت اس وقت بہت زیادہ خراب تھی کہ سانحہ پر اظہارِ غم و رنج بھی کرنا قدرت میں نہ تھا، **انا للّٰہ وانا الیہ راجعون. ان للّٰہ مااخذ و اعطی و کل شیءٍ عندہ اجل مسمی فلتصطبر و لتحتسب.**

و خیر من العباس اجر ک بعدہ والله خیر منک للعباس

احقر کو اپنے والد صاحب علیہ الرحمہ کی وفات پر اس شعر سے بہت قلبی سکون ملا تھا، خدا کرے آپ بھی اس سے صبر وسکون محسوس فرمائیں۔

حضرت مہتمم صاحب علیہ الرحمہ کی شخصیت ہم جیسے نااہلوں اور نکموں کی تعزیت اور مرثیہ سے بلند اور مستغنی ہے، ان کی وفات سے شاید خیرالقرون کا عہد بھی ختم ہوگیا۔

اولٰئک آبائی فجئنی بمثلھم الخ بہت دنوں تک اسلاف واکابر کے لیے دہرایا گیا، اس کا آخری مصداق بھی رخصت ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

طبیعت ابھی پوری طرح صحیح نہیں ہوئی ہے، علاج و پرہیز جاری ہے ورنہ خود حاضر ہوتا، ویسے بھی امسال انشاء اللہ تعالیٰ حج کا ارادہ ہے، اس لیے دو تین ماہ تک تو حاضری مشکل ہے، زندگی رہی تو واپسی پر حاضری کی کوشش کروں گا۔

............❖............

مولانا نجم الدین اصلاحی، راجہ پور سکرور اعظم گڑھ سابق مقیم سدھاری:

بندہ نواز مولانا! اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہم سبھوں کو حضرت مہتمم صاحبؒ کے وصال سے جو صدمہ پہنچا ہے صبر وجمیل بخشے اور مرحوم کے درجات میں بیش از بیش اضافہ فرمائے۔ آمین

میں رمضان کے قبل سے زیر علاج ہوں، ارادہ تھا کہ اور ہے کہ حکیم الاسلامؒ پر ایک مضمون لکھ کر رسمی خراج عقیدت نہیں بلکہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کے عروج کی صحیح ترجمانی بطریق نزول جو مہتمم صاحب مرحوم ہی کا حصہ تھا اس پر بھی روشنی ڈالوں، کیونکہ حضرت نانوتویؒ کے علوم و معارف کے حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ آخری اور صحیح ترجمان رہ گئے تھے جو بہت بڑا علمی نقصان ہے جس کی تلافی ناممکن، یہ ناکارہ اس سانحہ عظمیٰ پر آپ کے ساتھ برابر کا شریک ہے اور روح پرفتوح پر نذرانۂ عقیدت ذیل پیش کرتا ہوا رخصت ہو رہا ہے۔

فعلیک منی الف الف تحیة تغشی ضربجاک یا قرین الفرقد

............❖............

مولانا نجم الحسن مدرسہ امداد العلوم خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر یو پی:

مکرمی ومحترمی مولانا محمد سالم صاحب زیدت معالیہم سلام مسنون مع اخلاص مقرون

حضرت مہتمم صاحبؒ کی وفات حسرت آیات ہم سب کے لیے موجب قلق اور باعث رنج ہے۔ **انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ،ان للہ مااخذ و اعطی و کل شیءٍ عندہ اجل مسمی** جناب کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے، تعزیت کے مستحق تو ہم سب ہیں۔

آپ کو صبر واستقلال کی تلقین کرنا گویا لقمان کو حکمت کا درس دینا ہے، اللہ حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ کے ساتھ رحمت وغفران ورفع درجات کا معاملہ فرمائے۔ آمین ؎

جو تھے نوری رہ گئے افلاک پر مثل تلچھٹ رہ گئے ہم خاک پر

ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کا سلسلہ جاری ہے۔

............❖............

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین، مفتی دارالعلوم دیوبند:

حضرت المحترم زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خاکسار عید کی نماز پڑھ کر دیوبند سے وطن آ گیا تھا، ایک ضروری کام کے لیے یہ سفر ناگزیر ہو گیا تھا۔

یہیں دوشنبہ ۷؍شوال کا دن گذار کر رات میں یہ خبر دل گداز ملی کہ علم وعمل کا آفتاب روپوش ہو گیا، خانوادۂ قاسمی کا چشم و چراغ جو ساٹھ پینسٹھ سال سے دارالعلوم کی خدمت کر رہا تھا اور ملک وملت جس کے فیوض وبرکات سے سیراب ہو رہا تھا، چل بسا، جماعت علماء کے امیر کارواں نے اس دنیا فانی سے کوچ فرمایا اور جس کے وعظ وتبلیغ سے پوری دنیا پُر آشوب تھی اور جس کی صدائے دل نواز اب بھی ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے، داغ مفارقت دے گیا، علماء دیوبند ہی نہیں، عالم اسلام کے علماء اپنے دور کے حکیم الاسلامؒ سے محروم ہو گئے، ملت اسلامیہ کا محسن اٹھ گیا، **قال اللہ و قال الرسول** کا شیوۂ بیان جاتا رہا، **انا للّٰہ وانا الیہ راجعون**، دنیائے علم وعمل میں صف ماتم بچھ گئی، عالم انسانیت سر بہ گریباں ہے اس کا محسن جاتا رہا، خواص وعوام ایک بڑی دولت سے محروم ہو گئے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی علمی مجالس اور ان کی ذات ستودہ صفات سے ہم سب کی تشنگی جاتی رہتی تھی، آہ! اب وہ ہم میں نہیں رہے، موجودہ دور میں اپنی جماعت کے سید الطائفہ تھے اور دنیائے علم وحکمت کے رازداں، اس ذات اقدس کے اٹھ جانے پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے، نمود ونمائش سے قطعاً پاک وصاف تھے، مخلص، ولی کامل اور سراپا علم وعمل تھے، اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور تاقیامت آپ کی قبر پر رحمت کی بارش برساتا رہے۔

یہ غم اولاً آپ کے خاندان کا غم ہے، لیکن دراصل یہ ساری ملت اسلامیہ کا غم ہے اس غم میں سارے مسلمان ہی نہیں بلکہ ساری کائنات انسانی آپ کے ساتھ ہے، رب العالمین آپ حضرات کو صبر جمیل کی دولت سے نوازے اور پھر سارے مسلمانوں کو صبر کی توفیق عطا کرے، ہم سب کو بھی صبر عطا کرے۔

…………❖…………

مولانا غلام قادر صاحب مدرسہ عربیہ ضیاء العلوم، جموں و کشمیر:

واجب الاحترام استاذ المکرّم حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ کرے کہ آپ حضرات بخیر ہوں۔

بذریعہ ریڈیو یہ سن کر کہ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اس دار فانی سے کوچ فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پوری ملت اسلامیہ کا ناقابل تلافی نقصان ہوا، دراصل حضرتؒ اسلاف کی دور حاضر میں جیتی جاگتی تصویر تھے۔ کس طرح آپ نے اس صدمہ کو برداشت کیا ہوگا، اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے، حضرتؒ کو بندہ کے ساتھ اور مدرسہ کے ساتھ گہری دلچسپی تھی، حضرتؒ کی ہی دعاؤں کی بناء پر یہ مدرسہ پروان چڑھا اور ترقی کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ موصوفؒ کو جنت الفردوس میں عالی مقام نصیب فرمائے اور آپ سب حضرات کو صبر جمیل عطا فرمائے، ہم تمام خدام مدرسہ ضیاء العلوم حضرتؒ کی ہی ذات سے وابستہ تھے کوئی حکم ہمارے لائق ہو تو ہم حاضر ہیں۔

............❖............

مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب، مہتمم مدرسہ اسلامیہ گلزار حسینیہ، اجراڑہ، ضلع میرٹھ:

گرامی قدر جناب عالی! حضرت مولانا محمد سالم قاسمی. مولانا محمد اسلم قاسمی مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! تاجدار اسلاف واکابر قائد ملت اسلامیہ ہند، سلف صالحین حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے انتقال پر ملال کی خبر سن کر پورے مدرسہ اور علاقہ بھر میں ایک حزن و ملال، رنج والم کی گھٹائیں ماحول پر چھا گئیں درحقیقت عالم اسلام بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایسا عظیم نقصان واقع ہوا ہے کہ جس کی تلافی بظاہر کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

حضرت مرحوم ومغفور اس ادارہ کے سرپرست تھے، آج یہ ادارہ آپ کی سرپرستی سے محروم ہو گیا ہے، خداوند قدوس اس ادارہ کو آں محترم جیسا سرپرست عطا فرمائے۔ آمین، یہ خبر سنتے ہی مدرسہ کے اراکین اساتذہ کرام اور طلباء نے مل کر قرآن خوانی اور ایصال ثواب کیا، ایک تعزیتی جلسہ فوقانی مسجد میں منعقد ہوا۔

اس تعزیتی جلسہ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی زندگی بھر کی خدمات پر تفصیلات کے ساتھ روشنی ڈالی گئی اور ان کی ملی، دینی، تعلیمی، تصنیفی خدمات کا اعتراف کیا گیا، ایک تعزیتی قرارداد میں آپ حضرات اور تمام وابستگان و پسماندگان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا گیا، خداوند قدوس حضرتؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، مشیت باری تعالیٰ میں کس کی مجال ہے۔ ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

............❖............

مولانا ارشاد احمد صاحب، مبلغ دار العلوم دیو بند:

مکرمی ومخدومی دامت عنایاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابھی ابھی اچانک حضرت مہتمم صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال کی اطلاع موصول ہوئی رنج وافسوس کے گہرے اثر سے گویا اعصاب پر رعشہ طاری ہو گیا دل ودماغ اس خبر کے یقین پر کسی طرح آمادہ نہیں ہو رہے تھے، لیکن فطری طور پر اس عالم کا نقشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ یہاں کی زندگی کے بعد موت یقینی امر ہے کہ اس میں شخصیتیں آتی رہتی ہیں اور اپنے کمال کی جلوہ نمائیاں کر کے آغوش رحمت میں پناہ گزیں ہو جاتی ہیں، حضرت مہتمم صاحبؒ کو اپنے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ سے جو باطنی قرب حاصل تھا۔اس کا تقاضہ ہے کہ قرطاس کو آنسوؤں سے تر کروں، تاہم اس سیاہی کو بھی اشکہائے غم ہی تصور کیا جائے، حضرت مہتمم صاحبؒ کی رحلت سے ہمارے پورے حلقہ میں ایک مایوسی کی کیفیت پیدا ہو گئی، اللہ تعالیٰ ہم سب لوگوں کو سکون دیں اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائیں، ہم جملہ ایں خانقاہ کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

............❖............

مولانا محمد عثمان غنی قاسمیؒ، مظاہر علوم وقف سہارنپور:

مخدوم ومطاع استاذ نا المحترم السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی ۔آہ! ہم لوگ آج یتیم ہوگئے، سترہ جولائی دنیائے اسلام کے لیے بڑا اندوہناک، المناک یوم ثابت ہوا کہ علوم نانوتویؒ کا امین اسلاف کا یادگار تھانویؒ زہد وتقویٰ وورع کا نمونہ، متانت وسنجیدگی کا پیکر علم وفضل کا بحر بیکراں تحمل کا کوہ وقار علم وعمل کا سنگم یعقوبؑ کا صبر ابراہیمؑ کا تسلیم ورضا احقاق حق کے لیے حضرت حکیم کا جلال حضرت زکریاؑ کی طرح مستجاب الدعوات یحییٰؑ کا اخلاص، حال وقال میں یکسانیت گفتار وکردار میں مطابقت شرعیت وسنت کا عامل وترجمان عاشق سید المرسلین فخر الاماثل دنیائے رنگ وبو میں نہ رہے اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے، **رحمۃ اللّٰہ علیہ رحمۃ واسعۃ اعلی اللّٰہ درجۃ کاملۃ** اب مسند خطابت کو کون زینت بخشے گا؟ رموز تصوف کو کون سمجھائے گا؟ اسرار دین کی گتھیوں کو کون سلجھائے گا؟ علم وفضل کی سوتیں کہاں پھوٹیں گی؟ حقائق ومعارف کا دریا کون بہائے گا؟ حق تعالیٰ آں ممدوح کے کارہائے نمایاں وکارہائے لائقہ کو قبول فرما کر اعلیٰ علیین میں جگہ دے، آمین اور درجات بلند فرمائے۔آمین

میرے کرم فرما حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہ! آنکھیں اشکبار ہیں، دل بے قابو ہے، دنیا تاریک ہوگئی، اہل علم یتیم ہوگئے خانقاہ کی رونق ختم ہوگئی، تھانویؒ کا چہیتا جدا ہوگیا، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کا جگر گوشہ رخصت ہوگیا۔ بلیاویؒ کے دلدار نے رخت سفر باندھ لیا، علامہ کشمیریؒ کا پیارا اپنے قافلہ والوں سے جاملا۔

کیا کیجئے گا! اس دنیا کی ریت یہی ہے ضابطۂ الٰہی بھی یہی ہے۔ **وما جعلنا لبشرٍ من قبلکَ الخلد اَفَا منْ مِتّ** ،رب کریم آپ پسماندگان کو صبر جمیل کی دولت سے مالا مال کرے، آمین۔

…………❖…………

مولانا عتیق احمد قاسمی، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ:

مخدوم مکرم جناب حضرت مولانا محمد سالم صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ جناب والا صحت وعافیت کے ساتھ ہوں گے۔

اوائل شوال میں اپنے وطن بستی میں تھا، دیہات میں ہونے کی وجہ سے چند روز بعد حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے المناک حادثہ کی اطلاع ملی، دل ودماغ کی دنیا تہہ وبالا ہوگئی، آپ حضرات کے دلوں پر اس سانحہ سے جو گذری ہو کم ہے لیکن ہم سب کے لیے جو ان کی روحانی اولاد اور ان کے گلستانِ علم وفضل کے خوشہ چیں ہیں، صبر اور رضا بالقضاء کے سوا چارہ ہی کیا ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں بلند درجات سے نوازے۔

مرحوم اس آخری دور میں اسلاف اور اکابر دار العلوم دیوبند کے مسلک اور روایات کے واحد محافظ وامین تھے، مدت العمر انہوں نے دار العلوم دیوبند کی تعمیر وترقی اور مسلک دیوبند کی نشر واشاعت کے سلسلے میں جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں انہیں انصاف پسند مورخ کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

ہم سب فضلاء ومنتسبین دار العلوم پر مرحوم کا حق ہے کہ ان کے لیے بیش از بیش ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کریں اور ان کا نام وکام زندہ رکھیں، میں نے ایک قرآن تلاوت کرکے ان کے لیے ایصال ثواب کیا۔

حضرتؒ کی سوانح کی ترتیب کا کام ابھی جلد از جلد خوش سلیقگی سے ہوجانا چاہیئے تاکہ ان کی شخصیت آنے والی نسلوں کے لیے بھی مینارۂ نور کا کام دے، اس سلسلے میں اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں اس کی انجام دہی اپنے لیے سعادت تصور کروں گا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو بلند درجات سے نوازے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

............❖............

مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی، خادم تدریس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ:

مخدوم ومکرم جناب حضرت مولانا محمد اسلم صاحب دامت برکاتہم السلام علیکم

امید کہ جناب والا صحت و عافیت کے ساتھ ہوں گے۔اوائل شوال میں اپنے وطن بستی میں تھا، دیہات ہونے کی وجہ سے اخبار ورسائل وہاں نہیں پہنچتے ہیں اس لیے چندروز بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب ؒ کی وفات کے اندوہناک سانحہ کی اطلاع ملی، دل ودماغ پر اچانک جیسے بجلی آگری ہو، آپ حضرات کے دل و دماغ پر اس حادثہ کا جو اثر ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، اس سانحہ پر آپ کی تعزیت کیا کریں، حقیقت یہ ہے کہ ہم فضلاء دارالعلوم دیوبند خود تعزیت وتسلی کے محتاج اور مستحق ہیں، لیکن ہم سب کے لیے جوان کی روحانی اولاد اوران کے گلستان علم وفضل کے خوشہ چیں ہیں، صبر اور رضا بالقضا کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اس آخری دور میں اسلاف واکابر دارالعلوم دیوبند کے مسلک اور روایات کے واحد محافظ وامین تھے، مدت العمر انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی تعمیر وترقی اور مسلک دیوبند کی نشرواشاعت کے سلسلے میں جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں انہیں انصاف پسند مؤرخ کبھی فراموش نہیں کرسکتا، وہ حلقہ علماء ومشائخ کے گل سرسبد، دارالعلوم دیوبند کی آبرو اور تمام اہل حق کے متفقہ دینی رہنما تھے۔

ہم سب فضلاء ومنتسبین دارالعلوم دیوبند پر ان کا حق ہے کہ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کریں اوران کا نام اور کام زندہ رکھیں۔

حضرت ؒ کی سوانح کی ترتیب کا کام ابھی جلد از جلد خوش سلیقگی سے ہوجانا چاہئے تاکہ ان کی شخصیت آنے والی نسلوں کے لیے بھی مینارۂ نور کا کام دے، اس سلسلے میں اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں اس کی انجام دہی اپنے لیے سعادت تصور کروں گا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو بلند درجات سے نوازے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

..........❖..........

مولانا شمس تبریز خاں، نیا بھوجپور، آرہ بہار:

مشفق محترم زید مجدہم و لطفہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
میں آج کل وطن آیا ہوا ہوں، جہاں ۱۷ر جولائی کو ریڈیو سے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے سانحہ ارتحال کی خبر سنی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایتھا النفس اجملی جزعا فان ما تحذرین قد وقعا

ادھر کچھ عرصہ سے علالت کی خبروں سے یہ اندیشہ لگا ہوا تھا، پھر بھی اللہ کی ذات سے امید تھی کہ حضرت والا مرحوم ابھی ہمارے درمیان رہیں گے مگر۔ ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!
خاندان قاسمی پر اس حادثے سے جو گذر رہی ہوگی اور ہم تمام محبان خانوادۂ قاسمی کے دلوں پر جو گذر رہی ہے اس کا اندازہ (ایک ہی علمی خاندان کے افراد ہونے کے سبب) ہم سب کر سکتے ہیں۔
دار العلوم کے قضیہ نامرضیہ کے سلسلے میں حضرت حکیم الاسلامؒ وغیرہ کے بارے میں بہت سی ناگفتنی و ناشنیدنی سنتا رہا مگر دل کو ان باتوں کا کبھی یقین نہیں آیا اور حضرت سے عقیدت و محبت برقرار رہی اور دل ان کی نسبت گرامی، علوئے نسب و حسب، شرافتِ طبعی و عالی ظرفی اور بے مثال صبر و تحمل، وسیع و عمیق علم عالمانہ و حکیمانہ فکر و نظر، دار العلوم کی نصف صدی سے زائد پر خلوص خدمت اور مسلکِ دار العلوم کی حفاظت و اشاعت کا ہمیشہ معترف رہا۔ قلب و جگر خصوصاً اس صدمہ سے شق ہو رہے ہیں کہ علوم قاسمیہ کا وارث و امین نہیں رہا اور مسلک دار العلوم و دیوبندیت اور علوم اسلامیہ کا حکیم نکتہ داں، ہمارے درمیان سے اٹھ گیا، جس نے نئے حالات میں برابر زمانے کی رہنمائی کی اور مسلک حق کو واضح اور روشن رکھا۔
خبر سنتے ہی ایصال ثواب کیا اور انشاء اللہ حسب توفیق آئندہ بھی کرتا رہوں گا، حضرت مرحوم سے مجھے شرف تلمذ بھی حاصل ہے، میں نے ان سے حجۃ اللہ البالغۃ کا درس لیا تھا۔

............❖............

مولانا وقار علی صاحب مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور:

مکرم ومحترم جناب الحاج مولانا سالم صاحب ومولانا محمد اسلم صاحب۔ مدظلہما العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے سلسلے میں کلکتہ آیا ہوا ہوں اور چہارشنبہ کو واپسی کا ارادہ ہے میں چندہ وصول کرتا ہوا لورچت پور سے گذر رہا تھا کہ مدرسہ کے معاون سے جو آسنسول کے رہنے والے ہیں وہ کلکتہ آئے ہوئے ہیں، ان سے ملاقات ہوئی وہ ''اخبار مشرق'' کا مطالعہ کر رہے تھے مجھے خبر دی کہ حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کا انتقال ہو گیا سن کر طبیعت نے گوارا نہیں کیا اور اندر ہی اندر سوچتا رہا کہ یہ خبر غلط ہوگی کہ اچانک انہوں نے ''اخبار مشرق'' پیش کر دیا جس میں حضرتؒ کے انتقال کی خبر شائع ہوئی تھی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ حضرت کی مغفرت فرمائے مغفرۃ کلیہ اور حضرتؒ کے جملہ پسماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائے، میں کتنا بڑا بدقسمت ہوں کہ وطن سے اتنی دور پڑا ہوں کہ حضرت کی تجہیز وتکفین میں بھی شرکت نہ کر سکا، معلوم نہیں مدرسہ مظاہر علوم کی جانب سے بھی حضرات نے شرکت فرمائی یا نہیں اگر وقت پر ان حضرات کو اطلاع ہوگئی ہوگی تو ضرور شرکت کی ہوگی، آپ حضرات پر کیا گذر رہی ہوگی اللہ تعالیٰ زائد بہتر جانتا ہے، صبر کیجئے میری جانب سے آپ اور حضرت کے جملہ رشتہ دار تعزیت قبول فرمائیں سہارنپور حاضری کے بعد حاضر خدمت ہوں گا، والدین کا وجود اولاد کے لیے وہ نعمت ہے جس کا بدل نصیب نہیں ہوسکتا حضرت اپنے اکابر کے سچے جانشین تھے اور امت مسلمہ کے لیے بہت بڑے ستون اور سہارا تھے، اللہ تعالیٰ حضرت کو جنت الفردوس میں اپنی شایان شان اونچا مقام نصیب فرمائے، میں جس دوکان پر بیٹھا ہوا خط لکھ رہا ہوں ان کا نام جاوید ہے دہلی کے رہنے والے ہیں وہ بھی حضرت کے انتقال کی خبر سے غمگین ہیں سلام عرض کرتے ہیں اور تعزیت پیش کرتے ہیں میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ حضرت کی مغفرت فرمائے۔ آمین

............❖............

مولانا محمد باقر حسین قاسمی صاحبؒ دار العلوم الاسلامیہ بستی یوپی:

صاحبزادہ محترم حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت حکیم الاسلامؒ کے سانحۂ ارتحال کی خبر لوگوں پر صاعقہ بن کر گری۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔
آہ! آج ہم حضرت نانوتویؒ کے علوم کے جانشین، خطیب وقت، بین الاقوامی علمی شخصیت، مجموعۂ کمالات اور عصر حاضر میں مسلک دیوبند کے ممتاز ترین ترجمان اور ایک گوہر نایاب سے محروم ہو گئے۔
اس حادثۂ فاجعہ کی خبر ملتے ہی ختم قرآن پاک کرا کر ایصال ثواب کیا گیا، ختم قرآن کریم کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔
اس عظیم سانحہ میں ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور اپنے آپ کو مستحق تعزیت سمجھتے ہیں۔
انتقال کی خبر ملتے ہی ہم آپ کی خدمت میں ایک رقعہ بھی ارسال کر چکے ہیں، امید کہ ملا ہوگا، دعا ہے کہ خداوند قدوس آپ اور ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے اور حضرت حکیم الاسلامؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عنایت فرمائے۔

............❖............

تعزیتی قرارداد دارالعلوم الاسلامیہ بستی:

حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی وفات حسرت آیات پر دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں مجلس دعائے مغفرت اور تعزیتی پروگرام:

یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ حضرت حکیم الاسلام جناب مولانا محمد طیب صاحبؒ کا سانحۂ ارتحال صرف ایک خاندان ایک ضلع ایک صوبہ اور ایک ملک کا حادثہ نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا حادثہ ہے اس المناک حادثہ سے خصوصاً تمام علمی و دینی حلقوں اور مدارس و جامعات میں صفِ ماتم بچھ گئی اور ہر جگہ کی فضا سوگوار ہو گئی۔

دارالعلوم الاسلامیہ بستی جو مشرقی یوپی کا ایک ابھرتا ہوا عظیم ادارہ ہے، یہاں کے اساتذہ وطلباء کو جوں ہی معلوم ہوا کہ حضرت حکیم الاسلامؒ رحلت فرما گئے تو تمام لوگ مبتلائے رنج وغم ہو گئے اور دارالعلوم کے ذرے ذرے سوگوار ہو گئے، اس لیے کہ اس ادارے کی ابتداو تاسیس میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی پرزور تائید اور نیک دعاؤں کا زبردست ہاتھ ہے۔

دارالعلوم بستی میں مسلسل کئی روز حضرت حکیم الاسلامؒ کی روح کو ایصال ثواب کیا گیا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی، پھر بتاریخ ۱۳؍شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۲۴؍جولائی با قاعدہ اجتماعی طور پر قرآن خوانی کر کے ایصال ثواب کیا گیا اور ایک تعزیتی پروگرام و مجلس دعائے مغفرت منعقد کی گئی جس میں دارالعلوم کے اساتذہ وطلبا کے علاوہ شہر کے اور دوسرے علما و معزز لوگوں نے شرکت کی اور اظہار رنج وغم کیا۔

تعزیتی پروگرام میں دارالعلوم کے استاذ جناب مولانا حکیم محمد ساجد صاحب قاسمی اور جناب مولانا ابوالعاص صاحب قاسمی وحیدی نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے اوصاف و کمالات اور علمی و دینی خصوصیات پر مفصل روشنی ڈالی۔

مولانا حکیم محمد ساجد صاحب نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کا مکمل اور جامع جائزہ لیا اور تفصیل کے ساتھ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے حضرت حکیم الاسلامؒ کو بہت سی علمی و ادبی اور اجتماعی و

انتظامی خصوصیات عطا کی تھیں، حضرتؒ ایک اعلیٰ منتظم و مدبر تھے جس کی دلیل نصف صدی سے زائد تک بڑے ہی حسن انتظام کے ساتھ منصب اہتمام پر فائز رہے وہ ایک عظیم خطیب و واعظ، اچھے ادیب وشاعر اور باکمال مصنف تھے، جن کے قلم زرنگار نے تقریباً پانچ (۵۰۰) سو کتابیں تصنیف کیں، وہ ایک بہترین معلم و مدرس اور مختلف علوم وفنون کے جامع تھے، اسی طرح وہ ایک روحانی مصلح ومربی اور عظیم پیرومرشد بھی تھے اور خصوصاً وہ انتہائی متواضع اور منکسر المزاج انسان تھے۔

آخر میں موصوف نے دارالعلوم دیوبند کے ذمہ دارن کو مشورہ دیا کہ انہیں چاہئے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی مکمل سوانح حیات مرتب کرائیں، جس میں خاص طور پر ان کی ۵۴ رسالہ علمی و دینی اور اصلاحی وانتظامی خدمات کا مکمل جائزہ وتعارف کرایا جائے

مولانا ابوالعاص صاحب وحیدی نے کہا کہ حضرت الاستاذ حکیم الاسلامؒ کی شخصیت ایک پوری جماعت اور ایک بڑی انجمن تھی، دیکھنے کو تو وہ ایک تھے لیکن ان کے اندر مدبر و منتظم معلم و مدرس ادیب وشاعر، حکیم ودانشور، مصنف ومؤلف، خطیب ومقرر اور خدا جانے نہ معلوم کون کون سی شخصیتیں پوشیدہ تھیں، اس طرح حکیم الاسلامؒ اس دنیائے فانی سے کیا منتقل ہوئے علوم وفنون کا ایک قافلہ اور فکروفن کی ایک پوری انجمن دنیا سے کوچ کر گئی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کے تمام اوصاف وکمالات میں ان کی علمی وسعت و گہرائی اور حکمت ودانشمندی نمایاں ترین صفت تھی، ان کا حکیمانہ اسلوب ان کے تمام علمی وادبی کمالات وخصوصیات میں جلوہ گر تھا، اسی لیے عالم اسلام نے انہیں حکیم الاسلامؒ کے لقب سے نوازا۔

آخر میں موصوف نے اس حقیقت کو مفصل طور پر واضح کیا کہ اسلاف واکابر کی اصل یادیہ ہے کہ ان کے کارنامے زندہ کیے جائیں، ان کے اوصاف وخصوصیات کو اپنایا جائے، اللہ تعالیٰ ہم تمام متعلّمین کو اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

پھر پروگرام ختم ہوا اور زبانوں پر یہ دعائیہ کلمات تھے کہ اللہ تعالیٰ حضرت حکیم الاسلامؒ پر اپنے فضل وکرم کی بارش کرے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ملت اسلامیہ کو تمام آفات وبلیات سے محفوظ رکھے۔ آمین! تقبل یا ربَّ العٰلمین.

............❖............

حضرت مولانا امام علی دانش قاسمی، مدرسہ رئیس العلوم اہل سنت کھیری:

مولانا المحترم والمکرّم عمت فیوضکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل ریڈیو سے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہ کے انتقال کی خبر سن کر یہاں والوں کو صدمہ پہونچا، نماز عشاء کے بعد تعزیتی اجتماع جامع مسجد میں ہوا جس میں حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت وترقی درجات کی گئی، صبح بعد نماز فجر قرآن خوانی کی گئی ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اللہ تعالیٰ صبر جمیل بخشے اور نعم البدل عنایت فرمائے۔ آمین۔

............❖............

حضرت مولانا حکیم عبدالقوی دریاباد، مدیر صدق جدید (ہفتہ واری) لکھنؤ:

محترم ومکرم السلام علیکم

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے حادثہ ارتحال کی خبر ملی، سخت صدمہ ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم عالم اسلام کی ایک اہم شخصیت اور شریعت وطریقت کے مجمع البحرین کی حیثیت رکھتے تھے۔ انشاء اللہ آپ کی تعزیت صدق جدید کے اگلے پرچہ میں تفصیل سے درج ہوگی۔

اس حادثہ عظیم میں میری اور میرے خاندان والوں کی طرف سے مخلصانہ تعزیت آپ کی، آپ کے بھائیوں اور دوسرے اقرباء کی خدمت میں پیش ہے۔

............❖............

جناب عتیق احمد صدیقی، شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ:

بھائی سالم صاحب السلام علیکم

کل اخبار سے اس سانحہ عظیم کی اطلاع ملی جو آپ کے، ہمارے لیے ہی نہیں، بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے، اگرچہ قبلہؒ کافی دن سے علیل تھے، لیکن اس صورت حال کے لیے دل و دماغ آمادہ نہیں تھے، دل چاہتا تھا کہ ان کا سایہ ہم لوگوں کے سروں پر تادیر رہے اور ان کے فیوض و برکات سے مستفید ہوتے رہیں، قضا و قدر کے فیصلوں کے سامنے کس کو مجال دم زدن ہے، لکھی ہوئی ساعت ٹل نہیں سکتی، لیکن گذشتہ دو تین سال کے حالات نے مرحوم کو جس کرب میں مبتلا رکھا، اس کا بھی ان کی شخصیت پر برا اثر پڑا اور جس تحمل کے ساتھ وہ ان حالات سے عہدہ برآ ہوتے رہے وہ ان کی شخصیت کی عظمت کی دلیل ہے، ان کا تقدس، ان کی علمیت، ان کی علمی اور دینی خدمات، ان کا محبت و رافت کا سلوک، ان کی صلۂ رحمی اور ایسی ہی متعدد صفات حمیدہ، ان کے لیے جن درجات عالیہ کی ضمانت بنے ہوں گے، ہم تو ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے، **جزا ھم عند ربھم جنۃ الخ** کی مصداق ایسے ہی حضرات کی شخصیات تو ہوتی ہیں، گھر میں یہ خبر معلوم ہوئی تو پہلا جملہ یہ تھا کہ ''دیوبند کی آخری بزرگ ذات بھی رخصت ہوئی'' سچ یہ ہے کہ ان کے لیے دعا کرنے کو زبان نہیں اٹھتی کہ چھوٹا منہ بڑی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس سعادت میں شامل ہونے کے لیے اپنے رب سے دعا کرتا ہوں کہ انہیں ابرار کبار میں شامل فرمائے۔

خاندان کی، دارالعلوم کی، اس مشن کی جو ساری زندگی مرحوم کو عزیز رہا، ساری ذمہ داریاں اب آپ پر ہیں، خدا کرے آپ ان کو بوجوہ احسن پورا کریں، ان کو پورا کرنے کے لیے جس تحمل اور تدبر کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے نوازا ہے، اب تک مرحوم کے سایۂ عاطفت میں ان سے کام لیتے رہے، اب خود پوری ذمہ داری کے ساتھ ان کو روبہ کار لانا ہے، اللہ آپ کو استقلال عطا فرمائے۔

............❖............

مولانا عبدالعلیم فاروقی صاحب، رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند:

حامداً و مصلیا وسلاماً

مخدوم گرامی قدر دامت برکاتکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل ۱۷/جولائی ۸۳ء کو بمبئ پہونچا یہاں آکر حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندوی کے ذریعہ حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمہ کی وفات حسرت آیات کی اطلاع ہوئی، فانا للہ وانا الیہ راجعون ۔ یہ خبر حضرت والا کے خدام اور متوسلین کے لیے کس درجہ اندوہناک ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ افسوس عالم اسلام ایک نہایت عظیم المرتبت شخصیت سے محروم ہوگیا علم وتقویٰ کا آفتاب عالمتاب غروب ہوگیا، ہندوستان کے مسلمان یتیم ہوگئے دارالعلوم دیوبند کی عزت وآبرو اٹھ گئی اس عظیم حادثہ کو کن الفاظ سے تعبیر کیا جائے لغت ایسے الفاظ سے قاصر ہے۔

اللہ پاک حضرت والا پر اپنے خاص انعامات فرمائے اور درجات عالیہ بلند فرمائے، کاش میں اس وقت لکھنؤ میں ہوتا اور کسی طرح آپ تک پہنچ کر شریک غم ہوجاتا لیکن یہ میری بدنصیبی ہے کہ ہزاروں میل دور بمبئ میں ہوں انشاء اللہ بہت جلد دیوبند حاضر ہوکر خدمت والا میں حاضر ہوں گا۔

میری طرف سے خانوادہ عامرہ کے ہر ہر فرد کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش فرمادیں۔ اللہ پاک ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق نصیب فرمائے اور حضرت کے فیوض وبرکات عام فرمائے۔ بمبئ میں مقیم لکھنؤ کے بہت احباب سلام نیاز کے بعد کلمات تعزیت پیش کرتے ہیں۔

............❖............

حضرت مولانا احمد اللہ صاحب بجنوری:

مکرم و محترم مولانا محمد سالم و مولانا محمد اسلم صاحب دام فیوضکم السلام علیکم ورحمہ اللہ و برکاتہ

پرسوں شام بعد عصر حادثہ فاجعہ وفات حضرت مہتمم صاحب قدس سرہ کی خبر ملی، انا للہ وانا الیہ راجعون، وقت تدفین کا اعلان نہ تھا ورنہ رات کو پہنچ سکتا تھا۔ پھر یہاں برخورداری سعدیہ سلمہا کے پرسوں ہی بچہ تولد ہوا اس کی وجہ سے بھی سفر بہت دشوار تھا، انشاء اللہ جلد حاضر ہوں گا۔ ملت مرحومہ ایسے وقت ایک نہایت عظیم القدر شخصیت سے محروم ہوئی کہ ان کی نہایت احتیاج تھی، خدا کی مرضی میں کیا چارہ ہے؟ ولا نقول الا ما یرضیٰ ربنا.

............❖............

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مدنی، دار التالیف بجنور:

محترم المقام زید مجدکم سلام مسنون

مزاج گرامی! حضرت مہتمم صاحب قدس سرہٗ کے وصال کے بعد میں نے ایک مضمون الجمعیۃ اخبار کو بھیجا تھا، افسوس کہ وہ شائع نہ ہوسکا، جس کا افسوس ہوا اور نہ معلوم کتنے مضامین اور خبریں ہوں گی جو انہوں نے شائع نہیں کیں، بہر حال یہ ان کے اختیار کی بات تھی لیکن اس کے نتائج خدا کے اختیار میں تھے جو غالباً ان کے لئے مفید ثابت نہ ہوں گے۔ اب اگر آپ ان کے لیے یعنی حضرت مہتمم صاحب قدس سرہٗ کے لیے کوئی چیز شائع کرنا چاہتے ہوں تو اس کی اطلاع دیں تاکہ میں بھی کچھ لکھ کر بھیج دوں، حضرتؒ کے لیے دعا اور ایصال ثواب یہ ان کا ہمارے اوپر حق ہے دعائے خیر کا طالب ہوں۔

............❖............

تعزیتی قرارداد، باشندگان نگینہ، ضلع بجنور:

نگینہ ضلع بجنور میں حکیم الاسلام حصرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے سانحۂ ارتحال پر باشندگان نگینہ کا ایک عظیم الشان تعزیتی اجلاس جامع مسجد میں تمام پارٹیز پر مشتمل زیر صدارت حکیم محمد عارف صاحب، مفتی جلیل احمد سابق۔ایم۔ایل۔اے۔وحاجی راشد ضمیر کے انتظام میں منعقد کیا گیا جس میں مندرجہ ذیل حضرات نے حضرت مولانا محمد طیب مرحوم کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی عظیم اسلامی خدمات اوردارالعلوم دیوبند کے دوراہتمام کی کامیابیوں کا تذکرہ کیااور موصوف کوخراج عقیدت پیش کیا گیا مقررین میں (۱) مفتی جلیل احمد صاحب سابق ایم۔ایل اے (۲) عزیز الرحمٰن صاحب ایم۔ایل۔اے کانگریس آئی (۳) ذکاوت حسین صاحب ایڈوکیٹ نمائندہ مسلم مجلس (۴) قاضی مسعود علی جمعیۃ علماء (۵) ماسٹر اختر زیدی جماعت اسلامی (۶) مولانا محمد عارف صاحب لوک دل (۷) خورشید احمد نمائندہ تنظیم طلباء (۸) مولانا سعید احمد صاحب نمائندہ مدارس اسلامیہ (۹) مولوی محمود الحسن صاحب نمائندہ دارالعلوم دیوبند ہیں، جلسہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے کیا گیا۔

مولوی خلیل احمد صاحب نے قرآن پاک کی تلاوت کی اور ایک تعزیتی نظم انیس احمد نے پیش کی اور مندرجہ ذیل تجویز تعزیت منظور کی گئی۔

باشندگان نگینہ کا یہ عظیم اجلاس حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے سانحۂ ارتحال پر اپنے گہرے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور عالم اسلام کا ایک عظیم ناقابل تلافی نقصان محسوس کرتا ہے۔

بلاشبہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی پوری زندگی علم دین کی اور حدیث کی خدمت کرتے ہوئے گذری اور علوم دینیہ کی ترویج واشاعت ان کی زندگی کا لازم حصہ بن کر گذرا نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے عالم اسلام میں ان کے علمی کارنامے مشعل راہ ثابت ہوتے رہیں گے۔

مرحوم نے دار العلوم دیو بند کے ۵۸/ سالہ دور اہتمام میں اپنے کارہائے نمایاں سے علمی دنیا میں ہندوستان کا سر اونچا کیا ہے اور ایک درسگاہ کو اپنی خدمات سے ایشیا کی عظیم اسلامی یونیورسٹی کی شکل میں دار العلوم کو وجود دیا مرحوم کے دور اہتمام میں دار العلوم دیو بند کا جشن صد سالہ پوری دنیا میں ایک تاریخ بنا بہر حال حضرت مولاناؒ کے وصال سے علمی دنیا سوگوار ہوگئی، اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات سے سرفراز فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، نگینہ کا یہ عظیم اجلاس مرحوم کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ عالمی تحریک تحفظ مساجد کے سلسلہ میں جو کام حضرت حکیم الاسلامؒ نے انجام دیا ہے عالم اسلام ان کا احسان مند ہے۔

............❖............

مولانا محمد حامد صاحب، خطیب شاہی مسجد حیدر آباد:

محترمی و مخلصی مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دام ظلہم العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انتہائی گہرے صدمہ کے ساتھ عالم اسلام کے اس عظیم نقصان پر جس قدر بھی صدمہ کیا جائے وہ بہت کم ہے، حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حدیث شریف کی رو سے موت العالم موت العالم ہے واقعی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بے مثال ہستی تھی۔ حضرت کے جو احسانات اور لطف وکرم اس خاکسار پر تھے اس کو یاد کر کے کلیجہ اوپر کو آتا ہے ماشاء اللہ آپ خود علامہ ہیں مگر یہ صدمہ اتنا عظیم ہے کہ آپ سب کو دوہرا شدید صدمہ پہنچا ہوگا۔ ہم سب خدام آپ کے صدمہ میں شریک ہیں آج صبح سے اپنے اس مدرسہ عربیہ تنویر نسواں میں پہلے جلسہ تعزیت منعقد ہوا اور اب ختم قرآن مجید کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، کل ریڈیو سے ۲ر بجے خبر نشر ہوئی اور آج یہاں پر تمام اخباروں میں بڑی سرخیوں سے یہ خبریں شائع ہوئی ہیں۔

یہاں پر کل تعزیتی جلسہ اور ختم قرآن مجید کا شہر میں اہتمام کیا جا رہا ہے۔

میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے تین روز قبل ایک خواب دیکھا تھا کہ حضرت قبلہ ایک موٹر پر تشریف لا رہے ہیں مگر کرتا پہنے ہوئے ہیں اور کرتے میں سے کاندھے کی پوری ہڈیاں نظر آ رہی ہیں میں ایک دم دوڑا ہوا موٹر کے قریب گیا تو حضرت قبلہؒ نے مصافحہ کا موقعہ عطا فرمایا میں نے فرط محبت سے دست مبارک سر پر رکھ لیا حضرت قبلہؒ نے بہت ہی تپاک سے برتاؤ فرمایا۔

اب ہم سب سوگوار ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے حضرت قبلہؒ کو اپنے جوارِ خاص میں جگہ مرحمت فرمائے۔ آمین

سب برادرانِ محترم سے اور متوسلین سے بھی ہم خدام کا سلام

............❖............

حضرت مولانا احمد اشرف صاحب، مہتمم دارالعلوم اشرفیہ عربیہ راندیر سورت گجرات:

محترم المقام مولانا الحاج محمد سالم صاحب زید مجدہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

بعد از سلام و عافیت کے والد ماجدؒ ہمارے بہت قدیم مشفق تھے اور ہمارا قدیم تعلق تھا مرحوم کی وفات کی خبر سن کر از حد صدمہ ہوا فون سے خبر سنتے ہی آپ پر ٹیلیگرام کیا تھا جو ملا ہوگا اور دارالعلوم اشرفیہ راندیر میں احقر کی صدارت میں تعزیتی جلسہ ہوا، جس میں مرحوم و مغفور کی وفات پر اظہار غم کیا گیا۔

تمام اساتذہ وطلبا نے قرآن کریم کی تلاوت کر کے مولانا مرحوم کو ایصال ثواب کیا اور شیخ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ مولانا الحاج محمد رضا اجمیری صاحب دامت فیوضہم نے حضرت والا کے مختصر حالات و کمالات بیان کیے۔

بعد ازاں مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی اور آپ تمام پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی توفیق کی دعا کی گئی، خدا پاک قبول کرے۔ آمین ثم آمین۔

............❖............

مولانا اسماعیل صاحب، حافظ احمد صاحب، جامعہ حسینیہ محمدیہ عربیہ اسلامیہ حسینیہ، راندیر، سورت:

مکرم ومحترم مولانا محمد سالم صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون! آج یہ غمناک اور روح فرسا خبر بذریعہ ٹیلی فون معلوم ہوئی کہ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اس دار فانی سے رحلت فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، افسوس علم وعرفان کی شمع فروزاں، فضل وکمال کا نیر تاباں اور علم ودانش کا آفتاب غروب ہوگیا؛ امت اپنے ایک عالم جلیل، حکیم الاسلام، پیر طریقت اور رہنماء دین سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی، حضرت حکیم الاسلامؒ کی وفات حسرت آیات سے علمی دنیا میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے بظاہر اس کا پورا ہونا ممکن نظر نہیں آتا، آپ کا سانحۂ ارتحال پوری علمی دنیا کا نقصان ہے۔

فما کان قیس هلکه هلکة واحد و لکنهٗ بنیان قوم قدتهدما

حضرت والاؒ کو جامعہ کے ساتھ خاص تعلق تھا اسی وجہ سے ہمیشہ جامعہ کے سالانہ اجلاس میں تشریف لاتے رہے ہیں، گذشتہ سال میں خود جلسہ کی دعوت کے لیے حاضر ہوا تھا۔

اس سال بھی دعوت پیش کی تھی مگر بیماری کی وجہ سے حضرتؒ کی طرف سے آپ ہی نے اپنے قلم سے معذرت پیش کی تھی۔

میں اور اہل مدرسہ آپ کو، مولانا محمد اسلم صاحب کو اور جمیع متعلقین کو بایں الفاظ تعزیت پیش کرتے ہیں۔

ولو کا ن فی الدنیا لساکن لکان رسول اللهﷺ فیها مخلداً

وما کان احد ینجوه الموت سالما و سهم المتایا قد اصاب محمداً

ہم آپ کے غم میں برابر شریک ہیں، اظہار ہمدردی کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ خداوند کریم حضرتؒ والا کو جنت الفردوس میں بلند درجات مرحمت فرماویں اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا کریں

…………❖…………

تعزیتی قرارداد، جامعہ حسینیہ راندیر:

جامعہ حسینیہ راندیر سورت، گجرات میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی وفات حسرت آیات پر ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا، جس میں اراکین، اساتذہ، طلبہ کے علاوہ شہر کے ممتاز علماء وذی وقار حضرات نے بھی شرکت فرمائی، جلسہ میں حضرت موصوف کی وفات پر اپنے اپنے تاثرات اور جذباتِ غم کا اظہار کیا گیا اور آپ کی دینی وعلمی خدمات کا ذکر جمیل کر کے خراج عقیدت پیش کیا گیا، جلسہ کے تمام ہی شرکاء نے تلاوت قرآن کر کے ایصال ثواب اور دعاء مغفرت کی، آخر میں تعزیتی تجویز پیش کی گئی، جو بالاتفاق منظور ہوئی تجویز کا متن حسب ذیل ہے۔

الحمد اللّٰہ الذی لہ البقاء و الدوام قال اللّٰہ تعالیٰ فی کل فان و یبقی وجہ ربک ذو الجلال و الاکرام و صلی اللّٰہ علیٰ سید الانام۔

تجویز (۱) جامعہ حسینیہ راندیر کا یہ تعزیتی جلسہ حضرت حکیم الاسلام فخر الاماثل حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے سانحۂ وفات پر اپنے قلبی غمناک تاثر کا اظہار کرتا ہے اور بعد تأسف اقرار کرتا ہے کہ آہ! فضل و کمال کا پیکر، حسن اخلاق زہد وتقویٰ کا مرقع، صبر وثبات کا مجسمہ اس دارِفانی سے اٹھ گیا اور ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا جس کا پر ہونا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا، یہ جلسہ آپ کے سانحۂ ارتحال کو پوری علمی دنیا کا نقصان تصور کرتا ہے نیز یہ جلسہ حضرت مرحوم کی خدمات دینیہ اور نمایاں کارکردگی کا اعتراف کرتا ہے۔

تجویز (۲) حضرت مرحوم کو جامعہ کے ساتھ خصوصی تعلق تھا یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۰ء سے برابر جامعہ کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے ہیں لہٰذا جامعہ بھی اس حادثہ جانکاہ کو اپنے لیے ناقابل تلافی نقصان عظیم سمجھتا ہے، اہل مدرسہ اور شرکاء جلسہ حضرت مرحوم کے اہل بیت و متعلقین خصوصاً مولانا سالم اور مولانا محمد اعظم کی خدمت میں تعزیت اور اظہار ہمدردی کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ حق تعالیٰ مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں درجات عالیہ عطا فرماویں اور خصوصی رحمت ومغفرت سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین۔

............❖............

مولانا عبدالعلی فاروقی ایڈیٹر ''البدر'' صدر المدرسین دار العلوم فاروقیہ کاکوری لکھنؤ:

ذوالمجد والکرم حضرت استاذ محترم مدظلکم العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بستر علالت پر حضرت اقدس مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حادثۂ وفات کی اطلاع ملی، دل اس خبر کو سننے کے لیے قطعی آمادہ نہ تھا اور اب تو یک گونہ ڈھارس بندھ گئی تھی کیونکہ حضرت والد ماجد مدظلہ بمبئی سے یہ اطلاع لائے تھے کہ اب حضرت کے مزاج سامی پرسکون ہیں اور صحت اس درجہ اطمینان بخش ہو چکی ہے کہ حضرت کا جلد ہی بمبئی کا سفر ہونے والا ہے، جب اخبارات کے ذریعہ حضرتؒ کی تشویشناک علالت کی اطلاع ملی تھی دل پکڑا سا رہتا تھا اور ہر وقت ایک اندیشہ لگا رہتا تھا مگر والد ماجد مدظلہ سے یہ تسلی بخش حالت سن کر دل کو کچھ اطمینان ہو گیا تھا کہ اچانک یہ اندوہناک خبر سننے کو ملی کہ حضرت مہتمم صاحبؒ کی ضیا بار شخصیت سے ہم سب لوگ محروم ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مجھ جیسے ناکارہ کی کیا بساط کہ اس حادثۂ عظمیٰ پر حضرت والا کی خدمت میں تعزیت پیش کر سکے لیکن ادائیگی نیت کے جذبہ کے ساتھ یہ عریضہ ارسال خدمت ہے حق تعالیٰ حضرتؒ کے اسوۂ حسنہ پر ہم سیاہ کاروں کو بھی چلنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ (آمین)

یوں تو دنیا میں جو آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن جانا ہے مگر قلق اور افسوس اس بات کا ہے کہ حضرت مہتمم صاحبؒ اس حال میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ انجام آخرت سے لاپرواہ مفاد پرستوں نے ان کا کلیجہ چھلنی کر دیا تھا، آپ حضرات کو اس کا جس قدر بھی ملال ہو کم ہے، ویسے یہ تو یقین ہے کہ انشاء اللہ یہ کلفتیں ان کے لیے ذخیرۂ آخرت ثابت ہوں گی، اس سلسلہ میں اپنے دلی جذبات کا قلم برداشتہ اظہار ''البدر'' کے تازہ شمارہ میں کیا ہے اگرچہ مسلسل علالت کی وجہ سے بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ نہیں لکھ سکا، یہ شمارہ حسب معمول طبع ہونے کے بعد انشاء اللہ خدمت والا میں بھی بھیجا جائے گا۔

دل تو یہ چاہتا تھا کہ اس غم آگیں موقع پر حاضر خدمت ہو کر کفش برداری کی سعادت حاصل کرتا شاید

اس طرح حضرت والا کی کچھ تسلی کا باعث بن سکتا مگر شروع رمضان سے مسلسل بیماری کا سلسلہ چل رہا ہے، بخار کی شکایت رہی جس نے آخر رمضان میں بہت شدت اختیار کرلی اور ۱۰۵ر سے ۱۰۶ تک بخار ہوگیا جس کی وجہ سے معالجین بھی تشویش میں مبتلا ہوگئے تھے مختلف قسم کی جانچ اور ایکسرے ہوئے جس کے نتیجہ میں معلوم ہوا کہ خون میں کچھ فساد پیدا ہوگیا ہے جس کی اصلاح کے لیے صبح دوپہر شام ۳ر انجکشن یومیہ لگتے رہے اب بحمدللہ بخار کا سلسلہ کم ہوگیا ہے مگر علاج جاری ہے اور کمزوری کافی آگئی ہے، مدرسہ کھل چکا ہے مگر ابھی تک حاضری نہیں دے سکا ہوں۔

مخدومان گرامی جناب مولانا محمد اسلم صاحب و محمد اعظم صاحب کی خدمات میں بھی تعزیت مسنونہ پیش کردیں۔

............❖............

حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب، مدرسہ فیض القرآن نگرہ جھانسی یوپی:

مخدومی قبلہ مولانا محمد سالم صاحب، زید مجدکم سلام مسنون!

کل شام ریڈیو سے یہ خبر جگر خراش سارے ملک نے انتہائی رنج وقلق سے سنی کہ ملک کی مایہ ناز ہستی حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت نور اللہ مرقدہ کی ذات گرامی برّ اعظم ایشیاء میں ایک امتیازی شان رکھتی تھی اور اپنے ظاہر و باطن اور جسم وروح کے اعتبار سے ایک ایسی مافوق الفطرت ہستی تھی کہ جس کی نظیر اب صدیوں میں پیدا نہ ہو گی، حضرت شاہ ولی اللہؒ بلندیٔ فکر، شاہ عبد القادر وشاہ رفیع الدینؒ کی فراست قرآنیہ، شاہ عبد العزیز کا علم و عرفان اور حضرت نانوتویؒ کی حکمت کسی انسانی قالب میں جاری وساری تھی تو وہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی ذات گرامی ہی تھی، وہ یادگار سلف تھے، حکیم الامت تھے، وہ عصر نو میں سراج راہِ ہدایت تھے وہ ایک ہی وقت میں مفسر قرآن، محدث زماں، فقیہ امت، مورخ دوراں، دانائے رموز معرفت وحقیقت امام راہ طریقت سب کچھ تھے اقتصادیات ومعاشیات، معادیات واخلاقیات، اجتماعیات اور دیگر علوم وفنون کا وہ کون سا گوشہ تھا جس میں حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ کی رائے اور آپ کے قلم حکمت رقم سے بکھرے ہوئے جواہر ریزے حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتے ہوں، شریعت مصطفوی ﷺ کو دلیل و برہان کے حکیمانہ پیراہنوں میں آراستہ کر کے جس طرح آپ نے پیش کیا وہ صرف آپ ہی کا حصہ ہے جو رہتی دنیا تک باقی رہے گا، ان سب کی دلیل خود دار العلوم ہے جو آج سوگوار وآبدیدہ ہے، شریعت وطریقت، علم وعرفان کی بزم سونی ہو گئی، سلوک وتصوف کی خانقاہ اجڑ گئی، عزم واستقلال کے مینارے زمیں دوز ہو گئے، غرضیکہ ہدایت کا مینار، عزم وہمت کا سنگ میل گمراہی کی گھٹاؤں میں بدر منیر، اہل حق پر رحمت کا سایہ، حسن وتقویٰ اور طہارت کا مجسمہ آج ہم سے رخصت ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے جدا۔

رحمتوں کے پھول برسیں تیری تربت پر مدام خلد میں حاصل تجھے ہو ارفع واعلیٰ مقام

جہاں پوری دنیا آج اس رنج وغم میں آپ کے برابر کی شریک ہے، وہیں یہ پورا شہر جھانسی بھی اس رنج وغم میں شریک ہو کر ادارے میں جمع ہے طلبا واساتذہ اور اہالیان شہر قرآن خوانی اور کلمہ طیبہ سے ایصال ثواب کر رہے ہیں حق تعالیٰ قبول فرمائے اور حضرت علیہ الرحمہ کو اعلیٰ مقام عنایت فرمائے، آمین۔

خادم اور تمام حضرات کی جانب سے مولوی محمد اسلم صاحب اور مولوی محمد اعظم صاحب کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کیجئے۔

............❖............

محترم جناب شوکت علی فہمی صاحب، ایڈیٹر دین دنیا، جامع مسجد:

محترمی مولوی محمد اسلم صاحب السلام علیکم

ریڈیو اور اخبارات سے یہ معلوم کر کے انتہائی قلق ہوا کہ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ہم سے جدا ہو گئے، یہ حادثہ صرف آپ کے لیے اور آپ کے خاندان ہی کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ نہیں ہے، بلکہ مسلمانان ہند کا بھی ایک ایسا نقصان عظیم ہے جس کی شاید زمانہ دراز تک تلافی نہیں ہو سکے گی۔

ہمارے ملک میں یوں تو پہلے ہی قحط الرجال ہے اور اب اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا، اس میں ذرا بھی شک نہیں ہمارا ملک ایک ایسے عالم بے بدل، سحر بیان مقرر اور مجسم اخلاق سے محروم ہو گیا ہے، جسے کہ بری طرح سے محسوس کیا جائے گا، مجھے بھی اس حادثہ عظیم میں اپنا شریک غم تصور کیجئے اور میری جانب سے سب ہی متعلقین سے تعزیت فرما دیجئے۔

............❖............

مولانا ابراراحمد قاسمی دیوبندی:

محترم بھائی اسلم زیدمجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انتہائی صدمہ اور رنج ہوا اس بات کو سن کر کہ بھائی جی رحلت فرما گئے اس جانکاہ حادثہ سے ایسی حالت ہوگئی بیان نہیں کرسکتا یقین نہیں آتا تھا، ریڈیو میں جب الاؤنس ہوا دل پھٹ گیا کئی روز سے خط لکھنے بیٹھتا ہوں نہ دماغ کام کرتا ہے نہ ہی قلم چلنے کو تیار ہے اور یہ سوچتا تھا کہ اپنے بھائی اسلم کو کن الفاظ میں تعزیت پیش کروں بخدا اس وقت بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، اس اندوہناک حادثہ کی برداشت کہاں، اللہ رب العزت حضرت مولاناؒ کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عنایت فرما کر جنت الفردوس عطا فرماوے آمین ہم ہر وقت دعا کرتے ہیں اہلیہ ابراراحمد ارشاد احمد اور تمام بچے سب کو بہت ہی افسوس اور صدمہ وملال ہے، سب دعا کرتے ہیں اے اللہ تو اپنی رحمت کاملہ کے صدقہ حضرت مہتمم صاحبؒ کو کروٹ کروٹ چین وراحت نصیب فرما، یا اللہ بال بال مغفرت فرما، یا اللہ تو اپنے فضل وکرم سے خاندان قاسمی کے ہر فرد کو صبر جمیل عطا فرما، تمام متعلقین کو صبر کی دولت سے مالا مال فرما، بھائی اسلم صبر سے کام لینا ہم سب تمہارے سب کے غم میں برابر شریک ہیں تفصیل معلوم کرنے کے لیے بے چین ہوں، کسی کا خط تفصیل لے کر نہیں آتا کہ آخر میں کیسی طبیعت ہوگئی تھی نماز کس نے پڑھائی کتنے آدمی جنازہ میں شریک ہوئے بھائی طاقت پرواز نہیں ورنہ اڑ کر تمہارے سے مل کر اپنے غم کو ہلکا کرلیتا، جب بھائی جیؒ کا خیال آجاتا ہے تو کیسا دماغ ہوجاتا ہے گھر و دیوار بھی روتے ہی ہوں گے، آہ ثم آہ۔

آہ گل چینِ اجل تجھ سے نادانی ہوئی پھول وہ توڑا کہ گلشن بھر میں ویرانی ہوئی

اللہ رب العزت ہم سب کو صبر عطا فرما، بھائی جان سے بھی تعزیت پیش کرنا اعظم آگئے ہوں گے حمیرہ آپا کہاں ہیں، ذرا فرصت ملنے پر دو لفظ لکھ دو گے، مجھے بھی تسلی ہوجاوے گی، اہلیہ سے اور بچوں سے سلام ودعا کہنا، میں اور اہلیہ اور سب بچے آپ کے غم میں برابر شریک ہیں۔ آج کل جامع مسجد میں امامت کے منصب پر ہوں۔

گذشتہ جمعہ کے روز نماز سے پہلے بھری مسجد میں تمام مصلیان مسجد کو اس جانکاہ حادثہ کی اطلاع دی اور حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات اور علمی دینی وتدریسی تحریری تقریری خدمات پر تقریر کی اور بعد نماز حضرتؒ کے لیے ایصال ثواب کیا، تمام ہی نمازی شریک رہے، بسمل شاہجہاں پوری بھی تھے انھوں نے بھی حضرتؒ کے اوصاف بیان فرمائے۔

اللہ رب العزت حضرتؒ کے درجات میں ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

............❖............

مولانا محمد سعید الرحمٰن صاحب مدیر ماہنامہ ''نصرۃ الاسلام'' سرینگر کشمیر:

حضرت الاستاذ گرامی مدظلہ العالی   سلام مسنون نیاز مقرون

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے ارتحال کی خبر آل انڈیا ریڈیو سے سن کر پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اور خاکسار پر سکتہ کا عالم طاری ہوگیا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ بے شبہ دور حاضر میں ملت کا عظیم سرمایہ تھے، مرحوم کے وصال سے جو روحانی، عرفانی اور علمی فضا میں خلا پیدا ہوگیا ہے اس کا پر ہونا اب بظاہر ناممکن ہے۔ ع

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

انجمن نصرۃ الاسلام کے تحت چلنے والے اداروں اور انجمن اوقاف کے اہتمام سے تعزیتی جلسے اور ایصال ثواب کی مجلسیں منعقد کی گئیں۔

خاکسار عنقریب خود حاضر خدمت ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرتؒ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دیں اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق، آں محترم سے تعزیت کیا کروں، خود تعزیت کا مستحق ہوں۔

............❖............

مولانا عبدالجمیل صاحب خطیب باقوی وانمباڑی مدراس:

عزیز محترم مولانا محمد اسلم صاحب زادجبہٗ خلف الرشید حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ

سلام مسنون

کسی کی بھی موت کی خبر سن کر ایک دین دار مسلمان کی زبان سے انا للہ و انا الیہ راجعون نکلتا ہے مگر میری حقیر گنہ گار زبان اس عظیم سانحہ کو سن کر اس کے ساتھ ہی انک میت کا جملہ نکلا نبی کریم ﷺ کو اللہ نے مادی حیات کے بعد روحانی لباس موت کے اعزاز سے مشرف فرما کر آخرت کی زندگی پر یقین رکھنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کے لیے قرآنی دعوت کو عام کرنے والوں کے دل کو تسلی دیتے ہوئے یہ جملہ انک میت کے بعد وانھم میتون پھر ثُمَّ اِنَّ بَعدَ ذٰلک یو م القیٰمة تبُعَثون نازل کیا۔

حضرت مولانا مدنی علیہ الرحمہ نے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کی رحلت پر تعزیتی الفاظ میں فرمایا تھا کہ یہ ایسا سانحہ ہے جس کی تعزیت ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے کرے، پوری ملت اسلامیہ عالمی کے دل پر حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی وفات کا اثر نا گزیر ہے، دارالعلوم دیوبند کی عالمی شہرت کے وکیل اصلی حضرت ہی کی ذات اقدس تھی جگہ خالی ہے اور قیامت تک خالی رہے گی دارالعلوم کے درودیوار کنکریاں تک حضرت کی یاد میں اپنے انداز میں دعا گو رہیں گی۔

اللّٰھم اغفر لہ و قارب اللہ ثراہ وجعل الجنة مثواہ

اللہ تعالیٰ اس سانحہ عظمیٰ پوری امت کو صبر جمیل عطا کرے اور مرحوم کا نعم البدل نصیب کرے۔

............❖............

مولانا محمد ابوبکر صاحب، مکتبہ اثریہ، قاسمی منزل، غازی پوری:

محترم المقام جناب مولانا محمد سالم صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل شب ریڈیو سے حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ کے حادثہ رحلت کی جانکاہ خبر ملی اور دل و دماغ پر صاعقہ اثر بن کر گری، حضرت رحمۃ اللہ اگرچہ اپنی عمر طبعی کو پہو نچ چکے تھے مگر یہ توقع نہ تھی کہ علم وعمل اور فضل وکمال کی یہ گراں قدر شخصیت اتنی جلد ہم سے رخصت ہو جائے گی، یہ حادثہ صرف ہم وابستگان دارالعلوم ہی کے لیے نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے ایک زبردست حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور خصوصاً حضرت کے متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔

افسوس اس دور انحطاط میں یہ ساری باکمال ہستیاں ہم سے ایک ایک کر کے رخصت ہوتی چلی جارہی ہیں اور دنیائے علم وفضل سونی ہوتی چلی جارہی ہے، خدا کرے حضرت کے علوم کی حفاظت کا کوئی بندوبست ہو سکے، اس کی کوشش ہم سب کا دینی فریضہ ہے یہ میرے کلمات تعزیت گھر کے افراد کو آپ پہنچادیں۔

............❖............

مولانا علی احمد بلیاوی استاد مدرسہ دارالعلوم چھاپی:

محترم المقام حضرت الاستاذ صاحب دامت برکاتہم العالیہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

حضرت الاستاذ حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ کے سانحۂ ارتحال حادثۂ فاجعہ کی اطلاع بذریعہ ریڈیو معلوم کر کے انتہائی کرب واضطراب ہوا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا کو جنت کروٹ کروٹ نصیب فرمائے اور جنت میں اعلیٰ علیین میں مراتب عالیہ مرحمت فرمائے آمین اور پس ماندگان اولاد واحفاد، اعزہ واقارب کو اجر جزیل وصبر جمیل مرحمت فرمائے۔ آمین۔ آپ حضرات کو صبر وتسلیم ورضا کے سلسلے میں کچھ لکھنا لقمان کو حکمت کی باتیں تلقین کرنے کے مرادف ہے۔ البتہ تعزیت مسنونہ ارسال ہے۔ **ان للّٰہ ما اخذولہ ما اعطی وکل شیء عندہ باجل مسمی فلتصبر و لتحتسب** حضرت والا کا سانحۂ ارتحال ملت مسلمہ کے لیے عظیم نقصان ہے جو ناقابل تلافی ہے۔

حضرت والا نے جن نامناسب حالات میں دارالعلوم کی خون جگر سے آبیاری کر کے بام عروج پر پہنچا ہے اور زندگی کا مقصد حیات دارالعلوم کے طلبہ اور اساتذہ کی علمی واخلاقی زلفیں سنوارنا ہی تھا، اس انتھک محنت نے دارالعلوم کا علمی روحانی معیار عالم میں بلند کیا، ملک بیرون ملک علماء مشائخ کی کھیپ کی کھیپ تیار کی، ان کی خدمات جلیلہ کا اقرار واعتراف کرتے ہوئے خراج وتحسین پیش کرتے ہیں اور خداوند قدوس کی بارگاہ میں ہم سب دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت والا کے جنت میں درجات عالیہ میں جگہ مرحمت فرمائے آمین۔ حضرت والا کی دو عظیم الشان یادگار ہیں۔ دارالعلوم دیوبند، مسلم پرسنل لاء بورڈ۔ احقر نے انفرادی ختم قرآن وغیرہ کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ چند روز میں منجانب مدرسہ ایصال ثواب کا اہتمام انشاء اللہ ہونے والا ہے تمام طلبہ کے جمع ہونے کے بعد۔ جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم چھاپی سلام مسنون اور تعزیت مسنونہ عرض کرتے ہیں۔

............❖............

مولانا محمد عطاء الرحمٰن ابن محمود حسن صاحب وارد حال کڑے کل شیموگہ کرناٹک:

حضرت خطیب الاسلام مدظلہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ حضرت والا و دیگر اہل بیت بخیر و عافیت ہوں گے۔

۷رشوال کو جب میرے کان میں یہ خبر پہنچی کہ مرشدی و مولائی حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کا سایہ اقدس اس عالم فانی سے عالم باقی کی طرف اٹھ گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس دن سے میں بغیر ماں باپ کے یتیم ہو گیا اس تاریخ سے میں اپنے میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ میرا اس دنیائے فانی میں میرے مربی میرے مشفق شیخ میرے مشفق مرشد کے بغیر رہنا بیکار ہے ایک قسم کا پریشان حال ہو گیا ہوں یہ غم ایسا ہے کہ جیسا اپنے والدین کے رحلت پر ہوتا ہے بلکہ کہیں اس سے زیادہ بڑھ کر ہے، جب مجھے اتنا غم والم ہے تو حضرت آپ تو حضرت مرشدی و مولائی کے چشم و چراغ نور نظر لختِ جگر ہیں آپ کے غم والم کی کوئی انتہا نہ ہوگی اور دیگر اہل بیت بھی بہت مغموم ہوں گے حضرت خدا کی جو مرضی تھی وہ ہو گیا اس دنیا میں انبیاء بھی نہیں رہے، اللہ تعالیٰ آپ تمام اہل بیت کو صبر و سکون عطا فرمائے اور حضرت والاؒ کو جنت النعیم میں اعلیٰ مراتب و درجات پر فائز فرمائیں۔ آمین۔

ہمارے والدین بھی بہت مغموم ہیں اور ہمارے گھر میں ایصال ثواب کیا گیا اور ہمارے شہر شیموگہ میں ہر مسجد میں ایصال ثواب کیا گیا اور سارے شہر میں غم والم کا سیلاب بہہ گیا اور شافعیؒ مذہب کے مساجد میں جمعہ کے دن حضرت کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ مجھے اتنا اور اس وجہ سے غم ہے کہ آخر میں حضرت کا دیدار نہ کر سکا محروم القسمت ہو کر رہ گیا۔

انشاء اللہ میں پندرہ اگست کو دیوبند آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا اور ساتھ چھوٹا بھائی بھی آرہا ہے مجھے امید ہے کہ آپ نے اور تمام گھر والوں نے گذشتہ سال محبت و شفقت سے اپنے مکان میں کمرہ دیا تھا، امید کہ امسال بھی ان شفقتوں کو زندہ فرمائیں گے امی جان صاحبہ اور تمام گھر والوں کی شفقتیں مجھے یاد آرہی ہیں۔

زیادہ احترامات تمام اہل بیت کو سلام عرض ہے اور دعا کی درخواست، کچھ گستاخی ہوئی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔

............❖............

مولانا ابوزاہد محمد یونس قاسمی، سلک پیراڈائز وارانسی:

بخدمت اقدس حضرت مولانا محمد سالم صاحب زید مجدکم

بعد تحیہ مسنونہ بحمداللہ بعافیت ہوں۔ خدا کرے آپ جملہ حضرات بخیر ہوں، عرض دیگر یہ کہ حضرت مہتمم صاحب قبلہ نوراللہ مرقدہ کی وفات بذریعہ ریڈیو معلوم ہوئی، سن کر بے حد رنج وغم میں ڈوب گیا اور بڑی بے چینی سے دیوبند پہنچنے کی خواہش ہوئی۔ افسوس کہ کوئی شکل دیوبند پہونچنے کی نہ نکل سکی کہ تدفین میں شرکت کرسکوں۔ ٹیلی گرام ارسال کرنے کے سوا اور کوئی بات میرے سامنے نہ تھی، جہاں تک ہوسکا مدرسہ اور محلّہ کی مساجد میں قرآن خوانی وغیرہ کرادی۔ اللہ سے دعا ہے کہ حضرتؒ کے بال بال کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے اور آپ جملہ حضرات کو صبر جمیل عطا فرمائے، انشاء اللہ جلد سے جلد دیوبند حاضری کی کوشش کررہا ہوں، پھر بھی حضرتؒ کی بیماری اور اخری دور کے حالات کا بڑی بے چینی سے اشتیاق ہے، اگر ممکن ہوسکے تو خود اپنے دست مبارک سے کسی خادم سے ہی بس مختصر حالات لکھوادیں، تاکہ جانکاری ہوسکے۔

............❖............

حضرت مولانا محمد رشید بزرگ صاحب سملک ڈابھیل:

مخدوم محترم زید مجدکم السامی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج شریف! بعد یہ کہ ریڈیو اور اخبار کے ذریعہ والد محترم کی وفات کی اطلاع پا کر دلی رنج ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرما کر درجات عالیہ سے سرفراز فرمائیں، احقر مولانا مرحوم ومغفور کے دور اہتمام میں سات سال سے زائد دارالعلوم میں رہا ہے، یقیناً ان کی وفات امت محمدیہ ﷺ کے لیے نقصان عظیم کا درجہ رکھتی ہے، دعا ہے کہ حق جل مجدہ مولاناؒ کی مغفرت فرما کر درجات عالیہ سے سرفراز فرماویں اور ان کی نیکیوں کو قبول فرمادیں اور امت کو اس کا بہترین بدل عطا فرماویں۔ آمین اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرما کر ان کی ہر طرح سے مدد فرماویں، احقر اس خط کے ذریعے جملہ پسماندگان قاسمی برادری کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتا ہے۔

............❖............

جناب کریم الاحسانی صاحب حسن پور لوہاری مظفر نگر:

محترم المقام حضرت مولانا محمد سالم صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس صدی کے اس عظیم سانحۂ ارتحال پر قلبی وروحانی دکھ ہوا، میں اس عظیم غم میں آپ کا برابر کا شریک ہوں، یہ سانحۂ عظیم ملک ووطن کے لیے جہاں بڑا المیہ ہے وہاں ممالک اسلامیہ کے بھی عظیم سانحہ ہے خدا مرحوم کو جنت الفردوس اور سکون ابدی نصیب کرے۔ آمین

ریڈیو واخبارات کی روش سے بڑا دکھ ہوا کچھ لوگوں کا لاکھ اختلاف سہی لیکن اس عظیم المرتبت ہستی کے لیے اخبارات کے کالم (کم از کم) یا صفحات سیاہ ہونے چاہئیں تھے، لیکن یہاں ایسا نظر نہیں آیا، میں نے پرسوں شب میں جو خبریں سنی ہیں ان میں مرحوم کا قطعاً نام نہیں لیا گیا جب کہ جوش ملیح آبادی پر رات میں تبصرہ بھی سنایا گیا تھا اور کیا ستم ہے کہ جوش غیر ملکی بھی تھے اور کس قدر افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ حکیم الاسلامؒ کے بارے میں اس قسم کا کوئی فیچر یا تبصرہ نہیں تھا، کیا کوئی ایم۔ پی (غیرت منداور حق گو) پارلیمنٹ میں اس مسئلہ کو پیش کرنے کی جرأت اور سعادت حاصل کرسکتا ہے؟ یہ بات کھٹکی تھی اس لیے تحریر کررہا ہوں میرے لائق کوئی خدمت ہوتو حکم فرمائے گا۔

............❖............

مولانا عبدالحفیظ رحمانی صاحب، استاد مولانا آزاد کالج، قادرآباد ضلع بستی:

محترم المقام مولانا محمد سالم صاحب زادمجدہٗ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمدللہ بعافیت ہوں، کل ریڈیو پر حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کے سانحۂ ارتحال کی خبر سن کر مبہوت ہوگیا، یقیناً حضرت والا ان نابغۂ روزگار شخصیتوں میں سے تھے جن کے لیے زمانہ برسوں سے اپنی آنکھیں بچھائے رہتا ہے، مولانا مرحوم ایسی جامع شخصیت کم ازکم اس دور میں تو نظر نہیں آتی، بلاشبہ حضرت کی وفات سے ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جو تا دیر پر نہیں ہوسکے گا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ ملت ابراہیمی کے مرد حکیم، وسیع النظر محدث، ژرف نگاہ فقیہ، بے مثال خطیب دیدہ ور مصنف اور اسلاف کے علمی و عملی کارناموں کے امین تھے جن خوش نصیبوں کو حضرت والا سے حجۃ اللہ البالغۃ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے وہ تادم آخر مرحوم کی باریک نظری اور وسعت علم کی داد دیتے رہیں گے۔

ایسی عظیم شخصیت تو ہزاروں کو سوگوار بنا دیتی ہے چہ جائیکہ اولاد اور اہل خاندان کو، ان کے دکھ کا اندازہ لگانا ہی مشکل ہے، لیکن اس منزل کو عبور کر کے حضرت والا کو رفیق اعلیٰ سے ملنا تھا وہ جا ملے، اللہ تعالیٰ درجات بلند فرمائیں۔

ضرورت ہے کہ حضرت کے نصف صدی کے علمی و تصنیفی کارناموں کو فروغ دینے کے لیے بطور یادگار (حکیم الاسلام اکیڈمی) قائم کی جائے اور حضرت کی تابناک زندگی کو مشعل راہ بنا دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

............❖............

مولانا محمد عزیز الحسن صاحب صدیقی مہتمم مدرسہ دینیہ غازی پور:

محترم المقام مولانا محمد سالم صاحب زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گذشتہ رات ریڈیو نے حادثہ جانکاہ کی خبر سنائی، دل کسی طرح اس خبر کو صحیح ماننے پر تیار نہ تھا، مگر واقعہ جب پیش آچکا ہو تو اس کو صحیح ماننا ہی پڑتا ہے، کاش یہ خبر وحشت اثر کچھ دن اور سننے کو نہ ملتی۔

دعا ہے کہ خداوند کریم حضرت حکیم الاسلامؒ کو جنت الفردوس میں مقام اعلیٰ نصیب فرمائے اور ملت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل نصیب ہو۔

میں اس الم انگیز حادثہ پر اپنی طرف سے اور ادارۂ دینیہ کی طرف سے تعزیت پیش کرتا ہوں۔

............❖............

مولانا امین صاحب، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ پھلواری شریف پٹنہ:

حضرت مولانا المکرّم زید مجدکم واطال اللہ بقاءکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نادرۃ العصر حکیم الاسلامؒ قدس سرہ کی رحلت کی اطلاع ریڈیو کے ذریعہ ملی، اطلاع کیا تھی ایک صاعقہ تھی جو آئی اور ہوش وخرد کو کچھ دیر کے لیے لے گئی، یوں تو حضرت والا کی علالت کی خبریں دہلی وغیرہ سے برابر آرہی تھیں، مگر اس کے باوجود اس قدر جلد روپوش ہو جانے کا یقین نہیں تھا۔

حضرتؒ کی ذات اپنے موجودہ ہمعصروں میں علوم اسلامیہ کی جامعیت میں یکتا و منفرد تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جو بصیرت وتعمق اور حکمت عطا فرمائی تھی وہ اوروں کو نہ ملی تھی، اس حادثہ فاجعہ پر خداوند قدوس تمام اہل خانہ اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور آپ کے ذریعہ وہ خلا پر ہو، تمام کارکنان دفتر اس غم میں شریک ہیں۔

............❖............

مولانا محمد اکرام علی صاحب بھاگلپوری استاذ جامعہ مفتاح العلوم مئو:

مخدوم زادہ حضرت مولانا محمد سالم صاحب زید مجدکم السامی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! استاذنا المکرّم حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ کی وفات علمی حلقہ میں غیر معمولی سانحہ پر صرف آپ اور آپ کے برادران ہی نہیں بلکہ ہم تمام فرزندان قاسمی یتیم ہو گئے، مرحوم کے علمی، دینی خدمات ان کی ترقیٔ درجات کے لیے مکمل ضمانت ہیں، انشاء اللہ، افسوس اس کا نہیں کہ حضرت مرحوم دنیا سے رحلت فرما گئے کل نفسٍ الآیۃ کے تحت ایک دن تو ان کو کوچ کرنا ہی تھا بلکہ افسوس اس بات کا ہے کہ حضرت مرحوم نے اپنے پیچھے جو خلا چھوڑا ہے اس کا پر ہونا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے، حق تعالیٰ ان کے مراتب کو بلند سے بلند تر فرمائے اور ہم لوگوں کو ان کا سچا جانشین بنا دے، آمین۔ جو صدمہ آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو پہنچا ہے اس میں ناچیز برابر کا شریک ہے دعا ہے کہ حق تعالیٰ جملہ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین، ہم سبھوں کی تسلی کے لیے ایک اعرابی کا درج ذیل شعر کافی ہے، جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی وفات پر ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

اصبر بک فکن صابرین فانما صبر الرعیة بعد صبر الرأس

خیر من العباس اجرک بعده واللّٰه خیر منک للعباس

جس روز حضرت مرحوم کی وفات ہوئی حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب مدظلہٗ، چمپانگر بھاگل پور میں میرے یہاں تشریف فرما تھے، عین جلسہ کے دوران میں وفات کی خبر ملی جلسہ میں تعزیتی تقریر ہوئی اور ان کی ترقی درجات کے لیے دعا ہوئی اللہ تعالیٰ ہم سبھوں کی دعاؤں کو ان کے حق میں قبول فرمائے، آمین۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، الحمد للہ اچھا ہوں۔ دعا کر رہا ہوں دعا چاہتا ہوں۔

............❖............

جناب اخلاق حسین صاحب، ڈِپارٹمنٹ آف فلاسفی، اے۔ ایم۔ یو علیگڑھ:

محترم اعظم صاحب السلام علیکم

ریڈیو اور اخبارات کے ذریعہ معلوم ہوا کہ آپکے والد محترم حکیم الاسلام کا انتقال پر ملال ہو گیا۔ سن کر بہت افسوس ہوا اللہ تعالی ان کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ حکیم الاسلامؒ کی وفات سے مسلم قوم اور علمائے اسلام دونوں کو نقصان ہوا ہے مرحوم نے مدتوں تک عالم اسلام کے لئے خدمات انجام دیں انہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کرے کہ آپ ان کے مقصد کو آگے بڑھا سکیں تا کہ مرحوم کی روح کو سکون ملے۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ آپ سبھی کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

............❖............

مولانا احمد نصر صاحب بنارسی، مہتمم مدرسہ عربیہ امدایہ برنا پل بنارس:

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے وصال پر ملال کی خبر سن کر یہاں کا ایک ایک فرد رنجیدہ ہو گیا۔

آسماں را حق بود گر خون ببارد بر زمین ۔۔۔۔ بر وفات شیخ طیب صاحب حق الیقین

وہ خود اور ان کی زندگی کی جدوجہد ایک مسلّم ومکمل تاریخ ہے۔

۵۸ سال تک مسلسل از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کے منصب اہتمام پر فائز رہے وہ اور دارالعلوم کا ذکر گویا لازم وملزوم ہے کوئی ان دونوں کو علیحدہ کر کے دارالعلوم کی تاریخ ہرگز کبھی بھی نہ لکھ سکے گا۔ حضرت مہتمم صاحبؒ بانی دارالعلوم مولانا قاسمؒ نانوتوی کے پوتے تھے علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگرد تھے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے خلیفۂ مجاز تھے حضرت مہتمم صاحبؒ اپنی خصوصی صفات نیز علم وعمل صلاح وفلاح تقویٰ دیانت امانت صبر وتحمل مرنجا مرنج مزاج کی وجہ سے سب کے نزدیک قابل احترام اور غیر متنازع شخصیت تھے۔

بے مثال خطابت کی وجہ سے محبوب خلائق تھے تواضع عاجزی انکساری خاکساری ان کی خمیر میں تھا نسبی وروحانی شرافت کی وجہ سے علماء کے محبوب تھے۔ وہ دنیا سے چلے گئے مگر اپنے اخلاف میں صلبی اولاد کے علاوہ لاکھوں سے متجاوز تلامذہ مریدین خلفاء چھوڑ گئے حق تعالی حضرت مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور جملہ پس ماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائے۔ آمین

............❖............

مولانا محمد ابراہیم قاسمی، مدرسہ ناشر العلوم پانڈولی ضلع سہارنپور:

مخدومنا المکرّم حضرت استاذنا المحترم جناب مولانا محمد سالم صاحب زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید کہ مزاج گرامی بعافیت ہوں گے۔ افسوس صد افسوس آج ڈیڑھ بجے شام حضرت سیدی ومرشدی قبلہ، محترم حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی اچانک خبر اس دارفانی سے دار بقاء کی طرف چلے جانے کی ملی یہ خبر سنتے ہی زمین پیر تلے سے نکل گئی اور آنکھ سے آنسوؤں کا قطرہ موجزن ہوکر بے تحاشہ جاری ہونے لگے۔ عالم اسلام کا منور وروشن چراغ آہ آج ہمیشہ کیلئے گُل ہوگیا ایسا حلیم الطبع ومتحمل المزاج شخص ہم نا اہلوں کو چھوڑکر اپنے رب حقیقی سے جاملا یہ خبر ملنے کے بعد فی الوقت جتنے طلباء مدرسہ میں موجود تھے قرآن شریف پڑھوا کر حضرت مرحوم کیلئے ایصال ثواب کرا کر پسماندگان کیلئے صبر جمیل کی دعاء کرادی گئی۔ اللہ رب العزت حضرت مرحوم کی مغفرت فرما کر اعلیٰ علیین میں ہمیشہ ہمیش کیلئے جگہ عطاء فرماوے۔ آمین ثم آمین

............❖............

مولانا محمد اقبال قاسمی، خادم مدرسہ اسلامیہ احسن العلوم، موضع جڑودہ ڈاکخانہ خاص ضلع میرٹھ، یوپی:

گرامی قدر جناب حضرت مولانا محمد سالم صاحب زید مجدکم سلام مسنون

بخدمت اقدس: عرض خدمت اقدس یہ ہے کہ اچانک حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ وبرکاتہٗ کی وفات حسرت آیات کی خبر سنی قلب وجگر کو پارہ پارہ کر دیا آپ کی وفات پورے عالم کی وفات ہے، ہم آپ کے اس انتہائی رنج وغم میں برابر کے شریک ہیں خداوند تعالی آپ کو اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے آمین!

ہم جملہ اہلیان بستی نے قرآن پاک ختم کرا کر حضرتؒ کو ایصال ثواب کر دیا ہے، خدا کرے کہ آپ کے مزاج عالی بخیر ہوں دعا کی درخواست ہے۔

............❖............

معاذ الاسلام صاحب، دیپا سرائے، سنبھل، ضلع مراد آباد:

مخدومی حضرت مولانا محمد سالم صاحب زیدت معالیکم　　　　سلام مسنون

حضرت اقدسؒ کی وفات حسرت آیات کی اطلاع اگرچہ ریڈیو وغیرہ پر دن میں ہی آ چکی تھی مگر مجھے بعد المغرب اطلاع ہوئی۔ تدفین میں عدم شرکت کا بڑا افسوس ہے۔

حضرت اقدسؒ کی رحلت ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک عہد اور دار العلوم کی صد سالہ تاریخ کا خاتمہ ہے۔ حضرت کی جدائی ہم سب کے لئے ایک عظیم اور نا قابل تلافی سانحہ ہے۔

علم و عمل حقائق و معارف کا عدیم المثال ایک جامع اور آخری آفتاب تھا جو سرزمین دیوبند میں ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا۔ حضرتؒ کی جدائی سے جو زخم لگے ہیں اس سے صرف آپ کے نہیں بلکہ ہم سب خدام کے قلوب زخمی ہیں یہ صرف آپ کا غم نہیں بلکہ پوری ملت وقوم کا غم ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطاء فرمائے اور ہم سب کو حضرت کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ حضرت کیلئے قرآن پاک کا ختم کرایا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطاء فرمائے۔

............❖............

این ایچ جعفری صاحب، ڈپارٹمنٹ، جامعہ ملیہ، دہلی:

محبی ومکرمی برادرم اعظم صاحب

حضرت قبلہؒ کے انتقال کی خبر اخبار میں دیکھی۔ پروردگار ان کے ساتھ بہترین معاملہ کرے اور صدیقین اور شہدا کے ساتھ انکو روز حساب اٹھائے۔ ان کے دنیا سے اٹھ جانے کے ساتھ ایک عظیم روایت ختم ہوئی اور پورا ایک عہد تمام ہوا۔ اس وقت جبکہ پوری دنیا ایک بڑے عالم اور عہد ساز شخصیت کے دنیا سے رخصت ہونے کا ماتم کر رہی ہے، میں آپ سے کسی طرح تعزیت کروں؟ آپ کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا، میرے خیال میں کوئی بھی غم اس سے بڑا نہیں ہوسکتا۔ میں اس غم کو اسی حد تک محسوس کرسکتا ہوں۔ چونکہ میں غم کی اس منزل سے گزر چکا ہوں۔ جیسے کوئی بہت گھنا اور سایہ دار درخت ایکبارگی ٹوٹ کر گرے اور ہم اپنے آپ کو دھوپ میں کھڑا پائیں یا جیسے کسی گھر کی چھت گر پڑے اور دیواریں ننگی نظر آئیں لیکن شاید کوئی بھی مثال اس غم کی کیفیت کو بیان نہیں کرسکتی۔

میں نے اپنی زندگی میں اتنا خوبصورت انسان نہیں دیکھا جیسا کہ آپ کے نامور والد ماجدؒ تھے۔ اس قدر نرم خو اور اخلاق کریمانہ کے پیکر۔ مجھے آپ کے طفیل کئی بار ان کے ساتھ شریک طعام ہونے کا موقعہ ملا اور انکی مجلس میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔ لگتا تھا کہ کسی شیشے کے گھر میں بیٹھا ہوں جہاں تیز ہوا کا چلنا بھی گستاخی کے مترادف ہوگا۔ کچھ خنکی اور چاندنی اور شبنم کی ملی جلی کیفیت سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اس عہد کے لئے پیدا نہیں کئے گئے تھے جس آب و گل سے ان کو بنایا گیا تھا اسکی خوشبو اس دنیا کی نہ تھی۔ جشن صد سالہ کے بعد دارالعلوم میں جو ہوا اس دور کے مزاج کے مطابق تھا۔ سازش، ڈھونگ، مذہبی جذبات کا استحصال، رعونت اور آخر میں شب خون۔ لیکن ان سب چیزوں سے زیادہ افسوسناک اور عبرت انگیز اور شرمناک وہ واقعہ تھا جس دن ہندوستان کے ائمہ اور مشائخ اور علماء نے لکھنؤ میں بیٹھ کر ایک اٹھاسی سالہ بوڑھے کو مہتمم کے عہدہ سے برطرف کیا۔

پروردگار آپ کو اور مولانا محمد سالم صاحب کو اور مولانا محمد اسلم صاحب کو صبر دے بعدہٗ عائشہ صاحبہ بھی اس سانحہ سے بے انتہاء متاثر ہوں گی۔ ان کو اور احمد فرید سلمہٗ کو بھی اللہ صبر کی تلقین دے۔

............❖............

وحیدالدین ملک صاحب، وائس چانسلر یونیورسٹی آف کشمیر سری نگر، واختر ملک:

محترم المقام جناب غازی صاحب و بہن نازلی صاحبہ!

پرسوں ٹی وی اور ریڈیو پر معزز و محترم بزرگوار جناب مولانا محمد طیب صاحبؒ کے انتقال پرملال کی خبر سن کر بے حد صدمہ ہوا خداوند کریم مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ آمین!

وہ آپ ہی کے نہیں ہمارے بھی بزرگوار محترم تھے اور مدینہ منزل کی وساطت سے ہم بھی ان کے اتنے ہی معتقدین میں سے تھے جتنے کہ مرحوم مولوی مجید حسن صاحب۔

آپ لوگوں پر جو صدمہ جانکاہ گزر گیا، اسکا اندازہ تو نہیں کیا جاسکتا لیکن پھر بھی اس حادثہ فاجعہ میں ہم دونوں آپ لوگوں کے برابر کے شریک ہیں اور خداوند کریم سے دست بدعا ہیں کہ آپ سب پسماندگان کو صبر جمیل اور مرحوم کو جنت الفردوس عطا ہو، آمین نیز دینی علوم کے میدان میں جو بھاری خلاء پیدا ہو گیا ہے اس کو پُر کرنے کیلئے جلد کوئی دوسرا نعم البدل عطاء فرمائے۔ آمین۔

............❖............

بدرالدین صاحب، لکچرار عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی:

برادر محترم جناب مولانا محمد اسلم رمزی قاسمی   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

۱۷ر جولائی ۸۳ء کو عید کے بعد میں مرادآباد سے دہلی واپس پہنچا تو سہ پہر میں حضرت مہتمم صاحب مرحوم ومغفور کی وفات حسرت آیات کی خبر ملی، دل میں فوراً یہی خیال آیا، افسوس یہ ایک عالم دین کی یا ایک بزرگ کے وصال کی اطلاع نہیں ہے بلکہ ہندوستان، ایشیاء اور عالم اسلام کے ایک لاثانی مقرر کی رحلت کی خبر ہے جس کے بعد اب ایشیاء ایک متبحر عالم ایک بے مثال خطیب اور حکیم الاسلامؒ سے یکسر خالی ہو چکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم کو جو شہرت اور عظمت حضرت مہتمم صاحبؒ سے حاصل ہوئی وہ اس سے قبل کبھی بھی نہ تھی۔ آج حضرت مرحوم کی رحلت سے صرف آپ لوگ ایک مشفق باپ کی سرپرستی سے محروم نہیں ہوئے ہم سب ہی اپنے روحانی مربی سے محروم ہو گئے ہیں۔ مگر یہ دن تو سب کے لئے ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق بخشے اور حضرت مرحوم کا نعم البدل عطا فرمائے۔

برادر بزگوار حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب کی خدمت میں بھی عریضہ ارسال کر رہا ہوں اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس جانکاہ حادثہ سے جو ہم سب کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے وہ سب ہی کے لئے ایک دوسرے سے تعزیت کرنے کا متقاضی ہے۔ اللہ تعالی مرحوم ومغفور کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا کرے۔ آمین

............❖............

مولانا ذوالفقار احمد صاحب، مہتمم دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر ضلع سورت گجرات:

محترمی ومکرمی حضرت مولانا محمد سالم صاحب دامت فیوضکم سلام مسنون!

۱۸/ جولائی کو ریڈیو اور اخبارات کے ذریعہ برکت العصر فخر الاماثل بقیۃ السلف حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کی المناک خبر ملی، ہر شخص غم میں ڈوبا ہوا نظر آنے لگا، مرحوم کا سانحہ ارتحال کسی ایک خاندان اور گھرانے کا صدمہ نہیں ہے بلکہ پوری مسلم قوم کا صدمہ ہے ایک عالم کی موت عالم کی موت ہے خداوند قدوس نے مغفور کو جن کمالات اور خصوصیات سے نوازا تھا ایسی ہستیاں قرنوں میں پیدا ہوتی ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدور پیدا

مرحوم نے زندگی بھر اسلام کی جس حکیمانہ انداز میں ترجمانی فرمائی اور دارالعلوم جیسے دینی ادارے کی جو نصف صدی سے زیادہ خدمت کی اسکا حقیقی صلہ دنیا کیا دے گی اس کا صلہ تو خداوند قدوس ہی عطا فرمائیں گے۔ انشاء اللہ

ہم اس موقع پر آپ کو کیا تسلی دیں در حقیقت آج ہر دیندار مسلمان انکی جدائی پر تسلی کا محتاج ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اعلیٰ مراتب سے نوازے دارالعلوم فلاح دارین کے طلبہ، مدرسین وکارکنان نے مدرسہ کھلتے ہی آج قرآن مجید پڑھ کر ایصال ثواب کیا اور تعزیتی تجویز پاس کی اور دعائے مغفرت مانگی، مرحوم کو دارالعلوم فلاح دارین کے ساتھ خصوصی لگاؤ اور محبت تھی اسکو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

ہم اس موقع پر آپکے غم میں برابر کے شریک ہیں ہماری طرف سے اپنے سب ہی بھائی بہنوں کی تعزیت کرنے کی درخواست ہے۔

ترکیسر کی جامع مسجد میں عوام کی طرف سے بھی ایک تعزیتی اجلاس کیا گیا اور دعائے مغفرت کی گئی۔

............❖............

احتشام بن حسن صاحب، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ:

برادر اعظم صاحب سلام مسنون

محترم والد صاحبؒ کے ارتحال کی خبر اچانک ملی، بے حد افسوس و ملال ہوا، انکی ذات والا صفات ہم سب کیلئے ایک مشفق، بزرگ اور سرپرست کی تھی۔ اللہ تعالی ان کو عالی درجات سے نوازے، آمین۔ انھوں نے ساری زندگی تبلیغ اسلام اور خدمت دین کا اہم فریضہ انجام دیا عالم اسلام میں انکی عظمت، شہرت اور علمیت ایک مسلمہ حقیقت ہے ساری زندگی تعمیری امور انجام دیتے رہے یقیناً وہ دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران رہے آپ کو ان کی جدائی کا جو صدمہ ہوا ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے اس غم کے موقع پر مجھے بھی اپنا شریک غم کرلیں، خدا حافظ۔

............❖............

ناظم جامعہ اسلامیہ بھٹکل:

مکرم جناب مولانا محمد سالم صاحب و برادران دیو بند السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے انتقال پرملال پر اہلیان بھٹکل نہایت محزون ہیں، حضرت حکیم الاسلامؒ کی وفات حسرت آیات پر جامعہ اسلامیہ بھٹکل نے بھی بڑا درد و تکلیف محسوس کیا یہ خبر آتے ہی پہلے جمعہ کو شہر کی چاروں جامع مسجدوں میں جمعہ کی نماز کے بعد غائبانہ نماز جنازہ پڑھی گئی اور عصر بعد جامع مسجد قدیم بھٹکل میں مرحوم کی ایصال ثواب کیلئے قرآن خوانی ہوئی اور دعائیں کی گئیں۔

جامعہ اسلامیہ بھٹکل کی مجلس شوری کا یہ اجلاس مفکر اسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے انتقال پرملال پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے حضرت مولاناؒ نصف صدی سے زیادہ کا حصہ اسلام کے ایک زبردست خادم عالم دین کے شیدائی اور ایک مجاہد کی حیثیت سے گذارا، ایشیاء کی سب سے بڑی دینی یونیورسٹی دارالعلوم دیو بند بحثیت مہتمم کے آپ کا علم آپ کی فراست اور آپ کی خدمت حاصل تھی آپ علم دین کے ایک بے مثال خادم تھے آپ کی ذات گرامی لاکھوں انسانوں کیلئے رشد و ہدایت کا ذریعہ بنی رہی بھٹکل اور اہلیان بھٹکل سے بھی آپ کا گہرا لگاؤ تھا آپ اپنی زندگی میں دو مرتبہ بھٹکل تشریف لا کر دو ہفتے گزارے ہیں اور آپ کے خیر و برکت علم دین کا پرتو آج بھی بھٹکل میں موجود ہے حقیقت یہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی اور زندگی کے ساتھ اسلام کی قدریں اور علم دین کی شمعیں روشن تھیں اللہ مسلمانوں کو حضرت مولاناؒ کا بدل عطا کرے آمین۔ حق تعالی سے دعا ہے کہ اللہ تعالی مولانا مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں داخل فرما کر جنت الفردوس کا اعلی مقام عطا فرمائے آپ کی لغزشوں کو درگزر فرمائے اور دنیا میں آپ کے فیض کو عام کرے۔

جامعہ کا یہ اجلاس حضرت مولانا مرحوم کے خاندان کے ایک ایک فرد اور دارالعلوم دیو بند سے اپنی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور یقین دلاتا ہے کہ مولانا مرحوم کے جدائی کے غم میں جامعہ اسلامیہ کا ایک ایک رکن شریک ہے، اللہ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے

............❖............

سید محمد صدر الحق، مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ:

مورخہ ۲۴؍جولائی ۱۹۸۳ء مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے حال میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے سانحہ ارتحال پر ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت مولانا سید محمد صدر الحق صاحب پرنسپل مدرسہ منعقد ہوا قاری محمد اکرم حسین کی تلاوت کلام پاک سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کا انتقال ''موت العالم موت العالم'' کے مصداق ہے انکی وفات کی وجہ سے عالم اسلام میں ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند عالم اسلام کے ایک متبحر عالم، مفکر، خطیب، حکیم، عظیم مصنف اور منارہ رشد و ہدایت تھے۔ وہ حضرت نانوتویؒ کے فلسفہ اور حضرت تھانویؒ کے دعوت وارشاد دونوں ہی کے جامع تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے ازہر الہند دارالعلوم دیوبند کو بام عروج پر پہنچایا۔ یہ ان کے دور اہتمام کا روشن کارنامہ ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ جید عالم زہد وتقویٰ اور رشد و ہدایت دونوں ہی کے جامع تھے انکی زندگی مکمل تاریخ ہے وہ تاریخ اسلام میں ایک عظیم شخصیت کے حامل تھے یہی نہیں بلکہ وہ تاریخ عالم اسلام کے ایک گوہر نایاب تھے ان کے تذکرہ کے بغیر تاریخ عالم اسلامی کا ایک باب نامکمل ہے دعا ہے اللہ ہمیں بدل عطا کرے اور ان کے درجات بلند کرے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل اور ازہر الہند دارالعلوم دیوبند کو ر کاوٹ سے محفوظ رکھے اور شب و روز اس کی ترقی عطا کرے۔

............❖............

مولانا موسیٰ آدم صاحب، مہتمم مدرسہ سراج العلوم مقام مٹواڑ، پوسٹ کھاریل وایا نوساری ضلع بلساڑ گجرات:

محترم ومکرم استاذ حدیث وواعظ وقت حضرت مولانا محمد سالم صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون! خدمت اقدس میں عرض یہ ہے کہ ہم لوگ یہاں پر خیر وعافیت سے ہیں اور آنجناب کے مزاج عالی بھی بخیر ہوں گے دیگر عرض یہ ہے کہ چند روز پہلے ہم کو ایک خبر نے بے انتہا حسرت میں ڈال دیا اور افسوس اور غموں کے دریا میں ڈبو دیا اور وہ خبر ہے حکیم الاسلام فخر الاماثل مہتمم دار العلوم حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا اس در فانی سے دار بقاء کی جانب تشریف لے جانا اور ان کے اس دنیا سے تشریف لے جانے سے سارے عالم کے احساس رکھنے والے انسانوں کو افسوس ہوا ہوگا کیونکہ حضرت کی خدمت اور حضرت کا فیض شرق وغرب میں پھیلا ہوا ہے اس خبر سے ہم کو بھی بہت زیادہ افسوس ہوا اور ہم مدرسہ سراج العلوم کے اراکین وطلباء نے مل کر ختم کلام پاک کر کے ایصال ثواب کیا اور دعا کی کہ خدا موصوف کی قبر کو نور سے منور فرمائے اور موصوف کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے آمین یارب العالمین۔

............❖............

مولانا محمد عمر صاحب، نائب مہتمم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد:

مکرم ومحترم جناب حضرت مولانا سالم صاحب دامت فیوضہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ کل بعد نماز ظہر حضرت مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ وبرد اللہ مضجعہٗ کی وفات حسرت آیات کی خبر ملی۔ فوراً ہی طلباء اور اساتذہ اور شہری حضرات نے مل کر قرآن کریم کی تلاوت کے بعد ایصال ثواب کیا اور حضرت مولانا عبدالجبار صاحب مدظلہ شیخ الحدیث مدرسہ شاہی نے حضرت والد محترمؒ کے مختصر حالات وکمالات بیان کیے اس کے بعد دعاء مغفرت کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ کل صبح آٹھ بجے قرآن خوانی کے بعد ایصال ثواب کیا جائے گا اور جلسہ تعزیت ہوگا چنانچہ آج وقت مقررہ پر تلاوت کے بعد ایصال ثواب اور دعاء مغفرت کی گئی اور جلسہ تعزیت ہوا یہ حادثہ آپ اور ہم سب متوسلین کے لئے بڑا ہے اللہ تعالیٰ آپ اور ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے اور حضرت موصوف کو اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے دعوات صالحہ میں فراموش نہ فرمائیں۔

............❖............

مولانا ابوالقاسم نعمانی، بنارس

بنارس ۱۸؍جولائی آج بعد نماز عشاء محمود منزل مدن پورہ میں انجمن محمود المدارس (جامعہ اسلامیہ) مدن پورہ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے جلسہ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ کی وفات پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے مختلف مقررین نے موصوف کی تبحر علمی ذکاوت وذہانت تقویٰ وطہارت تواضع وانکساری اور تقریر وتحریر نیز درس وتدریس کے ذریعہ دین وملت کی خدمات کا ذکر جمیل کیا اور ان کو خراج عقدت پیش کیا۔

جلسہ کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا اور اختتام دعائے مغفرت اور ایصال ثواب پر، آخر میں ایک تعزیتی تجویز پیش کی گئی جو بالاتفاق منظور ہوئی۔

تجویز کا متن درج ذیل ہے۔

تجویز انجمن محمود المدارس (جامعہ اسلامیہ) مدن پورہ وارانسی کا یہ تعزیتی جلسہ حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ کے سانحہ ارتحال پر اپنے قلبی غمناک تأثر کا اظہار کرتا ہے۔

جلسہ حضرت مرحوم کی طویل ترین دینی ملی خدمات کا بالعموم اور دار العلوم دیوبند کے مسند اہتمام کے تعلق سے موصوف کی نمایاں کارکردگی کا بالخصوص اعتراف کرتا ہے،

جلسہ موصوف کے انتقال کو پوری ملت اسلامیہ ہند وپاک کے لئے اور خصوصا منتسبین دار العلوم دیوبند کے لئے عظیم اور ناقابل تلافی سانحہ قرار دیتا ہے۔

یہ جلسہ مرحوم کے جملہ اہل خانہ متعلقین منتسبین اور تلامذہ کی خدمت میں جذبات تعزیت پیش کرتا ہے اور بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہے کہ مولائے کریم مرحوم کو انکی خدمات کا اجر جزیل مرحمت فرمائے اور خصوصی رحمت اور مغفرت سے نوازے۔

............❖............

مولانا محمد ازہر صاحب، مہتمم مدرسہ حسینیہ، حسین آباد کڈرو رانچی بہار:

محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بحمد للہ بعافیت ہوں۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا حادثہ جانکاہ حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی رحلت کی خبر ممبئی میں ملی دل پر بڑا گہرا صدمہ ہوا سننے کے بعد چند لمحے تک ذہن سن سا ہوکر رہ گیا تھا۔ میں نے اسی وقت تہیہ کرلیا تھا کہ مدرسہ پہنچ کر تعزیتی جلسہ اور تمام طلبہ واساتذہ سے مل کر ختم کلام پاک اور دعاء مغفرت اور ایصال ثواب کروں گا۔ ۱۸رشوال کو مدرسہ آیا داخلہ شروع ہوگیا اب ۲۹رشوال ۱۴۰۳ھ کو مدرسہ میں قرآن خوانی ہوئی تقریبا ایک سودو ختم کلام پاک پڑھے گئے پھر تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا مرحوم کی روح پاک کو ایصال ثواب اور دعاء مغفرت کی اللہ تعالی قبول فرمائے آمین ثم آمین۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کی بال بال مغفرت فرمائے انکی قبر کو اپنے انوار سے بھر دے جوار رحمت میں جگہ دے۔ حضرت آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب نصیب فرمائے۔ پسماندگان کو خصوصا سارے عالم عموما صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ ان کے مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے۔ آپ کو آپ کے متعلقین کو مرحوم ومغفور کے حق صدقہ جاریہ بنائے آمین ثم آمین۔

ہم تمام لوگ آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ پرسان احوال ودیگر متعلقین اور بچوں سے سلام مسنون عرض ہے اور دعاء کی درخواست ہے۔

............❖............

اولاد واحفاد

حضرت حکیم الاسلامؒ

حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہٗ	مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی مدظلہٗ	جناب حافظ محمد عاصم قاسمیؒ	جناب ڈاکٹر پروفیسر محمد اعظم قاسمی
جناب محمد سلمان قاسمی	مولانا محمد فاروق قاسمی		جناب احمد فرید قاسمی
مولانا محمد سفیان قاسمی	محمد ہشام قاسمی		جناب قاسم رشید صاحب
جناب محمد عدنان قاسمی			
جناب حافظ محمد عاصم قاسمی			

(۱) حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہٗ

ولادت ۲۲؍ جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ مطابق ۸؍ جنوری ۱۹۲۶ء بروز جمعہ۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی نگرانی وتربیت میں پرورش پائی۔ ۱۳۵۱ء میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ ناظرہ وحفظ قرآن کریم کی تکمیل جناب پیر جی شریف صاحب گنگوہی کے یہاں ہوئی۔ فارسی کا چار سالہ نصاب مکمل کیا، آپ کے فارسی کے اساتذہ میں خلیفہ عاقل صاحبؒ، مولانا ظہیر صاحبؒ، مولانا سید حسن صاحبؒ۔ ۱۳۶۲ھ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی زبانِ مبارک سے میزان پڑھی، یہ عظیم سعادت اس وقت پوری دنیا میں آپ ہی کو حاصل ہے، آپ کے علاوہ حکیم الامتؒ کے تلامذہ میں کوئی موجود نہیں ہے۔ علوم فنون کی کتابوں میں کنز الدقائق حضرت مولانا سید اختر حسین میاں صاحبؒ سے، میبذی قاری اصغر صاحبؒ سے، مختصر المعانی وسلّم العلوم حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ سے، ہدایہ حضرت مولانا عبدالاحد صاحبؒ سے پڑھی۔ آپ نے ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۸ء میں فراغت حاصل کی۔ آپ کے دورۂ حدیث شریف کے اساتذہ میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ،

جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا ابراہیم صاحب بلیاویؒ، حضرت مولانا سید فخر الحسن صاحبؒ ہیں۔

فراغت کے فوراً بعد ہی دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس تقرر ہوا۔ ابتداءً نور الایضاح، ترجمۂ قرآن کریم زیر درس رہا، بعد میں بخاری شریف، ابوداؤد شریف، مشکوٰۃ شریف، ہدایہ، شرح عقائد وغیرہ آپ سے متعلق رہیں اور اس وقت بخاری شریف میں آپ سے استفادہ جاری ہے۔

آپ جملہ علوم وفنون میں ممتاز صلاحیتوں کے مالک، بالغ نظر، بلند فکر اور اعلم بہ زمانہ متصف رہے۔ علوم قاسمی کی تشریح وتفہیم میں حکیم الاسلامؒ کے بعد شاید ہی آپ کا کوئی ہم پلّہ ہو۔ ہمیشہ علمی کاموں کے محرک رہے۔ زمانۂ تدریس میں دارالعلوم دیوبند ایک تحقیقی شعبہ مرکز المعارف کا قیام عمل میں آیا اور اس کے ذمہ دار بنائے گئے۔ ۱۹۶۶ء میں مراسلاتی طریقۂ تعلیم کی بنیاد پر اسلامی علوم ومعارف کو جدید جامعات میں مصروف تعلیم طلباء وطالبات کے لئے آسان وقابل حصول بنانے کی غرض سے جامعہ دینیات دیوبند قائم فرمایا جو کہ اس دور کا جدید ترین طریقۂ تعلیم تھا۔ آپ نے قرآن کریم پر ایک خاص جہت سے کام کا آغاز کیا۔ افسوس کہ یہ عظیم فاضلانہ علمی کام شورشِ دارالعلوم کی نذر ہو گیا۔ آپ کے عالمانہ وحکیمانہ خطاب کا شہرہ عہد شباب ہی میں ملک کی سرحدوں کو پار کر کے یورپ اور عالم عرب میں پہنچ چکا تھا۔ علم میں گہرائی، فکر میں گیرائی، مطالعہ میں وسعت، مزاج میں شرافت اور باقاعدگی، زبان سے نکلا ہوا ہر جملہ فکر وبصیرت سے منور، حکمت وفلسفہ کے رنگ میں کتاب وسنت کی بے مثال تشریح وتفہیم کا ملکہ۔ مدلل اسلوب میں گفتگو، صائب الرائے، کذب، غیبت، عیاری اور چالاکی جیسے رائج الوقت امراض سے محفوظ، ماضی میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تاسیس میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے دستِ راست اور اس کے باوقار رکن، حال میں اُس کے سینئر نائب صدر، بہت سے ملّی اداروں، دینی مدرسوں کے سرپرست، طلبہ، اساتذہ علماء مشائخ، سب کے محترم، قیامِ دارالعلوم وقف دیوبند سے لے کر تا حال اس کے متفق علیہ مہتمم وسرپرست، مسند حدیث کی شان، اپنے عہد کی ایک معتبر، مسلّم اور پُرکشش دینی شخصیت۔ متعنا اللّٰہ بطول حیاتہٖ بالعافیة.

(۲) حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی مدظلہ، ولادت ۳/جون ۱۹۳۸ء

از اول تا آخر دارالعلوم دیوبند میں تعلیم وتربیت کے مراحل طے ہوئے۔ ناظرہ قرآن جناب قاری محمد کامل صاحبؒ کے یہاں مکمل ہوا۔ فارسی کا چار سالہ نصاب مولانا بشیر صاحب دیوبندیؒ، مولانا مشفع صاحب دیوبندیؒ، مولانا ظہیر صاحبؒ دیوبندی۔

عربی درجات کے اساتذہ میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحبؒ، حضرت مولانا سید فخر الدین

صاحبؒ مرادآبادی، حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہٗ، حضرت مولانا نعیم صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا نصیراحمد خاں صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالاحد صاحبؒ دیوبندی قابل ذکر ہیں۔

۱۹۵۹ء میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی اور ۱۹۶۹ء میں دارالعلوم دیوبند میں تقرر ہوا اور مختلف انتظامی شعبوں سے وابستہ رہے۔ اس عرصہ میں آپ نے تفسیر کبیر للرازی کے ترجمہ کا کام شروع کیا جس کے ابتدائی کچھ پاروں کی تفسیر منظر عام پر آئی، جو اپنے آپ میں ایک معیاری خدمت ہے۔ سیرت حلبیہ کا مکمل ترجمہ سیرت پاک کے نام سے سیرت کے موضوع پر ایک اہم مجموعہ۔ آپ کے قلم سے نکلا۔ آپ بے مثال خطیب، انفرادی شان کے مدرس، بلند پایہ مصنف، سحر طراز صاحب قلم و ادیب، بلند فکر شاعر، کثیر المطالعہ قدیم اور جدید کے پختہ عالم، گوناگوں صلاحیتوں کے حامل، خاموش طبیعت، متین، پروقار اور بردبار، یورپی ممالک میں حکیم الاسلامؒ کے رفیق سفر اور حکیمانہ خطاب کے ترجمان، اجلاسِ صدسالہ کے ناظم وروحِ رواں، دارالعلوم وقف دیوبند کے محدث، صدرالمدرسین اور ناظم مجلس تعلیمی، اپنی بے مثال خطابت کے حوالے سے ملک وبیرونِ ملک مقبول ومشہور شخصیت، اطال اللّٰہ حیاتہٗ بالعافیۃ .

جناب ڈاکٹر محمد اعظم صاحب قاسمی

ذی علم، صاحبِ بصیرت، ان کا چہرہ شائستگی، وقار اور علمی عظمت کا گواہ، سیرت واخلاق خاندانی شرافتوں کا نمائندہ، اسلامیات میں گہرے علوم کے ساتھ عصری علوم سے آگاہ۔ انگریزی میں عبور حاصل، حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کی فکر کے ایک خاص گوشے پر فاضلانہ مقالے سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور پھر وہیں شعبہ اسلامیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ تاحال مستقل اقامت علی گڑھ ہی میں ہے۔ بڑے فاضل، صاحبِ فکر اور رنگارنگ خوبیوں کے انسان۔

مولانا محمد سفیان قاسمی

صحیح معنیٰ میں اپنے والد مکرم کے خلف الرشید، دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کے بعد جامعہ ازہر مصر سے علومِ شرعیہ میں نمایاں حیثیت سے کامیابی حاصل کی۔ دینی علوم میں امتیازی صلاحیتوں کے ساتھ عصری علوم میں طاق، ماضی میں جامعہ دینیات جیسے معتبر ادارہ کے ذمہ دار، ذہانت، فراست، ذوقِ مطالعہ اور عالمانہ بذلہ سنجی میں خانوادۂ قاسمی کے فردِ جلیل۔ دارالعلوم وقف دیوبند کے قیام سے لے کر اب تک تدریسی خدمات کے ساتھ اہم انتظامی امور سے وابستہ۔ جوان ہمت، بلند حوصلہ، وسیع الظرف، شریف النفس،

نستعلیق، باوقار، خاندانی روایتوں کے حامل اور بے شمار خوبیوں سے آراستہ، اس وقت دارالعلوم وقف دیوبند کے نیابت اہتمام کے منصب پر فائز اور ادارہ کی ہمہ جہت تعلیمی و تعمیری ترقی کے لئے سرگرم عمل، موصوف کی شبانہ روز مساعی اور انتظامی حکمت عملیوں کے نتیجے میں دارالعلوم وقف دیوبند الحمد للہ ہر طرح سے مستحکم اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اطال اللّٰہ حیاتہٗ و ایدہٗ بنصرہٖ.

مولانا محمد فاروق قاسمی

دارالعلوم وقف دیوبند کے باصلاحیت مدرّس، نیک نہاد، سنجیدہ مزاج اور باوقار عالم، بچپن میں جدامجد حضرت حکیم الاسلامؒ سے خوب استفادہ کیا۔ ''معارف حکیم الاسلامؒ'' کے نام سے ایک مجموعہ موصوف ہی کی محنت سے منظر عام پر آچکا۔

فہرست خلفاء حضرت حکیم الاسلامؒ

- ...... حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہٗ مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند
- ...... مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب، سابق استاذ دارالعلوم دیوبند
- ...... علامہ رفیق احمد صاحبؒ بھیسانی
- ...... مولانا حکیم محمد اسلام صاحبؒ، مہتمم مدرسہ نورالاسلام، میرٹھ
- ...... مولانا معین الدین صاحب، صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ، بیڑ، دکن
- ...... مولانا انوارالحسن صاحبؒ مبلغ دارالعلوم دیوبند
- ...... مولانا حکیم عبدالقدوس صاحبؒ دیوبند
- ...... مولانا عبیداللہ صاحب، ناظم اعلیٰ جامعہ اشرفیہ، لاہور (پاکستان)
- ...... جناب صوفی عبدالرحمٰن صاحب، بمبئی
- ...... مولانا ابرار احمد صاحب، صدر مدرس مدرسہ ترکیسر، ضلع سورت، گجرات
- ...... مولانا محمد حامد صاحب صدیقی، پروفیسر عثمانیہ کالج، حیدرآباد، دکن
- ...... مولانا محمد زید صاحب، پروفیسر اسلامیہ کالج، لائل پور (پاکستان)
- ...... مولانا حفظ الکبیر صاحب، جلال آباد
- ...... مولانا عبدالحق صاحب قاسمی نواکھالی (بنگلہ دیش)

- ...... ابوبکر احمد صاحب، بمبئی
- ...... مولانا شیخ اخلاق احمد صاحب دیوبندی، مقیم کراچی (پاکستان)
- ...... جناب اسماعیل صاحب بزرگ مجاز صحبت، بمبئی
- ...... مولوی قاری حفظ الرحمٰن صاحب ابن قاری محمد شریف صاحب دیوبندی، مقیم دہلی
- ...... مولوی عبدالحق صاحب، سلہٹ، (بنگلہ دیش)
- ...... مولانا قمرالزماں صاحب بنگالی، خطیب جامع مسجد کرلا، بمبئی
- ...... مولانا یوسف شرقی صاحب، بنگلور
- ...... مولانا منصورالحق صاحب، بردوان
- ...... مولانا محمود صاحب گیورائی
- ...... مولانا انوارالحسن صاحب، بردوان
- ...... مولانا محمد عثمان میمن صاحب، کراچی (پاکستان)
- ...... جناب شیخ عبدالرحمٰن نورولی، مکہ مکرمہ
- ...... جناب محمد علی صاحب ایڈوکیٹ، حیدرآباد
- ...... مولانا عبدالقدوس حماد صاحب وارانسی
- ...... مولانا محمد زید صاحب، فیصل آباد (پاکستان)

تاسیسِ دارالعلوم وقف دیوبند

سقوط دارالعلوم کے بعد حکیم الاسلامؒ کے ساتھ طلبہ کی ایک بڑی تعداد اور قدیم ترین ملازمین جنہوں نے جوانی کے بہترین لمحات، جسمانی قوتیں اور ذہنی صلاحیتیں دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں صرف کی تھیں دارالعلوم سے باہر آگئیں۔ قدرت کو منظور تھا کہ دیوبند کی قدیم مرکزی جامع مسجد سے بھی قاسمیت کا وہ علمی فیضان جاری ہو جس کی حفاظت وصیانت کے لئے حکیم الاسلامؒ جاں گسل حوادث سے گذرے۔ حکیم الاسلامؒ کی ایماء پر ۱۹۸۳ء میں از اول تا دورہ حدیث شریف کی باضابطہ تعلیم کا آغاز ہوا اور ملازمین جامع مسجد کے حجروں میں بیٹھ کر دفتری امور کی انجام دہی میں مصروف ہوئے۔ خدائے علیم وخبیر ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ مرحلہ کتنا کٹھن اور مشکلات سے پر تھا۔ قدم قدم پر مسائل، وسائل ناپید، نہ درس گاہیں، نہ کتابیں، نہ چٹائیاں، نہ تپائیاں، دفاتر کے لئے کاغذ، نہ قلم، کوئی بھی چیز میسر نہ تھی۔

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم، فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا نعیم صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا خورشید عالم صاحب دیوبندیؒ جیسے فخر روزگار اساتذہ جن کی تدریس دارالعلوم دیوبند کا طرۂ امتیاز، علمی کمالات ضرب المثل اور شہرت و نیک نامی ہندوستان ہی میں نہیں پوری دنیا میں تھی اور دیوبندی مکتبہ فکر کے بیشتر نامور علماء مدارس اسلامیہ کے ذمہ داران اور ملی تنظیموں کے سربراہان کو ان کے شرف تلمذ پر ناز اور ان کی شخصیات پر ہمیشہ فخر رہا۔

دارالعلوم دیوبند کے ایسے قدیم الخدمت، مخلص اور تجربہ کار اساتذہ بے سروسامانی کے عالم میں دیوبند کی مرکزی جامع مسجد کے کھلے فرش پر بیٹھ کر خلوص وللّٰہیت اور شوق و ذوق سے درس دیتے جو دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کے جم غفیر کے درمیان ان کی پہچان بنا ہوا تھا۔ ان حضرات کے دل ودماغ میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ طلبہ کی ایک کثیر تعداد کے درمیان علم وحکمت کے موتی بکھیرنے والے چند لٹے پٹے غریب الوطن طلبہ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، جنہیں نہ ایک وقت کا کھانا نصیب، نہ سر چھپانے کی

جگہ میسر، نہ کتابوں کی سہولت، حتیٰ کہ زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے بھی کلیتاً محروم۔ ایک طویل عرصہ تک ایک کتاب میں کئی کئی طلبہ شریک ہوتے اور ہر قسم کی بے سروسامانی اور مشکلات کے باوجود اپنا سارا وقت تعلیم ومطالعہ میں صرف کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان طلبہ اور ان بے یار ومددگار ملازمین کے دل میں اخلاصِ نیت اور حکیم الاسلامؒ کے موقف اور شخصیت سے گہری محبت اور تعلق نہ ہوتا تو ایک لمحہ کے لئے بھی مشکلات کے اس طوفان کا مقابلہ نہ کرپاتے۔ اہل شہر میں سے چند مخلص احباب کی توجہ کے نتیجہ میں کچھ عرصہ کے بعد طلبہ کے کھانے کا کچھ سروسامان ہوا، شہر میں طلبہ کی رہائش کے لئے کرائے کے مکانات حاصل کئے گئے اور دیوبند کے کتب خانوں کی اعانت سے درسی کتابوں کی فراہمی بھی ہوئی۔

مولانا اسحاق صاحب مرحوم مالک کتب خانہ رحیمیہ اور مولانا شوکت صاحب مالک کتب خانہ ہاشمیہ نے درسی کتابوں کی فراہمی کے ساتھ ہر بار انعامیہ جلسوں کے موقع پر اچھے نمبرات حاصل کرنے والے طلبہ کی نقد انعامات سے حوصلہ افزائی فرمائی اور گراں قدر کتابوں سے بھی نوازتے رہے۔ علاوہ ازیں دیوبند کے تقریباً سبھی کتب خانہ والوں نے کتابوں کی فراہمی میں مخلصانہ تعاون دیا اور از روز اول تا حال ان کی ہمدردیاں دارالعلوم وقف دیوبند کے ساتھ وابستہ ہیں۔ دارالعلوم وقف دیوبند ان کا بیحد شکر گزار ہے۔

دارالعلوم وقف دیوبند کے قیام کے بعد متفقہ طور پر خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مہتمم، فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ صدر المدرسین وناظم مجلس تعلیمی، حضرت مولانا محمد نعیم صاحب دیوبندیؒ شیخ الحدیث اور حضرت مولانا خورشید عالم صاحب دیوبندیؒ نیابت اہتمام کے لئے مقرر ہوئے۔ ان ممتاز شخصیات کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے قدیم ونامور اساتذہ حضرت مولانا مفتی شکیل احمد صاحب سیتاپوری، حضرت مولانا خالد حسین بلیاوی، حضرت مولانا فیض الحسین صاحب کشمیری، مولانا محمد حسن باندوی، قاری سعید عالم صاحب تدریس کے کاموں میں مصروف رہے۔ مولانا مفتی شکیل احمد صاحب کچھ عرصہ کے بعد اپنے وطن میں کسی بڑے مدرسہ کے مہتمم ہوئے اور دارالعلوم وقف سے سلسلہ منقطع ہوگیا۔ مولانا خالد حسین بلیاوی پاکستان ہجرت کرگئے۔ اس کے بعد مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں بحیثیت شیخ الحدیث مقرر ہوئے اور تاحیات وہیں پر تدریس حدیث کی خدمت انجام دیتے رہے۔ مولانا فیض الحسین کشمیری قیام دارالعلوم وقف کے بعد دوسرے سال اپنے وطن میں انتقال کرگئے۔ اس طرح تین فائق الاستعداد اساتذہ کے چلے جانے سے ایک خلا پیدا ہوا مگر اللہ کی ذات بڑی کارساز ہے۔ اس کے بعد حضرت مولانا علامہ رفیق احمد بھیسانوی سابق شیخ الحدیث مفتاح العلوم جلال آباد، حضرت

مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی، مولانا محمد اسلام صاحب قاسمی، مولانا قمر عثمانی، مولانا محمد حنیف صاحب مظفرنگری، مولانا مفتی محمد واصف صاحب عثمانی سابق مبلغ دارالعلوم دیوبند، مولانا مفتی محمد عمران صاحب دیوبندی، مولانا محمد اسماعیل صاحب مدنی، مولانا اسماعیل خان دیوبندی، مفتی الیاس صاحب گونڈوی سابق رکن افتاء دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد سفیان قاسمی، مولانا سید احمد خضر شاہ کشمیری، ڈاکٹر مولانا انیس الاسلام قاسمی، مولانا غلام رسول کشمیری تدریسی خدمت کے لئے مقرر ہوئے۔ اس کے بعد مولانا غلام نبی صاحب کشمیری، مفتی انوار الحق صاحب دربھنگویؒ و دیگر نوجوان فضلاء تدریسی قافلہ میں شامل ہوئے۔

بخاری شریف کے اسباق حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی، حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا نعیم صاحب دیوبندیؒ، سے متعلق رہے جبکہ کچھ اسباق محدود وقت کے لئے حضرت مولانا رفیق احمد صاحبؒ سے بھی متعلق رہے۔ دارالافتاء کا شعبہ دارالعلوم دیوبند کے تجربہ کار مفتی حضرت مولانا سید احمد علی سعید صاحب کی سربراہی میں سرگرم عمل رہا۔ تکمیل ادب کے شعبہ کو مولانا محمد اسلام صاحب، شعبہ تجوید قاری سعید عالم صاحب، شعبۂ حفظ و ناظرہ جناب حافظ محمد انور صاحب دیوبندی، شعبۂ دینیات جناب ماسٹر موسیٰ صاحب، شعبۂ خوش خطی کو جناب منشی امتیاز صاحب کی نگرانی اور خدمات حاصل رہیں اور ان حضرات نے پوری لگن کے ساتھ معیار تعلیم کو بلند کیا۔

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم اور فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ انتظامی اور تدریسی خدمات کے ساتھ فراہمی سرمایا اور دارالعلوم وقف دیوبند کے مالی استحکام کے لئے سرگرم عمل بھی رہے۔ حکیم الاسلامؒ اور ان کی جماعت کے ساتھ ملک و بیرون ملک جو غلط فہمیاں پائی جارہی تھیں اور جس انداز سے پروپیگنڈہ کیا گیا تھا اس کی وجہ سے ابتداءً ان حضرات کو بڑی مشکلات کا سامنا رہا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کی مسلسل محنت، اخلاصِ نیت اور مسلکِ دیوبند کی حفاظت کے تئیں کمربستہ رہنے کی وجہ سے ان مشکلات کو سہولیات میں تبدیل فرما دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں حضرات نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے بعد جو مشکلات اٹھائیں، جن سختیوں کا سامنا کیا اور جو بے بنیاد تہمتیں اور الزامات اپنے سر لے کر دارالعلوم وقف کی نشو ونما، استحکام اور ترقی کے لئے حوصلہ دکھایا وہ ان حضرات کی اولوالعزمی اور عزیمت کا ایک روشن باب ہے اور انشاء اللہ آخرت میں ان حضرات کی یہ بے لوث خدمات اجر عظیم کا باعث ہوں گی۔

جن طلبہ نے ان روح فرسا ایام میں دارالعلوم وقف دیوبند سے کسب فیض کیا ان کے سامنے وہ تمام

واقعات اور حقائق جو طلب علم کی خاطر کتابوں میں درج ہیں اور انہیں پڑھ کر آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں روزِ روشن کی طرح عیاں ہوئے اور ان کی صداقت ان کے دلوں میں یقین بن کر اتر گئی۔
اداروں اور تحریکوں کی زندگی میں نشیب وفراز ضرور آتے ہیں، مگر وہ ادارے جو ایک مبنی بر حقیقت فکر کی اشاعت کے لئے سرگرم عمل ہوئے ہوں ان کے حصہ میں مشکلات کچھ زیادہ ہی آئی ہیں۔ دار العلوم وقف دیوبند اس سیاق وسباق میں ایک ادارہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک عالمی فکر کا ترجمان تھا تو ظاہر ہے کہ وہ تمام مشکلات اس کا مقدر بنیں جو انفرادی طور پر تحریکوں کا بنتی ہیں۔ بایں ہمہ ادارہ سے وابستہ جماعت نہ صرف ثابت قدم رہی بلکہ صبر واستقامت کے تابندہ نقوش صفحات دہر پر ثبت کئے۔

۹ رشعبان ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۸ء میں حضرت مولانا محمد نعیم صاحبؒ شیخ الحدیث دار العلوم وقف دیوبند طویل علالت کے بعد امریکہ میں انتقال کر گئے، حضرت مولانا مرحوم انتہائی باصلاحیت، تجربہ کار، امورِ تدریس کے ماہر، نظم وضبط کے پابند، کام کے دھنی، خاموش مزاج، بزرگانہ روایات کے حامل، خالص مدرس قسم کے انسان تھے، قیامِ دار العلوم وقف سے لے کر آخری وقت تک بخاری شریف اور ترمذی شریف کے اسباق آپ سے متعلق رہے اور کئی کئی گھنٹے ایک نشست پر بے تکان درس دیتے رہے۔ رجب کے مہینے میں طویل سے طویل اسباق کو مقررہ نصاب تک پہنچا دیتے۔ ہمیشہ کتاب پر نظر رہتی اور اپنے مخصوص انداز میں بڑی بڑی تفصیلات کو سمیٹ کر رکھ دیتے۔ درسی کتابوں کو درس کے انداز میں پڑھانے اور سہل وبامحاورہ ترجمہ اور تشریح میں قدرت نے ایک خاص ملکہ انہیں عطا فرمایا تھا۔ ان کے معیار تدریس سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ دار العلوم دیوبند جیسی عالمی دانش گاہ کے لئے کیسے مثالی اساتذہ کا انتخاب ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ کے لئے نظامتِ تعلیمات کے عہدہ پر بھی فائز رہے اور ان کے ذریعہ بڑی مفید اصلاحات وجود میں آئیں، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

حضرت مرحوم کی وفات سے دار العلوم وقف دیوبند ایک قد آور شخصیت کے فیضان سے محروم ہو گیا۔
حضرت مرحوم ومغفور کے بعد فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ حلقۂ دیوبند سے تعلق رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کو قدرت نے تدریس، تحریر، تقریر تینوں صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں اور تینوں میں اپنی مثال آپ تھے۔ دار العلوم دیوبند سے متعلق جو اسباق رہے ان کو جس آن بان اور شان کے ساتھ پڑھایا ان کے عہد زریں میں وہ دار العلوم دیوبند کی تاریخ کا ایک درخشاں باب رہا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں شاہ صاحبؒ سے متعلق دار العلوم دیوبند میں بخاری شریف، کتاب المغازی کا درس متعلق ہوا تو ان کے البیلے اندازِ تدریس، منفرد لب ولہجہ، کثرتِ معلومات اور بے نظیر

تحقیقات سے دورۂ حدیث کے طلبہ کے ساتھ دوسری جماعتوں کے طلبہ بھی محظوظ ہوتے اور واردین و صادرین بھی۔ قیامِ دارالعلوم وقف دیوبند کے بعد مرکزی جامع مسجد میں جب دورۂ حدیث میں درس دینے لگے تو خیال تھا کہ قضیۂ دارالعلوم کے زخموں سے چور حالات کی سنگینی سے رنجور اور بے سروسامانی کے عالم میں جامع مسجد کے فرش پر پڑے ہوئے ایک شکستہ دل قافلہ کا یہ فرد اپنی آب و تاب کھو چکا ہوگا اور شاید اس عندلیب خوش نوا کی وہ نغمہ سنجی حالات کی نظر ہو چکی ہوگی جو ہزاروں کے لئے سامعہ نواز ہوتی تھی مگر دیکھنے والوں نے دیکھا، اس نامانوس جگہ پر بھی چند ستم رسیدہ غریبانِ وطن کے سامنے اسی شان و شوکت سے بولتے اور علم و حکمت کے موتی رولتے رہے۔ کبھی اپنے لب و لہجہ اور اپنے شاہانہ انداز میں تبدیلی نہیں آنے دی، غیرت و حمیت کو داغ دار نہیں ہونے دیا، نازک سے نازک مرحلوں پر اور مشکل سے مشکل احوال میں اپنا بھرم قائم رکھا، لوگ دور دراز سے ان کے درسِ بخاری میں شریک ہوتے، خود طلبہ دارالعلوم کی ایک بڑی تعداد پابندی سے ان کے درس میں شریک ہوتی اور ان کے مخصوص اندازِ تدریس سے محظوظ ہوتی، اختتامِ سال پر ختم بخاری جس شان سے کراتے اور جتنا مجمع ان کے سامنے ہوتا اس کا تعلق دیکھنے سے ہوتا، ختم بخاری کا یہ مثالی انداز تا وفات قائم رہا۔ بے شک شاہ صاحبؒ حلقۂ دیوبند میں اپنی طرز کی ایک مثالی شخصیت تھے۔ ۱۹/ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ/۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء میں مختصر علالت کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ بَرَّدَ اللہ مضجعہٗ.

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات دارالعلوم وقف دیوبند کے لئے صحیح معنی میں ایک حادثۂ فاجعہ اور سانحۂ کبریٰ ثابت ہوئی، جس سے دارالعلوم وقف دیوبند کی نہیں، پوری علمی دنیا میں ایک ناقابل تلافی خسارہ محسوس کیا گیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے بعد دارالعلوم دیوبند کے قدیم ترین اور مایہ ناز استاذ حضرت مولانا خورشید عالم صاحبؒ شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ حضرت مولانا خورشید عالم صاحبؒ بڑے پختہ کار، سنجیدہ اور مثالی استاذ تھے۔ دارالعلوم میں بھی ان کی مقبولیت کا شہرہ رہا۔ دارالعلوم میں شرحِ عقائد اور مسلم شریف کے اسباق ان سے متعلق رہے اور نیابتِ تعلیمات کے منصب پر بھی فائز رہے۔ قضیۂ دارالعلوم کے بعد جامع مسجد میں دارالعلوم وقف کے نیابت اہتمام کے عہدہ پر فائز ہوئے اور طویل مدت تک بڑی خوش اسلوبی اور حسنِ تدبیر سے اپنی ذمہ داریوں کو انجام دیا۔ پریشان ملازمین جب ان سے الجھتے تو بڑی متانت اور بردباری سے کام لیتے، یہ کارکنوں کا دکھ درد بانٹنے، حوصلہ دینے اور جمائے رکھنے میں حضرت مولانا خورشید عالم صاحبؒ کا کردار کتنا نمایاں ہے اس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ مسلم شریف کا درس بھی

دیتے رہے، بچے تلے اور منظّم انداز میں بولتے، متعینہ وقت میں جتنا پڑھانا ہوتا اتنے ہی حصہ کی عبارت بھی پڑھواتے، ادھر مضمون ختم، اُدھر گھنٹہ تمام۔ مسلم شریف کا مقدمہ جتنا دقیق اور مشکل ہے اس کو اتنا ہی سہل اور خوشگوار انداز میں سمجھاتے۔ ایمانیات اور عقائد پر ان کی درسی تقریریں بڑی تحقیقی اور معیاری سمجھی جاتی تھیں۔ جسمانی عوارض کے باوجود تدریسی ذمہ داریوں کی پابندی ان کا ہمیشہ امتیاز رہا۔ ۱۴/ربیع الاوّل ۱۴۳۳ھ/۷/فروری ۲۰۱۱ء میں مختصر علالت کے بعد حضرت مولانا خورشید عالم صاحبؒ بھی اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ **اللهم اغفر وارحم۔**

حضرت شاہ صاحبؒ نظامتِ تعلیمات اور صدر المدرسین کے عہدے پر بھی فائز تھے، ان کی رحلت کے بعد نظامت تعلیمات اور صدارتِ تدریس کے منصب پر حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی دامت برکاتہم اور نیابت تعلیمات کے منصب پر حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کے فرزند جلیل مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی فائز ہوئے۔ دونوں حضرات گوناگوں علمی صلاحیتوں سے متمتع، ذہن و فراست سے بہرہ ور اور شرافتِ نفس کے پیکر۔ ان حضرات نے تدریسی خدمات کے ساتھ امور تعلیم کو احسن طریقہ سے انجام دیا۔ مولانا اسلم صاحب قاسمی کی شخصیت کئی پہلوؤں سے بے نظیر، آپ بہترین مدرس، مقبول مقرر، سنجیدہ اور صاحب طرز مصنف وادیب، ہر قسم کی معلومات کا خزانۂ عامرہ، قدیم وجدید علوم کے ماہر، صاحب فکر، خاموش طبیعت، سادہ مزاج اور متانت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تو مولانا سید احمد خضر شاہ صاحب اپنے جدِّ امجد حضرت علامہ کشمیریؒ کا مثنیٰ، سحر انگیز طرز تکلم اور خطابت میں اپنے والد گرامی کا عکس۔ شرافت ومروت میں خانوادۂ شاہی کی آبرو، خوش مزاجی وخوش اخلاقی اور خوش معاملگی میں اپنی مثال آپ۔

حضرت مولانا خورشید عالم صاحبؒ کی رحلت کے بعد مشیختِ حدیث کے منصب پر آپ کو فائز کیا گیا تو حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کے مثالی طرز پر ان کا درسِ بخاری طلبہ میں ان کی وجہ امتیاز اور ان کی خاص پہچان بنا ہوا ہے۔

۲۰۰۰ء میں جسمانی عوارض کی وجہ سے جب حضرت مولانا خورشید عالم صاحبؒ سبکدوش ہوئے تو صاحبزادہ خطیب الاسلام مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی نیابت اہتمام کے منصب پر باضابطہ فائز ہوئے۔ اس سے پہلے دار العلوم وقف دیوبند کی تاسیس میں مولانا موصوف اور مولانا سید احمد خضر شاہ صاحب کشمیری کا جو فعال کردار رہا وہ تاریخ دار العلوم وقف دیوبند کا ایک جلی باب ہے۔

وابستگی سے پہلے جامعہ دینیات، دیوبند جیسے عظیم الشان ادارہ کے ایک بیدار دماغ ذمہ دار رہ چکے

تھے۔ مولانا موصوف خانوادۂ قاسمی کے سنجیدہ، باصلاحیت اور صالح فکر فاضل ہونے کے ساتھ خاندانی بزرگوں کی علمی صحبتوں و خاص نہج پر علمی و اخلاقی تربیتوں سے مالا مال اور خداداد ذہن و فراست، انتظام و انصرام و معاملہ فہمی کے جوہر سے آراستہ ہونے کی وجہ سے دارالعلوم وقف دیوبند کے نیابت اہتمام کے منصب پر رہ کر دارالعلوم وقف دیوبند کی تعمیر و ترقی اور استحکام کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ ادارہ کو کئی نازک اور کٹھن مراحل سے نکالنے میں کامیاب ثابت ہوئے، ان کے نیابت اہتمام میں دارالعلوم وقف دیوبند نے تعلیم و تعمیر دونوں سطحوں پر نمایاں ترقی کی۔ ان کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں کارکنان کو بروقت مشاہرہ دیئے جانے کا ایک مضبوط نظام قائم ہوا، جب کہ اس سے پہلے صورت حال یکسر مختلف تھی۔ طلبہ کی امدادِ طعام کا عدد بڑھا، دفاتر کے نظم و ضبط میں بہتری، تنظیم و ترقی کی کارکردگی میں انضباط، مطبخ کے اخراجات اور بھاری بھرکم مصارف کی تکمیل کے لئے ملک و بیرونِ ملک پیہم اسفار، ان کے نیابتِ اہتمام کی برکات اور ان کے روشن کارناموں کا حصہ ہے۔

دارالعلوم وقف دیوبند کے مشکل حالات کے حوالے سے مفتی انوارالحق صاحبؒ قاسمی استاذ دارالعلوم وقف دیوبند کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مرحوم نے آڑے وقت میں ادارہ کی ہر خدمت انجام دی، خود کو ہر وقت ہر خدمت کے لئے وقف کئے رکھا۔ ایک بے ضرر، بے عذر، بے نفس، محنتی، کارگزار اور شریف النفس انسان تھے۔ شروع میں ابتدائی کتابوں کے ساتھ دارالافتاء اور سالِ ہفتم میں ہمیشہ سراجی کا درس دیا۔ سراجی میں انہیں اتنی مہارت حاصل تھی شاید آنکھیں بند کر کے بھی پڑھا لیتے۔ آخر میں ہدایہ آخرین اور ابوداؤد شریف جیسی اہم کتابیں ان سے متعلق رہیں۔ ۱۰؍صفر المظفر ۱۴۲۵ھ میں اچانک انتقال کر گئے۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات کو بلند فرمائے۔

۱۹؍جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ/۲۰؍فروری ۱۹۸۵ء میں مولانا عبدالحق غازی پوری انتقال کر گئے۔ مرحوم حکیم الاسلامؒ کے عہد اہتمام کے باوقار پیشکار اور معتقد و معتمد خاص تھے، بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ جب حکیم الاسلامؒ کا ذکر کرتے تو بے اختیار رو پڑتے اور بے حال ہو جاتے۔ ان کی رحلت کے بعد مولانا سید عبدالرؤف عالی پیشکار کے منصب پر فائز ہوئے اور پندرہ روزہ ندائے دارالعلوم کی ادارت کی ذمہ داریاں بھی ان کے سپرد رہیں۔ مولانا عبداللہ جاوید غازی پوری (فرزند مولانا عبدالحق صاحب پیشکار) اور مولانا نسیم اختر شاہ قیصر (فرزند مولانا سید ازہر شاہ قیصر، سابق مدیر رسالہ دارالعلوم دیوبند) ندائے دارالعلوم کی ادارت اور اشاعت میں ان کے معاون رہے۔ ان تینوں حضرات نے ندائے دارالعلوم کی اشاعت کو ایک

خاص معیار اور وقار کے ساتھ قائم رکھا۔ ۲۳ر نومبر ۲۰۰۹ء میں مولانا سید عبد الرؤف عالی کا انتقال ہو گیا تو ندائے دار العلوم کی ادارت کی ذمہ داری مولانا عبد اللہ جاوید اور مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کے سپرد ہوئی اور پیشکار کے منصب پر مولانا معین صاحب حیدر آبادی مقرر ہوئے۔ ۱۲ر صفر المظفر ۱۴۲۳ھ میں مولانا معین الدین حیدر آبادی کا انتقال ہو گیا تو ان کے بعد مولانا دلشاد احمد قاسمی ناظم تنظیم و ترقی کے ساتھ پیشکار بھی منتخب ہوئے۔ موصوف تا حال ان دونوں ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔

شعبہ تبلیغ کو مولانا سید ابوالکلام صاحب اور مفتی محمد واصف عثمانی جیسے دار العلوم کے قدیم اور منجھے ہوئے مبلغین کی خدمات حاصل رہی۔ یہ دونوں حضرات اپنی بے نظیر خطابت کی وجہ سے ہمیشہ دینی حلقوں میں مقبول رہے اور عوامی و دینی مدارس کے جلسوں میں ان حضرات کی موجودگی کو کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا رہا۔ مولانا مفتی محمد واصف عثمانی سے متعلق مشکوٰۃ شریف اور ابن ماجہ شریف جیسے اہم اسباق بھی رہے اور فتاویٰ نویسی کی خدمت بھی۔

۱۷ر ربیع الاوّل ۱۴۱۶ھ/۱۵ر اگست ۱۹۹۵ء میں کانپور میں سیرت کے ایک جلسہ سے لوٹ رہے تھے کار پیڑ سے ٹکرا گئی اور شہید ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور درجات کو بلند کرے۔

شعبہ دار الافتاء دار العلوم دیو بند کے قدیم ترین اور فن فتاویٰ نویسی کے ماہر حضرت مولانا مفتی احمد علی سعیدؒ کی نگرانی میں مصروفِ کار رہا۔ مفتی صاحبؒ دار الافتاء کے اکثر اسباق خود ہی پڑھاتے، دن میں کئی کئی استفتاءات کے جوابات بھی لکھتے اور دوسرے مفتیان حضرات کے لکھے گئے فتاویٰ پر نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کی خدمات بھی انجام دیتے۔ ایک عرصہ تک دورۂ حدیث میں ابوداؤد شریف کا سبق بھی آپ سے متعلق رہا، خالص فقہ و فتاویٰ کی زبان بولتے اور خوب تحقیق اور حوالوں کے ساتھ پڑھاتے، ۲۶ر رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء میں مفتی صاحب کا انتقال ہو گیا تو صدر مفتی کے منصب پر حضرت مولانا خورشید عالم صاحب فائز کیے گئے اور دار الافتاء کی مکمل ذمہ داری بھی آپ کے حوالہ تھی، جس کو انھوں نے آخری وقت تک نبھایا۔

دار الافتاء کی طرح شعبۂ تکمیل ادب بھی شروع سے ہی سرگرم عمل رہا، جس کی نگرانی مولانا محمد اسلام صاحب قاسمی (استاذ حدیث و ادب دار العلوم وقف دیو بند) کے سپرد رہی۔ مولانا محمد اسلام صاحب عربی زبان و ادب میں خصوصی مہارت کے ساتھ دیگر علوم و فنون بھی امتیازی صلاحیت کے حامل رہے ہیں، تکمیل ادب کی اکثر کتابوں کے ساتھ شروع میں دورۂ حدیث میں شمائل ترمذی کا درس بھی مولانا موصوف سے متعلق رہا اور رابطۂ عامہ کی ذمہ داری بھی انجام دیتے رہے۔ شعبۂ خوش خطی کی نگرانی جناب منشی امتیاز احمد صاحب مرحوم،

شعبۂ تجوید کی جناب قاری سعید عالم صاحب اور شعبہ تحفیظ القرآن الکریم، ناظرہ اور دینیات کی ذمہ داری جناب حافظ محمد انور صاحب انجام دیتے۔

سینکڑوں نظریاتی اختلافات کے باوجود اگر کوئی شخصیت علماء کے درمیان مقبول اور مسلّم نظر آئے اور ہر صاحب شعور اور شریف انسان ہر حالت میں اس کے احترام کو لازم ادب وتہذیب اور جز واخلاق ومروت سمجھے تو یقین کیجئے کہ وہ شخصیت کوئی معمولی شخصیت نہیں ہوتی، اس میں کچھ ایسے امتیازی اوصاف اور اعلیٰ صفات ضروری ہوں گے جو ہر انسان کو اخلاقی طور پر اس کے ادب واحترام پر مجبور اور اس سے دلی محبت اور قلبی تعلق پر آمادہ کرتے ہیں۔ خدا کی اس وسیع کائنات اور لاتعداد انسانوں میں ایسی معیاری شخصیات نہ جانے کتنی ہوں گی مگر حلقۂ دیوبند جن شخصیات کو ادب واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ان میں ایک شخصیت حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم کی بھی رہی ہے۔ جماعتِ علماء میں راسخ فی العلم، زمرۂ اساتذہ میں مخصوص صلاحیتوں کے حامل، طلباء میں علم وفضل کا کوہِ گراں، خطابت میں حکیمانہ اسلوب سے متعارف، اہل دانش میں بصیرت کے جوہر سے آراستہ، اربابِ نظر میں وسعتِ نظر سے مزین، اہل قلم میں اپنے انداز کی ایک البیلی شخصیت، سنجیدگی کا مرقع، متانت کا پیکر، ذہانت کا آئینہ، فراست کا سرمایہ، احتیاطِ کامل کی تفسیر، شرافت کی تصویر، لفظ لفظ علم وبصیرت کا ترجمان، جملہ جملہ حکمت وکلام کا دیوان، گفتگو میں آبشاروں کی روانی، بارانِ رحمت کا تسلسل، معلومات وسیع، دلائل ٹھوس اور کتاب وسنت سے سیراب، قوت استنباط مدہش، قوت استنتاج زرخیز، اصول کے پکّے، قول کے سچے، وقت کے پابند، معمولات پر کاربند، چھل فریب کی لغت سے ناواقف، مؤمنانہ سیرت وکردار کے مالک، سفر میں ہوں تو رفقاء سفر کے لئے دلچسپیوں کا سامان، حضر میں ہوں تو ماتحتوں کے لئے راحتِ جان، مسند درس پر ہوں تو طلباء کے لئے ابرنیسان، مجلس وعظ میں ہوں تو سننے والوں کے لئے سرمایۂ یقین وایمان، کسی بھی رخ سے دیکھئے ایک معیاری، مثالی اور قاعدے وضابطے کے انسان، ان کی زیارت دارالعلوم وقف دیوبند کے لئے موہبت ربانی، اساتذہ وطلباء کے لئے باعث برکت، کارکنان کے لئے موجب رحمت، دارالعلوم وقف دیوبند کے اہتمام، دینی مدارس کی سرپرستی، عالم اسلام میں دین کی بے لوث ترجمانی، ملّی قیادت اور صالح افکار سے علماء کی رہنمائی قدرت کی جانب سے ان کے حصہ میں آئی۔ ادام اللہ ظلّھم بالعافیۃ و نفع بھم العباد والبلاد.

دارالعلوم وقف دیوبند کی عماراتِ جدیدہ کا سنگ بنیاد

تقریباً تیس سال قبل جب حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اور ان کے مخلص ساتھیوں پر

دارالعلوم دیوبند میں پرسکون اور باوقار تعلیمی و انتظامی خدمات کا دروازہ بند کردیا گیا تو حضرتؒ نے اپنے اکابر کے انداز میں دارالعلوم کے ان امتیازات وخصوصیات کو باقی رکھنے کے لئے جس سے دارالعلوم کی شہرت ہے دارالعلوم وقف دیوبند کے نام سے انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں کام شروع کیا تھا، قدم قدم پر مشکلات اور ہر ہر مرحلہ پر حوصلہ شکن واقعات کے باوجود یہ کارواں بدستور آگے بڑھتا رہا۔ چند سالوں کے مختصر عرصہ میں یہ بے برگ وبار پودہ اللہ کے فضل وکرم سے ایک شجر سایہ دار بن گیا اور جامع مسجد کی وسعتیں اس ادارہ کی ہمہ جہت رفعتوں کو سمیٹنے سے قاصر ہوگئیں، طلبہ کی رہائش گاہیں منتشر ہونے کی بنا پر ذمہ دارانِ ادارہ اخلاق وتربیت کے وہ پہلو اجاگر نہیں کر پا رہے تھے جو کہ دینی درسگاہوں کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ ۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کے مسلسل کرفیو نے اپنی عمارت کی ضرورت کو اور زیادہ باور کروایا، چنانچہ اللہ کے فضل وکرم اور مخیّر حضرات کی مخلصانہ معاونت اور خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم وفخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کی شب وروز محنت سے ایک وسیع قطعۂ اراضی شہر سے باہر مدرسہ کے لئے خرید لی گئی۔

۲۴/جون ۱۹۹۴ء بروز جمعہ فقیہ الامت حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ، خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم، فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا مفتی مظفر حسینؒ، حضرت مولانا محمد نعیم صاحبؒ شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند نے سینکڑوں علماء، طلبہ اور اپنے وقت کے صلحاء ومشائخ کی موجودگی میں اپنے دستِ مبارک سے عمارت کی پہلی اینٹ اس زمین پر رکھی، جس کا نام ہے ''دارالعلوم وقف دیوبند''

دارالعلوم وقف دیوبند اکابر کی نظر میں

☆ مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادی خلیفہ ارشد حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا:

''آپ دارالعلوم وقف کو معمولی درسگاہ نہ سمجھئے۔ جس سطح پر ہندوستان و پاکستان کی عظیم درسگاہوں کا عالمی تعارف ہے دارالعلوم وقف بھی اب انہی بلندیوں میں پرواز کر رہا ہے۔ میں غیر ملکی سفر سے آرہا ہوں، ہر جگہ میں نے دارالعلوم وقف دیوبند کا ذکر خیر سنا۔ میں دارالعلوم وقف کو ہی اصل دارالعلوم دیوبند باور کرتا ہوں۔ اصل چیز روایات ہیں، عمارات نہیں۔''

☆ فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ نے فرمایا:

’’خدا تعالیٰ آپ کے مدرسہ کا فیض جاری و مستمر فرمائے۔ خدا تعالیٰ درس گاہ کو خصوصی مقبولیت عطا فرمائے، آپ کی درسگاہ دن دونی رات چوگنی ترقیات حاصل کرے، آپ جو دینی و تعلیمی کام کر رہے ہیں اس کی تفصیلات سن کر روح کو سکون ملتا ہے۔‘‘

سنگ بنیاد رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا: ’’مدرسہ تعمیر کیجئے، مدرسہ کا فیض جاری ہو چکا ہے‘‘

☆ حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحبؒ نے فرمایا:

’’اللہ دارالعلوم وقف کو بامِ عروج پر پہنچائے، اس کا علمی و دینی فیضان مستمر ہو، اس کی ترقیات کی کوئی انتہا نہ ہو، آسمانِ علم پر آفتاب کی طرح چمکے۔‘‘

☆ رئیس التبلیغ حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالن پوریؒ فرماتے ہیں:

’’الحمد للہ! اللہ آپ کی کوششوں کو کامیاب فرمائے، اسے علم دین کا سب سے بڑا مرکز بنائے۔ آپ سب کو خلوص کی دولتِ بے کراں عنایت فرمائے۔

ارکانِ عمل کمیٹی کا عماراتِ جدیدہ کی تکمیل میں قابل ستائش کردار

دارالعلوم وقف دیوبند کے لئے خرید کردہ زمین پر تعمیر کا سلسلہ ارکانِ عمل کمیٹی کی نگرانی میں دارالاقامہ سے شروع ہوا۔ جس کے روح رواں مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی (نائب مہتمم و استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند) و مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی تھے۔ دارالاقامہ کی تعمیر جوں جوں آگے بڑھتی رہی شہر سے کرائے کے مکانات سے طلبہ کو دارالاقامہ میں منتقل کیا جاتا رہا۔ درس گاہوں کے لئے عارضی طور پر ٹین کے شیڈ کا نظم کیا گیا، گرمی کی شدت میں جب یہ ٹین شیڈ گرم ہو جاتا تو طلبہ و اساتذہ پسینے میں شرابور ہو جاتے۔ اسی حالت میں ایک عرصہ تک تعلیم جاری رہی، اسے اللہ تعالیٰ کی نصرت ہی کہا جا سکتا ہے کہ گرمی کی شدت کے باوجود نہ کوئی بیمار پڑا اور نہ تعلیمی سلسلہ کے انقطاع کی نوبت آئی۔ جب دارالحدیث اور درسگاہوں کی باضابطہ تعمیر ہو گئی تو طلبہ و اساتذہ نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تعمیرات کی تکمیل میں مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی اور مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی نے بڑی جگر سوزی، محنت اور ذمہ داری سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ وسائل کی قلت کی بنا پر بہت سے کٹھن مرحلے ایسے بھی آئے کہ تعمیری کام موقوف ہوتا رہا مگر ان حضرات نے ہمت نہیں ہاری اور پوری لگن کے ساتھ تعمیری سلسلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور آج بھی اسی

فکرمندی کے ساتھ ادارہ کی تعمیر و ترقی اور نیک نامی کے لئے سرگرم عمل ہیں اور ان حضرات کی انتھک کوششوں کے نتیجے میں طلبہ واساتذہ اور عملۂ دارالعلوم وقف دیوبند کے لئے یکسوئی اور اطمینان کی فضا میسر آسکی۔ فجزاھم اللّٰہ احسن الجزاء.

ملکی وغیر ملکی طلبائے فارغین دارالعلوم وقف دیوبند (۱۴۰۲ھ تا ۱۴۳۴ھ)

۱۴۰۲ھ......۳۳	۱۴۰۳ھ......۴۸	۱۴۰۴ھ......۷۹	۱۴۰۵ھ......۱۱۴	۱۴۰۶ھ......۱۴۶
۱۴۰۷ھ......۱۸۹	۱۴۰۸ھ......۱۷۵	۱۴۰۹ھ......۱۹۷	۱۴۱۰ھ......۲۵۴	۱۴۱۱ھ......۱۹۸
۱۴۱۲ھ......۲۱۳	۱۴۱۳ھ......۲۶۲	۱۴۱۴ھ......۲۸۶	۱۴۱۵ھ......۳۲۹	۱۴۱۶ھ......۲۷۴
۱۴۱۷ھ......۳۳۲	۱۴۱۸ھ......۳۲۷	۱۴۱۹ھ......۳۴۴	۱۴۲۰ھ......۳۶۲	۱۴۲۱ھ......۳۷۴
۱۴۲۲ھ......۲۱۲	۱۴۲۳ھ......۳۷۴	۱۴۲۴ھ......۳۶۱	۱۴۲۵ھ......۴۰۱	۱۴۲۶ھ......۳۹۷
۱۴۲۷ھ......۴۱۹	۱۴۲۸ھ......۴۷۶	۱۴۲۹ھ......۴۵۱	۱۴۳۰ھ......۴۸۵	۱۴۳۱ھ......۵۹۴
۱۴۳۲ھ......۲۰۶	۱۴۳۳ھ......۸۳۳	۱۴۳۴ھ......۷۴۹	کل تعداد ۱۰۴۹۴	

یہ سال بہ سال دورۂ حدیث شریف کے فارغین کی تعداد ہے۔ جب کہ تکمیل ادب، افتاء، خوشخطی، حفظ، دینیات، تجوید وغیرہ شعبوں سے فارغ طلبہ کی تعداد اس سے الگ ہے۔ (۳۴)

............❖............

اخلاق، عادات، صفات

سراپا

قد نخل ثمر دار، نہ کوتاہ نہ دراز، احسنِ تقویم کا طغرۂ حسین، چہرہ علم وحکمت کی کتاب، آنکھیں فضل وکمال کی محراب، پیشانی چاند کی طرح روشن، نشانِ سجدہ شقِّ قمر کا نمونہ بھنویں شرافت وکرامت کا آئینہ، رخسار گلِ پُر بہار، بینی شرافت کی آئینہ دار، سر خوبصورت گولائی لئے ہوئے اوراس پر چوڑی باڑ کی دوپلّی ٹوپی بزرگانہ روایتوں کی نقیب، داڑھی مشرع سنتِ رسول کا اعلان کرتی ہوئی، کاندھے انکساری، خاکساری اور ذمہ داری کا نقشِ جمیل، ہتھیلیاں ریشم سے زیادہ نرم، ہمہ وقت بیگانہ وخویش کی اعانت میں سرگرم، دل صحیفۂ ابرار، دماغ ذہانتوں کا محرمِ اسرار، چال ڈھال و **عباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا** کی تفسیر، گفتار میں گہرائی، مزاج میں صفائی، طبیعت میں سچائی، فطرت میں رہنمائی، مجموعی ہیئت میں رعب دبدبہ، عظمت ووقار، سنجیدگی اور ایک اعلیٰ معیار، جلالِ علم کے ساتھ جمالِ حلم، لطافت کے ساتھ نظافت، شجامت کے ساتھ شرافت اور کرامت۔

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحبؒ رقمطراز ہیں:

’’حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ سرو قد، آتش بہ رخسار، نفیس پوشاک میں ملبوس دارالعلوم کے دفتر اہتمام کے زینے پر لپک کر چڑھ رہے ہیں، آہستہ خرام بلکہ محوِ خرام کا انداز رفتار تو کبھی نہیں دیکھنے میں آیا بلکہ ایک بھرپور نوجوان کی تصویر بنے ہوئے تقریباً دوڑ کر چلنے کے عادی تھے، سر پر ریشم سے زیادہ نرم بال، سیاہ گھنی داڑھی، سفید چہرہ پر گویا کہ چاند کے اردگرد ہالہ، معصومیت کا پیکر، لطیف المزاج، اس قدر نفیس کہ انشاء کے اس شعر کے واقعی مصداق ؎

نزاکت اس گلِ رعناء کی دیکھو انشاء   نسیمِ صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا‘‘

حضرت مولانا فضیل الرحمٰن عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

حضرت حکیم الاسلامؒ کی گفتار، رفتار، نشست و برخاست ہر چیز میں ایک نفاست جھلکتی تھی، گفتگو کرنے میں نہ آواز بہت بلند ہوتی تھی اور نہ اتنی پست کہ سنائی نہ دے، نہایت شیریں لب ولہجہ میں ایک ایک لفظ علیحدہ علیحدہ موتیوں کی طرح جگمگاتے الفاظ معلوم ہوتے تھے، آواز کا زیر و بم بھی بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا، قد بہت موزوں تھا نہ بہت لمبا تھا اور نہ پست، جسم نہ موٹا اور بھدا اور نہ اتنا دبلا پتلا بلکہ موزوں اور متناسب جسم تھا، لباس عالمانہ اور باوقار ہوتا تھا، دو پلی ٹوپی ذرا اونچی باڑ کی جوان کی اٹھی ہوئی پیشانی پر بہت زیب دیتی تھی، نشست میں تواضع جھلکتی تھی۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''کہتے ہیں کہ چہرہ انسان کے باطن کا آئینہ ہوتا ہے، حضرت حکیم الاسلامؒ کا چہرہ معصوم بھی تھا اور پرنور بھی، خدوخال باوقار، لب ولہجہ سبک جیسے منھ سے پھول جھڑ رہے ہوں، چہرے کی طرح ان کا دل بھی ایسا معصوم تھا''

حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

هينو ن لينو ن ايسا ر ذوو كر م سواس مكر مة ابنا ء ايسار

''خندہ جبیں وشگفتہ، نرم گفتگو اور نرم خو، حلیم و بردبار، متواضع ومنکسر المزاج پھر ظاہری حسن وجاہت بھی ایسی کہ ہزاروں میں ایک نظر آتے تھے''

حضرت مولانا شاہین جمالی صاحب شیخ الحدیث مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ لکھتے ہیں:

گداز دودھیا بدن حسنِ یوسفؑ کی طرح جلوہ فگن، متوسط قد وقامت جسمانی وروحانی ودانش کی دو گہری جھیلیں آنکھوں کے حلقوں پر سیاہ سفید بھوؤں کی کمان، تیرگی شام میں نمودِ سحر کا اعلان چوڑی تابناک پیشانی خدا کے حضور سر بسجود رہنے کی نشانی روشن چہرہ بدر وہلال نہیں آفتاب وماہتاب، چہرے کے دائرے پر مشرع سفید داڑھی آئینۂ جمال پر بزرگانہ جلال کی مینا کاری، سر پر عالمانہ ہیئت کے کٹے ہوئے سفید بال اور اس پر اونچی دیوار کی دوپلی طیب کیپ گویا: وله الجوار المنشئٰت فی البحر کا الا علا م: بدن پر موسم کے مطابق سرد وگرم فسٹ کلر کی شیروانی، نزاکت ونفاست کی کہانی، بیش قیمت کپڑے کا لمبا کرتہ اور گول موری کا پاجامہ، تراش وخراش اور لباس میں بزرگی کا خبرنامہ، اس قلمی خاکے کی عظیم شخصیت کو دیوبند کے عوام وخواص مہتمم صاحب اور باہر کی دنیا میں لوگ ''حکیم الاسلامؒ'' کے بلند لقب سے پکارتے تھے۔

معصومیت

معصومیت کا لفظ حکیم الاسلامؒ کے خدوخال، چال وڈھال، سیرت واحوال اور اخلاق واعمال سبھی پر یکساں طور پر صادق آتا ہے۔ جن حضرات کو آپ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ جسم وجاں کا ایک گلشن صدرنگ اور قلب وروح کی ایک نفیس ولطیف فردوس بریں، ہزاروں دلوں کی طمانیت اور بے چین روحوں کی تسکین کا سامان لئے ہوئے معصومیت کے پیکر میں جلوہ گر تھے۔

اس قدر سادہ وپرکار کہیں دیکھا ہے؟
بے نمود اتنا نمودار کہیں دیکھا ہے؟

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

جب ان کو معلوم ہوتا تھا کہ فلاں صاحب نے ان سے آکر غلط بیانی کی ہے تو فرماتے تھے کہ مجھے یہ خیال ہی نہیں ہوتا کہ کوئی مسلمان جھوٹ بھی بول سکتا ہے، خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کبھی اپنے قلم سے کسی کو الگ نہیں کیا، کیا شائستگی، شرافت، نرم روی اور سب سے بڑھ کر خداترسی جیسے ان کے مزاج کا حصہ بن گئی تھی، وہ دوسروں کی تکلیف سے دکھی تو ہوتے تھے مگر خود کبھی دوسروں کو تکلیف نہیں پہنچا سکتے تھے۔'' (۳۵)

نفاست

نفاست کسی ایک چیز میں نہیں جسم وجاں، عقیدہ وایمان، قلوب وجدان، اعمال واحوال، لباس و پوشاک، سفر وحضر، خلوت وجلوت، تحریر وتقریر، گفتگو ومجلس، معاملات، معمولات، معاشرت وسلوک، ذکر وفکر، احساس وجذبات سب میں رچی بسی۔ ع

نزاکت اس کے مکھڑے کی دیکھو انشاء
نسیم صبح بھی چھو جائے تو رنگ ہو میلا

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نہایت نفیس الطبع انسان تھے، ان کی طبعی نفاست جو لباس میں، گفتگو میں، نشست وبرخاست میں ہر چیز میں جھلکتی تھی اس کی وجہ سے بچپن سے ہی حضرت حکیم الاسلامؒ کے ساتھ بڑی انسیت محسوس ہوتی تھی اور وہی انسیت شعور کے بعد نیاز مندانہ اور عقیدت مندانہ تعلق میں بدل گئی، حقیقت یہ ہے کہ میں دیوبند کے بزرگوں کے بارے میں جو تصور کرتا تھا حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ

مجھے اس کی تصویر نظر آتے تھے، حلم، بردباری اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے چھوٹوں کی دلداری، وہ کوئی بات ایسی نہ کرتے تھے نہ کہتے تھے جس سے کسی کی دل شکنی ہوتی ہو۔''

انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

مولانا انظر شاہ صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ:

''نفاست ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھر گئی تھی، خود نفیس، پوشاک نفیس، گفتگو نفیس، وعظ نفیس، تحریر نفیس، گویا کہ سراپا نفاست، کھانے میں پسندیدہ امر یہ تھا کہ دسترخوان لگا دیا جائے، انہیں جو چیز پسند ہوگی خود ہی اٹھالیں گے، اگر میزبان زبردستی کھلانا چاہتا ہے تو قدرے ترش ہو کر فرماتے کہ بھائی کھانے کا تعلق رغبت سے ہے ترغیب سے نہیں۔

ایک دعوت میں مولانا فخر الحسن صاحب مرحوم بار بار رائتہ اٹھا کر پیش کرتے اور کہتے کہ: ''رائتہ، فرمایا کہ جی ہاں رأیتہٗ، غالباً رائتہ مرغوب نہ تھا۔'' (۳۶)

لقب حکیم الاسلامؒ کی معنویت

لفظ حکیم الاسلامؒ نے ٹھونس ٹھانس اور کھینچ تان کے ناروا سلوک سے نیم دم ہو کر امام غزالیؒ کے بعد اگر کسی موزوں شخصیت کے نام کے سابقہ نے دم لیا یقین کیجئے کہ وہ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ہی تھے۔ اس پر بھی حاسدین نے یہ احمقانہ اعتراض جڑ دیا کہ کیا اسلام بیمار ہے کہ ''حکیم الاسلامؒ'' ٹھہرے، یا للاسف مدت العمر پڑھتے پڑھاتے گزری، کیا اتنا ہی پڑھا اور پڑھایا کہ حکیم کے معنی بقول حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کشمیریؒ ''حکیم گل بنفشہ نویس ومصروف ہوالشافی'' ہی سمجھا کئے۔ اس کے کوئی اور معنی ہی نہیں، بایں عقل و دانش بباید گریخت۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ محدثین عظام کے حالات میں ایک جملہ تواتر کے ساتھ نقل ہوتا آیا ہے، **کان محسودا بین الناس** بس حکیم الاسلامؒ اپنے عہد میں اسی کا مصداق تھے اور سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ جملہ سیاق مدح میں بیان ہوا ہے، جس کا صاف صاف مطلب یہی ہے کہ وہ صاحب کمال اور اپنی علمی عظمتوں کی بنا پر مشہور بین العوام والخواص تھے اور یہی وہ چیز ہے جو حریفوں کے لئے وجہ حسد بنی ہے۔

اعتراض کرنے والے اپنے زعم میں نہ جانے کیا کیا تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ حاسدین کے سوا کچھ بھی نہ تھے، جو حکیم الاسلامؒ کے پورے عہد زریں میں ہزار نوازشوں کے باوجود وہی کاروبار کرتے رہے جس کا حاصل جمع حسد۔

خانگی زندگی

حکیم الاسلام علیہ الرحمہ کی نواسی محترمہ شہناز غازی کی یہ تحریر حضرت حکیم الاسلامؒ کی خانگی زندگی، اخلاق وعادات اور شخصیت کے بعض گوشوں کو اجاگر کرتی ہے۔

''صبح آنکھ کھلتی تو امی جان (ہماری نانی محترمہ) نماز کے تخت پر فجر کی نماز کے بعد مناجات مقبول بڑے عمدہ لحن سے پڑھتی ہوئی ہوتی تھیں، ابا جی قبلہؒ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے اسلئے وہ علی الصبح مدرسہ جاتے ہوئے نظر آتے چھوٹے ماموں صاحبان طالب علم تھے، مدرسہ کا گھنٹہ ہوتا اور وہ بھی روانہ ہو جاتے، سب سے بڑے ماموں محترم مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مدظلہ کا شمار مدرسے کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔

ابا جیؒ کا روزانہ کا معمول یہ تھا کہ مغرب کے بعد عشاء تک کشادہ اور وسیع صحن میں ٹہلتے ہوئے کلام پاک پڑھتے تھے، روزانہ ایک پارہ، ہم سارے بچے ان کے ساتھ ساتھ اس چہل قدمی میں شامل رہتے، کبھی ریس لگتی کبھی یونہی دوڑتے رہتے، ابا جی تیز قدموں سے ٹہلتے تھے، ان سے کچھ پوچھتے تو جواب نہ ملتا، ایک بار میں نے معلوم کیا کہ آپ صحن میں ٹہلتے ہوئے ہم سے باتیں کیوں نہیں کرتے، ان کے جواب نے مجھے حیران بھی کیا اور والدین کی محبت کا شدید احساس بھی دیا، فرمایا میرے والد صاحب قبلہؒ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ سارے علوم جو تم نے حاصل کئے ہیں وہ تمہارے ہیں مگر قرآن کریم جو حفظ کروایا ہے وہ میرے لئے ہے، اس کے ذریعہ تم مجھے یاد رکھنا، لہٰذا والد کے انتقال کے بعد میرا معمول ہے کہ مغرب سے عشاء کے درمیان ٹہلتا ہوں اور ایک پارہ روز پڑھتا ہوں اور اب اماں جی (ان کی والدہ) کی رحلت کے بعد ان کو بھی شامل کر لیا ہے، دونوں کو بخشتا ہوں نئی نسل کے لئے ایک نصیحت اور اولاد کا بہترین عمل، یہ وہ تربیت ہے جو ہمارے علماء اپنی نئی نسل کے ذریعہ ہر بچے کو دیتے رہے ہیں یہ وہ اعمال صالحہ ہیں جو انسان کو اس کے کردار، علم، عمل، فرائض اور حقوق کی دینی آگہی دیتے ہیں، جو ایک صالح معاشرے کی اساس ہوتی ہے۔

کہتے ہیں تعلیم بغیر تربیت کے اپنے جوہر نہیں کھولتی، ہمارے علمائے کرام نے ہر دور میں اس تربیت کے لئے خود کو وقف رکھا اور ایسے نقش قدم چھوڑے جو انسان کو معراج کا مفہوم سمجھاتے ہیں، عروج کی منزل دکھاتے ہیں۔

ابا جیؒ کو اپنی والدہ سے غیر معمولی تعلق اور انس تھا، یہ وہ مائیں تھیں جنھوں نے اکثر اصولوں پر ممتا کو قربان کیا اور ایسے کردار اس دنیا کو دیئے جنھوں نے رہبری اور راہ نمائی کے لئے اصول وضع کئے، ابا جیؒ اور ان کی والدہ ایسی ہی اولاد اور ماں رہے۔

ایک بار ان کی والدہ (جو سارے خاندان کی ''اماں جی'' تھیں) ان سے کسی بات پر خفا ہو گئیں ابا جیؒ کو احساس ہو گیا کہ ماں کا دل رنجیدہ ہے ایک صبح وہ مدرسہ سے لوٹے حسب عادت سیدھے اماں بی کے کمرے میں نیچے اور پلنگ کی پٹی کے نیچے زمین پر بیٹھ کر ان کے دونوں پیر پکڑ لئے اور سر جھکا لیا، ماں نے بیٹے کی معذرت اور ان کا عمل دیکھا اور خفگی سے منھ دوسری طرف پھیر لیا، ابا جی نے خفگی کی شدت کو بھی محسوس کیا اور ان کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا، بیٹے کی آنکھیں اشکبار تھیں، ماں کے قدموں میں ان کی جنت تھی وہ ان ہی قدموں میں بیٹھے تھے، یہ واقعہ والدہ مرحومہ کا چشم دید ہے جو انھوں نے ہمیں سنایا، اس وقت ابا جیؒ خود ناتی پوتوں والے تھے، کسی بزرگ خاتون نے کہا ''بس معاف کر دو'' کچھ دیر بعد ماں کی ناراضگی دور ہوئی تو ابا جی کے چہرے پر طمانیت قلب کا گہرا اثر تھا، یہ بھی ہمارے بزرگوں کا ناصحانہ عمل تھا اپنے چھوٹوں کے لئے کیوں کہ ہر اصلاحی کام اپنے گھر سے شروع ہوتا ہے۔

ابا جیؒ بیحد نرم مزاج تھے، ان کو ڈانٹنا آتا ہی نہیں تھا، قیام دیوبند میں ہم کھیل کود کے ساتھ شرارتیں بھی کرتے تھے، لیکن مجھے یاد نہیں کہ کبھی ابا جی نے ہمیں سرزنش کی ہو یا شرارتوں سے روکا ہو، بلکہ اکثر وہ ہمارے ساتھ کھیل میں شامل ہو جاتے تھے ایک کرسی پر بیٹھ جاتے ایک گیند ان کے پاس ہوتی، ہم سارے بچے دوڑ دوڑ کر ان کی پھینکی گیند کو اٹھاتے اور جا کر دیتے جیسے ہی بچہ بھاگتا وہ اس گیند کو اس کی پیٹھ پر مارتے، اب بچوں کو اس گیند سے خود کو بچانا بھی ہوتا اور دوبارہ گیند حاصل کرنا بھی، یہ واقعہ امریکہ میں مقیم میری خالہ زاد بہن اور ابا جیؒ کی نواسی (ان کی سب سے بڑی بیٹی محترمہ فاطمہ رشید فریدی مرحومہ) سلمٰی ریاض نے سنایا، دوسرا واقعہ یہ سنایا کہ ابا جیؒ کے مکان ''طیب منزل'' میں صحن میں آمنے سامنے پہلی منزل پر دو یکساں انداز کے کمرے ہیں جو بنگلے کہلاتے ہیں ان میں سے ایک حصہ ابا جیؒ کی اسٹڈی کے لئے مخصوص تھا، تصنیفی کام وہیں بیٹھ کر کرتے تھے، اس میں اندر کی طرف ایک کوٹھری تھی اس سے ملحق غسل خانہ تھا کوٹھری میں دو صندوق تھے، سارے بچے متجسس کہ ان میں کیا ہے، طے یہ ہوا کہ جب ابا جی مدرسے چلے جائیں گے تب اوپر جا کر صندوق کا جائزہ لیا جائے گا، حسب پروگرام کوٹھری میں پہنچ کر صندوق کھولے گئے، سب بچوں کے سر اور ہاتھ صندوق کے اندر تھے، اس میں رکھی چیزوں کا جائزہ لیا جا رہا تھا، ٹارچ، قلم، پینسلیں، دواتیں وغیرہ تھیں، ان چیزوں کو دیکھنے میں سب بچے مشغول و مستغرق تھے بے خبری کا یہ عالم کہ باہر ہونے والی آہٹ پر دھیان نہیں دیا، جب قدموں کی چاپ بالکل پشت پر سنائی دی تو دو ایک نے سر صندوق سے باہر نکالا ابا جی ان کے سامنے کھڑے تھے اور بغور دیکھ رہے تھے آہستہ آہستہ سب کے سر باہر نکلے سکتہ کی سی

کیفیت میں خوف زدہ سے بچے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے، اچانک اباجیؒ کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اور یہ کہتے ہوئے واپسی کے لئے مڑ گئے ''نامعقول کہیں کے۔''

گرمیوں میں آم کے موسم میں وہ بچوں کے ساتھ صحن میں بیٹھ کر آم کھاتے اور اسی دوران کسی بھی بچے کی طرف آم کی پچکاری چھوڑتے، بس پھر کیا تھا سارے بچے ایک دوسرے پر آم کے رس کی یہ میٹھی پچکاریاں چھوڑتے، لیکن کسی بچے میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان پر یہ رس بھری پھوار چھوڑتا، مگر وہ بچوں کو کھیل میں لگا کر خوب محظوظ ہوتے تھے، کشادہ صحن میں پہلے آم اور پھر پانی سے کھیل ہوتا جس میں بچوں کے ساتھ بڑے بھی شامل ہو جاتے گرمیوں کی چھٹیوں میں اباجی کی بیٹیاں اور نواسے نواسیاں آئے ہوئے ہوتے تو وہ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر شام کو یا رات کو ہمارے ساتھ وقت گزارنا ضروری سمجھتے تھے، ہمیں بیٹھا کر باتیں کرتے ہمارے دینی معلومات کے لئے کئے سوالات کے جواب دیتے، اپنے سفر کے بعض دلچسپ واقعات سناتے کس موضوع پر ان کا وعظ تھا وہ بھی بتاتے، پھر ہم سے نعتیں، غزلیں، نظمیں، سنتے درمیان میں ادبی لطائف بھی سنائے جاتے اور ہماری آپس میں شوخیاں چھیڑ چھاڑ بھی جاری رہتی، اباجی دیکھتے اور مسکراتے رہتے، گرمیوں کی چھٹیوں میں اباجی کی شفقتیں بچوں کے لئے ان کی مجلسیں نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بہترین زمانہ ہوتا تھا۔

قبلہ اباجیؒ اہل خانہ اور بچوں کے ساتھ کتنے مشفقانہ اور دوستانہ انداز سے رہتے تھے۔ ذیل میں ''مالشِ سر کی داستان اور میاں سفیان'' کے عنوان سے ۶۳ر اشعار پر مشتمل حضرتؒ کی طویل نظم ملاحظہ فرمایئے، جو حضرتؒ نے اپنے قلم مبارک سے ڈائری پر تحریر فرمائے اور رحلت سے تین گھنٹے پہلے یہ بیاض جس میں دیگر موضوعات پر بھی حضرتؒ کا منظوم کلام ہے اور نہایت خوش خط انداز سے تحریر فرمودہ ہے میرے ماموں زاد بھائی عزیزم محمد سفیان قاسمی کے حوالے فرمائی۔

خوشا وہ وقت کہ میرٹھ کا تھا سفر درپیش ۔۔۔ اسی مہم میں تھے مصروف سب یگانۂ وخویش
سفر کے سارے حوائج تھے منتشر گھر میں ۔۔۔ اسی کا نظم بنانے میں سب تھے گردوپیش
یکایک حضرت سفیان کو خدمتوں کی لگی ۔۔۔ کہ جس سے راحت وآرام پائے یہ درویش
کھڑے ہوئے کہ کریں سر پہ تیل کی مالش ۔۔۔ کہ نیند آئے سہانی جو ہے دماغ کا عیش
یہ جانتے ہوئے کم رہ گیا ہے ریل میں وقت ۔۔۔ خموش ہوگئے ہم بھی کہ نہ ہوں دل ریش
جھکا دیا سرِ تسلیم سامنے ان کے ۔۔۔ کہ سر پہ جو بھی کریں مشق حسب خاطر خویش

کھٹک ضرور تھی لیکن یہی مقدر تھا   کہ بات اونچی ہو ان کی اور آئے از بس پیش

اٹھے بجوشِ عقیدت، بجذبۂ خدمت   بخام کاریٔ طفلی بعقل نا اندیش

اٹھائی تیل کی بوتل نظر تھی دوسری سمت   رخ نگاہ بہ پشت و دہاں شیشہ بہ پیش

تو کج رخی سے یہ بوتل اونڈیل دی ساری   بجائے مالش سر، غسل سر ہوا در پیش

وہ سارے تیل کا دریا نکل کے بوتل سے   بہا جو سر پہ تو بوتل میں کچھ نہ تھا کم و بیش

امنڈ کے سر سے جو سیلاب تیل کا آیا   نہا گئے سر و گردن ، بہ سینہ تا دل ریش

لباس تیل کی تھا نہر، تن تھا تیل کا حوض   اور اس میں تیر رہا تھا یہ جثۂ دوں کیش

نہ ایک سر ہی رہا تیل کے تموج میں   شریک اس میں تھی آنکھیں بھی باغم درپیش

تھی ایک دھار تو کانوں میں، ایک آنکھوں میں   کہ اشکبار تھیں آنکھیں تو کان کلفت کیش

تھی سر سے تیل کی بارش اور آنکھ میں دریا   کہاں کی نیند؟ سر پے ہی بہہ گیا سب عیش

لگیں جو آنکھ میں مرچیں تو ہم اس صدمہ سے   کھڑے ہوئے وہیں بے چین ہوئے باغم خویش

کلن تھی سر میں جو بڑھتی ہی جاتی تھی دم دم   جلن تھی آنکھ کی لمحہ بلمحہ بیش از بیش

اب ان کے ہاتھ میں تھا سر ہمارا عقل سمیت   رہے وہ مالک سر اور ہم نرے درویش

سفر تو کیا وہ حضر بھی ہوا سقر صورت   کہ تن بدن میں ہمارے سما گیا غم و طیش

بپا تھا سر میں یہ طوفاں عجب تلاطم تھا   تھا بھاگ دوڑ میں گھر کا ہر اک یگانۂ وخویش

رہی کسی کو نہ سر کی خبر نہ پاؤں کی   کہ اضطراب کے پیکر تھے سب محبت کیش

ہر اک زباں پہ تھا لاؤ پانی اور صابن   معالجے میں تھے مصروف سارے خیر اندیش

ادھر تو ریل کا وقت اور اُدھر یہ درد سری   عجب ضیق تھی جس سے تھے سب مصیبت کیش

اُدھر تو حضرت سفیان پہ برہمی سب کی   کہ تم بلید ہو احمق ہو اور نااندیش

یہ تُک ہی کیا تھی کہ مالش ہو ایسی ساعت میں   کہ ریل کی بھی آمد ہو اس گھڑی درپیش

یہ عین ریل کا وقت اور مالشِ سروپا؟   یہ کیسے سمجھیں کہ تم کچھ بھی ہو مآل اندیش

تمھیں نے آج یہ ڈالا ہے ضیق میں سب کو   تمھیں ہو جس نے ملایا ہے نوش میں یہ نیش

نہ تھی تمہاری یہ حرکت بہ معنیٔ خدمت   عجب ہے کیا کوئی کہہ دے کہ تم ہو بد اندیش

کہا کسی نے تم ہی ہو سید الحمقاء   نہ ہوشمند ہو تم اور نہ عاقبت اندیش

کہا کسی نے کہ تم لائقِ ملامت ہو
ہو احمقوں کی حماقت کا گویا تم پردیش

غرض یہ خدمتِ مالش ہی بن گئی جھگڑا
کہ طعن اور ملامت ہی جس کے تھے پس وپیش

ملامتوں کی تھی بوچھار سر پہ سفیان کے
ندامتوں سے تھے سفیان سرخم ودل ریش

کھڑے تھے حضرت سفیان چور کی مانند
نظر نہ آتا تھا مخلص کہیں بھی گرد و پیش

بڑھی جب حد سے ملامت تو بڑھ گیا جھگڑا
بڑھا جو جوش تو یہ جوش بن گیا اک جیش

بالآخر ہم پہ ہی آکر کے فیصلہ ٹھہرا
کہ کون ان میں ہے دانا، ہے کون نااندیش؟

ملامتیں ہیں صحیح یا ندامتیں برحق
یہ خجلت ایک کی سچی ہے یا سبھوں کا یہ طیش

ہوا ہماری طرف سے یہ فیصلہ آخر
نہ جھول جس میں ذرا تھا نہ تھا وہ کچھ کم وبیش

کہ یہ نہیں کوئی جھگڑا دلی خصومت کا
نہ یہ ہے آتش جنات کا توہم و طیش

کھلی ہوئی ہے محبت ہر ایک کے دل میں
نہیں ہے رنج وعداوت کے زہر کا کوئی نیش

نہ ان میں کوئی ہے مفسد، نہ کوئی جھگڑالو
نہ ان کی جیب میں تھا اضطراب کا کوئی کیش

حمیت ایک طرف ہے، محبت ایک طرف
اسی کا سارا یہ جھگڑا تھا آگیا در پیش

مگر محبت طبعی ہے اندھی اور بہری
کہ اس میں ہوتی نہیں عقل تام پیش از پیش

نہ کچھ محل ملامت ہیں حضرتِ سفیان
نہ ملزم اس میں ملامت کنندگان کا جیش

نہ بدنیت ہیں یہ طاعن نہ بدنیت مطعون
وہ سادگی میں یہ بچپن میں کیا ہوں دور اندیش

وہ غرق بحر محبت، یہ بچپنے میں مگن
نہ یہ گناہ نہ وہ دونوں ہیں صحیح اُپدیش

سوال یہ ہے کہ جھگڑا بنا یہ کیوں آخر؟
نزاع کس کی حماقت سے آگیا درپیش

حماقتوں کی جو تنقیح ہو توحق یہ ہے
کہ ان میں کوئی بھی احمق نہیں نہ بداندیش

نہ اہل خانہ ہیں احمق نہ ہیں میاں سفیان
ہم ہی تھے احمق وناداں، ہم ہی تھے نااندیش

ہم ہی نے خیر سے بچوں کی بات میں آکر
اس اضطراب سے کتنوں کو کردیا دل ریش

حماقت اس کی جو بچوں کے ہاتھ میں کھیلے
خصوص جب کہ ہو بوڑھا بھی اور دور اندیش

اگرچہ منشاء دل پہلے ہوچکا تھا عیاں
خموشی بعد کی دلداریوں کا تھا سندیش

قرین عقل ہی منشا کی پاس داری تھی
نہیں ہوئی تو یہ جھگڑہ ہی آنا تھا درپیش

بسا کہ بوڑھوں کے منشا سے ہٹ کے بچوں کو
اٹھانی پڑتی ہے بوڑھوں سمیت کلفت عیش

سبق ہے اس میں نصیحت کا نوجوانوں کو — کہ خودسری سے نہ بوڑھوں کے ہوں مقابل پیش
اگر ہو تجربہ کاروں کا سامنے منشاء — تو خودسری نہ دکھائیں بخام عقلیٔ خویش
ہے سمع وطاعتِ پیراں ہی میں صلاح وفلاح — نہ خودسری میں نہ ضد میں جو ہو مرضیٔ خویش
دعا ہے سب کے لیے اور خصوص سفیان کے — نہ ہوں کبھی بھی یہ دل تنگ اور نہ ہوں دلریش
الٰہی اپنے مکارم سے میرے سفیان کو — بعافیت بہدایت ہمیشہ رکھ خوش عیش
تری اطاعتِ مطلق سے سرفراز رہے — تری غلامی سے سرتاجِ سروراں ہو ہمیش
تری رضا ہی میں اس کی ہوں مرضیات فانی — ہو بامراد مرادوں میں حسب مرضیٔ خویش
ترے کرم سے بزرگوں کا جانشین بنے — نبوتوں کی وراثت ہو اس کے دل کا کیش

محمد طیب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۳۹۴ھ

ہم نے پہلی بار مولانا الطاف حسین حالیؔ کی طویل نظم ''مدوجزر اسلام'' مسدس حالیؔ ان ہی سے سنی، وہ ایک خاص لحن میں پڑھتے تھے، انداز ایسا دل پذیر ہوتا کہ سارے بچے ذوق وشوق سے سنتے اور پھر سارے وقت اسے گنگناتے رہتے، مولانا حالیؔ نے مسدس حالیؔ میں مسلمانوں کے عروج وزوال کا احوال بڑے اثر انگیز انداز سے بیان کیا ہے، اس کی ابتداء یوں ہوتی ہے۔

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا — مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا — کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں — کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں
سبب یا علامت گر ان کو سمجھائیں — تو تشخیص میں سو نکالیں خطائیں

زوال شدہ قوم کا مرض اس کی جہالت، بے علمی، رسومات قبیحہ میں مبتلا ہونا تھا، دین کی اصلی تعلیم سے بے خبری نے اور بری حالت کر رکھی تھی۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان معاشی، معاشرتی اور علمی لحاظ سے کسمپرسی کے عالم میں تھے نہ داد تھی نہ فریاد۔ دارالعلوم دیوبند کا قیام اسی غرض سے ہوا تھا کہ مسلمانوں کو اس حالت سے باہر نکالا جائے اور علم وعمل کے ذریعہ عروج کا راستہ دکھایا جائے، اباجیؒ کے دادا حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے یہ ادارہ قائم کیا، ظاہر ہے مقصد زندگی اباجیؒ کو اپنے بزرگوں سے ملا تھا، اس کی ترویج و

توسیع کے لئے اباجیؒ ہمہ وقت مصروف رہتے۔

اباجیؒ کا دسترخوان وسیع تھا اور گھر کا آنگن وسیع تر تمام رشتے داروں کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا تھا، ہم نے بچپن میں ایسی کتنی ہی خواتین کو اس گھر میں گھر والوں ہی کی طرح رہتے دیکھا اگر کسی لحاظ سے کمزور ہیں تو قیام کا وقفہ بڑھتا رہتا چار پانچ مہینے رہ کر واپسی کا ارادہ کرتیں تو امی جان (نانی صاحبہ) بہ اصرار روک لیتیں بلکہ اکثر تو ان کی ڈولی (سواری) کو آدھے راستے سے واپس بلوالیا جاتا، اباجی اور امی جان کا گھر بھرا رہتا ان کے ساتھ عزت وقار اور محبت و تعلق کا اس طرح اظہار کیا جاتا جیسے اور خواتین کا اکرام ہوتا تھا، اباجی اور امی جان کسی بھی لمحے یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کسی پریشانی میں اس گھر میں مقیم ہیں، اس سلسلے میں امی جان اور ان کی بہویں (اہلیہ مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ و اہلیہ مولانا محمد اسلم قاسمی مدظلہ) کا انداز بھی اپنے بزرگوں جیسا ہی رہا، ہر آنے والے کے لئے دل ونگاہ فرش راہ، اباجی کے مکان (طیب منزل) کا مردانہ حصہ کہلاتا تھا، اس میں بھی درمیان میں صحن اور تین طرف برآمدے اور کمرے بنے ہوئے ہیں ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں اباجی کی شام کی مجلس ہوتی تھی، جس میں عموماً اساتذہ، طلباء اور احباب آکر بیٹھتے تھے، یہ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت ہوتا تھا وہاں کے دلچسپ واقعات اباجی ہمیں سناتے تھے، باقی کمروں میں اسی طرح لوگ رہتے تھے جیسے اندر زنان خانے میں خواتین تھیں۔ کچھ کمروں میں طلباء بھی رہتے ان سب کے لئے صبح ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک کا انتظام گھر سے ہوتا تھا۔

اباجی کی زندگی میں ہم نے نظم وضبط دیکھا وقت کی قدر دیکھی، اور وہی چیز ہم نے اپنی والدہ میں دیکھی، اباجی فجر کی نماز کے بعد اپنی اسٹڈی (بنگلے) میں پہنچ جاتے اور دو ڈھائی گھنٹے وہاں تصنیف وتالیف میں مشغول رہتے، پھر مدرسے کے لئے روانہ ہوتے دفتر اہتمام ان کا منتظر رہتا، ان کے دور اہتمام میں مدرسے نے غیر معمولی ترقی کی علمی اعتبار سے اساتذہ کا علمی شغف عروج پر تھا اور طلباء کا شوق حصول علم بے مثال اس دور کے بڑے صاحبان علم وفضل جیّد علماء مدرسے کے اساتذہ میں شامل تھے۔

اس کے علاوہ نئی عمارات کا سلسلہ بھی جاری تھا اسی دور میں مدرسہ اس لحاظ سے بھی خوبصورت، کشادگی اور تعمیری حسن کا منھ بولتا نمونہ بن گیا، جس پر کچھ مخلصین نے اباجی کو اپنے دور کا شاہ جہاں کہا، ہم اکثر شام کو اباجی کے ساتھ مدرسے جاتے خوب گھومتے، کھیلتے، بعض اوقات اباجی سے اجازت لے کر ہماری امی (محترمہ ہاجرہ نازلی صاحبہ مرحومہ) اور ہماری ممانیاں، خالہ اور گھر کی کچھ اور رشتے دار خواتین بھی ہمارے ساتھ ہوتیں، ہماری والدہ کو مدرسے کے مطبخ کا کھانا بہت پسند تھا، جو عام طور پر آلو گوشت (شوربہ)

اور اڑد کی دُھلی دال پر مشتمل ہوتا، وہ کھانا جو مدرسے کے طلباء کے لئے مطبخ (باورچی خانہ) میں پکتا تھا، والدہ اباجی سے وہاں کے کھانے کی فرمائش کرتیں، اباجی فرماتے جس قدر سالن منگوانا ہے اسی قدر گھر کے سالن میں سے وہاں بھجوا سلئے کہ وہ کھانا طلباء کا حق ہے تمہارا نہیں، پھر امی جان سے کہتے ایک دیگچی میں گھر کے سالن میں سے بھیجد و اسی مقدار کا وہاں سے آجائے گا، ہاجرہ کا دل چاہ رہا ہے مطبخ کے کھانے کو، امی جان کسی ملازم کے ہاتھ بھجوا دیتی اور وہاں سے آجاتا، بے حد مزیدار ہوتا تھا۔

امانت و دیانت کلیہ غیر معمولی انداز اپنی اولاد کے لئے بہترین عمل تھا، ورنہ ایک دیگچی سالن منگوانا بڑی بات نہیں تھی لیکن دینی اصلاحی و اخلاقی فکر کے تحت اباجی نے اس بات کو گوارا نہیں کیا، انسان کا چھوٹا عمل بھی بڑے نتائج دیتا ہے، مثال بن کر ہی بے مثال نئی نسل وجود میں آتی ہے اور ان کے سامنے تو ملت تھی، اباجی کی یہ تربیت گھر کے لئے تھی لیکن عالم دین عالمی طور پر لوگوں کو متاثر کرتے ہیں، اباجی کے غیر ملکی اسفار سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ ان کو کتنی محبت وارفتگی اور عقیدت سے بلاتے تھے، ذاتی فیض کا تعلق انسان کے بہترین اعمال سے ہے اور اباجی کی شخصیت مسلمانوں ہی نہیں غیر مسلموں کے لئے بھی باعث خیر تھی، باعث رشک تھی۔

اباجیؒ جب پہلی بار امریکہ گئے تو ان کو ایئر پورٹ پر لینے کے لئے برادر بزرگ محترم ڈاکٹر عابداللہ غازیؔ بھی پہنچے، ایئر پورٹ سے باہر آئے اباجی ان کے ہمراہ تھے تو ایک امریکن خاتون نے بھائی میاں (عابداللہ غازی) سے معلوم کیا یہ کون صاحب ہیں میں جہاز میں بھی ان کو دیکھ رہی تھی، میں نے ان کے چہرے پر روشنی کا ایک ہالہ دیکھا ''بھائی میاں'' نے اباجیؒ کا تعارف کروایا تو بولیں ''یقیناً یہ اللہ کے خاص بندوں میں سے ہیں''، ممکن ہے ان امریکن خاتون کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہو، قرآن کریم میں آتا ہے۔

''انّ الذّینَ آمنوُ والذّینَ ھَا دوُ ا والنّصریٰ والصّا بین مَنْ آمنَ باللّٰہ والُیومِ الاٰ خر وَعملِ صالحاً فلھُمْ اجر ھُمْ عِنْد ربّھمْ وَلَا خوفٌ عَلیھمْ وَلَا ھُمْ یحزنوُن''

ترجمہ : یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان اور یہودی اور نصاریٰ (عیسائی) اور فرقۂ صابئین (ان میں سے) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ (کی ذات اور صفات) پر اور روز قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے، ایسوں کے لئے ان کا حق الخدمت بھی ہے ان کے پروردگار کے پاس اور (وہاں جاکر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

اللہ کے یہ خاص بندے عوام کو اسی طرح متاثر کرتے رہے ہیں اباجیؒ کا جو اخلاق تھا اس نے لاکھوں

لوگوں کے دلوں میں اسلام کی روشنی پہنچائی، یہاں میں اپنے ماموں صاحب خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کے خطبات میں سے چند سطریں پیش کر کے اپنی بات پر دلیل دوں گی، جو سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں انھوں نے بیان فرمائی۔

''پہلی بات یہ ہے کہ شخصیت اور ذات کو جان لیجئے جس کی سیرت سے آپ واقف ہونا چاہتے ہیں جب آپ ذات سے واقف ہوں گے تو پھر آپ اس کی بات سے واقف ہوں گے، بات کی عظمت ذات کی خصوصیت سے پیدا ہوتی ہے، اس لئے جب شخصیت کا تعارف ہو جائے تبھی بات کی حقیقت سامنے آتی ہے اس لئے دونوں چیزوں کا تعارف ہونا ضروری ہے کہ آپ کی ذات کیا ہے اور بات کیا ہے، شخصیت کیا ہے اور کلام کیا ہے اور پیغام کیا ہے''

اباجیؒ قبلہ علماء کی صف میں اس بلند مقام پر نظر آتے ہیں جہاں خانگی زندگی سے لے کر عالمی امور تک میں سیرت مبارک صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضان دکھائی دیتا ہے اویہی بات ان کی شخصیت کا تعارف دیتی ہے۔

اباجی اور امی جان (نانا، نانی صاحبان جنت مکان) میں آپس میں بڑا گہرا تعلق تھا، مزاج کی ہم آہنگی، موانست، حلاوت کی بناء پر ہمیں تو یہ رشتہ بڑا روحانی انداز کا لگتا تھا، اباجی جب بھی سفر پر جاتے ہندوستان کا یا غیر ملکی سفر امی جان ہمیشہ شریک سفر ہوتی تھیں، وہ علمی مزاج رکھتی تھیں، تعلیم یافتہ تھیں سنجیدہ تھیں انداز گفتگو بیحد دلنشیں تھا جہاں جہاں اباجی کے ساتھ جاتیں خواتین میں وعظ ونصیحت کے ذریعہ دینی مسائل بتاتیں اور اصلاح کا کام کرتی تھیں ممبئی میں ان کی علمی مجلسوں میں مجھے بھی شریک ہونے کا موقع ملا، خواتین ان سے متاثر ہوتی تھیں۔

اباجیؒ نے ان کے انتقال کے بعد اپنے تاثرات لکھے تو اس میں ایک جملے میں سارے جذبات آ گئے۔ ''میں ان کی نیکی سے ہمیشہ متاثر رہا'' اسلامی اصولوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے جو حقوق عورت کو عطا فرمائے ہیں وہ ہم نے اباجی کی زندگی میں ہمیشہ محسوس کئے تھے اور دیکھئے امی جان مرحومہ ایک وزیر کی صاحبزادی تھی ان کے والد اندر گڑھ کے راجہ کے یہاں وزیر اعلیٰ تھے راجہ ان پر بہت اعتماد کرتا تھا، اباجی جب اندر گڑھ جاتے تھے تو راجہ کا اپنا ذاتی سواری کو اسٹیشن بھیجا جاتا تھا، داماد کو لانے کے لئے امی جان کا بچپن راجہ کے محل میں گزرا تھا، راجہ کی اپنی بیٹی امی جان کی ہم عمر تھی دونوں ساتھ ساتھ کھیل کر بڑی ہوئی تھیں امی جان فرماتی تھیں رانی ماں بیحد سلیقہ شعار تھیں امی جان کو گرہستی کے ہنر رانی نے ہی سکھائے (سلائی، بنائی، کڑھائی وغیرہ) چونکہ وہ ایک ہندو ریاست تھی اور وہیں کے محل میں امی جان کا بچپن اور نوعمری کا زمانہ گزرا تھا اس

لئے وہ بڑے کا گوشت نہیں کھاتی تھیں، کہتی تھیں اس طرف دل مائل نہیں ہوتا ابا جی نے ہمیشہ ان کے احساسات اور جذبات کا خیال رکھا اور بلا ناغہ امی جان کے لئے بکری کا گوشت آتا تھا، جن سے تعلق ہو محبت ہو ان کے جذبات و احساسات کی قدر کرنا ہم نے ابا جیؒ سے سیکھا، انسان کی ہر دل عزیزی کا تعلق دل دہی سے ہے خیر خواہی سے ہے، ایک مصلح، امامِ، رہبر، رہنما کے لئے تو یہ اصول بے حد ضروری ہے۔

ابا جیؒ کی ذات ہمارے لئے روشنی کا مینار تھی، بچپن سے ہم نے ان کے چہرے پر عزم واستقلال کے ساتھ ایک پرنور مسکراہٹ دیکھی، جس نے ہمیں حوصلہ مند بنایا، غیرت نفس کے ساتھ جینا سکھایا۔

مزاج کی فراخی، کشادگی، نرمی اور شفقت کا معیار مقرر کرنے کے لئے ابا جی کی ذات ہمارے لئے ایک مثال ہے اور میرے خیال میں وہ تمام حضرات جن کا ابا جیؒ سے واسطہ یا رابطہ رہا، جنھوں نے ان کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہے مجھ سے متفق ہوں گے۔ شیخ سعدیؒ نے فرمایا

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلافِ نیست

(بارش کہ کس کی فطرت میں لطافت وسودمندی ہے اس پر کسی کو اختلاف نہیں ہے)

خاندانی شرافت اور علمی ماحول

خاندانی شرافت ہزاروں صفحات سیاہ کرنے کے بعد بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ ہر شبہ سے بالا تر، ہر اختلاف سے ماوراء، ہر بحث سے مستثنیٰ، اور کیوں نہ ہو ہزاروں لاکھوں کو نسبت قاسمیہ نے کھرا سونا بنا دیا، کیا اس سے اندازہ لگانا مشکل ہے کہ خود یہ نسبت اپنے آپ میں کتنی عظیم چیز ہے جو براہ راست حضرت حکیم الاسلامؒ کو حاصل ہے!

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”کس قدر خوش نصیب ہے وہ انسان جسے حسب ونسب کی شرافتیں، گھر کا پاکیزہ ماحول، شریف الطبع والدین، ظاہر و باطن کی تربیت، علم و تعلم کے لئے یگانۂ روزگار شخصیتیں ملی ہوں، واقعی اس سے بڑھ کر کوئی سعید اور جس کے حصہ میں یہ سب امتیازات ہوں اس سے بڑھ کر کوئی بخت آور نہیں۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو یہ سب سعادتیں لگے بندھے انداز میں نہیں بلکہ وافر میسر تھیں، ان کی دادھیال میں حضرت نانوتویؒ کا نام نامی کافی وافی ہے۔ نانیہال دیوبند کی ایک شریف بلکہ اشرف خانوادہ، گھر کا ماحول علمی، تعلیم اور تعلم کا سلسلۂ فخر روزگار شخصیتوں تک پہنچتا ہے، روحانی تربیت کے لئے مجدد وقت سے وابستگی، خود طبعاً شریف، حلم کے پیکر، بزرگانہ اداؤں کا مرقع۔“

باکمال اساتذہ سے کسب فیض

ایک شفاف ابلتے ہوئے چشمے سے کتنی شفاف نہریں نکل کر سینکڑوں کشت زاروں اور چمنستانوں کی سرسبزی وشادابی اور شابی ورعنائی کا سامان بنتی ہیں۔ باکمال اساتذہ سے حکیم الاسلامؒ کے کسب فیض کے لئے یہ تمثیل اگر پوری طرح صحیح نہ ہو قریب قریب تو ہے ہی، سبحان اللہ! علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حکیم الامت حضرت تھانویؒ جیسے جبال علم سے نہ صرف کسب فیض بلکہ ان کی نگاہ خاص وفیض خاص جن کے حصہ میں آیا وہ حضرت حکیم الاسلامؒ ہی تو تھے۔

حضرت مولانا انظر شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''شعور نے آنکھ کھولی تو یہ عصر دارالعلوم کا خیر القرون تھا، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی اگرچہ بینائی جاتی رہی تھی تاہم حیات تھے، بارہا اپنے سینہ بلکہ معرفت وعرفان کے گنجینہ سے مہتمم صاحبؒ کو مس کیا، شیخ الہندؒ کا دست شفقت سر پر رہا، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ سے ابتدائی اسباق لئے۔''

حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے بڑا وقت آپ کی تعلیم کے لئے صرف کیا اور پھر دارالعلوم جو اس وقت ممتاز شخصیتوں کا کہکشاں تھا ان میں سے ہر ایک افادہ کے لئے سرگرم گویا کہ:

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں میرا حق ہے فصلِ بہار پر

آخر کار اپنے وقت کے محدث جلیل القدر ابن حجر اور ثانی ابن ہمام علامہ کشمیریؒ کے اتھاہ علم سے سیرابی کے لئے مستعد ہو گئے اور جم کر استفادہ کیا تا آں کہ جس شب میں علامہ اس خاک دامنی ارضی کو چھوڑ رہے تھے عصر تا مغرب اپنی معروف کتاب ''مشاہیر امت'' کے لئے بسلسلۂ ابوالحسن کذاب استفادہ فرماتے رہے۔''

اخلاق

اخلاق عالیہ کی کھلی کتاب، زندگی کے ہر ہر شعبہ میں پاکیزہ اخلاق کی جھلکیاں، اعمال ان کی تصویر، احوال ان کی تفسیر، معاملات، معمولات ان کی شرح، پھر زبان وقلم گفتگو میں جاری اور جملہ احوال زندگی میں سرایت کئے ہوئے ایک مستقل ضخیم وکیم شخیم کتاب ''اسلام کا اخلاقی نظام'' پڑھیں تو اندازہ ہوگا کہ صاحب کتاب کی فکروذہن اور علم ومطالعہ کا افق کتنا وسیع، کتنا عظیم الشان تھا۔ یہ تو ایک نمونہ ہے جولان گاہ شخصیت کے ایک زاویہ کا، ورنہ پوری شخصیت اس باب میں مثالی، نرالی اور دل کشا مناظر کا ایک صحیفہ ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں:

''حکیم الاسلامؒ نہایت متین، باوقار شخص اور تواضع واخلاق کا پیکر تھے، اسی کے ساتھ پرشکوہ اور باوقار بھی''

مولانا حکیم عبدالرشید محمود گنگوہی تحریر فرماتے ہیں:

''بے شمار محاسن و مکارم اور مناقب ومحامد کے ساتھ ان کی طبع لین، علم وفضل سے معمور، سیرت، معاملات ومعاشرت میں ستھرا، بے عیب متوازن کیریکٹر، جدال ومراء سے تنفر، غیر متصادم مزاج''

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی فرماتے ہیں:

''حضرت حکیم الاسلامؒ کے پیکر میں معصومیت حسن اخلاق اور علم وعمل کے جو نمونے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں، ان کے نقوش دل ودماغ سے محو نہیں ہو سکتے''

مخصوص عادات

عفو ودرگذر، حلم وبردباری، خوردنوازی، خیر خواہی وہمدردی بچوں کے ساتھ بچوں کی طرح معصوم اور شفیق، جوانوں میں بہترین ناصح مصلح، خیر پسند، بوڑھوں میں تجربات ومشاہدات کی چلتی پھرتی کائنات، علماء میں علم ومطالعہ، حکمت ومعرفت کا تاج محل، عوام میں ایک دردمند دینی شخصیت، جس کی زبان سے دین وایمان کی تشریحات کے پھوٹتے ہوئے لاکھوں شفاف آبشار۔

مولانا سید ازہر شاہ قیصر صاحبؒ اپنے ایک طویل مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مرحوم ایک بے حد مصروف زندگی کے انسان تھے، مزاجاً بھی نفاست پسند تھے کہ ان کے اوپر کی کئی پیڑھیاں خوش حال زمین داروں اور قصباتی رئیسوں کی پیڑھیاں تھیں، اچھا لباس اور گھر کا اچھا ماحول پسند فرماتے تھے، مگر اسی نفاست پسندی کے ساتھ سخت کوش اور اوقات کے سخت پابند تھے، سفر میں ہر طرح کی صعوبت بآسانی برداشت کرتے تھے، سفر وحضر میں کھانا اگر معمول کے مطابق نہیں ملتا تھا تو کبھی ناگواری کا اظہار نہیں فرماتے تھے، غریب سے غریب انسان کے دسترخوان پر بیٹھ کر انہیں دال بھات کھانے میں کوئی عذر نہ تھا، ان کی خندہ روئی، چہرہ کی مسکراہٹ، لب ولہجہ کی شیرینی، بڑی نرمی اور آہستگی کے ساتھ اصلاحی اقدامات کو آگے بڑھانے کا طریقہ ان کے اردگرد کے لوگوں کو متاثر کرتا تھا، اصلاح کے لئے ان کا طریقہ سخت گیری کا نہیں تھا بلکہ وہ اپنے ماحول میں اپنے اوقات کے انضباط اور اپنے اخلاق کی مضبوطی سے تغیر پیدا فرماتے تھے، غریبوں کی مالی مدد فرماتے تھے، مگر بہت پوشیدہ طور پر اس طرح کہ لینے اور دینے والے ہاتھ کے سوا اور کسی کو پتہ نہ چلے، امانت کی ذمہ داری کو خوب سمجھتے تھے، اگر کوئی شخص انہیں دس روپئے بھی کسی دوسرے شخص کو پہنچانے کے لئے دیتا تھا تو پوری کوشش فرماتے تھے کہ جسے امانت دینی ہے اس تک

خود پہنچ کر امانت سپرد کر دیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کی ادائیگی میں ان کا غیر معمولی شغف انتہائی طور پر حیرت انگیز تھا، مغرب کے بعد چند نوافل میں قرآن کریم کے ایک دو پاروں کی تلاوت ان کا معمول تھا اور اس معمول کو وہ ہوائی جہاز، ریل، ہوائی اڈوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر بھی پورا فرماتے تھے، مجلس کے اوقات متعین تھے، اس سے زائد وقت مجلس میں صرف نہیں فرماتے تھے، تحریر وتصنیف کی دنیا الگ تھی اور اس دنیا سے بھی ان کی وابستگی دائمی تھی، تقریر کی خوبیاں اور کمالات ان پر نازل ہوتی تھیں، سوتے سوتے بھی تقریر فرماتے تھے اور نیند کی یہ تقریریں بھی انتہائی مربوط، موثر اور منطقی لحاظ سے مکمل ہوتی تھیں، ان کی نیند کی تقریروں کی بہت سی کیسٹ لوگوں کے پاس موجود ہیں جنہیں سن کر قطعاً اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ بیداری کی تقریریں نہیں بلکہ نیند کی تقریریں ہیں، گھنٹہ گھنٹہ بھر کی پوری تقریر بلند آواز اپنے مخصوص لہجہ میں سوتے سوتے فرما دیتے تھے اور خود انہیں کوئی احساس نہ ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔''

ذوقِ عبادت وریاضت

جبینِ مبارک پر سجدہ کے نشانات، ذوق عبادت، شوق ریاضت کے غماز، چہرے کی نورانیت، نالۂ نیم شبی وآگاہ سحر گاہی کی علامت، آواز میں سوز وگداز، خوف وخشیت کا آئینہ دار، معاملات میں احتیاط، تقویٰ وطہارت کی دلیل، خیر خواہانہ جذبات، عبادت بے ریا کا پتہ دیتے، انتظام وانصرام و معمولات، لکھنے پڑھنے کے مشاغل اور اسفار کی مشغولیات کے ساتھ شب بیداری، ذکر وتلاوت کے معمولات سب سے بڑھ چڑھ کر۔

حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی رقمطراز ہیں:

''وہ عبادت وریاضت کے رسیا تھے، لگتا تھا کہ واقعی اسی کے لئے مخلوق ہوئے ہیں، سنن ونوافل اور قیام باللیل کی اسفار میں بھی ایسی پابندی تھی کہ جواں سال حوصلہ مند صالح جوانوں کی ہمت بھی اُس کے سامنے جواب دے دیتی تھی، مغرب کے بعد نوافل اور وقتِ تہجد کی نمازوں میں کئی کئی پارہ تلاوت کا معمول رہا، جس میں موت تک کبھی خلل نہیں پڑا۔ وہ عبادت وتلاوت میں انہماک کے حوالے سے بھی اپنے اسلاف کے امانت دار وارث تھے۔ دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم ادارے کے اتنے طویل عرصے تک قیادت کے لئے جو باطنی جوہر، قلبی کیفیات اور روحانی وارادات درکار تھیں اُن کے معیار پر نہ صرف وہ مکمل طور پر اترتے تھے، بلکہ پوری جماعت کے لئے اس حوالے سے بھی قائد وداعی تھے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس ادارے کی اس طویل دورانئے تک سربراہی کے لئے خدائے حکیم نے ہی اُنہیں بنایا اور منتخب کیا تھا۔ تاریخ

کے ہر طالب علم کا اس سچائی پر ایمان ہے کہ موزوں انسان جب جب کسی موزوں جگہ پر فائز رہا ہے، انسانی معاشرہ، فکر و عمل کے بے طرح نتائج سے مستفید ہوا ہے، جن کے برکات و ثمرات کا احاطہ بعض دفعہ بڑے بڑے بصیرت نگاہوں مورخ کے لئے ایک مشکل عمل ثابت ہوا ہے۔ اُس کے برعکس ہونے کی صورت میں انسانوں کو دیرپا اور دوررس نتائج بھگتنے پڑے ہیں۔ حکیم الاسلامؒ خدا کی تقدیر وانتخاب سے اس کے سربراہ ہوئے اور خدائے قدیر نے انہیں ان تمام خوبیوں سے نوازا جو اس الہامی ادارے کی کشتی کو صحیح سمت میں بہ سلامت کھینے کے لئے ناگزیر تھیں۔ (۳۷)

جامع الصفات

اسلاف دیوبند کی علمی، عملی، اخلاقی اور دینی خصوصیات اور امتیازات کو جاننے کے لئے اگر الگ الگ مطالعہ اور الگ الگ کتابوں کی ورق گردانی کی فرصت میسر نہ ہو تو مشورہ یہ ہے کہ صرف حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کو دیکھ لیجئے، سب کے اوصاف اس ایک شخصیت میں یکجا مل جائیں گے۔ ع

بشر میں عکس موجودات عالم ہم نے دیکھا ہے
وہ دریا ہے یہ قطرہ لیکن اس قطرے میں دریا ہے

مولانا سید عبدالرؤف عالی صاحبؒ فرماتے ہیں:

”بعض شخصیتیں اتنی جامع الصفات ہوتی ہیں کہ ان کے کارناموں اور کارگزاریوں پر نظر ڈالنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ زندگی کا کون سا پہلو ایسا ہے کہ جو اس شخصیت کے لئے وجہ امتیاز ہے اور جس کی چھاپ زندگی پر زیادہ ہے، کہیں تو ایسا ہوتا ہے کہ مختلف جہات میں جو کارنامے وجود پذیر ہوتے ہیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف اور ممتاز ہوتے ہیں، اس لئے ان کی نشاندہی بہ آسانی کی جاسکتی ہے اور ان کی حدود تعین بھی ممکن ہوتی ہے، لیکن بعض افراد ایسی گوناگوں صفات کے حامل اور اتنی مختلف النوع صلاحیتوں سے بہریاب ہوتے ہیں جن کو ایک دوسرے سے الگ کرنا آسان نہیں ہوتا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت بھی ان ناقابل فراموش افراد میں شامل ہے جو اپنی ذات سے ایک انجمن ہوتے ہیں اور جن کے فکر و عمل کے دائرے زندگی کے ہر گوشے تک پھیلے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ خود ان کی ذات معاشرتی اور جماعتی زندگی سے ایسی مربوط ہوتی ہے کہ جب کبھی ان کی ذاتی زندگی پر نظر ڈالی جاتی ہے اور ان کی خدمات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو وہ ایک لحاظ سے

وقت کی تاریخ کا بھی ایک جائزہ ہوتا ہے، وہ ایک فرد ہی کی تاریخ نہیں ہوتی، بلکہ اس وقت کے معاشرے اور جماعت کی تاریخ کا بھی بہت کچھ عکس اس میں آجاتا ہے۔'' (۳۸)

صبر وضبط

معمولی ناگواریوں اور تکلیفوں میں بھی صبر وضبط کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے، مگر جاں گسل حالات اور حوصلوں کو پست کر دینے والی مشکلات وحوادث میں صبر وضبط ایک ایسی اخلاقی صفت ہے جو انسان کو عظمت اور عزیمت کے مقام پر پہنچاتی ہے۔ تاریخ اسلام صبر آزما حالات اور دلدوز حادثات کی سچی داستانوں سے پُر ہے۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ ان حالات سے گزرنے والوں نے نہ صرف بے مثال صبر وضبط کا مظاہرہ کیا بلکہ اولوالعزمی کی ایک تاریخی رقم کی، جو بعد میں آنے والوں کے لئے راہِ حق میں مصائب جھیلنے اور صبر سے کام لینے کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئی۔

حکیم الاسلامؒ دارالعلوم دیوبند جیسے عالمی دینی ادارہ کے طویل المدت مہتمم رہے، ایک منتظم اور ذمہ دار کتنا بھی نرم مزاج اور بردبار ہو، تب بھی ضروری نہیں کہ ماتحت ہمیشہ اس سے خوش رہیں یا اس کی عظمت و احترام میں فرق نہ آنے دیں۔ حضرت حکیم الاسلامؒ خود فرماتے تھے کہ اہتمام ''ہَم'' سے بنا ہے گویا دردسر ہے۔ دورِ اہتمام میں ماتحتوں کی طرف سے یقیناً تکلیف بھی پہنچی ہوگی اور عمر کی آخری منزل میں انہیں جن تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑا ان میں آپ کے صبر وضبط کا جوہر کھلا اور بدترین دشمن نے بھی اس کا اعتراف کیا کہ حکیم الاسلامؒ واقعی صبر وضبط کا پیکر اور عزم واستقلال کا پہاڑ تھے۔ سخت سے سخت مرحلہ پر بھی اف تک نہیں کیا، دوسروں کو بھی اس کی تلقین کی۔ قضیہ دارالعلوم دیوبند اس کی زندہ مثال ہے۔

مستقل مزاجی

آپ کی زندگی کے طویل عرصہ میں خدا جانے کتنے نشیب وفراز آئے، کتنے سنگلاخ آئے ہفت خواں آئے، پہاڑوں سی رکاوٹیں کھڑی ہوئیں، طوفانوں نے قدم روکنا چاہا، فتنوں کے سیلاب امنڈے، مخالفتوں کا طوفان ابلا، عداوتوں کی آندھیاں چلیں، مخاصمتوں کے بگولے اڑے اور ایک وقت تو وہ آیا کہ از مبتدا تا خبر، از اول تا آخر۔ سوائے عداوت ومخالفت کے اور کچھ نہ رہا، لیکن یہ حلم کا پہاڑ، وقار کا بادشاہ، مکارم اخلاق کا خسرو، شرافت وانسانیت کا شہنشاہ، مروت ووفا کا تاجدار اپنی جگہ سے قطعاً نہیں ہلا، استقامت میں فرق نہیں آیا، طمانیت نے لڑکھڑانا نہ جانا، سب سنا، سب نے کہا، حریف دست گریباں ہوئے، چھوٹوں نے

ان کی دستار فضیلت سے کھلواڑ کیا، مگر مرحوم نے نہ کسی کو جواب دیا، نہ کوئی انتقامی کارروائی کی، نہ غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا، بلکہ غم کا ہمالہ اپنے دل پر لے کر اس دنیا ودوں سے منہ موڑ لیا۔

عزم مستحکم

عزم کے پکے جو بات ذہن مبارک میں آئی وہ ذہن ہی کی امانت نہیں رہی تمام حدود و قیود کو پھلانگتے ہوئے عمل کی دنیا تک پہنچی جس بات کو صحیح سمجھا گیا، اس پر عمل کے عزم مصمم نے بڑوں بڑوں کو سبق سکھایا۔ جو اس تردد کا شکار رہتے۔ ع

ارادے باندھتا ہوں توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے

اس ایک پختہ عزم اور مصمم ارادہ کو محسوس شکل میں کوئی دیکھ سکا ہے تو وہی شخص دیکھ سکا جس نے حکیم الاسلامؒ کو اپنے عہد میں دیکھا۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۸۰ء میں جب حضرت حکیم الاسلامؒ مالیر کوٹلہ تشریف لائے، میں نے ایک پروگرام کے متعلق درخواست کی اور اس کو آپ نے قبول فرما لیا، پورے پروگرام کے اشتہارات کی کتابت کروا کے میں دیو بند پہنچا تو دیکھا کہ دارالعلوم میں شورش کا آغاز ہو چکا ہے، یہ اسی شورش کا ایک سلسلہ تھا جس نے آخر سقوط دارالعلوم کی بدنما شکل اختیار کر لی اور جس حادثے سے آج بھی دل زخمی محسوس ہوتے ہیں۔

احاطۂ دارالعلوم میں نعرے بازیاں ہو رہی تھیں، میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے آپ کے پروگرام کے اشتہارات کتابت تو کروا لئے ہیں، ابھی چھپے نہیں ہیں اور یہاں حالات پراگندہ نظر آرہے ہیں، ایسا نہ ہو کہ پروگرام منسوخ کرنا پڑے۔ حضرت نے پورے اعتماد اور سکون سے فرمایا کہ نہیں، میں انشاءاللہ وقت پر پہنچوں گا، تم اشتہارات چھپوالو، اس کے بعد دوسرے وقت میں پھر حاضر ہوا اور میں نے کچھ شک کا اظہار کیا کہ پتہ نہیں حالات کیسے ہوں اور آپ تشریف لا سکیں کہ نہیں، حضرت حکیم الاسلامؒ نے پورے سکون کے ساتھ فرمایا کہ نہیں میں پہلے ہی آجاؤں گا، تم اشتہار چھپوالو اور اطمینان رکھو، چنانچہ یہی ہوا کہ حضرتؒ مقررہ تاریخ سے پہلے ہی تشریف لائے اور کئی روز تک یہاں بڑے اطمینان کے ساتھ قیام فرمایا۔" (۳۸)

حلم و بردباری

مہتمم صاحبؒ مرحوم کے اوصاف خصوصی میں حلم تھا، جس کی نظیر و مثال صدیوں کے اربابِ انتظام میں نہیں ملتی، تصور کیجئے تین سو کا عملہ ان کے ساتھ تھا، جس میں اچھے بھی تھے، برے بھی تھے، فرض شناس بھی تھے اور لا ابالی بھی، خیر بھی وجود میں آتا اور شر بھی، مگر کیا مجال کہ حضرت مہتمم صاحبؒ کے حلم میں کوئی فرق پیدا ہو، مخالفتوں کا طوفان ہزاروں میل کی رفتار سے اٹھا اور ان سے مسلسل ٹکراتا رہا، مگر ان کے حلم میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی، ایک شقی نے جب کہ یہ پچاسی سال عمر سے گزر رہے تھے اور حضرت زکریا علیہ السلام کے لہجہ میں **قد بلغت من الکبر عتیا** (یعنی بڑھاپے کی وجہ سے ہڈیوں میں بھی گودا نہ رہا کا پیکر بنے ہوئے تھے) ایک بے سروپا نہیں بلکہ فحش داستان نہایت متعفن لب و لہجہ میں اپنے اخبار میں شائع کر کے شقاوت ازلی کا مظاہرہ کیا تو دیوبند کے دو نامور صحافی حضرت کے حلم کا امتحان لینے کے لئے یہ اخبار لے کر سیدھے ان کی خدمت میں پہنچے، اخبار ان کے ہاتھوں میں تھا، عادت یہ تھی کہ جو چیز پڑھنے کو ملتی تو اس کو پورا پڑھ لیتے، مصروفِ مطالعہ ہو گئے، پورا مضمون پڑھ ڈالا، صحافی ان کے چہرہ و بشرہ کا جائزہ لیتے رہے، مگر کیا مجال کہ چہرے پر آثارِ غضب نمایاں ہوں یا پیشانی پر تلخ احساسات کی کوئی لکیر پڑی ہو، مطالعہ سے فراغت پر گردن اٹھی اور لب ہائے نازک پر وہی دلنواز مسکراہٹ کھل گئی، دریافت فرمایا کہ یہ اخبار کچھ بک بھی جاتا ہے؟ دونوں نے عرض کیا کہ بکتا ہے اور پڑھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے تشویش پیدا ہوئی آپ کی خدمت میں تردید کے لئے حاضر ہوئے، مگر دونوں کی توقعات پر نہ آنے والے جملہ ارشاد فرما کر برف کے تودے کے تودے گرا دیئے۔

”بھائی یہ میری کتنی بڑی سعادت ہے کہ لوگ مجھے گالیاں دے کر اپنا پیٹ پال رہے ہیں اور مجھے مفت کا ثواب مل رہا ہے۔“

غیبت سے اجتناب

غیبت بدترین اخلاقی بیماری ہے، جو ہمیشہ اخلاقی جرأت کی کمی کے باعث وجود میں آتی ہے۔ اگر انسان حق گوئی اور صاف گوئی کی صفت سے آراستہ ہو تو غیبت جیسی اور بھی بہت سی اخلاقی بیماریاں انسان سے دور رہتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص بلا خوفِ لومۃ لائم و بے لاگ اور ڈنکے کی چوٹ پر اپنی بات کہہ سکتا ہے اسے پیٹھ پیچھے کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور جو شخص اس جرأت سے محروم ہو وہ ہمیشہ غیبت کا سہارا لیتا ہے۔

غیبت جس طرح اخلاقی جرأتوں کا خون کرتی ہے اسی طرح بزدلی، کم ہمتی، مداہنت فی الدین اور مصلحت بینی جیسے رذائل کو بھی جنم دیتی ہے۔

حکیم الاسلامؒ کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح دیگر اخلاقِ عالیہ سے نوازا تھا، اسی طرح سے اخلاقی جرأت، صاف گوئی اور بے لاگ گفتگو کے جوہر سے بھی آراستہ کیا تھا۔ غیبت کرنا تو درکنار انہیں غیبت سننا بھی گوارا نہ تھا۔ ان کی مجلس میں بیٹھنے والے یا ان کے مزاج سے واقف لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ اس قسم کے رذائل سے پاک ہیں۔ اس لئے اولاً تو اس کی نوبت ہی نہ آتی تھی کہ آپ کی مجلس میں غیبت ہو۔ اگر کوئی نووارد یا آپ کے مزاج سے ناواقف ایسی گفتگو کرتا جس میں غیبت کا کوئی پہلو نکلتا تو اس پر سخت ناگواری کا احساس فرماتے اور بروقت تنبیہ بھی۔ یہ تو ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص آپ کی مجلس میں غیبت کرے اور حکیم الاسلامؒ خاموشی سے سنتے رہیں، جیسے آج کے دور میں ہماری علمی مجلسیں بھی اس رذیلہ کا شکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

حضرت مولانا انظر شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

”غیبت کا ان کے یہاں پر دروازہ پوری قوت سے بند تھا، بہت کچھ کسی کے حق میں فرماتے تو یہ ”بھائی بڑا اچھا آدمی تھا، کاش کہ کسی مفید کام میں لگتا“ یا ”فلاں صاحب تو اپنے ہی ہیں خدا جانے ان کو کیا ہو گیا“ حالاں کہ کبھی کبھی ان کے متعلقین پر ان کا یہ انداز گراں گذرتا“ وہ مصلحت وضرورت کا تقاضہ سمجھتے کہ حضرت کچھ تو جواب دیں، مگر یہاں لاکھوں کروڑوں تیروں کا ایک جواب ”نشانہ بننا“ تھا نہ کہ ”نشانہ لگانا“ صورتِ حال پر کبھی بہت ہی دل آزار ہوتے تو فتنہ کے طول وعرض کو واضح کرنے کے لئے فضاء میں اپنی انگشت شہادت گھماتے ہوئے فرماتے کہ ”بھائی یہ ہر وقت کی ہو ہو ہمیں تو اچھی نہیں لگتی“ ہمارا تو لکھنا پڑھنا ہی ختم ہو گیا۔ وقار اس طرح کوٹ کوٹ کر ان کی فطرت میں بھرا پڑا تھا کہ کبھی بے وقاری کا کوئی پرتو ان کی زندگی میں نہ نظر آیا۔“

مدح سرائی سے اجتناب

خود ستائشی اور مدح سرائی بھی ایک بدترین اخلاقی مرض ہے جو بسا اوقات متعدی ہو جاتا ہے، جو لوگ اس بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں وہ نہ تو اپنی اصلاح کر سکتے ہیں نہ دوسرے ان سے کوئی مفید چیز سیکھ سکتے ہیں۔ اس مرض کا علاج تواضع اور للّٰہیت ہی ہے جو ہمارے حلقوں میں بدقسمتی سے اکثر مفقود ہوتی جارہی ہے۔ حکیم الاسلامؒ تواضع اور انکساری کے پیکر تھے، اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ ”بھائی میں

اپنے بزرگوں کی جوتیوں کے صدقے میں اس قابل ہوا، میں دارالعلوم کے طلبہ کا ادنیٰ خادم ہوں''۔

جس شخص میں اس درجہ کی انکساری اور تواضع ہو اس کے یہاں مدح سرائی کا باب مغلق ہی نہیں مقفل ہوتا ہے۔ اس باب میں بھی حکیم الاسلامؒ اسلاف دیوبند کی بہترین مثال تھے۔

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحبؒ رقمطراز ہیں:

''اگر کوئی ان کی تعریف کرتا اپنی فطری انکساری کی بناء پر ایک لطیف ترمیم کے ساتھ تعریفی جملہ کو اس طرح واپس فرمادیتے کہ سننے والے عش عش کر کے رہ جاتے، ایک بار سہارنپور میں تشریف فرما تھے، جسے حضرت کی تشریف آوری کی اطلاع ملی تو ایک شخص دوڑتا ہوا پہنچا، نشست گاہ بھر چکی تھی اور سامنے بھی آدمی کھڑے تھے، اتنے میں یوپی کے وزیر کابینہ لیش پال صاحب پہنچ گئے، انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر مجمع کی کثرت پر عرض کیا کہ ''حضرت جہاں شہد ہوتا ہے وہیں مکھیاں پہنچ جاتی ہیں'' برجستہ فرمایا کہ ''بھائی شہد کو بھی تو مکھیاں بناتی ہیں'' وزیر موصوف اس برجستگی اور بذلہ سنجی پر انگشت بدنداں رہ گئے۔''

عفو و درگزر

حکیم الاسلامؒ کے عفو و درگزر کی سینکڑوں مثالیں مل جائیں گی مگر قضیہ دارالعلوم میں اکثر ایسے منظر دیکھنے میں آئے جن کی مثال دوسری جگہ بہت کم ملتی ہے۔ ایک معاصر بزرگ نے خط لکھ کر معافی مانگی تو نہ صرف معاف کیا بلکہ اپنی ندامت و پشیمانی کا اظہار فرمایا۔

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحبؒ اپنا مشاہدہ بیان فرماتے ہیں:

''انتقام ان کے مزاج میں ڈھونڈے سے نہ ملتا، ایک صاحب نے مجھ سے خود کہا کہ ''فلاں صاحب کی وفات کے بعد ہمیں یقین تھا کہ مہتمم صاحبؒ ہمارا تیاپانچہ کریں گے، مگر داد دیجئے اس شخص کے مزاج و اخلاق کی کہ منتقمانہ آنکھ بھی ہماری طرف نہ اٹھائی۔''

اعلیٰ ظرفی

چھوٹی موٹی باتوں کو ایک معمولی انسان بھی نظر انداز کر دیتا ہے مگر ایسی باتیں کہ جنہیں سن کر ایک عام آدمی کا پیمانۂ صبر لبریز، خون کی گردش تیز اور جذبات واحساسات کا درجۂ حرارت اپنی آخری حدود کو بھی پار کرنے لگے انہیں وہی لوگ نظر انداز کر سکتے ہیں جن کے حصہ میں صبر و تحمل کے ساتھ اعلیٰ ظرفی کا جوہر بھی آیا ہو۔

حکیم الاسلامؒ کی اخلاقی صفات میں ''اعلیٰ ظرفی'' کی صفت فطری اور موروثی تھی، اس لئے زندگی کے

ہر مرحلے اور زمانے کے گرم، سرد میں ہر لمحہ ایک پاسبان کی طرح ساتھ رہے۔ تجربات، مشاہدات اور علم و کمال کے نئے نئے سیر نے اعلیٰ ظرفی کی صفت کو اور مثالی بنا دیا تھا۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کی بھاری بھرکم ذمہ داری اور وہ بھی ایسے دور میں جب اساطین علم اربابِ بصیرت اور اصحابِ تقویٰ و طہارت سے دارالعلوم دیوبند کی فضا معمور اور ماحول معطر تھا۔ ہر اعتبار سے غیر معمولی شخصیت کا حصہ ہی ہو سکتی تھی۔ کیسے کیسے انقلاب رونما ہوئے اور کیسے ہائلے اور حادثے سامنے آئے۔ کہنے والوں نے کہنے کی انتہاء کر دی، الزامات اور اتہامات الامان، الحفیظ! بدزبانیاں، بدکلامیاں اور بدگوئیاں الحذر! نہ نسبت کا خیال، نہ مرتبہ کا لحاظ، نہ خدمات و بے شمار احسانات کی رعایت، سب کچھ بالائے طاق رکھ دیا گیا۔

یہ حکیم الاسلامؒ کا اعلیٰ ظرف ہی تھا کہ ان حالات میں بھی انہوں نے اف تک نہیں کیا۔ شکوہ اور شکایت تو در کنار کوئی اگر ذکر بھی کرتا تو حالات سے زیادہ ان کے ذکر سے طبیعت مکدر ہوتی ؏

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں؟

ہر حال میں ایک ساکت اور خاموش بحر بیکراں، دیکھنے والا ان کے مزاج، گفتگو، طرزِ عمل اور کسی بھی ادا اور کسی بھی انداز سے ان کی اعلیٰ ظرفی کے معیار کو گرتا ہوا نہیں دیکھ سکا مگر ایسا فرشتہ سیرت شخصیت کو طعن و تشنیع کا ہدف بنانے والوں کی کم ظرفی کا مشاہدہ ایک دنیا نے کیا اور خود انہوں نے بھی۔ حتیٰ کہ کمزور سے کمزور نگاہ والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ حکیم الاسلامؒ کا طریق بہر آئینہ مقابل و معارض کی روش سے یکسر مختلف ؏

ببیں تفاوتِ راہ از کجا تا بہ کجا

ربِ کریم اپنی رحمتوں، آخرت کی نعمتوں اور بلند مرتبوں سے نوازے۔

اس باب میں آپ کے کن کن واقعات کو ذکر کیا جائے۔ لوگوں نے اپنے نامۂ اعمال کو عمداً و قصداً ان کی شخصیت کو داغ دار کر کے سیاہ کر لیا اور یہ فرشتہ سیرت انسان سب کی سن کر بلند درجات پا گئے۔ رب اغفر وارحم.

شگفتہ مزاجی

حکیم الاسلامؒ کی شخصیت باغ و بہار شخصیت تھی، مگر عالمانہ ظرافت غالب تھی، مبتذل اور عامیانہ قسم کی ظرافتوں کا آپ سے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ایک بار اہل مجلس میں سے کسی نے آپ کا مزاج پوچھا، برجستہ فرمایا: ''بھائی بیماروں میں صحت مند ہوں اور صحت مندوں میں بیمار ہوں۔''

ایک مرتبہ دسترخوان پر جہاں بہت سے کھانے موجود تھے کسی عقیدت مند نے عرض کیا کہ حضرت یہ بھی تناول فرمایئے، یہ بھی تناول فرمایئے اور اٹھا اٹھا کر سامنے رکھنے لگے۔ حضرت نے فرمایا: ''کھانے کا تعلق رغبت سے ہے، ترغیب سے نہیں۔''

آپ کو ایک سفر درپیش تھا، سوار کرانے کے لئے ایک صاحب اسٹیشن تک گئے، جب آپ گاڑی میں سوار ہو گئے تو ان صاحب نے آپ کو ٹکٹ دیا، آپ نے جیب میں رکھ لیا۔ گاڑی کچھ دور پہنچی، آپ نے ٹکٹ نکال کر دیکھا تو وہ پلیٹ فارم ٹکٹ تھا، جوان صاحب نے غلطی سے آپ کو دیدیا تھا، اصل ٹکٹ ان ہی کے پاس رہ گیا تھا۔ سفر سے واپسی پر غالباً ان ہی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''بھائی کچھ حضرات طبعاً مخلص ہوتے ہیں مگر عقلاً مفلس ہوتے ہیں۔''

انتظامی صلاحیت

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس طرح ہمہ جہت صلاحیتوں، علمی عظمتوں اور بزرگانہ کمالات سے نوازا تھا، اسی طرح انتظامی صلاحیتوں تدبیر تدبر اور حکمت عملیوں سے بھی مالا مال فرمایا تھا۔

حضرت مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی آپ کی انتظامی صلاحیتوں کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''علمی ذوق اور مزاج ہونے کے باوجود حضرت حکیم الاسلامؒ میں انتظامی صلاحیت کم نہ تھی، ایک ایسے ادارے کا نظام چلانا جس میں مختلف فکر ورجحان کے لوگ ہوں کوئی آسان بات نہیں ہے۔

مسلک دیوبند کی ترجمانی

حکیم الاسلامؒ کو اللہ تعالیٰ نے زبان وقلم کی جو حیرت انگیز صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں، گزشتہ صفحات میں ان کا مختصر سا تذکرہ آچکا ہے، آپ نے ان صلاحیتوں کو ذاتی شہرت اور دنیاوی منافع کے لئے کبھی استعمال نہیں کیا، چاہتے تو اپنی معرکۃ الآراء تصانیف کی رائلٹی لے کر اپنی معیشت کو طبقہ علماء میں سب سے زیادہ مضبوط بنا سکتے تھے، دنیا کا وہ کون سا خطہ ہے جہاں آپ کے قدم نہ پڑے ہوں، آپ کی بے مثال خطابت کی گونج ہر جگہ سنائی دی اور ایک عالم کو آپ نے مسحور کیا، چاہتے تو پیشہ ور مقررین کی طرح مصارف سفر اور

حبسِ وقت کے حیل حجتوں سے لاکھوں کروڑوں جمع کر لیتے مگر آپ جیسی عظیم المرتبت شخصیت سے اس کی توقع تو درکنار اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آپ نے اپنی تمام تر خداداد صلاحیتوں کو دین مبین کی اشاعت، اساطین امت کے تعارف، مسلک دیوبند کی ترجمانی اور علمائے دیوبند کی تشریح و تفہیم میں صرف کیا اور جس وقت جس صلاحیت کو جس میدان میں آزمانے کی ضرورت پیش آئی اخلاص وللٰہیت اور حسن نیت کے ساتھ میدان میں اترے اور سرفرازی کے ساتھ لوٹے۔ **ذلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء واللّٰہ ذوالفضل العظیم۔**

مسلک دیوبند کے تعارف اور علمائے دیوبند کے دینی موقف و مزاج کی وضاحت سے حکیم الاسلامؒ کی کوئی تقریب، کوئی تحریک اور کوئی گفتگو خالی نہیں رہی۔ مواعظ اور تصانیف میں ہر جگہ کہیں راستوں پر اور کہیں ضمناً مسلک دیوبند اور علماء دیوبند کا بھرپور تعارف کرایا۔ زندگی کے آخری ایام میں اس موضوع پر آپ کے حکیمانہ و عالمانہ قلم سے ''علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج'' ایک جامع اور شاہکار تصنیف وجود میں آئی۔ کتاب ہذا کا علمی و تحقیقی معیار کتنا بلند ہے؟ عالم اسلام کی معروف دینی شخصیت حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی کی یہ شہادت اس کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے:

''جہاں تک اس کتاب کے مضامین کا تعلق ہے، اس کے بارے میں احقر ناکارہ کا کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مرادف ہے، اس سے زیادہ کچھ کہہ کر میں آپ کے اور کتاب کے درمیان حائل نہیں ہونا چاہتا کہ کسی پڑھے لکھے مسلمان کو بالخصوص دینی مدارس کے کسی استاذ یا طالب علم کو اس کتاب کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہئے بلکہ دینی مدارس میں اس کتاب کے مطالعہ یا تدریس کو نصاب کا حصہ بننا چاہئے''۔ (۳۹)

ذیل میں کتاب ہذا کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

''حاصل یہ نکلا کہ جس جماعت میں السنۃ اور الجماعۃ کے دونوں بنیادی عنصر موجود ہوں قرنِ نبوت سے تسلسل اور سندِ متصل کے ساتھ اس کا سلسلہ ملا ہوا ہو۔ نبی اکرمؐ سے سلسلہ بہ سلسلہ اس کی توثیق ہوتی آ رہی ہو۔ صحابہ کی اس پر شہادت اور اشاعت کی مہر ثبت ہو تو وہی جماعت فرقۂ حقہ ہوگی اور اسی کو قدیم اور اصل کہا جائے گا نہ کہ نوزائیدہ اور نومولود یا وقت کی پیداوار کو جوان دو عنصروں میں سے کسی ایک سے کٹی ہوئی ہوں اس لئے جو طبقہ اس سے کٹ جائے گا وہی اختلاف کنندہ شمار کیا جائے گا، نہ کہ اس جماعت کو جس کی اصل کسی اختلاف و شقاق کی زمین پر قائم نہیں بلکہ اصل پر قائم ہے۔ اس لئے اسے اختلاف کنندہ یا شقاق پر قائم شدہ نہیں کہا جائے گا''۔ (۴۰)

مسلک دیو بند عقیدہ، فکر، علم، اخلاق، معاشرت، سیاست ہر ایک میں اعتدال کا نام ہے۔ حکیم الاسلامؒ اس کی وضاحت کچھ اس طرح فرماتے ہیں:

پس مسلکِ علماء دیو بند نہ محض اصول پسندی کا نام ہے اور نہ شخصیت پرستی کا، نہ اُن کے یہاں دین اور دینی تربیت کے لئے تنہا لٹریچر کافی ہے نہ تنہا شخصیت، نہ تنہا مطالعہ اور اپنا ذاتی ذہن وفکر کافی ہے اور نہ تنہا شخصیتوں کے اقوال وافعال پر اتّکال اور بھروسہ بلکہ اصول وقانون اور ذوات وشخصیات اور بالفاظ مختصر لٹریچر بشرط معیت وملازمتِ صدیقین اور باقاعدہ درس وتدریس سے اس مسلک کا مزاج بنا ہے جس میں کسی ایک کے بھی احترام سے قطع نظر جائز نہیں اور جبکہ جامعیت واعتدال اور احتیاط ومیانہ روی ہی مسلک کا جوہر ہے تو دین کے ان تمام شعبوں اور علمی حجتوں میں قرآن وحدیث سے لے کر فقہ وکلام اور فنِ احسان اور فنِ اصول وغیرہ کی چھوٹی سے چھوٹی جزئی پر جمنا اور حکمت واعتدال کے ساتھ اُسے مشعلِ راہ بنانا ہی اس مسلک کا امتیاز ہے۔

اور ذوات اور شخصیات کی لائن میں حضرات انبیاء علیہم السلام سے لے کر ائمہ اجتہاد، علماء راسخین، عرفاء متقین، مشائخ عظام، صوفیاء کرام اور حکماء امت کی ذوات قدسیہ تک کے بارے میں افراط وتفریط سے الگ رہ کر ان کی عظمت ومتابعت پر قائم رہنا ہی اس مسلک کی امتیازی شان ہے۔

غور کیا جائے تو ان تمام دینی شعبوں کے اصول وقوانین اور علوم وفنون کا خلاصہ دو ہی چیزیں نکلتی ہیں، عقیدہ اور عمل جس کے لئے شریعت آئی اور ان شعبوں کو وضع کیا۔ باقی امور یا ان کے مبادی ولوازم ہیں یا آثار ونتائج ہیں جن سے ان فنون میں بحث ہوتی ہے۔ سو عقائد میں بنیادی عقیدہ بلکہ تمام عقائد کی اساس توحید ہے جو سارے انبیاء کا دین رہا ہے اور عمل میں سارے اعمال کی جڑ بنیاد اتباعِ سنت اور پیرویٔ اسوۂ حسنہ ہے۔ باقی تمام طرق عمل جو سند کے ساتھ منقول ہوں خواہ وہ پچھلوں کے ہوں یا اگلوں کے ان سنن نبویؐ کے مبادی ولوازم یا آثار ونتائج میں سے ہیں، اس لئے اس مسلک میں پہلی اصل توحیدِ خداوندی پر زور دینا ہے، جس کے ساتھ شریک یا موجبات شرک جمع نہ ہوسکیں اور کسی بھی غیر اللہ کی اس میں شرکت نہ ہو لیکن ساتھ ہی تعظیم اہل اللہ اور توقیر اہل فضل وکمال کو اس کے منافی سمجھنا مسلک کا کوئی عنصر نہیں۔

پس نہ توحید میں لگ کر بے باکی اور جسارت اور ذوات کی عظمتوں سے بے نیازی مسلک ہے کہ یہ کمال توحید نہیں بلکہ توحید کا غلو یا حقیقت سے خلو اپنی ذات کا علو ہے اور ایسے ہی تعظیمِ شخصیات میں مبالغہ کرنا جس سے توحید میں خلل پڑتا ہو یا اس میں شرک کی آمیزش ہوتی ہو، یہ بھی مسلک نہیں کہ یہ تعظیم نہیں،

تعظیم کا غلو اور حقیقت توحید کی تبدیلی سے بنام تعظیم توہین ہے۔ پس تعظیم اس حد تک کہ توحید مجروح نہ ہو اور توحید اس درجہ تک کہ تعظیم اہل دل متاثر نہ ہو۔ یہی وہ نقطۂ اعتدال ہے جو مسلکِ علماء دیوبند ہے۔ (۴۱)

علماء دیوبند اس عظمت وجلالت کے معیار سے صحابہؓ میں تفریق کے قائل نہیں کہ کسی کو لائقِ محبت سمجھیں اور کسی کو معاذ اللہ لائق عداوت، کسی کی مدح میں رطب اللسان ہو کر اطرّاء مادح پر اتر آئیں اور کسی کی مذمت میں غلو کر کے تبرائی بن جائیں یا تو انہیں سب وشتم کرنے میں بھی کسر نہ چھوڑیں اور یا پھر اُن میں سے بعض کو نبوت سے بھی اونچا مقام دینے پر آجائیں۔ انہیں معصوم سمجھنے لگیں حتی کہ اُن میں سے بعض میں حلولِ خداوندی ماننے لگیں۔

صحابہ کرامؓ کے دینی مرتبہ ومقام اور ان کی عظمت کے تئیں علماء دیوبند کا کیا نظریہ ہے، آگے اس کی وضاحت فرماتے ہیں:

پس علماءِ دیوبند کے مسلک پر یہ سب حضرات متقدسین تقدس کے انتہائی مقام پر ہیں مگر نبی یا خدا نہیں بلکہ بشریت کی صفات سے متصف، لوازم بشریت اور ضروریاتِ بشری کے پابند ہیں مگر عام بشر کی سطح سے بالا تر کچھ غیر معمولی امتیازات بھی رکھتے ہیں جو عام بشر تو بجائے خود ہیں، پوری امت کے اولیاء بھی اُن مقامات تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہی وہ نقطۂ اعتدال ہے جو صحابہؓ کے بارے میں علماء دیوبند نے اختیار کیا ہوا ہے۔ ان کے نزدیک تمام صحابہؓ شرفِ صحابیت اور صحابیت کی برگزیدگی میں یکساں ہیں، اس لئے محبت وعظمت میں بھی یکساں ہیں۔ البتہ ان میں باہم فرق مراتب بھی ہے تو عظمتِ مراتب میں بھی فرق ہے لیکن یہ فرق چوں کہ نفس صحابیت کا فرق نہیں، اس لئے اس سے نفس صحابیت کی محبت وعقیدت میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ پس اس فرق میں **الصحابة کلھم عدول** (صحابہؓ سب کے سب عادل تھے) کا اصول کارفرما ہے جو اس دائرہ میں علماء دیوبند کے مسلک کا جو حقیقی معنی میں مسلک اہل السنّت والجماعت ہے اولین سنگِ بنیاد ہے۔ (۴۲)

خوش الحانی اور جمال وکمال

جنہوں نے حکیم الاسلامؒ کے مخصوص لب ولہجہ میں قرآن کریم کی تلاوت سنی وہ گویا لحن داؤدی اور صوت سرمدی سن چکے سامعہ میں شکر وانگبین سے بڑھ کر عسل مصفیٰ کے قطرے ٹپکانا کسے کہتے ہیں؟ تعریف وتعارف کے لیے حکیم الاسلامؒ کی خوش الحانی کو بلا تکلف پیش کیا جا سکتا ہے۔

مولانا حکیم عبدالرشید محمود آگے لکھتے ہیں کہ:

''میرے والد صاحبؒ علیل ہو کر شفایاب ہوئے تھے، دیوبند سے ایک بڑا مجمع حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، علامہ ابراہیم صاحبؒ اور حضرت میاں سید اصغر حسین صاحبؒ وغیرہ مزاج پرسی کو تشریف لائے۔ مولانا طیب صاحب ۲۵ رسالہ بھی ساتھ تھے، بعد مغرب کا وقت تھا، حضرت حکیم صاحبؒ نے فرمایا طیب ایک رکوع سناؤ، یاد ہے: **ولقد خلقنا الانسان و نعلم ما توسوس به نفسه الٰى آخره** سنایا، سماں بندھ گیا، آنکھیں پرنم ہوگئیں، میرے کانوں نے یہ خوش لحنی عمر میں پہلی مرتبہ سنی تھی، ساز بھی سوز بھی، دل گداز بھی، نغمہائے دل کش سحاب اندر سحاب بھی، یہ پہلا نقش تھا جو آج بھی تازہ ہے۔''

اکابر دیوبند کا تذکرہ

اکابر دیوبند کا تذکرہ حکیم الاسلامؒ کی تحریر، تقریر، وعظ گفتگو، مجلس ہر ایک کا امتیاز انہوں نے بہت سے بے ناموں اور گم ناموں کو اپنی تحریر وتقریر سے زندگی دی، اکابر دیوبند کے افکار، خدمات، کاموں اور کارناموں کو شہرۂ آفاق بنایا، ان کی پاکیزہ زندگیوں کے نصیحت آموز واقعات کو ملت اسلامیہ کے نوجوانوں ، بچوں، بوڑھوں، خاص و عام اور ہر شعبۂ زندگی کے انسانوں کے لیے قابل استفادہ، قابل نصیحت، قابل درس بنا کر چھوڑا۔

اس باب میں وہ اپنی ذات میں اک انجمن کے صحیح مصداق تھے: **اللهم اغفره وارحم وارفع درجته فی جنة النعیم**

''حکیم الاسلامؒ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو اپنے بزرگوں سے جو تعلق خاطر تھا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا انظر شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

''انہیں اپنے بزرگوں سے عشق تھا، وعظ ہو کہ تقریر، مجلس ہو کہ مستفیدین کا حلقہ ہر جگہ اکابر کا وقیع تذکرہ فرماتے۔''

ہندوستان کی حدوں کو توڑ کر دار العلوم کا تعارف، بزرگوں کی معرفت ان کے انہی معمولات کا دل آویز ثمرہ ہے، بہت سے گمنام متعارف ہوگئے، بہت سے نامور جاوید بن گئے۔'' (۴۳)

............❖............

باب دوم

نگاہِ بلند، سخنِ دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

اخلاق و عادات، محاسن و امتیازات، علمی کمالات، تدریس و تعلیم، تقریر و خطابت، تصنیف و تالیف، مجالس، شعر و شاعری، مجالس، ملفوظات، چند واقعات اور ان سے مفید نتائج کا استنباط، مکتوبات، منثور و منظوم سپاسنامے

حضرت حکیم الاسلامؒ کا عکس تحریر

گر گزندت رسد ز خلق مرنج
کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج
از خدا داں خلاف دشمن و دوست
کہ دل ہر دو در تصرف اوست

محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند
۱۶/۲/۷۸ھ

ملاحظہ

''حیات طیب'' کے اس باب میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے کمالات علمیہ کو آپ کی تصانیف، خطبات، مجلسی افادات، ملفوظات، منظوم کلام اور سپاس نامہ کی صورت میں اہل علم کے پیش کردہ خراج عقیدت کی روشنی میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

کسی دینی شخصیت کے بارے میں خلق خدا کیا کہتی ہے؟ اور خواص کے تاثرات کیا ہیں؟ اس پہلو سے بھی اگرچہ شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے مگر شخصیت کے عملی کارنامے اس کی عظمت اور مرتبہ و مقام کو جاننے اور پرکھنے کے لئے بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

جو کچھ اس زبان اور قلم سے نکلا ہے اور جو عملی اور علمی رہنمائی اس سے دوسروں کو ملی ہے وہ اپنی افادیت اور تاثیر میں کس درجہ کی حامل ہے؟ کسی خارجی تنقید، تحلیل اور تجزیہ کے بغیر بھی اس کا تعین شخصیت کے کارناموں سے خود بخود ہو جاتا ہے یا کم از کم عملی کارنامے شخصیت کی پرکھ، پہچان اور معرفت کے لئے ایک پیمانہ ضرور دیتے ہیں۔

لفظیات سے تنقید کا کتنا ہی کمزور اور معمولی تعلق ہی کیوں نہ ہو تاہم اس کو تو سبھی جانتے اور مانتے ہیں کہ الفاظ شخصیت کے فکری شعور اور پیغام کی معنویت کے غماز ہوتے ہیں، اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایک بلند فکر انسان اس زبان اور ان الفاظ کا بھی نباض ہوتا ہے جس میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے، وہ نہ صرف لفظوں کے ساختیاتی اور نامیاتی پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے بلکہ اس کا بھی کامل شعور رکھتا ہے کہ بسا اوقات معمولی لفظی فروگزاشت مضامین عالیہ کو اسفل السافلین میں پہنچا دیتی ہے اور معمولی سی لفظی کرشمہ کاری ایک معمولی فکر کو کس انداز میں پیش کر دیتی ہے۔ اس میں انفرادیت، بیان اور حسن بیان کے ساتھ وہ خلوص بھی شامل ہے یا نہیں جس کی حرارت پتھروں کو پگھلا کر موم کر دیتی ہے۔

تیسرا مرحلہ حکم اور فیصلہ کا آتا ہے جو کچھ کہا گیا یا لکھا گیا، جن مقدمات، واقعات اور شواہد و دلائل کی روشنی میں آپ کو پیش کیا گیا اس کے نتائج اپنی قوت اور تاثیر میں کس درجہ اور کس مرحلہ کے ہیں؟ حکیم الاسلامؒ کی شخصیت اپنی تخلیقات و تحریرات کے تناظر میں بہرصورت اس منصب کی مستحق ہے کہ انہیں مذکورہ تینوں دائروں میں ایک ایک معیاری اور ممتاز شخصیت کہا جا سکے۔

ان کے الفاظ سادہ مگر پرکار، پرمعنی اور پرمغز، اسلوب، انفرادیت، حسنِ بیان، خلوص اور گہرے شعور کا نمائندہ، نتائج کشا اور رہنما، کہیں سے کہیں تک یہ احساس نہیں ہوتا کہ انہوں نے عقلی یا نقلی مسلمات کو نظر انداز کر کے کوئی نتیجہ اخذ کیا ہے یا فیصلہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

............❖............

درس و تدریس

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

تدریس و تعلیم کا منصب ایک باعظمت اور بھاری بھرکم منصب ہے اور معلم اپنے آپ میں اس تدریسی منصب کا بے تاج بادشاہ، اس منصب کی ذمہ داریوں کے احساس کی گرمی، بادشاہوں کے بھی پسینے چھڑا دیتی ہے، ایک بادشاہ اپنی رعیت کی سرکشی اور بغاوت کو فوجی طاقت اور شاہی خزانوں کے ذریعہ دبا سکتا ہے، مگر ایک معلم اپنی رعیت کی شرارت اور بغاوت پر صبر ہی کر سکتا ہے، جبر سے کام نہیں لے سکتا، اس کے پاس فوجی طاقت نہ شاہی خزانہ، اس کی اگر کوئی فوج ہو سکتی تھی تو وہ یہی طلباء تھے، اس کے پاس اگر کوئی خزانہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف استاذانہ عظمت اور بلندی کردار کا تھا اور یہ طاقت استاذ کی سلطنت کا شہ ستون ہیں، خدانخواستہ اس میں کوئی دراڑ پڑ گئی تو پھر سلطنت زیروزبر اور اس کا سلطانِ عالی شان دھڑام سے زمین پر، تاجِ افتخار سرنگوں اور لباسِ عظمت تارتار۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند پرائمری، متوسط اور اعلیٰ تعلیم پر کئی خطبات جامعہ اسلامیہ کے پلیٹ فارم سے دیئے۔ ایک جگہ اچھے استاذ اور حکمراں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حکمراں جبر کرتے ہیں، یہ صبر کرتا ہے، وہ مجبور کر کے راہ پر چلاتے ہیں، یہ آزاد چھوڑ کر ساتھ لیتا ہے، ایک کے وسائل میں تشدد اور زبردستی، دوسرے کے وسائل میں محبت اور خدمت، ایک کا کہنا ڈر سے مانا جاتا ہے، دوسرے کا شوق سے، ایک حکم دیتا ہے دوسرا مشورہ، یہ غلام بناتا ہے، یہ ساتھی، اچھے استاذ کی زندگی کی جڑیں محبت کے چشمے سے سیراب ہیں، اس لئے یہ وہاں امید رکھتا ہے جہاں دوسرے دل چھوڑ دیتے ہیں، وہاں تازہ دم رہتا ہے جہاں دوسرے تھک جاتے ہیں، اسے وہاں روشنی دکھائی دیتی ہے جہاں دوسرے اندھیرے کی شکایت کرتے ہیں، یہ زندگی کی پستیوں کو بھی دیکھتا ہے لیکن ان کی وجہ سے ان بلندیوں کو نہیں بھول جاتا۔'' (۴۴)

استاذ کے ادب و احترام کی فضا عصری دانش گاہوں میں کتنی مقدر ہے اور کیسی معطر، اس بحث کو

چھوڑ یئے، کہنا یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں کچھ اطمینان بخش نہیں ہے۔ معاف کیجئے اس کے ذمہ دار صرف طلباء ہی نہیں اساتذہ بھی ہیں، ایک وقت وہ تھا جب حضرت شیخ الہندؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت علامہ کشمیریؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ، جیسے اکابر اساتذہ کی نورانی جماعت تھی، عالمانہ عظمت، استاذانہ وقار اور مربیانہ دبدبہ قائم تھا، ان سے استفادہ تو بہت بڑی سعادت تھی، ان کی زیارت بھی استفادہ کا ایک وسیع باب تھا۔ ان کے چہروں پر اتباع سنت کا نور، زندگی میں تقویٰ، اخلاص، تواضع ومعرفت کا سرور تھا، دیکھنے والے ایک نظر میں ان سب کا اکتساب کرتے، ان کی بے داغ زندگی سے سبق لیتے، ان کے کردار وعمل اور اخلاق وسیرت سے متاثر ہوتے۔ مشہور ادیب اور عالم دین حضرت مولانا حامد الانصاری غازیؒ اپنے استاذ محترم حضرت علامہ کشمیریؒ کا سراپا لکھتے ہیں:

''جسم نور کی چادر میں لپٹا ہوا، چہرہ چودھویں رات کا چاند، رنگ چاند کی چاندنی میں دھلا ہوا، پیشانی شاہی جامع مسجد کی محراب، آنکھ اکثر رکوع میں رہتیں، جب قیام کے لئے اٹھتیں تو نور یقین کی چمک سے چاندنی پھیل جاتی، چلتے تو راستہ بن جاتا، نظر اٹھتی تو ہجوم کے دو ٹکڑے ہو جاتے اور صراطِ مستقیم تیار ہو جاتی، ایسا معلوم ہوتا کہ جنت کے سبزہ زار سے کوئی فرشتہ زمین پر اتر آیا ہے، سچ ہے کہ کشمیر کی طرح جنت نظیر تھے۔'' (۴۵)

شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے علمی دبدبہ اور عالمانہ وقار کی روایتیں تواتر کے درجہ میں ہیں، بروایت استاذ محترم حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ جب احاطہ دارالعلوم میں چشمہ لگا کر قدم رکھتے تو طلبہ ادب واحترام میں سمٹ سمٹ جاتے۔ دارالعلوم میں علم وفضل کی جن مثالی ہستیوں کا اجتماع تھا وہاں ''ہر گلے را بوئے دگر است'' کا معاملہ تھا۔ آخر میں حکیم الاسلامؒ تو گویا فخرِ روزگار ہستیوں کا عکس جمیل لئے ہوئے۔ یوں سمجھئے کہ ''فرشتوں کی دنیا کا ایک انسان یا پھر انسانی دنیا کا ایک فرشتہ ہی تھے۔''

حکیم الاسلامؒ کے تدریسی امتیازات کے بارے میں سینکڑوں نہیں ہزاروں تلامذہ کی شہادتیں اگر جمع کی جائیں تو بیان وروایت کے اختلاف کے باوجود قدرے مشترک وصف ''تدریسی کمال'' ہی سامنے آتا ہے۔

حکیم الاسلامؒ ہمہ جہت انتظامی، دعوتی، ملّی اور تصنیفی مصروفیتوں کے ساتھ تدریس کے میدان میں بھی ایک خاص ذہن اور صلاحیت لے کر آئے تھے، آج تو خیر مشکل ہی ہے، اس وقت بھی شاید ہی دنیا کا کوئی مہتمم اس شان کا رہا ہو کہ انتظامی بکھیڑوں کے ساتھ تدریس میں ایسا باکمال ثابت ہوا ہو، مشکوٰۃ شریف انہوں نے اپنے والد محترم فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سے پڑھی تھی اور طویل زمانہ تک مشکوٰۃ ہی کا درس دیا، انداز تفہیم کس غضب کا تھا ذیل کے اس واقعہ سے اندازہ کیجئے، خود فرماتے ہیں کہ:

''میں مسجد میں مشکوٰۃ شریف کا درس دے رہا تھا، چار پانچ آریہ مبلغ دارالعلوم دیکھنے آئے تھے، وہ دیکھتے دیکھتے مسجد میں بھی پہنچے اور درس میں آ کر بیٹھ گئے، اندازہ یہ ہے کہ میں کوئی کلامی مسئلہ بیان کر رہا تھا، ذات وصفات کا اس میں تذکرہ تھا، وہ سنتے رہے، ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے سمع قبول سے سنا اور تقریر سے متأثر بھی ہوئے۔ ان میں تعصب نہیں محسوس ہوتا تھا، بیان کے بعد انہوں نے تناسخ کا مسئلہ چھیڑا اور مجھ سے سوال کیا کہ:

''دیکھئے یہ ایک طبعی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ظلم نہیں ہے، یہ مسلّمہ ہے، پھر بھی جب کسی کو دکھ آئے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دَور ما بعد الدور بدلہ ہوگا، پھر اس میں جوان اور بالغ ہی نہیں بلکہ بچے بھی شامل ہیں، جنہوں نے کوئی گناہ اور برائی نہیں کی تو یقیناً یہ اس کی علامت ہے کہ پہلے کوئی وجود ہوا ہے کہ جس کے اندر غلطیاں اور گناہ سرزد ہوئے ہیں اور اس کا یہ ثمرہ ہے جو دکھ پہنچ رہا ہے ورنہ حق تعالیٰ ظالم نہیں ہیں، وہ ظلم سے بری ہیں، لہٰذا اس کا حل بجز تناسخ کے دوسرا نہیں ہوسکتا''۔

میں نے کہا کہ ''اس بارے میں پہلے الزامی بات عرض کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ آپ کے عقیدے کے مطابق یہ معلوم ہوا کہ مسئلہ تناسخ مبنی ہے شبہ کے اوپر اور اگر یہ شبہات نہ ہوں تو تناسخ کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہو اور شبہ ایک قسم کی جہالت ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا عقیدہ جہالت پر مبنی ہے علم پر نہیں ہے، اصل عقیدہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے اس پر کوئی شبہ نہ ہو کیوں کہ شبہات کا معاملہ بعد میں ہوتا ہے، مخلوق کو حقائق کے اترنے سے پہلے شبہات لاحق نہیں ہوتے کہ ان شبہات کے جواب میں حق تعالیٰ کوئی عقیدہ پیش فرمائیں۔ عقیدہ تو آدم علیہ السلام سے ہی چلا آ رہا ہے اور نقل صحیح کے ساتھ سارے انبیاء علیہم السلام اس کو کہتے چلے آئے ہیں، لہٰذا اس کا حل یہ نکلا کہ آپ کا یہ مسئلہ تعلیم الٰہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان شبہات پر مبنی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کو اس سے شبہ لاحق ہو رہا ہے کہ بڑے بڑے آدمی ظلم کرتے ہیں اور ان کو دکھ پہنچا ہے تو ممکن ہے پہلے سے وجود ہو، مگر یہ چھوٹے چھوٹے بچے کوئی گناہ اور ظلم نہیں کرتے، پھر بھی وہ بیماریوں میں اور مختلف قسم کی تکلیفوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی بلوۂ عام ہو تو بچے قتل بھی کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح جانور بھی قتل کئے جاتے ہیں اور سیلابوں میں بھی بہہ جاتے ہیں تو یقیناً کوئی پچھلا جنم ہوگا، جس میں انہوں نے ظلم اور زیادتی کی ہوگی جس کی وجہ سے اس جنم میں سزا دی جا رہی ہے۔ گویا آپ کا یہ شبہ ہے، میں نے کہا کہ اس شبہ کا معمولی سا حل یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ آپ کو علم نہیں محض وہم اور قیاس سے ثابت کریں اس سے بہتر یہ ہے کہ ان تمام حوادث کو مادے کی خاصیت مانیں، اس لئے کہ ساری دنیا مادی ہے اور مادہ کی ذاتی کیفیت تغیر ہے، وہ ایک حالت پر ٹھہرتا نہیں، آج پتّے ہرے ہیں تو کل خشک ہو گئے، آج

زمین میں خشکی ہے تو کل تری آ گئی تو اشیاء عالم میں تغیر ہونا یہ مادے کی خصوصیات میں سے ہے اور جو مادے سے بالاتر ہیں وہ تغیرات سے پاک ہیں، البتہ جو چیز مادی بنے گی اس میں تغیرات کا ہونا لازمی ہے''۔

''یہ دنیا متغیر ہے اور العالم متغیر کا قول فلاسفہ کے یہاں مسلمہ قول ہے تو جب ان تمام مصائب وآفات کا سبب قریب موجود ہے جو مادے کی خاصیت ہے تو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ لاکھوں برس پہلے جنم در جنم مانتے رہیں نہ جس کی کوئی سند ہے اور نہ عقل ہی اس کا ساتھ دیتی ہے اور اس کو آپ عقیدہ بنائیں اور عقیدے کو جہالت پر مبنی کریں اور قیاسات سے عقیدہ بنائیں اور اس پر دنیا کو چلائیں تو یہ کوئی عقیدہ ہی نہیں جس کی بنیاد جہالت ہو۔

اب اگر یہ سوال کریں کہ سبب قریب میں تغیر کیوں ہے اور مادہ متغیر کیوں ہے تو ہم کہتے ہیں کہ مادے کی صورتِ نوعیہ کا تقاضا یہی ہے کہ اس میں تغیر ہو، جیسے روحانیت نوعیہ کا تقاضہ ہے کہ وہ دوامی اور ابدی ہو تو جب مادہ کی صورتِ نوعیہ کا تقاضا ہی یہی ہے تو حق تعالیٰ نے اسے تغیر کے لئے پیدا ہی فرمایا ہے، اگر مادّے میں تغیر نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ اس کی خاصیت سلب کر لیتے تو مادہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کرتا کہ آپ نے مجھے پیدا کیا اور میری خاصیت سلب کر لی، مجھے اپنی خاصیت دکھانے کا موقع ہی نہیں دیا، جیسے آگ کو پیدا کریں اور جلانے کی خاصیت کو سلب کر لیں تو آگ شکوہ کرے گی کہ میری ذاتی خاصیت کو سلب کیوں کر لیا؟ اسی طرح پانی کی ذاتی خاصیت ٹھنڈا کرنا ہے، اگر یہ خاصیت چھین کر جلانے کی خاصیت دی جائے تو پانی زبان حال سے بارگاہِ حق میں شکایت کرے گا کہ آپ تو مبداء فیاض ہیں، ہر چیز کو آپ اس کے مناسب حال وجود دیتے ہیں، مجھے وجود بھی دیا لیکن میرے اندر سے وہ چیز نکال دی جو میری ذاتی خاصیت تھی، تو فی الحقیقت ذاتی خاصیت ذات کا جز ہوتی ہے''۔

''جب کسی ذات کو پیدا کریں گے تو اس کے ساتھ اس کے خواص وآثار بھی ہوں گے، اگر یہ آثار و خواص نکال دیئے جائیں تو شئے اپنے خواص کو چھوڑ کر شئے ہی باقی رہے گی، لہٰذا شئے کو حق ہے کہ وہ حق تعالیٰ سے شکایت کرے، لہٰذا جب مادہ پیدا ہوگا تو اس کے ساتھ تغیر بھی لازمی ہے۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ تغیر رکھا، لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کے یہاں مخلوقات کی دو نوعیں ہوگئیں۔ ایک یہ کہ وہ متغیر ہو، دوسرے یہ کہ وہ لاتبدیل ہو، تو متغیر کو لاتبدیل نہیں بنائیں گے اور لاتبدیل کو متغیر نہیں بنائیں گے ورنہ ہر ایک کو شکایت کا موقع ملے گا اور حق تعالیٰ کی بارگاہ ظلم وستم سے بہت بعید ہے کہ وہ ایسا کام کریں جس سے ساری مخلوق شاکی ہو جائے، تو میں نے کہا کہ جب سببِ قریب موجود ہے تو آپ لاکھوں برس کا سبب

بعید کیوں تلاش کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ اگر آپ نے یہ تغیر مانا بھی اور اس میں تغیر ہوا اور اس سے پچھلے معنی اس تغیر کی پاداش میں ہوا اور پھر اس سے پیچھے ہو تو یہ تسلسل ہے جو خود محال ہے تو آپ تسلسل محال کے قائل ہو گئے اور اس پر عقیدہ کی بنیاد رکھی تو عقیدہ خود ہی محال بن گیا، وہ کیسے رہا۔ اس پر وہ لوگ بالکل خاموش ہو گئے لیکن یہ بھی کہہ گئے کہ یہ تفصیل طلب بات ہے اور اس میں طویل گفتگو کی ضرورت ہے اور یہ اس کا موقع نہیں، میں نے کہا کہ اس کو آپ جانیں میں نے تو چھیڑا نہیں تھا، آپ نے خود ہی اس مسئلہ کو اٹھایا ہے۔ بہرحال نہ مناظرے کی عادت اور نہ سلیقہ ہے''۔(۴۶)

فہم حدیث کا کیسا ملکہ قدرت کی طرف سے ان پر فائض ہوا تھا، اس کی بھی ایک مثال ملاحظہ کیجئے:

قاری عبداللہ صاحب نے سوال کیا کہ حضرت یہ جو حدیث میں فرمایا گیا ہے **حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَةِ.** اس کا مطلب کیا ہے؟

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ:

''عبادت کے لئے سب سے بڑی چیز یکسوئی ہے، اگر یکسوئی نہیں ہے تو عبادت کی روح ختم ہو جاتی ہے، صرف ڈھانچہ رہ جاتا ہے، اسی لئے نماز میں اِدھر اُدھر نگاہ کرنے کی ممانعت ہے بلکہ ایک جگہ پر نگاہ رہے۔ حدیث شریف سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے اندر اگر آنکھ کی پتلی پھیر کر کوئی چیز دیکھ لی تو نماز میں کوئی خلل نہیں پڑے گا، البتہ گردن پھیرنے سے نماز مکروہ ہو جاتی ہے اور بدن کا حصہ ادھر ادھر پھیرنے سے عبد اور معبود کے درمیان جو رابطہ ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے، اسی لئے عبادت کے لئے یکسوئی اور سکون قلب شرط ہے، اس کے متعلق فرمایا گیا: **وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ.** اور نماز بے شک یقیناً بھاری ہے مگر سوائے خاشعین کے اور خشوع کے معنی سکون کے ہیں یعنی جو لوگ ساکن القلب اور یکسوئی والے ہیں ان پر نماز بھاری نہیں ہے، البتہ جن کے افکار میں تشکک ہے بے شک نماز ان پر بھاری ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب قلب میں سوءِ ظن ہوگا تو اس کے لئے تشکک لازم ہے اور شک ہی کی وجہ سے آدمی کو لوگوں سے بدظنی ہوتی ہے، اس لئے فرمایا گیا حسنِ ظن عبادت ہے اور عبادت کا حسن مبنیٰ ہے یکسوئی پر اور یکسوئی حسن ظن پر حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے حسن ظن کے دلیل کی ضرورت نہیں ہے **ظُنُّوا بِالْمُؤْمِنِيْنَ خَيْرًا** فرمایا گیا یعنی ہر مسلمان کے ساتھ حسن ظن رکھو اور بدظنی کے لئے دلیل کی ضرورت پڑتی ہے، جب تک آپ کے پاس دلیل نہ ہو اس وقت تک جائز نہیں ہے کہ آپ کسی کے ساتھ بدظنی قائم کریں۔ یورپ میں ہم نے اس کی عجیب مثال دیکھی ہے، وہ لوگ ہر شخص کو ایماندار سمجھتے ہیں، وہاں پر آرڈر یہ ہے کہ جب تک کوئی حجت نہ ہو یا گورنمنٹ کی طرف سے اشارہ نہ ہو اس وقت تک بلاوجہ تلاشی مت لو، یہاں تو کسٹموں

پر ہر چیز کی تلاشی لیتے ہیں اور چھان بین کرتے ہیں مگر وہاں پر یہ بات نہیں ہے، صرف یہ پوچھ لیتے ہیں کہ کوئی بات قابل اعتراض تو نہیں، اگر کہہ دو کہ نہیں تو کہتے ہیں جاؤ، البتہ اگر کسی پر شبہ ہو جائے یا گورنمنٹ کا اشارہ ہو تو پھر تلاشی کرتے ہیں، یہ حسن ظن ہی کا معاملہ ہے، لہٰذا ہر چیز کے اندر قلب کی یکسوئی بڑی نعمت ہے، آدمی کا سینہ آئینہ کے مانند ہو، اس میں کوئی کھوٹ نہ ہو تبھی عبادت کے اندر یکسوئی پیدا ہو سکتی ہے، اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ اگر آپس میں جھگڑا ہو جائے تو تین دن کے اندر مصافحہ کرلو اور ایک دوسرے کی طرف رجوع کرلے، اگر کسی سے غلطی ہو جائے تو وہ اپنی غلطی تسلیم کرلے، اگر لوگ ایسا کرلیا کریں تو بات ختم ہو جائے گی ورنہ آپس میں تشدد بڑھتا ہی رہے گا اور یہ قلب کے لئے مضر ہے تو عبادت کا حاصل و وسیلہ ہے جو عبد اور معبود کے درمیان قائم رہتا ہے اور وہ یکسوئی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

حکیم الاسلامؒ نے بخاری کا بھی درس دیا ہے اور کیا کیفیت تھی۔ یہ جاننے کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ حکیم الاسلامؒ نے بخاری شریف اپنے محبوب اور مخصوص استاذ علامہ کشمیریؒ سے پڑھی تھی، جو امتیازات شیخ کے تھے ان کا ترشح تلمیذ رشید کے انداز پر بھی، متن پر کلام، روایت اور سند پر بحث، رجال حدیث پر گفتگو، تراجم کی تشریح، مشکلات الحدیث کا حل، امام بخاریؒ کے تفقہ پر ارشادات، فقہ الحدیث کا تجزیہ، مسائل کی توضیح، حجۃ الاسلام امام نانوتویؒ کی روایتی و درایتی بصیرت کا جائزہ، مراجع و مآخذ کی نشاندہی، اپنے اساتذہ کے نقاط نظر کی وضاحت، سلوک و احسان کا تذکرہ، بزرگوں کے سیرت ساز واقعات کا ذکر، ان سے عمیق اور لطیف نتائج کا استنباط، حضرت نانوتویؒ کے علوم اور افکار کی وضاحت کا ملکہ تمام۔

مولانا اکبر شاہ بخاری لکھتے ہیں:

''حضرت حکیم الاسلامؒ کی حیات طیبہ کا اکثر حصہ درس و تدریس اور تبلیغ و ارشاد میں گذرا، جس طرح آپ فضل و کمال میں عدیل و مثیل نہ رکھتے تھے اسی طرح درس میں بھی آپ کی امتیازی شان تھی اور تدریس میں بڑا کمال حاصل تھا۔ آپ کا درس پُر وقار اور شائستہ ہوتا تھا اور حلقۂ درس کو دیکھ کر سلف صالحین اور اکابر محدثین کے حلقۂ تدریس کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ زمانۂ تدریس کے آغاز میں منطق و فلسفہ اور اصول فقہ وغیرہ کتب پڑھاتے رہے اس کے بعد حدیث کی اعلیٰ کتابیں زیر درس رہیں اور ہزاروں افراد کو اپنی زندگی میں فیض یاب کیا۔''

حجۃ اللہ البالغہ آپ کے درس میں زیادہ رہتی تھی۔ جس میں آپ کے حکیمانہ ذوق کے جوہر کھلتے اور پڑھنے والوں کی ان نادر تشریحات سے شریعت اسلامیہ کے مخفی پہلوؤں تک رسائی ہوتی، ابن ماجہ شریف اور مشکوٰۃ شریف بھی برابر زیرِ درس رہیں کئی سال تک شمائل ترمذی کا درس بھی دیا۔ (۴۷)

............❖............

خطابت

لذت ترے کلام میں یہ آئی کہاں سے
پوچھیں گے جا کے حالی جادو بیاں سے ہم

خطابت عطیۂ ربانی اور سنجیدہ خطابت اس کا لطف خاص، سحبان و وائل کی خطابت ضرب المثل اور زبان زدِ خاص و عام، سیدنا علی بن ابی طالب کی خطابت، فصاحت و بلاغت، حسن معنی، حسن تعبیر و حسن اسلوب کی شاہکار۔ خیال فرمایئے کہ صاحب جوامع الکلم، حاملِ کتاب معظم، محمد عربی ﷺ کی خطابت مبارکہ کیسی ہوگی؟ یوں سمجھئے کہ ہر وصف اصول خطابت کا ایک گلشن صد رنگ، احکام ہوں تو ان کے مناسب تعبیرات، مناہی ہوں تو ان کے مطابق مضامین، نصائح ہوں تو ان کی مکمل رعایت، انذار ہو تو اس کے سیاق وسباق کا اہتمام، بشارت ہو تو اس کے لوازمات کا التزام، الفاظ مختصر، ان میں معانی کا ایک سمندر موجزن، عام خطاب میں استعارات، کنایات سے گریز، مخصوص خطابت، فصاحت عرب کی آئینہ دار، معجز بیانی کی شاہکار، لب و لہجہ کا حسن اور مواقع کی رعایت، تنبیہ کا انداز الگ، ترغیب کا جدا، ترہیب مختلف، جامعیت بڑھ چڑھ کر، احادیث مبارکہ کا جو ذخیرہ امت تک پہنچا اگر اس کو نبوت کے ۲۳ رسالہ ایام وساعات پر تقسیم کیا جائے تو الفاظ کم مگر معانی و مفاہیم اس قدر کہ ابتداء کائنات سے آج تک جامع سے جامع کلام کرنے والے ہزاروں، لاکھوں کے کلام میں جو جامعیت، معنویت، اعجاز اور بلاغت ممکن ہوسکتی تھی، اس سے ہزار گنا آپؐ کے ایک جملہ میں آگئی۔ دنیا کے کسی ناصح، کسی واعظ اور خطیب کی خطابت کے وہ ۲۳ ربرس جو مکمل شعور وآگہی میں گزرے ہوں اگر اس کی بامعنی گفتگو، مخصوص تعلیم اور معیاری خطابت کو یکجا کیا جائے تو بھی دفتر کے دفتر تیار ہو جائیں، ہر گھر میں کتابوں کے طومار اور انبار لگ جائیں، مگر آپؐ کے ارشاداتِ مبارکہ کی تعداد گنی چنی اور ان میں خطبات کا حصہ محدود، یہ زندہ شہادت ہے ارشادات مبارکہ کی جامعیت اور بلاغت کی۔

اکابر دیوبند میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی خطابت مشہور، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن

سیوہارویؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ، شورش کاشمیری کی سحر بیانی معروف، عہد حاضر میں خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کا خطاب اپنی متانت، علمیت اور فکر و بصیرت میں زبان زد خاص و عام۔ حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کا خطابت کی دنیا میں اپنے منفرد لب ولہجہ اور مخصوص انداز کی وجہ سے نام، مگر حکیم الاسلامؒ کی بات ہی کچھ اور ہے

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے کہتے ہیں غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

حکیم الاسلامؒ کی خطابت اپنے عہد میں خطابت کی معراج اور خطابت کا اعجاز، نئے نئے مضامین، نئے نئے افکار کا مرقع، آیاتِ کریمہ، احادیث شریفہ، آثارِ مبارکہ کا عطر، ایمان افروز واقعات، بصیرت انگیز حقائق، علوم جدیدہ اور سائنسی معلومات کا انسائیکلوپیڈیا، حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کے علوم و افکار کی دلنشیں تشریح کا خزانہ، شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی روحانی و احسانی تعلیمات کا دفتر، دعوت وارشاد کے مضامین کا بحر بیکراں، حدیث وفقہ، فلسفہ وکلام، تاریخ وسیرت، اخلاقیات و آداب کا خزانۂ عامرہ، لہجہ شیریں، اسلوب پاکیزہ، پیرایۂ بیان مدلل، ڈھائی ڈھائی تین تین گھنٹے لگاتار بولتے اور مجمع لذتِ تقریر سے هَلْ مِنْ مَزِيْد کی تصویر بنا رہتا۔

مولانا حکیم عبدالرشید محمود گنگوہیؒ نے اپنے تعزیتی مکتوب میں وصف تقریر کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا تھا:

''ان کی شیریں زبانی، شگفتہ بیانی، صورت نورانی، ہوش مندی، فکرار جمندی، ذہن اور دردمندئ دل کو کون بھلا سکتا ہے، دوائر علمیہ ان کی جامعیت، علوم و افکار کا تنوع، ادبی ذوق، خوبی تعبیر، حسین و بدیع ترجمانی، حکمت ربانیہ بھی ولی اللٰہی بھی ابن جوزی کی سی سحر انگیزی بھی، کسی صاحبِ ذوق، جوہر شناس کو رہ رہ کر کیسے یاد نہ آئے گی، **عجزت النساء ان یلدن مثل طیب** اب وہ کوہ کی بات کوہ کن کے ساتھ گئی، کس کس نادرہ اور حلیفہ پر تعجب کریں، زبان ایسی کہ سب سمجھیں، بیان ایسا کہ دل مانے، عقل کی پاسبانی بھی لیکن کہیں کہیں اسے تنہا بھی چھوڑ دے اور افکار بھی، دلائل عقلی بھی نقلی بھی، جدلِ عدل بھی، انفسی بھی آفاقی بھی اور حقائق و معرفت آ گئیں بھی۔'' (۴۸)

مولانا مفتی محمد یوسف صاحب لدھیانویؒ فرماتے ہیں:

''حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کو خطابت کا خاص ذوق، زبان و بیان کا خاص انداز اور افہام و تفہیم کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا۔ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بلا تکلف خطاب فرماتے تھے۔ زبان ایسی صاف اور شُستہ اور جملے ایسے نپے تلے کہ گویا سامنے کتاب رکھی ہے اور

اس کی عبارت پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ حقائق و واقعات کی ایسی منظر کشی فرماتے تھے گویا واقعہ متمثل ہو کر سامعین کے سامنے کھڑا ہے۔ شریعت کے اسرار و حکم اور طریقت و حقیقت کے رموز و لطائف اس طرح بیان فرماتے تھے گویا دریائے علم و معرفت کا طوفان امڈ آیا ہے۔

حضرت مرحوم نے اپنے ساٹھ پینسٹھ سالہ علمی دور میں خدا جانے ہزاروں مرتبہ خطاب فرمائے ہوں گے اور بعض اوقات ایک ایک دن میں کئی کئی مرتبہ انہیں تقریر و خطابت کی نوبت بھی آئی لیکن ان کی ہر تقریر کا ہر موضوع منفرد ہوتا تھا اور جس موضوع کو بھی چھیڑتے اس میں لطائف و اسرار کے ایسے گل و لالہ بکھیرتے کہ حقائق و معارف کے چمنستان میں نئی بہار آ جاتی، ان کے علوم اکتسابی سے زیادہ وہبی تھے، مشکل سے مشکل مسائل کو بلا تکلف سامعین کے ذہن میں انڈیل دینا اور بات بات میں نکتہ پیدا کرنے میں انہیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کو تصنیف اور خطابت دونوں میں کمال عطا فرمایا تھا۔ اگرچہ انتظامی مشاغل کے ساتھ سفروں کی کثرت بھی حضرتؒ کی زندگی کا جزو لازم بن کر رہ گئی تھی حساب لگایا جائے تو عجب نہیں کہ آدھی عمر سفر ہی میں بسر ہوئی ہو، لیکن حیرت ہے کہ ان مصروفیات کے باوجود آپ درس و تبلیغ اور تصنیف و تالیف کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے۔ چناں چہ آپ کی بہت سی تصانیف آپ کے بلند علمی مقام کی شاہد ہیں اور ان کے مطالعہ سے دین کی عظمت و محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔

جہاں تک وعظ و خطابت کا تعلق ہے اس میں تو اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو ایسا عجیب و غریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔'' (۴۹)

مولانا قاری ابوالحسن صاحب اعظمی لکھتے ہیں:

''حضرت حکیم الاسلامؒ کی حیات کے اہم ترین عناصر میں نہایت پُر کشش پہلو یہ بھی ہے کہ آپ ایک بے مثال واعظ اور خطیب تھے، حقیقت یہ ہے کہ وعظ و تقریر میں علماء اور واعظین کی صف میں آپ کا کوئی مثیل اور ثانی نہ تھا، آپ بلاشبہ امتیازی مقام کے حامل تھے، اس میں آپ کو ایسا ملکۂ راسخہ حاصل تھا جسے موہبت الٰہی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

دورانِ تقریر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک چشمہ رواں ہے اور ایک ایسا آبشار ہے جو اوپر سے نیچے کی نہایت یکسانیت اور سکون کے ساتھ اپنے جلو میں علوم و معارف اور اسرار و حکم کو لئے بہہ رہا ہے۔''

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلویؒ لکھتے ہیں:

’’حکیم الاسلامؒ ’’علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل‘‘ کے صحیح مصداق تھے، وہ گلستان محمدیؐ کا شگفتہ پھول تھے اور ہر طرف نبوت محمدیؐ کا رنگ ونور بکھیرتے پھرتے تھے یا پھر بقول اکبر۔

محمدؐ پھول ہیں اور واعظ صبا ہیں　　　　کہ پھیلاتے پھریں بوئے محمدؐ

وہ مسند درس پر بیٹھے تو دنیائے تعلیم وتدریس پر اپنا سکہ بٹھا دیا، انھوں نے قلم ہاتھ میں لیا تو اسلام کی حکمتوں اور دین کی بصیرتوں کے موتی بکھیر دیئے اور خواص وعوام دونوں کو دین برحق کا شیدائی بنا دیا۔‘‘

مولانا محمد حنیف ملیؒ صاحب لکھتے ہیں:

’’بلاشبہ حضرت حکیم الاسلامؒ اپنے جد امجد حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے علم لدنی کے جانشین تھے، جس کی جھلکیاں ان کے مواعظ حسنہ میں بکثرت دیکھی جا سکتی ہیں، انہوں نے زبان وقلم سے دین کی سچی اور بے مثال خدمت کی ہے جیسا کہ ان کی سینکڑوں وقیع تصنیفات سے اندازہ ہوتا ہے، اسی نکتہ آفرینی اور دقیقہ سنجی نے انہیں سارے عالم کے لئے ’’حکیم الاسلام‘‘ بنا دیا۔ خطابت ان کا خاص جوہر تھا، جس میں ان کا کوئی مقابل نہ تھا، ان کی زبان میں بلا کی کشش تھی، حضرت کی تقریر کیا تھی ایک جادو تھا جو دل ودماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے، جملوں کی بندش، حکیمانہ اندازِ تفہیم، عربی فارسی اور اردو اشعار کا برمحل اور برجستگی سے استعمال، زبان کی شیرینی، حکایات وامثال کے ساتھ مقصد کی تشریح تو حضرت حکیم الاسلامؒ ہی کا حصہ تھا، پھر دریا کی روانی کی طرح حضرت پہروں تقریر کرتے لیکن کوئی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی، بلاشبہ سحبانِ وائل، قیس بن ساعدہ جیسے ممتاز مقررین کا دور حضرت کی تقریر سے تازہ ہو جاتا تھا۔‘‘

مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی لکھتے ہیں:

’’ان کی تقریر علم وفن کی خشک زمین کے لئے برسات اور تحریر قاری کے دل پژمردہ کے واسطے آب حیات تھی، لفظ لفظ میں علم وحکمت کے گوہر جملے جملے میں معرفت کا سمندر پوشیدہ ہوتا تھا۔‘‘

مولانا مفتی جمیل الرحمٰن ہاپوڑیؒ لکھتے ہیں:

’’سیرت مقدسہ، اسلامی معاشرت، ارکانِ دین، فقہ حنفی، اصول دعوت وتبلیغ، اسلام اور دیگر مذاہب کے تقابلی مطالعہ پر متعدد کتابیں لکھیں۔‘‘

مولانا نور عالم خلیل امینی تحریر فرماتے ہیں:

’’حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریروں کا انداز بالکل نرالا تھا، وہ کسی بھی موضوع پر بولتے، بات سے بات

پیدا کرتے جاتے اور مرکزی موضوع متعدد ذیلی موضوعات پر اس طرح پھیل جاتا کہ ان کی تقریر کے دوران بیچ میں حاضرِ مجلس ہونے والا سامع بسا اوقات یہی سمجھتا تھا کہ حضرت فلاں موضوع پر گفتگو فرما رہے ہیں، حال آں کہ وہ کوئی ذیلی گوشہ ہوتا جس پر وہ اظہار خیال کر رہے ہوتے تھے۔ ان کی تقریر شاخ در شاخ ہو کر پھر مرکزی تنے سے اس طرح جڑتی چلی جاتی تھی کہ بہت کم مقرروں کے لئے، اس طرح کی لمبی لمبی شاخوں کو مرکزی موضوع سے جوڑنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ نہ کبھی مرکز سے ہٹتے، نہ اصل موضوع کو بھولتے، جب کہ ذیلی موضوعات پر درازکلامی سے عموماً مرکزی موضوع کا سرا ہاتھ سے چھوٹ جایا کرتا ہے۔ وہ ہر ذیلی موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرتے اور پھر قرینے سے انہیں اصل موضوع سے جوڑ دیتے۔

تقریر کے دوران کتاب وسنت کے نصوص کو اصل عربی میں پڑھتے اور ان کا انتہائی سلیس اور مزے دار ترجمہ کرتے۔ اقوالِ سلف کو بھی ان کی اصل زبان میں ہی پیش فرماتے: عربی ہو یا فارسی یا اردو۔ دلچسپ لطیفوں، درس انگیز حکایات، عبر خیز نکات، نازک اشارات، معنی ریز تشبیہات، عقل کشا واقعات، ذہن کو بیدا کرنے والے نت نئے خیالات والتفاتات اور سب سے بڑھ کر تجدیدِ ایمان ویقین کا سامانِ صد ہزار رکھنے والے ایسے حقائق حیات سے، ان کی تقریریں بھری پُری ہوتیں، جن سے دل کا ہر زنگ دور ہو جاتا، ہمتِ عمل پر سان چڑھتی، کائنات میں پھیلی ہوئی خدا کی ان گنت نشانیوں پر غور کرنے کا نہ ختم ہونے والا جذبہ بیدار ہوتا اور بہت سی مرتبہ گنہ گار آنکھوں کو غسل تطہیر کا سامان میسر آ جاتا اور آدمی سابقہ خطاؤں سے بالکلیہ توبہ کر لینے کی، ایسی توفیق لے کر اٹھتا کہ آئندہ زندگی میں اپنی تقدیر اپنے ہاتھ سے لکھنے کی راہ پا جاتا۔'' (۵۰)

حکیم الاسلامؒ کے خطبات اتنے مربوط، مرتب ہوتے تھے کہ ان کو بعینہ ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے کتابی شکل دی جاسکتی تھی، کسی ترمیم کی ضرورت ہی نہ تھی، آپ کے اکثر خطبات ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے مرتب ہوئے ہیں، خطبات کے چند ہی اقتباسات سے قارئین کرام کو اندازہ ہو جائے گا کہ حکیم الاسلامؒ کی تقریر میں تحریر کی لذت اور تحریر کا لطف اٹھایا جاسکتا ہے، مضامین کی روانی، معانی کا بہاؤ اور نئے نئے زاویوں، گفتگو اور نئے نئے اسالیب میں ارشاد وافادہ دونوں جگہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ موجود ہے۔

انسانی فضیلت کا راز

انسانی فضیلت کا راز کیا ہے؟ اور وہ صفت یا وصف کون سا ہے جو انسانی فضیلت کی بنیاد بن سکے۔ حکیم الاسلامؒ اس کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

’’ذی شعور مخلوق ملائکہ، جنات، حیوانات، انسان میں سے علم صرف انسان کو بخشا، باقی تین اقسام ملائکہ، جنات اور حیوانات کو یہ علم نصیب نہ ہوا، یا کسی قدر ہوا تو انسان کے طفیل اور اس کے واسطے سے ہوا۔ سو اس میں اصل انسان ہی رہا، جس میں کوئی مخلوق اس کی ہمسری تو بجائے خود ہے شرکت کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی۔ اس سے واضح ہوا کہ علوم طبعیہ، علوم وہمیہ، علوم خیالیہ، علوم عقلیہ وغیرہ انسان کی خصوصیت نہیں۔ یہ اور انواع کو بھی میسر ہیں کیوں کہ یہ تمام علوم اپنے اندر اندرونی قویٰ سے ابھرتے ہیں اور وہ قویٰ جانداروں میں کم وبیش رکھے گئے ہیں۔ عقل ہو یا خیال، وہم ہو یا طبیعت ہر ایک کی چیز ہے اس لئے ان کے ذریعہ جو تصور بھی جاندار کو بندھے گا۔ اس سے خود اس کے نفس کی مرضی و نامرضی اور خدا کے مطلوبہ کاموں کا اس سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ خدا کی پسند ناپسند اس کے اندر سے آئے ہوئے علم سے سمجھ آ سکتی ہے اور وہی وحی کا علم ہے جو نبوت و رسالت کے ذریعہ آتا ہے اور یہ صرف انسان کو دیا گیا ہے اس سے نمایاں ہو گیا کہ انسان کی خصوصیت علوم طبعیہ، علوم وہمیہ، علوم خیالیہ، علوم شیطانیہ نہیں بلکہ علوم الٰہی ہیں، علومِ نبوت اور علومِ رسالت ہیں جو انسان کے سوا کسی کو میسر نہیں۔ اس لئے انسان اگر ساری مخلوقات پر برتری اور فضیلت کا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ علوم شرعیہ ہی کے ذریعہ کر سکتا ہے۔‘‘ (۵۱)

معجزۂ علمی

حکیم الاسلامؒ کی زبان میں امتِ مسلمہ کا امتیازی وصف علم ہے:

فرمایا : ’’ہر فن کے اندر اہل علم اور اہل کمال پیدا ہوئے اور ان کے ذریعہ علماء کے کمالات ظاہر ہوئے، وہ علوم لا کے رکھے کہ دنیا کی عقلیں عاجز آ گئیں، یہ قرآن ہی کا فیض تو تھا کہ خود بھی معجزہ ہے اور معجزہ گر بھی ہے۔ مسلمانوں میں اس نے اعجازی قوت پیدا کی۔ اس کو چھوڑ کر ہم اعجازی قوت سے محروم ہوں گے۔ امت کی طاقت ختم ہو جائے گی، اس کی طرف لوٹیں گے، تبھی جا کر امت کی شوکت بازیاب ہو گی، ان کی قوت بازیاب ہو گی۔‘‘ (۵۲)

رہنمائے انقلاب

قرآن کریم نے جو اصلاحی انقلاب برپا کیا ہے اس میں صحابہ کرامؓ کی جماعت سب سے پہلی صف میں ہے، جو اس انقلاب کی مثال بن سکتی ہے۔

فرمایا: ’’صحابہ کرامؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ قرآن اخذ کیا، دل بدل گئے،

روح بدل گئی، جذبات بدل گئے۔ پھر جہاں بھی یہ حضرات پہنچے وہاں بھی انقلاب برپا کر دیا۔ قیصر وکسریٰ کے تخت الٹ دیئے۔ خیر تخت الٹ دینا تو یہ ہے کہ ملک فتح کرلیا۔ قیصر کا ملک فتح ہوگیا، رومی ماتحت بن گئے، کسریٰ کا ملک فتح ہوگیا، ایران پر حکومت قائم ہوگئی، یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، مگر بڑی بات یہ ہے کہ جہاں بھی گئے ملک بدل دیا، تہذیب بدل دی، مذہب بدل دیا، زبان بدل دی، ساری چیزوں میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ آج آپ ''ممالکِ عربیہ'' کہتے ہیں مصر کو، شام وعراق کو حالاں کہ یہ عرب ممالک نہیں تھے۔ عراق جو ہے وہ خراسان کا ملک تھا۔ اس میں اور زبان بولی جاتی تھی، عربی نہیں بولی جاتی تھی۔ مصر قبطیوں کا ملک تھا اس میں قبطی زبان بولی جاتی تھی، یہ صحابہؓ کی شان ہے کہ عراق میں پہنچے، مذہب بھی بدل دیا، زبان بھی بدل دی، مصر میں پہنچے مذہب بھی بدل دیا اور زبان عربی ہوگئی، تمدن تک بدل دیا، تہذیب تک بدل دی، تو یہ تبدیلی اور انقلاب کی شان صحابہؓ میں کہاں سے آئی؟ اس قرآن کے ذریعہ سے آئی۔ صحابہؓ اسی کو لے کر کھڑے ہوئے، اسی کو دستور العمل بنایا تو عالم کی کایا پلٹ دی۔'' (۵۳)

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہے؟

سیرتِ نبویؐ کی بالکل صحیح تعریف کیا ہوسکتی ہے؟ ذیل میں حکیم الاسلامؒ کی یہ وضاحت ملاحظہ فرمائیے:

''۱۲ ربیع الاوّل کو ایک ذاتِ مقدس کو اللہ تعالیٰ نے نمایاں کیا کہ اس سے زیادہ حسین وجمیل ذات نہ پہلے عالم میں پیدا ہوئی تھی نہ بعد میں پیدا ہوگی۔ ایک کامل نقشہ انسانیت کا ایسا پیش کیا گیا کہ اس سے زیادہ حسین وجمیل نقشہ دوسرا نہیں ہے اور یہ تو قاعدہ کی بات ہے کہ جیسا سانچہ ہوتا ہے ویسی ہی اس میں چیز ڈھلی ہوتی ہے، سانچہ مکمل ہے تو جو چیز ڈھلے گی وہ بھی مکمل ہوگی، سانچہ اگر بے پیندہ کا ہے تو جو اس میں ڈھالو گے وہ بھی بے پیندہ کا ہوگا تو جب سراپا قد وقامت اور نقشہ، قالب مکمل تھا تو حقیقت بھی تو اتنی ہی مکمل آنی چاہیے تھی، اس لئے جیسا جمال بے نظیر تھا، ویسا ہی کمال جو اس میں بھرا ہوا تھا، وہ بھی بے نظیر تھا۔ اس کمال ہی کا نام سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، اسی کمال سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل پیدا ہوئے تو ایک ہے شمائل، شمائل کہتے ہیں ظاہری خصائل کو اور خصائل کہتے ہیں باطنی خصلتوں کو، یعنی اخلاق کو، عادات کو، کمالات کو، تو جب شمائل اعلیٰ ہوں گے تو خصائل بھی اعلیٰ ہوں گے، نقشہ بے نظیر تھا تو جو چیز ڈھلی ہوئی تھی وہ بھی بے نظیر تھی، تو جیسے صورت اعلیٰ تھی، سیرت بھی اعلیٰ تھی، اس واسطے میں نے عرض کیا صورت خود مقصود نہیں ہوتی، صورت سیرت کے دکھلانے کا آئینہ ہوتی ہے، صورت پہچاننے کا ذریعہ ہوتی ہے، کسی شخص کو دیکھ کر جب آپ پہچانتے ہیں تو صورت دیکھ کر

ہی پہچانتے ہیں کہ یہ کون شخص ہے یعنی اس کی حقیقت کیسی؟ اس کی باتیں کیسی؟ تو پہلا ذریعہ پہچاننے کا صورت ہے تو ذریعۂ تعارف ہے صورت، حقیقت میں جو چیز پہچاننے کی ہے، وہ ہے جو صورت کے اندر ڈھلی ہوتی ہے، اس کا نام سیرت ہے تو صورتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے پہچاننے کا وسیلہ بنی، دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ ولادتِ جسمانی ذریعہ بنی، ولادتِ روحانی پہچاننے کا کہ اس ذات کو ظاہر کیا جائے، اس ذات سے دنیا کے لئے پھر کمالات نمایاں ہوں تاکہ دنیا ان کمالات پر چل کر خود سعادت حاصل کرے''۔(۵۴)

تعلیمِ جدید

حکیم الاسلامؒ اور اسلامیۃ المعرفہ، ایک دل نشیں تشریح کہ تمام علوم کی اساس اور بنیاد اور اسی طرح ان کا منتہی یہ سب کا سب مبنی بر توحید ہو اور خدا کی معرفت کی غرض سے، اس سلسلہ میں ذیل کا اقتباس بڑی اہمیت کا حامل ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''کالج کے اندر جہاں اس کی ضرورت ہے کہ کائناتی اشیاء کو سمجھا جائے، وہیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ اس کا ''آخری نقطہ خدا کی معرفت ہو'' اسلام نے ان چیزوں کی طرف توجہ محض ''عیش وعشرت'' کرنے کے لئے نہیں دلائی۔ عیش وعشرت کوئی دوامی چیز نہیں، یہ تو چند روزہ قصہ ہے۔ آدمی دنیا میں آیا ہے مسافر کی طرح سے، اس کو ایک ''بڑی منزل'' تک جانا ہے۔ اگر وہ ''اصل منزل'' کو گنوا بیٹھا تو اس نے کائنات کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ یہ تو راستہ اور رہ گزر ہے مگر چوں کہ راستے کے نشیب وفراز کا جاننا ضروری ہوتا ہے اس کے بغیر آدمی راستہ پر نہیں چل سکتا اور نہ ہی آدمی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے دنیا کے ''عجائبات'' کا دیکھنا اور سمجھنا بھی ضروری ہے۔

یہ وہی تو راستہ ہے جس پر چل کر آدمی اپنے خدا کی معرفت تک پہنچتا ہے۔''(۵۵)

فن سیاست بھی حیوانات میں سے ہے

حکیمانہ نکتہ آفرینیوں کا ایک حیرت انگیز نمونہ، ملاحظہ کیجئے:

''پھر اگر یہ کہیں کہ طب نہ سہی فن سیاست سہی، ہم سیاست جانتے ہیں اور اپنی ملّت کا نظم کر سکتے ہیں اور سیاسی نظام قائم کر کے قوم کی منظّم خدمت کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہم اس بارے میں جانوروں پر فضیلت رکھتے ہیں تو میرے خیال میں یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فن سیاست بھی انسانی خاصہ

نہیں بلکہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے۔ شہد کی مکھی بھی ملت کی سیاسی اور انتظامی تنظیم کر سکتی ہے۔ شہد کی مکھیاں جب شہد کا چھتہ بناتی ہیں اور بے نظیر انداز سے اس میں ہشت پہلو سوراخ اور خانے بنا کر گویا اپنا یہ قلعہ تیار کر لیتی ہیں تو اس کے نظام کی تشکیل اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے تو وہ اپنا امیر منتخب کرتی ہیں، جس کا نام عربی زبان میں ''یعسوب'' ہوتا ہے۔ یہ امیر اس چھتہ پر ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے۔ ساری مکھیاں اس امیر کی اطاعت کرتی ہیں۔ اندرون قلعہ کی انتظامی تقسیم یہ ہوتی ہے کہ اس چھتہ کے ایک حصہ میں تو شہد بھرا جاتا ہے، ایک حصہ میں ان کے بچے ان خانوں میں پلتے ہیں۔ ایک حصہ میں بڑی مکھیاں رہتی ہیں اور امیر ان سب کی نگرانی کرتا ہے حتی کہ اگر کسی مکھی سے قوم کے خلاف کوئی غداری ہو جائے تو وہ اس مکھی کی گردن قلم کر دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ چھتے کے نیچے ہر طرف کچھ مکھیاں سر کٹی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی پڑی رہتی ہیں، کسی کا سر کٹا ہوا اور کسی کی کمر ٹوٹی ہوئی ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی زہریلے پتے پر بیٹھ کر اس کا زہریلا مادہ لے کر آتی ہے۔ جس سے بنے ہوئے شہد میں سمّیت سرایت کر جانا یقینی ہوتا ہے تو وہ یعسوب اسے فوراً محسوس کرتا ہے کہ زہریلا مادہ لے کر آئی ہے اور اس مکھی کی گردن توڑ کر اسے فوراً مار گراتا ہے کہ وہ اس چھتہ کے اندر نہ گھسنے پائے تا کہ اس کے زہریلے مادہ سے قوم کے دوسرے افراد کی جانیں ضائع نہ ہوں گویا وہ سمجھتا ہے کہ ایک کی جان لے کر پوری قوم کو بچا لیا جائے تو کوئی جرم نہیں یعنی اس کی سیاست اسے یہ اصول سمجھاتی ہے کہ: ''وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ'' (۵۶)

دنیا میں جنت کی شکل آیاتِ قرآنیہ ہیں

الفاظ کے سمندر میں حکمت آفرینی کی موجِ تہ نشیں کا ایک جیتا جاگتا نمونہ:

''جب کہ جنت اسی کلام کا مجموعہ ہے اور انہی آیات قرآنیہ کو جنت کہا گیا ہے، فرق یہ ہے کہ یہاں اس جنت کی شکل آیتوں کی ہے اور وہاں جا کر باغ و بہار ہو جائے گی، تو چیز ایک ہوئی لیکن جہانوں کے بدلنے سے ہیئت بدل جائے گی، اس دنیا میں وہ الفاظ و معنی ہیں اس دنیا میں جا کر وہ بہترین صورتیں اور بہترین نعمتیں اور بہترین لذتیں بن جائیں گی اور باغ و بہار ہو جائیں گی اور یہ کوئی مستبعد بات نہیں کہ ایک چیز ایک عالم میں ایک لباس پہنے ہوئے ہو اور دوسرے عالم میں دوسرا لباس پہن لے، وطن کی خصوصیت سے صورتیں، شکلیں بدل جاتی ہیں جیسے ایک انجینئر کوٹھی کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں بناتا ہے جو اس کے تصور میں ہوتا ہے، پھر اسی نقشہ کو وہ کاغذ پر اتارتا ہے اور پھر اسی کاغذی نقشہ کے مطابق وہ کوٹھی کی تعمیر زمین پر کرتا ہے، پس اصل کوٹھی وہی ہے جو اس کے ذہن میں تھی، وہی کوٹھی کاغذ پر آئی اور پھر وہی ذہنی کوٹھی آخر کار زمین

پر کھڑی ہوئی چیز ایک ہی ہے، مگر ہر وطن میں پہنچ کر اس نے لباس اختیار کیا، چیز ایک ہی ہے مگر وطنوں کے بدلنے سے لباس بدلتا رہا، ذہن میں تھی تو وہاں نہ روشنائی تھی نہ کاغذ تھا، کاغذ پر آئی تو وہاں نہ اینٹ تھی نہ پتھر تھا، زمین پر آئی تو وہاں مادی چیز تھی، غرض ہر جگہ اس وطن کے مناسب یہ کوٹھی لباس اختیار کرتی رہی''۔(۵۷)

انسانی دل ایک عجیب کائنات ہے

انسانی دل کی ماہیت وآثار وکیفیات کی عارفانہ منظرکشی، ملاحظہ کیجئے:

''قلب کو ایک عجیب کائنات بنایا اللہ تعالیٰ نے، اس قلب کے اندر محققین لکھتے ہیں کہ دو دروازے ہیں قلب کے ایک نیچے کی طرف کھڑکی کھلی ہوئی ہے، قلب میں اوپر کی طرف، اوپر کی کھڑکی کھلتی ہے تو عالم غیب کے مشاہدات کرتا ہے۔ وحی اور الہام ربانی اور جمالات اور کمالاتِ خداوندی کو دیکھتا ہے، عالم غیب منکشف ہوتا ہے اور نیچے کی کھڑکی سے دیکھتا ہے تو محسوسات نظر پڑتے ہیں، دریا اور پہاڑ اور جنگل تو محسوسات کو نیچے کے سوراخ سے دیکھتا ہے اور مغیبات کو اوپر کے سوراخ سے دیکھتا ہے، قلب ایک ہی ہے لیکن اس میں بینائیاں دو قسم کی رکھیں، ایک اوپر کے دیکھنے کی، ایک نیچے کی دیکھنے کی۔ ایک ظاہری چیزیں دیکھنے کی، ایک باطنی چیزیں دیکھنے کی، ظاہری چیزوں کے دیکھنے کے لئے آلات بنائے، قلب کے لئے آنکھ بنائی تا کہ شکلیں اور صورتیں دیکھے، کان بنائے تا کہ آوازوں کو سنے، زبانیں دیں تا کہ ذائقوں کو چکھیں، ناک دی تا کہ خوشبو اور بدبو کو سونگھے، تو شئے کی صورت بھی دیکھتا ہے انسان شئے کی خوشبو، بدبو کا بھی ادراک کرتا ہے، شئے کی آوازیں بھی سنتا ہے۔ آوازیں سن کر بچاؤ بھی کرتا ہے۔ اپنے کام بھی نکالتا ہے، اگر شیر کی دہاڑ سنی تو بچنے کی کوشش کرتا ہے تو کان ذریعہ بنتے ہیں بچنے کا اور اگر آواز سن لی کسی اچھے خوشنما پرندے کی تو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے کہ گھر کی زینت بناؤں گا تو کان ذریعہ بنا منافع حاصل کرنے کا بھی اور مضار یعنی مضرتوں سے بچنے کا بھی۔ اسی طرح سے آنکھ ذریعہ بنتی ہے چیزوں کے لینے کا بھی اور چیزوں سے بچنے کا بھی۔ اگر صورت دیکھ لے سانپ کی تو بھاگتا ہے آدمی، اگر صورت دیکھ لی کسی اچھے، خوشنما پتھر کی، سونے چاندی کی دوڑتا ہے اس کے اٹھانے کے لئے، اگر آنکھ نہ ہوتی تو نفع حاصل کر سکتا نہ مضرت سے بچ سکتا تو آنکھ کو اللہ تعالیٰ نے ذریعہ بنایا دور سے دیکھ کر منافع حاصل کرنے کا اور مضرتوں سے بچنے کا، بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ سامنے نہیں ہیں، ان کی آواز بھی نہیں آتی، لیکن ان کی بدبو اور خوشبو سے سمجھ لیتا ہے کہ یہاں فلاں چیز موجود ہے۔ شیر کے منہ میں بدبو ہوتی ہے، اگر وہ سامنے بھی نہیں تو اس کے منہ کی بدبو دور تک سونگھ سکتا ہے آدمی، سمجھ لیتا ہے کہ یہاں شیر موجود ہے بھاگتا ہے، وہاں سے اور اگر دوسرا جانور ہے اس کی بو آئی اور وہ استعمال کا ہے تو

شکار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ناک ذریعہ بنتی ہے۔ بہت سی چیزوں سے بچنے کا اور بہت سی چیزوں کے حاصل کرنے کا، اسی طرح سے ذائقہ بعضی چیزوں کو چکھ کر آدمی محسوس کرتا ہے کہ یہ مضر ہوں گی، اس کا ذائقہ بتلا رہا ہے کہ یہ مضر ہے، بعض جو فرحت بخشتے ہیں انہیں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ (۵۸)

اس دنیا کے حالات اور اس کی اشیاء پر جہاں تک ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہر چیز یہاں مرکب ہے۔ ایک حصہ اس میں نمایاں ہے جس کو آپ جسم یا صورت کہہ دیں اور ایک حصہ مخفی ہے جس کو آپ روح یا جان کہہ دیں۔ غرض یہاں کی ہر چیز روح اور جسم سے مرکب ہے۔ اس جہان میں نہ جسم محض ہے نہ روح محض ہے جسم محض ہو تو اس کا انجام گلنا پھولنا، پھٹنا سڑنا ہے۔ وہ بغیر روح کے باقی نہیں رہ سکتا اور روحِ بلا جسم کے نمایاں نہیں ہوسکتی، وہ مخفی کی مخفی رہ جائے گی۔ اسی لئے دنیا میں جب بھی کوئی چیز آئے گی تو وہ اپنا کوئی پیکر یا ہیئت لے کر آئے گی۔

یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ جب بھی کوئی غیبی حقیقت ظاہر ہوگی وہ کوئی نہ کوئی پیکر یا پیراہن ضرور اختیار کرے گی اور وہ پیراہن اسی کے مناسب حال ہوگا جو اللہ نے اس کے لئے تجویز کیا ہے۔ مثلاً گلاب کی خوشبو ایک غیبی حقیقت ہے، وہ جب نمایاں ہوگی یہ نہیں ہے کہ وہ کیکر کے پتوں میں نمایاں ہو جائے، اپنے ہی مناسب صورت اختیار کرے گی۔ خربوزہ ہے اس کا ایک ذائقہ ہے، جب بھی اسے آپ تلاش کریں گے تو خربوزے کی ہیئت میں تلاش کریں گے، یہ نہیں کہ آپ آم کی ہیئت میں خربوزہ کا مزا ڈھونڈنے لگیں۔ اس لئے اس ذائقہ کو اللہ تعالیٰ نے اسی کے مناسب شکل دی ہے۔ وہ غیر شکل میں نمایاں نہیں ہوسکتا۔

انسان کو حق تعالیٰ شانہٗ نے حقیقت جامعہ بنایا ہے جس میں ساری ظاہری اور باطنی کمالات رکھے ہیں۔ اس کے مناسب حال یہی صورت ہے جو آپ کی صورت نوعیہ ہے۔ یہ حقیقت کسی جانور کی شکل میں ظاہر ہو نہیں ہوسکتی۔ اسی انسانی پیکر میں ظاہر ہوگی تو ہر حقیقت قدرۃً چاہتی ہے کہ میرے مناسب صورت ہو۔ ہر صورت چاہتی ہے کہ میرے مناسب اس میں حقیقت ڈالی جائے۔ اللہ کے یہاں کوئی بے جوڑ قصہ نہیں ہے کہ حقیقت کوئی سی ہو اور شکل کوئی سی ہو، ہر صورت کے مناسب حقیقت اور ہر حقیقت کے مناسب صورت ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: **التمسوا الخیر فی حسان الوجوہ.**

خوبصورت چہروں میں خیر تلاش کرو۔ یعنی اگر چہرہ مہرہ اچھا ہے تو اندر بھی خیر ہی ہوگی، چہرہ مہرہ خراب ہے تو اس خیر کے درجے کی نہیں ہوگی۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ قادرِ مطلق ہیں۔ وہ پابند نہیں ہیں، وہ چاہیں تو بہتر سے بہتر صورت میں بری حقیقت ڈال دیں اور بری سے بری صورت میں

بہترین حقیقت ڈال دیں۔ درحقیقت ان کے قبضہٴ قدرت کی بات ہے لیکن سنت اللہ یہی ہے کہ جیسا پیکر ہوگا ویسی حقیقت ظاہر ہوگی۔

تو یہ حق تعالیٰ کو قدرت ہے کہ اچھی صورت میں بری حقیقت اور بری صورت میں اچھی حقیقت ڈال دیں مگر سنت اللہ یہی ہے کہ اچھی صورتیں ہوں گی تو اچھی حقیقتیں ہوں گی اور بری صورت ہوگی تو حقیقت بھی اسی درجے کی ہوگی۔ اس لئے حدیث میں فرمایا گیا: ”التمسوا الخیر فی حسان الوجوہ“ اچھی حقیقتوں کو پاکیزہ چہروں میں تلاش کرو، اس قسم کی تکوینی چیزیں اکثر ہی ہوتی ہیں، کلیہ نہیں ہوتیں، کوئی نہ کوئی جز ان سے نکلتا رہتا ہے“۔ (۵۹)

بعثتِ نبی امیؐ کا پسِ منظر

نہایت سادہ اور سہل انداز بھی حکیم الاسلامؒ کی زبان سے کتنا پرکشش بن جاتا ہے، اس کی ایک مثال دیکھئے:

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چوں کہ تمام عالم کی طرف مبعوث ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جامع العلوم بنایا گیا۔ ہر ذہنیت آپ کی شریعت میں موجود ہے کہ اسی ذہن کے مطابق تربیت دی جائے۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام کو علمِ اسماء دیا گیا، فرمایا گیا: **وَ عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ** تو حدیث میں ہے کہ **عُلِّمْتُ الْاَسْمَاءَ کُلَّهَا کَمَا عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّهَا**.

”آدم علیہ السلام کو سب نام سکھلا دیئے گئے تو وہی علم مجھے بھی عطا کیا گیا۔“

حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر کا علم دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مستقل تعبیر خواب کا علم تھا، تعبیر خواب کے اصول بیان کرنا کہ جس سے فن بن جائے اور ہزاروں معبّر پیدا ہوجائیں تو انبیاء علیہم السلام میں حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیر خواب کا علم دیا گیا تھا لیکن حضور علیہ السلام کو تعبیر خواب کے اصول بتلائے گئے جو قرآن وحدیث میں بکھرے ہوئے ہیں جس کے ذریعے سے یہ ایک فن بنا اور اس فن کے بڑے بڑے امام اس امت کے اندر پیدا ہوئے جنہوں نے انہی اصول وقواعد کے مطابق تعبیرات دیں، تو جزئی علم نہیں دیا گیا بلکہ کلی طور پر علم دیا گیا۔ غرض حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیر خواب کا حکم دیا گیا یعنی جزئی خواب جو آتے تو وہ ان کی تعبیر بتلا دیتے تھے مگر وہ اصول وقواعد جن سے تعبیر دینے کا طریقہ معلوم ہوجائے یہ فنی صورت نہیں تھی، لیکن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قواعد منکشف ہوگئے جن کو کتابوں میں نقل کیا گیا اور فنِ مستقل بن گیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے خواب ذکر کیا جاتا تو جو تعبیر ان کے قلب میں القاء کی جاتی وہ ارشاد فرماتے اور واقعہ سامنے آجاتا مگر جناب رسول اللہ ﷺ جو تعبیرات فرماتے ان کے دلائل بھی ذکر کئے گئے ہیں۔ علماء نے ان کو منضبط اور جمع کر کے ایک فن کی صورت دیدی۔

تعبیر خواب کا علم، علومِ مقصودہ میں سے نہیں ہے۔ علومِ مقصودہ میں تو احکام ہیں جن پر چل کر آدمی سعادتِ ابدی حاصل کرے اور اخروی نجات حاصل کرے۔ اگر عمر بھر کسی کو خواب کی تعبیر نہ معلوم ہو یا کوئی فن نہ جانے تو قیامت کے دن یہ سوال تھوڑا ہی ہوگا کہ تم نے تعبیر خواب کا علم کیوں نہ حاصل کیا؟ تو علومِ مقصودہ میں سے نہیں مگر اس کے باوجود قرآن کریم اور احادیث سے ایسے علوم کی بنیاد بھی نکلتی ہے جو مقاصد نہیں ہیں مگر قرآن وحدیث نے ان کو ایک فن کی صورت دیدی ہے اور علماء نے اپنے فہم کے مطابق اس فن کو ترتیب دیدیا ہے۔ (۶۰)

علم اور مال میں فرق

مال تو خزانہ ہے، سب جانتے ہیں مگر علم اس سے بڑھ کر ایک قیمتی خزانہ ہے۔ ان دونوں میں یہ فرق کیوں ہے؟ اس بات کو تھوڑا عنوان بدل کر حکیم الاسلامؒ کی زبان سے سنئے:

''حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ علم اور مال میں فرق ہے، وہ یہ کہ مال جتنا خرچ کرو، گھٹتا ہے، علم کو جتنا خرچ کرو بڑھتا ہے۔ اگر علم کہیں گھٹ جایا کرتا تو جو حافظ قرآن شریف پڑھانے بیٹھتا ہے تو جتنی آیتیں بچوں کو سکھلایا کرتا، خود بھول جایا کرتا۔ اس کا علم دوسرے کے پاس منتقل ہو جایا کرتا، حالاں کہ جتنا پڑھاتا ہے تو استاذ پرانا ہو جاتا ہے۔ اس کا علم ترقی کر جاتا ہے۔ غرض علم کو جتنا خرچ کرو، بڑھتا ہے، دولت کو جتنا خرچ کرو گھٹتی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ مال کی حفاظت مالک کو کرنی پڑتی ہے۔ چار پیسے ہوں گے تو آپ کو فکر ہے کہیں چور نہ لے جائے۔ تالا لگاؤں، تجوری میں رکھوں، گھر کی کوٹھری میں رکھوں اور سو رہے ہیں تو فکر ہے کہ رات کو کوئی چور نہ آئے گا، تو آپ کو خود مال کی حفاظت کرنی پڑتی ہے اور علم عالم کی حفاظت کرتا ہے، عالم کو ضرورت نہیں۔ علم خود بتلائے گا کہ یہ خطرے کا راستہ ہے، یہ نجات کا۔ تو علم اپنے عالم کی خود حفاظت کرتا ہے مگر مال اپنے مالک کی حفاظت نہیں کرتا، مالک کو حفاظت کرنی پڑتی ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ مال آئے گا تو سو مصیبتیں ساتھ لے کر آئے گا کہ حفاظت کرو چور سے اور اس سے وغیرہ وغیرہ اور علم آئے گا تو وہ احسان جتلاتا ہوا آئے گا کہ میں تیرا محافظ ہوں، میں تیری خدمت کروں

گا، میں تجھے نجات کا راستہ بتلاؤں گا، تو علم جیسی چیز اگر کوئی سکھلائے تو وہ سب سے بڑا محسن ہے کہ اس نے دنیا اور آخرت کا راستہ کھول دیا ہے۔" (۶۱)

"حقیقت یہ ہے کہ: **العلم عز لا ذل فيه يحصل بزل لا عز فيه** یہ امام ابو یوسف کا مقولہ ہے کہ علم ایک ایسی عزت ہے جس میں ذلت کا نشان نہیں، مگر ایسی ذلت سے حاصل ہوتا ہے جس میں عزت کا نشان نہیں۔ غلامی محض کرنی پڑتی ہے۔ اساتذہ کے آگے جھکنا پڑتا ہے، اڑی کڑی جھیلنی پڑتی ہے، تب جا کر چار حرف آتے ہیں۔

ابن عباسؓ سے کسی نے پوچھا کہ یہ اتنا بڑا علم آپ کو کیسے حاصل ہوا؟ تو فرمایا: "**بلسان سئول و قلب عقول**" سوال کرنے والی زبان اور عقل مند قلب کے ذریعہ حاصل ہوا۔ میں نے سوال کرنے میں کبھی عار نہیں کیا۔ اگر مسئلہ معلوم نہیں ہوا اپنے چھوٹوں سے سوال کرلیا۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک مسئلہ ذہن میں اٹکا، تو حضرت زید بن ثابتؓ، جو کاتب وحی ہیں حضرت ابن عباسؓ کے استاذ ہیں۔ ضرورت پڑی کہ ان سے تحقیق کی جائے تو بارہ بجے دوپہر کو یہ سوال ذہن میں آیا تو زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی دہلیز پر بیٹھ گئے جہاں جلتا ہوا پتھر ہے۔ دھوپ پڑ رہی ہے، یہ خیال کیا کہ جب ظہر کی نماز کے لئے نکلیں گے تو سوال کروں گا، اگر مسجد میں پہنچ گئے تو درس شروع ہو جائے گا، سوال کا موقع نہیں رہے گا، تو ساری دوپہر دھوپ میں دہلیز پر بیٹھ کر گزارا۔ جب اچانک زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نکلے فرمایا:

اے ابن عم رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ آپ کہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟ عرض کیا: حضرت ایک مسئلہ اٹک رہا تھا، اس کی تحقیق کرنی ہے۔ فرمایا: پھر آ جاتے۔

عرض کیا: سوال تو دل میں ابھی کھٹکا تھا، پھر آنے کا کون سا وقت ہے؟ جب سوال ذہن میں آیا تو جب ہی حاضر ہو گیا۔

اس سے شدتِ طلب معلوم ہوئی اور شدتِ طلب کے ساتھ ساتھ کسرِ نفس بھی واضح ہوا کہ علم کے حاصل کرنے میں نہ کسی وقار کا سوال، نہ کسی خودداری کا سوال، غلاموں اور خادموں کی طرح جا کر دہلیز کے اوپر بیٹھ گئے۔ اس طرح سے علم حاصل ہوتا ہے۔ (۶۲)

مزاجِ نبوت وملوکیت میں فرق

مزاجِ نبوت اور مزاجِ ملوکیت میں بہت سے فروق ہیں، مگر سب سے بڑا فرق کیا ہے، ذیل میں اس کا جواب مل جائے گا۔

ان دونوں کے مزاج میں بڑا فرق ہے۔ نبوت کا بھی ایک مزاج ہے اور بادشاہت وملوکیت کا بھی۔ دنیا میں جب بادشاہت غالب آتی ہے تو اس کا مزاج کچھ اور ہے۔ ان دونوں مزاجوں کا قرآن کریم نے تذکرہ کیا۔ فرمایا کہ بادشاہ جب کسی ملک پر غالب آتے اور اقتدار پاتے ہیں اور فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو وہ کیا کرتے ہیں:

"اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَ جَعَلُوْا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَا اَذِلَّۃً. وَکَذٰلِکَ یَفْعَلُوْنَ.

جب کوئی بادشاہ کسی ملک میں فاتحانہ داخل ہوتا ہے تو وہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے اس شہر کو اس طرح سے فاسد کرتا ہے کہ عزت والوں کو پست کرتا ہے، ذلت والوں کو اونچا کرتا ہے۔ انقلاب عظیم برپا کرتا ہے۔

اس لئے کہ جواب تک عزت والے تھے، ان سے عزت چھیننی ہے کیوں کہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ پھر برسر اقتدار نہ آجائیں، اس لئے انہیں کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کے اقتدار کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ وہ نشانات مٹائے جاتے ہیں جو کسی قوم کے اقتدار کے ہوتے ہیں۔ کاغذوں سے وہ نام محو کئے جاتے ہیں تاکہ خیال بھی ادھر نہ جائے، اس لئے کہ اگر ان کا اقتدار کسی درجہ میں بھی رہ گیا تو ہمارا اقتدار قائم نہیں ہوگا۔

وَ کَذٰلِکَ یَفْعَلُوْنَ یہ سلاطین کا طریقہ ہے، بادشاہت اور ملوکیت کی تاریخ دیکھی جائے تو الٹی ہی نظر آئے گی۔

اور ایک انبیاء علیہم السلام کا مزاج ہے۔ جب نبوت کا اقتدار غالب ہوتا ہے تو وہ امن کا اعلان کرتے ہیں، عزت والوں کو عزت کی داشت کرتے ہیں اور جو پست ہیں ان کو ابھارتے ہیں تاکہ سب عزت میں شریک ہو جائیں اور کسی کی تذلیل اور رسوائی نہ ہو۔

نبی کریم ﷺ دس برس کی زندگی کے بعد جب مدینہ طیبہ سے تشریف لائے اور فاتحانہ مکہ کے اندر داخل ہوئے تو دس ہزار صحابہ کرامؓ کا لشکر ساتھ تھا۔ آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہیں، بادشاہ ایسے موقع پر اقتدار کو جتلاتا ہوا اور اینٹھتا ہوا داخل ہوتا ہے لیکن حضور ﷺ داخل ہوئے۔ حدیث میں ہے کہ تواضع اور خاکساری کی وجہ سے گردن مبارک اونٹنی کی گردن پر جھکی ہوئی تھی، چوں کہ عزت کے ساتھ داخلہ ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عزت پیش نظر تھی، اس لئے غایتِ تواضع اور انکساری کی وجہ سے سر مبارک اتنا جھک گیا تھا کہ اونٹنی کے سر سے آملا تھا۔

ع نہد شاخ پر ز میوہ سر بر زمین

درخت کا پھل جب بڑھ جاتا ہے تو شاخیں زمین کی طرف جھک جاتی ہیں، یہ نہیں ہے کہ درخت جب پھل دار ہو تو اوپر کو اٹھنے لگے۔ انبیاء علیہم السلام اللہ کی طرف سے ساری دولتیں لے کر آتے ہیں، ان میں تواضع بڑھتی رہتی ہے لیکن مادی دولت جوں جوں بڑھتی رہتی ہے اس سے نخوت بڑھتی رہتی ہے۔ (۶۳)

جامع اضداد زندگی

اس عنوان کے تحت صحابہ کرامؓ کی حیاتِ مبارکہ کا ایک ایمان افروز تجزیہ ملاحظہ فرمائیے:

صحابہ کرامؓ کی اس اعلیٰ ترین زندگی کا نور تیز بھی ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اقرب تر اور اشبہ تر بھی ہے کہ اس نے نبوت کی زندگی سے متصل رہ کر اس کی شعاعوں کا نور قبول کیا ہے اس لئے یہ زندگی نہ صرف عزیمتوں کی زندگی اور اولوالعز مانہ زندگی ہے کہ جائزات کی آڑ لئے بغیر عمل کے اعلیٰ ترین حصہ ہی کو اپنا لیا جائے اور نفس کی راحت طلبیوں کو خیر باد کہہ کر عملی مجاہدہ و ریاضت ہی کو زندگی بنا لیا جائے بلکہ یہ زندگی جامع اضداد بھی ہے جو کمال اعتدال لئے ہوئے ہے کہ ایک طرف نفس کشی بھی انتہائی اور ساتھ ہی ادب شریعت اور اتباع سنن نبویؐ بھی انتہائی اور ایک طرف طبعی جذبات بھی قائم اور دوسری طرف عقلی وداعی اور ملکیت بھی غالب، اس کمال اعتدال و جامعیت کے ساتھ یہ زندگی صحابہ کرامؓ کے سوا امت کے کسی طبقہ کو طبقاتی حیثیت سے نصیب نہیں۔ آحاد وافراد اس زندگی کے حامل نظر پڑیں گے، جس میں شرف صحابیت کے سوا سب کچھ ہوگا، لیکن طبقہ کا طبقہ ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا ہو اور ہمہ وقت اخلاص و معرفت حد کمال کو طے کئے ہو۔ طبقہ صحابہؓ کے سوا دوسرا نہیں۔ جنہوں نے گھر بار چھوڑ کر اور نفس کی خواہشات سے منہ موڑ کر صرف اور صرف رضائے حق کو اپنی زندگی بنایا۔ مرغوبات کو شرعی مطلوبات پر قربان کر دیا۔ موطن طبیعت سے ہجرت کر کے موطن شریعت میں آ کر بس گئے اور شرعی مرادوں کی خاطر نفس کی حیلہ جوئیوں اور راحت طلبیوں سے کنارہ کش ہو کر عزم صادق کے ساتھ ہمہ تن مرضیاتِ الٰہی اور سنن نبویؐ کی پیروی میں مستغرق ہو گئے اور اسی کو اپنی زندگی بنا لیا۔ اس جامع اور جامع اضداد زندگی کا سب سے زیادہ نمایاں اور حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ وہ کلیۃً تارک دنیا بھی تھے اور رہبانیت سے الگ بھی، دنیا اور دنیا کے جاہ وجلال، دھن و دولت، حکومت وسیاست، گھربار، زمین، جائیداد کے ہجوم میں بھی تھے اور پھر ادائے حقوق میں بے لاگ بھی، یہ زن، زر، زمین ان کے تصرف میں بھی تھی اور پھر قلباً ان سب چیزوں سے بے تعلق اور کنارہ کش بھی، درویش کامل بھی ہیں اور قبا شاہی بھی زیب تن ہے۔ حکمران بھی ہیں اور دلق گدائی بھی کندھوں پر ہے۔ ممالک بھی فتح کر رہے ہیں اور فقیری بھی بدستور قائم ہے۔ (۶۴)

پس صحابہ کرامؓ درحقیقت نبوت کا ظل کامل تھے جن کے طبقہ سے نبوت اور کمالاتِ نبوت پہچانے جاتے ہیں، اس لئے اگر کسی طبقہ کے طبقہ کو بحیثیت طبقہ اللہ ورسولؐ کے یہاں مرضی و پسندیدہ قرار دیا گیا ہے تو وہ صرف صحابہ کرامؓ کا طبقہ ہے جس کی شہادت قرآن اور حدیث نے دی اور ''رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ'' اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی کی دستاویز رضا ان کے لئے آسمانی کتاب میں تا قیامِ قیامت ثبت کردی ہے۔ کہیں: اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی لَھُمْ مَغْفِرَۃٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ''یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے خالص کردیا ہے، ان لوگوں کے لئے مغفرت واجر عظیم ہے۔'' ان لوگوں کے ذریعے ان کے قلوب کی پاکیزگی کی شہادت دی گئی اور کہیں: ''اُولٰئِکَ ھُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰہِ وَ نِعْمَۃً'' اور کہیں وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا فرما کر ان کے اخلاق کی برتری ثابت کی گئی اور کہیں اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم فرما کر ان میں ہر ہر فرد کو پوری امت کا مقتدی بتلایا گیا جس کی پیروی اور پیروی سے حصول ہدایت میں کوئی ادنیٰ کھٹکا نہ ہو۔ (۶۵)

جنت عمل کا نہیں، ایمان کا صلہ ہے

علم کلام کا مشہور مسئلہ ہے کہ دخولِ جنت کے لئے ایمان شرط ہے اور اعمال رفع درجات کے لئے شرط کے درجہ میں ہے۔ ذیل میں حکیم الاسلامؒ اسی موضوع پر اپنے انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔

جنت کا بدلہ ایمان پر ملے گا، عمل پر نہیں ملے گا۔ عمل محض علامت ہے، جس سے ایمان پہچان لیا جائے۔ ورنہ اصل ایمان کا بدلہ جنت ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ آپ اگر سونا خریدنے کے لئے کسی صراف کی دوکان پر جائیں اور ایک ہزار روپئے کا سونا آپ کو خریدنا ہے تو آپ یہ نہیں کرتے کہ آپ نے ہزار روپئے دیئے، اس نے سونا دیدیا اور آپ لے کے چلے آئے۔ پہلے اسے پرکھتے ہیں کہ اصلی ہے یا نہیں؟ اس میں کھوٹ ملا ہوا تو نہیں ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسوٹی ایک پتھر ہوتا ہے، اس پر گھس کر دیکھتے ہیں۔ اگر اس پر سفید، چمک دار لکیریں پڑیں، یہ اس کی علامت ہوئی کہ سونا کھرا ہے تو آپ ہزار روپئے دیدیں گے، سونا لے لیں گے اور اگر میلی اور مٹیالے رنگ کی لکیریں پڑیں تو آپ سمجھیں گے کہ سونا کھوٹا ہے، آپ نہیں لیں گے۔

یہ جو آپ نے سونا خریدا اور صراف کو ہزار روپئے دیئے، یہ ہزار روپئے کیا ان لکیروں کی قیمت تھی، جو

پتھر پر کھینچی گئی یا سونے کی قیمت ہے؟ یہ سونے کی قیمت تھی، لکیروں کی نہیں تھی۔ وہ تو علامات تھیں، جن سے پہچانا گیا کہ سونا کھرا ہے۔ اسی طرح آخرت کے بازار میں جنت جو ملے گی یہ ایمان کا بدلہ ہوگا، عمل کا نہیں ایمان کا بدلہ ملے گا، ایمان کو پہچاننے کے لئے عمل کو دیکھا جائے گا۔

اگر عمل کا بدلہ ہوتا تو میں نے اور آپ نے پچاس برس مثلاً عمل کیا تو پچاس برس جنت میں رہتے، اس کے بعد کان سے پکڑ کے باہر نکال دیئے جاتے کہ جاؤ باہر، بدلہ ہوگیا۔ جنت میں جو ابدالآباد رہیں گے یہ عمل کا بدلہ نہیں، اس لئے کہ عمل محدود وقت تک انجام دیا تھا۔ ایمان ایک ایسی چیز ہے جو عمر بھر قائم رہے گا اور جب آدمی مرتا ہے تو عزم لے کے جاتا ہے کہ اگر ایک کروڑ برس بھی زندہ رہوں گا، تب بھی اس ایمان کو نہیں چھوڑوں گا، تو ایماندار ہی ہوتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ چوں کہ ابدی چیز ہے، اس لئے بدلہ بھی ابدی ملا، عمل ابدی چیز نہیں ہے، اس لئے عمل کا بدلہ نہیں ہوتا، اس کو بطور علامت دیکھتے ہیں۔ ظاہر میں بے شک عمل سے جنت ملی، مگر ایمان نہ ہو، کیا پھر بھی جنت مل جائے گی؟ نہیں ملتی۔ معلوم ہوا کہ عمل سے نہیں ملتی، ایمان سے ملتی ہے۔ ایمان ہو، تبھی عمل بھی معتبر ہوتا ہے اور ایمان کی پرکھ عمل سے ہی ہوتی ہے۔

اس واسطے میں عرض کر رہا ہوں کہ بلاشبہ فضل سے نجات ہوگی لیکن عمل کرنا اس کی علامت ہے، اس لئے عمل کو نہیں چھوڑنا چاہئے۔ (٦٦)

اختلاف مذہب کے اسباب

یہ تو طے ہے کہ جملہ الہامی مذاہب میں مذہب اسلام آخری اور دائمی مذہب ہے، دیگر مذاہب ہنگامی اور غیر دائمی تھے، اتنی سی بات سمجھ لی جائے تو بات ختم ہو جاتی ہے، اسلام اور دیگر الہامی مذاہب میں اصولاً کوئی ٹکراؤ نہیں رہتا ہے مگر اہل مذاہب اصول نے شرع کے بجائے جب عقلیں لڑانی شروع کیں تو اختلافات کی نئی نئی عمارتیں کھڑی ہوگئیں۔ اس سلسلہ میں حکیم الاسلامؒ کی یہ وضاحت ملاحظہ فرمائیے:

''اور ابتداء میں سارے انسان ایک ہی دین پر تھے، لیکن جوں جوں لوگوں نے اپنی عقلیں چلائیں تو دین کے اندر فتنے پیدا ہوتے گئے اگر محض اتباع کرتے کہ جو اللہ کے رسول نے لا کر دے دیا اس پر آنکھ بند کر کے چلتے، کوئی نزاع نہ ہوتا۔ نزاع جب ہوتا ہے جب اوپر سے آئی ہوئی چیزوں میں آدمی عقلیں لڑائیں اور عقلی ڈھکوسلوں سے عقیدے بنانا شروع کرے، یہیں سے آدمی کے اندر خلل پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔

اس طرح کبھی انتہائی محبت سے عقیدہ بگڑتا ہے کہ کسی ذات سے انتہائی محبت اور عقیدت ہے اس کو اتنی بڑائی دی کہ اس کو خدائی کے درجہ میں پہنچا دیا۔

کبھی انتہائی عداوت سے عقیدہ بگڑتا ہے کہ کسی سے عداوت ہوئی کہ فلاں پر نام لے کر لعنت بھیجنی شروع کردو، نام لے کر برا کہو، اس کا بھی ایک غلو ہے۔ تو کبھی غلو عداوت میں اور کبھی غلو محبت میں عقیدے بگڑتے ہیں جیسا کہ حدیث میں آپ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ:

''اے علی! تمہارے بارے میں بعض لوگ محبت کی وجہ سے تباہ ہوں گے اور بعض عداوت کی وجہ سے۔''

بعض لوگوں نے انتہائی محبت کی کہ حضرت علیؓ کو خدا تک کہا اور کہا کہ یہ خدا کا مظہر ہیں اور اتنی انتہائی عقیدت کی کہ ان کے سامنے جھکے جیسے خدا کے آگے، یہ غلو محبت میں ہلاک ہوئے اور رفض کا قصہ چلا۔

اور خوارج ان کی عداوت میں ہلاک ہوئے تو ان کو مسلمان تک بھی نہ مانا۔ ان کا تبرا شروع کیا، معاذ اللہ ان پر لعنت بھیجنی شروع کی تو بعض محبت میں اور بعض عداوت میں غلو سے تباہ ہوئے۔

یا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ بابرکات کہ نصاریٰ ان کی محبت میں تباہ ہوئے کہ ان کو اللہ کہا، اللہ کا بیٹا کہا خدائے مجسد کہا کہ ایک نورانی خدا ہے، ایک جسمانی خدا ہے، نورانی خدا اوپر ہے جسمانی خدا نیچے ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں ان کے لئے علم غیب اور قدرت ثابت کی اور سارے وہ اوصاف جو اللہ کے لئے ہیں ان کے لئے ثابت کئے تو غلو میں عقائد تباہ کئے۔

اور یہود عداوت میں برباد ہوئے حتی کہ ان کے بارے میں کہا کہ یہ ولد غیر ہیں، بازار والے آدمی، یوسف نجار سے پیدا ہوئے اور حضرت مریم علیہا السلام پر انہوں نے تہمت لگائی۔

بہرحال عقائد میں ان دو چیزوں سے خلل پڑتا ہے اور کبھی عقل لڑانے سے اس لئے کہ اللہ کی بھیجی ہوئی چیز ہو اس میں عقل کی گنجائش نہیں''۔ (۶۷)

منبع عقائد

مذکورہ وضاحت کے بعد عقیدہ کے تعلق سے ایک اور وضاحت:

''تو عقیدہ کبھی عقل سے بگڑتا ہے کہ ہے غیر عقلی چیز اس میں عقل لڑانی شروع کی تو یا سچے عقیدہ کا انکار کریں گے یا غلط عقیدہ گڑھ لیں گے۔ دین برباد ہو جائے گا اور کبھی عقیدہ غلو محبت سے بگڑتا ہے کہ اپنے اعتقاد والے بزرگوں سے اتنی محبت بڑھ جائے کہ آدمی فانی بن جائے جو وہ کہیں اسی کو آدمی شریعت سمجھ لے، جو وہ کہیں اسی کا عقیدہ بنا لے کیوں کہ عقیدے شریعت کے ہیں انمیں اس سے بگاڑ پیدا ہوگا اور کہا جائے گا کہ عقیدے پیغمبر سے لئے جائیں گے، اولیاء سے عقیدے نہیں لئے جائیں گے۔ علماء عقیدے

بنانے والے نہیں ہیں، مشائخ عقیدہ قائم کرنے والے نہیں ہیں۔ مشائخ خود پابند ہیں ان عقیدوں کے جو اللہ کے رسولؐ نے بتلائے ہیں، علماء خود ان عقائد کے پابند ہیں جو اللہ کے رسول نے ارشاد فرمائے۔ عقیدہ خدا کی خبر سے بنتا ہے، علماء کے کہنے سے عقیدہ نہیں بنتا، لیکن محبت میں ان کے ہر قول و فعل کو آدمی عقیدہ بنا لے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ شریعت اور دین کے اندر خلل پیدا ہوگا۔

اور کبھی غلو عداوت سے عقیدہ بگڑتا ہے کہ کسی جماعت یا کسی شخص سے عداوت پیدا ہو جائے، ضد یا عناد پیدا ہو جائے۔ اچھی سے اچھی بات بھی کہیں گے تو یہ غلط کہے گا۔ اس لئے کہ بدگمانی پہلے قائم کر لی۔ وہ صحیح عقیدہ بھی بیان کریں گے غلط کہے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ غلط عقیدے پر قائم ہو جائے گا اور صحیح عقیدے سے محروم رہے گا تو عقائد کو بگاڑنے والی کبھی عقل ہوتی ہے کہ غیبی امور میں دخل دے۔'' (۶۸)

اسلام کے پیش کردہ راستے

یہاں مقاصدِ شرع کا ایک اچھا اور اچھوتا موضوع زیر بحث ہے۔

''اسلام نے دنیا کے سامنے دو راستے پیش کئے ہیں۔ گویا اسلام دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک اقترابات، دوسرے ارتفاقات۔

اقترابات کا مطلب یہ ہے کہ وہ راستے جن سے آدمی اللہ تعالیٰ کا قرب اور نزدیکی پیدا کر سکے اور اس کی نزدیکی کی یہ صورت نہیں ہے کہ جیسے ہم آپ کے نزدیک ہو جائیں کہ گز بھر کی بجائے آدھ گز یا آدھ گز کے بجائے بالشت بھر کا فاصلہ رہ جائے۔ اسے نزدیک کہیں گے مگر یہ نزدیک ہونا جسمانی ہے اور اللہ جسم نہیں ہے کہ اس کے نزدیک ہونے کا یہ مطلب ہو کہ ہم دو چار گز سرک جائیں یا دس پانچ میل آگے پہنچ جائیں۔ اس کی نزدیکی کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے مناسبت اور مضبوط تعلق پیدا کریں۔ اس کے اخلاق سے مخلق ہوں۔ اس کے کمالات سے باکمال بنیں، خدائی اوصاف ہمارے اندر نفوذ کریں تاکہ ہمیں خلافت اور نیابت خداوندی کا مقام حاصل ہو۔ اس چیز کا نام اسلام میں اقترابات یعنی قرب خداوندی پیدا کرنے کا ذریعہ کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے عبادات، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ رکھی گئی ہیں۔

دوسری چیز ارتفاقات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باہمی میل جول، لطف و مدارات، تمدن و تعاون اور مدنیت و شہریت کے اصول و طریقے ہمارے سامنے ہوں کہ کس طرح سے ہم دنیا میں زندگی گزاریں۔ دنیا میں جیسے مساجد بنانے کی ضرورت ہوتی ہے، گھر بنانے کی بھی ضرورت ہے۔ جیسے گھر بنانے کی ضرورت

ہے، بازار بنانے کی بھی ضرورت ہے، یہ سلسلہ ارتفاقات کے شعبے ہیں کہ آپس کا میل جول اور باہمی تمدن اور تعاون یہ ہم کس طرح سے انجام دیں اس کے لئے مختلف شعبے ہیں، جن کی تفصیلات اسلام نے کی ہیں۔

بہرحال یہ دو سلسلے ہیں ایک اقترابات اور ایک ارتفاقات۔

اس لئے کہ ایمان کے دو شعبے ہیں ایک **التعلیم لامر اللہ** اور ایک **الشفقة علی خلق اللہ** اللہ تعالیٰ کے اوامر اور بھیجے ہوئے قانون کی عظمت اور اس کی مخلوق پر شفقت و مدارات اور رحم و کرم کرنا یہ ایمان کے دو شعبے ہیں۔ اس لئے علم کی بھی دو قسمیں ہو گئیں۔'' (۶۹)

عدم تشدد کے پانچ ہتھیار

اس عنوان کی وضاحت کتنے دلچسپ انداز میں فرمائی گئی ہے۔

''جس طرح تشدّد کے اسلحہ تیر و تفنگ اور توپ و بندوق ہیں، ایسے عدم تشدد کے بھی کچھ اسلحہ ہیں جو اس جنگ آزادی کے لئے موسیٰ علیہ السلام نے اللہ جل ذکرہٗ سے طلب فرمائے اور **اذھب الیٰ فرعون انهٗ طغیٰ** کی تعمیل کے لئے جواب میں عرض کیا کہ مجھے چند اسلحہ درکار ہیں جو اس جابر بادشاہ کے مقابلہ کے لئے ناگزیر بنیں، جن کو **رَبِّ اشرح لی صدری** سے شروع فرمایا۔

یہاں صرف ان معنوی اور اخلاقی اسلحہ کی تفصیل پر نظر ڈالئے جو آیت عنوان میں موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے طلب فرمائے ہیں۔ یہ عدم تشدد کے پانچ ہتھیار ہیں جو مانگے گئے ہیں۔

پہلی چیز شرح صدر ہے کیوں کہ جب تک کسی مقصد کے لئے سینہ نہ کھل جائے اور وہ مقصد دل کے اندرونی داعیہ اور جذبہ سے نہ ابھرے حوصلہ بلند نہ ہو آدمی زور قوت اور وزن دار آواز سے اسے پیش نہیں کرسکتا۔ دوسری چیز تیسیر امر ہے کیوں کہ اگر باوجود انشراح صدر کے ادھر سے اعانت و توفیق اور تہیۂ اسباب و وسائل نہ ہو تو محض جذبہ اندرون کام نہیں دے سکتا۔

تیسری چیز حل عقدۂ لسان ہے کہ اگر بلیغ انداز میں مافی الضمیر کی ادائیگی پر قدرت نہ ہو کلام میں فصاحت اور شیرینی نہ ہو تو مخاطب پر مقصد کا اثر نہیں پڑ سکتا اور اس اجتماعی مقصد میں نہ اپنوں کی جمعیت بن سکتی ہے نہ دشمن کی سوسائٹی ٹوٹ سکتی بلکہ وہ تصدیق کے بجائے اور تکذیب پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

چوتھی اعانت کار اور اشتراکِ عمل ہے کہ اگر کام میں اشتراک عمل نہ ہو اور کوئی بھروسہ کا معین و مددگار ساتھ نہ ہو تو انفراد کے ساتھ یہ اجتماعی کام نہیں چل سکتا، نیز طبع بشری تنہائی کے ساتھ جب کہ وہ بے معین و مددگار ہو قرار بھی نہیں پکڑ سکتی۔ ساتھ ہی قلبی و باطنی مقاصد میں انفراح و استقلال بھی میسر نہیں آسکتا؟ ایسا

ہی ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے بھی عمرین میں سے ایک عمر کے اسلام کی دعا فرمائی تھی جو حضرت عمر بن خطابؓ کے حق میں مقبول ہوئی کہ انہیں سے حضورؐ کی ایک وزارت کا قلمدان مکمل ہونے والا تھا۔

اور پانچویں چیز جوان سب کی روح اور معنوی قوت ہے وہ ذکر اللہ اور ذاتِ بابرکات حق کی تسبیح و تقدیس ہے کیوں کہ اگر توجہ الی اللہ نہ ہو تو نہ شرحِ صدر ہو، نہ تیسیر امر، نہ حلِّ عقد ہو، نہ اشتراک عمل کی توفیق و تاثیر۔(۷۰)

آزادی کا مفہوم

آج پوری دنیا میں آزادی، آزادی کی لہر ہے اور مختلف قسم کی آزادیوں کی بات ہورہی ہے، آیئے دیکھتے ہیں کہ جس آزادی کی بات ہورہی ہے وہ آزادی کے مفہوم میں آ بھی رہی ہے یا نہیں؟

اسلام، آزادی کا سب سے بڑا حامی اور علم بردار ہی نہیں بلکہ وہی اور صرف وہی حقیقی جامع اور مکمل آزادی کا پیغام لے کر دنیا میں آیا ہے۔ اگر دنیا اسلام سے روشناس نہ ہوتی تو آزادی کا مفہوم ذہنوں میں اوراس کا کوئی عملی نقشہ آنکھوں میں نہ سما سکتا کیوں کہ عقل کی تگ و تازگی حدتک آزادی کے معنی کوٹھی، بنگلہ، کیک، پیسٹری، توس، مکھن، کھیل، تماشا، گانا، بجانا، آلات لہو ولعب، نفسانی عیش ونشاط، ملکوں میں آمد ورفت، ہوائی یا بری و بحری سیر و سیاحت، پارٹی فیلنگ اوراس سے حریفوں کی شکست، استعمار اور جوع الارض مخصوص مفادات کو سامنے رکھ کر وضع قانون اور قانونی داؤ پیچ کے پردوں میں اقوام وطبقات کو بے بس اور بے حق ٹھہرا دینے کے نہیں ہیں، ورنہ غلامی اور غلام سازی کے لفظ کے لئے کوئی معنی باقی نہ رہیں گے بلکہ آزادی کے معنی حق وصداقت، عدل وانصاف اور ایثار و رواداری کے سچے جذبات کے تحت بے بسوں کی بے بسی رفع کرنے، ضعیفوں کو ابھارنے، بے کسوں کو سہارا دینے، ظالموں سے دبے ہوؤں کو اٹھا دینے اور حدود سے گزر کر ابھرے ہوؤں کو اتار دینے اور بالفاظِ دیگر اونچ نیچ کا فرق اٹھا کر سب کو حقوق کے لحاظ سے مساوی سطح پر لے آنے کے ہیں تا کہ ضعیف مظلوم نہ بننے پائے اور قوی کو ظلم وزیادتی کا موقع نہ ملے۔ پس آزادی کا حاصل بلا روک ٹوک پوری قوت وقدرت کے ساتھ ادائے حقوق نکل آتا ہے جس سے ظالم کے ہاتھ کٹ جائیں اور مظلوم کی بے وسعت وپائی ختم ہوجائے۔'' (۷۱)

فن سائنس کا موضوع

یہ مضمون سائنسی حقائق پر حکیم الاسلامؒ کی گہری نظر کا غماز ہے۔

اس دورِ ترقی میں جب تمدنی ایجادات اور مادیات کے نئے نئے انکشافات کا چرچا ہوتا ہے تو بطور تکملہ سائنس کا ذکر بھی ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ دورِ حاضر نے اپنی اعجازی کروٹ سے دنیا کو دیوانہ بنا دیا مثلاً: وسائل خبر رسانی کے سلسلہ میں ٹیلی فون اور ٹیلی گراف سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، ریڈیو اور لاسلکی اور دوسرے ایسے ہی برقی آلات سے عالم کو مبہوت کر دیا تو ساتھ ساتھ سائنس کا ذکر بھی ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کے سنہرے آثار ہیں یا مثلاً وسائل نقل وحرکت کے سلسلہ میں جب ریل، موٹر، ہوائی جہاز اور دوسری بادپیما سواریوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو ساتھ ہی سائنس کا نام بھی لیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کا طفیل ہے یا مثلاً صنائع وحِرَف کے سلسلہ میں لوہے، لکڑی کے خوشنما اور عجیب وغریب سامان تعمیرات کے نئے نئے ڈیزائن اور نمونے، سیمنٹ اور اس کے ڈھلاؤ کی نئی نئی ترکیبیں اور انجینئری کی نئی سے نئی اختراعات جب سامنے آتی ہیں تو سائنس کا نظر فریب چہرہ بھی سامنے کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب اسی کے خم ابرو کی کارگزاریاں ہیں، اس طرح نباتاتی لائن میں زراعتی ترقیات، پھل اور پھول کی افزائش کے جدید طریقے اور نباتات کے نئے نئے آثار وخواص کے متعلق انکشافات کا نام جب لیا جاتا ہے تو وہیں سائنس کا نام بھی پورے احترام کے ساتھ زبانوں پر آجاتا ہے۔

اسی طرح حیوانی نفوس میں مختلف تاثیرات پہنچانے کے ترقی یافتہ وسائل اور آپریشنوں کی عجیب وغریب پھرتیلی صورتیں، کیمیاوی طریق پر فن دواسازی کی حیرت ناک ترقی، تحلیل وترکیب کی محیر العقول تدبیریں، بجلی کے ذریعہ معالجات کی صورتیں جب زبانوں پر آتی ہیں کہ یہ سب اسی کے درخشندہ آثار ہیں۔ اس سے میری ناقص عقل نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ موضوع عمل موالید ثلاثہ، جمادات، نباتات اور حیوانات کے دائرے سے باہر نہیں ہے۔

پھر چوں کہ ان ہر سہ موالید کی ترکیب عناصر اربعہ آگ، ہوا، پانی مٹی سے ہوتی ہے جو تقریباً ایک مسلمہ چیز ہے اور اس لئے اس پر کسی استدلال کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے گویا سائنس کا موضوع بلحاظ حقیقت عناصر اربعہ ٹھہر جاتے ہیں جن کی خاصیت اور آثار کا علماً سمجھنا اور پھر کیمیاوی طریق پر ان کی تحلیل وترکب کے تجربات سے عملاً نئی نئی اشیاء کو پردہ ظہور پر لاتے رہنا سائنس کا مخصوص دائرۂ علم وعمل ہو جاتا ہے۔ پس سائنس کی یہ تمام رنگ برنگ تعمیریں درحقیقت انہی چار ستونوں (عناصر اربعہ) پر کھڑی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد اگر تفصیلی حقیقت کا مختصر عنوان میں خلاصہ کیا جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ سائنس کا

موضوع ''مادہ اور اس کے عوارض ذاتیہ'' سے بحث کرنا ہے اور بس جو بھی مادیات میں زیادہ سے زیادہ منہمک رہ کر ان کے خواص و آثار سے کام لینے والا ثابت ہوگا وہی سب سے بڑا سائنس دان اور بہترین ماہر سائنس کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔ (۷۲)

دور جدید میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا واحد طریق عمل

یہ دورِ جدید کا انتہائی حساس اور سلگتا ہوا موضوع ہے، اس کو ذرا غور سے پڑھئے۔

''آج کے اس سائنسی اور سریع رفتار صنعتی و علمی ترقیات کے دور نے زندگی کے ہر شعبہ میں نت نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں، جن کو فقہی اصطلاح میں ''نوازل'' کہا جاتا ہے۔ حکیم الاسلامؒ کے عہد میں یہ مسائل اتنے زیادہ نہیں تھے، مگر ان کی خداداد بصیرت، وسعت نظر اور دوراندیشی قابل دید ہے کہ انہوں نے ایسے احوال کا ادراک کرتے ہوئے ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' کا نظریہ بڑے کھلے ذہن سے پیش کیا ہے اور اس سلسلہ میں علماء دین کے ساتھ علماء دنیا کے اشتراک سے ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' کے عمل کا مشورہ دیا ہے اور ساتھ میں کچھ تحفظات اور شرائط کا بھی ذکر کیا ہے۔''

اس دور میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ اسلامی اصول، اسلامی مزاج اور نبوت کا منہاج بجنسہٖ قائم رکھ کر جس میں دیانت و سیاست اور عبادت و مدنیت بیک وقت جمع ہے۔ وقت کے مسائل کو نئی تشکیل وترتیب سے نمایاں کر کے نئے حوادث میں قوم کی مشکلات کا حل پیش کیا جائے تو یہ وقت کے تقاضوں کی تکمیل ہوگی جب کہ اس میں فقیہ المزاج شخصیات، اسلامی اصول کی روشنی اور جزئیات عملیہ کی رعایت، اسلامی مزاج کی برقراری، سلف صالحین کا اسوہ، مرادات خداوندی کے ساتھ تقید، رضاء حق کی پاس داری، اجتماعی اصلاح و فلاح، اخروی نجات کا فکر وغیرہ کی حدود قائم رکھی جائیں گی تو بلاشبہ ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' دینی ہی رنگ کے ساتھ منظر عام پر آجائے گی، مگر اسی کے ساتھ ان منتخب شخصیات میں جہاں اس دینی فکر اور تفقہ مزاج اور وقت کو بھی پہچانتے ہوں۔ عصری حالات اور وقت کی ضروریات بھی ان کے سامنے ہوں، علوم عصریہ میں انہیں مہارت و حذاقت میسر ہو، دنیا کی عام رفتار اور آج کے ذہن کو بھی وہ سمجھے ہوئے ہوں اور اس میں ذی فہم اور ذی رائے بھی ہوں کیوں کہ حالات ہی اصل محرک فتاویٰ ہیں۔ اگر یہ منتخب شخصیات شرعیات کی خوگر ہوں لیکن عصریات سے بے خبر ہوں یا برعکس معاملہ ہو تو ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔

اس سلسلہ میں کٹھن مرحلہ ایسی جامع شخصیتوں کی فراہمی کا ہے جو شرعیات اور عصریات میں یکساں حذاقت ومہارت کی حامل ہوں، عموماً اور اکثر وبیشتر ماہرین شرعیات، عصریات سے کچھ نابلد اور موجودہ دنیا کی ذہنی رفتار اور اس کے گونا گوں نظریات سے بے خبر ہیں اور ماہرین، عصریات اکثر وبیشتر شرعیات سے ناآشنا ہیں۔ اس لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا بار اگر تنہا ایک طبقہ پر ڈال دیا جائے تو علماء کی حد تک بلاشبہ مسائل کی تشکیل قابل وثوق ہوگی لیکن ممکن ہے جدید طبقے کے اعتراضات کا ہدف بن جائے اور دوسری طرف ماہرین عصریات جبکہ عامۃً دینی مقاصد اور ''اسلامی تشکیل جدید'' کا بار محض انہی کے کندھوں پر ڈال دیا جائے تو حوادث کے حد تک وہ ماہرین شریعت کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی، بہر دوصورت تشکیل جدید کا خاکہ نا تمام بلکہ ایک حد تک نقصان دہ ثابت ہوگا۔

ان حالات میں درمیانی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ اس تشکیل کے لئے دونوں طبقوں کے مفکرین کی مشترک مگر مختصر اور جامع کمیٹی بنائی جائے جس میں یہ دونوں طبقے اسلام کے تمام تمدنی، معاشرتی اور سیاسی مسائل میں اپنے اپنے علوم کے دائرے میں غور وفکر اور باہمی بحث وتمحیص سے کسی فکر واحد پر پہنچنے کی سعی فرمائیں اور جامع فکروں کو کتاب وسنت اور فقہ کی روشنی میں مسائل کی تنقیح میں استعمال کریں تو وہ فکر یقیناً جامعیت لئے ہوئے ہوگا۔ جس میں دینی ذوق اور شرعی دستور بھی قائم رہے گا اور عصری حالات سے باہر بھی نہ ہوگا، نیز ایک طبقہ کا ہدف طعن وملامت نہیں بن سکے گا اور مسائل کے بارے میں کوئی خلجان سدِّ راہ نہ ہوگا۔

البتہ مفکرین کو یہ ضرور پیش نظر رکھنا ہوگا کہ اسلام کوئی رسمی اور دنیوی قانون نہیں بلکہ دین ہے جس میں دنیا کے ساتھ آخرت بھی لگی ہوئی ہے اور ہر عمل میں خواہ وہ فکری ہو یا عملی، جہاں انسان کی دنیوی زندگی میں شائستگی کی رعایت رکھی گئی ہے اور انہیں تنگی اور ضیق وحرج سے بچا کر ہمہ گیر سہولتیں دی گئی ہیں۔ وہیں رضاء خداوندی اور آخرت کی جواب دہی بھی ان پر عائد کی گئی ہے۔ اس لئے اسے محض دنیوی قوانین اور صرف معاشی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر حوادث کا آلۂ کار بھی نہیں بننے دیا گیا ہے کیوں کہ احوال ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے، حال کے معنی ہی ''ما حال فقد زال'' کے ہیں (یعنی جو حال آیا وہ زائل بھی ہوگا) حال تو بدلنے ہی کے بنایا گیا ہے لیکن اصول فطرت بدلنے کے لئے نہیں لائے گئے ہیں، وہ اپنی جگہ اٹل ہی رہیں گے، البتہ ان شرعی اصولوں میں ایسی وسعتیں ضرور رکھی گئی ہیں کہ وہ ہر بدلتی ہوئی حالت میں وقت کے مناسب رہنمائی کرسکیں، اس لئے مفکر کا کام صرف اتنا ہی ہوگا کہ بدلے ہوئے حالات اور نئے حوادث کو سامنے رکھ کر ان جزئیات مسائل کو سامنے رکھ کر ان جزئیات مسائل کو سامنے لے آئے جو اس حادثہ کے بارے

میں منہاج نبوت نے اصولاً یا جزءً اوضع کئے ہیں اوران پر منطبق کئے ہیں، پس مفکر، دانشور یا مبصر، مفتی کا کام حادثہ اور مسئلہ تبدیل کرنا نہیں بلکہ دونوں میں تطبیق دے دینا ہے۔ نہ حالات سے صرف نظر کرنا ہے نہ مسائل سے قطع نظر کر لینا ہے، اس لئے شریعت نے تمدنی اور معاشرتی احوال کی حد تک زیادہ تر قواعد کلیہ ہی سامنے رکھے ہیں۔ نئی جزئی صورتوں کی تشخیص نہیں کی ہے کہ وہ ہر دور میں نئے نئے رنگ میں نمایاں ہوتی رہتی ہے۔ (۷۳)

عبادتِ مالی سے مقصود امیر و غریب میں توازن قائم کرنا ہے

مالی عبادت جیسے زکوٰۃ، صدقہ وغیرہ کے شرعی مصالح کیا ہیں؟ اس پر حکیم الاسلامؒ کی یہ وضاحت ملاحظہ کیجئے:

''مقصد یہ ہے کہ امیر اور غریب کے اندر قرب پیدا ہو۔ یہ نہ ہو کہ امیر آسمان کے اوپر ہو اور غریب زمین کے اوپر ہو، کچھ وہ نیچے اترے، کچھ غریب کو اوپر چڑھا دیا تاکہ توازن پیدا ہو جائے۔

یہ تو شریعت نے پسند نہیں کیا کہ مساوات کرو کہ بالکل ایک ہی جیسی روٹی، لباس اور ایک ہی سب کی آمدنی ہو اور جبر کر کے امیر سے ساری آمدنی لے لی جائے تاکہ غریبوں میں بانٹ دی جائے اس لئے کہ اس میں امیر اور غریب کو مضرت پہنچے گی۔

اول تو یہ فطرت کے خلاف ہے اس لئے کہ ایک آدمی میں اتنی عقل اور ہوشیاری ہے کہ وہ سو روپے لے جاتا ہے تو ہزار روپئے کما کے لاتا ہے اور ایک اتنا احمق ہے کہ ہزار روپئے لے جاتا ہے وہ بھی کھو کے آتا ہے۔ یہ دونوں کیسے برابر ہو جائیں گے؟ جو محنت کرے گا، اس کا حق زیادہ ہوگا، جو نہیں کرے گا اس کا حق کم ہوگا۔ شریعت یہ نہیں کہتی کہ دونوں برابر ہو گئے بلکہ صراحۃً فرمایا:

نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَيۡنَهُمۡ مَعِيۡشَتَهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَرَفَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِيَتَّخِذَ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا سُخۡرِيًّا.

حق تعالیٰ فرماتے ہیں، ہم نے اپنے بندوں پر معاش تقسیم کر دی ہے اور ایک کو دوسرے سے بڑھا دیا ہے۔ کوئی اونچا، کوئی نیچا، کوئی امیر، کوئی غریب تاکہ ایک دوسرے کے کام آنے والا ہو اور تمدن پیدا ہو۔ اگر سارے ایک جیسے ہوتے تو آپ صدقہ کیسے دیتے؟ جسے دیتے وہ کہتا، میرے گھر میں بہت سا پڑا ہوا ہے، مجھے ضرورت نہیں تو تعاون اور ایک دوسرے کی خدمت گذاری ختم ہو جاتی اور اگر سارے کے سارے ہی بھک منگے ہوتے تو نہ آپ اسے دیتے، نہ وہ آپ کو دیتا۔ وہ آپ سے بے تعلق، آپ اس سے بے تعلق،

بالکل سارے مفلس ہوتے جب بھی تعاون اور تمدن نہیں پیدا ہوتا اور سارے امیر بن جائیں، جب بھی پیدا نہیں ہوتا، تمدن جب ہی پیدا ہوگا جب کچھ امیر ہوں، کچھ غریب، امیر کی حاجت غریب اور غریب کی حاجت امیر کے خلاف ہے۔

اس لئے اگر مال کا فرق مٹانا ہے تو پھر عقلوں کا فرق مٹانا چاہیئے۔ ایک بڑا ہوشیار ہے، اسے تو بیوقوف بنانے کی کوشش کریں اور جو بے وقوف ہے اسے عقل مند بنانے کی کوشش کریں۔ یہ آپ کے قبضے میں نہیں۔ فہموں میں اختلاف ہے، رنگوں میں اختلاف ہے۔کوئی کالا، کوئی گورا، زبانوں میں اختلاف ہے، کسی کی عربی، کسی کی انگریزی تو زبانوں، صورتوں، سیرتوں کا، اخلاق کا اور عقل کا اختلاف ہے، تو جب مختلف عقل سے کمائیں گے، اس میں بھی اختلاف ہوگا، کوئی زیادہ کمائے گا، کوئی کم کمائے گا، اب اگر آپ جبر کرکے ایک امیر سے کہیں کہ ساری کمائی دے۔ اگر تیرے پاس پانچ ہیں تو یہ سب کو بانٹ دے تاکہ سب برابر ہوجائیں۔ اس کا نقصان یہ پہنچے گا کہ امیر کے دل میں مزدور سے بُعد پیدا ہوگا کہ محنت تو میری اور جبراً سب کچھ اس نے لے لیا۔ میں اور یہ برابر ہوگئے، فرق کیا رہا۔ میں رات دن محنت کروں اور اسے بے محنت دیدوں۔ محنت کو اس کا جی نہ چاہے گا، فطرت کے خلاف ہے اور غریب یہ سمجھے گا جب بے محنت مجھے بھی حصہ مل رہا ہے تو مجھے محنت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ معطل ہوجائے گا۔ غرض اگر آپ نے جبری طور پر معاش کے اندر مساوات اور برابری قائم کی تو نہ امیر باقی رہے گا، نہ غریب نہ دونوں ایک دوسرے کے کام آسکیں گے۔ اس واسطے مساوات فطرت کے خلاف ہے۔ ہاں توازن ہے، یعنی ایک دوسرے سے بالکل بعید نہ ہوں کہ ایک آسمان پر اور دوسرا زمین پر۔ حقوق رکھ دیئے کہ وہ نیچے اترے، کچھ یہ اوپر ہوجائے تاکہ محبتیں پیدا ہوں۔" (۷۴)

عروج وزوال کا معیار

عموماً عروج وزوال کے اسباب پر بحث ہوتی ہے، یہاں حکیم الاسلامؒ عروج وزوال کے گوشہ پر گفتگو فرمارہے ہیں، یعنی عروج وزوال کا معیار کیا ہے؟

"ہر قوم کی زندگی کا ایک معیار اور نصب العین ہوتا ہے جس سے اس کی ترقی وتنزل اور فناء وبقاء پہچانی جاتی ہے، مسلمانوں کے حال اور مستقبل پر غور کرنے کے لئے بھی یہی راستہ زیادہ سہل اور مختصر ہے کہ اس کے بنیادی نصب العین کو سامنے رکھ لیا جائے، گردوپیش کے حالات ہنگامی حوادث یا شخصی آراء معیار کا درجہ

نہیں رکھتیں کہ ان سے کسی قوم کے عروج وزوال کو پہچانا جائے، پس مسلم قوم کا نصب العین اس کی سیاسی تعلیمات اور ابتدائی قرون کے تعامل ہی سے سامنے آسکتا ہے جو اس کے عروج کا دور ہے، جس حد تک امت اس کے مطابق ہوا سے قوم کی بقاء اور ترقی باور کیا جائے گا اور اس میں اس کی ترقی مضمر ہوگی اور جس حد تک وہ اس سے ہٹی ہوئی ہو اسی کو اس کے لئے سبب تنزل قرار دے کر اس سے ہٹانے اور راستہ بدلنے کی سعی کی جائے گی، اس میں اس کا تنزل مضمر ہوگا۔

جناب کا یہ احساس بالکل صحیح ہے کہ مسلم قوم دنیا کی محتاج رہ کر ان کے سامنے سائل اور بھکاری بن کر زندہ نہیں رہ سکتی، چہ جائے کہ بڑھے اور پھلے پھولے، لیکن استغناء کے معنی یکسوئی، انقطاعیت، گوشہ گیری اور علیحدگی پسندی کے نہیں، بالخصوص اس بین الاقوامی دور میں یہ بھی موت کے مترادف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان دوسری اقوام سے مستغنی بھی ہوں، سائل اور بھکاری بھی نہ ہوں اور ساتھ ہی اقوام کے جمگھٹوں میں کندھے سے کندھا ملا کر ان میں گھسے ہوئے بھی ہوں تو اس گھسنے کے کیا معنی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ مسلمان دنیا کو کچھ دینے کے لئے آیا ہے لینے یا مانگنے کے لئے نہیں آیا۔

اور ظاہر ہے کہ وہ وہی کچھ دے سکتا ہے جو دوسروں کے پاس نہ ہو، اس کے پاس ہو، کھلی بات ہے کہ وہ دنیا کی دولت وثروت یا جاہ ومال کے ذخیرے نہیں ہو سکتے کہ یہ سب کچھ اوروں کے پاس بھی ہیں بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی ان کے ہاتھ میں ہیں۔

اس لئے دینے کی چیز ایک ہی رہ جاتی ہے اور وہ مستند دین ہے کہ اس فطرت الٰہی پر خود چل کر اقوام کو چلائیں اور ان کے معلم اور امام بنیں، اس سے امت مسلمہ کے نصب العین اور وجہ تشکیل کا خلاصہ مختصر لفظوں میں صلاح نفس کے ساتھ اصلاح عالم کو دعوت عام، اعلاء کلمۃ اللہ اور احیاء سنن انبیاء کے سوا دوسرا نہیں نکلتا۔ امت اسی راستہ سے آگے بڑھی اور اسی لائن سے دنیا کے خطے اس کے تابع فرمان ہوئے۔ دیانت وسیاست ہو یا تمدن ومعاشرت، بین الاقوامی تعلقات ہوں یا جنگ وصلح، امن ہو یا بدامنی، سرمایہ داری ہو یا ناداری وہ اسے اختیار کئے ہوئے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں کئے ہوئے ہیں تو اس صورت میں نہ اس کا استغناء باقی رہ سکتا ہے، نہ احسان وایثار، جو ان کے وجود کی اصل بنیاد تھا اور اس طرح ان کی قومیت ہی باقی نہیں رہ سکتی۔'' (۷۵)

صرف نماز اپنی ذات میں عبادت ہے

ایک عجیب نکتہ آفرینی، سبحان اللہ! ماشاء اللہ!

یوں کہنا چاہئے کہ حقیقی معنوں میں اگر عبادت ہے تو صرف نماز ہے، دوسری عبادات اور وجوہ سے عبادت بنی ہیں، اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ نماز اپنی ذات سے عبادت ہے۔

روزہ : اس کا معنی یہ ہے کہ کھانے پینے سے آدمی مستغنی ہو جائے، تو کھانے سے، پینے سے، بیوی سے مستغنی ہونا، یہ اللہ کی صفت ہے۔ اس میں ذلت تھوڑی ہے۔ یہ مشابہت ہے حق تعالیٰ کے ساتھ کہ کھانے سے بھی بری، پینے سے بھی بری، بیوی سے بھی بری، تو یہ اظہارِ ذلت تھوڑا ہی ہے، یہ تو اظہارِ عزت ہے، یہ عبادتِ تعمیل حکم کی وجہ سے ہے۔ حکم دیا تعمیل کر تو بن گئی عبادت۔

زکوٰۃ : اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے۔ اس کے معنی عطا کرنے کے ہیں کہ فقیروں کو دو، عطا کرنا تو اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ یہ تشبیہ ہے حق تعالیٰ کے ساتھ، اس میں ذلت تھوڑا ہی ہے، یہ تو عین عزت ہے، زکوٰۃ عبادت بنی اس لئے کہ حکم ہے زکوٰۃ دو، تعمیل ارشاد نے اس میں پیدا کر دیئے، معنی عبادت کے۔ اس طرح سچ بولنے کو عبادت کہتے ہیں اور وہ عبادت ہے لیکن سچ بولنا اپنی ذات سے عبادت نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے: وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلاً. وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا.

”اللہ سے زیادہ کس کا قول سچا۔ اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔“

تو سچ کہنا اور سچ بولنا حق تعالیٰ کی شان ہے، بندہ اگر سچ بولے گا تو مشابہت پیدا کر لے گا، کمالاتِ خداوندی کے ساتھ۔ اس میں ذلت تھوڑا ہی ہے یہ تو عین عزت ہے، پھر بھی وہ عبادت ہے کہ حکم کی تعمیل کیجاتی ہے۔ اللہ کا کہنا ہے، سچ بولو۔ تعمیل کے لئے گردن جھکا دی کہ سچ بولوں گا، سچ کو عبادت بنا دیا تعمیل حکم نے۔ اپنی ذات سے عبادت نہیں تھی، ورنہ اللہ کی صفت نہ ہوتی۔

لیکن نماز کی ہر ہیئت اظہارِ ذلت کے لئے ہے، ہر ذکر بھی اپنی ذلت کے اظہار پر مشتمل ہے، اس واسطے نماز اپنی ذات سے عبادت ہے محض تعمیل حکم سے عبادت نہیں، اس کے اندر خاصیت ہی اظہارِ تذلل کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساری کائنات پر فرض کی گئی ہے۔ زکوٰۃ، حج اور سچ بولنا فرض نہیں کیا گیا، فرمایا گیا: كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَهٗ وَ تَسْبِيْحَه ہر چیز نے اپنی نماز کو پہچان لیا۔ (۷۶)

تبلیغ کے لئے جماعتوں کا طریقہ

تبلیغی کام میں اجتماعیت کی تاثیر کا سراغ خود قرآن کریم سے ملتا ہے۔ اِذْ اَرْسَلْنَا اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْا اِنَّا اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ. بانی تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے

مبلغین کو تبلیغی کام میں بھیجنے کے بجائے ایک جماعت کو روانہ کرنے کی حکمت عملی تیار کی۔ حکیم الاسلامؒ نے اسی حکمت عملی کو قرآن کریم کی مذکورہ آیت سے منصوص فرمایا ہے۔

”ہندوستان میں اس وقت دعوت و تبلیغ کے کام کو چند سال قبل حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے شروع کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے قلب مبارک پر اس کا القاء کیا، انہوں نے تبلیغ کے لئے جماعتوں کا طریقہ اختیار کیا۔ کیوں کہ دستور ہے کہ جب کچھ لوگ مل کر ایک بات کہتے ہیں یا کوئی کام کرتے ہیں تو اس کا اثر خاص طور پر پڑتا ہے، ایک ہی بات کو جب مختلف وقتوں میں کہتے ہیں تو اس کا اثر کبھی نہ کبھی تو ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ نے سورۂ یٰسٓ میں ارشاد فرمایا: اِذْ اَرْسَلْنَا اِلَیْهِمُ اثْنَیْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْا اِنَّا اِلَیْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ.

جب ہم نے ان کے پاس دو رسول بھیجے تو انہوں نے ان کی تکذیب کی تو ہم نے تیسرا رسول بھیج کر ان کو سرفراز کیا، انہوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔

مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے اسی وجہ سے دعوت کے کام میں جماعتی طریقہ اپنایا کیوں کہ انہوں نے محسوس کیا کہ آج کا دور اجتماعی دور ہے۔ کھیل، کود، صنعت و تجارت و زراعت غرض ہر چیز میں اجتماعیت پائی جاتی ہے، ہر مسئلہ میں وفود جاتے ہیں، میٹنگیں ہوتی ہیں، ہر جگہ جماعتی رنگ دکھلائی دیتا ہے، اس جماعتی ماحول میں انفرادی بات کا زیادہ اثر نہیں ہوتا، یہی کچھ لوگ کسی آدمی کے پاس جاتے ہیں اور اس حال میں کہ کاندھوں پر بستر لدے ہوئے پیدل چل کر آرہے ہیں، محنت و مشقت کے آثار چہرے سے ظاہر ہیں، لامحالہ وہ آدمی سوچتا ہے کہ یہ لوگ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟ انہیں مجھ سے کوئی غرض و مطلب نہیں، پھر کیا چیز ہے جو انہیں اس تکلیف کو برداشت کرنے پر آمادہ کر رہی ہے، ضرور جو یہ لوگ کہتے ہیں وہ صحیح ہوگا، یہ چیز اسے بہت متاثر کرتی ہے۔

تبلیغی جماعت اور انقلاب عظیم

تبلیغی جماعت میں نکلنے کے فوائد، مقاصد اور اخلاص کے ساتھ بانی تبلیغ علیہ الرحمہ کی خدمت کو کتنے عمدہ پیرائے میں حکیم الاسلامؒ نے بیان فرمایا کہ ”تبلیغ کو اللہ تعالیٰ نے مولانا الیاس صاحبؒ کے دل پر القاء کیا، اس جملہ کی بلاغت پر داد دیجئے“۔

میں نے شاید کہیں لکھا ہے کہ تبلیغ کو اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے دل پر بطور فن کے القاء کیا، اس میں تعلیم و تربیت، سیر و سیاحت، روح کی دلچسپی، بدن کی ورزش ہر ایک چیز موجود ہے، آج کے دور میں یہ

کام بڑا ہی مفید اور لازمی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کام تیزی سے پھیل رہا ہے اور اس تبلیغ سے ایک عظیم انقلاب آرہا ہے، ہندوستان کے ہر خطے میں اور ہندوستان سے باہر جہاں بھی میں گیا وہاں میں نے تبلیغی جماعتیں اور تبلیغی مرکز دیکھے۔ رسمی انداز میں اس عالمگیر طریقہ پر کام نہیں ہوسکتا اور اس کے ساتھ نہ فتنہ وفساد ہے اور نہ واویلا اور شور، آپ نے کہیں نہیں سنا ہوگا کہ ان جماعتی لوگوں نے کہیں غدر کیا، کہیں فساد برپا کیا، یہ ایک خاموش تبلیغ ہے، جو عالمگیر طریقہ سے ساری دنیا میں پھیلتی جارہی ہے اور اس کی مقبولیت روز بروز بڑھتی چلی آرہی ہے۔

تبلیغ کے کام میں آدمی کو اس کے گھر سے نکالا جاتا ہے، وہ گھر کے ماحول سے نکل کر خدا کے گھر میں پہنچتا ہے، وہاں اسے دوسرا ماحول ملتا ہے، گھر کے ماحول میں اور اس ماحول میں بڑا فرق ہوتا ہے، یہاں اسے داعی اور عامل دونوں بننا پڑتا ہے، وہ داعی بن کر آتا ہے اور عامل بن کر جاتا ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ہم نے علم حاصل کیا تھا، غیر اللہ کے لئے مگر جب علم آگیا تو اس نے کہا کہ میں تو خدا کے لئے ہوں۔ اس تبلیغی کام کا ایک نظام ہے اور اوقات نکالنے کا ایک اصول اور روحانی قوتوں کا جلا ہو، شیطانی قوتیں دبیں اور مغلوب ہوجائیں۔

آج کے دور میں بہت سی تحریکیں چل رہی ہیں لیکن یہ تحریک اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں نہ عہدے، نہ منصب ہیں، نہ کرسیاں اور نہ سیٹیں ہیں، بلکہ اپنے ہی مال کا خرچ ہے، اپنی جیب پر بار ہے، یہ تحریک موجودہ دور میں دین کے تحفظ کے لئے ایک ایک بڑی پناہ گاہ ہے، کسی ریاست کی بنیاد ہوتی ہے ''توہمات'' اور ''تنازع للبقاء'' پر لیکن یہاں اس کے برعکس ہے، یہاں تنازع للبقاء کی جگہ فنا للبقاء ہے اور توہمات کی جگہ محبت و الفت ہے، ریاست کے لئے پارٹیاں بنائی جاتی ہیں اور یہاں خود بخود پارٹیاں بن جاتی ہیں۔ (۷۷)

............❖............

تصنیف و تالیف

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

''تصنیف و تالیف'' ایک مشکل فن ہے، بالخصوص دین اور دینیات کے موضوع پر تصنیف و تالیف کا کام انتہائی محنت اور عرق ریزی کا دوسرا نام ہے، جس میں الفاظ کے ساتھ معلومات کا رشتہ اور معلومات کے عقب میں ایک جاندار دماغ، استنباطی ذہن، عالمانہ نظر، ایک خاص تربیت، مخصوص طرز بیاں، معیاری اسلوب، واضح عبارات، سنجیدہ تعبیرات اور نفیس استدلالات کا ملکہ، اس رزم گاہ کا وہ اسلحہ ہے جس کے بغیر کسی فتح مندی کا خواب نہیں دیکھا جاسکتا۔

زمانہ قدیم میں اپنی معلومات کو ذہنوں میں محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی قوتِ حافظہ بھی عطا کیا تھا، معیار زندگی سادہ، تکلفات کم، ذہنی قوتیں، مرغن غذاؤں، مضر دواؤں اور نشہ آور چیزوں کے منفی اثرات سے محفوظ تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ انساب عرب کے حافظ اور گھوڑوں تک کی کئی کئی نسلوں کے شجرے انہیں ازبر، درباری شعراء میں بعض اس بلاء کے حافظہ رکھتے کہ حریف کا پورا پورا دیوان یاد کرلیتے اور اسے بھرے دربار میں سنا کر صاحب دیوان کو نہ صرف زچ کردیتے بلکہ انعام بھی پاتے، جس سے عام تاثر یہی قائم ہوتا کہ صاحب دیوان سرقہ کا مرتکب ہے۔ اصل شاعر یہی ہے۔

ابن ہشام کلبی کے بارے میں ہے کہ پورا قرآن کریم تین دن میں حفظ کرلیا تھا۔ ابوالحسن ابناری کو قرآن کریم کی سینکڑوں تفاسیر محفوظ تھیں اور عربی شعراء کے دواوین نوک برزبان، ائمہ حدیث میں امام بخاری کا حافظہ مدہش اور امام ترمذی کی یادداشت غضب کی۔ ماضی قریب میں حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے بےنظیر حافظہ کی روایتوں کی تصدیق کردی۔ مرور ایام کے ساتھ ساتھ حافظے کمزور اور یادداشتیں متاثر ہوتی چلی گئیں۔ خدا کو منظور تھا کہ دین متین کی حفاظت ہر دور میں دستیاب وسائل سے ہو۔

سرمایۂ احادیث کی حفاظت کا ذریعہ، جمع وتدوین اور کتابت بن گیا۔ اس کے بعد دیگر علوم وفنون پر کتابوں کی ایک نئی دنیا سامنے آتی گئی۔ اسلاف کی اس روایت کو اخلاف نے آگے بڑھایا اور امت کی صلاح وفلاح کے لئے دین کے ہر موضوع پر ایک قابل قدر کتابی ذخیرہ وجود میں آگیا۔ امام محمد بن حسن شیبانیؒ کے بعد امام غزالیؒ اپنے عہد میں کثیر التصانیف گزرے ہیں، ان کے بعد بالاتفاق حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور آخر میں ان کے خلیفۂ ارشد حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ دین کے ہر موضوع پر گراں قدر تصانیف کے حوالہ سے برصغیر کی علمی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔

حکیم الاسلامؒ کو اللہ تعالیٰ نے تصنیف وتالیف اور تحریر وقلم کی ایسی بے نظیر صلاحیت اور نفیس ذوق سے نوازا تھا کہ حلقۂ دیوبند میں اس شان کا مصنف حکیم الامتؒ کے بعد نظر نہیں آتا، جس کے قلم سے انتہائی معرکۃ الآرا اور بصیرت افروز کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ وجود میں آیا ہو۔ حکیم الاسلامؒ نے اپنے قلم سے علم وحکمت کے اتنے دلکش، سحرانگیز اور خوبصورت پیکر تراشے ہیں کہ پڑھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ اسلوب تحریر کی جاذبیت اور کشش ایسی کہ ایک پامال موضوع پر بھی ان کی جس کتاب کو شروع کیجئے تمت بالخیر سے پہلے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ کتاب کے مضامین آدمی کو پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں، نئے نئے عنوانات، نئے نئے انکشافات، نکتہ آفرینیاں، خوبصورت مثالیں، ایمان افروز قصے، ظرافتیں، علم وادب کے جواہر پارے، چشم کشا حقائق، بصیرتیں، نصیحتیں اور اخلاقی تعلیمات کے حسین مناظر جگہ جگہ، مضامین کی ندرت، تسلسل اور جامعیت سے آپ کی چھوٹی سے چھوٹی کتاب یہاں تک کہ کوئی مختصر سے مختصر مکتوب بھی خالی نہیں، حکمت وبصیرت، تدریس، تقریر، تحریر، تصنیف، گفتگو، مجلس ہر جگہ ہم عناں کی روح میں حلول کرتے ہوئے۔

حکیم الاسلامؒ کے طرز تحریر کو ''سہلِ ممتنع'' کی صنعت کا اعجاز کہا جاسکتا ہے۔ حکیم الاسلامؒ کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھئے، اس کی سطر سطر وسعتِ مطالعہ اور دقت نظر کا اعلان کرتی ہے۔ کوئی سا بھی مضمون پڑھئے لفظ لفظ سے علم وحکمت کی تیز روشنی پھوٹتی ہے

صفت برق چمکتا ہے مرا فکر بلند کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمت میں راہی

حکیم الاسلامؒ نے جس موضوع کو اختیار کیا اس میں جان ڈال دی، جس عنوان کو ان کے قلم نے چھولیا اس کو سدابہار بنا دیا۔ ان کے صریر خامہ میں فکر کے اتنے گوشے کہ ؎

دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

’’نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی معتدل اسوۂ منصوصہ کو حضرت حکیم الاسلامؒ نے زندگی بھر اپنی پرتاثیر تحریر وتقریر کے ذریعہ عالمی پیمانے پر مسائل دینیہ کا مرکز موضوع قرار دیا، جس کے نتیجے میں دنیا کے بے شمار ممالک کے قلیل العلم یا محروم العلم مسلمانوں کو حق تعالیٰ نے کتاب وسنت سے عقیدۃً اور عملاً وابستہ فرمانے کا عالمی اور تاریخی وسیلہ بنا کر حضرت حکیم الاسلامؒ کو دین کی اس عظیم واہم تر خدمت سے مشرف فرمایا کہ جوامت میں کم ہی لوگوں کو نصیب ہوئی۔

حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی لکھتے ہیں:

’’جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس میں حقائق وواقعات کے ساتھ عقلی ونقلی دلائل کا انبار لگا دیا کہ قاری اس میں کھو کر دریائے تحیر میں غرق ہو جاتا اور زبان وبیان کی شستگی، سلاست اور روانی ایسی کہ لگتا الفاظ و معانی کا دریا بہہ رہا ہے، آپ کے شب وروز میں سب سے زیادہ وقت تحریری وتصنیفی کام کرنے میں صرف ہوتا۔ لکھنے میں مضامین کی اس قدر آمد ہوتی کہ گھنٹوں قلم کاغذ پر سے نہ اٹھتا، ایسا لگتا کہ آپ کے سامنے کوئی کھلی کتاب رکھی ہے اور اسے مسلسل نقل کر رہے ہیں، یہی وجہ تھی کہ لکھنے کے دوران آپ گردوپیش سے بالکل غافل ہو جاتے، کوئی آکر سامنے بیٹھ جائے اور متوجہ نہ کرے تو آپ کو اس کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوتا۔ تحریری مشغولیت سفر کے دوران بھی ایسی ہی رہتی حتی کہ ٹرین اور ہوائی جہاز میں بھی تصنیفی کام برابر جاری رہتا۔ عام طور پر ٹرین میں اس کی مسلسل حرکت کی وجہ سے لکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور حروف بھی صحیح نہیں بنتے بلکہ تحریر بگڑ جاتی ہے، مگر حضرتؒ ٹرین میں بھی اسی روانی اور تحریر کی شستگی کے ساتھ لکھتے جیسے اپنے ڈیسک کے سامنے لکھتے۔ احقر کو بارہا ملک اور بیرونِ ملک کے دوروں میں حضرت والد مکرم کا ہم سفر ہونے کا اتفاق ہوا، میں نے کبھی آپ کو سفر میں خالی بیٹھے نہ پایا، ایک بریف کیس جو چند کتابوں اور کاغذات پر مشتمل تھا ہمیشہ سفر میں آپ کے ساتھ رہتا تھا، کار کے سفر میں اس میں سے کتاب نکال کر دورانِ سفر مطالعہ میں منہمک رہتے اور ٹرین یا ہوائی جہاز کے سفر میں اس میں سے کاغذات نکال لیتے اور تحریری کام میں مصروف ہو جاتے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو وقت کی قیمت کا کیسا زبردست احساس تھا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ علمی ودینی تصانیف کا ایک زبردست ذخیرہ چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوئے جن میں سو کے قریب تصانیف تو آپ کی زندگی میں ہی چھپ کر لاکھوں انسانوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنیں اور مقبولِ خاص و عام ہوئیں، جبکہ بہت ساری تصانیف مسودوں کی شکل میں غیر مطبوعہ ہیں جو رفتہ رفتہ شائع ہو رہی ہیں۔ *

* حجۃ الاسلام اکیڈمی ان تصانیف کو معیاری اور تحقیقی انداز میں شائع کرنے کا عزم کئے ہوئے ہے۔ (محمد شکیب قاسمی)

آپ کی پوری زندگی سفروں میں گذری، اگر کبھی دو چار دن گھر پر رہنے کا موقع ملتا تو اس میں بھی سارا وقت مطالعہ اور تحریر وتصنیف میں گذر جاتا، آپ کا کمرہ علیحدہ تھا، جس میں فرش پر تھوڑے حصے میں دری بچھی ہوئی تھی، سامنے ڈیسک اور گرد وپیش میں کتابوں کا ایک انبار ہوتا، حسب ضرورت کتابیں بدلتی رہتیں، دن بھر تو یہ لکھنے کا سلسلہ رہتا، البتہ دوپہر کو آرام کے لئے اور نماز ظہر سے واپس آکر پھر وہی مشغولیت شروع ہوجاتی، جس میں ایسے منہمک ہوتے کہ دوپہر اور رات کو بار بار آکر عرض کیا جاتا کہ ابا جی کھانا تیار ہے تو جواب ملتا کہ سطر پوری کر کے آتا ہوں مگر اس کو پوری کرتے کرتے بھول جاتے کہ کھانے کے لئے اٹھنا ہے۔ اکثر بار بار یاددہانی کرنے پر زچ ہوکر فرمادیتے کہ ابھی بھوک نہیں ہے، گویا کھانا پینا غیر ضروری تھا اور اصل واہم مشغولیت صرف تحریر وتصنیف کی تھی۔ (۷۸)

حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''تحریر کے لئے قلم اٹھاتے تو نکتہ آفرینیوں کا مرقع تیار کرتے، لکھنے لکھانے میں نہ جہاز کے ہچکولے مانع ہوتے، نہ ریل کی گھڑگھڑاہٹ اور اس کے جھٹکے، مجلس شوریٰ کے بقراط وسقراط چھوٹے چھوٹے مسئلہ کو جذرِ اصم بناتے تو حکیم الاسلامؒ قرطاس وقلم کی کائنات میں گم ہوجاتے۔ میں نے خود ایک دن دیکھا کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ ان کے شغل کو حیرت سے دیکھ رہے ہیں، غالباً وہ سوچ رہے تھے کہ ہمیں لکھنے لکھانے کے لئے خلوت درکار، یکسوئی مطلوب اور اس شخص کو نہ تنہائی کی ضرورت، نہ بے چیخ وپکار کی فضا کی۔ (۷۹)

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی گراں قدر تصانیف کے علمی وتحقیقی معیار کا اندازہ کرنے کے لئے چند اقتباسات نذر قارئین کئے جارہے ہیں:

قابلِ تبلیغ صرف علمِ الٰہی ہے

''بہر صورت تبلیغی چیز صرف علمِ الٰہی نکلا جسے علم شرعی کہا جاتا ہے اور اس لئے یہ واضح ہوگیا کہ دعوتی پروگرام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ خدا کی طرف سے ہو، مخلوقاتی دائرہ کی چیز نہ ہو کہ مخلوق کی طرف سے جو علم وفن بھی ہوگا وہ محض طبعیاتی یا عقلیاتی دائرہ کا ہوگا جس کی تبلیغ کا انسان محتاج نہیں۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ دعوتی پروگرام کی اولین خصوصیت تشریعیت ہونی چاہئے، کہ وہ منجانب خلق نہ ہو اور ظاہر بات ہے کہ من جانب اللہ جو چیز منتقل ہوتی ہے وہ علم وہدایت ہی ہے، اس لئے دعوتی پروگرام کے سلسلہ میں داعی اور مبلغ کا مقاصدِ تبلیغ کے حق میں عالم اور باخبر ہونا ضروری

ٹھہرتا ہے، محض لسّانی اور بولتا ہونا کافی نہیں۔

جاہلِ محض اور شرعی ذوق سے بے بہرہ حقیقی داعی یا منصبِ دعوت کا اہل نہیں ہوسکتا اور خواہ مخواہ بن بیٹھا تو لوگوں کے لئے گمراہی کا سبب اور خطرۂ ایمان بنے گا، جیسے نیم حکیم خطرۂ جان ہوتا ہے اور پھر اس کی روک تھام یا تو مشکل ہوگی یا فتنہ کا سبب بن جائے گی۔

جیسا کہ آج اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے، بہت سے لسّان مگر جاہل واعظ تبلیغی اسٹیجوں پر اُچھلتے کودتے نظر آتے ہیں جو اپنے ذہنی تخیلات کو برنگِ شریعت پیش کر کے مخلوقِ خدا کو گمراہ کر رہے ہیں، جس سے عوام میں دھڑے بندیاں قائم ہو رہی ہیں اور امت کا کلمہ بجائے متحد ہونے کے زیادہ سے زیادہ منتشر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جس سے امت اجتماعی لحاظ سے کمزور اور بے وقار ہوتی جا رہی ہے جو تبلیغ کے حق میں قلبِ موضوع ہے۔ محض اس لئے کہ اس قسم کی تبلیغ صحیح عالم اور صحیح علم سے محروم ہوتی ہے اس لئے دعوتی پروگرام کی اساس و بنیاد علمِ الٰہی کے سوا دوسری چیز نہیں ہوسکتی، جو تشریعت کا پہلا مقام ہے۔'' (۸۰)

اسلامی تبلیغ عالمی ہے

اقتباسِ بالا سے دو اہم نکتے واضح ہوئے:

(۱) تبلیغ صرف شریعت اسلامیہ کی ہونی چاہئے، غیر شرعی امور کی تبلیغ جائز نہیں، جیسا کہ اہل بدعت و بدعات و محدثات کی تبلیغ اور مغربی تہذیب کے دل دادہ فحش اور مخربِ اخلاق لٹریچر کی تشہیر کرتے پھرتے ہیں، شرعاً یہ جائز نہیں۔

(۲) تبلیغ کا تعلق چوں کہ شریعت سے ہے اور شریعت علمی چیز ہے، اس لئے تبلیغ علماء ہی کو کرنی چاہئے۔ جہلاء کا یہ منصب نہیں۔

اُدْعُ کے کلمہ سے دوسرا مسئلہ یہ بھی نمایاں ہوتا ہے کہ اسلام صرف تبلیغی مذہب ہی نہیں بلکہ عالمی تبلیغ اور بین الاقوامی دعوت کا مذہب بھی ہے جو کسی ایک وطن یا زمانہ تک محدود نہیں بلکہ تا قیامِ قیامت ہر دور، ہر ملک اور ہر قوم کے لئے اس کی دعوت عام ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اُدْعُ کا فعل مطلق لایا گیا ہے جو کسی خاص صورت، خاص حالت یا خاص نسبت سے مقید نہیں اور عربیت کا مسلمہ ضابطہ ہے کہ فعل کے مطلق لانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام احوال و شئون اور سارے ممکن الاجتماع ظروف کے ساتھ جمع ہے اور ساری شانیں اور تقدیریں اس کے عموم و اطلاق کے اندر آئی ہوئی ہیں اور وہ ہر تقدیر کے ساتھ جمع ہو کر پایا جا سکتا ہے۔

پس اس کا خلاصہ واضح الفاظ میں یہ ہے کہ اُدْعُ کی دعوت ہر ممکن شان، ہر ممکن حال، ہر ممکن زمان اور ہر ممکن مکان میں دی جائے اور اُسے کسی خطۂ زمین یا وطن یا کسی خاص وقت یا خاص تقدیر کے ساتھ مقید نہ کیا جائے، ورنہ فعل کا اطلاق باطل ہو جائے گا جو اس آیت کا مفاد ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی کا نام بین الاقوامیت اور عالمیت ہے کہ شئے ہر وطن، ہر خطہ اور ہر قوم میں پہنچی ہوئی ہو۔ اس لئے اسلام کی دعوت و تبلیغ کا عالمی ہونا خواہ بلحاظِ وطن ہو یا بلحاظِ وقت، بلحاظِ قومیت ہو یا بلحاظِ رنگ و نسل، بلحاظِ احوال ہو یا بلحاظِ کیفیات وشئون (جیسے تحریری تبلیغ بصورتِ تصنیف یا تقریری تبلیغ بصورتِ خطاب، یا اشاراتی تبلیغ بذریعہ ہیئت وغیرہ) اسی آیتِ دعوت کے کلمہ اُدْعُ کے اطلاق سے ثابت ہو گیا اور وہ یہ ہے کہ آیت میں جب اسلام کو بنام سبیلِ رب مدعوالیہ (دعوتی پروگرام) ٹھہرا کر اس کی طرف اُدْعُ سے دعوت دینے کا امر کیا تو اس کا مفعول ذکر نہیں کیا کہ کن کو دعوت دو اور یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عربیت کے قواعد کے مطابق ایسے مواقع میں مفعول کا ذکر نہ کیا جانا اسکے عام ہونیکی دلیل ہوتا ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ سبیلِ رب کی دعوت ہر اس شخص کو دو جس میں فہمِ خطاب کا مادہ ہو، یعنی ہر ایک عاقل بالغ انسان کو تبلیغ کرو اور ظاہر ہے کہ دعوتِ عام دینا اور ساری دنیا کو اس دعوت کا مدعو ٹھہرا دینا جب ہی ممکن ہے کہ خود دعوتی پروگرام میں بھی عموم و ہمہ گیری کی صلاحیت ہو، ورنہ امر عام عبث ٹھہر جائے گا جو کلامِ الٰہی میں محال ہے۔ اس لئے عمومِ دعوت اور عمومِ مدعوین کا مقتضاء قدرتی طور پر عمومِ مدعوالیہ ہوتا ہے، یعنی دعوتی پروگرام بھی بذاتِ خود عالمگیری کی شان رکھتا ہو، اس لئے اسلام کا تبلیغی ہونا، جامع ہونا اور اجتماعی ہونا اسی آیت کے اقتضاء سے ثابت ہو جاتا ہے۔ (۸۱)

لفظ ''اُدْعُ'' سے کیا بلیغ نکات اخذ کئے ہیں، اقتباسِ بالا کے مابعد کے اقتباسات کو ذرا غور سے پڑھئے۔

تبلیغی کلام کی فصاحت و بلاغت

چنانچہ اس کلیہ کا ایک فرد یہ ہے کہ مبلّغ اپنے کلام کو فصاحت و بلاغت سے آراستہ کرے خواہ وہ حکمت سے کام لے یا موعظت اور مجادلہ کے میدان میں آئے۔ بہر حال بے تکلفانہ انداز سے شستہ کلامی، فصاحتِ لسانی اور بلاغت بیانی اس کا خاص شعار ہونا چاہیے تا کہ مخاطب صحیح عنوان سے صحیح مقاصد ہی اخذ کر سکے۔ اگر کلام میں پیچیدگی، گنجلک اور بے ترتیبی ہو یا کلام ان محاورات کے مطابق نہ ہو جس کے اہلِ لسان خوگر ہوں تو مخاطب صحیح اثر قبول نہ کر سکیں گے اور کلام رائیگاں چلا جائے گا۔

اس لئے کلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ مقتضائے حال کے مطابق ہو، زمانہ اور وقت کی زبان میں ہو اور

ایسے عنوان سے ہو جو لوگوں میں معروف اور متعارف ہو۔ غریب لغات، ناشناسا تعبیرات اور بے محاورہ کلام نہ ہو، ورنہ کلام میں نہ دلچسپی پیدا ہوسکتی ہے نہ تاثیر۔ اس لئے حدیث نبویؐ میں اس قسم کے کلام کی صریح ممانعت فرمائی گئی ہے۔

ارشادِ نبویؐ ہے: **نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن الاغلوطات.** (مشکوٰۃ شریف)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے پیچیدہ اور مغالطہ انگیز کلام سے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تبلیغی سلسلہ میں اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنے ساتھ رکھنے کی یہ کہہ کر درخواست کی کہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں اور میری تقریر کی تائید میں جب وہ رواں اور صاف تقریر کریں گے تو قلوب پر اچھا اثر پڑے گا، ورنہ مجھے ڈر ہے کہ میری رکتی ہوئی زبان سے لوگ بُرا اثر نہ لیں اور تکذیب کے دَرپے نہ ہو جائیں۔ ارشاد ہے:

وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْءًا یُّصَدِّقُنِیْۤ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ.

ترجمہ: اور (اے میرے رب) میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ رواں ہے، تو ان کو میرا مددگار بنا کر میرے ساتھ بھیج دیجئے کہ وہ (میری تقریر کی تائید اور) تصدیق کریں گے، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ (فرعون اور اس کے درباری) میری تکذیب نہ کریں۔

اس واقعہ سے واضح ہے کہ کلام مخاطبوں کی ذہنیت کے مناسب ہو کر ہی اثر انداز ہوتا ہے، گویا شہروں میں ادبی زبان، دیہات میں معمولی اور سادہ زبان، علمی طبقوں میں اصطلاحی زبان اور اہل فنون کے طبقہ میں فلسفیانہ زبان ہی مفید اور مؤثر ہوسکتی ہے۔ (۸۲)

سماعِ قبول

مخاطبوں کی اس اقتضائی تقسیم سے ان کا اولین وصف حسنِ سماع ہے جو یہاں سے نکلتا ہے، جو ان میں بتقاضائے عقل راسخ رہنا چاہئے جس کا ثمرہ جذبۂ قبولیت اور تسلیمِ حق ہے، یعنی مخاطب کا جوہر یہ ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کو سماعِ قبول سے سنے اور بشرطِ معقولیت ماننے اور حق ہونے کی صورت میں اُسے تسلیم کر لینے کا جذبہ اپنے اندر رکھے، جسے داعی بھی اُن میں پیدا کر سکتے ہیں جو اسی آیت کے اقتضاء سے ثابت ہو رہا ہے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب حجت بیانی کی یہ سہ گانہ قسمیں محض مخاطبوں کے فہم کے تفاوت اوران کی سمجھ کے مختلف درجات کی وجہ سے بیان فرمائی ہیں، تو ان کی غرض وغایت صرف یہی ہوسکتی ہے کہ مخاطب کو انکار کی گنجائش نہ رہے اور بشرطِ عقل وانصاف وہ کلمۂ حق کو قبول کرنے پر اپنے دلی داعیہ سے مجبور ہو جائے۔

اگر یہ غرض نہ ہوتی تو استدلال اور حجت بیانی اوران کے مختلف طریقوں کی حاجت ہی نہ تھی، محض احکام کا بیان کر دیا جانا کافی تھا، خواہ کوئی سنے یا نہ سنے اور خواہ قبولیت کی اس میں گنجائش اور استعداد ہو یا نہ ہو، گویا داعی الی اللہ صرف اس کا مصداق ہوتا ہے کہ:

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

اور جب کہ مخاطبوں کی اس تقسیم سے قدرتاً مخاطب کا یہ وصف سامنے آیا تو یہ حسنِ سماع بطور اقتضاء کے اسی آیت سے ثابت ہو گیا۔ اَب غور کرو تو سماعِ قبول کے اثبات سے اس کی ضد جسے سوءِ سماع یا حق سے انحراف کہنا چاہئے جو قلب میں دعوت کو راسخ نہ ہونے دے مع اپنی تمام اقسام کے اس آیت سے خود بخود منفی ہو جاتی ہے۔

یا مثلاً قلب کا لہو ولعب اور لا ابالی پن، قلتِ فکر یا قلبی اعراض اور بے توجہی یا زبان کی بکواس، کثرتِ سوال اور فضول استفسارات یا دور از کار احتمالات وشبہات نکالنا جو کلام کو رَلانے کے لئے کئے جائیں اور جن کی طبعی خاصیت یہ ہے کہ مخاطب کے دل میں داعی کی بات جمنے نہ دیں اور اس پر کسی حیثیت سے بھی متکلم کا اثر نہ ہونے دیں، یہ سب اسی آیتِ دعوت سے مردود ہو جاتے ہیں، کیوں کہ قاعدہ ہے کہ **الامر بالشئ یقتضی النهی عن ضدہٖ** (کسی شئے کا حکم دینا اس کی ضد کی ممانعت کی دلیل ہوتا ہے) پس جب حسنِ قبول آیت کے اقتضاء سے ضروری اور مامور بہ ٹھہرا تو اس کی ضد سوءِ قبول مع اپنی اقسامِ مذکورہ کے خود ہی ممنوع ثابت ہوئی۔ سامع کے ان قبیح اوصاف پر قرآن حکیم نے جدا جدا بھی روشنی ڈالی ہے۔

اعراض

مثلاً قلبی اعراض اور بے توجہی پر ملامت کرتے ہوئے ہٹ دھرموں اور متعصّبوں کی شان بتائی کہ:

وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○

ترجمہ: اور اگر وہ ان کو سنائیں گے بھی تب بھی وہ پشت پھیر کر چلے جائیں گے۔ اس حال میں کہ وہ اعراض کرنے والے ہوں گے۔

دوسری جگہ فرمایا:

بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ○

ترجمہ : بلکہ وہ اپنے رب کے ذکر سے اعراض کرنے والے ہیں۔

شغب و اِضلال

یا مثلاً حق پہنچانے کے وقت معاندوں کے شور و شغب کے بارے میں قرآن حکیم نے دوسری جگہ ان کی یہ خصلت تفصیل سے بیان فرمائی ہے کہ کلامِ حق کو سرے سے سننے ہی کا ارادہ نہیں رکھتے چہ جائیکہ سماعِ قبول سے سنتے اور نہ صرف یہ کہ خود سننا نہیں چاہتے بلکہ شور و شغب سے دوسروں کو بھی نہیں سننے دیتے۔ فرمایا:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْ فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ○

ترجمہ: اور کافروں نے کہا کہ اس قرآن کو مت سنو اور شور مچاؤ، تا کہ تم غالب آجاؤ۔

استہزاءِ دعوت

یا مثلاً قلبی لہو ولعب کے بارے میں فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَ هَا هُزُوًا.

ترجمہ: اور بعض لوگ وہ ہیں جو لغو اور فضول باتیں خریدتے ہیں تا کہ اللہ کے راستے سے بغیر علم کے گمراہ کر دیں اور اس کو تمسخر اور استہزاء بنا دیں۔

یا مثلاً حدیث میں کثرتِ سوال کی ممانعت فرمائی گئی، جو محض قیل وقال کے لئے ہو اور جس سے واقع شدہ شک کا مٹانا مفقود نہ ہو بلکہ شکوک کا واقع کرنا اور کلام کو مشکوک بنانا منظور ہو۔

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن كثرة السوال وعن قيل وقال وعن اضاعة المال. (مسلم شریف)

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرتِ سوال، قیل وقال اور اضاعتِ مال سے منع فرمایا ہے۔

غرض یہ آدابِ مخاطب بتقریر بالا اسی آیت کے تقاضے سے ثابت ہوتے ہیں۔ (۸۳)

قربانی کی حقیقت

قربانی کی حقیقت اور اس کے پس منظر کی وضاحت اتنے سہل اور دل نشیں اسلوب میں فرمائی گئی ہے کہ ایک عامی بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اسے کہتے ہیں قدرت کلامی اور سحر بیانی۔

اصل میں قربانی کی حقیقت تو یہ تھی کہ عاشق خود اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے حضور میں پیش کرتا مگر

خدا تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ ان کو یہ گوارا نہ ہوا، اس لئے حکم دیا کہ تم جانور کو ذبح کرو، ہم یہی سمجھیں گے کہ تم نے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے خواب کے ذریعہ بشارت دی کہ آپ اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی پیش کریں۔

اب دیکھئے یہ حکم اول تو اولاد کے بارے میں دیا گیا اور اولاد بھی کیسی اور فرزند بھی ناخلف نہیں بلکہ نبی معصوم، ایسے بچے کو قربان کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ حقیقت میں انسان کو اپنی قربانی پیش کرنا آسان ہے مگر اپنے ہاتھ سے اپنی اولاد کو ذبح کرنا بڑا سخت اور مشکل کام ہے، مگر حکم خداوندی تھا اس لئے آپ نے بیٹے کی محبت کو پس پشت ڈالا اور حکم خداوندی کے آگے سر جھکا دیا اور حضرت اسماعیلؑ کو لے کر منیٰ کے منحر میں تشریف لے آئے اور فرمایا کہ بیٹے مجھے خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں تجھ کو ذبح کر دوں، تو حضرت اسماعیلؑ نے فوراً فرمایا:

اِفۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ یعنی جو آپ کو حکم ہوا وہ ضرور کیجئے۔

اگر میری جان کی ان کو ضرورت ہے تو ایک جان کیا ہزار جانیں بھی ہوں تو نثار ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے رسیوں سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھے، چھری تیز کی، اب بیٹا خوش ہے کہ میں خدا کی راہ میں قربان ہو رہا ہوں۔ اُدھر باپ خوش ہے کہ میں اپنی قربانی پیش کر رہا ہوں۔ چنانچہ حکم خداوندی کی تعمیل میں اپنے بیٹے کی گردن پر چھری چلائی تو چھری کند ہوگئی اور اس وقت حکم ہوا:

قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّؤۡیَا اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ۝

یعنی بے شک آپ نے اپنا خواب سچا کر دکھایا، ہم نیکو کاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں۔

اور اب ہم اس کے عوض جنت سے ایک مینڈھا بھیجتے ہیں اور تمہارے بیٹے کی جان کے عوض ایک دوسری جان کی قربانی مقرر کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی دن سے گائے مینڈھا یا بکری وغیرہ قربانی کے لئے فدیہ مقرر ہو گیا۔ (۸۴)

زبان اور قومی روایات کا تعلق

زبان اور قومی روایات کی وضاحت کا یہ اچھوتا اسلوب بڑے بڑے زباں دانوں اور دانشوروں کے لئے چشم کشا اور دنیائے ادب کے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔

پس جب کہ محض رضائے کار سے شریکِ کار ہونے کا حکم لگا دیا گیا ہے تو جہاں حقیقتاً عملی شرکت بھی کی جائے تو وہاں بالاولیٰ شرکِ عمل کا حکم لگایا جائے گا۔ پھر عادت اور تجربہ شاہد ہے کہ ہر ایک قوم کی زبان اور

اس کا لٹریچر صرف اسی کے تہذیب وتمدن کی ترجمانی کرتا ہے کہ وہ زبان ان ہی اشیاء کی ترجمانی کے لئے منصۂ ظہور پر آتی ہے، جو اس قوم میں مرز بوم کی خصوصیات مذہبی روایات اور اس قوم کی مخصوص ذہنیت کے ماتحت رائج ہوتی ہیں، گویا ہر ایک قوم اپنی زبان کے ذریعہ اپنے ہی احوال وکیفیات کا اظہار کرتی ہے نہ کہ دوسری اقوام کے حالات کا۔

مثلاً اہل دیہات اپنی بول چال میں شہری حالات کی ترجمانی نہیں کریں گے، بلکہ وہی اپنے بدوی مقامات ظاہر کریں گے، ان کے محاورات، ضروب الامثال اور عام تشبیہات واستعارات کھیت کے ڈولوں مویشیوں اور گھانس پھونس وغیرہ سے آگے نہیں گذر سکتے کہ ان کی زبان انہی کے حالات کی ترجمانی کے لئے ہے اور وہ حالاتِ بداوت ہی سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ حضارت وشہریت سے۔ اسی طرح ایک متمدن اور شہری قوم کا لٹریچر اپنے محاورات وتعبیرات کے لحاظ سے گھانس پھونس وغیرہ کے بجائے انجن، مشین ،ریل، تار، سر بفلک عمارات اور عام تمدنی ترقیات کا آئینہ دار ہوگا، گویا وہ تمام مادّی ترقیات جو انکے عمل نے سطحِ زمین پر مجسم کی ہیں انکی زبان اور لغت انہی کی ترجمانی کرے گی، جو چیز ان کی قومیت کے دائرہ میں موجود ہی نہیں اس کی ترجمانی اس لٹریچر میں کیسے ہوسکتی ہے؟

پھر اسی طرح جس قوم کے حالات وکیفیات میں مادیت کے بجائے مثلاً روحانیت کا غلبہ ہو، تدین، اخلاص اور وابستگی حق اس پر چھایا ہوا ہو تو اسکے لغت، محاورہ، کہاوتوں اور مثلوں، تشبیہوں اور استعاروں میں بھی انہی امور کی عام ترجمانی ہوگی، زبان کا ہر ہر جملہ حقائقِ مذہب، معارفِ الٰہیہ، اخلاقِ ربانی اور اسماء ِ خداوندی سے لبریز ہوگا اور اس زبان کا بولنا ایسا ہوگا گویا ایک مذہبی وعظ ہو رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر کوئی قبیلہ یا قوم اہل دیہات کے محاورات کا گرویدہ ہوکر انھیں حاصل کرے تو زبان کے ذریعہ درحقیقت وہ دیہی زندگی اور بداوۃ کے حالات حاصل کر رہا ہے، یا کسی متمدن قوم کا لٹریچر حاصل کرے تو لغت کے واسطہ سے وہ اس کی تمدنی روایات حاصل کر رہا ہے اور کسی مذہبی قوم کی زبان سیکھے تو وہ فی الحقیقت اس کے مذہبی خیالات سیکھ رہا ہے کہ وہ زبان ان حالات وخیالات ہی کی ترجمانی اور انہی کیفیات کا دوسرا رخ ہے۔

بہر حال جب کہ واقعہ ہے کہ کسی قوم کے لغت پر عبور حاصل کرنا حقیقتاً اس قوم کی تہذیب وتمدن اور مذہب ومعاشرت پر علماً وخیالاً عبور کر جانا ہے تو ساتھ ہی اس پر بھی عبور کر لینا چاہئے کہ جب ہر تہذیب وتمدن میں کچھ جزئیات دلفریب اور دلکش بھی ہوتی ہیں تو یہ ناممکن ہے کہ ان کے مقابلہ میں اپنی تہذیب

ومعاشرت کی مخصوص جزئیات سے بُعد یا کم از کم ان کی بے وقعتی ، یا اور بھی کچھ نہیں تو ان کی موزونیت کے بارہ میں کچھ نہ کچھ شکوک وشبہات اوراعتراضات نہ پیدا ہو جائیں۔ظاہر ہے کہ ذہنیت کی اس طبعی رفتار کے ماتحت جتنا جتنا کسی قوم کی زبان اور لٹریچر کا مطالعہ وسیع ہوتا جائے گا اسی حد تک اس کی تہذیب وتمدن سے موانست اور اپنی تہذیب وتمدن سے بیزاری اور بے رخی بڑھتی جائے گی اور اس کا آخری نتیجہ قدرتی طور پر یہی ہوسکتا ہے کہ انسان کی جدت پسند ذہنیت کے ماتحت یہ متعلّم قوم ہمیشہ کے لئے اپنی قدیم مخصوص قومیت کا سرمایہ چھوڑ کر معلم قوم کی دریوزہ گر ہو جائے اور پھر اسی کی قومیت کا ایک پرزہ بنکر گھومنے لگے۔(۸۵)

اردو زبان کی اسلامی حیثیت

اردو زبان فارسی ،عربی، سنسکرت ، برج بھاشا، کھڑی بولی اور ہندوستان کی رنگارنگ زبانوں سے مرکب ایک شیریں زبان ہے، جس کو ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی زبان ہونے کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ اسلامی علوم وفنون، شعروادب، تاریخ وتمدن کا ایک عظیم سرمایہ اردو زبان میں منتقل ہو چکا ہے جو علماء کرام اور مدارسِ دینیہ کے مرہونِ منت ہے۔حکیم الاسلامؒ نے ذیل میں ان تمام گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو زبان کی اہمیت پر اپنے مخصوص انداز میں گفتگو فرمائی ہے۔

’’آج ہندوستان میں اردو کی حیثیت کلیۃً یہی ہے کہ وہ اسلامی محاورات کی امین ،عربیت کی ترجمان، اسلامی علوم وفنون کی حامل اور عام اسلامی ذہنیت کی آئینہ دار ہے۔اس کی شاعری ہو یا نثر، کتب ورسائل ہوں یا مضامین ومقالات، پھر ادبی سلسلہ میں غزلیات ہوں یا قصائد، حقائق نویسی ہو یا واقعہ نگاری، تشبیہات ہوں یا استعارات، ضرب الامثال ہوں یا کہاوتیں ، قصص تاریخ وایام ہوں یا سنین وشہور، اصطلاحات ہوں یا عنوانات ،نعرے ہوں یا رجز، تحیات ہوں یا القاب وخطاب ،غرض اس زبان کا کوئی بھی شعبہ ہو،سب میں اسلامی ذہنیت کی روشنی، مذہبیت کا رنگ، دینی جذبات کی آمیزش، خداشناسی کی جھلک، اکابرین اسلام کی روایات اور پیغمبروں اور اولیاء کی سیرتوں کی چاشنی اس درجہ اس میں رچی ہوئی ہے کہ اس کا ہر گوشہ عام نگاہوں میں اسلامی گوشہ اور اس کا ہر فقرہ اسلام کا فقرہ محسوس ہوتا ہے۔

ایک مسلمان اپنی روزمرّہ کی بات چیت اور محاورات میں جو کلمات استعمال کرتا ہے وہ عربیت اور اسلامیت کی اس درجہ آمیزش لئے ہوئے ہوتے ہیں کہ غیر مسلم ان کے استعمال کی کبھی جرأت ہی نہیں کرسکتا۔ مثلاً ابتداءِ کار پر بسم اللہ، من مانے کام ہوجانے پر الحمد للہ، تعجب پر سبحان اللہ، قدر افزائی پر ماشاء اللہ، تحاشی وتبری پر معاذ اللہ، ندامت پر استغفر اللہ، افسوس پر انا للہ، حلف پر واللہ باللہ، توقع پر انشاء اللہ، بچاؤ پر اللہ اللہ،

ندامت پر یا اللہ، شکر یہ پر جزاک اللہ، اظہارِ عظمت پر لا الہ الا اللہ، ظہورِ منکر پر لاحول ولاقوۃ الا باللہ، پیغمبروں کا نام آنے پر صلی اللہ، جوش پر اللہ اکبر وغیرہ، اس کی بے تکلف زندگی ہے، جب کہ اسی قسم کے اسلامیت شعار اور عربیت نواز محاورے اردو کی روح ہیں، تو پھر کونسی وجہ ہوسکتی ہے کہ اسے اسلامی زبان نہ کہا جائے اور مسلمانوں کی چیز شمار نہ کیا جائے؟

دو مسلمانوں میں ملاقات اور مکالمے کا آغاز ہوتے ہی بے تکلف جو کلمات نکلتے ہیں وہ صرف عربیت واسلامیت ہی کے آئینہ دار ہوتے ہیں، مثلاً السلام علیکم! مزاجِ اقدس یا مزاج شریف، جناب عالی، خیر وعافیت، تشریف ارزانی، ماحضر تناول، اہل بیت کی صحت، حاضر ہوتا ہوں وغیرہ ان جملوں کا اگر عطر کشید کیا جائے تو اسلامیت وعربیت کے سوا ان میں سے اور کیا نکل سکتا ہے؟ یہ وہ جملے ہیں جو ملاقات ہوتے ہی گویا ایک سانس میں زبان سے نکلتے ہیں۔ اس سے دوسری عام بے تکلف گفتگوؤں کا اندازہ کرلیا جائے اور وہ تصانیف یا عبارت یا شاعری جس میں ایک اردو کا مصنف یا شاعر کچھ سوچ بچار سے کام لیکر کلام کرے تو اس کی اسلامی ذہنیت جس عربیت واسلامیت کا مظاہرہ کرے گی وہ اس سے بھی زیادہ ہوگا جو ان جملوں سے اندازہ کرایا گیا ہے۔

غرض عربی زبان جوہر ہے اور اردو زبان وہ آئینہ ہے جس میں اس جوہر کی عکاسی ہورہی ہے، تو کیا اس اسلامیت کی آئینہ داری کے ہوتے ہوئے اردو مسلمانوں کے لئے کوئی ناقابل اعتناء زبان رہ جاتی ہے؟ اگر فی الحقیقت اللہ کے ان ناموں، اس کے ان محاوراتی حقائق ومعارف کی حفاظت کوئی اسلامی فریضہ ہے جن کو اردو کی تعبیرات نے اپنے دامنوں میں چھپا رکھا ہے تو خود اردو کی حفاظت کیوں اسلامی فریضہ نہیں ہے؟ پھر اردو کی صورت چھوڑ کر اگر اس کے مادہ پر غور کیا جائے تو مسلمانوں نے اپنے مخصوص علمی مذاق کے ماتحت اسلامی علوم اس میں منتقل کئے، آج کوئی علم وفن ایسا نہیں جس میں ہزاروں کی تعداد میں اردو کے سفینے موجود نہ ہوں اور عربی سے اردو میں منتقل نہ ہو چکے ہوں۔

پھر ایک علومِ قدیمہ ہی نہیں بلکہ علومِ جدیدہ اور فنونِ عصریہ کا لامحدود ذخیرہ ہے جسے مسلمانوں نے اردو کی زینت بنادیا ہے، دکن کی دولت ابدمدت نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے سائنس، فلسفہ، کیمسٹری، تاریخ، جغرافیہ اور تمام جدید فنون کو دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل کر دیا ہے۔

غرض اردو زبان آج ایک قابل فخر علمی زبان بن گئی ہے جس نے تمام علومِ قدیمہ وجدیدہ کو اپنے وسیع دامنوں میں چھپا لیا ہے۔ پس جس طرح اس وقت ہندوستان کی کوئی ایک زبان بھی خواہ ہندی ہو یا

سنسکرت، اس میدان میں اپنے کو سرخروئی کے ساتھ پیش نہیں کرسکتی کہ اس نے اس قدر علوم وفنون کا ذخیرہ اپنی تعبیرات کے بطون میں پنہاں کر رکھا ہو، اسی طرح اس ملک کی کوئی ایک قوم بھی خواہ وہ ہندو ہو یا غیر ہندو اپنے کو پیش نہیں کرسکتی کہ اس نے مسلمانوں کی برابر نہ سہی اس کی آدھی تہائی بھی اس ترقی اردو اور اس کے مادہ وصورت کے بنانے اور سنوارنے میں حصہ لیا ہے۔ چنانچہ اردو کے اسلامی اور مسلمانوں کی زبان ہونے کی ایک سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ ہندوستان کے غیر مسلم اسے بحالتِ موجودہ اپنی نہیں بلکہ مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں اور اسی لئے اس کی نوک و پلک قطع کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

غور اس پر کیجئے کہ وہ اردو کی فکر میں محض ایک زبان ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہیں کہ وہ اسلامیت اور عربیت کی ترجمان ہے۔ پس وہ نفسِ اردو کو مٹانا نہیں چاہتے بلکہ اس کی عربیت اور اس مخصوص اسلامیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ پس اگر وہ اسلامیت وعربیت کے فنا کرنے کی خاطر اردو کی ہیئت تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو کیا اسی اسلامیت کی بقاء کی خاطر مسلمانوں کا شرعی فریضہ نہ ہوگا کہ وہ اردو کو اس کی اسی ہیئتِ کذائی کے ساتھ باقی رکھنے کی انتھک سعی کریں۔

جب کہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ خود عربی زبان کا بقاء وتحفظ بھی اسی اسلامیت کے بقاء کے لئے ایک شرعی فریضہ ہے۔ پس علت کے اشتراک سے حکم بھی مشترک رہے گا، اگر عربی زبان کا بقاء اسلامیت کی خاطر فرض ہے تو ہندوستان میں اسی علت وحکمت کی خاطر اردو کا بقاء بھی شرعی فرض ہوگا، اگر خدانخواستہ اردو کا یہ اسلامی مغز نکال کر اس کے چھلکے کو باقی رکھا جائے یا اس کے موجودہ شیریں مغز کے بجائے اس میں کسی مردہ زبان کا تلخ مغز بھر دیا جائے تو مسلمان اسے کیسے برداشت کرسکیں گے کہ ان کے یہاں چھلکے کا تحفظ ہی صرف مغز کی خاطر ہے''۔(۸۶)

اسلامی قانون فطرت کے مطابق ہے

دین اسلام فطری دین ہے اور اس کے اصول وقوانین فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ دنیا کا کوئی قانون اسلام کے نظامِ قانون کی جگہ نہیں لے سکتا کیوں کہ اسلام کے علاوہ کوئی بھی مکتبہ فکر الہامی یا غیر الہامی مذہب اسلام کی طرح فطری اصولوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ مسلم پرسنل لاء اسلام کے ان ہی فطری اصولوں کا نام ہے۔ ذیل میں حکیم الاسلامؒ اسی مفہوم کو اپنے مخصوص انداز میں بیان فرماتے ہیں:

''بہر حال میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ مسلم پرسنل لاء کا اگر یہ مطلب ہے کہ ان کے شخصی قوانین، تو ان کا

من حیث القوم نہ کوئی شخصی قانون ہے اور نہ کوئی ذاتی قانون ہے، وہ خدا کا قانون ہے ہم اس قانون کو دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کریں گے۔ مسلم پرسنل لاء کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ ہم اپنے قانون کو بچا لے جائیں، نہیں! ہم اس کے تحفظ کے ساتھ ساتھ دنیا کی قوموں کو بھی دعوت دیں گے کہ تم بھی اس پر عمل کرو، خواہ وہ شخصی چیز ہو، خواہ خاندانی چیز ہو۔ اس لئے کہ وہ قوانینِ فطرت کے مطابق ہیں، وہ انسان کے طبعی جذبات کے مطابق ہیں، وہ زبردستی کے قوانین نہیں کہ عقل نہ مانتی ہو اور دل نہ مانتا ہو اور زبردستی اس کے اوپر ڈالا جائے۔ یہ بات نہیں! بلکہ جب غور کرے گا تو آدمی اس کو فطرت کے مطابق پائے گا۔

اس لئے ایک انسان کی زندگی اسی میں ہے، اس ماننے والے انسان کا نام ہے مسلمان اور مسلمان کی زندگی مہد سے لے کر لحد تک اور پیدائش سے لے کر موت تک اور اس درمیان میں جتنے اس کے افعال اور احوال ہیں سب پر اسلام کا قانون لاگو ہے اور جتنی ہدایات ہیں وہ سب خدا کی طرف سے ہیں۔ وہ کوئی موضوع قانون نہیں کہ ہم نے بنالیا ہو، افعال کو چھوڑ کر انسان کی ذات پر اس وقت سے اسلامی قانون لاگو ہو جاتا ہے کہ اسے عقل بھی نہیں، شعور بھی نہیں، تمیز بھی نہیں''۔(۸۷)

جامعیتِ منافعِ احکام

اسلامی احکام وشرائع اور تعلیمات کی جامعیت کی شرح و تفصیل کے لئے عام اہل علم کو کئی کئی صفحات کی ضرورت پیش آتی ہے، اس کے باوجود موضوع کا احاطہ بمشکل ہی ہو پاتا ہے۔ حکیم الاسلامؒ بھی اسی موضوع پر گفتگو فرماتے ہیں مگر تفصیل بھی اجمال میں اور شرح بھی ایجاز میں کہیں ہو سکتی ہو تو آپ کا یہ تحریری کرشمہ اس ہنر کا شاہکار ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''احکام کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ دین و دنیا، آجل و عاجل، مادی و روحانی دونوں کے منافع پر حاوی ہیں۔ چنانچہ جو امور دیانات سے متعلق ہیں جیسے عباداتِ خمسہ، ان میں تو بطور خاصیت منافع دنیا شامل ہیں اور جو امور معاشرت سے متعلق ہیں ان میں فوائدِ آخرت بھی مستور ہیں۔ نماز کے بارے میں اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ، نمازی آدمی اور بھی کچھ نہیں تو مخلوق ہی کی عار سے تو کھیل تماشوں سے بچے گا، پھر جماعت میں استقامتِ صفوف سے اتحاد پیدا ہوتا ہے استووا تستوقلوبکم اور اتحادِ حسن مغائرتِ دنیوی کی روح ہے اور اختلاف ایک عذاب ہے۔

زکوٰۃ سے توازنِ طبقات ہے کیونکہ تؤخذ من اغنیاء ھم وترد الٰی فقراء ھم (مالداروں سے

لے کر ضرورت مندوں کو دیا جائے) ورنہ تنافر بلکہ تعاند قائم ہو جائے جیسا کہ اب قائم ہے اور بے قید سرمایہ داری کی وجہ سے دنیا جہنم زار بھی ہو جاتی ہے۔ حج میں تعارفِ باہمی مشرق و مغرب کا میل جول، قومی وحدت، جو تمدن و معاشرت کی بہترین اساس ہے اور جس پر تجارتی، سیاسی، اقتصادی تعلقات ہمہ گیر ہو سکتے ہیں۔

روزہ صحت کے لئے ضروری ہے **صوموا لصحوا** (روزہ رکھو صحت پاؤ گے) فاقہ اور بھوک چھوڑ کر کھانے سے بہتر طباً کوئی علاج نہیں جیسا کہ چار طبیبوں میں ہندی نے ہلیلہ، رومی نے مصطگی، عراقی نے گرم پانی جس سے معدہ دھل جائے اور عربی نے بھوک چھوڑ کر کھانا بتلایا۔ شریعت نے یہی بارہ مہینہ بھوک چھوڑ کر کھانے اور ایک مہینہ بھوکا رہنے کا امر کیا۔

صدقات سے تزکیہ کے ساتھ ربطِ باہمی اور حسنِ تعلقات وحسنِ معاشرت ومحبوبیت کی تعلیم دی:

وَلَوْاَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَ كَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ.

جہاد پر حوصلہ مندی، صحت وقوتِ بدنی، غنائم سے رزق کا اضافہ یعنی مالِ غنیمت جس میں اقسام اقسام کے اموال آتے تھے:

جعل رزقی تحت ظل رمحی برّالوالدین یزید فی العمر.

یعنی فقط روزہ اور زکوٰۃ ہی کی تعلیم نہیں دی گئی جس میں سے مال ولذات کو اپنے سے دور کیا جاتا ہے بلکہ جہاد کی تعلیم بھی دی گئی جس میں مال حاصل ہوتا ہے مگر عزت وشوکت اور خودداری کے ساتھ، گویا مداخل ومخارج دونوں بتلائے، نہ رہبانیت سکھلائی، پھر جو امور خالص طبعیاتی اور معاشرتی تھے، جیسے کھانا پینا، سونا جاگنا، ان میں مفادِ اخروی کی صورتیں پیدا کر دیں جو محض نیت اور ذرا سے دھیان سے حاصل ہو جاتی ہیں اور کھانا پینا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا، جماعِ زوجہ سب عبادت ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ نیت صحیح رکھی جائے"۔

ڈاڑھی کے ثبوت کے چار طریقے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ داڑھی کا ثبوت قرآن کی کس آیت اور کس حدیث سے ہے؟ اور جواب دینے والے مفصل ومدلل جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں، مگر پھر بھی اطمینان کی شکل پیدا نہیں ہو پاتی، حکیم الاسلامؒ نے اتنے مختصر، جامع اور سہل انداز میں ثبوتِ داڑھی کی چار دلیلیں ذکر فرما دیں، خدا توفیق دے تو عمل کے لئے یہی بہت ہے۔ بے توفیقوں اور کج بحثیوں کے خوگر آیات واحادیث کو بھی اپنی کٹ حجتیوں کے سامنے کچھ نہیں سمجھتے۔

’’اندریں ثبوت اگر انبیاء علیہم السلام کسی چیز کا استحسان ظاہر فرمائیں تو دانش کا تقاضا یہ ہے کہ اسے قبول کیا جائے اور اگر کسی چیز کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھ کر خود اپنا اُسوہ بنالیں تو منہاجِ نبوت کے عقیدت مندوں کا خوش گوار وظیفہ یہی ہونا چاہئے کہ وہ بھی اُسے دستور العمل بنالیں اور اگر یہ مقدس طبقہ کسی چیز کے بارے میں ترغیبی کلمات بھی استعمال فرمائے، یعنی دوسروں کے حق میں بھی اُسے پسند کرے تب تو وہ حرزِ جان بنا لینے کے قابل ہے اور اگر اس سے آگے ہو کر کسی چیز کو وہ اپنی امت کے حق میں ضروری قرار دے تو اس کے لئے تو سرتا پا تعمیل اور اس کے خلاف سرتا پا گریز بن جانا چاہئے۔ ظاہر ہے کسی چیز کی مشروعیت یا خدائی دستور کے جزو ہونے کی یہی چار صورتیں ہوسکتی ہیں کہ وہ بذاتِ خود مستحسن کہی جائے یا اسوۂ پیغمبر ہو یا اس کے بارے میں ترغیبی عنوان اختیار کیے گئے ہوں کہ وہ خود بھی اچھی بتائی گئی ہو، اسوۂ پیغمبر بھی ہو، اس کی ترغیب بھی دی گئی ہو اور اس کا امر بھی کیا گیا ہو۔ تو اس سے زیادہ اس کے شرعی ہونے کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے؟ ڈاڑھی کے مسئلہ میں حسن اتفاق سے یہ چاروں وجوہِ مشروعیت جمع ہیں‘‘۔ (۸۸)

فہمِ حدیث کے بغیر فہمِ قرآن ممکن نہیں

کلامِ رسول کو سمجھے بغیر کلام اللہ کو سمجھنا مشکل ہے، یہ موضوع انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ لکھنے والے جب اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو موضوع کی اہمیت کا حق صرف اس قدر سمجھتے ہیں کہ اس کو پھیلا کر بیان کیا جائے لیکن کسی موضوع کی اہمیت کا تقاضہ تو یہ ہوتا ہے کہ اس کو سمجھا کر بیان کیا جائے خواہ مختصر ہی طور پر کیوں نہ ہو، اسی اصل کی روشنی میں حکیم الاسلامؒ کے اندازِ بیان پر نگاہ ڈالئے کہ اکثر مقامات پر اس کی پرشوکت مثالیں اور پرشکوہ نمونے مل جائیں گے۔ ذیل کا مضمون اس کا شاہد عدل ہے۔

’’اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ پیغمبر کی زبان سے ہر کلامِ ہدایت کسی نہ کسی کیفیت سے صادر ہوتا ہے، یہ کیفیات ظاہر ہے کہ نفسانی نہیں ہوتیں، جو ہر کس و ناکس پر طاری ہوسکتی ہیں، بلکہ روحانی و رحمانی ہوتی ہیں، اسلئے وہ کلام درحقیقت اسی متعلقہ کیفیت میں ڈوبا ہوا اسی سے سرزد ہوتا ہے اور اسی کا مظہر ہوتا ہے گویا وہ کیفیت ہی الفاظ کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے پھر اس کیفیت سے یہ کلام چل کر اسی کیفیت کی طرف لوٹتا بھی ہے، جس سے یہ کیفیت قلب میں اور زیادہ مستحکم ہو کر جڑیں پکڑتی ہے گویا اس کلام کے اول و آخر رحمانی اور روحانی کیفیت چھائی رہتی ہے۔

غور کیا جائے تو اس کلام کی مراد، درحقیقت اسی کیفیت میں چھپی رہتی ہے، کیوں کہ کلام کسی نہ کسی

مقصد کے لئے کیا جاتا ہے اور مقصد کسی نہ کسی باطنی کیفیت کا مقتضا ہوتا ہے، اس لئے قدرتی طور پر کلام کی صحیح مراد کو وہی پا سکتا ہے، جو کسی نہ کسی حد تک اس کیفیت سے آشنا اور اس سے ہم آہنگ ہو۔ عاشق کی مراد کو عشق آشنا ہی پوری طرح جان سکتا ہے، عالم کی مراد کو علم آشنا ہی سمجھ سکتا ہے، صناع کی مراد صنعت آشنا ہی پوری طرح پا سکتا ہے، اس لئے کلامِ رب کو رب آشنا ہی کسی نہ کسی حد تک پا سکتا ہے، جو ربانی کیفیات سے کسی حد تک مانوس ہو، ورنہ بے کیفیت اور نا آشنا ممکن ہے کہ کلام کے لغوی مفہوم اور معنی اول تک پہنچ جائے لیکن متکلم کے صحیح منشاء و مراد تک اس کیفیت سے مانوس ہوئے بغیر پہنچنا عادت کے خلاف ہے، چہ جائے کہ وہ لوگ جو ان کیفیات کی متضاد اور ضد کیفیات سے مانوس اور ان میں غرق ہوں تو عادۃً وہ مراد کو سمجھانے سے بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے، جس سے ادراکِ مراد کا حق ادا ہو جائے اور اگر اتفاقاً وہ الفاظ کی مدد سے کسی حد تک مرادِ حق پر مطلع بھی ہو جائیں تو اس کیفیت کے بغیر اس میں مبصر نہیں بن سکتے، جس سے اسکی مخفی حقائق ان پر کھل سکیں اور ان حقائق میں مضمر شدہ احوال ان پر طاری ہو سکیں، جن سے حقیقی معرفت کا دروازہ کھلتا ہے اور آدمی مبصر بن جاتا ہے''۔

اہل سنت والجماعت کا معتدل مسلک

اہل سنت والجماعت کا صحیح تعارف یہ ہے کہ اس کے عقائد، اعمال، اخلاقیات اور جملہ شعبہ جاتِ زندگی میں توازن ملحوظ ہے، آپ اسے مسلکِ اعتدال کہہ سکتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں اس کی کچھ وضاحت فرمائی گئی ہے۔

''مگر اہل سنت والجماعت نے (جو حقیقتاً اس شریعتِ حقہ کے اصلی مفسر اور شارح ہیں جو خالق ومخلوق اور حادث وقدیم کا درمیانی رشتہ بتلانے اور اسے جوڑنے اور مضبوط کرنے کے لئے آئے ہیں) اس اکہری اور ادھوری راہ میں قدم نہیں رکھا۔ اگر وہ بھی اہل بدع کی طرح واجب وممکن کو غیر مربوط چھوڑ کر بعض کے الگ الگ احکام بتلا دینے پر قناعت کر لیتے اور اس درمیانی نسبت کو نہ کھولتے تو وہ اپنے منصب سے نازل ہو جاتے اور شریعتِ حقہ کی تفسیر وتشریح اور توضیح وتلویح کا کوئی حق ادا نہ کر سکتے۔ اس لئے کسی پیچیدگی کی پرواہ کئے بغیر مردانہ وار انہوں نے اس نازک مرحلہ کی طرف قدم بڑھایا اور اس درمیانی اور معتدل رشتہ کو واشگاف کر دیا جو حقیقتاً بندہ اور خدا کے درمیان قائم ہے اور درحقیقت مسئلہ تقدیر کا حقیقی موضوع ہے۔ انہوں نے نہ تو صفاتِ خالق کو ثابت کرتے وقت صفاتِ عبد کی نفی کی اور نہ صفاتِ عبد کو ثابت کرتے ہوئے صفاتِ خالق کی نفی کی کہ پورے جہانوں کی نفی ان کے سر پڑتی۔ بلکہ انہوں نے دونوں کی صفات کو اپنی اپنی جگہ مان

کر پھر تنزیہہِ حق کا حق ادا کیا ہے جو اہل بدع کے علی الرغم ان کے اخلاص للہ اور اتباع انبیاء اللہ کا ثمرہ ہے جس سے وہ کامیابی کی منزل پر پہنچ گئے۔

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد دست بر پائے کبوتر زد وناگاہ رسد" (۸۹)

علم غیب کی تعریف

علم غیب حق تعالیٰ کی صفت خاص ہے، عام مخلوق کو تو کجا خاصانِ خاص انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بھی حاصل نہیں، حتی کہ نبی آخرالزماں ﷺ کو بھی حاصل نہیں، جس کا اعلان خود آپ کی زبانِ مبارک سے کرایا گیا۔ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ. کہ غیب کے کسی قسم، کسی نوع، کسی جزء کا علم بھی مجھے نہیں ہے۔ صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین نے دیگر سینکڑوں اختلافات کے باوجود یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں مگر بدقسمتی سے ایک فرقۂ مبتدع جو احداث فی الدین کو دین سمجھتا ہے اور اس کی اشاعت کو اپنا عظیم الشان کارنامہ۔ اس سلسلے میں کھلے ضلال میں مبتلا ہے۔ علم غیب کسے کہتے ہیں ذرا اس کی تعریف تو سنئے:

"علم غیب وہ ہے جو بلا واسطۂ اسباب ہو، جب بھی وہ بالواسطہ آئے گا تو وہ حقیقی معنی میں علم غیب نہ ہوگا بلکہ علم غیب کی ہو بہو حکایت اور من وعن نقل ہوگی اور سب جانتے ہیں کہ علم کے عادی وسائل میں سے وحیٔ الٰہی بھی ایک وسیلہ ہے بلکہ اولین وسیلہ ہے، جس کے توسط سے عالم بشریت کے علم کی ابتداء ہوتی ہے، کشف ہو یا الہام، فراست ہو یا وجدان، سب بعد کے وسائل اور وحی کے دستِ نگر توابع میں سے ہیں، خود اصل نہیں، اس لئے عادتاً حصولِ علم کا سب سے پہلا، سب سے زیادہ قطعی اور یقینی وسیلہ یہی وحیٔ الٰہی ہے۔ جسکے ذریعہ سے انسان علم سے آشنا ہو کر عالم کہلاتا ہے۔

پس جیسے سمع وبصر، عقل وخرد، حدس وتجربہ، کشف والہام، علم کے کھلے اور چھپے ذرائع ہیں جن کے راستہ سے عالم الغیب والشھادۃ اس ظلوم وجہول انسان کو علم سے سرفراز فرماتا ہے، ایسے ہی وحی بھی ایک رفیع المنزلت اور لطیف ترین وسیلۂ علم ہے، جو صرف انبیاء علیہم السلام جیسے لطیف الاجسام، لطیف الارواح، لطیف القلوب اور لطیف الاسرار مقدس گروہ کو عطا ہوتا ہے اور وہ اس کے واسطہ سے علومِ الٰہیہ، مرضیاتِ خداوندی اور شرائعِ ربانی کو جذب کرتے ہیں، یا ان کی پاکیزہ ارواح غیب کے عالم کی طرف رخ کرتی ہیں، جو عام نگاہوں سے اوجھل اور تمام علوم وکمالات کا سرچشمہ ہے۔ وہاں انھیں حقائق اور ملکوت کا روحانی مشاہدہ ہوتا ہے اور وہ ان سے علم اخذ کر کے دنیا کو دیتی ہیں، جس سے دنیا میں روشنی پھیلتی ہے اور جن وبشر

عالم کہلائے جانے کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ وحی کے سوا دوسرے وسائل کسبی ہیں، جنھیں مشق ومحنت اور ریاضت ومجاہدہ سے حاصل کر کے حصولِ علم کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے، لیکن وحیٔ الٰہی نبوت کے بغیر نہیں ہوتی اور نبوت محض ایک موہبتِ الٰہی ہے جو بہ انتخابِ خداوندی منتخب افرادِ بنی آدم کو دی جاتی ہے، اس لئے وحی بھی ایک موہبہ رُبانی ہے جو بلا کسب ومجاہدہ محض عطاءِ الٰہی سے مخصوص نفوسِ قدسیہ کو دی جاتی ہے۔ **اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَه.**‘‘(۹۰)

ایجاد اور اجتہاد

ایجاد اور اجتہاد لفظی اعتبار سے ہم وزن سے ہیں مگر معنوی لحاظ سے دونوں میں فرق ہے۔ ذیل میں اس فرق کو ملاحظہ فرمایئے:

’’مگر ہاں جس طرح تکوین کے ان منظّم اور مرتب مادّوں اور علوی وسفلی ذخیروں سے بواسطہ فکر وتدبر نئے نئے عجائبات کا انکشاف کیا جاسکتا ہے اور ان کی چھپی ہوئی طاقتوں کا سراغ لگا کر تمدن کے نئے نئے کارنامے دنیا کو دکھائے جاسکتے ہیں جن کی کوئی حد نہیں کہ **لا تنقضی غرائبه** اسی طرح تشریح کے منظّم احکام ومسائل اور قواعد وکلیات کے مخفی علوم واسرار کا پتہ لگا کر ان سے تدیّن کے نئے نئے فروعی مسائل، لطائف وظرائف اور حقائق ومعارف پیدا کئے جاسکتے ہیں کہ قرآن کی شان بھی **لا تنقضی عجائبه** وارد ہوئی ہے۔ اس تکوینی انکشاف کا نام ایجاد ہے اور تشریعی استخراج کا نام اجتہاد ہے۔ نہ ایجاد کی کوئی حد ہے نہ اجتہاد کی۔ یہ الگ بات ہے کہ جیسے ایجادات ہر زمانہ کی ذہنیت اور ضرورت کے مطابق ہوتی ہیں اور فطرۃً موجدوں کی طبیعتیں ان ہی ایجادوں کی طرف چلتی ہیں جن کی زمانہ کو ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو طبائع کی یہ دوڑ بھی ختم ہو جاتی ہے، آگے صرف ان ایجادات سے فائدہ اٹھانا رہ جاتا ہے۔

ایسے ہی اجتہادات کا رنگ بھی ہر دور کی علمی ذہنیت اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ مجتہدوں کے قلوب فطرۃً چلتے ہی اس استخراج کی طرف ہیں جس کی اس قرن کو ضرورت ہوتی ہے۔ پس تکمیل ضرورت کے بعد اجتہاد کا وہ دور نہیں لوٹتا جو آچکتا ہے۔ اب صرف اس سے نفع اٹھانے کا موقع باقی رہ جاتا ہے‘‘۔(۹۱)

امت میں اگر اجتہاد ضروری ہے تو تقلید بھی ضروری ہے

ذیل کے اقتباس میں اجتہاد کے ساتھ تقلید کی ضرورت اور تقلید کے ثبوتِ شرعی پر ایک مختصر آیتِ کریمہ سے اتنا زبردست استدلال جو لطیف بھی اور دقیق بھی عام انسان تو کیا اکثر پڑھے لکھے حضرات کا

ذہن بھی جلدی سے اس جانب منتقل نہیں ہوتا۔ ملاحظہ فرمایئے:

''بہرحال جب یہ واضح ہو گیا کہ دین میں نص نہ ہونے یا متعین الوجہ نہ ہونے یا غیر معلول نہ ہونے کی صورت میں اجتہاد و قیاس جائز ہے اور اس کے لئے افراد من اللہ منتخب اور مخصوص ہوتے ہیں، ہر ایک اس کا اہل نہیں اور وہ بتصدیق پیغمبر حجتِ شرعیہ ہے تو ظاہر ہے کہ اہل اجتہاد یعنی غیر مجتہد کے لئے بجز اس کے چارۂ کار ہی کیا ہے کہ اس اجتہاد کی متابعت اور پیروی کرے اور جب خود علم نہیں رکھتا تو علم والے کی اتباع کرے، خود ان مخفی دلائل اور علل تک نہیں پہنچ سکتا تو دانایانِ اسرار و علل کے سامنے جھک جائے۔ کیونکہ مرتبے علم کے دو ہی ہیں یا خود سمجھنا یا فہمیدہ لوگوں کی اطاعت کرنا۔ چنانچہ یہی دو مرتبے بلا کسی واسطے کے قرآن نے ہدایت کے رکھے ہیں، قیامت کے دن کفار اسی پر افسوس کریں گے کہ ہم نے دین کو نہ خود اپنی عقل سے سمجھا اور نہ عقل والوں کی سنی۔

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحَابِ السَّعِيْرِo

ترجمہ: اور کہیں گے کفار اے کاش! ہم سنتے یا عقل سے سمجھتے تو ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے''۔ (۹۲)

مسئلۂ کفاءت کا ماخذ

کفاءت یا کفو ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں عام لوگ نہیں پڑھے بھی لکھے بھی الجھے پھرتے ہیں۔ فقہاء نے بھی اس پر خاصی بحث کی ہے کہ کفو برادری کا نام ہے یا برابری کا؟ حدیث میں **فاظفر بذات الدین** کا لفظ آیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین داری میں کفو مقصود ہے۔ اس اہم مسئلہ کو ذرا حکیم الاسلامؒ کی زبان سے بھی سنئے:

''بہرحال یہ تو واضح ہو گیا کہ نسب کی کرامت نہ دنیا میں فخر و تعلّی کے لئے ہے نہ آخرت میں مدارِ نجات سمجھنے کے لئے، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جب کسی شخص کو کوئی خلقی کرامت دیدی جائے تو ان احاد افراد امت کو چھوڑ کر جن میں نفس کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی باقی نہ رہا ہو، عام طبائع میں ایسے فضائل سے گونہ وقار و خودداری کا مضمون پھر بھی باقی رہتا ہے جو یقیناً تکبر نہیں ہے بلکہ ایک غیر اختیاری طبعی جذبہ ہے جو محض انعامِ خداوندی کی قدر و منزلت سے قلوب میں برپا ہوتا ہے۔

پس اگر اسلام کی فطری شریعت طبعی جذبات کو پامال کرنے کے بجائے اعتدال کے ساتھ ان کا احترام کرنا چاہتی ہے تو اس کرامتِ نسب سے پیدا شدہ جذبۂ وقار کا مصرف اس نے کیا تجویز کیا ہے جس سے یہ

جذبہ پامال نہ ہونے پائے۔ سواس کی رعایت بھی فی الجملہ اسی آیت میں فرمائی گئی ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اس نسبی وقار وخودداری کا کوئی ادنیٰ اعتبار اجرائے احکام شرعیہ میں تو نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں نسب و غیرنسب ایک درجہ میں ہیں، نہ مقبولیت عنداللہ میں اس کا کوئی اثر ہے کہ وہاں نسیب وغیرنسیب کے لئے ذریعہ کرامت صرف تقویٰ ہے۔ غرض معاملہ مع اللہ میں نسبی وقار کا کچھ نہیں اٹھتا، ہاں معاملہ مع الخلق میں کسی حدتک اس کا اعتبار کیا جانا طبعی رفتار کے خلاف بھی نہیں ہے، مگر معاملاتِ عامہ میں نہیں بلکہ صرف اسی معاملہ میں جہاں انسانوں کے کسی طبعی مگر مستحکم میل ملاپ کا قصہ درپیش ہواوران کے باہمی عادات وطبائع کی ایک ایسی محکم آمیزش ہورہی ہو جس سے عمر بھر کے لئے ان کے معاملات ومنافع مشترک ہوجائیں، یگانگت اس درجہ پر کرائی جارہی ہو کہ بیگانگی کا نشان نہ رہے، توافقِ طبائع اس قسم کا مطلوب ہو کہ ایک کے لئے دوسرا باعثِ تشویش خاطر ہونے کی جگہ انتہائی مودّت ورحمت اور تسکینِ خاطر کا سبب ہوجائے اور ظاہر ہے کہ ایسا معاملہ ایک نکاح وازدواج ہی کا معاملہ ہے"۔ (۹۳)

جزئیات کا حسن وقبح کلیات کے تابع ہے

جزئیات کا حسن وقبح فی نفسہٖ ہوتا ہے یا کلیات کے تابع ہے؟ ایک اصولی اور علمی بحث ہے۔ حکیم الاسلامؒ نے اس بحث کو اتنے آسان انداز میں بیان فرمایا ہے کہ گویا کہ لوہے کو پانی بنادیا ہے۔

"وجہ یہ ہے کہ جزئیات یا فرعیات کسی بھی دائرہ کی ہوں اور کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہوں خودان کا حسن وقبح بذاتہ کوئی معیاری حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ان کی خوبی وخرابی کا معیار درحقیقت وہ کلیات یا اصول ہوتے ہیں جن کے سلسلہ سے وہ پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص نماز کے شرعی فضائل بیان کرے، مگر خود نماز کو ذکراللہ اور قربِ الٰہی کے بجائے پہلوانی کے نقطۂ نظر سے دیکھ کر ایک جسمانی ورزش قراردے تو اگرچہ یہ فضائل خود اپنی جگہ کتنے ہی صحیح ہوں مگر اس خاص نقطۂ نظر کے ماتحت غلط ہوجائیں گے۔ اس لئے بات صحیح ہونے کے باوجود اصولاً کذبِ محض اور خلافِ واقعہ ہوجائے گی۔ یا اگر ایک شخص حج کے شرعی محاسن پر تقریر کرے مگر خود حج کو سیاسی نقطۂ نظر سے محض ایک بین الاقوامی کانفرنس تصور کرتا ہو جو تبادلۂ افکار یا مظاہرۂ اجتماعیت کے لئے منعقد کی گئی ہو، نہ کہ مظاہرۂ عشق ومحبتِ خداوندی کے لئے، تو یہ سارے فضائل اس نقطۂ نظر سے غلط ٹھہر جائیں گے، اگرچہ خود یہ فضائل صحیح اور منصوص بھی ہوں، کیونکہ زاویۂ نظر بدل جانے سے ان کا استعمال بے محل ہوگیا اور وہ کذبِ محض ہوگئے"۔

حضرت حسینؓ پر کسی الزام کی گنجائش نہیں

شہادتِ حسینؓ کے واقعہ میں بہت سے حقائق اور بہت سے پہلو شرعی نقطۂ نظر سے بڑے نازک ہیں۔ بعض حضرات نے انتہائی غلو سے کام لیا ہے۔ بعض نے بہت ہلکا کرنے کی کوشش کی جب کہ ایک تیسری جماعت نے کسی کو بھی نہیں بخشا۔ یہ شہادت حسین سے بھی بڑا ظلم ہے۔ اس موضوع پر حکیم الاسلامؒ کی یہ عالمانہ بحث ملاحظہ فرمائیے:

''بہر حال حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اس اقدام پر جو بمقابلہ یزید مدینہ سے کربلا کے میدان تک پھیلا ہوا ہے، تاریخ، فقہ، حدیث، کلام اور عقل کے راستہ سے کسی الزام و اتہام کی گنجائش نہیں نکلتی۔

(۱) کیوں کہ اول تو یزید کی بیعت ہی اجماعی نہ تھی، متعدد گروہوں، خطوں اور منطقوں نے ابتداء ہی سے اسے قبول نہ کیا تھا۔ جس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں، اس لئے ان پر یزید کی اطاعت ہی واجب نہ تھی کہ خروج و بغاوت کا سوال پیدا ہو۔ خروج و بغاوت کی مذمت اور ممانعت التزامِ بیعت کے بعد ہے اور جب کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے دوسرے بہت سے ہم خیال لوگوں نے یزید کی بیعت ہی قبول نہ کی تھی تو ان پر اس کی اطاعت ہی واجب نہ تھی کہ وہ خروج و بغاوت کا محل قرار پائیں اور اس کی رُو سے ان پر معاذ اللہ کسی عصیان کا اتہام لگایا جائے۔

(۲) اور پھر بھی اگر اس اقدام کو خروج و بغاوت ہی فرض کر لیا جائے تو جب کہ وہ امیر کے متعدی فسق و فجور، اس کی اہانتِ شیوخ و کبراء اور امارتِ صبیان و سفہاء اور ان کی اطاعت کے سبب اضاعتِ دین ہونے کی بناء پر تھی، جن کے ہوتے ہوئے سمع و طاعتِ امیر باقی نہیں رہتی، تب بھی ان پر خروج و بغاوت کا الزام نہیں آسکتا کہ یہ اصلاحی قدم تھا، جو ضروری تھا نہ کہ باغیانہ اقدام۔

(۳) لیکن اگر خواہی نہ خواہی اسے خروج و بغاوت ہی کا لقب دیا جائے تو حسبِ تصریح حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ قرنِ اول کے باغی گروہ کا حکم مجتہدِ مخطی کا ہے، جس پر اسے ایک اجر ملے گا (ازالۃ الخفاء) جو معصیت اور مخالفتِ شریعت پر کبھی نہیں مل سکتا۔ اس لئے اس صورت میں بھی حضرت امام کے اس اقدام کو غیر شرعی اقدام نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے ماجور عند اللہ اور شہیدِ مقبول ہونے میں کسی تأمل کی گنجائش ہو۔

(۴) رہیں وہ احادیث جن میں باوجود امیر کے شدید فسق و فجور کے بھی اس پر خروج و بغاوت کی شدید ممانعت آئی ہے اور ان ہی کی رُو سے عباسی صاحب نے حضرت امام پر الزامِ خروج و بغاوت لگا کر ان

کے اس اقدام کو شرعاً نا جائز باور کرانا چاہا ہے، سوان احادیث کا جواب وہ احادیث ہیں جن کی رو سے امیر کے غیر شرعی یا مخالفِ شریعت اقدامات سے اس کی سمع و طاعت اُٹھ جاتی ہے اور معصیتِ خالق میں طاعتِ مخلوق باقی نہیں رہتی، جس کا حاصل یہ نکلے گا کہ جہاں تک امیر کے ذاتی فسق و فجور کا تعلق ہے وہ کتنا بھی شدید ہو، خروج کی شدید ممانعت ہے اور جہاں تک اس کے متعدی فسق و فجور کا تعلق ہے، جس سے نظامِ دیانت مختل ہونے لگے تو امیر کی مخالفت نہ صرف جائز بلکہ استطاعت کی حد تک ضروری ہے۔ اس لئے ممانعتِ خلاف کی حدیثیں امیر کے ذاتی فسق و فجور پر محمول ہوں گی اور اجازتِ خلاف کی حدیثیں امیر کے متعدی اور جماعتی فسق و فجور پر، جس سے روایات میں کوئی تعارض نہیں رہتا اور نہ ہی حضرت امام ہمام کا یہ اقدام ان میں سے کسی ایک روایت کے خلاف ٹھہرتا ہے، کہ ان کے اس فعل پر نا جائز یا نا مناسب ہونے کی تہمت لگائی جائے، جو ڈوزی کے منہ میں گھس کر عباسی صاحب نے ان پر لگائی ہے۔

اب خلاصۂ بحث یہ نکل آیا کہ یزید کی شنیع حرکات اور اس کے فاسقانہ افعال نصوصِ فقہیہ اور نصوصِ تاریخیہ سے واضح ہیں۔ جن کی رو سے فسقِ یزید کا مسئلہ محض تاریخی نظریہ نہیں رہتا جسے مؤرخین نے محض تاریخی ریسرچ کے طور پر قلم بند کر لیا ہو، بلکہ حدیث و فقہ کی رو سے ایک عقیدہ ثابت ہوتا ہے، جس کی بنیادیں کتاب و سنت میں موجود اور ان کی تفصیلات علماء اور اتقیاء کے کلاموں میں محفوظ ہیں۔ اسی لئے اسے نقل کرنے پر حکم لگانے اور اسے ثابت کرنے کیلئے محض مؤرخ نہیں بلکہ محدثین فقہاء اور متکلمین آگے آئے اور انھوں نے اس مسئلہ پر کتاب و سنت کے اشارات اور فقہ و کلام کی تصریحات سے احکام مرتب کیے جس سے اس کے عقیدہ ہونے کی شان نمایاں ہوئی''۔ (۹۴)

سلسلۂ تشبہ کے درجات

حکیم الاسلامؒ کی معرکۃ الآراء کتاب اسلامی تحریک وتمدن میں **تشبّہ بالاغیار یا تشبّہ بالکفار** پر بھی بحث آئی ہے اور اس سلسلہ میں تسلی بخش گفتگو آپ کی ایک دوسری کتاب ''**التشبّہ فی الاسلام**'' میں کی گئی ہے۔ اول الذکر کتاب کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''یہاں سے سلسلۂ تشبہ میں دو درجے پیدا ہوتے ہیں، ایک درجہ تحصیلِ فضائل کا ہے جو تشبہ بالانبیاء سے حاصل ہوتا ہے اور دوسرا درجہ تخلیۂ رذائل کا ہے جو ترکِ تشبہ بالکفار سے پیدا ہوتا ہے۔ گویا پہلا سلسلہ ماموراتِ کا ہے اور دوسرا محظوراتِ شرعیہ کا، یا پہلا حصہ ماذونات کا ہے اور دوسرا ممنوعات کا۔ پھر ان دونوں درجوں میں دو دو مرتبے پیدا ہوتے ہیں، عزیمت اور رخصت۔

کیوں کہ سلسلۂ ماموارت میں انبیاء علیہم السلام اپنے بعد دو چیزیں چھوڑتے ہیں، ایک اپنا ذاتی اسوہ اور عمل اور ایک اصول یا قانونِ عام۔ ان کا خصوصی عمل تو عزائم سے پرُ ہونے کے سبب نہایت ارفع اور بلند پایہ خصوصیات سے لبریز ہوتا ہے جس کی پیروی واتباع پر ہر ایک جری نہیں بن سکتا، معدود افرادِ امت ہی کو اس کی متابعت نصیب ہوتی ہے لیکن اصول وقانون بوجہ اپنی کلیّۃ ووسعت اور ہمہ گیری اور مباحاتِ اصلیہ کے ہزاروں جزئیات اپنے اندر پنہاں رکھنے کے سبب سہل العمل ہوتا ہے، اس لئے امت کے حق میں جو دشواریاں اور متاعب اس ذاتی اسوہ کی پیروی میں پیش آسکتی ہیں، وہ قانونِ عام میں آکر مرتفع ہوجاتی ہیں اور خواص وعوام کے لئے حسبِ استعداد جائزات پر عمل پیرا ہونے کے لئے ہزاروں متفاوت المراتب جزئیات کا ذخیرہ میسر آجاتا ہے۔

پس تشبہ بالاخیار کا اعلیٰ اور انتہائی مقام یعنی عزیمت تو یہ ہے کہ لباس اس اخلاقی معیار پر منطبق ہوتے ہوتے ٹھیک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شخصی اور غالب العادت لباس پر منطبق ہوجائے اور گویا عینی مشابہت نصیب ہوجائے اور ابتدائی مقام یعنی مقامِ رخصت یہ ہے کہ ممنوعاتِ لباس سے بچ کر ان جائز لباسوں پر اکتفا کیا جائے جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً یا جزئی طور پر پسند فرمایا اور اجازت دی، یا کلی طور پر اباحتِ اصلیہ کے تحت میں چھوڑ دیا ہے کہ یہ بھی نوعی اور کلی طور پر آپ ہی کے ساتھ تشبہ کرنا ہے۔ اگر جائزاتِ مستعملہ میں نہیں تو جائزات مطلقہ میں ہے، جن کا ایک فرد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی لباس بھی ہے اور جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی لباس کو ذاتِ اقدس کے ساتھ استعمال کی نسبت ہے اسی طرح اجازت فرمودہ یا مباح کردہ لباسوں کو آپؐ کے ساتھ حکم اور علم کی نسبت ہے اور اس انتساب ہی کا نام تشبہ ہے، خواہ وہ تصویراً ہو یا تصوراً اور اس طرح اس مشابہتِ نبوی کے یہ دو مرتبے مشابہتِ عینی اور مشابہتِ حکمی کے ساتھ بھی تعبیر کئے جاسکتے ہیں۔

بہر حال مباحاتِ شرعیہ پر عمل کرکے بھی ایک انسان دین یا اتباعِ سنت یا تشبہ بالانبیاء کے دائرہ سے نہیں نکل سکتا۔ اس لئے یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ آج اہل لطافت میں سے بھی کوئی فرد حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لباس میں تشبہ کا شرف نہیں رکھتا۔ کون ہے کہ آج حلّہ استعمال کررہا ہے اور کب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ لباس استعمال فرمائے ہیں جو آج طبقۂ خواص میں استعمال کئے جارہے ہیں؟ بلاشبہ یہ خصوصی اوضاع ان ہیئاتِ کذائیہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استعمال میں نہیں آئیں لیکن اسی طرح آپ کی ممانعت کے تحت میں بھی نہیں آئیں، اور ان کو اگر آپ سے استعمال کی نسبت حاصل نہیں ہے تو

قواعدِ کلیہ کے تحت میں اجازت واباحت کی نسبت حاصل ہے اور یہ تمام اوضاع اس وقت تک اباحتِ اصلیہ کے تحت میں چھوڑ دی گئی ہیں جب تک کہ کوئی دشمن اسلام قوم ان کو اپنا خصوصی شعار نہ ٹھہرا لے یا اس کے ساتھ ان اوضاع کو کوئی خصوصی نسبت نہ حاصل ہو جائے''۔(۹۵)

شرعیات اور تاثیرِ ظاہر

ظاہری اعمال، لباس اور شکل وصورت کا اثر لازمی طور پر باطن پر بھی پڑتا ہے، اس ایمان افروز مضمون کو آیات واحادیث کی روشنی میں حکیم الاسلامؒ کی زبان سے سنئے:

''خیر کے سلسلہ میں شریعت نے تصریحات کی ہیں کہ جوارح کے اعمال، لباس کی انواع اور کپڑوں کی اقسام، ایمان کی کیفیات پر زیادتی اور کمی کا اثر ڈالتی ہیں۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ صوف کا پہننا (جو محض ایک ظاہری فعل ہے) ایمان کی حلاوت پیدا کر دیتا ہے جو محض ایک باطنی کیفیت ہے۔

من سره ان یجد حلاوة الایمان فلیلبس الصوف.

''جسے ایمان کی حلاوت پسند ہو اسے چاہئے کہ صوف پہنے۔''

حدیث میں فرمایا گیا کہ عمامہ باندھنے سے حلم اور وقار کی کیفیت قلب میں پیدا ہو جاتی ہے۔

اعتموا تزدادوا حلمًا.

''عمامہ باندھو تا کہ تم میں حلم بڑھ جائے۔''

حدیث میں ہے کہ نماز میں صفیں سیدھی رکھو گے تو قلوب میں بھی راستی واستقامت پیدا ہو جائے گی ورنہ کجی واختلاف۔

استووا لتستوا قلوبکم ولا تختلفوا فتختلف قلوبکم.

''(صفوفِ صلوٰۃ میں) سیدھے رہو تو تمہارے قلوب سیدھے رہیں گے، آگے پیچھے مت رہو ورنہ قلوب بھی اسی طرح آگے پیچھے اور متفرق ہو جائیں گے۔

پھر جس طرح یہ اعمالِ خیر اپنی تاثیرات سے خیر کی حقیقت قلوب تک پہنچا دیتے ہیں اسی طرح اعمالِ شر، شر کی حقیقتیں قلب میں پیدا کر دیتے ہیں۔

قرآن کریم نے خبر دی کہ بداعمال لوگوں کے قلوب میں بدعملی کے سبب ایک زنگ بیٹھ جاتا ہے، جو قبولِ حق کی استعداد کو آخر کار فنا کر دیتا ہے، جس کو کہیں طَبع سے کہیں رَین سے کہیں خَتم سے کہیں وَقر سے کہیں

کناؔن سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ایک جگہ فرمایا:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَo

''ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمالِ بد کا زنگ بیٹھ گیا ہے۔''

کہیں فرمایا:

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ.

''بلکہ خدا نے ان کے قلوب پر مہر کردی ان کے کافرانہ اعمال کے سبب۔''

اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا:

اياكم والمحقرات من الذنوب فان الذنب على الذنب يوقد على صاحبه جحيما ضخمته.

''چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بہت بچو کیوں کہ گناہ پر گناہ کرتے رہنا اس گناہگار پر آگ روشن کردیتا ہے۔

یعنی صغائر سے کبائر پر جرأت ہوتی ہے اور کبائر سے استخفافِ معاصی اور کفر پر اور یہی آگ کا پیش خیمہ ہے۔مجاہد کہتے ہیں:

القلب كالكف فاذا اذنب انقبض واذا اذنب ذنبًا اٰخرًا انقبض ثم يطبع عليه وهو الرين.

''قلب مثل کفِ دست کے کھلا ہوا ہے یعنی منشرح ہے۔جب گناہ کیا جاتا ہے تو سکڑ جاتا ہے پھر کیا جائے تو اور سکڑ جاتا ہے یہاں تک کہ بالآخر اس پر مہر کردی جاتی ہے اور یہی زنگ ہے یعنی قبولِ حق کی استعداد بھی باقی نہیں رہتی۔''

اس لئے حدیث ابی ہریرہؓ میں فرمایا گیا کہ:

اذا اذنب الانسان حصلت فى قلبه نقطة سوداء حتى يسودالقلب.

جب آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب میں ایک سیاہ نقطہ پیدا ہوجاتا ہے۔جوں جوں وہ عملِ بد کرتا رہتا ہے یہ ظلماتی نقطہ بھی بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ آخرکار قلب سیاہ پڑ جاتا ہے۔گناہ کے دواعی قوی ہوجاتے ہیں اور توبہ کی توفیق مسلوب۔

بہرحال جس طرح پہلی نوع کی احادیث نے قلوب میں ایمانی کیفیات، ایمانی اخلاق راسخ ہونے کا

سبب اعمال کو بتایا تھا، اسی طرح ان آیات واحادیث نے قلوب کے زنگ کفر اور بے توفیقی کا سبب بھی انسانی عمل اور کسب ہی کو بتایا ہے اور ان دونوں قسم کے سلسلوں سے شریعتِ اسلام کا یہ دعویٰ بالکل پختہ اور مضبوط ہو جاتا ہے کہ ظاہری عمل کا اثر قلب پر پڑتا ہے‘‘۔(۹۶)

ہر امت کی ذہنیت اپنے نبی کی ذہنیت کا عکس و پرتو ہوتی ہے

ذرا اس مضمون کو کافی توجہ کے ساتھ پڑھئے، لگتا ہے کہ حکیم الاسلامؒ کی زبان سے حکمت قاسمیہ کے سوتے پھوٹ رہے ہیں، ایک ایک جملہ پر سبحان اللہ، ماشاءاللہ برجستہ زبان سے نکلتا ہے۔

’’جس نبی کی جو شان غالب ہوگی اسی شان کا غلبہ اس کی امت میں بھی ہوگا اور جس رنگ کی ذہنیت مقتدائے اعظم کی ہوگی وہی رنگ اس ساری ملت کی ذہنیت میں رچا ہوا ہوگا۔ بالفاظِ دیگر رسولِ برحق اللہ کی جس صفت سے خصوصی استفادہ کرتا ہے اسی صفتِ غالبہ سے وہ اپنی امت کو افادہ بھی کرتا ہے اور امت کی مجموعی ذہنیت نبی کی ذہنیت کا عکس اور پرتو ہوتی ہے۔

بہر حال جرائم اور واردات کے اعداد وشمار لو تو متمدن ممالک کے امن عامہ اور ایثار وہمدردی کی حقیقت کھل جاتی ہے اور حادثات کی گنتی کرو تو سکون وعیش اور زندگیوں کے مامون ومطمئن ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے اور نمایاں ہوتا ہے کہ اگر عیسائی اقوام نے مادی میدانوں پر فتح پا کر روحانیت کو کچلا تھا تو خود انہی کی مادیات نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا، یہی نا کہ قومی اور نسلی خودکشی کی بنیادیں اس طور پر مضبوط کر دیں کہ قوم کو اپنی زندگی قائم کرنا یا اسے برقرار رکھنا ہی دشوار ہو گیا۔

چنانچہ متمدنوں کی عیاشی پسند ذہنیت پہلے تو نکاح ہی پر تیر وتبر لے کر کھڑی ہو گئی، جس سے تولیدِ انسانی کا سلسلہ چلتا تھا جیسا کہ یورپ کی دوشیزہ لڑکیوں کی انجمنوں کے عہد نامے صاف بتلا رہے ہیں، پھر جو نکاح وجود پذیر بھی ہوئے تو وہ اس لئے تولید کا ذریعہ نہیں بن سکے کہ انھیں طلاقوں کی کثرت نے پامال کر دیا۔ پھر طلاقوں کی زد سے نکل گئے تو ان کے تولیدی نتائج کو برتھ کنٹرول (منع حمل) کی تدابیر نے سوخت کر دیا اور جو اس مہلک جال سے بچ کر تولید کا سلسلہ شروع بھی ہوا اور کچھ نفوس ان عیاشیوں کے علی الرغم دنیا میں آ کودے تو ان میں سے لاکھوں کو ملکی بد امنی یعنی قانونی امن کے نتائجِ بد قتل وغارت اور مار دھاڑ کی وارداتوں نے سنبھال لیا۔

پھر جو اس سے بھی بچ نکلے تو لاکھوں کی تعداد میں سائنس کے چمکتے ہوئے آثار کارخانوں، مشینوں،

ریل، موٹر اور برقی لائنوں کی لپیٹ میں آ کر ختم ہو گئے، پھر جو بد بخت اس سے بھی بھاگ نکلے ان میں سے کروڑوں کو تھوڑی ہی تھوڑی مدت کے وقفہ سے محکمۂ جنگ کے قابل قدر سائنسی اسلحہ ڈریڈ ناٹ مشین گنوں، زہریلے گیسوں، خاردار تاروں، رائفلوں کی گولیوں اور ہوائی جہاز کی بے پناہ بم بازیوں کی کھلاریاں نمٹاتی رہتی ہیں اور جوان مہلک جھپٹیوں سے بچ کر دادِ عیش دے بھی رہے ہیں تو وہ اپنی عیاشی کی ہوسنا کیوں اور وسائلِ عیش کے افراط کے سبب طرح طرح کے امراضِ جسمانی و نفسانی، فتورِ دماغ، ضعیف البصری، نامردی، آتشک، فحش کاری، ہجومِ افکار، بے اطمینانی اور خلجان و تشویش کا شکار ہیں جس کا انجام پھر ناکارگی یا خودکشی اور اضافۂ موت ہے اور اگر ان ساری ارضی و سماوی آفات سے نکل کر کچھ لوگ صحیح الدماغ اور قوی البدن نمٹ بھی جاتے ہیں تو وہ رات دن انہی مایۂ ناز ایجادات اور سائنسی موشگافیوں کے پیچ و خم میں گرفتار رہتے ہیں جن کی بدولت انہی کا کنبہ مختلف عنوانوں سے ختم ہوتا رہتا ہے۔ انسانی پیداوار اولاً مسدود ہوتی ہے پھر گھٹتی ہے۔

اس لئے ان ساری تمدنی گہرائیوں اور سائنس کے کارناموں کا حاصل دو لفظوں میں یہ نکلتا ہے کہ قوم کا ایک حصہ مرتا رہتا ہے اور ایک حصہ اسے مارتا رہتا ہے، ایک حصہ چھریاں تیز کرتا ہے اور دوسرا ایک حصہ اپنی گردنیں جھکاتا ہے اور اس طرح نہایت سہولت اور سکون کے ساتھ کشتن و مردن کی گردانیں جاری رہتی ہیں اور خودکشی اور غیر کشی کی روشن مثالیں مہیا ہوتی رہتی ہیں۔

پس اس مارنے اور مرنے یا فساد پھیلا پھیلا کر خود ہی اس کا شکار بننے کا نام تمدن، تہذیب، شائستگی، ایثار، ہمدردی، اخوت، مساوات، عدل، رفاہِ عام وغیرہ کا رکھ لیا گیا ہے۔ ع

برعکس نام نہند زنگی کافور

پس کیا کافرانِ فرنگ کی مادی مساعی کے یہی وہ نمونے ہیں جن کی طرف آج عیسائی قوم نہیں بلکہ ہمارے ہی روشن خیال ہم کو بلا رہے ہیں، کیا یہی وہ روشن نظام ہے جسے قرآن کا مصداق اور خدا کا منشا باور کرایا جا رہا ہے۔ کیا یہی وہ روشن خیالی ہے جسے ہٹانے پر علماء مجرم، صلحاء گردن زدنی اور علماء علمائے سو کہلانے کے مستحق ہوئے ہیں؟ اینٹی ملّا ازم قائم کیا جاتا ہے، مذہب اور اہل مذہب پر آوازے کسے جاتے ہیں، روحانیت کے شعائر کو سرنگوں کیا جاتا ہے، تقویٰ و طہارت اور دنیا میں محتاط زندگی گزارنے کو تنگ دلی کہا جاتا ہے اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اخلاق و اعمال یعنی مذہب کو لغو، مانع ترقی اور مخلِ تمدن بتلایا جاتا ہے، کیوں اور کس بوتے پر؟ اسی سائنسی چمک دمک پر ریجھ کر جس کی حقیقت خود سائنس دانوں کے ہی اعتراف سے کھل چکی ہے''۔ (۹۷)

عالمگیر دین اسلام کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا

اسلام عالمگیر دین ہے اور دیگر الہامی مذاہب ایک جزء کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس حقیقت کو حکیم الاسلامؒ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

''ہاں مگر اسی صورت وحقیقت کی باہمی نسبت اور دنیا میں صرف انہی دو چیزوں کی حکمرانی دیکھتے ہوئے بھی یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ تصویری ایجادات پہلے ساری دنیا کو صورت پسند بنائیں گی اور پھر یہی صورتیں حقیقت کی طرف جھکائیں گی اور ظاہر ہے کہ صورت پسندی کی ذہنیت قومی طور پر مسیحی اقوام کا حصہ ہے، اس لئے بالفاظِ دیگر پہلے ساری دنیا مسیحی اقوام کے تصویری نظام اور ان کے مادی کیریکٹر پر آئے گی، نصرانی حسیات کا غلبۂ عام ہوگا اور عالم میں محض صورت آرائی اور رسم پرستی کا مذہب عامۃً رائج ہوجائے گا۔ ہاں پھر ان ہی صورت پرستیوں کے مادی مضار سے تنگ آکر دنیا حقیقت واصلیت کی تلاش میں سرگرداں ہوگی اور ان تصویری تلبیسات سے غیر معمولی نقصانات اٹھا کر آخر کار انہی صورتوں کے ذریعہ حقیقت آشنا ہوگی اور یہ ثابت ہی ہو چکا ہے کہ حقیقت رسی اور اصلیت دوستی کی ذہنیت قومی طور پر امتِ مسلمہ کا حصہ ہے، اس لئے یہ کہنا ہرگز غیر طبعی نہیں کہ انجام کار یہ ساری اشتراک یافتہ قومیں بیک دم اسلامی اقوام میں مدغم ہوجائیں گی اور کلمۂ واحدہ ان کی شیرازہ بندی کردے گا۔فَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔''(۹۸)

نماز میں عبادت کے پہلو

عبادت اور عبودیت کیا چیز ہے؟ اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان پوری یکسوئی، استحضار اور احسانی کیفیت کے ساتھ نماز میں ہوتا ہے، اس مضمون کو حکیم الاسلامؒ کتنے حکمت ریز ونکتہ انگیز پیرائے میں بیان فرماتے ہیں، دیکھنے کے قابل ہے:

''کیونکہ نماز کے اندر دو ہی بنیادی چیزیں ہیں ایک اذکار جو زبان سے متعلق ہیں اور ایک ہیئات جو اعضائے بدن اور جوارح سے متعلق ہیں۔اذکار میں ثناء(سبحانک اللّٰھم)سے لے کر فاتحہ وسورۃ تک، پھر تسبیحات سے لے کر التحیات وتشہد تک اپنی عبدیت، غلامی اور فدویت، یا اللہ کی عظمت وبرتری اور لامحدود بزرگی کے سواء اور کسی چیز کا بیان ہی نہیں ہوتا اور ہیئات کے لحاظ سے دیکھو تو نیازمندانہ سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، پھر رکوع میں جھکنا اور آخر کار اپنی سب سے زیادہ باعزت چیز ناک اور پیشانی کو اپنے معبود کے سامنے خاک پر ٹیک دینا اور اس کی عزتِ مطلقہ کے سامنے اپنی ذلتِ مطلقہ کا عملاً وہیئۃً اعتراف

کرنا بندگی اور غلامی محض نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ چنانچہ جب کسی کی انتہائی ذلت اور رسوائی ہو جاتی ہے تو کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص کی ناک کٹ گئی، یا فلاں کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا۔

پس جب کہ انسان اپنے ان شریف اور با عزت اعضاء کو حسی طور پر ذلت کے ساتھ خاک میں رگڑنے لگتا ہے اور معنوی طور پر قلب وزبان سے اپنے ذلیل ہونے کا اعتراف کرتا ہے تو اس سے زیادہ اپنے کو ذلیل بنانے کی اس کے پاس اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اور جب اسی حقیقت کا نام عبادت ہے اور یہ صرف نماز میں پائی جاتی ہے تو حقیقی طور پر اگر عبادت کہلائے جانے کی مستحق ہے تو وہ صرف نماز ہی ہو سکتی ہے کہ اس میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جسے عزتِ نفس یا اپنی تنزیہہ وتقدیس کہا جا سکے، یا کسی درجہ میں بھی اسے خدائی کمالات کے ساتھ تشبہّ اور تخلّق بتلایا جا سکے، کہ خدا کی شان کسی کے آگے جھکنا وغیرہ نہیں ہے کہ یہ سب چیزیں احتیاج سے پیدا ہوتی ہیں اور وہاں غنائے مطلق کے سوا کسی ادنیٰ احتیاج کا نشان نہیں۔

غرض نماز ہی ایک چیز نکلتی ہے کہ اس میں ذاتی طور پر تشبہّ بالخالق کا پتہ نہیں ہے بلکہ صرف تذلل للخالق اور صرف اعلانِ عبدیت وفدویت ہے۔ اس لئے صحیح معنی میں عبادت کا لقب دیئے جانے کی مستحق بھی صرف یہ نماز ہی ہو سکتی ہے۔ ہاں پھر جب کہ نماز کا امر خدا کی طرف سے ہے تو امتثالِ امر کی نسبت بھی نماز میں آئی، جس نے حج وزکوٰۃ اور صیام کو بھی عبادت بنا دیا تھا، اس لئے نماز جہاں حقیقی عبادت تھی وہاں اضافی عبادت بھی ثابت ہوئی۔ پس حقیقت وصورت اور اضافت ونسبت ہر ایک کے لحاظ سے اگر عبادت کہلائی جا سکتی ہے تو وہ صرف نماز ہے''۔ (۹۹)

نماز جامع عبادت بھی ہے

نماز میں تمام عبادات کے نمونے ہیں۔ حکیم الاسلامؒ اس جامع عنوان کے تحت حکیمانہ انداز سے روشنی ڈالتے ہیں:

''پھر یہی نہیں کہ وہ اقوامِ عالم کے اذکار وطاعت کا ایک جامع مرقع ہے بلکہ اگر غور کرو تو خود اسلام کی بھی جس قدر عبادات اور طاعات ہیں ان سب کو بھی اس نماز میں لا کر جمع کر دیا گیا ہے۔ روزہ کو دیکھو تو نماز میں موجود، کیوں کہ روزہ کی حقیقت نیتِ صادق کے ساتھ کھانے پینے اور عورتوں سے منتفع ہونے سے بچنا ہے۔ غور کرو تو یہ ساری چیزیں نماز میں لازم ہیں اور ان میں سے ہر ایک چیز مفسدِ صلوٰۃ ہے، بلکہ نماز کا روزہ رمضان کے روزہ سے بھی زیادہ مکمل ہے، کیونکہ روزہ میں تو یہ تین ہی چیزیں ممنوع ہیں لیکن نماز میں ان

تین کے علاوہ سلام وکلام، عورتوں کو چھوڑ دینا، ہنسنا بولنا، چلنا پھرنا اور عام نقل وحرکت سب ہی ممنوع ہے یعنی نماز میں ان سب چیزوں کا بھی روزہ ہوتا ہے اس لئے نماز میں روزہ اپنی انتہائی مکمل شکل کے ساتھ موجود ہے۔

اعتکاف کو لو تو وہ بھی نماز میں مکمل شکل کے ساتھ موجود، کیونکہ اعتکافِ صوم میں ضروریاتِ بشریہ پوری کر لینے، سو جانے، لیٹے رہنے، کھانے پینے کی تو اجازت ہے لیکن نماز میں یہ سب امور ممنوع اور مفسد ِصلوٰۃ ہیں، حتیٰ کہ بحالتِ نماز بیرونِ مسجد تو بجائے خود ہے خود مسجد میں بھی ٹہلنے اور نقل وحرکت کی بھی اجازت نہیں۔اس سے واضح ہے کہ نماز کا اعتکاف روزہ کے اعتکاف سے بھی زیادہ مکمل ہے اور نماز اعتکاف کو بھی جامع اور حاوی نکلی۔

پھر حج کو لو تو وہ بھی نماز میں موجود ہے کیونکہ حج کی حقیقت تعظیم بیت اللہ اور تعظیم حرمِ محترم ہے۔ سو نماز میں تعظیم بیت اللہ کا یہ مقام ہے کہ استقبالِ قبلہ شرط صحتِ صلوٰۃ ہے، کہ اس کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی اور ظاہر ہے کہ استقبالِ قبلہ بھی قبلہ کی اعلیٰ تعظیم ہے، چنانچہ ہیئتِ تعظیم ایسے اوقات میں ممنوع کی گئی ہے جو گندے اور خسیس افعال کے اوقات ہیں جیسے کہ استنجاء کرتے وقت استقبالِ قبلہ ممنوع قرار دیا گیا کہ تعظیمی ہیئت افعالِ تعظیمی کے وقت سزاوار ہے نہ کہ افعالِ خسیسہ کے وقت۔

پھر جس طرح طواف میں بیت اللہ کے سامنے رفعِ یدین کر کے گردشِ طواف شروع کرتے ہیں، اسی طرح نماز میں سمتِ بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر نماز کا دوران شروع کرتے ہوئے تعظیماً رفعِ یدین کرتے ہیں، حتیٰ کہ بنصِ حدیث طواف کو حکم میں نماز کے فرمایا گیا ہے، الاّ یہ کہ اس میں سلام وکلام جائز ہے نماز میں نہیں اور پھر جس طرح طواف طرح طرح کے اذکار وادعیہ سے معمور ہے ایسے ہی نماز بھی ہر طرح کے اذکار وادعیہ سے بھر پور ہے۔ پھر جس طرح حج میں حرمِ محترم کی حدود میں رہ کر تا بحدِ عرفات یادِ حق میں مصروف رہتے ہیں، اسی طرح مسجد کے حرمِ محترم میں رہ کر ذکرِ الٰہی اور نوافل میں مصروف رہتے ہیں اور جس طرح وہاں حرمِ محترم میں شیطان کے آثار کو سنگریزوں سے سنگسار کیا جاتا ہے اسی طرح نماز میں اولاً ہی اعوذ باللہ پڑھ کر اس کے فتنوں سے پناہ مانگی جاتی ہے، اس کے شر کو معنوی ہتھیاروں سے دفع کیا جاتا ہے اور جس طرح حج سے طوافِ وداع کر کے رخصت چاہی جاتی ہے اسی طرح نماز میں سلامِ وداع کر کے دربارِ الٰہی سے رخصت ہوا جاتا ہے۔ غرض حج کی پوری حقیقت اپنے اہم اجزاء کے ساتھ نماز میں بجنسہٖ یا بمثلہٖ موجود ہے، اس لئے نماز حج کی عبادت پر مشتمل نکلی۔

غرض جس طرح سے کہ مسلم انسان جامع ادیان اور جامع حقائقِ عالَم تھا تو اس کے لئے نماز بھی ایسی

ہی جامع ہونی چاہئے تھی کہ جس میں تمام ہی انواعِ عبادت جمع ہوں اور ہر ایک نماز کی ہر ممکن سے ممکن صورت اور محتمل سے محتمل حقیقت موجود ہو۔ اگر نباتات اور درختوں کی نماز قیام تھا اور نباتات کے نمونے خود انسان میں موجود تھے تو ان کی نمازوں کا قیام بھی اس کی نماز میں آنا چاہئے تھا۔ اگر حیوانات کی نمازوں میں رکوع وسجود تھا اور انسان میں خود حیوانات کے ہی سارے نمونے موجود تھے تو اس کی نماز میں رکوع وسجود آنا لازم تھا اور اگر پہاڑوں کی نماز میں قعود، ملائکہ کی نمازوں میں صف بندی، زمین کی نماز میں سکون، سیارات اور سماوات کی نماز میں دوران، جنت ونار کی نماز سوال ودعاء ہے اور ان تمام چیزوں کے نمونے انسان میں موجود ہیں تو ان کی نمازوں کی یہ ساری ہی حقیقتیں اور نمونے اس کی نماز میں بھی موجود ہیں، حتیٰ کہ اگر شیاطین کا کام اضلال وگمراہی پھیلانا اور وسوسہ اندازی تھا اور گویا تکوینی طور پر ان کی اطاعت تھی وہ سرکشی کرنے ہی میں پابندِ تخلیقِ الٰہی رہیں اور اس سے سرموتجاوز نہ کریں، تو انسان اس سے بھی خالی نہیں، کیوں کہ انسان میں یہ شیطان نفسِ امارہ کی صورت میں موجود ہے، جو اسے ہر وقت بغاوت وطغیانی پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ اس کی نماز میں یہ شیطانی کارگزاری بھی موجود ہے یعنی عین صلوٰۃ میں نفسانی تخیلات، وساوس اور طرح طرح کے ہوا جس بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں جو اس کے خشوع وخضوع میں خلل ڈالتے ہیں۔ گویا نفس تخیل آفرینی اور نماز میں خلل اندازی کرنے کی تکوینی طاعت اور تکوینی نماز میں مصروف ہے۔

ظاہر ہے کہ عامۃ الناس کی نماز وساوس وخطرات سے پُر ہی رہتی ہے اور جو بات کہیں بھی یاد نہ آئے وہ لازمی طور پر نماز میں ضرور یاد آجاتی ہے، حتیٰ کہ بعض بزرگوں کا مقولہ سننے میں آیا کہ اگر کسی کی کوئی چیز گم ہو جائے اور یاد نہ آتی ہو تو نماز شروع کردے وہ خوامخواہ بھی یاد آجائے گی۔

بہرحال جیسے مسلم انسان تکوین وتشریع کے لحاظ سے جامع تھا ویسے ہی نماز بھی اسے جامع دی گئی اور اس لئے دی گئی کہ اس ساری کائنات کے ذرہ ذرہ پر اسے فائق بنانا تھا، تاکہ خلافت کا شرف سنبھالنے کے قابل ہو اور یہ فوقیت بغیر عبدیتِ کاملہ کے ناممکن تھی اور عبدیتِ کاملہ اس کے بغیر ناممکن تھی کہ عبادت کی تمام انواع اس کی نماز میں موجود ہوں''۔ (۱۰۰)

فطری اور غیر فطری حکومت کا فرق

قرآن کریم میں اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ. آیا ہے کہ حکومت، حاکمیت، فرماں روائی، قانون سازی سب کچھ اسی کے لئے سزاوار ہے۔ اس موضوع کا احاطہ حکیم الاسلامؒ نے ایک مستقل کتاب میں کیا ہے، ذیل

میں اس کا ایک اہم اقتباس ملاحظہ فرمائیے، جس میں آپ نے اسلامی مملکت کے نظام اور دفعات کا نقشہ قرآن کریم سے پیش کیا ہے۔

''اس اصول پر ہر چیز کی طرح حکومت کی بھی وہ نوع فطری کہلائے گی جس کی طرف طبیعتوں کی سلامتی خود بخود مائل اور بلا کسی بیرونی دباؤ اور خارجی محرکات کے انسانوں کے ضمیر از خود اس کے شائق ہوں اور وہ حکومت غیر فطری کہلائے گی جو تقاضائے درونی کے بجائے بیرونی دباؤ اور فضائی تحریکوں کے تسلط سے دماغوں پر مستولی کردی جائے مگر پھر بھی دماغ کے اندرونی دروازے اس پر بند ہوں اور دلوں کا کوئی منفذ بھی اس کو اندر اُتارنے کے لئے کھلا ہوا نہ ہو، یا ہو تو اصلیت سے بیگانگی اور بے خبری کی وجہ سے عارضی طور پر ہو، جوں ہی وہ عوارض زائل ہوں تو وہی فطری حکومت کے قیام کی خواہش اندروں سے خود بخود اُبھر آئے اور اس ٹھونسی ہوئی جھوٹی خواہش کو دھکا دے کر پرے پھینک دے''۔

ظاہر ہے کہ ایسی فطری اور محبوب القلوب حکومت صرف اسی ذات کی ہوسکتی ہے جو خود بذاتہٖ سب محبوبوں سے بڑھ کر محبوب اور سارے مطلوبوں سے زیادہ مطلوب ہو اور وہ ذات بجز ذاتِ بابرکات حق تعالیٰ کے دوسری نہیں ہوسکتی، جو محبوبِ مطلق اور مطلوبِ حقیقی ہے۔ اس لئے فطری حکومت بھی جو دلوں کی آرزو اور طبیعتوں کا تقاضا ہو، بجز حکومتِ الٰہی کے دوسری نہیں ہوسکتی۔

دستورِ حکومت کے پانچ اساسی ارکان

(۱) **مصدرِ نظام** : یعنی اقتدارِ اعلیٰ اور وہ ذاتِ بابرکات خداوندی ہے کہ زمینوں اور آسمانوں میں اُسی سے نظام کائنات صادر ہو رہا ہے اور اسی کی یکتائی اور حاکمیتِ مطلقہ کی روح دوڑی ہوئی ہے، اُس کے ہی لئے مثلِ اعلیٰ ہے:

وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَ عْلٰى فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ.

(۲) **مرکزِ نظام** : یعنی میزانِ اعلیٰ اور وہ قانونِ قدرت ہے، جس سے نظام کا شجرہ پھوٹتا ہے اور جس کی طرف ہر نظام رجوع کیے ہوئے ہے۔ گویا اسی میں سے نظامات نکلتے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جاتے ہیں، جو کل کائنات پر حاوی اور جس کے عدل سے ہر ہر ذرّہ تھما ہوا ہے کہ کسی حالت میں بھی اس سے انحراف نہیں کرسکتا۔ اگر کرے تو اسی وقت اس کی قیامت قائم ہو جائے یعنی ہر ذرّہ کی بود و نمود نابودگی و گمشدگی اسی قانونِ عدل کے معیار سے ہے:

اَللّٰهُ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ.

(۳) **محورِ نظام** : یعنی ملاءِ اعلیٰ اور وہ آسمانی بادشاہت کی شاہی کونسل ہے، جو ارواحِ مقدسہ پر مشتمل ہے اور اُن میں مباحث ولم زیر بحث آتی ہیں، جنھیں اختصامِ ملاءِ اعلیٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مَا کَانَ لِیَ مِنۡ عِلۡمٍ بِالۡمَلَاِ الۡاَعۡلٰی اِذۡ یَخۡتَصِمُوۡنَ.

(حدیث) **یا محمد فیم یختصم الملأ الاعلیٰ.**

(۴) **مقصدِ نظام** : یعنی مقصدِ اعلیٰ اور وہ آسمانی بادشاہت کا وہ نصب العین ہے جو تربیت و ہدایتِ کائنات پر مشتمل ہے اور حضرت ربِ اعلیٰ کی شانِ ربوبیت اور قدیرِ اعلیٰ کی شانِ ہدایت کو ظاہر کرتا ہے:

سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَیo الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰیo وَالَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰیo

(۵) **منشاءِ نظام** : یعنی مصلحتِ اعلیٰ اور وہ آسمانی بادشاہت کی وہ سرکاری پالیسی اور اندازِ حکومت اور منشاءِ شاہی ہے جس کی رو سے ساری کائنات بحیثیت رعایا اپنے شہنشاہِ حقیقی سے مربوط اور اُس کی گرویدہ ووفادار ہے اور وہ رحمتِ عامہ ہے:

۱۔ **اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی.**

۲۔ **فَقُلۡ رَّبُّکُمۡ ذُوۡرَحۡمَةٍ وَّاسِعَةٍ.**

۳۔ **وَرَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ.**

(حدیث) **ان رحمتی سبقت غضبی.**

پہلی آیت سے رحمت کا احاطہ اور تختِ شاہی سے لے کر ساری کائنات تک کے اوپر استیلاء واضح ہے۔ دوسری آیت سے رحمت کا فی نفسہٖ عموم واضح ہے اور تیسری آیت سے رحمت کے تعلق کا عموم واضح ہے اور چوتھی نص سے رحمت کا غلبہ اور دباؤ ہر چیز پر واضح ہے۔

واجباتِ رعیت کی دو جامع ترین نوعیں

اس اعلیٰ ترین حکومت اور اُس کے اعلیٰ ترین دستورِ حکومت سے رعایا پر جو حقوق اور واجبات عائد ہوتے ہیں ان کا خلاصہ دو چیزیں ہیں۔

(۱) جذبۂ وفاداری

باطنی تسلیم وانقیاد یعنی حلفِ وفاداری کہ ذرہ ذرہ اُس کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے۔

اَفَغَیۡرَ دِیۡنِ اللّٰهِ یَبۡغُوۡنَ وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ.

(۲) عملی اطاعت شعاری

ظاہری طاعت وعبودیت، یعنی اس بادشاہ کے سامنے انتہائی تذلل وعبودیت اور اپنے اپنے متعلقہ قانون پر بحیثیت عبادت عمل۔ كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ.

اس لئے ضابطۂ حکومت کی رو سے آسمانی بادشاہت کے سات رکن ثابت ہوئے جو گویا سبع سنابل یعنی سات خوشے ہیں کہ انہی سات سے سلطنت کی کشت زار کے سارے ہی پھل پھول اُگ رہے ہیں، پانچ حکومت سے متعلق ہیں: اقتدارِ اعلیٰ، میزانِ اعلیٰ، ملاءِ اعلیٰ، مقصدِ اعلیٰ، مصلحتِ اعلیٰ اور دو رعایا سے متعلق ہیں: باطنی انقیاد وتسلیم اور ظاہری طاعت وعبودیت، جن کو شرعی اصطلاح میں ایمان واسلام کہتے ہیں اور اسی کو حدیثِ معاذ میں حقوق کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ پس اس پوری تالیف میں اصولی یا ضمنی عنوانات کے تحت میں جس قدر بھی مظاہر سلطنت وشوکت یا محاکم نظام سلطنت یا مقتضیاتِ سلطنت مذکور ہوئے وہ سب انہی کے آثار ولوازم ہیں اور اُن سب میں انہی سات اصول کی روح کام کر رہی ہے۔ (۱۰۱)

کثرتِ رائے اور قوتِ رائے

طرزِ جمہوری میں کثرتِ رائے کو وزن دیا جاتا ہے، جب کہ اسلامی نظامِ حکومت میں اصل وزن وِژن (Vision) اور قوتِ رائے کا ہوتا ہے۔ حکیم الاسلامؒ نے ذیل میں ان آیاتِ کریمہ کا زیادہ سے زیادہ احاطہ فرمایا ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت میں کثرت رائے کی اہمیت نہیں قوتِ دلیل کی اہمیت ہے۔

”اس سے کثرتِ رائے کو فیصلہ کا بنیادی اصول قرار دیئے جانے کی جڑ کٹ جاتی ہے، یعنی امیر منتخب شوریٰ کی آراء میں رائے شماری کر کے اکثریت واقلیت کا پابند نہ ہوگا بلکہ قوتِ دلیل کا پابند ہوگا۔ پس قوتِ دلیل اساسی چیز ہوگی نہ کہ کثرتِ رائے کہ زیادہ افراد کا کسی ایک جانب آ جانا اسلام میں حق وباطل کے فیصلہ کے لئے کوئی بنیادی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لئے فی نفسہٖ اکثریت کو اسلامی قانون (قرآن حکیم) نے کوئی بھی وقعت نہ دیتے ہوئے حد درجہ غیر اہم ٹھہرایا ہے اور دین وملک اور دیانت وسیاست کے تمام ہی دائروں میں نفس اکثریت کی بے وقعتی اور بے اعتباری کھلے لفظوں میں ظاہر کی ہے۔

قرآن حکیم نے ایک سے زائد جگہوں میں فرمایا:

کثرتِ رائے کی بے وزنی

وَمَآ اَکْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ.

اور اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے گو آپ کا کیسا ہی جی چاہتا ہو۔

وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ.

لیکن اکثر آدمی ایمان نہیں لاتے۔

وَاَکْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ.

اور اُن میں سے اکثر آدمی نہیں سمجھتے۔

وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ.

اور لیکن اکثر آدمی علم نہیں رکھتے۔

وَلٰکِنَّ اَکْثَرَهُمْ یَجْهَلُوْنَ.

لیکن اُن میں زیادہ جہالت کی باتیں کرتے ہیں۔

وَلٰکِنَّ اَکْثَرَهُمْ لِلْحَقِّ کَارِهُوْنَ.

اور اُن میں اکثر آدمی حق بات سے نفرت کرتے ہیں۔

وَاِنَّ اَکْثَرَهُمْ فَاسِقُوْنَ.

اور اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں۔

وَمَا یَتَّبِعُ اَکْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا، وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا.

اور ان میں سے اکثر لوگ صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں اور یقیناً بے اصل خیالات امر حق میں ذرا بھی مفید نہیں۔

وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیَاتِنَا لَغَافِلُوْنَ.

اور حقیقت یہ ہے کہ بہت سے آدمی ہماری عبرتوں سے غافل ہیں۔

وَمَا وَجَدْنَا لِاَکْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ .

اور اکثر لوگوں میں ہم نے وفائے عہد نہ دیکھا۔

وَاَکْثَرُهُمْ لَکَاذِبُوْنَ.

اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں۔

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ.

اور ان سے پہلے بھی اگلے لوگوں میں اکثر گمراہ ہو چکے ہیں۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ.

ان میں سے اکثر لوگوں پر بات ثابت ہو چکی ہے، سو یہ لوگ ایمان نہ لاویں گے۔

وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ.

اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب ثابت ہو گیا ہے۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً م بِاِذْنِ اللّٰهِ.

کثرت سے بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آ گئیں ہیں۔

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ.

اور حنین کے دن بھی جبکہ تم کو اپنے مجمع کی کثرت پر غرور ہو گیا تھا، پھر وہ کثرت کچھ تمہارے کار آمد نہ ہوئی اور تم پر زمین باوجود اپنی فراخی کے تنگی کرنے لگی، پھر تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ.

آپ فرما دیجئے کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں گو تجھ کو ناپاک کی کثرت تعجب میں ڈالتی ہو۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ.

اور دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کہنا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں اور وہ محض بے اصل خیالات پر چلتے ہیں اور بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں۔

پس قرآن نے دنیا کی اکثریت سے ایمان کی نفی کی، عقل کی نفی کی، علم کی نفی کی، محبتِ حق کی نفی کی، تحقیق حق کی نفی کی، تیقظ و بیداری اور فہم سلیم کی نفی کی، وفاءِ عہد کی نفی کی، ہدایت کی نفی کی، ثوابِ آخرت اور جنتی ہونے کی نفی کی، جہاد میں اکثریت کے گھمنڈ پر فتح و نصرت کی نفی کی۔

استعمالی اشیاء میں اکثریت معیارِ حق تو کیا ہوتی مرکزِ باطل ہے، کیوں کہ بلحاظ واقعہ دنیا کی اکثریت حماقت، جہالت، کراہتِ حق، اٹکل کی پیروی، غفلت، بدعہدی، ضلالت، عذابِ اُخروی، جہنم رسیدگی،

شکست خوردگی وغیرہ کا شکار ہے، اس لئے محض عددی اکثریت اسلامی اصول پر کیا قابلِ وقعت قرار پاسکتی تھی کہ اسے حقوق کیلئے فیصلہ کن اصول تسلیم کیا جاتا اور امیر کو اس کا پابند کردیا جاتا‘‘۔(۱۰۲)

مسلک دیوبند

حدیث صحیح میں امت کے بہتّر فرقوں میں بٹ جانے کی جو پیشین گوئی فرمائی گئی وہ بعد میں حرف بہ حرف سامنے آتی چلی گئی۔ عہدِ رسالت کے بعد کیسے کیسے فرقوں اور عقیدوں نے جنم لیا، کیا کیا گمراہیاں اور خرابیاں وجود میں آئیں اور یکے بعد دیگرے پیدا ہورہی ہیں۔ دیارِ ہند میں ابتداء ہی سے بت پرستی کی مختلف شکلیں رائج رہی ہیں، مخلوط معاشرت اور مشترک تہذیب کے اس ملک میں مسلمانوں نے اپنی جہالت اور بے خبری کی وجہ سے دوسری قوموں کے عقائد اور تہذیب کے اثرات قبول کئے اور ان میں ڈھلتے چلے گئے۔ بدعات، خرافات اور توہمات نے عقائد کی جگہ لے لی اور بدنصیبی سے ان گمراہیوں کو دین کی شکل دے کر اہل اسلام میں اس کی تشہیر کے لئے ایک جماعت مسلمانوں سے ہی وجود میں آگئی، جس نے اپنے چہرے پر بے حیائی اور دینی بے حمیتی کا نقاب ڈال کر سادہ لوح مسلمانوں کے عقائد پر نقب زنی کا افسوسناک عمل شروع کردیا۔ نوبت ایں جارسید کہ عبادت اور پرستش کے جو طریقے ہنود کے یہاں جاری تھے انہوں نے بھی ان کی نقالی شروع کردی۔

ادھر ایک بدبخت، شقی اور کافرانہ اعمال میں ڈھلا ہوا شیطان نبوت کا دعویٰ کر بیٹھا، اس کی فتنہ سامانیاں الحذر، اس کی ہرزہ سرائیاں الامان، پھر اس کے دوش بدوش نامعلوم کتنے فرقے اور کتنی گمراہ جماعتیں ہندوستان میں اہل اسلام کے لئے دردِ سر بنتی چلی گئیں۔ ان جاں گسل احوال میں اسلام کی حقیقی تصویر اور کتاب وسنت کی صحیح تفسیر پیش کرنے کے لئے علمائے دیوبند ہی کمربستہ ہوئے اور انہوں نے ہی تعلیم وتبلیغ، درس وتدریس اور زبان وقلم کی صلاحیتوں سے عقائد باطلہ اور بدعات وخرافات کے تار پود بکھیرے، رنگ رنگ کے فرقوں اور عقیدوں کے درمیان یہ امتیاز کرنا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ سادہ لوح مسلمانوں کے بس کا تو تھا نہیں۔ باطل فرقوں نے انہیں باور کرانا شرع کیا کہ ہونہ ہو سب سے زیادہ گمراہ یہی ہیں، عوام شکوک وشبہات کا شکار ہونے لگے، علمائے دیوبند نے اپنی کتابوں میں مسلک دیوبند کا تعارف کروایا اور غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے اپنے عقائد کو بیان کیا۔ آخر میں حکیم الاسلامؒ نے ’’علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج‘‘ کے عنوان سے ایک مدلل اور تحقیقی کتاب تصنیف فرمائی جو اپنے موضوع پر

ایک شاہکار تصنیف ہے۔ عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ کتاب کے مندرجات علمائے دیوبند کے عقائد اور دینی موقف کی وضاحت میں ہیں۔

ذیل میں ایک اقتباس اسی کتاب کا پیش کیا جارہا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''اس لئے علمائے دیوبند کے مسلکی مزاج کا خلاصہ حسبِ منشاءِ حدیث نبوی مختصر الفاظ میں ''اتباعِ سنت بتوسطِ اہل الانابت، یا تعمیلِ دین بہ تربیتِ اہل یقین، یا اتباعِ دین و دیانت بہ تربیتِ اہل السنۃ، یا انصباغِ قلوب بصبغۃ علام الغیوب، یا اتباعِ اوامر اللہ بصحبت اولیاء اللہ'' نکل آتا ہے۔

اب اگر اس مسلک کو کھولنے کے لئے السنۃ اور الجماعۃ کے ان چھوٹے چھوٹے اور مختصر الفاظ کی وسیع ترین معنویت اور تفصیلات کو سامنے لایا جائے تو ان الفاظ میں لایا جاسکتا ہے کہ السنۃ کے تحت روشِ نبوی سے دین کے جس قدر بھی شعبے بنتے چلے گئے وہ سب مسلک علماءِ دیوبند کا جزو ہیں اور الجماعۃ کے تحت ذاتِ نبویؐ کے فیض سے صحابہؓ سے لے کر تابعین، ائمہ مجتہدین اور علماءِ راسخین فی العلم تک ان شعبوں کے لحاظ سے جس قدر بھی عظیم شخصیتیں بنتی چلی گئیں، فرقِ مراتب کے ساتھ ان سب کی عظمت و متابعت اور ادب و احترام اس مسلک کا جوہر ہے اور اس طرح یہ مسلک اپنے اصول اور اپنی متبوع شخصیتوں کے لحاظ سے سنتِ نبویؐ اور ذاتِ نبویؐ کی عظمت و محبت سے پیدا شدہ ایک درخت ہے جس کے ہر پھل پھول میں وہی سنت کا رنگ و بور چا ہوا ہے، جس کی نوعیت یہ ہے کہ کوئی بھی دینی اور اسلامی شعبہ نہیں اور نہ ہوسکتا ہے جو سنتِ نبویؐ کے آثار میں سے نہ ہو، ورنہ اسے دینی ہی کیوں کہا جاتا اور دین کی کوئی بھی دینی اور اولوالامر قسم کی شخصیت ایسی نہیں جو ذاتِ نبویؐ سے مستنیر نہ ہو اور آپ سے نسبت نہ رکھتی ہو، ورنہ اسے دینی شخصیت ہی کیوں کہا جاتا؟

اس لئے اگر کسی مسلک کو منشاءِ نبوت کے مطابق بننا تھا تو وہ اس کے بغیر بن ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام منتسب شعبوں اور حضورؐ سے منسوب تمام ذواتِ قدسیہ کے تعلق کو اپنے مسلک کا رُکن بنائے اور انہی کی روشنی میں آگے بڑھے تاکہ اسے اپنے نبیؐ سے اصولی اور ذاتیاتی دونوں قسم کی صحیح اور جامع نسبت حاصل رہے جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی تعلق مع اللہ کی ساری نسبتوں کے جامع اور ان میں فردِ اکمل ہیں، اس لئے ہر اچھی نسبت جو حضورؐ سے چل کر آئے گی خواہ وہ کسی بھی شعبۂ دین کے راستے سے آئے یا کسی بھی مستند دینی شخصیت کے توسط سے نمایاں ہو، وہ اپنے وابستہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف لے جائے گی اور آپؐ ہی سے وابستہ کرے گی۔

اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو شریعت کے تمام علمی و عملی شعبے اور نہ صرف فروعی شعبے بلکہ دین کی وہ ساری حجتیں جن سے یہ شعبے اور خود شریعت بنی ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی مختلف الانواع نسبتوں کے ثمرات و آثار ہیں۔ مثلاً آپ ؐ کی نسبتِ ایمانی سے عقائد کا شعبہ پیدا ہوا جس کا فنی اور اصطلاحی نام کلام ہے اور آپ ؐ کی نسبتِ اسلامی سے عملی احکام کا شعبہ پیدا ہوا جس کا اصطلاحی نام فقہ ہے، آپ ؐ کی نسبتِ احسانی سے تزکیۂ نفس اور تکمیلِ اخلاق کا شعبہ پیدا ہوا جس کا اصطلاحی نام تصوف ہے۔

آپ ؐ کی نسبتِ اعلاءِ کلمۃ اللہ سے سیاست و جہاد کا شعبہ پیدا ہوا جس کا عنوانی لقب امارت و خلافت ہے۔

آپ ؐ کی نسبتِ استنادی سے سند کے ساتھ نقلِ دین کا شعبہ پیدا ہوا جس کا اصطلاحی نام فنِ روایت واسناد ہے۔

آپ ؐ کی نسبتِ استدلالی سے حجت طلبی اور حجت بیانی کا شعبہ پیدا ہوا جس کا اصطلاحی نام درایت وحکمت ہے۔

آپ ؐ کی نسبتِ اتقائی سے علومِ فراست و معرفت کا شعبہ پیدا ہوا جس کا اصطلاحی نام فنِ حقائق واسرار ہے۔

آپ ؐ کی نسبتِ استقرائی سے کلیاتِ دین اور قواعدِ شرعیہ کا شعبہ پیدا ہوا جس کا اصطلاحی نام فنِ اصول ہے خواہ وہ اصولِ فقہ ہوں یا اصولِ تفسیر و حدیث وغیرہ۔

پس مسلکِ علماءِ دیوبند نہ محض اصول پسندی کا نام ہے اور نہ شخصیت پرستی کا، نہ ان کے یہاں دین اور دینی تربیت کے لئے تنہا لٹریچر کافی ہے نہ تنہا شخصیت، نہ تنہا مطالعہ اور اپنا ذاتی ذہن و فکر کافی ہے اور نہ تنہا شخصیتوں کے اقوال و افعال پر اتکال اور بھروسہ، بلکہ اصول و قانون اور ذوات و شخصیات اور بالفاظِ مختصر لٹریچر بشرطِ معیت و ملازمتِ صدیقین اور با قاعدہ درس و تدریس سے اس مسلک کا مزاج بنا ہے جس میں کسی ایک کے بھی احترام سے قطع نظر جائز نہیں اور جب کہ جامعیت و اعتدال اور احتیاط و میانہ روی ہی مسلک کا جوہر ہے تو دین کے ان تمام شعبوں اور علمی حجتوں میں قرآن و حدیث سے لے کر فقہ و کلام اور فنِ احسان اور فنِ اصول وغیرہ کی چھوٹی جزئی پر جمنا اور حکمت و اعتدال کے ساتھ اسے مشعلِ راہ بنانا ہی اس مسلک کا امتیاز ہے اور ذوات و شخصیات کی لائن میں حضراتِ انبیاء علیہم السلام سے لے کر ائمۂ اجتہاد، علماءِ راسخین، عرفاءِ متقنین، مشائخ عظام، صوفیاءِ کرام اور حکماءِ امت کی ذواتِ قدسیہ تک کے بارے میں افراط و تفریط سے الگ رہ کر ان کی عظمت و متابعت پر قائم رہنا ہی اس مسلک کی امتیازی شان ہے۔

غور کیا جائے تو ان تمام دینی شعبوں کے اصول و قوانین اور علوم و فنون کا خلاصہ دو ہی چیزیں نکلتی ہیں: عقیدہ اور عمل، جس کے لئے شریعت آئی اور ان شعبوں کو وضع کیا، باقی امور یا ان کے مبادی ولوازم ہیں یا آثار و نتائج ہیں جن سے ان فنون میں بحث ہوتی ہے۔ سو عقائد میں بنیادی عقیدہ بلکہ تمام عقائد کی اساس

توحید ہے، جو سارے انبیاء کا دین رہا ہے اور عمل میں سارے اعمال کی جڑ بنیاد اتباعِ سنت اور پیرویٔ اسوۂ حسنہ ہے، باقی تمام طرقِ عمل جو سند کے ساتھ منقول ہوں خواہ وہ پچھلوں کے ہوں یا اگلوں کے، ان سننِ نبویؐ کے مبادی ولوازم یا آثار ونتائج میں سے ہیں، اس لئے اس مسلک میں پہلی اصل توحیدِ خداوندی پر زور دینا ہے، جس کے ساتھ شرک یا موجباتِ شرک جمع نہ ہو سکیں اور کسی بھی غیر اللہ کی اس میں شرکت نہ ہو، لیکن ساتھ ہی تعظیم اہل اللہ اور توقیر اہل فضل وکمال کو اس کے منافی سمجھنا مسلک کا کوئی عنصر نہیں۔

پس نہ توحید میں لگ کر بے باکی اور جسارت اور ذوات کی عظمتوں سے بے نیازی مسلک ہے کہ یہ کمالِ توحید نہیں بلکہ توحید کا غلو یا حقیقت سے خلو، یا اپنی ذات کا علو ہے اور ایسے ہی تعظیمِ شخصیات میں مبالغہ کرنا جس سے توحید میں خلل پڑتا ہو یا اس میں شرک کی آمیزش ہوتی ہو، یہ بھی مسلک نہیں کہ یہ تعظیم نہیں، تعظیم کا غلو اور حقیقت توحید کی تبدیلی سے بنامِ تعظیم توہین ہے۔ پس تعظیم اس حد تک کہ توحید مجروح نہ ہو اور توحید اس درجہ تک کہ تعظیم اہلِ دل متاثر نہ ہو، یہی وہ نقطۂ اعتدال ہے جو مسلکِ علمائے دیو بند ہے''۔ (۱۰۳)

............❖............

مجالس

بہت لگتا ہے جی صحبت میں اُن کی
وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں

بزرگوں کی مجلسیں افادیت کی حامل ہوتی ہیں ان سے بڑی بڑی رہنمائیاں ملتی ہیں، اخلاق وعقیدہ کی اصلاح ہوتی ہے۔حکیم الاسلامؒ کی مجالس جب آپ دیوبند میں موجود ہوتے تو عصر کے بعد بالعموم دولت خانہ ''طیب منزل'' پرآپ کی مجلس ہوتی، جس میں اساتذہ دارالعلوم، طلباء اور واردین وصادرین ذوق وشوق سے شریک ہوتے حکیم الاسلامؒ کی مجلس میں اعمالِ صالحہ کی ترغیب اور ترک معاصی کی تحریک پیدا ہوتی، عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ جب تک اہل مجلس میں سے کوئی سوال نہ کرتا خاموش رہتے اور جب کوئی سوال کرتا تو قرآن وحدیث سے جواب دیتے، کبھی خود بھی ارشاد فرماتے: مجلس ہر طرح کے سوالات اور شبہات کے حکیمانہ جوابات سے علم وعرفان کا گہوارہ بنی رہتی، ضمن میں بزرگوں کے واقعات کا ذکر بھی ہوتا، تفہیم کے لئے مثالیں نہایت برمحل دی جاتیں۔

مولانا حبیب اللہ قاسمی مالک ادارہ تصنیفات اولیاء نے عصر بعد کی تقریباً ۳۸؍مجالس کا ایک مجموعہ ''مجالس حکیم الاسلامؒ'' کے نام سے ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء کے عرصہ میں ۶۷۲؍صفحات پر مشتمل شائع کیا تھا۔

ذیل میں چند اقتباس اسی کتاب سے دیئے جارہے ہیں۔

صبر کی حقیقت اور صابرین کے درجات

سوال : شریعت میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی پریشانی یا مصیبت آئے تو اس پر صبر کیا جائے۔ مثلاً اگر کوئی چیز گم ہوجائے تو اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ پڑھے لیکن اگر کوئی شخص اس کے باوجود اپنی گم شدہ چیز کو تلاش کرنے کی کوشش کررہا ہے اور اِدھر اُدھر دوڑ رہا ہے تو کیا ایسا شخص بھی صابرین میں شمار کیا جائے گا؟

جواب : فرمایا کہ صبر کا تعلق ہاتھ، پیر سے نہیں، بلکہ قلب سے ہے اور قلب کا وظیفہ یہ ہے کہ صبر کرے اور صبر کے معنی یہ ہیں کہ بندہ رضا کا اظہار کردے کہ جو کچھ منجانب اللہ ہوا وہ ٹھیک ہوا، باقی ادھر سے امر ہے کہ جدوجہد بھی کرو اور کوشش بھی کرو۔ ہاتھ پیر سے سعی بھی کرو، یہ صبر کے منافی نہیں ہے۔ سعی کا حاصل یہ ہے کہ اس چیز کو پانے کے لئے جدوجہد کرو جو گم ہے لیکن جو کچھ نتیجہ نکلے اس پر راضی رہے۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہنا بھی صبر ہے، اس میں چوں و چرا بالکل نہ کریں۔

رہا یہ کہ صبر کس طرح سے کرے تو اس کی بھی تدبیر ہے، یعنی قلب کے اندر تشویش نہ ہو کہ ہائے میری فلاں چیز کھوگئی، اب کیا ہوگا، جب کسی چیز کے تلف ہونے یا فقدان پر صبر کرے گا تو جب تک اس کا کوئی بدل موجود نہ ہوگا جس کی طرف رجوع کرے تو اس وقت تک صبر نہیں ہوسکتا، اس لئے مصیبت آنے پر اس کے بعد پر غور کرے کہ کیا گیا اور کیا باقی ہے؟

فرمایا کہ: ”ایک بزرگ کہیں جارہے تھے، دیکھا کہ ایک بچھو بڑی تیزی سے کہیں جارہا ہے، یہ بھی اُس کے پیچھے لگ گئے، ان کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ بچھو کسی کام پر من جانب اللہ مامور ہے۔ راستے میں ایک نالہ آیا، بچھو بڑی تیزی سے اس کو بھی عبور کرگیا۔ دیکھا کہ سامنے ایک باغ ہے اس میں جارہا ہے، پھر دیکھا کہ ایک بزرگ باغ میں سو رہے ہیں۔ اُدھر سے ایک سانپ کاٹنے کے لئے بھی تیزی سے آرہا ہے، جب سانپ اس شخص کے پاس پہنچا تو اُس نے سر کاٹنے کے لئے اٹھایا، فوراً بچھو نے سانپ کو ایک ڈنک مارا، سانپ پانی پانی ہوگیا، انہوں نے ان کو اٹھایا۔

معلوم ہوا کہ کوئی اونچے لوگوں میں سے ہیں انہوں نے کہا کہ آپ کہاں تو اُس بزرگ نے واقعہ سنایا تو حق تعالیٰ شانہٗ نے سانپ کی موت مقدر کی تھی اور بچھو کو مقرر کیا تھا اُن کو بچانے کے لئے اور یہ بزرگ جو پیچھے گئے تھے اُن کو دکھانا تھا کہ ایک ہی واقعہ میں ہماری کتنی مصلحتیں ہوتی ہیں، کسی کی موت مقدر کسی کی حیات مقدر اور کسی کے لئے علم و حکمت مقدر، واقعہ ایک مگر پہلو اتنے۔“

سوال : قارون کے بارے میں فرمایا گیا کہ اے موسیٰ! اگر ایک مرتبہ بھی قارون مجھ سے فریاد کرتا تو میں اس کی فریاد سُن لیتا اور اُس کو بچالیتا یعنی عین عذاب کے وقت مغفرت کا وعدہ ہے اور قوم یونسؑ کے ایمان کو عذاب کے وقت قبول کرلیا گیا اور عذاب ہٹالیا گیا مگر فرعون کے ایمان کو عذاب کے وقت قبول نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی مغفرت تامہ کا ظہور بظاہر اسی وقت معلوم ہوتا کہ فرعون جیسے گناہگار کے ایمان کو قبول کرلیا جاتا۔ اگر فرعون کے ایمان کو اس لئے قبول نہیں کیا گیا کہ اس نے عین عذاب کے

وقت ایمان قبول کیا تھا تو قارون کو عذاب کے وقت بچانے کا وعدہ اور قومِ یونس کو عذاب کے وقت بچانا اور ان کے ایمان کو قبول کرنا اس کا مطلب کیا ہوگا؟

جواب : فرمایا کہ قانون شریعت یہ ہے کہ فَلَمۡ یَکُ یَنۡفَعُھُمۡ اِیۡمَانُھُمۡ لَمَّا رَاَوۡ بَاۡسَنَا یعنی اس وقت کا ایمان قبول نہیں ہے کہ جب ہمارا عذاب سامنے آجائے اور عالم غیب منکشف ہوجائے، اس لئے کہ ایمان بالغیب مقبول ہے، ایمانِ بالمشاہد مقبول نہیں ہے۔ یعنی جب آنکھ سے آدمی کوئی چیز دیکھ لے تو اُسے ایمان نہیں کہتے۔ مثلاً اٰمَنۡتُ بِاَنَّ الشَّمۡسَ طَالِعَۃٌ یعنی میں ایمان لایا کہ سورج طلوع ہو رہا ہے اس کو ایمان نہیں کہتے یا آنکھ سے دیکھ کر یا کان سے سن کر ایمان لائے یہ محسوسات ہیں ان کو ایمان نہیں کہتے ہیں ایمان بالغیب معتبر ہے وہ یہ ہے کہ نہ یہ چیزیں آنکھ سے دیکھی جاسکتی ہیں، نہ کان سے سنی جاسکتی ہیں، نہ عقل سے سمجھی جاسکتی ہیں، یہ چیزیں حسّی ہیں۔

ایمان کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی اطلاع پر اعتماد کر کے مانا جائے، مثلاً جنت و نار، فرشتوں کا وجود، پل صراط، میزان اور قیامت وغیرہ تو یہ ساری چیزیں نہ عقل سے مدرک ہوتی ہیں، نہ محسوسات سے بلکہ انبیاء علیہم السلام کے فرمانے پر اعتماد کر کے ان کو مانا جاتا ہے اور یہ غائب ہیں لیکن جب یہ چیزیں سامنے آگئیں تو ایمان بالغیب نہ رہا کیوں کہ قیامت میں جب کفار جنت وجہنم کو دیکھیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے مگر اس وقت کا ایمان قبول نہیں ہوگا کیوں کہ وہ ایمان بالغیب نہیں ہوگا بلکہ ایمان بالمشاہد ہوگا اور وہ غیر مقبول ہے۔

فرمایا کہ: بزرگوں پر کسی نہ کسی عمل کا غلبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ پر حج کا غلبہ تھا، پیسے جمع کرتے رہتے، جب پورا انتظام ہوجاتا تو حج کے لئے روانہ ہوجاتے، اس طرح سے آپ نے بیسیوں حج کیے، عبادت میں حضرت مولانا کو حج سے زیادہ مناسبت تھی، ہمارے مولانا مبارک علی صاحبؒ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد (حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ) پر صلوٰۃ کا غلبہ تھا، واقعی وہ نماز بڑے ہی ذوق وشوق سے پڑھتے تھے اور کہنے لگے کہ انہوں نے مجھے اس نسبت پر لگا دیا تھا۔ میں نے کہا بھائی مجھے بھی لگا دو مگر انہوں نے لگایا تو نہیں لیکن ان میں یہ جذبہ تھا اور کہتے تھے کہ نسبتِ صلاتیہ مجھے ان سے حاصل ہوئی ہے تو بعض پر نماز کا غلبہ ہوتا ہے جب دیکھو نفلیں پڑھ رہے ہیں اور بعض پر حج کا غلبہ، حج نہ ہو تو عمرہ ہی سہی، مطلب یہ کہ بیت اللہ حاضری ہو۔

اور حضرت تھانویؒ پر صفائی، معاملات کا غلبہ تھا، آپ کی خواہش تھی کہ نہ کسی کو مجھ سے تکلیف پہنچے اور نہ

کسی سے مجھے۔ چنانچہ معاملات بہت صاف رہتے تھے، جہاں کسی نے کوئی عمل کیا آپ نظر رکھتے کہ اس سے کسی کو ضرر تو نہیں پہنچا اور بعض پر انفاق فی سبیل اللہ کا غلبہ ہوتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو، انہیں بزرگوں میں سے کسی کے ایک صاحب متعلق تھے، وہ اسٹیشن ماسٹر تھے، بھوپال میں ان کے اوپر انفاق کا غلبہ تھا، ان کا یہ معمول تھا کہ جب اپنی ملازمت کے فرائض سے فارغ ہوتے تو ریل میں چڑھ جاتے تھے اور تحقیق کرتے تھے جس کے پاس ٹکٹ کے پیسے نہ ہوتے ان کو پیسے دیتے تھے، ساری تنخواہ ان کی اسی میں جاتی تھی، وہ مسافروں کی خبر گیری کرتے رہتے تھے، تو طبائع کی مناسبت ہوتی ہیں اور آدمی اسی لائن سے ترقی کرتا ہے جس سے اس کو ذوق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی راہ سے اس کو مدارج دیتے ہیں

ہر گلِ را رنگ بوئے دیگر است

کہا جاتا ہے کہ چین کے اندر آٹھ حضرات صحابہؓ پہنچے اور تاجر بن کر پہنچے اور تجارت کی لائن سے انہوں نے تبلیغ اسلام کی دیانت اور معاملے کی صفائی اور سچائی پر عمل کر کے انہوں نے دکھلایا اور لوگوں کو آمادہ بھی کیا تو ہزاروں آدمی ان کے ساتھ ہو گئے اور ان چیزوں پر چلنے لگے کہ واقعی یہ دیانت کا راستہ ہے۔ اس سے مقامی چینیوں کے اندر حسد پیدا ہوا کہ ان کی دوکانیں چل رہی ہیں اور مقامی دوکانیں ٹھپ ہیں۔ یہ حضرات سچے تھے، اس لئے تجارت میں فروغ ہوا اور دوسرے دغل فسل کرتے تھے تو مقامی تجار حکومت کے پاس پہنچے کہ یہ غیر ملکی تاجر کہاں سے آ گئے ہیں۔ انہوں نے بازار ٹھنڈے کر دیئے، ان کو یہاں سے نکالا جائے، چنانچہ ان آٹھوں حضرات کو حکومت نے بلایا اور کہا کہ تم ہمارے ملک کو کیوں تباہ کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم تباہ کر رہے یا آباد کر رہے ہیں؟ ہم نے دیانت داری سکھلائی، معاملے کی سچائی سکھلائی تو یہ کام ملک کے فروغ کا ہے، تباہی کا نہیں ہے مگر انہوں نے کہا کہ تم لوگ نکل جاؤ تو ان لوگوں نے کہا کہ آپ ہماری غلطیاں بتلائیں، ہم ان کی اصلاح کریں گے، جب کوئی غلطی نہیں تو خواہ مخواہ آپ یہ کہہ رہے ہیں، ہم نہیں جائیں گے، انہوں نے کہا کہ ہم زبردستی نکالیں تو ان آٹھ آدمیوں نے پوری چینی حکومت کو چیلنج کر دیا کہ ہم نہیں جائیں گے۔ وہاں سے جبراً حکم ہوا کہ انہیں یہاں سے نکالو، جب ان کے نکلنے کا وقت آیا تو چین کی ساری عوام ان کے ساتھ تھی کہ جہاں یہ جائیں گے ہم بھی جائیں گے، یہ منظر دیکھ کر ذمہ دارانِ حکومت نے کہا کہ جب اس قدر لوگ ان کے ساتھ چلے جائیں گے تو آپ حکومت کس پر کریں گے؟

نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو آرڈر واپس لینا پڑا اور کہا کہ تم اپنے کام میں لگے رہو، ان آٹھ آدمیوں کا ثمرہ ہے کہ آج چین میں آٹھ کروڑ مسلمان ہیں تو انہوں نے تجارت کی لائن سے دین کو پھیلایا۔

نفس تصویر کو شرک میں بھی دخل ہے، اسی وجہ سے اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ اللہ کے دین میں جو شرک شروع ہوا اور توحید میں خلل پڑا، اس کی بنیاد تصویر ہی ہوئی ہے۔ سب سے پہلا جو شرک شروع ہوا ہے وہ نوح علیہ السلام کی قوم میں شروع ہوا ہے۔ نوح علیہ السلام کا زمانہ آدم علیہ السلام کے زمانے سے ایک ہزار سال کے بعد ہے۔

نوح علیہ السلام جس قوم میں مبعوث فرمائے گئے اس میں شرک آیا اور اس شرک کی بنیاد یہ ہوئی کہ اس قوم میں پانچ بزرگ تھے، ان کی مجلسوں میں لوگ بیٹھ کر خدا کو یاد کرتے تھے اور مسائل سنتے تھے، اس سے ان کے دین کو تقویت پہنچتی تھی، جب ان بزرگوں کا انتقال ہو گیا تو قوم میں پریشانی ہوئی کہ اب نہ وہ مجالس رہیں اور نہ وہ مسائل رہے۔ اب ہم کہاں بیٹھیں، اس وقت شیطان نے ان کے دل میں یہ پھونک ماری کہ ان بزرگوں کی تصویریں بنا کر اپنے پاس رکھ لو، جب ان تصویروں کو دیکھو گے، ان کا زمانہ یاد آ جائے گا اور وہ کیفیت پیدا ہو جائے گی، تو ان پانچوں کے مجسمے بنائے گئے اور ان پانچوں کا نام تھا (۱) ودع (۲) سواع (۳) یغوث (۴) یعوق (۵) نسر۔ ان کا قرآن کریم میں ذکر ہے۔ یہ پانچ بت بنا کر رکھے گئے۔ ان کا مقصد محض تذکیر تھا کہ ان تصویروں کے ذریعہ یاد دہانی ہو جائے، ان تصویروں کو پوجنا مقصود نہیں تھا۔ ابتداء میں جب تک لوگوں کے دلوں میں معرفت رہی اور ان بزرگوں کے اثرات بھی رہے تو موحد رہے، لیکن جب دوسری نسل آئی تو ان کے دلوں میں وہ معرفت نہیں رہی، ان کے سامنے تو یہی بت تھے چنانچہ وہ کچھ خدا کی طرف متوجہ ہوئے تو اس طرح ان کا دین مخلوط ہو گیا اور جب تیسری نسل آئی تو ان کے دلوں میں اتنی بھی معرفت نہیں رہی ان کے سامنے بُت ہی بُت رہ گئے، انہیں کو سجدہ انہیں کو نیاز، انہیں کی نذر، یہاں تک کہ شرک شروع ہو گیا۔ اس شرک کو مٹانے کے لئے نوح علیہ السلام آئے، تو شرک کی ابتداء جو ہوئی وہ تصویر سے ہوئی ہے۔ تصویر میں خاصیت ہے شرک پیدا کرنے کی، پس اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تصویر یا تو ایسی قوم بناتی ہے جو مذہبی قوم ہے وہ بزرگوں کی یادگار کے طور پر ایسا کرتی ہے مگر آگے چل کر یہ تصویر شرک کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ (۱۰۴)

............❖............

ملفوظات

مثلِ خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

الفاظ زبان سے ادا ہوں یا نوکِ قلم سے، نثر میں ہوں یا نظم میں، کیفیت مسرت میں ہوں یا احساسِ الم میں، عہد شباب میں ہوں یا دورِ کہولت و شیخوخت میں، عالم کوئی سا بھی ہو، فضا کیسی بھی ہو، بہرصورت شخصیت شناسی کا پیمانہ ہوتے ہیں۔

شیخ سعدیؒ کا یہ حکیمانہ شعر تو سنا ہی ہوگا:

تا مردے سخن نہ گفتہ باشد　　　عیب و ہنرش نہفتہ باشد

پھر گفتگو کرنے والا ایک عام انسان نہیں بلکہ دینی شخصیت اور مستند عالم شریعت ہو تو اس کے الفاظ، اس کی شخصیت کے شایانِ شان، اس کی دینی حیثیت، اس کی علمیت، بصیرت اور دیدہ وری کی بوو باس اور کردار وعمل کی روشنی لئے ہوئے ہوتے ہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت کو جب ہم ان کے الفاظ اور ملفوظات کے آئینہ میں دیکھتے ہیں تو ہمیں فضل و کمال اور حکمت و معرفت میں ایک ایسا پُرنور، پرکشش اور پروقار چہرہ دکھائی دیتا ہے جس کی ادنیٰ جھلک بھی مخاطب کو مسرور و مسحور اور محظوظ کر دیتی ہے۔ سادہ، سہل اور جچے تلے الفاظ، جب ان کے سحر انگیز لہجہ میں ڈھل کر سامعہ نواز ہوتے ہیں تو عسلِ مصفیٰ کی حلاوت، آب حیات کی جاں نوازی، نسیم سحر کی ٹھنڈک، شراب طہور کی سرمستی اور فردوس بریں کی دل کشی پیدا کر دیتے ہیں، جن خوش طالع نفوس کو حضرت حکیم الاسلامؒ کی زبان سے ان کے پاکیزہ کلمات کو براہِ راست سننے کا موقع ملا، سعادت مندی میں ان کی ہمسری ممکن نہیں، ان کے حصہ میں الفاظ کے ساتھ صاحب الفاظ کی قلبی کیفیات اور لہجہ کی سحر طرازیاں بھی آئیں اور آئندگان کے لئے یا ملفوظات کا مطالعہ اور ان میں پوشیدہ حکیم الاسلام کا دینی فکر

وفلسفہ اور علمی، عملی، اخلاقی اصلاحات وتربیت کا سروسامان۔

ملفوظ: ''حیوانات کے ان خلقی مقاصد پر غور کرو تو ان کے لئے فہم وعقل کی ضرورت نہ تھی، بلکہ عقل ان میں حارج ہوتی کیوں کہ اگر ان میں عقل ہوتی تو جب انسان ان پر سوار ہوتا، زین رکھتا، یا بوجھ لادتا تو عقل مند جانور کہتا کہ: ذرا ٹھہریئے، پہلے یہ ثابت کیجئے کہ آپ کو مجھ پر سواری کرنے یا بوجھ لادنے کا حق ہے یا نہیں؟ اب آپ دلائل بیان کرتے، وہ اپنی عقل کے مطابق آپ سے بحث کرتا، تو سواری اور بوجھ تو رہ جاتا بحث چھڑ جاتی اور اگر کہیں بحث میں جانور غالب آجاتا تو آپ کھڑے منہ تکتے رہ جاتے بلکہ ممکن ہوجاتا کہ وہی آپ پر سواری کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑی مشکل بات ہوتی، ہر حیوان سے کام لیتے وقت یہی مناظرہ بازی کا بازار گرم رہتا، نہ بیل کھیت جوت سکتا، نہ گھوڑے سواری لے جاسکتے، نہ حلال جانوروں کا گوشت کھایا جاسکتا۔ سارے کام تجارت وغیرہ کے معطل ہوجاتے اور انسان کو ان حیوانوں کے مناظروں سے کبھی بھی فرصت نہ ملتی اور یہ ساری خرابی حیوانوں کو عقل وفہم ملنے سے ہوتی، پھر آپ کی تعلیم گاہوں میں بھی علم حاصل کرنے جمع ہوتے اور ایک ہی کلاس میں گھوڑے، گدھے، کتے سب جمع رہتے بلکہ جنگلوں سے شیر، بھیڑیئے، ریچھ، گیدڑ بھی جمع ہوتے تو آپ کو علم حاصل کرنا وبال جان بن جاتا۔ غرض علمی اور عملی کارخانے سب کے سب درہم برہم ہوجاتے۔ اس لئے شکر کیجئے کہ اللہ نے انہیں عقل وفہم نہیں دیا، جن سے آپ کے کام کاج چل رہے ہیں۔''

ملفوظ: جنات میں نبوت نہیں رکھی گئی، وجہ یہ ہے کہ جیسے ملائکہ میں خیر کا غلبہ ہے اور شر کالعدم ہے، جنات میں شر کا غلبہ ہے اور خیر کالعدم ہے اور نبوت کے لئے غلبہ خیر ہی نہیں خیر محض کی ضرورت تھی۔ ورنہ بشر کے ہوتے ہوئے بدفہمی یا بدعملی کی وجہ سے شرائع پر عمل اور ان کی تبلیغ دونوں غیر مامون ہوتیں اور صحیح دین مخاطبوں کو نہ پہنچ سکتا، اس لئے انہیں تابع انسان بنایا گیا تاکہ اس کی شریعت سے وہ علم اور عمل کی خطاؤں سے بچنا سیکھیں۔ اس لئے جو انبیاء انسانوں میں مبعوث ہوئے ان ہی کی اطاعت ان پر لازم کی گئی۔ غرض اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو تو خطاب ہی نہیں کیا، ملائکہ کو خطاب کیا مگر غیر تکلیفی اور جنات کو خطاب تکلیفی کیا مگر خطاب بالاستقلال نہیں فرمایا۔''

ملفوظ: ''پس ایک طرف تو علم کے میدان میں انسان کو فرشتوں سے فائق ثابت کرایا اور ایک طرف عبادت واطاعت میں اسے فرشتوں سے اونچا ثابت فرمایا اور خود فرشتوں ہی کو اس کی نیکی پر گواہ بنایا تاکہ اس کی سفا کی اور فساد کا تخیل ان کے ذہن سے نکل جائے اور وہ بصدق دل اس کی خلافت کے معترف

ہو جائیں۔ چنانچہ ہر غیر معمولی عمل عبادت کے مواقع پر ملائکہ کو اسی طرح گواہ بنایا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب حاجی احرام باندھ کر حج وزیارت کرتے ہیں، طواف وسعی میں دوڑتے ہیں، منٰی وعرفات میں ٹھہرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ملائکہ کو خطاب فرماتے ہیں کہ یہ لوگ آخر گھر بار چھوڑ کر، بیوی بچوں سے منہ موڑ کر، سر سے کفن باندھ کر اپنی لذت وآرام کو مٹا کر یہاں کیوں آئے ہیں؟ یہ سب میری خوشنودی ورضا کے لئے آئے ہیں اور پروانوں کی طرح نثار ہو رہے ہیں۔ اے ملائکہ! تم گواہ رہو، میں نے انہیں بخش دیا۔''

ملفوظ: ''انسان کے سوا کائنات کی تین باشعور مخلوقات ایک ایک جوہر کی حامل ہیں۔ حیوانات میں صرف بہیمیت ہے، جنات میں صرف شیطنت ہے اور ملائکہ میں صرف ربانیت ہے، اسی لئے ان میں کسی کی بھی ترقی نہیں ہوتی، برخلاف انسان کے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ مساوی قوتیں جمع فرما دی ہیں۔ اس میں ملکیت بھی ہے، بہیمیت بھی ہے اور شیطنت بھی ہے، تو لازمی بات ہے کہ یہ متضاد قوتیں باہم ٹکرائیں گی اور ٹکراؤ سے نئے نئے افعال کا ظہور ہوگا''۔

ملفوظ: ''مرد وہ ہے جسے دیکھ کر رعب طاری ہو، مرد وہ نہیں جسے دیکھ کر شہوت ابھرے۔ یعنی صورت آرائی شہوت رانی ہے اور صورت آرائی مردانگی نہیں ہے، اس لئے کہ صورت کو کہاں تک بنائیں گے، جو بگڑنے کے لئے ہی بنی ہے اور بنانا اس چیز کا ضروری ہے جو بن کر بگڑتی نہ ہو اور وہ سیرت اور اخلاق فاضلہ اور علوم وکمالات ہیں۔''

ملفوظ: ''انسان کا پیٹ حوضِ بدن ہے۔ حوض میں جو بھرا جائے گا وہ نلوں اور نالیوں میں بھی آئے گا، پیٹ میں اگر پاک غذا ہے تو قلب ودماغ میں پاک آثار آئیں گے، اقوال وافعال بھی صادر ہوں گے اور اگر لقمۂ حلال نہیں ہے تو پھر وہی ظلمت وکدورت ملے ہوئے اقوال وافعال سرزد ہوں گے اور ایسی ہی حرکات ہوں گی۔ (۱۰۵)

............❖............

معارف

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار
کیا کیا کہا کریں ہیں زبان وقلم سے ہم

علمی دنیا کا ایک ادنیٰ فرد بھی بخوبی واقف ہے کہ ''خانوادہ قاسمی'' برصغیر میں علوم ومعارف اور صالح دینی افکار کا استعارہ اور دین و دانش میں امامت کا درجہ رکھتا ہے۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اسی خانوادہ کے فرزند جلیل اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے حفید رشید ہیں۔ انہوں نے علم وکمال کی پاکیزہ فضا میں آنکھ کھولی، حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ سے روحانی تربیت پائی، علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے دیدہ ور اساتذہ کے تلمّذِ خاص سے بہرہ ور ہوئے، اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے اپنے عہد کی بلند پایہ علمی وروحانی شخصیات میں بھی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر ذیل میں آپ کے نہایت پرمغز اور معلومات افزا ارشادات نقل کئے جارہے ہیں۔

وقت

ایک انتہائی پیچیدہ مگر مبتلا بہٖ سوال کہ جن ملکوں میں چھ مہینے کا دن، چھ مہینے کی رات ہوتی ہے وہاں نماز، روزوں کی ادائیگی کا مسئلہ کیسے ہوگا؟ اس سلسلہ میں کیا معیار ہوگا؟ اور کیا پیمانہ؟ ذیل کی تفصیلات حضرت حکیم الاسلامؒ کی زبانی ملاحظہ فرمایئے تو آپ کو لگے گا کہ واقعی مشکل مسائل حکیم الاسلامؒ کے ہاتھ میں ایسے ہیں جیسے برتن بنانے والے کی مٹھی میں گیلی مٹی، گویا کہ لوہے کو موم کردینے والا استنباطی ملکہ یا پھر مجتہدانہ عبقریت۔

سوال : علماء اصول کے نزدیک نماز کے لئے وقت سبب ہے اور روزہ کے لئے ظرف ہے۔ اگر

واقعی وقت ہی سبب وجوب بھی ہے تو جن خطوں میں رات چھ چھ مہینے کی ہیں وہاں تو چھ ماہ میں صرف پانچ ہی نمازیں ہونی چاہئیں؟

جواب: ’’اس کے لئے جواب صریح حدیث ہے جس میں اس کا اصول ارشاد فرمایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ بنص حدیث دجال پوری دنیا میں چالیس دن گھوم جائے گا اور اس کی مسافت کا پہلا ایک دن چالیس دن کے برابر ہوگا، اس پر صحابہؓ نے عرض کیا کہ رسول اللہؐ اس ایک دن میں نماز کس طرح اور کتنی پڑھی جائیں گی گویا سوال کا حاصل یہ تھا کہ اگر وقت سبب ہے تو چالیس دن کے برابر ایک دن پورے دن کی تین ہی نمازوں کی وسعت رکھے گا۔ حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ اس دن میں نمازیں حساب سے پڑھی جائیں گی، یعنی چوبیس گھنٹہ کا ایک دن رات لگا کر پانچ نمازیں ان چوبیس گھنٹوں میں پڑھی جائیں گی، اس لئے نماز کا مسئلہ تو صاف ہوگیا۔ اب یہ بحث رہ جاتی ہے کہ وقت خاص سبب نہ رہا کیوں کہ عمل صلوٰۃ حساب پر دائر ہوگیا، سبب تو طلوع وغروب تھا نہ کہ مطلق وقت، سو اس حقیقت پر غور کرنا چاہئے کہ وقت کی حقیقت کیا ہے؟ سو ظاہر ہے کہ وقت کی حقیقت اور ذات یہ لیل ونہار نہیں ہیں بلکہ مسافت زمانی ہے، یہ لیل ونہار اور یہ روشنی وظلمت وقت نہیں بلکہ وقت کے الوان ہیں جو اس پر عارض ہوتے ہیں، وقت ہر صورت قائم رہتا ہے، اگر وقت کی ذات دن ہوتا تو دن ختم ہونے پر وقت محو ہوجاتا حالاں کہ رات آتی ہے تو اسے بھی وقت ہی کہتے ہیں، اسی طرح اگر وقت کی ذات رات ہوتی تو رات گزرتے ہی وقت فنا ہوجاتا حالاں کہ رات گزر کر دن آتا ہے تو اسے بھی وقت ہی کہتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ رات اور دن کی یہ نورانی اور ظلمانی شکلیں خود وقت نہیں بلکہ وقت کے اوپر طاری ہونے والی صورتیں ہیں جو وقت کے عوارض کہلائیں گے۔ ان تمام عوارض میں قدر مشترک وقت ہے، پس وقت زمانی مسافت کا نام ہوا نہ کہ نور وظلمت یا چاندنے اور اندھیری کا نام، جنت میں رات دن نہیں بلکہ یکسانی کے ساتھ یکساں ہی حال ہوگا اور اسے وقت ہی کہیں گے، قیامت کا دن پچاس ہزار برس کا ہوگا جس پر رات آئے گی ہی نہیں مگر اسے بھی وقت ہی کہا جائے گا۔‘‘

نزول مطر اور نزول ماء

اس عنوان کے تحت حکیم الاسلامؒ نے ایک مشہور سائنسی مسلّمہ کا شریعت کی روشنی میں کس طرح جائزہ لیا ہے کہ سبب قریب کے ادراک سے سبب بعید کی نفی نہیں ہوا کرتی، باقی تفصیلات آپؒ ہی کی زبان سے سنئے:

فرمایا: قرآن کریم نے دعویٰ کیا ہے و انزلنا من السماء ماء طهوراً اور ففتحنا ابواب

السماء بماءٍ منھمر و فجرنا الارض عیوناً فالتقی الماء علٰی امرٍ قد قدر. حالاں کہ بارش بظاہر مانسون ہوتی ہے اور پانی آسمان سے نہیں سمندر سے آتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ شریعت اسباب ظاہری کو رد نہیں کرتی بلکہ باطنی اسباب پر مطلع کرتی ہے، ہوسکتا ہے کہ بارش کا ظاہری سبب مانسون ہو لیکن خود مانسون کا سبب دوسرا ہے جو بارش کا حقیقی سبب ہوگا، جیسے دنیا کی شدید گرمی کو فیح جہنم سے پیدا شدہ فرمایا گیا، حالاں کہ سبب ظاہری وقریبی تپش آفتاب ہے، پس شریعت نے اس تپش کو رد نہیں کیا بلکہ تپش آفتاب کے سبب پر مطلع کیا کہ وہ جہنم ہے۔

علماءِ دیوبند کا مسلک

علماءِ دیوبند کا مسلک کیا ہے؟ کیا یہ کوئی فرقہ ہے جو سوادِ اعظم سے دوسرے فرق ضالہ کی طرح کچھ حاشیہ پر ہے۔ اس سلسلہ میں حکیم الاسلامؒ کی زبان سے ملاحظہ فرمایئے:

علماءِ دیوبند کے مسلک کے بارے میں ابتداء ذات بابرکات حق سے کی جائے کہ وہ سرچشمۂ کمالات وبرکات ہے، مصدر خیرات ہے، ہر خیر اسی کی ہے اور اسی کی طرف جانے والی ہے۔ **لیس کمثلہٖ شئ.**

پھر انبیاء علیہم السلام ہیں کہ **عباد مکرمون** ہیں، معصوم از کبائر وصغائر قبل از نبوت وبعد نبوت۔ ان کی محبت، ان کی عظمت، ان کی اطاعت اصل ایمان جانیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلی الخلائق جانیں لیکن معبود نہ سمجھیں۔ **ما کان لبشرٍ ان یؤتیہ اللّٰہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لّی من دون اللّٰہ۔**

صحابۂ کرامؓ

صحابۂ کرامؓ شریعتِ محمدیہؐ کے اوّلین مخاطب ہیں، مزاج نبوت کے شناسا ہیں، اسلام کا عہد اوّلیں ان کی نظروں میں ہے اور وہ اسلام کے عہد زریں کا بہترین اثاثہ ہیں، شرعاً ان کی حیثیت کیا ہے؟ ملاحظہ فرمائیں:

فرمایا: ”صحابۂ کرامؓ مقدسین امت ہیں، کلھم عدول امت ہیں، کوئی بھی شرف صحابیت کو نہیں پہنچ سکتا، ان کو معیارِ حق جانیں، وہ معیارِ تشریع کے علاوہ تمام علمی وعملی کمالات کے بعد از نبوت معیار ہیں۔

فرمایا: ”ہر فکر اور عقیدہ جو دین سے متعلق ہو صحابہ ہی کے اقوال وافعال کو اس کا معیار بنانے میں امن ہے ورنہ فرقہ باطلہ خود فکری اور خود نظری سے بنے ہیں، یہ عقل کو منجمد کر دینے کا مشورہ نہیں ہے بلکہ اسے

حدودِ مقررہ میں استعمال کرنے کا مشورہ ہے، جس طرح قرآن حکیم میں فکر و تدبر اگر بمقابلہ نص ہو تو یہ ابلیسی قیاس ہے اور اگر اس کی مرادات ماثورہ کے دائرہ میں رہ کر ہو تو وہ علومِ قرآنی میں وسعت کی دلیل ہے، جس سے عجائبات قرآنی واشگاف ہوتے ہیں۔ ایسے ہی صحابہؓ کے قول و عمل اور ان کے مذاق کے دائرہ میں رہکر عقل کو استعمال کیا جائے تو یہ عقل کی عبادت بھی ہے اور علوم میں اضافہ بھی ہے اور اس کے معنی صحابہؓ کے معیارِ حق ہونے کے ہیں۔ ورنہ خودفکری اور خودنظری وہی زلتہ ہے کہ پھر آدمی کا سنبھلے رہنا اور فرقہ ناجیہ کی حدود کو قائم رکھنا عرف شریعت میں ناممکن ہے، ورنہ صحابہ کو معیار نہ بنایا جاتا۔ گو حقیقی معیار ذات بابرکات نبوی ہے مگر آپ کی معیاریت کا تعارف سوائے صحابہؓ کی زندگی کو سامنے رکھنے کے ممکن نہیں ہے جب کہ آپ کی سنتیں صحابہؓ میں ہی اول آئیں اور ان کے ذریعہ مختلف ممالک میں ہی پہنچنے اور وہاں کے مختلف حوادثات دیکھنے سے انہوں نے ان سنتوں کو مختلف رنگوں سے کس کس طرح نمایاں کیا ہے؟ جس سے ان سنن مبارکہ کے الوان نمایاں ہوئے اور امت کے حق میں توسع کی صورتیں پیدا ہوئیں تو انہیں کے ذوق کے دائرہ میں رہ کر عقل صافی کو بھی کام کرنے کا موقع ملا اور ملتا رہے گا، اس لئے یہ اتباع عقل کو منجمد نہیں کرے گا بلکہ اسے دوڑنے کے لئے میدان فراہم کرے گا۔

اولیاءِ کرام

ایک جماعت اولیاء کرام کی ہے، سب جانتے ہیں مگر ان کے تئیں اہل ایمان کا رویہ کیا ہونا چاہئے؟ اور ان کی عظمت، مرتبہ و مقام کے مناسب کون سا طریقہ مناسب سمجھا گیا ہے، ذرا اس کو بھی دیکھئے:

فرمایا: ''اولیاءِ کرام کی محبت و عظمت کو علامت ایمان جانیں، ان کی قبور کی زیارت کو باعث خیر و برکت سمجھیں، وہاں کی حاضری حدودِ شریعت میں کریں۔''

علم

علم کیا ہے؟ علماء اور محققین کی زبان میں اعتقادِ جازم کا نام علم ہے، جس میں قلب اور عقل دونوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ خالی عقل گمراہی کا سبب ہے۔ اگر وحی کی روشنی اس کو میسر آجائے اور معرفت قلب بھی تو سبحان اللہ ورنہ ایسا علم جس کا دارومدار خالص عقلیات، حاسّہ اور حواس پر ہو کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ ذیل میں حکیم الاسلامؒ کی روح پرور تجزیہ کے تناظر میں ملاحظہ کیجئے:

فرمایا: ''علم وہ ایک علم الٰہی ہے، بقیہ سب حس و احساس کے دائرہ کی چیزیں ہیں، علم یا خبر صادق

وحی سے آتا ہے یا وحی میں تدبر کر کے عقل تربیت یافتہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جس کا نام اجتہاد و استنباط ہے۔ پس عقل موجد معلومات نہیں لیکن موجود معلومات میں تحلیل و ترکیب کا کام انجام دے سکتی ہے۔ اگر اسے آزاد چھوڑ دیا جائے گا تو اس کے دوڑنے کا ایک میدان انکار خدا بھی ہے، انکار رسول بھی ہے، انکار دین بھی ہے مگر کیا اسے اہل ذوق گوارہ کر سکتے ہیں؟ نہیں۔ تو اس سے واضح ہے کہ عقل کو آزادی محض دینے کے لئے کوئی تیار نہیں ہے۔''

عبادت

عبادت کے عام مفہوم سے سب واقف ہیں، مگر عبادت کا شرعی اور حقیقی مفہوم کیا ہے؟ ذرا حکیمانہ انداز سے اس کی ایک جھلک دیکھئے:

فرمایا : ''جب نفس انسان کی تخلیق کی غرض و غایت عبادت ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اجزاء انسانی کی تخلیق کی عبادت نہ ہو، پس زبان پیدا کی گئی ذکر کے لئے ضمناً کھانا اور چکھنا بھی ہے۔ انگلیوں کے پورو ے پیدا کئے گئے، عقد انامل کے لئے ضمناً گرفت بھی ہے، ہاتھ پیدا کئے گئے مجاہدہ کے لئے پیر پیدا کئے گئے، مشی بالذکر کے لئے ضمناً مشی بالدنیا بھی ہے، آنکھ پیدا کی گئی، رویت جمال و آثار جمال کے لئے نہ کہ تفریح نفس کے لئے، حواس پیدا کئے گئے محسوسات سے مغیبات کی طرف جانے کے لئے، عقل پیدا کی گئی اثبات حقائق الٰہیہ کے لئے کہ اس کا ذکر بھی ہے، قلب پیدا کیا گیا مشاہدۂ احوال کے لئے اور تبسیط اخلاق کے لئے، قوائے غضبیہ پیدا کئے گئے اقہار اعداء اللہ کے لئے، قوی ملکیہ پیدا کئے گئے تقرب کے لئے، معدہ پیدا کیا گیا تقوّی علی العبادت کے لئے، دماغ پیدا کیا گیا تفکر آخرت کے لئے اور روح تو آئی ہی تھی اس شرط پر کہ اسے ذکر کے مواقع دیئے جائیں تو اس کی وجہ تخلیق ماسوائے ذکر اور کچھ ہے ہی نہیں۔ رہا عالم آفاق تو وہ مجموعہ وسائل زندگی ہے نہ وہ موضوع زندگی ہے نہ مقصد زندگی۔ اس لئے اس کے تو ہر جزء کو ہی وسیلۂ ذکر و عبادت بنایا جائے گا۔ مثلاً کھانا، پینا، پہننا نہ خود عبادت نہ مقصد بلکہ بعض عبادتیں بنتی ہیں کہ یہ کھانا، پینا، پہننا چھڑا دیا جائے جیسے روزہ کہ ہے ہی ترک اکل و مشروب و جماع اور جیسے حج کہ ہے ہی ترک الالتذاذ بالنساء و باللباس و بالمکان و بجمیع وسائل دنیا کہ ان کی تقلیل مقصود ہے جو قدرتاً بھی ہو جاتی ہے۔ معرفت اشیاء کیوں ہے تاکہ اس کے ذریعہ معرفت خالق ہو، اس لئے تکوینیات پر رجوع الی اللہ رکھا گیا ہے، جیسے لیل و نہار کا انقلاب طلوع و غروب کا انقلاب، نوم و یقظہ کا انقلاب، صحت و مرض کا انقلاب، نقل و حرکت کا انقلاب۔''

انسان مرکز عالم ہے

اس عنوان کی معنویت کو صحیح معنی میں حکیم الاسلامؒ کی زبان ہی سے سمجھا جا سکتا ہے:

فرمایا: ''مرکز صحیح ہوتا ہے تو محیط بھی صحیح رہتا ہے اور وہ بگڑ جاتا ہے تو پورے عالم میں خرابیاں آجاتی ہیں، تکوین ہو یا تشریع سب کا مدار انسان پر ہے۔ تکوینی طور پر فرمایا گیا **ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس** اور تشریعی طور پر اگر انسان میں ایمان ہو تو ظلم و جور پر کمر باندھے گا، تب بھی عالم بگڑے گا، آج فساد تکوینیات میں ہے جیسے حدیث میں ہے کہ اگر زکوٰۃ نہ دی جائے تو عالم میں شح اور بخل پھیلے گا۔ اس سے بارشیں بند ہوں گی، ایمان بگڑتا ہے تو اخلاق بگڑتے ہیں، اخلاق بگڑنے سے اعمال میں تباہی آتی ہے اور بر و بحر میں فساد پھیلتا ہے، انسان میں مرکز قلب ہے یہ درست ہے تو سارا انسان درست ہے، ورنہ فاسد ہے اور انسان فاسد ہے تو عالم فاسد ہے۔''

مقصدِ زندگی

ارشادِ خداوندی: **اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا الخ.** کی تشریح حضرت حکیم الاسلامؒ کے دل نشیں انداز اور حکیمانہ اسلوب میں ملاحظہ فرمائیے:

فرمایا: ''دنیا میں ہر حرکت کا کوئی مقصد ہوتا ہے، زندگی بھی ایک مستقل حرکت ہے۔ اپنی حرکت بھی ہے کہ انسان عالم الست سے چلا، عالم رحم میں آیا، پھر عالم دنیا میں آیا، پھر عالم برزخ میں جائے گا، پھر عالم حشر کو سدھارے گا، پھر عالم جنت اس کے لئے ہے۔ غرض ہر عالم میں انتقال ہے، ارتحال ہے، ایک سے دوسرے عالم کی طرف اور ساتھ ہی ترقی کے ساتھ یعنی وہ ارذل عالم سے اعلیٰ و اشرف عالم کی طرف منتقل ہوتا رہا ہے۔ جس سے انسان کا ابدی ہونا ثابت ہوتا ہے گو ازلی نہیں اور ارتقاء ثابت ہوتا ہے، پھر اس اپنی حرکت کے ساتھ اس میں وضعی حرکت بھی ہے جو زندگی کی علامت ہے، اس کا قلب متحرک، اعضاء متحرک، معدہ متحرک، جگر متحرک، پھر عمل کی حرکت جسے کسب معاش کہتے ہیں۔ پھر علمی حرکت بھی ہے، قوت فکریہ بھی متحرک ہے، غرض انسان کا ذرہ ذرہ حرکت ہی ہے جس سے اسے زندہ سمجھا جاتا ہے، جس سے واضح ہے کہ زندگی نام ہی حرکت کا ہے۔ پس زندگی خود متحرک، اس کے آثار متحرک، حرکت مکانی الگ اور حرکت زمانی الگ، حرکت وضعی الگ، حرکت وصفی الگ، حرکت حالی الگ اور حرکت قالی الگ، کہ انسان کی ساری عملی حرکتوں کو نطق میں لانا، لکھنا ممکن نہیں اور جب کہ ہر حرکت کا کچھ نہ کچھ مقصد ہونا لازمی ہے ورنہ وہ

حرکت بے فائدہ ہو جائے گی جس سے حکمت حق وابستہ ہے تو زندگی کا بھی کوئی مقصد ہونا چاہئے۔ حرکت قالی خطباء وعلماء کی ہے، حرکت فکری حکماء کی ہے، حرکت قلبی عرفاء کی ہے، حرکت قلمی کاتبوں کی ہے۔''

بین الاقوامی دین

بین الاقوامی تمدن کے اس دور میں بین الاقوامی دین کا ہونا، اس بات کو حکیم الاسلامؒ اس طرح فرماتے ہیں:

''اگر آج تمدن انسان کے لئے ضروری ہے تو اسلام آج کے دور میں اور زمانوں سے کہیں زیادہ ہے کیوں کہ آج کا تمدن بین الاقوامی ہے تو آج کے دور میں مذہب بھی بین الاقوامی ہی کار آمد ہوسکتا ہے۔ آج نہ تمدن میں انفرادیت چل سکتی ہے نہ تدین میں اور بین الاقوامی دین اگر ہوسکتا ہے تو اسلام ہوسکتا ہے۔''

مذاہب کے پرکھنے کا معیار

ذیل میں حکیم الاسلامؒ نے مذاہب کو پرکھنے کے تین اصول ذکر فرمائے ہیں:

''مذاہب کے پرکھنے کے بنیادی طور پر تین اصول ہیں۔ ایک روایت، ایک درایت، ایک عدالت یا نقل و انه لتنزيل رب العلمين عقل تبيانا لكل شئ عدل و تمت كلمة ربک صدقاً و عدلا روایت بمعنی استفادہ ہے نہ کہ محض نقل وتفوہ کہ منہ چلتی بات ہو، درایت بمعنی حکمت ہے نہ بمعنی فلسفہ، عدالت بمعنی توسط ہے نہ کہ افراط ہو نہ تفریط۔

اہل سنت والجماعت اور اس کے عناصر ترکیبی، کا خلاصہ ذیل کے چند جملوں میں فرمایا:

''۱-لا دين الا بالعلم ۲-ولا علم الا بكتاب الله ۳-ولا كتاب الا بمراده ۴-ولا يتبين مراده الا بسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم ۵-ولا تتضح السنة الا بكلام الفقهاء ۶-ولا يفيد كلامهم الا بالانصباغ ۷-ولا يتم الانصباغ الا بالتزكية ۸-ولا تتأتى التزكية الا بمعية الشيوخ وملازمتهم و اتباعهم.

علم کی حقیقت

حکیم الاسلامؒ کی زبان سے علم کی عارفانہ کا ایک نمونہ:

علم وہ ہے جو ایمان میں سے برآمد ہو کیوں کہ ایمان کی حقیقت دو چیزوں سے مرکب ہے، معرفت اور محبت۔ معرفت علم کا انتہائی مقام ہے اور محبت شغف وعشق کا ابتدائی مقام ہے۔ پس مؤمن وہ ہے جو

معرفت حق اور محبت حق رکھے اور اس معرفت کے راستہ سے پھر دوسروں کی معرفت کرے اور اس محبت کے ذریعہ سے دوسرے کی محبت کرے۔

''اقوام کے مزاج کے مطابق ہی احکام اترتے ہیں، یہود کا مزاج طبعاً تنگ تھا تو احکام بھی تنگ اور ضیق دیئے گئے، بغوی نے لکھا ہے کہ نوف البکائی الحمیدی نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو ہم سے ملاقات کے لئے منتخب کیا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے فرمایا کہ میں تمہارے لئے زمین کو مسجد اور پا کی حاصل کرنے کا ذریعہ بنادوں گا جہاں بھی تم پر نماز کا وقت آئے گا تم نماز پڑھو گے سوائے حمام یا قبر یا پائخانہ کے اور میں تمہارے دلوں میں سکینہ ڈال دوں گا تا کہ تم سکون حاصل کرنے کے لئے دنیا کے زیب وزینت کی طرف متوجہ نہ ہو، میں تم کو ایسا بنادوں گا کہ تم تورات کو بے دیکھے پڑھو گے، اس کو مرد عورت اور آزاد اور غلام اور چھوٹا اور بڑا پڑھیں گے، تو موسیٰ نے یہ بات اپنی قوم کو سکھائی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو مطلع کیا اور ان سے مشورہ لیا، گویا اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو یہ احکام قبول کرنے کے لئے اختیار کیا تو قوم نے کہا کہ ہم صرف کنیسہ میں نماز پڑھنا چاہتے ہیں اور ہم تورات بغیر دیکھے پڑھنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور ہم اس کو دیکھ کر ہی پڑھنا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تورات ان لوگوں کے لئے لکھوں گا جو پرہیز گاری اختیار کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں (تو اس سے کفار نکل گئے کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں کو بغیر دیکھے پڑھنے پر قادر نہیں ہیں اور وہ اپنی عبادت گاہوں کے علاوہ جہاں چاہے نماز نہیں پڑھتے ہیں) وہ لوگ جو ایک رسول نبی امی کی اتباع کرتے ہیں، اس کو اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں (تو اس سے یہود و نصاریٰ نکل گئے) وہ رسول ان کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور ان کو منکر سے روکتا ہے۔(۱۰۶)

اسلام کے پانچ بنیادی شعبے

دین اسلام کے پانچ شعبہ جات کی حکیمانہ تشریح اور بصیرت مندانہ تدابیر کا ذکر اس طرح فرمایا:

اعتقادات، عبادات، اخلاقیات، معاملات، سیاسیات۔

اعتقادات کی بنیاد توحید ورسالت پر ہے، اگر ان میں ایک بھی نہ ہو تو عقیدہ نہیں بن سکتا۔

عبادات کی بنیاد اخلاص واتباع پر ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو عبادت نہیں بن سکتی۔

اخلاقیات کی بنیاد مساوات وایثار پر ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو خلق مطلوب نہیں بن سکتا۔

انعام ابتدائی مقام ہے، ایثار درمیان اور احسان انتہائی ہے۔ اول خلق حسن ہے، دوسرا خلق کریم ہے، تیسرا

خلق عظیم ہے۔ معاملات کی بنیاد صدق وعفاف پر ہے۔ اگر ایک بھی نہ ہوتو معاملہ سچا نہیں ہوسکتا۔

سیاسیات کی بنیاد عدل وخشیت پر ہے۔ اگر ایک بھی نہ ہوتو سیاست تربیت نہیں بن سکتی لیکن ان تمام ابواب دین میں رسائی اور رسوخ حسن معاشرت اور صفائی معاملات پر موقوف ہے خواہ وہ تدبیر منزل سے تعلق رکھتے ہوں یا قبائل و ماحول اور حلقہ جات سے، تدبیر منزل میں خانگی امور بالخصوص عورتوں کی اصلاح ورعایت، ان کی عفت و پاک دامنی، حجاب و پردہ ان کی گھریلو تعلیم اولاد کی تربیت اور اداء حقوق وغیرہ، پھر قبائلی معاملات میں صدق وعفاف نیت کی اصلاح، رسوم مروجہ کی پابندی کے بجائے رسوم دین کی پابندی پر ہے۔ افراد درست ہوجائیں تو قوم درست ہوجاتی ہے، جس سے سیاست مدنی بنتی ہے اور اس طرح دین اور نظم دین دونوں صحیح رہ سکتے ہیں۔ اداءِ حقوق اور انسدادِ اتلاف حقوق کے لئے سیاست ہے۔ اسلام کی سیاست کی بنیاد جو سیاست نبوت ہے خوف خدا اور عدل حقوق کے لئے سیاست ہے۔ اسلام کی سیاست کی بنیاد جو سیاست نبوت ہے خوف خدا اور عدل پر ہے۔ مکروفریب، گندم نمائی اور جوفروشی پر نہیں یہ نفاق بقاء اقتدار اور حصول جاہ و مال کے لئے کیا جاتا ہے، لیکن اسلام نے ایسے اقتدار پسندی تخت وتاج اور بادشاہی کا خاتمہ کر کے خلافت رکھی ہے اور طالب اقتدار کو سونپنے کی ممانعت کی ہے وہاں تنازع للبقاء ہے اور یہاں فنا للبقاء ہے، وہاں اقتدار نفس ہے اور یہاں اقتدار رب ہے، وہاں اپنی بادشاہت ہے، یہاں خدا کی بادشاہت ہے، اس طرح جب معاشرت صحیح ہوگی تو امن وسکون ہوگا اور عبادت کے لئے سب سے پہلے امن وسکون کی ضرورت ہے۔ فتنہ میں عبادت کے بجائے خود نہیں رہتی، اس لئے اسلام نے دین پھیلانے کے لئے کبھی تلوار نہیں اٹھائی، فتنہ فرو کرنے کے لئے اٹھائی ہے۔ **و قاتلوھم حتی لاتکون فتنة و یکون الدین للّٰہ** پس عبادت ہو یا اخلاق، سیاست ہو یا نظم ملت، حسن معاشرت اور سچائی معاملات پر موقوف ہے اور اس میں فرد کی اصلاح و تربیت مقدم ہے، سیاست کے دو شعبے ہیں ایک تحفظ ملک کی سیاست، اسے بیرونی سیاست کہا جاسکتا ہے۔ ایک اندرونِ ملک معاملات اس کا نام محکمۂ قضاء اور شرعی عدالت ہے، جس سے شریعت مسلمانوں پر نافذ ہوتی ہے، پس قضاء کا کام مسلمانوں پر حکم شرعی کا اجراء اور عسکریت کا کام ہے، تحفظ ملک کے ساتھ اللہ کے ملک میں اس کے دین کا اجراء ونفاذ قضاء کے ساتھ قوت شامل ہوتی ہے، یہی فرق ہے افتاء اور قضاء میں لیکن اگر سیاسی قوت وشوکت نہ ہوتو پھر یہ ذمہ داری اخلاقی رنگ میں علماء اسلام پر عائد ہوتی ہے مگر اس میں دو باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک علم صحیح دوسرے فہم سلیم، مجتہدین کے فیصلے کمال علم پر دلالت کرتے ہیں جیسے کمال فہم پر دال ہیں۔

اکمال دین

حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ اکمال دین کا پہلا اثر توحید و رسالت میں ظاہر ہوتا ہے:

''الیوم اکملت لکم دینکم دین کی بنیادیں دو ہیں، توحید و رسالت، اس لئے تکمیل کا پہلا اثر اسی دور میں ظاہر ہوسکتا تھا اور وہ یہ کہ توحید تو اتنی کامل ہو کہ شرک کا شائبہ باقی نہ رہے اور رسالت اتنی کامل ہو کہ الحاد و اختراع یعنی بدعت کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہے ورنہ مطلق توحید اور مطلق رسالت تو ہر دور میں اور ہر امت میں رہی ہے۔''

انسان مرکز عالم ہے

اس عنوان کے تحت حکیم الاسلامؒ اکثر مقامات پر حکیمانہ انداز میں عجیب عجیب نکات بیان فرماتے ہیں:

''اسلامی کائنات کا مرکز انسان ہے، اس کے اردگرد سارے جہاں گھوم رہے ہیں اور منافع متعلقہ نمایاں ہو رہے ہیں۔ ان الدنیا خلقت لکم گویا اس سے دنیا وجود پذیر ہوئی ہے، اس لئے حضرت آدمؑ کو ساری کائنات بنانے کے بعد پیدا کیا کہ سامان پہلے مہیا ہو جائیں۔''

زبان و بیان

زبان و بیان اظہار مافی الضمیر کا ذریعہ ہے، حکیم الاسلامؒ ذیل میں مافی الضمیر کے اظہار کے مختلف وسائل کا ذکر فرمایا ہے:

الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمه البیان. حق تعالیٰ نے کائنات کو وجود بخشا جو انمول ہے، محض فضل ہے اللہ خالق کل شیٔ پھر ہر ایک کے مناسب اس میں ہدایت پیوست کی جس پر طبعاً وہ گامزن ہے جیسے ہر جانور کا اپنے اپنے مناسب حال گھونسلہ بنانا، غذا چن کر لانا، پال پرورش اور تسبیح الٰہی کرنا ربنا الذی اعطیٰ کل شیٔ خلقه ثم هدیٰ.

پھر ایک کو اظہار ضمائر پر قدرت دی کہ اپنے اپنے مناسب حال مافی الضمیر کا اظہار کرے، اس لئے جیسے ہر ایک کے بہت سے افعال طبعیہ میں ایسے ہی ہر ایک میں اظہار مافی الضمیر بھی طبعی ہے، یہ ضمائر کا اظہار جس سے دوسروں میں اپنے باطنی آثار پہنچائے جائیں وہ مختلف ہیں یعنی اظہار ضمائر دوسروں میں چند انواع ہیں، جو کتاب و سنت سے محسوس ہوتے ہیں۔

۱- القاء : ایک طریقہ اظہار ضمائر کا القاء و الہام سے کائنات کے اندروں میں اثر پہنچاتے ہیں،

بنص حدیث نبویؐ قلب کے دائیں جانب فرشتہ کا مقام ہے اور بائیں جانب شیطان کا اور دونوں اپنے اپنے ضمیر کی باتیں انسان میں پہنچاتے ہیں، فرشتہ ایماء بالخیر کرتا ہے اور شیطان ایماء بالشر، قرآن حکیم نے دونوں بنیادیں بتلائی ہیں، شیاطین کے بارے میں ارشاد ہے: **و ان الشیاطین لیوحون الیٰ اولیائهم لیجادلوکم و ان اطعتموهم انکم لمشرکون** ملائکہ کے بارے میں ارشاد ہے **الحمد للّٰہ فاطر السمٰوٰت والارض جاعل الملئٰکۃ رسلاً اولی اجنحۃ مثنٰی و ثلاث و رباع. اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلا و من الناس** اور رسالت کا حاصل ارسال رسالت ہے جو فکر و عمل کے لئے ہوتی ہے۔**اذ یوحی ربک الی الملائکۃ انی معکم فثبتوا الذین آمنو**یہ ارسال ظاہر ہے کہ دلوں میں نہیں ہوتا جس میں نہ صوت ہے نہ آواز لفظ مگر سب کچھ سمجھ اور سمجھا لیا جاتا ہے، اظہار ما فی الضمائر کا یہ طریقہ الہام کہلاتا ہے۔

دوسرا طریقہ ہیئات میں ہیں کہ کبھی ہیئت کذائی سے ضمائر کا اظہار کیا جائے، دوسرے کو متاثر کیا جائے یہاں لفظ نہیں ہوتے، آواز نہیں ہوتی مگر بات سمجھی جاتی ہے، کبھی ایک ہیئت سے تسلیم و رضاء کا اظہار ہوتا ہے، آواز و صوت نہیں ہوتے۔

تدبیر و علاج

فتن و مہالک سے حفاظت کی کچھ شرعی تدابیر اور علاج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

”آج فتن و مہالک کا دور دورہ ہے، مسلمانوں کے لئے شخصی اور قومی اجتماعی فتن اور ہلاکتوں کی بہتات ہے، مسلمانوں کے جان و مال کا اتلاف ہے، قوت دفاع تک ان کے پاس نہیں چہ جائے کہ ہجوم و اقدام کی قوت ہو، اس صورت میں بچاؤ کی کیا شکل ہے؟ سو اس صورت میں حق تعالیٰ نے راستے بتلا دیئے ہیں جو چار اجزاء پر مشتمل ہیں۔

سب سے پہلے دین کا تحفظ سو اس کے لئے فرمایا **یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللّٰہ و کونوا مع الصادقین** تقویٰ کے مراتب اور معیت و مجاورت و ملازمت کے طبعی اور عقلی اثرات سے دین کا تحفظ ہوگا یعنی عوام کے لئے ضروری ہے کہ وہ بلحاظ دین درست رہیں۔ دوسری چیز دنیا ہے سو اس کے لئے فرمایا **ولاتتمنوا ما فضّل اللّٰہ بہ بعضکم علیٰ بعض للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن واسئلوا اللّٰہ من فضلہٖ** اس میں حریصانہ اور حاسدانہ نگاہ سے بچا کر طلب حلال کی طرف متوجہ کیا گیا ہے یعنی کسب معاش کا وجود ضروری قرار دیا ہے۔

حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے اسی لئے ایک ہزار صنعتیں سکھلائی تھیں کہ دنیا ان سے کماؤ، دین کے ذریعہ دنیا نہ بناؤ، اس طرح پیشے رکھے گئے غرض صنعت وحرفت، پھر تجارت و ملازمت وغیرہ اب آگے مسلمانوں کی قومی شیرازہ بندی ہے جس سے ان میں اجتماعیت بحال ہو اور شوکت قائم ہو کہ اس کے بغیر فرد کا وجود باقی نہیں، سو اس کے لئے ابن کثیر کی حدیث ہے، جس میں پانچ اسباب شوکت بیان فرمائے گئے ہیں۔ فرمایا مجھے پانچ چیزیں عطا کی گئیں ہیں: **الجماعة، السمع، الطاعة، الهجرة، الجهاد.**

جماعت بغیر مرکز کے نہیں ہوتی تو انتخاب امیر و امام ناگزیر ہو اور پھر سمع و طاعت اور آخر کار ہجرت وجہاد ہے، یہ شوکت وقوت کی فراہمی ہے، یہ نہ ہوں تو پیدا کرنے کی سعی کی جائے۔ **و اعدوا لهم ما استطعتم** ضرورت ہے کہ تنظیم ہو پھر توسیع اثر و اضافۂ حلقہ ہوتا کہ برادری اسلامی پڑھے تو اس کے لئے دعوت رکھی گئی ہے۔ **ادع الى سبيل ربك بالحكمة** بالمعروف اور نہی عن المنکر اور نصیحت ان چار اجزاء پر عمل درآمد ہو گا تو مصائب سے بچاؤ ہو گا۔

اسلام جامع دین ودنیا ہے

اسلام میں دین اور دنیا دونوں کے حالات کی رعایت اور دونوں کے مناسب تعلیمات موجود ہیں۔ حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں:

فرمایا: ”اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس نے معانی اسلام میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کو جوڑ دیا ہے، نماز طلب آخرت ہے، دنیا سے یکسو ہو کر اور زکوٰۃ ہمواریٔ دنیا و معاملات دنیا ہے لوجہ اللہ، وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کے لئے نصاب شرط ہے اور نصاب کے لئے کسب معاش اور طلب حلال کہ اس کے بغیر عبادت ادا نہیں ہو سکتی تو جیسے نماز سے دین کی طرف متوجہ کیا گیا ہے ایسے ہی زکوٰۃ سے دنیا کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے، جس سے اسلام کا جامع دین ودنیا ہونا واضح ہے۔“

انسانیت کے حقوق

اسلام انسانی حقوق کی رعایت اور تحفظ کا علمبردار ہے۔ قرآن کریم اور حدیث رسولؐ میں حقوق اللہ کے دوش بدوش حقوقِ انسانی کا جا بجا ذکر ملتا ہے۔ حکیم الاسلامؒ نے اس عنوان کے تحت تفصیلی گفتگو فرمائی، جس کا خلاصہ یہ ہے:

”سب سے پہلی چیز انسانی کرامت ہے جو اسلام نے قائم کی ہے۔ **ولقد كرمنا بني آدم** جس کی

صورت یہ ہے کہ اسے خالق کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکایا، **ان الدنیا خلقت لکم و انکم خلقتم للآخرۃ** جس سے واضح ہے کہ کمال توحید سے بڑھ کر عمومیت اور ہمہ گیری کسی اور دائرہ میں نہیں ہے۔

پھر یہ کرامت بلا امتیاز وتخصیص رکھی ہے اور اسے بنیادی حقوق میں شمار کیا ہے جو سارے انسانوں کے حق میں برابر ہیں۔ **کما فی الحدیث لا فضل لعربی علی عجمی ولا لابیض علی اسود الا بالتقویٰ.**

اخوت

اخوتِ انسانی قرآنی مضامین کا ایک بنیادی حصہ ہے۔ حکیم الاسلامؒ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''سارے انسانوں کو ایک برادری اور ایک کنبہ بنانا چاہتا ہے۔ **وحدۃ الاسرۃ الانسانیۃ کما فی الحدیث الخلق کلھم عیال اللّٰہ واحبھم الیہ وانفعھم لعیالہ.**

تعارف وتعاون باہمی کی دعوت عامہ تمام بنی نوع انسان کے لئے **لا ینھاکم اللّٰہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیھم.**

انسانی حریت یعنی ضمیر کی آزادی کہ اس کے فکر پر کسی دوسرے کا جبر واکراہ نہیں حتی کہ دین میں بھی نہیں، **فضلاً عن الدنیا کما فی قولہٖ تعالیٰ لا اکراہ فی الدین.**''

رحمت وشفقت عامہ

اسلام میں شفقت ومحبت کی تعلیم ہے، نفرت وعداوت اسلامی تعلیم کے منافی ہے:

''غلاموں کو بھی بھائی بنادیا ہے۔ اس ہمہ گیری میں تعصّبات حائل ہوسکتے تھے جیسے جماعتی جو کسی معتقد کو سامنے رکھ کر پیدا ہوتا ہے کہ میرا ہادی ایسا اور دوسروں سے کم رتبہ، کبھی مذہبی تعصب ہوتا ہے کہ میرا مذہب ایسا اور دوسروں کا کم حیثیت، کبھی وطنی تعصب ہوتا ہے کہ میرا وطن اونچا اس لئے اس کے بسنے والے ایسے، کبھی نسل اور رنگ وروپ کا تعصب ہوتا ہے کہ ہم گورے اس لئے ہمارے حقوق اونچے اور وہ کالے، لہٰذا ان کے حقوق نہیں، کبھی جماعتی تعصب مقتداؤں کی تفضیل وتنقیص سے پیدا ہوتا ہے تو اسلام نے اسے مٹادیا اور تمام انبیاء سابقین پر ایمان لانا فرض عین اور جزو ایمان قرار دیا۔ **قولوا آمنا باللّٰہ وما انزل الیٰ ابراھیم.**''

عالم دو ہی میں

دنیا وآخرت کی ایک دلنشیں تشریح اور کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ:

”عالم دو ہی ہیں جنہیں ہر شخص ماننے پر مجبور ہے ایک دنیا اور ایک آخرت۔ دنیا ولادت سے شروع ہوتی ہے اور آخرت موت سے۔ یہ دونوں چیزیں ناممکن الانکار ہیں لیکن دنیا اور آخرت کا باہمی ربط کیا ہے، اس کے سمجھنے میں مختلف اقوام غلطیوں کا شکار ہوگئے ہیں۔ بعض نے دنیا کے معنی سمجھنے میں غلطی کی سو محض تخیلات ہے، حالاں کہ ان دونوں کی بنیادیں سمجھنے کے لئے نقل مستند کی ضرورت تھی، یہ غیبی چیز تھی جسے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے سمجھا جاتا نہ کہ عقل محض سے، جو خود انسان کا اپنا ہی ایک خلقی مادہ اور طبعی غریزہ ہے اور محض محسوسات تک محدود ہے، غیبیات کے دائرہ سے اس حاسہ کا تعلق ہی نہیں۔ بعض اقوام نے تو آخرت کے معنی یا موت کے معنی فناء مطلق سمجھے کہ جو گیا وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ اب نہ اسے پھر زندہ ہونا ہے نہ کہیں جانا ہے۔ اس کا ثمرہ یہ نکلا کہ ان کا تمام تر مقصد دنیا ہی دنیا رہ گئی اور وہ اسی میں منہمک ہو کر ختم ہوگئے۔ یہ وہ متمدن اقوام ہیں جن کا دین ہی تمدن اور اس کے وسائل عیش کی تکثیر اور اس کے جوڑ توڑ میں عمر ختم کر کے مٹی میں جا کر ملنا ان کا پیغمبران کی عقل نارسا اور مادۂ دین یہی عناصر اربعہ اور شریعت بدنی منافع کا جوڑ توڑ لگاتے رہنا ہے۔“

عقل محض اور شرعی لائحہ عمل

عقل انسانی قانون سازی کی اہلیت نہیں رکھتی، قانون پر عمل کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا قوانین وضع کرنے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے:

”عقل محض شرعی پروگرام نہیں بنا سکتی یعنی قانون جو جزئیات مطلوبہ پر مشتمل ہو یہ کام وحی کا ہے کیوں کہ جزئیات مطلوبہ کے معنی مرضی الٰہی کے ہیں اور مرضی بالحق کا پتہ عقل محض سے نہیں چل سکتا بلکہ وحی سے ہوسکتا ہے اور اگر کچھ بنا بھی لے اور یہ سمجھ لے کہ یہی مرضی ہوگی جو معقول ہے حالاں کہ یہ ضروری نہیں کیوں کہ عقلیں متفاوت بھی ہیں اور مریض بھی ہوتی ہیں تو وہ اعمال پر آثار اور ان کے ذاتی خواص کا پتہ نہیں چلا سکتی، جیسے مادیات میں چل جاتا ہے کہ زہر کی خاصیت موت ہے امرتِ کی حیات وہ یہ نہیں بتلا سکتی کہ مثلاً وضوء کی کیا خاصیت ہے؟ بخار کی کیا ہے؟ اور ان کے عواقب کی صورت مثالی کیا ہے؟ کیوں کہ ہر عمل کی ایک صورت مثالی ہے، عالم مثال میں عقل اس کے ادراک سے عاجز ہے، جیسے مال کی شکل بلحاظ آثار کے سانپ کی ہے، غضب کی صورت آگ کی ہے، رحمت کی شکل پانی کی ہے، گناہ کی شکل نجاست کی ہے، نوع نیکی کی شکل طہور کی ہے اور بفرض محال اگر خواص اعمال کا پتہ چل بھی جائے تو ان کی مقبولیت عنداللہ کا پتہ نہیں چلا سکتی کہ وہ خود قبول بھی ہوں گے یا نہیں۔“

موجودہ دنیا کی ترقیات

ترقی کھانے پینے اور وسائل معیشت کو بہتر بنانے کا نام نہیں ہے۔ ترقی کی حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی اعتبار سے انسان آگے بڑھے:

''ترقی نام کھانے پینے یا وسائل معیشت کو خوبصورت بنانے یا ان کے بڑھا لینے کا نہیں ہے کہ یہ تو حیوانی اور بہیمی ترقی ہے، انسان کی ابتدائی ترقی عقلی ہے یعنی انسانی ترقی، درحقیقت مصالح کلیہ کی رعایت کا غلبہ ہے جو عقل سے ہوتی ہے اور امور عقلیہ میں ترقی ہے اور آگے بڑھ کر امور عرفانیہ میں ترقی ہے وہ اس سے اعلیٰ ہے کہ مشاہدہ حق ہو جائے اور ان چیزوں کا جسے اخلاقی کہتے ہیں۔''

عقل و عشق

اس عنوان کی اشعار کے ذریعہ ایک دلنشیں تشریح:

فرمایا: کام عقل سے نہیں ہوتا جذبہ سے ہوتا ہے اور وہ جذبہ ہی عشق ہے مطلوب کے ساتھ۔

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد است فرزانہ کہ فرزانہ نہ شد

عشق گوید شش جہت راعیست حدے بیش نیست

عشق گوید ہست را ہے بارہا من رفتہ ام

حدیث رسول کے معتبر ہونے کا ماخذ اور دلیل

حدیث رسولؐ درحقیقت قرآن کریم کی تشریح وتفسیر:

''حق تعالیٰ نے فرمایا: **وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم** سے واضح ہوا کہ رسول حق کا کام بیان قرآن ہے، جن الفاظ میں رسول بیان قرآن فرمائیں یا بیان کے سلسلہ میں جو مضمون ارشاد فرمائیں وہی حدیث ہے۔

حقوق

غیر مسلموں کے حقوق کی بھی اسلام نے رعایت کی ہے مگر کہاں تک؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

''غیر مسلموں کے حقوق اسلام نے کافی مانے ہیں لیکن اس کا مطلب ادغام یا شکست حدود یا اسلامی

شعائر کی برہمی نہیں ہے جیسے فی زمانہ مسلمان غیر مسلموں سے شادیاں کرنے لگے یا ہندوؤں کو تہواروں میں شرکت کی دعوت دینے لگے۔ ایک ہے کسی قوم سے وفاق اور اس کی رعایت اور اس کے حقوق کی ادائیگی اور ایک ہے اس میں مدغم ہو جانا یا کسی کی خاطر اپنے حقوق ختم کر دینا، پس دوسروں کے حقوق ادا کئے جائیں لیکن ان کی خاطر اسلامی حقوق کی پامالی کسی حالت میں جائز نہیں ہے۔

ذکر اللہ

ذکر کی مختلف قسموں کے لئے اہل تصوف نے مختلف اصطلاحات قائم کی ہیں۔ حکیم الاسلامؒ ان اصطلاحات کی وضاحت فرماتے ہیں:

فرمایا: ''ذکر ہی سے نفس میں صفائی، قلب میں نور ہوتا ہے جس سے طاعت کی رغبت ہوتی ہے اور جتنی غفلت بڑھتی جائے گی اتنی ہی نفس میں ظلمت اور کدورت بڑھتی ہے، ذکر کے مخصوص کلمات احادیث میں تلقین فرمائے گئے ہیں اور وہ دس انواع ہیں یعنی تسبیح و تہلیل، تکبیر، حوقلہ، استغفار، تصلیہ، تعوذ، دعاء، تلاوت۔ اگر کوئی اذان ہی سیکھ لے تو ذاکر بن جائے گا، جس کا مطلب یہ ہے کہ زبان اور کان سے ہی صرف اذان کا کام نہ کیا جائے بلکہ قلب سے اذان کہی جائے اور اس کی حقیقت کو سمجھا جائے۔

ان اذکار کے مناشی یہ ہیں، تنزیہہ کے لئے تسبیح ہے، تنویہہ جس کے لئے تحمید ہے، توحید جس کے لئے تہلیل ہے، تعظیم جس کے لئے تکبیر ہے، تفویض جس کے لئے حوقلہ ہے تخلیہ جس کے لئے استغفار ہے، تعوذ جس کے لئے استعاذہ ہے، تبرک جس کے لئے بسملہ ہے، تقبل جس کے لئے تصلیہ ہے، محادثہ جس کے لئے تلاوت ہے۔''

فتم میقات ربہٖ اربعین لیلۃ

یہ عنوان قرآن کریم کی آیت سے قائم فرمایا گیا ہے، ذیل میں اس کی حکیمانہ تشریح ملاحظہ ہو:

فرمایا: ''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اربعین کو تکمیل شئے میں دخل ہے، ثلثین لیلۃ پر آٹھ نو کا اضافہ نہیں کیا گیا بلکہ عشر کا اضافہ کر کے اسے **فتم میقات ربہ** فرمایا گیا جس سے واضح ہے کہ عشر ذریعہ تکمیل نبوت کا تھا یعنی اربعین کو تو دخل ہے ہی تکمیل میں مگر عشر کو بھی ہے ورنہ ثلثین پر عشر کا اضافہ نہ کیا جاتا، حاصل یہ ہے کہ یہ اربعین کی ملاقات جب کہ عشر سے مکمل ہوئی یعنی مجموعی حیثیت سے تو اس پر بھی غور کیجئے کہ یہ اربعین اجزاء کی حیثیت سے بھی چار عشروں کا مجموعہ ہو تو اربعین بھی عشرات سے مکمل ہوئے اور

پھر وہی اربعین وجہ بنی اپنے مظروف کی تکمیل کا تو نتیجہ یہ نکلا کہ عشر ذریعہ تکمیل ہے، ایک عشر ہو تب بھی تکمیل کنندہ ہوگا اور کئی عشر مل جائیں تو مجموعی مدت کی تکمیل بڑھ جائے گی، غرض عشر ذریعۂ کمال ثابت ہوا۔''

تکمیل خلافت

حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خلافت ارضی کا منصب عطا فرمایا ہے جو آغازِ کائنات سے آخر تک قائم رہے گا:

''انسان ازلی نہیں ابدی ہے وہ الست سے چلا اور ابد تک درمیانی عوالم سے گزرتا چلا جائے گا۔ لہٰذا اس کی زندگی کا نصب العین کسب مال اور انتفاع نہیں ہوسکتا، یہ تو صرف ایک عالم کی چیز ہے اور عمر اس کی آگے تک ہے، پس وہ نصب العین کیا ہے جو اس کی ابدی زندگی تک پھیلا ہوا ہے بلکہ جتنا آگے بڑھتا جائے اتنا ہی یہ نصب العین نکھرتا جائے، وہ خلافت یعنی انسان دنیا میں بحیثیت خلیفہ الٰہی کے لایا گیا ہے کہ یہ نائب حق بن کر رہے اور حق دائم قائم ہے تو اس کی نیابت بھی دائم و قائم رہنی ضروری تھی، اس کا فرض ہے کہ دنیا کا نظام بطور نیابت قائم کرے اور حق کی منادی کرے، اللہ نے اس کی عظمت شان کے خلافت کی وجہ سے بڑھائی اور اسے ساری مخلوقات پر فضیلت اور برگزیدگی کی عطا فرمائی، اس کی نوعی زندگی کا آغاز ہی اس مقصد کے اظہار کے لئے ہے، پھر اختتام تک خلافت کی نوعیت باقی رکھنی ضروری تھی تا کہ نظام قائم رہے۔ (۱۰۷)

............❖............

مکتوبات

''مکتوبات'' شخصیت کی ذہنی کیفیات، اخلاق و اعمال، سیرت و سلوک اور اس کی اندرونی صلاحیتوں کے عکاس ہوتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیراہن ہر پیکرِ تصویر کا

غالب کے مکتوبات ان کے ہم پلّہ اور معاصر شعراء کے مکتوبات میں غالبؔ ہی کی طرح اپنا ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ''غالبیات'' کے ماہرین و ناقدین کے کانوں سے اگر غالب کے مکتوب کا ایک فقرہ بھی ٹکرا جائے تو آنکھیں بند کر کے بہ آسانی بتا دیں گے کہ یہ غالب کا اسلوب، غالب کا طرز بیان اور غالب کا فکر و فلسفہ ہے، یہ ایک مثال ہے۔ مکتوبات کے مضمون اور اسلوب سے مکتوب نگار کے تعین اور اس کی شخصیت کی علمی دنیا میں، آیئے تو اس دعویٰ کی ایک نہیں سینکڑوں دلیلیں مل جائیں گی۔

حکیم الاسلامؒ مکتوب نگاری کے باب میں بھی سب سے منفرد اور ممتاز ہیں۔ آپ کے مکتوبات کے دستیاب اور مطبوعہ ذخیرہ سے چند ایک کا انتخاب اس باب میں بطور نمونہ پیش کیا جا رہا ہے ورنہ آپ کا ہر مکتوب اپنی جگہ پر علم و دانش کا ایک خزانہ عامرہ ہے۔

حکیم الاسلامؒ کے مکتوبات میں زیادہ تر علمی و دینی سوالات و استفسارات کے جوابات ملتے ہیں جو سیکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کے بعد بھی نہیں مل پاتے، جواب کا اسلوب ''مفتیانہ'' کے بجائے حکیمانہ و شارحانہ ہے اور انتہائی مسکت و مدہش ہے۔

جناب مولانا محمد وصی صاحب ضلع دربھنگہ کے رہنے والے ہیں جناب نے کلام پاک کی کچھ سورتوں اور آیات کی بالکل جدید تفسیر لکھ کر حضرت مہتمم صاحبؒ کی خدمت میں آپ کی رائے معلوم کرنے کے لئے بھیجی تھیں۔

مولانا محمد وصی صاحب کی تفسیر کا نمونہ درج ذیل ہے:

لکھتے ہیں کہ: اِذَا جَاءَ نَصرُ اللّٰهِ سے مراد مفید ہوا اور بارش ہے جس کو دیکھ کر لوگ فوج در فوج مسرت کے ساتھ اللہ کے دین و کام میں جو ''زراعت'' ہے جس کو خدا نے ''نَحنُ الزّٰرِعُونَ'' کہہ کر اپنا کام اور دین قرار دیا ہے۔ خوشی کے ساتھ لوگ اس میں داخل ہو جاتے ہیں اور مسرت کا اظہار لفظ اَفوَاجاً سے

ہوتا ہے۔ اس جگہ دِیۡنُ اللّٰہ سے زراعت مراد ہے اور نصر اللہ سے مفید ہوا مراد ہے اور فتح سے مناسب بارش مراد ہے، اس لئے کہ اس میں خون ریزی ہو کر لوگوں کو کچھ جانی نقصان پہنچا ہے، جو خدا کی عام مدد کے خلاف ہے۔ فوج کی مدد سے جو ملک فتح ہوتا ہے اس کے متعلق خدا کا فرمان ہے اِنَّ الْمُلُوۡکَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡیَۃً اَفۡسَدُوۡهَا وَجَعَلُوۡا اَعِزَّۃَ اَهۡلِهَا اَذِلَّۃً. الخ اور فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ استغفار کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاشت کاری سے عدم واقفیت کا اظہار فرما دیا تھا۔

ذیل میں حضرت حکیم الاسلامؒ کا حکیمانہ جواب ملاحظہ ہو۔

محترمی، زید مجدکم سلام مسنون!

گرامی نامہ پہنچا، بوجہ کثرت کار و ہجوم اسفار جواب میں تاخیر ہوئی، معذرت پیش کرتا ہوں۔

آپ نے سورۂ فتح کی جو کاشت کارانہ تفسیر فرمائی ہے اس کی سند اور ماخذ کیا ہے؟ یعنی یہ تفسیر سلف میں سے کسی نے کی ہے یا محض آپ کا تخیل ہے؟ اگر کی ہے تو اس کا حوالہ تحریر فرمائیں اور اگر یہ بلا سند محض تخیل ہے تو اگر کوئی لوہار اس کی لوہارانہ تفسیر لکھے اور کہے کہ دین اللہ سے مراد فولاد سازی ہے اور نصر اللہ سے مراد لوہا بنانے کی بھٹی ہے اور دھونکنی ہے اور یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ سے مراد فولادی فیکٹریوں مزدور اور کاری گروں کا داخلہ ہے اور فتح سے مراد فیکٹری کے آہنی مال کی دنیا میں سپلائی ہے جس سے مالی فتوحات کا دروازہ کھل جاتا ہے اور استغفار کا حکم لوہاروں اور آہنی فیکٹریوں کے کاریگروں کو ہے حضورؐ کو نہیں، یا اسی طرح ایک نجّار اس سورت کی ایک نجّارانہ تفسیر لکھے کہ دین اللہ سے مراد لکڑی کی صنعت ہے اور نصر اللہ سے مراد آرا مشین اور نہانی و بسولہ ہے اور دخول افواج سے مراد فرنیچر کے کارخانوں میں کاریگروں کا داخلہ اور استغفار کا حکم حضورؐ کو نہیں بلکہ بڑھئیوں کو ہے تو کیا اپنے تخیل کے نقطۂ نظر سے اس کو قبول فرماویں گے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اور اگر قبول فرماویں گے دراں حالے کہ آپ کے تفسیری کی نفی ہوگی تو آپ نے خود ہی اپنے تفسیر کی نفی کر دی اور اسے رد کر دیا۔ اب اگر اسی طرح دوسرے لوگ بھی اس صورت حال کے ہوتے ہوئے اسے رد کر دیں تو اس میں کیا حرج ہے؟ اور جب یہ تفسیر اسی رد و نفی کے کنارہ پر ہے تو اگر یہ کہہ دیا جائے کہ ایسی ردی چیز تفسیر نہیں ہو سکتی تحریف ہوگی تو اس میں کیا قباحت ہے؟ مقصد یہ ہے کہ آپ کے نزدیک تفسیر کا معیار کیا ہے اور تفسیر کے معنی کیا ہیں جسے پیش نظر رکھ کر آپ کی اس تفسیر کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکے۔

والسلام

محمد طیب مہتمم دار العلوم دیو بند

۱/۶/۹۰ھ

مکتوب

محترمی زادمجدکم سلام مسنون، نیا مقرون، گرامی نامہ نے ممنون یادآوری فرمایا۔نورالایضاح کا واقعہ تو میرے علم میں نہیں ہے لیکن حضرت علامہ محمد انور شاہ رحمۃ اللہ کی حیرت انگیز قوت حافظہ کا جو واقعہ خود میرے ساتھ پیش آیا وہ عرض کئے دیتا ہوں۔

مجھے اپنی ایک تصنیف کے سلسلہ میں ابوالحسن کذاب کے سوانح حیات کی ضرورت تھی، میں نے اس کے لئے حضرت شاہ صاحبؒ سے ماخذ دریافت کئے تو حضرتؒ نے متعدد کتابوں کے حوالے دیدیئے کہ ان میں ابوالحسن کے حالات مل جائیں گے۔میں نے عرض کیا کہ حضرت میں کہاں تلاش کرتا پھروں گا آپ خود ہی کچھ فرمادیں۔اس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے برجستہ ابوالحسن کذاب کا سن ولادت سے لے کر سن وفات تک اس کے اجمالی حالات ترتیب وار اور مسلسل بیان فرمائے اوراس کے کذب وزور کے متعدد واقعات سنائے۔ مجھے خیال گذرا کہ حضرتؒ نے شاید ابھی حال ہی میں یہ حالات مطالعہ کئے ہیں جو سنین تک یاد ہیں، چنانچہ حضرت کے سامنے میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو فرمایا کہ نہیں مولوی صاحب! تیس، چالیس سال کا عرصہ ہوا جب مصر جانا ہوا تھا، وہاں کے ایک کتب خانہ میں اتفاق سے ابوالحسن کے حالات پر ایک کتاب ہاتھ میں آگئی تھی، کتب خانہ کی الماری کے قریب کھڑے کھڑے اس کا مطالعہ کرلیا تھا، اب آپ کے دریافت کرنے پر وہ حالات من وعن مستحضر ہوگئے۔

درس حدیث کے دوران میں حضرت شاہ صاحبؒ کے غیر معمولی حافظہ کے واقعات کم وبیش روزانہ مشاہدہ میں آتے رہتے تھے، مسائل کی بحث میں بے تکلف، نہ صرف کتابوں کے حوالے دیتے تھے بلکہ صفحات اور سطر تک کی نشاندہی فرمادیا کرتے تھے۔ان میں بعض کتابیں ایسی بھی ہوتی تھیں جن کے مطالعہ پر کم وبیش چالیس، چالیس سال کی طویل مدت گزر چکی تھی

والسلام

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲۹ر۷ر۸۲ھ

مکتوب

محترمی زید مجدکم

سلام مسنون! گرامی نامہ صادر ہوا، خطبہ جمعہ ہو یا عیدین کا، وعظ و تذکیر کے لئے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ وعظ و تذکیر میں وہی باتیں بیان کی جاتی ہیں جو وقتی ہوں اور جن کی ضرورت ہو، وقتی مسائل ہی ان خطبات کا اصل موضوع ہوتے ہیں، اس لئے اس میں تمام باتیں ایسی بیان ہونی چاہئیں جو مسلمانوں کے لئے مفید اور ضروری ہوں، اس لئے اگر بر سبیل تذکرہ ''ہریجن لیڈر'' کا ذکر خطبہ میں آجائے تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے بلکہ اگر اس طرح کے ذکر سے مسلمان متوجہ ہو سکیں تو خطیب کے لئے توجہ دلانا ضروری ہے۔

جن صاحب نے اعتراض کیا ہے ان کا یہ اعتراض دینی جذبہ کے تحت خلوص پر مبنی معلوم ہوتا ہے، ان کا جذبہ غالباً یہ ہوگا کہ منبر جیسی پاکیزہ جگہ پر ''ہریجن لیڈر'' اور اس طرح کی غیر پسندیدہ باتوں کا ذکر نہ آنا چاہئے، ان کا یہ جذبہ بہر حال قابل قدر ہے مگر جذبات کا عقل سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں ہے، شرعی مسائل کی بنیاد حقائق پر ہوتی ہے، جذبات و تصورات پر نہیں۔

معترض کو اسی نہج پر نرمی سے سمجھائیے اور ان سے کہئے کہ قرآن کریم میں بھی آخر ایسی بہت سی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی ناپاکی کی وجہ سے ہم انہیں پسند نہیں کرتے لیکن چوں کہ یہ ذکر ضرورتاً کیا گیا ہے اس لئے ان کے ذکر نہ آتا، اس سے معلوم ہوا کہ ناپاک اور ناپسندیدہ کا ذکر ضرورتاً کیا جاسکتا ہے اور اسے قرآن کریم نے جائز رکھا ہے۔

اگر معترض کو اس انداز پر موثر طریق سے سمجھایا گیا تو امید ہے کہ انشاء اللہ ضرور سمجھ جائیں گے۔

والسلام

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۸۲/۱۱/۱۴ھ

مکتوب

آج حیدر آباد (آندھرا) سے آئے ہوئے بعض دوستوں کے خطوط سے علم ہوا کہ حیدر آباد کی قادیانی جماعت نے احقر کی تقریر سے جو ۱۶/نومبر ۱۹۶۳ء کو مکہ مسجد حیدر آباد میں یوم افضل الانبیاء کے موقع پر ہوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی سعی کی ہے، اس کی تصدیق قادیانیوں کے ایک مطبوعہ پمفلٹ سے ہوئی۔

(۱) بعض جملے افترا پردازی سے اس میں خود اضافہ کئے گئے ہیں جیسے ''لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل النبیین کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ آپ کو دیگر انبیاء کی نسبت بعض باتوں میں فضیلت عطا ہوئی ہے، ص۲'' یہ کذب محض ہے نہ میری تقریر کا یہ کوئی جملہ ہے نہ میرا یہ عقیدہ ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ تمام انبیاء علیہم السلام سے علی الاطلاق اور کمالات نبوت میں کلیۃً فائق ہیں جس کا مدلل دعویٰ تمام انبیاء نے شب معراج میں کیا۔

(۲) بعض جملوں کے مطلب بیان کرنے میں تحریف کی گئی ہے جیسے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں سب سے اول بھی ہوں اور سب سے آخر بھی ہوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انبیاء آپؐ کے متبع ہیں لیکن آپ کسی کے متبع نہیں۔

اولیت اور آخریت کا یہ مطلب میری طرف منسوب کرنا محض افتر پردازی اور دھوکہ دہی ہے، نہ میرا یہ جملہ ہے، نہ میرا مفہوم، نہ آخریت کے یہ معنی ہوسکتی ہیں۔ آخریت کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ سب انبیاء کے آخر میں تشریف لائے اور آخری پیغمبر ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی بھی کسی قسم کا آنے والا نہیں، میرا اور میرے بزرگوں کا یہی عقیدہ ہے۔ ہمارے نزدیک جو شخص حضورؐ کے بعد کسی نبی کی بعثت مانتا ہے یا امت محمدیہ میں حضورؐ کے بعد وحی کا سلسلہ غیر مختتم سمجھتا ہے وہ دائرۂ اسلام سے خارج، مرتد اور کافر ہے۔ آپؐ ذاتی طور پر خاتم النبیین ہیں کہ آپؐ تمام کمالات نبوت کا منتہیٰ ہیں اور جس نبی میں نبوت کا جو کمال بھی آیا ہے وہ آپؐ کے فیضان سے آیا ہے اور زمانی طور پر بھی خاتم النبیین ہیں کہ آپؐ ہی سب انبیاء کے بعد میں مبعوث ہوئے اور آپؐ کے بعد کوئی نبی، کوئی شریعت، کوئی آسمانی کتاب اور کوئی وحی آنیوالی نہیں۔ میں نے صاف لفظوں

میں بیان کیا تھا کہ ختم نبوت کے معنی تکمیل نبوت کے ہیں جس کی تشریح یہ تھی کہ نبوت حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر آ کر تمام مراتب کے ساتھ ختم ہوگئی اور کوئی درجہ نبوت کا باقی نہیں رہا کہ اس کو دنیا میں لانے کے لئے کسی نبیؑ کو مبعوث کیا جائے، یہی کامل اور آخری نبوت قیامت تک کے لئے کافی ہوگئی ہے اور ابد تک باقی رہے گی، جیسے سورج نکلنے کے بعد نور کا کوئی درجہ باقی نہیں رہتا کہ کسی ستارے کی ضرورت پڑے ایسے ہی حضورؐ کے بعد کسی ستارۂ نبوت کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

(۳) بعض نتائج کذب بیانی کے ساتھ میری تقریر سے اخذ کر کے میری طرف منسوب کئے گئے جیسے:

''اب آئندہ کوئی نبی نہیں آئے گا جو ایک ایسے مرتبہ کا حامل ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا ہے۔''

یہ جملہ نہ میری تقریر کا ہے نہ اس کے مفہوم کو میں اسلامی مفہوم جانتا ہوں جب کہ ہم لوگ اس کے قائل اور مدعی ہیں کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی ہی سرے سے مبعوث ہونے والا نہیں تو ایسے ویسے کا کیا سوال۔ یہ نتیجہ میرے کسی مفہوم کی طرف منسوب کرنا محض کذب بیانی اور افترا پردازی ہے، میں نے اسی لئے خاتم النبیین کی تحقیق کرتے ہوئے اس کے نیچے اولیت کے ساتھ آخریت کا درجہ بھی صاف لفظوں میں بیان کر دیا تھا اور عرض کیا کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں، اس لئے خاتمیت کو بمعنی منتہائے کمالات لے کر آپؐ کی آخریت کے مقام کو حذف کر جانا یا اس کی یہ غلط تشریح کرنا کہ نبوت بایں معنی اب بھی باقی ہے کہ حضورؐ کے بعد نبی مبعوث ہوسکتا ہے زیادہ سے زیادہ وہ آپ کا متبع رہے گا، محض افترا پردازی اور دھوکہ دہی ہے، ہم اس شخص کو کافر اور خارج از اسلام سمجھتے ہیں جو حضورؐ کے بعد کسی نبی کی بعثت کا قائل ہو خواہ مستقل، خواہ تابع غیر مستقل، یا اس امت میں وحی کا سلسلہ غیر مختتم جانتا ہے اور کہتا ہے کہ نبوت کا دروازہ حضورؐ کے بعد بند نہیں ہوا کہ جس طرح موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل میں بند نہیں تھا اور وحی کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا اور امت موسوی میں نبی مبعوث ہوتے رہے تھے۔ میری تقریر کے کسی جملہ کو قادیانی جماعت کے موقف کی تائید یا ترجمانی کہنا انتہائی بددیانتی اور دیدہ دلیری ہے، اس لئے کتابچہ موسومہ (مسلمانانِ حیدرآباد و یادگری کے لئے ایک لمحۂ فکریہ) کو میں ایک گمراہ کن تحریر سمجھتا ہوں، نہ اسے میری تقریر کی تشریح سمجھی جائے نہ ترجمانی۔

والسلام

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۸/ رجب ۸۲/ ھ

مکتوب

محترمی زید مجدکم

سلام مسنون، نیاز مقرون!

گرامی نامہ ممنون یاد آوری فرمایا، اردو کانفرنس کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں اور اپنے ہر قسم کے تعاون کا آپ کو یقین دلاتا ہوں۔

اردو کی بقا اور فروغ کے لئے آپ جو منظّم جدوجہد فرما رہے ہیں وہ یقیناً لائق صد تحسین و تبریک ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے عزائم میں ترقی اور برکت عطا فرمائے۔ اردو زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کا صحیح اندازہ ہندوستان سے باہر جا کر ہوتا ہے۔ ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے بیشتر ملکوں میں آپ کو اردو زبان کے جاننے والے مل جائیں گے، کسی زبان کی بین الاقوامی حیثیت کا یہی سب سے بڑا ثبوت ہے کہ وہ ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہو، اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اردو زبان کی خدمت لسانی حدود سے نکل کر بین الاقوامی اتحاد کا ایک اہم ذریعہ بن جاتی ہے جو آج کے دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس طرح آپ صرف اردو زبان کی خدمت ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ بین الاقوامی اتحاد کے لئے اردو زبان کے ذریعہ ایک اہم رول بھی ادا کر رہے ہیں۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

والسلام علیکم

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۲/۲/۸۷ھ

مکتوب

محترم زید مجدکم السامی

سلام مسنون، نیاز مقرون

گرامی نامہ موصول ہوا، یہ اشتہار جس کا حوالہ دیا گیا ہے سرسری طور پر میری نظر سے گذرا مگر دکھانے والے معاً ہی اسے ساتھ لے گئے، میں اشتہار کے مضمون سے بری ہوں، میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا بلکہ تصور بھی نہیں کیا کہ یہ تحریک کتاب وسنت کے خلاف ہے، تبلیغی تحریک کے بارے میں میرے خیالات کا پورا اندازہ میری ایک نظم سے ہوتا ہے جو میرے کلام کے مجموعہ میں چھپی ہوئی ہے، اس کے صفحہ ۲۴۰ کو ملاحظہ فرمالیں اور اشتہار کے مضمون کو غلط محض باور کریں، یہ ممکن ہے کہ کسی تحریک کے بارے میں کچھ ترمیم یا اصلاح کے بارے میں کسی سے کچھ کہا ہو لیکن اس سے تحریک ہی کا خلافِ شریعت ہونا سمجھ لیا جانا سمجھنے والوں کی سمجھ ہے، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک نسخہ ''عرفانِ عارف'' کا ارسال ہے، اس کے ص ۲۴۰ کو ملاحظہ فرمالیں، اس میں میں نے تبلیغی جماعت کے بارے میں اپنے پورے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔

والسلام

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۸۷/۴/۲۴ھ

مکتوب

مکرمی مزاج شریف

گرامی نامہ صادر ہوا نفحاۃ الانس کے اردو میں ترجمہ کئے جانے کی اطلاع سے خوشی ہوئی، خداوند قدوس کامیابی عطا فرمادے۔ مشائخ نقشبندیہ کے حالات کی ایک بہت اچھی کتاب اردو میں منتقل ہوجائے گی، اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل کتب سے مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔

(۱) حالات نقشبندیہ مجدّدیہ تالیف محمد حسن نقشبندی۔

(۲) منشور طریقت حالات مرزا مظہر جانِ جاناںؒ۔

(۳) تذکرہ مجدّد الف ثانیؒ: تالیف مولانا محمد منظور نعمانی۔

(۴) سالک السالکین، جلد اوّل، مطبوعہ آگرہ پریس

(۵) تذکرۃ العابدین: تالیف مولوی نذیر اختر صاحب

یہ صرف ان کتابوں کے نام درج کئے گئے ہیں جو دارالعلوم دیوبند کی لائبریری میں موجود ہیں ورنہ اس موضوع پر اور بھی بہت سی کتابیں مل سکتی ہیں۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔

والسلام

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۸۷/۹/۳ھ

مکتوب

محترم المقام زید مجدکم سلام مسنون!

گرامی نامہ ملا جس میں آپ نے اپنے علاقہ کے بعض اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ کے بارے میں ان کے کچھ خیالات دین کے بارے میں تحریر فرمائے ہیں۔

عامۃً تمام علماء عرب وعجم نے قادیانیوں کو مرتد اور خارج از اسلام کہا ہے کیوں کہ وہ ضروریات دین مثلاً نبوت وغیرہ عقائد کے منکر ہیں۔

یہ جھوٹا پروپیگنڈہ ہے کہ انہوں نے یورپ میں اسلام پھیلایا، آج یورپ کے لوگ خود ان سے بیزار و بدظن ہو رہے ہیں، لندن میں کئی مسجدیں ان سے خالی کرائی جاچکی ہیں، یہ جماعت البتہ پروپیگنڈا ہٹ ضرور ہے اور اس کا طریقہ تبلیغ عیسائیت سے ماخوذ ہے، اسی انداز سے یہ لوگوں کو ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نوجوانوں کو شکوہ ہے کہ اہل سنت نے قادیانیوں کی تکفیر کردی لیکن حیرت ہے کہ قادیانیوں سے انہوں نے یہ شکوہ نہیں کیا کہ انہوں نے اپنے سوا مسلمانانِ عالم کی تکفیر کردی دراں حالیکہ قادیانی تعداد میں چند ہزار سے زیادہ نہیں، ان کی تکفیر تو دلوں میں کھٹکے اور اہل سنت جو کروڑوں کی تعداد میں ہیں ان کی تکفیر پر شکوہ نہ کیا جائے۔ بہرحال وجوہ تکفیر اہل سنت کے یہاں تو یہ ہیں کہ یہ لوگ ضروریات دین کے منکر ہیں اور ان کے یہاں کروڑوں اہل سنت کی تکفیر کی بنیاد یہ ہے کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے قائل نہیں ہیں۔

ان کے عقائد پر پورا لٹریچر مطبوعہ موجود ہے، اسے منگایا اور دیکھا جائے، اس گروہ نے اسلام کی بنیاد جو ختم نبوت ہے اکھاڑ پھینکنے کی پوری پوری سعی کی ہے اور کر رہی ہے، حیرت ہے کہ جس نے اسلام ہی کو خطرہ میں ڈال دیا ہے وہ قابل شکوہ نہ ہو اور جو لوگ ان مخربین اسلام کو یہ کہہ دیں کہ وہ اسلام سے خارج ہیں قابل شکوہ وسرزنش ہو جائیں۔ امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے اور اس شکوہ پر نظر ثانی فرمائیں گے۔

والسلام

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۸۸/۲/۱۶ھ

مکتوب

محترمی زید مجدکم سلام مسنون!

گرامی نامہ نے ممنون یادآوری فرمایا۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ پر مقالہ کی تیاری کے لئے جہاں تک مرسلہ مقالہ کے خاکہ کا تعلق ہے وہ ماشاء اللہ بڑی محنت اور کافی غور وفکر اور کاوش سے تیار کیا گیا ہے۔ البتہ پہلے دوسرے اور تیسرے باب میں جو کچھ کمی محسوس ہوتی ہے جسے اس طرح دور کیا جاسکتا ہے کہ ان ابواب میں علی الترتیب حسب ذیل عنوان بڑھا دیئے جائیں۔

(۱) قبول اسلام کا سبب، (۲) دارالعلوم سے علمی اور فکری وابستگی، (۳) طریق درس کی خصوصیات، (۴) اندازِ فکر ونظر۔

خاکہ کے بعد دوسرا مرحلہ متعلقہ مواد کی فراہمی کا ہے تو ظاہر ہے کہ اس سلسلہ کی فہرست کتب تیار کی ہوگی، اگر اس کی نقل ارسال فرمائی جائے تو اس پر غور کر کے اگر کچھ اضافہ ممکن ہوسکتا تو ضرور کردیا جائے گا، یہ اس لئے عرض کیا گیا کہ اگر یہاں بھی صرف ان ہی کتابوں کی فہرست تیار ہوسکی جو آپ پہلے سے تیار کر چکے ہیں تو وقت بھی ضائع ہوگا اور محنت بھی اکارت جائے گی، اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ آپ اپنی مرتبہ فہرست یہاں بھیج دیں تو اس پر اضافہ ممکن ہوسکا تو بسہولت ہوجائے گا۔

یہ اطلاع غالباً آپ کے لئے باعث مسرت ہوگی کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پچھلے دنوں یونیورسٹی کے لکچرر قاری رضوان اللہ صاحب، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں اور اب قاری صاحب قاہرہ یونیورسٹی سے دارالعلوم دیوبند پر ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ہی کی ایک طالبہ شفقت فاطمہ فریدی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی پر ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں اور دارالعلوم سے ممکن حد تک ان حضرات کی علمی وفکری رہنمائی کی جارہی ہے۔ (۱۰۸)

والسلام

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۸۸/۱۱/۴ھ

شاعری

میری متاع سخن ہے تمہارا سرمایہ
اسے سنبھال کر رکھنا متاعِ جاں کی طرح

اکابرادب نے شاعری کی مختلف تعریفیں کی ہیں، فرسٹ نے جمالیاتی احساس کولفظوں کے پیراہن میں ظاہرکرنے کانام شاعری رکھاہے، وہ کہتے ہیں:

''شاعری مسرت سے شروع ہوتی ہےاوربصیرت پرختم ہوتی ہے۔''

اس کے بعدشاعری کی ہیئت اور مواد پر بحث ہوتی ہے، یعنی اظہار کا طرز اور اسلوب کیا ہےاور جس احساس کوظاہرکیا گیاہے وہ کیاہےاورکس قسم کاہے؟ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''اظہار احساس'' میں جتنی اہمیت ''اظہار'' کی ہوتی ہےاتنی ہی ''احساس'' کی بھی ہوتی ہے، عموماً شعرکی تعریف اس کلام موزوں سے کی جاتی ہے جوشاعری کےاوزانِ مقررہ میں سے کسی پرہو، مقفّٰی ہواور بالقصد موزوں ہو۔ مرآۃ الشعرمیں ہے کہ: ''وہ کلام موزوں ومقفّٰی جومقدمات موہوم پرمشتمل ہواوران کی ترتیب سے نتائج غیر واقعی پیداکرےمگراس طرح کہ حقیقت کووہم اوروہم کوحقیقت دکھائے۔''

پروفیسرآل احمدسرورکا کہناہے کہ:

''شاعری زبان کوسلیقہ اور ہنرمندی سے استعمال کا نام ہےاورشاعرماضی کاامین، حال کانقش گراور مستقبل کانقیب ہوتاہے۔''

بعض ناقدین نے انکشاف کیاہے کہ ''شاعری اظہارکانہیں اخفا کا نام ہے'' معیاری شاعری میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں یایوں کہئے کہ معیاری شاعری کل کی کل اس کی مثال ہوتی ہے۔طویل سے طویل مضمون کوایک شعرمیں سمیٹ کررکھ دینا اورایسے استعارات کا استعمال کرنا جس میں شرح وتفسیر کے اتنے گوشے نکل آئیں کہ ان کی نثرکئی کئی صفحات میں ممکن ہواورزیادہ سے زیادہ اور بڑی سے بڑی تفصیل اس

میں آسکتی ہو۔شاعری میں غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ اور اقبالؔ کے یہاں اشعار بکثرت ملتے ہیں جن میں جہان معنی پوشیدہ ہوتا ہے۔

آل احمد سرور کے خیال میں ’’ایسے شعراء کی نظر صحیح معنی میں نادرہ کار، تازہ کار اور لالہ کار ہوتی ہے۔ ان کی نظر مانوس احساسات میں، نئے جلوے اور نامانوس کیفیات میں مانوس بوباس پیدا کرتی ہے۔ وہ لفظ کو نشتر یا تلوار یا موج ہائے رنگ سے شفق بنا دیتے ہیں۔ لفظ میں طلسمی دنیا کو اس طرح سمو دیتے ہیں کہ وہ کائنات بن جاتا ہے، یہی شاعر اگر نثر میں اظہار خیال کرے تو اس میں بہاؤ تو ہوتا ہے مگر شاعری جیسا تموّج نہیں ہوتا، خاموش روانی تو ضرور ہوتی ہے مگر اتار چڑھاؤ، شاعری کی بہ نسبت ذرا کم ہوتا ہے۔ وہ شاعری میں صرف نظر سے سروکار رکھتا ہے، جب کہ نثر میں نظریہ سے، شاعری میں اس کا احساس اُبھرا ہوا ہوتا ہے اور نثر میں ذرا دبا ہوا۔‘‘ (۱۰۹)

شاعری ایک شعوری غریزہ، ایک قلبی احساس اور تخیلاتی ملکہ کا نام ہے، جس میں نشاط و مسرت، حزن و الم، یاس وقنوطیت کی ملی جلی واردات کارفرما ہوتی ہیں، فی نفسہ شاعری کوئی بری چیز نہیں، بشرطیکہ ہیئت اور مواد کو یکساں اہمیت دی جائے اور ایک تعمیری فکر و فلسفہ کی اس میں آبیاری ہو، ابتذال، ہزل، بے مصرفی اور فحش بیانی سے اس کا دامن داغ دار نہ ہو۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی شاعری کے فنی اعتبار اور وزن و وقار پر گفتگو کرنا ہمارا منصب نہیں ہے، ہم صرف اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انہیں شعروشاعری کا پاکیزہ ذوق عطا فرمایا تھا جس سے انہوں نے اپنی عالمانہ و بزرگانہ شان کے مطابق ہر جگہ دینی خدمت، دین کی اشاعت اور دین کی ترجمانی، تحریر وخطابت اور تصنیف وتالیف کی طرح ایک کارآمد ہتھیار کا کام لیا ہے اور جس لفظ کو انہوں نے استعمال کرلیا وہ گنجینۂ معنی بن گیا

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے　　　　جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آوے

آپ نے طالب علمی کے زمانہ میں بڑی پختہ اور معیاری نظمیں کہی ہیں اور ان نظموں میں اپنا تخلص ’عارفؔ‘ اختیار کیا ہے، کہیں کہیں بغیر تخلص کے بھی آپ کی نظمیں ملتی ہیں۔ اردو، عربی، فارسی، تینوں میں شعر گوئی پر قادر تھے، مگر شاعری کا بڑا حصہ اردو میں ہے۔ مجموعی طور پر آپ کی سینتالیس نظمیں ملتی ہیں، جن میں سب سے طویل نظم آنکھ کی کہانی ہے۔ اس میں تقریباً ۱۶۷/اشعار ہیں، آپ کی نظمیں حسن تعبیر، ندرتِ خیال اور ترجمانیٔ جذبات کا خوبصورت نمونہ ہیں۔ نظموں میں مذہب، اخلاق، نصائح، مزاح، لطافت، فلسفیانہ

خیال، منطقیانہ استدلال اور لمّی انداز غالب ہے۔

لسان العصر سید اکبرالہ آبادیؒ نے ایک انگریزی نظم کا اردو میں منظوم ترجمہ ''پانی کی روانی'' کے عنوان سے کیا تھا۔ حکیم الاسلامؒ نے اس طرز پر ''روانی اسلام'' کے نام سے ذیل کی نظم کہی جو رسالہ ''القاسم'' ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

چلا ارض بطحا سے ایک بحرِ ذاخر — کہ تھا جس کی موجوں کا اول نہ آخر
وہ توحید کی لے بجاتا ہوا — سرود حجازی میں گاتا ہوا
وہ جنگل میں منگل مناتا ہوا — وہ شہروں میں شادی رچاتا ہوا
پہاڑوں پہ نعرے لگاتا ہوا — سمندر میں طوفاں اٹھاتا ہوا
ضلالت کے پیڑوں کو ڈھاتا ہوا — زمانے میں اُدھم مچاتا ہوا
صداقت کے جھنڈے اڑاتا ہوا — وہ باطل کو نیچا دکھاتا ہوا
بتوں سے وہ رشتے تڑاتا ہوا — حضور اس کے سب کو جھکاتا ہوا
جہالت کی رسمیں مٹاتا ہوا — معارف کے ایوان اٹھاتا ہوا
اذانیں زمیں پر دلاتا ہوا — شیاطین کو دھکے لگاتا ہوا
معاصی کو آنکھیں دکھاتا ہوا — گناہوں کی گرن دباتا ہوا
وہ غیروں کو اپنا بناتا ہوا — لگن اک نئی سی لگاتا ہوا
وہ آنکھوں سے آنکھیں لڑاتا ہوا — دلوں میں ہر اک کے سماتا ہوا
تمدن کی بیخیں جماتا ہوا — مہذب جہاں کو بناتا ہوا
دلوں کو وہ ہمت دلاتا ہوا — وہ روحوں کی قوت بڑھاتا ہوا
دروس حقائق پڑھاتا ہوا — خرافات یوناں بھلاتا ہوا
صدفہائے علمی بہاتا ہوا — گہرہائے عرفاں لٹاتا ہوا (۱۱۰)

اکبرالہ آبادیؒ کی نظروں سے یہ نظم گزری تو بہت خوش ہوئے اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کو خط لکھا تھا ''مولانا محمد طیب صاحب کی نظم روانی اسلام'' نظروں سے گزری، ماشاء اللہ صل علیٰ، جزاک اللہ نقاش نقش ثانی بہتر کشد از اول''۔

آنکھ کی کہانی

حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیو بند کی دائیں آنکھ کا آپریشن گاندھی آئی اسپتال، علی گڑھ میں ۱۹/جنوری ۱۹۶۳ء کو ہوا تھا، اسی اسپتال میں دو سال بعد ۱۹/دسمبر ۱۹۶۴ء کو حضرتؒ کی بائیں آنکھ کا آپریشن ہوا، ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق آپریشن کے بعد ابتدائی دو ہفتے آنکھ کو مکمل سکون و آرام دینا ضروری ہے۔ چنانچہ حضرتؒ کو بھی آپریشن کے بعد ابتدائی ایام میں ڈاکٹر کی طرف سے مکمل آرام کی ہدایت کی گئی، جس میں اٹھنا، بیٹھنا، لکھنا، پڑھنا، حتی کہ زیادہ بات چیت کرنے کی بھی ممانعت تھی۔ گزشتہ آپریشن کے موقع پر بھی حضرتؒ نے ڈھائی سو اشعار کی ایک طویل نظم اسپتال میں بسترِ آپریشن پر لیٹے لیٹے موزوں فرمائی جس میں آنکھ کے سلسلہ کے بہت سے حقائق اور آپریشن کی جملہ کیفیات بلیغ انداز میں بیان فرمائی گئی ہیں۔ اہل علم نے اس نظم کو بہت پسند کیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس نظم کو پڑھ کر حضرتؒ کی خدمت میں عریضہ لکھا۔

”حضرت محترم السلام علیکم!

آنکھ کی کہانی آں محترم کا عطیہ یہاں آتے ہی پڑھ ڈالی، سبحان اللہ، مجھے علم نہ تھا کہ آپ کو شعر و ادب میں اس درجہ قدرت حاصل ہے، **ذلک فضل اللّٰہ** کیا کیا قافئے نکالے ہیں، کیسے کیسے مضمون باندھے ہیں کہ پیشہ ور شاعروں کے بھی چھکے چھوٹ جائیں، نہ کہیں جھول، نہ اتنی طویل نظم میں کہیں آورد، بس آمد ہی آمد، خوش دماغ تو آپ بحیثیت سچے قاسم زادہ تھے ہی، اب معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ خوش فکر بھی اس درجہ ہیں، ماشاء اللہ۔“

دعا گو و دعا جو

عبدالماجد

۱۵/دسمبر ۱۹۶۴ء

”آنکھ کی کہانی“ کی ابتداء حمد و صلوٰہ سے کرتے ہیں:

مستحق حمد و ثنا کا ہے خدائے وہاب
جس نے دی آنکھ ہمیں آنکھ کو دی نور سے آب

کھول دی چشم بصارت بجمال ظاہر
جس سے ممتاز نگاہوں میں ہیں خوب اور خراب

دل کو دی چشم بصیرت بکمال باطن
جس کی رو سے متمیز ہیں خطا اور ثواب

ساری تعریفیں ہیں اس رب دو عالم کے لئے
جس نے بینائی کی آنکھوں میں ہے رکھی تب و تاب

نعت و توصیف ہے اس ذات مقدس کے لئے دل کی بند آنکھ کے جس ذات نے کھولے ابواب
ختم جس ذات پہ ہے عین نبوت کا کمال خوشہ چیں جن کے ہیں انسان و ملک اور دواب

آگے آنکھ کی افادیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

آنکھ قائم ہے تو لذت رنگ و صورت نہ رہے باقی تو موعود ہے جنت کا ثواب
ہو کھلی آنکھ تو اس سے ہے ظہور عیاں اور ہو بند تو ہے زیر نظر عالم خواب
آنکھ کھل جائے تو بھرپور ہے بجلی دل پر نیم وا ہو تو بھری اس میں ہے مستی شراب
آنکھ نیچی ہو تو ہے نور حیا کا چشمہ اور اٹھ جائے تو ہے نار فروزاں عتاب
آنکھ پھر جائے تو ہے شعلۂ نفرت کی بھڑک اور بھر آئے تو ہے بارش رحمت کا سحاب
آنکھ ترچھی ہو تو پھٹ جائے فضاءِ پیشیں اور سیدھی ہو تو سیدھا ہے جہانِ اسباب
آنکھ گرامن پسند ہے تو ہے دل بھی آزاد آنکھ لڑ جائے تو پھر دل ہے گرفتار عذاب
آگئی آنکھ تو کہتے ہیں کہ بیمار ہوئی اور نہ آئی تو سمجھتے ہیں صحیح و صواب
چشم حق بیں ہو تو نافع دین و دنیا چشم بد بیں ہو تو دارین کا خسران و عذاب
آنکھیں دو ہیں تو وہ ہیں کاشف الوان جہاں چار ہو جائیں تو ہیں سِرِّ محبت کا نقاب

''خلاصۂ احوال معالجہ'' عنوان سے آپریشن کے مراحل کا خلاصہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہاں خلاصہ اگر احوال کا ہو پیش نظر مختصر طور سے ہیں اس کے یہ کل سات ابواب
دس منٹ کا ہے عمل آنکھ کے آپریشن کا ہے یہ اس منزل مشکل کا اہم پہلا باب
چت پڑے رہنا ہے چھ گھنٹے پسِ آپریشن ان مراحل کا اہم تر ہے یہی دوسرا باب
ساتویں گھنٹہ میں ملتی ہے کمر کو کروٹ جو کہ اس مدت احوال کا ہے تیسرا باب
پانچویں روز میں ہے اذن نشست و برخاست جو کہ اس قصرِ مہمات کا ہے چوتھا باب
چارپائی پہ سوار آنکھ پہ پٹی ہو چڑھی بارہ دن تک کی ہے یہ قید رواں پانچواں باب
ہاں اسی کا یہ تتمہ ہے جب پٹی کھلے آنکھ کے چہرے پہ چڑھ جائے جب ہی سبز نقاب
تین دن زخم کے ٹانکوں کی برآمد کے ہوئے اس مداوا کی منازل کا چھٹا ہے یہ باب
اس سے ایک ماہ کے بعد آتا ہے چشمہ کا مقام سہل تر سارے مراحل کا یہ ہے ساتواں باب
آپریشن کے مہمات کی تلخیص ہے یہ سات ابواب کا ہے یہ ڈیڑھ مہینے کا نصاب

زمانۂ طالب علمی میں ''کوثر العلوم'' کے نام سے آپ نے یہ ایک نظم لکھی تھی، جس کے چند اشعار یہ ہیں:

یہ کیسی دھوم ہے باغِ جہاں میں آج اے ہمدم
گلوں سے بلبل نالاں گلے ملتی ہے کیوں پیہم

خوشی میں کیوں ترانے گا رہی ہیں قمریاں باہم
برستا ہے یہاں پر ابر رحمت آج کیوں چھم چھم

ہوئے جاتے ہیں گل جامے سے باہر شادمانی سے
ہوئی جاتی ہے بلبل مست اپنی نغمہ خوانی سے

خرام ناز سے باد بہاری آج آتی ہے
بنا کر ہار پھولوں کا چمن میں ساتھ لاتی ہے

چمن میں ہر طرف سے یہ مبارکباد آتی ہے
مبارک ہو بہار بے خزاں گلشن میں آتی ہے

پلا دے ایک ساغر ساقی رنگیں بیاں مجھ کو
تیری آنکھوں کے صدقے دے شراب ارغواں مجھ کو

بتا دے عالم اسرار کے راز پنہاں مجھ کو
پلا دے وہ مئے عرفاں کہ کردے بے نشاں مجھ کو

مضامیں کا چلا ہے دل سے اک قلزم رواں ہو کر
میرے عجز بیاں نے سر اٹھایا آسماں ہو کر

تخیل کے ہے سینے میں مضامین کی فراوانی
تصور کے خزانے میں ہے تصدیقوں کی ارزانی

دیگر نظموں کے عنوانات یہ ہیں: بارگاہِ نبوت میں فریاد، فکر حزیں، آہ دردمنداں، استقبالِ مجاہد، یادِ رفتگاں، ہیئت وہیبت، موعظت وذکریٰ وغیرہ

''شکریہ نظامِ دکن'' کے عنوان سے نظام دکن کے نام درج ذیل القاب کے ساتھ ایک نظم تحریر فرما کر نظام دکن کے نام بھیجی گئی تھی، جس میں عیدین کے موقع پر طلبۂ دارالعلوم کے لئے نظام دکن کے ارسال کردہ وظیفہ مبلغ پانچ سو روپئے کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

شکریہ بندگانِ عالی متعالی اعلیٰ حضرت نظام دکن **خلد اللّٰہ سلطانہٗ و ابقیٰ اجلالہٗ** وقتیکہ پنج صد روپیہ سالانہ بتقریب عید الفطر وعید الاضحیٰ برائے طلبۂ دارالعلوم دیوبند از بارگاہِ رفیعش بتقرر آمد **متع اللّٰہ الاسلام والمسلمین بطول بقائہٖ وحیاتہٖ**

اے سرور محفل عالم عجب ہے تیری تاب کا
بحر شادی میں ہے پیدا جزر و مد کا انقلاب

جلوہ پیدا ہے ہر ایک ذرہ مثال آفتاب
مدعی ہے آسماں کی یہ زمیں خاک یاب

دل کا غوغا ہے کہ لا ساقی مئے ناب سخن
ساغر و مینا ہے خالی اور پیاسی انجمن

رخصت اے ذوق خموشی چھوڑ دے اپنا سماں
دیکھنے دے اب تکلم کی بھی مجھ کو شوخیاں

آسماں آسا ابھرتا ہے مرا عجز بیاں
صورت سے ہوں سراپا اپنی بہجت کا نشاں

شعلۂ سوز الم سے آج میں کوسوں ہوں دور
چھیڑ مت مجھ کو کہ میں ہوں مفت صہبائے سرور

بحر راحت کا تلاطم لے چلا سوئے دکن مژدہ اے دل، ہو مبارک تجھ کو شوقِ انجمن
ہورہی ہیں ناامیدی پر امیدیں خندہ زن پھوٹ نکلی ہے افق سے مہر ہمت کی کرن
کیا عجب چشم تصور نے ہے باندھا انتظام سامنے ایک دم میں کردی درگہہ شاہ نظام
اے کے عالم میں طراز مسند عظمت ہے تو از پئے دین الٰہی آیۂ رحمت ہے تو
ہستیاں ہیں راحت آمادہ تو تیرے نام سے اور شرف اندوز ہے دنیا تیرے انعام سے

شاعرانہ ذوق آپ کے صاحبزادگان مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی اور جناب ڈاکٹر محمد اعظم صاحب قاسمی پروفیسر اسلامیات علی گڑھ میں بھی پایا جاتا ہے۔ دونوں حضرات بہت اچھے شاعر ہیں۔ مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی شاعری میں ''رمزیؔ'' تخلص کرتے ہیں اور ڈاکٹر محمد اعظم قاسمی صاحب کا تخلص ''سحابؔ'' ہے۔

مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی کی شاعری کا نمونہ اس نعتیہ کلام میں ملاحظہ فرمایئے:

اے خدائے پاک تیری حمد ہے وردِ زباں تیرا جلوہ ذرّے ذرے میں ہے مستور و نہاں
تو ہی آقا تو ہی مالک تو ہی خلّاق جہاں تیری قدرت کا کرشمہ ہیں زمین و آسماں
بے کراں رحمت سے تیری ہے اس عالم کو ثبات تیرے حکمِ غیب سے پیدا زمین و آسماں
عزت و ذلت کی ہے تقسیم بس در سے ترے آسرا تیرا ہے جو بگڑی بناتا ہے یہاں
فقر و دولت ہے اشارہ تیری ذات پاک کا ہر کوئی تیرا بھکاری صرف تو روزی رساں
فرش تا عرشِ بریں ظاہر ترا قدس و جلال تیری ہستی کی تجلی اوج و پستی میں نہاں
بندۂ عاجز یہ رمزیؔ غرقِ عصیاں و گناہ طالبِ عفو و کرم ہے تجھ سے ربِّ دو جہاں (۱۱۱)

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم کو بھی نظم پر دسترس حاصل ہے۔ چنانچہ تفنن طبع کے طور پر چند قطعات کہیں کہیں مل جاتے ہیں۔

ذیل میں چند اشعار پیش خدمت ہیں:

نذرِ امیر علمائے ہند

حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد طیب صاحب رحمہ اللہ علیہ

سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، بانی وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

آفتاب دین حق کی ہے ضیاء علم وفن حق نے بخشا ہے تجھے اسلاف کا ذوق سخن
شاہدِ عدل ہیں اس پر یہ زمین و یہ زمن کلمہ طیب سے سرنگوں باطل رہا

زندہ رکھا ذوقِ حق ملت میں تو نے عمر بھر — اس کے پشتیباں کتنے ہی ہے گنگ وجمن
حق رسا ہے تیرے نغموں کی صدائے دلنشیں — داد کا طالب نہیں ہے تیرا ذوقِ فکر وفن
کردیا تیرے معارف نے دلوں کو حق شناس — جن کی پرتاثیری نے گویا کردیا سب کو مگن
شعر کو صرف حسنِ معنی ہی سے ملتا ہے دوام — حسنِ لفظی رلاش ہے جس میں نہیں روحِ سخن
دردِ دل سے نغمۂ بیتاب بن جاتا ہے شعر — یہ نہ ہو تو شعر رہ جاتا ہے ایک بے جان تن
تھی رفیقِ زندگی، توفیقِ حق گوئی تری — تجھ پر قرباں تاکہ ہوں دنیا کے تن من اور دھن

رحمتِ رب سے رہے روشن رہے سدا تربت تری
یہ دعا دیتا ہے تجھ کو سالمِ مخلص کا من

اسی طرح آپ کے صاحبزادہ مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی مدظلہٗ بعض اوقات بہت اچھے اشعار کہہ لیتے ہیں۔ جن میں ایک فکر ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو، آخر خانوادہ قاسمی کے خوش دماغ وخوش فکر فرزند جلیل ہیں۔

یک چراغ شب دریں خانہ کہ از پرتوئے آں — ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

اب حکیم الاسلامؒ کے منظوم کلام ''عرفانِ عارف'' سے چند منتخب نظمیں ملاحظہ فرمایئے۔

آہ دردمنداں

مل جائے کساں و بے کساں رفت — ماوائے ضعیف و ناتواں رفت
مطلوبِ قلوبِ طالباں رفت — محبوبِ دل جہانیاں رفت
گنجینۂ فیض بے کراں رفت — قسّام بزم قاسماں رفت
راس زمن و پناہِ ایماں — سر حلقۂ بزمِ مؤمناں رفت
سر دائرۂ علوم و تقویٰ — محمود و حبیبِ عالماں رفت
تسکینِ خواطرِ کریماں — ہیہات کہ از جہاں چساں رفت
باغ است و بہار خاک برسر — کز گلشنِ علم باغباں رفت
طفلانِ چمن بزرد روئی — شادابی و نکہتِ گلاں رفت
اے وائے چمن چنیں خزانے — گل رفت و نسیمِ گلستاں رفت
آں رفت کہ رفتنش ز عالم — گویا ز ہمہ جہاں تواں رفت

آں راہ نمائے دینِ احمدؐ
آں قدر فزائے قدسیاں رفت

آں صدر نشینِ مرکزِ علم
آں گلّہ علم را شباں رفت

آں قاسمِ علم و ابنِ قاسمؒ
از حلقۂ قاسمی دواں رفت

دارائے علوم حافظ احمد
بگذاشتہ نام و خود نہاں رفت

ماندیم زمرکزِ عقیدت
افسوس کہ قبلۂ دلاں رفت

او رفت کہ رفت رعب و ہیبت
او رفت کہ شیرِ نیستاں رفت

اے طیبؔ و طاہرِ شکستہ
الصبر کہ پیر دوداں رفت

تسلیم کہ رفت پیر سالے
لیک آہ کہ ہمتِ جواں رفت

انداختہ خرقۂ یتیمی
بردوشِ شما سوئے جناں رفت

اندوختہ زادہ راہِ عقبیٰ
از راہِ زمیں بآسماں رفت

ظلِ پدری کشیدہ از ما
در ظلِّ ملیکِ مالکاں رفت

برداشتہ دل زما غریباں
از غربتِ رہ رہ جناں رفت

رفتہ ز جہاں کہ رفتنی بود
حیفے کہ زدہر ناگہاں رفت

ناسودہ * بہ ملک تن چو جانش
تسبیح کناں بہ ملکِ جاں رفت

بر لوحِ جبیں نوشتہ مومن
از کلکِ قضاء عرق چناں رفت

لاریب شہیدِ موتِ غربت
رفتہ بحیاتِ جاوداں رفت

پیمودہ سبیلِ حق تعالیٰ
باموت شہادت ہم عناں رفت

مہمانِ شہِ دکن شدہ پس
مہماں سوئے شاہ آسماں رفت

در خطۂ صالحین نہفتہ
بر خطۂ امرِ رب نہاں رفت

بگذاشتہ زود دوش احباب
بردوش و سرِ فرشتگاں رفت

بگذاشتہ ایں سرائے فانی
باطائرِ قدس آشیاں رفت

با ذلق گدا بطبع شاہی
پیوستہ بماند و ہم چناں رفت

اگر یہ کناں بسیلِ اشکیم
واں خندہ زناں بجا وداں رفت

* حرکت زدہ، مسبحۂ انامل تہلیل کناں رواں دواں رفت

مایم و فتادگی و دوری او بر در قرب بے گماں رفت

پایاب نمود منزلِ ہجر قطرہ سوئے بحرِ بے کراں رفت

پابندِ ہوائے شوق گشتہ ذرہ سوئے آفتاب جاں رفت

رحمت بہ تن و روانِ تو باد اے آں کہ زجان بہ جانستاں رفت

دعوت آم سردھنہ میں

اس بار سفرِ سردھنہ میں صعوبتِ سفر کافی پیش آئی، کئی جگہ کار خراب ہوئی، کہیں رکشا لینی پڑی، کہیں پیدل چلنا پڑا، بالآخر دو گھنٹے کا سفر چار چھ گھنٹوں میں پورا ہوا اور تاریخی بن گیا، جس کا ذکر ذیل کی نظم میں کرتے ہوئے دعوتِ انبہ اور آم خوری کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

بہت ہی سر دُھنے سے سر دَھنے تک پہنچ پائے بفضل ایزدی ہم

مشقت رہ گذر کی منتظر تھی کہ الجھیں اُس کے کانٹوں سے ذرا ہم

لگا دامن تو کانٹوں نے بصد شوق کیا آگے کو بڑھ کر خیر مقدم

بگڑ بیٹھی اچانک کار اپنی لگی رکنے مکرر اور پیہم

چلی کار اور بیکاروں کی مانند رہی کچھ دیر رک رک اور تھم تھم

بگڑ کردی پھر اک پرزے نے آواز کہ اب ممکن نہیں منزل کا تقدم

غرض موٹر کا باطن کچھ خفا تھا مگر اس میں خفا تھا شے تھی مبہم

سڑک کا رخ بھی کافی پر جفا تھا کہ جس سے پڑ گئے تھے کار میں خم

کھلی گاڑی تو رخنے کھل گئے سب کہیں تب جا کے آیا کار میں دم

چلی تب سیدھی سادھ کر سیدھ لیا بس سردھنے آکر ہی پھر دم

خوشی ہے ناخوشی راہوں کی مٹ کر درِ مقصد پہ با مقصد ہوئے ہم

صعوبت راہ کی پاور ہوا تھی جوں ہی منزل نے آکر سر کیا خم

کشش سچی تھی اہلِ سردھنہ کی کہ پہنچے اور پہنچے سر کے بل ہم

محبوں، مخلصوں کی ہے یہ بستی فداکاری ہے جن کی غیر مبہم

درِ مسجد سے تا مسجد دو رویہ صفیں تھیں مخلصوں کی بستہ باہم

کھڑے تھے دوست سب باجمع ضدین دلوں میں آتشِ حب آنکھ میں نم

لبوں پر انبساطِ دل کے آثار — تبسم کی جھلک کے پیچ اور خم

قدم بڑھتے ہوئے پھیلے ہوئے ہاتھ — گلے ملنے کا جذبہ سب میں منضم

مصافحہ میں ہر اک سباق بالخیر — ہر اک تھا بے خودی میں غرق و مدغم

بغل گیری کے جذبے سے ابھر کر — بڑھے اخلاص کا بھرتے ہوئے دم

ملے سب شوق سے بالطف و اکرام — خوشی اڈی، ہوا کافور سب غم

یہ قدریں کس قدر ہیں قابلِ قدر — نظر آتے ہیں یاں آکر ہم ہی ہم

کہیں جلسے، کہیں دعوت، کہیں کچھ — جدھر دیکھو اُدھر ہے خیرمقدم

فضا میں نغمۂ شادی کی ہے گونج — شکارِ بے کسی ہے نوحۂ غم

ہر اک سنّی ہے،قسمت سے ہے دل شاد — نصیبِ شیعیاں ہے ان کا ماتم

محبت کا ہر اک سر میں ہے سودا — تعاون کا ہر اک بازو میں دم خم

ہر اک لائق لئیق صد ستائش — ہر اک کا حق کی چوکھٹ پر ہے سر خم

ہر اک ہے بندگی میں عبدِ واحد — مگن طاعت میں اور دنیا سے بے غم

کوئی ہے یاس سے کٹ کر یٰسیں — امیدوں کی بشاشتہ میں ہے مدغم

ہے اس تثلیث میں پیوست توحید — کہ یہ سب شرک کے بارے میں ہیں گم

ہے قدرِ مشترک اخلاص ان میں — کوئی زیادہ ہے اس میں اور کوئی کم

ہیں تن سب کے الگ پر دل ہیں سب ایک — مئے وحدت کا ہر دم بھرتے ہیں دم

ہے ان کی روح وحدت اور محبت — محبت جام ہے خود اس کے ہیں جم

محبت کے ہی ہوتے ہیں آثار — کبھی دعوت، کبھی ہدیہ، کبھی غم

ہے آج ان کی طرف سے دعوتِ آم — کہ جس پر آج ہم یک جا ہیں باہم

کوئی دیبن سے، کوئی کوکھنی سے — کوئی میرٹھ سے آئے مل کے باہم

نگاہیں متحد ہر آم پر ہیں — خیالوں تک کی رو جاتی ہے یاں تھم

مئے وحدت ہے گویا آم کا رس — ملا دیتا ہے سب بچھڑوں کو باہم

ہے مرکز وحدتوں کا آم کا طشت — کہ چوگرد اس کے سب بیٹھے ہیں بے غم

نگارستان ہے آموں کا تشلا — ہے رنگا رنگ محبوبوں کا عالم

ہیں بیٹھے طشت پر آسن جمائے — نہیں دنیا و مافیہا کا کچھ غم

ہے جب تک سامنے آموں کا تشلا
ہر اک دل میں ہے آموں ہی کا سودا
ہر اک آموں کی الفت میں ہے سرشار
جب ہم ہوں، آم ہوں پھر فکر ہے کیا؟
دل آرا مے برنگِ صاف و شفاف
شرابِ زرد سے بھرپور شیشے
بلا سینہ کے پستاں مہر بر سر
سرور آور برائے قلبِ عشاق
شرابِ پاک میں شہدِ مصفیٰ
شراب و شہد و شیر و آبِ صافی
شرابوں کے ہیں رنگا رنگ ساغر
عجب پُر کیف ہے آموں کا یہ کیف
نہیں انسان کی صنعت گری یہ
نہ کچھ پیرِ مغاں کا اس پہ احساں
جہانِ غیب کا ہے راست تحفہ
یہ ساغر غیب کا ڈھالا ہوا ہے
زمیں پر خاکساری سے ابھر کر
نہیں ہے ایک رنگ کا اُس پہ ملبوس
لباسِ نو بہ نو میں ایک محبوب
کوئی سبز اور کوئی زرد اور کوئی سرخ
عجب رنگیں ادا، رنگیں صورت
بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوشی
ضخامت اور قامت میں تفاوت
کوئی چپٹا، کوئی چوڑا، کوئی گول
کوئی کہتر کوئی مہتر کوئی وسط

سمجھتے ہیں کہ سب کے دم میں ہے دَم
ہر اک کا طشت کے آگے ہے سر خم
زبہرِ رنگ و بو و از بہر مَطعَم
بپا ہوجائے گو معدہ میں ماتم
خنک صہبا بہ ساغر ہائے نیلم
جو کھودیتے ہیں غم والوں کے سب غم
بسنتی دودھ سے لبریز و پُرنم
سکوں بخشے، پئے رومانِ پیہم
ہے مائیت میں شیرِ پاک مدغم
ہے آم انہار جنت سے مقوّم
بھرا ہے مستیوں خا جن میں عالم
نشہ ہے پر خرد ہوتی نہیں کم
نہ خم خانوں سے یہ مینا ہے پرنم
نہ ہے یہ میکدہ کا قیدئ غم
زدست قدرتِ خلاقِ عالم
رسیلی آنکھ میں مستی کا عالم
فضاؤں کی بلندی میں ہے قائم
ہے صد الوانِ رنگینی کا عالم
تجلی ریز بر خضرائے خاتم
کوئی ہے زعفرانی، کوئی نیلم
رنگوں کا اُن پہ لہراتا ہے پرچم
ز اندازِ قدت پر نور چشم
نمایاں جس سے حکمت کا ہے عالم
کوئی قامت میں سیدھا کوئی پر خم
کوئی کم کوئی زیادہ اور مفخم

ہزاروں ہیں قدو قامت کے پیکر
نرالا قدرتِ حق کا ہے عالم
بہر قامت کہ آئی، بر سر و چشم
بہر پیکر کہ باشی نور چشم
ہر اک کی خاص خوشبو ہے نرالی
ہر اک خوشبو کا پھر ان میں ہے سنگم
گلابِ خاص ہے گر اس کو سونگھو
بہشتوں کا ثمر ہے بہرِ مطعم
ہے ہر ہر آم کا اک ذائقہ خاص
بہت سے ذائقے ایک اک میں مدغم
حلاوت با حموضت بے مرارہ
ہے گویا ذائقوں کا ایک عالم
اگر یکجا کہیں ہوں مختلف آم
دکھائی دیتے ہیں پھولوں کا البم
دل عشاق کو راحت کا پیغام
نگہ کی زندگی ہے ان کا موسم
جو بلبل کو ہے گل سے خاص نسبت
لئے ہیں آم سے وہ ابنِ آدم
نمود و بود اُس کی فصل باراں
ہیں پانی کے لگن سے اس کے دم خم
بآب صاف رنگیں مچھلیاں ہیں
جو خود پانی کی زینت کا ہیں پرچم
لباسِ آب میں عریاں ہیں ایسے
حریرِ تر میں جیسے ابن آدم
ہیں رنگ رنگ ساغرہائے انبہ
بزیبائی صورت دافعِ غم
نہیں کام و دہن ہی ان کا شیدا
اگر ہوں ناک تک تب بھی رہیں کم
لبوں رہوں تو شیرینی سے لب دوز
اتر کر منہ میں پہنچیں تب ہیں ہم دم
گلے لگ کر اتر جائیں جو نیچے
جراثیم شکم کے حق میں ہیں سم
غذا بھی ہیں تفکہ بھی دوا بھی
دم انسان کے دم ساز وہم دم
یہ دم دم کی بھی خواہی کا ہے سہرا
اُنہی کے سر ہے اور رہتا ہے پیہم
ہے آموں کی محبت بھی نرالی
کسی حالت میں بھی ہوتی نہیں کم
اُگل کر پھر نگلنا گو ہے منفور
نہیں ہوتی ہے رغبت پھر بھی کچھ کم
اُگلنا بھی نگلنے کے لئے ہے
کہ نگلا جائے اس کو لے کے کچھ دم
ہے انبہ ایسی اک محبوب زوجہ
کہ ہے اُس کے بغیر عاشق لبِ دم
طلاقِ بائنہ یاں کب ہے ممکن؟
کہ ہجرِ آم پر ہو کوئی خرّم
ہے فصلِ آم کا مقصود بھی وصل
ہے اس کے فصل میں بھی وصل منضم
ہے وصلِ آم ہر ہر فصل کے بعد
طلاقیں ہیں، مگر رجعی ہیں پیہم

نکاحِ نو کی یاں حاجت نہیں ہے
یہ رشتہ بدر فطرت سے ہے دائم

یہ زوجہ گھر میں ہو یا باغ میں ہو
بہرصورت ہیں ازواج اس سے منضم

یہ آموں ہی کی ہے شیریں ادائی
کہ ان کی ترشیوں پر بھی ہے سرخم

اگر ہوں ترش رو تب بھی گوارا
محبت کا عجب ہے اُن کی عالم

ہوں نیچے رنگ رنگ آموں کے تشلے
اور اوپر سے برستا مینھ ہو چھم چھم

ہوں جمع نیم عریاں پینے والے
لنڈھائے جائیں ساغرہائے پیہم

تو یہ دنیا میں ہوگی بزمِ جنت
شرابِ طہر سے دل ہوں گے خرّم

عجب رنگین ہے آموں کی محفل
ہے گویا مجلسی ہی ان کا سسٹم

تمام عاشق یہاں شیشہ بدست ہیں
ہے اس محفل میں یکجا جام اور جم

یہ آموں کی محبت کا ہے ثمرہ
کہ ان پر آ کے جڑ جاتے ہیں باہم

ہے آموں میں لڑائی کا بھی پہلو
کہ بن جائیں مقابل جو تھے ہمدم

ہے بزمِ آم سے وابستہ نو روز
کہ جس میں جنگ کی صورت ہے منضم

ان آموں کے یہ گٹھلی اور چھلکے
سروں پر پڑتے ہیں جب صورتِ بم

تو بزمِ آم بن جاتی ہے اک رزم
اور اٹھ جاتے ہیں سراب تک جو تھے خم

جہاں مصروفِ ناؤ نوش تھے سب
وہ ہوجاتے ہیں مار اور دھاڑ میں ضم

لباس و تن پہ زرد از او دھبّے
مثالِ خون مجروحین بے دم

مگر اس جنگ کا منشا تفریح
جو ہے وجہ نشاطِ ابنِ آدم

غرض ہے بزم و رزم آموں میں یکجا
عجب ہے جمع ہوں ضدین باہم

یہاں رزمی بھی ہے ہمدوش بزمی
ہے مجلس اور میداں اس میں تو اَم

ہے انبہ عشق کی رو سے بھی جامع
ہے محبوبی میں اس کی عاشقی ضم

ہے آموں میں محبت کا بھی مضموں
کہ محبوبی میں بھرتا حُب کا ہے دم

اچھلتا رس ہے گر کپڑوں کی شامت
تو فاش اس سے ہے اس کا عشق مبہم

ہے دلدادوں پہ اپنے اتنا شیدا
چھڑکتا ہے اُچھل کر اپنا خود دَم

ادھر محبوب اُدھر عاشق بیک وقت
اِدھر دلدار اُدھر دل گیر اسی دم

تعجب ہے کہ پھر بھی ہے وہ مظلوم
محبت کا بدل اس کو ملے غم

ہوں آموں پر پیا پے ایسے حملے
کہ ایک ایک آم کا ہے ناک میں دم

کہ ہر ہر ہاتھ چابک دست ایسا
کہ آم اس سے ہیں دم کے دم میں بے دم

بعجلت ہاتھ بڑھتے ہیں لگن پر
کہ اک دانہ بھی رہ جائے نہ بادم

ہے دانتوں کی یہ شورش اور یلغار
تنِ نازک پہ صدا از خم پیہم

ہر ایک کا پیٹ وسعت پر ہے نازاں
کہ کتنے آم بھرتا ہے بیک دم

تعجب ہے کہ یہ عشاقِ انبہ
بنے ہیں اس کے حق میں ففتھ کالم

ہیں دشمن سے زیادہ اس کے دشمن
بد عوائے محبت اس پہ ہیں بم

خود ہی کرتے ہیں اس کا حسن پامال
نچوڑیں ہاتھ سے اور کھینچ لیں دم

نہ صرف ہاتھوں سے، دانتوں سے بھی مسلیں
لگا کر زخم کردیں اُس کو بے دم

اکھاڑیں پوست، ہڈی تک نہ چھوڑیں
کریں پھر فخر محبوبے خورندم

عجب محبوب ہے عاشق سے مجبور
عجب محبوب عاشق کے سہے غم

عجب عاشق جنوں کا نام لے کر
کرے محبوب ہی کے لختِ پیہم

چبا جائے برغبت گوشت اور پوست
نہ چھوڑے رنگ و بو کا اس کے عالم

پیئے خون اور ہڈی تک چچوڑے
نہ کرنے دے اسے فریاد و ماتم

یہ عاشق ہے کہ خوش اُتنا ہے جتنا
تنِ محبوب پر کاری لگیں زخم

تعجب ہے جفا محبوب پر ہو
وہ غمگیں ہو، رہیں عشاق خوش دم

یہ آموں کا سمجھئے حسنِ سیرت
کہ ہیں صبر و رضا میں خوب محکم

یہ آموں کا ہے اخلاص اور ایثار
محبت کے شغف کا یہ ہے عالم

مگر ہے اس میں کیا آموں کا نقصان
محبت میں گیا جو وہ ہے دائم

یہاں کی ہر فنا میں اک بقا ہے
مٹا جو بھی وہی آخر ہے دائم

یہی آموں کی محبوبی کا ہے راز
کہ تسلیم و رضا میں ہیں وہ محکم

ختامِ فصل سے تا فصلِ ثانی
سراپا شوق رہتا ہے یہ عالم

کہ کب آم آئیں کب ہم منتفع ہوں
انہیں غم دے کر ہم ان سے ہوں خوش دم

پس اے آموں کی امت مت ہو دل ریش
نہیں دارین میں تیرے لئے غم

تو اس مشقِ ستم سے ہو نہ دل گیر دوامِ زندگی ہے تجھ میں قائم
ملا ہے جس کو جو ہستی کو کھوکر فنا ہی میں بقا ہوتی ہے منضم
فنا میں ہے بقا کا راز مضمر بقا اندر فنا، ہے قدر مبرم
مٹا جو، وہ ہے انمٹ، ہے یہ قطرہ تو مٹ جانے سے تجھ کو کیا ہے پھر غم

مگر ہوں کھانے والے بھی نہ نادم کہ قدرِ نعمتِ حق ہے مقدم
ہے استعمالِ نعمت قدرِ نعمت اور اس کا ترک ہے عصیان و مآثم
تم ان آموں سے جتنا منتفع ہو یہی قدرت کا ہے ایماء پیہم
پس انساں بھی ہو خوش اور آم بھی خوش کہ دونوں نے اطاعت کا بھرا دم
وہ مستعمل ہوا جس کے لئے تھا حوائج کا یہی ہے کارِ اقوم
یہ عامل بن گیا جس کے لئے تھا عمل ہی ہے یہ اک شے سے مقدم
خدا کا شکر ہے دونوں ہیں فائز رہے طاعت میں دونوں ہی بہر دم
مبارک ہے ہماری دعوتِ آم ہوئیں دو طاعتیں اُس سے منظّم

اقانیم ثلٰثہ کا تشکر کہ جن کے دم سے دعوت میں پڑا دم
لئیق و احمد و یٰسین تینوں پھر اہل سردھنہ ہوں سارے خرّم
انہی سے آم کو طاعت ملی آج انہی سے ہم نے طاعت کا بھرا دم
خدا یا دے انہیں توفیق ہر سال کہ آموں کا منائیں جشن نیلم
خدایا رکھ انہیں ایسا سبک سار کہ سر پر ان کے ماثم ہو نہ مغرم
خداوندا رہیں دائم یہ دل شاد نہ چھو پائے انہیں تشویش اور غم
غمِ دنیا سے یکسر ہوں یہ آزاد غمِ عقبٰی میں ہرلمحہ ہوں پُرغم
رہیں دنیا میں جب تک آبرووے چلیں عقبٰی کو جب کردے معظم
زمیں کے فرش پر عرش آشیاں ہوں ہوں ظلِّ عرش میں رحماں کے محرم

والحمد للّٰہ اولاً و آخراً

۴؍ربیع الثانی ۱۳۸۶ھ

کیلا

برادرم حکیم محمد الیاس صاحب کٹھوری ثم المیرٹھی نے بمبئی کی ایک دعوت کے موقع پر جب کہ کیلے بھی دسترخوان پر آئے تو فرمایا کہ ایک کیلا قابض ہوتا ہے، دو قابض نہیں ہوتے، تین ہاضم ہوتے ہیں اور اس سے زائد ملیّن ہو جاتے ہیں۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے اُسی موقع پر اسے نظم کر کے جو حسبِ ذیل ہیں حکیم صاحب ممدوح کی خدمت میں پیش کیا۔

ہیں کیلے کی شانیں عجب رنگ رنگ — نرالے ہیں تاثیر اُس کے ڈھنگ
کہیں قبض آور کہیں ہے ملیّن — کہیں ہے یہ پانی، کہیں ہے یہ سنگ
عدد کے تفاوت سے تاثیر اس کی — دکھاتی ہے معدہ کو دنیا کے رنگ
ہے قابض اگر ہو اکیلا یہ کیلا — دو کیلا ہو تو قبض سے ہے بجنگ
کمک ایک کی اور مل جائے گر — تو پھر قبض کے رنگ میں ہے یہ بھنگ
اکیلے دو کیلے جو مل جائیں چند — تو مسہل بھی رہ جاتے ہیں ہو کے دنگ
نمایاں نہ ہو گر یہ تاثیر کا فرق — تو سمجھو کہ کیلے کے جوہر میں ہے زنگ
یہی بات کہتے ہیں الیاس حکیم — ہے امراض کا قافیہ جن سے تنگ
اسی کے موید ہیں طب کے اصول — ہے آئینِ فن کا یہی رنگ ڈھنگ
جوانی کے غرّے میں ترکِ اصول — اگر عذر بھی ہو تو ہے عذرِ لنگ

مقصدِ زندگی

لسان العصر اکبرالٰہ آبادی نے فرمایا تھا:

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے — یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی — وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

اس میں دنیائے فانی کی زندگی اور اس کے احوال کو ناقابل التفات ٹھہرایا گیا ہے جو امرِ حق ہے مگر مقصد کا پتہ نہیں دیا گیا جس کے لئے ان احوال کو ترک کر دیا گیا ہے، نیز بعض احوالِ دنیا رہ بھی گئے ہیں جو ذکر میں نہیں آئے، اس لئے حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس قطعہ میں بطور تتمہ چند اشعار کا اضافہ کر دیا ہے۔

اب اس قطعہ کو یوں پڑھنا چاہئے:

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی وہ فقط وقت کا گذرنا ہے

اکبر

رہ گیا عزّ و جاہ کا جھگڑا یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
قابلِ ذکر بھی نہیں خورد نوش یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے
مقصدِ زندگی ہے طاعتِ حق نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

استقبالِ مجاہد

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے احمد آباد جیل سے رہا ہونے پر یہ نظم لکھی گئی جو جامع مسجد دیوبند کے جلسۂ خیر مقدم میں پڑھی گئی۔

باد ممدودے کریمے کہ زمدح خویش از ثنائش ہمہ ترساں و گریزاں آمد
چہ کنم مدح عزیزے کہ زتسلیم و رضا مدح و ذم در نظرش واحد و یکساں آمد
شکر معبود بجا آرم و شاداں گویم از رہِ فضلِ خدا یوسفِ زنداں آمد
پیکرِ صبر و رضا رہ گرِ اخوانِ صفا یوسفِ راہِ وفا باز بکنعاں آمد
اسم سامیش حُسین است و مسمّٰی حسن است روحِ تکبیر بہ تصغیر چہ پنہاں آمد
نیک مردے ست کہ سرمستِ شہادت بینم ہم حیاتش ہمگی ظلِّ شہیداں آمد
اے تو عیسیٰ قدمی زانکہ ہمیں خطۂ ہند بود صحرا ز قدومِ تو خیاباں آمد

حیات النبیؐ

مسئلہ حیات النبی میں حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کا مسلک اور آبِ حیات کا خلاصہ:

جب موت بھی مزیلِ حیات آپؐ کی نہیں کہنا ہی کیا پھر آپ کی عینِ حیات کا
اصلِ حیات علم ہے اور علم آپؐ کا مرکوز ذات میں ہے جو جوہر ہے ذات کا
بس ذات ہی خود آپؐ کی ہے آپؐ کی حیات ہے موت ایک عارضی پردہ حیات کا
یہ موت انتقال ہے تبدیلِ حال ہے جو انبیاء کے واسطے افزوں کمال ہے

نوا سنج انا الحق

اے نوا سنجِ انا الحق ترا کہنا تھا بجا
پر نہیں پاسِ ادب عشق میں دعویٰ ہونا

ہے انا عشق میں اک راز درونِ پردہ
پر نہیں راز کا حق، راز کا افشا ہونا

عشق خوددار ہے خود رازِ درونِ عشاق
عشق کی خامی و رسوائی ہے لب وا ہونا

شور برپا نہ ہو ہر ایک بلا ہو برسر
یاں ہے برسر ہی ہنر عیب ہے برپا ہونا

اپنے آپے میں خودی ہوتو خودی ہے ورنہ
اپنے آپے سے گذرنا ہی ہے رسوا ہونا

غیرتِ عشق ہے اسرارِ خودی ہوں خاموش
نہ کہ اسرارِ خدا تک سے بھی گویا ہونا

دیکھ کر مہر کو اپنے میں نظر آئے جو مہر
یہ نظر ہی نہیں آنکھوں کا ہے خیرا ہونا

ہو اَنا مونہہ میں تو انت کی صدا کا کیا منہ
ہے انا ہی کا فنا منہ کا مداوا ہونا

نعرۂ سنجیٔ انا حق سہی لیکن پھر بھی
شرطِ انصاف ہے، انصاف سے گویا ہونا

ہے انا حسنِ نوا بحر بقطرہ ہو اگر
پر نہیں اس کا محل قطرہ بدریا ہونا

ختمِ نبوت

اک نبوت ہی نہیں ختم نبوت بردوش
اک صحیفہ ہی نہیں ہاتھ میں اعجازی کتاب

ذاتِ خاتم میں نبوات کے سارے انوار
ذاتِ قرآں میں ہدایات کے سارے ابواب

کیسے اقوام و ملل میں نہ پہنچتی یہ ضیاء
جب کہ جامع بھی تھی، خاتم بھی تھی ذات اور کتاب

خاتمِ وحی خدا، خاتمِ علم و اخلاق
خاتمِ نورِ نبوت، زرہِ علم و کتاب

منبعِ سرِ سلف، مصدرِ انوارِ خلف
جس سے ہیں سارے نبی اور ولی فیض مآب

دعوتِ الی اللہ

اعلاء دین کی ہے خلافت اسے ملی
وہ نائبِ حضورِ رسالت مقام ہے

اللہ کی وکیل ہے خلقت پہ ہے گواہ
اور اُس پہ پھر گواہی خیرالانام ہے

دعوت میں اس کی حق کی امانت ہے مستتر
علم اور عدل میں وہ جہاں کی امام ہے

اس علم اور عدل سے اسلام کا نظام
غلبہ میں اور ظہور میں اعلاء مقام ہے

اسلام ہی کے دن و سیاست میں منحصر　　اصلاحِ حال امت خیرالانام ہے
اس میں ہی ہے بقاء و ترقی کا انحصار　　ضامن ترقیات کا اُس کا نظام ہے
اُس میں ہے پھیل جانے کی خوداسپرٹ چھپی　　اس کی خود ہی خود سے اشاعت نظام ہے

اوازنِ مبالغہ

درسِ مقامات کے ذیل میں بزمانۂ طالب علمی مبالغہ کے مشہور چار صیغوں مِفْعَال، فَعُوْل، مِفْعل، فَعَّال کا فرق وامتیاز حضرت حکیم الاسلامؒ کو یادنہیں رہتا تھا، اس لئے ان کے فروق کو آپ نے نظم کرلیا تھا، جس کے بعد پھر کبھی اس سے ذہول نہیں ہوا اور جب مشکوٰۃ شریف کا درس آپؒ سے متعلق ہوا تو طلبہ نے بھی اس کی نقلیں لے کر یادداشت کا فائدہ اٹھایا۔

تُرید فروق اوزان فسمعاً　　لامرک یا بُنَیَّ وما تقولٗ
هی الاوزان اربعة تراها　　بنظم عن لحاظک لا یزولٗ
فمفعال متی تعتاد فعلاً　　و اَن تقویٰ علی فعل فعُولٗ
ومن هو عُدَّةٌ للفعل مِفعلٗ　　و قوّال یکرّر ما یقولٗ

سبعۃ اَحرف

معانی حدیث انزل القرآن علیٰ سبعة احرف

نزول کتاب اللّٰه فی سبع احرف　　تعدُّ لفظٍ لأعداد معان
فاما لغات من قبائل سبعة　　فصاحتها امتازت بحسن بیان
قریشٌ هُذیلٌ ثم طَیٌّ هوازنٌ　　ثقیفٌ تمیمٌ ثم اهل یمان
و امّا قراء اتٌ بانواع لهجة　　تسبَّعها القراءُ بالاتقان
و اما یُراد بسبعة تنویعها　　انواع احکام من القرآن
حلالٌ حرامٌ محکمٌ متشابهٌ　　فزجرٌ و امرٌ والمثال بشان

سازِامکانی

حضرت حکیم الاسلامؒ کی یہ نظم ''القاسم'' قدیم بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۴۵ھ میں شائع ہوئی۔

زبوں اندوزیوں نے گھر بنایا ہے کہاں میرا　　ثریٰ اپنی زمیں ہے اور زمیں ہے آسماں میرا

نہیں قسمت میں جن کی کشف میں پنہاں میں وہ ہستی ہوں
چمن میں باغِ امکاں کے عدم ہے آشیاں میرا
میں وہ کشتی ہوں جس کا ناخدا آغوشِ طوفاں ہے
فضا کے تند جھونکوں پر چلا ہے بادباں میرا
اس عالم کے مرقع میں میں اک تصویر باطل ہوں
سراب وہم کی موجوں میں ملتا ہے نشاں میرا
صدف ہوں پھر بھی اک نایاب سا اس بحرِ ہستی کا
کہ صدر چشمک زنِ لؤلؤ ہے اشکِ خونچکاں میرا
ہویدا کچھ نہیں گو چشمِ غم سے نورِ گویائی
میں خود غم کی زباں ہوں گم اگر ہے بے زباں میرا
عنادل کے ترنم سے الگ ہے زمزمہ اپنا
مگر کرتی ہے حرماں کی تجلّی امتحان میرا
مدامم مست می دار و شرابِ صد طپید نہا
خرابم می کند در دستِ حسرت صد و دید نہا

''حیاتِ طیب'' کے بابِ اوّل میں سفر وادیٔ کشمیر میں حکیم الاسلامؒ کے منظوم سفر نامہ کے چند اقتباسات پیش کیے گئے ہیں، ذیل میں اُسی سفر نامہ کے چند مفید اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

اہلِ کشمیر

''کشمیری وطن میں بے وطن''

مالک ہیں اس کے آہ کہ تشویش کا شکار
ضیق دروں سے زار ونزار اور دل فگار
محروم ہے وطن سے مگر مالک وطن
محروم ہے بہار سے خود مالک چمن
ان خوبیوں پہ کیوں ہیں وہ دلگیر و دل نزار؟
کیا جرم ہے کہ جس سے بنے وہ قصور وار؟
بنیاد ہے مصیبت کُل، معصیت نہیں
بنیاد خوبیاں ہیں کوئی منقصت نہیں
بنیاد اس کی زیب ہی خود اس چمن کی ہے
خوش منظری جہاں میں اس انجمن کی ہے
بنیاد یہ کہ کیوں ہے وہ جنت نشاں زمین؟
بنیاد یہ کہ اس کے مناظر ہیں کیوں حسین؟
بنیاد یہ کہ کیوں ہے جمالوں میں وہ فرید؟
بنیاد یہ کہ کیوں ہے ممالک کی وہ کلید؟
ہر بوالہوس کی اس لئے پڑی ہی تھی نظر
پھنسنا ہی تھا اسے بھی بلا میں کمر کمر
کشمیر خود سے گو اک عروس حسین ہے
خطّوں میں مثل چہرۂ ماہ مبین ہے
پر اس کے حق میں حسن ہی یہ بن گیا بلا
شکوہ کرے تو کس سے وہ کس کا کرے گلا
کشمیر خود نہیں ہے اس آفت کا ذمہ دار
وہ عاشقوں کے تیر رقابت کا ہے شکار
عاشق ملے مگر ہیں وہ خود غرض و بے وقار
محبوب بھی ہے جن سے ستم دیدۂ و فاصلہ سے وفگار
یہ عشق تا بہ زانو ہے آگے نہیں ہے کچھ
شہوت ہے نفس کی یہ محبت نہیں ہے کچھ

خواہش ہے سیم وزر کی ہوس اقتدار کی
ہے اک لپٹ یہ نفس کے اٹھتے شرار کی
مار سیاہ گرد خزانے کے ہیں پڑے
ایسے اڑے ہوئے ہیں کہ گویا یہ اب لڑے
اس جنگ زرگری میں ہے کشمیر کا یہ حال
اس کا رہا نہ قال نہ بر جائے خود ہے حال
نازک بدن عروس پہ یہ ناوکِ جفا
خود غرضیاں نہیں ہیں تو کیا ہوں گی یہ وفا؟

کشمیر کی المناک حالت

زینت کی ان فضاؤں میں آفت زدہ مقام
ہے ایک صرف ایک ہے کشمیر جس کا نام
لاکھوں یہاں یہ آتے ہیں کرنے کو غم غلط
کشمیر کا مگر نہیں ہوتا ہے غم غلط
کشمیر کی یہ رنجیدہ حالت پُر الم
آئندگاں براحت وباشندگان بغم
کشمیر کی زبان پہ جاری ہے یہ حُدی
اے روشنی طبع تو برمن بلاشدی
کشمیر بے زباں بیچارہ اُدھر میں ہے
پورا سفر میں اور نہ پورا حضر میں ہے

کشمیریوں کی بجا فریاد

کشمیری اس پہ گر کریں فریاد الغیاث
بے جا نہیں ہے بلکہ یہ ہے بہترین اثاث
کشمیریوں کا قول ہی اس میں ہے مستند
کہتے ہیں وہ اور ان کا یہ کہنا ہے خود سند
ہم سب اسی لئے سرِ میداں ہیں سر بکف
ہے خواہ مخواہ ہم کو بنایا ہوا ہدف
مقصد ہے یہ کہ ضیق کی بیماریاں گھٹیں
کشمیریوں کے تا کہ کچھ آگے قدم بڑھیں
سعی و عمل ہیں ہاتھ میں ہے کر رہے ہیں ہم
کرتے رہیں گے دم میں ہے جب تک کہ اپنے دم
راہیں ہیں پیچ دار، خلیجیں ہیں بے شمار
دشواریاں ہزار ہیں کمزور راہوار

اصل مصیبت

لیکن یہاں اک اور دقیقہ ہے مختصر
ہے مستحق کہ اس پر بصیرت سے ہو نظر
یہ باغ و راغ جو بھی ہیں کشمیر کا ہے حسن
ہوگا نہیں شمار یہ کشمیریوں کا حسن
حسن و جمال کا ہے الگ ہر محل میں طور
کشمیریوں کا اور ہے کشمیر کا ہے اور
کشمیر کا جمال ہے قدرت کا شاہکار
کشمیریوں کا حسن ہے اخلاق و جوش کار
کشمیر اگر ہے اپنے مناظر میں باجمال
کشمیری وہ ہے جو ہو محاسن میں باکمال

قدرت کی ہے یہ دین کہ کشمیر باجمال
کسب کمال میں بھی سدا سے ہے مالا مال
مثل جمال اس کا تمدن بھی تھا جمیل
اس کی بقا کا سب سے بڑا تھا یہی کفیل
منظر مٹے تو قوم کا مٹنا نہیں ہے یہ
مشرب مٹے تو قوم کا بچنا نہیں ہے یہ

کشمیر کی اصل تاریخ

کشمیر کی جب اپنی ہے تاریخ مستقل
علمی بھی صنعتی بھی بہر دور مستقل
تعلیم مستقل رہ تہذیب مستقل
انداز تربیت ہو کہ تادیب مستقل
وہ ان خصوصیات سے ہے ملک مستقل
اس کے حقوق بھی ہیں بہرحال مستقل
اس کی ضرورتوں کے تقاضے بھی مستقل
ہے ناگزیر ان کے لئے سعی مستقل
ان کا ہے اقتضا کہ طلب بھی ہو مستقل
قربانیاں بھی دینی پڑیں خواہ مستقل

زعماء کشمیر کا فرض

اس کو ہی پھر سے زندہ کریں قوم کے امین
جزوی مفاد چھوڑ کے مقصد کے ہوں رہین
لے کر اسی کو پھر سے چلیں قوم کے خواص
قائم کریں دیانت باطن سے اختصاص
عیش فزوں میں لائیں بہرحال اعتدال
راہ عمل میں پیش کریں علم کا جمال
اصلاح قوم کے لئے سب ہو کے مستعد
اک متحد نظام پہ ہوجائیں متحد
باہم ہو اختلاف فروعات میں اگر
سب متحد اصول کی حد تک رہیں مگر
اس میں کبھی بنائے نہ جائیں حکم عوام
یہ گھر میں بیٹھ کر ہے فقط رہبروں کا کام
تنقید وتبصرہ سے نکھر جائے بات جب
اسٹیج پر عوام کے ہو سامنے وہ تب
ورنہ یہی ہے پارٹی فیلنگ کی اساس
پھر اتحاد قوم رہے گا نہ آس پاس

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۳۰/جون ۱۹۷۳ء

............❖............

منظوم صد سالہ

حمد و نعت

خدا کی حمد حرفِ اوّلیں ہے — نبی کی نعت نقشِ آخریں ہے
سلام و رحمت اصحابِ نبی پر — اور اُن کے بعد ہر اک تابعی پر
پھر ہر ہر تابعی کے مقتدی پر — اور ایک اک فردِ مومن امتی پر
پھر اس دارالعلوم دیوبند پر — اور اُس کی سرزمین کے بند بند پر

دیوبند

سلام اے دیوبند اے مرکزِ دین — سلام ایک مخزنِ ارشاد و تلقین
سلام اے منبعِ رُشد و ہدایت — سلام اے مرجعِ دین و دیانت
سلام اے مولد اہلِ شریعت — سلام اے منشاءِ اہلِ طریقت
سلام اے معدنِ عرفان و حکمت — سلام اے موردِ کشف و کرامت
سلام اے قوتِ اسلام و ایمان — سلام اے جامع ایقان و اتقان
سلام اے دیوبند اے حق کے راہی — سلام اے دین و ملّت کے سپاہی
جنم تو نے دیا ہر علم و فن کو — کیا روشن زمیں کو اور زمن کو
یہ عالمگیر دارِ علم و عرفاں — مہ و خور سے ہے جو زیادہ نمایاں
تری ہی گود نے پالا ہے اس کو — ترے ہی بطن نے ڈھالا ہے اس کو
تجھ ہی پر ہے کھڑا دارالعلوم آج — مدارس کے لئے ہے جو کہ سرتاج

دارالعلوم دیوبند

تو اے دارالعلوم دیوبند آج
بحق ملتِ حقہ ہے معراج
سلام اے نورتن علم و وفا کے
سلام اے نعرہ زن عشق و وفا کے
سلام اے دار علم و بحر عرفان
سلام اے وارث عرفان و احساں
بفضلِ رب ہے تو امّ المدارس
تری اولاد ہیں یہ سب مدارس
اگر تو ہے تو تازہ ہر چمن ہے
نہ ہو گر تو تو پھر ویرانہ پن ہے
تو مصدر ایشیا میں علم و دیں کا
تو ہی سرچشمہ ہے دینِ متیں کا
سماء علم کے روشن ستارے
ترے ہی فیض سے اُبھرے ہیں سارے
زمیں کو آسماں تونے بنایا
کواکب سے اسے پھر جگمگایا
بنا اُن میں ہر اک نجم ہدایت
ہدایت باقیات بہر ملّت
تری ہے اصل ثابت فرعِ عالی
ہے توہی شجرۂ گنج معالی
فقیری میں بھی کی ہے تونے شاہی
تو قاسم ہے بامدادِ الٰہی

دارالعلوم کی اساسی شخصیتیں

تو ہے بہر جہاں امدادِ اللہ
تو ہے اک ہدیۂ مُہداۃِ اللہ
اساسی شخصیت امدادِ اللہ
رئیس الطائفہ امداد اللہ
یہی تھی شخصیت تیری بڑی اصل
جو تھا اللہ کا تجھ پر بڑا فضل
اسی کی سجدہ ریزی تیری بنیاد
ہے یہ گلشن ترا اس سے ہی آباد
تری بنیاد کا پہلا تصور
اسی اک ذات کا تھا اک تنوّر
تنے اس کے تھے محکم چارگانہ
نہاں تھا جن میں پھولوں کا خزانہ

مبانیٔ دارالعلوم

رشید و قاسم اُستاد زمانہ
رفیع الدین ویعقوب یگانہ
جلو میں ان کے حاجی سید عابد
بقلب روشن و با نفسِ زاہد
بہ پیشین ذوالفقارِ سیفِ ایماں
بہ پہلو فضل رحمٰں بحرِ احساں

یہ سارے اولیاء و اتقیاء تھے
محبِ حق تھے مقبولِ خدا تھے
تھے پہلے دو مسلّم قطبِ ارشاد
فنا فی اللہ اور دنیا سے آزاد
تھے علم ظاہر و باطن میں قدوہ
عمل اور اتباعِ حق میں اُسوہ
محدِّث اور محدَّث باطریقت
تھے دونوں قطبِ تکوین و شریعت
اور آخر کے تھے پانچوں غرقِ احسان
بعرفان حجت و در دین برہان

آثارِ علم

مدارِ مستند تھے قاسم العلم
بنے یعقوب اُن سے پھر درِ علم
اسی جڑ سے یہ شاخیں ساری پھوٹیں
پھر اُن سے ٹہنیاں کتنی ہی ابھریں
کھلے پھول اُن پہ رنگا رنگ ہر سو
مہک اٹھی جہاں میں اُن کی خوشبو
تری بنیاد ان سچوں نے ڈالی
تری طفلی انہوں نے ہی سنبھالی
تو اُن کے عزم و اخلاصِ دروں سے
چڑھا پروان ان کی برکتوں سے
تو کونپل تھا مگر ہے آج شجرہ
وہ شجرہ ہے دوامی جس کا ثمرہ
ترے شیریں پھلوں سے دل کی دنیا
ہے شیریں لب سرور آگیں بھر جا
ترا ایک ایک پھل ایک ایک درخت ہے
درخت اندر درخت اندر درخت ہے
ہے شیخ الہند اس وادی میں کوئی
حکیم الامت اس گلشن میں کوئی
کوئی ہے شیخ تفسیر معلّٰی
کوئی شیخِ حدیث نور افزا
کوئی ہے شیخ فقہ و با درایت
کوئی ہے محو اسناد و روایت
کسی کو فنِّ احساں میں مہارت
جو دل کے زیغ کو کرتا ہے غارت
کوئی افتاء کی خدمت میں ہے فانی
کوئی تنظیمِ ملت کا ہے حامی
کوئی میداں مجاہد مردِ غازی
کسی کا داعیہ ہے قوم سازی
غرض ہر فن پہ اک اک شیخ حاوی
فقیہ النفس کوئی، کوئی راوی
یہ ابنائے قاسمی ہوں یا رشیدی
ہوں یعقوبی کہ ابنائے رفیعی
سبھی مل کر بنے نجمِ ہدایت
انہیں سے پھیل پائی ہے سعادت
سو اوّل قاسمی ابناء کو لیجئے
جو کافی ہیں مثالاً چند لیجئے

ابنائے قاسمی

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ محدّث دیوبندی

حمیدِ خلق محمودِ زمانہ   بقلم قاسمی فردِ یگانہ
بشیخ الہند معروف اور مشہور   زمانہ جن کی خوشبو سے ہے مخمور
محدّث اور مجدّد اور مجاہد   بہ دنیائے دنی بے مثل زاہد
شرابِ جَاهِدُوْ فِی اللّٰه سے مست   غنی از وہم و فکرِ نیست اور ہست
معلّمِ از علوم ذاتِ سبحاں   رشید و مرشد از انوار احساں
نمونہ قاسمی علم و عمل کا   بامدادِ رشیدی رُشدِ کل کا
خزینہ علمِ اسرار نبی کا   کمالِ حسنِ اخلاقِ ولی کا
تواضع سے عیاں ذوقِ کہی تھا   فقیری میں نہاں فرِّ شہی تھا
تھی انگریزوں سے اس درجہ عداوت   کہ جس درجہ میں تھی دینی محبت
شدیم آزاد از جذبِ درونش   برفت انگریز از دفع برونش

حضرت مولانا سید احمد حسن قدس سرہٗ محدّث امروہی

گلِ امروہہ میر احمد حسن تھے   کہ جن سے تازہ سب علمی چمن تھے
کلامی دائروں کی قاسمیت   انہیں کے دم سے پھیلی تا بغایت
لقب تھا قاسم ثانی اور حق تھا   کہ جن سے مبطلوں کا رنگ فق تھا
محدّث باصفا باقلبِ روشن   علومِ حق سے تھا جن کا کنکشن

حضرت مولانا عبد العلی قدس سرہٗ محدّث میرٹھی

محدّث دہلوی عبدالعلی تھے   جلالی شان سے گل رو ولی تھے
تھی دلّی اُن سے پُر انوار پیکر   حدیثِ پاک کا پُر نور مظہر
علوم قاسمی کا آب گینہ   تھا اخلاقِ ستودہ کا خزینہ

حضرت الشیخ مولانا صدیق احمد صاحب مرادآبادیؒ

مرادآباد میں صدیق احمد   مجسم علم اور خُلقِ مجدّد

نمونہ قاسمیت کا عیاں تھا اور اس میں قاسمی جذبہ نہاں تھا

حضرت مولانا فخرالحسن صاحب گنگوہیؒ

زہے گنگوہ جس کا اک ذکی فرد شدہ فخرالحسن نامش زباں زد
فیوضِ قاسمی کا نورتن تھا بہارِ قاسمی کا اک چمن تھا
یکے از ترجمانِ قاسمی بود کہ علمش از قلم بنوشتہ آسود
قلم سے کی ہے نقاشی چمن کی قلم میں تھی وہ جذّابی دہن کی
مسائل میں وہ کی ہے ترجمانی عیاں ہے جس سے ایمانِ یمانی

حضرت مولانا نواب محی الدین خان صاحب مرادآبادیؒ

محی الدین خاں نوابِ ذی جاہ بدنیا دیں پناہ و علم آگاہ
مرادآباد کی علمی مجالس تھیں روشن اُن سے، تھے شمع مجالس
مؤثر نفس میں انفاسِ قاسم مربی روح میں آثار قاسم
ہوئے بھوپال کے قاضی اعلیٰ تھے سب زیر قلم اعلیٰ و ادنیٰ
کمالِ خیر عقبیٰ کا نمونہ مجمع دین و دنیا برّ و تقویٰ

حضرت مولانا حکیم منصور علی خان صاحب مرادآبادی ثم الدکنیؒ

حکیم نکتہ داں منصور علی خاں طبیبِ ملک و استاد طبیباں
اطباء دکن را بود ناظر بعلم دین و طب اُستاد ماہر
رسالہ مذہب منصور لکھ کر کیا احسان ملت پر سراسر
کتابِ نادر و مملوز تحقیق ہے جس میں دین وطب کی خاص تطبیق

حضرت مولانا محمد مراد صاحب پٹنی ثم المظفرنگری

اُسی حلقے کے اک فرد فریدی ہیں مولانا مرادِ پٹنی بھی
فریدی اور فاروقی نسب میں امین قاسمی علم و حسب میں
خلافت حضرت قاسم سے پائی یہ روحانی بھی نسبت ہاتھ آئی

اثر ان کا مرادی مدرسہ جو امر قاسمی کا ہے نتیجہ
مظفر در نگر میں نور افگن ہے انکی کی ہوئی یہ شمع روشن

حضرت مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوریؒ

رحیم اللہ فتحِ باب رحمت ز بجنور آمدہ باصد کرامت
ارسطوئے زماں در بابِ حکمت معاً پھر ماہر قرآن و سنت
زاعیان و اکابر در فضائل کریم الخلق و پاکیزہ شمائل
گلِ رنگینِ باغِ قاسمی بود کہ بوئے خوش بمالش بے فزود

ابناءِ رشیدی

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدّث سہارنپوریؒ

خلیل احمد فقیہ العصر و عارف محدّثِ شیخ کامل ذو المعارف
ز تقوائے درونی مظہرِ دیں مظاہر جن کے ہیں سب پیکر دیں
تھی تدریس ابتدائی دیوبند میں مظاہر میں جمی پھر بند بند میں

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہٗ

شہ عبدالرحیم رائے پوری کہ جن کی رائے تھی ہر فن میں پوری
ز نورِ قطب گنگوہی منور ز فیضانِ رشیدی روحِ پرور
ہزاروں نفس نفسِ مطمئنہ بنے ان سے ہوئے سب اہل جنّہ

حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھویؒ، مفتی مالیرکوٹلہ

شہِ صدیق احمد باصداقت تلمذ کردہ بر قاسم ز الفت
مجاز قطب گنگوہی در احساں زار بابِ کشوفِ کون و اکواں
رشیدیت بخلطِ قاسمیت زا انبہٹہ بشہرِ کوٹلہ رفت
ریاست کوٹلہ کے مفتیِ خیر جو فرد ہو کر بھی تھے اک عالم خیر

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند

زہے از آلِ قاسم حافظ احمد محمد احمد و با عرفِ احمد
محدّث مستند استاذِ حاذق رہِ تفہیم میں ممتاز و فائق
بیانش سحر در درسِ احادیث شدے منقول چوں عقلی نوامیس
خلافت حضرتِ امداد سے تھی سند گنگوہ کے اسناد سے تھی
اسی میں اہتمام مدرسہ تھا جو علمی شغل کا اک مخمصہ تھا
بناہا آخری دم تک بھی اُس کو ترقی دی نظامِ مدرسہ کو
یہی چالیس سالہ دورِ مسعود ترقی کا رہا اک دورِ محمود
وجاہت، علم اور نسبت کی عظمت کہ جس سے نظم تھا با رعب و ہیبت
بہ عہد اہتمامش چہل سالہ یہ ذرہ بن گیا کوہِ ہمالہ
چو بست و نہ رسید عقدِ اَنامل شدہ روحش سوئے اللہ واصل
دکن شد مدفنش درموتِ غربت نصیبے بُرد از موت شہادت

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند

حبیب باصفا رحماں میں فانی ادیبِ بے دل با نکتہ دانی
بہ نفحاتِ عرب بے مثل بودہ باوصاف و کمالاتِ ستودہ
تدبر اور دانش میں یگانہ تھے قائل جن کے سب اہل زمانہ
تھے نائب، پر وہی تھے نظم کی روح تھے عُقدے انتظامی اُن سے مفتوح
سو جب ہو مہتمم بھی باوجاہت اُدھر نائب ہو با تدبیر و حکمت
تو ہو ایسا ادارہ کیوں نہ اونچا دکھا سکتا تھا اس کو کون نیچا
ترا اے دارِ عرفاں یہ زمانہ بلا شک خیر کا تھا اک خزانہ
تھے نائب اور منیب ایسے میسر کہ مل پایا نہ اُن کا کوئی ہمسر
اداری نظم اور تعلیم تیری نہ تھی دونوں کو اُس سے کوئی سیری
انہوں نے تجھ میں عمر اپنی کھپادی بہ شرق و غرب کی تیری منادی

ابناءِ یعقوبیؒ

حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

مجدّد تھانوی کی کیا ہو تعریف ہیں زائد از ہزار اُن کی تصانیف
شہِ اشرف علی شیخ طریقت رہِ احکام میں میرِ شریعت
علوم ظاہر و باطن میں ماہر بجان و جسم طیب اور طاہر
امینِ علم یعقوبی بدوراں امانت کردہ در سینہ چو قرآن
تحمل اور ادا دونوں میں کوشاں افادہ استفادہ دل میں جوشاں
تصوف میں مجدد اس صدی کے بلا شک حضرتِ اشرف علی تھے

حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوریؒ

ترے ہی مرتضیٰ نے اٹھ کے یکسر اکھاڑا بدعتوں کا بابِ خیبر
مجادل بالّتی اَحسَن کے مظہر ز سنت ردِّ بدعت کے تھے محور
یہ تھے سب درس یعقوبی کے آثار کہ جن کا اُن سے ہوتا تھا یہ اظہار

ابنائے رفیعیؒ

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، مفتی اوّل دارالعلوم

عزیزِ دوجہاں مفتیٔ اعظم فقیہ وقت و استاذِ معظم
انیسِ انس و جاں تھا اُن کا فتویٰ رفیقِ روح و تن تھا اُن کا تقویٰ
کمالِ نقشبندی اُن سے پیدا کہ تھی شانِ رفیعی اُن پہ شیدا
انہیں سے دارالافتاء کا تھا آغاز بنا یہ ''دارالافتاء'' جس سے ممتاز

ابناءِ شیخ الہندؒ

تھے شیخ الہند اک تخم سعادت اُگے جن سے شجرہائے قیادت

حضرت علامہ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری، صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

ترے بحر العلوم عصر حاضر کہ ہر فن سامنے تھا جن کے حاضر

تھے انور شاہ اک علمی خزانہ جنہیں مانے ہوئے تھا اک زمانہ
مثالی حفظ و استحضار ایسا کتب خانہ تھا گویا چلتا پھرتا
کمالِ اتباع سنت ایسا عمل سے ان کے کھل جاتا تھا مَسلا*
تبحر اور تفقہ طبع ثانی روایت اور درایت نقش مانی
کتابوں میں کتابِ دل بھی شامل دماغی عقل اوپر سے مماثل
دماغ و قلب و روح و طبع سالم سب ہی مل کر تھے علم حق کے خادم
نہ تھا اک علم بلکہ علم جامع جو ہر علمی رکاوٹ سے تھا مانع
ادب دینی کتب کا بے پنہ تھا کہ چھونا بے وضو ان کا گنہ تھا

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، صدر المدرسین دار العلوم دیو بند

حسین احمد کا دیکھے کوئی دم خم اُڑایا جس نے آزادی کا پرچم
جہادِ حریت کا اک کمانڈر نہ دل میں خوف و اندیشہ نہ کچھ ڈر
مجاہد شیر دل اعداء پہ بھاری حکومت جس سے تھرّاتی تھی ساری
مثالی عزم و ہمت ضبطِ اوقات کہ بے معنی یہاں تھا لفظ مافات
ادھر ہر وقت ہے درس بخاری ادھر ہے جنگ آزادی بھی جاری
اِدھر درس و کتب کا میل بھی ہے دگر سُو ریل بھی اور جیل بھی ہے
تواضع عجز و خوئے خاکساری وقار و تمکنت اوپر سے طاری
بہم تھے حبِّ فی اللہ بغض للہ عطاء و منع تھے للہ فی اللہ
عجب تھی جامع الاضداد سیرت کہ ناممکن بھی تھا ممکن کی صورت
بہم کس نے کئے یوں سند و ساغر اور اُس پر عجب و خود بینی سے باہر

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ

عبید اللہ سندھی مرد آہن ز اغراض خسیسہ پاک دامن

---

*اصل میں ''مسئلہ'' تھا، وزن شعری کی رعایت میں ''مسلا'' تحریر کر دیا گیا ہے۔

فنا فی شیخ ہند با صد عقیدت بکارِ شاں موفق بہر ہجرت
غریقِ بحرِ علم و بحرِ حکمت فقیہ العلم و دانائے سیاست
گذارے دشتِ غربت میں مہ و سال نہ گھر باہر نہ دل میں اُن کا جنجال

حضرت مولانا محمد میاں انصاریؒ

عرف مولانا منصور انصاری انبیٹھوی ثم الکابلیؒ

محمد ابن بنت قاسم الخیر عمید شیخ و ذاتش جامع الخیر
مجاہد مردِ میدان اور مفکر ممالک کی سیاست میں مبصر
وکیل شیخ ہند در بابِ تحریک صحیح تعبیر بہر خوابِ تحریک
امینِ ریشمی خط جانِ تحریک مصائب بر سر و میدان تحریک
تحمل کی مثالی شمع تھی پاس کہ جس سے پاس تک پھٹکے نہ وسواس
یہاں انبیٹہ تھا آبائی مسکن وہاں کابل ہوا پھر اُن کا موطن
بکابل کردہ ہجرت باز نامد بجہدش لیک ہند آزاد و آمد
خدا رحمت کند ایں عاشقاں را بغربت خوش بدادند نقد جاں را

حضرت مولانا عزیر گل صاحبؒ

عزیر گل برنگ و لون ہم گل بصورت گل بہ سیرت بوئے خوش گل
زبان ظاہر کی باطن کے موافق ہر اک قول و عمل باہم مطابق
رفیق خاص شیخ الہند مغفور برائے ما امیر و زانش مامور
دخیل اندر مزاجِ شیخ بودہ بطبعش بے تکلف صاف بودہ
بجمع علم و دین و ہم سیاست بکارِ شیخ فانی فی العقیدت

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، استاذ دار العلوم دیوبند

ترے شبیر نے العقل لکھ کر جنوں کا کر دیا تاراج دفتر

کلام و فلسفہ میں با درایت بیانِ حکم میں میرِ خطابت
بیانش سحر تقریرش ز حکمت خطابت یافت از وے عز و شہرت
ملقّب شد بہ پاکستاں ز اسلام بالقاب امین و شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ، استاذ دارالعلوم دیوبند

ترے اصغر حسینِ باکرامت سیادت اُس پہ پھر علمی وجاہت
فقیہہ و عارف و صوفی و زاہد تقی و عالم و صدیق و عابد
نہ کچھ پھسلا سکی دنیا کی زینت رفیقِ راہ تھا زہد و قناعت
ترے حلقوں میں یکساں محترم تھے باخلاقِ حمیدہ ذوالکرم تھے
دلی خواہش تھی پائیں موتِ غربت رہے امن اور ملے موتِ شہادت
خدا نے کی دعا مقبول حضر میں وفات آئی تو راندیری سفر میں

حضرت مولانا محمد سہول صاحب بہاریؒ، صدر افتاء دارالعلوم دیوبند

سہول اندر بہار و خود بہاراں ز فیضِ شیخ ہند از علم ملّاں
رقیق القلب از عشق و محبت قوی القلب از علم و بصیرت
شدہ زینت دہ افتاء و تدریس بدارالعلم کردہ کارِ ادریس
مجاہد اس پسِ آزادیٔ ہند کہ جیسے حکمراں ہو ہند پر سندھ
بحسنِ نیتش معذور وماجور مگر از ما ضعیفاں گشتہ مہجور

حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، شیخ الادب دارالعلوم دیوبند

ملا فقہ لغت کا اس کو اعزاز کہ جس سے تو وہ ہیں ہم چشموں میں ممتاز
مراد اعزاز علی اُستاد مشفق ادیب وہم مودّب لیک بارفق
محشّیِ کتب فقہ و ادب میں بہ شرح و بسط حاوی سب کی سب میں

حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی صاحبؒ، صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

وہ ابراہیم کی ملت کا طُغریٰ ترے ہی سر پہ ہے آج اس کا سہرا

علیمے جامع معقول و منقول حلیمے جامع افراد و مقبول
بہ تفہیم مضامین مختصر گو بہ شفقت مستفیداں را دعا گو
یہ تھی علامہ بلیاوی کی برکت نمایاں رہتی تھی مسلک کی قوت

حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ، شیخ المعانی دارالعلوم

زہے عبدالسمیع شیخ معانی مطوّل مختصر میں شیخ فانی
بغایت منکسر بے لوث و بے نفس مگر آنچ آئے مسلک پر تو بانفس
فھُم اَمثالُ آبائِیْ فَجِئنِیْ بِمِثلٍ بَل بِشِبْہِ الْمِثلِ جِئنِیْ
وَلاَ تَجِدُوْنَ مِثْلَھُمْ بِعِلْمٍ وَلاَ عَمَلٍ وَلاَ خُلُقٍ وَحِلْمٍ

حضرت مولانا سید فخر الدین احمدؒ، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

ز فخرالدین احمد شیخ الآثار مدرسہ جن سے تھا دَربار دُربار
بکھرتے یاں یواقیت و داراری وہاں تھی منبسط روحِ بخاری
بخاری کے خصائص کے تھے حافظ اور ابواب و تراجم کے محافظ
بجسمے نازک و با روح اقویٰ بجسم و جان خود فتویٰ و تقویٰ

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ، امیر تبلیغ دہلی

یکے تلمیذ شیخ الہند الیاس محقق عارف و پاکیزہ انفاس
امیر دعوت و تبلیغ و ارشاد کہ ہے اصلاح امت جس کی بنیاد
جہاد حق کی بیعت شیخ سے کی جہاد اکبر یہ اک تبلیغ ہی تھی
ہمہ گیری تھی شیخ الہند کا جذبہ ہے تبلیغ ہمہ گیر اس کا ثمرہ
ہوئے ممدوح اس دعوت کے قائد ہیں آج ہر ملک میں اس کے عمائد
ہوئی ہے ملک ملک اس کی منادی ندائے حق تھی جو سب کو سنادی

حضرت مولانا رسول خاں صاحبؒ, شیخ المعقول دارالعلوم

یکے تلمیذ شیخ الہند ذی شاں ضیاءِ صوبۂ سرحد رسُل خاں

بعلم عقل و نقل استاد ماہر برعبِ علم بر تلمیذ قاہر
وقار و تمکنت بر رو نمایاں نشستہ وقتِ تدریس ہم چو شاہاں
بدارالعلوم گشتہ شیخ معقول سپش در اشرفیہ شیخ منقول

احفاد شیخ الہندؒ

قلم لگتے گئے پھر اس شجر میں چلی نسل اور پھیلی بحرو بر میں
کھلے پھر رنگ رنگ کے پھول اس میں مگر رنگِ سلف حاوی تھا سب میں
ہر اک کا رنگ و بو اپنا جدا تھا شریعت پر مگر ہر اک فدا تھا
ہیں شیخ الہند کے احفاد اتنے کہ اَبنا بھی نہیں گنتی میں اُتنے
نہیں ممکن شمار ان کا کہ کیئے ہیں ہزاروں میں مثالاً چند یہ ہیں

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ، بانی و شیخ الحدیث مدرسہ نیوٹاؤن کراچی

یکے یوسف جمال از ارضِ بنّور کیا جذبِ علم انور شہ بصد غور
سفینے بھر دیئے علم نبی سے جو ہیں روشن نکاتِ انوری سے
بنا کردہ مدرسہ در کراچی کہ پھیلیں یہ علومِ حق شناسی
بنا اس کی ہے مبنی بر دیانت عمل احوط بہ تاحدِّ امانت
مقامی اور آفاقی ہیں شعبے کہ جن سے دین ہر پہلو سے پھیلے
جزاہُ اللہ عنا احسن الخیر بلا نقصٍ و لا نجس ولا ضیر

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مفتیٔ پاکستان و سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند

شفیعِ نکتہ آور مفتی پاک کہ جن سے بن گئے ناپاک بھی پاک
فتاوٰی کی وہ کی خدمت کہ جس سے فضاء پاک میں پاکیزگی ہے
مصنف اور موفّق بہتر تصنیف ہے پُر از تربیت ہر ایک تالیف
ہے تصنیفوں کا شہ کار ان کی تفسیر جو قرآنی معارف کی ہے تعبیر
مُجازِ اشرفی، مقبولِ انور نگاہِ صغرٰی سے بہرہ آور
ہیں آثار اُن کے قائم اور دوامی ز دارالعلم شیرانی کراچی

مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھیؒ مہاجر مدنی، سابق استاذ دارالعلوم دیوبند

ہلالِ نو بالآخر بدر عالم
جواں علم و جواں ہمت جواں دم

علومِ انوری تھے پیش ہر دم
بہ سمع بالقاء و صحبتش ہم

مؤلف فیضِ باری بر بخاری
ز فیض شیخ و نورِ فتحِ باری

بہ دیوبند ابتداءً گشتہ استاد
سپس رفتہ بہ پاکستان شد آباد

نظامِ علم ٹنڈو در گرفتہ
بدیں روشن فضاء سندھ کردہ

زعیمِ مدرسہ ٹنڈوالہ یار
شدہ پس بہر طیبہ تیز رفتار

زہے آں ترجمانِ سنت پاک
مہاجر مستقر شاہِ لولاک

شدہ پیوست در خاکِ مدینہ
چو گوہر چو در آید در خزینہ

خمیرش بود چوں زیں قطعۂ پاک
ز بس مدفن شدہ بہرش ہمیں خاک

برائے رفعتِ ایں آبگینہ
بقیعِ غرقد آں را شد چو زینہ

جَزاہُ اللّٰہ فی الدارین خیراً
وَ رقّاہُ ارتقاءً ثم سیرا

مولانا عبدالحق اکوڑویؒ شیخ الحدیث جامعہ حقانیہ، اکوڑہ خٹک وسابق مدرس دارالعلوم دیوبند

ازاں ہم عبدِ حق یک شیخ حاذق
بدارالعلم بود استاد سابق

بعلم حق ز حق آراستہ شد
باخلاقِ کرم پیراستہ شد

اکوڑہ شد بہ پاکستاں منور
بہر لمحہ برایش علم یاور

چو نورش صورتِ محسوس بربست
ہموں دارالعلوم حقانیہ گشت

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ

شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور وسابق شیخ التفسیر، دارالعلوم دیوبند

زہے شیخ الحدیث ادریس فرحاں
محدّث اور مفسر بحرِ قرآں

منور گشتہ از انوارِ کشمیر
بدیوبند اولاً شد شیخ تفسیر

سپس آں را چو پاکستان کشیدہ
فیوضِ بے کراں ازوے چشیدہ

شدہ در اشرفیہ نور افشاں
کشیدہ از وے لاہور علم و عرفاں

طبیعت منکسر بے روگ سادہ　　کتابوں کا ذخیرہ اور وِسادہ
نقوشِ علم بر کاغذ نمایاں　　علوم نقش اندر سینہ پنہاں
بشان ورع و تقویٰ زُہدِ وافر　　باخلاق حسن با علم حاضر
بایں سامان عمرش تام کردہ　　بعقبیٰ شد بہ دنیا نام کردہ
بایں آثار پاکش از جہاں شد　　بعقبیٰ سہل تر رفتہ رواں شد

حضرت مولانا شمس الحق افغانی صاحبؒ

شیخ الحدیث جامعہ عباسیہ بھاول پور، سابق استاذ دارالعلوم دیوبند

زہے شیخ الحدیث استاذ دوراں　　بشمس الحق کہ حقا فخر افغاں
بھاول پور میں ایک شمعِ فروزاں　　چمک اٹھتا ہے جس سے نورِ ایماں
بـدیـبـنُ اولاً استاد بودہ　　بذہن صاف و منہاج ستودہ
وزیر دولت قلّات ہم شد　　بدینساں علم با دولت بہم شد
دوبارہ علم محض اورا کشیدہ　　نماند تا ازیں دولت رمیدہ
بھاول پور کی تھی خوبی قسمت　　کہ دی شیخ الحدیث ہونے کی دعوت
خطابت اور کتابت میں ہیں یکساں　　بلیغ و با اثر باعدلِ میزاں

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، سابق مدیر ''القاسم'' دارالعلوم دیوبند

مناظر احسن از گلہائے گیلاں　　ذکیِ بے بدل ہادیِ عرفاں
بہار از وے بہاراں شد بہ بستاں　　اگر مورے بیاید شد سلیماں
دکن میں نورِ عرفاں جن سے پھیلا　　ضیاءِ دینِ حق کا رنگ چمکا
دکن میں علم حق کی طرح ڈالی　　ہزاروں نے مرادِ رفتہ پالی
مصنف با تصانیف لطیفہ　　مٹے ہیں جن سے آثارِ کثیفہ
مقالاتِ قلم دُرِّ ثمیں تھے　　خطابات ان سے بھی بڑھ کر حسین تھے
بہ نظم و نثر یکساں بحرِ مسجود　　کہ نظمش دُرّ و نثرش درِّ منثور
نصیبہ جامعہ عثمانیہ کا　　کہ اُن جیسا معلّم اُس نے پایا

مولانا محمد میاں صاحب دیوبندیؒ

شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی و رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند

محمد با میاں اسم مرکب — دو لفظی خیر سے خود بھی مرکب
فقیہہ و عالم تحدیث پیشہ — بہ میدانِ سیاست شیر بیشہ
مؤرخ مستند در باب تصنیف — سند مانی گئی ہے جن کی تالیف
بہ تصنیفش قلم سنجیدہ تحریر — شگفتہ رو زباں شیریں بہ تقریر

مولانا الشیخ وصی اللہ اعظمیؒ

وصی اللہ دوائے روحِ ویراں — مریضانِ قلوب ان کے تھے جویاں
مربی من و عن بر طرز اشرف — جلالی شان لیک انداز اظرف
فضائے بمبئی روشن تھی اُن سے — یہ سوکھا کھیت بھی گلشن تھا اُن سے

مولانا الشیخ مسیح اللہ صاحبؒ، شیخ الحدیث مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد

مسیح اللہ اہلہ شفاء دردِ ہجراں — مسیحیّت بشانِ شاں نمایاں
مریضانِ نفوس آتے حیراں — مگر جاتے ہیں ہو کر شاد و فرحاں
وہ شان اشرفی کا اک نشان ہیں — نہ اک گل مستقل خود گلستاں ہیں
جہاں بھی پڑ گئے ان کے قدم آج — تو پالی اہل حق نے اپنی معراج

مجاہد ملّت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند

زعیم خاص و ممتاز حفظ رحماں — خطابت کا کیا سر جس نے میداں
اٹھایا جس نے سوتوں کو جگا کر — بنایا جنگ آزادی کا رہبر
پسِ آزادی ملت کی حفاظت — وہ کی احسان مند ہے ساری ملّت
پسِ آزادی ہر خطرہ میں پڑ کر — بچائیں جانیں مظلوموں کی بڑھکر
یہ ایک ہی کام وہ ہے کارنامہ — کہ روشن ان کا ہے اعمال نامہ

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ، رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

ہیں رحماں کے عتیق عثمان جوہر　　حیاء و غیرت ملّی کے پیکر
بہ جوش لحن و لہجہ سب پہ غالب　　دلائل سے مدلل رائے صائب
باحوال زمانہ دور اندیش　　بہ حق ایں ادارہ خیر اندیش

مولانا حامد الانصاری غازیؒ، رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

وہ فاضل حامد انصاری و غازی　　بجامِ ہند صہبائے حجازی
سیاست میں نمایاں جوش با ہوش　　نزاع و جدل کے میداں میں خاموش
خطیبِ نغز گو شیریں ادائے　　بعنوانات برجستہ نوائے
قلم کی بادشاہی جس پہ نازاں　　فصاحت اور صحافت جس پہ حیراں
مدینہ کی صحافت کا تھا دعویٰ　　بارود ''صاحبِ طرز'' اہلِ انشاء
یہ تھے سب جنگ آزادی کے شیدا　　جبین سے حریّت سب کے ہویدا

مولانا منت اللہ رحمانیؒ

امیر شریعت صوبہ بہار واڑیسہ ورکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

زہے ممتاز اقراں منت اللہ　　باسم بامسمیٰ منت اللہ
امیر شرع و منہاجِ شریعت　　بعدلش بر خصیماں ابرِ رحمت
برای صائب و سنجیدہ اخلاق　　باتفاق و بایقان و باوفاق
بطبع لیّن و با قلب هیّن　　بعزم راسخ و باجزم بیّن
مشیخت برجنبش از اب و جد　　بیامد مثل بیضہ بر زبرجد
ز دارالعلوم دیوبند مستفید ست　　سپش در مجلس شوریٰ مفید ست

احقر ناکارہ محمد طیب قاسمی، مہتمم سابع دارالعلوم دیوبند

یکے از احقر خدّامِ انور　　کہ شد قدرے ز فیضانش منور
محمد طیب است از آلِ قاسم　　بنام مہتمم ہے ایک خادم

تلمذ کردہ ہم بر شیخ محمود سند یاب از مصنف بذل مجہود
سپش از خلق انور شہ منور ازاں نورے کز و بودہ مطہّر
مربی پھر ہوئے صدیقِ مالیر جو ہر صورت سے تھے سبّاق بالخیر
ز فیضِ اشرفی ہم مستفید است بطبعِ قاسمی طبعش مطیع است
تہید ست ہے مگر نسبت ہے اُن سے خدایا حشر بھی ہو ساتھ اُن کے

دارالعلوم کا مسلک جامع

سفینے اور یہ سینے مبارک یہ علم و عشق کے چشمے مبارک
یہ مسلک معتدل با استقامت ہوا تجھ میں باذن اللہ ودیعت
کتاب و شخصیت ہو جبکہ ممزوج تو ہے افراط و تفریط اس میں مفلوج
ہے نصب العین تیرا قسط اور عدل جو تجھ پر ہے خدا کا اک بڑا فضل
ترا پیغام بھی ہے عدل کی روح کہ جس سے روح و دل ہوتے ہیں مفتوح
خلاصہ ہے یہی اسلام و دیں کا تقاضا ہے یہی شرع متیں کا
ہے جیسے اعدل الادیان اسلام شریعت بھی ہے اُس کی اعدل و تام
شریعت کے ہیں نیچے کچھ مذاہب تفقہ کی ہیں روحیں جن میں غالب
مذاہب میں ہے عدل فقہ حنفی ہے جامع اور نقائص اوس سے منفی
ہیں اس مذہب کے نیچے کچھ مسالک جو راہ تربیت ہیں بہر سالک
ہے جامع تر ولی اللّٰہی مسلک نہیں ذرہ برابر جس میں گنجلک
ہے جس میں امتزاج دین و دنیا دیانت اور سیاست کا سراپا
پھر اس مسلک کے اندر ہیں مشارب جو فکر و ذوق کے ہیں کچھ مراتب
اور اس فکرِ وسط کا خاص مشرب رشیدی قاسمی سے ہے ملقب
بزیر سایۂ علم شریعت توسط اعتدال از نور سنت
سلف کا پھر تعامل باصد عظمت بہ شخصیات قدسیہ عقیدت
تعلّم ہے ز کاغذ بل بہ صحبت ز اہل دل بہ تکثیر معیت

ادب توقیرِ اسلاف و اکابر دلوں میں جاگزیں ان کے مآثر
تورع نور تقویٰ اور بصیرت رسوخ دین اور دینی حمیت
عبادت اور عبودیت کی نسبت منور جلوت اور باآخیر خلوت
تفقہ فہم اسرار و معانی یمانی حکمت ع ایمان یمانی
یہی ہے دیوبندی فکر اور ذوق شریعت کا اُبھرتا جس سے ہے شوق
خلاصہ یہ ہے باعنوان ملت شریعت اور طریقت اور حقیقت
خلاصہ ہے ترے پیغام کا صاف ہے توحید اتحاد اور ذوق اسلاف
ہے مسلک کی یہی وہ جامعیت کہ جس نے تجھ کو بخشی عالمیت
ترا پیغام دنیا بھر میں گونجا جو ہے اجلاس صد سالہ کا ثمرہ
یہ اجلاس اپنی نوعیت کا تھا واحد ہیں ماضی حال سب ہی اس کے شاہد
نہ ماضی میں ہوا ایسا نہ فی الحال ہیں علم حق میں مستقبل کے احوال
یہ عالمگیر آفاقی تھا اجلاس کہ لاکھوں نے بجھائی اس سے ہے پیاس
ممالک کے عوام اور دولتوں نے حکوماتی وفود اور افسروں نے
حجاز و یثرب و مکہ مدینہ ہو جدہ جو ہے بحر و بر کا زینہ
یمن ہو یا عرب یا مصر اور شام ہو عمان یا عراق اور روس و بگلام
ہو افریقہ کہ امریکہ کہ فیجی کہ ان تک میں تری آواز گونجی
ہو بنگالہ کہ کیرالہ کہ آسام ہو یاغستاں کہ ترکستانِ گلفام
بلوچستاں ہو یا ہو سندھ سرنام دکن گجرات یا پنجاب شہ گام
ہو پاکستان و ایراں یا امارات ہو ہندوستاں کے اضلاع و ریاسات

اجلاس کی طرف رجوع عام اور اجتماعِ عظیم

جب اُن سب نے تھا تجھ سے فیض پایا ملا تھا سب کو کچھ درجہ بہ درجہ
تو ان کا تھا رجوع اک امر فطری کہ پہنچیں تجھ تک باجذب طبعی

سو جوں ہی دعوتِ اجلاس پہنچی
وہیں لبیک سب کے برزبان تھی

ہوا میں شوق سے اُڑ اُڑ کے آئے
زمین کیا؟ تھے فضاؤں پر بھی چھائے

ائربس اور ہوائی کشتیاں تک
سکوٹر اور گھوڑا گاڑیاں تک

بسیں، ریلیں، مکانات اُن سے بھرپور
جگہ تل تک کے رکھنے کی تھی کافور

اُمنگوں سے بھرے تھے سب کے اوقات
امنڈتے آرہے تھے مثل بارات

تھی میلوں میں بسی خیموں کی بستی
جگہ پانے کی تھی ہر اک میں چستی

دو رُویہ ڈیرے خیمے شامیانے
دو ڈھائی میل تک تھے آشیانے

تھے صوبہ دار کیمپ اور اُن کے حلقے
قطار اندر قطار اُن کے تھے خیمے

بنے تھے کیمپ خوشتر مثل عرفات
نظر کو دیتی تھی دعوت ہر اک گھات

بنا پنڈال مثل شہر خوباں
محبت کے تھے تارے جس میں رُخشاں

یہ تیری تھی کرامت اور عظمت
تھی تیرے بانیوں کی نیک نیت

اجلاس کی کیفیت

تھا لاکھوں کا ہجوم اور پُر امن تھا
نہ جھگڑا تھا نہ کوئی مکر و فن تھا

یہ مجمع تیس پینتیس لاکھ کا تھا
ادارہ کی نمایاں ساکھ کا تھا

زحامِ بے پنہ اور پُرسکوں تھا
کہ شیطانوں کا لشکر سرنگوں تھا

نہ دنگا تھا نہ ٹنٹا تھا نہ آزار
گلوں کے تھے محافظ گر تھے کچھ خار

محبت کی تھیں زنجیریں گلوں میں
تھے شامل خار بھی رنگیں گلوں میں

سکینت اور بشاشت تھی کچھ ایسی
کہ جیسے اہل جنت کی ہو بستی

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

سکون دامن تھا دار و رسن آج
مسرت اور خوشی تھی شاہِ بے تاج

اٹھائیں کلفتیں اور پھر بھی سب خوش
بدن خوش روح خوش اور سارے سرخوش

بہر سو دین حقانی کے نغمے
فضا میں چار سو بکھرے ہوئے تھے

ممالک مشرقی اور مغربی سب
اخوت کے نشے میں مست تھے سب

متاعِ نور تھی کچھ ایسی سستی — کہ جیسے ہو بسی سورج میں بستی
اِدھر ظاہر میں بستی بُقعۂ نور — اُدھر باطن میں ٹھنڈک اس کے مستور
عجب برد و سلاماً کا تھا منظر — کہ تھی برق تپاں با آبِ کوثر
اسی اضداد کے جھرمٹ میں سارے — اٹھا کر کلفتیں بھی خوش تھے سارے
بہر صورت ہوا اجلاس ایسا — ہوا ہوگا نہ اس دنیا میں ویسا
یہ دارالعلوم کی تھی ایک آواز — جو معنیً تھی خلیل اللّٰہی آواز
عرب ہوں یا عجم، تھے محوِ پرواز — عجب تھا والہانہ اُن کا انداز
تھے جمع تیس پینتیس لاکھ افراد — کہ سب شاداں تھے کوئی تھا نہ ناشاد
یہ تھی محبوبیت از بس خداداد — جو تیرے حق میں تھی مالک کی اک داد
تری ہی مرکزیت سب نے مانی — تو ہی تنہا تھا اس وحدت کا بانی
ترا اجلاس ربطِ عالمی تھا — کہ تو خود ہی ادارہ عالمی تھا

اسماءِ منتظمین اجلاس اور اُن کی خدمات

یہ سب تھے تیرے حق میں غیبی تحفے — عطیات خداوندی کے تمغے
مگر اس کی عطا کے ہیں وسائل — جو اس دنیا میں ہیں وجہ فضائل
ہے امرِ حق کہ شکر اُن کا بھی ہے حق — کہ جیسے شکرِ حق واجب ہے اور حق
تھے اس اجلاس کے بھی کچھ وسائل — کہ اُن سے ہی ہوا یہ نظم کامل
ہے ناشکری اگر اُن کا نہ ہو ذکر — جنہیں تھیں رات دن اجلاس کی فکر
بحکم مجلس شوریٰ تھے اسلم — عمید و ناظم اعلیٰ مسلّم
کریں اجلاس کا تا نظم محکم — سلیقہ سے بپا ہو کارِ پیہم
کیے ناظم نے خود ہی منتخب چند — معین اپنے جو ہمت تھے وہ چند
یہ چیدہ منتخب تھے بارہ افراد — ہوا اجلاس جن سے خانہ آباد
ظفیر و ازہر و محمود و خورشید — نعیم و سالم و بدر اور جاوید
وحید و اظہر و قمر و سلیم ہم — کہ اینہاں جملہ پیوستہ باہم

یہ تھے تمثال بارہ ماہ یک سال ہوئے ایام اجلاس ان سے بہرحال
یہ تھے بارہ کواکب نورِ افشاں سماء محنت و ہمت پہ رخشاں
یہ تھے اثنا عشریہ اسباط کی مثل نقیب اثنا عشر تھے اُن میں بادِل
مؤثر تھی ہر اک کی ہمتِ کار خصوصاً ناظمِ اعلیٰ کا کردار
کیئے تقسیم کامِ ان پر باوقات بنائے ذمہ دار اربابِ خدمات
معاون تھے ادارہ کے سب استاد دفاتر کے ہمہ تن سارے افراد
جنہوں نے لگ کے دن رات ایک کر کے جمائے نظم کے خاکے پہ خاکے
زمین ہموار کی خطّے نکھارے نظام جلسہ کے گیسو سنوارے
ہر اک نے کی وہ خدمت بہ ترتیب کہ جیسے اُس کے گھر کی ہے یہ تقریب
کیا بعضوں نے سرمایہ فراہم کیا بعضوں نے دفتر کو منظّم
کیا بعضوں نے لگ کر کیمپ کا نظم سجائی بعض نے خوراک کی بزم
کیا بعض نے تعمیرات کا کام بہ تزئین و بہ ترمیمات خوش فام
ہمہ دم نظم کا تھا ان کو احساس ہوا پایاب جس سے نظمِ اجلاس

شکریہ منتظمین ومعاونین

ہے ترحیب ان کی زیب حق شناسی نہ ہوگی گر تو ہوگی ناسپاسی
یہ سارے مستحق تبریک کے ہیں سب ہی حق دار یہ تحسین کے ہیں
جزا دے حق تعالیٰ ان سبھوں کو عطا ہوں برکتیں ان ورکروں کو
فجازاهم جزاء الخير فضلاً و نجاهم من المكروه عفوا
مبارک ہو اُنہیں محنت کا ثمرہ مبارک یہ عظیم الشان جلسہ

اہل شہر کا تعاون

ہے اہل شہر کا بھی شکر لازم جو اس خدمت میں تھے لازم ملازم
عمائد شہر کے سارے ہی تھے ساتھ رہا ان محنتوں میں ان کا بھی ہاتھ

نہ اک مسلم گھرانوں کا تھا ایثار تھے شامل ہندوؤں کے بھی رضا کار
بلا تخصیص مذہب اور ملت سب مصروف تھے با صد عزیمت
یہ اک تاریخی خدمت کا ہے شہ کار رہے گا یادگار اُن کا یہ کردار

حکومت ہند کا شکریہ

حکومت کا تعاون بھی تھا بھرپور ہیں سب ہم اس کے ممنون و مشکور
ٹکٹ اجلاس کے اُس نے چلائے نشان جلسہ کی شہرت کے جمائے
چلائے اسپیشل صوبوں سے ہر گام کہ پہنچیں جلسہ گاہ تک سب بآرام
پئے اجلاس اسٹیشن بنایا کہ مہماں پر نہ ہو کلفت سایا
ہزاروں غیر ملکی بھی تھے مہمان پڑا ویزوں میں ان کے کچھ نہ خلجان
کیا سب نے بدل اجلاس کا کام دعا ہے سب یہ پائیں حسنِ انجام
جو ہیں اسلام پر وہ ہیں با سلام نہ ہوں جو اُن کو بھی مل جائے اسلام

اجلاس کی کامیابی پر تبریک وتہنیت

ہوا جلسہ تری برکت سے قائم وگر نہ ہمتیں تھیں اپنی نائم
پس اے دارالعلوم اے دین پرور تو ہے محفوظِ حق اور حق کا یاور
تری مقبولیت پہلے تو تھی تام اور اس اجلاس سے وہ ہوگئی عام
قبول عام کا یہ غیبی تحفہ جو ہے اجلاس صد سالہ کا ثمرہ
مبارک ہو تجھے دارالعلوم آج ترا اجلاس ہے جلسوں کا سرتاج (۱۱۲)

............❖............

چند واقعات

اوران سے مفید نتائج کا استنباط

ذیل کے واقعات بہت سوں کو یاد ہوں گے اور بہت سے حضرات اپنی تقریر وتحریر میں ان واقعات کو اپنے طریقہ سے استعمال کرتے اور برتتے ہوں گے مگران واقعات کو جس سہل، سادہ، درس آموز اور حکمت افروز اسلوب میں حکیم الاسلامؒ بیان فرماتے ہیں وہ ایک دوسری چیز ہے جو دوسروں کے لئے قابل تقلید تو ہوسکتی ہے لیکن ہو بہو اس کی نقل مشکل ہی نہیں بہت مشکل بھی ہے۔

فرمایا: ''حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ مولسری کے احاطہ میں جو کنواں ہے اس کی من پر حضور ﷺ تشریف رکھتے ہیں اور دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔ دودھ لینے والوں میں سے بعض کے ہاتھ میں گھڑا ہے، بعض کے ہاتھ میں لوٹا ہے اور کسی کے ہاتھ میں پیالہ ہے اور جس کے پاس کچھ نہیں ہے وہ ہاتھ پھیلا کر چلّو ہی سے پی لیتا ہے۔ حضرت جب بیدار ہوئے تو مراقبہ فرمایا کہ آخر یہ کیا چیز ہے؟ کچھ دیر مراقب رہنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ دودھ صورت مثالی علم کی ہے اور قاسم العلوم نبی اکرم ﷺ ہیں۔ آپ علم تقسیم فرما رہے ہیں اور طلباء فرق مراتب کے ساتھ علم حاصل کررہے ہیں۔

اس واقعہ کا علم لوگوں کو اس طرح ہوا کہ ایک بار شاہ رفیع الدین صاحبؒ احاطۂ مولسری میں کھڑے تھے، ایک طالب علم شوربے کا پیالہ لے کر آپ کے سامنے آیا اور اسے پھینک کر کہنے لگا کہ اس میں گھی ہے اور نہ مصالحہ ہے اور شاید مفتی صاحب اس سے وضو کے جواز کا فتویٰ بھی دیدیں، یہ ہے آپ کا اہتمام۔ جب وہ طالب علم چلا گیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا مدرسہ ہی کا طالب علم ہے اور مطبخ سے اسے کھانا ہے؟ اور مطبخ کے رجسٹر میں اس کا نام درج ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ یہ مدرسہ کا طالب علم نہیں معلوم ہوتا، تحقیق کی گئی تو

معلوم ہوا کہ اسی کا نام کے ایک دوسرا طالب علم ہے، اصل میں کھانا اس کا تھا، لیکن نام میں اشتراک کی بنا پر غلطی سے ٹکٹ اسے مل گیا تھا۔ طلبہ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا حضرت بات تو وہی ہوئی جو آپ نے فرمایا تھا، مگر آپ کو معلوم کیسے ہوا؟ اس پر آپ نے دودھ والا واقعہ بیان فرمایا اور اس کے بعد جو عجیب بات فرمائی وہ یہ کہ جب شوال میں طلباء داخل ہوتے ہیں تو ایک ایک کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ بھی اس مجمع میں تھا، یا نہیں تھا۔ اس طالب علم پر میں نے تین مرتبہ نیچے سے اوپر تک نگاہ ڈالی تو مجھے یہی معلوم ہوا کہ یہ اس مجمع میں شریک نہیں تھا۔''

یہ چمن یوں ہی رہے گا

فرمایا : دارالعلوم پر ایک وقت ایسا بھی گذرا کہ مہتمم سے لے کر دربان تک سب ہی اہل نسبت تھے۔ حاجی عبداللہ صاحبؒ دربان تھے، نوشت وخواند کچھ نہ تھی لیکن صاحب نسبت بزرگ تھے، صبح صادق پر جو دارالعلوم میں گھنٹہ بجتا ہے اس کے بجانے کا کام انہیں کے سپرد تھا، یہ ضرب لگاتے تو زبان پر سبحان اللہ ہوتا، دوسری پر الحمدللہ اور تیسری پر اللہ اکبر کے ایک نعرہ کے ساتھ، پھر یہ شعر زبان پر عجیب کیفیت سے لاتے۔

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں فصل اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے۔

یہ منظر کچھ ایسا ہوتا کہ جو سنتا بے اختیار اس پر بکاء طاری ہو جاتا۔

فرمایا : ''حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ مرض وفات میں ہیں، ڈاکٹروں نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ آپ مطالعہ نہ فرمایا کیجئے مگر جب ڈاکٹر چلے جاتے تو آپ فوراً مطالعہ میں مشغول ہو جاتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت ڈاکٹر نے منع کیا ہے تو فرماتے کہ بھائی کیا کروں؟ یہ مرض مطالعہ کا بالکل لاعلاج مرض لگا ہے، چوبیس گھنٹوں میں شاید آپ چند ساعت ہی ترک مطالعہ کرتے تھے، ان کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ کی دلالت اولیٰ مطالعہ ہی پر تھی۔ حضرت کو زیادت فی العلم کی ایک دھن لگی ہوئی تھی، اسی کے ساتھ ساتھ حق تعالیٰ نے حافظہ اتنا قوی دیا تھا کہ جو چیز ایک بار دیکھ لیتے تو عمر بھر کے لئے کافی ہو جاتی، خود ایک بار درس میں فرمایا کہ جو چیز نظر سے گذر جاتی ہے پھر فراموش نہیں ہوتی۔ درس میں معروف ومشہور کتب تو درکنار غیر متعارف قلمی نادر کتب کا حوالہ بقید صفحات سطور مطبع بے تکلف اس طرح دیتے کہ محسوس ہوتا کہ شاید گذشتہ رات ہی حضرت نے ان کتابوں کا مطالعہ فرمایا ہے لیکن اس قدر قوت حفظ کے باوجود بھی حضرت نے تیرہ بار فتح الباری کا از اول تا آخر مطالعہ کیا تھا، بتائیے کہ جس کے ایک بار کتاب دیکھ لینے کے

بعد یہ عالم ہو کہ سالہا سال کے بعد بھی مستحضر، تو تیرہ بار فتح الباری کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا عالم ہوگا؟ آپ کے یہاں حدیث کا درس ہوتا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ سارے ہی فنون کا درس ہوتا تھا۔ افسوس کہ آپ کی بتائی باتیں اور تقاریر محفوظ نہ رکھ سکا، مگر یقین ہے کہ اگر حضرت کے جملے ہی محفوظ رہتے تو بھی ان سے مستقل علوم نکلتے اور جو جملے یاد رہ گئے ہیں آج ان سے علوم کے دفتر نکلتے ہیں۔''

ارسطو حکیم

ارسطو مشہور حکیم اور فلسفی گذرا ہے، رات دن جڑی بوٹیوں کی تلاش میں رہتا اور ان کا امتحان لیا کرتا تھا، وہ اپنے کام میں اتنا مشغول رہتا کہ اسے نہ دن کی خبر ہوتی اور نہ رات کی، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ سارے دن کا تھکا ماندہ جنگل سے آیا، دوکان میں بیٹھ گیا، تھوڑی دیر میں آنکھ لگ گئی، اتفاق سے اسی دن بادشاہ کی سواری نکلی ہوئی تھی، آگے آگے نقیب و چوب دار ہٹو بچو، ہٹو بچو کی صدائیں لگاتے آرہے تھے، مگر نیند میں اس طرح مست کہ اسے کچھ بھی خبر نہیں پڑا، سوتا رہا۔ حتیٰ کہ بادشاہ کا اس کے پاس سے گذر ہوا، بادشاہ اسے اس طرح سوتا ہوا دیکھ کر سواری سے اترا اور اسے ٹھوکر مار کر کہنے لگا کہ گستاخ! تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔ ارسطو نے جواب دیتے ہوئے کہا، غالباً آپ جنگل کے درندے معلوم ہوتے ہیں، اس لئے کہ وہی ٹھوکر مارتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ بادشاہ کو اس کے اس گستاخانہ کلام کو سن کر اور بھی غصہ آیا، اس نے کہا: بدتمیز! میرے پاس خزانہ ہے، فوجیں ہیں، قلعہ ہے، تخت و تاج ہے، پھر بھی تو مجھ سے یہ گستاخانہ انداز اختیار کئے ہوئے ہے۔ ارسطو نے کہا کہ یہ ساری چیزیں تو تیرے باہر کی ہیں، تیرے اندر میں کون سی چیز، کون سی خوبی اور کون سا کمال ہے تو یقین رکھ کہ جس دن تیرے اوپر سے یہ قبا شاہی اتر جائے گی تو ذلیل ہو جائے گا، تیرا کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ آدمی کو فخر اپنے اندر کی چیز پر کرنا چاہئے، جب تیرے اندر کوئی کمال نہیں ہے تو تو کپڑوں اور تخت و تاج سے با کمال نہیں بن جائے گا، یہ قباء شاہی چھوڑ اور ایک لنگی باندھ پھر ہم دونوں دریا میں کودیں، جب معلوم ہوگا کہ تم کون ہو اور میں کون ہوں، تیرے اندر کیا کمال ہے اور میرے اندر کیا کمال ہے۔

واقعات کی بات ختم ہوگئی، انداز آپ نے دیکھ لیا، کیسا رسیلا اور کتنا میٹھا، گویا کہ لفظ لفظ پر شہد ٹپکا رہے ہیں۔ سبحان اللہ، اب آگے ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ طالبانِ علوم کے لئے حکیم الاسلامؒ اپنے نہاں خانۂ دل میں کیا کیا خواہشیں اور تمنائیں رکھتے ہیں اور فضلائے دار العلوم سے کیسی توقعات وابستہ کئے ہوئے ہیں جو پوری ہو رہی ہیں یا نہیں، خدا معلوم۔ اس سلسلہ میں ہم اور آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

قدیم روایت

فرمایا : ''ایک بات آپ حضرات سے اور کہہ دوں کہ جس طرح آپ علم حاصل کرنے کے لئے محنت کرتے ہیں، مجاہدہ کرتے ہیں، تکلیفیں اٹھاتے ہیں، مشقتیں برداشت کرتے ہیں، اسی طرح آپ کو عملی اخلاقی قوت پیدا کرنے کے لئے ریاضت ومجاہدہ کی ضرورت ہے جب تک آپ کی عملی اور اخلاقی قوت مضبوط نہیں ہوگی، علم کام نہیں دے گا، ایک عالم میں اگر کبر ہو، حسد ہو، بغض ہو، کینہ ہو، طمع ہو، حرص ہو تو وہ خود بھی ذلیل ہوگا اور علم کو بھی ذلیل کرے گا۔

اسلاف جب علم سیکھ لیتے تھے تو اس کے بعد مستقل طور پر عمل بھی سیکھتے تھے خود دارالعلوم پر نصف صدی ایسی گذری تاوقتیکہ شیخ کامل کی اجازت نہ ہوتی، دارالعلوم اپنی علمی سند نہ دیتا گویا کہ علم وعمل کی تکمیل کا نام سند تھا۔ میں نے جو آپ کے سامنے حدیث پڑھی تھی کہ **منھومان مالا یشبعان منھوم فی العلم ومنھوم فی الدنیا** یعنی نہ تو کوئی طالب دنیا کبھی سیر اور نہ طالب علم سیر ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ کسی طالب مال کو کسی حد پر قناعت ہوتی ہے اور نہ طالب علم کو بلکہ حرص بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اگر کسی کے پاس سو روپئے ہیں تو وہ دوسو کی خواہش میں لگا ہوا ہے اور اگر دوسو ہیں تو چار سو کی خواہش میں، اسی طرح کسی عالم کو اگر سو مسئلے معلوم ہوئے تو دوسو معلوم کرنے کی کوشش میں رہتا اور اگر دوسو معلوم ہو جاتے ہیں تو چار سو معلوم کرنے کی جدوجہد کرتا ہے۔

جب علم کی طلب اس درجہ تک پہنچ جائے گی تو علم خود ہی عمل کو دعوت دے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے **اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ** جس قدر علم بڑھتا جائے گا، خشیت بڑھتی جائے گی اور جب خشیت بڑھے گی تو آپ یقیناً طاعت کی جانب مائل ہوں گے، اس لئے کہ علم کے لوازم میں عمل ہے اور ایسے ہی زیادت فی العلم کے لوازم میں سے ہے زیادت فی العمل۔''

احساس مسئولیت

فرمایا : ''ابھی تو آپ حضرات کا طالب علمی کا زمانہ ہے، ابھی آپ دوسروں کی نگرانی میں رہتے ہیں اور یہاں رہ کر آپ صالح بن رہے ہیں مگر یہاں سے جانے کے بعد آپ خود نگراں بنیں گے اور آپ کو مصلح بننا ہوگا، پھر آپ کے سامنے مختلف قسم کے مسائل آئیں گے اور اس کے مطابق آپ کو تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی، آپ کے سامنے ملک وقوم کے حالات ہوں گے اور آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس وقت قوم میں

کون سی بیماریاں ہیں، کیا کوتاہیاں ہیں، ان کے اسباب کیا ہیں اور ازالہ کی تدابیر کیا ہوں گی؟ ایسے ہی یہاں سے نکلنے کے بعد آپ کے سامنے شرک وبدعت کا میدان ہوگا اور عیسائیت ویہودیت سے بھی آپ کا مقابلہ رہے گا، اگر آپ نے ان کاموں کے لئے ابھی سے تیاری نہ کی اور محنت ومشقت کر کے میدان کو ہموار نہ کرلیا تو آگے چل کر آپ کو جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا وہ ظاہر ہے۔''

فرمایا : ''میری خواہش ہے کہ آپ یہاں صرف عالم اور صالح ہی بن کر نہ نکلیں بلکہ معلم اور مصلح بن کر نکلنے کی کوشش کریں، اس لئے قوم منتظر ہے کہ ہمارے نونہال دار العلوم میں پڑھنے گئے ہیں، وہ آئیں گے، ہماری اصلاح کریں گے، ہمیں غلط راستے سے ہٹا کر صحیح راستے پر لگائیں گے اور ہماری پریشانیوں کا حل ہوگا، لہٰذا آپ ان چیزوں کے سلسلے میں خود بھی سوچیں، اس کا حل نکالیں، اپنے اساتذہ سے سوالات کریں، پھر نہ آپ کو ایسا وقت ملے گا اور نہ ایسے اساتذہ ملیں گے۔''

ذرۂ آفتاب تابانیم

شاید ہم نے کئی ایک جگہ لکھا ہے کہ حکیم الاسلامؒ انکساری اور تواضع کا پیکر تھے، اب ذرا انہی کے الفاظ میں ملاحظہ بھی کیجئے:

فرمایا : ''میں کیا ہوں کچھ بھی تو نہیں، بس ایک نام اور ایک نسبت لگ گئی ہے ان بزرگوں کے ساتھ جن کے طفیل ہم اور آپ یہاں موجود ہیں، غالبؔ نے کہا ہے ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ہمارا تو جو کچھ بھی ہے انہیں بزرگوں کی وجہ سے ہے، ہمیں تو روٹیاں بھی مل رہی ہیں تو ان ہی بزرگوں کے طفیل میں، سپاس نامے اور تعارف میں تو اکثر مبالغے ہی سے کام لیا جاتا ہے اور اس میں ایران، توران کی باتیں کہی جاتی ہیں، آپ لوگوں کی جانب سے جو سپاس نامہ پیش کیا گیا ہے اس میں بھی مجھے ہر طرح سے اچھا اور لائق دکھانے کی کوشش کی گئی ہے مگر کیا عجب ہے کہ جب اتنے لائق لوگ ایک نالائق کو لائق کہہ رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ اتنے لائقوں کی لاج رکھ لیں اور یہی میری بخشش کا ذریعہ بن جائے۔

اخلاق فاضلہ ہر انسان میں

اخلاق فاضلہ کس چیز کا نام ہے؟ ذرا ہلکی سی تعریف وتعارف اگر ذہن میں رہے تو ہم اس ملکۂ ربانی کو محسوس کرسکیں گے۔ اس سلسلہ میں حکیم الاسلامؒ کی یہ عبارت دیکھئے:

فرمایا : ''اس دنیا میں برائی اصل ہے، اس کو بروئے کار لانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت ہوتی ہے، نہ مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے، ورنہ نہ تعلیم گاہیں ہوتیں نہ خانقاہیں اور نہ اس طرح کے تبلیغی اجتماعات ہوتے، تعلیم کی حاجت ہونا یہ دلالت ہے کہ آدمی اپنی ذات کے اعتبار سے کچھ نہیں بلکہ اس کو گھڑ گھڑا کر انسان بنایا جاتا ہے، آدمی پیدا ہوتا ہے مگر آدمیت بنائی جاتی ہے، آدمی کی صورت کا نام انسان نہیں بلکہ وہ تو سیرت اور اخلاق کے مجموعہ کا نام ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

گر بصورت آدمی انساں بودے احمد و بو جہل ہم یکساں بودے

اگر آدمی کی صورت ہی کا نام انسان ہوتا تو نبی کریم ﷺ اور ابوجہل میں کوئی فرق نہ ہوتا، صورت تو دونوں کی یکساں ہی تھیں، اس سے معلوم ہوا کہ انسانیت دراصل آتی سیرت سے، اخلاق سے، اگر صورت اچھی ہوئی لیکن باطن خراب ہے یا ظاہر درست ہے لیکن اندر ناقص اور نکما تو اس سے کوئی بات پیدا نہ ہوگی، بلکہ یہ صورت حال عیب ہے، ہنر نہیں اور اسی طرح باطن کے خراب رہتے ہوئے ظاہر کو بنانے اور سنوارنے کی جدوجہد بالکل ایسی ہے جیسا کہ نجاست کے اوپر چاندی کا ورق لگا دیا جائے، اس طرح نجاست کا پاک ہونا تو درکنار ورق بھی ناپاک اور ناقابل استعمال ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی بہترین لباس پہن لے مگر دل میں گندگی بھری ہو تو لباس کی وجہ سے وہ نہ تو واجب الاحترام ہوگا اور نہ اس کے کمال میں کسی طرح کا اضافہ ہوگا۔''

............❖............

احسان وسلوک

اصلاحِ نفس کا بہترین اصول

نفس کی اصلاح کیسے ہو؟ زیادہ ذہن پر زور ڈالنے کی ضرورت نہیں، دماغ کو الجھانے کی قطعاً حاجت نہیں، ذرا حکیم الاسلامؒ کی اس زریں نصیحت کو توجہ سے پڑھیئے، ذہن میں محفوظ کیجئے۔

فرمایا : ''اگر کسی شخص کو اتفاق سے شیخ میسر نہ آئے اور وہ کہے کہ میری بستی میں نہ تو کوئی شیخ ہے نہ کوئی عالم، پھر میرے نفس کے اصلاح کی کیا صورت ہوگی؟ ایسے شخص کے متعلق امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ اسے مایوس نہ ہونا چاہئے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بستی میں اس کا کوئی دوست تو ہوگا ہی اور اگر نہ ہو تو ایک دو آدمیوں سے دوستی کر کے آپس میں سمجھوتہ کر لینا چاہئے کہ اگر میں کوئی برائی کروں تو تم میرا ہاتھ پکڑ کر روک دو، تم کرو گے تو میں روک دوں گا، تم سے کوئی کوتاہی ہوگی تو زیادہ نہیں چالیس دن کے اندر سینکڑوں برائیاں ختم ہو جائیں گی۔

تو اگر کوئی شیخ نہیں ملتا، کوئی عالم نہیں ملتا تو اس طرح اپنے نفس کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے مواخات فی اللہ کہتے ہیں۔

''لیکن اگر کوئی کہے کہ میرا تو کوئی دوست ہی نہیں تو پھر اس کے لئے تیسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ذریعہ اپنی اصلاح کرے، ایسا تو شاید ہی کوئی ہوگا کہ آج کے دور میں جس کا کوئی دشمن نہ ہو، آپ کے دشمن چھانٹ چھانٹ کر آپ کے عیوب اور برائیاں نکالتے اور پھیلاتے رہیں گے اور اس طرح آپ اپنے نفس کی برائیوں پر مطلع ہوتے رہیں گے۔ اب آپ کا کام یہ ہوگا کہ آپ کے اندر جو برائیاں ہیں انہیں چھوڑتے چلے جایئے۔ اگر اس طرح آپ ایک چلّے، دو چلّے بھی گزار لیں گے تو بڑی حد تک آپ کی برائیاں ختم ہو جائیں گی اور آپ صالح بن جائیں گے۔''

''اور اگر کوئی کہے کہ میں پہاڑ کی کھوہ میں رہتا ہوں، مجھے نہ کسی شیخ کی صحبت میسر ہے اور نہ میرا کوئی دوست ہے، نہ دشمن ہے، پھر میرے لئے اصلاح کا کیا طریقہ ہوگا۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ اس کو بھی مایوس نہ ہونا چاہئے۔ اس کے لئے چوتھا طریقہ محاسبۂ نفس کا ہے۔ روزانہ سوتے وقت کم از کم پندرہ منٹ مراقبہ کرے اور سوچے کہ آج میں نے کتنی بھلائیاں کیں اور کتنے گناہ مجھ سے سرزد ہوئے، جو بھلائیاں کی ہوں ان پر شکر ادا کرے، اس لئے کہ شکریہ ادا کرنے سے اللہ تعالیٰ زیادتی کی توفیق دیں گے اور جو گناہ سرزد ہوئے ہوں ان پر سچے دل سے توبہ کرے، جب صدق دل سے توبہ کرلے تو سارے گناہ جھڑ جائیں گے۔

ذکر اللہ روح عالم ہے

حدیث میں آیا ہے **لا تقوم الساعة حتی یقال فی الارض اللہ اللہ** یعنی کہ جب تک روئے زمین پر اللہ کا نام لیا جاتا رہے گا اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی، جس کے معنی یہ ہوئے کہ قیامت کو اللہ کا ذکر تھامے ہوئے ہے، جہاں ذکر بند ہوا قیامت آئی۔ اس مضمون کو حکیم الاسلامؒ کی زبان سے بھی سنئے، کتنا پیارا اور کیسا دل نشیں انداز ہے۔ آپ کوئی فرق محسوس نہیں کریں گے۔

فرمایا: ''کائنات عالم کی روح جس سے وہ زندہ اور برقرار ہے ذکر اللہ اور یاد حق ہے۔ اگر یہ روح اس میں سے نکل جائے تو پھر یہ عالم برقرار نہیں رہ سکتا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک زمین میں اللہ، اللہ کہا جا رہا ہے'' یعنی جب تک ذکر اللہ کی گونج اس جہان میں قائم ہے جب تک یہ جہان قائم ہے، جس دن اس میں یادِ الٰہی باقی نہ رہے گی اسی دن اس عالم کی موت آجائے گی، جس کا نام قیامت ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عالم کی روح ذکر الٰہی ہے جس کے گم ہوتے ہی اس کی زندگی ختم ہو جائے گی۔''

''پھر نہ صرف مجموعہ عالم بلکہ اجزائے عالم کی زندگی بھی یادِ الٰہی سے قائم ہے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ''کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اللہ کی تسبیح اور حمد نہ کرتی ہو لیکن تم اس کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔'' اور فرمایا کہ ''ہر چیز نے اپنی نماز اور تسبیح کو جان لیا ہے۔'' حدیث میں ہے کہ ماءِ جاری اللہ کی تسبیح کرتا ہے یعنی جب اس کی روانی رک جاتی ہے تو تسبیح بند ہو جاتی ہے اور وہی اس پانی کی موت کی ساعت ہوتی ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ ''سرسبز ٹہنی اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔'' (یعنی جوں ہی وہ اپنی اصل سے جدا ہوتی ہے اس کی تسبیح بند ہو جاتی ہے اور یہی اس کے مرجھانے اور مرنے کی گھڑی ہوتی ہے) اسی طرح حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''سفید کپڑا

اللہ کی تسبیح کرتا ہے'' (پس جوں ہی وہ میلا ہوتا ہے اس کی تسبیح بند ہو جاتی ہے اور یہی اس کی معنویت کی موت کا وقت ہوتا ہے۔ غرض ہر چیز کی زندگی ذکر اللہ سے ہے اور موت غفلت عن اللہ سے ہے۔

کائنات کا اہم جزو انسان ہے۔ انسان کی حقیقی زندگی بھی ذکر الٰہی سے ہی ہے، اس کی معنویت کی روح بھی یہی ذکر اللہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''جو شخص اپنے پروردگار کو یاد کرتا ہے اور جو یاد نہیں کرتا ان کی مثالیں زندہ اور مردہ کی سی ہیں۔'' یعنی ذاکر زندہ ہے اور غافل مردہ اس سے واضح ہے کہ انسان کی روحانی اور قلبی زندگی کی روح بھی ذکر اللہ ہے جس سے اس کا دل زندہ ہے کہ اصل زندگی دل ہی کی زندگی ہے۔''

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے		کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

ذکر اللہ ہی عمل صالح کی بھی روح ہے

پھر اسی مضمون بالا کو ایک نئی طرح سے اور ایک نئے اسلوب سے ایک دوسرے مفہوم میں اس طرح ادا فرماتے ہیں:

فرمایا: ''پھر اسی طرح انسان کے عمل کی روح بھی ذکر اللہ ہی ہے جس سے وہ عمل قبول اور پائیدار ہوتا ہے۔ اگر انسانی عمل کا ڈھانچہ ذکر اللہ سے خالی ہو اور اس میں یہ روح نہ ہو وہ عمل ہی مردہ ہے جس پر نہ آخرت میں کوئی پھل آئے گا نہ دنیا میں اس کی قدر و قیمت ہوگی۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''ذکر اللہ کرنے والے کی مثال ایک سرسبز درخت کی سی ہے، درختوں کے مجموعہ میں'' یعنی جیسے سرسبز درخت ہی پھل و پھول لاسکتا ہے نہ کہ خشک جھاڑ، ایسے ہی ذکر اللہ کی تازگی رکھنے والا عمل باثمر ہوسکتا ہے نہ کہ غفلت آمیز اور ریاکارانہ عمل۔

ظاہر ہے کہ جب ذکر اللہ روح عالم، روح کائنات، روح قلب و جان اور روح اعمال وافعال ہے تو ذکر اللہ ہی تمام اعمال میں افضل ترین عمل بھی ہوسکتا ہے، اسی لئے حدیث نبوی میں ذکر اللہ کو ''خیر الاعمال'' بہترین، پاکیزہ ترین عمل، بلند پایہ عمل، چاندی سونا خرچ کرنے سے بھی زیادہ اونچا عمل، جہاد فی سبیل اللہ سے بھی اعلیٰ ترین عمل فرمایا گیا ہے۔''

ذکر اللہ کے فوائد و برکات

ذکر اللہ کے تکوینی اور کائناتی فوائد تو سامنے آئے، اب کچھ تشریعی اور اخروی فوائد پر بھی توجہ فرمائیے۔

فرمایا: ''اسی لئے یہ ذکر اللہ کمال قرب الٰہی اور معیت حق کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ حدیث قدسی

میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب کہ وہ میری یاد کرتا ہے۔ اگر وہ دل میں اور اپنے نفس میں مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے کسی مجمع میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اس سے بہتر مجمع (یعنی جماعت ملائکہ) میں یاد کرتا ہوں۔‘‘

عالم میں سب سے بڑے ذاکر جناب رسول اللہ ﷺ تھے، آپ کی شان حدیث شریف میں فرمائی گئی ہے کہ آپ کی کوئی گھڑی ذکر اللہ سے خالی نہ ہوتی تھی اور مختلف اندازوں سے آپ ہر ہر آن ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے۔ کان یذکر اللّٰہ علی کل احیانہٖ (آپ اپنے تمام اوقات میں اللہ کو یاد کرتے رہتے تھے) حدیث شریف میں ذکر اللہ کی مجلسیں جنت کے باغات بتائی گئی ہیں گویا حضور ﷺ دنیا میں رہ کر بھی ہمہ وقت جنت ہی کے باغوں میں سیر فرماتے رہتے تھے۔‘‘

ذکر اللہ کے آثار

اب ایک سوال باقی رہا کہ ذکر اللہ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی برکتوں اور فائدوں کا انسانی طبائع پر ظہور کیسے ہو؟ اور کیسے پتہ چلتا ہے یہ فوائد واقعی مرتب ہوئے ہیں۔ اس سوال کا جواب ذیل میں:

فرمایا: ’’ذکر اللہ ہی سے قلب میں رقت اور نرمی پیدا ہوتی ہے اور سخت دلی کافور ہو جاتی ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ ذکر اللہ کے بغیر کلام بہت مت کیا کرو۔ کیوں کہ کثرت کلام بلا ذکر الٰہی کے قساوت قلب اور سخت دلی ہے اور اللہ تعالیٰ سے بعید تر آدمی وہی ہے جس کا دل سخت ہو، نیز پاکیزگی نفس اور صفائی اخلاق بھی ذکر اللہ ہی سے ممکن ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ جو قوم بھی کسی مجلس سے اٹھتی ہے کہ اس میں یاد الٰہی نہ کی گئی ہو تو وہ ایسے اٹھتے ہیں جیسے کسی گدھے کی مردہ لاش پر سے اٹھے ہوں اور ان پر حسرت و ہلاکت پڑی ہوئی ہو۔

پھر ذکر اللہ ہی سے نفس میں شیطانی اثرات زائل ہو سکتے ہیں۔ ارشاد نبوی ہے کہ آدمی کے قلب کو شیطان چمٹا رہتا ہے، جیسے ہی اس نے یاد الٰہی کی اور ذکر اللہ میں مشغول ہوا ویسے ہی شیطان کھسک جاتا ہے اور جیسے ہی آدمی ذکر اللہ سے غافل ہوا ویسے ہی وہ وسوسے ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔

پھر عذاب الٰہی سے بچاؤ کا بھی سب سے بڑھ کر موثر ذریعہ یہی ذکر اللہ ہے۔ حدیث نبوی میں ارشاد ہے کہ ’’ذکر اللہ سے بڑھ کر کوئی عمل بھی عذاب الٰہی سے نجات دلانے والا نہیں۔

ساتھ ہی قلب کے زنگ دور کرنے، اس پر نور کی پالش کرنے والی چیز بھی ذکر اللہ ہی ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ ہر شئے کے لئے ایک صیقل ہے (جس سے اس پر چمک آتی ہے، جیسے تانبے کے لئے قلعی اور لوہے و لکڑی

کے لئے پالش) اور قلوب کا صیقل ذکر اللہ ہے، اس لئے اگر ایک مردِ مومن چاہتا ہے کہ اس کے قلب میں نور اور صیقل پیدا ہو، دل میں نرمی اور رحمت پیدا ہو، عذابِ الٰہی سے نجات پا جائے، شیطانی اثرات سے محفوظ رہے اور اُسے قربِ الٰہی نصیب ہو تو وہ ذکر اللہ کی کثرت کرے اور ہمہ وقت اپنی زبان کو یادِ الٰہی سے تر رکھے۔''

ذکر اللہ کی عظمت

اب تین سطری خلاصہ ذکر اللہ کی عظمت کے سلسلہ میں کچھ یوں ہے:

فرمایا : ''حق تعالیٰ نے جو صیغہ خود اپنی بڑائی بیان کرنے کے لئے استعمال فرمایا ہے وہی صیغہ اپنے ذکر کی عظمت و بڑائی کے لئے بھی استعمال فرمایا ہے اپنے لئے فرمایا اَللّٰہُ اَکْبَرُ یعنی اللہ ہر چیز سے بڑا ہے اور ذکر اللہ کے لئے فرمایا وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَر اور اللہ کا ذکر ہر چیز سے بڑا ہے۔''

ذکر اللہ کے واجب ہونے کی دلیل

اس سلسلہ کی ایک آخری کڑی کہ یہ ذکر اللہ واجب کہاں سے ہوا؟ کس آیت سے، کس حدیث سے اور کس صیغہ سے؟ ملاحظہ فرمائیے:

فرمایا : ''اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ذکر اللہ کرنے کا حکم فرمایا اور بصیغہ اَمر اُسے واجب ٹھہرایا۔

ارشادِ ربانی ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُو اللّٰہَ ذِکْراً کَثِیْرًا.

ترجمہ : اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کو خوب کثرت سے یاد کیا کرو۔

آیت بالا سے مطلقاً ذکر اللہ کی ضرورت اور احادیث مذکورہ سے مطلق ذکر اللہ کی عمومی فضیلت و منقبت واضح ہوگئی۔ ارشادِ ربانی اور عرض کردہ فضائل ذکر کے پیش نظر اشد ضرورت ہے کہ ہم مسلمان ذکر اللہ کی قوت و عظمت کو پہچانیں اور اپنی تمام دینی و دنیوی مصائب کا علاج اس میں تلاش کریں۔

چوں کہ مطلق ذکر کی ادائیگی بغیر کسی مخصوص صیغہ اور خاص کلام کے نہیں ہوسکتی، اس لئے ہم سہولت عمل کے لئے ذکر اللہ کے اقسام اور ان کی خصوصی حقیقت و نوعیت اور ان کے ورد کا طریقہ و وقعت ان چند سطروں میں مختصراً پیش کرتے ہیں تاکہ طالبین ذکر کے لئے ان اذکار کا اپنا دائمی ورد اور معمول بنا لینے میں آسانی ہو۔

اذکارِ عشرہ

اب ذرا عارفانہ رنگ میں ''اذکارِ عشرہ'' کے عنوان سے شب و روز کے کچھ اذکار و اوراد ملاحظہ فرمائیے:

فرمایا: ''شریعت اسلام کے عرف میں ذکر اللہ کے دس کلمے منتخب اور معروف ہیں جو اپنی جامعیت کے لحاظ سے ہر نوع کے ذکر پر حاوی ہیں اور اسی لئے خصوصی طور پر ان کے ورد کی تاکید اور فضیلت آئی ہے اور جن میں سے ہر ایک کلمہ بجائے خود ایک مستقل ذخیرۂ دین، عمدہ ترین خزانۂ اجر وثواب اور میزان عمل میں ثقیل ترین وزن دار جنس ہے اور اسی لئے ہر دور میں اہل اللہ اور مشائخ نے ان کلمات طیبات کی تلقین بھی فرمائی ہے اور خود بھی انہیں اپنا معمول بنائے رکھا ہے، وہ دس کلمے یہ ہیں۔''

(۱) کلمۂ تکبیر یعنی اللہ کی بڑائی بیان کرنے کا کلمہ اور وہ ''اللہ اکبر'' ہے

(۲) کلمۂ تسبیح یعنی اللہ کی پاکی بیان کرنے کا کلمہ اور وہ ''سبحان اللہ'' ہے۔

(۳) کلمۂ تحمید یعنی اللہ کی صفت بیان کرنے کا کلمہ اور وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰه ہے۔

(۴) کلمۂ توحید یعنی اللہ کی ذات وصفات کی یکتائی بیان کرنے کا کلمہ اور وہ لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰه ہے۔

(۵) کلمۂ توبہ یعنی اللہ سے گناہوں کی معافی مانگنے کا کلمہ اور وہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰه ہے، جس کا جامع صیغہ حدیث شریف میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے: اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لاَ اِلٰهَ اِلاَّ هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَ اَتُوْبُ اِلَیْهِ.

(۶) کلمۂ تعوذ یعنی آفات ومصائب کے وقت اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگانے کا کلمہ اور وہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ فرمایا گیا ہے۔ اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ ما خَلَقَ

(۷) کلمہ بَسْمَلَه یعنی اللہ کے نام سے اوقات اور افعال کو شروع کرنے کا کلمہ اور وہ بِسْمِ اللّٰهِ ہے جس کا جامع صیغہ حدیث شریف میں یہ فرمایا گیا ہے بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لاَ یَضُرُّ مَعَ اِسْمِهٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلاَ فِی السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

(۸) کلمہ حوقلہ یعنی اللہ تعالیٰ ہی کو تمام قوتوں کا سرچشمہ ماننے کا کلمہ اور وہ لاَحَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ اِلاَّ بِاللّٰهِ ہے۔

(۹) کلمہ حَسْبَنَه یعنی اللہ تعالیٰ ہی کو اپنے اور اپنے ہر کام کے لئے کافی وافی سمجھنے کا کلمہ اور وہ حَسْبُنَا اللّٰهُ ہے جس کے لئے قرآن کریم نے یہ دو جامع صیغے ارشاد فرمائے ہیں:

۱- حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ.

۲- وَ حَسْبِیَ اللّٰهُ لاَ اِلٰهَ اِلاَّ هُوَ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ.

(۱۰) کلمہ تَصْلِیَهٗ یعنی اللہ تعالیٰ سے حضرت ﷺ کے لئے رحمت مانگنے کا کلمہ اور وہ درود شریف ہے

جس کا جامع اور مختصر صیغہ یہ ہے: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ بِعَدَدِ کُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّکَ.

تِلْکَ عَشَرَۃٌ کَامِلَۃٌ

کلمات عشرہ کا قرآن سے ثبوت اور وجوب

اب ان اذکار کا قرآن وحدیث سے ثبوت بھی ملاحظہ ہو:

فرمایا: ''ان دسوں کلموں کا مآخذ قرآن حکیم میں ہے جس میں ان کے ورد رکھنے و پڑھتے رہنے کا امر فرمایا گیا ہے:

(۱) ذکر تسبیح کے بارے میں ارشاد ہے وَ سَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّ اَصِیْلًا اور صبح وشام اس کی تسبیح کرتے رہو۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی آپ اپنے پروردگار عالی شان کے نام کی تسبیح کیجئے۔ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ سو اپنے عظیم الشان پروردگار کی تسبیح کیجئے۔

(۲) ذکر تحمید کے بارے میں حکم دیا گیا قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی آپ کہئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے سزاوار ہیں اور اس کے ان بندوں پر سلام ہو جن کو اس نے منتخب فرمایا وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ سَیُرِیْکُمْ اٰیَاتِہٖ فَتَعْرِفُوْنَھَا اور آپ کہہ دیجئے کہ سب خوبیاں خالص اللہ کے لئے ہی ثابت ہیں جو عنقریب اپنی نشانیاں دکھلا دے گا ورتم ان کو پہچانو گے۔

(۳) ذکر توحید کے بارے میں ارشاد ہے فاعلم انہ لا الہ الا اللّٰہ جان رکھ کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ۔

(۴) ذکر تکبیر کے بارے میں ارشاد ہے وَ کَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا اور اس کی خوب بڑائیاں بیان کیا کیجئے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ اور اپنے رب کی سو بڑائی کر۔

(۵) ذکر توبہ و استغفار کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا اے ایمان والو! تم اللہ کے آگے سچی توبہ کرو۔

ایک جگہ ارشاد ہے وَ تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا اَیُّھَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ. اور مسلمانو تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تا کہ فلاح پاؤ۔

ایک جگہ ارشاد ہے وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ اور مغفرت چاہو اے پیغمبر اپنی خطا کے لئے اور مؤمنین کے لئے۔

(۶) ذکر تعوذ و استعاذہ کے بارے میں حکم ربانی ہے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ الخ آپ کہئے کہ میں صبح کے مالک کی پناہ لیتا ہوں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ الخ آپ کہئے کہ میں لوگوں کے مالک کی پناہ لیتا ہوں۔

(۷) ذکر بَسْمَلَه کے بارے میں ارشاد باری ہے۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ اے پیغمبر آپ قرآن اپنے رب کا نام لے کر پڑھا کیجئے جس نے پیدا کیا۔

(۸) ذکر حوقلہ کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا وَلَوْ لَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَکَ قُلْتَ مَاشَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ. حدیث میں اس پر لَا حَوْلَ کا مزید اضافہ ہے۔ اس لئے مجموعی کلمہ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ. ہو جاتا ہے۔

(۹) ذکر حَسْبَنَه کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْم پھر اگر وہ روگردانی کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میرے لئے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں ہے، اسی پر بھروسہ کر لیا اور وہ بڑے بھاری عرش کا مالک ہے اور فرمایا وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْل اور کہا انہوں نے ہم کو حق تعالیٰ کافی ہے اور وہ ہی سب کام سونپ دینے کے لئے اچھا ہے۔

(۱۰) ذکر تَصْلِيَه کے بارے میں ارشاد حق ہے يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا اے ایمان والو! تم نبی پر صلوٰۃ وسلام بھیجا کرو۔

بہر حال ان دس کلمات طیبات کے لئے قرآن نے مستقل باب قائم کر دیئے ہیں اور ان کی نہ صرف ترغیب ہی دی بلکہ حکم اور امر کیا ہے کہ انسان انہیں اپنا ورد وظیفہ بنائے۔"

ذکر اسماءِ حسنیٰ

اسمائے حسنیٰ کو مشائخ نے بہت بابرکت اور بافیض بتایا، آخر کیوں نہ ہوں، اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے پیارے نام ہیں۔ حکیم الاسلامؒ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"پھر اس دعاء پکار میں اعلیٰ ترین دعاء و پکار وہ ہے جو اسماءِ حسنیٰ کے ذریعہ سے ہو جس کے بارے میں امر الٰہی ہے وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (اور اللہ کے نام ہیں، ان کے ذریعہ اللہ کو پکارو) پس اللہ کو اس کے اسماء حسنیٰ کے ساتھ یاد کرنا اور ان اسماء حسنیٰ کے ساتھ اس سے دعائیں مانگنا بھی مطلوب ہے جس کے لئے عمدہ صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام جو حدیثوں میں آئے ہیں یاد کر لئے جائیں اور

بچوں کو یاد کرا دیئے جائیں اور روزانہ نہیں تو کم از کم ہفتہ میں ایک بار پڑھ لئے جاویں، چوں کہ ذکر اسماء حسنی اور ذکر دعا و سوال اور ذکر تلاوۃ متعین اور مخصوص کلمہ نہ تھا، اس لئے ہم نے ان تین اذکار کا تذکرہ اذکار عشرہ میں نہیں کیا لیکن عملاً ان کو لازم کر لینا چاہئے''۔

شجرۂ مشائخ

بزرگانِ طریقت ہمیشہ اپنے شجرۂ طریقت کو مناجات کی صورت میں نظم کرتے رہے ہیں۔ حکیم الاسلامؒ نے بھی اپنا شجرۂ طریقت مناجات کی صورت میں نظم فرمایا ہے، آگے ملاحظہ کیجئے:

فرمایا: ''جس طرح فیضانِ الٰہی ہم تک جناب رسول اللہ ﷺ کے طفیل اور توسل سے پہنچا ہے اور اسی لئے آپ تمام عالم بشریہ کے محسن اعظم و مربی اکبر ہیں اور اسی احسان عظیم کو پہچاننے اور ماننے کے لئے درود شریف رکھا گیا جس سے حضورؐ کے ذکر مبارک کے علاوہ بارگاہ خداوندی میں توسل اور قرب و قبول بھی مقصود ہے۔

چنانچہ اسی بناء پر دعاء کے اول و آخر درود شریف پڑھنے کا حکم اور اس سے دعاء کی مقبولیت کا وعدہ احادیث میں دیا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح فیضان نبوت ہم تک نائبانِ نبوت اور وارثانِ رسالت کے واسطہ اور وسیلہ سے پہنچا ہے۔ بالخصوص فیضانِ اخلاق و کمالات باطن کے پہنچنے کا واسطہ اور وسیلہ مشائخ طریقت کے سوا دوسرا نہیں، جو ان کمالات میں خلفائے نبوی اور نبوت کے بعد آپ کے سچے وارث ہیں۔ بنابریں حضور اکرم علیہ السلام کے بعد بھی یہ حضرات امت کے محسن اور مربی مانے گئے ہیں، اس لئے اس احسان کو پہچاننے اور ماننے نیز قرب خداوندی اور نسبت نبوی ڈھونڈنے کے لئے ان کا تذکرہ بھی شامل طاعت اور ذکر اللہ ہی شمار کیا گیا ہے کہ یہی لوگ حدیث نبوی اذا اذکر اللّٰہ ذکروا ذا اذکروا اذکر اللّٰہ (جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کا ذکر بھی زبان پر آتا ہے اور جب ان کا ذکر کیا جاتا ہے تو اللہ کا ذکر زبان پر آتا ہے) کے سچے مصداق ہیں، گویا

خاصانِ خدا خدا نہ باشند لیکن ز خدا جدا نباشد

اور اس ذکر کی صورت مشائخ نے شجرہ پڑھ لینا تجویز کی ہے جو اکابر طریق کا معمول رہا ہے۔ بنابریں شجرۂ چشتیہ مؤلفہ حضرت شیخ المشائخ قطب طریق مرشدنا و مولانا حضرت شاہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کا پڑھنا بھی معمول بنالیا جائے، خواہ روزانہ یا حسب ذوق وشوق دوسرے تیسرے دن۔

شجرۂ طیبہ

كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ.

حمد ہے سب تیری ذات کبریا کے واسطے
اور درود و نعت ختم الانبیاء کے واسطے

اور سب اصحاب و آل مصطفیٰ کے واسطے
رحم کر مجھ پر الٰہی اولیاء کے واسطے

حضرت طیبؒ شہ علم و ہدیٰ کے واسطے
حضرت محمودؒ و اشرفؒ ذوالعلا کے واسطے

حاجی امداداللہ ذوالعطاء کے واسطے
حضرت نورؒ محمد پر ضیاء کے واسطے

حاجی عبدالرحیمؒ اہل غزا کے واسطے
شیخ عبدالباریؒ شہ بے ریا کے واسطے

شاہ عبدالہادیؒ پیر ہدیٰ کے واسطے
شاہ عضدالدینؒ عزیز دوسرا کے واسطے

شہ محمدؒ اور محمدیؒ اتقیا کے واسطے
شہ محبّ اللہؒ شیخ باصفا کے واسطے

بو سعیدِؒ اسعد اہلِ وراء کے واسطے
شہ نظامِ الدینؒ بلخی مقتدا کے واسطے

شہ جلال الدینؒ جلیل اصفیا کے واسطے
عبد قدوسؒ شہ قدس و صفا کے واسطے

اے خدا شیخ محمدؒ رہنما کے واسطے
شیخ احمدؒ عارف صاحب عطا کے واسطے

احمد عبدالحقؒ شہ ملک بقا کے واسطے
شہ جلال الدینؒ کبیر الاولیاء کے واسطے

شیخ شمس الدینؒ ترکِ باصفا کے واسطے
شیخ علاء الدینؒ صابر بارضا کے واسطے

شہ فریدالدینؒ شکر گنج بقا کے واسطے
خواجہ قطبؒ الدین مقبول ولا کے واسطے

شہ معین الدینؒ حبیب کبریا کے واسطے
خواجہ عثمانؒ با شرم و حیا کے واسطے

شہ شریفؒ زندانی با اتقیاء کے واسطے
خواجۂ مودودؒ چشتی پارسا کے واسطے

شاہ بویوسفؒ شہ شاہ و گدا کے واسطے
بو محمدؒ محترم شاہِ ولا کے واسطے

احمدؒ ابدال چشتی باسخا کے واسطے
شیخ ابواسحاقؒ شامی خوش ادا کے واسطے

خواجہ ممشادؒ علوی بوالعلاء کے واسطے
بوہبیرہؒ شاہ بصری کے پیشوا کے واسطے

شیخ حذیفہؒ مرعشی شاہ صفا کے واسطے
شیخ ابراہیمؒ ادہم بادشاہ کے واسطے

شہ فضیلؒ ابن عیاض اہل دعا کے واسطے
خواجہ عبدالواحدؒ بن زید شاہ کے واسطے

شیخ حسن بصریؒ امام الاولیاء کے واسطے
ہادیٔ عالم علیؓ شیرِ خدا کے واسطے

سرور عالم محمد مصطفیٰ کے واسطے ... یاالٰہی اپنی ذاتِ کبریا کے واسطے

آخرت میں کر شفاعت کا وسیلہ ان کو تو ... مجھ ذلیل و خوار و مسکین و گدا کے واسطے

کردوئی کو دور اور پرنور وحدت سے مجھے ... تا ہوں سب میرے عمل خالص رضا کے واسطے

سرورِ عالم محمد مصطفیٰ کے واسطے ... یا الٰہی اپنی ذاتِ کبریا کے واسطے

آخرت میں کر شفاعت کا وسیلہ ان کو تو ... مجھ ذلیل و خوار مسکین و گدا کے واسطے

کردوئی کو دور اور پرنور وحدت سے مجھے ... تا ہوں سب میرے عمل خالص رضا کے واسطے

کر ذرا اس ہوش سے بیہوش و مستانہ مجھے ... باحق اپنے عاشقانِ باوفا کے واسطے

دیکھ مت میرا عمل کر لطف پر اپنے نگاہ ... یا رب اپنے رحم و احسان و عطا کے واسطے

چار سو ہے فوجِ غم کر جلد اب مجھ پر کرم ... کر رہائی کا سبب اس مبتلا کے واسطے

تیرے در کو چھوڑ کر تو ہی بتا جاؤں کہاں ... کون ہے تیرے سوا مجھ بے نوا کے واسطے

ہے عبادت کا سہارا عابدوں کے واسطے ... اور تکیہ زہد کا ہے زاہدوں کے واسطے

سجدۂ طاعت سہارا ساجدوں کے واسطے ... ہے عصائے آہ مجھ بے دست و پا کے واسطے

نے فقیری چاہتا ہوں نے امیری کی طلب ... دردِ دل پر چاہئے مجھ کو خدا کے واسطے

نعمتیں دنیا کی سب دیں تونے اے پروردگار ... بخش وہ نعمت جو کام آوے سدا کے واسطے

کوئی بھی تحفہ نہیں لائق ترے دربار کے ... جان و دل لایا ہو بس تجھ پر خدا کے واسطے

کر میری امداد اللہ وقت ہے امداد کا ... اپنے لطف و رحمت بے انتہا کے واسطے

جس نے یہ شجرہ دیا ہو، جس نے یہ شجرہ پڑھا

بخش دیجئے سب کو ان اہل صفا کے واسطے (۱۱۳)

............❖............

سپاس نامے

ترے تفکر میں قرنِ اوّل کی عظمتوں کا نشاں ملے گا
تری خطابت میں عبرتوں کا تصور جاوداں ملے گا

کسی بلند پایہ دینی شخصیت کی مجالس اوراس کے علمی وروحانی افاضات سے بہرمنداور مستفیض ہونے پراس کی شخصیت کے بارے میں علمی شغل اور دینی مزاج رکھنے والے انسان کے تاثرات و جذبات کیا ہوتے ہیں، یہ اگر بیانِ محاسن اوراظہارِتشکر کے اسلوب میں الفاظ کی ہیئت اختیارکرلیں تو شاید ''سپاس نامہ'' کہلائیں بایں ہمہ سپاس نامہ کی تعریف میں اختلاف بھی ہوسکتا ہے مگر تعریفات کے الٹ پھیر کے باوجود منشا ایک ہی رہتا ہے اوروہ ہے اعترافِ عظمت۔

عبار اتنا شتی و حسنک واحد کل الی ذالک الجمال یشیر

حکیم الاسلامؒ کوعلمی دنیانے اتنے ''سپاس نامے'' پیش کئے کہ اگران سب کا احاطہ کیا جائے تو کتابوں کی کتابیں وجود میں آجائیں، مگرہم یہاں بطورنمونہ چندایک سپاس ناموں پراکتفا کریں گے، آخر میں حکیم الاسلامؒ کے خامہ عنبر شمامہ سے نکلے ہوئے وہ سپاس نامے بھی افادۂ قارئین کے لئے شامل کئے گئے ہیں جوآپ نے اپنے اہتمام کے عہد زریں میں دارالعلوم دیوبند میں آنے والے بعض عمائدین حکومت جیسے مولانا ابوالکلام آزاد، شاہ افغانستان اور ہمایوں کبیر وغیرہ کوازخود پیش فرمائے ہیں۔

حکیم الاسلامؒ کے تحریرفرمودہ یہ سپاس نامے جہاں آپ کے علم وفضل کے غماز ہیں، وہیں سیاسی، ملّی اور انتظامی امورمیں بصیرت کے بھی شاہدعدل ہیں۔

سپاس نامہ

یہ سپاس نامہ جو کسی قدر ترمیم و تلخیص کے بعد درج کیا گیا ۱۹۵۷ء میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت اقدس میں رنگون (برما) میں پیش کیا گیا۔

عالی مرتبت! ہمارے قلوب شاداں و فرحاں ہیں کہ آج ہمیں سرزمین ہند و پاک کی جلیل القدر ہستی اور عالم اسلام کے ایک عظیم المرتبت مفکر کو خوش آمدید کہنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے، ہمارے قلوب کی گہرائیوں سے نکلنے والی مخلصانہ صدائیں بے اختیار ملتِ اسلامیہ کے زعیم باوقار کو اس ورودِ مسعود پر نذرانۂ عقیدت پیش کر رہی ہیں ع

اے آمدنت باعث خوش بختیٔ ما

زعیم ملت! عالم اسلام کی نظر میں جامعہ عالیہ دارالعلوم دیوبند کی دینی و علمی کاوشوں کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اظہر من الشّمس ہے، آج دنیا کے گوشے گوشے میں اس مادر علمی کے فیوض و برکات سے خلق خدا مستفید ہو رہی ہے۔ براعظم ایشا میں واقع اس عظیم اسلامی یونیورسٹی کی برق رفتار ترقی کے پس منظر میں جہاں اس کے بانیوں کی نیک نیتی اور خلوص کارفرما ہے وہیں آپ کی نصف صدی کی خدماتِ جلیلہ اور مخلصانہ و جاں نثارانہ محنتوں کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

مفکر اسلام! آج اس ملک کی سنگلاخ زمین علم و اخلاق کے اس آفتاب تاباں کی ضیا بار کرنوں کو جذب کر رہی ہے جسے دنیا دارالعلوم کے نام سے جانتی ہے، بہ ایں ہمہ یہ سرزمین ایک اور خدمت کی متقاضی تھی اور وہ ہے اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کا اولین مصداق یعنی حفظِ قرآن، جناب کے سامنے اس اظہارِ حقیقت پر ہمیں ناز ہے کہ ملک بھر میں اپنی نوعیت کی یہی واحد درسگاہ ہے جو اس گراں مایہ خدمت کو بلا کسی احتیاج کے محض اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے انجام دے رہی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آں جناب کی توجہات عالیہ ادارہ کو بامِ عروج پر پہنچانے میں ممد و معاون ثابت ہوں گی اور جب کبھی اس ملک کی دینی خدمات کا تذکرہ ہوگا آں جناب اس ادارہ کو فراموش نہیں فرمائیں گے۔

ضیف محترم! ہمارا آپ کی خدمت میں ہدیۂ سپاس پیش کرنا محض رسمیات میں سے نہیں ہے۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ کا ورودِ مسعود غیروں میں نہیں اپنوں میں ہوا ہے۔ یقین فرمائیے کہ ع

اتحادے ست میاں سن و تو من و تو نیست میان من و تو

سپاس نامہ

یہ سپاس نامہ جو اصلاً فرانسیسی زبان میں تھا جزیرۂ رے یونین مشرقی (افریقہ) میں عالی جناب جاورت صاحب صدر مسلمانانِ رے یونین نے مورخہ ۲۴ر جولائی ۱۹۵۹ء کو سینٹ ڈینس (دارالحکومت جزیرہ رے یونین) میں تمام مسلمانانِ رے یونین کی جانب سے اُن کی موجودگی میں بصد عقیدت واحترام حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت اقدس میں پیش کیا۔

حضرتِ اقدس! آج مسرت اور خوشی کے جن جذبات سے ہم سرشار ہیں اُن کا بیان الفاظ اور تعبیرات سے ممکن نہیں بلکہ اُس کے لئے اُن نگاہوں کی ضرورت ہے جو دلوں کی کیفیات کو دیکھ سکیں اور ایسے شعور کی ضرورت ہے جو قلبی جذبات کا ادراک کر سکے۔

ہمیں اطمینان ہے کہ یہ جذبات جس ذات کی محبت اور عقیدت نے پیدا کئے ہیں وہ دل کی اُن آنکھوں اور ادراک کی اُس قوت سے بہرہ ور ہے جو ہمارے قلوب کی کیفیات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ حضرت والا اپنی روحانی بصیرت سے ہمارے اخلاص کی گہرائی اور ہماری والہانہ عقیدت و محبت کا بخوبی اندازہ لگا کر ان الفاظ کی صداقت پر گواہ ہوں گے۔

حضرت اقدس! ہم دیوانگی سرور کی اُس منزل پر ہیں کہ آں جناب کو نظروں کے سامنے دیکھ کر بھی اب تک کبھی کبھی ہمیں اس حقیقت پر خواب کا سا گمان ہوتا ہے کیوں کہ جب ہم اپنی برسوں کی بے چینی اور مدتوں کے اشتیاق زیارت کا تصور کرتے ہوئے رے یونین کے اس دور دراز اور الگ تھلگ جزیرے پر نظر کرتے ہیں اور دوسری طرف ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں آپ کی ہمہ وقت مصروفیات اور علمی، تبلیغی اور اصلاحی مشغولیات کا خیال کرتے ہیں تو اس دور افتادہ جزیرے میں آں جناب کی تشریف آوری کو ایک مسرت خیز حقیقت کے بجائے محض ایک دل خوش کن خواب کی طرح سمجھتے ہیں مگر جب بار بار حضرتِ اقدس کے منور چہرے پر نظر ڈالتے ہیں تو بے اختیار اپنے بخت کی سعادت اور نصیبے کی یاوری پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔

حضرت والا! آں جناب کو علم ہے کہ ہم مسلمانانِ جزیرہ رے یونین ایک طویل عرصہ سے حضرت والا کی یہاں تشریف آوری اور زیارت کے لئے بے چین تھے مگر قانونی دشواریوں کے علاوہ حضرت اقدس کی بے شمار مشغولیات ہمیشہ ہماری آرزو کی تکمیل میں مانع رہیں۔

گزشتہ سال ہمارے سینٹ پیر کے محترم بزرگ جناب حاجی پٹیل صاحب کے صاحبزادے جناب احمد پٹیل صاحب جب حج بیت اللہ کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو حسن اتفاق اور ہماری یاوری بخت سے حضرت والا بھی حج کے ارادے سے وہاں پہنچے اور محترم پٹیل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں پٹیل صاحب نے مسلمانانِ رے یونین کے بڑھتے ہوئے اشتیاق اور زبردست شوقِ زیارت کا حال حضرتِ والا کے گوش گذار کر کے ایک بار پھر بڑے شد و مد اور اصرار کے ساتھ دیرینہ درخواست پیش کی۔ یہ اُس مقام مکرم کا فیض ہے کہ اس دفعہ حضرت اقدس نے درخواست فوراً قبول فرما کر محترم پٹیل صاحب کی حج سے واپسی پر ہمیں یہ مژدہ جانفزا ملا تو ہماری خوشیوں کا ٹھکانا نہ رہا اور مسرتِ زیارت، بے چینی انتظار میں بدل گئی۔ ہم ایک ایک لمحہ تکمیل آرزو کی دعاؤں میں گزارنے لگے اور آج رب العزت کے اس بے پایاں کرم پر ہمارے سر شکر و حمد سے جھکے ہوئے ہیں کہ اس نے بہت جلد یہ تمام قانونی مراحل طے فرما کر حضرت اقدس کے لئے اس جزیرہ تک کا تبلیغی سفر آسان فرما دیا۔ **فللّٰہ الحمد والشکر**

حضرت اقدس! یہ جزیرہ رے یونین جنوب مشرقی افریقہ کا ایک بہت چھوٹا سا مگر نہایت خوبصورت، صحت افزا، شاداب و آباد اور جزیرہ ہے جو فرانس کی حکومت کے تحت ہے۔ اس جزیرہ کی کل آبادی تقریباً تیس لاکھ ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار ہے، باقی تمام آبادی فرانسیسیوں پر مشتمل ہے اور فرانس ہی کی معاشرت اور تمدن یہاں رائج و برپا ہے۔ اس مختصر سے جزیرہ کا کل رقبہ تقریباً ستّر مربع میل ہے جس کے درمیان بلند اور برف پوش پہاڑ ہیں، یہ جزیرہ موریشس اور مڈغاسکر کے درمیان میں ہے اور ہوائی اور بحری راستوں سے، فرانس، آسٹریلیا اور یورپ و امریکہ کے ممالک سے اس جزیرہ میں تجارتی مال آتا ہے جس سے تجارت کو فروغ اور تمدن کو ارتقا حاصل ہے۔ اس جزیرہ میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے علاوہ تیسری کوئی قوم نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ یہاں کی مسلم آبادی مالی حیثیت سے نہایت آسودہ حال اور مطمئن ہے۔ اکثر لوگ تجارت پیشہ ہیں اور اپنی محنت و جاں سوزی سے ایک مستحکم مالی حیثیت کے مالک ہیں، نیز مقام شکر ہے کہ ماحول کی اس رنگینی اور یورپین لوگوں کے ساتھ ہر وقت کے خلط ملط کے باوجود یہاں کے مسلمان اپنے شعائر اور اوامر دینی کے محافظ ہیں اور نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ جیسے ارکانِ دین پر اپنے علم و استطاعت کے مطابق پورے ذوق وشوق اور دلچسپی کے سات عمل پیرا ہیں۔ اس شہر سینٹ ڈینس میں جو اس جزیرہ کا دارالسلطنت ہے چوں کہ تمام جزیرے کے مسلمانوں کی آمد و رفت رہتی ہے اس لئے ہم لوگوں نے

یہاں باہمی تعاون کے جذبے سے ایک مسافر خانہ قائم کیا ہوا ہے جس کے ساتھ مسجد بھی ہے اور یہیں ایک ابتدائی دینی مدرسہ کے قیام کا بھی عرصہ سے عزم تھا مگر اس ارادہ کی تکمیل حضرت والا کی آمد کے انتظار میں رکی ہوئی تھی کیوں کہ ہم سب خدام کا یہ مشترکہ اور قلبی جذبہ تھا کہ اس مسجد و مدرسہ کی بنیاد حضرت والا کے بابرکت ہاتھوں سے رکھی جائے، خدا کے فضل وکرم سے اب اُس عزم کی تکمیل کا وقت آ گیا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کے دینی جذبات اور مذہبی شغف کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس جزیرہ کے تقریباً ہر شہر میں ایک ایک خوشنما اور کشادہ مسجد موجود ہے جو پانچوں وقت مقامی مسلمانوں کی تکبیرات سے گونجتی ہیں۔

مگران تمام اطمینان بخش حقائق کے باوجود یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ ہمیں صحیح اور مخلصانہ دینی رہنمائی کی ضرورت تھی، موجودہ ماحول اور وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہمارے نوجوان بھی محفوظ نہیں۔ ضرورت تھی کہ ایسا مربی اور شفیق عالم و رہنما یہاں آئے جس کے مواعظ و نصائح اور پند و ہدایت ہمارے قلب وجگر کو گرما دیں اور ہمیں ایسی ایمانی تازگی دے جائیں جو دنیا اور آخرت کے ہر گام پر ہماری معاون و دستگیر ہو۔ خدائے قدوس کا بہ ہزار زبان شکر ہے کہ اُس نے ہماری ناکارہ دعائیں قبول فرمائیں اور ہماری رشد و ہدایت اور اصلاح کے لئے حضرتِ والا کی ہر دل عزیز و عظیم ذات کو منتخب فرمایا۔ ہماری آرزو ہے کہ حضرت والا کے اس جزیرہ میں مختصر سے قیام کے دوران ہم خدام زیادہ سے زیادہ مستفید ہوں اور اپنی دنیا و آخرت کے صحیح راستے متعین کرسکیں۔

آج حضرت اقدس کے استقبال اور ذاتِ گرامی کو خوش آمدید کہنے کے لئے دارالحکومت سینٹ ڈینس میں پورے جزیرہ رے یونین کے تمام مسلمان جمع ہیں اور اپنے دیرینہ شوقِ زیارت کو پورا کر رہے ہیں۔ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ حضرت اقدس کے اس ماہ کے قیام میں جزیرہ کے ہر شہر کی مسجد میں حضرت کی وعظ و تقریر کا موقع فراہم ہوسکے اور ہر تقریر میں انشاء اللہ پورے جزیرہ کے لوگ شرکت کے لئے حاضر خدمت ہوا کریں گے۔

چوں کہ اصل داعی جناب پٹیل صاحب اور ان کا خاندان دارالحکومت سے تقریباً ساٹھ میل دور شہر سینٹ پیر میں مقیم ہے اس لئے حضرت والا کا اصل قیام وہیں رہے گا۔ مختلف شہروں کے تبلیغی دورے وہیں سے ہوں گے اور ہر دورے سے مراجعت وہیں ہوا کرے گی۔ اگرچہ کوشش کریں گے کہ ہمارا کوئی پروگرام حضرت اقدس کے لئے باعث تعب وتکان نہ ہو مگر اس کے باوجود بھی اس مختصر قیام میں تمام مسلمانانِ جزیرہ کا شوق و اشتیاق دیکھتے ہوئے ایک ماہ کا جو پروگرام ترتیب کیا ہے اس سے اگر تعب محسوس فرمائیں تو ہم

خدمتِ گرامی میں بصد ندامت عفو کی درخواست کرتے ہوئے اس کی منظوری کے امیدوار ہیں کیوں کہ ایک طرف حضرتِ والا کی تکلیف و تنگی کا خیال ہے تو دوسری طرف ہمارا شوق استفادہ اتنا شدید ہے کہ ہم اس خود غرضی کے لئے مجبور ہوئے ہیں۔

ساتھ ہی ہمیں اس ناز آفریں حقیقت سے بھی حوصلہ ملتا ہے کہ حضرت اقدس کی پوری حیاتِ مبارکہ کی اشاعت واستواریٔ دین کے لئے ایک جہادِ مسلسل اور جہد پیہم سے عبارت ہے۔ ہم اس دورافتادہ جزیرہ میں بیٹھ کر بھی حضرتِ اقدس کی ان شب وروز کی دینی، علمی اور اصلاحی کوششوں سے واقف ہیں جن سے آج برصغیر ہندو پاک کے علاوہ پورے عالم اسلامی کو ایک جذبۂ تازہ مل رہا ہے۔ ہم مسلمانانِ جزیرہ حضرت والا کی اُن مساعی جمیلہ کا تذکرہ اپنی نجی مجالس میں کر کے ایک ناقابل بیان فخر وسرور محسوس کرتے تھے اور وہ حیات انگیز تذکرے ایک مبارک داستان کی طرح ہماری لوحِ قلب پر ثبت ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے تذکروں اور داستانوں کے اُس عظیم ومقدس ہیرو کو آج اپنی خیرہ نگاہوں کے سامنے اور اپنی مجلسوں کے درمیان پا کر سرور وانبساط کی جس کیفیت سے دوچار ہیں وہ جنون ودیوانگی کی وہ منزل ہے جہاں ہم خود اپنی نگاہوں پر بھی آسانی سے اطمینان نہیں کر سکے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ان مساعی اور مجاہدانہ خدمات کو قبولیت عطا فرمائے اور عالم اسلام کو آپ کی ذاتِ بافیض سے اتنا مستفید فرمائے کہ اُن کی حیات وموت کے راستے ایک صحیح مسلمان کے راستے ہو جائیں۔ آمین

آخر میں ہم جملہ مسلمانانِ جزیرہ ایک بار پھر حضرت اقدس کی اس مسرت خیز تشریف آوری پر اپنی بے پایاں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس کرم فرمائی اور طویل رہ نوردی پر جذبات تشکر وعقیدت نذر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کے پُر از افادہ اور بابرکت سائے کو ہم خدام کے سروں پر بصحت وسلامتی ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین

............❖............

سپاس نامہ

یہ سپاسِ عقیدت تمام اہالیانِ جزیرہ موریشس کی جانب سے مورخہ ۲۴ر اگست ۱۹۵۹ء کو شہر ''پورٹ لوئس'' دارالحکومت موریشس مشرقی افریقہ کے مشہور پلازا تھیئٹر ہال میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت اقدس میں پیش کیا گیا۔ یہ عظیم اجتماع جزیرہ موریشس میں بسنے والے تمام فرقوں اور مذاہب کا نمائندہ اجتماع تھا، جس میں حضرتؒ نے مذہب اسلام کی عالمی حیثیت کے موضوع پر ایک بصیرت افروز اور تاریخی تقریر فرمائی جسکی تاثیر کے نتیجے میں حضرتؒ کے دوران قیام مختلف فرقوں کے لوگ حاضر ہوکر اظہار مسرت واعتراف کرتے رہے اور اس تقریر کے اقتباسات وہاں کے انگلش اور فرانسیسی زبانوں کے اخبارات کی زینت بنتے رہے۔ اسی تاریخی اور اہم تقریر کے فوراً بعد موریشس ریڈیو نے حضرتؒ کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کر کے نشر کیا۔

حضرتِ محترم! ہم تمام مسلمانانِ جزیرہ موریشس انتہائی خلوص ومحبت کے ساتھ حضرت والا کی مبارک تشریف آوری پر خیر مقدم کرتے ہیں اور سپاس عقیدت و نیاز پیش کرتے ہیں۔ حضرت والا کی اس کرم نوازی اور احسان پر ہم دلی شکریہ پیش کرتے ہیں کہ جناب والا نے ہم مسلمانانِ جزیرہ کی مخلصانہ درخواست قبول فرما کر ہمیں زیارت وخدمت کا شرف عطا فرمایا۔ ہم اپنی اس خوش بختی پر نازاں ہیں کہ دنیائے اسلام کی ایک مسلمہ اور بزرگ ومشہور شخصیت سے ہمیں براہِ راست استفادہ کا موقع ملا، یہ نعمت ہماری پروازِ تخیل سے بہت زیادہ ہے اور اسی لئے احساسِ شکر کے جذبات بھی اتھاہ اور بے پایاں ہیں جن کے اظہار سے ہم زبان وقلم کو مجبور پاتے ہیں۔

حضرت اقدس! جناب والا کی ذاتِ بابرکات اور عالمِ اسلام کی عظیم درسگاہ دارالعلوم دیوبند، دونوں کا ارتباط اور نسبت وتعلق باہمی کچھ اتنا گہرا ہے کہ آپ کی ذات کے تصور کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کا تصور ابھرتا ہے اور دارالعلوم دیوبند کا تصور آپ کی عظیم ومبارک شخصیت کے ساتھ ملزوم رہتا ہے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اُس تاریخی درس گاہ کو جو کمال وعروج آں جناب کی مخلصانہ اور انتھک خدمات سے حاصل ہوا ہے اس کی مثال ادارہ کی گزشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ دارالعلوم دیوبند کے حلقۂ اثر اور مسلک کی اشاعت وتوسیع کے سلسلہ میں آپ کی دن رات کی محنتیں، طویل سفر اور فکری جدوجہد کا گہرا اور

اعترافی نقش ہر مسلمان کے قلب پر مرتسم ہے اور مسلمانانِ عالم آں جناب کی اُن خدمات اور جہد مسلسل کے لئے آپ کو مبارکباد کے ساتھ ساتھ ہدیۂ عقیدت وتشکر پیش کرتے ہیں۔

بحر ہند میں واقع اس دور دراز اور چھوٹے سے جزیرے میں حضرتِ اقدس کی تشریف آوری کی اطلاع ہمارے لئے پیغام عید بن کر آئی۔ پڑوسی جزیرہ رے یونین میں آں جناب کی آمد اور مواعظ حسنہ اور مبارک مجلسوں کے ذریعہ فیض رسانی کی جو اطلاعات ہمیں ملتی رہتی تھیں انہیں سن سن کر جہاں ہم ایمانی تازگی محسوس کرتے تھے وہیں اشتیاقِ زیارت اور آرزوئے قدم بوسی میں بیتابی کی حد تک اضافہ ہوتا رہتا تھا، اگرچہ اس نعمت کے حصول میں اہل رے یونین ہم سے سبقت لے گئے مگر نعمت کی عظمت وشان کے پیش نظر ہم اسے بھی اپنے لئے باعث صد افتخار وناز سمجھتے ہیں کہ ہمیں بھی ضمناً حضرت والا کی فیض رسانی سے حصہ مل گیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا کے اس مختصر مگر انتہائی مبارک قیام کو ہمارے حق میں مسعود فرمائے اور ہمیں استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حضرت اقدس! یہ جزیرہ موریشس پڑوسی جزیرہ رے یونین سے کسی قدر رقبے اور آبادی میں بڑا ہے، اس کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے اور یہ برطانوی حکومت کے زیر اقتدار ہے، یہاں کی کل آبادی میں عیسائی، ہندو اور مسلمان تین قومیں ہیں جن کی کثرت آبادی کی ترتیب بھی مذکورہ ترتیب کے مطابق ہے۔

یہ شہر ''پورٹ لوئس'' جہاں آج حضرت والا اس جلسے کی صدارت فرما رہے ہیں، اس جزیرے کا دارالحکومت ہے۔ اس جزیرے کا تمدن جیسا کہ آں جناب نے ملاحظہ فرمایا جزیرہ رے یونین کی طرح ہی نہایت اونچا اور مغربی طرز کا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے مسلمان خوش حال اور مطمئن ہیں اور تجارت، صنعت اور ملازمت وغیرہ کے میدانوں میں اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ امر قابل اطمینان ہے ومسرت ہے کہ مسلمانوں میں دینی جذبات بھی موجود ہیں اور وہ رفتار زمانہ کے ساتھ بہہ کر خدا اور رسول اور مذہب سے بیگانہ نہیں بن گئے۔ اکثر شہروں میں خوبصورت اور کشادہ مساجد موجود ہیں جن میں سے بعض میں ابتدائی دینی تعلیم کا بھی انتظام ہے جو مخلص اور دینی درد رکھنے والے مسلمانوں کی توجہ سے چل رہی ہے۔

ہم لوگوں کی آرزو تھی کہ حضرت اقدس کی پُر از سعادت ہم نشینی میسر آئے اور ہم آں جناب کے مواعظ، پند ونصائح اور علمی مذاکرات سے اپنے ذہن وفکر کو جلا دے سکیں۔

ری یونین سے حضرت اقدس کے پاس ہم نے جن امیدوں اور توقعات کے ساتھ دعوت نامہ دے کر اپنا وفد بھیجا تھا الحمد للہ کہ آں جناب کی ذرہ نوازی اور دینی دردمندی نے اس کو شرفِ قبول عطا فرماتے ہوئے ہمارے اس جزیرہ میں ایک ہفتہ کے قیام کا پروگرام منظور فرمایا۔ یہ حضرت اقدس کے اس فیاضانہ اور کرم گسترانہ جذبہ پر ہم تمام باشندگان موریشس آں جناب کے ممنون ومشکور ہیں جیسا کہ مطبوعہ پروگرام کے چارٹ سے آں جناب کے علم میں یہ بات ہوگی کہ یہ اجتماع جو پلازا تھیٹر ہال میں منعقد ہے موریشس کے ہر فرقے، ہر طبقے، ہر مذہب اور ہر ملت کی نمائندگی کر رہا ہے۔

عیسائی، مسلمان، ہندو، سکھ، افریقی، ایشیائی اور یورپین ملکوں کا یہ مشترک اجتماع حضرت والا کو خوش آمدید پیش کرتے ہوئے امید رکھتا ہے کہ آں جناب کا یہ مختصر قیام پُر آرام اور پُر مسرت گزرے گا، نیز ہم سب مشتاق ہیں کہ حضرت اقدس ہم تمام حاضرین جلسہ کو اپنے گراں قدر علمی خیالات ونظریات سے مستفید فرمائیں گے اور دارالعلوم دیوبند کے تعارف کے ساتھ مذہب اسلام کی عالمی حیثیت پر جامع روشنی ڈالیں گے۔

ہم سب اہل جزیرہ ایک بار پھر دل کی گہرائیوں کے ساتھ آں جناب کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور اس عنایت وکرم پر اظہارِ ممنونیت کرتے ہیں۔

............❖............

سپاس نامہ

یہ سپاسِ عقیدت اہالیانِ تاتاردیو (دارالحکومت جزیرہ مڈغاسکر) نے
مورخہ ۳۰؍اگست ۱۹۵۹ء بروز اتوار شہر کی جامع مسجد میں
حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

حضرت والا! ہم اپنی سعادت اور خوش بختی پر بجا طور پر نازاں ہیں کہ آں جناب نے ہم اہل جزیرہ مڈغاسر کی دعوت قبول فرماتے ہوئے ہمیں ذاتِ گرامی سے استفادہ کا موقع عنایت فرمایا۔ یہ ایک ایسی سعادت ہے جس کا ہم کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور اسی لئے اس نعمت غیر مترقبہ پر ہم خدا کا ہزاروں ہزار شکر ادا کرتے ہوئے آں جناب کو دل کی گہرائیوں اور انتہائی نیازمندی سے خوش آمدید کہتے ہیں۔ ع

اے آمدنت باعثِ خوش بختی ما

حضرت والا! مڈغاسکر کا یہ عظیم الشان جزیرہ بحر ہند میں واقع ہے اور فرانسیسی حکومت کے زیر اقتدار ہے۔ اس جزیرے میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور اسی لئے یہاں ہماری کسی اجتماعی ہیئت کا فقدان نظر آتا ہے۔ دینی تعلیم اور مدارس کا کوئی انتظام نہیں ہے اور جو ہے وہ خوجہ فرقوں کا ہے کیوں کہ اس جزیرے میں اسی فرقہ کے مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ جزیرہ ہر لحاظ سے نہایت خوش حال اور سرسبز و شاداب ہے اور تمدنی ترقیات میں کافی آگے ہے۔ آں جناب کا قیام یہاں بہت مختصر ہے ورنہ ہم تفصیل سے آپ کو جزیرہ کے مختلف اور مرکزی مقامات دکھاتے۔

ہم اپنی اس خوش قسمتی پر دوبارہ اظہارِ مسرت کرتے ہوئے آپ کو خوش آمدید پیش کرتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ اپنے پند و نصائح سے مستفید فرمائیں۔

............❖............

سپاس نامہ

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے ۱۹۵۹ء کے سفر افریقہ میں ساڑھے تین ماہ میں ایشیاء وافریقہ کے دس ملکوں کینیا، رے یونین، موریشس، مڈغاسکر، ٹانگانیکا، زنجبار، حبش، اسمارا، مصر اور پاکستان کا دورہ کیا، ان ملکوں میں ہر جگہ خیر مقدمی اور تبلیغی جلسوں میں تحریراً یا استقبالیہ تقریروں کے ذریعہ ممدوح کو سپاس نامے پیش کئے گئے، جو مولانا محمد اسلم قاسمی صاحب مدظلہ نے قلم بند کیا، یہ ان سپاس ناموں کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے، ۳۰ر ستمبر ۱۹۵۹ء بروز جمعرات حضرت ممدوح کے کینیا کے دارالحکومت نیروبی سے کینیا، ٹانگانیکا اور بخبار تین ملکوں کا ایک ہفتہ تک دورہ فرمایا جس میں کچاڈہ، موشی، اروشا، دارالسلام (دارالحکومت ٹانگانیکا) مومباسہ اور بخبار کا سفر کر کے ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۹ء بروز شنبہ واپس نیروبی پہنچے، اس دورے میں جو سپاس نامے پیش کئے گئے ان کا ملخص ذیل کے سپاس ناموں میں پیش ہے۔

کچاڈہ (ٹانگانیکا)

حضرت والا! اپنی اس سعادت پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ آں جناب نے کچاڈہ کی بستی کو اپنی گذرگاہ کے طور پر استعمال فرمایا اور ہمیں اس مختصر سے وقت میں خدمت واستفادہ کا موقع عنایت فرمایا۔ آں جناب نے راہ میں یہاں قیام فرما کر جو ذرہ نوازی فرمائی ہے، ہم اس کے لئے آں جناب کو تہِ دل سے شکریہ پیش کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ اس مختصر سے وقفے میں آپ کی ذات سے جو فیض حاصل ہوا ہے وہ ہمارے لئے فلاحِ آخرت کا موجب ثابت ہوگا۔

اروشا (ٹانگانیکا)

حضرت والا! اس چھوٹی سی بستی میں آں جناب کا ورودِ مسعود ہمارے لئے باعث عزت وصد افتخار ہے۔ آں جناب کی ذات سے جو فیض جاری ہے ہمیں مسرت ہے کہ ہم نے بھی اس میں حصہ دار ہونے کا شرف حاصل کر لیا، ہماری جانب سے نیاز وعقیدت کے مخلصانہ جذبات قبول فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا یہ سفر راحت وآرام اور کامیابی سے پورا فرمائے۔ آمین

موشی (ٹانگانیکا)

حضرتِ اقدس! آپ نے اس قصبے میں ایک شب کا قیام منظور فرما کر ہماری جو عزت افزائی فرمائی اس کے لئے ممنونیت وتشکر کے جذبات قبول فرمایئے، تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل ہم نے یہ پُرمسرت خبر سنی تھی کہ آں جناب براعظم افریقہ کے تین ماہ کے دورے پر نیروبی تشریف لائے ہیں اور سرِ دست ہزاروں میل آگے ایک ماہ کے قیام کے لئے جزیرلہ رے یونین تشریف لے جارہے ہیں۔ ہم نے اسی وقت سے یہ عزم کرلیا تھا کہ اس موقع پر محرومی ہماری بدقسمتی ہوگی۔ اس لئے اس قصبے میں تشریف آوری کی دعوت دیں گے۔

آج ہم فخر ومسرت سے ہم کنار ہیں کہ آں جناب نے ہماری دعوت کو پذیرائی بخشی اور یہاں مختصر قیام منظور فرماتے ہوئے ہم خدام کو استفادہ کا موقع عنایت فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مبارک وقفے میں زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ ہم نیاز مندی کے ساتھ خوش آمدید کہتے ہوئے آپ کے اصلاحی دورے کی کامیابی کے لئے دعا کرتے ہیں۔

مومباسہ (کینیا)

حضرت والا! سب سے پہلے ہم آں جناب کی اس کرم نوازی پر دلی تشکر وامتنان کے جذبات نذرِ خدمت کرتے ہیں کہ آں جناب نے اپنے اس دورۂ افریقہ میں مومباسہ جیسے اہم اور بندگارہ ہونے کی بناء پر مرکزی مقام کو فراموش نہیں فرمایا بلکہ ہمیں استفادہ وخدمت کے لئے تین دن عنایت فرما کر نیاز مندوں میں ایک ممتاز مقام عنایت فرمایا۔

آں جناب کی ذات سے عرصہ سے جو فیض جاری ہے ہمیں خوشی ہے کہ اس میں براعظم افریقہ کو اس کا حصہ مل گیا اور یہاں کے عقیدت کیشوں کو زیارت وخدمت کی سعادت نصیب ہوئی۔ مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند اور اس کی خدمات سے یہاں کے لوگ پوری طرح واقف نہیں تھے لیکن اب آں جناب کے اس کامیاب دورے کے بعد ہمیں یقین ہے کہ اُس کے وابستگان کا حلقہ اس طرف کے ممالک میں بھی دوسری جگہوں سے کم نہیں ہوگا۔

دارالعلوم کے سرپرست ومہتمم اعلیٰ اور اپنی ذاتی صفات وخدمات کی بناء پر آپ کو مسلمانانِ عالم کے دلوں میں جو مقام حاصل ہے اس کا اندازہ آں جناب کو یہاں کے مختلف ممالک اور ان کے شہروں کے سفروں میں بخوبی ہو چکا ہوگا۔

خدا کرے آپ کے اس جذبہ اصلاح و تبلیغ میں برکت ہو اور ایک عالم آپ کی شمع علم و ہدایت سے منور ہو۔ آمین

زنجبار

حضرتِ والا! اس جزیرے میں آں جناب کی تشریف آوری ہم سب مسلمانوں کے لئے باعث رحمت وسعادت ہے اور اس نعمت سے ہم کنار ہونے پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

افریقہ کے اس سفر کے دوران یہاں کے مسلمانوں کو آں جناب کی ذات سے زبردست اُنس پیدا ہو گیا ہے اور دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ عظیم خدمات سے واقفیت پیدا ہوئی ہے کہ آج وہ مسلمانوں اور اسلام کے لئے ایک مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قلعہ کی حفاظت فرمائے اور آپ جیسے محافظ کو اس کی سرپرستی وخدمت کے لئے تا دیر قائم رکھے۔ آمین

دارالسلام (ٹانگانیکا)

حضرتِ والا! ٹانگانیکا کے دارالحکومت میں آپ کے قدوم میمنت لزوم پر ہمارے دلوں کی گہرائی سے ابھرنے والے جذبات تشکر و امتنان قبول فرمائیے۔ اس شہر کی مرکزی اہمیت کے پیش نظر یہاں جن جلسوں کا انتظام کیا گیا ہے امید ہے ان میں آپ کے مواعظِ حسنہ مسلمانوں کی رہنمائی اور رہبری کے لئے زبردست معاون ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اس جذبہ کو قبول فرمائے اور مسلمانوں کو آپ کی ذات بابرکات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔

............❖............

سپاس نامہ

یہ اظہار عقیدت ایبی سینیا (ایڈس ابابا دار الحکومت ملک حبش) میں مورخہ ۱۹؍ستمبر کو حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس سفر میں مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی مدظلہٗ آپ کے رفیق سفر تھے۔

حضرتِ اقدس! یہ ہماری انتہائی سعادت وخوش نصیبی ہے کہ اگرچہ بہت تھوڑے وقت کے لئے ہی مگر آپ جیسے بزرگ اور مشفق بزرگ کی زیارت ورفاقت میسر آئی۔ ہماری اس سعادت میں جہاں ہمارے جذبِ دل اور انتہائی عقیدت کو دخل ہے وہیں آں جناب کی شفقت اور کرم نوازی بھی شامل ہے جس پر ہم خلوصِ قلب کے ساتھ شکریہ عرض کرتے ہیں اور اس مختصر سی بزم میں آں جناب کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

جناب عالی! جیسا کہ آپ کو علم ہے یہ ملک حبشہ فدائیانِ رسول اور شیدائیانِ اسلام کی سب سے پہلی پناہ گاہ رہا ہے جہاں حضرت سرور کائنات رسول اکرم ﷺ کے حکم پر صحابہ کرام نے پہلی اور دوسری ہجرت فرمائی، اس ملک کے نیک دل بادشاہ نجاشی نے ان جلیل القدر اصحاب رسولؐ کو عرب کے اُن ریگستانوں سے پناہ دی جو اس وقت بھیڑیوں کی شکارگاہ بنے ہوئے تھے اور جہاں کلمۂ حق ادا کرنے والوں کو بڑے سے بڑے عذاب کا مستحق قرار جارہا تھا۔ اس طرح اس ملک اور یہاں کے باشندوں کو اسلامی تاریخ میں ایک خاص اور محترم مقام حاصل ہے۔ اپنی شدت عقیدت اور تاریخ اسلام میں اس ملک کی اہمیت کے پیش نظر دل چاہتا تھا کہ آں جناب کچھ نہ کچھ وقت اس تاریخ ساز وطن کو عنایت فرمائیں جس نونہالانِ اسلام کو اپنا خونِ جگر پیش کیا تھا۔ ہمیں امید ہے کہ آں جناب بھی ان تاریخی حقائق کی موجودگی میں اپنے اس سفر کو مغتنم خیال فرما رہے ہوں گے۔

آخر میں مکرر شکریہ کے ساتھ ہم آپ کو خوش آمدید پیش کرتے ہیں۔

............❖............

سپاس نامہ

یہ سپاس نامہ ۲۲؍جون ۱۹۶۲ء کو دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (مغربی پاکستان) میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت اقدس میں پیش کیا گیا۔

ہم سب دربارِ خداوندی میں باعجز وانکسار شکر گذار ہیں کہ ہمارے مدرسہ کے مختصر نمایاں دورحیات میں تیسرا موقعہ ہے کہ حضرتِ والا کے وجود گرامی کو ہم خدام اپنے درمیان باثمین و برکات موجود پا رہے ہیں۔ چندروز قبل جب کہ حضرت والا کی جانب سے تشریف آوری کی اطلاع ملی تو تمام متعلقین ومتوسلین اوراہالیانِ شہر خدا شکر بجالائے۔

صبا پیام رسانید وشادماں گشتم طلوعِ صبح سعادت درانتظارمن است

اس مدرسہ کا ذرہ ذرہ اور خدام وارا کین اس نعمت غیرمترقبہ پرتحدیث بالنعمۃ جس قدر نازاں وشاداں ہوں وہ بجا ہے۔

مخدومِ محترم! آپ کے کمالات ومراتب اورخصائص وامتیازات چاردانگ عالم میں روشن ہیں جن پر روشنی ڈالنا تحصیل حاصل ہے۔

وما انتم ممن یھنی بمنصب ولکن بکم حقا تھنّی المناصبا

حضرت والا! اس مختصر مگر والہانہ خوش آمدید کے بعد اس حقیقت کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ اس مدرسہ کو حضرت والا اور دوسرے اکابر سے کس حدتک نسبت ہے۔ دراصل اس مدرسہ کی تاسیس حضرت اکابر دیوبند کی روحانی توجہات وکرامات کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھی جن حالات میں حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات حضرت نانوتویؒ نے دیوبند کی ایک مسجد میں اس دینی ادارہ کا آغاز کیا جو بلاشبہ آج اپنی عظیم خدمات اور فیوض وکرامات کے لحاظ سے پورے کرۂ ارض میں اسلامی اقدار ونظریات کا عظیم ترین مرکز ''دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے مشہور ہے، اسی قسم کے حالات میں اپنے بزرگوں کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر ان کی دعاؤں کے سہارے دارالعلوم دیوبند کے طرز پر خدا تعالیٰ کے دین متین کی اشاعت وحفاظت کا یہ مضبوط و مستحکم قلعہ معرض وجود میں آیا۔ اپنی زندگی کے اس مختصر وقفے میں اس مدرسہ نے ملک وملت کی جو خدمات انجام دیں ان کا مختصر جائزہ سالانہ کارگزاری کی رپورٹ سے لیا جاسکتا ہے اور مقام شکر وامتنان ہے کہ ملک کے دوردراز حصوں میں بھی کوئی ایسا گوشہ نہ ہوگا جہاں اس درسگاہ کا فیض یافتہ اشاعت دین میں مصروف نہ ہو۔

باطل سے ٹکر لینے اور کفر و معصیت کو پاش پاش کرنے کے لئے ہمارے اکابر دارالعلوم دیوبند جس عزمِ صمیم، جن مجاہدانہ ولولوں اور جس توکل واعتماد علی اللہ کی طاقتوں کو لے کر اٹھے آج ہمارے ملک کے گم کردہ راہ مسلمانوں کی اصلاح و ہدایت کے لئے اسی جوش وخروش، ولولہ مردانہ وار ہمت اور عمل وشغف کی ضرورت ہے۔ وقت کا اہم ترین فریضہ ہے کہ حاملانِ علوم نبوت اٹھیں اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر اپنے مشن کو کامیاب بنائیں اور ایک تازہ اور جوان عزم کے ساتھ اٹھ کر ملت کی قیادت کی باگ ڈور سنبھال لیں۔

کیا عجب میری نوا ہائے سحر گاہی سے　　　زندہ ہو جائے وہ آتش جو تری خاک میں ہے

مظہر انوارِ قاسمی! فتنوں کے اس نازک دور میں جب کہ اکابر ایک ایک کر کے اٹھتے جاتے ہیں دین کی قندیلیں گل ہو رہی ہیں، ہم خدام کی سرپرستی ورہنمائی اور مسلمانوں کی رشد وہدایت کے لئے بلا ریب آپ کا وجود مسعود خدا تعالیٰ کی طرف سے رحمت ونعمت بے کراں ہے۔

ہماری دعاء ہے کہ خداوند قدوس قحط الرجال کے اس اندوہناک دور میں علوم وانوار قاسمی کے اس مینارۂ نور کو تادیر تابندہ و درخشاں رکھے۔ زہے نصیب کہ انعامِ خداوندی سے آپ کی صحبت میسر آئی اور آں جناب کی سرپرستی میں یہ اجتماع ہوا۔ ہم اصاغر جیسے اکابر ہی کے لئے زیر سایہ ہیں اور آپ ہی کے خرمن عواطف کے خوشہ چیں ہیں۔

آخر میں ہم ایک بار پھر حضرت والا اور ان مشائخ اور اکابر ملک وملت وارباب فکر ونظر اور زعماء و شرفاء قوم اور اپنے تمام معاونین کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے موسم کی شدت کے باوجود تکلیف برداشت کر کے ہماری حوصلہ افزائی فرمائی اور جلسہ کو کامیاب بنایا۔ اس توجہ اور شفقت کی بدولت ہم اپنی رگوں میں جوش عمل کی نئی حرارت محسوس کر رہے ہیں۔ خدا کرے یہ مواقع ہمیں جلد جلد اور بار بار حاصل ہوتے رہیں۔ آمین

............❖............

سپاس نامہ

یہ سپاس نامہ حلقہ احباب دیو بند، کراچی کی طرف سے مورخہ ۲۹ رستمبر ۶۳ء کو حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

عالی مرتبت! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

جناب والا! آج ہم سب جناب کے ہم وطن ہونے کی حیثیت سے اس امر پر جس قدر بھی اظہارِ مسرت کریں کم ہے کہ ہم جناب کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں، یوں تو اس شہر میں جناب کی تشریف آوری بار ہا ہوئی ہے اور ہم سب کو ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہتا ہے، مگر آج ہم لوگ جس حیثیت میں جناب والا کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں وہ انفرادی حیثیت کے بجائے اجتماعی اہمیت کا حامل ہے اور یہ سبق بھی ہم نے آپ کے گھرانے سے ہی سیکھا ہے کہ ایک مسلمان انفرادی زندگی بسر کرنے کے بجائے اجتماعی حیثیت سے اگر زندگی بسر کرے تو اس میں زیادہ خیر و برکت ہے۔

عالی جاہ! دیو بند کے وہ احباب جو اس شہر میں آباد ہیں گاہ بگاہ چند اقارب سے کسی شادی یا غمی کے موقع پر ہی مل سکتے تھے ورنہ یہاں کی مصروف زندگی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ لوگ ایک دوسرے کے پاس جانے اور ملنے کا وقت نکالتے رہیں۔ اس کا نتیجہ چند سالوں میں یہ ہوا کہ ہم اپنے احباب واقارب اور قریب تر رشتہ داروں کی موجودہ نسل و پودے سے ہی ناواقف ہوتے جارہے ہیں۔ باشندگان دیو بند علیحدہ علیحدہ اور دور دراز بستیوں سے آباد ضرور ہیں مگر قلبی اطمینان اور روحانی سکون کسی کو بھی میسر نہیں ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری کوئی کالونی یا مشترکہ بستی نہیں ہے جس کے نتیجے میں ہماری خاندانی روایات اور اسلامی اخلاق و عادات روز بروز کمزور ہوتے جارہے ہیں اور جس معاشرہ میں یہ چیزیں کمزور ہو جائیں وہ بلاشبہ روحانی اذیت اور قلبی بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارے چند نوجوانوں نے اس کمزوری کو بھانپ لیا اور انہوں نے گزشتہ سال اس حلقۂ احباب کی بنیاد ڈالی اور عیدین کی خوشیوں میں اس خوشی کا مزید اضافہ کر کے ہماری آنے والی نسلوں پر احسانِ عظیم کیا ہے۔

عالی مرتبت! ابھی ہم ابتدائی مراحل سے گزر رہے ہیں مگر ہمیں امید ہے کہ ہم ان تمام مشکلات پر جلد از جلد قابو پالیں گے جو ہمارے اتحاد و اتفاق میں حائل ہیں، اس سلسلہ میں جناب سے ہماری درخواست ہے کہ جنابِ والا ہماری کامیابی کے لئے خصوصی اور مقبول اوقات میں دعا فرماتے رہیں گے تو ایک ایسا وقت بھی آئے گا کہ ہم اپنے مقاصد کا افتتاح جناب کے مقدس ہاتھوں سے کرائیں گے۔ انشاء اللہ

سپاس نامہ

یہ سپاس نامہ ۶۳ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور کی طرف سے حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

گرامی قدر! آپ نے جس خلوص و محبت سے باوجود کثرت مشاغل و تنگیٔ اوقات کے اپنی تشریف آوری کی سعادت سے ہمارے مدرسہ کو نوازا ہے اس کے لئے ہم صمیم قلب سے جناب کے شکر گذار ہیں۔ خداوندِ کریم آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

مخدوم العلماء! آج کا دن ہمارے لئے باعث صد افتخار ہے کہ آج ہم اپنے مایۂ ناز بزرگ اور ایک عالمگیر شہرت رکھنے والی مذہبی شخصیت کو اپنے درمیان دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے پاس نہ وہ الفاظ ہیں اور نہ وہ زبان ہے کہ جس سے ہم آپ کے شایانِ شان خیر مقدم کرسکیں اور آپ کی اس ذرہ نوازی و شفقت کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ رب العزت آپ کو اس احسان کا اجر جزیل عطا فرمائے۔

مہمان معظم! خدا گواہ ہے کہ آج اس جامعہ کے تمام اراکین، اساتذہ وطلبہ و جملہ خدام و متعلقین کے قلوب آپ کو یہاں دیکھ کر فرطِ مسرت سے سرشار ہیں اور سرور و انبساط کی ایک ایسی کیفیت محسوس کررہے ہیں جس کو احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔

سحبان الہند! آج سے تقریباً دس گیارہ سال قبل آپ صبوہ کی اس سب سے بڑی اور تاریخی مسجد تشریف لائے تھے، لیکن اُس وقت اس عظیم جامع مسجد کے فلک بوس مینار مسلمانوں کی مذہبی اور تعلیمی غفلت پر اشک بار اور اُن کی دین سے عدم دلچسپی پر شکوہ کناں تھے لیکن بحمد اللہ کچھ دردمند اور پُر جوش و متحرک حضرات کی مساعی جمیلہ رنگ لائیں اور ان کے نتیجے میں یہ ذہنی انقلاب اور عملی تحریک پیدا ہوئی کہ آج اس میں تین سو کے قریب طلباء حدیث و دیگر فنون علوم اسلامیہ کی تحصیل میں شب و روز لگے ہوئے ہیں، نیز جامعہ کے طلباء و فضلاء کو صوبہ بھر میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں اور صلاحیتوں کے پیش نظر مذہبی حلقوں میں رشک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

آسمانِ ہند کے خورشید! اللہ کا کرم و احسان ہے کہ اس صوبہ کے تقریباً تمام مدارسِ عربیہ اسلامیہ مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہیں اور یہاں کے تمام فضلاء و علماء اکابرین دارالعلوم کے فیض یافتہ ہیں، مشرب کے اعتبار سے سابق صوبہ سرحد کے تمام مدارس عربیہ میں صرف یہ جامعہ ہی ایک ایسی درسگاہ ہے جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے ذوق پر گامزن ہے جیسا کہ اس کے نام سے

بھی ظاہر ہے اور یہ حضرتؒ ہی کے روحانی فیوض و برکات کا نتیجہ ہے کہ اتنے قلیل عرصہ میں جامعہ اشرفیہ نے ترقی کے وہ منازل طے کر لئے ہیں جو ہماری توقعات سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ **فالحمد للہ علیٰ ذلک**

عالی جاہ! جامعہ کی روز افزوں ترقی کے پیش نظر جگہ کی قلت کا مسئلہ عرصہ سے ہمارے سامنے اپنی پیچیدہ شکل میں موجود تھا لیکن یہ معلوم ہو کر آپ کو یقیناً مسرت ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے شہر کے مرکزی مقام شاہی باغ کے متصل دو نہروں کے درمیان جامعہ کی نئی عمارت کی تعمیر کے لئے ۳۶/کنال زمین حاصل ہوگئی ہے، جس کی تعمیر کا کام انشاء اللہ العزیز عنقریب شروع ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں حضرتِ والا سے دعاؤں اور مفید مشوروں کے لئے التماس ہے۔ خداوند کریم آپ کو دارالعلوم دیوبند اور اس سے وابستہ علمی اداروں کی سرپرستی کے لئے عمرِ نوح عطا فرمائے۔

آخر میں ایک بار پھر ہم آپ کی تشریف آوری کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ ملفوظاتِ عالیہ سے مستفید فرمائیں۔

............❖............

سپاس نامہ

یہ سپاس نامہ انجمن خدام دیو بند سرگودھا (مغربی پاکستان) کی طرف سے
حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

عالی جاہ! ہم خدام تنظیم دیو بند اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں جس نے ہم مشتاقانِ زیارت کو نبیرہ قاسم العلوم والخیرات کی دوبارہ تشریف آوری سے نوازا، آپ جیسی واجب الاحترام شخصیت نے طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے ہم خدام کو اپنی تشریف ارزانی سے معزز و مفتخر فرمایا، ہم آپ کی اس ذرہ نوازی پر اپنی محبت اور مخلصانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

جناب والا! ہم اس مرکز علم و حکمت اور راز ہر ہند دار العلوم دیو بند کے خوشہ چین ہیں جس کے آپ مدبر شہیر اور مہتمم ذی وقار ہیں اور جو اس الحاد و بے دینی کے دور میں بھی طالبان علوم نبویہ کے لئے مرکز اور جوئندگانِ حق و صداقت کا منتہائے نظر ہے انشاء اللہ اس مشعل رشد و ہدایت کی علمی کرنیں رہتی دنیا تک ضوافشاں رہیں گی۔

حضرت والا! دار العلوم دیو بند سے ملکی تقسیم کے باعث بظاہر ہم کٹے ہوئے ہیں اور یہ قدرت کا وہ ناگزیر فیصلہ ہے جس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے سوا چارۂ کار نہیں ہے مگر ہم ان ظاہری پردوں کے باوجود قدرتاً اپنے دلوں میں علمی و روحانی رشتے کو پہلے سے زیادہ مضبوط و مستحکم پاتے ہیں۔ ملت اسلامیہ پر دار العلوم اور اس کے اکابر بالخصوص قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا جو احسان عظیم ہے اس کو ملتِ اسلام کبھی فرموش نہیں کر سکی۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ایک طرف انگریز اپنی دسیسہ کاریوں سے ملحدانہ نظام تعلیم، مغربی تہذیب کے نفاذ کی تدابیر اور عیسائیت کی تبلیغ میں منہمک تھا، آریہ سماج اور شدھی سنگھٹن جیسے فتنے سر اٹھا رہے تھے، دوسری طرف یہ مردِ حق کی بربادیوں کا منظر دیکھ کر مسلم قوم کو اس کے زہریلے اثرات سے بچانے کے لئے دین محمدؐ کا ایک مضبوط قلعہ تیار کر رہا تھا۔ اسی آغوش تربیت سے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ اسیر مالٹا، محدثِ اعظم حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ صاحبؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی صاحبؒ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ جیسے مجاہد اور متبحر علماء پیدا کئے جن کی علمی قابلیت، علمی صلاحیت اور سیاسی بصیرت کے سامنے ناموران عالم کی گردنیں جھکے بغیر نہ رہ سکیں۔

اے نورِ نگاہِ قاسم! تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے، تمام امت مسلمہ بالخصوص ملت اسلامیہ پاکستان آج پھر انہیں عظیم فتنوں کے طوفانوں میں گھری ہوئی ہے، سیلاب والحاد وارتداد کے تھپیڑے ایمان واسلام کے قلعہ سے ٹکرا رہے ہیں، عیسائیت ومرزائیت کے عفریت امت مرحومہ کو لقمۂ تر سمجھ کر نگلے چلے جا رہے ہیں۔ خسرو پرویز کے یہ پیرو پیام ونامۂ مصطفویؐ کو آج پھر پارہ پارہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، جس شمع نور و ہدایت کو کفر و باطل کی تیز وتند آندھیوں سے قاسمؒ ورشیدؒ نے بجھنے نہ دیا تھا، اے پاسبانِ ملت! آج اسی شمع فروزاں کو بجھانے پر تمام طاغوتی طاقتیں کمربستہ ہیں، ارتدادی فتنوں کے ان امنڈتے ہوئے سیلابوں سے خود ہماری حکومت مضطرب وحیران ہے، بتایئے آج کس قاسمؒ کو پکاریں، کس رشیدؒ کو بلائیں اور کہاں سے لائیں محمود الحسنؒ اسیر مالٹا کو، اس قافلہ رفتہ کی حدی خواہاں کو اٹھ اٹھ کر ہماری نگاہیں تلاش کر رہی ہیں مگر وہ قافلہ جا چکا، اب ہم اسکو تو نہیں پاسکتے لیکن ؎

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تلک　　اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تلک

آپ باقیات الصالحات میں سے ہیں اور اس وقت تبلیغ وہدایت کا مرکز ومرجع ہیں۔

حکیم الاسلامؒ! آپ کی تشریف آوری ہم مضطرب الحال لوگوں کے لئے باعث صد طمانینت اور وجہ سکون ہے۔ آپ کی زندگی کے زریں لمحات امت کے اس درد وکرب کے علاج واندمال میں بسر ہو رہے ہیں۔ خدا را ہمارے درد کا مداوا فرمایئے اور ہمیں قرآن وسنت کے وہ مواعظ سنا جایئے جو ہمارے ایمانوں کو تازگی اور ہمارے یقین کو ثبات بخشیں، نیز اپنی مستجاب دعاؤں میں ہم نحیف ونزار خدام کو ہمیشہ یاد فرماتے رہا کریں۔

آخر میں ہم صمیم قلب سے ایک بار پھر حضرت والا کے دیدار پر اپنی بے پایاں مسرت کا اظہار کرتے ہیں اور اس زحمت فرمائی پر آں جناب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت والا کی ذات بابرکات کو ہمارے سروں پر ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین

............❖............

سپاس نامہ

یہ سپاس نامہ حضرت حکیم الاسلامؒ کو خیر المدارس ملتان (مغربی پاکستان) میں پیش کیا گیا۔

جناب صدر اور معزز حاضرین!

آپ کا اس مدرسہ میں قدم رنجہ فرمانا نہ صرف علماء اور طلباء کے لئے ہی باعث خیر و برکت ہے بلکہ اس شہر کے عوام الناس کے لئے بھی باعث فخر و مباہات ہے، جس طرح جناب کی عظیم الشان درسگاہ کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے اسی طرح آپ کی ذات بابرکات کو بھی علماء اور منتظمین مدارس کی قیادت حاصل ہے اور ہم لوگوں میں جو آپ کی عظیم درسگاہ کے منتسبین ہیں آپ کی ذاتِ والا صفات کو وہ مرجعیت حاصل ہے جو کسی دوسرے شخص کو حاصل نہیں ہے۔

جناب والا! آج جس دور سے ہم گذر رہے ہیں وہ فتنہ وفساد کا دور ہے اور ہر طرف الحاد و زندقہ کے گھٹاٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے ہیں، بیرونی فتنوں سے مبلغین عیسائیت کا منظّم فتنہ ہمارے لئے سب سے زیادہ سوہانِ روح ہے اور اندرونی فتنوں میں مرزائیت اور منکرین حدیث اور منکرین حیات النبی ﷺ کے فتنے سب سے زیادہ ملت مرحومہ کی راہزنی کا کام کر رہے ہیں لیکن ہر طرف سے مصائب و نوائب میں گھرا ہوا ہونے کے باوجود ہم نے جی نہیں چھوڑا ہے بلکہ حتی الوسع ہمت و استقلال کے ساتھ ہم ان فتنوں کا مقابلہ کر رہے ہیں مگر اس کے باوجود ہم جناب کی ہدایات وارشادات کو مشعل راہ بنانے کے لئے ہمہ وقت مستعد و منتظر ہیں۔

عالی مرتبت! آپ موجودہ زمانہ میں اہل علم اور اہل دین کے لئے ایک عظیم راہنما اور ایک زبردست مربی ہیں، جب کبھی کوئی نیا فتنہ کھڑا ہوتا ہے تو اُس اعتماد کی بنیاد پر جو آپ کی ذات کو عوام وخواص میں حاصل ہے لوگوں کے رخ آپ کی طرف پھر جاتے ہیں اور وہ فتنہ وفساد کے استیصال کے لئے جناب والا کی طرف سے کسی مفید لائحہ عمل کے متوقع اور منتظر ہو جاتے ہیں۔

جنابِ محترم! اس تکلیف فرمائی کے لئے ہم سب آپ کے ممنون و متشکر ہیں کہ آپ نے اپنے قیمتی وقت میں سے ہم لوگوں کے لئے بھی کچھ وقت فرمایا اور ہمیں اپنے ملفوظات عالیہ سے مستفید ہونے کا گراں قدر موقع عنایت فرمایا۔ آخر میں ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آں جناب کو محفوظ و مامون رکھے اور آپ سے ملت کو زیادہ سے زیادہ مستفید فرمائے۔

ترجمہ از پشتو

یہ تہنیتی کلمات حضرت حکیم الاسلامؒ پر افغانستان کے ایک اخبار ''انیس'' نے اپنی ۲۳؍رمضان ۱۳۵۸ھ کی اشاعت میں سپرد قلم کیا۔ حضرتؒ کا یہ دورۂ افغانستان رجب ۱۳۵۸ھ میں پشتو زبان میں شائع ہوئے تھے جن کو اردو میں پیش کیا جارہا ہے۔

جناب مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیو بند، مولانا محمد احمد صاحبؒ کے صاحبزادے اور حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دارالعلوم کے پوتے رجب کے مہینے میں کابل تشریف لائے۔

والاحضرت اشرف صدر اعظم صاحب (وزیر اعظم) اور جناب وزیر معارف کی ملاقات سے مشرف ہوئے۔ جناب مہتمم صاحبؒ قرآن کریم کے حافظ، دانش منداور علوم اسلامیہ کے جامع عالم ہیں۔ آپ کی تشریف آوری کی تقریب پر کابل کی انجمن ادبی اور افغانستان کی جمعیۃ العلماء اور مرکز کے بانی اہل فضل نے آپ کے اکرام و اعزاز میں دعوتیں دیں۔ جناب مہتمم صاحبؒ جو ایک بہت ہی لائق اور فصیح ادیب ہیں اپنے داماد مولانا حامد الانصاری غازی مدیر الجمعیۃ دہلی کے ساتھ جو ایک لائق اور فاضل نوجوان ہیں تشریف لائے تھے۔

............❖............

مولانا محمد طیب ریکٹر دارالعلوم دیو بند

یہ خیر مقدمی نوٹ جنوبی افریقہ کے مشہور اخبار ''پریٹوریا نیوز'' نے اپنی ۲؍جولائی ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے شہر پریٹوریا کے ایک روزہ دورہ کے وقت شائع کیا اور حضرتؒ کو حکمراں ڈچ قوم کی طرف سے خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

ہندوستان سے تشریف لانے والے تیرسٹھ سالہ مہمان جن کا مرتبہ دنیائے اسلام میں پوپ کے برابر سمجھا جاتا ہے شہر پریٹوریا میں گزشتہ کل ایک دن کا دورہ فرمایا۔

آج تک جنوبی افریقہ میں جتنے علماء اسلام آ چکے ہیں ان میں حضرت حکیم الاسلامؒ سب سے زیادہ شہرت یافتہ عالم ہیں۔ آپ نے مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کا سفر کیا ہے اور اکثر ملکوں میں تقریریں فرمائی ہیں، آپ کے قلم سے اب تک سو سے زائد تصانیف ظہور پذیر ہو چکی ہیں، جن کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہو رہا ہے۔

مولانا طیبؒ کمیونزم کے شدید مخالف ہیں اور دنیائے اسلام کی سب سے بڑی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم ہیں۔

جب آپ سے پوچھا گیا کہ بغیر جنگ وجدل کے مغرب کس طرح کمیونزم کو شکست دے سکتا ہے؟ تو آپؒ نے فرمایا:

''کمیونزم جہل، بھوک اور ظلم کی گود میں جنم لیتی ہے، ان تمام کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے اللہ پر ایمان کی ضرورت ہے۔

ان ہی کمزوریوں کی وجہ سے ہندوستان میں کمیونزم آہستہ آہستہ سرایت کر رہا ہے اور افلاس اور جہالت سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔''

آپ سمجھتے ہیں کہ بیرونی ملکوں کی امداد سے ہندوستان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے لیکن جو امداد مل رہی ہے وہ ناکافی ہے۔

پریٹوریا میں آپ کو دعوت دینے والی انجمن ''یونیورسل ٹروتھ موومنٹ'' جس کے ایک رکن جناب یوسف ایچ۔ ایس ابراہیم ہیں اور جو ہندوستان میں ایک بااثر آدمی سمجھے جاتے ہیں۔

............❖............

خیر مقدمی کلمات

ڈربن (جنوبی افریقہ) کے مشہور پندرہ روزہ اخبار ''دی ویوز'' The Views نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے دورۂ جنوبی افریقہ کے دوران ڈربن پہنچنے پر مورخہ ۸؍جولائی ۱۹۶۳ء کو ادارہ میں حضرت والا کے خیر مقدم میں تحریر کیا۔

اپنے معزز مہمان اور ایشیاء کی سب سے بڑی اسلامی درسگاہ کے مہتمم حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے وردو مسعود پر ہم اُن کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ کی مقامی ہندوستانیوں کی تاریخ کے سب سے زیادہ نازک موڑ پر ہورہی ہے جب کہ وہ یہاں کے نسلی امتیاز کے قانون کی بناء پر نہایت سخت مشکلات میں مبتلا ہیں۔

صوبہ ٹرانسوال کی مسلم اکثریت تجارت پیشہ ہے جن کی تجارتیں برسوں کے بعد استحکام کو پہنچی ہیں۔ اس زمانے میں جب ملک میں تجارتی منڈیاں ناپید تھیں اور جب اپنے شہر اور گاؤں سے دور دوسری بستیوں میں جا کر تجارت کرنا موت سے ہم آغوش ہونے کے مرادف سمجھا جاتا تھا، بڑی محنت اور تکلیف سے گذر کر یہ مسلمان شہرے سے دور اپنی تجارت قائم کرتے تھے، اس زمانے میں نہ سڑکیں تھیں اور نہ آمد و رفت کے وسائل، بسا اوقات موت اور زندگی کے موڑ سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس حالت میں پورے عزم و استقلال کے ساتھ یہ مسلمان وہاں آباد ہوئے اور حیرت انگیز رفتار سے ترقی کے منازل طے کرتے رہے۔ اب یہاں کی قومیت پرست حکومت قانون کے بل پر نسلی امتیازات کے قانون کو عملی جامہ پہنانے کی لئے پوری طاقت کے ساتھ کوشاں ہے جس کے ذریعے ان بہادر لوگوں کو بے گھر کر دیا جائے گا اور کسبِ معاش کے مسائل ان کے لئے پھر سے پیدا کر دیئے جائیں گے۔ ایسے مصائب کے وقت ہمارے مہمانوں کا ورود ہو رہا ہے، جس سے ہمیں امید ہے کہ ہمارے حوصلوں اور عزائم میں ترقی و استقلال پیدا ہوگا اور ہم ان مشکلات کے مقابلے میں جم سکیں گے۔ ہماری آرزو ہے کہ آپؒ کے پر حکمت الفاظ ہمارے زخموں پر مرہم کا کام دیں گے اور ہمیں اپنی جدوجہد میں قوت ملے۔

نیز ہم قابل احترام مولانا اور ان کے صاحبزادے کا استقبال کرتے ہیں، وہ ایک ایسے وقت میں ہمارے ساحلوں پر تشریف لائے ہیں جب مسلمانوں نے اسلام کے زریں اصولوں کو چھوڑ رکھا ہے اور چھوٹی چھوٹی چیزوں میں الجھ کر وہ آپسی تفرقہ کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ حضرت مولاناؒ اپنے مختصر سے قیام کے دوران مسلمانوں میں بھائی چارہ اور اتحاد کی فضا پیدا فرمائیں گے اور اس مفاہمت اور اتحاد کے قیام کے لئے وہ صرف مسلمانوں کے درمیان ہی جدوجہد نہیں فرمائیں گے بلکہ بلا تخصیص رنگ و نسل وہ ہر فرقہ اور ہر قوم کے ساتھ ''آشتی'' کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

سپاس نامہ

یہ سپاس نامہ ۱۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۳ھ کو مرکزی جمعیۃ الطلباء دارالعلوم دیو بند کی طرف سے حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت میں سفر افریقہ و مشرق وسطیٰ سے مراجعت پر پیش کیا گیا۔

سیدنا المحترم! مسلسل تین چار ماہ سے ہم خدام جناب والا جیسی شفیق و عظیم اور ہمہ گیر شخصیت کی دید سے محروم تھے، قدرت نے آپ میں علم و فضل، زہد و تقویٰ، عزم و استقلال، خلوص و محبت، رفق و مروت اور دوسرے اوصاف و کمالات اس فیاضی سے جمع کر دیئے ہیں کہ بلاشبہ آپ ہمارے لئے مرجع و مرکز کی حیثیت رکھتے ہیں اور اہم ایک لمحہ کے لئے بھی آپ سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی جدائی نے ہم میں سے ہر ایک کو بے چین کئے رکھا۔

للہ الحمد کہ حضرت والا اس طویل سفر سے بصحت و سلامتی واپس تشریف لائے۔ اس موقع پر ہم جس قدر بھی مسرت و انبساط محسوس کریں کم ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج ہر شخص بے حد خوش ہے اور اس کی دلی دعا ہے کہ رب العالمین حضرت اقدس کا سایۂ عاطفت تا دیر ہم سب پر قائم رکھے۔

مرکزِ علوم! آپ کی اس طویل مفارقت سے جس طرح ہم سب بے چین اور بسا اوقات محزون و دل گیر رہے ہے یقیناً حضرت والا نے بھی اس دوری سے تکلیف محسوس کی ہوگی مگر چوں کہ یہ سفر تبلیغ اسلام اور رشد و ہدایت کے عظیم و اہم مقصد کے لئے اختیار فرمایا گیا تھا، اس لئے دور دراز کے سفر کی صعوبتیں باعثِ طمانینت و سکون تھیں۔

پیکر خلوص! اگر چہ یہ ادارہ ایک طویل مدت سے اپنے فیوض و برکات سے دنیا کے گوشہ گوشہ کو سیراب کر رہا ہے اور بلاشبہ اس کی علمی و روحانی خدمات نے اس صدی میں دنیا کو جو سہارا دیا ہے وہ بس اُسی کا حصہ ہے مگر پھر بھی ضرورت تھی کہ اس سائنسی اور ترقی یافتہ دنیا میں اس ادارہ کی خدمات کی ایک جیتی جاگتی تصویر چل پھر کر دنیا کو حق و صداقت اور ایمان و ایقان کا پیغام پہنچائے اور اس کی مثالی شخصیت زبانِ حال سے دنیا کو بتلائے کہ یہ عظیم ادارہ کس قسم کے افراد تیار کر رہا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ حضرتِ والا کو قریب سے دیکھ کر دنیا نے محسوس کیا ہوگا کہ یہ درسگاہ اپنے فرزندوں کو علم و فن اور فضل و کمال کے ساتھ روحانی کمالات، خدا ترسی، فرض شناسی اور حکمت و دانائی کی دولت سے بھی بہرہ ور کر رہی ہے۔

سپاس نامہ

یہ سپاس نامہ ۱۴؍ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو اہالیانِ دیوبند کی طرف سے حضرت حکیم الاسلام کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

حضرت والا! جذبات شکر و سپاس کے حامل الفاظ کا مشاہدہ اور سماعت آپ کی ذات کے لئے کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے لیکن اسرار کی زبان میں گفتگو کی اجازت ہو تو دیوبند کی جامع مسجد میں اہالیانِ دیوبند کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کئے جانے والے الفاظ کے یہ خوبصورت پھول ایک جہانِ معنیٰ اپنے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں۔ دارالعلوم کے صدر دروازہ سے لے کر دور بحر اٹلانٹک کے ساحل تک آپ کی عظمت عالمگیر کے سامنے خلوص اور اعتراف عظمت کے کتنے ہی الفاظ سجدہ ریز ہوئے ہوں گے، کتنی ہی گردنیں آپ کی بزرگی و عظمت کے سامنے جھک گئی ہوں گی، سپاس اور سپاس ناموں کی لامحدود قطاروں نے آپ کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف واحسان کو محبت اور خلوص کی خوشبوؤں سے بسے ہوئے الفاظ کے ذریعہ ادا کیا ہوگا۔ اس لئے ہم اس سپاس نامہ کی ظاہری قدر و قیمت کے معاملہ میں تر زبانی کا اعتراف اور عجز بیانی کا اظہار کرتے ہیں۔

زعیم ملت! اظہار شکر و سپاس اور مقام عجز و نیاز لباس واحوال کے اختلاف کے باوجود اپنے مقام عروج پر متحد اور ایک رنگ ہو جاتے ہیں۔ اول مقام وہ ہے جہاں احساس شکر و سپاس جذبات کے وفور سے بوجھل ہو کر زبان کو گنگ اور گلوگیر کر دیتا ہے۔ جذبات کا سیلاب وسیلوں اور واسطوں کی حدود کو توڑ کر بہہ نکلتا ہے، ایسی حالت میں خاموشی سب سے بڑا اعتراف اور تر زبانی سب سے بڑا اظہار بن جاتی ہے اور جب احساس و اظہار مجسم ہو جائیں تو ذہن و زبان کے لئے سب سے بہتر چارہ کار یہی ہے کہ وہ دل کی دھڑکنوں کے راستے سے ہٹ جائیں۔

ایسا ہی کچھ ہمارا حال ہے۔ اس مختصر سے اظہار عقیدت میں الفاظ کے خوبصورت پھول نہیں ہیں۔ رسمیت کے تزئین و آرائش نہیں ہیں، کند جذبات کا ملمع نہیں ہے، کھوکھلے احساس کی پردہ داری نہیں ہے، یہ ایک مختصر سا مجہول سا، نامکمل سا اعتراف ہے جو دیوبند کے لوگ اپنے ایک ہم وطن اپنے ایک بزرگ، اپنے ایک زعیم، اپنے ایک عالم، اپنے ایک رہنما اور اپنے ایک درویش کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں، اس کی سب سے بڑی اہمیت یہی ہے کہ وہ ایک وطن والے کو اہل وطن کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔

حضرت والا! آپ ایک ایسے تاریخی سفر سے مراجعت فرما ہوئے ہیں جس کی صحیح قدر و قیمت تو مستقبل کا مورخ ہی متعین کر سکے گا لیکن اس وقت بھی بظاہر اس کے جو اثرات ہندوستان اور ساری دنیا پر مرتب ہوئے ہیں انہوں نے آپ کا، دارالعلوم کا اور دیوبند والوں کا نام ساری دنیا میں روشن اور تابناک کر دیا ہے۔

آپؒ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم نے ایک پاک مقدس اور شیریں ندی کے بجائے ایک گونجتے، گرجتے اور ملکوں ملکوں کی سرحدوں کو چھوتے ہوئے سمندر کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس کی شہرت، اس کی عظمت، اس کے اثرات اب ایک یونیورسٹی، ایک درسگاہ یا ایک تعلیمی ادارہ کے اثرات نہیں رہے بلکہ اب دارالعلوم ساری دنیا میں ایک طرز فکر، اسلام کا ایک علمی ورثہ، مسلمانوں کی ایک مقدس اور محترم امانت، ایک مسلک، ایک طریقہ اور ایک قلعہ بن گیا ہے۔

آپؒ کی مسلسل پیہم، انتھک اور دشنام و تعریف سے بے نیاز جدوجہد اور کوشش نے مسلمانوں کی علمی تاریخ کا ایک نیا اور روشن باب تحریر کیا ہے، دین کے تحفظ کی کوششوں میں ایک یادگار اضافہ کیا ہے۔ آپؒ کی عصر ساز شخصیت نے تنہا وہ کارنامہ انجام دیا ہے جو موجودہ دنیا کے دانشوروں میں پوری ایک جماعت، پورے ایک گروہ اور پورے ایک ادارے کے لئے بھی ممکن نہیں تھا۔

دنیا کے نقشہ میں دیوبند ایک نظر نہ آنے والا نقطہ ہے، لیکن آپؒ کی شخصیت، آپ کی جدوجہد اور آپ کی کوششوں کے طفیل، یہ نظر نہ آنے والا نقطہ، علمی اور دینی آسمان پر آج آفتاب نصف النہار کی شکل میں جگمگا اٹھا ہے۔ ہم آپ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی اس نو پید اہمیت پر آپ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

آپؒ نے اس سرزمین پر جہاں مغربی عریانیت و فحاشی کی یلغار اور نسلی منافرت کے حیوانی جذبات سے ہانپتے ہوئے عفریت کا منحوس سایہ ہے، تہذیب کی ایک مشعل روشن کی، دین کا چراغ جلایا، تقدس کا مینارۂ نور تعمیر کیا، انگریزی زبان سے ناواقفیت، اجنبی رسوم و معاشرت سے مغائرت کے باوجود عصر حاضر کے سرکش اور متمرد سامریوں کی زبان سے دارالعلوم کے لئے، دیوبند کے لئے، دیوبند والوں کے لئے اعتراف و تحسین کا خراج حاصل کیا۔ ایک موہوم سی شہرت کو ایک جیتے جاگتے اور زندہ مسئلہ کی حیثیت دی اور اس حیثیت کو منوا بھی لیا۔ اس عظیم کارنامہ پر ہم آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

رجل عظیم! دیوبند کی اس جامع مسجد سے دارالعلوم کا فاصلہ بمشکل چند فرلانگ ہوگا لیکن دارالعلوم کی عمارت سے لے کر بحر اوقیانوس کے ساحل تک ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔ ہزاروں میل کے اس فاصلے کے

ایک ایک اہم جادہ پر آپ کی عظمت و بزرگی اور جلالت علمی سے متعلق اعتراف واقرار کے نشانات مرتسم ہیں۔ آپ کے پیش رو بزرگوں اور اکابرین کے سامنے بھی دیوبند کے باہر گردنوں کے خم اور استحسان کے بول منتظر رہتے تھے لیکن اعتراف وتسلیم کے معاملہ میں آپ کی ذاتِ اقدس کے علاوہ کسی بھی شخصیت کے متعلق دیوبند کے لوگوں کے اعتراف واحسان کے الفاظ ادا نہیں ہوئے۔ اس لحاظ سے چند فرلانگ کا یہ فاصلہ صدیوں کی مسافت بنا رہا۔ اس اظہارِ عقیدت کی اہمیت بس اتنی ہی ہے کہ آج اعتراف واقرار، فضل و احسان نے اس مسافت کو ختم کر دیا ہے۔

جامع مسجد، جہاں دارالعلوم کی کشتی چھوٹی سی ایک آب جو میں ڈالی گئی، جامع مسجد، جہاں ایک وسیع و عریض اور گرجتے ہوئے سمندر کے درمیان عزم، اطمینان اور استقلال کے ساتھ چلتے ہوئے دارالعلوم کے ایک عظیم الشان جہاز کے ناخدا کی حیثیت سے ہم آپ کی خدمت میں اظہار شکر وسپاس کر رہے ہیں۔

آخر میں ہم خداوند عز وجل سے دعا کرتے ہیں کہ آپ کی جلیل شخصیت تادیر ہمارے سروں پر شرف و افتخار کا سایہ قائم رکھے اور آپ قاسم العلوم کے ورثۂ علمی کے وارث کی حیثیت سے دارالعلوم اور دیوبند کے اقبال واعزاز کا پرچم فضاؤں میں لہراتے رہیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

............❖............

سپاس نامہ

یہ سپاس نامہ حضرت مولانا صدیق احمد باندویؒ نے مدرسہ عربیہ ہتورا، ضلع باندہ کی طرف سے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

مخدوم محترم! آج ہم مسلمانانِ باندہ کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ سیرتِ پاک کے اس مبارک اجتماع میں ہم اپنے مخدوم ومحترم عہد حاضر کے مایۂ ناز عالم، فخر اسلام اور ایشیاء کی سب سے بڑی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم کے قدوم میمنت لزوم پر بہ صمیم قلب ہدیۂ تشکر پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

حضرت والا! ہمارے ضلع باندہ کو اکابر دارالعلوم سے ایک روحانی تعلق ہے، اگر ایک طرف اکابر دارالعلوم سلسلۂ ولی اللّٰہی کے درخشاں ستارے تھے تو دوسری طرف ہمارے ضلع باندہ کے والی نواب ذوالفقار الدولہ بہادر خاندان ولی اللّٰہی کے آبدار موتی اور حضرت شاہ اسحاق صاحب مہاجر مکیؒ سے فیض یافتگان میں سے تھے، جس طرح اکابر دارالعلوم دیوبند نے ملک کے اندر علم دین اور آزادی وطن کا علم بلند کیا اسی طرح یہ صفات ہمارے نواب صاحب کی ذات میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے قبل یہ شہر علم کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ نواب صاحب کے مدرسہ میں حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی، جامع علوم عقلیہ ونقلیہ مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی لکھنوی، فقیہ ہند حضرت مولانا خرم علی صاحب بلہوری مترجم درمختار رحمہم اللہ جیسے اکابر علماء وفضلاء درس دیتے تھے اور صدہا تشنگانِ علوم اس چشمہ سے سیراب ہوتے تھے۔ باندہ میں خاندان سادات کے قیام کے باعث نواب صاحب ہی تھے۔

آخر کار ۱۸۵۷ء کا انقلابی اور نہ بھولنے والا دور آیا۔ ہمارے نواب صاحب نے بھی اکابر دارالعلوم کی طرح دین وملت کے تحفظ اور تحصیل آزادی کے لئے بے مثال قربانیاں پیش کیں، لیکن حالات نے موافقت نہ کی اور انہیں سلطنت کو خیر باد کہہ کر یہاں سے اندور چلا جانا پڑا مگر ہمارے لئے جامع مسجد اور دیگر آثارِ عبرت چھوڑ گئے جو ہم کو برابر درس دے رہے ہیں۔ کاش ہم اہل باندہ کی آواز سن لیں اور اپنے مشفق ومہربان والی کی یاد تازہ کریں۔ خدا کرے ہمارے دن پھریں اور ہمارا شہر پھر سے اپنی کھوئی ہوئی علمی مرکزیت حاصل کر لے، ہمارے یہاں پھر علماء ربانی کا مجمع ہو اور ہم اپنے والی کی طرح دین کے واسطے جان ومال کی بازی لگائیں۔

مصلح ملت! آپ کی تشریف آوری ہم فالِ نیک تصور کرتے ہیں، ہم اس وقت اپنی خوش طالعی پر بجا طور پر ناز کر رہے ہیں کہ اللہ پاک نے ہمارے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو پھر ایک لڑی میں ملا دیا اور ہم کو پھر اپنے

والی کی طرح دارالعلوم کے اکابر کی سرپرستی حاصل ہوئی۔

حضرت محترم! اب تک ہم غافل تھے، اب ہم نے اپنے والی کے اُن آثار کی صدا سن لی، ہم نے خدا پر بھروسہ کر کے یہ طے کرلیا کہ اپنی ساری زندگی خدمت دین کے لئے وقف کردیں۔ اللہ پاک اپنے فضل و کرم اور اپنے حبیب پاک ؐ کے طفیل سے ہماری یہ آرزو پوری کردے۔ اس بارے میں ہم آں جناب سے دعا کے طالب ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ اگر آپ جیسے مجاہد جلیل کی سرکردگی اور سرپرستی حاصل رہی تو انشاء اللہ ہم عہد ماضی کی یاد تازہ کردیں گے۔

مجاہد جلیل! ہم ناکارہ خدام حضرت والا کی شایانِ شان مدارات سے تہی دامن ہیں جس پر سوائے اعتراف تقصیر اور کیا عرض کرسکتے ہیں۔

حضرت والا شان! ہم کو آں جناب کی مصروفیت کا بخوبی علم ہے، ایسی حالت میں اور اس شدت کی گرمی میں دور دراز کا سفر کر کے ہم دور افتادگان کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشنا اس کے لئے ہم تہہ دل سے ممنون ہیں اور بارگاہِ خداوندی میں دست بدعا ہیں کہ ہم اور تمام باشندگانِ ملک کو جناب کا پرشفقت سایہ تادیر حاصل رہے اور ہمارا مرکزی ادارہ دارالعلوم دیوبند حضرت والا کی سربراہی میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہا۔

............❖............

سپاس نامہ

یہ سپاس نامہ مورخہ ۱۵/ذی قعدہ ۱۳۸۶ھ مطابق ۲۵/فروری ۱۹۶۷ءکو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت میں پیش کیا۔

مخدومِ محترم! آج کی شام ہم طلباء آفتاب بالخصوص اور اہل یونیورسٹی عموماً دنیائے اسلام کے ایک فاضل علمبردار اور مادرِ وطن کے ایک مایۂ ناز فرزند کو خوش آمدید کہتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ عرصہ سے خواہش تھی کہ آپ ہماری مادرِ درس گاہ کو شرفِ مہماں نوازی بخشیں۔ ہم تہہ دل سے آپ کے ممنون و مشکور ہیں کہ آپنے اپنی گونا گوں مصروفیات میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر ہم کو موقع عنایت فرمایا کہ ہم آپ کی زبانی آیاتِ ربانی اور تعلیماتِ محبوب سبحانی سے مستفیض ہوں۔ ہم متمنی ہیں کہ آں جناب آج اپنے مخصوص انداز میں ہم کو رحمت عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس تعلیمات سے وہ روشنی عطا فرمائیں جو ہمارے لئے مشعل راہ ہو۔

مکرمی! آپ نے ملک اور بیرون ملک میں اسلامی دنیا کی جو خدمات کی ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں، مسلمانانِ ہند کو خصوصاً آپ کی دعوت نے نہ صرف بیدار کیا بلکہ ان کی روح کو تازگی بخشی۔ آپ کی بصیرت افروز اور جامع تقاریر نے قرآن اور پیغمبر اسلام سے متعارف کر کے انسانی زندگی کو اسوۂ حسنہ کے ذریعہ پروردگارِ عالم نے جو لائحہ عمل دیا ہے اس کو ہندوستانی ذہنوں میں اتارنے کے لئے آپ نے اپنے زبان وقلم کو متحرک کر رکھا ہے، جس پر آپ کو مبارکباد عرض ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی دعائیں قبول فرماتا ہے۔ آپ طلبائے آفتاب ہال کے حق میں دعا فرمائیں وہ دعائیں جو خالق و مالک نے اپنے کلام پاک میں اپنے بندوں کو خود ہی تعلیم فرمائی ہیں۔

آخر میں ہم ایک بار پھر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں اور آپ کی زحمت فرمائی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

............❖............

سپاس نامہ

یہ سپاس نامہ ۱۲/ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ کو لجنۂ فضلائے دکن کی جانب سے حیدرآباد میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

بعزِ نگاہ، رفیع المرتبت، منبع المرتبت، حارسِ مضمار مآثر وفضائل، حارثِ بستان، مکارم وجلائل، غارسِ اشجار و حکم، دارس آثار بدعت، حامیٔ دین متین وکتاب مبین، ماحی نقوش الکفر والزندقۃ والشرک المہین، جامع الدرایہ والروایہ، قامع الضلالۃ والغواید، الفاضل اللودعی الیلمعی حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمہ اللہ مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

عزیز القلوب! ہمارے لئے اس مسرت کا اظہار الفاظ میں نہایت دشوار ہے جو ہم آں محترم کے بلدۂ حیدرآباد فرخندہ اساس کے ورودِ سعادت آمود پر محسوس کر رہے ہیں۔ یہ ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ ہماری اس انجمن لجنۃ الفضلاء کی تجدید عین اُن ایام میں عمل میں آتی ہے جب کہ کرۂ ارض کے اس حصہ کو آں محترم کے اقدامِ میمنت التیام سے اکتساب سعادات کا ندرت مآب موقع میسر آتا ہے اور اس طرح ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ آں محترم سے اجتماعی شکل میں عزتِ تعارف وشرفِ مجالست حاصل کرسکیں۔ اگر اس امرِ واقعہ کو ہم طائر روضات الجنات قاسم العلوم والخیرات (طاب ثراہ) کے قرۃ العین وسکینۃ القلب اور ثمرۃ الفواد کے ورودِ مسعود کی فرخندہ فرجامی کا ایک پرتوِ لطیف قرار دیں تو غالباً اربابِ نظر کے نزدیک اسے افراطِ حسنِ ظن سے تعبیر نہ کیا جائے گا۔

معارف مآب! آپ کے خاندانی خصائص اور قاسمی افاضات وافادات کا ذکر ان تنگ دامن سطور میں کسی عنوان ممکن نہیں جن کی ایک جیتی جاگتی تصویر (جو یوماً فیوماً اپنی افادتِ ملی کے دامن کو تمام اقطارِ عالم تک وسیع کرتی جا رہی ہے اور جس آفتاب معارف کی چشم جہل والحاد کو خیرہ کر دینے والی ضیاء پاشیاں ہندوسندھ سے گزر کر تمام دنیائے اسلام کا اپنی روشنی سے احاطہ کئے ہوئے ہیں، دارالعلوم دیوبند کی شکل میں موجود ہے، اس مغتنم لیکن بغایت مختصر صحبت میں ہم ان خدمات دارالعلوم کا تذکرہ بھی خارج از حیطۂ قدرت سمجھتے ہیں جو زمامِ اہتمام ہاتھ میں آنے کے بعد سے آں محترم نے شخصاً انجام دی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم جیسی عظیم الشان درسگاہ کے داخلی نظم ونسق کی ذمہ داریوں سے بہ حسن اسلوب عہدہ برآ ہونا، اس کی توسیع و ارتقاء کے دل پذیر خاکوں میں رنگ بھرنا اور پھر یہاں کی شبانہ روز مصروفیات سے کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر ہندو بیرون ہند کے دوروں کے ذریعہ سے اربابِ خیر کی توجہ کو دارالعلوم کی طرف منجذب کر کے اُن کی علمی اعانت سے اس کی مالی پوزیشن کو جنس دین ومذہب کی ہیچ میرزی کے اس پُرآشوب اور معمورِ فتن دور میں

مستحکم کرنا کوئی ایسا معمولی کام نہیں ہے جس سے صرفِ نظر ممکن ہو۔ اس سلسلہ میں حکومت خداداد افغانستان سے پچاس ہزار کی گراں قدر رقم کا حصول اور اس سے بھی زیادہ والی افغانستان کی توجہ کا اس طرف مبذول کرانا آں محترم کے اس علم وانتظام، فکر وتدبر اور فراست واصابت رائے کی صلاحیت کو ظاہر کرتا ہے جس کے بغیر کسی ایسی مذہبی وعلمی درسگاہ کے سفینۂ اہتمام، بقاء وقیام کا ساحل مراد تک پہنچنا مجالِ عادی کہا جاسکتا ہے۔

مکرمت پناہ! ہم متوسلین دارالعلوم اگر چہ جسماً اپنی مادر علمی سے ایک ہزار میل سے بھی زیادہ دور ہیں اور قاسم ارزاق نے ہمارے وسائل حیات ومعاش کو اس سرزمین سے وابستہ کر کے ہمیں اپنی محبوب درسگاہ اور ہمارے ذہن وفکر کے مربیوں سے تابدیر مہجور رہنے پر مجبور کر دیا ہے لیکن ہم آپ کو صدق نیت اور خلوصِ فکر وطوبت کے ساتھ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہمارے مضطرب دل اور ہماری بے قرار روحیں کبھی ان دونوں کو فراموش نہیں کرسکتیں اور نہ کبھی ہمارے اذہان وافکار اپنی پیاری درسگاہ کے سود و بہبود سے غافل اور اس کے شیون ارتقاء واستحکام سے بے تعلق ہوسکتے ہیں۔

ثریا اعتلاء! ہم اگر چہ اپنے جذبات میں سے یکے از ہزار کا بھی اظہار نہیں کرسکے لیکن ان سطور کی کوتاہ دامانی ہمیں کفِ لسان قلم پر مجبور کرتی ہے، اس لئے ہم بادل ناخواستہ ایسے اجمال سے کام لیتے ہوئے جسے شاید بخل کہا جاسکتا ہے ایک دو ضروری امور کی طرف آں محترم کی توجہ گرامی مبذول کراتے ہوئے اپنی اس گذارش مضطرب کو ختم کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

فضیلت پژوہا! ہمیں دلی اندوہ وملال کے ساتھ اس تلخ حقیقت کا ہمیشہ اعتراف رہا ہے کہ دارالعلوم جیسی درسگاہ جس نے ملت اسلامیہ کے ہزاروں افراد کو فضیلت نثار وفضیلت پناہ بنا دیا آج تک نہ جانے کیوں اپنے متوسلین ومنتسبین کی ایک جامع تنظیم وارتباط کی ضرورت کو جو ہزاروں ہزار سعادات وبرکات پر منتج ہوسکتی ہے ناقابل اعتناء سمجھتی رہی ہے۔ سنا گیا تھا کہ خاص اسی مقصد کیلئے کوئی شعبہ مستقلاً قائم کیا گیا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ دکن کو اس کے دائرہ عطوفت واعتناء سے کیوں محروم رکھا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ تنظیم وارتباط کے لوائح عمل اور دائرہ کار کو محیط الکل بنالیا جائے۔ ضروریات حالات سے غض بصر روانہ رکھتے ہوئے بعجلت ممکنہ اس کام کی تکمیل ہوجائے اور ایک شخص بھی متخرجین ومنتسبین دارالعلوم میں سے خواہ وہ کہیں کیوں نہ ہو، ایسا نہ رہ جائے جس کے نام اور ضروری حالات سے دارالعلوم باخبر نہ ہو۔

و دمتم یاسیدنا بالخیر والسلامۃ والھناء و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ الذی لا یجری سواہ للحمد والثناء.

سپاس نامہ

یہ سپاس نامہ منتظمین اجلاس سیرت مدرسہ عالیہ اسلامیہ میل وشارم کی طرف سے مورخہ ۹ رنومبر ۱۹۵۷ء کو حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

ضیفنا المکرّم! خداوند ذوالجلال والاکرام کا فضل واحسان ہے کہ آں جناب اس چھوٹے سے اور دور افتادہ قصبہ میں قدم رنجہ فرما ہوئے۔ اللہ رب العزت کے اس احسانِ عظیم اور اپنی سعادت وخوش نصیبی پر ہم بے حد مسرور ومحفوظ ہیں اور اس زحمت فرمائی پر آں جناب کی خدمت میں سپاس عقیدت پیش کرتے ہیں۔

آج حالت یہ ہے کہ ہر طرف الحادوزندقہ کی آندھیاں چل رہی ہیں، دہریت وخداناشناسی کا سیلاب امنڈ رہا ہے، اخلاق وروحانیت پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ ایمان وایقان کے بجائے جہل واوہام اور شکوک وظنون کا دور دورہ ہے۔ غرض آج مسلمانانِ عالم جس نازک اور پرآشوب دور سے گذر رہے ہیں اس کی نظیر اسلام کی صدیوں کی تاریخ میں شاید نہ مل سکے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں گذرا جس میں ہمارے دور سے زیادہ تغیرات واقع ہوئے ہوں اور مادہ پرستی اپنے اس عروج پر پہنچی ہو کہ ہر طرف دین ودینی معتقدات کے ساتھ تضحیک واستہزاء کا بازار گرم ہو، ایسے نازک اور پرشور دور میں سفینۂ اسلام کی ناخدائی صرف آپ جیسے علماء حق کا ہی حصہ ہے۔

حضرت والا! ایک ایسے ادارہ کے مہتمم اعلیٰ ہیں جو دنیائے اسلام کی عظیم الشان اور مایۂ ناز دینی درسگاہ ہے اور جس کے بانی محترم آں جناب کے جد امجد قاسم العلوم والخیرات، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ ہیں، اسی آفتاب علم وعرفان اور روحانیت کی شعاعیں آج دنیا کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ کو روشن ومنور کر رہی ہیں، آج عالم اسلام میں عموماً اور ہندوپاکستان میں خصوصاً جو کچھ دین داری نظر آرہی ہے یہ اسی ادارہ کا علمی اور روحانی فیضان ہے جن اسلاف واکابر نے اس شجرہ طیبہ کو اپنے مبارک ہاتھوں سے لگایا، جناب والا ان ہی اسلاف کی حقیقی یادگار ہیں اور یہی وجہ ہے تبلیغ دین اور اصلاح کی جدوجہد میں حضرت والا کا مقام انفرادی اور خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

حضرت والا! آپ سپہر علم وحکمت کے نیر درخشاں اور راہ معرفت وصداقت کے روشن ستارے ہیں، آں محترم کے قدوم میمنت لزوم سے سرزمین وشارم رشکِ جناں بنی ہوئی ہے۔ ہمارے قلوب مسرور وشاداں ہیں کہ ہم خدام کو حضرت والا کی زیارت نصیب ہوئی ؎

آمدن آں یارے کہ ما می خواستیم

اے واعظ رنگیں بیاں خوش آمدید! جناب والا کی ہستی مسلمانانِ عالم کے لئے بالعموم اور مسلمانانِ ہند کے لئے بالخصوص سرمایۂ فخر ومباہات ہے۔ خدا کا شکر واحسان ہے کہ اس قحط الرجال کے دور میں حضرت والا کی ذات بابرکات ہم گناہگاروں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے میسر ہے جس سے ہزارہا تشنگان علم ومعرفت سیراب ہورہے ہیں اور ایک عالم آپ کی دینی وعلمی اور روحانی خدمات کا ثنا خواں ہے۔ حقیقت میں سرور کائنات نبی کریم ﷺ کے ارشاد عالی **العلماء ورثة الانبیاء** کا صحیح مصداق اس پر آشوب دور میں آں جناب کی ذات ہے۔

تحدیث نعمت کے طور پر یہ چند کلمات خدمت اقدس میں عرض کرنے کی جرأت کی گئی ورنہ ہمارے الفاظ وتعبیرات کا ذخیرہ کیفیت مسرت کے اظہار سے بھی تہی ہے اور حضرت والا کے اوصاف حمیدہ کے اظہار سے بھی ع

دامان نگہہ تنگ وگل حسن تو بسیار

اے شیخ باصفا! ہم ایک بار پھر صمیم قلب سے آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں، آپ کی تشریف آوری اہل وشارم کے لئے عموماً اور منتظمین اجلاس سیرت مدرسہ عالیہ کے لئے خصوصاً باعث صد عزت وسعادت اور موجب خیر وبرکت ہے۔ جناب نے ہماری حقیر دعوت قبول فرما کر ہم پر بڑا احسان فرمایا۔ ہم بارگاہ مجیب الدعوات میں بہ ہزار عجز وانکسار دعا کرتے ہیں کہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم ودائم رکھے اور قوم وملت کو آپ کے فیوض سے بیش از بیش مستفید وبہرہ ور فرمائے۔ آمین

............❖............

سپاس نامہ

یہ سپاس نامہ ۲۱ ر نومبر ۶۵ ء کو حضرت مولانا ابوالسعود صاحب مہتمم مدرسہ دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت میں مدرسہ کی جانب سے پیش کیا۔

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ. امابعد!

اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ آج دارالعلوم سبیل الرشاد میں ہمارے درمیان عالم اسلامی کی ایک برگزیدہ شخصیت جلوہ افروز ہے، جس کی روحانیت سے ہمارے قلوب سرور واطمینان کی کیفیت محسوس کررہے ہیں۔ تعبیر والفاظ سے قطع نظر ہم اس کرم بے پایاں کی کیفیت محسوس کررہے ہیں۔ تعبیر والفاظ سے قطع نظر ہم اس کرم بے پایاں کے لئے حضرت والا کے شکر وسپاس گذار ہیں کہ آپ نے اپنے بیش قیمت لمحات دارالعلوم سبیل الرشاد کے لئے عنایت فرمائے۔ ہمارے مدرسہ میں حضرت والا کی تشریف آوری پہلی مرتبہ نہیں ہے بلکہ حضرت والا کا معمول ہے کہ جب جنوبی ہند میں آپ کا دورہ ہوتا ہے تو دارالعلوم سبیل الرشاد میں تشریف لاکر اپنے قدوم میمنت لزوم سے ہمیں ضرور نوازتے ہیں۔ الحمدللہ گزشتہ سال ہماری دعوت پر دارالعلوم کی زیر تعمیر درسگاہوں کی عمارت کا سنگ بنیاد حضرت والا نے اپنے دست مبارک سے رکھا۔ بلاشبہ ہمارے پاس الفاظ کا وہ ذخیرہ نہیں ہے جس کی وساطت سے ہم اپنے دل کی گہرائیوں میں پائی جانے والی مسرت وخوشی کا اظہار کرسکیں۔

جانشین قاسم العلوم والخیرات! حق جل شانہٗ نے آپ کی ذات والا صفات کو یوں تو اپنے فضل عمیم سے بہر نوع نوازا ہے جس کی بنا پر آپ کی شخصیت دور حاضر کے علماء وصلحاء میں مرکزی حیثیت کی حامل ہے لیکن اگر آپ کی ذات میں ودیعت کئے گئے اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کیا جائے تو قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی جانشینی ایک ایسا وصف ہے جس کو سرفہرست جگہ دی جائے گی اور اگر الولدُ سرٌّ لابیہ کا مصداق متعین کیا جائے تو ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ حضرت قاسم العلوم والخیرات کے روحانی وعلمی اثاثہ سے حضرت والا کو وراثت آبائی کے طریق حظِ وافر عنایت کیا گیا ہے اور آج دیوبند کی سرزمین علم وفن کی آبیاری، آپ کے بے پایاں خلوص، آپ کی شبانہ روز کی محنت شاقہ اور آپ کے بے کراں علوم قاسمی کی رہین منت ہے۔ اگر حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے کارناموں کو اصطلاحی زبان میں بیان کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موصوف نے اپنی مختصر مگر گراں قدر حیات طیبہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان میں تصوف وسلوک، تصنیف وتالیف، خطاب و

تقریر اور مناظرہ کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کا وجود سب سے وسیع کارنامہ ہے۔ حضرت نانوتویؒ کے طرزِ فکر اور علم ونظر کے حاملین نے ان راہوں پر اپنی کوششیں صرف کیں اور دورِ حاضر میں جب اس زاویہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو صرف آپ کی ذات گرامی ان اوصاف کی حامل اور جامع نظر آتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی خدمت اور علمی چمن کی آبیاری سے جو نتائج آپ کی زندگی میں رونما ہوئے ان کے بارے میں بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے اس مرکز علوم شرعیہ کو آفتاب نصف النہار بنادیا اور آج دارالعلوم دیوبند بلاشبہ ایشیاء کا سب سے بڑا دینی وعلمی سرچشمہ ہے جہاں تشنہ کامان علمِ دین اقطارِ عالم سے حاضر ہوکر بقدر ظرف سیرابی حاصل کرتے ہیں اور ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں فرزندانِ دارالعلوم، آسمان علم ومعرفت پر آفتاب وماہتاب بن کر چمک رہے ہیں، سچ پوچھئے تو ان کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔

اسی طرح حضرت نانوتویؒ کے علمی وروحانی سلسلہ میں آپ نے ہر ہر پہلو سے وہ عظیم کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں کہ دورِ حاضر میں آپ کے علاوہ کسی نے اس وادی پُر خار میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کی، تصوف وسلوک اور معرفت کی سڑکوں کو عبور کرنے کے ساتھ گم گردگانِ منزل کی ہدایت آپ کا شب وروز کا مشغلہ ہے۔ اس دورِ قحط الرجال میں بہت کم ایسے بلند پایہ افراد ملتے ہیں جنہیں اسلاف کی صحیح جانشینی کا فخر حاصل ہو۔ سچ ہے کہ دورِ حاضر میں حضرت نانوتویؒ کے باطنی علوم کو سننے اور دیکھنے کے لئے گوش برآواز اور چشم براہ تھا، آپ نے اس زاویہ حیات کو رعنائی ویکتائی اور حسن وجمال عطا فرمایا۔

یادگارِ اکابر! حضرت نانوتویؒ کی ذات گرامی سے اپنی کسی مناسبت کے بعد مزید کسی گذارش کی ضرورت نہیں تاہم جن اوصاف حمیدہ نے آپ کی ذات والاشان کو بین الاقوامی شخصیت بنایا ہے، ان میں آپ کے علم وفضل، تقویٰ ومعرفت الٰہی کے ساتھ حسن اخلاق کو بڑا دخل ہے۔ زبان کی حلاوت، دعوت الی الخیر میں مناسب اسلوب اور مواعظ حسنہ کا بہترین طریق ایک ایسا وصف ہے جس نے آپ کی ذات کو عوام وخواص کے لئے یکساں طور پر مرجع ومرکز کی حیثیت عطا کی ہے اور اس وقت پورا عالم اسلام آپ کی قیادت ورہنمائی کا محتاج ہے۔ امت مسلمہ آپ کی نگاہ حقیقت شناس کو اپنے لاینحل مسائل کے لئے علاج تصور کرتی ہے۔

ہم بارگاہِ ایزدی میں بصد عجز ونیاز دعا کرتے ہیں کہ خداوند قدوس آپ کے عزائم میں رسوخ وبلندی، کوششوں میں قوت وکامیابی، عمر واقبال اور مراتب ومناصب میں ترقی عطا فرمائے اور دیر تک امت مسلمہ پر آپ کا سایہ باقی رکھے۔ آمین

آخر میں پھر ہم آپ کی تشریف آوری کے لئے ہمہ تن سپاس گزار ہیں۔ امید ہے کہ آپ اپنے قیمتی لمحات کا کچھ حصہ ہماری رہنمائی میں صرف فرمائیں گے۔ (۱۱۴)

سپاس نامے واستقبالیہ خطبات

تحریر فرمودہ : حضرت حکیم الاسلامؒ

حکام، امراء اور سلاطین اگر علماء کے دربار میں آجائیں تو ان کی خوش نصیبی، علماء کرام ان معزز مہمانوں کی پذیرائی اور ضیافت، کام ودہن کی لذتوں سے اپنے احوال کے مطابق کر سکتے ہیں، ورنہ تکلف کی صورت میں سراسر تکلیف اور زحمت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے مگر زبان وقلم سے ان کی شکر گزاری میں ان کی شان کو پیش نظر رکھنا لازمۂ اخلاق اور خاصۂ تہذیب وشائستگی ہے۔ خود حدیث میں بھی اس کی تاکید ہے **السلطان ظل اللّٰہ ومن اھانہٗ اھانہ اللّٰہ** ہمارے اسلاف نے سلاطین کے چوکھٹوں پر کبھی جبہا سائی کو گوارا نہیں کیا، خود سلاطین ان کی خدمت میں چل کر آئے اور ہمارے اسلاف نے سنت نبویؐ کے مطابق ان کا استقبال واحترام بھی کیا، کلماتِ تحسین بھی پیش کئے اور شریعت کی حدود وقیود میں رہتے ہوئے ادب و احترام کے باب میں جو کچھ بن پایا کیا۔

حکیم الاسلامؒ کے عہد اہتمام میں دارالعلوم دیوبند میں شاہِ افغان ظاہر شاہ، مولانا ابوالکلام آزاد اور عرب دنیا کے مشاہیر علماء، امراء کی آمد ہوئی تو حکیم الاسلامؒ نے ان کے شایانِ شان پذیرائی فرمائی۔ استقبالیہ جلسوں میں ان کی آمد کے شکریہ میں اپنے گوہر بار قلم سے کلماتِ سپاس بھی پیش فرمائے۔

ذیل میں اہل علم کے ذوقِ علمی کی ضیافت کے لئے حکیم الاسلامؒ کے قلم سے تحریر فرمودہ فصیح و بلیغ سپاس نامے پیش کئے جارہے ہیں:

بہ پیش گاہ خسروی اعلیٰ حضرت ہمایونی المتوکل علی اللہ محمد ظاہر شاہ

بادشاہ دولت مستقلۂ افغانستان خلد اللہ ملکہٗ ودولتہٗ

بعد از آدابِ شاہانہ وتحیات نیازمندانہ ودعاہائے مخلصانہ

اعلیٰ حضرت معظم! امروز ماہمہ خدام دارالعلوم مرکزی دیوبند خیلے خوش بختیم کہ دریں مرکز علمی بحفلۂ علماء

امت وصلحائے ملت بتقریب قدوم ذات شاہانہ ہمایونی بہ ایئے خیر مقدم شان موفق شدیم، بلاشبہ ایں روز برائے ایں موسسہ عرفانی روزِ سعید و یوم عید است وما بصمیمیٔ قلب برقدوم اعلیٰ حضرت ظل سبحانی فریضۂ تشکر وترحیب بجامی آریم قدمتَ خیر قدوم و نزلت خیر مقام.

اعلیٰ حضرت! روابطِ اسلاف و اکابر دارالعلوم بذات ملوکانۂ ہمایونی و بدودمان شاہی و بملت نجیبۂ افغانستان قدیم العہد وتاریخی اندنہ از کہنگیٔ زمان کہنہ شدندو نہ از مرورایام متاثر، چناں کہ بودند ہستند بلکہ از پیشتر پیشتر وہمیں است کہ افغانستان بدلہائے ایں نیاز کیشان مثل دیوبند چناں جا گرفتہ نظرمی آید کہ شمّۂ از اجنبیت ندارد۔

چنانچہ اوّلین جذبات اجتماعیہ کہ برائے استخلاص ملّت ووطن از استبداد فرنگ بجولان گاہِ ذہن بزرگانِ دیوبند سرافراشتند امیدگاہ شان افغاستان بود، سپش تحریکات ملیہ حضرت شیخ الہند مولانا محمودالحسن قدس سرہٗ کہ رخِ شان نیز بافغانستان بود وروردِ رفیق خاص سیاسی حضرت شیخ وامین خط ریشمینش مولانا منصور انصاری و داعیٔ اجتماعی شیخ مولانا عبیداللہ سندھی رحمہما اللہ بایما گرامیٔ شان بخاک پاک افغانستان کہ بسے خدماتِ جلیلۂ ملتِ ہندیہ وافغانیہ بانجام رسانیدند یک اضافہ پیش قیمت بر روابط مابینی بود کہ ازان تاریخ مودت ایں معہدِ دینی وافغانستان تازگیہا گرفت وقوتہائے بیکران یافت، ہمیں بود کہ چون تختِ خوش بخت افغانستان بعداز مساعی مجاہدانہ غازیٔ اعظم شہید معظم اعلیٰ حضرت سردار محمد نادرخاں مرحوم از تشویشات داخلی وخارجی پاک شدہ بدولتِ استقلال سرفراز شدہ بذات شاہانۂ ہمایونی عزت یافت واز بدوجلوس اعلیٰ حضرت شان در تمامی شعب مملکت پیشترفتہائے محسوس رخ دادہ و دولت افغانستان توانستہ کہ تحت رہنمائے ہائے ذاتِ شاہانہ قدمہائے موثری برائے ترقیات علمی وتمدنی وسیاسی و بلند بردن سطح زندگی مردم برادرو ہمہ اقوام ملک بلاتفریق مذہب وملت زیرسایۂ عدلِ گستریہائے شاہانہ بامن ومساواۃ گذر بسر کنند۔ مجلس شوریٰ دارالعلوم ایں نیازمند قدیم رابسلسلۂ ابراز مکنونات انبساط ومسرت بخاک پاک افغانستان فرستادتا کلمۂ تہنیہ وتبریک و پیغام نیازمندیہائے نیاز کیشان بسمع ہمایونی تقدیم کردہ برائے استحکام روابط قدیم وقیام یک نظام ہم آہنگ، عرفانی خالص اقداماتِ خوش بختانہ رہنمایم، ثمرۂ عظیمے کہ براین اقدام مخلصانہ برائے این ہم آہنگی، حکومت اعلیٰ حضرت معظم ابراز نمودہ احسانِ عظیم برگردن ملت نہادنقل ترجمۂ قرآن کریم ازحضرت شیخ الہند نوراللہ مرقدہٗ وتفسیرات حکیمانہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ است کہاز اردو بفارسی منقل کردہ و بغایت پاکیزگی انصرامِ طباعتش نمودہ تخم ریزیہائے علوم سلسلہ ولی اللہٰ ومکتب فکر قاسمی کہ اساسِ دیوبندیت است

بقلو ملت نجیبۂ افغانستان یکسانی ویکجہتی پیدا آمد وعلاقہ ہائے عرفانی اساسِ علم ونظر گرفتہ چناں زندہ و پائندہ شدند کہ آثارش نسلاً بعد نسلٍ متوارث شدہ می روند وخواہند رفت۔

اعلیٰ حضرت معظم! ازیں حقیقت کسے انکار کردہ نتواند کہ اگر ایک طرف تعاون رجال فعال ملت و حکومت افغانستان معین کار ایں موسسہ اسلامی شدہ دگر طرف مساعیٔ عرفانی ایں دارالفنون بسا رجالِ ملت افغانیہ را بعلم و اخلاق تربیت نمودہ بافغانستان فرستاد کہ بخدماتِ جلیلہ تعلیم و تدریس و پند و خطابت وغیرہ مصروف بکار اند و برائے مادعا گویان لائق صد شکر و نازش است کہ مجلس ملیہ علمی جمعیۃ علماء افغانستان کہ باموور مملکت اثر و رسوخ دارد ہم یک عددِ کافی فضلاء دیوبند بدامنش فرا گرفتہ کہ اعلاء کلمۂ حق شعار شان می باشد، نیز علم ایں حقیقت برخودِ اعلیٰ حضرت معظم از ہمہ زیادہ است کہ خاندان مبارکہ شاہی را علاقہ برقوائے ظاہری و مادی وشرافتِ خاندانی خود از توجہات روحانی و ادعیۂ مستجاب ومقبول بزرگان دیوبند ہم امداد کاملے رسیدہ است، بہ علت این اتحاد علمی و عرفانی وتعاون طرفین ہر ہر فرد قاسمی ترقیات خاندانِ اعلیٰ حضرت معظم وملت نجیبۂ افغانی را عیناً ترقیٔ خویش اعتقاد می کند۔

کشش ہمیں علاقہ ہائے قدیم و جدید و روابط خصوصی و عمومی ذات شاہانۂ ہمایونی را بما غریبان در بن مرکز علمی جمع ساخت وکلاہ گوشہ مایان بآفتاب رسانید تا آنکہ اساسے کہ تخم بود امروز شجرۂ طیبہ گشت کہ **اصلھا ثابتٌ و فرعھا فی السماء. فللّٰہ الحمد والمنۃ.**

اعلیٰ حضرت معظم! بعد از برگشتگیٔ طالع ملتِ اسلامیہ ہندیہ در سنہ یک ہزار و ہشت صد ہفت و پنجاہ میلادی موسس ایں مرکز دینی کہ حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہم اللہ باشند اولاً مقابلۂ استبداد فرنگ بشمشیر وسنان آغاز نہادند وسپش بقوت فکریۂ عرفانی در سنہ یک ہزار صد ہفت شصت برائے ابقاء علوم اسلامی و حفظ جذباتِ حریت و استخلاص و مدافعتِ فتنۂ فرنگ این معہد علمی را بر اصول ہشت گانۂ الہامی خویش تاسیس نمودند و باخلاصے وایثارے کہ در اساس ایں موسسہ بزرگ پیوستہ شدہ است ایں ادارہ یوماً فیوماً بشاہراہِ ترقی گامزن شدہ می رود کہ از حیثیت یک مکتب خیلے خورد کہ بیک تلمیذ و یک استاذ آغاز نہانی وترقی دیدہ امروز یک دارالفنون مذہبی خیلے بزرگ وکلاں شدہ کہ از صیتِ فضل و فیضش چپّہ چپّہ عالم اسلامی سیراب است ونفوس لاتعداد مذہبی آسیا و افریقہ را در مسلک یک نظام اجتماعی و دینی فرا گرفت۔

فیضِ گستریہائے این موسسہ عرفان پناہے در مرنو دو چہار سالۂ خویش باقدامات علمیہ متنوع الاصناف عظمت بے مثال جلب نمودہ و چناں خدمت حیرت آورے نمودہ است کہ ہمہ ادارہ ہائے مذہبی ہند یکجا شدہ

ہم نظیر آن را پیش کردہ نمی تو انند ہزاران ہزار علماء وفضلاء مصنفین وخطباء، مدرسین ومناظرین، مفتیان وقضاۃ ارباب وعظ وتربیت واصحاب بیعت وارشاد وغیرہ پیدا نمود کہ باطراف ممالک اسلامیہ کہ یکے ازان ہم افغانستان است منتشر شدہ بخدمات ملّی ودینی مصروف بکارند۔

اعلیٰ حضرت! کار این معہد علمی بر جاگیر ہا وسرمایہ ہائے تجارت وخزانہ ہائے دولتی نیست بلکہ عموماً بعطایائے عامہ مسلمین اتمام میابد وبسا از ہند وبیرونِ ہند ارباب اقتدار وامراء وملوک دریں اعانہ ہم حصہ وافر احراز نمایند مثل خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خان وسلطان محمد رشاد خامس والی ٹرکی وجلالۃ الملک سلطان سعود والیٔ نجد وحجاز وعزت مآب سید انور السادات وزیر معارف مصر وعالی جناب اونو وزیر اعظم برما وعالی جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریۂ ہندوستان وغیرہ، قوم خطیرہ وہدایائے عرفانی باوقات مختلفہ ابلاغ نمودہ بتقویت این مرکز دینی پرداختند وازان جملہ عطیۂ مبارکۂ ذات شاہانہ ہمایونی یک یادگار تاریخی است کہ ازان صدر دروازۂ دار جدید بنام ''باب الظاہر بنا یافت کہ ہمہ وقت سرِ خود بلند داشتہ یادِ ذاتِ ملوکانہ ہمایونی را بچشم ودل تازہ می دارد۔

اعلیٰ حضرت معظم! نظام کارہائے جلیلہ اش مانند نظام یک دولت منظّم می باشد کہ بر قلوب حکمرانی دارد، رجوع ہمہ کارہائے انتظام وتعلیمش بسوء یک مجلس شورائے است کہ بنام مجلس اعلیٰ موسوم است، مجلس اعلیٰ برائے انتظامات عمومی ادارہ وتنفیذ تجاویز خویش یک دفتر عمومیٔ مرکز بنام ادارۂ اہتمام ترتیب داد کہ تقریباً برو صد کا تبہائے وارباب خدمات بست شعبہ ہائے انقسامی دست ضبط وتصرف دارد کہ ہر یکے ازان برنگ یک مدیریہ مستقل می باشد، اندرین شعبہ جات شعبۂ خیلے بزرگ ومہم شعبۂ تعلیمی است کہ روحِ این ادارہ است وبرائے این شعبہ یک مجلس مستقل بنام مجلسِ علمی می باشد کہ ذمہ بردار تمام تشکیلات تعلیمی است، صدر نشین این مجلس حضرت اقدس شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ صدر المدرسین دارالعلوم بودند کہ عرصۂ سہ ماہ گزشتہ کہ این مجاہد جلیل وبطل حریت وجامع علم وعمل مارا داغ مفارقت دادہ رہ گرائے عالم جاودانی شد اگر ذاتِ گرامی شان درین حلقۂ قدسی بودے رنگِ مجلس دگر بودے۔ رزقنا اللہ تعالیٰ امثالہم۔

وبودوجہ (سالیسانہ) اش امروز تا شش لکھ روپیہ می باشد اندازہ مصارف عمارات دارالعلوم تا دہ ملیون افغانی می رسد، عدد اساتذہ کہ بتفاوت مراتب خویش علماء درجہ اوّل شمردہ می آیند تا چہل می رسد در ہر سال تعلیمی اوسطاً تعداد طلبہ قریب بیک ہزار وپنج صد می باشد کہ ہر سال ازاں یک صد وپنجاہ تا دوصد تکمیل علوم نمودہ دارائے شہادت نامۂ فضیلت می گردند شاخہائے علمی اش در ہند وبیرون ہند تا بہ ہزاران می رسند،

فضلائش چناں کہ بہ میدان علم و دیانت می دوند ہم چنیں براہ خدماتِ ملی و وطنی ہم می پویند و بلا تامل گفتہ می توانم کہ در ہندوستان علم آزادی اولاً ہمیں جماعۂ عرفانی بلند نمود و بآخر کار دوش بدوش اقوام ہند رفتہ قربانیہا پیش نمود و بمنزل آزادی نارمل شد دائرۂ خدمات شان از ہند بیرون گذشتہ بہمہ منطقہ ہائے اسلامی وسیع شد، شکر خدائے بزرگ و برتر کہ ایں موسسۂ عرفانی با ایں ہمہ وسعت پذیری و ہمہ گیریٔ خورد امروز برای نعمت خاص خداوندی بفخر و ناز سر بفلک می کند کہ اعلیٰ حضرت ہمایونی بغیر باء نوازی خاندانی خویش و ذوق تحفظ ارتباط قدیم را بروئے کار آوردہ خدام ایں معہد علمی و جمیع اساتذہ و طلبہ را بتفصلات شاہانہ بے کراں نوافتند و بقدوم میمنت مزلوم سرادارہ را سربلند یہا و رانی داشتند کہ علم از مکنت سلاطین پاک نہاد بلند و بالا روداد از فرش تا بہ عرش پیماید، و امراء بخانہ غرباء بایں تواضع درونی از بلند یہا بہ بلند یہا بلند تر می شوند ''نعم الامیر علی باب الفقیر'' ما ایں قدوم میمنت لزوم را ایک اثر عظیم آن علم پروری و عرفان پناہی می بینیم کہ بزرگانِ سربرآوردہ خاندانِ شاہی با مؤسسین و اکابر دارالعلوم براہِ راست علاقۂ مخصوصے می دارند و برین نعمتِ خداوندی کلمۂ پاک الحمدللہ گفتہ تشکرات لائقہ بارگاہِ خسروی تقدیم می نمائیم۔ ''اے آمدنت باعث آبادیٔ ما''

اعلیٰ حضرت معظم! ازیں عطوفات شاہانہ و روابطِ قدیمانہ و نظر بر نیات نیک اعلی حضرت ہمایونی ما اگر آرزو داریم و طمعہا کہ بدل می بندیم بجز اعتلاء مملکت افغانستان و اعلاء کلمہ اسلام دگر نیست و باللہ التوفیق مع ہذا وقت حاضریٔ این نیازمند قدیم با فغانستان در سنہ ایک ہزار و پناجہ و ہشت ہجری والاحضرت سردار محمد ہاشم خاں مرحوم صدرِ اعظم افغانستان حسب درخواست این نیازمند داخلۂ یک عدد طلبائے دارالعلوم بہ یونیورسٹی ہاء کابل برائے تعلیم السنہ یورپ منظور فرمودند لیکن جنگِ عظیم یورپ و آثار پراگندگی اش بمعمورۂ دنیا عمل این منصوبہ را معطل ساخت حالے وقت تبدیل شد و ہندوستان آزاد شدہ با فغانستان رابطۂ دوستی و خیرسگالی مستحکم می دارد کاش این منصوبہ جامعۂ عمل بپوشد و روابط قدیم عرفانی مابین این موسسۂ مرکزی دیوبند و مؤسساتِ علمی افغانستان مستحکم و مضبوط تر شوند۔

اعلیٰ حضرت معظم! ما غریبان از وسائل مدارات شایانے کہ لائقِ ذاتِ شاہانہ ہمایونی باشد تہی دامنیم بجز اعتراف تقصیر و خواست گاریہائے معافی ہیچ متاعے نہ داریم کہ تقدیم نمائیم۔ گرہمی تہی دستی را دستِ کریمانۂ شاہی قبول نماید زہے عز و شرف۔

تشکر مزید براں می نمائیم کہ اعلیٰ حضرت معظم بکرم خیلے فیاضانہ ذات عرفان پناہ موقع سپاس گذاری و تقدیم نمودن نذر عقیدت و اخلاص مرحمت فرمودند اعز اللّٰہ الامیر و ادام دولتہٗ و شوکتہٗ و نفع بہ

المسلمین اجمعین آمین

اوقاتِ گرامی شاہانہ را کافی مشغول نمودیم زیادہ جرأت نداریم و براین کلمات چند مسک ختام می کنیم کہ قدوم مبارک ذات ملوکانۂ ہمایونی بایں موسسۂ عرفانی یک باب تابناک تاریخ دار العلوم و یک اضافۂ بیش قیمت ایں تاریخ است کہ دار العلوم برآن دواماً فخر و ناز خواہد کرد و برائے ہمہ کار و رجال کار این معہدِ دینی فال نیکو خواہد ماند۔

زندہ باد اعلیٰ حضرت ہمایونی بادشاہ افغانستان و پائندہ باد دولتِ مستقلۂ خداداد افغانستان۔ و اللہ المعین.

ترجمہ : اعلیٰ حضرت معظم! آج خدام دار العلوم کی انتہائی خوش بختی ہے کہ علمائے امت اور صلحائے ملت کے اس بابرکت اجتماع میں ہم ذات شاہانۂ ہمایونی کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں اور بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ آج کا دن مرکز عرفانی کے حق میں روزِ سعید اور یوم عید سے کم نہیں ہے۔ اعلیٰ حضرت ظل سبحانی کے قدوم میمنت لزوم پر بصمیم قلب ہم جذبات تشکر و امتنان پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت معظم! اسلاف و اکابر دار العلوم دیوبند کے تاریخی اور قدیم تر مخلصانہ روابط جو ذات ملوکانۂ ہمایونی، خاندانی شاہی اور ملت نجیبۂ افغانستان سے قائم ہیں جن پر کسی بھی وقت میں زمانے کی انقلاب آفرینی موثر نہیں ہوئی اور یہ ہمیشہ مائل بہ ترقی رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم نیاز مندوں کے قلوب میں دولت افغانستان کسی بھی لحاظ سے اجنبی نہیں ہے۔

چنانچہ حریت پسندی اور استخلاص وطن کا جو جذبۂ اولین بزرگانِ دیوبند کے ذہن رسا نے پیدا کیا اس کی سب سے پہلی امید گاہ بھی افغانستان ہی بنا اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس سرہ کی اجتماعی تحریکات کا مرکزی نقطہ بھی افغانستان ہی بنا، جس کی عملی کار براری کے لئے حضرت شیخ کے خاص رفیق سیاسی اور ''مکتوب ریشمی'' کے امین ''مولانا منصور انصاری'' اور ''مولانا عبید اللہ سندھی رحمہما اللہ'' خود حضرت شیخ کے ایماء گرامی سے خاک پاک افغانستان پر ملت ہندیہ اور ملت افغانیہ کی عظیم الشان اجتماعی خدمات ایک طویل عرصہ تک انجام دیتی رہے، ان کی جدو جہد اس معہد دینی اور افغانستان کے درمیان مخلصانہ روابط قائم کرنے میں ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی روابط تھے کہ جب افغانستان کے تحت خوش بخت کو غازی اعظم شہید معظم اعلیٰ حضرت سردار محمد نادر خاں مرحوم کی مجاہدانہ مساعی نے خارجی اور داخلی انتشار انگیزیوں سے پاک اور دولت استقلال سے سرفراز کیا اور پھر ذاتِ شاہانۂ ہمایونی کی جلوہ افروزی کی عزت مندی اور

مدبرانہ رہنمائی سے مملکت افغانستان ہر شعبۂ حیات میں ترقی پذیر ہوئی۔ نیز علمی، تمدنی اور سیاسی لحاظ سے عوام کا معیارِ زندگی بلند تر اور ذات شاہانہ کی انصاف آگینی سے بلاتفریق مذہب وملت ہر ہر فرد بہرہ مند ہوا، تو مجلس شورائے دارالعلوم نے اس نیازِ مند قدیم کو عازم خاک پاک افغانستان کیا تاکہ میں ان مخلصین کی تہنیت وتبریک کا جماعتی فریضہ ادا کرتے ہوئے روابط قدیم کا استحکام اور عرفانی تعلقات کی تجدید کروں۔

اعلیٰ حضرت کی حکومت کا حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے ترجمۂ قرآن کریم اور شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی تفسیرات کو اردو سے فارسی میں منتقل کرنا نہ صرف ایک تاریخی نقش ہے بلکہ توثیق روابط کے ساتھ ملتِ اسلامیہ پر ایک عظیم احسان بھی ہے اور سلسلہ ولی اللّٰہی اور مکتب فکر قاسمی جو دیوبندی مکتب فکر کی اساس ہے ملتِ نجیبۂ افغانستان کے قلوب تک پہنچا کر ہند وافغانستان کے مابین ایک فکری یکسانیت اور علاقۂ عرفانی قائم کیا، یہ وہ زندہ وتابندہ خدمت ہے جو نسلاً بعد نسلٍ اپنے مبارک آثار کے ساتھ ہمیشہ صفحات تاریخ پر ثبت رہے گی۔

اعلیٰ حضرت معظم! یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اگر ایک جانب حکومت افغانستان کے ارباب کار کا تعاون اس دارالفنون کو حاصل رہا ہے تو دوسری جانب یہ مرکز علم بھی ملتِ افغانیہ کے بہترین افراد کی اعلیٰ اور اخلاقی تربیت کرتا رہا جو تعلیم وتدریس اور وعظ وخطابت وغیرہ کی خدمات جلیلہ کی انجام دہی میں آج بھی مصروف ہیں اور ہم خیر اندیشان ذات شاہانہ کے لئے یہ بات لائق صد شکر اور قابل افتخار ہے کہ ''جمعیۃ علماء افغانستان'' میں جو فکری لحاظ سے امور مملکت میں گہرا اثر رکھتی ہے ایک معتد بہ تعداد اسی دارالعلوم دیوبند کے ان قابل قدر فضلاء کی ہے جو اعلاء کلمۂ حق کو اپنا شعار سمجھتے ہیں، نیز یہ حقیقت ہم سے زیادہ اعلیٰ حضرت معظم پر روشن ہے کہ خانوادۂ شاہی کی سطوت وجلالت جہاں خاندانی شرافت اور مادی شوکت وقوت کی رہین منت ہے، وہیں اس کو بزرگان دیوبند کی روحانی توجہات اور مقبول ومستجاب دعائیں بھی حاصل رہی ہیں۔ اس اعلیٰ اور عرفانی اتحاد اور باہمی تعاون نے اعلیٰ حضرت معظم کے خاندان اور ملت افغانیہ کی ترقیات کو ہر ہر فرد قاسمی کے لئے خود اپنی ترقی کا مرادف بنادیا ہے۔

یہ قدیم وجدید وہ تاریخی روابط ہیں کہ جنہوں نے ذاتِ شاہانہ ہمایونی کو اس مرکز علم میں ہم غریبوں کے ساتھ جمع کر دیا ہے اور ہم بجا طور پر ع کلاہِ گوشہ مایاں بآفتاب رسید، کہہ کر پختگیٔ تعلق پر اظہار مسرت کر سکتے ہیں۔ **فللّٰہ الحمد.**

اعلیٰ حضرت معظم! ملتِ اسلامیہ ہندیہ جب گردش ایام کا شکار ہوئی تو ۱۸۵۷ء میں اس مرکز دینی کے

بانی محترم حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سرگرم عمل ہوئے اور فرنگی غارت گری کا اولاً نیزہ وشمشیر سے مقابلہ کیا اور اس کے بعد ۱۸۶۷ء میں علوم اسلامی اور جذبات حریت کی حفاظت کے لئے اس معہد علمی کی آٹھ الہامی اصولوں پر بنیاد قائم کی اور اس جذبۂ ایثار نے جو اس مرکز کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھا، اس کو شاہراہ ترقی پر گامزن کردیا۔ چنانچہ صرف ایک استاذ اور ایک شاگرد سے شروع ہونے والا مکتب وہی آج ایک عظیم مذہبی دارالفنون کی حیثیت سے اہل فکر ونظر کے سامنے ہے جس کے فیضان نے عالم اسلامی کے چپہ چپہ کو سیراب کیا اور ایشیاء اور فریقہ کے لاتعداد دیندار افراد کو ایک فکری نظام کا پابند بنادیا اور اپنی چورانوے سالہ عمر میں ہمہ گیر علمی خدمات انجام دے کر وہ بے مثال عظمت حاصل کی کہ ہندوستان کے تمام مذہبی ادارے بحیثیتِ مجموعی اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں علماء، فضلاء، مصنفین ومقررین، مناظرین و مدرسین، مفتی، قاضی، ناصح و مربی اور ارباب بیعت وارشاد پیدا کئے کہ جو تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل کر جن میں افغانستان بھی شامل ہے۔ ملّی و دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اعلیٰ حضرت معظم! اس معہد علمی کا نظام عمل جاگیروں، تجارتی سرمایوں اور حکومتی امدادوں کا مرہونِ منت نہیں ہے بلکہ عام مسلمانوں کی بابرکت عطایا پر ہی یہ اپنے نظام کو دائر رکھتا ہے جس میں متعدد ہند اور بیرون ہند کے اربابِ اقتدار، امراء اور بادشاہوں نے بھی گراں قدر حصہ لے کر اکتسابِ سعادت کیا ہے جیسے خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خاں اور سلطان محمد رشاد خامس والی ٹرکی اور جلالۃ الملک سلطان سعود والی نجد وحجاز اور عزت مآب سید انور السادات وزیر تعلیم حکومت مصر اور عالی جناب اونو دوزیر اعظم برما اور عالی جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریۂ ہند وغیرہ نے گراں بہا رقموں اور علمی ہدایا سے مختلف اوقات میں اس مرکز دینی کو تقویت بہم پہنچائی ہے۔ ان میں ذاتِ شاہانۂ ہمایونی کا عطیہ گرامی بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ جس سے صدر دروازہ دار جدید ''باب الظاہر'' کے نام سے تعمیر کیا گیا، جو ہمہ وقت اپنی عظمتوں کے ساتھ ذات ملوکانۂ ہمایونی کی یاد کو ہمارے دلوں میں زندہ رکھتا ہے۔

اعلیٰ حضرت معظم! اس مرکز دینی کا نظام کار ایک بانظم حکومت کے نظام کے مشابہ ہے جس کی حکمرانی قالبوں پر نہیں بلکہ قلوب میں ہے، اس کے تمام تر تعلیمی اور انتظامی امور کا آخری مرکز ایک مجلسِ شوریٰ ہے جو مجلسِ اعلیٰ کے نام سے موسوم ہے۔ اسی مجلسِ اعلیٰ کے تحت ادارے کے عمومی انتظامات اور قراردادوں کی تنفیذ واجرا کے لئے ایک عمومی ادارہ بنام ''ادارۂ اہتمام'' قائم ہے جو دوسو کے قریب اربابِ خدمات اور بیس انتظامی شعبوں پر بااختیار نگراں ہے اور ہر شعبہ ایک مستقل ناظم کے ماتحت مصروف کار ہے۔ ان تمام شعبہ جات میں

سب سے زیادہ اہم شعبہ ''تعلیمات'' ہے جو اس ادارہ کا روح رواں اور اس کی تمام تعلیمی مہمات ایک مجلس علمی انجام دیتی ہے۔ اس مجلس علمی کے صدر نشین حضرت اقدس مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند تھے۔ صد ہزار افسوس کہ اس مجاہد جلیل اور جامع علم و عمل نے آج تین ماہ قبل ہمیں داغِ مفارقت دیدیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ان کی ذاتِ گرامی اس اجتماع مسرت میں رونق افروز ہوتی تو رنگِ مجلس کچھ اور ہوتا۔ **رزقنا اللہ تعالیٰ امثالھم.**

اس مرکز کا سالانہ میزانیہ چھ لاکھ روپیہ ہوتا ہے اور عمارات دار العلوم کا مجموعی اندازہ ایک کروڑ روپیہ افغانی ہے۔ اس کے اساتذہ کی تعداد چالیس ہے جو اپنے مختلف مراتب علمی کے لحاظ سے صف اوّل کے علماء شمار کئے جاتے ہیں اور ہر تعلیمی سال میں ڈیڑھ ہزار کے قریب طلباء اکتساب علم کرتے ہیں جن میں سے ہر سال ڈیڑھ سو سے دو سو تک تکمیل علوم کر کے سند فضیلت حاصل کرتے ہیں، نیز ہند و بیرون ہند میں اس مرکز کی علمی شاخیں ہزاروں سے متجاوز ہیں اور جس طرح اس کے فضلاء علمی اور دینی خدمات انجام دیتے ہیں، اسی طرح سیاسی اور اجتماعی میدانوں میں بھی پیچھے نہیں ہیں اور میں اس حقیقت کے اظہار میں یقیناً حق بجانب ہوں کہ اسی جماعت نے ہندوستان میں سب سے پہلے علم آزادی بلند کیا اور ہندوستان کی دوسری اقوام کے دوش بدوش راہ آزادی میں بے مثال قربانیاں پیش کیں اور ان کا دائرہ خدمت نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلامی کو محیط ہے۔ حق تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ یہ مرکز عرفانی اپنی ہمہ گیر خدمات کے طفیل آج اس پر سر افتخار بلند کئے ہوئے ہے کہ اعلیٰ حضرت ہمایونی اپنی خاندانی غرباء نوازی اور قدیم تعلقات کا پاس فرماتے ہوئے اس مرکز کے خدام اور اساتذہ اور طلباء کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نواز رہے ہیں۔ اعلیٰ حضرت ہمایونی کا قدوم میمنت لزوم اس ادارہ کے لئے ایک تاریخی عزت ہے اور حقیقتاً سلاطین پاک نہاد کی پشت پناہی سے ہی علم سربلندیوں سے ہم کنار ہوتا ہے۔ اگر ہم اس ''نعم الامیر علیٰ باب الفقیر'' کی علمی تشریح کو علم پروری اور عرفان پناہی سے تعبیر کریں جو معززین خاندان شاہی کے اکابر دار العلوم دیوبند کے ساتھ اخلاص مندانہ تعلق پر ایک تاریخی دلیل ہے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا جس پر ہم حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے بارگاہِ خسروی میں ہدیہ تشکر و امتنان پیش کرتے ہیں۔

''اے آمدنت باعث آبادیٔ ما''

اعلیٰ حضرت معظم! ذات ملوکانۂ ہمایونی کی توجہات تاریخی تعلقات اور اعلیٰ حضرت کی نیات صالحہ کے پیش نظر ہم صرف یہی آرزو رکھتے ہیں کہ مملکت خداداد افغانستان سربلند اور اعلاء کلمۂ اسلام کے لئے توفیق یاب ہو۔

ان ہی مراسم کے واسطے سے ۱۳۵۸ھ میں اس نیاز مندی کی افغانستان حاضری کے موقع پر والا حضرت سردار محمد ہاشم خاں مرحوم نے راقم الحروف کی درخواست پر دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کی ایک محدود تعداد کو مغربی زبانوں کی تعلیم کی سہولتیں دینا منظور فرمایا تھا، لیکن یورپ کی جنگ عظیم اور عالمی پراگندگی نے اس منصوبے کو عمل سے ہم کنار نہ ہونے دیا۔ کاش آج جب کہ وہ دور ختم ہو چکا ہے اور آزاد ہندوستان آزاد افغانستان سے دوستی اور خیر سگالی کا مستحکم رشتہ قائم کئے ہوئے یہ منصوبہ جامۂ عمل پہن سکتا ہے اور اس دارالعلوم مرکزی اور افغانستان کے مراکزِ علمی کے درمیان پھر یہ عرفانی ربط تجدید پذیر ہوسکتا ہے۔

اعلیٰ حضرت معظم! ہم غرباء ذات شاہانۂ ہمایونی کے شایانِ شان مدارات سے تہی دامن ہیں۔ جس پر ہم سوائے اعتراف تقصیر اور معافی طلبی کے اور کیا عرض کر سکتے ہیں؟ اگر یہی تہی دستی بارگاہِ خسروی میں شرف قبول حاصل کرے تو زہے عزت و زہے نصیب۔

نیز ہم اعلیٰ حضرت معظم کے اس فیاضانہ کرم پر شکریۂ مزید پیش کرتے ہیں کہ ہمیں سپاس نامہ پیش کرنے کا موقع مرحمت فرمایا گیا۔ **اعز اللہ المیر و ادام دولتہٗ و شوکتہٗ و نفع بہ المسلمین اجمعین. آمین**

ہم نے نیاز مندانہ جرأت کے ساتھ ذات شاہانۂ ہمایونی کا بہت کافی وقت لیا اور اب ان کلمات پر اس عرض عقیدت کو ختم کرتے ہیں کہ "اعلیٰ حضرت ہمایونی کا ورود مسعود دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں ایک تابناک باب اور بیش قیمت اضافہ ہے جس پر دارالعلوم کو ہمیشہ ہمیشہ فخر و ناز رہے گا اور ذاتِ شاہانہ کی یہ تشریف ارزانی اس معہد دینی کے خدام کے لئے دواماً فال نیک رہے گی۔

زندہ باد اعلیٰ حضرت ہمایونی بادشاہ افغانستان پائندہ باد دولت مستقلہ خداداد افغانستان۔

محمد طیب

مدیر عمومی دارالعلوم دیوبند

وجمیع اراکین مجلس شوریٰ

۵ رشعبان ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۵ رفروری ۱۹۵۸ء

یہ سپاس نامہ ایک خوبصورت صندوقچی میں رکھ کر بذریعہ ایک ٹرے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کیا گیا، ٹرے پر دارالعلوم کی عظیم الشان عمارت دارالحدیث کا رنگین مرقع بنایا ہوا تھا۔

............❖............

مولانا ابوالکلام آزادؒ

سپاس نامہ منجانب دارالعلوم دیوبند

بہ پیش گاہ عالی مرتبت، جمع الفضائل صاحب المجد والشرف والاحضرت آنریبل مولانا ابوالکلام آزاد، وزیر تعلیمات حکومت ہند دامت معالیہم۔

جناب والا! میرا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ خوشگوار فریضہ ہے کہ میں پوری جماعت دارالعلوم دیوبند کی ترجمانی کرتے ہوئے جناب والا کا خیر مقدم کروں اور دنیائے اسلام کے اس مسلمہ مذہبی مرکز میں جناب والا کی اس پرخلوص تشریف آوری اور ہماری ناچیز درخواست کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے اس مبارک قدوم پر خوش آمدید کہنے کے ساتھ فریضۂ تشکر وامتنان بجالاؤں۔

اے آمدنت باعثِ آبادئ ما

جناب والا! ہم اپنے جلیل القدر مہمان کی ذاتی اور منصبی خصوصیات کو دیکھتے ہوئے **کیف نشکر و کیف لا نشکر** کے ذہنی عقد وحل میں تھے اور اپنے ممدوح کے حقوق مدح کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہونے میں متفکر تھے لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ ہمارے مقتدر مہمان صرف حکومت ہندوستان کے ایک اعلیٰ ذمہ دار رکن اور جلیل القدر عہدہ دار ہی نہیں بلکہ اُس سے زیادہ ہماری قوم کے ایک دردمند، زعیم اور ملت کے ایک ممتاز قومی کارکن بھی ہیں اور اس سے بھی زیادہ بوریہ نشین علماء وطلباء کہ جماعت کے ایک روشن دماغ فرد اور مفکر عالم بھی ہیں جن کا اصلی جذبہ سادگی، بے تکلفی اور رسوم سے بے نیازی کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا، ہم نے سپاس گذاری کے سلسلہ میں اپنی بے بضاعتی کے پیش نظر اسی سادگی اور بے تکلفی سے رسمی طرز تشکر کے ترک کردینے ہی کو حسب حال اور اپنے مقتدر مہمان کے شایانِ شان سمجھا۔

لا خیل عندک تھدیھا ولا مال فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

جناب والا! دیوبند کی یہ چھوٹی سی بستی جس میں دارالعلوم کی یہ وسیع عمارت کھڑی ہوئی ہے ایک نہایت

ہی قدیم اور کوردہ بستی ہے، اس بستی کی خصوصیت بجز قدامتِ سن وسال یا محل وقوع دار العلوم ہونے کے اور کچھ نہیں، یہ بستی برادرانِ وطن کی ایک بڑی تیرتھ گاہ تھی، آج بھی یہاں ایک مورتی بنام "دیوی"، جس کے نام پر یہ قصبہ "دیبی بن" سے موسوم ہوا اور کثرت استعمال سے دیوبند ہو گیا" موجود ہے جس پر سالانہ میلہ لگتا ہے۔ تقریباً چھٹی صدی ہجری سے اس میں آثار اسلام نمودار ہوئے اور تیرہویں صدی ہجری کے اواخر میں اس بستی کے ظلماتی افق پر علومِ الٰہی اور کمالاتِ ولی اللّٰہی کا آفتاب چمکا یعنی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ رُست و خیز کا ہمارے لئے ہندوستان میں اگر معنی خیز نتیجہ نکلا تو وہ دیوبند میں اس علمی درسگاہ کا قیام ہے جس کو مدارِ جماعت قطب عصر فرید دہر حضرت اقدس مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ نے بالہام الٰہی قائم فرمایا، وقت کے تمام اہل اللہ کے الہامات وبشارات اور غیبی تائیدات کی اجماعی قوت امن کے ساتھ کارفرما تھی۔

یہ دار العلوم جو اپنی ابتداء میں ایک ضعیف کونپل تھا اور آج ایک تناور درخت ہے، درحقیقت حضرت بانیؒ کے اس خواب کی تعبیر تھا کہ "وہ بیت اللہ کی چھت پر کھڑے ہوئے ہیں اور اُن کے ہاتھ پیروں کی تمام انگلیوں سے پانی کی نہریں اطراف عالم میں جاری ہیں" اور دار العلوم کے مہتمم اول حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ اجل خلفاء حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلوی قدس سرہٗ کے اس رویا کی تاویل تھا کہ "علوم کی کنجی میرے ہاتھ میں دیدی گئی ہے" اور حضرت سید احمد شہید قدس سرہٗ کے اس مکاشفہ کی تصدیق تھا کہ "مجھے یہاں سے علم نبوت کی بو آرہی ہے" (جبکہ وہ جہاد پنجاب پر جاتے ہوئے دیوبند کے اس مقام سے گذرے جہاں دار العلوم کی عمارت کھڑی ہوئی ہے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے اس مقولہ کی تفسیر تھا کہ "مجھے یہاں علم نبوت کے آثار محسوس ہورہے ہیں" (جب کہ وہ ادھر سے گذرے) اور حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی قدس سرہٗ شیخ الشیخ حضرت بانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس الہام کی محسوس تصویر تھا کہ فقیر نے ایسی ہانڈ پکائی جو نہ سو برس پہلے پکی ہے نہ سو برس بعد میں پکے گی۔ بہرحال اس معہد دینی کی تاسیس عام مروجہ طریقہ کے فکری یا خیالاتی مشوروں کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اشارات غیب کے ماتحت ایک حقیقت ثابتہ کا ظہور تھی۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جب کہ داخلی اور خارجی فتنے اپنے تمام ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اُس قوم کے مقابلہ پر صف آرا تھے جس کے سر سے چھپر اتر چکا تھا اور پیر کے تلے سے زمین بھی نکل چکی تھی، وقت کے نبض شناسوں نے اپنی فراستِ ایمانی سے محسوس کر لیا تھا کہ آج کی یہ علمی بے مائیگی، اخلاقی تنگ دستی اور اجتماعی بے حسی بغیر ایک ایسے جامع تربیتی ادارہ کے قیام کے رفع نہیں ہو سکتی جس میں علم، اخلاق اور اجتماعیت سے مخلوط پروگرام سے قوم کے نونہالوں کو تربیت دی جائے اور ان کے دل و دماغ کو ایک ایسی

جامعیت پر اٹھا دیا جائے کہ نہ وہ کسی ایک جانب کے غلو میں گرفتار ہوں اور نہ کسی سمت سے خلو کے شکار ہوں، جدید حالات میں افرنجیت سے گھائل ہوں اور نہ وقت کے جدید تقاضوں سے بے خبر اور غافل ہوں، اُن میں جرأت وحق گوئی کا بلند پایہ جذبہ بھی ہو اور ساتھ ہی تواضع للہ اور ادب واحترام کا جوہر بھی ہو، اُن کی زندگی اگر ایک طرف بوریہ نشینی کے ساتھ درس کتاب وسنت اور خلوت نشینی کے ساتھ ذکر اللہ اور تزکیۂ نفس میں گزرے تو دوسری طرف سرفروشی اور جاں بازی کے ساتھ قومی جدوجہد کا اسٹیج بھی ان سے خالی نہ رہے، چنانچہ ان ہی بنیادوں پر یہ ادارہ تعمیر ہوا اور اُس کے آغاز ہی سے ان مقاصد کا بھی عملی آغاز ہو گیا، حضرت بانی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات ہی میں جہاں اُس کے احاطہ سے قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں بلند ہونی شروع ہوئیں وہیں خود بانی نے اسی صحن دارالعلوم میں جہاں ہمارے مہمان عزیز تشریف فرما ہیں طلبہ کو فن سپہ گری کی عملی مشق بھی شروع کرائی اور ساتھ ہی ملت کے جذبۂ خود استقلالی کو برقرار رکھنے کے لئے ایک محکمۂ قضا بھی قائم فرمایا جس کے قاضی اسی دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہٗ بنائے گئے، اسی تربیت گاہ کے احاطوں میں ملک کی آزادی کے جذبات وافکار کے تذکرے بھی ان بانیوں کی زبانوں پر رہتے تھے، آزادی وطن کی پیشین گوئیاں بی انتہائی آرزو کے ساتھ کی جاتی تھیں، یہیں ان کے مذکور الصدر صدر مدرس مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے آج سے تقریباً ۹۰ برس پیشتر پیشین گوئی فرمائی تھی کہ ہندوستان میں پرامن طریقہ پر انقلاب آئے گا، لوگ سوئیں گے انگریزوں کی حکومت میں اور صبح کریں گے دوسری حکومت میں۔ گویا انقلاب کی گھڑیاں شب کی ساعتیں ہوں گی، عجیب بات ہے کہ انقلاب نے رات ہی کے وقت جنم لیا اور ہم نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ۱۹۴۷ء کے اگست کی پندرہویں شب میں آزاد الہلال کی تحریک، ترک موالات، گاندھی جی کی تحریک عدم تشدد اور حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک آزادیٔ ہند کی صورت میں برآمد ہوا اور جو لوگ انگریزی اقتدار میں شب کو سوئے تھے، وہ اُس کے زوال پر صبح کو جاگے۔

اسی لئے یہ تربیت گاہ جہاں علم واخلاق کے مربیوں کا گہوارہ بنی ہیں وہ اس ملک کی سیاسی زندگی میں رضا کارانِ حریت واستقلال کا ایک مضبوط قلعہ بھی ثابت ہوئی، جو درحقیقت بانیوں کے جامع فکر وعمل کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ جہاد آزادی کے سلسلہ میں یہ اسلاف کرام، قوتِ علم واخلاق اور جذبۂ آزادی واستخلاص کا بیک وقت مجموعہ تھے اور بوریہ نشینی کے ساتھ ساتھ زیب میدان بھی ہوئے، تلواریں بھی اٹھائیں، قلم سے بھی کام لیا، اُس پر قید وبند کی سزائیں بھی بھگتیں، جلاوطنی کی مصیبتیں بھی مول لیں اور وہ سب کچھ قبول کیا جو

ایک سرفروش کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہجرت فرمائی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ نے چھ ماہ کی جیل بھگتی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ وارنٹوں کی کثرت سے ایک عرصہ تک روپوش رہے، اُن کے تلمیذ خاص حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے پانچ برس مالٹا کی نظر بندی میں بسر کئے، شیخ الہند کے تلمیذ خاص حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اپنے برگزیدہ استاذ کی معیت میں پانچ برس اسیر مالٹا رہے، پھراسی جذبۂ آزادی کے جرم میں دو برس کراچی جیل میں رہے، دو برس مراد آباد جیل میں بسر کئے اوراس کے علاوہ بھی کئی کئی بار اسیریٔ فرنگ سے دوچار ہوتے رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے دوسرے جاں باز تلمیذ مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی دام مجدہٗ دومرتبہ ملتان جیل میں رکھے گئے، پھر کتنے ہی فضلاء دیوبند نے جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے اپنے اسلاف کے نقش قدم پر قید و بند کی سزائیں بھگتیں مگر قومی خودداری اور ملکی خود اختیاری کے جذبات کی بے آبروئی گوارہ نہیں کی۔

ان اسلاف واخلاف نے اُس وقت بھی آزادی کے تصورات کو دماغوں سے محو نہیں ہونے دیا، بلکہ ۱۸۵۷ء کے بعد وفاداریوں کے بڑھتے ہوئے جذبات کے ہجوم میں قرآن کریم کی بہت سی گرم جوش آیات کو مصحف سے نکال ڈالنے کے مسوّدے پیش کئے جارہے تھے، البتہ جہاں تک اس تعلیم گاہ کے احاطہ کا تعلق ہے اس میں امور تعلیمیہ کے غلبہ کو ہمیشہ اور ہمہ وقت ضروری سمجھا گیا اور اُس کی سیاسی پالیسی میں بھی اعتدال اور غیر جانبداری قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے اس احاطہ کی قومی خدمات، سیاسی گرہ بندیوں اور پولٹیکل کشمکش سے الگ رہ کراپنے ہی جادۂ اعتدال پر قائم رہیں اور ملک کی عام سیاسی پارٹیوں اور جماعتوں کو اُس سے ہمدردی قائم رکھنے میں کوئی خاص مانع پیش نہیں آیا۔

جناب والا! دارالعلوم کے اس علمی اوراجتماعی مسلک کو بروئے کار لانے کے لئے اُس کا وسیع نظام بیس شعبوں تعلیم، تبلیغ، افتاء، نشر واشاعت (رسالہ) کتب خانہ، محاسبی، اوقاف، تعمیرات، تنظیم ابنائے قدیم، مالیات، مطبخ، صفائی، ورزش، صنعت وحرفت، احتساب و دارالاقامہ، خوش خطی، محافظ خانہ، طب، جمعیۃ الطلبہ، بجلی اور مرکزی دفتر ادارۂ اہتمام پر مشتمل ہے، جس میں دوسو سے زائد کا عملہ کام کرتا ہے، ہر سال ہزار ڈیڑھ ہزار طلبہ کا اجتماع ہندو بیرون ہند سے ہوتا ہے، اُن کے لئے چالیس قابل اساتذہ کار تعلیم انجام دیتے ہیں، اس کے مالیہ کا میزانیہ تین ساڑھے تین لاکھ تک ہوتا ہے اوراس کے زیر اثر فروعی مدارس جو اسی کے نقش قدم پر چلتے ہیں ہندو بیرون ہند میں کثیر تعداد میں قائم ہیں جن میں فضلاء دیوبند عموماً علمی اور اصلاحی

کام کرتے ہیں، اس کے مستخرج بہت بڑی تعداد میں میدان صحافت، افتاء، تبلیغ اور دوسرے دینی، سیاسی شعبوں میں کام کررہے ہیں، اس علمی سلسلہ میں بھی اس کے امام وقدوہ وہی اکابر ہیں جو اس کے اجتماعی سلسلہ کے ائمہ ہیں۔ اندازِ فکر ونظر ولی اللہی ہے، انداز استدلال و بیان قاسمی ہے اور انداز سعی وعمل رشیدی ہے۔ اولین سرچشمہ علم واجتماع شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ ہیں۔ اداری دور میں ادارہ کے اولین امام حضرت قاسمؒ و رشیدؒ ہیں اور ان دونوں بزرگوں کے مذاق اور علم واجتماع کا نقطۂ اجتماع حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ ہیں۔ یہ سارا نظام حسب وصیت بانی عام چندوں اور غرباء ومتوسطین کے عطیات پر چل رہا ہے۔ امراء، جاگیرداروں، نوابوں اور حکمرانوں کی طرف کوئی خاص عنان توجہ منعطف نہیں کی گئی، گویا آج سے ۹۰ ربرس پیشتر بانی کی فراست ایمانی نے رابطۂ عوام کے اصول کو اس ادارہ کی اساس بنادیا تھا، جس کی آج کے دستوری دور میں پوری دنیا نے ضرورت محسوس کرلی ہے۔

جناب والا! ہمیں خوشی ہے کہ آج ہم اس علمی واجتماعی ادارہ میں اُس ذات گرامی کو دیکھ رہے ہیں جن کی خود اپنی علمی، ادبی، سیاسی اور اجتماعی خدمات بھی ایک مجموعی ادارہ کی خدمات سے کم نہیں ہیں اور دنیا اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ جناب والا کی ادبی خدمات نے ادبی دنیا میں علمی خدمات نے علم میں اور سیاسی خدمات نے دنیائے سیاست میں نمایاں انقلاب پیدا کیا ہے۔ علمی مقالات نے بیش بہا قیمت، علمی جواہر پاروں کا سفینوں اور سفینوں سے سینوں میں اضافہ کیا ہے اور سیاسی رہنمائی اور خدمات نے انتہائی صبر آزما اور کٹھن منزلوں سے گذر کر ہندوستانی ملت کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ الہلال اور البلاغ کی آواز نے سوتی ہوئی ملت کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا ہے اور اب مرکزی وزارت تعلیم کے منصب جلیل پر فائز ہونے کے بعد ملک و ملت کی جو سنہری خدمات انجام دی ہیں انہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

جناب والا! ذات گرامی کا تعلق اس دارالعلوم سے اور جماعت دارالعلوم کا رابطہ ذات والا سے نیا نہیں بلکہ روایتی ہے۔ ہمیں وہ وقت یاد ہے کہ ۱۹۱۲ء میں جب کہ الہلال کی صدائے آزادئ ملک وملت فضاء ہند میں گونج رہی تھی اور اس کی روح رفتہ رفتہ مردہ اجسام میں سرایت کررہی تی۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اُس کے پرچوں کو ذوق وشوق سے بھری مجلس میں پڑھواتے اور سنتے اور سنواتے تھے۔ ہم طلبہ اس طرز عمل سے متاثر ہوکر ان پرچوں کو جمع کرتے اور اُن کے رنگ وبو سے فکر وعمل کو معطر کرنے کی سعی کرتے تھے اور اس طرح الہلال مستفیدین کے اندر گھس کر اس کے فاضل مدیر کے ساتھ ایک باطنی اور غیر محسوس رشتہ جوڑ رہا تھا۔ یہ ایک رشتہ تھا جو آج سے چالیس پینتالیس برس پیشتر ہمارے اور ہمارے مقتدر مہمان کے درمیان

میں قائم ہوا۔ پھر تحریک خلافت کے اشتراک عمل نے اسے مضبوط کیا اور بالآخر جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے پر اس نے ایک مضبوط، رسمی صورت بھی اختیار کرلی، جس کی بدولت آج تک سے قومی اوراق باہم مربوط ہیں۔

پھر یہ تعلق سیاسی حد تک ہی نہیں رہا، بلکہ ہمیں صمیمانہ اعتراف ہے کہ اُس نے وقتاً فوقتاً مختلف اندازوں سے دارالعلوم کی اعانتوں اور خدمتوں کی صورت بھی اختیار کی ہے۔ صوبۂ یوپی کے علمی نصاب کی تدوین وترتیب کے سلسلہ میں جناب والا نے ذمہ داران دارالعلوم کو شرکت اور خدمت کا موقع عنایت فرمایا۔ ریاست حیدرآباد دکن کی امداد کی بقاء کے سلسلہ میں دارالعلوم کی پوری اعانت و ہمدردی فرمائی۔ پاکستان کی طرف سے آنے والے طلبہ کے لئے پرمٹ کی سہولت دیئے جانے کے بارے میں دارالعلوم کی تحریک کو کامیاب بنایا وغیرہ۔ ان قدیم وجدید تعلقات کی بناء پر ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے مقتدر مہمان اپنوں میں آئے ہیں اور اپنے گھر آئے ہیں ۔ بیا بیا وفرود کہ خانہ خانۂ تست۔

اور اسی بنا پر ہم یہ توقع رکھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مستقبل میں جناب والا دارالعلوم کو اپنا اور خالص اپنا سمجھیں اور اسی اتحاد بینی کے سلسلہ میں ذات گرامی کی آمد و رفت ضابطوں سے بھی بے نیاز ہوجائے، ان ہی مراسم اخلاص کے ماتحت ہم امید کرتے ہیں کہ ماضی کی ان اخلاقی اعانتوں کی طرح جناب والا مستقبل میں بھی اس مرکز کی بقاء وترقی سے مخصوص دلچسپی لیتے رہیں گے۔ آج متعدد مدرسین دارالعلوم پاکستان میں رُکے ہوئے ہیں جن کی افادیت محدود ہوکر رہ گئی ہے، ان کے آنے اور سال بہ سال تعطیلات میں وطن جانے کا مسئلہ گورنمنٹ کی اخلاقی اعانت کا محتاج ہے۔ دارالعلوم کو حکومت کی تسلیم کردہ یونیورسٹی بنانے اور حیثیات ومعاملات میں اُس کے ساتھ مسلمہ یونیورسٹیوں جیسا برتاؤ کرنے کا مسئلہ اٹھا ہوا ہے۔ دارالعلوم کی سند فراغ کو بی اے، ایم اے کی ڈگریوں کے برابر سمجھے جانے، منظور کرنے اور متعلقہ حقوق عطا کئے جانے کا مسئلہ بھی حکومت میں پیش شدہ ہے۔ دارالعلوم کے شعبہ طب کو خصوصیت سے منظور کئے جانے اور اُس سے فارغ شدہ مستند اطباء کو سرکاری طور پر مجاز مطب کئے جانے کا مسئلہ بھی اٹھا ہوا ہے اور چل رہا ہے۔ دارالعلوم میں ایک خیراتی اسپتال کھولے جانے، مفت علاج کئے جانے کے بارے میں گورنمنٹ کی موجودہ اعانتوں کا مطالبہ مسلموں اور کاغذات میں آیا ہوا ہے۔ اگر یہ تمام مسائل حل ہوجائیں تو دارالعلوم کی افادیت میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوجائے گا یہ اور اسی قسم کے اور مسائل جو آئندہ پیش آئیں جہاں گورنمنٹ کی اخلاقی اعانت کے محتاج ہیں وہیں بحیثیت ایک تعلیم گاہ کے مسائل ہونے کے جناب والا

کی منصبی توجہات کے خصوصیت سے محتاج ہیں۔

دارالعلوم کی امتیازی خصوصیات عرض کرنے اور ذات والا کی امتیازی خدمات کے اعتراف کرنے کے بعد اب میں جناب والا کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا اور اس عرض داشت کو جو بطور سپاس نامہ پیش کی جارہی ہے مکرر شکریہ قدوم اور اس اعتراف پر ختم کرتا ہوں کہ ہم غرباء ذات گرامی کے شایانِ شان نہ حق میز بانی ادا کر سکے ہیں اور نہ احترامات کے وظائف واجبہ ہی پورے کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمارا سب سے بڑا وظیفہ یہ دعاء ہے کہ حق تعالیٰ ذات گرامی کو بایں عز و وقار قائم رکھ کر قوم کے لئے بھرپور نافع اور مفتاح خیر بنائے اور ذات والا کا حسن تدبر وقت کی گھتیوں کو سلجھانے اور ملک کی عام بے چینیوں کو رفع کرنے میں مؤثر ثابت ہو۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد!

میں آپ کا مخلص

محمد طیب غفرلہٗ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲۹؍ربیع الاول ۱۳۷۰ھ، یوم دوشنبہ

............❖............

ڈاکٹر راجندر پرساد

سپاس نامہ منجانب دارالعلوم دیوبند

بہ عالی خدمت گرامی مرتبت والاشان عالی جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب

صدر جمہوریہ ہند بالقابہ العالیہ

جناب والا! دارالعلوم دیوبند میں قدم رنجہ فرمائی کا یہ نیک دن جماعت دارالعلوم کی سرزمین تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے، مسرت وانبساط کے ان لمحات میں پوری ''جماعت دارالعلوم دیوبند'' کی جانب سے میں ایک خوشگوارترین فریضہ ادا کرتے ہوئے جناب والا کو خوش آمدید کہہ رہا ہوں۔ ''اے آمدنت باعثِ خوش وقتی ما'

جناب والا! ہم حیران ہیں کہ صدر وطن کی شاندار اور باوقار منصبی خصوصیات کے خیر مقدم کے لئے کن وسیع اور وقیع الفاظ میں سپاس گذار ہوں، لیکن یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمارے مقتدر اور محترم مہمان صرف حکومت ہند کی منصبی عظمتوں ہی کے حامل نہیں بلکہ قوم وملت کے ایک دردمند لیڈر اور بااخلاص ممتاز قومی کارکن بھی ہیں جن کی زندگی ملک وقوم کے لئے ایثار، قربانی اور جفاکشی کی زندہ تاریخ اور سبق آموز مثال ہے۔

جنابِ محترم! آپ کی سادگی، بے تکلفی اور رسمی تکلفات سے بے نیازی کی شاندار ماضی ہمیں حوصلہ دلا رہی ہے کہ ہم رسمی طرز تشکر کو ترک کر کے حقیقی اخلاص ومحبت کے ساتھ اپنے جلیل القدر مہمان کا بے تکلف استقبال کریں، اس لئے ہم نہایت خلوص کے ساتھ جناب والا کی خدمت میں اپنی نیک آرزوؤں اور جذبات مسرت وانبساط کا ہدیہ اخلاص پیش کررہے ہیں۔

گر قبول افتد زہے عز وشرف

قصبہ دیوبند

جناب والا! دیوبند کی مختصر سی بستی بہت ہی قدیم ہے، دو ہزار سال سے بھی پہلے تک اس کی آبادی کا پتہ

چلتا ہے، یہاں برادرانِ وطن کی ایک قدیم تیرتھ گاہ ''سندری دیوی'' کا مندر بھی ہے جس پر ہر سال چیت کے مہینہ میں ایک شاندار میلہ لگتا ہے، آج اس بستی کی سب سے بڑی خصوصیت جس نے اسے عالمگیر شہرت وعظمت دے رکھی ہے یہ ''دارالعلوم دیوبند'' ہے جس میں اس وقت آپ جیسی ہندوستان کی ایک عظیم وجلیل ہستی تشریف فرما ہیں۔

دارالعلوم اور جذبۂ آزادی

جناب والا! جس ادارہ میں اس وقت جنابِ محترم رونق افروز ہیں اس کا قیام آج سے نوّے برس قبل ۱۸۶۸ء/۱۲۸۳ھ میں ایک چھوٹی سی درسگاہ کی صورت میں عمل میں آیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں فرنگی اقتدار کو زیروزبر کرنے کی خونیں جدوجہد میں بزرگانِ دارالعلوم کی پیش روی آزادیٔ ملت اور استخلاص وطن کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ شاملی ضلع مظفرنگر میں انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جنگ اکابر دارالعلوم ہی کے زیرِسرکردگی لڑی گئی۔ اگرچہ یہ خواب اس وقت شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا لیکن حریت واستقلال وطن کے اس جذبۂ بے پناہ کو دلوں میں زندہ وتابندہ رکھنے کے لئے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنے بزرگوں اور اپنے ساتھیوں کے تعاون سے یہ عظیم مرکز ۱۸۶۶ء میں قائم کیا جس نے اپنی ۹۱ ویں سالگرہ کی شاندار علمی واخلاقی ماضی میں حریت ملّی اور وطن دوستی کے مقدس جذبہ کو تاریخ کے ہر موڑ پر جان کی بازی لگا کر باقی رکھا ہے۔ ۱۸۸۵ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی تو اس مرکز کے بزرگوں نے اس کی حمایت و تائید میں فتویٰ صادر کیا، پھر ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد جب آزادی کی مشترک جدوجہد شروع ہوئی تو دارالعلوم کی جماعت بھی اسی اشتراک اور تعاون کے راستہ، آزادی اور استخلاص وطن کی جدوجہد میں مصروف ہوگئی اور دارالعلوم کے سربرآوردہ بزرگ جو اب تک جہاد آزادی کے دوسرے راستوں پر چل کر قید و بند اور جلاوطنی کی مصیبتیں اٹھارہے تھے بیک طرف انہوں نے علماء ہند کے اشتراک وتعاون سے جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد رکھی اور دوسری جانب کانگریس کے قومی پلیٹ فارم پر پہنچ کر جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی وہ تعبیر ہے جس کا خواب بانیانِ دارالعلوم بہت پہلے دیکھ چکے تھے اور جس کے لئے قربانیوں کا سلسلہ اس سے بھی پہلے سے جاری تھا۔

جناب والا! جنگ آزادی کی تاریخ سے واقف کوئی شخص اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہے کہ اس طویل اور صبر آزما جدوجہد میں علمائے دارالعلوم کا ایک خاص امتیازی مقام ہے ''دارورسن'' پر جاں سپاری، قید وبند کی بے کسی اور جلاوطنی کی المناک صعوبتوں کو محض استخلاص ملک وملت کے لئے اس جماعت نے لبیک کہا

ہے۔ حافظ محمد ضامن صاحب مرحوم کی شہادت، حضرت حاجی امداد اللہؒ کی ہجرت، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی قید و بند، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے وارنٹ گرفتاری اور برداشت مصائب، مولانا منصور انصاریؒ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی جلاوطنی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی مالٹا میں نظر بندی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی اسارت مالٹا کراچی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم سابق صدر جمعیۃ علماء ہند اور مولانا احمد سعیدؒ کی اسارت ملتان، مولانا حفظ الرحمٰن ناظمِ اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند کی طویل اسارت اور اس دور کے سینکڑوں سے متجاوز فضلاء دارالعلوم دیوبند کی قید و بند گونا گوں مصائب اور قربانیوں کے عظیم واقعات کو تاریخ نظر انداز نہیں کر سکتی جو دارالعلوم کے بانیوں اور اس کے اساتذہ ہی کی تعلیم و تربیت کے روشن نشانات ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے مقاصد اور اس کی خصوصیات

جناب والا! آپ ایک فاضل تاریخ داں اور سیاسی مفکر کی حیثیت سے بخوبی واقف ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی تمام ناکامیوں اور ہولناک مصیبتوں کے بعد بھی محبان وطن اور فدایانِ ملک و ملّت کے حوصلے پست نہیں ہوئے، ان ناامیدیوں میں بھی امید کی کرن سامنے تھی اور کشت زار غور و فکر میں ایک تعمیری شعور جنم لے رہا تھا۔ دارالعلوم کے بانی ان ہی باہمت بزرگوں میں سے تھے جنہوں نے چٹان بن کر اس طوفان کا مقابلہ کیا اور جیسے ہی یہ سیلاب پایاب ہوا انہوں نے تمام حالات کا جائزہ لے کر طے کیا کہ ملک کی ناکامیوں کا رخ بدلنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک روح کی حفاظت، دوسرے تعمیری رجحان اس لئے کہ جو قوم روحانیت پر ایمان رکھتی ہے اور اپنی روح بیدار رکھ سکتی ہے وہ خدا کی مدد سے اپنے حالات میں ایک تعمیری انقلاب لاسکتی ہے۔ یہ دارالعلوم اسی تعمیری انقلاب کا نمونہ ہے۔ اس عظیم ادارے کی بنیاد جن اصولوں پر قائم ہے وہ مختصر سے مختصر الفاظ میں یہ ہیں:

(۱) ایک قوم کے لئے سب سے پہلی چیز خدا پر بھروسہ (توکل علی اللہ) ہے، ہر بڑے نصب العین کے لئے یہی ایک بڑا سرمایہ ہے۔ دارالعلوم کا پہلا بجٹ نوے سال پہلے چار سو روپئے پر مشتمل تھا، آج ساڑھے پانچ لاکھ ہے، یہ سب اسی توکل علی اللہ کا نتیجہ ہے۔

(۲) تعلیم اور تعمیر جیسے نصب العین کے لئے اجتماعی جدوجہد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، عوام کی مشترک محنت سے جو کام کیا جائے گا اس میں خیر و برکت بھی ہوگی اور قبول عام بھی حاصل ہوگا، یہ دارالعلوم اجتماعی جدوجہد کا پہلا نمونہ ہے۔

(۳) تعلیم انگریزی ہو یا عربی، دنیاوی ہو یا دینی، مادی زبان میں دی جائے، دارالعلوم نے اس اصول کونوّے سال پہلے تجربہ کی کسوٹی پر پرکھا اور کامیاب ہوا اور نہ صرف یہ کہ اس تجربے کی بدولت اردو بولنے والے طلباء کی بہت سی مشکلیں آسان ہوگئیں بلکہ عجیب وغریب بات یہ ہے کہ اردو براعظم ایشیاء اور افریقہ وغیرہ کے ان تمام ممالک میں پہنچ گئی جو اس دارالعلوم سے علمی اور روحانی رابطہ رکھتے ہیں۔ تیسرے سال کی بات ہے جب ہمارے ملک کے وزیراعظم پنڈت نہرو روس کا دورہ کرتے ہوئے تاشقند پہنچے تو وہاں اُن کو سپاس نامہ اردو میں پیش کیا گیا اور اردو میں ہی پنڈت جی نے اس کا جواب دیا، یہ سپاس نامہ پیش کرنے والے اسی دارالعلوم کے فاضل ایک تاجیک عالم تھے، غالبًا اسی سال چینی حجاج کا وفد ہندوستان آیا، اس کا خیر مقدم مسلمانوں سے زیادہ آپ کی وسیع المشرب حکومت نے کیا، ہندوستانیوں کے سامنے ہندوستانی زبان میں ان کا تعارف کرانے والے اسی وفد کے ایک رکن مولانا حامد احمد چینی تھے جو بیس سال پہلے اسی دارالعلوم میں تعلیم پا رہے تھے۔

(۴) تعلیم کو آزاد ہونا چاہئے، یہ ہے وہ اصول جس کی بنا پر دارالعلوم ایک آزاد تعلیمی ادارے کی حیثیت سے کام کر رہا ہے، یہ ادارہ دارالعلوم اس وقت بھی آزاد تھا جب ملک غلام تھا، ملک کی آزادی کے لئے اس دارالعلوم کی تاریخی خدمات اسی عظیم اصول کا نتیجہ ہیں، جس پر دنیا کے تعلیمی ماہرین آج پہنچ رہے ہیں۔

(۵) استاذ کو شاگرد سے بہت قریب اور اس کے دکھ درد کا شریک رہنا چاہئے، تاکہ تعلیم کے ساتھ تربیت بھی ہوتی رہے اور طلباء کی شخصیت اس سانچے میں ڈھل سکے جو اس تعلیم کا مقصد ہو، یہ ہے دارالعلوم کا وہ پرانا اصول جس کی برتری، بہتری اور کامیابی کے اعتراف پر آج کے ماہرین تعلیم جدید مجبور ہو رہے ہیں۔

(۵) تعلیم بے قیمت اور فری ہونی چاہئے، غالبًا یہ دارالعلوم دنیا کی واحد درسگاہ ہے جو اکیانوے سال سے تمام طلباء کو فری تعلیم دے رہا ہے اور ان کے جملہ اخراجات حتی کہ کورس کی کتابوں کا خرچہ بھی برداشت کر رہا ہے۔

(۷) سادگی، صفائی، جفاکشی اور محنت پسندی یہ وہ اصول ہیں جو اس دارالعلوم کے بزرگوں کے خاص شعار ہیں، یہاں اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنا عیب نہیں بلکہ ایک تہذیبی خوبی ہے، اسی اصول کی برکت سے کم سے کم اخراجات کے نتیجے میں بہتر سے بہتر علماء قومی اور ملی خدمت کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دے چکے اور دے رہے ہیں۔

(۸) علم خود ایک مقصد ہے، اس کو اگر واسطہ بنایا جا سکتا ہے تو صرف تکمیل روح اور تعمیر انسانیت کا کسی

مادی مقصد کے لئے اس کو واسطہ بنانا علم کی توہین ہے، یہ دارالعلوم کا وہ مقدس اصول ہے جس کی بنا پر اس نے کبھی پسند نہیں کیا کہ اس کی سند سرکاری ملازمتوں کا ذریعہ بنائی جائے۔

(۹) علم ایک دریا ہے جس کی فطرت بخل کو برداشت نہیں کرسکتی، دارالعلوم کا یہی مسلک ہے جس کی بنا پر نہ صرف مسلمان بلکہ علم دوست برادرانِ وطن کی ہمدردیاں بھی اس ادارے کے ساتھ وابستہ رہی ہیں، انتہا یہ ہے کہ جب تک فارسی نے اپنی پرانی دلچسپی اور مقبولیت ختم نہیں کی تھی تو مسلمان بچوں کے ساتھ ہندو بچے بھی اس کے درجات فارسی سے فیضیاب ہوتے تھے۔

جناب والا! دارالعلوم کے یہی مقاصد ہیں جن کی وجہ سے وہ تمام مادّی ذرائع اور وسائل کے فقدان کے باوجود ترقی کی شاہراہ پر تیزی سے قدم بڑھاتا رہا، یہاں تک کہ صرف ایک استاذ اور ایک شاگرد سے وجود پذیر ہونے والا مکتب آج یہ عظیم الشان جامعہ ہے جس میں ہندو پاکستان کے علاوہ ایران، افغانستان، تبت، چینی ترکستان، روسی ترکستان، کنکیانگ، برما، انڈونیشیا، سیلون اور افریقہ وغیرہ کے طلبا بھی علمی پیاس بجھا رہے ہیں اور دارالعلوم ان طلبا کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ایک بین الاقوامی بستی بنا ہوا ہے۔ **فللّٰہ الحمد**

تعداد طلبہ اور مختلف شعبہ جات

جناب والا! دارالعلوم اپنے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آج ڈیڑھ ہزار طلبہ، چالیس سے زائد اساتذہ اور ڈیڑھ سو سے زائد اسٹاف پر مشتمل ہے، اس کا نظم اٹھارہ انتظامی شعبوں، تعلیم، افتاء، نشر و اشاعت، صنعت و حرفت، طب، کتابت، محافظ خانہ، دارالاقامہ، تنظیم، اوقاف، کتب خانہ، تعمیرات، مطبخ، صفائی روشنی، محاسبی اور مرکزی ادارہ، ادارۂ اہتمام پر مشتمل ہے۔ دارالعلوم کا سالانہ بجٹ ساڑھے پانچ لاکھ روپئے ہے جو عام قومی چندوں سے پورا ہوتا ہے، طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی اور تمام طلبہ کو بلاتخصیص کتابیں اور دارالاقامہ میں رہنے کی جگہ اور طبی امداد مفت مہیا کی جاتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند اور آزاد جمہوریہ ہند

جناب والا! انقلاب ۴۷ء کے بعد سے لے کر آج تک حکومتِ ہند نے ہمیشہ دارالعلوم کے معاملات سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور گورنمنٹ کا اخلاقی تعاون ہمیشہ دارالعلوم کو حاصل رہا ہے، ہمیں توقع ہے کہ حکومت ہند اور اس قومی ادارے کے درمیان جس نے حکومت کی تاسیس میں اہم پارٹ ادا کیا ہے یہ خوش اعتمادی اور معاونت باہمی ترقی پذیر رہے گی۔

چند مسائل

جناب والا! جب دارالعلوم دیوبند جمہوریۂ ہند کا ایک جز ہے تو قدرتی طور پر ایسے مسائل سے بھی واسطہ پڑتا رہے گا جو حکومت کے تعاون کے بغیر حل نہیں ہو سکتے، آج بھی اس قسم کے چند امور پیش ہیں، مثلاً پاکستان سے دارالعلوم میں بغرضِ تعلیم آنے والے طلبہ کی آمد و رفت اور قیام میں خاص سہولت کا مسئلہ وہاں سے طلبہ اساتذہ کا بہ سلسلہ درس و تدریس جہاں قیام پاکستان برما وغیرہ ممالک سے حاصل شدہ امدادوں کی ہندوستان میں منتقلی، دارالعلوم کے دائرۂ طب کے فضلاء کا سرکاری طور پر مجاز مطب قرار دیا جانا، دارالعلوم کے فاضلوں کا علوم مشرقیہ کی ریسرچ اور علمی تجربات کے لئے بیرون ہند جانے آنے اور سفر کی سہولتیں بہم پہنچانے کا مرحلہ، دارالعلوم میں ہسپتال اور ایک عظیم لائبریری کی تعمیر کا منصوبہ، حفظانِ صحت اور صفائی کے سلسلہ میں پانی کے بہاؤ کا مناسب راستہ وغیرہ وغیرہ، یہ مسائل ہیں کہ جناب والا کی ترقی پذیر حکومت کی تعمیر پسند پالیسی کے تحت بآسانی حل ہو سکتے ہیں اور ہم پر امید ہیں کہ جس طرح اب تک سہولتیں، ہمدردیاں اور اخلاقی امدادیں حاصل ہوتی رہی ہیں ہم آئندہ بھی ان سہولتوں اور اخلاقی امدادوں کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے رہیں گے۔

جناب والا! ہم تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مزید شکر گذار ہیں کہ جناب نے وقت کی فیاضی فرما کر ہمیں سپاس گذار ہونے کا موقع دیا، اب اس سے زیادہ وقت لینا جرأتِ بے باکانہ ہے۔ مزید شکریہ ادا کرتے ہوئے اس حقیقت کے اظہار کی اجازت چاہتا ہوں کہ جناب والا کی یہ قدم رنجہ فرمائی دارالعلوم کی تاریخ کا ایک تابناک نقش ہے جس پر دارالعلوم کو ہمیشہ فخر رہے گا۔

سپاس گذار

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

از جانب ارکانِ مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

۱۴؍ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۳؍جولائی ۱۹۵۷ء

............❖............

سپاس نامہ

پروفیسر ہمایوں کبیر

بخدمت عالی قدر محترم مسٹر ہمایوں کبیر صاحب، وزیر ثقافتی امور و سائنسی تحقیقات ہندیونین

عالی قدر محترم! ہماری آرزوؤں میں بہترین آرزو یہ تھی کہ برعظیم ایشیاء کے اس تاریخی اور تعلیمی مرکز میں جناب والا تشریف لائیں اوران کاموں اور کارناموں کو دیکھیں جو اس سائنسی دنیا کی ہنگامہ خیز جدوجہد سے الگ تھلگ خالص علمی اور روحانی ماحول میں انجام پا رہی ہیں۔

ہم خوشی سے بھرپور قلوب کے ساتھ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں، دارالعلوم دیوبند کے بزرگ اساتذہ، کارکن، طلبہ وارکانِ شوریٰ کے لئے آپ کی تشریف آوری تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ آپ تاریخ، انسانی تہذیب، ہندوستانی کلچر، سائنس اور پولیٹیکل سائنس کے ایک زبردست محقق اور عالم ہیں، آپ نے اپنی تقریروں میں مسلمانانِ ہند کے تاریخی اور تہذیبی رشتوں، ہندستان کے عالمی تعلقات اور عرب و ہند کے رابطوں کے اُستوار کرنے میں جس علم و تحقیق سے کام لیا ہے اس سے ہندوستان کی تہذیبی وراثت میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔
آپ ہندوستان کی تعمیر و ترقی کے ایک ممتاز رہنما اور امام الہند مولانا آزاد کے قریبی رفیق کار رہے ہیں۔ مولانا مرحوم ایک عظیم، ملّی رہنما، بلندنظر عالم اور جدید ہندستان کے اولین معماروں میں سے تھے، اس دارالعلوم سے ان کا رابطہ بے حد مخلصانہ، بے حد گہرا اور گراں قدر تھا، اس قریبی رشتے کی بنا پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ آپ اپنے ادارے میں اپنوں کے مہمان ہیں اور اپنی ہی علمی برادری میں تشریف فرما ہیں۔
جناب والا! دارالعلوم دیوبند ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کی یادگار ہے، یہ دارالعلوم آج سے سو سال پہلے اسلامی اور عربی علوم کی ترقی کے لئے قائم کیا گیا تھا، اس کے بانی اعظم شمس العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب

رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفیق کار قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تھے، ان اکابر کے جانشین حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اسلام کی سربلندی، وطن عزیز کی آزادی اور قومی یکجہتی کے اولین داعی تھے۔ یہ بزرگ جہاں علم وفضل کا بلند نشان، دینی تعلیم وتربیت کا روشن مینار اور حقیقی معنی میں خدا پرستی کا مخزن تھے وہیں سچے محبّ وطن اور انسانی معاشرے کے زبردست خیر خواہ بھی تھے اور کوئی شبہ نہیں کہ انسانیت پر ان کے گراں قدر احسانات ہیں۔

جناب والا! یہ دارالعلوم جس کے احاطہ میں اس وقت جناب والا رونق افروز ہیں آج ان ہی اکابر کی یادگار اور ان ہی کے نقشِ قدم پر گامزن ہے، اس کے سامنے قدیم روحانی ورثہ ہے اور اسے نئے دور کے تقاضوں کا احساس ہے۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب صرف ہندوستان کا سیاسی انقلاب نہ تھا بلکہ اسلامی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا بھی انقلاب تھا۔ برطانوی تعلیمی پالیسی کے تحت قدیم اسلامی مدارس روبزوال تھے، قدیم تہذیب موت کے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی اور قدیم علوم کی حامل بہت سی شخصیتیں فنا کے گھاٹ اتار دی گئی تھیں، یا جلاوطن ہو چکی تھیں، اندریں حالات ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون اور تہذیب و ثقافت کے بقاء کی اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ ایک ایسی درسگاہ قائم کی جائے جو اپنی مخصوص تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اسلامی روح کو بھی مضمحل نہ ہونے دے اور وقت کے لحاظ سے گرتی ہوئی قوم کو بھی سنبھالے، قوم کے نبض شناسوں نے انہی مقاصد کے لئے اس درسگاہ کی بنیاد رکھی، حکومت سے امداد لینے کے بجائے محض خدا پر بھروسہ اور عوام کے چندوں پر اس ادارے کو قائم کیا، جس میں تعلیم مفت اور آزاد رکھی گئی، طلبہ سے فیس لینے کے بجائے ان کے لئے ماہانہ وظائف جاری کئے گئے تاکہ اس تعلیم سے غریب و امیر سب یکساں طور پر منتفع ہوں اور کسی بھی غریب ونادار کے لئے تعلیم کا دروازہ بند نہ رہے، یہ تجزیہ نہایت کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہوا اور آگے چل کر بہت سے اداروں کے لئے مشعلِ راہ بنا۔ اس تعلیمی لائن سے دارالعلوم نے سیاسی غلامی کی فضا میں ذہنی آزادی کو اپنے طلبہ اور متوسلوں میں برقرار رکھا۔

جناب محترم! دارالعلوم دیوبند میں اس وقت ہند وبیرون ہند کے تقریباً ڈیڑھ ہزار طلبہ دینی علوم وفنون کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، چالیس سے اوپر اساتذہ ان کی تعلیم پر مامور ہیں اور پونے دوسو کے قریب افراد کا عملہ دفتری خدمات انجام دے رہا ہے۔

دارالعلوم کا سالانہ بجٹ ساٹھ لاکھ روپے کے قریب ہے جو حیرت ناک طریقہ پر عوامی چندوں سے

پورا ہوتا ہے اور قوم کے نونہالوں پر خرچ کر دیا جاتا ہے۔ قوم کا وہ طبقہ جس پر تعلیمی اخراجات کی گراں باری نے علم کے دروازے بند کر دیئے تھے، اس درسگاہ کی آغوش میں ان کی تعلیم وتربیت کے لئے ہمیشہ کھلی رہی ہے، اس لئے اگر یہ کہا جائے تو قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ دارالعلوم دیوبند ہی وہ تعلیمی درسگاہ ہے جس نے موجودہ دور کے نعرے ''فری ایجوکیشن'' کو ملک میں سب سے پہلے عملی جامہ پہنا کر آج سے سو سال قبل مثال قائم کر دی تھی۔

دارالعلوم دیوبند اور جذبۂ آزادی

جناب والا! دارالعلوم دیوبند کے بزرگوں نے تعلیم وتربیت اور علم وفضل کے نمایاں اور غیر معمولی کارناموں کے ساتھ ملک اور قوم کی آزادی کے جذبہ کو تاریخ کے ہر موڑ پر اپنی جان کی بازی لگا کر باقی رکھا ہے جس کے لئے تاریخ کے اوراق شاہد ہیں، اس سلسلہ میں قومی یکجہتی اور علیحدگی پسندی سے دوری کے جو جذبات اس کے ۱۹۴۷ء سے قبل تھے وہی آج تک بھی ہیں، اس نے عمل صالح اور صحیح رہنمائی سے کسی وقت بھی قدم پیچھے نہیں ہٹایا، دین وعلم کے ساتھ ساتھ اس ملک کے ساتھ ہمیشہ حب الوطنی کا رشتہ قائم رکھا ہے جو آج تک قائم ہے، اس کا جذبہ یہ ہے کہ اس کے فضلاء جہاں قدم قدم پر اپنی آخرت کو یاد رکھیں وہیں اس ملک کے لئے ایک سچے خداترس اور روشن ضمیر شہری بھی ثابت ہوں اور ہم یقین کی قوت سے کہہ سکتے ہیں کہ بانی دارالعلوم سے لے کر شیخ الہند تک اور شیخ الہندؒ سے لے کر ان کے شاگردوں اور شاگردانِ شاگرد تک ان ہی دو باتوں کو اپنے دلوں کا جوہر بنائے ہوئے ہیں جو اُن بانیوں کے کاز کی مضبوطی اور نصب العین کے استحکام کی روشن دلیل ہے۔

ہم آخر میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں اور اس یقین کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ یہ دارالعلوم پچھلے سو سال کی طرح آنے والے سو سال میں بھی اسلامی علوم کی سربلندی، وطن عزیز کی تعمیر وترقی، قومی یکجہتی اور انسانیت کی عام بہتری اور خیر خواہی کے لئے سرگرمی سے کام کرتا رہے گا، اوّل وآخر ہمارا سرمایہ اللہ کا نام ہے اور ہم آئندہ کامیابیوں کے لئے بھی اسی نام سے برکت حاصل کرتے رہیں گے۔ (۱۱۵)

ہم ہیں آپ کے مخلص

محمد طیب مہتمم وارکان مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

............❖............

حیات طیب......ایک مختصر خاکہ

۞...... ۱۳۱۵ھ جمادی الثانی، پیدائش، (تاریخ نام مظفر الدین اور اصلی نام محمد طیب رکھا گیا۔

۞......۱۳۲۲ھ رسم بسم اللہ (اس مجلس میں تمام اکابر علماء جمع تھے خصوصاً مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ (والد محترم شیخ الہندؒ)، مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ (والد حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ) مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحبؒ اور دیگر اساتذہ دارالعلوم دیوبند)

۞...... ۱۳۲۶ھ شعبان: حفظ قرآن بالتجوید (مولانا قاری عبدالواحد خاں الہ آبادیؒ آپ کے استاذ تھے)

۞...... ۱۳۲۷ھ درجہ فارسی میں داخلہ (فارسی کی تمام کتابیں مولانا یسین صاحبؒ (والد ماجد مفتی محمد شفیع عثمانی صاحبؒ سے پڑھیں)۔

۞...... ۱۳۲۹ھ تکمیل نصاب فارسی (اس کے ساتھ ریاضی، حساب، جیومیٹری وغیرہ بھی پڑھ لیں)۔

۞...... ۱۳۳۰ھ درجہ عربی میں داخلہ (کتب عربی میں مندرجہ ذیل اساتذہ کرام سے استفادہ کیا)۔

۞...... صغری، کبری مکمل مرقات ابتدائی حصہ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ بقیہ مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، سلم العلوم، ملاحسن شرح سلم العلوم حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، حمد اللہ قاضی مبارکؒ، حضرت مولانا رسول خان صاحبؒ کافیہ حضرت شیخ الہندؒ، بقیہ کافیہ، شرح جامی حضرت مولانا نبیہ الدین صاحبؒ، شرح وقایہ: حضرت مولانا گل محمد صاحبؒ، ہدایہ اولین، شرح عقائد نسفی، عروض المفتاح، میبذی: حضرت مولانا غلام رسول خان صاحبؒ، ہدایہ آخرین: حضرت مولانا اعزاز علی صاحب دیوبندیؒ، مسلم شریف و مشکوۃ شریف: حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ، سنن ابی داؤد: حضرت مولانا میاں محمد اصغر صاحبؒ، نسائی شریف: حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی صاحبؒ، ابن ماجہ: حضرت مولانا رسول خاں صاحبؒ، بخاری شریف، ترمذی شریف حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری صاحبؒ، طحاوی، جلالین، موطا امام مالک، موطا امام محمد: حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، فن سپہ گری: جناب امیر شاہ خان صاحبؒ (حضرت نانوتویؒ کے متوسلین میں سے تھے) خوشنویسی! جلد بندی: منشی محبوب علی صاحب میرٹھیؒ (محبوب رقم) محمد علی میرٹھیؒ

(بالترتیب) خصوصی اجازت حدیث: حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اور مولانا عبداللہ انبٹھویؒ نے عطا فرمائی۔

- ...... ۱۳۳۷ھ تکمیل درس نظامی (سات سال میں ہوئی)
- ...... ۱۳۳۹ھ بیعت حضرت شیخ الہند (م ۱۳۳۹ھ) یہ تعلق صرف چھ ماہ تک رہا۔
- ...... ۱۳۳۴ھ نکاح (حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے پڑھایا)
- ...... ۱۳۳۹ھ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری صاحبؒ سے رجوع (آپ نے باضابطہ بیعت تو نہیں فرمایا مگر تعلیم دیتے رہے)
- ...... ۱۳۴۵ھ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں حاضری اور بیعت
- ...... ۱۳۵۰ھ خرقہ خلافت از حضرت تھانویؒ۔
- ...... ۱۳۳۷ھ ابتدائے تدریس (جو ۱۳۴۳ھ تک جاری رہی)
- ...... ۱۳۴۳ھ قائم مقام مہتمم (کی حیثیت سے ۵ سال مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کے ساتھ کام کیا)
- ...... ۱۳۴۸ھ اہتمام دار العلوم دیوبند کی ذمہ داریاں آپ کے سپرد کر دی گئیں۔
- ...... ۱۳۴۹ھ اہتمام میں سب سے پہلا کام تعمیر مسجد بالائی منزل وتوسیع صحن مسجد بجانب مشرق۔
- ...... ۵۱،۱۳۵۰ھ دورۂ تفسیر کا اجراء اور تفسیر بیضاوی مکمل اور تفسیر ابن کثیر کی نصاب میں شمولیت، شعبہ تجوید کا قیام۔
- ...... ۱۳۵۲ھ نو درے پر ایک عظیم الشان ہال (دار الحدیث فوقانی) کی تعمیر کا آغاز، قواعد داخلہ کی اصلاح وغیرہ۔
- ...... ۱۳۵۳ھ پہلا حج، واپسی پر مدرسین دار العلوم کے لیے پینشن کا اجراء۔
- ...... ۱۳۵۴ھ زمانہ اہتمام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (بوجہ سفر حج حضرت مہتمم صاحبؒ)
- ...... ۱۳۵۵ھ دار العلوم میں تین شعبوں کی منظوری (۱) شعبہ تنظیم وترقی (۲) شعبہ محافظ خانہ (۳) شعبہ ورزش۔
- ...... ۱۳۵۵ھ آمد وفد علماء جامعۃ الازہر از مصر۔

۱۳۵۶ھ تعمیر جدید عمارات (۱) یادگار سعدی (برائے درجہ فارسی) (۲) محافظ خانہ کی دو منزلہ عمارت (۳) دار الاقامہ (دار جدید) کی تعمیر ۵۲ کمروں پر مشتمل۔

- ...... ۱۳۵۷ھ حضرت مدنی کا سفر حج اور وہاں سے سلطان ابن سعود کا دار العلوم کے لیے ہدیہ کتب۔
- ...... ۱۳۵۷ھ سفر افغانستان (حکومت افغانستان کی طرف سے دار العلوم کو عطیہ)
- ...... ۱۳۵۸ھ دار الحدیث کی بالائی منزل پر تیس تیس مربع فٹ ہال کی درسگاہ ''دار التفسیر'' کی تعمیر۔

- ...... ۱۳۵۹ھ "باب الظاہر" کی تعمیر (یہ تین منزلہ عمارت متعدد کمروں اور بڑی بڑی درسگاہوں پر مشتمل)
- ...... ۱۳۵۹ھ دورہ ریاست قلات برائے تدوین تعلیمی اسکیم۔
- ...... ۱۳۵۹ھ معائنہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (جہاں اسلام اور سائنس کے موضوع پر عالمانہ اور فلسفیانہ تقریر فرمائی)
- ...... ۱۳۶۰ھ دورہ مدراس اور کلکتہ، تکمیل دارالاقامہ (جس کی نچلی منزل ۱۰۹ کمروں پر مشتمل ہے)
- ...... ۱۳۶۰ھ ماہنامہ رسالہ "دارالعلوم" کا اجراء (جس کی ادارت کے فرائض مولانا سید ازہر شاہ قیصر کو سونپے گئے)
- ...... ۱۳۶۱ھ حضرت مدنیؒ کی گرفتاری پر ایک احتجاجی جلسہ کی صدارت اور آپ کا صدارتی خطاب
- ...... ۱۳۶۲ھ تحریک پاکستان کے سلسلہ میں دارالعلوم کے ارباب حل وعقد میں شدید اختلاف۔
- ...... ۱۳۶۲ھ قیام پاکستان اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مفتی شفیع صاحبؒ کا پاکستان منتقل ہو جانا۔
- ...... ۱۳۶۳ھ حضرت مدنیؒ کی رہائی پر دارالعلوم میں عظیم الشان جلسہ کا انعقاد۔
- ...... ۱۳۶۴ھ دارالعلوم میں شعبہ خوشخطی کا اجراء۔
- ...... ۱۳۶۵ھ دارالصنائع (شعبہ صنعت وحرفت کا قیام)
- ...... ۱۳۶۶ھ دارالعلوم کی طرف سے بہار اور گڑھ مکتیشر کے فسادزدہ مسلمانوں کی امداد واعانت۔
- ...... ۱۳۶۶ھ پرائیویڈنٹ فنڈ کا اجراء۔
- ...... ۱۳۶۷ھ دارالافتاء کی جدید عمارت کی تعمیر اور دارالافتاء کی جدید عمارت میں منتقلی۔
- ...... ۱۳۶۸ھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے لیے علماء دیوبند کا انتخاب اور حضرت حکیم الاسلامؒ کا اس کی رکنیت کے لیے منتخب ہونا۔
- ...... ۱۳۶۹ھ حضرت مہتمم صاحبؒ کی درخواست پر پاکستانی طلبہ کے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ پر پابندی ہٹا دینا۔
- ...... ۱۳۶۸ھ آل انڈیا ریڈیو کے ذریعے حکومت ہند کا بیرون ہند دارالعلوم کا تعارف کرانا۔
- ...... ۱۳۶۹ھ سفیر افغانستان سردار نجیب اللہ خاں کی سرکاری حیثیت سے دارالعلوم میں آمد۔
- ...... ۱۳۷۰ھ وزیر تعلیم حکومت ہند مولانا ابوالکلام آزاد کی دارالعلوم میں آمد اور فصیح وبلیغ خطاب۔
- ...... ۱۳۷۱ھ اچاریہ ونوبھادے کی اپنی بھومی وان کی تحریک کے سلسلہ میں دارالعلوم میں آمد اور مہتمم صاحبؒ سے ملاقات۔
- ...... ۱۳۷۲ھ شعبہ طب اور دارالشفا کا قیام۔

۞...... ۷۴-۷۳ھ ۱۳حکومت حجاز (سعودیہ) کی طرف سے حضرت مہتمم صاحبؒ کو پیغام تبریک، جلالۃ الملک کی ہندوستان آمد، دارالعلوم کے لیے خصوصی عطیہ فرمانا، نیز اسی سال جمہوریہ عربیہ مصر کے صدر انوارالسادات کا دارالعلوم تشریف لانا۔

۞......۱۳۷۵ھ دارالعلوم دیوبند کے جامعہ الازہر مصر سے روابط، جامعہ الازہر سے دو جلیل القدر اساتذہ کا دو سال کے لیے دارالعلوم کے لیے اپنی خدمات پیش کرنا، دارالعلوم میں جدید عربی انشاء و ادب کے شعبہ کا قیام، دارالعلوم کی مسجد کی توسیع، فتاوی دارالعلوم دیوبند کی ترتیب و تدوین اور اشاعت۔

۞...... ۱۳۷۶ھ صدر جمہوریہ ہند کی دارالعلوم آمد۔

۞...... ۱۳۷۷ھ سفر برما، واپسی پر کتب خانہ دارالعلوم کے لیے ہال کی تعمیر، شاہ افغانستان محمد ظاہر شاہ کی دارالعلوم آمد۔

۞...... ۱۳۷۸ھ شعبہ تنظیم فضلاء دارالعلوم کا قیام۔

۞...... ۱۳۷۹ھ سفر افریقہ، دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد کی جو بلی میں صاحبزادہ مولانا سالم صاحب کی شرکت، حج بیت اللہ شریف کی سعادت جمہوریہ عربیہ مصر کے صدر جمال عبدالناصر کی ہندوستان آمد اور دارالعلوم کی جانب سے ہدیہ کتب۔

۞...... ۱۳۸۰ھ جامعہ طبیہ کا اجراء اور دارالعلوم کے شمال میں جامعہ طبیہ کے لیے ایک وسیع عمارت کا قیام۔

۞...... ۱۳۸۱ھ حکومت ہند کے وزیر ثقافت و سائنس ہمایوں کبیر کی دارالعلوم میں آمد، حکومت مصر کی طرف سے قرآن مجید کی قراءت پر مشتمل ۴۴/کیسٹوں کا مکمل سیٹ دارالعلوم کو تحفہ بھیجنا۔

۞...... ۱۳۸۲ھ شام کے جلیل القدر عالم عبدالفتاح ابوغدہؒ کی دارالعلوم میں آمد، شعبہ تعمیرات کا اجراء۔

۞......۱۳۸۳ھ سفر جنوبی افریقہ، سفر مصر، ۱۹/شوال ۱۳۸۳ھ کو عالمی موتمر اسلامی قاہرہ میں شرکت، حج بیت اللہ۔

۞...... ۷۵-۷۴-۱۳ھ عربی رسالہ ''دعوۃ الحق'' (زیر ادارت مولانا وحید الزمان صاحبؒ) کا اجراء، اترپردیش کے گورنر کی دارالعلوم میں آمد، حکومت ہند کی طرف سے دارالعلوم کے تعارف میں ایک کتابچہ شائع کرنا۔

۞...... ۸۷-۱۳۸۶ھ دارالعلوم کی عمارتوں میں کتب خانہ کی توسیع کے لیے ایک جدید ہال اور دو کمروں کا اضافہ۔

۞...... ۸۹-۱۳۸۸ھ عرب ممالک کے زائرین کا دارالعلوم میں تشریف لانا، مسجد چھتہ شمالی جانب حجرہ قدیم کی تعمیر نو۔

⚙...... ۱۳۹۰ھ دارالعلوم کے نصاب میں چند تبدیلیاں، بیرون ممالک سے رابطہ کے لیے مختلف اوقات میں دورے۔

⚙...... ۱۳۹۱ھ دارالاقامہ (موسوم بہ افریقی بلڈنگ) کی تعمیر (۱۱ کمروں پر مشتمل)، اسی سال یورپ، انگلستان، فرانس، مغربی جرمنی کا سفر، پھر عمرہ۔

⚙...... ۱۳۹۲ھ مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کے لیے حضرت مہتمم صاحب کا انتخاب۔

⚙...... ۹۴-۱۳۹۳ھ سعودی عرب کے دو وفود کی دارالعلوم میں آمد (ایک وفد رابطہ عالم اسلامی کی جانب سے اور دوسرے میں وزارت معارف کے ڈائریکٹر اور ادارہ مباحث علمیہ کے نمائندے شامل تھے، دارالقضاء کا قیام، جس میں مسلم پرسنل لاء اور قوانین شریعت کے تحفظ اور بقاء کے لیے عملی طور پر محکمہ قضا قائم کیا گیا)، سعادت حج بیت اللہ۔

⚙...... ۱۳۹۵ھ سفر افریقہ وحجاز و یورپ، عمرہ کی ادائے گی اور مکہ مکرمہ میں بہت سی تقاریب سے خطاب، شیخ الازہر مصر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، وکیل الازہر شیخ عبدالرحمٰن بیطار، مفتی اعظم مصر محمد خاطر اور سابق شیخ الازہر (محمد الفحا) کی دارالعلوم میں آمد۔

⚙...... ۱۳۹۶ھ صدر جمہوریہ ہند کی دارالعلوم میں آمد، ایک عظیم الشان جلسہ میں دارالعلوم کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنا۔

⚙...... ۱۳۹۶ھ حضرت مہتمم صاحبؒ کی پاکستان کی بین الاقوامی سیرت کانفرس میں شرکت اور سیرت کے موضوع پر زبردست تقریر، اختتامی اجلاس میں سیرت کمیٹی کی طرف سے آپ چاندی کے منقش خول میں ایک مخملی بکس کے اندر تھا ایک سپاس نامہ پیش کرنا۔

⚙...... ۱۳۹۷ھ دارالعلوم دیو بند کے صد سالہ اجلاس کے انعقاد کا اعلان اور متعدد ممالک کے دورے۔

⚙...... ۱۳۹۸ھ دورہ پاکستان سلسلہ تعزیت حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا خیر محمد جالندھریؒ، (اس دورہ میں دارالعلوم کراچی، جامعہ اشرفیہ لاہور، خیر المدارس ملتان، تعلیم القرآن راولپنڈی، جامعہ رشیدیہ ساہیوال، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک اور دوسرے شہروں میں اہم خطابات)

⚙...... ۱۳۹۹ھ کئی ممالک کے دورے اور اجلاس صد سالہ کی انتظامی مصروفیات۔

⚙...... ۱۴۰۰ھ دور اہتمام کا آخری سال، دارالعلوم کے اہتمام سے علیحدگی۔

⚙...... ۱۴۰۳ھ ۶ رشوال، ۱۷ رجولائی ۱۹۸۳ء وفات حسرت آیات اور جماعت دیو بند کے اکابر و اصاغر کا یتیم ہو جانا۔

............❖............

تصنیفات وتالیفات

۱...... آفتاب نبوت کامل (دو حصے) محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب، قرآن محل کراچی نمبر۱، صفحات: ۲۳۱، سن ندارد، (قرآن کریم کی صرف ایک آیت ''و داعیا إلیه بإذنه وسراجا منیرا'' کی قرآنی تمثیل سے نبوت محمدیہ کی تمام شانوں کا حکیمانہ استنباط)

۲...... آنکھ کی کہانی، یہ دوطویل نظموں پر مشتمل ہے جن کے اشعار کی تعداد سات سو کے قریب ہے، پہلی نظم جنوری ۱۹۶۳ء اور دوسری دسمبر ۱۹۶۴ء میں لکھی گئی۔

۳...... اردو کی شرعی حیثیت (حوالہ: تذکرہ طیبؒ، ص:۱۱۱)

۴...... ارمغان دارالعلوم (۷۰ر صفحات پر مشتمل اس نظم میں دارالعلوم کے مشاہیر اسلاف میں سے ۸۰ر شخصیات کی خصوصیات دارالعلوم کی مروجہ درسی کتب اور غیر درسی کتب میں سے ۱۸۶ر کتابوں کے اسماء و صفات دارالعلوم کے مسلک اعتدال کے امتیازات، اجلاس صد سالہ کے حالات و انتظامات، اس کے عالمگیر و دوررس اثرات، اس کے ذمہ دار منتظمین کے اسماء و خدمات اور ان کے حق میں دعا و تبریکات دارالعلوم کی ترقیات کی تمنیات اور مہمانوں کے حق میں نیک خواہشات پر روشنی ڈالی گئی ہے)

۵...... اسرائیل (کتاب وسنت کی روشنی میں) ادارہ اسلامیلات ۱۹۰، انارکلی لاہور، باراول اگست ۱۹۷۸ء صفحات: ۷۶۔

۶...... اسلام اور مغربی تہذیب (حوالہ تاریخ دارالعلوم دیوبند ص: ۱۷۷)

۷...... اسلام اور فرقہ واریت (حوالہ تذکرہ طیبؒ، ص: ۲۵۳)

۸...... اسلام کا اخلاقی نظام، ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی لاہور، اشاعت اول جون ۱۹۷۸ء۔

۹...... اسلامی تہذیب وتمدن (یعنی التشبہ فی الاسلام) کامل، ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی لاہور، صفحات: ۳۱۸، باراول ۱۹۸۰ء۔ (غیر مسلم اقوام کے ساتھ مسلمانوں کی مشابہت کی اصل حیثیت اور اسلامی تہذیب وتمدن کی حفاظت اور اس کی بقاء قرآن وحدیث، آثار صحابہ اور فقہاء امت کے عقلی ونقلی دلائل کی

روشنی میں) نیز اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی ابتداء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ، مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ اور شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ جیسے اکابر کی تقاریظ ثبت ہیں)

۱۰...... اسلامی مساوات (حوالہ تذکرہ طیبؒ، ص: ۲۵۳)

۱۱...... اصول دعوتِ اسلام، ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی لاہور، صفحات ۳۱۸، بار اول ۱۹۸۰ء، قرآن پاک کی آیت ''ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلھم بالتی ھی أحسن '' کی روشنی میں اسلام کے تبلیغی نظام کی وضاحت، نیز دعوت ومدعووین کی اقسام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۲...... الکلم الطیب، (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متفرق واقعات جو اپنے بزرگوں سے سن کر اس رسالہ میں جمع کیے گئے ہیں) (حوالہ سوانح قاسمی از مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، مکتبہ لاہور، اردو بازار، لاہور)

۱۳...... انسانیت کا امتیاز، ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی لاہور، صفحات ۱۹۶، خاتمہ کتاب ۲۲ر اکتوبر، ۱۹۵۸ء۔

۱۴...... ایک قرآن، ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی لاہور، بار اول ۱۹۶۹ء، صفحات: ۱۴۸ر ایم ثناء اللہ خان اینڈ سنز ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۶۹ء صفحات: ۱۴۸۔ پروفیسر غلام جیلانی برق کی کتاب دو قرآن کے جواب میں لکھی گئی۔

۱۵...... پچاس مثالی شخصیات ، مرتبہ حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان، صفحات ۱۹۰، محرم ۱۴۱۸ھ۔

۱۶...... تاریخ دارالعلوم دیوبند، دارالاشاعت، اردو بازار کراچی، اشاعت اول، صفحات: ۱۴۴، (دارالعلوم کی سوسالہ زندگی، اس کی تاسیس وجہ تاسیس، تعلیمی، تبلیغی، انتظامی اور عام افادی کوائف واحوال اور مشاہیر دارالعلوم کے حالات زندگی کا مختصر مگر جامع مرقع پیش لفظ تحریر کردہ ۱۵ر محرم ۱۳۵۸ھ)

۱۷...... تصویر اسلام کے آئینہ میں، جو تذکرہ طیبؒ، ص: ۱۱۱۔

۱۸...... تعلیمات اسلام اور صحیح اقدام، ولی پرنٹنگ پریس دہلی انڈیا، ۱۳۵۱ھ۔

۱۹...... تعلیمات اسلام اور مسیحی اقدام، نگارشات میاں چیمبرز، ۳ ٹمپل روڈ لاہور، ۱۹۹۲ء، صفحات: ۲۵۱، (تاریخ اختتام ۳۰ر ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ، نفیس اکیڈمی کراچی، مئی ۱۹۸۳ء ایڈیشن اول صفحات ۲۵۱)

۲۰...... جنون شباب (منظوم کلام کا مجموعہ) حوالہ تذکرہ طیبؒ، ص: ۲۵۴۔

۲۱...... جذبات الم (حوالہ مجالس حکیم الاسلامؒ، جلد اول) ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان، ص: ۵۰ تا ۵۴، (اہلیہ محترمہ کی وفات پر دکھ بھر جذبات سے لبریز ازدواجی زندگی کی کہانی)

۲۲...... حاشیہ عقیدۃ الطحاوی (حوالہ تذکرہ طیبؒ ۲۵۹)

۲۳...... حجیت حدیث (حوالہ تذکرہ طیبؒ، ص: ۲۵۹)

۲۴...... حدیث رسول کا قرآنی معیار، ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی لاہور، صفحات ۳۱۸، باراول اپریل ۱۹۷۷ء، صفحات ۱۲۴، علم حدیث کی اہمیت وعظمت اوراس کی اقسام کا قرآن کریم سے محققانہ ثبوت۔

۲۵...... خاتم النبیین، ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی لاہور، صفحات: ۳۱۸، باراول اپریل ۱۹۷۷ء، صفحات ۸۵، (خاتمہ کتاب ۱۷رشعبان، ۱۳۷۷ھ، (اس کتاب میں سابقہ انبیاء کے مخصوص کمالات کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں یک دم جمع ہونے کی بے مثال تفصیلات پیش فرمائی ہیں)

۲۶...... دارالعلوم کی سوسالہ زندگی، دارالعلوم دیوبند (حوالہ مآخذ ومراجع تاریخ دارالعلوم دیوبند ازسید محبوب رضوی)

۲۷...... دارالعلوم کے ایک فتوے کی حقیقت، ادارہ نشر واشاعت دارالعلوم دیوبند ضلع سہارن پور، (حوالہ انکشافات، مرتبہ قاری عبدالحمید صاحب، مکتبہ تبلیغ اسلام حبیب بینک فلیمنگ روڈ لاہور، بارششم اکتوبر ۱۹۷۰ء صفحات: ۱۷۰)

۲۸......دینی دعوت کے قرآنی اصول، (حوالہ تاریخ دارالعلوم دیوبند، ازسید محبوب رضوی، ص: ۱۷۵)

۲۹...... ڈاڑھی کی شرعی حیثیت (مع رسالہ ڈاڑھی کا فلسفہ ازمولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ) دارالاشاعت کراچی نمبر ۱رجون ۱۹۷۴ء صفحات: ۱۲۷۔

۳۰......سفرنامہ افغانستان، (حوالہ تاریخ دارالعلوم دیوبند، سید محبوب رضوی، ماہنامہ، الرشید ساہیوال مارچ، اپریل ۱۹۸۰ء، صفحات: ۱۷۸)

۳۱...... سفرنامہ برما، مرتبہ مولانا محمد سالم قاسمی، حوالہ بالا۔

۳۲...... سفرنامہ مقامات مقدسہ ومآثر سفر مصر، حوالہ بالا۔

۳۳...... سورہ فیل میں پرویزی تحریف (یہ رسالہ تفسیر سورۂ فیل کے نام سے بھی چھپ چکا ہے) حوالہ تذکرہ طیبؒ، صفحات: ۱۱۱۔

۳۴...... سیرت خاتم الانبیاء حوالہ تذکرہ طیبؒ، صفحات: ۲۵۹۔

۳۵...... سیرت قرآنی، حوالہ تذکرہ طیبؒ، ص:۱۱۱۔

۳۶...... شان رسالت، کتب خانہ صدیقیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان شہر، صفحات ۱۴۶، بار سوم، سیرت پر ایک جامع کتاب۔

۳۷...... شرعی پردہ، ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انار کلی لاہور، صفحات :۱۲۷، اسلام کا نظام عفت و عصمت کا حسین مرقع، پردہ کی ضرورت و اہمیت کا قرآن و حدیث سے ثبوت اور پردہ پر کئے جانے والے اعتراضات کا شافی جواب۔

۳۸......شہید کربلا اور یزید، ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انار کلی لاہور، بار اول اپریل ۱۹۷۶ء صفحات: ۲۰۹، خاتمہ کتاب ۲۰/رجب، ۱۳۷۹ھ (محمود احمد عباسی کی کتاب، ''خلافت معاویہ ویزید'' کا مفصل مدلل اور مسکت جواب، حادثہ کربلا کے اسباب ونتائج، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے موقف کی وضاحت، آپ کے موقف پر کئے گئے اعتراضات کا تحقیقی جواب، نیز افراط وتفریط سے ہٹ کر علمائے اہل سنت کے مسلک اعتدال کی تشریح)

۳۹...... عالم انسانیت کا مکمل قانون، کتب خانہ محمودیہ، دیو بند یوپی انڈیا۔

۴۰......علمائے دیو بند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج (آخری تصنیف) ادارہ اسلامیات، انار کلی لاہور، بار اول جولائی ۱۹۸۸ء، صفحات :۱۹۶، کتاب کے شروع میں مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ کا پیش لفظ شامل ہے، (تاریخ اختتام کتاب یکم محرم، ۱۴۰۰ھ)

۴۱...... علم غیب (مع رسالہ مسئلہ علم غیب از مولانا رشید احمد گنگوہیؒ) ادارہ اسلامیات، ۱۹۰، انار کلی لاہور طبع دوم، مارچ، ۱۹۸۱ء، صفحات ۱۶۶، (مسئلہ علم غیب پر بے مثل تحقیق) خاتمہ کتاب ۱۳/ذیقعدہ، ۱۳۷۷ھ۔

۴۲...... عرفانِ عارف (اردو، فارسی اور عربی کلام کا مجموعہ) مرتبہ مولانا محمد اسلم رمزی (صاحبزادہ حضرت حکیم الاسلامؒ) مکتبہ قاسمی دیوبند ۱۹۶۷ء۔

۴۳...... فطری حکومت (حوالہ تذکرہ طیبؒ، ص:۲۵۳)

۴۴...... فلسفہ طہارت (حوالہ تذکرہ طیبؒ، ص:۷۶)

۴۵-فلسفہ نعمت ومصیبت (کامل) ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انار کلی لاہور، بار اول اگست ۱۹۸۱ء، صفحات:۲۳۰

۴۶...... فہم قرآنی اور تعلیم مذہب کے دو بنیادی اصول (حوالہ تذکرہ طیبؒ، ص:۱۱۱)

۴۷- قرآنی دعوت کے ستر اصول (حوالہ تذکرہ طیبؒ، ص:۴۷)

۴۸-قول فیصل (کلام طیب) ادارہ نشر واشاعت دار العلوم دیوبند ضلع سہارنپور (حوالہ انکشافات ص:۱۸۱)

۴۹...... کلمات طیبات (بزرگان دیوبند کے احوال وسیر) حوالہ بزم اشرف کے چراغ، ص: ۶۷۔

۵۰...... کلمہ طیبہ مع رسالہ کلمات طیبات، ادارہ اسلامیات لاہور، بار اول جون ۱۹۷۶ء صفحات: ۵۹ (تاریخ اختتام ۲۷/شوال ۱۳۷۷ھ) (پہلے رسالے میں کلمہ طیبہ کا قرآن، حدیث اور اجماع سے ثبوت اور اس کے دلائل بیان کیے گئے ہیں، دوسرے رسالہ میں ذکر اللہ کے دس اسلامی کلمات کے فضائل اور ان کے پڑھنے کا طریقہ مع شجرہ منظوم ذکر فرمایا ہے)

۵۱...... مسلک علمائے دیوبند، دار الاشاعت کراچی نمبر ا، جولائی ۱۹۷۶ء صفحات: ۹۳، (کتاب کے شروع میں مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا پیش لفظ موجود ہے) (اس میں نہایت عام فہم انداز میں مسلک علماء دیوبند کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ جماعت علمائے دیوبند ہی اصل اہل سنت و الجماعت اور مسلک اعتدال پر قائم ہے، یہی کتاب ''علمائے دیوبند کے مسلک'' کے عنوان سے ادارہ الصدیق ملتان ۷/ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ میں طبع ہوئی ہے)

۵۲...... مسئلہ تقدیر، ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی لاہور، بار اول ۷۸ء صفحات: ۱۵۹، (یہ کتاب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے مقدمے کے ساتھ تین محقق علماء کرام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمہم اللہ تعالیٰ اور حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے مقالات پر مشتمل ہے)

۵۳...... مسئلہ، اردو زبان، ہندوستان میں (حوالہ تذکرہ طیبؒ، ص: ۲۵۳)

۵۴...... مشاہیر امت (نونیۃ الاحاد (عربی) مع ترجمہ، تشریح اردو) منظوم، ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان، صفحات: ۶۴ (اس کتاب میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے چند مشاہیر کو (جو علوم وفنون میں یکتا اور فرد تسلیم کیے گئے ہیں) عربی قصیدہ میں منظوم کیا ہے ۱۶۸، اشعار پر مشتمل ہے)

۵۵...... مقالات طیبہ، ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی لاہور، بار اول مئی ۱۹۷۸ء صفحات: ۱۷۶ (اس کتاب میں تین مقالات اور ایک تقریر شامل ہے۔ (۱) اسلام عالمی مذہب ہے۔ (۲) دار العلوم دیوبند کے اساسی اصول اور جنگ آزادی میں اس کا کردار (۳) دو علمی سوال اور ان کے جواب۔ (۴) تقریر علم وحکمت۔

۵۶...... میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت (حوالہ تذکرہ طیبؒ، صفحات: ۱۱۱)

۵۷...... نسب اور اسلام (حوالہ تذکرہ طیبؒ، صفحات: ۱۱۱)

۵۸...... نظریہ دو فرقوں پر ایک نظر (حوالہ تذکرہ طیبؒ، صفحات: ۲۵۴)

۵۹...... اسلام کے دو امتیازی پہلو (حوالہ تذکرہ طیبؒ، ص: ۲۵۳)

............❖............

مقدمات وتقاریظ

۱...... مقدمۃ القرآن بعنوان ''کلامی معجزہ'' جو تفسیر کشف الرحمٰن (مولفہ مولانا احمد سعید) کی ابتداء میں شامل کیا گیا ہے، محمد مسلم بن برکت اللہ ٹھٹائی کمپاؤنڈ، بندر روڈ کراچی، ۱۹۷۸ء تحریر کردہ ۲/ربیع الثانی ۱۹۸۱ء۔

۲...... مقدمہ ''بیان اللسان'' (عربی اردو ڈکشنری مع لغات القرآن) مرتبہ قاضی زین العابدین، دارالاشاعت کراچی، نمبر ا، ص: ۳-۱۱۔

۳...... مقدمہ ''تاریخ دارالعلوم دیوبند (جلد اول) مرتبہ محبوب احمد رضوی، بعنوان ''الہامی مدرسہ اور اس کا الہامی مکتب فکر'' ادارہ اہتمام دارالعلوم دیوبند طبع اول ۱۳۹۷ھ /۱۹۷۷ء تحریر کردہ ۲۲/رجب المرجب ۱۳۹۶ھ ص: ۱۱ تا ۵۶''۔

۴...... مقدمہ ''تمدن اسلام'' مصنفہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی، حوالہ تذکرہ طیبؒ، ص: ۳۶۰۔

۵...... مقدمہ ''سوانح قاسمی'' (جلد اول) مکتبہ رحمانیہ ۱۸/اردو بازار لاہور تحریر کردہ ۱۰/جمادی الاولیٰ ۱۳۷۳ھ، ص: ۱ تا ۲۲۔

۶...... مقدمہ ''مودودی دستور وعقائد کی حقیقت'' مصنفہ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مکتبہ عثمانیہ نزد مدرسہ حنفیہ اشرف العلوم ہرنولی میاں والی، تحریر کردہ ۲۰/جمادی الاولیٰ ۱۳۷۳ھ، ص: ۲۷ تا ۴۵۔

۷...... (۱) پیش لفظ ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' (جلد دوم) مرتبہ محبوب احمد رضوی، ادارہ اہتمام دارالعلوم دیوبند، طبع اول ۱۳۹۸ھ، ۱۹۷۸ء تحریر کردہ ص: ۹ تا ۱۱، ۵/ربیع الاول، ۹۸ھ، (۲) پیش لفظ ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' (جلد اول) مکتبہ امدادیہ، ملتان، تحریر کردہ ۵/جمادی الثانی ۱۳۸۱ھ ص: ۲۵ تا ۵۰۔ (۳) پیش لفظ ''لطائف علمیہ'' اردو ترجمہ ''کتاب الاذکیاء'' از علامہ بن الجوزیؒ ترجمہ مولانا اشتیاق احمد، دارالاشاعت کراچی نمبر ۲، ۱۴۱۳ھ، تحریر کردہ ۱۸/ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ، ص: ۵ تا ۱۴۔

۱...... تصدیق ''احسن الکلامی فی ترک القراء خلف الامام'' مصنفہ مولانا سرفراز خان صفدرؒ، مکتبہ صفدریہ،

نز د نصرت العلوم گوجرانوالہ، تحریر کردہ یکم ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ، ص: ۱۰ تا ۱۷۔

۲...... تصدیق ''المنہاج الواضح'' المعروف ''راہ راست'' مصنفہ مولانا سرفراز خان صفدر، مکتبہ صفدریہ، نزد نصرت العلوم گوجرانوالہ، ۹۵، تحریر کردہ ۲۱/رجب ۱۳۷۷ھ ۶/صفحات۔

۳...... تصدیق ''تسکین الصدور'' (فی تحقیق احوال الموتی فی البرزخ والقبور) مصنفہ مولانا سرفراز خان صفدر، مکتبہ صفدریہ، نزد نصر العلوم گوجرانوالہ، طباعت ششم، اگست ۹۵ء، ص: ۲۰۔

۱...... تقریظ ''اسلامی اخلاق وآداب'' (مہد سے لحد تک) مولفہ منشی عبد الرحمٰنؒ ادارہ اسلامیات لاہور باراول جولائی، ۱۹۸۸ء۔

۲...... تقریظ ''الانوار'' (سوانح حضرت انور شاہ صاحب کشمیریؒ) مولفہ عبد الرحمٰن کوندو، دار المصنفین دہلی، طبع دوم، فروری ۱۹۷۸ء تحریر کردہ ۲۴/محرم ۱۳۹۸ھ ص س ع۔

۳...... تقریظ ''تبرید النواظر فی تحقیق الحاضر والناظر'' المعروف ''آنکھوں کی ٹھنڈک'' مولفہ مولانا سرفراز خان صفدر، مکتبہ صفدریہ، نزد مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ، طبع شانزدہم ۱۴۱۶ھ اگست ۱۹۹۵ء ۹۵ء تحریر کردہ، ۳۰/ذیقعدہ ۱۳۷۸ھ ص: ۹۔

۴...... تقریظ حیاۃ الصحابہ جلد سوم تالیف مولانا یوسف کاندھلویؒ اردو ترجمہ مولانا محمد عثمان فیض آبادی، تحریر کردہ ۲۳/محرم ۱۳۸۷ھ، ص ۴ تا ۸۔

۵...... تقریظ ''دعوات حق'' جلد اول افادات مولانا عبد الحق صاحبؒ، ضبط وترتیب مولانا سمیع الحق صاحب، موتمر المصنفین دار العلوم اکوڑہ خٹک پشاور، طبع دوم تحریر کردہ ۲۶/مارچ ۷۶ء، ص: ۳۔

۶...... تقریظ ''علم قراءت اور قراء سبعہ'' تالیف مولانا قاری ابوالحسن اعظمی ادارہ اسلامیات لاہور، دسمبر ۸۹ء تحریر کردہ ۱۳/ستمبر ۱۳۹۸ھ ص: ۵ تا ۸۔

۷...... تقریظ ''فیشن پرستی اور اس کا علاج'' مرتبہ سعد حسن، کتب خانہ مظہری کراچی، ص: ۱۳ تا ۱۴۔

۱...... تاثرات ''تحفہ علم وحکمت'' تالیف محمد اسحاق خان (حوالہ ہفت روزہ ''ترجمان الاسلام'' لاہور، جلد ۲۵، شمارہ ۵۲، ۳۱/جنوری ۱۹۸۳ء۔

۲...... تاثرات ''تنبیہہ الغافلین'' ترجمہ وتلخیص مولانا محفوظ الرحمٰن سنبھلی مکتبہ رشیدیہ رائے ونڈ (تحریر کردہ ۱۶/ذیقعدہ ۱۳۹۸ھ، ص: ۱۳)

۳...... تأثرات ''شیخ محمد بن عبد الوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق'' تالیف مولانا منظور احمد

نعمانی، قدیمی کتب خانہ آرام باغ، کراچی نمبرا، (تحریر کردہ ۵/ ذیقعدہ ۱۳۹۸ھ)

۴...... تأثرات ''فطرت اسلام'' مولفہ اخلاق احمد عثمان (موسوم بہ کلیم عثمانی) حوالہ کلام العارفین ص: ۲۱، تالیف مولف مذکور۔

۵...... تأثرات ''منہاج المتقین'' مولفہ اخلاق احمد عثمان (موسوم بہ کلیم عثمای) حوالہ کلام العارفین ص ۱۲۳ تالیف مولف مذکور، مطبوعہ ۱۳۹۸ھ (تحریر کردہ ۲/ مئی ۱۹۷۸ء)

۶...... نقوش وتاثرات ''نقش دوام'' سوانح حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ مرتبہ سید انظر شاہ مسعودیؒ، المکتبہ البنوریہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی ص: ۱۱ تا ۱۴۔

۷...... تبصرہ ''اسلام اور عصر حاضر'' تالیف مولانا سمیع الحق صاحب موتمر المصنفین اکوڑہ خٹک بشاور (تحریر کردہ ۱۵/ جمادی الاولی ۱۳۹۸ھ)

۸...... تعارف ''تعلیمی چہل حدیث'' مرتبہ مولانا وحید الدین قاسمی پاک اکیڈمی بک سیلر دکان نمبر ۲۳، جامع مسجد بالب الاسلام آرام باغ کراچی نمبرا، تحریر کردہ ۴/ محرم ۱۲۹۶ھ، ص: ۲ تا ۶۔

۹...... رائے گرامی قاموس القرآن ڈکشنری مرتبہ قاضی زین العابدین صاحب، دارالاشاعت کراچی، ص: ۳، ۴، تحریر کردہ ۲۳/ محرم ۱۳۷۴ھ۔

۱۰...... رائے گرامی عبقات من باب الاستفسارات مرتبہ علامہ خالد محمود صاحب دار التصنیف و الاشاعت، ۱۴، بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔

۱۱...... رائے گرامی ''بیس بڑے مسلمان'' مرتبہ عبدالرشید ارشد (مکتبہ رشیدیہ لاہور)

............❖............

مکتوبات

۱...... پرسکون زندگی (کراچی کے ایک صاحب اے جی یوود جس کے خط کا جواب) مکتبہ انوریہ کراچی، مکتبہ انوریہ رائے ونڈ، صفحات: ۱۵۔

۲...... حضرت مولانا نانوتویؒ کی ''آب حیات'' (مکتوب بنام احسان الحق قریشی پرنسپل گورنمنٹ کمرشل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ سیالکوٹ، مشمولہ ہفت روزہ ''خدام الدین'' لاہور جلد ۶، شمارہ ۴۵، ۱۷/ مارچ، ۱۹۶۱ء، ص: ۱۶ تا ۱۸۔

۳...... خطوط بنام مولانا محمد ظفیر الدین صاحب (۵/ عدد خطوط جو مکتوب الیہ نے اپنے مضمون ''ایک جامع کمالات شخصیت'' مشمولہ تذکرہ طیب مرتبہ محمد ابوبکر غازی پوری منشورہ المکتبہ الاشرفیہ قاسمی منزل سیدواڑہ غازی پوری انڈیا)

۴...... رائے عالی جناب مولانا محمد طیب صاحبؒ (متعلقہ تحریک مودودیت، تاریخ اور سنت کی روشنی میں) یہ مکتوب آپ نے مولانا عبدالجبار ابوہری کے استفسار کے جواب میں تحریر فرمایا۔

۵...... عالم برزخ، ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی لاہور، باراول اگست ۷۸ء صفحات ۶۸، تحریر کردہ ۲۴/ صفر ۱۳۸۹ھ (مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی طرف سے عالم برزخ سے متعلق ایک سوال کے جواب میں حضرت حکیم الاسلامؒ نہایت اہم مکتوب)

۶...... حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خط بنام حضرت شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ (تحریر کردہ ۵/ جولائی ۱۹۶۲ء) مشمولہ سوانح حیات مولانا غلام اللہ خانؒ تالیف محمد عبدالمعبود، کتب خانہ رشیدیہ، مدینہ مارکیٹ راجہ بازار، راولپنڈی، ص: ۳۵۰ تا ۳۵۱۔

۷...... حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مکتوب گرامی (بنام وکیل احمد شیروانی) اس مکتوب میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلفائے کرام کے بارے میں صدیوں پہلے پیشین گویوں کا ذکر ہے،

جو سنسکرت زبان کی ایک کتاب سے (جو حضرت حکیم الاسلامؒ نے ڈھاکہ میں دیکھی تھی) نقل کی گئی ہیں، مشمولہ ماہنامہ ''الحسن''، لاہور (حضرت تھانوی نمبر) ص:۴۸۹ تا ۴۹۳، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء۔

۸...... مکاتیب حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ بنام حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، ۱۶/خطوط، مشمولہ ماہنامہ البلاغ کراچی (مفتی اعظم نمبر) ص:۱۱۹۹ تا ۱۲۱۳، جلد نمبر ۱۳، شمارہ نمبر ۶ تا ۸، جمادی الثانی، ۱۳۹۹ھ تا شعبان ۱۳۹۹ھ۔

۹...... مکاتیب فاضل اجل یادگار سلف حضرت حکیم الاسلامؒ ۱۵/مکاتیب بنام منشی عبدالرحمٰن صاحب مشملہ ''انداز سخن''، مرتبہ منشی عبدالرحمٰن صاحب تخلیق مرکز ۳۳/اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور، ص:۲۱۵ تا ۲۲۵۔

۱۰...... مکتوب حضرت حکیم الاسلامؒ بنام مولانا منظور احمد نعمانی صاحبؒ تحریر کردہ ۷/جمادی الاولی ۱۳۸۳ھ، مشمولہ ذکر طیب مرتبہ حافظ محمد اکبر شاہ بخاری ادارہ اسلامیات لاہور، ص:۱۸۹ تا ۱۹۱۔

۱۱...... مکتوب طیب بنام شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان صاحب، تحریر کردہ ۶/۷/۲۰۸/مشمولہ ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی جولائی ۱۹۷۷ء جلد ۲۵/شمارہ ۷۔

۱۲...... مکتوب گرامی اپنے ایک عزیز کے نام تحریر کردہ ۹/ربیع الثانی، ۱۳۹۱ھ ناشر جناب قاری سراج احمد صاحب، ناظم دارالعلوم پرانی انارکلی، لاہور، ص:۴۔

۱۳...... نجوم ہدایت صحابہ کرام کے معیار حق ہونے سے متعلق بعض منتسبین دارالعلوم کے خط کا تفصیلی جواب، تحریر کردہ ۲۰/جمادی الاول ۱۳۷۵ھ مکتبہ شیخ الاسلام، لغاری روڈ رحیم یار خاں، ص:۱۳ تا ۲۸۔

............❖............

مجالس وملفوظات

۱...... ''اخلاص'' کے بارے میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے ملفوظات، مشمولہ روحانی زندگی کے عناصر اربعہ مرتبہ اخلاق احمد عثمانی دبستان عثمانیہ گلشن اقبال کراچی نمبر ۴۷، ص: ۳۸ تا ۴۸۔

۲...... انٹرویو حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ، ضبط وترتیب مولانا سمیع الحق صاحب ایڈیٹر ماہنامہ ''الحق''، اکوڑہ خٹک پشاور، بتاریخ ۲؍رجب ۱۳۸۸ھ مشمولہ، ماہنامہ الرشید لاہور، دارالعلوم دیوبند نمبر فروری، مارچ ۷۶ء۔

۳...... باتیں دارالعلوم کی اور اکابر کی مجلس میں، (مجلس منعقدہ ۵؍مئی ۱۹۷۸ء بروز جمعہ بعد از عصر) ضبط وترتیب شفیق فاروقی، (اس مجلس میں حکیم الاسلام مولانا محمد طیب اور مولانا عبدالحق صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ کی گفتگو ہوئی جو ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے محفوظ کرلی گئی) مشمولہ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک جلد ۱۳؍شمارہ ۹؍جون ۱۹۷۸ء ص: ۲۳ تا ۳۵۔

۴...... روایات طیب (بزرگان دارالعلوم کے ایمان افروز واقعات) ادارہ اسلامیات لاہور، بار اول دسمبر ۱۹۷۸ء ص: ۱۱۸، ادارہ عثمانیہ رجسٹرڈ ۳۲ مین بازار پرانی انارکلی لاہور، مئی ۱۹۶۲ء، ص: ۱۲۰، تاریخ اختتام کتاب ۱۴؍ذیقعدہ ۱۳۷۳ھ۔

۵...... علم کے بارے میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے ملفوظات، مشمولہ روحانی زندگی کے عناصر اربعہ، مرتبہ اخلاق احمد عثمانی، دبستان عثمانیہ، گلشن اقبال کراچی نمبر ۴۷، ص: ۱۹ تا ۳۵۔

۶...... عمل کے بارے میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے ملفوظات، مشمولہ روحانی زندگی کے عناصر اربعہ، مرتبہ اخلاق احمد عثمانی، دبستان عثمانیہ، گلشن اقبال کراچی نمبر ۴۷، ص: ۴۷ تا ۶۴۔

۷...... فکر آخرت کے بارے میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے ملفوظات، مشمولہ روحانی زندگی کے عناصر اربعہ، مرتبہ اخلاق احمد عثمانی، دبستان عثمانیہ، گلشن اقبال کراچی نمبر ۴۷، ص: ۵۳ تا ۶۴۔

۸...... کلمات طیبات (انٹرویو حضرت حکیم الاسلامؒ متعلقہ مولانا محمد ادریس صاحب کاندہلوی رحمۃ اللہ علیہ بتاریخ ۲۸؍جنوری ۱۹۷۵ء، بمقام جامعہ اشرفیہ لاہور) مشمولہ تذکرہ مولانا محمد ادریس کاندہلوی رحمۃ اللہ علیہ مرتبہ محمد میاں صدیقی، مکتبہ عثمانیہ جامعہ اشرفیہ لاہور طبع اول جولائی ۱۹۷۷ء۔

۹...... مجالس حکیم الاسلامؒ حصہ دوم ترتیب مولانا حبیب اللہ قاسمی، ادارہ تالیفات اشرفیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان صفحات: ۲۴۴۔

۱۰...... مجالس حکیم الاسلامؒ (مع سوانح حیات) حصہ اول ترتیب مولانا حبیب اللہ قاسمی مقدمہ مولانا ظفیر الدین صاحبؒ ادارہ تالیفات اشرفیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان، طبع اول، ربیع الاول ۱۴۰۷ھ صفحات: ۳۶۸۔

۱۱...... ملفوظات جامع شریعت وطریقت حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا محمد طیب صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ مشمولہ کلام العارفین مرتبہ اخلاق احمد قاسمی دبستان عثمانیہ گلشن اقبال کراچی نمبر ۴۷۔

............❖............

کتابوں میں شامل تحریریں

۱...... تاثرات حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ دربارہ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مشمولہ شیخ الاسلامؒ کے حیرت انگیز واقعات مرتبہ ابوالحسن بارہ بنکوی مکتبہ رشیدیہ پاکستان چوک کراچی ۱۹۶۵ء۔

۲...... تبلیغ اصلاح نفس کی ایک جامع تحریک ہے، مشمولہ عالمی تبلیغی جماعت اکابرومشاہیر کی نظر میں مرتبہ عبدالمجید دیلوری اسلامی کتب خانہ بنوری ٹاؤن کراچی، ص:۲۹ تا ۴۸۔

۳...... رائے گرامی حضرت حکیم الاسلامؒ متعلقہ ''تبلیغی جماعت''، مشمولہ تبلیغی جماعت پر اعتراضات اوران کے جوابات مرتبہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ناشران قرآن لمیٹڈ لاہور، ص ۷۹ تا ۸۲۔

۴...... سائنس اور اسلام، مشمولہ سائنس اور اسلام اردو ترجمہ رسالہ حمیدیہ مصنفہ علامہ سین آفندی مترجم سید محمد اسحٰق علی ادارہ اسلامیات لاہور، اکتوبر ۱۹۸۴ء ص: ۵۶۵ تا ۶۴۵۔

۵...... ضمیمہ اقتباس از تحریر حضرت حکیم الاسلامؒ، مشمولہ امداد المفتیین (جلد دوم) مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ص:۹۱ تا ۹۸۔

۶...... سائنس اور مذہب کی حقیقت، مشمولہ مذہب اور سائنس، مرتبہ منشی عبدالرحمٰن طیب اکیڈمی بیرون بوہڑ گیٹ ملتان، باراول اپریل ۱۹۸۲ء، ص:۳۲ تا ۴۶۔

۷...... مختصر تاریخ دارالعلوم دیوبند مشمولہ بیس بڑے مسلمان مرتبہ عبدالرشید مکتبہ رشیدیہ ۱۳۲ اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور، ص:۲۴ تا ۷۹۔

۸...... مقام ادب (مقالہ) مشمولہ اسلامی اخلاق وآداب (مہد سے لحد تک) منشی عبدالرحمٰن، ادارہ اسلامیات لاہور، باراول جولائی ۱۹۸۸ء۔

۹...... نماز کی اہمیت وفضیلت مشمولہ اسلام کے بنیادی ستون مرتبہ منشی عبدالرحمٰن اشاعت اول

۱۹۹۳ء، ص: ۱۰۴ تا ۱۱۹۔

۱۰...... نورالانوار مقالہ متعلقہ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ، مشمولہ الانور، سوانح مشمولہ الانور، سوانح حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ مرتبہ عبدالرحمٰن کوندو دارالمصنفین دہلی، طبع دوم ۱۹۷۸ء۔

۱۱...... مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کے علوم و معارف مرتبہ مولانا محمد اقبال قریشی، دارالاشاعت، اردو بازار کراچی نمبر ۱، اشاعت اول جون ۱۹۸۰ء، ص: ۴۰ تا ۴۳۔

............❖............

رسائل میں مطبوعہ تحریریں

۱...... آہ! مولانا محمد یوسف (مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ) کی وفات پر تعزیتی بیان مشمولہ ہفت روزہ ''خدام الدین'' لاہور جلد۱۱/شمارہ،۱۰/شوال ۱۴۱۶ھ،ص:۳۳ تا ۳۵۔

۲...... اسلام میں عورت کے حقوق، مشمولہ ماہنامہ الفاروق کراچی جلد۱۱،شمارہ۱۰،شوال ۱۴۱۶ھ، ص:۳۳ تا ۳۵۔

۳...... اسلام کا نظام اخوت ومساوات، مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور جلد۳۴،شمارہ۴۶،مئی ۸۹ء،ص:۹ تا ۱۲۔

۴...... اسلام کی اساسی عبادتوں میں حج کا مقام دوقسطوں میں مشمولہ ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، جلد ۳۷،شمارہ۱۲، مارچ ۱۹۷۰ء جلد ۳۸،شمار۱۲، مارچ ۱۹۷۰ء، جلد ۳۸،شمارہ۱،اپریل۔

۵...... افادات علم وحکمت حضرت حکیم الاسلامؒ کی تحریروں سے انتخاب، مرتبہ محمد ارشد خان ڈی آئی خان، مشمولہ ماہنامہ الخیر ملتان جلد۴،شمارہ۱۰،۱۱/شوال ذیقعدہ ۱۴۱۷ھ مارچ ۱۹۹۷ء ص:۶۵ تا ۶۷۔

۶...... الہامی مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے متعلق ایک تحریر، مشمولہ ماہنامہ الرشید لاہور (دارالعلوم دیوبند نمبر) جلد۴، شمارہ۲، ۳/فروری مارچ ۱۹۷۶ء، ص: ۱۳۷ تا ۱۴۱، ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی جلد۹،۱۰،ص:۳۱ تا ۳۵ تحریر کردہ،۲۳/جمادی الاول ۱۳۹ھ۔

۷...... پردہ (اسلام میں پردہ کی شرعی حیثیت) مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور جلد۲۳،شمارہ ۱۹۱۸ء، ۱۸/۲۵/نومبر ۱۹۷۷ء،ص:۲۹ تا ۴۴۔

۸...... تاریخ کا ایک ورق، مشمولہ ماہنامہ اقراء ڈائجسٹ کراچی، جلد۵،شمارہ،۵/جنوری، فروری، ۱۹۹۰ء،ص:۱۰۶ تا ۱۱۰۔

۹...... تکفیر اہل حق اور محترم مدیر (چٹان) کا حق پسندانہ دفاع، مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور

جلد۸،شمارہ ۲۸،نومبر ۶۲ص:۱۱تا۱۶۔

۱۰...... حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تبلیغ کے اثرات،مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور جلد ۳۲، شمارہ ۶-۷، ۲۹/اگست، ۱۹۸۶ء، ص:۲۸۔

۱۱...... حکایات اولیاء، مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور جلد ۳۱ شمارہ ۳۲، ۲۱/فروری، ۱۹۸۶ء، ص:۲۸۔

۱۲...... دارالعلوم دیوبند (بنیادی اصول ومسلک) مشمولہ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک، پشاور، جلد ۱۵، شمارہ، ۵-۶۔

۱۳...... دارالعلوم دیوبند (علمی وتحقیقی مقالہ) یہ مقالہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی تحریرات سے ماخوذ و مستنبط ہے اکثر جگہ فقرے بھی تبرکا آپ ہی کے ہیں، مرتبہ پیرزادہ احمد حسن جامی، گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن کراچی، مشمولہ ماہنامہ الرشید لاہور، دارالعلوم دیوبند نمبر جلد ۴، شمارہ ۲، ۳/فروری، مارچ ۱۹۷۶ء ص: ۳۲۹ تا ۳۴۹۔

۱۴......دارالعلوم کا صد سالہ جشن، مشمولہ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک بشاور جلد ۱۳، شمارہ ۲، نومبر ۱۹۷۷ء۔

۱۵...... دارالعلوم کے ترجمان (حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق حضرت حکیم الاسلامؒ کے تاثرات محترم جناب حافظ اکبر شاہ بخاری صاحبؒ نے آپ کی کتاب ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' اورآپ کے تعزیتی مکتوب کو ملا کر مربوط انداز میں مرتب کیا ہے، مشمولہ ماہنامہ البلاغ کراچی مفتی اعظم نمبر جلد ۱۳، شمارہ ۶-۷-۸، جمادی الثانی تا شعبان ۱۳۹۹ھ، ص: ۲۹-۳۱۔

۱۶...... دو نعتیں، مشمولہ ماہنامہ اقراء ڈائجسٹ کراچی جلد ۳، شمارہ نمبر ۵ ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ، ص: ۱۱۱ تا ۱۳۰۔

۱۷......دین کے اصول ثلاثہ، شریعت، طریقت، سیاست، مشمولہ ماہ نامہ الحق اکوڑ خٹک، پشاور، جلد ۳۲، شمارہ، ۳/دسمبر ۱۹۹۶ء، ص: ۷ تا ۱۲۔

۱۸...... سید حسین احمد مدنیؒ، مشمولہ ہفت روزہ الجمیعۃ لاہور، جلد ۴، شمارہ ۱۱، ۱۹/مارچ، ۱۹۳۹۳ء۔

۱۹...... سیرت کی جامعیت کے چند بنیادی اصول مشمولہ ماہنامہ نقوش (رسول نمبر جلد اول) شمارہ ۱۳۰، دسمبر ۱۹۸۳ء، ادارہ فروغ اردو لاہور، ص: ۳۸ تا ۵۲۔

۲۰......شانِ خلفائے راشدین، تلخیص از جناب محمد اقبال قریشی ہارون آبادی، مشمولہ ماہنامہ الحق اکوڑ خٹک پشاور جلد ۱۳ شمارہ، ۸/مئی ۱۹۷۸ء، ص: ۲۳ تا ۲۷۔

۲۱......شانِ رسالت، تلخیص از جناب محمد اقبال قریشی ہارون آبادی، مشمولہ ماہنامہ الحق اکوڑ خٹک

پشاور صفر ۱۳۹۳ھ۔

۲۲...... شیخ الحدیث مولانا عبدالحق اکوڑوی نظم مشمولہ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک پشاور جلد ۱۷ شمارہ، ار محرم الحرام ۱۴۰۲ھ، ص: ۲۸۔

۲۳...... صحابیت مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور جلد ۲۸، شمارہ ۱۶، ۲۳/ اکتوبر ۱۹۸۲ء ص: ۷-۸۔

۲۴...... صحبت کا اثر مشمولہ ماہنامہ اقراء ڈائجسٹ کراچی نمبر جلد ۵، شمارہ نمبر ۷، ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ، ص: ۲۰ تا ۳۰۔

۲۵...... صدی کا انقلاب (ایک تحریر بسلسلہ پندرہویں صدی ہجری) مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، جلد ۲۶، شمارہ ۲۱، نومبر ۹۸ء، ص: ۱۳ تا ۱۹۔

۲۶...... علم غیب کی تشریح اور متعلقہ شبہات کا رد دو قسطوں میں، مشمولہ ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی جلد ۳۰ شمارہ، ۱۱/ نومبر ۱۹۹۱ء ص: ۱۳ تا ۲۰، شمارہ ۱۳، دسمبر ۱۹۹۱ء ص: ۱۲ تا ۱۸۔

۲۷...... قرآن کریم کی عملی تفسیر، مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین، لاہور جلد ۲۵ شمارہ ۳۰، ۲۵/ جنوری، ۱۹۸۰ء، (۲) ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور جلد ۲۲ شمارہ ۱۱ ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ، ص: ۷ تا ۱۱۔

۲۸...... قرآن کی سمجھ، مشمولہ ماہنامہ اقراء ڈائجسٹ کراچی جلد ۴، شمارہ ۲ مئی ۱۹۸۸ء ص: ۹۶ تا ۱۰۰۔

۲۹...... مسلک علمائے دیوبند مشمولہ الصدیق ملتان، جلد ۱۵ شمارہ ۲-۳، جولائی اگست ۱۹۹۴ء ص: ۲۵ تا ۹۷ (۵۵/ صفحات)

۳۰...... مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق چار سالہ نزاع کا خاتمہ، مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور جلد ۸، شمارہ ۱۰، ۱۳/ جولائی ۶۲ء ص: ۶ تا ۱۶۔

۳۱...... مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مصالحت کے سلسلے میں حضرت حکیم الاسلامؒ کا وضاحتی بیان مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور جلد ۸، شمارہ ۱۸، ۱۴/ ستمبر ۱۹۶۲ء، ص: ۸-۹۔

۳۲...... موت و مابعد الموت مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کی رفیقہ حیات کی وفات پر ان کی تسلی کے لیے صدق جدید کے کئی نمبروں میں نکلتا رہا، حوالہ تذکرہ طیبؒ، ص: ۲۵۹۔

۳۳...... نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم مشمولہ ماہنامہ الخیر ملتان جلد ۱۴، شمارہ ۴، ستمبر ۱۹۹۶ء۔

............❖............

خطبات وتقاریر (کتابی شکل میں)

۱......اجتہاد اور تقلید، (یہ انڈیا احناف کانفرس کا خطبہ صدارت ہے اس میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے مسئلہ اجتہاد و تقلید کی عقلی، فقہی اور تشریعی حیثیت، اجتہاد کی انواع، اجتہاد کی صحیح حدود اور عدم تقلید کے نقصانات کو کھولا ہے) ادارہ اسلامیات ۱۹۰/انار کلی لاہور اشاعت بار اول جون ۸۷ء صفحات: ۱۲۵۔

۲......اخلاص فی الدین، اس تقریر میں نیت کی اہمیت اور دین کو اللہ کے لیے خالص کرنے کی ضرورت اور اہمیت کو مثالوں سے واضح کیا ہے۔ ترتیب، تکمیل قاری عبدالکریم میلسی (وہاڑی) ادارہ کریمیہ تعلیم القرآن، اندرون شیرانوالہ گیٹ لاہور، ۱۹۸۰ء۔

۳......ارشادات حکیم الاسلامؒ (اس میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی دو تقاریر شامل ہیں جو آپ نے دارالعلوم اکوڑ خٹک میں فرمائیں) ۱-معجزات انبیاء ۲- دارالعلوم دیو بند کی روحانی عظمت اور اس کا مقام۔ شعبہ تصنیف و اشاعت دارالعلوم حقانیہ اکوڑ خٹک (پشاور) ربیع الاول ۱۳۸۲ھ، صفحات: ۶۴۔

۴......اسباب عروج وزوال قوم (خطبہ صدارت جمیعۃ علمائے ہند کانفرس) حوالہ تذکرہ طیبؒ، ص: ۲۵۳۔

۵......اسلام میں تعلیم کی اہمیت (مدرسہ عربیہ خیر المدارس کے تعلیم النساء کے شعبہ میں کی گئی اس تقریر میں علم کے تعلق سے اسلام کی امتیازی شان کو بیان کیا گیا ہے، بالخصوص مستورات کی تعلیم کی اہمیت کو کھولا گیا ہے) ترتیب و تکمیل قاری عبدالکریم میلسی ادارہ کریمیہ تعلیم القرآن اندرون شیرانوالہ گیٹ لاہور، یہی تقریر مرتبہ شیر محمد سرحدی ہفت روزہ خدام الدین لاہور جلد ۸ شمارہ ۱۲، ۲۷/جولائی ۶۲ء، میں طبع ہوئی۔

۶......اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام (خطبہ صدارت جمیعۃ علمائے بمبئی (ہند) حوالہ تذکرہ طیب، ص: ۲۵۳۔

۷- اقتباسات از خطبات حکیم الاسلامؒ مشمولہ ذکر طیبؒ مولفہ حافظ محمد اکبر شاہ بخاری ادارہ اسلامیات ۱۹۰/انار کلی لاہور، ص: ۱۴۰ تا ۱۸۵۔

۸......الوہیت کا مقام (بخاری شریف کی آخری حدیث پر علوم ومعارف کے جواہر) ترتیب وتکمیل قاری عبدالکریم میلسی وہاڑی ادارہ کریمیہ تعلیم القرآن اندرون شیرانوالہ گیٹ لاہور، ۱۹۸۰ء صفحات:۶۴۔

۹......انسانی فضیلت کا راز، (۱۳۸۷ھ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی دارالعلوم حقانیہ میں معرکۃ الآراء تقریر) شعبہ تصنیف واشاعت دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور)

۱۰......ایک تاریخی تقریر (بموقع سیرت کانگریس بمقام کراچی) بتاریخ ۲۰؍مارچ ۷۶ء، حوالہ ذکر طیب، ص:۱۶۵-۱۶۶۔

۱۱...... ایمان افروز تقریریں، مرتبہ نثار احمد قاسمی سہارنپوری، کتب خانہ محمودیہ دیوبند یوپی (انڈیا)

۱۲......پرانوں کے لیے طریقہ، اصلاح اور تبلیغی جماعت (یہ تقریر حضرت حکیم الاسلامؒ نے عالمی اجتماع سہارنپور منعقدہ ۷؍جون ۱۹۷۱ء کو بروز دوشنبہ بعد مغرب اسلامیہ انٹر کالج میں فرمائی) مکتبہ زکریا بالمقابل جامع مسجد عالمگیر مارکیٹ لاہور، صفحات:۵۶۔

۱۳......پیغام ربانی بنام عالم انسانی کتب خانہ محمودیہ دیوبند (انڈیا)

۱۴......تبلیغی جماعت اور اصلاح (تبلیغی جماعت کے مختلف اجتماعات میں حضرت قاری صاحب کی تین تقاریر کا مجموعہ) (۱) تعلیم وتبلیغ (بمقام بھوپال اجتماع ۱۵؍فروری ۱۹۶۷ء) (۲) تبلیغی جماعت اور اصلاح (بمقام سہارنپور اجتماع) (۳) جماعتی تبلیغ بمقام مسجد الحفائر مکہ مکرمہ بتاریخ ۱۶؍نومبر ۱۹۷۸ء۔

۱۵......تقاریر مولانا محمد طیبؒ حوالہ تذکرہ طیبؒ، ص:۲۵۳۔

۱۶......تقریر بھوپال اجتماع، ضبط وترتیب، مولوی محمد احسن ندوی، نشان منزل بھوپال (حوالہ تبلیغی جماعت پر اعتراضات اوران کے جوابات از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ علیہ، ص:۸۰)

۱۷......تقریر ختم بخاری (یہ تقریر جامعہ مدنیہ لاہور کے جلسہ میں فارغ التحصیل طلباء کے سامنے فرمائی) ناشر قاری صابر علی اختر خطیب جامع مسجد صدیقی زبیری کالونی منگھو پیر روڈ کراچی ۱۹۷۱ء ص:۳۸۔

۱۸......تقریر دلپذیر حصہ اول مرتبہ قاری عبدالکریم میلسی مدرسہ عربیہ کریمیہ تعلیم القرآن اندرون گیٹ شیرانوالہ لاہور۔

۱۹......تقریر دلپذیر حصہ دوم مرتبہ قاری عبدالکریم میلسی مدرسہ عربیہ کریمیہ تعلیم القرآن اندرون گیٹ شیرانوالہ لاہور، صفحات:۴۷۔

۲۰......تقریر دلپذیر کامل ترتیب وتکمیل قاری عبدالکریم میلسی ادارہ مدرسہ عربیہ کریمیہ تعلیم القرآن

اندرون گیٹ، شیرانوالہ، لاہور، صفحات: ۱۲۸، اس مجموعہ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی تین تقاریر اور ایک درس قرآن شامل ہے (۱) بمقام جامع مسجد شیرانوالہ گیٹ بموقع تقسیم اسناد بتاریخ ۲۸/اپریل ۱۹۶۲ء، (۲) علم اور زیادت علم بمقام دارالعلوم کراچی ۱۹۷۵ء (۳) طریق حفظ ایمان (جو آپ نے ڈیرہ غازی خان میں اپنے اعزہ کے درمیان فرمائی اس کے مطالعے سے آدمی آج کل کے ملحدین کے شر سے محفوظ رہ سکتا ہے) (۴) درس قرآن۔

۲۱...... حدیث دین کے دو اہم رخ، مرتبہ مولوی محمد احسن علی ندوی ادارہ نشان منزل بھوپال (۱۵/ فروری ۱۹۶۷ء) (یہ تقریر آپ نے دارالعلوم تاج المساجد بھوپال میں فرمائی)

۲۲...... حضرات صحابہ کرام کا مقام اہل سنت والجماعت کی نظر میں، یہ تاریخی تقریر مدرسہ معدن العلوم وانمباڑی ضلع شمالی آرکاٹ (صوبہ مدارس) کی جدید عمارت کی تقریب افتتاح و دستار بندی کے موقع پر مورخہ ۳/صفر ۱۴۰۰ھ، ۳۰/دسمبر ۱۹۷۹ء کو فرمائی، سعید اینڈ کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی صفحات: ۲۱۔

۲۳...... حضرت حکیم الاسلامؒ کی منامی تقریر (خواتین سے حکیمانہ خطاب) مرتبہ مشمولہ دینی دستر خوان، ص: ۱۳۴۱ تا ۱۳۴۳۔

۲۴...... حقیقت نکاح، (ایک نکاح کے موقع پر یہ تقریر ارشاد فرمائی) توکل اکیڈمی، جہانگیر روڈ ایسٹ کراچی نمبر ۵، صفحات: ۸۷۔

۲۵...... خطبات حکیم الاسلامؒ (جلد اول) مرتبہ مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری، کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہر گیٹ ملتان، اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں (۱) محمد بن عبداللہ سے محمد رسول اللہ تک (۲) مقام نبوت اور اس کے آثار و مقاصد (۳) کتاب خداوندی اور شخصیات مقدسہ (۴) معجزہ علمی (۵) جہلائے عرب سے مقام صحابیت تک (۶) قرآن حکیم کی عملی تفسیر (۷) حیوۃ طیبہ (۸) فلسفہ علم (۹) وعظ یوسفی۔

۲۶...... خطبات حکیم الاسلامؒ جلد دوم، مرتبہ مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری، کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان، صفحات: ۵۱۲، اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں (۱) معارف القرآن (۲) رحمۃ للعالمین (۳) بیت اللہ الکریم (۴) عبادت وخلافت (۵) اخلاص فی الدین (۶) صحبت صالح (۷) راہ نجات (۸) راہ اعتدال (۹) مقصد حیات (۱۰) فلسفہ موت (۱۱) اسلام میں تصور آخرت (۱۲) فضیلت یوم الجمعہ (۱۳) سنت حضرت خلیل علیہ السلام (۱۴) حقیقت نکاح۔

۲۷......خطبات حکیم الاسلامؒ جلد سوم، مرتبہ مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری، کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان، صفحات: ۲۲۸، اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں (۱) ذکر اللہ (۲) معرفت باری تعالیٰ (۳) رضائے الٰہی (۴) طریق اصلاح (۵) تعارف اہل حق (۶) تسکین فطرت (۷) ادب اور اختلاف رائے (۸) حقوق مالیہ (۹) خطبہ طیبہ۔

۲۸......خطبات حکیم الاسلامؒ جلد چہارم، مرتبہ مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری، کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان، اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں (۱) مقصود بعثت (۲) یاد حق (۳) نبوت وملوکیت (۴) ثمرات علم (۵) عمل صالح (۶) انسانی زندگی کا نصب العین (۷) پرسکون زندگی (۸) سیرت اور صورت (۹) شعب الایمان (۱۰) تعلیم، تبلیغ (۱۱) تبلیغی جماعت اور اصلاح (۱۲) جماعتی تبلیغ (۱۳) فضیلت النساء (۱۴) پیغام ہدایت (۱۵) فکر اسلامی کی تشکیل جدید (۱۶) اسلامی تمدن (۱۷) درس ختم بخاری (۱۸) اظہار تشکر۔

۲۹......خطبات حکیم الاسلامؒ جلد پنجم، مرتبہ مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری، کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان، صفحات: ۴۷۹ اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں (۱) شان بعثت (۲) عناصر سیرت (۳) اسلام عالمی مذہب ہے (۴) انسانی فضیلت کا راز (۵) مقصد نعمت ومصیبت (۶) افادات بخاری (حصہ اول) (۷) افادات بخاری (حصہ دوم)۔

۳۰......خطبات حکیم الاسلامؒ جلد ششم، مرتبہ مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری، کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان، صفحات: ۴۶۰، اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں (۱) علمی معجزہ (۲) خلافت تجوید (۳) نجوم ہدایت (۴) آغاز بخاری (۵) تعلیم وتدریس (۶) تاثیر الاعمال (۷) آداب دعاء (۸) الہامی ادارہ اور اس کے فضلاء کی تنظیم (۹) سائنس اور اسلام۔

۳۱......خطبات حکیم الاسلامؒ جلد ہفتم، مرتبہ مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری، کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان، صفحات: ۴۴۹، اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں (۱) خطبہ استقبالیہ اجلاس صد سالہ دار العلوم دیوبند (۲) اساس توحید (۳) حج بین الاقوامی عبادت (۴) اہمیت تزکیہ (۵) جواہر انسانیت (۶) ملت اسلامیہ کا المیہ اور اس کا علاج (۷) تعلیم نسواں (۸) افادات علم وحکمت۔

۳۲......خطبات حکیم الاسلامؒ جلد ہشتم، مرتبہ مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری، کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان، صفحات: ۴۷۲، اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں (۱) جامعہ اسلامیہ

(مدینہ منورہ) میں خطاب (۲) موتمر اسلامی قاہرہ میں خطاب (۳) عالمی موتمر اسلامی قاہرہ سے واپسی پر خطاب (۴) تقسیم فلسطین اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانان ہندوستان کے دلی جذبات کا اظہار (۵) مذہب اور سیاست (۶) مسلم پرسنل لاء (۷) اسلام اور آزادی (۸) عروج وزوال (۹) تیونس اور مراکش کی جدوجہد آزادی (۱۰) آئینہ خدمت جمیعۃ علمائے ہند (۱۱) نصاب تعلیم کی تدوین (۱۲) تصویر سازی کی مذہبی اور تمدنی حیثیت (۱۳) اشتراک مذہب (۱۴) دنیا وآخرت (۱۵) عالم اصغر (۱۶) افادات علم وحکمت۔

۳۳......خطبات حکیم الاسلامؒ جلد نہم، مرتبہ مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری، کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان، صفحات: ۴۶۹، اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں (۱) اساسی عبادات (۲) اہمیت نماز (۳) رمضان اور اس کے مقاصد وبرکات (۴) فضیلت تقوی (۵) اسلام میں عید کا تصور (۶) محبت ومعیت (۷) تعلیم جدید (۸) مرکز سعادت (۹) امتیاز دار العلوم (۱۰) آزادی ہند کا خاموش رہنما (۱۱) اکابر دیوبند اور آزادی ہند (۱۲) حدیث پاکستان (۱۳) امارت شرعیہ (۱۴) الواعظ (۱۵) اظہار تعزیت (۱۶) جامع مذہب (۱۷) افادات علم وحکمت۔

۳۴......خطبات حکیم الاسلامؒ جلد دہم، مرتبہ مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری، کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان، اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں (۱) نبی امی علیہ الصلوۃ والسلام (۲) راہنمائے انقلاب (۳) عظمت حفظ (۴) آل انڈیا احناف کانفرس سے خطاب (۵) اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام (۶) تکمیل انسانیت (۷) حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ (۸) افادات علم وحکمت۔

۳۵......خطبات حکیم الاسلامؒ جلد یاز دہم، مرتبہ مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری، کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان، اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں (۱) فلسفہ نماز (۲) تفسیر سورۃ ملک (۳) افادات علم وحکمت۔

۳۶......خطبات حکیم الاسلامؒ جلد دوازدہم، مرتبہ مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری، کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان، صفحات: ۴۴۹، اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں (۱) تفسیر سورہ قلم (۲) آثار صحبت (۳) کتابیاتی جائزہ۔

۳۷......خطبات طیبؒ (حضرت حکیم الاسلامؒ رحمۃ اللہ علیہ کی ۱۲ تقاریر کا مجموعہ، ترتیب قاری نثار احمد قاسمی، نظر ثانی مولانا سالم قاسمی ادارہ تالیفات اشرفیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان، صفحات: ۳۸۱۔ اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں (۱) فضائل تقویٰ (۲) اخلاص واصلاح (۳) قرآن کا اعجاز (۴) سیرۃ رحمۃ للعلمین

صلی اللہ علیہ وسلم (۵) گنجینہ علوم و معارف (۶) امارت شرعیہ کے قیام کی ضرورت (۷) مومنانہ زندگی کا قرآنی تجزیہ (۸) عالم انسانیت کا مکمل قانون اسلام (۹) پیغام ربانی کی ضرورت بنام عالم انسانی (۱۰) مذاہب عالم میں اسلام کے تین بنیادی امتیازات (۱۱) تحفہ مومن (۱۲) منامی تقریر (نیند میں عورتوں سے حکیمانہ خطاب)۔

۳۸......خطبہ طیبہ مطبوعہ شاہ آباد (صفحات ۱۳۰) بحوالہ ذکر طیبؒ، ص: ۱۴۳، مولفہ حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، ادارہ اسلامیات لاہور، جون ۱۹۸۴ء۔

۳۹......خطبہ استقبالیہ صد سالہ اجلاس دارالعلوم دیوبند ۱۴۰۰ھ، (اس تقریر میں دارالعلوم دیوبند کے ۱۱۷ سالہ دور کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے) حوالہ ذکر طیب، ص: ۱۱۵۔

۴۰......دارالعلوم کی روحانی عظمت اور اس کا مقام، شعبہ تصنیف و اشاعت دارالعلوم حقانیہ اکوڑ خٹک پشاور (ربیع الاول ۱۳۸۲ھ)

۴۱......دین اور شعائر دین کا احترام، ترتیب و تکمیل قاری عبدالکریم میلسی، ادارہ کریمیہ تعلیم القرآن اندرون شیرانوالہ لاہور، صفحات: ۴۸۔ (اس تقریر میں یہ بیان فرمایا گیا کہ شعائر دین کا تحفظ ادب کے بغیر ناممکن ہے)۔

۴۲......دین و سیاست (خطبہ صدارت جمیعۃ علمائے ہند، ضلع مراد آباد کانفرس) حوالہ تذکرہ طیبؒ ص: ۲۵۳۔

۴۳......سائنس اور اسلام، دارالاشاعت مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی نمبر ۱، اشاعت اول، اپریل ۱۹۷۵ء، صفحات ۱۱۰، (یہ تقریر آپ نے اسلامی تاریخ و تمدن علی گڑھ میں فرمائی جس میں ''سائنس اور اسلام'' کا صحیح مفہوم اور حقیقت بیان فرمائی، نیز یہ ثابت کیا گیا کہ ارتقا پسند انسانی عقل اور ہدایات ربانی کا سنگھم صرف اسلام ہے اس کتاب پر علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا اعزاز علی اور ڈاکٹر محمد ذکی الدین صاحب کی تقاریظ ثبت ہیں)۔

۴۴......سرکاری عربی مدارس کے نصاب کے ترتیب و تدوین (مولانا ابوالکلام آزاد کی زیر صدارت کونسل ہاؤس لکھنؤ میں ۱۹۴۷ء میں یہ تقریر فرمائی جس پر مولانا آزاد جیسے خطیب بھی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے) حوالہ ذکر طیبؒ، ص: ۱۲۷۔

۴۵......طریقت شریعت اور سیاست مکتبہ مدینہ باغپورہ جدید گوجرانوالہ (اس کتابچہ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر کے شروع میں مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خط بھی شامل ہے جو آپ کو لکھا گیا)۔

۴۶......فضائل جمعۃ المبارک، مرتبہ صابر علی اختر مدرس مدرسہ یعقوبیہ بولٹن مارکیٹ کراچی، ۱۳۹۷ھ ص: ۴۶۔ (یہ حکیم الاسلامؒ کی ایک علمی تقریر ہے جس میں فضائل جمعہ کے موضوع پر علم و منطق کے بحرِ ذخار سے آپ کے حساس ذوق نے جواہرات کے انبار لگا دیئے)۔

۴۷......فکر اسلامی کی تشکیل جدید، ترتیب مولانا حسین احمد نجیب، ناشر محمد عثمان میمن لیاقت آباد کراچی نمبر ۱۹، (یہ تقریر جامعہ طیبہ دہلی کے ''ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز'' میں ۲۶/دسمبر ۱۹۷۶ء کو فرمائی) صفحات: ۴۸۔

۴۸......فلسفہ موت، مرتبہ قاری عبدالکریم میلسی، ادارہ کریمیہ اندرون شیرانوالہ گیٹ لاہور، ۱۹۷۹ء صفحات ۶۴۔ (یہ کتابچہ حضرت کی چند تقاریر پر مشتمل ہے جو آپ نے مئی ۱۹۷۸ء میں دارالعلوم خیر المدارس میں جلسہ دستار بندی کے موقع پر ارشاد فرمائی تھی)۔

۴۹......فلسفہ نماز ادارہ اسلامیات لاہور طبع دوم ستمبر ۷۸ء صفحات: ۱۶۰۔ (کتاب کے آخر میں امام غزالی کا ایک چھوٹا سا رسالہ آداب نماز بھی شامل کیا گیا ہے)۔

۵۰......فلسفلہ نماز و تبلیغ مرتبہ سید شبیر علی شاہ صاحب، ناشر دارالعلوم تعلیم القرآن متصل ڈنگی کھوئی راولپنڈی (یہ تقریر آپ نے کمپنی باغ راولپنڈی کے وسیع میدان میں ۲۸/اگست ۱۹۵۰ء کو ایک عظیم اجتماع میں فرمائی)

۵۱......کیا تبلیغی کام ضروری ہے، (یہ کتاب تبلیغ سے متعلق حضرت حکیم الاسلامؒ کی کئی تقاریر کا مجموعہ ہے) صفحات: ۲۴۔ حوالہ تبلیغی جماعت پر اعتراضات اور ان کے جوابات مولفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

۵۲......مذاہب عالم میں اسلام کے تین بنیادی امتیازات (عقل، نقل، استناد) کتب خانہ محمودیہ دیوبند یوپی انڈیا۔

۵۳......معجزات انبیاء مرتبہ قاری عبدالکریم میلسی ادارہ کریمیہ تعلیم القرآن اندرون شیرانوالہ گیٹ لاہور، ستمبر ۱۹۸۰ء۔ (یہ تقریر ۲۳/جون ۱۹۶۲ء کو دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے ارشاد فرمائی)

۵۴......معجزہ کیا ہے؟ ادارہ اسلامیات ۱۹۰/انارکلی لاہور، باراول اگست ۷۸ء صفحات: ۹۵۔ (اس تقریر میں انتہائی مربوط اور دلچسپ انداز میں معجزوں کی حقیقت، انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر ان کے ظہور

کے وجود پر ایک جامع اور مدلل بحث کی گئی ہے)۔

۵۵......معیت وصحبت کا اثر، ترتیب تکمیل قاری عبدالکریم میلسی ادارہ کریمیہ تعلیم القرآن اندرون شیرانوالہ گیٹ لاہور ستمبر ۱۹۸۰ء صفحات: ۳۲۔

۵۶......ملک کے تعلیمی مسائل (۱۹۴۹ء لکھنؤ میں ایک کانفرس منعقد ہوئی جس میں تعلیم کے مسائل پر اس انداز میں روشنی ڈالی گئی کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے زبردست تحسین فرمائی) حوالہ ذکر طیبؒ، ص: ۱۲۹۔

۵۷......مومنانہ زندگی کا قرآنی تجزیہ، کتب خانہ محمودیہ دیوبند یوپی انڈیا۔

۵۸......نماز اسلام کی میزان کل ہے (حضرت حکیم الاسلامؒ کے ایک وعظ کی تلخیص بقلم مولانا محمد اقبال قریشی) صدیقی ٹرسٹ نسیم پلازہ کراچی ۵۔ جون ۱۹۷۷ء صفحات: ۱۷۔

۵۹......وعظ یوسفی ترتیب تکمیل قاری عبدالکریم میلسی ادارہ کریمیہ تعلیم القرآن اندرون شیرانوالہ گیٹ لاہور ستمبر ۱۹۸۱ء صفحات: ۲۸۔ (۱۳۷۸ھ میں جامعہ خیر المدارس ملتان میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے یہ تقریر ارشاد فرمائی جس کا موضوع یوسف علیہ السلام کا قیدیوں کو وعظ ونصیحت تھا، درمیان میں خوابوں کے بارے میں عجیب وغریب تحقیق بھی ضمناً آ گئی ہے)۔

............❖............

خطبات وتقاریر: رسائل میں طبع شدہ

۱......اسوہ حسنہ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے پایاں وسعتیں (پیغام نبوت کے بنیادی اصول و عناصر) (یہ تقریر حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۲/اکتوبر ۱۹۶۲ء کی شب اردو پارک دہلی کے جلسہ سیرت میں ارشاد فرمائی) مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور جلد ۸ شمارہ ۲۶، اکتوبر ۱۹۶۲ء ص: ۱۰-۱۸۔

۲......الوہیت کی چار صفات، ضابط وسامع محمد یوسف خاں جامعہ اشرفیہ لاہور، مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور جلد ۲۴ شمارہ ۴۵، ۱۱/مئی ۹۷ء ص: ۲۵-۲۸۔

۳......امام لاہور رحمۃ اللہ علیہ (۲۸/اپریل ۱۹۶۲ء نماز عشاء کے بعد جامع مسجد شیرانوالہ گیٹ لاہور میں دورۂ تفسیر کے کامیاب طلباء کے جلسہ تقسیم اسناد میں یہ تقریر فرمائی) مشمولہ خدام الدین حضرت لاہوری نمبر ص: ۴۹ تا ۱۷۱۔

۴...... بیان القرآن (تلخیص تقریر حضرت حکیم الاسلامؒ از جناب عبدالرحمٰن لدھیانوی) مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور جلد ۷ شمارہ ۴، جو ۶۱ء، ص: ۹ تا ۱۱۔

۵......تبلیغی جماعت اور اصلاح افادات حضرت حکیم الاسلامؒ، مرتبہ محمد ارشد صاحب ڈی آئی خان تبلیغ سے متعلق حضرت قاری صاحب کی تین اہم تقاریر سے اقتباسات، مشمولہ ماہنامہ الخیر ملتان نومبر ۱۹۹۹ء جلد ۱۴ شمارہ ۶، ص: ۲۹ تا ۳۶۔

۶......تحفۃ المؤمن الموت، (یہ تقریر حضرت حکیم الاسلامؒ نے حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مفتی محمد حسن صاحب، سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمہم اللہ تعالیٰ کی وفات پر ۲۷/اپریل ۱۹۶۲ء بروز جمعۃ المبارک نماز جمعہ سے پہلے جامع مسجد شیرانوالہ گیٹ لاہور میں ارشاد فرمائی) مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور ۴/مئی ۱۹۶۲ء ص: ۴ تا ۵۔

۷......تقریب ختم بخاری شریف میں حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کا خطاب، رپورٹ مولانا

محمد اکرم کاشمیری (یہ تقریر ۱۱؍جولائی ۷۷ء کو جامعہ اشرفیہ لاہور میں ارشاد فرمائی) مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور سلسلہ مطبوعات ۶۱ ص: ۱۱ تا ۳۲۔

۸......تعزیتی خطاب بسلسلہ وفات مولانا خیر محمد جالندھری خیر المدارس ملتان مشمولہ ماہنامہ الرشید ساہیوال ستمبر ۸۳ء۔

۹......جلسہ تقسیم اسناد کی تقریب میں حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر (۴؍ قسطوں میں) قسط نمبر ۱ ہفت روزہ خدام الدین جلد ۸ شمارہ ۵، ۸؍جون ۱۹۶۲ء قسط نمبر ۲ ہفت روزہ خدام الدین جلد ۸ شمارہ ۶، ۲۵؍جون ۱۹۶۲ء۔

۱۰......جلسہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کا خطاب مرتبہ الطاف الرحمٰن کاشمیری، مشمولہ ہفت روزہ ترجمان الاسلام لاہور جلد ۱۹، شمارہ ۱۶۔

۱۱- حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا مختصر خطاب (مولانا عبید اللہ انور صاحب کے سپاس نامے کے جواب میں ارشاد فرمایا، مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور ۱۵؍دسمبر ۷۵ء ص: ۱۱-۱۲-۳۱۔

۱۲......حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی تقریر (پیش کش عزیز الرحمٰن لدھیانوی) دو قسطوں میں، مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور قسط ۱، جلد ۳۹ شمارہ ۴۵، ۳؍نومبر ۱۹۹۵ء قسط ۲ جلد ۳۹ شمارہ ۴۶، ۱۷؍نومبر ۱۹۵۵ء۔

۱۳......خطاب طیبؒ (بمقام دار العلوم سرحد پشاور) مرتبہ پروفیسر محمد سراج صاحب مشمولہ ماہنامہ البیان پشاور جلد ۳ شمارہ ۶ تا ۱۰ دسمبر ۸۵ء تا اپریل ۸۶ء ص: ۵۵ تا ۷۱۔

۱۴......روح اور جسم کی حقیقت مشمولہ ہفت روزہ اداکار لاہور، جنوری فروری ۷۵ء۔

۱۵......سائنس اور اسلام (حضرت حکیم الاسلامؒ علی گڑھ یونیوسٹی میں کی گئی فاضلانہ تقریر کی تلخیص) بقلم محمد سعید الرحمٰن علوی، مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور جلد ۲۱، شمارہ ۲۱، ۷، اکتوبر ۱۹۷۵ء، ۱۱؍شوال ۱۳۹۵ھ، ص: ۱۳ تا ۱۷۔

۱۶......طریق حفظ ایمان مشمولہ ماہنامہ الصدیق ملتان ربیع الاول ۸۰ھ اگست ۱۹۶۰ء۔

۱۷......عقیدہ اور عمل مرتب جناب عمیر ہاشمی (یہ تقریر مدرسہ اسلامیہ لاہور میں ارشاد فرمائی) مشمولہ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور جلد ۱۸ شمارہ ۴۶، ۴۷، ۴۸ (۲۸؍نومبر ۴؍دسمبر ۷۵ء)۔

۱۸......علم اور زیادت علم، مرتبہ صبار دانش (یہ تقریر ۱۹۷۵ء میں دار العلوم کراچی کے اساتذہ اور طلبہ

کے سامنے فرمائی) مشمولہ ماہنامہ البلاغ کراچی ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ ص: ۴۹ تا ۶۱۔

۱۹......فضلائے دیوبند سے خطاب، دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں جلسہ عام کے علاوہ تنظیم فضلائے دیوبند سے خطاب فرمایا، یہ جلسہ ۲۳، ۲۴ر جون ۶۲ء میں منعقد ہوا، مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، جلد ۸ شمارہ ۱۳-۳، اگست ۶۲ء ص: ۷ تا ۱۰ تا ۱۶۔

۲۰......قرآن اور درس قرآن (یہ تقریر آپ نے ڈیرہ غازی خان میں ارشاد فرمائی) مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، ۱۷ر اگست ۶۲ء ص: ۱۰ تا ۱۳۔

۲۱......مدارس دینیہ اور وعدہ بقاء (جامعہ اسلامیہ بھٹکل (جنوبی ہند) کی دعوت پر ۳ر ذی الحجہ ۹۶ھ، چوک بازار میں سنگ بنیاد مکتب جامعہ اسلامیہ کے موقع پر یہ خطاب فرمایا) مشمولہ ماہنامہ البلاغ کراچی جلد ۳۲ شمارہ ۱۰ر فروری ۱۹۹۸ء شوال ۱۴۱۸ھ، ص: ۱۷ تا ۲۳۔

۲۲......مسئلہ قربانی پر ایک نظر (یہ تقریر حضرت حکیم الاسلامؒ نے ۵۵ء میں جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور میں ارشاد فرمائی) مشمولہ (۱) ماہنامہ انوار العلوم لاہور جلد ۴ شمارہ ۵، اگست ۱۹۵۵ء ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ ص: ۵۷ تا ۲۷۔ (۲) ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور جلد ۲۴ شمارہ ۴۱، ۴۲، (دوقسطوں میں) ۹/ ۱۶ر اکتوبر ۸۱ء۔

(۳) ہفت روزہ خدام الدین لاہور جلد ۹، شمارہ ۴۸، ص: ۷ تا ۱۰، ۱۵ تا ۱۷۔

۲۳......مقاصد شریعت ترتیب وتزئین مولانا نعیم الدین صاحب فاضل و مدرس جامعہ مدنیہ لاہور (۷ر قسطوں میں) قسط نمبر ۱، مشمولہ ماہنامہ ''انوار مدینہ'' لاہور جلد ۵ شمارہ ۷ر اپریل ۱۹۹۷ء ص: ۲۳ تا ۲۵، قسط نمبر ۲، مشمولہ ماہنامہ ''انوار مدینہ'' لاہور جلد ۵ شمارہ ۸ر مئی ۱۹۹۷ء ص: ۱۳ تا ۲۲۔ قسط نمبر ۳، مشمولہ ماہنامہ ''انوار مدینہ'' لاہور جلد ۵ شمارہ ۹ر جون ۱۹۹۷ء ص: ۱۴ تا ۲۱ - ۲۵، قسط نمبر ۴، مشمولہ ماہنامہ ''انوار مدینہ'' لاہور جلد ۵ شمارہ ۱۰ر جولائی ۱۹۹۷ء ص: ۱۱ تا ۱۷۔ قسط نمبر ۵، مشمولہ ماہنامہ ''انوار مدینہ'' لاہور جلد ۵ شمارہ ۱۲ر ستمبر ۱۹۹۷ء ص: ۱۷ تا ۲۴، قسط نمبر ۷، مشمولہ ماہنامہ ''انوار مدینہ'' لاہور جلد ۷ شمارہ ۲ر نومبر ۱۹۹۷ء ص: ۸ تا ۱۳۔

۲۴......یاد ایام (یہ تقریر انڈیا ریڈیو پر نشر کی گئی) مشمولہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور جلد ۳۴ شمارہ ۲۴، ۳۱ر مارچ ۱۹۷۸ء۔

............❖............

کتابوں میں تذکرہ

۱......اکابر علمائے دیوبند حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، ادارہ اسلامیات لاہور (تذکرہ حضرت قاری طیب صاحبؒ، ص: ۳۴۸ تا ۳۵۰)۔

۲......اکابر کے خطوط محمد شاہد سہارنپوری، مکتبہ زکریا بالمقابل جامع مسجد عالمگیر مارکیٹ لاہور (تذکرہ حضرت قاری صاحبؒ ص: ۱۷۰)۔

۳......بزم اشرف کے چراغ پروفیسر احمد سعید، مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ، ''التصویر'' ۶۲ر چیمبر لین روڈ لاہور مئی ۵۷ (تذکرہ حضرت قاری صاحبؒ، ص: ۶۴ تا ۶۷) مصباح اکیڈمی جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ لاہور اگست ۹۲ء (تذکرہ قاری صاحبؒ، ص: ۷۱ تا ۷۴)

۴......بیس مردان حق (جلد دوم) عبد الرشید ارشد مکتبہ رشیدیہ لاہور بار اول جمادی الثانی ۱۴۱۷ھ اکتوبر ۹۶ء (تذکرہ حضرت قاری صاحبؒ، بقلم احمد کامران ص: ۷۷۷ تا ۹۰۸)

۵......تاریخ دار العلوم دیوبند مولانا قاری طیب صاحبؒ، دار الاشاعت اردو بازار کراچی، اشاعت اول ستمبر ۷۲ء (تذکرہ حضرت قاری صاحبؒ، بقلم عزیز احمد قاسمی ص: ۴۷ تا ۶۷)

۶......تحریک پاکستان اور علمائے دیوبند، حافظ محمد اکبر شاہ بخاری ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی (تذکرہ حضرت قاری صاحبؒ، ص: ۴۷۳ تا ۵۰۲)۔

۷......پرانے چراغ (جلد دوم) مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام ناظم آباد کراچی۔

۸......تذکرہ طیبؒ محمد ابوبکر غازی پوری المکتبہ الاثریہ قاسمی منزل سید واڑہ غازی پور (انڈیا) ص: ۲۶، ۱۴۰۳ھ۔

۹......جہاں دانش (جلد دوم) بحوالہ ماہنامہ الرشید (دار العلوم دیوبند نمبر) ص ۴۹۷، جامعہ رشیدیہ ساہیوال ۱۹۷۶ء۔

۱۰......دار العلوم کے ۱۱۷/سال، شائع کردہ دفتر اجلاس صد سالہ دار العلوم دیو بند پاکستان میں ادارہ اسلامیات لاہور اشاعت اول مارچ ۱۹۸۱ء ص: ۶۲ حضرت حکیم الاسلامؒ کا تذکرہ بعنوان عہد حاضر اور دار العلوم ص: ۵۷ تا ۵۸۔

۱۱......ذکر طیبؒ حافظ محمد اکبر شاہ بخاری ادارہ اسلامیات لاہور ۱۴/جون ۱۹۸۴ء ص: ۳۰۴۔

۱۲......روحانی زندگی کے عناصر اربعہ اخلاق احمد عثمانی موسوم بہ کلیم عثمانی دبستان عثمانیہ گلشن قبال کراچی (تذکرہ حضرت حکیم الاسلامؒ ص: ۵-۸)۔

۱۳......سیرت المصطفی جلد سوم مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ مکتبہ عثمانیہ بیت الحمد واقع جامعہ اشرفیہ لاہور، طبع دوم جون ۱۹۸۳ء رمضان ۱۴۰۳ھ (تذکرہ حکیم الاسلامؒ ص: ۳۹۲)

۱۴......شخصیات و تاثرات مولانا محمد یوسف لدھیانوی مکتبہ لدھیانوی جامعہ مسجد فلاح فیڈرل بی ایریا، نصیر آباد بلاک نمبر ۱۴ کراچی ۳۸، جون ۱۹۹۵ء، تذکرہ حکیم الاسلامؒ ص: ۲۱۴ تا ۲۱۷۔

۱۵......مشاہیر علمائے دیو بند (جلد اول) قاری فیوض الرحمٰن صاحب مکتبہ العزیزیہ ۱۳/اردو بازار، لاہور بار اول ۱۹۷۶ء، ۱۳۹۶ھ (تذکرہ حکیم الاسلامؒ ص: ۵۲۸ تا ۵۳۳)

۱۶......نقش دوام (سوانح مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ) سید انظر شاہ مسعودیؒ: المکتبۃ البنوریہ: علامہ بنوری ٹاؤن کراچی نمبر ۵ (تذکرہ حکیم الاسلامؒ ص: ۴۸ تا ۴۹)

۱۷......نقوش رفتگان: مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ عالی، ادارۃ المعارف کراچی نمبر ۱۴، طبع جدید جنوری ۱۹۹۴ء، رجب ۱۴۱۴ھ، تذکرہ حکیم الاسلامؒ ص: ۱۸۹ تا ۱۹۴۔

۱۸......کاروان آخرت مولانا سمیع الحق مرتب مولانا محمد ابراہیم فانی موتمر المصنفین دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور (تذکرہ حکیم الاسلامؒ ص: ۲۰۹ تا ۲۳۴)

۱۹......مقدمہ انوار الباری شرح اردو صحیح بخاری (حصہ دوم) افادات مولانا انور شاہ صاحب کشمیری، مکتبہ ناشر العلوم بجنور طبع ثانی ۱۳۶۳ھ (تذکرہ حکیم الاسلامؒ ص: ۲۵۵)

۲۰......الانوار (سوانح حضرت انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) مرتبہ عبد الرحمٰن کوندو، ندوۃ المصنفین دہلی طبع دوم فروری ۱۹۷۸ء (تذکرہ حکیم الاسلامؒ ص: ۲۴۳ تا ۲۴۵)

۲۱......تاریخ دار العلوم دیو بند سید محبوب احمد رضوی، جامعہ رشیدیہ ساہیوال مارچ اپریل ۱۹۸۰ء (تذکرہ حکیم الاسلامؒ ص: ۳۱۸ تا ۳۱۹، زیر عنوان فضلائے دیو بند تذکرہ حکیم الاسلامؒ ص: ۲۴۹ تا ۲۵۰، زیر عنوان صدر مدرسین۔

............❖............

رسائل میں ذکر

۱...... ماہنامہ البلاغ کراچی فروری ۱۹۷۵ء رپورٹ دورۂ پاکستان حضرت حکیم الاسلامؒ۔

۲...... ماہنامہ البلاغ کراچی جلد نمبر ۱۷، شمارہ ۱۱ ر ستمبر ۱۹۸۳ء، ذیقعدہ ۱۴۰۳ھ، (تذکرہ حکیم الاسلامؒ بقلم مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ عالی، ص: ۳-۸)۔

۳...... ماہنامہ البیان پشاور جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۲، اگست ۱۹۸۳ء، ذیقعدہ ۱۴۰۳: (تذکرہ حکیم الاسلامؒ، بقلم مولانا محمد اشرف صاحب، ص: ۳ تا ۱۳)

۴...... ماہنامہ الحق اکوڑ خٹک جلد نمبر ۱۸ شمارہ ۱۱، اگست، ذیقعدہ ۱۴۰۳ھ (۱) حکیم الاسلامؒ کی جدائی پر مولانا عبد الحق صاحب کے تاثرات، ص: ۹ تا ۱۳۔ (۲) اشکہائے غم مرثیہ بروفات حضرت حکیم الاسلامؒ، حافظ محمد ابراہیم فانی ص: ۵۷۔

۵...... ماہنامہ الخیر ملتان جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۷ (تذکرہ حکیم الاسلامؒ، بقلم مولانا محمد ازہر شاہ صاحبؒ، ص: ۲۶ تا ۴۰)۔

۶...... ماہنامہ الرشید ساہیوال ستمبر ۱۹۸۳ء نمبر ۱۱ شمارہ ۹۔

۷...... ماہنامہ الرشید ساہیوال (تاریخ دار العلوم دیوبند نمبر) از سید محبوب رضوی جلد ۸ شمارہ ۴-۵، مارچ، اپریل ۱۹۸۰ء جامعہ رشیدیہ ساہیوال حضرت حکیم الاسلامؒ کا تذکرہ بعنوان فضلائے دیوبند صدر مدرسین ص: ۲۱۸-۲۱۹-۲۵۰۔

۸...... ماہنامہ الرشید لاہور (دار العلوم دیوبند نمبر) جلد ۴، شمارہ ۲-۳، فروری، مارچ ۱۹۷۶ء، الف: مدح طیبؒ، نظم قاری عبد العزیز شوقی ص: ۱۶۵۔ ب: مرقع عقیدت بخدمت عالی جناب حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ۔ از قاری عبد العزیز شوقی ص ۴۹۲۔ ج: تذکرہ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ بقلم حکیم انیس احمد صدیقی ص: ۵۸۱ تا ۵۸۲۔

۹......ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی اگست ۱۹۸۳ء جلد نمبر ۲۱ شمارہ ۸ (تذکرہ حضرت حکیم الاسلامؒ بقلم ابواحمد سجاد بخاری، ص:۲ تا ۴)۔

۱۰......ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی، جلد نمبر ۳۶، شمارہ ۲-۳ فروری، مارچ ۱۹۹۷ء (تذکرہ حضرت حکیم الاسلامؒ، ص: ۲۵-۲۶، بقلم میاں محمد الیاس)۔

۱۱......ماہنامہ بینات کراچی جلد ۴۳، شمارہ ۵/ستمبر ۱۹۸۳ء ذیقعدہ ۱۴۰۳ھ، الف: مولانا کا تذکرہ بقلم مولانا محمد یوسف لدھیانوی ص:۲/۶۔ ب: مولانا کا تذکرہ بقلم کلیم عثمانی ص:۵۸ تا ۶۱۔

۱۲......ماہنامہ دارالعلوم دیوبند جلد ۶۲، شمارہ ۲، نومبر ۱۹۸۱ء، محرم ۱۴۰۲، مضمون قاری طیب صاحبؒ کی طویل ترین عظیم خدمات بقلم مولانا عبدالحق محافظ خانہ دارالعلوم دیوبند۔

۱۳.....ہفت روزہ لولاک فیصل آباد جلد ۲۰ شمارہ ۱۸، ۲۶ اگست ۸۳ء ۱۶/ذیقعد ۱۴۰۳ھ، مضمون حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ، بقلم مولانا غلام مرتضی صاحب جامعہ اشرفیہ شاہ کوٹ۔

۱۴......ماہنامہ فاران کراچی جولائی ۸۳، جلد نمبر ۳۴ شمارہ ۱۰ تذکرہ قاری صاحب، ص:۴۹ تا ۵۱۔

۱۵.....ہفت روزہ خدام الدین لاہور، ۲۰/جولائی ۱۹۶۲ء ص ۱۹، جلد نمبر ۸، شمارہ نمبر ۱۱، (نظم سید امین گیلانی بعنوان حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(بشکریہ: حافظ قاری بشیر حسین حامد صاحب، پاکستان)

............❖............

حوالہ جات

(۱) از: مولانا عطاء اللہ بخاریؒ، سواطع الالہام، ص: ۹۴۰

(۲) مولانا مناظر احسن گیلانی، ہندوستان کے دینی مدارس، ص: ۱۰۱

(۳) مولانا مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت ص: ۳۹۷/۳۹۶

(۴) رسالہ ماہنامہ ''دارالعلوم'' دیوبند

(۵) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، پچاس مثالی شخصیات، ص: ۳۷ تا ۴۲

(۶) روئیداد دارالعلوم دیوبند ۱۳۴۳ھ؛ تعلیمی ریکارڈ حضرت حکیم الاسلامؒ، مفتی محمد الیاس گونڈوی، محرر دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

(۷) سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج: ۲، ص: ۳۴،

(۸) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، پچاس مثالی شخصیات، ص: ۷۸

(۹) مولانا زکریا صاحبؒ، آپ بیتیؒ، ج: ۲، ص: ۱۶۷

(۱۰) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، پچاس مثالی شخصیات، ص: ۱۳۴ تا ۱۳۷

(۱۱) ایضاً

(۱۲) ایضاً، ص: ۱۱۷

(۱۳) ایضاً

(۱۴) ایضاً، ص: ۱۲۸

(۱۵) ایضاً۔

(۱۶) مولانا ازہر شاہ قیصر، حیات انورؒ، ص: ۳۸

(۱۷) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، پچاس مثالی شخصیات، ص: ۱۲۴ تا ۱۲۹

(۱۸) ماہنامہ البلاغ، کراچی، مفتی اعظم نمبر

(۱۹) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، پچاس مثالی شخصیات، ص: ۱۲۱ تا ۱۲۳

(۲۰) ایضاً، ص: ۱۳۹ تا ۱۵۱

(۲۱) ایضاً، ص: ۱۵۵

(۲۲) ایضاً، ص: ۱۷۰

(۲۳) ماہ نامہ بینات کراچی، ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ، ص: ۲۵

(۲۴) سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج ۲، ص: ۱۳۵

(۲۵) ہفت روزہ لولاک، خصوصی شمارہ حکیم الاسلامؒ نمبر، فیصل آباد، پاکستان

(۲۶) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، جذبات الم، ص: ۸ تا ۹

(۲۷) ایضاً، ص: ۶ تا ۷

(۲۸) ایضاً، ص: ۷

(۲۹) ایضاً، ص: ۱۰

(۳۰) ایضاً، ص: ۱۸ تا ۱۹

(۳۱) ماہنامہ الحق، اگست ۱۹۸۳ء اکوڑہ خٹک

(۳۲) مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیں: سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص: ۲۷۸ تا ۳۷۸؛ رجسٹر تجاویز مجلس شوریٰ ۱۳۴۰ھ؛ روئیداد ۱۳۴۹ء - ۱۳۴۸ھ ص: ۵؛ حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، سفر نامہ افغانستان؛ مولانا محمد سالم قاسمی، سفر نامہ برما؛ ماہنامہ دارالعلوم کا عالمی موتمر اسلامی قاہرہ نمبر، ص: ۱۵، ۱۹۶۵ء مطابق ۱۳۸۳ھ؛ ماخوذ ہفت روزہ، افلاک، حکیم الاسلامؒ نمبر، لاہور؛ مختصر رپورٹ ماہنانہ دارالعلوم دیوبند ۱۹۷۶ء؛ ماہنامہ الرشید ساہیوال، ستمبر ۱۹۸۳ء؛ ماہنامہ الرشید، مئی ۱۹۷۸ء؛ حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، سیر کشمیر؛ خصوصی انٹرویو، حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب۔

(۳۳) اخبار عزائم لکھنؤ، ۱۴/ نومبر ۱۹۷۲ء؛ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام، ص: ۱۷-۱۶

(۳۴) روئیداد، دارالعلوم وقف دیوبند، ۱۹۸۳ء تا ۲۰۱۳ء

(۳۵) خصوصی شمارہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ، ندائے دارالعلوم ۱۹۸۵ء

(۳۶) ایضاً

(۳۷) مولانا نور عالم خلیل امینی، پس مرگ زندہ، ص: ۱۱۲

(۳۸) خصوصی شمارہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ، ندائے دارالعلوم ۱۹۸۵ء

(۳۹) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج، ص: ۱۵، ۱۴

(۴۰) ایضاً ص: ۸۸

(۴۱) ایضاً ص: ۱۱۳ تا ۱۱۴

(۴۲) ایضاً ص:۱۰۲

(۴۳) خصوصی شمارہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ، ندائے دارالعلوم ۱۹۸۵ء

(۴۴) خطبات ڈاکٹر ذاکر حسین، ص:۳۶

(۴۵) مولانا حامد الانصاری غازی، استاذ اکبر، ص:۲۵

(۴۶) مولانا فاروق قاسمی، معارف حکیم الاسلام، ص:۳۲۰ تا ۳۲۴

(۴۷) ماہنامہ البلاغ، خصوصی نمبر، دارالعلوم کراچی

(۴۸) خصوصی شمارہ، ماہنامہ ندائے دارالعلوم دیوبند، ۱۵/ جولائی تا یکم ستمبر، ۱۹۹۴

(۴۹) ماہنامہ البلاغ، خصوصی نمبر، دارالعلوم کراچی

(۵۰) مولانا نور عالم خلیل امینی، پس مرگ زندہ، ص:۱۴۵

(۵۱) مولانا ادریس صاحب ہوشیار پوری، خطبات حکیم الاسلام، ج۱، ص:۶۸

(۵۲) ایضاً: ج۱، ص:۱۱۳

(۵۳) ایضاً، ج۱، ص۱۴۹

(۵۴) ایضاً، ج۲، ص۴۹

(۵۵) ایضاً، ج۲، ص:۱۴۰

(۵۶) ایضاً، ج۱، ص:۸۳

(۵۷) ایضاً، ج۱، ص:۲۵۶

(۵۸) ایضاً، ج۱، ص:۳۳۹

(۵۹) ایضاً، ج۲، ص:۵۶۶

(۶۰) ایضاً، ج۲، ص:۱۵۴

(۶۱) ایضاً، ج۲، ص:۲۰۵

(۶۲) ایضاً، ج۲، ص:۲۴۳

(۶۳) ایضاً، ج۲/ص:۲۷۵

(۶۴) ایضاً، ج۲، ص:۳۵

(۶۵) ایضاً، ج۲، ص:۳۰۶

(۶۶) ایضاً، ج۲، ص:۵۶۰

(۶۷) ایضاً، ج۴، ص:۵۵۴

(۶۸) ایضاً، ج ۴، ص: ۵۷

(۶۹) ایضاً، ج ۴، ص: ۱۱۵

(۷۰) ایضاً، ج ۴، ص: ۱۹۲

(۷۱) ایضاً ج ۴، ص: ۲۲۵

(۷۲) ایضاً، ج ۴، ص: ۲۴۱

(۷۳) ایضاً، ج ۴، ص: ۳۲۰

(۷۴) ایضاً، ج ۴، ص: ۳۷۸

(۷۵) ایضاً، ج ۴، ص: ۳۹۹

(۷۶) ایضاً، ج ۴، ص: ۴۳۶

(۷۷) ایضاً ج ۴، ص: ۴۹۳

(۷۸) خصوصی شمارہ، سہ ماہی ندائے دارالعلوم دیوبند، ۱۵ر جولائی تا یکم ستمبر ۱۹۹۴ء

(۷۹) ایضاً

(۸۰) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، دینی دعوت کے قرآنی اصول، ص: ۱۱۷

(۸۱) ایضاً، ص: ۱۳۳

(۸۲) ایضاً، ص: ۱۴۲

(۸۳) ایضاً، ص: ۱۵۵

(۸۴) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، قربانی کی حقیقت، ص: ۱۹۹

(۸۵) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، اردو زبان کی شرعی حیثیت، ص: ۳۹۵

(۸۶) ایضاً، ص: ۱۰۱

(۸۷) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، عالم انسانیت کا مکمل قانون، ص: ۱۰۲

(۸۸) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، نکاح کی حقیقت ص: ۵۸۹

(۸۹) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، مسئلہ تقدیر، ص: ۲۱۶

(۹۰) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، علم غیب، ص: ۱۸

(۹۱) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، اجتہاد اور تقلید، ص: ۳۸۳

(۹۲) ایضاً، ص: ۴۰۹

(۹۳) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، نسب اور اسلام، ص: ۳۸

(۹۴) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، شہید کربلا اور یزید، ص: ۳۴۶
(۹۵) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، اسلامی تہذیب وتمدن، ص: ۱۹۶
(۹۶) ایضاً، ص: ۲۷۷
(۹۷) ایضاً ص: ۵۰۳
(۹۸) ایضاً، ص: ۵۳۸، ۵۳۹
(۹۹) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، فلسفۂ نماز، ص: ۵۸۲
(۱۰۰) ایضاً، ص: ۵۹۳
(۱۰۱) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، فطری حکومت، ص: ۲۹۰
(۱۰۲) ایضاً، ص: ۳۰۴، ۳۰۷
(۱۰۳) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، علمائے دیوبند کا دینی رخ ص: ۵۶۱
(۱۰۴) انتخاب از مولانا حبیب اللہ قاسمی، مجالس حکیم الاسلام
(۱۰۵) اقتباسات از مولانا عبدالبصیر، ملفوظات حکیم الاسلامؒ
(۱۰۶) قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ج ۳، ص: ۴۷۰
(۱۰۷) اقتباسات از مولانا فاروق قاسمی، معارف حکیم الاسلام
(۱۰۸) اقتباسات از مولانا شفیق قاسمی، مکتوبات حکیم الاسلام
(۱۰۹) سید احتشام حسین، تنقیدی نظریے، ج ۲، ص: ۵۲
(۱۱۰) مولانا محمد اسلم قاسمی، عرفانِ عارف، ص: ۱۵
(۱۱۱) خصوصی شمارہ، سہ ماہی ندائے دارالعلوم دیوبند ۱۵/ جولائی تا یکم ستمبر ۱۹۹۴ء
(۱۱۲) اجلاس صد سالہ کے موقع پر شائع ہونے والے منظوم کلام ''ارمغانِ صد سالہ'' سے ماخوذ
(۱۱۳) انتخاب از حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، کلمات طیبات
(۱۱۴) انتخاب از مولانا محمد اسلم قاسمی، سپاس نامے
(۱۱۵) شاہِ افغانستان دارالعلوم دیوبند میں؛ روئیدادِ خیر مقدم آنریبل مولانا ابوالکلام آزاد، وزیر تعلیم حکومت ہند؛ صدر جمہوریۂ ہند دارالعلوم دیوبند میں؛ پروفیسر ہمایوں کبیر دارالعلوم دیوبند میں

............❖............

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی زندگی علم و فضیلت، بصیرت، وسعت علم اور علم کی پختگی و رسوخ، خدمت دین اور اس کے ساتھ اصلاح و وعظ و ارشاد، عوام سے رابطہ، تربیت و دعوت و بیعت و ارشاد ان سب پہلوؤں اور گوشوں پر محیط تھی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

حضرت حکیم الاسلام کو خدا تعالیٰ نے قرآن و حدیث پر گہری نظر دی تھی، وہ اسلام کے اصول و اساس، فلسفہ و حکمت کے رمز شناس تھے، اور انہیں علم و حکمت کی تشریح و تفصیل، اظہار و بیان کی بے پناہ صلاحیت دی گئی تھی، مشکل سے مشکل موضوع پر وہ گھنٹوں اتنے آسان اور دل نشین انداز میں اظہار خیال فرماتے تھے کہ سننے والے کے دل میں بات اترتی چلی جاتی تھی، اپنی اس صلاحیت اور خصوصیت کے لحاظ سے وہ منفرد شخصیت کے مالک تھے۔

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحبؒ

ہندوستان کی سرحدوں کو توڑ کر دارالعلوم دیوبند کا تعارف، بزرگوں کی معرفت ان کے معمول کا دل آویز ثمرہ ہے، بہت سے گمنام متعارف ہو گئے۔ بہت سے نامور جاوید بن گئے، کاش کہ وہ اپنی سوانح جس کے لئے میں نے بہت اصرار کیا قلمبند فرماتے تو ایک صدی کی داستان علم و عمل مرتب شکل میں ملتی۔

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحبؒ

حکیم الاسلام کی دسیوں تصانیف آپ کے بلند علمی مقام کی شاہد ہیں اور ان کے مطالعہ سے دین کی عظمت و محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جہاں تک وعظ و خطابت کا تعلق ہے اس میں تو اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو ایسا عجیب و غریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

Hujjat al-Islām Academy

Al-jamia al-Islamia Darululoom Waqf, Deoband

Eidgah Road, P.O. Deoband-247554, Distt. Saharanpur U.P. India

Tel : + 91-1336-222352, Mob: + 91-9897076726

Website: www.dud.edu.in, www.darululoomwaqf.com

Email: hujjatulislamacademy@dud.edu.in, hujjatulislamacademy2013@gmail.com

بیسویں صدی میں قرونِ اولیٰ کے علمی کمالات دینی افکار اور مثالی سیرت و اخلاق کی حامل
ایک ممتاز دینی شخصیت ایشیا کی مثالی دینی دانش گاہ دارالعلوم دیوبند کے طویل المیعاد اور مثالی
مہتمم، فکرِ ولی اللّٰہی کے نقیب، حکمتِ قاسمیہ کے شارح، مسلکِ دیوبند کے ترجمان

حکیم الاسلام حضرت مولانا

محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

کی حیاتِ مبارکہ و خدماتِ جلیلہ کا مفصل جائزہ

حسبِ ایماء

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہ

مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

نگرانی

حضرت مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی

نائب مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

ترتیب

غلام نبی قاسمی

استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند

محمد شکیب قاسمی

استاذ تفسیر و ناظم حجۃ الاسلام اکیڈمی
دارالعلوم وقف دیوبند

باہتمام

حجۃ الاسلام اکیڈمی

دارالعلوم وقف دیوبند

تفصیلات

نام کتاب

حیاتِ طیب (جلد دوم)

ترتیب

- غلام نبی قاسمی، استاذ دارالعلوم وقف دیو بند
- محمد شکیب قاسمی، استاذ دارالعلوم وقف دیو بند

صفحات :

اشاعت

رجب المرجب ۱۴۳۵ھ مطابق مئی ۲۰۱۴ء

پروف ریڈنگ

حجۃ الاسلام اکیڈمی اسٹاف

کمپوزنگ

عمر الٰہی، دارالعلوم وقف دیو بند

باهتمام

حجۃ الاسلام اکیڈمی، دارالعلوم وقف دیو بند

فہرست مضامین

............❖............

فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید

آج جس کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ منہاجِ نبوت کو سمجھ کر فکرِ اسلامی کو ایک نئی ترتیب اور نئے رنگِ استدلال سے آج کی زبان اور اسلوب سے مرتب کیا جائے کہ حقیقی معنی میں فکر اسلامی کی یہی تشکیل جدید ہوگی، ورنہ منہاج اور اس کے متوارث ذوق سے ذرا بھی ہٹ کر تشکیل ہوگئی تو وہ تشکیل نہ ہوگی بلکہ تبدیل ہو جائے گی، جو قلبِ موضوع ہوگا۔ اس لئے تشکیل جدید کا خلاصہ دولفظوں میں یہ ہے کہ ''مسائل ہمارے قدیم ہوں اور دلائل جدید کہ یہ تشکیل قائم کر کے ہم خلافتِ الٰہی اور نیابتِ نبویؐ کا حق ادا کرسکیں''۔

(حضرت حکیم الاسلامؒ)

باب سوم

حوادث دہر تیری شہرت نہ زندگی بھر مٹا سکیں گے
ترے قدم کی بلندیوں کو عروج والے نہ پا سکیں گے

نواسنجِ انا الحق

اے نواسنجِ انا الحق! ترا کہنا تھا بجا
پر نہیں پاسِ ادب، عشق میں دعویٰ ہونا

ہے انا عشق میں، اک رازِ درونِ پردہ
پر نہیں راز کا حق، راز کا افشا ہونا

عشق خود دار ہے، خود رازِ درونِ عشاق
عشق کی خامی و رسوائی ہے، لب وا ہونا

شور برپا نہ ہو، ہر ایک بلا برسر
یاں ہے برسر ہی ہنر، عیب ہے برپا ہونا

اپنے آپے میں خودی ہو، تو خودی ہے ورنہ
اپنے آپے سے گذرنا ہی ہے، رسوا ہونا

غیرتِ عشق ہے، اسرارِ خودی ہوں خاموش
نہ کہ اسرارِ خدا تک سے بھی گویا ہونا

(حضرت حکیم الاسلامؒ)

............❖............

ہدیۂ تشکر

''حیات طیبؒ'' کے اس جزء میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی حیات وخدمات پر مشاہیر علماء وارباب قلم کی نگارشات پیش کی گئی ہیں، بہ ایں ہمہ حضرت حکیم الاسلامؒ جیسی ہمہ جہت شخصیت کے بعض اہم گوشوں پر تشنگی کا احساس ہوتا ہے مگر کیا کیجئے ؎

طرفیں رکھے ہے ایک سخن ور چار چار
کیا کیا کہا کریں ہیں زبان وقلم سے

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر مقالہ نگار حضرات میں سے رفتگاں کے حق میں دعاء **اللّٰھم اغفرھم واکرم مثوٰھم** اور پائندگان کے لئے تہ دل سے شکریہ۔

حکیم الاسلامؒ کی حیات وخدمات پر ملک وبیرونِ ملک سے اہل علم واہل قلم بالخصوص حلقۂ دیوبند سے تعلق رکھنے والے احباب وفضلائے دارالعلوم کی قلمی کاوشیں بڑی تعداد میں حجۃ الاسلام اکیڈمی کو موصول ہوئیں مگر افسوس ہے کہ ہم ان میں سے ''حیات طیب'' کے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے چند ایک ہی کو شامل اشاعت کر سکے ہیں۔

اس موقع پر ہم ''حکیم الاسلام عالمی سیمینار'' بمقام دارالعلوم وقف دیوبند پر موصول شدہ بعض مقالات جو ہمیں دفتر ماہنامہ ''ندائے دارالعلوم وقف دیوبند'' سے بذریعہ جناب محترم مولانا عبداللہ ابن القمر الحسینی دستیاب ہوئے ان کے لئے مولانا موصوف کے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

............❖............

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت زمانی رقبہ کے لحاظ سے بھی بہت وسیع اور جامع تھی، اور معنوی رقبہ کے لحاظ سے بھی زمانی رقبہ تو ۸۸/سال کا ہے، جس میں سے ابتدائی زمانہ نکال دیا جائے تو بھی ۷۰/سال کے قریب ہوتے ہیں، معنوی رقبہ اس لئے وسیع ہے کہ علم وفضیلت، بصیرت، وسعتِ علم اور علم کی پختگی و رسوخ، خدمت دین اور اس کے ساتھ اصلاح و وعظ وارشاد عوام سے رابطہ تربیت و دعوت و بیعت و ارشاد، ان سب پہلوؤں اور گوشوں پر ان کی زندگی محیط تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ شاید (کم سے کم ہندوستان میں) کسی علمی و دینی شخصیت کو کم ایسی ہر دل عزیزی، عام شہرت ومقبولیت اور مختلف دینی اداروں اور جماعتوں کا اعتماد حاصل ہوا ہوگا، جو ان کو حاصل تھا، اس کے ساتھ ان کو طویل عرصہ تک دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم وجلیل اور بین الاقوامی شہرت کے ادارہ کی خدمت اور ترقی کا موقعہ ملا ان کے اس عام مقبولیت اور جامعیت اور ان کی ذات کے اختلاف سے بہت حد تک بالاتر ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی صدارت کے لئے (جو ہندوستان کے مختلف الخیال گروہوں، دینی جماعتوں اور اداروں کا نمائندہ ہے) روز اول سے ان کی وفات کے دن تک ان سے زیادہ موزوں اور متفق علیہ صدر نظر نہیں آیا، اور وہ اس عہدہ پر باتفاق آراء اس کے قیام کے پہلے دن سے وفات کے دن تک صدر رہے۔

ان کو نبیرۂ بانئ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ ہونے کی نسبت گرامی کا شرف حاصل تھا اور وہ نصف صدی تک مسلسل اس مؤقر اور عظیم ادارہ کے منصب اہتمام پر فائز رہے اور ان کے دورِ اہتمام میں اس ادارہ نے ایسی ترقی کی جو اس کے ابتدائی دور کے دیکھنے والوں کے

خواب وخیال میں بھی نہ تھی، انھوں نے بڑے بحرانی موقعوں پر اس ادارہ کی حفاظت اور رہنمائی کی، انھوں نے اپنا نام اور زندگی اس ادارہ کے نام اور اس کی زندگی سے وابستہ کر دی تھی کہ ان میں سے ایک کا تصور دوسرے کے ساتھ آتا تھا۔

انسان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے خلاف سننے کی صلاحیت رکھتا ہو اور سخت سے سخت بات برداشت کرے، راقم نے حکیم الاسلامؒ کو اس معاملہ میں بہت عالی ظرف اور قوی الارادہ پایا، واقفیت رکھنے والے پورے حلقہ میں یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ حکیم الاسلامؒ نہایت کریم النفس، بڑے شیریں اخلاق، نرم خو اور نرم گفتگو تھے، اقبال نے جو کہا ہے:

''نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو'' یہ تعریف حکیم الاسلامؒ پر صادق آتی ہے۔ حکیم الاسلامؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند کو ایک ہر دل عزیز ادارہ بنایا اور دارالعلوم کو بغیر کسی اختلاف کے عوام سے متعارف کرایا، اور ان کا اس سے تعلق پیدا کیا، تقسیم سے پہلے تحتی برّ اعظم کے دورے کئے تقسیم کے بعد پاکستان بار بار گئے، جنوبی افریقہ کا دورہ کیا، انگلستان گئے اور آخر میں امریکہ گئے۔

حکیم الاسلامؒ عوام کی اصلاح اور وعظ وارشاد میں شیخ وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے متبع تھے، حسن تقریر اور دعوتی و اصلاحی رنگ ان کا امتیاز تھا جس سے ہزاروں انسانوں کو فائدہ پہونچا، ہزاروں دلوں میں دین کے احترام کا جذبہ اور علماء کے متعلق حسن ظن پیدا ہوا، ایسا خوش بیان مقرر و واعظ وسیع المعلومات اور نورانی شکل کا عالم مشکل سے دیکھنے کو ملتا ہے، جس پر پہلی نظر پڑتے ہی قلب شہادت دیتا کہ یہ فطرتاً معصوم ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ضرر پہونچانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، ایسے بے ضرر انسان کی اس خوبی یا کمزوری سے لوگ غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور عزل ونصب کا بھی وہ نشانہ بن جاتا ہے۔

حکیم الاسلامؒ نہایت متین و باوقار شخص اور تواضع واخلاق کا پیکر تھے، اسی کے ساتھ پر شکوہ اور باوقار بھی، حکیم الاسلامؒ ندوۃ العلماء کے بھی ایک مقتدر رکن تھے، اور اس کے کارکن اور ذمہ داران کا بزرگوں کی طرح احترام کرتے تھے، آخری بار آپ اسلامک اسٹیڈیز کانفرنس میں شرکت کے لئے ندوہ آئے اور تقریر فرمائی، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا رکن ہونے کی بناء پر بھی راقم کو حکیم الاسلامؒ سے نیاز حاصل ہوتا رہا، اور ہم نشینی کا شرف، بعض مرتبہ ان کو سخت تبصرہ اور تنقید سننی پڑی اور انھوں نے عالی ظرفی اور کریم النفسی کے ساتھ اس کو برداشت کیا، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک سخت جملہ انھوں نے سنا اور کچھ جواب نہیں دیا، ان کے بعض اہل تعلق سے معلوم ہوا کہ اس کے صدمہ سے ان کو بخار آ گیا۔

حکیم الاسلامؒ خانوادۂ بانی دارالعلوم دیوبند کے چشم و چراغ تھے، اور راقم سطور حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جن سے مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کا تعلق عقیدت کا نہیں بلکہ عشق کا تھا، اور اس کا اندازہ راقم سطور کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی کتاب ''دہلی اور اس کے اطراف'' سے ہوسکتا ہے۔ جس میں مولانا نے اپنے دیوبند اور گنگوہ کی حاضری اور وہاں کے بزرگوں اور قابل احترام ہستیوں کے سید صاحب کے ساتھ اظہار عقیدت و محبت کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے، حکیم الاسلامؒ کے وفات سے چند دن پہلے جب لکھنؤ میں ایک تقریب میں (جس میں ان کو کسی ادارہ یا مکان کے سنگِ بنیاد رکھنے کی زحمت دی گئی تھی) ملاقات و مصافحہ کا شرف حاصل ہوا، مصافحہ کرتے وقت فرمایا کہ کچھ دن آپ کے ساتھ رائے بریلی رہنے کو جی چاہتا ہے۔ وکفی بہ شرفاً۔

افسوس ہے کہ ۶/شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷/جولائی ۱۹۸۳ء کو انھوں نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، اور اپنے اسلاف کرام سے جا ملے، جن کی خدمت دین اور اصلاح مسلمین کی یادگاریں ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وَحَسُنَ اولٰئک رفیقاً.

............❖............

عہد ساز شخصیت اور ترجمان

حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانیؒ

سابق رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

حکیم الاسلام محمد طیب صاحبؒ کے وصال سے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا، ان کی شخصیت ایک ایسی کڑی تھی جو حال کو ماضی سے جوڑتی تھی اور جنھیں دیکھنے سے اسلاف اور اکابر کی یاد تازہ ہوتی تھی ان خیالات کا اظہار امیر شریعت حضرت منت اللہ صاحبؒ نے اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا ہے، آپ نے لکھا ہے کہ حضرت حکیم الاسلام کو خدائے تعالیٰ نے قرآن وحدیث پر گہری نظر دی تھی، وہ اسلام کے اصول و اساس، فلسفہ وحکمت کے رمز شناس تھے، اور انہیں علم وحکمت کی تشریح وتفصیل، اظہار و بیان کی بے پناہ صلاحیت دی گئی تھی، مشکل سے مشکل موضوع پر وہ گھنٹوں اتنے آسان اور دل نشین انداز میں اظہار خیال فرماتے تھے کہ سننے والے کے دل میں بات اترتی چلی جاتی تھی، اپنی اس صلاحیت اور خصوصیت کے لحاظ سے وہ منفرد شخصیت کے مالک تھے، ان کے وصال سے دنیا اسلام کے سب سے بڑے ترجمان سے محروم ہو گئی۔

حضرت امیر شریعت نے تحریر فرمایا ہے کہ ان کی شخصیت عہد ساز تھی، انھوں نے ''مدرسہ اسلامی عربی'' دیوبند کو ترقی دی، اور دارالعلوم دیوبند بنا دیا، دیوبند کے مدرسے کا یہ علمی، دینی اور انتظامی سفر حضرت حکیم الاسلام کی سربراہی میں طے ہوا، وہ تقریباً ۶۵ رسال تک اس ادارہ کے سربراہ رہے، اس طویل عرصے میں مختلف صلاحیتوں وخصوصیتوں کے حامل مختلف ممالک کے ہزاروں طلبہ عالم دین بنے اور اس طرح انھوں نے براہ راست ہندوستان اور دوسرے ممالک کے دینی، سیاسی اور سماجی ماحول پر اثر ڈالا ہے خود حضرت حکیم الاسلامؒ کے خطبات اور مواعظ نے علماء اور دانشوروں کو متاثر کیا ہے اور ملک کے دینی ماحول کی تیاری اور سماجی اصلاح کے کام میں ان کا اہم حصہ رہا ہے، اس طرح ان کی ذات نے اس پورے عہد کو متاثر کیا

ہے، جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں۔

حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی نے فرمایا ہے کہ اسلام پر کسی بھی پڑنے والی آنچ کو دور کرنے کے لئے وہ برابر آمادہ رہتے تھے، مسلم پرسنل لاء میں ترمیم کا مسئلہ اٹھا تو انھوں نے دیوبند میں ابتدائی غور وفکر کے لئے اجلاس طلب کیا، اور پھر ممبئی پہنچ کر مسلم پرسنل لاء کنونشن کے لئے فضاء ہموار کی اور ۷۲ء میں وہ تاریخی کنونشن ہوا، جس نے عوام اور حکومت دونوں ہی کو اپنی طرف متوجہ کرلیا، کنونشن کے نتیجہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل ہوئی تو انھیں متفقہ طور پر بورڈ کا صدر بنایا گیا اور آخر تک وہ اس منصب پر فائز رہے، بورڈ نے اس عرصہ میں جو خدمات انجام دیں، وہ انہی کی سربراہی میں انجام پائی ہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا وصال اسلام کے رمز شناس دین وشریعت کے ترجمان ایک عالم باعمل، روحانی پیشوا اور ایک عہد ساز شخصیت کا انتقال ہے، خدا تعالیٰ ان کے مراتب بلند فرمائے اور ان کی قبر پر ہمیشہ رحمت کی بارش برسائے۔ آمین

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ
علمی اور عرفانی نسبتوں کی جامع شخصیت

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مدظلہ

مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

خطیب بے مثال امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے اپنی طلاقت لسان فصاحت کلام اور جامعیت خطاب پر مشتمل ایک عظیم وطویل حقیقت کو خیر المدارس جالندھر میں پیرایۂ اختصار عطا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ:

''اگر حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی جامع الصفات ذات گرامی کو دیکھنے والا قسم کھا کر یہ کہے کہ میں نے حقائق اسلام کی حکمت آفرینیوں کے ساتھ حضرت اقدس شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو، کتاب اللہ کے ظاہر و باطن کے انسانیت نواز علوم کے ساتھ حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو، حقائق واحکام اسلام پر ناقابل شکست استدلال کے ساتھ حجۃ اللہ فی الارض شیخ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کو، تفقہ اسلام کی مدلل راہ نمائی کے ساتھ فقیہ الاسلام حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو، علم وعرفان کی بہم آمیز جرأت ایمانی کے ساتھ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی کو، عالم بے عدیل حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کو ان کی منفرد قوت حفظ واتقان کے ساتھ، علم حدیث پر مثالی وسعت نظر کے ساتھ محدث جلیل حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کو بے مثال طلاقت وفصاحت کے ساتھ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، کو، تفقہ فی الدین اور کمال اتباع سنت کے ساتھ شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کو، فراست ایمانی پر تدبر کامل کے ساتھ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ سابق

نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو اور علم وعرفان زہد واتقاء اور فضل وکمال کے پیکر جمال کے ساتھ حکیم الامت حضرت اقدس مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کو دیکھا ہے، تو میرا دل اس پر یقین رکھتا ہے کہ انشاءاللہ وہ عنداللہ حانث نہیں ہوگا''۔

حضرت مولانا عطاءاللہ شاہ صاحبؒ کے اس یقین کی تائید حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ کے شیخ، شیخ العالم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے اس عرفانی قول وعمل سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت تھانویؒ کے مرضِ وفات میں وفات سے دوروز قبل حضرت حکیم الاسلامؒ بغرض عیادت حسب معمول تھانہ بھون تشریف لے گئے اور حضرت حکیم الاسلامؒ کی تشریف آوری پر شدت علالت کی اس حالت میں حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ آپ کے آنے سے مجھے علالت میں خفت، بدن میں قوت اور روح میں بشاشت بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

دوسرے روز حضرت حکیم الاسلامؒ نے ایک روز بعد دارالعلوم دیوبند میں مجلسِ شوریٰ کے اجلاس کی وجہ سے واپسی کا ارادہ حضرت سے ظاہر فرمایا، اور بعد فجر واپسی کی اجازت خواہی کے لیے حضرت کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے۔ جہاں مولانا شبیر علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے، حضرت مہتمم صاحبؒ نے عرض کیا کہ حضرت آپ کے پاس سے جانے کو جی تو نہیں چاہتا لیکن کل مجلسِ شوریٰ ہے اس کی وجہ سے جانا بھی ضروری ہے، اس لیے میں بطیب خاطر نہیں بلکہ بضیق خاطر واپسی کی اجازت لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں، یہ سن کر حضرتؒ نے قریب آنے کا اشارہ فرمایا۔ اور فرمایا کہ مجلسِ شوریٰ کی وجہ سے جانا بھی ضروری ہے، گو میرا دل بھی آپ کو واپسی کی اجازت دینے کے لیے نہیں چاہ رہا ہے، اور پھر حضرت حکیم الاسلام کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوما، پھر آنکھوں سے لگایا، پھر سر پر رکھا جس سے حکیم الاسلام غیر معمولی طور پر محجوب بھی ہو رہے تھے اور آبدیدہ بھی۔ پھر حضرت تھانویؒ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ میرا وقت اخیر ہے۔ یہ ہاتھ میں نے اس لیے چوما اور قلب ودماغ پر لگایا کہ اس ہاتھ کے لگانے سے مجھے حضرت اقدس نانوتویؒ حضرت مولانا محمد احمدؒ حضرت شیخ الہندؒ حضرت گنگوہیؒ اور جماعت کے تمام بزرگوں کی جامع نسبتوں کی برکات اور غیر معمولی سکینت قلب حاصل ہوئی اللہ رب العزت نے آپ کی ذات میں ان تمام نسبتوں کو جمع فرما دیا ہے اور اس وقت جو بھی حضرات وہاں موجود تھے سب پر گریہ طاری تھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ اس واقعہ کو بیان فرماتے وقت آبدیدہ ہو کر فرمایا کرتے تھے کہ حضرت اقدس تھانویؒ کے اس مشفقانہ عمل کو میں اپنے لیے عظیم سعادت، عظیم شہادت اور وسیلہ مغفرت سمجھتا ہوں۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کے علمی کمالات، عرفانی رفعت اور نسبتوں کی جامعیت پر یہ واقعہ ایک تاریخ ساز شہادت ہے، اور اس کی توثیق مزید اشد بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل کے مطابق، تاریخ دارالعلوم کا ہائلۂ کبریٰ ہے کہ جس پر صبر، سکوت اور استغناء کی وہ عظیم مثال قائم فرما کر حضرت حکیم الاسلامؒ دنیا سے تشریف لے گئے کہ تاریخ جماعت اکابرؒ میں اس کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ عزم و عزیمتِ مثالی کے ساتھ بتوفیق الٰہی انہی صفاتِ عرفانی کو ''دارالعلوم وقف دیوبند'' کی بنیادوں پر شامل فرما کر گئے ہیں، اس لیے دارالعلوم وقف دیوبند کا اصل اور حقیقی سرمایہ یہی ہے کہ جس کی بحمد اللہ تعالیٰ ''خدام دارالعلوم وقف دیوبند'' اپنی بساط کے بقدر روزِ اوّل سے تا حال تمام بزرگان جماعت کی امانت قرار دے کر بہ دل و جان حفاظت کر رہے ہیں اور انشاءاللہ کرتے رہیں گے۔ اور عالمی پیمانے پر اسی کا یہ شاید نتیجہ اہلِ علم و بصیرت کے سامنے ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا قدیم ''و بلند معیار تعلیم'' عرفانی ذوق، تحفظ مسلک، اور طرز و طریق اکابرؒ کی مکمل رعایت ''دارالعلوم وقف دیوبند'' میں پورے اہتمام کے ساتھ الحمدللہ باقی اور محفوظ ہے۔

اللہ تعالیٰ دارالعلوم وقف دیوبند کے علمی فیضان کو نسبت عرفانی قاسمی و رشیدی کے ساتھ عالمگیر پیمانے پر دوام و استمرار عطا فرمائے۔ (آمین)

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ
ایک مثالی شخصیت

فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ
سابق شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند

کس قدر خوش نصیب ہے وہ انسان جسے حسب ونسب کی شرافتیں گھر کا پاکیزہ ماحول شریف الطبع والدین، ظاہر وباطن کی تربیت، علم وتعلم کیلئے یگانۂ روزگار شخصیتیں ملی ہوں واقعی اس سے بڑھ کر کوئی سعید اور جس کے حصے میں یہ سب امتیازات ہوں اس سے بڑھ کر کوئی بخت آور نہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو یہ سب سعادتیں لگے بندھے انداز میں نہیں بلکہ وافر میسر تھیں۔ ان کی ددیہال میں حضرت نانوتویؒ کا نام نامی کافی ووافی ہے، ننھیال دیوبند کی ایک شریف بلکہ اشرف خانوادۂ گھر کا ماحول علمی، تعلیم اور تعلم کا سلسلہ فخر روزگار شخصیتوں تک پہنچتا ہے، روحانی تربیت کے لئے مجدد وقت سے وابستگی ہے، خود طبعاً شریف حلم کے پیکر، بزرگانہ اداؤں کا مرقع۔

اب ذرا تفصیل اس اجمال کی سنئے والد مولانا احمد صاحبؒ مزاج کے خسرو پیدا ہوئے۔

یہ وہ دور تھا کہ جب نسبتیں سب سے زیادہ بار آور چیز تھیں۔ پھر ان کی نسبت حضرت نانوتویؒ ایسے فرد فرید سے، تجویدی لب ولہجہ میں گفتگو کرتے، مکلّف زندگی بلکہ ٹھاٹ باٹ، لب ولہجہ شاہانہ مگر سینے میں دل برف کی سل بگڑتے تو جوالہ، سنبھلتے تو برگِ گل، طلباء کے ساتھ تعلق دیدنی وشنیدنی، کوئی طالب علم بیمار ہوتا تو عیادت کے لئے بار بار اس کی رہائش پر پہنچتے، اگر اس کی موت ہوجاتی تو حجرہ کے سامنے بیٹھ کر تعزیت لیتے کیا مجال کوئی استاد اور کارکن حافظ صاحب کو تعزیت نہ پیش کرے۔

مسجد کا بڑا احترام ملحوظ تھا، اوابین وہیں پر ادا کرتے ایک روز صحن مسجد میں کسی طالب کو ٹانگ پر ٹانگ

رکھے ہوئے پایا پھر کیا تھا مولانا محمد احمد صاحبؒ کا غضب اُبل پڑا تادیب کے ساتھ کھانا بند دوایک روز کے بعد اسی طالب علم کے حجرے کے سامنے سے گذر رہے تھے، دیکھا کہ وہ کھا رہا ہے دریافت کرنے پر تفصیل معلوم ہوئی تو خود بھی اس کے ساتھ دیوار گریہ ہوگئے، گھر لے آئے اور ہمیشہ کے لئے وہ دستر خوان قاسمی کا خوشہ چیں ہوگیا۔

بھولے اتنے کہ انگریزی دونی اور چونی میں فرق نہ کرتے کسی ملازم پر بگڑتے تو فرماتے تم اپنی اس حرکت پر مباح الدم ہو چکے ہو یا تمہارا یہ جرم گردن زدنی ہے مہتمم صاحبؒ کی مرحومہ والدہ مرقع حیا، چہرہ پر معصومیت، گفتگو معصوم بچوں کی طرح بلکہ محسوس ہوتا کہ بات چیت میں فراخ ذہن ہیں اس کم گفتاری کے نتیجہ میں بہت سے گناہوں سے خود کو بچالیا تھا۔

سردی میں سبز کاہی شال جس پر چھوٹے پھول ہوتے گرمیوں کا لباس عموماً ڈھاکہ کی چکن دوپٹہ بھی اسی کا ہوتا جواں بخت بیٹے کے جب اسفار عالمگیر انداز میں شروع ہوگئے تو کبھی فرماتیں کہ ''طیب جب خدا تعالیٰ رزق تقسیم کر رہا تھا تو تیرے حصہ کو دنیا میں بکھیر دیا'' ہمارے یہاں عموماً تشریف فرما ہوتیں خصوصاً میرے برادر بزرگوار کی شادی جب رامپور ہوئی تو چندروز مسلسل قیام رہا ایسی نیک بخت بیبیاں کم از کم پون صدی پہلے کی دلآویز یادگار تھیں نئی نسل کے طمطراق نے تو انھیں آثار قدیمہ کی فہرست میں داخل کردیا۔

بے ہمہ و باہمہ اس قدر معصوم کہ ایک قریبی عزیز نے سوروپے کا وہ نوٹ جس سے بچے کھیلتے ہیں امانتاً ان کے پاس رکھوا دیا اور حسب ضرورت وہ پانچ دس لیتا رہا ایک دن اماں بی اس نوٹ کو دیکر کسی خادم سے بازار سے کچھ منگانے لگیں تو راز کھلا کہ سب جعل وفریب تھا، غرضیکہ نیکی وشرافت، معصومیت ومحبوبیت مہتمم صاحب مرحوم کے حصہ میں طرفین سے آئی۔

شعور نے آنکھ کھولی تو یہ عصر دارالعلوم کا خیر القرون تھا، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اگرچہ بینائی جاتی رہی تھی تاہم حیات تھے، بارہا اپنے سینۂ بے کینہ بلکہ معرفت وعرفان کے گنجینہ سے مہتمم صاحبؒ کو مس کیا، شیخ الہندؒ کا دست شفقت سر پر رہا، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ سے ابتدائی اسباق لئے۔ حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے بڑا وقت آپ کی تعلیم کے لئے صرف کیا اور پھر دارالعلوم جو اس وقت ممتاز شخصیتوں کا کہکشاں تھا ان میں سے ہر ایک افادہ کے لئے سرگرم گویا کہ:

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مراحق ہے فصل بہار پر

آخر کار اپنے وقت کے محدث جلیل ابن حجر عصر اور ثانی ابن ہمام علامہ کشمیریؒ کے اتھاہ علم سے سیرابی کے لئے مستعد ہوگئے اور جم کر استفادہ کیا تا آنکہ جس شب میں علامہ اس خاکدانی ارضی کو چھوڑ رہے تھے

عصر تا مغرب اپنی معروف کتاب ''مشاہیر امت'' کے لئے بسلسلۂ ابوالحسن کذّاب استفادہ فرماتے رہے۔

روحانی تربیت کے لئے مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ کی رفاقت میں سفر شروع ہوا اولاً حضرت شیخ الہندؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی ان کی وفات کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ پر نظر جا ٹکی سادگی یہ برتی کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مدیر اہتمام سے سفارشی خط لکھوایا۔

تھانہ بھون کا یہ فقیر غیور بڑے ضابطہ کا انسان تھا جواب آیا ''کہ اس خاندان کی خدمت میرے لئے سعادت ہے، لیکن استفادہ کیلئے مستفید کا عریضہ مطلوب ہے، نہ کہ کسی مخدوم کی سفارش''۔

مہتمم صاحبؒ فرماتے کہ پہلا سفر مفتی شفیع صاحب کے ساتھ رمضان المبارک میں ہوا خیال یہ تھا کہ صاحبزادہ نوازی کا مظاہرہ ہوگا، لیکن خانقاہ تھانہ بھون میں چند ساعتی سکون کے بعد اپنے وقت کے حکیم حاذق کا پیغام پہنچا، چونکہ آپ استفادہ کے لئے آئے ہیں، اس لئے کھانے کا نظم خود فرمایئے، تبرعاً یہ بھی بتاتا ہوں کہ یہاں خانقاہ میں چھ پیسے کے عوض صبح وشام کا کھانا میسر ہے جس کی تفصیل کھانے کے علاوہ ایک چراغ، سرسوں کا تیل اور اس میں فتیلہ بھی ہے۔

دیوبند میں مہتمم صاحبؒ کا معمول تراویح کے بعد چائے، بے تکلف احباب بذلہ سنجی وغیرہ تھا، تھانہ بھون میں بھی اس معمول کو نبھانا چاہا خلیفہ اعجاز صاحب نے حکیم وقت کے کانوں تک یہ بات پہنچائی فرمایا کہ ''براہ راست تو خطاب نہ کیا جائے لیکن آج اگر یہ حادثہ پیش آئے تو حجرہ کے سامنے باآواز بلند اعلان ہو کہ خانقاہ کا معمول تراویح کے بعد ذکر وفکر ہے نہ کہ مجلس آرائی''۔

مربی نے انتباہ میں رعایت ملحوظ کی مستفدین کے پاس گوش شنوا تھا، اس لئے اس لطیف تنبیہ پر معمول بدل گیا، مرحوم پر تحمل، حلم، تواضع اور نبوی اخلاق کا ایسا غلبہ تھا کہ ان مواقع پر بھی تہدید و وعید تو درکنار واجبی تنبیہ سے بھی گریز کرتے، جہاں انتباہ نظم وانتظام کا ضروری حصہ ہے، چنانچہ ایک بار دارالعلوم کے اہم شعبہ میں خرد برد کا حادثہ پیش آیا، مہتمم صاحب نے کمیٹی تشکیل دی۔ تحقیقات شروع ہوگئیں، میں اس زمانہ میں ناظم مجلس تعلیمی تھا، میرے زبردست اصرار پر کہ کمیٹیوں سے کچھ بھی نہیں ہوگا، آپ براہ راست محاسبہ فرمائیں، بڑی ردوقدح کے بعد تیار ہوئے اور اس شان سے کہ مجرموں کے سامنے خود سب سے بڑے مجرم بن گئے سر بہ جیب آنکھیں بند اور نرم گداز لہجہ میں امانت ودیانت کے اہتمام پر ایک دل پذیر وعظ فرمایا وہ سمجھ رہے تھے کہ مخاطب کے پاس گوش حق نیوش ہے اور یہ وعظ کام کر جائے گا حالانکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے کب مانتے ہیں۔ یا بقول اقبال ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے، ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

عمر بھر میں اس جبریہ کارروائی پر خود غایت حیاء سے پسینہ میں شرابور ہو گئے۔

مجرمین سامنے سے ہٹے تو مجھ سے فرمایا کہ ''مولوی انظر شاہ تم نے مجھ سے بہت سخت کام لیا، ہمیشہ فرماتے کہ ''بھائی کام ضابطہ سے زیادہ رابطہ سے لینا چاہئے'' یہ ٹھیک بھی تھا لیکن تاوقتیکہ خیر القرون کا ڈوبتا سورج دل و دماغ پر سایہ فگن تھا پھر جب فضا بدل گئی، خیر اٹھ گئی شر نے قدم جما لئے نیکی رخصت ہوئی اور بدی نے اپنی حکومت قائم کر لی تو رابطہ کا اصول ختم ہو کر ضابطہ پر عمل کی ضرورت تھی، مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ جس سانچہ میں ڈھالے گئے تھے، اس میں گرفت و مواخذہ، احتساب و محاسبہ راہ نہیں پا سکتا تھا، لاریب کہ پیدا کردہ مشکلات مسائل اور مصائب کے بہت سے طوفانوں میں انھوں نے اپنے مزاجی ساخت اور ناخن تدبیر سے رشتۂ کار میں پڑی ہوئی گرہیں کھولیں لیکن خاتمۂ عمر پر وہ زبان حال سے کہتے:

بیچارگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں

انھیں اپنے بزرگوں سے عشق تھا وعظ ہو کہ تقریر، مجلس ہو کہ مستفدین کا حلقہ ہر جگہ اکابر کا وقیع تذکرہ فرماتے۔

ہندوستان کی سرحدوں کو توڑ کر دارالعلوم کا تعارف، بزرگوں کی معرفت ان کے اسی معمول کا دلآویز ثمرہ ہے، بہت سے گمنام متعارف ہو گئے۔

بہت سے نامور جاوید بن گئے، کاش کہ وہ اپنی سوانح جس کے لئے میں نے بہت اصرار کیا قلمبند فرماتے تو ایک صدی کی داستان علم و عمل مرتب شکل میں ملتی، حالانکہ وہ لکھنے کے سلسلہ میں چابک دست تھے مجمع ہو یا رزم و بزم کاغذ اٹھاتے اور لکھنے میں ڈوب جاتے، ریل بھاگ رہی ہو، ہوائی جہاز چھلانگیں لگا رہا ہو مگر ان کے اس شغل میں کوئی فرق نہ پڑتا۔

پھر خدا جانے وہ اپنی سوانح کی تالیف سے کیوں گریز کرتے رہے علماء نے لکھا ہے کہ ایمان اگر ظاہر پر آجائے تو اسلام ہے اسلام سرایت کرتے ہوئے باطن پر ضو فگن ہو تو ایمان ہے اسی طرح نفاست ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی، خود نفیس، پوشاک نفیس گفتگو نفیس، وعظ نفیس، تحریر نفیس، گویا کہ سراپا نفاست، کھانے میں پسندیدہ امر یہ تھا کہ دستر خوان لگا دیا جائے انھیں جو چیز پسند ہو گی خود ہی اٹھا لیں گے اگر میزبان زبردستی کھلانا چاہتا تو قدرے ترش ہو کر فرماتے کہ ''بھائی کھانے کا تعلق رغبت سے ہے ترغیب سے نہیں''۔

ایک دعوت میں مولانا فخر الحسن صاحب مرحوم بار بار رائتہ اٹھا کر پیش کرتے اور کہتے کہ رائتہ فرمایا کہ جی ہاں رأیت غالباً اس وقت رائتہ مرغوب نہ تھا۔

مجھ پر شفقت کی خاص نظر تھی اور میری گستاخیوں پر مکدر نہ ہوتے کبھی حاضر ہوتا تو فرماتے ''تشریف لائیے مولانا'' خود ہی ایک بار فرمایا کہ بھائی تمہیں مولانا کہتے ہوئے تکلف ہوتا ہے جی چاہتا ہے کہ جیسے میں سالم کہتا ہوں، اسی طرح تمہیں بھی انظر کہوں، میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ تو میری سعادت ہوگی اور آپ کا غایت تعلق جو میرے لئے وسیلۂ نجات ہوگا۔ انشاء اللہ۔

میری گستاخیاں بعض اوقات ان کے تکدر کو فرحت وانبساط میں بدل دیتی تھیں، مدراس کے ایک سفر میں نمازِ فجر کے بعد کسی بات پر ان کی طبیعت قدرے مکدر ہوگئی، ناشتہ کے دسترخوان پر تشریف لانے کے بجائے اپنے کمرہ میں قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئے میں معمولاً تفریح سے لوٹا تو ان کے کمرے کے باہر یہ منظر دیکھا کہ مدراس کے بہت سے رئیس التجار سہمے ہوئے کھڑے ہیں۔ معلوم ہوا کہ حضرت ناشتہ کے لئے تشریف نہیں لا رہے ہیں اور تحریری شغل میں منہمک ہیں، میں سیدھا کمرے میں حاضر ہوا تو لکھنے میں مستغرق تھے، میں نے ہنستے ہوئے عرض کیا، لگتا ہے آج آپ نے بھوک ہڑتال کر دی، جب نظر اٹھاتے تو چشمہ کے عقب میں داہنا حاجب تن جاتا۔ نظر میری طرف اٹھا کر فرمایا کہ تمہیں ہر وقت مذاق کی سوجھتی ہے، لہجہ تکلف آمیز تھا، میں نے جرأت پائی تو عرض کیا کہ ویسے تو کوئی نقصان نہیں البتہ دوسروں کے لئے مسئلہ پیدا ہوگیا ہے، فرمایا کیوں؟ عرض کیا آپ نے ہاتھ کھینچ لیا، یہ فرماتے ہوئے اٹھے کہ بھائی پھر بھی نہیں چھوڑتے، دسترخوان پر تشریف فرما ہوئے تو وہی بذلہ سنجی اور نکتہ طرازی پھر یہ نشست دوپہر تک چلتی رہی۔

دارالعلوم سے آپکو اس درجہ تعلق تھا کہ میری موجودگی میں ایک صاحب کا تجوید میں تقرر ہوا، کسی نے کان میں چپکے سے کہا کہ امیدوار کا تعلق فلاں گروپ سے ہے، جھنجھلا کر فرمایا، اس سے کیا ہوتا ہے کہ فلاں سے ہے فلاں سے نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ دارالعلوم کیلئے بھی مفید ہیں یا نہیں۔

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ

حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی مدظلہ
استاذحدیث و ناظم تعلیمات دارالعلوم وقف دیوبند

اس پردۂ دہر پر اولادِ آدمؑ میں بے شمار بلند و بالا شخصیات نمایاں ہوئیں لیکن مطلق العنان تاجداروں اور فاتحوں کی صف سے لے کر فلاسفہ، مصلحین اور فن کاروں تک کسی نے بھی عالمِ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی نمونہ نہیں چھوڑا سوائے اُس مبارک سلسلے کے جو انبیائے کرام کا پاکیزہ طبقہ کہلاتا ہے۔ اس طبقے کے تاجدار پیغمبر آخرالزماں ﷺ کا نمونہ تو ایسا بے مثال ہے کہ قیامت تک حق تعالیٰ نے اُسے ایک ابدی معیار قرار دے دیا جس کی تابانیوں سے دنیا منور ہوتی آرہی ہے اور آخر تک منور ہوتی رہے گی۔ یہ مبارک نمونہ کتابوں میں تو محفوظ رہے گا ہی مگر ساتھ ہی اس نمونے کی پیروی کرنے والے اکابرامت کے ذریعہ یہ پاکیزہ اسوہ تا قیامِ قیامت غلامانِ محمدیؐ کے پیکروں میں عملی صورت کے ساتھ بھی نمایاں ہو کر دنیا کو دعوتِ شوق دیتا رہے گا۔

ان عاشقانِ نبوتؐ کے طبقے میں شروع سے آج تک ایک جماعت ایسے علمائے مخلصین کی رہی ہے جس نے اتباعِ رسولؐ کو اپنا شعار اور مقصدِ زندگی بنایا حتی کہ اُن کے ہر حرکت وسکون سے سنتیں زندہ ہوتی رہیں۔

ان عاشقانِ رسولؐ کی طویل فہرست میں ماضی قریب میں ایک ممتاز نام حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی ہمہ گیر شخصیت کا ہے جن کی پاکیزہ زندگی آنحضرت ﷺ کی سنتوں کا ایک حسین مرقع رہی اور جن کی پاکباز حیات عشق واتباعِ رسولؐ میں ایسی ڈوبی ہوئی تھی کہ آپؒ کے ہر عمل کو دیکھ کر یقین ہو جاتا کہ یہ سنتِ نبویؐ کا نمونہ ہے، عادات کے ساتھ ساتھ آپ نے طبیعت کو بھی اس انداز میں

ڈھال لیا تھا کہ اخلاق اور نرم خوئی سے بھی حضرت رحمۃ للعالمینؐ کے اسوۂ پاک کی جھلک نمایاں ہو۔ یہ بھی اتباعِ رسولؐ کا جذبۂ بے اختیار ہی تھا کہ انتہائی ناخوشگوار صورتِ حال میں بھی کبھی چیں بجبیں نہ ہوتے، نہ نرم خوئی کو ترک کرتے حالاں کہ آپ کے والدِ مکرم حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمہ اللہ کی مزاجی افتاد کا رنگ نرم وگرم بہم آمیز تھا، اُن کا پُر جلال انداز رعب ودبدبہ سنتِ فاروقی کا نمونہ تھا۔ اسی طرح آپؒ کے چھوٹے بھائی مولانا محمد طاہرؒ صاحب قاسمی کی گرمیٔ مزاج بھی مشہور ومعلوم تھی مگر اس کے برخلاف والدِ مکرم حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کا حلم، آپ کی بردباری، نرم مزاجی اور نرم گوئی مثالی انداز کی تھی۔ لگتا تھا کہ غصہ کی خو آپ کو چھوکر بھی نہیں گذری۔ گھر میں بچوں کے شور وشغب یا کسی خلافِ ادب بات پر ایک باپ کبھی نہ کبھی تو سخت سست کہہ ہی دیتا ہے لیکن ہمیں حضرتؒ کے ساتھ گذارے ہوئے وقت میں ایک لمحہ بھی ایسا یاد نہیں جب والد مکرم نے ڈانٹا ڈپٹا ہو۔

ایک ہی گھر کے افراد میں اس قدر مزاجی فرق کو دیکھ کر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس اعتدالِ طبیعت میں بھی ارادی طور پر اتباعِ رسول کا جذبہ ہی کارفرما تھا۔ جیسا کہ آنحضرتؐ کی مجلس مبارک میں کوئی خلاف مزاج بات کسی سے سرزد ہوجاتی تو آپؐ اس شخص کو برسرِ مجمع نہ ٹوکتے بلکہ لطیف پیرایہ اختیار فرماتے تاکہ اُس کی سبکی بھی نہ ہو اور وہ شخص سمجھ بھی لے۔ غرض اَلْعَادَۃُ جِبلّۃ الثانیۃ کے مطابق جب انسان کسی چیز کا خوگر ہوجاتا ہے تو اُس سے بے اختیارانہ طور پر بھی اسی عادت کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی مثال اسی مقولہ کے مطابق ہے کہ آپؒ کو حق تعالیٰ نے عشقِ نبویؐ اور اتباعِ رسولؐ کا ایسا زبردست جذبہ وشوق عطا فرمایا تھا۔ آپؒ نے اپنی رفتار وگفتار، عادات وطریق حتی کہ مزاج وطبیعت کو بھی اسی مبارک اسوہ کا تابع کر دیا تھا اور اس طرح آپ کے ہر عمل سے بے اختیارانہ طور پر محبوبِ کبریا کی سنتیں زندہ ہونے لگیں۔

حق تعالیٰ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کو غیر معمولی محاسن اور صفات سے آراستہ فرمایا۔ اس طرح آپ کی ذات ان خوبیوں اور صلاحیتوں کی وجہ سے علماء وعوام اور قدیم وجدید کے درمیان محبوبیت اور احترام کا مرکز بن گئی۔ حضرت کی ہمہ جہت شخصیت نے ایک فقیہ، ایک عارف، ایک عالم، ایک خطیب، ایک شیخ اور ایک مشفق مربی کی حیثیت میں اطرافِ عالم سے شایانِ شان خراجِ تحسین وآفرین حاصل کیا اور دانشوروں اور عوام کے زبان وقلم اعترافِ عظمت کے لئے اپنی صلاحیتیں لٹانے کے باوجود اپنے صحیح جذبات واحساسات کو ظاہر کرنے کے لئے تشنگی محسوس کرتے رہے۔

ایک فقیہ کی حیثیت سے حضرتؒ کی تحریریں نازک مسائل میں اُن نکات کو تلاش کرلائی ہیں جو آپ کی

ذہانت وذکاوت اور علمی گہرائی کی شہادت دیتی ہیں اور جو علمی حلقوں میں اپنی بصیرت افزا نکتہ آفرینیوں کی بنا پر ایک منفرد اور وقیع مقام حاصل کر چکی ہیں۔ آپ کی تصانیف سے مخلوق خدا نے جس قدر نفع اٹھایا اور اٹھا رہی ہے اس کی مثال خال خال نظر آتی ہے۔

ایک عارف کی حیثیت سے حضرتؒ کا بلند مقام اربابِ تصوف وطریقت میں ہمیشہ ممتاز رہا اور آپ کی پوری حیات طیبہ اور کردار و اخلاق آپ کے عرفانِ حق کا عکّاس ہے۔ آپ کا اخلاص، آپ کی تواضع و انکسار، مہمان نوازی اور انتہائی ناروا حالات میں بھی توکل علی اللہ، زبان کی غیر معمولی حفاظت، ہر دوست و دشمن کے لئے حرف کلمۂ خیر اور راضی برضا رہنا حضرتؒ کے وہ اوصاف ہیں جن کی فی زمانہ مثال ملنی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ دنیوی امور سے فطری طور پر اس قدر عدم توجہ اور لاتعلقی تھی کہ گھر پر ہوتے ہوئے بھی گھریلو واقعات سے بے خبر صرف عبادات واذکار اور تصنیف وتحریر میں مشغولیت رہتی حتیٰ کہ کھانے پینے کے لئے یاددہانی کی ضرورت پیش آتی اور اس پر بھی اکثر و بیشتر بھوک نہ ہونے کا عذر پیش فرما کر پھر اپنے مشاغل میں منہمک ہو جاتے۔ گھر پر رہتے ہوئے جب کبھی اپنی مصروفیات سے تکان محسوس کر کے باہر تشریف لاتے تو گھر کے سب لوگ آپ کے پاس آ بیٹھتے اور مجلس وعظ ونصیحت شروع ہو جاتی۔ اِدھر اُدھر کی بے فائدہ باتوں سے ہمیشہ گریز فرماتے ہوئے سیرت نبویؐ اور صحابہؓ واکابر کے ایمان افروز واقعات بطور عبرت بیان فرماتے اور اس طرح یہ فرصتِ مختصر بھی یادِ الٰہی میں صرف ہو جاتی۔

ایک عالم کی حیثیت سے حضرتؒ کا مقام جس عظمت سے ہم کنار رہا اس کا اندازہ ہم نشینوں اور خوشہ چینوں کو آپ کے اُس استحضار اور قوتِ افہام وتفہیم سے کھلے طور پر ہو چکا تھا جو آپ کی مجالس اور علمی مذاکروں میں طالبانِ علم کی آسودگی واطمینان کا باعث بنتا تھا۔ بڑے بڑے پیچیدہ علمی مسائل آپ کے سامنے رکھے جاتے اور آپ اس پر مختصر مگر جامع الفاظ میں کلام فرماتے جس سے سائل کو تسلی ہو جاتی۔ یہ جوابات صرف ذہانت پر ہی مبنی نہیں ہوتے بلکہ حضرتؒ کے وسعتِ مطالعہ کی بھی شہادت ہوتے کیوں کہ اکثر علمی مسائل کے جواب میں اکابر امت کے حوالوں سے استشہاد بھی فرماتے اور سلف کی عبارات سے استنباط بھی فرماتے۔ وسعتِ مطالعہ کے سلسلے میں راقم الحروف خود اپنا مشاہدہ پیش کر سکتا ہے کہ حضرتؒ کی اپنی زبردست لائبریری تھی جو اَب بھی موجود ہے جس میں تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، منطق، فلسفہ، تاریخ، سیرت، طب، طبعیات، ادب، عروض اور معانی وغیرہ موضوعات پر تقریباً پندرہ بیس ہزار کے درمیان کتابیں ہیں۔ لائبریری کے لئے گھر کا ایک بڑا کمرہ مخصوص کر دیا گیا تھا جس کے اندر چھت تک اونچی

الماریوں میں یہ تمام کتابیں فن وار لگی ہوئی ہیں۔ ان میں زیادہ تر قدیم علماء کی عربی تالیفات ہیں۔ حضرتؒ سفر کے دوران ان میں سے چند کتابیں ہمیشہ ساتھ رکھتے اور مطالعہ فرماتے رہتے۔ احقر نے ان میں سے زیادہ تر کتابوں میں پایا کہ جگہ جگہ حاشیوں پر متعلقہ صفحہ کے مضامین پر اضافات اور تشریحات حضرتؒ کے قلم سے لکھی ہوئی ہیں جس سے آپ کے محض مطالعہ پر ہی نہیں بلکہ عمیق مطالعہ پر دلیل دی جاسکتی ہے۔ اسی کا فیض تھا کہ مشکل سے مشکل سوالات اور الجھنوں کا آپ برجستہ جواب دے کر سائل کو مطمئن فرما دیتے۔

ایک خطیب کی حیثیت سے حضرتؒ کے زورِ بیان، حسن تعبیر اور سحر انگیز تکلم کی صدائے بازگشت سے برصغیر ہندوستان و پاکستان سے لے کر نہرِ سویز اور بحرِ ایٹلانٹک کے ساحل تک گونج رہے تھے۔ جہاں حضرتِ والا کے نشانِ قدم اسلام کے ایک مخلص سپاہی اور عظیم مقرر کی حیثیت سے ثبت ہیں اور جہاں آپ کے بے لوث اور پُر اثر لفظوں کا تاثر عظمتِ دین کے لئے ایک دفاعی حصار کا درجہ رکھتا ہے۔ تاریخ اس حقیقت کی بجا طور پر شاہد رہے گی کہ اسلامی خدمات کے باب میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی خطیبانہ اور واعظانہ سرگرمیوں نے نئے رنگ بھرے ہیں اور ایک دنیا کے سامنے قرونِ اولیٰ کے اُن مبلّغوں کا پیغام تازہ کیا ہے جن کے مدفن آج مسلمانوں کی غفلت پر ماتم کناں ہیں۔

ایک شیخ کی حیثیت سے حضرت حکیم الاسلامؒ نسبتِ قاسمی کی میراث کے ایک سچے اور پرجوش وارث تھے اور ان کے متوسلین و مریدین کا دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا عظیم سلسلہ آپ کے فیوض و برکات کا مشاہد ہے اور آپ کا بابرکت دامن تھام کر جادۂ روحانیت کے منازل طے کرتا رہا۔ ایشیا کے علاوہ آپ کے مریدین و منتسبین کا سلسلہ یورپ، امریکہ اور افریقہ کے براعظموں میں پھیلا ہوا ہے جو آپ کی نگاہِ مسیحا اثر سے حضرت والا کے گرویدہ ہوئے اور آپ کے حلقۂ ارادت سے وابستہ ہو کر تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس کی طرف متوجہ ہوئے۔ سلوک وطریقت میں آپ محققِ اسلام حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے فیض یافتگان اور مجازین میں سے ہیں۔ دبستان تھانوی کے وابستگان اپنے شیخ کی بے مثال اصول پسندی اور منفردانہ تربیت کے طفیل اس خانقاہ سے کندن بن کر نکلے اور اخلاص و بے لوثی میں اپنے مرشد کے نقوش قدم پر چلتے ہوئے اِن مشائخ نے زندگی کا ایک ایک لمحہ خدمتِ خلق اور فیض رسانی کے لئے وقف کئے رکھا۔ حضرت تھانویؒ کے خلفاء تو تمام کے تمام ہی اس دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں لیکن اب تو حضرت حکیم الاسلامؒ کے خلفاء میں سے خال خال ہی باقی رہ گئے ہیں۔

ایک مربی کی حیثیت سے حضرتؒ نے علاوہ اپنے متوسلین و مریدین کی روحانی تربیت کے، دارالعلوم

دیوبند کے اپنے تقریباً ساٹھ سالہ دورِ اہتمام میں طلبائے دارالعلوم کی جس شفقت و محبت کے ساتھ علمی سرپرستی کی اور ان کے سامنے علمی طور پر مستقبل کے لئے ایک طرزِ حیات اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی طرف سے رہبری فرمائی وہ شاید حضرت قبلہ کی زندگی اور نصب العین کا سب سے تابناک اور قابلِ رشک پہلو ہے۔ فرزندانِ دارالعلوم دیوبند جن میں آج بڑے بڑے مشاہیر علماء اور منفرد شخصیات ابھی موجود ہیں، ہر قدم پر اُن کی رہنمائیوں اور نصائح کو متاعِ عزیز کی طرح حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں۔

آپ کی زندگی کے یہ سب وہ روشن پہلو ہیں جن سے آپ کے ساتھ وابستگی رکھنے والے حلقوں میں افادہ اور استفادہ کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان تمام مشاغل و مصروفیات اور اس دستورِ حیات کے ساتھ آپ کو صنفِ شعر سے دلچسپی لینے کے مواقع شاذ و نادر ہی ملتے ہوں گے مگر آپ کی کتابِ زندگی کے مطالعہ سے آپ کی قوتِ بیان کا یہ نیا رخ بھی سامنے آتا ہے جو اربابِ ادب کے لئے ایک انکشاف ہوگا اور یقیناً حضرتؒ کی علمی تصانیف اور افادات کے درمیان یہ منظوم کڑی اس خاندانی مذاق کا مظہر ہوگی جس کا مزاج آپ کے جدِّ امجد حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کو واہبِ عطایا کی طرف سے ہوا تھا۔ حضرت کا منظوم کلام شوق شعرگوئی کے بجائے واقعات و حادثات پر ذی تاثر حقیقی جذبات اور تبادرِ ذہنی پر مبنی ہے۔ آپ کی تمام نظموں کے محرکات جماعتِ دیوبند یا اپنے خاندان میں پیش آنے والے اہم واقعات و تقریبات یا حادثات ہیں جن سے متاثر ہوکر جذبات نے جامۂ شعر اختیار کرلیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے منظوم کلام میں تصنع و پُرکاری کے بجائے سادگی و سلاست اور پرخلوص جذبات ہیں اور یہی بنیاد حضرتؒ کی صنفِ غزل سے عدم دلچسپی کی ہے جس کی تعمیر محض نزاکتِ تخیل اور ندرتِ اظہار و بیان پر ہوتی ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی یادگار اور ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند نے اپنی تاریخ کے ابتدائی دور سے ہی تاریخ کی عظیم و بلند قامت شخصیات کا ایک کہکشانی سلسلہ دیا، یہ بوقلموں شخصیات ایک سے بڑھ کر ایک ثابت ہوئیں جنہوں نے اپنے اخلاص اور اپنی زبردست خدمات سے ساری ملتِ مرحوم پر بالعموم اور ہندوستانی مسلمانوں پر بالخصوص ایک اَن مٹ چھاپ چھوڑی۔ ان میں تصوف و روحانیت کے تاجدار بھی ہیں اور علم و فضل کے کوہِ ہمالہ بھی۔ اگر ایک طرف مصنفین اور قلم کاروں کی صف اِن سے پُرنظر آتی ہے تو دوسری طرف شعلہ بیان خطیبوں، بزمِ سیاست کے جیالوں، ادب و انشاء کے چاند تاروں اور علمِ طب اور علومِ فطرت کے حاذقوں کا جمگھٹ بھی دامنِ دل کو کھینچتا نظر آتا ہے۔

اسی دور میں کاروانِ اسلام کا وہ عظیم سپہ سالار سامنے آیا جس کے دستِ مسیحا کے اثر نے مضمحل ملت

اسلام میں ایک نئی روح پھونکی اور خوابیدہ قوم کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اُس دور میں جب کہ مسلمانانِ عالم تنزل اور انحطاط کی طرف مائل اور دنیا کے ہر گوشے میں استعماری طاقتوں کے آگے بے آبروئی سے دوچار تھے، اِس میر کارواں نے اُنہیں اُن کی کھوئی ہوئی پونجی کا پتہ دیا، انہیں غفلت کی نیند سے چونکا کر پروردگارِ عالم کے جلال کی چوکھٹ پر جھکا دیا اور پیغمبر علم کے درسِ آ گہی کا دیوانہ بنا دیا کہ مسائل کا حل صرف رجوع الی اللہ اور علمی ترقی میں چھپا ہے یعنی یہ دور علم و تحقیق و جستجوئے آ گہی کا دور ہے اور یہی سید المرسلین ﷺ کا ورثہ ہے۔ ہم اس کے امین ہیں۔ ایک دور تھا کہ ہمارے اسلاف نے پیغمبر اعظم ﷺ کی تعلیمات سے درسِ وفا لے کر اس گنبدِ افلاک کو اپنی تکبیر مسلسل اور علمی صداؤں سے بھر دیا تھا۔ ہم ان ہی کے وارث ہیں۔ اگر ہم نے خاک آغوش ہو کر استعماری و غلامی کو قبول کر لیا اور ساحل پر بیٹھ کر موجۂ علم کے حرف تماشائی بنے رہے تو یہ قناعتِ حیات ہمیں بہت مہنگی پڑنے والی ہے۔ آپ نے دنیا بھر میں علمی بیداری کا پیغام پہونچایا اور مسلمانوں کو چونکایا کہ چشمِ بینا کھول کر دیکھو کہ آج علم و تحقیق کا قافلہ کیسی قیامت کی چال چل گیا، وقت نے کیسی زقند بھری ہے کہ ستاروں سے آگے خلاؤں کے جہان کو اپنی جولان گاہ بنا لیا۔ ہمیں ایک زوال آشنا قوم بن کر نہیں جینا ہے بلکہ ایک زندہ اور متحرک وحدت اور خیر امت کی طرح نفع بخشی کے اصول پر جینا ہے۔

یہ دانائے راز اسی دارالعلوم دیوبند کا ایک عظیم سپوت بلکہ بانی دارالعلوم کے علوم کا امین و وارث اور اُن کا پوتا تھا۔ ظاہری وجاہت و خوبصورتی کا نمونہ، علم و مروت کا پیکر، اخلاقِ اسلامی کا مجسمہ اور متواضع و انکسار کی بہترین تصویر، آپ ہی اسم بامسمی ہو کر حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمہ اللہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کہلائے۔

آپ حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمہ اللہ (ابن حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ) کے فرزند اکبر ہیں۔ آپ رحمہ اللہ ماہ جون ۱۸۹۷ء مطابق محرم ۱۳۱۵ء بروز یک شنبہ دیوبند میں پیدا ہوئے۔ چوں کہ بڑے ارمان وتمنا اور دعاؤں کے بیچ حق تعالیٰ نے حضرت رحمہ اللہ کے یہاں ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا تھا اس لئے قدرتی طور پر آپ سارے خاندان کی آنکھ کا تارا تھے جس کی پرورش بڑے لاڈ پیار کے ساتھ کی گئی، یہاں تک کہ پانچ چھ سال کی عمر ہوئی تو انتہائی شوق و اہتمام کے ساتھ آپ کو پڑھنے بٹھایا گیا۔ بسم اللہ کی تقریب میں اس وقت کے سارے بزرگانِ دارالعلوم اپنی دعاؤں کے ساتھ شریک ہوئے۔

آپ کو حق تعالیٰ نے حسن صورت کے ساتھ حسنِ آواز اور خوش گلوئی سے بھی انتہائی فیاضی کے ساتھ نوازا تھا، عمر کے ساتھ خوش گلوئی نمایاں ہوئی تو آواز کا جادو بھی ہر ایک کو مسحور کرنے لگا اور پورا گھر اور ماحول

دینی تھا اور خوش آوازی کا مظاہرہ تلاوتِ قرآن کریم سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا تھا اس لئے طے پایا کہ کسی جید قاری کا انتظام کیا جائے۔ اس زمانے میں الہ آباد کے قاری عبدالوحید خاںؒ کا شہرہ فنِ تجوید وقرأت ہر طرف تھا۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ کے اشارے پر قاری صاحب موصوف کو ذاتی مہمان واستاد کی حیثیت سے بلاکر آستانۂ قاسمی میں ہی ٹھہرایا گیا جن کے حق الخدمت اور خورد ونوش کی ذمے داری حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ پر تھی۔ اس طرح حضرت حکیم الاسلامؒ کو وقت کے بہترین قاری نے تجوید وقرأت کے رموز سے آشنا کیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد ہی حضرت شیخ الہند کے مشورے پر شعبۂ قرأت قائم کیا گیا تاکہ دوسرے شائق طلبہ بھی اس فن کی تعلیم حاصل کرسکیں۔ آپ چوں کہ غیر معمولی طور پر ذہین اور محنتی تھے لہٰذا صرف گیارہ سال کی عمر میں شعبان ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء تک مکمل قرآن کریم مع تجوید وقرأت کے حفظ کرلیا۔ اس کے بعد ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں فارسی کا پورا نصاب تین سال میں مکمل کیا اور فارسی بولنے کی مشق کرکے اس پر عبور حاصل کرلیا جس کا ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ آپ اپنی طالب علمی کے ابتدائی دور میں ہی فارسی میں بھی شعر کہنے لگے تھے۔ ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں آپ نے درجات عربی میں داخل ہوکر علومِ اسلامی کی تعلیم کا آغاز کیا۔ خوش قسمتی سے آپ کو اپنے وقت کے مشہور اور بہترین اساتذہ ملے جن کے سامنے آپ نے زانوئے ادب طے کیا۔ ان میں بطور خاص حضرت شیخ الہندؒ، حضرت العلاّم مولانا انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور حضرت مولانا رسول خاں صاحبؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں آپ نے دارالعلوم دیوبند سے سند فضیلت حاصل کی۔

آپ کے اساتذہ میں خود آپ کے والدِ مکرم حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند بھی شامل ہیں جن سے آپ نے مشکوٰۃ شریف اور مسلم شریف جیسی حدیث کی اہم کتابیں پڑھیں ہیں۔ چنانچہ آپؒ خود فرمایا کرتے تھے کہ مجھے حدیث کے ساتھ مناسبت اپنے والد مکرم حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے درس سے حاصل ہوئی۔ تشریح حدیث کا انداز حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے پایا اور استخراجِ مسائل کا طریقہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحبؒ عثمانی سے ملا۔

علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ اپنے ذوق ومزاج کے لحاظ سے درس وتدریس کے مشغلے کو پسند کرتے تھے۔ اُدھر آپ کی علمی استعداد وذہانت، قوتِ افہام وتفہیم اور خاندانی لحاظ سے خالص علمی پس منظر کو دیکھتے ہوئے اکابرِ دارالعلوم کی نگاہوں میں بھی آپ کے لئے تدریس کا سلسلہ ہی موزوں ترین تھا۔ چنانچہ

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کا تقرر بحیثیت استاذ دار العلوم کر دیا گیا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ اپنی ذہانت وذکاوت کی بنا پر نہ صرف دار العلوم کے اندر مقبول ترین اساتذہ میں شمار ہونے لگے بلکہ تمام علمی حلقوں میں آپ کی فراست وذکاوت، قوت بیان اور علمی گہرائی و گیرائی کی شہرت ہوگئی اور آپ کی نکتہ رسی اور نکتہ آفرینی کے چرچے ہونے لگے۔ دورانِ تدریس تقریباً ہر علم وفن کی کتابیں آپ کے زیرِ درس رہیں۔ چنانچہ فقہ کے علاوہ نحو وصرف، منطق، فلسفہ اور معانی وغیرہ تمام فنون کی کتابیں انتہائی حسن وخوبی کے ساتھ پڑھائیں جس سے علمی حلقوں میں آپ کی شہرت کو چار چاند لگے اور اکابر کے ذریعہ سندِ اعتراف ملی۔ تقریباً چھ سات سال کے دوران جب تک آپ صرف استاذ دار العلوم کی حیثیت سے ادارہ کی خدمت کرتے رہے آپ نے کبھی کوئی حق الخدمت یا معاوضہ نہیں لیا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی ذات اور دار العلوم دیوبند ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم رہے۔ نہ آپؒ کا تذکرہ بغیر دار العلوم کے مکمل ہوسکتا ہے نہ دار العلوم کی تاریخ آپؒ کے تذکرے کے بغیر مکمل ہوسکتی ہے۔ جس کو آپ نے تقریباً پچپن سال (اور اگر نائب مہتمم ہونے کے زمانے کو بھی شامل کرلیا جائے تو کل مدت ساٹھ سال تک پہنچ جاتی ہے) اپنے خونِ جگر سے سینچا اور حضرت نانوتویؒ کے لگائے ہوئے اس پودے کو بحیثیت مہتمم ایک تناور درخت کے مقام پر پہونچایا جس کی جڑیں حضرت والا کی شب وروز کی جدو جہد، سعیِ پیہم اور مسلسل سفروں نے ہندوستان سے باہر پورے ایشیاء، یورپ کے ممالک، امریکہ وکنیڈا اور براعظم، افریقہ کے بڑے سے لے کر چھوٹے کوردہ اور غیر معروف جزائر تک پھیلا دیں۔ عرب ممالک میں اس ادارہ کا اعتبار قائم فرمایا اور اس درسگاہ کو ایک یونیورسٹی کی حیثیت دے کر عربوں میں اس کا تعارف بطور ازہرِ ہند اور ''ایشین اسلامک یونیورسٹی'' کرایا۔

حضرت نانوتویؒ کی یہ یادگار جسے اُن کے پوتے حضرت حکیم الاسلامؒ نے پروان چڑھایا آج نہ صرف امت مسلمہ کا ایک قابل فخر ادارہ ہے بلکہ پورے ہندوستان کے لئے سرمایۂ افتخار وناز ہے۔ ایشیا کی اس سب سے بڑی دانش گاہ نے بالخصوص حضرت حکیم الاسلامؒ کے دور اہتمام میں اپنی شہرت وعظمت کی وجہ سے دنیا کے دور دراز ممالک سے طالبانِ علم کو دعوت شوق دی جس کے نتیجے میں چند سو کے بجائے اقطارِ عالم سے ہزاروں تشنگانِ علم اس کی طرف کھنچنے لگے۔ اس ادارہ نے اپنی طویل تاریخ میں وقت کی عظیم وبلند قامت شخصیات کا ایک تابناک سلسلہ دیا جو علمی ذوق سے سرشار تھا۔ اب ظاہر ہے کہ اس شجرۂ طوبیٰ کے فرزندوں میں حکیم الاسلامؒ کو تو اس ذوقِ علمی سے بطور خاص سرشار ہونا ہی چاہئے تھا کہ آپ بانی دار العلوم کی براہ راست اولاد تھے۔

چنانچہ ایک طرف فراغت کے فوراً بعد ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں آپ اپنے شوق اور فطری رجحان کی بنا پر تعلیمی خدمت میں مصروف ہو گئے تو دوسری طرف اربابِ بصیرت کی دوررس نگاہیں اس ذوق کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے لئے اُس غیر معمولی محبّت واخلاص کو بھی تاڑ رہی تھیں جو آپ کے دل میں موجزن تھا۔ اسی مشاہدہ کے تحت ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں ہی مجلس شوریٰ دارالعلوم نے آپ کو تدریسی مشغولیت کے ساتھ ہی اتفاق رائے سے نائب مہتمم دارالعلوم کے منصب پر تقرر کر دیا جسے آپ نے بزرگوں کے امتثالِ امر کے طور پر طبیعت پر جبر کر کے قبول فرمالیا۔ اُس وقت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ مہتمم تھے۔

۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کا انتقال ہو گیا۔ اُدھر حکیم الاسلامؒ کی انتظامی صلاحیتیں اور جوہر گذشتہ پانچ سات برسوں میں عیاں ہو چکے تھے اس لئے مجلس شوریٰ نے آپ کو مہتمم دارالعلوم دیوبند کے اعلیٰ عہدے پر فائز کر دیا۔ اس تقرر کے چند ماہ بعد جب مجلس شوریٰ کا دوبارہ اجلاس ہوا تو اس میں حضرت والا کی اعلیٰ کارکردگی کو دیکھ کر مجلسِ شوریٰ نے ان الفاظ میں آپ کے حسنِ انتظام پر تحسین پیش کی۔

''ہم ممبرانِ شوریٰ اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ جب سے مولانا محمد طیب صاحب نے زمامِ اہتمام اپنے ہاتھ میں لی ہے اُن کے ہر طریقِ عمل سے صدق واخلاصِ نیت، حب فی اللہ اور بغض فی اللہ اور ادائے حقوق نمایاں ہے۔''

آپ نے انتظام دارالعلوم سنبھالتے ہی اپنی بلند فکری کے تحت اس ادارے کو بامِ عروج پر پہونچانے کا عزم کیا اور اس مرکزِ علم کو ایک مدرسہ کے مقام سے بڑھا کر علومِ اسلامی کی ایک منفرد اور عالمی دانش گاہ کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کریں جو اپنے طلبہ میں ایک خالص اسلامی مزاج، دینی درد اور مسلکی پختگی کے ساتھ ایسے عمل کے پیکر پیدا کرے جن کے قول وفعل اور نشست و برخواست سے عظمتِ توحید نمایاں ہو اور سننِ نبوی زندہ وتازہ ہوں۔

آپ نے سب سے پہلے تعلیمی نظام پر توجہ دی اور اس کی بہتری واصلاح کے لئے مناسب اقدامات کئے تاکہ معیارِ تعلیم بلند ہو اور طلباء میں صحیح استعداد پیدا ہو۔ ساتھ ہی ادارہ میں مزید انتظامی شعبہ جات قائم فرمائے تاکہ طلبہ اور کارکنان کے درمیان ہر سطح پر رابطہ رہے۔ چنانچہ حضرتؒ کو جب اہتمام سپرد کیا گیا تو پورا ادارہ صرف آٹھ شعبوں پر مشتمل تھا۔ آپ نے طلبہ کی اور نظم کی سہولت کے لئے متعدد ضروری شعبوں کا اضافہ فرمایا جن کی تعداد کچھ ہی عرصے میں چار پانچ گنا بڑھ گئی۔ اسی طرح ادارہ کے کارکنوں کا کل عملہ اُس

وقت ۴۵ /افراد کا تھا جو آپ کے دورِ آخر تک ڈھائی سو سے بھی متجاوز ہو چکا تھا۔ ایسے ہی اساتذۂ کرام کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ آپ نے طلبائے دارالعلوم کے معاشی مستقبل کے لئے کچھ مفید اقدامات فرمائے تاکہ فراغت کے بعد اُن کے پاس ایک باعزت روزگار کا بھی فی الجملہ وسیلہ رہے۔ چنانچہ آپ نے دارالصنائع کا شعبہ قائم کیا جس میں چمڑے کا سامان بنانا جیسے سوٹ کیس، ہینڈ بیگ اور پرس نیز گھڑی سازی اور جلد بندی کا کام سکھایا جاتا تھا۔ اسی طرح خوش نویسی اور کتابت کا شعبہ قائم کیا پھر جامعہ طبیہ قائم کر کے اس کی وسیع عمارات تعمیر کرائیں جن میں متعدد درس گاہیں، علم الابدان کی نظری تعلیم کے ساتھ ایک اناٹمی میوزیم اور تقریباً بیس تیس بیٹ کے دو وارڈ بھی تھے۔ دواسازی کا شعبہ علیحدہ تھا، اس کے علاوہ تعمیری ترقیات بے شمار ہوئیں حتیٰ کہ چند ابتدائی مگر بڑی عمارات کے علاوہ باقی تمام آپ کے ہی دور اہتمام کی ہیں جیسے مسجد کا بالائی حصہ، دارجدید، مطبخ، دارالافتاء، باب الظاہر، افریقی منزلیں قدیم و جدید، دارالمدرسین، درجۂ حفظ، درجۂ دینیات اور فارسی خانہ کی عمارات وغیرہ وغیرہ۔

آپ کی پوری زندگی ایک جہد مسلسل رہی جس کا ایک ایک لمحہ دارالعلوم کی خدمت، شہرت اور اُس کے حلقۂ اثر کی توسیع کے لئے وقف تھا۔ ادارہ کی عالمی شہرت کے لئے آپ کے علمی و تقریری کارنامے، دارالعلوم کے انتظامی امور کی ہمہ وقتی مصروفیات، مسلسل اصلاحی مقاصد کے سفر اور پیہم تصنیف و تالیف کا مشغلہ! پھر ان تمام مشاغل کے باوجود آپ نے طبعی ذوق کے مطابق درس و تدریس کا سلسلہ آخر تک برقرار رکھا۔ چنانچہ آپ مشکوٰۃ شریف کے علاوہ صحاح ستہ کی اہم کتابیں مثلاً ابن ماجہ وغیرہ۔ اور آخر کے برسوں میں بخاری شریف بھی پڑھاتے رہے چوں کہ حضرت حکیم الاسلامؒ اپنے جدِّ امجد حضرت الامام النانوتویؒ کی ذہانت و فراست کے علاوہ اُن کے علوم و معارف کے اصلی وارث تھے، اُدھر شیخ الطائفہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کے امین تھے۔ نیز حدیث کی بصیرت و فہم میں اپنے استاذ مکرم حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے فنِّ حدیث میں خوشہ چیں تھے۔ اس لئے تینوں نسبتوں کا ظہور آپ کی شخصیت میں نمایاں ہوا اور آپ کی تحریر و تقریر کی روانی، سلاست، اثر انگیزی اور حکم و نکتہ آفرینی ان خصوصی نسبتوں کی عکاسی تھی۔ یہ آپ کی قوت استدلال ہی تھی کہ احکام منقولہ اور تشریعی امور کو آپ واضح کرتے تو اللہ کی حکمت و دانش پر اس انداز میں روشنی ڈالتے کہ عقل و فکر مبہوت ہو کر حیرت و وجد کی دوگونہ کیفیت میں کھو جاتا۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل اور نسبتِ قاسمی کا وہ مسلسل فیضان تھا جو آپ کے خطبات و تصنیفات میں کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوتا ہے۔

دارالعلوم کے عظمت و وقار کے لئے آپ کا آخری عظیم کارنامہ اجلاس صد سالہ کا انعقاد ہے جس نے

دارالعلوم دیوبند اور اُس کی سوسالہ عظیم خدمات کو عالمی سطح پر ایک قابل لحاظ ادارے کی حیثیت سے متعارف کرایا اور جس کے ساتھ عرب و عجم کے مسلمانوں کا ایک اٹوٹ مذہبی جذباتی رشتہ ہے حتی کہ مسلمانانِ عالم اس کے شرعی فیصلوں کو دل و جان سے حق جان کر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ اعتماد دو چار سال میں نہیں پیدا ہو گیا بلکہ یہ ایک مجاہد کی زندگی کے طویل اور ایک صدی کے تین چوتھائی حصے کی پیہم آبلہ پائی کا پھل تھا۔ یہ اُن مسلسل قربانیوں کا ثمرہ تھا جو ایک انسان اپنے دنوں کے چین اور راتوں کے آرام کو تج کر ہی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ صلہ تھا ایک مردِ مومن کے اخلاص کا اور انعام تھا ایک مردِ راہ داں کے ایثار کا۔ اجلاسِ صد سالہ نے ایک بندہ مومن کی زندگی کے اس نصب العین کو مکمل کر دیا جو دارالعلوم دیوبند کو آسمانِ علم و تحقیق کے ایک آفتابِ عالم تاب کی صورت جگمگاتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا جس کے خیرہ کن نور سے دنیا کا گوشہ گوشہ منور ہوا اور جو امتِ مسلمہ کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل کہلائے ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

............❖............

حکیم الاسلامؒ کی ہمہ جہت شخصیت

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمی نور اللہ مرقدہٗ کی ذات گرامی دارالعلوم دیوبند کے اس بابرکت دور کی دلکش یادگار تھی، جس نے حضرت شیخ الہندؒ، حضرت حکیم الامت تھانویؒ، حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ اور ان جیسے دوسرے حضرات کا جلوہ جہاں آراء دیکھا تھا۔ جس ہستی کی تعلیم وتربیت میں علم وعمل کے ان مجسم پیکروں نے حصہ لیا ہو اس کے اوصاف وکمالات کا ٹھیک ٹھیک ادراک بھی ہم جیسوں کے لئے مشکل ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے پیکر میں معصومیت، حسن اخلاق اور علم وعمل کے جو نمونے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں ان کے نقوش دل ودماغ سے محو نہیں ہوسکتے۔

حضرت حکیم الاسلام محمد طیب صاحب قدس سرہٗ بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے پوتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حکمت دین کی جو معرفت حضرت نانوتویؒ کو عطا فرمائی تھی اس دور میں حضرت حکیم الاسلامؒ اس کے تنہا وارث تھے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے علوم کو جن حضرات نے اپنے مزاج ومذاق میں جذب کر کے انہیں شرح وبسط کے ساتھ امت کے سامنے پیش کیا ان میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہٗ کے بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کو تعلیم سے فراغت کے بعد تدریس وتصنیف کے لئے باقاعدہ وقت بہت کم ملا۔ اور نوعمری ہی میں دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم الشان ادارے کے انتظام وانصرام کی ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر آ گئیں۔ ان ذمہ داریوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو عموماً علمی مشاغل سے دور کر کے اس کی علمی استعداد پر بہت برا اثر ڈالتی ہیں۔ لیکن حضرت حکیم الاسلامؒ کا معاملہ اس لحاظ سے

بھی حیرت انگیز تھا۔ انتظامی بکھیڑوں میں مبتلا رہنے کے باوجود ان کا علمی مذاق ہمیشہ تازہ اور ان کی علمی استعداد سدا بہار رہی، احقر کے والد ماجد مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ اور حضرت حکیم الاسلامؒ بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھی اور زندگی کے ہر مرحلے میں ایک دوسرے کے رفیق رہے ہیں، دونوں نے دار العلوم دیوبند میں ساتھ پڑھا ساتھ فارغ ہوئے، ساتھ ہی پڑھانا شروع کیا، دونوں ایک ہی وقت حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے دست مبارک پر بیعت ہوئے، اور پھر حضرتؒ کی وفات کے بعد ایک ہی ساتھ تھانہ بھون حاضر ہو کر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور تقریباً دونوں کو ساتھ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی طرف سے خلافت عطا ہوئی۔ ۱۳۴۵ھ میں سب سے پہلا حج بھی دونوں نے ساتھ کیا۔ غرض ظاہری تعلیم اور باطنی تربیت سے لے کر سیر و تفریح تک ہر چیز میں دونوں کی رفاقت مثالی رفاقت تھی۔ پھر جب قیام پاکستان کی تحریک شروع ہوئی اور آزادی ہند کے طریق کار سے متعلق علماء دیوبند کے درمیان اختلاف رونما ہوا تو حضرت والد صاحبؒ کی طرح حضرت حکیم الاسلامؒ کا نقطہ نظر بھی حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی رائے کی طرف مائل تھا۔ لیکن حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے کو عملی سیاست سے بالکلیہ یکسو کر کے ہمہ تن دار العلوم دیوبند کی خدمت کے لئے وقف کیا ہوا تھا۔ اس لئے یہ نقطہ نظر اسٹیج پر نہ آ سکا۔ حضرت والد صاحبؒ قیام پاکستان کے بعد یہاں تشریف لے آئے اور حضرت حکیم الاسلامؒ کے لئے دار العلوم کی گراں بار ذمہ داری کے پیش نظر دیوبند چھوڑنے کا سوال ہی نہ تھا۔ لیکن یہ بات میں نے حضرت حکیم الاسلامؒ سے بارہا سنی کہ جس روز حضرت مفتی صاحبؒ پاکستان کے لئے روانہ ہوئے اس روز میں دن بھر روتا رہا۔ آپ نے حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے موقع پر جو تعزیتی مکتوب ارسال فرمایا اس میں بھی لکھا تھا کہ:

”تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستانی قومیت اختیار فرمائی اور یہاں سے ہجرت فرما کر پاکستان تشریف لے گئے کسی مرنے والے کے لئے بھی اتنا کبھی نہیں رویا تھا جتنا آپ کے فراق پر رویا تھا، یہ حالت دیکھ کر سب گھر والے پریشان ہو گئے تھے کہ آخر کیا حادثہ پیش آ گیا جو اتنا گریہ طاری ہے۔ یہ تعلق کی بناء پر تھا کہ ابتدائے عہد سے ہم رفیق رہے تھے“

اس کے بعد سے وہ ہمہ وقتی رفاقت چھوٹ گئی۔ قلب و روح کا رشتہ کسی مرحلے پر نہ ٹوٹا ایک مرتبہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے خط میں حضرت والد صاحبؒ کو لکھا کہ:

”کل یہاں مستحسن صاحب فاروقی کے ساتھ مولوی ظہور احمد صاحب نے میری بھی دعوت کی تھی،

آپ ہی کے مکان سے متصل منشی بشیر احمد صاحب مرحوم کے مکان میں کھانا کھلایا۔ مکان دیکھ کر مکینوں کی یاد تازہ ہوگئی اور دیر تک اس تصور میں استغراق رہا۔"

یہ لکھنے کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ نے متمم بن نویرہ کے ان اشعار سے تمثل فرمایا کہ:

وکنا کندمانی جذیمة حقبة　　من الدهر حتی قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا کانی ومالکا　　لطول اجتماع لم نبت لیلة معا

قیام پاکستان کے بعد بارہا حضرت حکیم الاسلامؒ کراچی تشریف لائے، اور یہ ممکن نہیں تھا کہ کراچی تشریف لانے کے بعد آپ دارالعلوم تشریف نہ لائیں، چنانچہ ہر بار خدام دارالعلوم کو اپنی شفقتوں سے بہرہ ور فرماتے طلباء اور اساتذہ سے خطاب بھی ہوتا۔ اور پھر حضرت والد صاحبؒ اور ان کے درمیان جو باغ و بہار مجلس ہوتی اس میں علمی تبادلہ خیال کے علاوہ ماضی کے تذکرے زمانہ طالب علمی کی یادیں، اساتذہ کے واقعات اور نہ جانے کتنے موضوعات پر گفتگو ہوتی اور ہم خدام کو افادات کا نہ جانے کتنا خزانہ ہاتھ آ جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کو تصنیف اور خطابت دونوں میں کمال عطا فرمایا تھا۔ اگرچہ انتظامی مشاغل کے ساتھ سفروں کی کثرت تھی اور یہ سفر حضرتؒ کی زندگی کا جزو لازم بن کر رہ گئے تھے۔ حساب لگایا جائے تو عجب نہیں کہ آدھی عمر سفر ہی میں بسر ہوئی ہو، لیکن حیرت ہے کہ اتنی مصروفیات کے باوجود آپ تصنیف و تالیف کا وقت نکال لیتے تھے۔

چنانچہ آپ کی دسیوں تصانیف آپ کے بلند علمی مقام کی شاہد ہیں اور ان کے مطالعہ سے دین کی عظمت و محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جہاں تک وعظ و خطابت کا تعلق ہے اس میں تو اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو ایسا عجیب و غریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں حضرت حکیم الاسلامؒ کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے۔ نہ جوش و خروش نہ فقرے چست کرنے کا اندازہ، نہ پر تکلف لسانی، نہ لہجہ اور نہ ترنم اور نہ خطیبانہ ادائیں لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر موثر دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ اور مستفید ہوتے تھے۔ مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ لیکن الفاظ و معانی کی ایک نہر سلسبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی اور قلب و دماغ کو نہال کر دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منہ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں۔ ان کی تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا جو انسان کو زیر و زبر کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے مخالف فرقوں کی تردید کو اپنی تقریر کا موضوع کبھی نہیں بنایا لیکن نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں نے ان کے مواعظ سے ہدایت پائی اور کتنے غلط عقائد ونظریات سے تائب ہوئے۔

لاہور میں ایک صاحب علماء دیوبند کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈہ سے بہت متاثر اور علماء دیوبند سے بری طرح برگشتہ تھے۔ طرح طرح کی بدعات میں مبتلا بلکہ ان کو کفر ایمان کا معیار قرار دینے والے اتفاق سے حضرت حکیم الاسلامؒ لاہور تشریف لائے اور وہاں ایک مسجد میں آپ کے وعظ کا اعلان ہوا۔ یہ صاحب خود سناتے ہیں کہ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ان کے وعظ میں اس نیت سے پہنچا کہ انہیں اعتراضات کا نشانہ بناؤں گا اور موقع ملا تو اس مجلس کو خراب کرنے کی کوشش کرونگا۔ لیکن اول تو ابھی تقریر شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کا معصوم اور پرنور چہرہ دیکھ کر ہی اپنے عزائم میں زلزلہ سا آ گیا۔ دل نے اندر ہی گواہی دی کہ یہ چہرہ کسی بے ادب، گستاخ یا گمراہ کا نہیں ہوسکتا۔ پھر جب وعظ شروع ہوا اور اس میں دین کے جو حقائق ومعارف سامنے آئے تو پہلی بار اندازہ ہوا کہ عالم دین کسے کہتے ہیں؟ یہاں تک کہ تقریر کے اختتام تک میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے آگے موم ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے سابقہ خیالات سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے بزرگان دین کے بارے میں ایسی بدگمانیوں سے نجات عطا فرمائی۔ برصغیر کا تو شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو کہ جہاں حکیم الاسلامؒ کی آواز نہ پہنچی ہو۔ اس کے علاوہ افریقہ، یورپ اور امریکہ تک آپ کے وعظ وارشاد کے فیوض پھیلے ہوئے ہیں اور ان سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا منصب اہتمام کوئی معمولی چیز نہ تھی، حضرت حکیم الاسلامؒ نے پچاس سال سے زائد اس منصب کی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھایا۔ اس دوران دارالعلوم پر نہ جانے کتنے کٹھن اور نازک دور آئے، لیکن حضرت حکیم الاسلامؒ نے ان تمام جھمیلوں کو نمٹایا اور اپنی ساری زندگی دارالعلوم کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ سخت سے سخت مرحلوں پر بھی انہیں پرسکون ہی دیکھا۔ اجلاس صدسالہ کا ہنگامہ دارالعلوم کے منتظمین کے لئے ایک کڑی آزمائش کی حیثیت رکھتا تھا۔ دیوبند جیسی مختصر جگہ میں لاکھوں افراد کے اجتماع کا انتظام انتہائی مشکل کام تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس موقع پر اس سراسیمگی سے نجات حاصل نہ کرسکتا۔ لیکن ٹھیک اجلاس کے افتتاح کے روز حضرت حکیم الاسلامؒ کے پاس حاضری ہوئی تو حسب معمول انہیں متبسم اور پرسکون دیکھا۔ چہرے پر تھکن ضرور تھی لیکن گھبراہٹ اور پریشانی نام کو نہ تھی۔

افسوس ہے کہ اجلاس صدسالہ کے بعد دارالعلوم دیوبند میں باہمی اختلافات نے جن ہنگاموں کی شکل اختیار کی انھوں نے ماضی کے تمام ہنگاموں کو مات کر دیا۔ دور ہونے کی وجہ سے ہمیں تمام حالات و

واقعات سے واقفیت تو نہ تھی لیکن اس بات سے دل بے چین تھا کہ اس آخری عمر میں حضرت حکیم الاسلامؒ پر ان ہنگاموں کی وجہ سے کیا بیت رہی ہوگی؟ اس زمانے کے حالات اس قدر پیچیدہ ہیں اور ان کے بارے میں ملنے والی اطلاعات اتنی متضاد ہیں کہ اب حق و ناحق کا فیصلہ تو شاید آخرت ہی میں ہو سکے گا، لیکن اتنی بات واضح ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے چھوٹوں نے ان کی نصف صدی سے زائد کی خدمات کا جو صلہ اس آخری عمر میں ان کو دیا ہے وہ انتہائی تکلیف دہ ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کی زندگی تک ایک ضعیف سی امید باقی تھی کہ شاید اس بحران کا کوئی مناسب حل نکل آئے، لیکن اب ان کی وفات نے اس امید کو بھی خاکستر کر دیا۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کے دم سے دارالعلوم دیوبند میں بزرگوں کی روایات زندہ تھیں اور اس کے مخصوص مزاج و مذاق کی جھلک باقی تھی اب دارالعلوم کی ان روایات کا اللہ ہی حافظ ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کی وفات بلاشبہ پوری امت کے لئے عظیم سانحہ ہے، وہ ۴؍شوال المکرّم ۱۴۰۳ھ کو ہمیں داغ مفارقت دے کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے تھے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ دارالعلوم دیوبند میں سلف کی آخری یادگار تھے۔ ان کی وفات کسی ایک شخص کی وفات نہیں۔ یہ ایک پورے عہد کا اس کے مزاج و مذاق کا اور اس کی دل آویز خصوصیات کا خاتمہ ہے۔ اور اس کے سانحے کی ٹیس نہ جانے کب تک دلوں میں تازہ رہے گی۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون.

وما کان قیس هلکه هلک واحد ولکنـــه بنیان قـــوم تهدمها

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ

مولانا قاضی محمد اطہر مبارکپوریؒ

حضرت مولانا محمد طیب صاحب علم وفضل، ارشاد وتبلیغ، اخلاق وعادات، درس وتدریس حلم وصبر، نظم وضبط، تصنیف وتالیف، حکمت وموعظت، تقویٰ وطہارت، اور دیگر علمی ودینی وذاتی اوصاف وکمالات میں اپنے دور کے فرد واحد تھے۔ عوام وخواص میں مقبولیت ومحبوبیت اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے جو مستحقین ہی کو ملتا ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ اپنے اوصاف جمیلہ کی وجہ سے اس فضلِ خداوندی کے بہترین مستحق تھے پورے عالم اسلام میں ان کو جو مقبولیت ومحبوبیت حاصل تھی اس میں ان کے معاصرین میں کوئی شریک وسہیم نہیں ہے حد یہ ہے کہ ان کے مخالفین بھی ان کے ادب واحترام میں بخل نہیں کرتے تھے۔

وہ علمائے دیوبند کے اصلاحی وعلمی ودینی تحریک کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھے بلکہ اس حلقہ کے آخری ترجمان تھے ان پر اس جماعت کا ایک دور ختم ہوگیا اور اس کی جملہ خصوصیات اب کسی ایک ذات میں باقی نہیں رہیں۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی عام خدمات اور ان کے ثمرات سے صرفِ نظر کرکے اگر صرف دارالعلوم دیوبند کی کم وبیش ۵۰ر سالہ خدمات ہی سامنے رکھی جائیں تو دینی وعلمی خدمت کا ایک طویل سلسلہ نظر آئے گا جس کے نتیجہ میں دارالعلوم واقعی ازہر ہند بن گیا اور مسلمانانِ عالم کی قدیم ومشہور درسگاہوں جامع زیتون، جامع قروین، جامعہ ازہر، وغیرہ میں اس کا بھی شمار ہونے لگا۔ انھوں نے ''مدرسہ عربیہ دیوبند'' کو زندگی کا مقصد قرار دے کر واقعی معنی میں دارالعلوم بنایا۔ ان کا یہ کارنامہ علمی دنیا میں عظیم کارنامہ ہے جو ان کی عظمت کے لیے کافی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آدمی کا اصل روپ سفر میں کھلتا ہے۔ ایک مرتبہ مجھے حضرت حکیم الاسلامؒ کی معیت

وصحبت دو دنوں تک پونہ کے سفر میں حاصل رہی۔ ان کے حلقۂ ارادات سے میرا بھی دینی و علمی تعلق تھا میرے دوست اور حکیم الاسلامؒ کے بے تکلف خادم جناب سجاد حسین صدیقی نے میری کتاب ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' حضرت حکیم الاسلامؒ کو سفر میں وقت گذاری کے لیے دیدی تھی۔

ہمارے کئی بزرگ اپنے حلقۂ ارادت و مشیخیت میں دوسروں کی پذیرائی اور موجودگی کو اپنے حق میں مضر سمجھتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کہیں ہمارے حلقہ میں دراڑ نہ پڑ جائے اس لئے وہ ہر وقت اسی فکر میں رہ کر اپنے خوردوں سے ایک گونہ بے اعتنائی برتتے ہیں اور کوئی ایسی بات نہیں کرتے جس سے خوردہ نوازی ظاہر ہو مگر حضرت حکیم الاسلامؒ کے اپنے ذہن و مزاج اور اخلاق کے اعتبار سے اتنا بلند تھے کہ خوردنوازی کو اپنے لئے مضر نہیں سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ بڑے انبساط وانشراح سے پیش آتے تھے حتّٰی کہ بعض اوقات ان کے اخلاق کریمانہ سے شرم محسوس ہونے لگتی کھانے اور ناشتے کے وقت اپنے پاس بٹھاتے تھے۔ سامنے کے خاص خاص کھانے میری طرف بڑھاتے تھے اور اصرار کر کے کھلاتے تھے خود تو عمر کے تقاضے اور مرض کی پرہیزی کی وجہ سے کم خوری پر مجبور تھے۔ اور مجھ کو بسیار خوری پر مجبور کرتے پچاسوں مریدوں اور معتقدوں سے بھرے دسترخوان پر اس قسم کا مظاہرہ خوردنوازی کے ساتھ وسعت ظرفی اخلاقی برتری اور حوصلہ مندی کی بات ہے۔

ان واقعات کے نتیجہ میں میرے نزدیک حضرت حکیم الاسلامؒ کی عظمت بڑھ جاتی ہے اسی سفر میں حضرت حکیم الاسلامؒ کا وعظ ہوا۔ ظاہر ہے ان کے نام پر کتنا زبردست مجمع ہوا ہوگا۔ آپ نے مجھے پہلے تقریر کا حکم دیا۔ عام طور سے مصنف وصحافی تقریر وخطابت میں یوں ہی سے ہوتے ہیں جس طرح مقرر وخطیب کے لئے چند سطریں سلیقے سے لکھنا ''کارے دارد'' ہوتا ہے ویسے بھی میں تقریر کے میدان سے دور رہتا ہوں۔ مگر حضرت حکیم الاسلامؒ کی ان کے الفاظ میں گذارش پر انکار نہ کر سکا اور تھوڑی دیر کچھ بیان کیا اس کے بعد آپ نے خطبۂ مسنونہ پڑھ کر اپنے وعظ کی ابتدا میرے بیان کی تعریف وتوصیف سے فرمائی اور کہا کہ اس جامع تقریر کے بعد مزید کی ضرورت نہیں ہے اس لئے اسی متن کی شرح کروں گا۔ چنانچہ شروع سے آخر تک اسی کا حوالہ دیتے رہے اور پورے وعظ کا موضوع یا متن اسی کو قرار دیا۔ اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے؟

پھر بات پر بات آ گئی۔ ایک جلسہ میں کئی علماء ومقررین مدعو تھے جن میں میں بھی شامل تھا میں نے ایک خاص موضوع پر اپنی تقریر میں زور دیا۔ میرے بعد ایک بزرگ نے تقریر فرمائی جس کی ابتدا میری تقریر کی مخالفت سے تھی اور وہ کہتے رہے کہ آج مسلمانوں کو اس کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس بات کی

ضرورت ہے اور میں سوچتا رہا کہ حضرت اپنی بڑائی کا مظاہرہ اس انداز میں نہ فرماتے تو ان کے حق میں اچھا ہی رہتا۔

اسی پونہ کے سفر میں دو دن تک حضرت حکیم الاسلامؒ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا جس میں میں نے ان کی خلوت وجلوت کے معمولات اور عادات واطوار قریب سے دیکھے۔ ان کی شخصیت قریب سے بڑی پُر کشش معلوم ہوئی جس طرح سے دور سے بڑی پُرکشش معلوم ہوتی تھی۔ اگر شخصیت کے دیکھنے اور پرکھنے میں دورو نزدیک کی مسافت حائل نہ ہو تو اس کے اصلی خدوخال نظر آتے ہیں۔

............❖............

موت العالِم موت العالَم

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ
سابق رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

وادریغا! دودمان قاسمی کا لعل شب چراغ گم ہوگیا۔ چمن زار دارالعلوم دیوبند کا گل سرسبد مرگ کی بادِ صرصر سے نذر خزاں ہوگیا، بزم علم وعرفان کی شمع فروزاں بجھ گئی، حسن بیان وخطابت کے ایوان مین زلزلہ آ گیا، مسند وعظ ومصطبہٗ ارشاد وہدایت بے رونق ہوگئے، یعنی ۱۷؍جولائی کو حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب کم وبیش ۸۸؍برس کی عمر میں عالم آب وگل کو خیر آباد کہہ کر عالم آخرت کی طرف منتقل ہوگئے۔ **انا للّٰہ وانا الیہ راجعون.** شب میں عشاء کی نماز کے بعد ہزاروں ماتم گساروں کے مجمع میں نمازِ جنازہ دارالعلوم کے احاطہ مولسری میں ادا کی گئی۔ اور پھر تدفین جدامجد نوراللہ مرقدہٗ کے پہلو میں ہوئی، اس طرح گویا ع

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

کل من علیھا فان. ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام.

حضرت مرحوم جب پیدا ہوئے یہ دارالعلوم دیوبند کے اوجِ شباب کا زمانہ تھا، اساتذہ کرام اپنے اپنے فن میں یگانۂ روزگار تھے، جن کے علم وفضل اور مہارت فن کا آوازہ مما لک غیر میں بھی دور دور تک پہونچا ہوا تھا۔ پھر اس دور کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اصحاب درس تدریس خود بھی روحانی اور باطنی کمالات کے حامل اور جامع ہوتے تھے، اور ان کے علاوہ تھانہ بھون سہارنپور اور دیوبند میں مستقل طور پر طریقت ومعرفت کی درسگاہیں قائم تھیں اور دارالعلوم جس کا نام تھا وہ درحقیقت انھیں دونوں قسم کے علوم و فنون کی تعلیم وتربیت گاہ تھی، غرض کہ ایک طرف یہ سرچشمہائے فیض تھے جو پوری آب وتاب کے ساتھ رواں دواں تھے اور دوسری جانب حضرت مرحوم خانوادۂ قاسمی کے چشم و چراغ ہونے کے باعث ہر ایک

کے نورِ نظر اور لختِ جگر تھے اور خود بھی ذاتی طور پر نہایت ذہین اور طباع، روشن ضمیر و نکتہ رس تھے، اور طالب علم کا جوہر فطری رکھتے تھے، پھر کسر کس بات کی تھی، جوان ہوئے تو حافظ قرآن اور قاری خوش الحان ہونے کے ساتھ ایک پختہ استعداد کے بالغ النظر عالم ہو گئے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کے انتقال کے بعد حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب مہتمم بنا دیئے گئے۔ اگرچہ آپ کی شہرت اور ملک میں مقبولیت کا آغاز نیابت اہتمام کے زمانہ میں ہی ہو گیا تھا، لیکن مہتمم ہونے کے بعد وقت آیا کہ آپ کے اوصاف و کمالات پورے طور پر ابھریں اور جلا پائیں یہ کمالات تین قسم کے تھے، علمی، عملی، اور اخلاقی، اول الذکر کمال تو یہ تھا کہ علوم وفنون میں پختہ استعداد کے ساتھ ایک طرف حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی تصنیفات و تالیفات پر گہری نظر رکھتے تھے، اور دوسری جانب حضرت تھانویؒ سے بیعت کا تعلق رکھتے تھے، ظاہر ہے کہ جو شخص ان دونوں نابغہ روزگار بزرگوں کے علوم وفنون پر حاوی ہو اس کو شریعت و طریقت کا رمز شناس و نکتہ داں بننے کیلئے اور کیا درکار ہے پھر اس پر حسن تقریر و خطابت کا ملکہ خداداد سونے پر سہاگہ! گھنٹوں بولتے تھے، زبان بڑی شگفتہ اور شائستہ، کہیں کہیں ظرافت اور مزاح کے چھینٹے، آواز از اول تا آخر یکساں، نہ زیر و بم نہ اتار چڑھاؤ، مگر ساتھ ہی منطقی استدلال اور فلسفیانہ تشقیق، اس لئے تقریر عوام وخواص دونوں کی کام کی، بات سے بات اور نکتہ در نکتہ، پھر معلومات کی کثرت اور طبعیت کی روانی کا یہ عالم کہ کیا مجال، ایک تقریر کا مضمون دوسری تقریر میں مکرر آ جائے، میرے نزدیک یہ کچھ فیضان حضرت نانوتویؒ اور حضرت تھانویؒ کا تھا۔

عملی کمال یہ تھا کہ کارکردگی کی صلاحیت غیر معمولی تھی، جس کام کو کرتے تھے پوری توجہ اور یکسوئی سے کرتے تھے، ہم نے بارہا دیکھا ہے، ایک مجمع میں بیٹھے ہیں، لوگ بات چیت میں مصروف ہیں، اور آپ ایک گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے اور کاتبوں کی طرح بیٹھے کوئی مضمون مسلسل لکھے جا رہے ہیں، خالی بیٹھنا تو جانتے ہی نہ تھے، ہر وقت کام سے کام تھا، اخلاقی اعتبار سے وہ اس شعر کا مصداق تھے۔

ہینون لینون ایسارُذ و وکرم   سواس مکرمۃ ابناء ایسارً

خندہ جبیں و شگفتہ، نرم دم گفتگو اور نرم خو، حلیم و بردبار، متواضع و منکسر المزاج پھر ظاہری حسن و وجاہت بھی ایسی کہ ہزاروں میں ایک نظر آتے تھے، حسن قراءت کا یہ عالم کہ وجد آفریں و کیف آور، غرض کہ یہ کمالات سہ گانہ تھے جنھوں نے مولاناؒ کی شخصیت کو برصغیر کے علماء میں بہت نمایاں اور ممتاز کر دیا تھا۔ اور آپ سچ مچ سرخیل طائفہ بن گئے تھے، اللہ کے فضل و کرم سے عمر کافی طویل پائی، اس لئے جس طرح آپ

کے اہتمام کی مدت دارالعلوم کے تمام سابق مہتمموں کی مدت اہتمام سے زیادہ ہے، اسی طرح مدرسہ میں جو توسیع وترقی آپ کے عہد میں ہوئی، کسی کے عہد میں نہیں، آپ کی فیض رسانی کا دائرہ برصغیر تک محدود نہیں رہا بلکہ ایشیا اور افریقہ کے دور دراز خطوں کے علاوہ امریکہ اور یورپ پر محیط ہوگیا، اس لئے آپ کا حادثۂ وفات عالم اسلام کا وہ عظیم دوسرا المیہ ہے جو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کی وفات کے بعد پیش آیا ہے، آپ کے سانحۂ ارتحال سے دارالعلوم دیوبند کا ایک دَور اور ایک عہد ختم ہوگیا۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اور حضرت حکیم الاسلامؒ دونوں ہم جماعت اور ہم درس ہونے کے علاوہ وہ بھی صاحبزادہ اور یہ بھی صاحبزادہ، اس لئے ہم مرتبہ ہم مقام بھی تھے۔ اس لئے دونوں میں بڑی دوستی اور بڑی بے تکلفی تھی، لیکن میں ایک جونیر طالب علم تھا، اس لئے حضرت مرحوم سے کوئی سابقہ نہ تھا۔ البتہ ان کے برادر خورد مولوی محمد طاہر مرحوم بڑے ہنسوڑ، خوش مزاج و یار باش انسان تھے، ان سے بڑی دوستی اور بے تکلفی تھی، میں ان کے گھر جاتا اور وہ میرے کمرہ میں آتے، اور ہم دونوں گھنٹوں گپ شپ کرتے رہتے تھے، البتہ ۱۹۶۲ء میں مجلس شوریٰ کا ممبر منتخب ہوا تو اب حضرت مرحوم سے بھی ذاتی تعلقات پیدا ہوگئے جو محض رسمی اور واجبی نہ تھے بلکہ حقیقی اور قلبی و روحانی تھے، اب ان سے صرف ادب واحترام کا تعلق نہ تھا بلکہ محبت اور تعلق خاطر کا بھی تھا، محبت کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی، بلکہ متعدی ہوتی ہے، چنانچہ ادھر بھی ایسا ہی تھا، اس کا پائیدار ثبوت یہ ہے کہ حضرتؒ کا ذوق شعروادب بھی بڑا پاکیزہ تھا اور خود بھی قادرالکلام شاعر تھے، ایک مرتبہ انھوں نے اپنے ایک قصیدہ کے ایسے چند اشعار خود اپنے قلم سے لکھ کر مجھ کو عنایت فرمائے جن میں ازراہ شفقت بزرگانہ اس ہیچ میرز کی نسبت ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا جن کو پڑھ کر میں شرم سے پانی پانی ہوگیا، میں نے یہ تحریر تبرک سمجھ کر حفاظت سے رکھ لی، ایک مرتبہ خیال ہوا کہ تحدیث نعمت کے طور پر ان اشعار کو برہان میں چھاپ دوں لیکن خودستائی کے ڈر سے، جہاں میں برہان کی ڈاک سے اس قسم کے روزانہ دو تین خط نہیں چھاپتا، ان اشعار کو بھی صرف اپنے تک محدود رکھا، آج یہ شفقت ومحبت اور التفات خاص ومراعات یاد آتے ہیں تو دل بے چین ہوجاتا اور تڑپ اٹھتا ہے اور یہ حادثہ ملی وقومی ہی نہیں بلکہ ذاتی اور شخصی بھی ہوجاتا ہے، مگر بہرحال بقول غالبؔ:

صبر کرتے ہی بنے گی غالبؔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

............❖............

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ

مولانا سید محمد از ہر شاہ قیصر صاحبؒ

سابق مدیر ماھنامہ دارالعلوم دیو بند

پچھلی تاریخ میں نہیں بلکہ خود اپنے دور اور اپنی زندگی کے رواں دواں اوقات اور اس زندگی کے پیچ و خم کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبوت ختم اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا دروازہ بلاشبہ بند کر دیا گیا ہے، مگر امت کی سطح پر اب بھی ان سے مصلحین امت، علماء حق اور قوم وملت کو زندگی کی نئی تب و تاب بخشنے والے مردانِ کار دنیا میں آتے رہتے ہیں، جن کی قابل تقلید زندگی، بے غرض عمل، علم وعرفان کی گہرائیاں بابرکت صحبت، اور ہمہ گیر تبلیغی اور اخلاقی سرگرمیاں ملت کو از سر نو زندگی بخشتی ہیں، اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبلؒ، ابن تیمیہؒ، مجدد الف ثانیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، سید احمد شہیدؒ، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کا نام لینا غلط نہ ہوگا، یہ حضرات بعض وقت تو امت کی زندگی کے کسی ایک گوشے میں تجدید و تذکیر کا کام کرتے ہیں، بعض وقت اصلاح و تعمیر کیلئے ان کے سامنے امت کی زندگی کے بہت سے شعبے ہوتے ہیں، اور وہ سب ہی شعبوں میں اپنی کارکردگی کا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے تقریباً ۸۷ برس کی عمر پائی عمر کے ابتدائی ۲۰ سال چھوڑ کر جو تعلیم اور تربیت کی نذر ہو گئے بقیہ ۶۷ برس انھوں نے درس و تدریس، تصنیف و تالیف، دارالعلوم جیسے عظیم الشان ادارہ کی تعمیر و ترقی، دنیا کے مختلف طبقوں میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کو قرآن وسنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب لانے کے لئے ہزاروں میل کے سفر، دن رات دینی مذاکرت، بیعت وارشاد کی لائن پر ہزاروں افراد کی اخلاقی اور مزاجی تربیت اور ملی اداروں میں کام کرنے والے افراد کی نگہداشت میں گذارے۔

حضرت مرحوم ایک بیحد مصروف زندگی کے انسان تھے مزاجاً بھی نفاست پسند تھے کہ ان کے اوپر کی کئی پیڑھیاں خوشحال زمینداروں اور قصباتی رئیسوں کی پیڑھیاں تھیں اچھا لباس اور گھر کا اچھا ماحول پسند

فرماتے تھے، مگر اسی نفاست پسندی کے ساتھ سخت کوش اور اوقات کے سخت پابند تھے، سفر میں ہر طرح کی صعوبت بآسانی برداشت کرتے تھے، سفر و حضر میں کھانا اگر معمول کے مطابق نہیں ملتا تھا تو کبھی ناگواری کا اظہار نہیں فرماتے تھے، غریب سے غریب کسی انسان کے دسترخوان پر بیٹھ کر انھیں دال بھات کھانے میں بھی کوئی عذر نہ تھا، ان کی خندہ روئی، چہرہ کی مسکراہٹ، لب ولہجہ کی شیرینی، بڑی نرمی اور آہستگی کے ساتھ اصلاحی اقدامات کو آگے بڑھانے کا طریقہ ان کے اِردگرد کے لوگوں کو متاثر کرتا تھا، اصلاح کے لئے ان کا طریقہ سخت گیری کا نہیں تھا، بلکہ وہ اپنے ماحول میں اپنے اوقات کے انضباط اور اپنے اخلاق کی مضبوطی سے تغیر پیدا فرماتے تھے، غریبوں کی مالی مدد فرماتے تھے، مگر بہت پوشیدہ طور پر اس طرح کہ لینے اور دینے والے ہاتھ کے سوا اور کسی کو اس کا پتہ نہ چلے، امانت کی ذمہ داری خوب سمجھتے تھے، اگر کوئی شخص انہیں دس روپے بھی کسی دوسرے شخص کو پہونچانے کے لئے دیتا تھا، تو پوری کوشش فرماتے تھے، کہ جسے امانت دینی ہے اس تک خود پہنچ کر امانت سپرد کر دیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کی ادائیگی میں ان کا غیر معمولی شغف انتہائی طور پر حیرت انگیز تھا، مغرب کے بعد چند نوافل میں قرآن کریم کے ایک دو سپاروں کی تلاوت ان کا معمول تھا اور اس معمول کو وہ ہوائی جہاز، ریل، ہوائی اڈوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر بھی پورا فرماتے تھے، مجلس کے اوقات متعین تھے اس سے زائد وقت مجلس میں صرف نہیں فرماتے تھے، تحریر وتصنیف کی دنیا الگ تھی، اور اس دنیا سے بھی ان کی وابستگی دائمی تھی، تقریر کی خوبیاں اور کمالات ان پر نازل ہوئی تھیں، سوتے سوتے بھی تقریر فرماتے اور نیند کی یہ تقریریں بھی انتہائی مربوط مؤثر اور منطقی لحاظ سے مکمل ہوتی تھیں، ان کی نیند کی تقریروں کے بہت سے کیسٹ لوگوں کے پاس موجود ہیں، جنہیں سنکر قطعاً اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ بیداری کی تقریریں ہیں یا نیند کی تقریریں، گھنٹہ گھنٹہ بھر کی پوری تقریر بلند آواز اور اپنے مخصوص لہجہ میں سوتے سوتے فرمادیتے تھے، اور خود انھیں اس کا احساس نہ ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

اپنے اساتذہ، مشائخ اور بزرگوں کے بیحد مداح، ان کی روایات و کمالات کے عاشق، ان کی بارگاہ میں بیحد مؤدّب تھے، اپنے جدّ امجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانئ دارالعلوم دیوبند کے علوم پر غائر نظر تھی، جنھیں اپنی سادہ زبان میں اس طرح بیان فرماتے تھے کہ معمولی سی استعداد کا انسان بھی ان سے مستفید ہوتا تھا، علمی لائن پر اپنے اساتذہ محدث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بیکراں علوم کے قدر دان تھے، حضرت علامہ انور شاہ محدث کشمیریؒ سے تعلق خاطر غیر محدود تھا، جب بھی محدث جلیل کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ ان کے ذکر خیر میں مستغرق ہو جاتے ان کے علوم، ان کے درس اور ان کی ذاتی زندگی کی ایک داستان انکی زبان پر آجاتی سیاست و جہاد میں حضرت شیخ الہندؒ کی مردانہ وار سرگرمیوں کے

ورق کے ورق انھیں محفوظ تھے، بعض دفعہ دیر تک حضرت کی زندگی کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے تھے۔

منجملہ اور اوصاف کے حضرت مہتمم صاحبؒ کا ایک وصف خصوصی یہ تھا کہ وہ خلوت وجلوت میں کبھی کسی کی غیبت اور برائی نہیں فرماتے تھے، سیاسی اور انتظامی معاملات میں ان پر مخالفین نے سیکڑوں دفعہ یورش اور یلغار کی دوسرا کوئی ہوتا تو ان کے صبر آزما الزامات اور بدترین لب ولہجہ سے یقیناً مشتعل ہو جاتا مگر حضرتؒ کی دارالعلوم کی شوریٰ کے جلسوں سے باہر آتے تو ان کے ماتھے پر ایک بھی شکن نہ ہوتی اور انہی لوگوں سے جو خفیہ میٹنگوں میں اچھل اچھل کر ان پر حملے کرتے تھے ان کا لب ولہجہ انتہائی نرم، ادب آمیز اور مشفقانہ ہوتا ہم لوگ عمر بھر حضرت کے قریب رہے، خلوت وجلوت کے ساتھی رہے مگر بہت سی تلخیوں کا ہمیں بروقت نہ علم ہوسکا اور نہ احساس ان ہی تلخ واقعات کی گونج جب کبھی باہر اٹھی تو ہمیں معلوم ہوا کہ فلاں جلسۂ شوریٰ میں فلاں صاحب نے یہ دریدہ دہنی کی تھی اور فلاں مٹنگ میں فلاں صاحب اس طرح مقابلہ پر آ گئے تھے۔

حضرتؒ کی زندگی اپنے کمالات معنوی وظاہری کے ساتھ بے حد وسیع اور ہمہ گیر ہے ان کے اخلاق و اعمال، ان کے درس وتدریس ان کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف افریقہ، امریکہ، لندن اور ممالک عرب تک ان کے اصلاحی مواعظ دارالعلوم میں ان کی ۶۰ رسالہ خدمات دارالعلوم کی علمی اور عملی زندگی کو منظّم کرنے کے لئے ان کی بھرپور جد وجہد بیعت وارشاد کے گوشوں میں ان کی امتیازی خصوصیات، ان کی دیانت، حلم، بردباری شرافتِ طبعی اور شرافتِ نسبی جمعیۃ العلماء ہند کے تعمیری دور سے ان کی وابستگی اور اس کے بہت سے اجتماعات میں ان کے معرکۃ الآراء خطبات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مذہبی شعور کے احیاء کے لئے ان کی ابتدائی خدمات مسلم پرسنل لاء بورڈ کے پلیٹ فارم پر مسلمانوں کے شخصی اور قومی حقوق کے تحفظ کے لئے ان کا قائدانہ کردار دارالعلوم کے بے مثال صد سالہ اجتماع جو اس کا نقطۂ عروج تھا اور جسے دیکھ کر مسلمانوں کے شاندار مستقبل کا اندازہ کر کے مخالفین نے وہیں سے دارالعلوم کے لئے زوال کے حالات پیدا کئے اپنے اساتذہ کا احترام اور ان کی اولاد سے ان کا مشفقانہ طرز عمل، طلبائے علوم دینیہ پر ان کی لگاتار شفقت، اپنے مخالفین ومعاندین سے چشم پوشی کی عادت، ان کے لاتعداد ملکی وغیر ملکی سفر مسلم لیگ اور کانگریس کے سیاسی مراعات کے تحریکی دور میں دارالعلوم کے مفاد کی خاطر ان کا محتاط طرز عمل، دارالعلوم کے انتظامی معاملات میں ان کے بے نظیر تدبر اور مدبرانہ حکمت عملی کے صدہا واقعات نرمی اور شفقت کے ساتھ دارالعلوم کے سیکڑوں افراد پر مشتمل عملہ سے ان کی درسی اور انتظامی خدمات کی تکمیل کرا لینے کا مخصوص طریقہ یہ سب عنوانات حضرتؒ کی صدابہار زندگی کے پھیلے ہوئے گوشے ہیں، جن میں سے ہر ایک پر ایک مفصل مضمون لکھا جانا چاہئے، کسی ایک مضمون میں ان سب کا احاطہ ناممکن ہے۔

جماعت شیخ الہند کا نورِ نظر

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلویؒ

وہ پیکر حلم وحیا جس کی مظلومیت کئی سال سے موضوع بحث بنی ہوئی تھی اور جس کی بے چارگی پر عالم اسلام کا ہر درد مند انسان آنسو بہار رہا تھا بالآخر زمانہ کی دست درازیوں کی تاب نہ لا کر اپنے دادا ابا کے پہلو میں آسودۂ راحت ہوگیا ۔

وحشت وشیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید　　　مر گیا غالب آشفتہ بیاں، کہتا ہیں

یہ قاسم العلومؒ کے پہلو میں کون سکون سے لیٹا ہوا ہے؟ یہ ولی اللّٰہی علوم کا وارث ہے، یہ فکر قاسمی کا ترجمان ہے، یہ محدث کشمیری کی آخری یادگار ہے، یہ شیخ تھانویؒ کے میکدہ کا آخری ساقی ہے، حضرت مدنیؒ کا نورنظر ہے، یہ جماعت شیخ الہند کی آبرو ہے۔

اب ہم اسے تلاش کریں گے کہ ہزاروں کے مجمع میں کھڑا ہو کر اپنی حسین صورت، حسین سیرت اور دل فریب لب ولہجہ میں دین حق کا پیغام دلوں میں اتار دے، لیکن ہمیں وہ نظر نہ آئیگا۔

ہم چراغ لے کر ڈھونڈیں گے کہ علماء ومشائخ کی آبرو بن کر کوئی سامنے آئے، لیکن ہمیں ناکامی ہوگی۔

جسے دیکھ کر چمنستان قاسمی کے پودوں پر بہار آجاتی تھی، وہ نہ رہا، جس کا نام لے کر فرزندانِ دار العلوم فخر سے سر اونچا کرتے تھے، اسے ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا گیا۔

معاصرانہ رقابت کا سب شکار ہوئے لیکن، اس جیسا مبتلا اور محسود نہ دیکھا ۔

کون ہوتا ہے حریف مئے مردافگن عشق　　　ہے مکرر لب ساقی یہ صدا میرے بعد

حضرت مولاناؒ نے دار العلوم دیوبند کو عالم اسلام کے کونہ کونہ میں ایشیا کی ایک عظیم دینی یونیورسٹی کے طور پر متعارف کرایا، آپ عظیم علمی اور روحانی شخصیت اکابر اور اساتذہ دارلعلوم کی علمی اور روحانی عظمت کے

تعارف کا ذریعہ ثابت ہوئی۔

دارالعلوم نے آپ کے ساٹھ سالہ دور میں غیر معمولی ترقی کی اور ہر شعبہ کامیابی کی انتہائی معراج پر پہنچا۔

اجلاس صد سالہ کی بے مثال کامیابی کا سہرا آپ ہی کی کامیاب قیادت کے سر ہے، اس اجلاس نے دشمنانِ حق کے دلوں پر لازوال صداقت اسلامی کی دھاک بٹھادی۔

اجلاس کی کامیابی کے بعد یہ عظیم دینی اور ملی ادارہ جن آزمائشوں میں گرفتار ہوا، اگر وہ نہ ہوتا تو دارالعلوم ایک نئے دور ترقی میں داخل ہو جاتا، اور مسلمانان عالم کی دینی اور سماجی ضرورتوں اور مشکلات میں عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق رہنمائی کا فرض ادا کرتا، جس طرح دارالعلوم نے ماضی کے ہر انقلاب کا چیلنج قبول کر کے مسلمانوں کی دینی اور ملی رہنمائی کا فرض انجام دیا ہے، نئے تعمیری مقاصد کے لئے اور وہ بھی ملی امتحان کے نازک دور میں دارالعلوم جیسے دینی ادارہ کو مضبوط اور مستحکم قیادت کی ضرورت تھی اور اس کے لئے ابھی انتظار کرنا ہوگا اور دیکھنا ہوگا۔

''صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے''

حکیم الاسلامؒ نے علمی اور روحانی سرگرمیوں اور دارالعلوم جیسے بین الاقوامی ادارہ کے کامیاب اہتمام کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا۔

آپ نے جماعت شیخ الہند کے شانہ بشانہ ۱۹۴۷ء کے ہمت شکن حالات کے اندر ملی تعمیری کاموں میں قائدانہ شرکت فرمائی۔

عوامی تقریروں اور خطبات کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر اجتماعی حوصلہ پیدا کیا، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعیدؒ اور مولانا حفظ الرحمٰنؒ کے رفیق کار کی حیثیت سے احیائے ملت کی تحریک میں معاون و مددگار رہے۔

دینی تعلیمی تحریک کے سلسلے میں آپ کے فاضلانہ خطبات ہمیشہ روشنی دیتے رہیں گے۔

ہندوستان کے قومی سیاسی حلقوں نے سیکولر ہندوستان کی تعمیر و ترقی کے معاملہ میں آپ کے رہنمائی سے زبردست فائدہ اٹھایا، اس سلسلہ میں مذہبی پیرایہ کے اندر فرقہ پرستی کے خلاف حضرت حکیم الاسلامؒ نے اہم کتابیں چھوڑی ہیں، جو ہندوستان جیسے ملک میں دینی تعلیم و دعوت کا کام کرنے والوں کے لئے مشعل ہدایت ہیں۔

ہندوستان میں بعض نام نہاد ترقی پسند مسلمان مسلم پرسنل لاء کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرتے

رہتے ہیں اور مسلمانوں کے مذہبی تشخص کو ختم کرنے کی غرض سے یکساں سول کوڈ کا مطالبہ کرنے والوں کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں۔

اس سلسلے میں حکیم الاسلامؒ نے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر کی حیثیت سے مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کی تحریک میں قائدانہ رول ادا کیا اور اپنی دانشمندانہ رہنمائی سے تحریک کو تقویت پہنچائی۔

دارالعلوم کے کاز کی اشاعت و تبلیغ کی ذمہ داریوں نے حکیم الاسلامؒ کو بڑی کتابوں کی تصنیف و تالیف سے باز رکھا، لیکن آپ کے حکیمانہ قلم سے جو کتابیں وجود میں آ گئیں ان میں سے ہر کتاب اپنے عنوان اور افادیت کے لحاظ سے بڑی اور ضخیم کتابوں پر بھاری ہیں، علاوہ اسکے آپ نے مختلف علوم وفنون کی کتابوں پر جو مبسوط مقدمات تحریر فرمائے ان میں سے ہر مقدمہ اور ہر تبصرہ اس فن کا نہایت جامع اور محققانہ تعارف ہے، مولانا احمد سعید صاحب کے ترجمہ کشف الرحمٰن پر حضرت کا مقدمہ تحریر ہے جو کتاب الٰہی کا مختلف خصوصیات پر ایک جامع تبصرہ ہے اور کتاب وسنت کے باہمی تعلق پر نہایت مکمل اور محققانہ مقالہ ہے۔

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی تقریر بخاری (فضل الباری) پر حدیث نبوی کے تعارف اور حجت شرعی ہونے کی تحقیق بڑے سائز کے اکیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس عنوان پر ایک مکمل کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولاناؒ کی تصنیفات پر مستقل تبصرہ و تعارف کی ضرورت ہے جس کے لئے علیحدہ مضمون درکار ہے۔

حکیم الاسلامؒ "**علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل**" کا صحیح مصداق تھے، وہ گلستان محمدیؐ کا شگفتہ پھول تھے اور ہر طرف نبوت محمدیؐ کا رنگ و نور بکھیرتے پھرتے تھے یا پھر بقول اکبر۔

محمدؐ پھول ہیں اور واعظ صبا ہیں   کہ پھیلاتے پھریں بوئے محمدؐ

وہ مسند درس پر بیٹھے تو دنیائے تعلیم و تدریس پر اپنا سکہ بٹھا دیا، انھوں نے قلم ہاتھ میں لیا تو اسلام کی حکمتوں اور دین کی بصیرتوں کے موتی بکھیر دیئے، اور خواص و عوام دونوں کو دین برحق کا شیدائی بنا دیا، ان پر ولی اللٰہی توسع اور قاسمی محبت و جمال کا رنگ غالب تھا، مگر امام ربانی حضرت گنگوہیؒ کے اصلاحی درد سے بھی آپ کا دل خالی نہیں تھا۔

بدعت وضلالت کے کوہنی قلعے توپ کے گولوں سے نہیں ٹوٹتے تھے وہ آپ کی شہد سے زیادہ شیریں باتوں سے سرنگوں ہو جاتے تھے، اور ان سب باتوں کا سب کو اعتراف تھا اور ہے اور ہمیشہ رہے گا لیکن۔

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجئے   ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہئے

زندگی کی سخت آزمائش وہ ہے جو اپنوں کے ہاتھوں پیش آئے اور زندگی کی اس منزل میں پیش آئے

جس منزل میں آدمی دو چار گھڑی کا آرام چاہتا ہے، اس آزمائش میں ثابت قدم رہنا ''علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل'' کا آخری اور مکمل ثبوت ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کی ساٹھ سالہ خدمات کے بعد جس امتحان میں ڈالے گئے اور پھر اس امتحان میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے جس حلم وکرم کا مظاہرہ کیا وہ صرف ایک عالم کے بس کی بات نہیں تھی بلکہ ایک عارف کامل ہی اس دشوار گزار منزل پر ثابت قدم رہ سکتا تھا۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیبؒ نے اضطراب و بے قراری کی یہ ساری گھڑیاں ایک عارف باللہ کی طرح گزاریں۔

اس ساری کش مکش میں نیک نیت لوگ بھی تھے اور حاسد و معاند بھی، لیکن مولاناؒ نے کسی کے خلاف زبان نہ کھولی، البتہ قانون قدرت کی پکڑ بہت سخت ہے، وقت فیصلہ کرے گا کہ اس صف میں ذاتی بدخواہ کون کون تھے اور نیک نیت کون کون؟

کچھ ہورہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

زندگی کی سخت ترین آزمائش میں حکیم الاسلامؒ نے جو اسوۂ حسنہ چھوڑا وہ سلف صالحین کی یاد تازہ کرتا ہے، تاریخ کو انتظار رہے گا کہ جن گوشوں سے عقل وشعور کے متاثر ہونے کی آواز سنائی دے وہ زندگی کی اتنی ہی سخت آزمائش میں گرفتار ہوکر عقل وشعور میں مرد آہن ہونے کا ثبوت پیش کریں۔

یہ عقل وشعور اور بڑھاپے اور کمزوری کا طعنہ دینے والے جس تلوّن وتنزل کا مظاہرہ کر چکے ہیں، ملی تاریخ ہمیشہ اس پر ہنستی رہے گی، ان کے تدین کا مذاق اڑاتی رہے گی، اک کے اندر دارالعلوم کے لئے خیر خواہی کا جذبہ کتنا ہے؟ اس کی آزمائش کے بغیر ان کی زندگی کا ادھورا باب ختم نہیں ہوسکتا۔

ہمارا امتحان لیتے ہو لیکن تمہارا بھی اسی میں امتحاں ہے

اوپر عرض کیا گیا کہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے زندگی کی اس آزمائش کا ایک عالم کی طرح نہیں بلکہ ایک عارف کامل کی طرح سامنا کیا، وہ اس باب میں صبر وحلم کا ایسا نمونہ چھوڑ گئے جو ہم جیسوں کے لئے ایک چیلنج ہے۔

وہ اس شیخ کبیر کی مانند تھے جس کے لاڈلے بیٹے کو اس کے اپنے بیٹے ہی کنویں میں ڈال آئے تھے، پھر وہ کس کے خلاف زبان کھولتا، صبر جمیل کے نعرے لگا کر اپنے آپ کو تسلی دیتا رہا۔

حضرت عثمانؓ نے اپنی زندگی کی سخت آزمائش میں ایک مخالف صاحبزادے سے بس اتنا ہی کہا۔

بھتیجے! تمہارا باپ تو اس داڑھی کی بڑی عزت کرتا تھا، بڑے باپ کے بیٹے نے اتنا سن کر حضرت

عثمانؓ کی داڑھی چھوڑ دی اور پیچھے ہٹ گیا، لیکن دشمنوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی آپ نے اجازت اس لئے نہیں دی کہ دوستوں کی کرم فرمائیاں بھی سامنے تھیں۔

دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا　　تیری محفل سے اٹھاتا، غیر مجھ کو کیا مجال

امام بخاریؒ صحیح بخاری کی جمع و ترتیب سے فارغ ہو کر اسی ۸۰ برس کی عمر میں اپنے وطن بخارا آئے تا کہ حدیث رسولؐ کی خدمت اور حفاظت کی خاطر در بدر کی ٹھوکریں کھانے کی بعد بڑھاپا اپنے بال بچوں میں گزاریں، لیکن ابھی آزمائش کی آخری منزل باقی تھی، بخارا میں آپ کے حلقۂ درس کی کامیابی حاکم بخارا کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی، امام کو حکم بھیجا کہ میرے لڑکوں کو گھر پر آکر حدیث پڑھایئے۔ امام نے انکار کر دیا، حاکم وقت کا غرور جوش میں آ گیا، علماء بخارا کو بلا کر امام بخاری کو بخارا سے نکالنے کی تدبیریں سوچی گئیں، علماء شہر نے یہ تدبیر نکالی کی امام کو بدعقیدہ ثابت کیا جائے اور اس طرح عوام میں امام کے خلاف غم و غصہ پیدا کیا جائے۔

چنانچہ باکمال علماء نے خلق قرآن کے پرانے مسئلہ میں امام الحدیث کو الجھا دیا، درس حدیث کے دوران قرآن کریم کے حادث اور قدیم ہونے کی بحث زندہ کر دی گئی، امام بخاریؒ اس مسئلہ میں حضرت امام احمد ابن حنبل کے مسلک پر تھے، کلام لفظی اور کلام حقیقی کے فرق کو عوام کیا سمجھیں، امام کے خلاف پروپیگنڈہ شروع ہو گیا، اسماعیل بخاری بدعقیدہ ہو گئے حاکم شہر نے فائدہ اٹھایا، امام کو شہر بخارا سے نکل جانے کا حکم دے دیا، امام مستجاب الدعوات تھے، مزاج میں جلال تھا، خالص علمی اور تحقیقی مزاج جلالی ہوتا ہے، تہجد میں حاکم کے لئے بددعا کر دی، خداوندا! اسماعیل پر تیری زمین تنگ ہو گئی ہے، اب اسے اپنے پاس بلا لے اور جس نے اس بوڑھے کو بے وطن کیا ہے اسے بھی وطن میں رہنا نصیب نہ ہو، دعا قبول ہوئی، ادھر امام اس دنیائے دَنی کو چھوڑ کر خدا کو پیارے ہوئے، ادھر حاکم وقت پر خلیفہ کا عتاب نازل ہوا، اور اسے بال بچوں سمیت بخارا سے ذلت و رسوائی کے ساتھ نکلوا دیا گیا۔

امام بخاریؒ وطن سے بے وطن ہو کر سمرقند جاتے ہوئے اپنے رشتہ داروں کے پاس خرتنگ میں مقیم تھے، وہیں وصال ہوا، تاریخ مین اس بدنصیب حاکم بخارا کا نام خالد ابن احمد ذہلی ہے، لیکن جمال قاسمی کا پیکر حسین جلال سے بالکل خالی تھا، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کا جمال اور شان عبدیت ان کے تمام معاصرین میں ان کو ممتاز درجہ دیتی ہے، اور یہ رنگ عشق سے شکست کھا لی تھی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی فرماتے تھے، مولانا قاسم! اتنی تواضع اختیار نہ کرو، علم کی شان بھی برقرار رکھو، لیکن مولانا قاسم عشق نبوی میں فنائیت کا مقام رکھتے تھے، یہی رنگ ان کے پوتے میں نظر آیا۔

امام بخاریؒ کو غصہ آ گیا، لیکن حکیم الاسلامؒ کو کبھی غصہ اور غضب کی حالت میں نہیں دیکھا گیا، لیکن واہ رے جانشین قاسمؒ وانورؒ، اشرفؒ وحسین احمدؒ تیرے دل میں کسی قسم کا نہ خوف پیدا ہوا نہ غبار وکدورت نے راہ پائی، تو نے شیطان لعین کو پر بازی میں پیدل سے مات دیدی، اس مادی دنیا میں عروج وزوال، آرام و تکلیف کا آنا معمولی بات ہے اور موت وزندگی کا بھی چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن اخلاق کردار پر کبھی زوال نہیں، یہ وہ جوہر ہے جس کی تابانی ہر آن بڑھتی رہتی ہے۔

وَلَلْآخرۃُ خیرٌ لکَ مِن الْاُولیٰ میں اس حقیقت کی طرح اشارہ ہے۔

قاسم ومحمود اور انور وحسین احمد کا وہ لاڈلا جنتی تھا، اور اس کے اخلاق حمیدہ اور کریم النفسی اس کے جنتی ہونے کا واضح ثبوت تھا، قرآن کریم نے کہا **ونزعنا ما فی صدورھم من غل الخ**: ہم اہل جنت کے سینوں سے حرص وہوس اور باہمی رنجش وکدورت کے جذبات کو نکال دیں گے تاکہ یہ لوگ جنت میں مکمل آرام وسکون کی زندگی گزاریں۔

حکیم الاسلامؒ کے اخلاق شریفانہ کا ان کے دشمن کو بھی اعتراف ہے ان کا سینہ دنیا میں بھی بے کینہ رہا اور وہ اسی سینۂ روشن کے ساتھ اپنے مولا سے جا ملے، وہ دنیا میں رہ کر جنتی تھے تو پھر کیوں نہ امید قوی کی جائے کہ جنت میں بھی ان کا شاندار استقبال ہوا ہوگا۔

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے   کہ غیر جلوۂ گل رہ گزر میں خاک نہیں

موت سے کس کو چھٹکارا ملتا ہے، محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا: **انک میت وانھم میتون: ثم انکم یوم القیمۃ عند ربکم تختصمون**

لیکن افسوس اور قلق اس کا ہے کہ ملت اسلامیہ ہند خاص طور پر قحط الرجال کا شکار ہے، اور علماء کے نام پر شر العلماء کا دور دورہ ہے، علم دین کو بدنام کرنے والے نمودار ہو رہے ہیں دنیا کے لئے دین کو قربان کرنے والوں کا زور شور ہے، امام شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے کہ اگر مسیحی علماء کو دیکھنا ہو تو اس امت کے زر پرست علماء کو دیکھو اور اگر یہودی علماء کی زیارت کرنی ہو تو علماء ومشائخ کی اس اولاد کو دیکھو جو اپنے باپ دادا کی جھوٹی تعریفیں کر کے ان کے نام کی روٹیاں کھاتی ہیں۔

فکر اس کا ہے ورنہ موت کے برحق ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔

حجاج ابن یوسف نے بڑے بڑے لوگوں کو تہ تیغ کر دیا ان میں صحابہ کرامؓ بھی تھے اور تابعین عظام بھی وہ اس بات کو برداشت نہیں کرتا تھا کہ آل نبی کو نبی کی ذریت کہا جائے، ان مظلومین میں حضرت سعید ابن

جبیر بھی تھے، حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ نے ایک روز حجاج کو خواب میں دیکھا او پوچھا کیا گزری؟ بولا ہر مقتول کے بدلہ میں مجھے قتل کیا گیا اور پھر زندہ کیا گیا لیکن سعید ابن جبیرؒ کے بدلہ میں ستر دفعہ قتل کیا گیا، علامہ دمیری نے حیوۃ الحیوان میں یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھا کہ ایک صحابی کے بدلے میں تو حجاج ایک ہی دفعہ قتل کی سزا پائے گا مگر ایک تابعی کے بدلہ میں ستر دفعہ سزاء کا مستحق ہو؟ پھر علامہ نے خود ہی اس کا جواب دیا کہ سعید جس وقت مارے گئے اس وقت کوئی ان جیسا نہ تھا جوان کی جگہ پر کرتا، ان سے پہلے جو حضرات صحابہؓ وتابعین مارے گئے ان کی جگہ بھرنے والے موجود تھے۔

مولوی اور علماء روزانہ پیدا ہو رہے ہیں۔ اور ہوتے رہیں گے لیکن وہ علماء جو: **کا بنیاءبنی اسرائیل** کا مقام رکھتے ہیں وہ بہت مشکل سے پیدا ہوتے ہیں میر صاحب نے کہا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں　　تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ایک روز عالمگیرؒ اپنے استاد ملا جیون کے ساتھ کسی سفر پر روانہ ہوا، سواری کے لئے ہاتھی لایا گیا، عالمگیرؒ سپاہی آدمی تھا، جست لگا کر ہاتھی کی پیٹھ پر سوار ہو گیا لیکن ملا جی آہستہ آہستہ بڑی احتیاط سے ہاتھی پر سوار ہوئے، عالمگیرؒ دیکھ رہا تھا، ہنس کر بولا، استاد محترم، آپ کو اپنی جان بڑی پیاری ہے؟ ملا جی نے جواب دیا عالمگیرؒ! تیرے بعد تیرا جانشین تیار ہو گا وہ تیری جگہ سنبھال لیگا، میرا جانشین بڑی مشکل سے پیدا ہو گا، زندگی کا بڑا حصہ چراغ کے سامنے اوندھا پڑا رہیگا، تب اس قابل ہو گا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کے بارے میں یہ چند سطریں سچی عقیدت کے تحت تحریر کی گئی ہیں، کوئی منفی جذبہ کارفرما نہیں۔

میں نے اپنے شیخ اور استاد حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی زبان مبارک سے یہ سنا ہے کہ: میں خاندان قاسمی کا غلام ہوں، ادنیٰ غلام ہوں۔

جب دار العلوم کا تاریخی ابتلاء شروع ہوا تو حضرت مدنیؒ کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجتے تھے، اور میں حالات کی نزاکتوں کو دیکھ کر ششدر رہ جاتا تھا۔

اپنے شیخ واستاذ کے واسطے سے اس خاندان کا جو احترام مجھے ملا ہے میں اسے کیسے فراموش کر سکتا ہوں۔

............❖............

جامع الکمالات شخصیت

مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانویؒ

۶ شوال المکرّم ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء بروز اتوار حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ ۸۸ سال کی عمر میں عالم فنا سے عالم بقا کی طرف رحلت فرما گئے۔ انا للّٰہ وانا الیه راجعون.

حضرت حکیم الاسلام مرحوم کی عبقری شخصیت گونا گوں فضائل وکمالات کا مجموعہ تھی۔ وہ اپنے دور کے بہترین قاری، جید حافظ، صاحبِ کمال عالم، قوی النسب شیخ طریقت، بے بدل خطیب، صاحبِ طرز ادیب، نامور متکلم، نکتہ رس فلسفی، قادر الکلام شاعر، کامیاب مدرس اور شگفتہ قلم مصنف تھے۔ حکمت قاسمی کے شارح اور روایات سلف کے امین تھے۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے پوتے تھے۔ ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں عالمِ وجود کو رونق بخشی اہل اللہ کی آغوش محبت میں پھلے پھولے۔ قاعدہ بغدادی کی بسم اللہ سے لے کر علوم عالیہ کی تکمیل تک سب کچھ دار العلوم ہی میں پڑھا۔ دار العلوم کے اس دور کے خضر صفت اساتذہ نے نہایت محبت وشفقت اور محنت وتوجہ سے پڑھایا۔ حدیث میں حضرت امام العصر علامہ محمد سید انور شاہ کشمیری قدس سرہ سے تلمذ تھا۔

۱۳۳۷ھ میں سند فراغت حاصل کی اور دار العلوم ہی میں حسبۃ للّٰہ تدریس کی خدمات انجام دینے لگے۔ ۱۳۴۳ھ-۱۳۴۸ھ تک اپنے اکابر کی موجودگی میں دار العلوم کے نائب مہتمم رہے۔ اور ۱۳۴۸ھ سے اہتمام کے منصب پر فائز ہوئے۔ قدرت فیاض نے انہیں حسن وجمال اور فضل وکمال کے ساتھ ساتھ عقل و دانش، فہم وفراست، حلم ووقار، حسنِ تدبیر اور نظم ونسق کی بے پناہ صلاحیتیں بھی عطا فرمائی تھیں۔

حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی مالٹا سے تشریف آوری پر ان سے بیعت ہوئے

اوران کے وصال کے بعد حضرت اقدس حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ سے سلوک کی تکمیل کی اور خلافت واجازت سے مشرف ہوئے۔

حضرت مرحوم کا عظیم الشان کارنامہ قریباً ساٹھ سال تک مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی انتظامی خدمات ہیں۔صرف دارالعلوم کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ دیگر اداروں میں بھی اتنی طویل مدت تک منصبِ اہتمام پر فائز رہنے کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔

حضرتؒ کی صحت کافی عرصہ سے مخدوش چلی آ رہی تھی۔اورایک سال سے تو قریباً صاحبِ فراش تھے۔ بالآخر وہ وقت موعود آ پہنچا جس سے کسی فرد و بشر کو مفر نہیں، حضرت کی وفات حسرت آیات اہل حق کے لیے عظیم سانحہ ہے۔حق تعالیٰ شانہ مرحوم کو درجات عالیہ عطا فرمائیں۔اور تمام متعلقین اور پس ماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائیں۔آمین۔

............❖............

ایک جامع کمالات شخصیت

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ
دارالافتاء دارالعلوم دیو بند

اچھی طرح یاد ہے کہ سب سے پہلے حکیم الاسلامؒ کو میں نے شہر مونگیر کے ایک عظیم الشان اجلاس میں دور سے دیکھا جب آپ کرسی پر بیٹھے وعظ کر رہے تھے، وعظ اس قدر دل آویز و دل پذیر تھا کہ پورے مجمع میں کہیں سے کھانسنے کی آواز تک نہیں آ رہی تھی، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ واعظ جادو کر رہا ہے اور پورا مجمع ہمہ تن گوش ان کی طرف متوجہ سکتہ کے عالم میں ہے، خود اپنا بھی اس وقت یہی احساس تھا کہ آپ سے بڑھ کر موثر بولنے والی شخصیت دوسری نہیں ہے دو ڈھائی گھنٹہ رات کے دس بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک مسلسل بولتے رہے، لیکن مجمع جب وہاں سے اٹھا تو سب کی زبان پر تھا کہ تقریر جلد ختم ہوگئی، کاش کچھ دیر تک اور حضرت مہتمم صاحبؒ بولتے رہتے، اور ہم لوگ سنتے رہتے، تقریر کا عنوان تھا، **یبنی اقم الصلوٰۃ وأمرُ بالمعروف وَانْہَ عن المنکر واصبر علی مااصابک ان ذالک من عزم الامور** (لقمان ۲۰)

حضرت مہتمم صاحبؒ کی زبان بہت شیریں، لب ولہجہ بڑا ہی خوشگوار، اور انداز بیان ہلکا پھلکا بہت سلیس و دلنشیں تھا، قرآن پاک کی آیتیں، احادیث نبوی کے ٹکڑے اور صحابۂ کرامؓ و اولیاء اللہ کی تاریخ واقعات اس طرح تقریر میں برجستہ پڑھتے اور بیان کرتے جاتے کہ سننے والا محو حیرت رہ جاتا، پوری تقریر مربوط مدلل اور ذہن وفکر کو متاثر کرنے والی تھی، اپنا تاثر یہی تھا کہ اس قدر بلیغ، عام فہم اور موثر وعظ کبھی اور سننے میں نہیں آیا، یہ حقیقت ہے کہ آپ جہاں تقریر کرنے گئے چھا گئے، نہ گھن گرج، نہ نشیب وفراز، نہ ہاتھ پاؤں کے اشارے، سنجیدہ و متین اور صاف وشستہ انداز، کہا جا سکتا ہے کہ آپ بلاشبہ اپنے دور کے بے مثال واعظ ومقرر اور جاندار خطیب تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک وہ تقریر ذہن کے گوشوں میں گونج رہی ہے۔

اب تک دور سے ہی سنا تھا اور دور سے ہی دیکھا تھا، ان دنوں خاکسار دارالعلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر کی صدارت تدریس کی خدمت انجام دے رہا تھا، اور اس مدرسہ کو خس پوش چھپر سے پختہ بلڈنگ میں منتقل کرنے کی جدو جہد میں ہمہ تن مصروف تھا، ۳۰ رجون ۱۹۵۶ء کو دارالعلوم دیوبند (یوپی) کا ایک لفافہ ڈاک سے موصول ہوا، حیرت ہوئی کہ دیوبند میں میرا کوئی نہیں، کس نے یاد کیا، کھولا تو دارالعلوم کے پیڈ پر ٹائپ شدہ خط ملا۔

حضرت المحترم زید مجدکم السامی

سلام مسنون، نیاز مقرون، صحتوریٔ مزاج کا خواہاں ہوں، اس وقت ایک خاص ضرورت سے عریضہ لکھ رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس وقت دارالعلوم کے شعبہ تبلیغ اور یہاں کے نشر و اشاعت کو ایک ایسے فاضل کی ضرورت ہے، جو صاحبِ قلم، خوش تحریر، اور شرعی مسائل وحقائق کو دلنشیں پیرایہ میں اچھے اسلوب کے ساتھ، موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق پیش کرنے پر قادر ہو، بالخصوص مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے ان نظریات کا جو اہل سنت والجماعت کے مسلک سے ہٹے ہوئے ہیں، اصول ودلائل کی روشنی میں تجزیہ کر کے ان کا کھرا اور کھوٹا واضح کر سکتا ہو، نیز مخالف تحریرات سے انصاف واعتدال کے ساتھ اخذ کرنے اور اس پر سنجیدہ گرفت کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو، اور معاندین کے شبہات واعتراضات کا شرعی مواد کی روشنی میں متانت کے ساتھ جواب دینے کی اہلیت رکھتا ہو، ساتھ ہی اکابر دارالعلوم کے بتلائے ہوئے اسالیب بیان وعنوانات کلام پر، ان کے ذوق وفکر کی روح کو محفوظ رکھتے ہوئے، اچھے ڈھنگ سے ان کے مقصود کی ترجمانی کر سکتا ہو، اور اسی کے ساتھ احیاناً دارالعلوم کی ضروریات یا بیرونی دعوت پر حسب موقع تقریر بیان پر بھی قادر ہو۔

اس سلسلہ میں مختلف شخصیتوں کے نام کے ساتھ جناب کا اسم گرامی بھی سامنے آیا، بندہ کا حسن ظن تو ذات سامی کی نسبت جو ہے وہ ہے، اور وہی اس تحریر کا باعث ہوا ہے لیکن درخواست یہ ہے کہ معیار بالا کی رو سے اپنے بارے میں خود جناب بے تکلف اظہار خیال فرما دیں، کہ ان خدمات مطلوبہ کو جذبات مذکورہ کے ساتھ انجام دے سکیں گے یا نہیں؟ اگر دے سکیں تو مطلع فرما دیں تا کہ میں مجلس انتخاب میں اسم گرامی کو اپنی سفارش کے ساتھ پیش کر سکوں، ساتھ ہی اگر کوئی مقالہ یا رسالہ یا مضمون یا تالیفات میں سے ہو تو اسے بھی ارسال فرما دیں، خواہ مطبوعہ ہو یا مخطوطہ،

امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔

والسلام

محمد طیب

مہتمم دارالعلوم دیوبند ۱۵/۱۱/۱۹۷۵

خاکسار نے اس خط کو بڑی عقیدت ومحبت کی آنکھوں پڑھا دل نے گواہی دی کہ ایک عالم ربانی ایک گمنام ناچیز کی عزت افزائی فرما رہا ہے، اور غالباً دوتین مرتبہ پڑھا، یہاں یہ ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ اب تک میں تحریر کی جامعیت اور قیود وشرائط میں حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا قائل تھا، اور بحمد للہ اب تک ہوں، مگر اوپر کا خط پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا، اور تحریر بالا کی جامعیت اور شرائط وقیود دیکھ کر دنگ تھا کہ اس میں حکیم الامتؒ کی تحریر کی پوری جھلک موجود تھی، اس پہلی تحریر کو اپنے نام سے پاکیزہ لب و لہجہ میں پڑھ کر دلی مسرت ہوئی، اور میری خود اعتمادی کو مہمیز لگی اور سمجھا کہ ایک گمنام، طالب العلم، اور نوعمر مدرس کو اس طرح خطاب فرمایا گیا، یہ محض رب العالمین کا فضل وکرم ہے، حضرت والا کا وعظ جلسہ میں سن چکا تھا، اب قلمی تحریر دیکھی دل ودماغ میں عظمت اور تقدس پیوست ہوگیا اور یقین کرنا پڑا کہ جیسا سنتا تھا، ویسا ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ پایا، پھر قدرت نے مجھے سانحہ سے دیوبند پہونچا دیا اور زندگی میں بالکل پہلی مرتبہ ۳ر صفر ۱۳۷۶ھ کو خدمت میں حاضر ہوکر اطمینان کے ساتھ ملا، کریمانہ اخلاق سے ملے بیان نہیں کرسکتا، پھر تو یہ دستور ہوگیا کہ دن کے کسی حصہ میں حضرت مہتمم صاحبؒ کی مجلس میں پابندی سے چلا جاتا، اور رات میں حضرت مدنیؒ کے درس بخاری میں حاضری دیتا، سال بھر پوری پابندی کی اور اس طرح مدت کی حسرت پوری ہوئی اور اپنے ان دونوں بزرگوں سے استفادہ کا موقع حصہ میں آیا۔

حضرت مہتمم صاحبؒ کی مجلس کے متعلق پورے تیقن کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں ایسی عالمانہ مجلس اور حکیمانہ باتیں ناپید ہیں۔ اب اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مسلسل گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ طلبہ اور علماء مختلف علمی سوالات کرتے اور حضرت مہتمم صاحبؒ برجستہ ان کا جواب دیتے اور کتاب وسنت سے دلائل بھی پیش کرتے جاتے اور عقلی طور پر ذہنوں میں واضح کرنے کی سعی فرماتے، نہ کسی پر تنقیدی تبصرہ ہوتا، نہ کسی کی غیبت خالص علمی، دینی مسائل پر مسلسل گفتگو، کسی کا نام آیا تو بڑے ادب کے ساتھ نام لیتے اور اس کے فضائل ومناقب بھی بیان کرتے، اکابر دار العلوم سے بہت گہری مناسبت اور دلچسپی تھی، ہر مجلس میں ان کے دوچار تاریخی حقائق کا تذکرہ ضرور آتا، سیرت سازی کا انداز ایسا دیکھنے میں نہیں آیا، کہ ایک سال رمضان کی مجلسوں کی تقریر یا گفتگو کے لئے بعض لوگوں نے ٹیپ ریکارڈ کا انتظام کیا، اور خاکسار نے ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے ان باتوں کو مرتب کیا جو ''حکیم الاسلام اور ان کی مجالس'' کے نام سے کتابی شکل میں بہت پہلے چھپ کر شائع ہوچکی ہے، اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مہتمم صاحبؒ کی مجلس میں کتنے اور کیسے علوم ہوا کرتے تھے، اور اندازِ بیان کس قدر دلچسپ ہوتا تھا دنیا جانتی ہے کہ حضرتؒ کا دل کینہ کپٹ اور میل کچیل

سے بالکلیہ پاک وصاف تھا، دارالعلوم کے اساتذہ اور دوسرے علماء کا بڑا احترام فرماتے۔

مزاج خالص علمی اور دینی تھا، اہل علم کی بڑی قدر و منزلت فرماتے تھے، میں جس سال نیا نیا یہاں آیا، سات آٹھ ماہ کے بعد دارالعلوم معینیہ سانحہ سے ایک محضر نامہ آیا کہ ہمارے مدرس جو آپ کے یہاں گئے ہیں ان کو واپس فرمادیں، اس دن مجھے اپنے دولت خانہ پر حضرت نے یاد فرمایا، جب میں حاضر ہو گیا تو اندر سے تشریف لائے، اور بیٹھ گئے، مزاج پوچھنے کے بعد کہنے لگے کہ آپ کے مدرسے سے ایک لمبا چوڑا محضر نامہ ملا ہے، اس سلسلہ میں کچھ دریافت کرنا ہے، پہلے دارالعلوم کے فضائل و حالات پر مختصر روشنی ڈالی، پھر فرمایا کہ جب آدمی نئی جگہ آتا ہے تو نئے حالات سے سابقہ پڑتا ہے، نئے ماحول میں کچھ افراد موافق ہوتے ہیں کچھ مخالف، کوئی تعریف کرتا اور کوئی تنقید، مگر یہ سب عارضی باتیں ہوتی ہیں۔ اور تھوڑے دنوں کے بعد آدمی کا ایک مقام بن جاتا ہے۔ پھر یہ سب بیان کر کے فرمایا کہ میں تو آپ سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ گھبرا تو نہیں گئے ہیں؟ میرے جواب کے بعد فرمایا مجھے آپ کا لحاظ و خیال ہے۔ دارالعلوم میں اہل علم کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں، سیاسی تو بہت سارے علماء ہونے لگے مگر اہل علم کمیاب ہوتے جارہے ہیں۔ اس کمی کا مجھے احساس ہے آپ جانتے ہیں آج کل ذوق علمی نایاب ہے، حالانکہ اصل چیز یہی ہے، علم پر تھوڑی دیر بولتے رہے، پھر اصل گفتگو پر آئے، آپ نے اپنی دو ضرورتیں بتائی ہیں، یہ دونوں پوری ہونگی اور دونوں کا ہی انتظام کرونگا، آپ بالکل مطمئن رہیں، اب میں آپ کے مدرسہ کو جواب لکھ دوں گا، آپ کو جو ضرورت ہو مجھ سے آکر بیان کریں۔

حضرت مہتمم صاحبؒ کی ان باتوں سے میں کافی متاثر ہوا اور اب تک جیسا میں نے ان کو سمجھا تھا اس کا تیقن بڑھتا ہی چلا گیا، مجھے یاد نہیں کہ اس کے بعد کبھی بھی میں اپنا کوئی مسئلہ چھبیس سال میں لے کر حضرت کی خدمت میں گیا یا اپنے سلسلہ میں کوئی بات کہی۔ مگر اس کا یقین رہا کہ مہتمم صاحبؒ کی نظرِ عنایت منعطف ہے۔ اہتمام کے نام جب کوئی علمی و تحقیقی سوال آتا تو عموماً میرے نام بھجوادیتے۔ میں جواب لکھ کر دفترِ اہتمام کے سپرد کر دیتا، حضرت نظرِ ثانی کر کے اسے بھجوادیتے۔

دو سال بعد دارالعلوم معینیہ کے اصرار پر ایک دفعہ مجھے تین ماہ کی رخصت لے کر وہاں جانا پڑا۔ حضرت مہتمم صاحبؒ نے اس وعدہ پر چھٹی بلا مشاہرہ منظور فرمادی کہ اس تین ماہ کے بعد فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔ رخصت پر میرے چلے جانے کے بعد کچھ لوگوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ میری واپسی نہیں ہوگی، اس لئے میری جگہ دوسرے صاحب کو رکھ لیا جائے، یہ باتیں حضرت مہتمم صاحبؒ سے بھی بار بار کہی گئیں اور مختلف لوگوں

کے ذریعہ کہلوائی گئیں۔ حضرتؒ نے ان کی باتوں پر اعتماد کرنے سے پہلے اپنے قلم سے مجھے باضابطہ ایک خط لکھا اور میری رائے معلوم کی اور اس کی حقیقت کیا ہے۔ خط یہ تھا۔

حضرت المحترم زید مجدکم السامی

سلام مسنون نیاز مقرون، الحمد اللہ بعافیت ہوں، امید ہے کہ آپ بھی بعافیت ہونگے، آپ نے تین ماہ کی رخصت حاصل کی ہے۔ جس کا تقریباً ایک تہائی حصہ پورا ہو چکا ہے، مجھے اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ رخصت تو ایک ضابطہ کی چیز ہے وہ اپنی جگہ ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اس رخصت کے بعد حقیقتاً ارادہ واپسی کا ہے یا نہیں؟ اگر ارادہ ہے تو آپ اسے قطعیت کے ساتھ تحریر فرمادیں لیکن اگر واپسی کا قصد نہ ہو، یا تردّد ہو تو عرض یہ کرنا ہے کہ اس منصب کے لئے جس پر کام کر رہے ہیں ایک موزوں شخصیت مل رہی ہے جو اپنی قابلیت اور وجود استحقاق کی بنا پر واجب التوجہ ہے۔ اگر آپ کی تشریف آوری نہ ہو تو ان سے بات چیت کی جائے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ضابطہ سے الگ ہوکر اپنا حقیقی منشاء واضح فرما دیں آنے کی صورت میں آپ ہر حال مقدم ہیں۔ ساتھ یہ بھی کہ اس رخصت کے بعد کوئی رخصت نہ لیں اور وہ منظور بھی نہ ہو سکے گی اسکے ختم پر جو حقیقی ارادہ ہو اس سے قطعیت کے ساتھ مطلع فرمادیں۔

امید ہے مزاج گرامی بعافیت ہوگا پرسانِ حال حضرات کی خدمت میں سلام مسنون۔

والسلام

محمد طیب از دیوبند ۸۷/۱۱/۱۸ھ

یہ ایک اجنبی ملازم کے ساتھ ہمدردی اور انصاف کا عالم تھا خط بار بار پڑھا کہ ایک طرف آپ پر کس قدر دباؤ ہے، دوسری طرف ایک اہل حق کے حق کی کس قدر پاس داری ہے، اور آپ کو یہ معلوم ہوکر حیرت ہوگی کہ حضرت والا نے اپنا یہ خط رجسٹرڈ بھجوایا، معمولی ڈاک سے نہیں بھیجا۔

۲/ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ کو خاکسار نے جواب میں لکھا کہ حاضری کا ارادہ ہے وہاں جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ غلط ہے انشاء اللہ خاکسار دار العلوم دیوبند واپس آئے گا۔

حضرت والا کو جب میرا یہ جواب موصول ہوگیا تو پھر اس کا جواب بقلم خود تحریر فرمایا وہ مکتوب گرامی بھی پڑھا جائے۔

حضرت المحترم زید مجدکم السامی

سلام مسنون، نیاز مقرون گرامی نامہ نے مشرف فرمایا، سابقہ عریضہ کا مقصد صرف آمد کا متعین کرانا

تھا، سو وہ ہوگیا، اب خواہ ابھی آپ تشریف لے آئیں۔ یا رخصت پوری کر کے آئیں۔ بعض لوگوں نے وثوق سے چونکہ یہ بیان کیا کہ آپ کا ارادہ واپسی کا نہیں ہے اس لئے عریضہ بھیجنے کی ضرورت پیش آئی، سو الحمدللہ بات صاف ہوگئی۔ دعا کا مستدعی ہوں۔

والسلام

محمد طیب از دیو بند ۷۸/۶/۲ھ

آپ اندازہ لگائیں حضرت اقدس مہتمم صاحبؒ کو اپنی ذمہ داری اور دوسروں کے حقوق کا کتنا لحاظ و پاس تھا، اور اپنے ماتحت کام کرنے والوں کی دل جوئی کس طرح کیا کرتے تھے، حضرت مہتمم صاحبؒ کی بڑی خوبی یہ تھی کہ سب پر نظر رکھتے تھے کہ کون کیسا ہے اور کیا کر رہا ہے، جفاکش، محنتی کارکن کو بہت پسند فرماتے تھے، یہ درست ہے کہ ایک معمولی مفاد پر بہت طبقہ غلط فہمیوں کا شکار بنانے کی جدو جہد میں بھی مشغول رہتا تھا، جیسا کہ ہر بڑے کے ساتھ ہوا کرتا ہے، مگر حضرت اپنی فطری ذہانت اور سالہا سال کے تجربہ کے بعد ان کی باتوں میں عموماً نہیں آتے تھے اور صحیح نتیجہ تک پہونچنے کی سعی فرماتے تھے اور اسے پا بھی لیتے تھے۔

جن دنوں میری چھٹی ختم ہو رہی تھی اس زمانہ میں حضرت اقدسؒ ۶ رمحرم ۱۳۷۹ھ کو افریقہ روانہ ہوگئے روانہ ہوتے ہوئے دفتر کو تاکید فرما گئے کہ یاد دہانی کا ایک خط دارالعلوم دیو بند معینہ سانحہ میرے نام بھیج دیا جائے چنانچہ اس وقت کے نائب مہتمم حضرت مولانا مبارک علی صاحبؒ کی طرف سے یاد دہانی کا خط موصول ہوا۔

محترمی زید مجدکم

بعد سلام مسنون آنکہ آپ کی رخصت قریب الختم ہے، لہٰذا آپ کو جلد پہونچ جانا چاہئے۔ حضرت مہتمم صاحب کے گرامی نامہ سے کیفیت واضح ہو چکی ہے کہ اس کی رو سے مزید رخصت کا قصد نہ فرمائیں اس کے لئے حالات مساعد نہیں ہیں لہٰذا آپ کا دارالعلوم میں واپسی کا قصد ہے تو فوراً تشریف لاکر اپنے کام میں لگ جایئے۔ تاخیر نہ فرمایئے حضرت مہتمم صاحب ۶ رمحرم ۱۳۷۹ھ کو افریقہ تشریف لے جا چکے ہیں امید ہے آپ مع الخیر ہونگے۔

والسلام

محمد مبارک علی

نائب مہتمم دارالعلوم دیو بند ۷۹/۱/۱۳ھ

یہ خط بھی بذریعہ رجسٹری بھجوا دیا گیا، مجھے غالباً ۲۳ رمحرم سے حاضر ہونا تھا۔ بحمد للہ میں وقت پر

دارالعلوم حاضر ہو گیا اور اپنی مفوضہ خدمت انجام دینا شروع کر دی۔

اسی طرح ایک دفعہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مدلل و مکمل پر بحیثیت مرتب نام کا مسئلہ سامنے آیا تو دفتر نے نہ معلوم کس کے مشورہ سے میرا نام حذف کر دیا اور صرف شعبہ ترتیب فتاویٰ لکھا ہوا رہنے دیا، جب یہ مسئلہ میرے سامنے آیا میں نے کہا اس میں میرا کوئی نقصان نہیں، ذمہ داری ہلکی ہو جائیگی مگر یہ بات دوسروں تک پہونچی، بعض ممبران شوریٰ نے یہ بات سنی تو ان کو حیرت ہوئی کہ بغیر نام اس کی غلطیوں کی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے گی، انھوں نے دفتر اہتمام کو اس طرف توجہ دلائی بالخصوص امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے۔

حضرت مہتمم صاحبؒ پاکستان تشریف لے جا چکے تھے مولانا عبدالحق صاحب پیشکار نے مجھے بلایا اور کہا یہ صورت ہے آپ مناسب سمجھیں تو ایک خط حضرت مہتمم صاحبؒ کے نام لکھ دیں میں اس کو اپنے خط کے ساتھ پاکستان بھجوا دونگا۔ حضرت کے خط آ جانے کے بعد بات صاف ہو جائے گی چنانچہ میں نے فتاویٰ دارالعلوم کے ٹائٹل پر مرتب کے نام لکھے جانے کے سلسلہ میں دریافت کیا کہ حضرت کی رائے کیا ہے؟ چنانچہ حضرت والا نے پاکستان سے جواب میں یہ خط لکھا۔

محترمی زید مجدکم السامی

سلام مسنون، اخلاص مقرون، گرامی نامہ ملا میں آج ہی سرگودھا پہونچا ہوں، پرسوں لائل پور کیلئے روانگی ہے، جولائی کے پہلے ہفتہ میں دیوبند پہنچ جانے کی توقع ہے۔ انشاء اللہ۔

فتاویٰ دارالعلوم کے سلسلہ میں ٹائٹل پر بحیثیت مرتب فتاویٰ آپ کا اسم گرامی آنا میرے خیال میں قابل اعتراض نہ ہونا چاہئے، بلکہ حق پسندی کا تقاضہ یہی ہے کہ یہ نام آنا آپ کا حق ہے، جب کہ اول سے آخر تک محنت آپ کی ہے احقر کی رائے آپ کے گرامی نامہ کے بعد یہی ہے کہ نام کی تصریح ضرور ہونی چاہئے۔

امید ہے کہ آپ بعافیت ہونگے، دعا کا خواستگار ہوں، حضرت مفتی صاحب اور دوسرے بزرگوں سے بشرط ملاقات و یاد سلام فرما دیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کا خط مل گیا ہے ان کو سلام فرما دیں۔

محمد طیب از سرگودھا مدرسہ سراج العلوم

یوم چہارشنبہ ۸۲/۱/۹ھ

یہ مکتوب گرامی براہ راست دارالافتاء کے پتہ پر خاکسار کے نام موصول ہوا، میں اسے لے کر نائب صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا پیشکار اور نائب صاحبؒ نے مشورہ کے بعد سید محبوب رضوی صاحب مرحوم کو

بلا کر فرمایا کہ اس بلاک میں مرتب کے نیچے اور شعبہ ترتیب کے اوپر محمد ظفیر الدین کسی کاتب سے بڑھوا دیں چنانچہ اس طرح فتاویٰ دارالعلوم پر خاکسار کا نام جو خارج کیا جاچکا تھا ٹائٹل پر لکھا گیا اور وہ برابر چلا آ رہا ہے اور بحمد اللہ اس وقت تک فتاویٰ کی بارہ جلدیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں اور ہر سال دو تین جلدوں کے نئے اڈیشن چھپتے ہیں اس سال ایران کے ایک عالم نے فتاویٰ دارالعلوم کو فارسی میں منتقل کرانے کی اجازت بھی حاصل کی ہے، خدا کرے یہ کام کر رہے ہوں۔ فتاویٰ پر نام کے قصے کے بعد ہی اسی سال دو چار ماہ بعد نہ معلوم کس وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا کہ مجلس شوریٰ نے مجھے دارالافتاء سے کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں منتقل کر دیا، اور میرے فرائض میں کتب خانہ کی نئی ترتیب و تنظیم داخل فرمائی، گویا میری ذمہ داری یہ طے پائی کہ اوقات مدرسہ میں کتبخانہ کی تنظیم و ترتیب کا فریضہ میں ادا کروں اور خارج اوقات میں ترتیب فتاویٰ دارالعلوم کی خدمت انجام دینے کی جدوجہد کروں۔

بحیثیت ملازم شوریٰ کا یہ حکم ماننا تھا۔ آپ کو یہ معلوم ہو کر تعجب ہوگا کہ فتاویٰ کی پہلی جلد کے سوا بقیہ گیارہ جلدیں خارج اوقات کی ہی مرتب کی ہوئی ہیں اور یہ سارا کام حضرت مہتمم صاحبؒ کی سرپرستی میں انجام پایا ہے کوئی شبہ نہیں کہ یہ تبادلہ میرے لئے تکلیف دہ ثابت ہوا، جب تبادلہ کا یہ حکم آیا میں وہ کاغذ لے کر حضرت مہتمم صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا حضرت! یہ کیا ہوا؟ فرمانے لگے سو سال سے زیادہ ہو گیا کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم نہیں ہوئی ممبران شوریٰ کو بھی اس کی شکایت ہے اور دوسرے اہل علم کو بھی جب کسی کتاب کی ضرورت ہوتی ہے اس کی تلاش میں کئی کئی دن لگ جاتے ہیں۔ اس جگہ کے خواہش مند دوسرے کئی حضرات تھے کہ ان کا وہاں تقرر کر دیا جائے مگر ممبران شوریٰ کی رائے متفقہ طور پر آپ کے لئے ہوئی۔ جس میں خود میں بھی داخل ہوں۔ لہٰذا آپ اسے منظور کر کے کام شروع کر دیں، میں نے عرض کیا حضرت یہ تو میرا تنزل ہو گیا، میری تنخواہ ناظم کتب خانہ سے اس وقت زیادہ ہے پھر کتب خانہ میں ترقی کی کوئی منزل نہیں، یہاں میرے لئے ترقی کے مواقع تھے، میں نے محسوس کیا کہ میری باتوں سے متاثر ہوئے اور آپ کی سمجھ میں یہ بات آ گئی، تھوڑی دیر خاموش رہے فرمایا دارالعلوم کی علمی خدمت سمجھ کر یہ کام کریں، انشاء اللہ برکت ہوگی، اور میں آئندہ آپ کا خیال رکھوں گا، پھر دارالافتاء میں لے آؤں گا، وہاں دو ایک آدمی اور تھے، انھوں نے مذاقاً کہا کہ تم جمعیتی ہو اور ناظم کتب خانہ بھی سیاسی ہیں، دونوں کو یکجا کر دیا گیا ہے میں نے دیکھا کہ یہ سنتے ہی حضرتؒ کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا فرمانے لگے یہ سب بیہودہ باتیں ہیں، پیش نظر دارالعلوم اور اس کی خدمت ہے اور یہی رہنی چاہئے، پھر تھوڑی دیر دارالعلوم کی برکات پر بولتے رہے

اور مجھے مطمئن فرماتے رہے اور کہنا چاہئے حضرت کی تقریر سے میرے دل کا بوجھ بڑی حد تک ہلکا ہو گیا۔

یہاں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت مہتمم صاحبؒ کا ذہن وفکر دار العلوم اور اس کی خدمت کے گرد کام کرتا تھا اور اپنے ملازم کی دلدہی اپنا اہم فریضہ سمجھتے تھے اور جب کوئی خدمت میں حاضر ہوتا تو اس کو مطمئن کر کے واپس فرماتے تھے۔

حضرت مہتمم صاحبؒ بڑی خوبیوں کے مالک تھے محاسن اخلاق اور اخلاص ومروت کے پیکر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ساری سادگی کے باوجود بڑا رعب ووقار عطا کر رکھا تھا، بڑے بڑے عظیم المرتبت انسان آپ کے سامنے آ کر مرعوب ہو جاتے تھے، جاہ وجلال، رعب ودبدبہ، اور شرافت ومروت چہرہ سے عیاں تھی، یہی نہیں کہ وہ عوام کے سامنے بے جھجھک تقریر فرماتے بلکہ علماء کرام اور صوفیاءعظام کے مجمع میں جب بولتے تو اندازہ ہوتا کہ آپ کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا، حافظ قرآن اور قاری تو تھے ہی لیکن اسی کے ساتھ ان احادیث کا بڑا ذخیرہ برزبان تھا، جن کا تعلق عوام وخواص کے اعمال واخلاق اور عقائد سے ہے۔

دار العلوم میں جب تقسیم انعام کا جلسہ ہوتا تو عام طور پر حضرت مہتمم صاحبؒ کی معرکۃ الآرا تقریر ہوتی، سارے علیا کے اساتذہ، تمام شعبہ جات کے نظماء مفتیان کرام اور پورے دار العلوم کے طلبہ موجود ہوتے تقریر کا لب ولہجہ بڑا ہی دلنشیں ہوتا علماء جھوم جاتے تھے اور یہ کہہ کر اٹھتے تھے کہ حضرت مہتمم صاحبؒ کو خطاب کا حق ہے، جیسا مجمع ہوتا اور جہاں جس طرح کا موقع ہوتا اسی انداز کا خطاب بھی ہوتا تھا۔

حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ صدر المدرسین وشیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کی وفات کے بعد جب سوال پیدا ہوا کہ بخاری شریف کا درس کون دے، تو تمام اساتذہ اور اراکین شوریٰ نے اس خدمت کے لئے حضرت اقدس کا انتخاب کیا، حالانکہ عرصہ سے درس وتدریس کا سلسلہ تقریباً بند سا تھا، مگر باوجود حضرت والا نے تین چار ماہ بخاری شریف کا درس دیا اور جمعہ کو طلبہ کو پڑھایا، کتابی صلاحیت بھی بہت اچھی تھی، چونکہ جوانی میں مستقل یہ خدمت انجام دے چکے تھے، اور مشکوٰۃ شریف کا درس اور اسی طرح حجۃ اللہ البالغہ کا درس تقریباً پوری عمر دیتے رہے، آپ کا ذہن ہر وقت حاضر ہوتا تھا، دماغ بیدار پایا تھا اور فکر صحیح اور دور رسی حصہ میں آئی تھی، اللہ تعالیٰ پر پورا اعتماد تھا، دار العلوم کے اہتمام نے اعتماد کو اور پختہ کر دیا تھا، جب کوئی یہ بات ذہن نشیں کر دیتا حضرت یہ کام دار العلوم میں بہت ضروری ہے، اور مفید بھی اگر یہ بات سمجھ میں آ گئی فوراً اس پر عمل کرتے کچھ لوگ کہتے حضرت بڑا خرچ ہے روپئے کہاں سے آئیں گے؟ فرماتے یہ خدا کا کام ہے، میرا کام ابتداء کر دینا ہے، تکمیل وہ کریگا، یہ بھی کہتے زندگی کا تجربہ ہے کہ جو کام دار العلوم کا

شروع کر دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے پورا کر دیا، حضرت مہتمم صاحبؒ کے زمانہ میں بحیثیت صدر جمہوریہ پہلے راجندر پرشاد آئے اور پھر فخر الدین علی احمد دونوں ہی حضرات دارالعلوم اور اس کے مہتمم کے اخلاق سے خوش ہو کر گئے اور زندگی بھر مہتمم صاحبؒ کے مدح خواں رہے، عرب ممالک کے سیکڑوں وفود مختلف مواقع سے آتے رہتے ہیں۔ مہتمم صاحبؒ سے ملکر بہت خوش ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آواز میں بڑی کشش دے رکھی تھی، حکیمانہ انداز بیان کا سبھوں پر ہی کم وبیش اثر پڑتا تھا، رجسٹر معائنہ جات سے اس کی تصدیق ہوسکتی ہے۔

سرکاری مہمانوں سے کبھی کبھی الجھن محسوس فرماتے تھے اور کہا کرتے تھے ہم فقیروں کے یہاں ان بادشاہوں اور ان کے پیروکاروں کا کیا کام، انھیں دیکھ کر کبھی مجھے وحشت ہوتی ہے، حکومت کی امداد سے بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے روک رکھا تھا اس لئے کبھی دارالعلوم نے سرکاری امداد قبول نہیں کی، ہندوستان کی آزادی کے بعد مختلف حلقوں سے کہنا چاہئے دباؤ ڈالا گیا کہ اب حکومت سے امداد قبول کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ لیکن حضرت مہتمم صاحبؒ قبول کرنے سے ہمیشہ سے گریز اختیار کیا کرتے اور کسی نہ کسی طرح ٹال جاتے فرماتے تھے جب مسلمان دارالعلوم کی ساری ضرورتیں پوری کر دیتے ہیں پھر حکومت وقت کی امداد کیوں قبول کی جائے۔

طبیعت میں غایت درجہ تواضع تھی، کبھی بھی کبر وغرور کا شائبہ نہیں دیکھا گیا، بارہا دیکھا کہ جب دارالعلوم میں تقریر کے لئے کھڑے ہوئے فرمایا کہ آپ کی ہی طرح ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ مجھ میں اگر کچھ اچھی بات پائی جاتی ہے وہ دارالعلوم کا اور اس کے اکابر کا صدقہ ہے معمولی سے معمولی آدمی سے بھی بڑے تپاک سے ملتے یہ بھی فرماتے تھے کہ میں جہاں جاتا ہوں دارالعلوم میرے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دارالعلوم کو بین الاقوامی ادارہ بنانے میں حضرت کا بڑا ہاتھ ہے یورپ، امریکہ، افریقہ اور عرب ممالک جہاں تشریف لے گئے اولاً تذکرہ دارالعلوم کا فرمایا، دارالعلوم آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا، آپ دارالعلوم کے نشان بن گئے تھے جہاں دارالعلوم کا نام آتا ساتھ ہی آپ کا نام آتا اور جہاں آپ کا نام آتا دارالعلوم کا نام آتا، دونوں نام لازم وملزوم سے ہوگئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے زبان میں بڑی تاثیر دے رکھی تھی، جو بات کہتے ایسا معلوم ہوتا کہ دل میں اتر گئی، یہی وجہ ہے کہ سیکڑوں بدعتی خاندان دیوبندی المسلک ہوگئے اور بدعات وخرافات سے توبہ کی پھر علماء دیوبند کے گرویدہ ہوگئے، جو فرماتے مثبت انداز میں فرماتے، مناظرہ اور بحث ومباحثہ کی عادت نہیں تھی۔ برا تو اپنے دشمن تک کو نہیں کہتے تھے، ذہن وفکر تعمیری تھا، تخریب سے ذرا بھی لگاؤ نہیں رکھتے تھے، تخریب کاروں

سے متنفر اور دور رہنا پسند کرتے تھے۔

تصوف میں پہلے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانیؒ، پھر محدث کبیر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور اخیر میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے وابستہ ہوئے، اور خرقہ خلافت اسی دربار سے عطا ہوئی، حضرت نانوتویؒ کی نسبت کی وجہ سے سارے بزرگ آپ سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، اور آپ کی طرف متوجہ رہتے تھے خود ذاتی اوصاف وکمالات کے بھی آپ مالک تھے، علم وفضل چہرہ مہرہ سے ظاہر ہوتا تھا۔ ارشاد و بیعت کا مشغلہ بھی تھا مگر پہلے دار العلوم پھر کچھ اور، کھلے عام ارشاد و بیعت کا مشغلہ نہ تھا۔ اگر کسی نے اصرار کیا تو بیعت فرمالیا، اس معاملہ میں طبیعت میں بے نیازی کی شان تھی یہی وجہ ہے کہ آپ کے مستشرشدین میں خواص زیادہ ہیں اور وہ بھی اہل علم اور سنجیدہ ومتین، خاموش مزاج لڑنے جھگڑنے سے گریزاں اور اپنے کام سے کام رکھنے والے، پھر بھی ملک اور بیرون ملک میں آپ کے فیض یافتوں کی کافی تعداد ہے، اس راستہ سے بھی ایک بڑے طبقہ نے آپسے فائدہ اٹھایا، ایک گرامی نامہ میں لکھتے ہیں۔

محترمی ومکرمی سلام مسنون

سلام مسنون، نیاز مقرون، گرامی نامہ نے مشرف فرمایا، میں اپنی عدیم الفرصتی کے بارہ میں کیا عرض کروں، چار پانچ سو آدمیوں سے سابقہ روزانہ تعلیم وتلقین اور تقریر کا سلسلہ رات ودن کے مختلف حصوں میں رہتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وابستہ لوگوں کی تعداد کم ہونے کے باوجود خاصی ہوا کرتی تھی، لیکن یہ سب خدمت خاموشی کے ساتھ انجام پائی تھی، کیوں کہ نہ کوئی مہمان خانہ تھا، نہ خانقاہ تھی، نہ مریدین کا سال کے کسی حصہ میں کہیں اجتماع ہوتا تھا، جب کبھی حضرت کی سوانح مرتب ہوگی تو ممکن ہے اس میں اس کی کچھ تفصیل آئے۔

بڑی خوبی یہ تھی کہ مہتمم صاحب قدس سرہٗ صاف باطن تھے، قلب میں کہیں کھوٹ نہیں تھا، جس سے جتنا تعلق ہوتا، اس کا لحاظ و پاس تھا، اور موقع پا کر اس کا اظہار بھی فرمادیا کرتے تھے، ایک دفعہ پاکستان تشریف لے گئے، اور قیام لمبا ہوگیا، تو دیوبند سے مختلف لوگوں نے لکھا کہ حضرت والا کی جدائی بہت محسوس ہورہی ہے، جلد تشریف لے آئیں۔ اسی زمانہ میں خاکسار کے اس طرح کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا۔

سلام مسنون، نیاز مقرون، گرامی نامہ باعث شرف وانبساط ہوا، نامۂ محبت نے دل میں یاد ومحبت میں تموج پیدا کردیا۔ یہ محبت نہ مٹنے کی چیز ہے، نہ مٹائی جاسکتی ہے، انشاء اللہ یہ یاد آخرت تک ساتھ جانے والی ہے۔ اس لئے باقی ہے اور باقی رہے گی، یہاں کے عزیزوں اور دوستوں نے ویزہ اکتوبر تک بڑھوایا ہوا

ہے، اوراسی کے تحت پروگرام ہیں، جلسوں کے سلسلہ کی بات آپ جانتے ہیں کہ جلسے والے سب کچھ گوارہ کر لیتے ہیں، لیکن پروگرام کے بارے میں جان لڑادیتے ہیں۔ میرٹھ، بمبئی وغیرہ میں بارہا اس کی نوبت آئی کہ مجھے بخار شدت کا چڑھا ہوا ہے لیکن جلسے والوں نے اپنی بدنامی کے تصور پر دوسرے کے آرام کو نثار کردیا، اس لئے پروگرام بہر صورت پورے کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں، آپ حضرات کی یاد دل میں کتنی ہے؟ الفاظ میں لانے کی چیز نہیں۔

ایسی ہی یادیں کچھ ادھر بھی ابھری ہوئی ہیں، **وقد یوذیٰ من المقت الجبیب**. یہاں سب اعزہ بعافیت ہیں، ملنے کے لئے دوسرے شہروں سے بھی لوگ آتے رہتے ہیں، وہاں سب پرُسان حال حضرات کی خدمات میں سلام مسنون پہونچادیا جائے۔ والسلام

محمد طیب، از کراچی نمبر ۱۸/ ناظم آباد نمبر

مکان زاہر قاسمی، ۷/۷/۸۸ھ

حضرت مہتمم صاحبؒ میں جہاں بے انتہا مروت تھی وہیں بے پناہ شفقت و محبت کا بھی جذبہ تھا، اپنے چھوٹوں پر مہربان تھے، جب میں پہلے سال دارالعلوم میں آیا، تو مجھ سے جو کام متعلق تھا، وہ تصنیف وتالیف کا تھا، جماعت اسلامی کے دینی رجحانات، میری پہلی کتاب تھی جو دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی رمضان قریب آیا تو زندگی بھر کی عادت رمضان گھر گذارنے کی تھی، یہاں معلوم ہوا کہ شعبہ جات دیگر کو رمضان کی چھٹی نہیں ملتی ہے۔ میں نے خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ رمضان گذارنے کی اجازت وطن میں دیدیں فرمایا ضابطہ میں آپ کے شعبہ کی چھٹی نہیں ہے، میں نے کہا پھر میرا کیا ہوگا، میری اداسی دیکھ کر فرمانے لگے، تصنیف وتالیف کا کام آپ گھر بھی تو کر سکتے ہیں، میں نے جواب دیا ضرور کرتا رہوں گا، اس کے بغیر تو وقت ہی نہیں گذرے گا، فرمانے لگے اچھا پھر پینسل لیکر کچھ لکھنے لگے، وہ کاغذ میری طرف بڑھا کر فرمایا اس مضمون کی درخواست لکھ کر پیش کریں۔ میں نے وہ کاغذ لے لیا وہ باضابطہ درخواست کا مضمون تھا اسے نقل کر کے پیشکار صاحب کے حوالہ کردیا دوسرے دن پیشکار صاحب نے بتایا کہ آپ کی درخواست منظور ہوگئی ہے۔ جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے حضرت والا کی شفقت بیتاب کر دیتی ہے، کیا آدمی تھے، واقعی فرشتہ خصلت اور معصوم کردار کے مالک تھے، کبھی کسی معمولی سے معمولی انسان کا بھی دل توڑنا پسند نہیں کیا، انشاء اللہ برزخ و آخرت میں حضرتؒ کی بھی دلجوئی و دلداری ہوگی، اور اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ایسی شفقت و محبت کا معاملہ کریں گے جیسی اس کی رافت و رحمت کی شان ہے۔

اخیر بیماری میں دیکھا کہ غم والم نے خون نچوڑ لیا تھا، ذہنی وفکری اذیت نے نڈھال کر دیا تھا، مگر جب بھی کوئی ملنے حاضر ہوتا چہرہ پر وہی بشاشت ہوتی اور مسکراتے ہوئے مزاج پوچھتے، ڈیڑھ ماہ اس طرح گذارا کہ کھانا بالکل نہیں کھایا، مگر چہرہ کی رونق میں کوئی فرق نہیں دیکھا گیا، گفتگو کا وہی انداز رہا جو پہلے تھا، جب قلم لے کر بیٹھتے تو اس کمزوری میں بھی گھنٹوں لکھتے چلے جاتے، گفتگو ہمیشہ علمی دینی فرماتے تھے۔

ایک بار فرمانے لگے ایک حدیث ہے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہتھیلی رکھی۔ وضع كفه بين كتفي حتى و جدت بر د أنامِلهٖ بين ثديي. یہ حدیث کہیں آئی ہے کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا حضرت یہ حدیث مشکوٰۃ شریف میں بھی آئی ہے فرمانے لگے اسے نقل کر کے حوالہ بھیج دیں اس کی ضرورت ہے۔ میں سوچتا رہا کہ اتنے دنوں سے بیمار ہیں کھانا بند کر رکھا ہے، خود سے اٹھ بیٹھ نہیں سکتے مگر علم کے ساتھ یہ وابستگی ہے چنانچہ میں نے وہ حدیث نقل کر کے حضرتؒ کے پاس بھیج دی۔ اس لمبی بیماری میں مجھے یاد نہیں کہ خود سے کبھی بیماری یا کمزوری کا شکوہ زبان پر آیا ہو گفتگو ہوتی تو یا کوئی علمی مسئلہ بیان کرتے یا دارالعلوم کی تعلیم کے متعلق پوچھتے کہ تعلیم ہو رہی ہے؟ جواب عرض کیا جاتا حضرت تعلیم جاری ہے فرماتے الحمدللہ مقصد تعلیم و تربیت ہی ہے، اکابر واسلاف کا جو مسلک ومشرب ہے اس میں فرق نہیں آنے دینا چاہئے۔

کبھی کبھی بڑی حسرت کے ساتھ فرماتے کہ اپنی جماعت میں پھوٹ پڑ گئی اسے ختم ہونا چاہئے یہ بھی ایک دن فرمایا کہ اختلاف ظاہر ہونے کے بعد تقریریں میں نے تقریباً بند کر دیں، شرم معلوم ہوتی ہے کہ ان حالات میں دوسرے کو خطاب کروں، جب اپنے گھر میں اختلاف جاری ہے، ذہن وفکر ہمیشہ بیدار رہا، ایک لمحہ کے لئے بھی غفلت میں نہ پایا گیا موت بھی ایسی ہوئی کہ کسی کو خبر نہیں ہوئی، بات کرتے کرتے، ذرا سانس تیز ہوئی ایک دو منٹ میں اعلیٰ علیین روح پہنچ گئی جنازہ میں اتنا بڑا مجمع ہوا کہ بوڑھے تک یہ کہتے نہیں تھکتے کہ آج سے پہلے کسی جنازہ میں اتنے آدمی نہیں دیکھے گئے اور نہ کبھی دیوبند میں اتنے بڑے مجمع کا تصور ہو سکتا تھا۔

............❖............

حکیم الاسلامؒ کا نقش جمیل

مولانا حکیم عبدالرشید محمود گنگوہیؒ

آہ! مولانا محمد طیبؒ رہ گزر آخرت ہوگئے۔ ہونا ہی تھا نہ کوئی نئی بات ہے نہ غیر متوقع حادثہ، مگر دلوں کی دنیا اور یادوں کی بستی سے ان کا نقشِ جمیل مٹ جانا ممکن نہیں، وہ باقیات صالحات سے بھی تھے اور ”وجعلها كلمة باقيةً في عقبه“ ان کی زندگی اور زبان یہی تھی۔ ان کی شیریں زبانی، شگفتہ بیانی، صورت نورانی، ہوش مندی وفکرار جمندی ذہن اور دردمندی دل کو کون بھلاسکتا ہے، دوائر علمیہ میں ان کی جامعیت۔ علوم وافکار کا تنوع، تبحر، ادبی ذوق خوبیِ تعبیر، حسین وبدیع ترجمانی، مجامع میں خطاب گویا فلک اعلیٰ سے ”اذا تكلم يخيل الينا انه يويد“ کا سا کیف، حکمت ربانیہ ولی اللٰہی بھی ابن جوزی کی سی سحر انگیزی بھی کس صاحب ذوق جوہر شناس کو رہ رہ کر یاد نہ آئے گی۔

”عجزت النساء ان يلدن مثل طيب“ اب وہ کوہ کن کی بات کوہ کن کے ساتھ کس کس نادرہ اور خلیقہ پر تعجب کریں۔ زبان ایسی کہ سب سمجھیں، بیان ایسا کہ دل مانے، عقل کی پاسبانی بھی۔ ”لیکن کہیں کہیں اسے تنہا بھی چھوڑ دے“ کے سے افکار بھی دلائل عقلی بھی، نقلی بھی جدل عدل بھی انفسی، آفاقی بھی اور حقائق ومعرفت آگیں بھی۔ میں نے مجلس سے اٹھتے ہوئے اکثر لوگوں کو کہتے ہوئے سنا۔

عالم کیا ہے ایک دریا ہے عجیب نابغیت۔

آہ! آخر وہ وقت آگیاع

عشية قيل طيب ليس فينا

انہی کا یہ شعر ہے ؎

خوگر عیش وطرب اب آہ اپنا دل نہیں ۔۔۔ اے تماشا گاہِ عالم بس تجھے آداب ہے

بے شمار محاسن ومکارم اور مناقب ومحامد کے ساتھ ان کی طبع لین، علم وفضل سے معمور، سیرت، معاملات ومعاشرت میں ستھرا، بے عیب متوازن کیریکٹر، جدال ومراء سے تنفر، غیر متصادم مزاج۔

"(بھائی میں لڑنا نہیں چاہتا لڑنا میری افتاد نہیں)" اہم امور وحوادث میں ان کی ایسی رواداری کہ بعض اشخاص کو تداہن وتہاون کا شبہ ہو جائے مگر سچ پوچھئے تو وہ مسامحت تھی نہ مداہنت۔ یہ الطاف خداوندی اس تبرِ متہ پر مثال تھے۔ اب کون ہے جو اس کا دعویٰ کر سکے۔

ہاں مگر بشری اقسام کا انفکاک بھی ممکن نہیں، ممکن کبھی اس سے مامون نہیں ہو سکتا **الا القوم الخاسرون** اخیر کے چند سال جس ضیق خلجان اور ذہنی انتشار کے گزرے بجز اس کے کیا کہا جاوے کہ **وکان امر اللہ قدراً مقدوراً.**

اللہ تعالیٰ ان کو کفارۂ سیئات بنا دے۔ یہ ابتلاءِ عام ہے۔ عوام اور علماء حسب حالات سب ان میں مبتلا ہیں۔ بقول مولانا ندویؒ مسلمانوں سے اجتماعی کام کی صلاحیت اٹھتی جا رہی ہے۔ ارتفاقی مزاج کم ہو رہا ہے۔ کون تبریہ کر سکتا ہے۔ **الانبیاء اشد بلاء فالامثل.** مگر اس شخصیت کے خدوخال وجمال محبوبی میں ان کا محسوس ہونا ناگزیر تھا۔ پھر ہوا جو کچھ ہوا۔ اور کہا گیا جو نہ کہنا تھا حق بھی ناحق بھی۔ حدود کے اندر بھی، تجاوز بھی۔ اخلاص سے حق کہا گیا کہنے والا ماجور۔ ناحق اور حدود سے متجاوز کہا گیا۔ تو اس کی شکایت ہی کیا۔

مانجیٰ اللہ والرسول معاً   من لسان الوریٰ فکیف انا

اب تعزیتاً آپ کے متعلقین، پسماندگان سے وہی کہتا ہوں جو ایک بدوی نے حضرت ابن عباسؓ سے ان کی وفات پر کہا تھا کہ

خیرٌ من العباس اجرک بعدہٗ   واللہ خیرٌ منک للعباس

آپ کو عباسؓ سے بہتر ان کی وفات کا اجر مل گیا۔ اور عباسؓ کو آپ سے بہتر اللہ اور لقاءِ رب میسر ہو گیا۔ زیادہ موجب تاسف وتالم یہ مضمون ہے۔

اِذا مات العالم ثلمة فی الاسلام لایسدھا الا عالم آخر. ورنہ ویسے تو

نزلنا ساعة ثم ارتحلنا   کذا لدنیا رجالٌ فارتحلنا

قانون ہے۔ اب عالم آخر کہاں کب، اللہ جانے۔ البتہ اس دعا کی ضرورت ہے

قرب الرجال الیٰ دیار الآخرة   فاجعل الھی خیر عمری اٰخرة

بڑوں کا اٹھنا حرمان تو ہے ہی پیش آنے والے خطرات کا ارہاص بھی ہے اب تک جانے کتنے فتنے

رُکے ہوں گے۔انابت واستعاذت کی ضرورت ہے۔

یہ خط ختم کر چکا تھا کہ لکھنؤ کے کچھ حضرات اور ایک قاری اسلم نامی تشریف لے آئے۔ دفعتہً نصف صدی قبل کا واقعہ ذہنی اسکرین پر ابھرا۔ میرے حضرت والد صاحبؒ علیل ہوکر شفایاب ہوئے تھے۔ دیوبند سے ایک بڑا مجمع حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ، مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت علامہ ابراہیم صاحبؒ اور حضرت سید اصغر حسین میاں صاحبؒ وغیرہ مزاج پرسی کو تشریف لائے۔ مولانا محمد طیب ۲۵ رسالہ بھی ساتھ تھے۔ بعد مغرب کا وقت تھا۔ حضرت حکیم صاحبؒ نے فرمایا طیب ایک رکوع سناؤ یاد ہے۔ **ولقد خلقنا الانسان ونعلم ماتوسوس به نفسه الی آخره** سنایا۔ سماں بندھ گیا۔ آنکھیں پرُنم ہوگئیں۔ میرے کانوں نے یہ خوش لحنی عمر میں پہلی مرتبہ سنی تھی، ساز بھی سوز بھی۔ دل گداز بھی نغمہائے دلکش سحاب اندر سحاب بھی۔ یہ پہلا نقش تھا جو آج بھی تازہ ہے۔ اس کے بعد دیوبند پہنچ کر تو بارہا سنی۔ جہری نمازوں میں بھی اکثر جب وہ ہوتے امامت وہی کرتے۔ جس کا لحن بھی لحن طیبی سے کچھ مشابہ ہوتا۔ میں تاثر لیتا۔ اب برسوں سے اس کی نوبت نہیں آئی تھی کہ کچھ سنتا۔ مولاناؒ کہولت سے گزر کر شیخوخت کی منزل میں آ گئے تھے۔ لحنیت اور گلے کے گھنگرو اپنا زیر و بم ختم کر چکے تھے۔

پرسوں یہ لکھنوی حضرات اور قاری اسلم ندوی آئے میں نے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ برائے نام کچھ تشابہ تھا یا ذہن نے محسوس کیا قریب تھا کہ دل اور آنکھیں بے قابو ہوجائیں۔ بند وضبط ٹوٹ جائے۔ قراءتِ طیب یاد آ گئی۔ اوپر سے یہ حادثہ سن ہی چکا تھا۔ **عشیة قیل طیب لیس فیند** آج وہ نہیں ہیں وہ عصر ختم ہوگیا۔ دیوبند کا زمانۂ قیام اپنا قیام، اکابر کا مجمع۔ مولانا محمد طیبؒ کا حسین سراپا۔ ان کی لحنیت، طیبؒ سب کی آنکھ کا تارا تھے۔ ان کی نسبت، حضرت مہتمم سلالہ قاسم الخیراتؒ کے بیٹے ہونا ذاتی جمال وکمال مکارم، خوش کلامی، خوش خطابی، خوش تعبیری مضامین خوش نوائی لحن۔ لباس وتلبس تک میں گونہ تزئین جمال امتزاج اور رنگ علمی مذاکرہ میں نوالی انداز۔ جمال بھی کمال بھی نوال بھی۔ مگر جلال نہیں (بہ مفہوم عرفی) ورنہ زندگی کے سب پہلو جلالت کے شاہدِ عدل اور فخامت کے غماز جو بعد میں ایسے نمایاں ہوئے کہ فخر اماثل کہے گئے۔ یہ ہرگز نہ اطراء مادح تھا نہ مبالغہ۔ اللہ ان کی گور کو اپنے انوار سے معمور فرمائے۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کے بعد سے بہ ظاہر مداح ومعتقدین سے زیادہ مجھے ان کے اوصافِ ذکیہ پر اطلاع ہے۔ مجھے بہت سے زمان ومکان واقعات واحوال میں ان سے اور ان کا قرب رہا ہے۔ سفر میں حضر میں، حج میں۔ ایک ہفتہ ہونے کو آیا۔ ان کا نقشِ جمیل کس کس نوع وجہت سے ابھر کر نہیں آیا۔ ان کی جوانی،

بڑھاپا، کہولت ان کے اقوال، افکار، رفتار، مجالس وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ اب اللہ ان کو احبار امت کی انجمن میں جگہ دے۔ اور یہ ان کی صحبت کبھی منتہیٰ نہ ہو۔ دل بھی چاہتا ہے کہ بس یہی ذکر کرتا رہا ہوں۔ کوئی ذکر کرتا ہے تو میں گویا اس کے منھ سے نوالہ چھین لیتا ہوں اور خود بات کرنے لگتا ہوں بار بار خیال ہوتا ہے کہ کہاں کس حال میں ہوں گے نہ قاصد ہے نہ سفیر ہے نہ مرغ نامہ بَر ہے۔ کن کن اخیار و آباء صالحین سے ملاقات ہو رہی ہوگی۔ کوئی بے قاعدگی ہوئی بھی ہوگی تو وہ یعفو عن کثیر ہے اور اس کا کثیر تو کل ہی ہے۔ سب محو کر دے گا۔

کتنی شہادات ان کے لیے ہوں گی۔ جنازہ پر آنے والے شہدا ہی ہیں۔ کتنوں نے عقیدت سے زندگی میں مصافحہ کیا ہوگا۔ انتم شهداء الله فی الارض۔ کتنوں نے ان کے محققانہ خطاب سے شہادتِ حق سنی ہوگی۔ اور خود ان کے لیے شہادت دی ہوگی۔

خطہ ہائے ارض میں کون سا مقام ہے جہاں انھوں نے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اور بات نہ کہی ہوگی۔ ایشیاء، یوروپ، مغربِ اقصیٰ مشرقِ وسطیٰ سب ان کے اعمال نامہ میں مکتوب و محفوظ ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو صبر دے، اجر دے، حادثہ کی اہمیت نا قابلِ انکار ایسی شخصیت کا فقدان نا قابلِ تلافی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ماخوذ ماہ نامہ الرشید صفر، ۱۴۰۴ھ

(ہفت روزہ خدام الدین لاہور)

............❖............

فکر دارالعلوم کی اشاعت میں

حکیم الاسلامؒ کا حصہ

مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی
دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین

محمد و آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین.

ایسی کسی شخصیت پر قلم اٹھانا نسبتاً آسان ہوتا ہے جو بس ایک دو خوبیوں کی مالک یا چند صفات میں ہی امتیاز رکھتی ہو لیکن ایسے افراد میں سے کسی پر کچھ لکھنا جو عبقری صفت اور گونا گوں خصوصیات کے حامل ہوں اور جن کے محاسن بے شمار ہوں جو صفاتِ حمیدہ کا مجموعہ ہوں ان پر لکھنا کاتب کے لئے ایک طرح کا امتحان ہوتا ہے کیوں کہ تمام خصوصیات کا بیان اور شخصیت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنا بالخصوص کسی مقابل میں ممکن نہیں ہوتا اور پھر یہ فیصلہ کرنا کہ ان اوصاف میں سے کسے موضوع بنایا جائے اور کسے چھوڑا جائے حیران و سرگشتہ کرنے کا موجب ہوتا ہے۔

ایسے ہی جامع صفات اور مجموعۂ کمالات افراد میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدۂ کی ذاتِ گرامی بھی تھی چنانچہ جب راقم سے آں مخدوم پر کچھ لکھنے کے لئے اصرار کیا گیا تو یہ عاجز سرگشتہ و حیراں ہو گیا اور اس کے سامنے یہ شاعرانہ تخیل ع

دامن نگہہ تنگ و گل حسن تو بسیار گل چیں ز تنگیٔ داماں دارد!!

حقیقت بن کر کھڑا ہو گیا، کیوں کہ گلِ حسن کی بسیاری پر تنگیٔ داماں کا گلہ کسی اور جگہ استعارہ و کنایہ یا مبالغہ ہو تو ہو مگر حکیم الاسلام نوراللہ مرقدۂ کی ذات میں تو واقعۃً گلہائے گونا گوں اس طرح پیوست ہوئے تھے کہ ان کا شمار مشکل، مزید برآں یہ کہ آں ممدوح کی شخصیت کا ہر پہلو ''کرشمہ دامن می کشہ کہ جا اینجا است''

کا سچا نمونہ ہونے کی وجہ سے لکھنے والے کا دامن پکڑتا ہے کہ مجھے نہ چھوڑو۔ اس بنا پر خیال ہوتا کہ ہے کہ اچھا ہوتا کہ اگر برادرِ موصوف ''تذکرۂ طیب'' کے ہر تذکرہ نگار کے لئے' حیات طیب کا ایک گوشہ بطور موضوع مقرر کر دیتے کہ اس طور پر' محاسن کے اس گلدستہ کا ایک درجہ میں سراپا اور ان کی سوانح بھی آجاتی جنہیں اب صرف مرحوم کی موئے قلم کے ذریعہ کھنچی ہوئی تصویر ہی دیکھنے کو مل سکے گی۔ع

سب کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

لیکن جب ایسا نہیں کیا تو راقم نے مرحوم کی زندگی کا وہ پہلو پیش کرنا طے کیا جس پر خیال ہے کہ کسی اور نے (خلاف مصلحت جان کر) قلم نہ اٹھایا ہوگا، حالاں کہ آج بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی، اس پہلو کا سامنے لانا کم سے کم راقم کی نظر میں جتنا زیادہ مناسب بلکہ ضروری ہے اتنا کسی اور پہلو کا نہیں ہے، اسی وجہ سے راقم نے آں محترم کی زندگی کا یہی اہم پہلو (بلکہ کہنا چاہئے کہ اہم کارنامہ) یعنی فکر دارالعلوم کی اشاعت وحفاظت میں حکیم الاسلام کا حصہ پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ (وبیداللہ التوفیق)

اس عنوان وموضوع کا قدرتی تقاضہ ہے کہ پہلے ''دارالعلوم کا فکر'' (جو مجموعہ ہے خاص مسلک، مشرب اور منہج کا) ہو، اس کے بعد ہی حفاظت وبقاء، نیز اشاعت وصیانت کا تذکرہ برمحل قابل اعتناء ہوگا۔

یہاں یہ حقیقت ظاہر کئے بغیر نہیں گذرا جا سکتا کہ فکر دارالعلوم کا یکجا تفصیلی اور جامع تعارف، تحریری شکل میں آج ہمیں اسی کی زبان وقلم سے معلوم ہوسکتا ہے جس کی ساری زندگی اس کی ترجمانی کرتے بلکہ اسی کی فکر میں گھلتے گذری، یعنی وہی شخصیت جو آج کے تذکرے کا موضوع ہے۔ (رحمه الله واسعة كاملة)

اس تحریری فکر کا درجہ اعتبار بڑھانے کے لئے تنہا یہ بات کافی ہونی چاہئے کہ ''مسلک دارالعلوم'' کے عنوان سے یہ دستاویز اس زمانہ میں ہی منظر عام پر آچکی تھی جب کہ ''دارالعلوم'' کے ارباب بست وکشاد میں اکثریت ایسے حضرات کی تھی جو مسلکِ دارالعلوم، یا فکرِ دارالعلوم سے نہ صرف پورے طور پر آگاہ تھے بلکہ تنہا اسی کو اپنی دنیا وآخرت سنوارنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان میں اس وقت ایسے تو بہت کم تھے جو اس فکر سے ناواقف یا نامانوس ہوں یا اس پر پورا انشراح نہ ہونے کی وجہ سے فلاحِ ذات وقوم کے لئے دوسری راہوں اور فکروں کی تلاش وتجربات میں مشغولیت کو یا اس فکر سے متوحش ہونے کی بنا پر اس کی مخالفت کو حق ودیانت کا تقاضا سمجھتے رہے ہوں (اور ایسا تو شاید ایک بھی نہ تھا یا اس کی جرأت کرسکتا تھا۔ جو کہ محض دنیاوی مصالح کی خاطر حق سے چشم پوشی یا حق دشمنی پر کمر بستہ ہوجانے میں تامل نہ کرے)

دارالعلوم کا مسلک

حاصل کلام یہ ہے کہ ذیل میں ''مسلک دارالعلوم'' کا جو تفصیلی تعارف کرایا جارہا ہے وہ تنہا کسی ایک ذات کی جودۂ طبع یا تراوشِ قلم نہیں ہے بلکہ اس پر زمانہ کے مسلم ''دیوبندیوں'' کی مہر تصدیق ثبت ہے خواہ وہ سکوتی ہی ہو، اس کے بعد ''مسلک دارالعلوم'' نامی رسالہ کے مصنف کے الفاظ میں اس کا تعارف سنئے۔ علمی حیثیت سے یہ ولی اللہی جماعت، مسلکاً اہل سنت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب وسنت اجماع وقیاس پر قائم ہے۔ (ایک دوسری جگہ مصنف نے خود ہی اس کی ایسی بلیغ تشریح کی ہے کہ پڑھ کر بے ساختہ جزاک اللہ نکلا، فرماتے ہیں کہ پہلی دو حجتیں تشریعی ہیں، جن سے شریعت بنتی ہے اور آخری دو حجتیں تفریقی ہیں جن سے شریعت کھلتی ہے۔ اس کے نزدیک تمام مسائل میں اولین درجہ نقل و روایت کو اور آراءِ سلف کو حاصل ہے...... اس کے یہاں کتاب وسنت کی مرادات محض قوت مطالعہ سے نہیں بلکہ اقوال سلف اوران کی متوارث مذاق کی حدود میں رہ کر، نیز اساتذہ اور شیوخ کی صحبت و ملازمت اور تعلیم وتربیت ہی سے متعین ہوسکتی ہے۔ اسی کے ساتھ بطریق اہل سلوک جو رسمیات رواجی طریقوں اور نمائشی حال وقال سے مبرا اور بری ہے۔ تزکیہ نفس اور اصلاح باطن بھی اس مسلک میں ضروری ہے۔

مزید فرماتے ہیں:

''دارالعلوم نے اپنے جامع مسلک میں حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، کلام، تصوف، (یا احسانی صفت جس کا اصطلاحی نام تصوف ہے) حقیقت اور معرفت یعنی جملہ و دینی علوم اور مقامات کے مختلف الالوان پھولوں کا ایک گلدستہ ایسے جامع انداز میں پیش کیا کہ تمام مسلکی طبقات کے ایک نقطہ پر جمع ہونے کی صورت پیدا ہوگئی۔ (۱)

دارالعلوم کے دستور اساسی میں (ص ۶ پر دارالعلوم کے مسلک ومشرب کی مختصر تشریح اس طرح کی گئی ہے: دارالعلوم دیوبند کا مسلک اہل سنت والجماعت حنفی مذہب اور اس کے مقدس بانیوں (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ قدس سرہما) کے مشرب کے موافق ہوگا۔ (۲)

مشرب

اس سے پہلے اور بھی اوپر کی سطروں میں دستور کے حوالے سے دارالعلوم کے مسلک کے ساتھ مشرب کا لفظ بھی آیا ہے۔ یہاں اس کی بھی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

مشرب سے مراد جیسا کہ دستور کی عبارت میں گذرا ان دونوں (حضرت نانوتویؒ وحضرت گنگوہیؒ) کا خاص زاہدانہ، متوکلانہ، متصوفانہ یعنی احسانی رنگ ہے جسے صاحب ''مسلک دارالعلوم'' نے دوسری جگہ ''مشرباً صوفی'' سے تعبیر کیا ہے، ایک موقع پر اس کی تفصیل یہ کی ہے، سلاسل علمیہ اور سلاسل فقہیہ کے ساتھ سلاسل صوفیہ (احسانی نسبت) کو بھی جمع کر دیا ہے۔ایک کے مرجع الامر شاہ ولی اللہؒ تھے اور دوسرے کے حضرت جھنجھانوی خلیفۂ مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہیدؒ) کے خلیفۂ اعظم حاجی امداد اللہ تھے (جس کی وجہ سے) سند حدیث کے ساتھ سند خلافت باطنی نقشبندیت کی لائن سے مجددی (یعنی پیروئ سنت اور سید احمد شہیدؒ کے (جذبۂ) اعلاء کلمۃ اللہ کی روح بھی راسخ رہی، اس (مشرب میں) ہر (دینی) فتنہ کی مدافعت بھی داخل ہے، خواہ وہ (فتنہ) نقل و روایت کی راہ سے آیا ہو بے لگام عقلیت (نیچریت) کی راہ سے (اس فتنہ نے) خواہ شرک و بدعت کا روپ دھارا ہو یا الحاد و بے دینی اور آزاد خیالی کا، (ان سب باتوں کے ساتھ دارالعلوم کا مشن) تمام مسلک حقہ (بالخصوص ہندوستان کے) واہل مسالک کو باہم جوڑنا ہے۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ ''دیوبندیت'' کوئی نیا مذہب یا فرقہ نہیں ہے بلکہ وہ مسلک اہل سنت والجماعت کا ایک مرقع ہے، چنانچہ شاعرِ مشرق ڈاکٹر سید محمد اقبال مرحوم (کہ جن کی دینی حمیت اور وسعت نظر نیز محبت رسولؐ معلوم ومعروف ہے) سے جب کسی شخص نے اس بارے میں سوال کیا تو فرمایا ''دیوبندیت'' نہ مذہب ہے نہ فرقہ بلکہ ہر معقول دیندار کا نام دیوبندی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یا یوں کہہ لیجئے کہ حقیقی دیوبندی کی پہچان مولانا طیب صاحبؒ ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ آدمی میں علمی وقار، استغنا، فروتنی...... ایثار و زہد (صفات جمع ہوتی ہیں) لیکن کبر و نخوت (نہیں ہوتی) اور نہ ذلت (کہ عزت نفس پامال کرلیں) جہاں یہ علم واخلاص کی بلندیوں پر پہنچ کر عوام سے بلند ہو جاتے ہیں وہیں تواضع کی وجہ عوام میں ملے بھی رہتے ہیں، مجاہدہ وہ مراقبہ کی وجہ سے خلوت پسند ہونے کے ساتھ مجاہدانہ و غازیانہ نیز قومی خدمات کے جذبے سے شرشار بھی ہوتے ہیں۔ (ان کے نزدیک) محدث ہونے کے معنی فقیہ سے لڑنا یا فقیہ ہونے کے معنی محدث بیزار ہونے، یا صوفی ہونے کا مطلب متکلم دشمنی یا علم کلام میں مہارت کا تقاضا تصوف بیزار نہیں ہے بنا بریں (دینی شعبہ کے تمام اربابِ فضل وکمال (کیا محدثین متکلمین، کیا فقہا و صوفیہ، کیا اصولیین و منطقیین اور کیا امراء وخلفاء) ان کے یہاں سب واجب الاحترام ہیں لیکن ان تمام شعبوں میں سب سے زیادہ اہمیت اس جماعت کے نزدیک تعلیم علم نبوت کو حاصل ہے۔ (۳)

دارالعلوم کے مسلک و مشرب کی قابل لحاظ حد تک تفصلات بیان میں آجانے کے بعد مناسب ہوگا کہ

ادارہ کے مقدس بانی نے اس کے چلانے کے غرض سے جو اصول مقرر فرمائے اور تحریر کر دیئے تھے ان کا بھی مختصراً تذکرہ آ جائے اس کو یہاں منہج کا نام دیا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے مقرر کردہ ان اصول ہشت گانہ سے اب شاید ہی کوئی وابستگانِ دارالعلوم میں سے ناواقف ہوگا جو موصوف نے بطور اصول موضوعۃً یا دستور العمل کے مقرر فرمائے تھے۔ غالباً اسی لئے زبانی اظہار و بیان پر اکتفا نہیں کیا گیا تھا بلکہ تحریری شکل میں منضبط فرما کر گویا انہیں رجسٹرڈ کر دیا تھا، عبارت کا طرز صاف بتا رہا تھا کہ ان کے اصول کے اندر دارالعلوم کے چلانے کا دائمی طریقۂ کار بیان کیا گیا ہے، ورنہ ان سے انحراف ہونے کی شکل میں، زوال کی پیشین گوئی نہ ہوتی (حالیہ واقعات نے تو عملی طور پر ان کی دائمی بلکہ الہامی ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا) یہاں ان تمام اصولوں کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی اس لئے بس چند کے بیان کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ جن چند اصولوں کے ملحوظ نہ رکھنے پر اس میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے وہ پوری ہوتی صاف نظر آ رہی ہے اس قبیل کا ایک اصول یہ ہے۔

مشیرانِ مدرسہ (نا کہ حاکمانہ مدرسہ) کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی کو اپنی بات کو اونچی نہ کی جائے خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد ہل جائے گی۔

غور کیا جائے کیا حالیہ فتنے میں رونما ہونے والے افسوسناک بلکہ شرمناک واقعات کی ایک اہم بڑی وجہ یہی نہیں ہوگی کہ بعض مشیرانِ مدرسہ (نا کہ حاکمانہ) نے اپنی بات کو اونچی کی اور اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہوا؟

ان اصول ہشت گانہ میں ایک یہ ہے۔

یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خود ہوں اور دوسروں کے درپے نہ ہوں، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی پھر مدرسہ کی خیر نہیں۔ کیا یہ مقام حیرت بلکہ عبرت نہیں، کیا حالیہ ہنگامے کے دوران بعض مدرسین خود بینی اور خودسری کی آخری حد تک پہنچ کر کیا دوسروں بلکہ خود مہتمم تک کے درپے آزار نہیں ہو گئے تھے؟ تو پھر ایسی صورت میں کیا مدرسہ کی خیر کی امید جا سکتی ہے؟

ہم یہاں ان اصولوں میں سے صرف ایک کے پیش کرنے کی اور اجازت چاہیں گے جو یہ ہے۔

اس مدرسے میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقین نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ

اسی طرح چلتا رہے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف درجہ، جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہوجائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا۔

جیسا کہ اوپر مسلک دارالعلوم کے بیان کے دوران گزرا ان اصول ہشت گانہ سمیت، مسلک دارالعلوم کی پیروی اور حفاظت دستورِ اساسی کی رو سے تمام ارکان متعلقین دارلعلوم پر فرض قرار دی گئی تو کیا یہ واقعۃً ارکانِ دارالعلوم اور اس کے متعلقین نے یہ فرض ادا کیا؟ سب کو بالخصوص 'ارکان' کو (کہ انہوں نے سب سے زیادہ دستور کا ذکر کیا ہے) اپنا بھی محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ خود ان پر ہے۔ (فکر دارالعلوم کا بیان ہوجانے کے بعد آیئے) دیکھیں اس ذاتِ گرامی نے دستور مسلک اور دارالعلوم (مع اصول ثمانیہ) کی رعایت وحفاظت کس درجہ کی؟ کہ جس پر دستور کی خلاف ورزی کا بہت زوردار آواز میں الزام لگایا گیا؟

مرحوم کی فکر دارالعلوم کی اشاعت وحفاظت میں حصہ کے جائزے سے پہلے یہ بھی ضروری معلوم ہو رہا ہے کہ دیکھا جائے کہ خود موصوف اس فکر سے کتنے ہم آہنگ تھے اور کس درجہ اس کے مثالی نمونہ بننے کے لائق؟ کہ اس کے بغیر سچ پوچھئے تو نہ ترجمانی کا حق حاصل ہوتا ہے اور نہ بے عملی کی بات میں تاثیر ہوئی اور نہ ہوسکتی ہے، کیوں کہ **لم تقولون مالا تفعلون کبر مقتا عنداللہ**.....الخ کا تقاضا ہے کہ ایسی صورت میں خداوند تعالیٰ کی رضا کے بجائے شدید ناراضگی حصے میں آئے تو پھر کامیابی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے؟

اس فکر کے پہلے جزو (مسلک) میں سب سے اہم مقام (اس لئے سب سے زیادہ توجہ کا مستحق بھی) علوم نبوت کا اور ان کی تعلیم وتعلم کا بتایا گیا ہے چنانچہ اس بارے میں موافق ومخالف سب ہی متفق ہیں کہ مرحوم کا علمی مقام بہت بلند تھا، واقعہ یہ ہے کہ علم کے بعض شعبوں میں ملک کے خواہ دوسرے علماء امتیاز رکھتے ہوں لیکن مجموعی طور پر، مطالعہ کے تنوع وسعت وعمق میں موصوف کا پایہ اگر سب سے بلند نہیں تو کم از کم یہ بہت بلند تھا اور مشکل علمی مضامین بالخصوص نصوص متعارفہ اور سلف اقوال مختلفہ میں تطبیق دے کر اور ان کی مراد متعین کر کے واضح عام فہم ودلنشیں اور شیریں انداز سے بیان کرنے کے کمال میں اب کوئی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بعد ان کا ثانی نہ تھا۔

موصوف کے تبحر اور علمی وسعت کی چھاپ عوام ہی نہیں علماء تک پر کس درجہ کی تھی؟ اس کا اندازہ کرنے کے لئے شاید یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آج نہیں بلکہ پچیس تیس سال قبل بھی جب کہ آج کل

جیسا قحط الرجال بھی نہ تھا اہل علم تک یہ کہتے سنے گئے کہ ہندوستان کے سارے علماء کا مجموعی علم ایک طرف اور تنہا مولانا محمد طیب صاحبؒ کا علم ایک طرف! ظاہر ہے کہ کم سے کم اس وقت یہ قول مبالغہ سے خالی نہ تھا لیکن اس سے بہر حال اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ اہل علم کے نزدیک ممدوح علمی طور پر ممتاز ترین علماء کی صف میں شامل سمجھے جاتے تھے۔

موصوف کے ذوقِ علمی کے تمام دوسرے مذاقوں پر غالب ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ دارالعلوم کے اہتمام جیسے اعلیٰ اعزاز واکرام بلکہ ایک درجے میں راحت واحترام کے منصب پر فائز ہوتے اور تعلیمی شعبے سے منتقل ہونے کے لئے موصوف طبعاً تیار نہ تھے مگر اس فکر کے ایک ہی تقاضہ اکابر کے حکم کی تعمیل اور ان کا احترام سے بادلِ ناخواستہ، مہتمم بننا گوارہ کیا۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ تقریباً دس بارہ سال قبل مجلس شوریٰ کے بہت سے ممتاز اور بااثر ارکان نے حضرت مہتمم صاحبؒ سے ان کے خلف الرشید کو نائب مہتمم بنانے کے لئے جب اجازت چاہی تو موصوف نے اجازت دینے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ خاندانِ قاسمی کا امتیاز علم ہے، نظم نہیں، یہ واقعہ حالیہ حادثات کے موجب کے طور پر جس واقعے کو بہت نمایاں کیا جاتا ہے اس پر روشنی ڈالنے کے لئے بھی اہل نظر کے واسطے کافی ہے۔ اگر واقعۃً موصوف نے حالیہ زمانے میں ایسی خواہش کا اظہار کیا تھا تو وہ کسی اور جذبے سے نہیں بلکہ دارالعلوم ہی کی خیر خواہی کے تقاضے سے کیا ہوگا (کہ ان کی مثال اس بارے میں خود رہنمائی کرتی ہے اور پھر یہ کہ موصوف کی پوری زندگی دارالعلوم کی سچی خیر خواہی کے جذبات پر شاہد ذی عدل ہے، مگر ان پر الزام لگانے والوں کی زندگی کا تو شاید بہت محدود عرصے ہی میں اس کی شہادت پیش کرنا بہت مشکل ہوگا)۔

موصوف کے علمی مقام پر سب سے بڑھ کر شہادات، وہ بیانات بھی ہیں جو ان کی حادثۂ وفات پر زبانی یا تحریری، تمام قابلِ ذکر علماء اور دوسرے طبقات کے آئے، ان میں موافق ومخالف سب ہی نے دوسری خوبیوں کے ساتھ علمی بلندی کا بھی اعتراف واظہار کیا ہے۔

اس سے بھی زیادہ قوی تر دلیل حضرت حکیم الاسلامؒ کے ذوقِ علمی کی یہ کہ اہتمام کے متنوع اور تھکا دینے والے بے پناہ مشاغل نیز دیگر میدانوں میں سرگرم عمل رہنے کے باوجود، ساری عمر موصوف نے علم و مطالعہ سے اپنا رشتہ قائم رکھا، اسی تعلق کا یہ اثر تھا کہ فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمدؒ جیسے جلیل القدر محدث کی وفات کے بعد اور اس کے علاوہ بھی دیگر مواقع پر دارالعلوم جیسی ممتاز درسگاہ میں صحیح بخاری

جیسی ادق واعلیٰ کتاب کا دورۂ حدیث جیسی اہم جماعت کے طلباء کو جس میں ایک خاصی تعداد ماہر اساتذہ تک کی شامل ہوا کرتی تھی اور پھر بعض طلبہ بھی ایسے جید الاستعداد، کثیر المطالعہ اور وسیع النظر ہوتے تھے کہ ہندوستان کے بہت سے مدارس کے اعلیٰ مدرسین ' شیخ الحدیث ' کی سند سنبھالنے والے بھی ان کی برابری بمشکل کر سکتے تھے) نہایت کامیابی کے ساتھ درس دیا۔

فکر دارالعلوم کے علمی تقاضوں کے علاوہ دیگر اوصاف و تقاضے مثلاً نصاب فی الدین، دینی حمیت، اسلاف کی عظمت، فرق باطلہ کا حکیمانہ رد تحمل، حقیقی تصوف (تزکیہ و احسان) مناسبت، تواضع، استغناء وغیرہ، اوصاف تو موصوف میں اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ ان کا کٹر سے کٹر دشمن بھی انکار کرنے کی جرأت، آخرۃً جواب دہی کا خطرہ مول لئے بغیر نہیں کر سکتا تھا، اس وجہ سے ان کے مذکورہ اوصاف میں کچھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں، البتہ صرف تین (تواضع، تصوف اور فرق باطلہ کا حکیمانہ) کے بارے میں اتنا کہے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہو رہا ہے کہ کم سے کم ادھر تیس چالیس سال کے اندر ان کے جیسے پایہ کے کسی شخص کے یہاں، ان کی جیسی تواضع کا تجربہ و مشاہدہ، کسی کو مشکل ہی سے نصیب ہوا ہوگا وہ اپنے چھوٹوں کے چھوٹوں سے بھی اس طرح پیش آتے تھے کہ برابر والے بھی کم ہی پیش آتے ہیں۔ غرض یہ کہ ان کی جیسی کم سے کم راقم السطور کو تو اور کہیں تواضع نظر نہیں آئی (حالاں کہ سینکڑوں چھوٹے بڑے علماء سے ملنا جلنا ہوا ہے)۔

اسی طبعی تواضع کا یہ اثر تھا کہ ان کے ایک معاصر نے جو عمر میں بھی ان سے کم ہے جب ان سے معافی طلب کی تو ان کی متواضعانہ طبیعت پر سخت بار ہوا اور اس کا اظہار ایسے الفاظ میں کیا جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں، حضرت حکیم الاسلامؒ نے انہیں جواب دیا، آں محترم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میں نے اپنے چھوٹوں کو بھی خطاوار نہیں سمجھا کہ ان کی زبانی پر معافی کی بات آئے۔

تزکیہ و احسان کی صفت میں امتیاز کی سند کے لئے یہی کافی ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ اپنی جماعت اور اپنے وقت کے سب سے اہم متقی عالم حضرت شیخ الہندؒ کے دست گرفتہ اور اپنے اثر کے سب سے بڑے مصلح اور بے مثال مربی اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلفیۂ مجاز تھے۔

فرق باطلہ کی حکیمانہ تردید میں مرحوم کے حکیمانہ اسلوب کی شہادت کے لئے برصغیر کے مشہور صحافی اور مبصر ماہر القادری صاحب مرحوم کا وہ تبصرہ کافی ہے جس میں ماہر صاحب نے اپنے پشتینی مسلک کٹر بریلویت سے ہٹ کر حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ہی کی تقریر دل پذیر کے اثر سے صحیح العقیدہ بن جانے کی تفصیل اور دیگر بہت سی مفید باتیں اپنے شہرۂ آفاق ماہنامہ '' فاران '' کراچی میں تحریر فرمائی تھی (جو بعد میں کتابی

شکل میں بھی شائع اور مقبول ہوا) اس وصف کی سب سے نمایاں مثال اور جیتی جاگتی تصویر بمبئی شہر ہے کہ جہاں حضرتؒ کے حکیمانہ خطابات ہی کے ذریعہ ابتداءً فضا بدلی اس کے بعد ہی اہل حق کو وہاں پاؤں ٹکانے بلکہ اپنی بات کہنے اور باطمینان سنانے کے لئے زمین مل سکی یہی وجہ ہے کہ اہل حق میں جہاں تک اندازہ ہے سب سے زیادہ باشعور لوگ ان ہی کے دست گرفتہ پائے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی آں محترمؒ نے ''فکر دارالعلوم'' کی اشاعت وحفاظت کے لئے کیا کیا قدم اٹھائے، آئندہ سطروں میں ان میں سے کچھ کا ذکر کیا جارہا ہے، سب کا ذکر تو کسی مقالے کا نہیں کتاب کا موضوع ہے اوپر کی سطروں سے نیز دوسرے واقعات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ یہ فکر موصوف کے جسم وروح میں اس طرح پیوست ہوکر رچ بس گئی تھی کہ ان کی ذات ہی ''مجسم فکر قاسمی'' اور ''سراپا دارالعلوم بن گئی تھی، ان کی وفات پر متعدد اہل علم اور اصحاب فکر ودانش نے جو یہ لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی ذات کو دارالعلوم میں اس طرح گم کردیا تھا کہ ایک کا تصور دوسرے کے بغیر ممکن نہ رہا تھا (مفہوم) اس میں نہ غلط بیانی ہے نہ مبالغہ بلکہ حقیقت کی صحیح صحیح ترجمانی ہے کیوں کہ وہ جس جگہ گئے اور دنیا کا کون سا اہم حصہ ہے جہاں وہ نہیں گئے؟ کیا امریکہ ویورپ کیا افریقہ وایشیاء کیا عرب وعجم جہاں وہ گئے فکر دارالعلوم کے ساتھ پہنچے، بلکہ ان کی تنہا ذات گرامی کی بدولت مدرسہ دیوبند مدرسہ سے (دارالعلوم) پھر عظیم جامعہ بنا اور شہروں سے لے کر قصبات ودیہات تک دارالعلوم کی صدا ان کی ہم آواز بن کر اس طرح پہنچی کہ وہاں کے حساس دلوں کی دھڑکن اور ان کی اپنی آواز بن گئی اور ان کی آواز کی طرح ذات بھی دارالعلوم میں اس طور پر سما گئی تھی کہ ان کی ذاتی شہرت اور ان کا اپنا نفع ونقصان، دارالعلوم کا نفع ونقصان بن گیا تھا، اسی لئے ان کے لئے (مہتمم صاحبؒ) کا لفظ وصف نہیں ان کا ذاتی نام بن گیا اور ایسا ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں، بلکہ اس کے خلاف ہوتا تو حیرت ہوتی کیوں کہ موصوف کی تو آنکھیں ہی اس فکر کے آغوش میں کھلیں اور اسی فکر کے اعلیٰ ترین نمونوں اور مثالی پیکروں کے سائے میں وہ پروان چڑھے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ حکیم الاسلامؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے وہ حکیمانہ الفاظ، مہتمم صاحبؒ کی ذات میں جسم و قالب بن کر نظر آنے لگتے ہیں جو شاہ صاحب نے مشہور حدیث رسول (ﷺ) **الائمه من قریش** کی تشریح کرتے ہوئے زیبِ قرطاس کئے ہیں۔ فرمایا ہے:

ان یجعل الخلفاء من بعدہٖ اهل بلدہٖ و عشیرتہٖ الّذین نشوء واعلی تلک العادات السنن و لیس التکحل کاالکحل و یکون الحمیة الدینیة فیهم مقرونة بالحمیة النسبیة

و یکون غلوّ امرھم و نباھۃ شانھم علواً لامر صاحب الملۃ. (۴)

جانشینوں کو ان ہی کے خاندان اور انہیں کے شہر کا ہونا چاہئے کیوں کہ اسی ماحول میں چلنے اور بڑھنے کی وجہ سے ان لوگوں کے اندر (مطلوبہ) عادات اور طریقے رگ وریشے میں سرایت کر جاتے ہیں (اس کے بعد بہت بلیغ وتمثیل کے ذریعے فرق واضح کر دیتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ) جس کی آنکھ قدرتی اور پیدائشی طور پر سرمگیں ہو اس کا وہ شخص مقابلہ کہاں کرسکتا ہے کہ جس نے صرف سرمہ لگا لیا ہو اور یہ بات بھی ہے کہ (اسی خاندان کے جانشین کی) حمیت دینی اور حمیت نسبی دونوں ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور (اسی لئے) اس کی ذاتی بڑائی بھی دین کی بڑائی سے مربوط ہو جاتی ہے۔

اشارۂ نبویؐ اور اسی سے پیدا شدہ حکمت ولی اللہی کا ہی غالباً یہ پرتو تھا کہ دارالعلوم کی فکر کے حقیقی نمونہ اور اس کے سچے خیر خواہ اور اکابرؒ نے اصرار کے ساتھ حکیم الاسلامؒ مولانا محمد طیب صاحبؒ کو منصب اہتمام پر فائز کیا تھا چنانچہ جو تجویز بابت تقرری منظور ہوئی اس میں یہ بھی صراحت تھی کہ مولانا موصوف نوجوان، صالح، صاحب علم اور اعلیٰ خاندان اور دارالعلوم کے ساتھ آبائی نسلاً بعد نسل سچی ودلی ہمدردی رکھتے ہیں۔ (۵)

یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا بھی شاید بے محل نہ ہوگا کہ تحویلِ قبلہ کی حالیہ مہم کے دوران جن لوگوں نے اپنے ذاتی غور وفکر کے نتیجے میں تبدیلی کو ضروری سمجھا اور اسی لئے اپنا پورا زورِ سنانِ قلم یا لسانِ ذہن استعمال کر کے صرف کیا ان میں یا تو متکحل تھے یا ایسے تھے جنہیں اس کحل سے مناسبت ہی نہ تھی یا ان کے نزدیک اس سے زیادہ دوسرے مصالح عزیز تھے اور بعض تو ایسے بھی تھے جو اس سے آشنا ہی نہ تھے بلکہ بے گانہ تھے۔ اس لئے اس پر بھی تعجب نہ ہونا چاہئے کہ اس شورش کے درمیان (حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے دادا) حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ کے بانیؒ دارالعلوم ہونے کی حیثیت کو چیلنج کیا گیا بلکہ ان کی مقدس ذات (نیز ان کے بلند مرتبہ صاحبزادہ، مولانا محمد احمد صاحبؒ) پر تنقیص کی حد تک پہنچنے والی تنقیدوں میں بھی ذرا تامل یا باک نہیں ہوا، مزید برآں بانیٔ دارالعلوم کے مقرر کردہ اصول ہشت گانہ کو آج کے دور کے لئے نہ صرف ناکافی بتایا گیا بلکہ ان کا مذاق تک اڑایا گیا۔ (فالی اللہ المشتکیٰ)

یہاں مہتمم صاحبؒ کے فکر دارالعلوم کی حفاظت کے لئے اہتمام کا پتہ دینے والے ایک خاص واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہو رہا ہے لیکن واقعہ سننے سے پہلے اصول ہشت گانہ میں سے وہ اصول ذہن میں تازہ کر لیجئے جس کے اندر کارخانۂ تجارت جیسی مستقل آمدنی کی سبیل، امداد غیبی موقوف ہونے کا سبب قرار دیتے ہوئے اس سے منع کیا گیا ہے۔

اجلاس صد سالہ کے موقع پر دارالعلوم کی ہمہ گیر خدمات (اور مہتمم صاحبؒ کے ذریعے ہونے والے عمومی طور پر اس کے تعارف اور) خداداد مقبولیت کی وجہ سے، سارے عالم بالخصوص، ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے آ کر جمع ہونے والے انسانوں کا سمندر کہ جس کی نظیر میدانِ عرفات کے علاوہ اور کہیں نہیں دیکھی جاتی بلکہ نہیں دیکھی جاسکتی، جب دیوبند میں ٹھاٹھیں مارنے لگا تو قدرتی بات تھی کہ دارالعلوم کے چندہ میں غیر معمولی رقم جمع ہوئی، اس جمع شدہ رقم کے بارے میں ''بعض اہل الرائے'' نے تجویز کیا کہ اسے یونٹ ٹرسٹ میں جمع کر دیا جائے (جس کو وہ سمجھتے تھے کہ تجارتی ادارہ ہے اور وہاں جمع شدہ رقم پر تجارتی نفع بھی ملتا ہے جو سود کے شائبہ سے پاک ہوتا ہے) فرمایا دارالعلوم کا موضوع تجارت نہیں، تعلیم ہے، اس لئے بھی وہاں رقم جمع کرنا مناسب نہیں، یہ واقعہ نقل کرتے ہوئے راوی آبدیدہ سے ہو کر کہنے لگے کہ بھلا ان نزاکتوں کو کون ملحوظ رکھے گا؟ (اس واقعہ کے راوی بھی وہی ثقہ قاسمی فاضل ہیں جن کے حوالے سے اوپر بھی ایک واقعہ گذر چکا ہے) یہ واقعہ جو ہر طرح دارالعلوم اور اس کے مسلک کے محافظ مہتمم کے شایانِ شان تھا لیکن اس کے کرم فرماؤں کی نظر میں کیا بن گیا؟ اسے جاننے کے لئے دل پر جبر کر کے یہ چند سطریں آپ بھی پڑھ لیجئے، اس وقت بھی بعض ارکان کو یہ اندیشہ تھا کہ مہتمم صاحبؒ کے بعض متعلقین اس تجویز کو اپنے غلط ارادوں کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر چلنے نہیں دیں گے اور مہتمم صاحبؒ کو اس کے لئے استعمال کریں گے۔ افسوس یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا اور نہ صرف یہ کہ اس تجویز کی تکمیل نہیں کی گئی بلکہ اس کی عدم تعمیل کو مقدس شرعی لباس پہنایا گیا۔

اس موقعہ پر امام شافعیؒ کا یہ مشہور شعر نقل کرنا بھی شاید بے محل نہ ہوگا۔ ع

عين الرضا عين كل عيب كليلة
كما ان عين السخط بدى المساريا

اہل نظر کے لئے تنہا یہ مثال آئندہ دارالعلوم کا 'رخ اور قبلہ' دریافت کرنے کے لئے کافی ہے۔

اس لئے یہ سوال قدرتی ہے کہ مہتمم صاحبؒ کے بعد دارالعلوم کی ظاہری شان وشوکت باقی رہنے بلکہ بڑھ جانے کے باوجود کیا اس کی معنویت بھی اس درجہ قائم رہ سکے گی؟ یہ بات اللہ عالم الغیب کے علاوہ اور کون جانتا یا جان سکتا ہے؟

یہی وہ سوال ہے کہ جو خیر خواہوں کو فکر مند بنائے رکھتا ہے اگرچہ کارسازِ حقیقی نے جس طرح اس کے بانیوں اور اولین معماروں کے اخلاص کی برکت سے اب تک نازک تر مواقع پر اس کی حفاظت فرمائی ہے اسی کے فضل وکرم سے امید ہے کہ آئندہ بھی حفاظت فرمائے گا مگر ڈر اس بات سے لگتا ہے کہ

حالیہ فتنہ کے درمیان دوسری کوتاہیوں کے علاوہ خداوند تعالیٰ کی ایک بہت عظیم نعمت کی بڑی ناقدری ہوئی اور کفرانِ نعمت ہوا ہے۔

اوپر دارالعلوم کے مسلک ومشرب کے تذکرہ میں ذکر آیا کہ اس کے مقاصد میں ہر دنی فتنے کی مدافعت بھی شامل ہے، اس بارے میں مہتمم صاحبؒ کے بس ایک روشن بلکہ عالم آشکارا، کارنامے کا تذکرہ کافی ہوگا، ہندوستان میں جب مسلمانوں کے عائلی قوانین (نکاح، طلاق، میراث وغیرہ) جنہیں مسلم پرسنل لاء کہا جاتا ہے، کے خلاف کچھ نام نہاد مسلمانوں اور روشن خیال سیاست دانوں کی طرف سے، حکومت کی ایماء پر زبردست مہم چلائی گئی اور اس کا پورا خطرہ پیدا ہوا کہ شریعت اسلامیہ کے جن چند قوانین پر عمل کرانے کا مسلمانوں کو ہندوستانی دستور کی رو سے 'حق باقی رہ گیا ہے بس وہ بھی اب چھینا جانے والا ہے اور پارلیمنٹری جمہوریت جو دراصل اکثریت کا نام ہے کی لاٹھی سے اس کے کچلنے کی تیاریاں آخری مراحل پر ہیں تو سب سے پہلے اس دارالعلوم کو کہ جس کے قیام اور وجود کا اصل باعث ہی دین وشریعت کی حفاظت و بقاء ہے، اس کے سربراہ حضرت محمد طیب صاحبؒ بے چین ہوگئے اور پھر بہت سی حکیمانہ تدابیر اختیار کیں جس کا ثمرہ بالآخر تمام ہندی مسلمانوں کے واحد متفقہ پلیٹ فارم ''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کی شکل میں برآمد ہوا اور ایسے مختلف افکار ونظریات رکھنے والے افراد پر مشتمل بورڈ کی صدارت کے لئے موصوف سے زیادہ موزوں تر اور کوئی شخصیت پورے ہندوستان میں نہ مل سکی، چنانچہ وہی از روز اول تا آخر حیات اس کے صدر رہے۔

(مرحوم کی اس خصوصیت کا خاص طور پر ذکر، ان کی وفات پر دیئے جانے والے بیان میں ہندوستان کے ایک عظیم مفکر نے کیا ہے)

آخر میں مرحوم کا وہ آخری مطبوعہ خط پیش کیا جارہا ہے، جس کے حرف حرف سے، سوزِ دروں دارالعلوم اور اس کے مسلک و جماعت کی حفاظت کے لئے بے قراری اور اس کی زبوں حالی پر دل فگاری ٹپک رہی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ خط روشنائی سے نہیں خونِ جگر سے لکھا گیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ اللہ کی امانت ہے، آج کے لادینی دور میں دین کے ہر شعبہ میں امت کی رہنمائی اور عوام امت کی خدمت اس کا نصب العین رہا ہے، آج اس کا کیا حال ہے؟ اور ہم اللہ کے سامنے مسئول ہیں۔ یہ ہے وہ غم سوز جس سے میرا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے...... نہ اپنی ذات کا غم ہے نہ اپنے عزیزوں کا غم بلکہ غم دارالعلوم کا ہے۔ وہ جماعت جو ایک سو سولہ برس تک اوروں کے لئے ہدایت، تقویٰ اور توحید کی علامت تھی بکھر کر رہ گئی ہے، یہی میری بیماری ہے، اس عالم بیچارگی اور بیماری

میں آپ کا مکتوبِ گرامی ملا۔ (واضح رہے کہ اس خط کے مخاطب ایک ایسے بزرگ ہیں جن کے اختلافات موصوف سے اس وقت آخری نکتہ تک پہنچ کر اذیت ناک بن گئے تھے) جسے میں اپنے لئے اور دارالعلوم کے لئے روحانی صحت مندی کی علامت سمجھتا ہوں، معاملہ ہم میں سے کسی ذات کا نہیں بلکہ ہمارے اسلاف کی یادگار دارالعلوم کا ہے، ہم سب اپنی خطاؤں کی معافی اللہ سے مانگیں اور کچھ مانگیں تو دعا مانگیں۔ ہم سب کو توفیق نصیب ہو اور آخرت کی جواب دہی سے نجات ملے، زندگی کی آخری آرزو اور آخری دعا یہ ہے کہ دارالعلوم کا پہلا رنگ جس میں روحانیت تھی، خلوص تھا اور سب ایک تھے اور فیصلے ایک رائے سے ہوتے تھے پھر بحال ہو جائے۔

آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ

---

(۱) سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص: ۲۸، ج ۱

(۲) ایضاً، ص: ج ۱، ص: ۴۳۱

(۳) ایضاً، ص: ج ۱، ص: ۴۲۵

(۴) حضرت شاہ ولی اللہؒ، حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص: ۱۱۹

(۵) سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج ۱، ص: ۲۷۹

آہ! حضرت حکیم الاسلامؒ

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ
دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ کھٹک، پاکستان

دارالعلوم دیو بند کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیّب صاحبؒ پچھلے دنوں دیو بند میں انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ ایک پاک باز اور با کردار انسان تھے۔ اپنے جدامجد حضرت مولانا قاسم نانوتوی صاحبؒ کے علوم (جب کہ ان کی ہر کتاب علم ومعرفت کی ایک بحرِ ذخار ہے۔ اوران کی تصنیفات جو علم الکلام، علم الحدیث پر لکھی گئی ہیں کو سمجھ لینا بھی کوئی آسان بات نہیں ہے۔) کے ترجمان تھے۔

الولد سر لابیہ کا مظہر تھے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ اکابرین دیو بند کے علوم بالخصوص علومِ قاسمیہؒ۔ علوم شیخ الہند اور علوم تھانویؒ کا ایک عظیم خزانہ جامع ماہر اور شارح تھے۔ تحریر وتقریر میں ان کو زبردست ملکہ حاصل تھا۔ اورسب سے نئی چیز یہ ہے کہ دارالعلوم دیو بند کو جو خدا تعالیٰ نے علمی لحاظ سے طلباء کے لحاظ سے اساتذہ اور علماء کے لحاظ سے، اقتصادیات اور تعمیرات کے لحاظ سے، غرض اور ہر لحاظ سے جو خوبیاں عطا فرمائی ہیں اور ترقیات سے نوازا ہے۔ یہ سب کچھ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے دورِ اہتمام اوران کے زیر نگرانی انجام کو پہنچا ہے۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے زمانہ میں حضرت علامہ مولانا انورشاہ کشمیریؒ دارالعلوم دیو بند کے صدر مدرس رہ چکے ہیں پھر ان کے بعد مولانا سید حسین احمد مدنیؒ۔ حضرت حکیم الاسلامؒ ہی کے زمانۂ اہتمام میں تدریس کرتے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم دیو بند نے اس زمانہ میں جو عروج اور ترقی حاصل کی ہے۔ یہ تاج اوراس کا سہرا حضرت حکیم الاسلامؒ صاحب مرحوم کی مساعیِ جمیلہ کے سر ہے۔ اور یہ ان ہی کے مخلصانہ شبانہ روز مساعی کا ثمرہ ہے۔

بہر تقدیر حضرت حکیم الاسلامؒ ایک پاکیزہ شخصیت جامع العلوم اور بہترین کمالات سے متصف تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے خاندان میں اور ان کے نائبین کے خاندان میں حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مرحوم والے تمام اوصاف وکمالات پیدا فرما دیئے اور اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے اس خلا کو پورا فرما دے۔ آمین

آج شہر شہر، بستی بستی، قریہ قریہ جو آپ کو یہ دینی علوم کے مدارس ومراکز نظر آتے ہیں، اور ہر گاؤں اور ہر بستی میں جو آپ کو دارالعلوم دیوبند کا فاضل، اکابر اساتذہ کا تلمیذ یا تلمیذ التلمیذ آپ کو نظر آتا ہے یہ سب دارالعلوم دیوبند کا فیض اور حضرت حکیم الاسلامؒ کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ اور یہ سب دارالعلوم کی برکات ہیں۔ ایشیا بھر میں پھیلے ہوئے مدارس ان کے اساتذہ منتظمین کا تعلق بغیر واسطہ یا بالواسطہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو دیگر اساتذہ دیوبند کی طرح دارالعلوم حقانیہ سے حد سے زیادہ شفقت اور حد سے زیادہ محبت تھی جب بھی پاکستان تشریف لاتے تو دارالعلوم حقانیہ ضرور تشریف لاتے۔ جب ہم سالانہ جلسہ دستار بندی کرتے تب بھی حضرت تشریف لاتے ایک مرتبہ اس سامنے والی گیلری (دارالحدیث) کے سامنے برآمدے کے اوپر بالا خانہ میں قیام فرمایا، اور غالباً ایسے ہی ایک موقعہ پر جب آپ نے دارالعلوم حقانیہ اور اس کے مختلف شعبوں اور طلباء کی قیام گاہوں کے مختلف احاطوں کا معائنہ کیا تو فرمایا:

''مجھے دارالعلوم حقانیہ، دارالعلوم دیوبند سے جدا نظر نہیں آتا۔ بلکہ دارالعلوم حقانیہ نے دارالعلوم دیوبند کو اپنے ضمن میں لے رکھا ہے سارے پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کے نمونے اور نقش قدم پر دارالعلوم حقانیہ گامزن ہے۔ اور یہ دیوبند ثانی بن چکا ہے''۔

اور ایک مرتبہ تو یہاں تک فرمایا کہ میں دارالعلوم حقانیہ آ کر یوں محسوس کرتا ہوں جیسے دارالعلوم دیوبند آ گیا ہوں اور گویا اپنے گھر میں موجود ہوں''۔

یہ تاثرات دارالعلوم کی کتاب الآراء میں بھی قلم بند فرمائے ہیں۔ بہر حال یہاں آ کر حد درجہ خوشی اور محبت کا اظہار فرماتے اور جو نئے مسائل پیش آتے اس میں بھی دارالعلوم حقانیہ کی رائے کو شامل فرما لیتے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ حضرت کو دارالعلوم حقانیہ اور خاص کر مجھ ناچیز پر حد درجہ شفقت تھی۔ دارالعلوم دیوبند میں میں نے جو زندگی کے لمحات گزارے ہیں خاص کر تدریس کا زمانہ جو تقریباً ساڑھے چار سال ہے اور اس زمانہ میں ہر فن میں تقریباً کوئی ایسی کتاب نہ ہوگی جو میں نے نہ پڑھائی ہو۔ دیگر اساتذہ کی شفقت ومحبت کے باوجود چوں کہ اختیارات مہتمم صاحب کے ہوتے ہیں تو حضرت مہتمم صاحبؒ ہر معاملہ میں ترجیحی سلوک میرے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔ اسباق اور تدریس کا مسئلہ بھی یوں تھا۔ کہ جب بعض اساتذہ حج کو

تشریف لے جاتے یا کسی اور اعذار سے اسباق نہیں پڑھا سکتے تو ان کے اسباق اور کتابیں جو زیادہ تر فقہ ،حدیث، فلسفہ، منطق ،معانی اور تفسیر کی ہوتی تھیں کی تدریس کی ذمہ داری بھی مجھے سونپ دی جاتی اور فرماتے کہ یہ نوجوان ہے اور کام اچھا چلا سکتا ہے اور یہ محض ان کا حسن ظن تھا۔

اور ایک موقعہ پر فرمایا کہ: ''دارالعلوم حقانیہ دارالعلوم دیوبند کی بیٹی ہے۔''

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ دارالعلوم حقانیہ کو بہت ترجیح دیتے تھے۔ اور اس کے ذکر پر فخر فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ خدا تعالیٰ کا اپنا فضل وکرم ہے کہ تمام اکابر واساتذہ دارالعلوم دیوبند کو دارالعلوم حقانیہ سے ایک خاص محبت تھی اور سب فرماتے کہ یہ ہمارا اپنا دارالعلوم ہے حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا سب سے بڑا کارنامہ دارالعلوم کو ترقی وعروج کے بلند معیار پر پہنچا دینا ہے کہ آج تمام دنیا کے لیے دیوبند مشعلِ راہ ہے۔ تکثیر علماء، تکثیر طلباء، تدوین کتب اور تعمیرات ہر لحاظ سے دارالعلوم دیوبند ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ جس کی خدمات مسلّم اور شہرہ کالشّمس فی نصف النہار ہے۔ آج ہم ان کے سایہ شفقت سے محروم ہوگئے ہیں۔ یہ تمام اہل علم کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔

میں کیا عرض کروں حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی وفات سے ہمارے قلوب کو بہت صدمہ پہنچا۔ ہم ایک بڑے مشفق، ایک مہربان، ایک بڑے تجربہ کار، بڑے عالم اور خاص کر دارالعلوم دیوبند اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے علوم کے حامل سے محروم ہوگئے۔ قیامت کی علامات سے من جملہ ایک علامت یہ بھی ہے کہ ''یرفع العلم'' جیسا کہ امام بخاریؒ نے اس جانب اشارہ فرمایا ہے کہ جب علم ناپید ہو جائے اور لوگ علوم دینیہ سے محروم ہو جائیں تو دین ختم ہو جائیگا۔ دین ہم کو علم ہی بتاتا ہے ہم جو یہاں مدارس میں جمع ہوتے ہیں۔ ہمارا مقصد علم حاصل کرنا ہے کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور اللہ تعالیٰ کے دین کے احکام ومسائل سیکھ لیں۔ جب مسائل معلوم ہو جائیں تو اولاً ان پر خود عمل کریں پھر ان کی حفاظت واشاعت کی کوشش کریں اسی تبلیغ واشاعت کے نتیجہ میں ان شاء اللہ عالم آباد رہے گا اور اگر یہ کام چھوڑ دیا جائے تو عالم برباد ہو جائے گا۔ ہمارے اکابر اور اساتذہ اور علماء عمر طبعی کو پہنچ کر وفات پاگئے **کل من علیها فان.** مگر الحمد اللہ کہ دین کے پودے لگاتے رہے اگر یہ سلسلہ جاری نہ رہتا تو دین کا باغ برباد ہو جاتا۔

اللہ تعالیٰ حضرت حکیم الاسلامؒ اور جمیع اکابر اساتذہ دارالعلوم دیوبند کے درجات بلند فرمادے۔ آمین۔

............❖............

دار العلوم دیو بند کا آخری چراغ گل ہو گیا

مولانا سمیع الحق صاحب
اکوڑہ خٹک، پاکستان

داغ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی   اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

دار العلوم دیو بند کی محفل دوشیں کا وہ چراغِ سحر جو پچھلے دو سال سے حوادث وانقلاباتِ زمانہ کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر بھی ٹمٹما رہا تھا بالآخر شوال ۱۴۰۳ھ کے پہلے ہفتے میں ہمیشہ کے لیے خموش ہو گیا یعنی حکیم الاسلامؒ مظہرِ انوارِ قاسمیہ، مسند نشین جامعہ دیو بند، ترجمانِ حقائق اسلامیہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دیو بندی مکتبِ فکر کے اس میر مجلس کے بساط لپیٹ دینے سے محفلیں اجڑ گئی ہیں اور ہر سو وحشت اور ویرانگی کا سا عالم ہے اب اس دور کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہے جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیو بندیؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامۃ العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا یادگار تھا۔ ان کی ذات ان اکابر کی نہ صرف بقیۃ السلف نشانی تھی بلکہ ان کی ذات میں ان تمام اکابر واساطین دیو بند کی نسبتیں، جمع تھیں۔ اور وہ زندگی بھر اپنی ذاتی حسبی اور نسبی گونا گوں خصائل وکمالات کی وجہ سے ان تمام اکابر کے محبوب بن چکے تھے۔

بلاشبہ ان کی ذاتِ محبوبیت میں تماشا گاہِ عالم تھی۔ وہ اس گلشن علم ومعرفت کے مالی اور شجرۂ طوبیٰ کے امین تھے۔ جس کے لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین ہموار کی۔ جس کی داغ بیل حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور فقیہ الاسلام مولانا رشید احمد گنگوہی نے ڈالی اور جس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیو بندیؒ۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ علامۃ العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے عمائدین امت نے اپنی زندگی تج دی۔

یہ امانت جب آپ کے ہاتھوں آئی تو پون صدی کے طویل اور صبر آزما شبانہ روز جدوجہد، خداداد اہلیت وصلاحیت اخلاص ودیانت اور والہانہ جہد وعمل کے ساتھ آپؒ نے اس مدرسہ علم کو ایک ایسے جامعہ میں تبدیل کر دیا جس کے انوار وتجلیات سے ایک عالم جگمگا اٹھا۔ اور وہ اس امانت سے الگ ہو کر جب دنیا سے رخصت ہوئے تو دیوبند کا وہ سرچشمہ علوم نبوت کا ایک بحر ذخار بن کر علم ودانش کی پوری دنیا سے اپنی برتری اور فضیلت کا لوہا منوا چکا تھا۔

آپؒ حضرت بانیِ دارالعلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے اور فخر الاسلام مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس کے صاحب زادے تھے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے خصوصی تلمیذ حضرت شیخ الہند سے بیعت اور حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ پورے طبقہ کے محبوب ومنظورِ نظر اور مرکز علمی کی سیادت کے لحاظ سے پوری جماعت کے سید الطائفہ تھے۔ علمی فیض کے علاوہ بیعت وارشاد کے میدان میں بھی لاکھوں مسترشدین کے روحانی رہبر ورہنما تھے۔

۱۳۳۷ھ میں درسِ نظامی سے فراغت پائی اور دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ ۱۳۴۳ھ سے ۱۳۴۸ھ تک دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم رہے ۱۳۴۸ھ سے لے کر آخر وقت تک اس مرکز علم وہدایت کی سیادت آپ کو حاصل رہی۔ نیرنگی زمانہ یا چرخ نیلگوں کی ستم ظریفی کہیے کہ زندگی بھر علم وحکمت کے جس ''تاج محل'' (دارالعلوم دیوبند) کی آرائش وتزئین میں مصروف رہے۔ جب وہ بنائے عظیم جشن صد سالہ کی شکل میں عظمت وترقی کے اوجِ کمال کو چھونے لگی تو اس عمارت کا یہ ''شاہجہاں'' جدائی اور ہجوری کے داغ لیے ہوئے دنیائے رنگ وبو سے الگ ہو گیا جو کچھ پیش آیا گو اس کے محرکات ان کے عہد اہتمام کی طرح دیرینہ اور قدیم تھے اور مشیتِ ایزدی کے سامنے کس کی چلتی ہے۔ مگر پھر بھی بے اختیار جی میں آتا ہے کہ کاش یہ صورتِ حال دو ایک سال مزید پیش نہ آتی۔ اور دارالعلوم دیوبند کا یہ جرنیل ان ہی عظمتوں اور رفعتوں کے ساتھ اور ان ہی قدر شناسیوں کے ساتھ ہم سے رخصت ہوا ہوتا۔ جو زندگی بھر ہم سب نے انہی کے لیے مخصوص کر رکھی تھیں۔ اور جس کے وہ سزاوار تھے کہ سالارِ کارواں کی شوکت وسطوت پوری جماعت اور قافلہ کی شان بڑھاتی ہے۔ **ولکن ماشاء اللہ کان ومالم یشا لم یکن۔**

حکیم الاسلامؒ نسبی اور روحانی رشتوں کے ساتھ ساتھ علم وحکمت کے لحاظ سے اپنی ذات سے بھی ایک انجمن تھے۔ ان کے علوم وتصانیف اور خطبات، حکمت ولی اللٰہی اور معرفت نانوتویؒ کے ابلتے ہوئے سرچشمے ہوتے تھے۔ اسرار دین کی تشریح اور شریعت کی ترجمانی میں ان کا شمار گنے چنے حکماء اسلام میں ہو سکتا ہے۔ ان

کی ہر تقریر حقائق و معارف کا ایک سمندر اور ہر تحریر اسرار و نکات کی ایک دنیا اپنے اندر لئے ہوئے تھی۔ ان کے خطبات سے نہ صرف برصغیر کا گوشہ گوشہ بلکہ عالم اسلام کے علاوہ افریقہ اور یورپ کی دور دراز بستیاں بھی مستفید ہوئیں۔ دین اور مادر علمی دیوبند کی آواز پہنچانے میں زندگی کا اکثر حصہ طویل اسفار کی نذر رہا۔

اسلام کے اہم اور عصر حاضر کے جدید مسائل پر ایک سو سے زائد تصانیف چھوڑیں۔ حدیث و تفسیر اور فن حقائق و اسرار کی کتابیں اکثر زیر درس بھی رہتیں۔ دعوت و بیان کا انداز حکیمانہ تصنیف و تالیف کی شان فلسفیانہ ہونے کے باوجود شعر و سخن میں بھی اعلیٰ ذوق اور ثقہ انداز رکھتے تھے۔ ان کی مثنویاں، قصائد اور فصیح و بلیغ نظمیں۔ اعلیٰ ترین ذوق سخن کی غمازی کرتی ہیں۔

الغرض وہ اپنے جامع الصفات اکابر و اسلاف کے کمالات و محاسن، نجابت و سعادت، شرافت و وجاہت، فضل و کمال، اخلاق و شرافت، وقار و تمکنت، فکر و اصابت، تواضع و متانت کا ایک پیکر جمیل اور دیوبند کی اعلیٰ روایات کا ایک مرقع اور ظاہری لطافت و نظافت اور حسن و پاکیزگی کا ایک مجسمہ تھے۔ ان کا ماتم ان سب صفات کا ماتم ہے۔ پوری قوم اور پوری ملت کا ماتم ہے۔ دنیائے علم و فضل کا ماتم ہے۔ درسگاہوں جامعات اور خانقاہوں کا ماتم ہے اور دارالعلوم حقانیہ کے لیے بھی اس لحاظ سے ایک عظیم ماتم ہے کہ دارالعلوم اور اس کے بانیِ مدظلہ کے ساتھ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے علائق و روابط اور خصوصی عنایات و توجہات کی داستان تقریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ ع

کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہے داستان میری

الوداع اے فخر دین و ملت۔ الوداع اے خادم حصنِ اسلام۔ الوداع اے شارح علوم قاسمیہ الوداع اے امین گلشن نبویہ ﷺ الوداع اے میر کارواں، الوداع تیری تربت پہ ہزاروں رحمتیں ہوں اور تو رب کریم کے بے پناہ لطف و کرم سے مالا مال ہو۔

نذرِ اشک بے قرار از من پذیر　　　گریہ بے اختیار از من پذیر

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ اور دفاع عن الدین

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب
جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا

کسی بھی مذہب کی ترجمانی کے لئے دو باتیں ضروری ہیں: اول یہ کہ وہ جن افکار ونظریات کا داعی ہو، ان کو دلائل سے ثابت کیا جائے اور ان کی معقولیت، قانونِ فطرت سے ہم آہنگی اور افادیت کو نمایاں کیا جائے، دوسرے جو نظریات اس کے مغائر اور اس سے متضاد ہوں، ان کے غلط ہونے اور عقل ونقل کے موافق نہ ہونے کو بھی دلائل سے واضح کیا جائے، اسی لئے قرآن مجید میں جہاں عقیدۂ توحید کو کائناتی شواہد سے ثابت کیا گیا ہے، وہیں شرک کے رد پر بھی دلیلیں پیش کی گئی ہیں، جیسے آخرت کے ثبوت کے لئے خدا کی بے پناہ قدرت وطاقت کے حوالے سے استدلال کیا گیا ہے، وہیں انکار آخرت کی تردید بھی کی گئی ہے، کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا نے انسان جیسی عظیم مخلوق کو بے کار اور عبث پیدا کیا ہو، جہاں رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور قرآن مجید کی اعجازی شان کو واضح کیا گیا ہے، وہیں جو لوگ آپ کی نبوت ورسالت کا انکار کرتے تھے، ان کی تردید بھی کی گئی ہے، کہ مالک کو اپنی ملکیت میں تصرف کا پورا پورا حق ہوتا ہے، اس لئے اللہ جسے چاہے اپنی رسالت سے نواز سکتا ہے، **اللہ یعلم حیث یجعل رسالتہ**.

اسی لئے ہر عہد میں امت کے اکابر علماء اور اصحابِ نظر نے دونوں پہلوؤں پر توجہ دی ہے، انہوں نے ایک طرف اسلامی تعلیمات کو پیش فرمایا، ان کی مصلحتوں اور حکمتوں پر روشنی ڈالی اور احکام وشریعت کے اسرار ورموز سے پردہ اٹھایا، دوسری طرف اسلام کے خلاف ہونے والی یورشوں کا مقابلہ کیا اور مخالف اسلام نظریات وافکار پر مدلل رد فرمایا، پھر اسلام کے خلاف جو فتنے اٹھتے رہے ہیں، وہ دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو غیر مسلموں کی طرف سے پیش آئے اور دوسرے ان لوگوں کی طرف سے جن کے افکار امت کے سوادِ اعظم

یعنی اہل سنت والجماعت کے نظریات سے متصادم تھے، تاہم ان کا شمار مسلمانوں میں کیا گیا ہے جیسے معتزلہ، خوارج، روافض کے بعض گروہ، ان دونوں طرح کے مخالفین کا مقابلہ علماء حق کرتے رہے ہیں، البتہ بعض حضرات کی زیادہ توجہ داخلی اختلافات کی طرف رہی تا کہ امت کو صحیح فکر وعمل پر قائم رکھا جائے اور اس میں کوئی انحراف نہ آنے پائے اور بعض حضرات کی زیادہ توجہ بیرونی فتنوں پر رہی کیوں کہ بیرونی فتنوں کا مقابلہ درحقیقت دین حق اور اسلام کا دفاع ہے اور امت کو ارتداد وضلال سے بچانا ہے۔

ہندوستان میں جن شخصیتوں نے اس دوسرے محاذ پر کام کیا ہے، ان میں نمایاں مقام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ہے، شاہ صاحبؒ نے یوں تو روافض اور اہل بدعت پر بھی رد کیا ہے اور تقلید کے مسئلہ میں افراط وتفریط پر بھی قلم اٹھایا ہے، لیکن ان کی اصل کاوش بیرونی حملوں سے مدافعت کی رہی ہے، شاہ صاحبؒ نے محسوس کیا کہ اب جو دور آرہا ہے وہ عقلیت پرستی کا دور ہوگا، اس میں شریعت کے ہر حکم کو عقل کی ترازو میں تولنے اور حکمت ومصلحت کی کسوٹی پر کسنے کی کوشش کی جائے گی، اسی پس منظر میں انہوں نے 'حجۃ اللہ البالغہ' جیسی شہرہ آفاق کتاب تالیف فرمائی اور اس میں عقائد وعبادات سے لے کر معاشرت ومعاملات، معاشی نظام اور جرم وسزا وغیرہ تک، احکام شرعی کے باہمی ارتباط، عقل وحکمت سے ان کی ہم آہنگی، انسانی فطرت اور ضرورت سے ان کی مطابقت اور ان کے مادی وروحانی فوائد پر تفصیل سے روشنی ڈالی، اس طرح مغرب کی طرف سے اسلام پر جو یلغار ہونے والی تھی گویا قبل از وقت اس کے مقابلہ کے لئے ہتھیار تیار کئے گئے، شاہ صاحبؒ کے بعد جس شخصیت نے اس کام کو آگے بڑھایا، ان میں بہت ہی نمایاں ترین نام حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کا ہے، انہوں نے آریہ سماجی اور عیسائی فتنے کے مقابلہ پر خصوصی توجہ دی اور اپنی زیادہ تر کاوشیں مسلمانوں کو ان فتنوں سے بچانے میں صرف کیں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور حضرت نانوتویؒ کا ایک مشترکہ مزاج یہ بھی رہا ہے کہ انہوں نے اہل سنت والجماعت کے فروعی اختلاف میں نسبتاً کا پہلو اختیار کیا اور اسلام کی مدافعت اور اس کی فکری تائید وتقویت کو اصل موضوع بنایا۔

پھر ماضی قریب میں جو شخصیت ولی اللہی افکار اور قاسمی علوم کی امین اور شارح وترجمان رہی ہے، ان میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا نام نامی سرفہرست ہے، وہ واقعی اقبال کے اس شعر کے مصداق تھے۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
بزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

یوں تو حلقۂ دیوبند کے سربراہ اور شارح وترجمان ہونے کی حیثیت سے انہوں نے داخلی فتنوں پر بھی قلم اٹھایا ہے اور جن گروہوں کی فکر میں ایک درجہ انحراف پایا جاتا تھا ان پر بھی نصح کے ساتھ رد فرمایا ہے، چنانچہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی فکر کے بارے میں کلیدی کتاب وہ ہے جو آپ نے دیوبند کے مزاج و مذاق اور اس مسلک ومشرب کے اعتدال اور میانہ روی کی نسبت سے لکھی ہے اور واقعہ ہے کہ اس موضوع پر قلم اٹھانا آپؒ ہی کا حق تھا، کیوں کہ فکر دیوبند آپ کی روح میں اس طرح رچ اور بس گئی تھی جیسے گلاب میں اس کی رنگت اور موتیا میں اس کی خوشبو، اس لئے کوئی شبہ نہیں کہ آپؒ فکر قاسمی کے سب سے بڑے نقیب وترجمان تھے اور زندگی بھر اس ترجمانی کا حق ادا کرتے رہے۔ لیکن آپؒ کی زیادہ توجہ اپنے ان دونوں بزرگوں کے مزاج کے مطابق بیرونی فتنوں کی طرف رہی، آپؒ نے فتنہ قادیانیت کی رد میں بھی کوششیں فرمائی ہیں اور خود پنجاب میں اس موضوع پر مؤثر خطابات فرمائے ہیں، جب مسلم پرسنل لاء کے خلاف حکومت ہند نے بال و پر نکالنے شروع کئے اور مغرب زدہ مسلمانوں نے بھی شریعت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، تو آپؒ نے اس کا بھرپور مقابلہ کیا، اس لئے آپ کی زیادہ تر تالیفات دعوت واصلاح اور اسلام کی حقانیت کے ثابت کرنے سے متعلق ہیں، دین حق کو عقل واستدلال کی قوت کے ساتھ سمجھانا اور مسلمانوں کو بصیرت وشعور پر مبنی ایمان سے ہم کنار کرنا آپ کی فکر ونظر اور جہد وعمل کا خاص ہدف تھا، حضرت حکیم الاسلامؒ کے فکر ومزاج اور علمی و دعوتی مذاق پر اس تحریر سے روشنی پڑتی ہے جو آپؒ نے حضرت نانوتویؒ کے علوم کی تسہیل کے لئے ''مجلس معارف القرآن'' کی تاسیس کے پس منظر میں لکھی ہے، اس تحریر کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

دین عقیدہ وعمل کے مجموعہ کا نام ہے، عقیدہ سے عمل کا وجود ہوتا ہے اور عمل سے عقیدہ کا رسوخ ہوتا ہے جیسے درخت کے بیج سے شاخوں اور برگ و بار کا وجود ہوتا ہے اور پھر شاخیں جوں جوں پھیلتی اور بڑھتی ہیں جڑ کا رسوخ اور اندرونی پھیلاؤ بڑھتا جاتا ہے، مجموعۂ عقائد کا نام ایمان ہے اور مجموعۂ عمل کا نام اسلام اور ان دونوں کے مجموعہ کا نام دین ہے، ایمان تخم کی طرح دل کی گہرائیوں میں مخفی رہتا ہے، جسے عقل وبصیرت کی آنکھ دیکھتی ہے اور اسلام برگ و بار کی طرح فضا میں پھیلا ہوا ہوتا ہے جو سر کی آنکھ سے نظر آتا ہے۔ حدیث نبوی ﷺ میں اس حقیقت کو اس طرح واشگاف فرمایا گیا ہے کہ

الایمان سر والاسلام علانیة

ایمان (دل میں) چھپی ہوئی چیز ہے اور اسلام (ہاتھ پیر پر) کھلی ہوئی چیز ہے۔

ایمانی عقائد اعمال کے رد وقبول کا بھی معیار ہیں کہ ان کے بغیر بڑے سے بڑا عمل بھی رد، نا قابل

قبول اور اکارت ہے اور یہی کسی مذہب کے حق و باطل کے پہچاننے کا بھی معیار ہیں، کیوں کہ اساسی عقائد ہر مذہب میں گنے چنے چند ہی ہوتے ہیں، لمبا چوڑا قصہ نہیں ہوتا جس کی تحقیق دشوار ہو؛ اس لئے کسی دین کے سمجھنے یا قبول کرنے کا مختصر راستہ اس کے عقائد ہی کا دیکھنا ہے کہ وہ مخالف عقل تو نہیں ہیں، نیز صاحب شریعت تک ان کی سند بھی متصل ہے یا نہیں؟ اس لئے کم سے کم یہ ناگزیر اور ضروری ہے کہ عقائد اور ایمان میں ایک ماننے والے کو بصیرت حاصل ہو اور وہ دین اور شریعت پر خواہ اصول کا حصہ ہو یا کلیات کا، سمجھ بوجھ کر جھکے اور ان پر دلائل اور حقیقت شناسی کے ساتھ جمے، اگر عقائد کا معاملہ محض سنے سنائے پر مبنی ہو، خود اپنی تحقیق یا سمجھ بوجھ کو اس میں دخل نہ ہو تو اسے صورتِ ایمان تو کہا جا سکتا ہے لیکن حقیقت ایمان باور نہیں کیا جا سکتا، اسی بناء پر محقق علماء میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہوا ہے کہ ایمان تقلیدی جس میں حجت و برہان اور بصیرت کا دخل نہ ہو بلکہ محض باپ دادا سے سنی سنائی ایک نقل ہو معتبر بھی ہے یا نہیں؟ ایک جماعت ادھر گئی ہے کہ ایمان تقلیدی معتبر بھی نہیں جب تک کہ وہ دلائل و براہین سے تحقیقی نہ بن جائے۔

اسی بناء پر قرآنِ حکیم نے دین و ایمان کے بارے میں تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، جس کی جیتی جاگتی تصویر حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا وجودِ باجود اور ان کا مثالی ایمان ہے جو صاحب شریعت کے سامنے حاضر رہ کر بھی اپنے ایمان کو تحقیقی بنا کر ہی دل میں جگہ دیئے ہوئے تھے، قرآنِ حکیم نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا:

اَدْعُوْا اِلَی اللّٰهِ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ.

بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے اور اللہ پاک ہے اور میں نہیں شریک بنانے والوں میں۔

پھر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اولیت کے ساتھ اور ان کے مابعد کے لوگوں کے بارے میں تبعیت کے ساتھ ارشاد فرمایا گیا:

وَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا.

اور وہ لوگ کہ جب ان کو سمجھایئے ان کے رب کی باتیں، نہ پڑیں ان پر بہرے اندھے ہو کر۔

اس کلامِ خداوندی سے ظاہر ہے کہ ایمان خواہ اجمالی ہو یا تفصیلی، اس کی بنیاد بصیرت و تحقیق پر ہوتی ہے گو اس کے درجات حسب استعداد اور مختلف ہوں جس کا ثمرہ فراستِ ایمانی ہے جو ہر مؤمن کا طغرائے امتیاز ہوتی ہے۔ اسی لئے حدیث نبوی ﷺ میں ارشاد فرمایا گیا:

اتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ.

مؤمن کی فراست سے ڈرتے رہو کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

جس سے صاف واضح ہے کہ ایمان دار میں بقدر ایمان بصیرت وفراست اور نور حق کا وجود لازمی طور پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس حقیقت کا ثمرہ بصیرت ہو وہ بے بصیرت حقیقت نہیں ہوسکتی؛ کہ بے بصیرتی سے بصیرت پیدا نہیں ہوسکتی، جس کا حاصل وہی ایمان تحقیقی ہے نہ کہ سنا سنایا ایمان، اسی لئے اس دین میں عقل وبصیر کی عظمت وفضیلت بیان فرما کر گویا اس کی دعوت دی گئی ہے اور اسی لئے قرآن حکیم نے جگہ جگہ آیاتِ الٰہی میں غور وفکر اور تدبر وتذکر اور حجت طلبی کی طرف بلایا ہے جو دوسرے عنوان سے اسی بصیرت و یقین کے پیدا کئے جانے کا امر ہے، اسی ایمانی حقیقت کو جو عقل وبصیرت اور تحقیقی حجت لئے ہو، آیات و روایات میں کہیں حلاوت ایمان سے، کہیں بشاشت ایمان سے، کہیں طعم ایمان سے، کہیں تفقہ فی الدین سے اور کہیں فہم سلیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں خاص طور پر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ آپؒ کا لب ولہجہ جرح وتنقید کے موقع پر بھی نہایت نرم اور فریق مخالف کے احترام پر مبنی ہوتا ہے، مثلاً آپؒ کی کتاب 'اسلام کا اخلاقی نظام' ایک عیسائی پادری کے اعتراضات کے رد میں ہے، انہوں نے اسلام پر چار اعتراضات کئے ہیں اور اس ضمن میں خاص کر پیغمبر اسلام ﷺ کے سلسلہ میں نہایت ہی دل آزار لب ولہجہ اختیار کیا ہے، حضرت حکیم الاسلامؒ نے ان اعتراضات کا تفصیلی وتحقیقی جوابات دیئے ہیں۔ لیکن اپنے اسلوب اور طرز تخاطب میں ہمیشہ اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ مخالف کی گفتگو کا مواد کچھ بھی ہو لیکن ہم رحمۃ للعالمین ﷺ کی امت ہیں؛ اس لئے ہم فریق مخالف کے معیار پر اتر کر گفتگو نہیں کر سکتے

چنانچہ آپؒ اپنے جوابی مکتوب کے شروع میں تمہیدی گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''گرامی نامہ سے آپؒ کے ذوق تحقیق کے ساتھ انکساریٔ طبع کی روش سے خوشی ہوئی، اختلاف دین کے باوجود اگر طبائع میں یہ جوہر ہو تو غیر مذہب کے انسانوں میں خیر خواہی اور موعظت ونصیحت کا جذبہ قائم رہ سکتا ہے، جو نیک راہ سامنے آجانے اور حق بینی کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے، البتہ آپؒ کی تحریر میں الزام و اعتراض کے موقعوں پر جگہ جگہ متانت وسنجیدگی کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ گیا ہے، حتی کہ بعض جگہ استہزاء وتمسخر اور تحقیر وتوہین کا رنگ بھی آ گیا ہے، اگر جواب میں بھی رد والزام کے موقعوں پر کہیں ایسا رنگ نظر آئے تو اسے اپنی ہی تحریر کا آوردہ اور رد عمل سمجھا جائے پھر بھی انشاءاللہ مقتداؤں کی توہین یا استہزاء کا کوئی ایک کلمہ بھی

اس تحریر میں آپ کو نہیں ملے گا اور اگر کہیں ایسا بھی ہوگا تو وہ آپ ہی کے دعووں پر بطور فرض والزام کے ہوگا۔

اس کتاب میں عیسائی پادری نے اسلام کے خلاف چار سوالات اٹھائے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ اسلام کے پاس اخلاقی تعلیمات ہیں ہی نہیں، دوسرے رسول اللہ ﷺ کے حضرت زینبؓ سے نکاح کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے، تیسرے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو پیش کیا گیا ہے کہ جس نے "لا اللہ الا اللہ" کہا وہ جنت میں داخل ہوگا، گو وہ چوری اور زنا کا مرتکب ہو، چوتھے ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بائبل کا قرآن پر تفوق ظاہر کرتے ہوئے بائبل کے بعض احکام کا ذکر کیا ہے، جیسے چوری مت کر، زنا مت کر، خون مت کر آپؒ نے ان سوالات کے شافی و کافی جوابات دیئے ہیں، سب سے پہلے آپ نے اخلاق و افعال کے فرق پر روشنی ڈالی ہے، آپؒ نے لکھا ہے کہ اخلاق دراصل قلب کے اندر پیدا ہونے والے مادے صبر وشکر، سخاوت وشجاعت، مروت و عجز، حیا اور غنا وغیرہ سے عبارت ہیں، افعال ان کے آثار ہیں گویا اخلاق جڑ ہیں اور اعمال صالحہ ان سے پھوٹنے والی شاخیں ہیں، اس پس منظر میں آپؒ نے بتایا ہے کہ قرآن نے اعمال صالحہ کی تشریح کے ساتھ ساتھ اخلاقی صلاحیتوں کے پروان چڑھانے کی کوشش بھی کی ہے۔

پھر آپؒ نے اسلام کے نظام اخلاق کی وسعت کو بتانے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسمائے حسنیٰ کو قرآن وحدیث سے نقل کیا ہے اور ان کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہی اسمائے حسنیٰ اخلاق کی بنیاد ہیں کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **تخلقوا باخلاق اللّٰہ**، چنانچہ فرماتے ہیں:

یہی حق تعالیٰ کے وہ اصول اخلاق، رحم وکرم، حلم وصبر، عفو ودرگذر، بڑائی وعظمت قدرت وقوت، محبت، عدل وانصاف، علیمی وخبیری، وسعت واحاطہ، یکتائی، غنا، نورانیت، ہدایت، بزرگی، حفظ ونگہبانی، نفع وضرر رسانی کی طاقت انعام وانتقام، سلب وعطا، ثبات واستقلال، مصدریت کمالات، تقدس وپاکی، حکومت و ملوکیت، لطافت وستھرائی، علوشان، اعزاز وتذلیل، وغیرہ ہیں، جن کی اصولی تعداد ننانوے تک پہنچتی ہے، جنہیں حدیث نے "اسماء الٰہیہ" کے نام سے تعبیر کیا ہے اور قرآن نے "اسماء حسنیٰ" کے لقب سے یاد کیا ہے، یہی وہ پاکیزہ اخلاق خداوندی ہیں جنہیں حاصل کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے امت کو امر فرمایا کہ:

تخلقوا باخلاق اللہ.

اور انہی اخلاق الٰہیہ سے مخلوق کی اخلاقی تکمیل کے لئے نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے، چنانچہ خود ہی حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بعثت لاتم مکارم الاخلاق.

میں بھیجا گیا ہوں اس لئے کہ پاکیزہ اخلاق کو حد کمال تک پہنچا دوں۔

پھر آپؒ نے لے پالک کے بارے میں شرعی حکم، حضرت زینبؓ سے آپ ﷺ کے نکاح کی مصلحت اور اس سے متعلق بعض روایتوں کی توضیح وتشریح نمبر وار دس فقروں میں بیان فرمائی ہے، جو بہت ہی اہم اور چشم کشا ہے اور اس میں بہت سے اہم نکات واضح کئے گئے ہیں، اس سلسلہ میں آپ نے ایک اصولی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے جو آپ ہی کے الفاظ میں اس طرح ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم کے ہاتھ میں مستند دین نہ رہے اور تحریف شدہ کتاب پر دین کا دار و مدار رہ جائے جس کی سند ہو نہ روایت ہو اور جس میں وقتاً فوقتاً خواہشات قوم اور حسب ضرورت زمانہ ترمیم و تنسیخ بھی عمل میں آتی رہی ہو، تو اس قوم میں دینی مذاق اور خدا اور اس کے پیغمبروں کے معاملات کو صحیح صحیح سمجھنے اور حدود کو قائم رکھنے اور ادب واحترام کا ذوق کہاں سے آئے؟(۱)

اس جواب کے ذیل میں آپؒ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ''وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاهُ''کی بھی بڑی عمدہ توضیح فرمائی ہے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ والی حدیث کا جواب دیتے ہوئے آپؒ نے فرمایا ہے:

حدیث ابوذر رضی اللہ عنہ جواز معصیت کے لئے نہیں آئی، بلکہ ایمان کی خاصیت بتانے کے لئے آئی ہے کہ وہ سبب نجات ہے اور اس میں معصیت حارج نہیں ہوسکتی، خواہ نجات کو مؤخر ہونا پڑے اور عذاب بھگت کر آدمی کو نجات ملے مگر ملے ضرور۔(۲)

اسی ذیل میں آپؒ نے عیسائیوں کا عقیدۂ کفار اور عملی زندگی میں اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی خدا ناترسی کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ چوتھا اعتراض کہ ''اسلام نے زور زبردستی سے مسلمان بنانے اور کفار کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے۔'' کے جواب میں آپ نے آیت قتال کے پس منظر کو واضح فرمایا ہے، نیز مسلمانوں کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح لوگوں نے رضا کارانہ خواہش ومرضی سے اسلام قبول کیا ہے۔(۳)

آپؒ کی تالیفات میں ایک اہم کتاب ''مقالات طیب'' ہے جو چار مقالات پر مشتمل ہے، اس میں پہلا مقالہ جو چھیالیس صفحہ پر مشتمل ہے، ''اسلام عالمی مذہب ہے'' کے عنوان پر ہے، یہ مقالہ عصری افکار کے پس منظر میں اسلام کے تعارف پر نہایت اہم ہے، جس میں تین دعوؤں پر بحث کی گئی ہے۔

- اسلام عالمی دین ہے۔
- اسلام دائمی دین ہے۔

۞ اسلام تنہا مدار دین ہے۔

اس میں آپ نے بہت ہی مدلل انداز میں اسلام کی آفاقیت اور عالمگیریت کو ثابت کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام میں سارے فیصلے اصولوں کی بنیاد پر ہوتے ہیں، نہ کہ قوم پرستی کی بنیاد پر، کیوں کہ قومیت خواہ رنگ ونسل کی بنیاد پر ہو یا علاقہ وطن کی اساس پر، وہ انسانوں کو تقسیم کرتی ہے، آپ نے اس میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ کوئی بات محض قومیت یا آبائیت کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہوسکتی، بلکہ اس پر عقلی یا نقلی دلیل ضروری ہے، آپ نے اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ اسلام بنیادی طور پر مساوات کا قائل ہے، چنانچہ اس نے تحصیل علم میں کوئی امتیاز رکھا نہ عبادت میں اونچ نیچ، نہ قانون میں تفریق اور نہ حقوق میں جانب داری، یہاں تک کہ

اس کے یہاں قانون کی نگاہ میں مسلم اور ذمی بھی برابر ہیں، جس میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا۔(۴)

اس مقالہ میں یہودیت ونصرانیت اور اسلام کے مزاج کو سمجھاتے ہوئے تفصیل سے دونوں کے نظریاتی فرق پر روشنی ڈالی گئی ہے، اسی ذیل میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

جس کا حاصل یہ نکلا کہ ایک یہودی یہودی نہیں بن سکتا ہے جب تک کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کا انکار نہ کرے، ایک نصرانی نصرانی نہیں بن سکتا جب کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار نہ کرے، ایک ہندو، ہندو نہیں ہوسکتا جب کہ وہ غیر ہندی پیغمبر کا انکار نہ کرے، یعنی تفریق اقوام کو اعتقاداً وعملاً قبول نہ کرلے، لیکن ایک مسلم، مسلم نہیں بن سکتا جب تک کہ ان کے سارے پیغمبر کا اقرار کر کے ان کی تصدیق نہ کرے، نام بنام مذکور ہوں تو نام بنام اجمالی طور پر بلا ذکر نام مذکور ہوں تو اجمالی اور کلی تصدیق نہ کرے، چنانچہ اسلام نے پیغمبروں کو کبھی نہیں جھٹلایا، اس کے نزدیک پیغمبر کبھی غلط گوئی نہیں کرسکتے۔(۵)

آپؒ نے اسلام کی 'رحمت عامہ' کے ذیل میں اسلام کے نظامِ عدل پر بھی بڑی بصیرت افروز گفتگو کی ہے، پھر اس کے ضمن میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ نجات کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے اور غیر مسلم کوئی بھی، کتنا بھی اچھا کام کرے دوزخ میں ہی داخل ہوگا، تو ایسا کیوں ہے؟ اور کیا یہ تعصب نہیں ہے؟

آپ نے اسلام کے اصول مساوات اور مغرب کے تصور مساوات پر بھی روشنی ڈالی ہے، آپؒ نے ایک اصولی اور بنیادی حقیقت پر توجہ دلائی ہے کہ ''تقسیم عمل اور تقسیم وظائف میں فرق استعداد وقابلیت کے لحاظ سے ہوسکتا ہے، مساوات کا تعلق حقیقتاً انسان کے اختیاری افعال سے ہے، غیر اختیاری امور سے نہیں'' (۶)

نیز آپ نے تاریخی حقائق اور مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ اسلامی نظریات اور اس کے منصفانہ اصول

سے اقوام عالم نے بھی خوشہ چینی کی ہے۔

'مقالاتِ طیبہ' میں ایک اور اہم مقالہ 'دو علمی سوال اور ان کے جواب' کے عنوان سے شامل ہے، پہلا سوال ہے: ''وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا'' کہ اس میں اختلاف نہ ہونے کو کلام الٰہی ہونے کی دلیل قرار دیا گیا ہے، حالاں کہ مطلق اختلاف تو کلام الٰہی میں بھی موجود ہے اور جہاں تک تاویلات وتوضیحات کے بعد تعارض رفع کرنے کی بات ہے تو یہ کلام بشر میں بھی ممکن ہے۔

دوسرا سوال قرآن مجید میں قسم سے متعلق ہے، حضرت مولانا طیب صاحبؒ نے متکلمانہ انداز میں ان دونوں سوالات کے جواب دیئے ہیں۔ جو بتیس صفحات پر مشتمل ہے۔

مذاہب کے درمیان معجزات کا مسئلہ ہمیشہ سے زیر بحث رہا ہے، حضرت حکیم الاسلامؒ کا خطاب اس موضوع پر بڑا مفید اور مدلل ہے جو ''معجزہ کیا ہے؟'' کے نام سے شائع ہوا ہے اور اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے۔

اس دور میں مستشرقین کی جانب سے اسلام کے خلاف جن شکوک وشبہات کو ابھارا گیا ہے اور ان سے بہت سے مغرب زدہ مسلمان بھی متاثر ہوئے ہیں، ان میں ایک حدیث رسول اللہ ﷺ کی حجیت اور اس کے اعتبار و اسناد کا مسئلہ بھی ہے، اس موضوع پر آپؒ کی کتاب ''حدیث رسول کا قرآنی معیار'' نہایت ہی بصیرت افروز اور منفرد نوعیت کی حامل کتاب ہے، جس میں حدیث کی مختلف اقسام - خبر عزیز، خبر قریب، خبر متواتر - کی قرآن مجید سے حجیت اور راوی کی مطلوبہ صفات کے بارے میں قرآن کی وضاحتوں وغیرہ پر بڑی عمدہ روشنی ڈالی گئی ہے، خاص طور پر جو لوگ قرآن کو حجت مانتے ہیں اور حدیث کا انکار کرتے ہیں، ان کے فکری انحراف کے علاج کے لئے یہ اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔

آج کل مغربی تہذیب کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان میں مردں کے لئے داڑھی اور عورتوں کے لئے پردہ کے مسائل بھی ہیں، چنانچہ آپ کی تالیف ''داڑھی کی شرعی حیثیت'' آپؒ نے فکری اور فقہی دونوں جہتوں سے گفتگو کی ہے، ایک طرف آپؒ نے بتایا ہے کہ مردوں کے لئے داڑھی مقتضیات فطرت میں سے ہیں اور تمام مذاہب میں داڑھی رکھنے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے، دوسری طرف آپؒ نے اسلامی نقطۂ نظر سے داڑھی کی اہمیت کو بیان کیا ہے، نیز قرآن وحدیث، آثار صحابہ اور فقہا کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ داڑھی کی کم از کم مقدار ایک مشت ہے، اسی طرح پردہ کے موضوع پر آپؒ کا رسالہ ''شرعی پردہ'' جو ایک سو چھبیس صفحات پر مشتمل ہے نہایت اہم ہے، اس کتاب میں آپؒ نے مسئلہ حجاب کی اہمیت اور اس کی علت اور بے حیائی کے نقصانات، نیز پردہ کے نقطۂ نظر سے مشرقی اور مغربی

تہذیب کا موازنہ جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلہ میں مغرب کے موجودہ حالات پر بعض اعداد و شمار بھی نقل کئے ہیں، نیز پردہ پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں اور اس کے جو نقصانات بتائے جاتے ہیں، ان کا بھی تفصیلی رد فرمایا ہے، اس رسالہ میں خواتین اسلام کے علمی اور اصلاحی کارنامے کا بھی بڑا تفصیل سے ذکر آ گیا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں ایک طویل اقتباس نقل کئے جانے کے لائق ہے:

صاحب بدائع الصنائع کی بیوی اپنے دور میں ایسی فقیہ سمجھی گئی ہیں کہ ایک درجہ میں فتویٰ کا مدار ان پر ہو گیا تھا، اس فقیہ خاتون کے باپ نے اپنی بیٹی کے فضل و کمال کو دیکھ کر اعلان کیا تھا کہ جو شخص اپنے ممتاز علم اور راسخ تفقہ کا ثبوت دے گا، اس سے لڑکی کی شادی کی جائے گی، صاحب بدائع نے اس اعلان پر کتاب 'بدائع الصنائع' تصنیف کر کے پیش کرائی، جو صاحب زادی کے باپ کو پسند آئی اور نکاح کر دیا، پھر خاوند و بیوی کے علم و کمال نے یہاں تک قلوب پر سکہ جمایا کہ اس زمانہ میں کوئی فتویٰ اس وقت تک معتبر نہ سمجھا جاتا تھا جب تک اس پر صاحب بدائع، ان کی علامہ بیوی اور خسر کے دستخط نہ ہو جاتے تھے۔

امام طحاوی کی صاحب زادی وہ اعلیٰ تعلیم رکھتی تھیں کہ امام ممدوح حدیث و فقہ کا املاء بھی ان ہی کے قلم سے کراتے تھے، خود بولتے تھے اور صاحب زادی قلم بند کرتی رہتی تھیں۔

سعید بن المسیبؒ کی عالمہ صاحب زادی کے فضل و کمال کی تمام اسلامی قلم رو میں شہرت پھیل گئی، خلیفہ وقت نے نکاح کا پیام دیا مگر نامنظور ہوا، نکاح ایک غریب عالم و فاضل سے ہوا، ان جیسی سینکڑوں عالم و فاضل خواتین اسلام کی سوانح عمریاں مستقل کتابوں میں درج کی گئی ہیں، پھر صحابیات میں کتنی ہی وہ خواتین ہیں جن کے فضل و کمال کو لسانِ نبوت پر سراہا گیا ہے، ایک عائشہؓ ہی حضور ﷺ نے نبوت کے آدھے علم کا حامل اور امین بتلایا ہے، کیا ان علم پرور خواتین اور ان جیسی دوسری ہزارہا قابل ذکر خواتین نے اپنا پردہ فروخت کر کے علم کی متاع خرید کی تھی؟ نہیں، بلکہ امام طحاوی کی تو وفات کا سبب ہی اس عالم صاحب زادی کا حجاب و انفعال ہوا ہے، صاحب زادی سے مسائل فقہ کا املاء کرا رہے تھے، اس میں بعض نسوانی مسائل کا ذکر آیا، جس میں بعض مسائل جماع و مباشرت سے متعلق تھے، جن میں یہ لفظ بھی املاء میں آیا کہ "اذنجامعهن یکون کذا" (جب ہم عورتوں سے جماع کرتے ہیں تو ایسا ہوتا ہے مثلاً غسل واجب ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ) صاحب زادی نے یہ مسئلہ لکھا اور غیر اختیاری طور پر کچھ ہلکا سا شرم آمیز تبسم کیا، اس پر امام طحاوی کی نظر پڑ گئی، بے حد منفعل ہوئے اور اسی انفعال سے مغلوب ہو کر وفات پا گئے، ظاہر ہے کہ حیاء دار سے حیا کی جاتی ہے، اس سے جہاں امام موصوف کی محجوبیت اور پردہ داری نمایاں ہوتی ہے وہیں صاحب

زادی کی حیاء وعفت اور پردہ داری کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ وہ حجاب کی کس حد پر پہنچی ہوئی تھیں، جس نے باپ پر انفعال کا یہ غیر معمولی اثر ڈالا کہ وہ جاں بر نہ ہوسکے۔

اس سے اوپر کے طبقات میں ازواجِ مطہراتؓ، عام صحابیاتؓ اور پھر قرون اسلاف کی عام خواتین اتقیاء پر نظر ڈالو اور غور کرو کہ آیا ان کے علوم کی گہرائیاں زیادہ تھیں جب کہ پردہ وحجاب اپنی اعلیٰ حدود پر پہنچا ہوا تھا، یا آج کی مسلم خواتین علوم وکمالات میں بڑھی ہوئی ہیں جب کہ ہر نہج کی بے حجابی اور آزادی دل و دماغ میں سرایت کر چکی ہے، اگر تعلیم میں حجاب حائل تھا تو حضرت عائشہ صدیقہؓ پردہ میں بیٹھ کر اور بلا کسی اسکول یا مدرسہ میں گئے ہوئے اتنی زبردست عالمہ کیسے ہوگئیں کہ بڑے بڑے علماء صحابہ رضی اللہ عنہم پس پردہ ان سے مسائل حل کرتے تھے اور علوم نبوت کا نصف حصہ ان کے حصہ میں آ گیا، حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ عارف منصب نبوت تھیں جنہوں نے اول وحی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھبرا جانے پر آپ کو ڈھارس اور تسلی دی اور علاج بتایا کہ یہ معرفت کی بات ہے تو کسی عارف ہی سے اس کا علاج کرایا جائے تو ورقہ ابن نوفل کے پاس لے گئیں، پھر دوسری صحابیاتؓ جن میں ایک سے ایک اعلیٰ علم رکھتی تھیں اور بعد کے قرون میں جیسے حضرت رابعہ بصریہؒ، رابعہ عدویہؒ وغیرہ کہ علماء وعرفاء میں اعلیٰ علم رکھتی تھیں اور مشاہیر عارفات میں سے تھیں، آخر وہی پاکباز عورتیں تھیں جو پردوں میں عفت کے ساتھ خانہ نشیں تھیں، حافظ ابن عساکر جیسے مشہور محدث نے جن اساتذہ سے علم حاصل کیا ہے، ان میں اسّی (۸۰) سے زیادہ عورتیں شمار کرائی ہیں، حفید ابن زہرا کی بہن اور بھانجی علم طب اور فن حکمت میں مشاہیر زمانہ سے میں ہوئی ہیں، یزید بن ہارون کی لونڈی ان کی آخری عمر میں جب کہ وہ ضعیف البصر ہو چکے تھے خود کتب حدیث سے احادیث کو یاد کرتی، انتخاب کرتی اور اپنے آقا کو حدیثوں پر مطلع کرتی۔

ابن سماک کوفی مشہور عالم کو لونڈی ان کی تقریروں میں اصلاح دیا کرتی تھی اور انہوں نے فن خطابت میں اپنی باندی ہی سے استفادہ کیا، حضرت معاذہ عدویہ صدیقہ عائشہؓ کی شاگرد ہیں، مشہور مرتاض ونفس کش خاتون گذری ہیں۔

حضرت فاطمہ نیشاپوری ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے شیوخ میں سے ہیں، جن سے انہوں نے فیض اٹھایا ہے۔

حضرت رابعہ شامیہ علوم معرفتہ میں مشاہدہ کے درجہ پر پہنچ گئی تھیں، جنات اور حوریں انہیں آنکھوں سے نظر آتے تھے۔

حضرت اُمۃ الجلیل اولیاء کبار میں سے ہیں، مشائخ وقت معرفت کے مسائل دقیقہ ان سے حل کیا کرتے تھے۔

عفیرہ عابدہؒ کے پاس ان کے علوم وکمالات اور قرب الٰہی کے سبب عبادِ زمانہ دعا کرانے کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔

حضرت شعوانہ ایسی جلیل القدر عالم باطن تھیں کہ فضیل ابن عیاض رحمۃ اللہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور دعاء کے خواہش مند ہوتے۔

آمنہ رملیہؒ مشہور عارفہ ہیں، بشر بن حارث اور امام احمد بن حنبل امام علوم ان سے نیاز مندانہ پیش آ کر دعاء کے خواستگار ہوئے۔

حضرت سیدہ نفیسہؒ کی جلالت قدر کے سبب امام شافعیؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے، حضرت ست الملوکؒ اپنے زمانہ کی مقبول بارگاہِ حق تھیں، بڑے بڑے علماء ومشائخ ان کی عظمت کرتے اور استفادہ کے خواہش مند رہتے۔

یہ بطور نمونہ ان چند مشاہیر عورتوں کے اسماء گنا دیئے گئے ہیں، ان جیسی ہزار ہا فاضلہ عالمہ عورتیں امت کے ہر قرن میں پیدا ہوئیں جنہوں نے اپنے فضل میں مردوں کی نوع کو مات دے دی، جن کے لئے کتاب صفۃ الصفوۃ میں مستقل باب رکھا گیا ہے، جس میں ان فاضلات وعالمات کی سوانح عمریاں درج کی گئی ہیں، پھر فنون دین ہی نہیں فنون عصر شاعری ادبیات اور بلاغۃ ومعانی میں بھی عورتیں بڑی بڑی فاضلہ گذری ہیں، مسماۃ نہانی جو والدۂ شاہ سلیمان کی مصاحب خاص اور حسن وجمال میں بے نظیر تھی اس درجہ کی ادیب اور شاعرہ تھی کہ اس نے اپنے نکاح کی شرط ہی یہ قرار دی تھی کہ جو اس کے ذیل کے ادیبانہ قطعہ کا جواب لکھ کر لائے گا وہ اس سے شادی کرلے گا۔ قطعہ یہ تھا:

از مردِ برہنہ روئے زری طلبم	میں خالی ہاتھ مرد سے زر چاہتی ہوں
در خانۂ عنکبوت پر می طلبم	اور مکڑی کے جال میں پر چاہتی ہوں
من از دہنِ مار شکر	میں سانپ کے منھ سے شکر چاہتی ہوں
وز پشۂ مادہ شیر نر می طلبم	اور مچھر کی مادہ سے شیر نر چاہتی ہوں

مردوں میں سے کوئی شاعر اس کا جواب نہ دے سکا، ایک سعد اللہ خاں وزیر آگے آیا جس نے اس قطعہ کا برجستہ جواب دیا:

علمے است برہنہ زر کہ تحصیل زر است

علم خالی ہاتھ سے ہے جس سے زر حاصل ہوتا ہے

تن خانۂ عنکبوت دل بال و پر است

تن خاکی مکڑی کا ایک جال ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں، دل اس کے لئے پر اور بازو ہے جس سے وہ پرواز کرتا ہے اور عرش تک جا پہنچتا ہے۔

زہر است جفائے علم و معنی شکر است

راہ علم کی محنت سانپ کا زہر ہے اور اس کی معنویت جو اس کے اندر مخفی ہے شکر ہے جس سے روح تک شیریں ہو جاتی ہے۔

ہر پشہ از و چشید آں شیر نر است

مچھر (یعنی کمزور سے کمزور انسان بھی) اسے چکھ لے تو وہی شیر نر ہے۔

ظاہر مسماۃ نہانی کی یہ قابلیت پردہ دری کی رہین منت نہ تھی بلکہ پردہ پوش اور وہی شاہی حرم سرا کے پردوں میں رہ کر تھی جس کا پلہ بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا، ریاض الفردوس میں ایک درجن ایسی فاضلہ عورتوں کے تذکرے ملتے ہیں جو فضلاء وقت تھیں اور مردان سے استفادہ کرتے تھے مگر یہ سب کچھ اسی دور کی تاریخ ہے جو آج کی بے حیائی اور بے پردگی سے بہت دور تھا، اور ان تمام علوم وفنون میں صنف نازک نے اپنے پردہ کو محفوظ رکھ کر ہی ترقی کی تھی، ایسی مثالیں بعد کے قرون میں بکثرت ملتی ہیں جن میں پردہ کے تحفظ کے ساتھ علوم وفنون کی گرم بازاری قائم رہی۔

ان کے یہ سارے علمی و عملی کمالات معاذ اللہ پردہ دری کے نتائج نہ تھے بلکہ پردہ داری اور پاک دامنی کے ثمرات تھے، ہواؤ ہوس کے نہیں بلکہ ہدیٰ و تقویٰ کے، پس ان جیسی صدہا اور بے شمار فاضل و پاکباز عورتیں آخر پردہ میں رہ کر کس طرح زیور علم سے آراستہ ہو گئیں، یا اگر بفحوائے کریمہ ”وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِىْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَة“ خانگی تعلیم مسلمان بچیوں کے لئے ناکافی ہوتی تو اس قدر کافی علم و معرفت اور فقہ ان جیسی ہستیوں کو کیسے میسر آ گیا۔

مسلمانوں پر فرقہ واریت کا الزام لگایا جاتا ہے اس موضوع پر بھی آپؒ کا رسالہ اسلام اور فرقہ واریت، (صفحات: ۸۰) نہایت اہم رسالہ ہے جس میں آپ نے اسلام کی عالم گیریت اور اس کے علاقائی، قبائلی اور سیاسی تعصّبات سے بالاتر ہونے کی بات بڑے مدلل انداز میں پیش فرمائی ہے، اس ذیل میں ایک جگہ

ہندوستان کے فضائل پر بھی بڑی اچھی گفتگو آ گئی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

اللہ کا پہلا دار الخلافہ جس میں اولین خلیفۂ خداوندی آدم علیہ السلام نازل ہوئے ہندوستان ہے کیوں کہ آدم جنت سے سراندیپ کے جزیرہ میں دجنی کی وادی میں اترے ہیں جو ہند میں ہیں، چنانچہ ابن جریر ابن حاتم اور حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے اور اسے صحیح کہا ہے کہ:

اول ما اهبط اللّٰه آدم الیٰ ارض الهند (وفی لفظ) بو جنیٰ ارض بالهند.

سب سے پہلے اللہ نے آدم کو زمین ہند میں اتارا اور ایک لفظ میں ہے، دجنی میں اتارا جو سرزمین ہند میں ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت میں سراندیپ کا لفظ بھی موجود ہے، اس وادی کی فضیلت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

خير وادٍ فی الناس وادی مكة و وادٍ نزل به آدم بارض الهند.

بہترین وادی لوگوں کی وادیٔ مکہ ہے (جس میں بیت للہ ہے) اور وہ وای جس میں آدم سرزمین ہند میں اترے۔

آدم علیہ السلام نے اول ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنایا، گویا دنیا کی پہلی آبادی ہندوستان سے شروع ہوئی، آدم علیہ السلام اول النبیین ہیں، اس کے لئے پہلا دارلنبوت خدا کا ہندوستان ٹھہرتا ہے جیسا کہ آخری دارالنبوت حجاز ہے، اول با آخر نسبتے دارد۔

جنت سے دو ہی انسان زمین پر اترے ہیں، آدم ہندوستان میں اور حواء (زوجۂ آدم علیہ السلام) سرزمین حجاز میں، خدا کا پہلا قانون، ہندوستان ہی میں آیا اور یہیں سے دین شروع ہوا جس کی تکمیل بالآخر حجاز نے کی، جبرئیل امین اور روح القدس کا پہلا ورود ہند میں ہوا جو وحی لے کر اترے، پہلی اذان ہندوستان میں ہوئی جس میں توحید کا اعلان ہوا، جیسا کہ روایات میں موجود ہے، اول النبیین کو آخر النبیین کی بشارت ہند ہی میں دی گئی، یعنی سرزمین ہند پہلا دار التبشیر ہے۔ طبری کی روایت میں ہے کہ آدم حواء علیہا السلام کو لے کر حجاز سے لوٹے تو اسی وادی میں آئے جس میں نزول ہوا تھا اور وہیں رہنے کے لئے گھر بنایا، یعنی ہندوستان پہلے نبی کا وطن ہے، وکفی بہ فخراً، آدم علیہ السلام کی قبر بھی دجنی ہی میں ہے اور بنص حدیث ثابت ہے کہ آدمی کی قبر اس جگہ بنتی ہے جہاں سے اس کے خمیر کے لئے مٹی لی جاتی ہے، اس لئے کہا جاتا ہے کہ خاکِ ہند ہی نے پیغمبری کی بنیاد رکھی، آدم علیہ السلام نے چالیس حج کئے اور ایک حج کے لئے بیل پر سوار ہو

کر گئے ہیں جیسا کہ سبحۃ المرجان نے روایت نقل کی، نیز کھیتی باڑی کے لئے پہلا جانور سرخ رنگ کا بیل اور گائے ہی اللہ نے آدم علیہ السلام کو عنایت فرمایا ہے، گویا بیل کی نسل ہند ہی سے شروع ہوئی ہے، شاید اسی لئے ہندوستان میں اس جانور کی عظمت زیادہ کی جاتی ہے کہ یہ اولین حیوانات بھی ہے اور اسے اول النبیین سے ایک خاص نسبت بھی حاصل ہے۔

انبیاء علیہم السلام میں فہم ادریس معروف ہے گویا فہم کی تیزی حضرت ادریس علیہ السلام کا ممتاز وصف ہے اس لئے ان پر علوم حکمۃ خصوصیت سے اتاری گئی۔

پس اگر حجاز اس لئے مقدس ہے کہ خاتم النبیین کا مولد ومنشا اور مہبط وحی قرآنی ہے، اگر شام اس لئے مقدس ہے کہ وہ انبیاء بنی اسرائیل کا مولد ومنشا ہے، اگر مصر اس لئے مقدس ہے کہ اسے موسیٰ علیہ السلام سے نسبت حاصل ہے اور اگر عراق اس لئے مقدس ہے کہ اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبت ہے، تو بلا شبہ ہندوستان اس لئے مقدس ہے کہ اسے آدم علیہ السلام سے نسبت ہے اور پہلی وحی کا مہبط ہے، پہلا دار النبوۃ اور دار الخلافہ ہے اور اس لئے مقدس ہے کہ بنص روایت طبرانی وہ حضرت شیث علیہ السلام کا وطن ہے جو آدم علیہ السلام کے جلیل القدر بیٹے اور ان کے خلیفہ ہوئے جنہوں نے آدم علیہ السلام کے جنازہ کی نماز پڑھائی ہے اور اس لئے مقدس ہے کہ بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ (جس کو سبحۃ المرجان نے نقل کیا ہے) وہ نوح علیہ السلام کا وطن ہے، سینکڑوں اہل اللہ کے مکشوفات بھی ہیں، جس سے ہندوستان کے مختلف انبیاء کی قبروں اور آثار کا انکشاف ہوا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ (اول صدر مدرس دار العلوم دیوبند) نے فرمایا کہ گنا کے دہانے پر مجھے انوار نبوت محسوس ہوئے، کسی نبی کا جسم مدفون ہے، یا آثارِ نبوت ہیں، حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ مجددی نقشبندی خلیفۂ ارشد حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ اور اولین مہتمم دار العلوم دیوبند کا مکاشفہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دار العلوم دیوبند کی قبر عین کسی نبی کی قبر میں واقع ہے۔

نماز اسلام کا اہم ترین رکن ہے بلکہ کلمہ شہادت کے بعد رکن اعظم ہے، نماز کی اہمیت اس کی کیفیت اور افعالِ نماز کی مصلحت وحکمت اور اسرار ورموز پر آپ کی کتاب فلسفۂ نماز (صفحات: ۱۶۰) بڑی ہی چشم کشا اور نہایت ہی نادر مضامین کی حامل کتاب ہے، اس میں فلسفہ اور مذہب کا تعلق، انسانی بدن میں جمادات، حیوانات اور نباتات کا اجتماع اور نماز کی تاثیر اور اس میں تربیتی پہلو وغیرہ جیسے نکتوں پر ایسی نفیس گفتگو کی گئی ہے کہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملی، حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں آپؒ کا قلم امام غزالیؒ، عزالدین بن

عبد السلامؒ اور شاہ ولی اللہ کا ہم رکاب نظر آتا ہے۔

آپ کا ایک اہم خطبۂ مذاہب عالم اسلام کے تین بنیادی امتیازات کے عنوان سے ہے جو پچاس صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے، اس خطبہ میں بتایا گیا ہے کہ ''عقل ونقل اور استناد'' تینوں باتیں اسلام کو حاصل ہیں، اس ذیل میں آپ نے حفاظت قرآن اور اس کی ظاہری و باطنی شہادت، حدیث کی حفاظت و حجیت، اسلام کا قانون وراثت، تعدد ازدواج اور ہندوستان میں اسلام کی آمد اور اس کی مقبولیت جیسے موضوعات پر گفتگو کی ہے، یہ بھی آپ کے اہم خطبات میں ہیں۔

برصغیر میں جن لوگوں نے انکار حدیث کے فتنے کو کھڑا کیا، ان کی قیادت کرنے والوں میں ایک پروفیسر غلام جیلانی برق بھی تھے، جن کی کتاب 'دوقرآن' اور 'دو اسلام' نے ایک زمانہ میں پورے ملک میں دھوم مچا رکھی تھی، دوقرآن میں یہ بات دکھائی گئی ہے کہ ایک خدا کا قولی قرآن ہے اور وہ ہے مصحف مقدس اور ایک خدا کا فعلی قرآن ہے اور وہ ہے کائنات، پھر اس پس منظر میں مطالعہ کائنات کی اہمیت کو بتاتے ہوئے دین کے بہت سے مسلمہ حقائق کا انکار بلکہ ان کا استہزاء کیا گیا ہے، آپ نے اس کو جواب ''ایک قرآن'' (صفحات: ۱۲۶) کے نام سے لکھا ہے اور اس میں یہ بات واضح کی ہے کہ مادی تمدنی ترقی کے مقابل روحانی تمدنی ترقی زیادہ اہم ہے، یہی انبیاء کی دعوت کا مقصد رہا ہے اور قرآن مجید نے اس کو بار بار تاکید واہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے، اس رسالہ میں ''اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْن'' پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی اور اس کی صحیح مراد متعین کی گئی ہے، اس کا خلاصہ خود مؤلف کے الفاظ میں اس طرح ہے:

(۱) آیاتِ تکوین کی رو سے صحیفۂ کائنات کا مطالعہ ضروری ہے لیکن معرفتِ صانع کے لئے، نہ کہ محض معرفتِ مصنوعات اور مادہ کی توڑ پھوڑ سے صنعتی کاروبار چلانے کے لئے۔

(۲) مادی اقتدار ضروری ہے، لیکن قانونِ فطرت کو نافذ العمل بنانے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے نہ کہ استبداد و تعیش اور اعلاء کلمۃ الفسق کے لئے۔

(۳) استخلاف فی الارض ضروری ہے لیکن مادی حوائج سے غنی بن کر کامل بننے کے اور بنانے کے لئے، نہ کہ وفورِ اسباب سے اپنی محتاجگی کو بڑھانے اور دنیا کی نقالی کرنے کے لئے۔

(۴) مدنیت اور تمدنی اکتشافات بقدرِ ضرورت ضروری ہیں لیکن تعاونِ باہمی میں ازدیاد کے لئے نہ کہ مادیت میں غلو اور فناء فی العیش ہوجانے کے لئے۔

(۵) تسخیرِ کائنات ضروری ہے لیکن روحانی تصرفات کی مشق بہم پہنچانے اور صورتوں کے راستہ سے

حقائق تک پہنچنے کے لئے ، نہ کہ مادی تصرفات میں محصور اور محدود رہ کر صورت پرستیوں اور مختلف الاشکال ڈیزائنوں میں غرق ہو جانے کے لئے۔

(۶) اعداء اللہ کی تخویف کے لئے امکانی تیاری (اعداد مستطاع) ضروری ہے لیکن دشمن کی نقالی یا اس کی طرح عَددا اور عُدد پر کلیۃً اعتماد کے ساتھ نہیں بلکہ فی الجملہ ان اشیاء کی رعایت رکھ کر، قوت قلب، حوصلۂ یقین اور حکیمانہ تدابیر کی ضرورت کے ساتھ۔

(۷) اور بالآخر یہ تمام امور، تمدن، سیاست، امارت، تسخیر، تکوین وغیرہ ضروری ہیں، مگر رضائے الٰہی اور قربِ حق کے لئے، نہ کہ رضائے نفس اور ارضائے غیر کے لئے۔

(۸) اور خلاصہ یہ ہے کہ جب کہ تمام دینی مقاصد کی تحصیل بغیر اتباع نبوی ﷺ کے ناممکن ہے جو حقیقتاً عملی قرآن ہے، تو بطور تفنن طبع اگر تعددِ قرآن کا نظریہ موزوں ہے تو ''تین قرآن'' کے عنوان کے ساتھ تا کہ کتاب اللہ علمی قرآن ہو، کائنات اللہ برہانی اور تمثیلی قرآن ہو اور رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس عملی قرآن ہو، نہ کہ ''دو قرآن'' کے نظریہ کے ساتھ، جس میں تمثیلی قرآن تو سرے سے حذف ہو جائے اور عملی قرآن باقی بھی رہے تو تلبیس کے ساتھ اور غیر واقعی ہو کر، یعنی بجائے ذاتِ نبوی ﷺ کے کائنات آجائے جس سے کوئی اسوہ اور عملی نمونہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال اس مضمون کی جملہ تفصیلات اور آخر میں اس نمبر وار خلاصہ سے یہ مخفی نہیں رہتا کہ میرا مقصد مسلمانوں کی مادی، صنعتی، عسکری اور دوسری انواع کی قوت وشوکت یا حسب ضرورت دنیا کی ترقی یافتہ وسائل کے استعمال سے گریز یا انکار کرنا نہیں بلکہ انہیں آیات تکوین کا مدلول کہے جانے، ان کے معیارِ کفر و اسلام ہونے اور انہیں مقصدِ حیات کہہ کر اپنی ترقی کا میدان بنا لینے یا غلو وافراط اور مبالغوں سے ان میں منہمک اور فنا ہو جانے پر نکیر وانکار کرنا ہے۔

آپ کی ایک تالیف ''خاتم النبیین'' (صفحات: ۸۵) ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایک انوکھی کتاب ہے، جس میں ختم نبوت کی دلیلوں کے علاوہ نبوت محمدی کے تمام انبیاء سے فائق ہونے نیز تمام انبیاء کے کمالات ومعجزات کے جامع ہونے کا تذکرہ ہے۔

اس سلسلہ میں آپ کی ایک قابل ذکر تالیف ''اصولِ دعوت اسلام'' بھی ہے، یہ دعوتِ دین کی اہمیت و افادیت اور دعوت کے طریقۂ کار کے سلسلہ میں شرعی اصول واحکام پر نہایت ہی اہم تحریر ہے اور دریا بہ کوزہ کا مصداق ہے، اس میں آپ نے دعوتی اسفار، دعوت کی انواع، مدعوین کی قسموں، داعی کے اوصاف وغیرہ

جیسے موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اس اہم فریضہ سے غفلت پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور کار دعوت کے لئے ایک لائحہ عمل بھی پیش کیا ہے، نیز تمہیدی طور پر مذاہب عالم کا مختصر جائزہ بھی لیا گیا ہے، جس میں عیسائی مذہب، لامی وبتتی مذہب اور یہودی مذہب کا خصوصی تذکرہ ہے۔

جن لوگوں نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے خطبات کو سننے اور آپ کی مجلسوں میں بیٹھنے کی سعادت حاصل کی ہے، وہ بخوبی واقف ہیں کہ ان مواقع پر آپ کی زبان سے ایسا لگتا تھا کہ علم وفکر کا آبشار جاری ہے اور اس میں جہاں دعوت واصلاح اور موعظت وتذکیر کی باتیں ہوتی تھیں، وہیں احکام دین کا باہمی ارتباط، قانون فطرت سے ان کی مطابقت، ان کے اسرار ومصالح اور ان کی عقلی توضیحات پر بھی بڑی حکیمانہ گفتگو ہوتی تھی، جو قلب و روح کے ساتھ ساتھ، دماغ کو بھی مطمئن کرتی تھی، حضرت حکیم الاسلامؒ کے وہ خطبات جو ''خطبات حکیم الاسلامؒ'' کے عنوان سے دس جلدوں میں طبع ہو چکے ہیں، میں بھی بہت خطبات کا موضوع متکلمین کے طرز پر اسلام کی صداقت وحقانیت کو ثابت کرنا اور معاندین کے سوال کا جواب دینا ہے اور ضمنی طور پر تقریباً ہر خطبہ میں اس طرح کے مضامین آگئے ہیں، یہاں چند اہم خطبات کے صرف عناوین ذکر کئے جاتے ہیں۔

۞ راہِ اعتدال	خطابت حکیم الاسلام	جلد سوم
۞ معرفت باری	؍؍	؍؍
۞ تسکین فطرت	؍؍	؍؍
۞ خطبۂ طیبہ	؍؍	؍؍
۞ اسلام- عالمی مذہب ہے	؍؍	چہارم
۞ نبوت وملوکیت	؍؍	پنجم
۞ افادات علم وحکمت	؍؍	ہفتم
۞ مسلم پرسنل لاء	؍؍	ہشتم
۞ اسلام اور آزادی	؍؍	؍؍
۞ اشتراکِ مذہب	؍؍	؍؍
۞ نبی امی ﷺ	؍؍	دہم
۞ رہنمائے انقلاب	؍؍	؍؍
۞ اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام	؍؍	؍؍
۞ تکمیل انسانیت	؍؍	؍؍

اس سلسلہ میں آپ کے دو اہم خطبات صدارت بھی قابل ذکر ہیں، ایک ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' کے عنوان سے ہے، جو آپ نے دسمبر ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ دہلی میں دیا تھا، اس خطبہ میں آپ نے فکر و تعقل کی اہمیت، قواعد و اصول اور جزئیات کی افادیت، ضمیر کی آزادی اور حریت رائے، نیز اسلام کی عالمگیریت پر بڑی حکیمانہ روشنی ڈالی ہے۔

دوسرے نومبر ۱۹۷۳ء میں مسلم پرسنل لاء کنونشن بمبئی کا خطبہ صدارت جو نہایت ولولہ انگیز اور تاریخی خطبہ ہے، جس میں قانون شریعت کی اہمیت اور اس کے اعتدال و توازن پر نہایت ہی عالمانہ طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسلام کی حفاظت و مدافعت کے پہلو سے جو علمی و تالیفی خدمات آپ نے انجام دی ہیں، ان کے علاوہ تحریکی اعتبار سے بھی آپ کی خدمات نہایت ہی اہمیت کی حامل ہیں، جن میں سب سے جلی عنوان ''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کا ہے، ہندوستان میں آزادی سے پہلے معمارانِ قوم یہ وعدہ کرتے آرہے تھے کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کے پرسنل لاء کو تحفظ دیا جائے گا، پھر جب دستور بنا تو مذہب پر عقیدہ، اس پر عمل اور مذہب کی تبلیغ کی آزادی کو اقلیت کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا لیکن بدقسمتی سے آہستہ آہستہ حکومت کا تیور بدلنے لگا، مسلم پرسنل لاء کے خلاف سرکاری ذمہ داروں کے بیانات کے ذریعہ تبدیلی کا راستہ کھولنے کی کوشش کی گئی، اس موقع پر حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند میں اس موضوع پر اجلاس طلب کیا، جس میں علماء اور دانشوران شریک ہوئے۔

پھر نومبر ۱۹۷۲ء میں اس اجلاس کی تحریک پر بمبئی کا وہ عظیم الشان کنونشن منعقد ہوا، جس کے بارے میں بزرگوں کا تصور تھا کہ خلافت تحریک کے بعد ایسا ہمہ مسلکی، ہمہ جماعتی اور ہمہ علاقائی اجلاس منعقد نہیں ہوا، اس اجلاس کی صدارت کے لئے آپ ہی کا انتخاب عمل میں آیا، اس اجلاس نے بورڈ کی تشکیل کا فیصلہ کیا، بورڈ کی تشکیل مسلکی اور جماعتی کشاکش کی وجہ سے بہت دشوار کام تھا لیکن حضرت حکیم الاسلامؒ کی بالغ نظر، معتدل اور مرنجان مرنج شخصیت کی شکل میں ایک ایسی شخصیت موجود تھی جن کی صدارت پر تمام لوگوں کا اتفاق ہو گیا اور پھر آپ کی وفات تک تحفظ شریعت کا یہ کارواں نہایت ہی کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا اور ایمرجنسی جیسے پر افتاد حالات میں بھی آپ کی حکیمانہ قیادت میں اس نے سفر جاری رکھا۔

حقیقت یہ ہے کہ خارجی فتنوں کا مقابلہ اور دین حق کا دفاع آپ کی کاوشوں کا خاص ہدف تھا اور اس معاملہ میں بھی آپؒ دیوبند کے اصل مزاج و مذاق اور فکر و نظر کے نمونہ تھے، کیوں کہ دارالعلوم کے قیام کے

بعد سے جب بھی اسلام کے خلاف کوئی فتنہ اٹھا، علماء دیوبند اس کا مقابلہ کرنے میں پیش پیش رہے، اس ملک میں ہندو احیاء پسندی کی تحریک اٹھی، عیسائی مبلغین ملک کی گلیوں اور کوچوں میں لوگوں کو دعوت ارتداد دینے لگے، انگریزوں کی مدد سے قادیانیت کے فتنہ نے ایک سیل بلاخیز کی طرح اپنے بال و پر پھیلائے، الحاد اور نیچریت ایک طوفان بن کر نئی نسلوں کے دل و دماغ پر چھانے لگی اشتراکیت اور کمیونزم نے علمی لباس پہن کر اور اسلامی لبادہ اڑھ کر مسلمانوں کو متاثر کرنا شروع کیا، انکار حدیث کا فتنہ ایک زبردست علمی یلغار کے ساتھ اٹھا اور قانون شریعت کی معقولیت، فطرت انسانی سے اس کی ہم آہنگی اور موجودہ دور میں اس کی نافعیت پر سوالیہ نشانات اٹھائے گئے، خود رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ پر حرف گیری کی گئی ان فتنوں کے مقابلہ کے لئے جو لوگ اٹھے، یا جنہوں نے اس کاروانِ تحفظ دین کی سالاری کی وہ یا تو علماء دیوبند تھے، یا وہ لوگ جو دیوبند کی فکر سے متاثر تھے۔

دین پر استقامت اور حمیت ایمانی کا امتزاج اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی ایسی ترجمانی جو دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہو، علماء دیوبند کا مزاج رہا ہے اور آج بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ہماری توجہ فروعی اور داخلی اختلافات سے زیادہ دفاعِ اسلام پر ہو، کیوں کہ فروعی اختلافات میں الجھ جانے والے لوگ اکثر خارجی فتنوں کی طرف توجہ نہیں کر پاتے، یہی فکر دیوبند کے سرخیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی زندگی کا پیغام ہے، یہی مکتب دیوبند کے بانی و مؤسس حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کوششوں کا اصل ہدف رہا ہے اور یہی حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی زندگی کی اصل دعوت ہے۔

....

(۱) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، اسلام کا اخلاقی نظام، ص: ٦٧

(۲) ایضاً، ص: ۱۷۳

(۳) ایضاً، ص: ۱۹۹

(۴) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، مقالاتِ طیبؒ، ص: ۱۸

(۵) ایضاً ص: ۳۴

(٦) ایضاً ص: ٦٨

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ کی تصانیف پر ایک نظر

مولانا اسیر ادروی

ریوڑی تالاب، بنارس

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی شہرت ایک سحر البیان خطیب اور شیوا بیان مقرر کی حیثیت سے تھی، ان کا ظاہری جاہ وجلال، حسن و جمال، رکھ رکھاؤ، لباس کی پاکیزگی وزیبائی، پُر وقار چہرہ، عالمانہ تمکنت ووجاہت ان تمام خصوصیات نے مل جل کر ان کی شخصیت کو دل کش اور پُر وقار بنایا تھا، پہلی ہی نگاہ میں ان کو دیکھنے والا مرعوب اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، وہ ایک خطیب اور شیوا بیان مقرر کی جملہ خصوصیات سے متصف تھے، کشیدہ قامت، دل کش شخصیت، سرخ وسپید چہرہ، مخصوص لب ولہجہ، واضح اور صاف لہجہ وآواز، اندازِ گفتگو میں توازن واعتدال، خودداری اور خود اعتمادی، موضوع کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال احادیث وقرآن کے ایک ایک لفظ سے حکیمانہ نکتہ آفرینی خالص عالمانہ زبان میں حقائق ومعارف اور اسرار وحکم کی ایسی نقاب کشائی فرماتے تھے کہ علماء، صلحاء، زہاد، اساتذہ علم وفن تو ایک طرف عوام اور کم پڑھے لکھے لوگ بھی مسحور ہو کر رہ جاتے تھے۔ زبان جادو کرتی تھی اور اندازِ بیان دلوں کو جیت لیتا تھا۔

الفاظ ومعانی کے پھول برساتی ہوئی زبان، شان وشوکت سے مرصع ومسجع کلام، مخصوص لب ولہجہ، خاص طرزِ ادا کے ساتھ موضوع کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر ممکن مواد کو سمیٹتی ہوئی، علم وحکمت کا نور بکھیرتی چلی جاتی تھی، سلجھا اور نکھرا ہوا اندازِ بیان، معیاری اور رفیق عالمانہ زبان، پُر شوکت الفاظ کے ساتھ حُسن اخلاص مضمون سے لگن، موضوع سے وابستگی و وفاداری، علم کی گہرائی وگیرائی، مطالعہ کی وسعت، پیش کش کا خوبصورت سلیقہ دلوں پر سحر کرتا چلا جاتا تھا۔ ان کی دقت نظر سلامتی ذہن اصابتِ رائے، احتیاط وتیقظ، اکابر علماء وبزرگانِ دین کی صحبت وتربیت، تقویٰ وطہارت، اخلاص وبے نفسی، غیر جذباتی ٹھنڈی طبیعت، علوم

متداولہ پر عبور، ان کی تقریر سے متاثر ہوئے بغیر کوئی شخص نہیں رہ سکتا تھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ درحقیقت منبر ومحراب کے بزرگ تھے، اسی میدان میں ان کے جوہر بھی کھلے کیوں کہ ان کا حقیقی میدان یہی تھا، اپنی زندگی اور ماحول، عہدہ ومنصب، ذمہ داری وفرائض کے لحاظ سے بھی خطابت وشیوا بیانی کی ضرورت تھی اور وہ ان کی ذات کا ایک ضروری عنصر بن گئی تھی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ بحیثیت مصنف

اپنے فرائض و ذمہ داریوں کی مصروفیتوں اور طول طویل اسفار کے باوجود درجنوں کتابیں بھی یادگار چھوڑی ہیں، ہر کتاب اپنے مواد، اپنی معلومات، اپنے دلائل، استنباط مسائل واستخراج نتائج، حکیمانہ نکتہ آفرینیوں اور پُرشوکت ومرعوب کن کلامی مباحث کے لحاظ سے اپنا ایک خاص امتیاز ومقام رکھتی ہے، ان کتابوں کو پڑھ کر قاری محسوس کرتا ہے کہ دائرۂ معلومات میں بہت سی ایسی باتیں ضرور آ گئی ہیں جن پر اب تک ان کی نگاہیں نہیں پڑی تھیں، ہر کتاب حضرت حکیم الاسلامؒ کی مخصوص طرز تحریر کے ساتھ عالمانہ ومحققانہ مباحث، زبان وبیان کی رعنائیوں اور دل آویزیوں سے آراستہ وپیراستہ ہے۔

آپؒ کی اکثر کتابوں کا اپنا اپنا ایک تاریخی پس منظر ہے، ہر کتاب کسی ناگزیر ضرورت کے پیش نظر معرض تحریر میں آئی ہے، ایسا کم ہوا ہے کہ خود حضرت حکیم الاسلامؒ کے ذہن نے کوئی علمی موضوع منتخب کیا ہو اور اس پر غور وفکر کے بعد اپنی کتاب مرتب کی ہو بلکہ اکثر ہوتا یہ رہا ہے کہ کسی نے ان سے علمی ومذہبی سوالات کئے یا ان کے گردوپیش کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ اس میں مسلمانوں کی رہنمائی کی شدید ضرورت محسوس ہوئی یا اسلامی حلقوں میں کسی فتنہ نے سر اٹھایا اور اس کے دفعیہ کی ایک عالم دین کی حیثیت سے ان پر ذمہ داری عائد ہوئی اور انہوں نے قلم اٹھا لیا اور مختصر جواب یا مضمون کے بجائے ایک مستقل کتاب تیار ہو گئی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ عرصۂ دراز تک اسلامی دنیا کے ایک عظیم ترین مذہبی ادارے کے سربراہ رہے جس ادارے سے وابستہ عام اہلِ علم کا ملک میں ایک اہم پُروقار اور بلند علمی مقام تھا، یہ ادارہ اپنی علمی ومذہبی خدمات اصلاحِ مفاسد و بدعات اور اسلامی دستورِ حیات وتعلیمات وروایات کو ہر قسم کی آمیزشوں اور آلائشوں سے پاک وصاف، مصفیٰ ومجلی رکھنے اور ان کو روشن وتابناک بنانے کی جہد مسلسل کی وجہ سے مستقل ایک مکتبۂ فکر بن گیا تھا۔ قدرت نے اس ادارہ میں ایسی عبقری شخصیتیں پیدا کیں جو اپنی بے پناہ علمی صلاحیتوں اور علومِ اسلامی پر مبصرانہ نگاہ کی وجہ سے اپنے اندر اجتہادی شان رکھتے تھے، فرق باطلہ میں ان کی علمی شہرت نے زلزلہ ڈال دیا تھا ان کے لئے ان کی زبان، ان کا قلم، شمشیر براں کی تیزی اور عدو برق کی

کڑک وگرج رکھتا تا، انہیں اسباب کی بنا پر اسلام پر اعتراض کرنے والوں نے بھی انہیں کو اسلام کے ترجمان کی حیثیت سے خطاب کیا، اپنے شکوک وشبہات اور اعتراضات انہیں کے سامنے پیش کئے اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات وروایات سے محبت رکھنے والوں ان کو روشن وتابناک دیکھنے کی تمنا رکھنے والوں کی نگاہیں بھی انہیں کی طرف اٹھتی تھیں جب اسلام پر اور اس کی تعلیمات وروایات پر کسی طرف سے کوئی حرف آتا تھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ تو اس ادارہ کے سربراہ ہی تھے اس لئے قدرتی طور پر اس طرح کے سوالات ان کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ خود حضرت حکیم الاسلامؒ اپنی ذہنی وطبعی ساخت وپرداخت اور ایک عظیم علمی سلسلۃ الذہب سے وابستہ ہونے کی حیثیت اور ذہن ومزاج کے لحاظ سے انہیں علماء کے گروہ میں شامل تھے، جنھوں نے کچھ ہی دنوں پہلے عیسائیت کے دہاڑتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھا تھا، آریوں کی یورشوں اور بدزبانیوں کا سدباب کیا تھا، قادیانیوں کے طائرِ فکر وخیال کے پر نوچ کر ان کی قوت پرواز چھین لی تھی، انہیں اسباب کی وجہ سے جب وہ ملک میں اصلاحی وتبلیغی دورے کرتے تھے تو ان سے ہر طرح کے لوگ ملتے تھے اور اپنے اشکالات اور شکوک وشبہات پیش کرتے تھے۔

ان شکوک وشبہات، اعتراضات واشکالات کو دور کرنا وہ اپنا مذہبی ودینی فریضہ تصور کرتے تھے اور اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور وہ قلم ہاتھ میں اٹھا لیتے تھے۔ عام طور پر حضرت حکیم الاسلامؒ کی تصانیف کا یہی پس منظر ہے۔

میں نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی تصانیف کا تعارف کراتے ہوئے ان کے پس منظر بتانے کی بھی کوشش کی ہے تاکہ کتاب کے مباحث کو اس سے سمجھنے میں سہولت اور مدد ملے اور کتابوں کی اہمیت کا اندازہ ہوسکے، میرے سامنے حضرت حکیم الاسلامؒ کی جو تصانیف ہیں انہیں پر اظہارِ خیال کیا ہے اگر ان کی اہم تصانیف کا ذکر اس مضمون میں نہیں ہے تو یہ سمجھ لیجئے کہ مجھے وہ کتابیں دستیاب نہیں ہوئیں اور تادمِ تحریر مجھے نہیں مل سکیں۔

اجتہاد وتقلید

ہندوستان میں تقلید وعدم تقلید کی بحث ایک صدی سے چلی آرہی ہے۔ اس مسئلے پر چھوٹی بڑی کتابیں لاتعداد ہیں، مباحثے ومناظرے بھی بڑی تعداد میں ہوئے ہیں جو بالعموم چند فروعی مسائل تک محدود رہے۔ اس ماحول اور بحث ومباحثہ نے تعلیم وتعلم کے طریقہ کو بھی ایک خاص رنگ میں رنگ دیا، احادیث کے اسباق میں قرأۃ خلف الامام، آمین بالجہر، رفع یدین، رکعاتِ تراویح کی تعداد کے مسئلے پر اساتذہ دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں اور طلبہ کے ذہن میں ان مسئلوں کے سارے پہلوؤں کو اتنی تفصیل سے جاگزیں کردیتے ہیں کہ ذہین طلبہ میں ان مسائل کے دلائل دونوں طرح کی حدیثوں کے درمیان تطبیق، احادیث

کی صحت وضعف اس سلسلہ کے راویوں کی جرح وتعدیل تک سے واقف ہو جاتے ہیں، زیادہ تر یہ بحث انہیں چند جزئی مسئلوں تک محدود رہتی ہے۔ ان مسئلوں نے ہندوستان میں دو گروہ بنا دیئے ہیں جو آج تک قلمی معرکہ آرائیوں اور نبرد آزمائیوں میں مصروف ہیں، ان مسائل کی بحث بھی ناتمام ہے۔ ایک صدی گزر چکی ہے لیکن ہنوز روزِ اول ہے، ہندوستان کی فضا میں اب بھی **ھل من مبارز** کی صدا گونجا کرتی ہے۔

ان دونوں گروہوں کا بنیادی اختلاف تقلید وعدم تقلید کا مسئلہ ہے جو اجتہاد کی ضرورت اور اس کی شرائط کی تفصیلات پر منحصر ہے۔ اگر یہ مسئلہ حل ہو جائے تو سارے مسائل از خود حل ہو جائیں۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک ہندوستان کے مسلمانوں میں ساری تباہیوں اور بربادیوں کے باوجود اس بحث ومباحثہ سے دلچسپی باقی رہی ہے اور اس دور کے ہر قابلِ ذکر عالم نے جس کے ہاتھ میں قلم تھا اس مسئلہ پر کوئی کتاب یا کوئی رسالہ ضرور لکھا، شبلی جیسا مؤرخ اسلام اور محقق انسان بھی اس گروہ بندی اور ہنگامہ آرائی سے دامن نہ بچا سکا اور ''المعتدی'' لکھ کر ان مجاہدین کی صف میں شامل ہو گیا جو عدم تقلید کے خلاف مصروفِ جہاد تھی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کا دورِ شباب اسی ماحول اور فضا میں گزر رہا تھا وہ کیسے اس سے دور رہ سکتے تھے، اس لئے اس فضا سے متاثر ہو کر آپ نے بھی ایک مختصر رسالہ ''اجتہاد وتقلید'' کے نام سے سپردِ قلم کیا اور حق یہ ہے کہ بحث کا حق ادا کر دیا، آپ نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے بدیع المثال نمونے پیش کئے ہیں جن کی طرف ابھی ایسی کوئی غائرانہ نظر نہیں ڈالی گئی تھی اور اپنی حکیمانہ نکتہ رسی کی وجہ سے مباحث کے ایسے ایسے پہلوؤں کو منصہ شہود پر لائے ہیں جن کی طرف عام طور سے اہل علم کے ذہن نہیں گئے تھے۔ اس رسالہ میں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی اور وہ راہ اختیار نہیں کی جس پر دوسرے ہزاروں نقوش قدم پہلے سے موجود تھے بلکہ انہوں نے اپنی راہ خود نکالی۔

آپ نے اصل بحث سے پہلے گفتگو کا آغاز تکوین وتشریع کے درمیان ایک تعلق خاص کو بتاتے ہوئے نتیجہ نکالا کہ جس طرح کائنات عالم کے کلی مادے آب، خاک اور باد وآتش پھر مادوں کی کلی موالید جمادات، نباتات، حیوانات پھر ان کے علویات اور سفلیات پھر موالید علوی وسفلی کی جامع انواع واجناس انسان، شیر، بکری، شجر، حجر، بحر وبر، جن وملک، سیارات وثوابت، ارض وسماء وغیرہ وغیرہ کی یہ مجموعی ہیئت جسے 'عالَم' کہتے ہیں کوئی کمی بیشی قبول نہیں کر سکتے۔ اسی طرح دین کے اصول وکلیات اساسی قواعد وضوابط اور تمام منصوص عقائد واحکام کی اس مجموعی ہیئت کذائی میں جسے عالَم کہتے ہیں اب کوئی کمی بیشی اور ترمیم وتنسیخ نہیں ہو سکتی کیوں کہ **لن تجد لسنة الله تبديلا** کہہ دیا گیا۔

یہ نتیجہ نکالنے کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ نے بتایا کہ جس جس طرح کائنات کا نظام درجۂ تکمیل کو پہنچ جانے کے بعد اس میں تغیر وتبدل نہ ہوتے ہوئے بھی سیکڑوں اور ہزاروں پہلو ایسے ہیں جو اب تک نگاہوں سے مخفی ہیں اور جب غور وفکر سے کام لیا جاتا ہے تو ایسے ایسے عجائبات وغرائب نگاہوں کے سامنے آتے ہیں جہاں تک عقلِ انسانی کی اب تک رسائی نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح تشریع کے منظّم احکام ومسائل اور قواعد و کلیات کے مخفی علوم واسرار کا پتہ لگا کر ان سے تدیّن کے نئے نئے فروعی مسائل، لطائف وظرائف اور حقائق و معارف پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ تکوینی اکتشافات کا نام ایجاد ہے اور تشریعی استخراج کا نام اجتہاد ہے۔

آپ نے کتاب میں آگے چل کر بتایا کہ اجتہاد کا رنگ ہر دور کے علمی ذہنیت اور تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ مجتہد انہیں کے مسائل کے استخراج پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے جن کی اس دور کو ضرورت ہوتی ہے اور جب ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو اس کے بعد اجتہاد کا وہ دور نہیں لوٹتا جو آچکتا ہے کیوں کہ زمانہ کو بات حاصل ہو چکی ہوتی ہے اب صرف اس سے نفع اٹھانے کا موقع رہ جاتا ہے۔ آپ نے مزید ارقام فرمایا کہ ہر دور میں مسلمانوں میں دو طبقے رہے ہیں، ایک وہ جن میں قدرت نے استنباط واستخراج مسائل کی فطری صلاحیت ودیعت کر دی تھی اور دوسرے وہ لوگ جو اس نعمت عظمیٰ میں اس کے شریک نہیں تھے، جن کی احادیث کے ذخیرے پر نگاہ ہے وہ جانتے ہیں کہ صحابہ کرام میں بھی دو طبقے موجود تھے، بعض صرف حافظِ حدیث تھے اور بعض فقیہ ومجتہد تھے جیسے ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابن مسعودؓ حضرات شیخین رضی اللہ عنہم، پھر فقہائے صحابہؓ میں بھی فرق مراتب تھا۔ بعض کے ذہن کی رسائی بہت گہری تھی اور بعض کی اس سے کم کیوں کہ ملکۂ اجتہاد وہبی ہوتا ہے کسبی نہیں، بعض اس کے اہل ہوتے ہیں بعض نہیں۔ احادیث، قرآن اور واقعاتِ صحابہ سے بہت سی مثالیں دیتے ہوئے اس فرقِ مراتب کو آپ نے واضح کیا ہے۔

فرقِ مراتب کی موجودگی نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر اجتہاد ضروری ہے تو تقلید بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت نے جن لوگوں کو قوت اجتہاد نہیں دی ہے ان کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں جو اس کی دسترس سے باہر تھا مجتہد کی تقلید کرے اور اس پر عمل کرے جب خود علم نہیں رکھتا تو علم والے کی اتباع کرے۔ خود ان کے مخفی دلائل وعلل تک نہیں پہنچ سکتا ہے تو دانیان اسرار و علل کے سامنے جھک جائے کیوں کہ علم کے دو ہی مرتبے ہیں یا تو خود سمجھنا یا سمجھے ہوئے لوگوں کی اطاعت کرنا، اس کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اس دعویٰ کی تائید کے لئے شاہد عادل ہے۔

اسلامی تاریخ سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ قرونِ اولیٰ میں بھی یہی صورت حال رہی ہے کہ اگر کوئی صحابی مجتہد ہے تو دوسرے صحابی کے قول وعمل پر عمل کرتے تھے، واقعات شاہد ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ قرض دینے والا قرض کی مدت سے پہلے قرض ادا کرنے پر قرض کا کچھ حصہ کم کرنے کے لئے تیار ہے تو کیا یہ درست ہے؟ آپ نے اس کو ناپسند فرمایا اور ایسا کرنے سے منع کیا جب کہ اس سلسلہ میں کوئی مرفوع حدیث موجود نہیں تھی، ظاہر ہے کہ یہ ان کا اجتہاد تھا، اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو اس شرط پر غلہ دیا کہ وہ دوسرے شہر میں اس کو ادا کرے گا حضرت عمرؓ نے منع فرمایا اور کہا کہ بار برداری کا کرایہ کہاں گیا؟ اس مسئلہ میں بھی کوئی حدیث مرفوع حضورؐ سے مروی نہیں، کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ حضرت عمرؓ کا اجتہاد تھا، مذکورہ بالا دونوں مسئلوں پر عمل کیا گیا سامعین نے حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی باتیں مانیں اور انہیں پر عمل بھی کیا، سوال کرنے والوں نے ان حضرت سے دلیل کا مطالبہ نہیں کیا حالاں کہ سائل ومسئول دونوں صحابی ہیں لیکن ایک میں اجتہادی ملکہ تھا دوسرے میں نہیں اس لئے جو اہل علم نہیں تھے انہوں نے اہل علم کی رائے پر عمل کیا اور ان کی اتباع کی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس شبہ کا ازالہ بھی دلائل و براہین کی روشنی میں بہت واضح طور پر کر دیا کہ اجتہاد کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوا ہے اور ہر ابجد خواں مدعی اجتہاد بن جائے، شریعت اسلامیہ میں اس کی گنجائش نہیں، ہاں عام تحقیق وتلاش کتاب وسنت میں تدبر ان کے لطائف وحقائق کا استخراج ہر زمانہ کے تکوینی حوادث سے تشریعی مسائل کو تطبیق دے کر مناسب فتاویٰ دینا، معاندین اسلام کے نئے نئے شکوک و شبہات اور اعتراضات کی تردید کے لئے نصوص شرعیہ سے استنباط کرنا، اصول اسلام کے اثبات اور تحقیق کے لئے کتاب وسنت سے تائید پیدا کرنے کا کام باقی ہے اور ہر دور میں اہل علم کے لئے میدان باقی ہے۔ اجتہاد کی یہی نوع کل بھی تھی اور آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی اجتہاد کی بحث سے لازمی طور پر ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ مجتہدین کی رایوں میں اختلاف کی صورت میں سوائے امت کی تفریق کے اور کیا حاصل ہوگا؟ امت میں اختلاف ہے کہ شریعت کے احکام کی کوئی معین صورت اور تحقیقی شکل باقی نہیں رہے گی، یہ اختلاف زحمت کے بجائے رحمت بن جائے گا اس خلجان کو دور کرنے کے لئے حکیم الاسلامؒ نے ایک لطیف اور دقیق بحث چھیڑی ہے اور انہوں نے عقل وروایات کی روشنی میں اسے امت کے لئے رحمت ہی ثابت کیا ہے، اس مسئلہ کو واضح کرنے کے لئے آپ نے جو مقدمات ترتیب دیئے ہیں عقل کو اپیل کرنے والے ہیں اس لئے آپ نے ان مقدمات سے جو نتیجہ نکالا ہے عقل اسے خود قبول کر لیتی ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس دکھتی ہوئی رگ پر بڑے ماہرانداز میں نشتر لگائے ہیں جس کو تقلید شخصی کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے۔ آپ نے محکم دلائل سے ثابت کردیا کہ اجتہاد مشروع ہے۔ اجتہادیات پر عمل بھی مشروع ہے، ان کا مجموعی ذخیرہ فراہم کرانا بھی شرعی چیز اس مجموعہ کا نام رکھنا بھی شرعی بات ہے تو اس کے بعد آپ نے بتایا کہ اجتہادیات میں غیر مجتہد کے لئے تقلید کرنا بھی ناگزیر اور ضروری ہوجاتا ہے، یہ صحیح ہے کہ اجتہادی مسئلوں میں دورائیوں یا اس سے زیادہ کا ہونا فطری اور قدرتی بات ہے اور وہ دائرہ شرع میں داخل ہے تو ایسے اختلافی مسائل میں تقلید شخصی بھی ضروری ہوجاتی ہے۔ آپ نے عقلی مقدمات ترتیب دے کر بطور نتیجہ ثابت کیا ہے کہ ایک مسلمان کے لئے تقلید شخصی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے اگر ایک شخص اپنی صواب دید کے مطابق کسی مسئلہ میں کسی امام کی رائے پر عمل کرتا ہے تو وہ تقلید شخصی ہی تو ہوتی ہے کیوں کہ دو مخالف رایوں پر بیک وقت عمل ممکن نہیں ہے اس لئے جب کسی مسئلہ خاص میں کسی امام کی رائے ترک کر کے دوسرے امام کی رائے پر عمل کرتا ہے تو وہ بھی تقلید شخصی ہوئی۔ فرق یہ ہے کہ پہلے امام کے بجائے اب اس نے دوسرے امام کی رائے قبول کرلی ہے پہلے امام کی رائے کو ترک کردیا ہے۔

سب سے اخیر میں آپ نے اس بحث کو چھیڑا ہے جو حاصلِ کلام ہے اور جس کے لئے یہ کتاب معرض وجود میں آئی ہے اور وہ مسئلہ ہے امام واحد کی تقلید کا۔ اگر تقلید ضروری ہے تو پھر ایک ہی امام کی تقلید کیوں ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر امام اور مجتہد کا اہلِ علم میں شمار ہے اور جن میں اجتہاد کی صلاحیت نہیں وہ اہل علم نہیں ٹھہرے اب وہ کسی بھی اہلِ علم یا مجتہد کی رائے پر عمل کرتا ہے تو اس کا یہ فعل عین شریعت ومنشاء ہونا چاہئے۔ ایک شخص بعض مسائل میں امام ابوحنیفہ کی تقلید کرتا ہے اور بعض مسائل میں امام مالک کی رائے پر عمل کرتا ہے۔ کچھ ایسے مسئلے ہیں جن میں وہ امام شافعیؒ کی رائے قبول کرلیتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے ہر حال میں وہ اہل علم اور مجتہد ہی کی رائے پر عامل ہوتا ہے پھر یہ بات اس کے لئے ممنوع کیوں ہوگئی جب کہ وہ فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ پر عمل کرتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس بحث کو بڑی تفصیل سے تحریر فرمایا ہے اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ بیک وقت ایک سے زیادہ ائمہ کی تقلید کی صورت میں بعض مسائل میں جزئیاتی تناقض ہوگا بعض میں ان جزئیات کے کلیوں اور اصولوں میں تناقض نمایاں ہوگا اور پھر اس دعویٰ کو درجنوں مثالوں سے واضح کیا ہے اور تناقض کی مختلف صورتوں کو تحریر کیا ہے پھر بتایا ہے کہ کسی مجتہد کے مزاج میں توسیع کا غلبہ ہے اور کسی کے مزاج میں احتیاط کا، کسی میں شدت ہے کسی میں طینت، کسی میں جمعیت کا غلبہ ہے اور کسی میں جامعیت کا، کسی کسی میں

دیانت کا وفور ہے اور کسی میں اس کے ساتھ سیاست ونظم اور اجتماعیات کا بھی اعلیٰ شعور ہے، کسی میں ظاہریت کا غلبہ ہے اور کسی میں باطنیت کا، کسی میں تأسی باسوق السلف کا غلبہ ہے اور کسی میں رجحانات سلف کے تتبع واستقراء کا، ظاہر ہے کہ جہاں ظاہریت غالب ہوگی وہاں سب سے بڑا مرجح ظواہر روایت ہوں گی اور جہاں باطنیت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح بواطن روایت یعنی درایت ہوگی، جس امام کی جو ذہنی خصوصیت ہوگی وہی اس کے اصول استنباط سے چھنے گی اور پھر وہی خصوصیات ان اصولوں کے تحت مستنبط شدہ جزئیات سے مترشح ہوگی اور انہیں خصوصیات کا خاص رنگ بالآخران افراد کی تربیت کرے گا جو اس فقہ پر عامل ہوں گے۔ ایک سے زائد امام کی تقلید کرنے والا ہر جگہ متضاد خصوصیات کے مابین متعارض جزئیات کا شکار ہوکر پھر کلیاتی تناقض کا شکار ہوگا، اس تقلید میں دو ذوقی رنگ اپنے تناقض کے ساتھ جمع ہونے کی کوشش کریں گے جس کا لازمی نتیجہ مزاج میں فساد ہوگا اور دو متضاد اثرات کی کشاکش میں گرفتار ہوکر پراگندہ حال بن جائے گا اور اس میں عملی فساد پیدا ہوجائے گا، اس طرح شریعتِ اسلامیہ کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی اصل روح اس کے عمل سے ختم ہوجائے گی اور شریعت بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس پامال موضوع پر اپنے نکتہ آفریں دماغ اور دقیقہ رس نگاہ سے کام لے کر روایت ودرایت کی روشنی میں اتنی لطیف بحث کی ہے کہ عقل اس سے حاصل شدہ نتائج کو قبول کرنے کے لئے مجبور ہوجاتی ہے۔ اب تک اس مسئلہ پر اردو میں بہت کم ایسی کتابیں وجود میں آئیں جو اپنی متکلمانہ اندازِ بیان میں روایات وآیاتِ قرآنی سے ایسے لطیف نکتے پیدا کرتی ہیں جہاں تک عام اہل علم کے ذہنوں کی رسائی مشکل سے ہوتی ہے۔ پوری کتاب استخراج نتائج کے اس خصوصی پہلو کے لحاظ سے شاہکار ہے۔

علم غیب

ہندوستانی مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو اسلامی تعلیمات وروایات میں عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح افراط وتفریط کا شکار ہے، عقائد ومسائل میں یہ افراط وتفریط اس کے ذہن کی پیداوار اور اس کی کم فہمی وکوتاہ علمی کا نتیجہ ہے جس طرح حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں ان پر ایمان لانے والے تو کم ہی رہے اور اتنی تعداد بھی نہ ہوسکی کہ وہ اپنے پیغمبر کو دشمنوں سے بچاسکیں جب وہ پھانسی پر چڑھانے کے لئے لے جائے جارہے تھے اور جب یہودیوں نے اپنے خیال کے مطابق پھانسی دیدی تو پھانسی کی لکڑی ساری دنیا کے عیسائیوں کے گلے کا ہار بن گئی۔ صلیب یا کراس جو کہتے ہیں ان کے مذہبی شعار میں داخل ہوگئی ایک طرف

تو ان کو پیغمبر تک ماننے میں غافل رہے اور جب پیغمبر ماننے پر آمادہ ہوئے تو ان کو اتنا بڑھایا کہ خدا بنادیا، آج پوری عیسائی دنیا اسی وجہ سے تثلیث کے شرک میں گرفتار ہے۔ یہ افراط و غلو محبت کے اظہار کی حد ہے، جب تک پیغمبر نہیں مانا تو کافر مطلق رہے اور جب ان کی عظمت کو پہچاننے کی گھڑی آئی تو مشرک مطلق ہوگئے، کچھ یہی حال ہندوستان میں اس گروہ کا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت، علومِ اسلامی کی تعبیر و تشریح، احادیث و قرآن کی تفسیر و توضیح، اسلام دشمن فرقوں، اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے، دوسرے مذاہب کے اہل علم کے اسلام اور بانی اسلام حضور اکرم ﷺ پر اعتراضات کے جواب دینے، ملک میں اسلام اور مسلمانوں اور ان کے شعائر کو محفوظ کرنے کا کوئی کام بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے ذمہ نہیں سمجھتے، مسلمان تباہ ہوتا ہے ہونے دو، جبر کے ہاتھوں مجبور ہو کر مرتد ہوتا ہے ہو جائے، مسجدیں اصطبل بنا دی جائیں بن جانے دو، اسلام کا نام لینے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جائے ان کی بلا سے، ان کو نہ ان باتوں کا غم ہے اور نہ پرواہ، نہ اس کی صلاحیت نہ جذبہ، لیکن جب رسول اکرم ﷺ کی ذات سے زبانی دعوائے محبت پر آمادہ ہوئے تو ان کو رسول اور پیغمبر کے بجائے خدا اور خدائی طاقت و قوت کا مالک بنا دیا اور صفاتِ خداوندی کو حضورؐ کی ذات سے وابستہ کر دیا۔

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر   اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

وہ مالک کائنات بھی ہیں اور مختار کل بھی اور جنت و دوزخ کی کنجی بھی آپ کے دست مبارک میں ہے اور ہر جگہ حاضر و ناظر بھی، ازل سے ابد تک کا پورا علم بھی ہے اور سارے مغیبات کا اسی طرح علم رکھتے ہیں جیسے خداوندِ قدوس کا علم محیط ہے جس کو چاہیں جنت دے دیں جسے چاہیں جہنم میں بھیج دیں، وغیرہ ذالک۔

اسی گروہ نے علم غیب کے مسئلہ کو پیدا کیا ہے اس مسئلہ پر چھوٹی بڑی اتنی کتابیں، رسالے اور مضامین اردو میں لکھے جاچکے ہیں کہ مزید اس پر اضافہ کی گنجائش نظر نہیں آتی اور یہی وجہ ہے کہ اب اس مسئلہ پر کوئی نئی کتاب سامنے نہیں آتی اور فضا میں ایک طرح کی خاموشی ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے آج سے پہلے جب ملک میں اسلامی ذہن رکھنے والوں اور دل و دماغ سے سوچنے والوں اور پیٹ سے سوچنے والوں کے درمیان معرکہ کارزار گرم تھا تو آپ نے علم غیب کے نام سے یہ کتاب لکھی تھی اور شائع تو بعد میں ہوئی جب شور و غوغا ایک حد تک خاموش ہو چکا تھا۔

''علم غیب کسے کہتے ہیں؟'' حضرت حکیم الاسلامؒ نے بات یہیں سے شروع کی ہے، قدیم علماء کی کتابوں سے علمِ غیب کے مفہوم کو واضح طور پر پیش کرتے ہوئے حاصل کلام یہ بتایا ہے کہ غیب وہ ہے جو

انسان کی اپنی کسی بھی ارادہ کی قوت سے خواہ ظاہری ہو یا باطنی حاصل نہ ہو سکے اور حواس و عقل اور کشف و انکشاف سے بالاتر ہو اور جب علم غیب کا یہ معنی متعین ہو گیا تو علم غیب کے لئے جو وسائل امت کے حق میں منفی ہیں یعنی عقل و نظر و فکر و بصیرت وغیرہ نبی کے حق میں بھی بدستور منفی ہیں یعنی عقل و نظر فکر و بصیرت وغیرہ وہ نبی کے حق میں بھی بدستور منفی رہیں گے کہ انبیاءؑ کو بھی ان وسائل سے علم غیب حاصل نہیں ہوگا البتہ غیب کی خبر پیغمبر کے بجائے پیغمبری و رسالت و نبوت خدا کی خبر اور علم غیب کا ذریعہ بنیں گی جس کو وحی کہتے ہیں۔ معلوم ہوا مخلوق کے لئے علم غیب کا ذریعہ صرف وحی ہے جو پیغمبر پر براہِ راست آتی ہے اور امتی کو پیغمبر کے ذریعہ اس طرح نبی اور امتی صرف خدا کی اطلاع ہی سے غیب پر مطلع ہو سکتے ہیں، خود اپنے کسی ارادہ کی قوت، عقل و نظر یا حس و وجدان سے مطلع نہیں ہو سکتے اور ظاہر ہے کہ علم غیب وہی کہا جائے گا جو بلا واسطہ اسباب ہو اور جب وہ بالواسطہ آئے گا تو وہ حقیقی معنی میں علم غیب نہیں ہوگا، اہل اللہ کو کشف و الہام کے ذریعے کسی بات کا علم ہو جائے تو لغۃً اسے علم غیب کہیں گے کہ غیبی امور کا انکشاف ہوا لیکن شرعاً علم غیب نہیں کہیں گے، علم کے جملہ حسی وسائل ہوں یا معنوی، کھلے ہوئے ذرائع ہوں یا چھپے ہوئے ان سے حاصل شدہ علم کو شرعاً علم غیب نہیں کہا جائے گا اور ظاہر ہے کہ جب اصطلاحاً علم غیب وہی ہوگا جو عادی وسائل سے بالاتر ہو کر بلا توسط اسباب از خود ہو تو اس معنی میں علم غیب بجز ذات بابرکات خداوندی اور کسی کے لئے نہیں ہو سکتا کیوں کہ غیرِ خدا کو جب بھی علم ہوگا اور جیسا بھی ہوگا وہ عطاءِ الٰہی ہوگا خواہ وحی سے ہو یا کشف و الہام سے، تجربے سے ہو یا حواس سے، عقل و خرد سے ہو ظاہری اسباب کے راستے سے ہو یا باطنی اور معنوی اسباب کے طریق سے، ظاہر ہے کہ ان معنوں میں علم غیب خاصۂ خداوندی نکل آتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے دعویٰ کو متعدد آیتوں سے مدلل و مبرہن کیا ہے، الفاظ قرآنی سے ایسے حکیمانہ نکتے اور الفاظ کی معنوی وسعت کو ظاہر کرتے ہوئے اس کے حقیقی مقصود کو اس طرح واضح کیا ہے کہ دل استدلال و استنباط نتائج سے قطعی طور پر مطمئن ہو جاتا ہے، آیتوں کی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے آیت کے ایک ایک لفظ اور آیتوں کے انداز بیان سے غیر اللہ سے علم غیب کی کلی نفی اور اس کے متعلق ہر ہر شبہ کا حل اور ذہنی خلجان کو دور کر دیا ہے اور تمام شرک آمیز تصورات کا قلع قمع کر دیا ہے۔

قرآن کی آیتوں میں کئی مقامات پر علم غیب پر رسولوں کو مطلع کرنے کا ذکر آیا ہے اس سے عام ذہن میں یہ خیال آسکتا ہے کہ جب ذاتِ خداوندی عالم الغیب ہے اور اس نے اپنے علم غیب پر رسولوں کو مطلع کر دیا ہے تو خدا اور رسول دونوں علم غیب میں برابر ہو گئے زیادہ سے زیادہ ایک کا علم ذاتی ہوگا اور دوسرے کا عطائی

لیکن علم میں مساوات تو پیدا ہوگئی ہے اور یہ سراسر مشرکانہ عقیدہ ہے کہ عبد و معبود دونوں میں کسی طرح کی مساوات پیدا کی جائے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس بحث کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور خود آیت ہی کے لفظوں سے اس ذہنی خلجان کو واضح طور پر دور کر دیا ہے، اس سلسلہ میں آپ نے تحریر کیا ہے کہ اظہار غیب کے موقع پر رسول کا لفظ قرآن میں ذکر کیا گیا ہے یعنی جس ذات پر غیب کو ظاہر کیا گیا ہے وہ وصف رسالت سے متصف ہے یعنی اطلاع غیب کی مستحق اور متقاضی کسی رسول کی ذات نہیں بلکہ وصف رسالت اور عہدہ و منصب نبوت ہے اسی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ اس موقع پر لفظ رسول لا گیا ہے اور یہ بالکل واضح اور ہر شخص جانتا ہے کہ رسول کی رسالت کا موضوع اور مقصد توحید اور اصلاح خلق اللہ ہے نیز بندگانِ خدا کی راہِ حق کی طرف رہنمائی اور ان کی تربیت و تکمیل ہے اس لئے وصفِ رسالت کا قدرتی تقاضا وہی علوم غیب ہو سکتے ہیں جو کہ ہدایت و اصلاح میں کارآمد ہوں اور جن علوم غیبیہ کا اصلاح و تربیت میں دخل نہ ہو اس سے وصفِ رسالت کو خود ہی سروکار نہ ہوگا، مغیبات میں قیامت کے وقت، اس کی تاریخ و سن یا اس کی مدت کے قرب و بعد کی اگر رسولوں کو اطلاع نہ ہو جیسا کہ قرآن کی متعدد آیتوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا علم کسی کو نہیں دیا گیا ہے اسی طرح ان بے شمار کائناتی حوادث اور جزئیات کا انہیں علم نہ ہو جو روزمرہ دنیا میں رونما ہوتی رہتی ہیں تو یہ ان کے حق میں نہ صرف یہ کہ کسی طرح کا نقص نہیں بلکہ ان امور کا علم نہ ہونا ہی ان کے وصفِ رسالت کا ایک طبعی وفطری تقاضا ہے۔

جب رسولوں کو علم غیب کی طرف وہی قسم دی گئی ہے جن کا ان کے منصب رسالت سے تعلق ہے اور بقیہ مغیبات کا علم نہیں دیا گیا کیوں کہ ان کے منصب نبوت کو ان کی ضرورت ہی نہیں تھی تو پھر اس سے نبیؑ کی شان میں نقص کہاں لازم آتا ہے؟ ان حقائق کے ہوتے ہوئے رسول کے لئے جمیع ما کان و ما یکون کے علم کا دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے جو قرآن کے اُسلوب بیان اور شریعت خداوندی کے مزاج سے ناآشنا اور وصف رسالت کے فطری تقاضوں سے بے خبر ہو۔

قرآن و حدیث اور عقل و نقل سے علم غیب کے مسئلہ کی صحیح صورت پیش کر کے آخر میں تحریر کیا کہ قرآنی تصریحات و تلمیحات کے ہوتے ہوئے حضرت سید الاولین والآخرین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علم غیب کا دعویٰ اور وہ بھی علم کلی اور علم ما کان و ما یکون کی قید کے ساتھ نہ صرف بے دلیل و بے سند بلکہ مخالف دلیل معارض قرآن اور اس توحیدی شریعت کے مزاج کے خلاف ہونے میں اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا، علم ما کان

وما یکون حضور ﷺ کے لئے ثابت کرنے کی غرض سے بعض احادیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے حضرت حکیم الاسلامؒ نے بالاستیعاب ان دلائل کا علمی جائزہ لیا ہے اور ہر ایک کا شافی اور مدلل ومبرہن وغیر مبہم الفاظ میں رد کیا ہے۔

بحث کے آخر میں آپ نے حکیمانہ انداز میں مسئلہ کو پرکھ کر کھوٹے اور کھرے کو علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے اس سلسلۂ بحث میں علم غیب کی حقیقت و ماہیت کو پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ عقلی طور پر بھی علم کلی مخلوق کے لئے ممکن نہیں، آپ نے نظامِ کائنات کی قدرتی ترتیب کو پیش کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ایک حقیر سے حقیر جز کا بھی علم وادراک اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ موجودہ اور ممکنہ کائنات کا یہ سارا کلیاتی نظام اپنی حقیقت سمیت علم میں نہ آجائے اور ذہن ان سارے حقائق وکلیاتی نظام اپنی حقیقت سمیت علم میں نہ آجائے اور ذہن ان سارے حقائق وکلیات کا احاطہ نہ کرلے اور یہ انسانی بساط سے باہر ہے، یہ کلامی اور فلسفیانہ بحث پچاسوں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ کتاب کا آخری حصہ اتنا بلند اور دقیق ہے کہ جن لوگوں کے دل ودماغ کی تطہیر کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے ان کے مبلغ علم سے کہیں بلند اور دقیق ہے، لیکن جو لوگ معقول اور معقول دلائل کے متلاشی ہیں ان کے لئے یہ کتاب تسلی بخش دلائل فراہم کرتی ہے اور ذہن کے سارے خلجان کو دلیل وبرہان کی روشنی میں دور کرتی ہے اور مسئلہ کے صحیح پہلو کو متعین کرتی ہے، یہ متکلمانہ بحث دیکھ کر مفکر اسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کی یاد آجاتی ہے جنہوں نے ایک نئے علم کلام کی بنیاڈالی اور دشمنانِ اسلام کے منہ بند کر دیئے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے بھی اس سے حظ وافر پایا ہے یہ دیکھ کر یہ یقین کرنے پر دل مجبور ہے۔

اسلام کا اخلاقی نظام

ہندوستان میں انگریز آئے تو ان کے ساتھ ہی عیسائیت بھی آئی دونوں کو ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت تھی، عیسائی مذہب کی سرگرمیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا مقصد سیاسی استحکام کے سوا اور کچھ نہیں تھا، مگر بڑے پیمانے پر عیسائی پادریوں کی فوج تیار کی گئی اور اس نے ہندوستان میں مسلمانوں سے پنجہ آزمائی شروع کر دی۔ بڑے بڑے مناظر ہوئے، قدرت بھی وقت کے لحاظ سے افراد پیدا کرتی ہے۔ علماء اسلام میں بھی ایسے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے عیسائیوں کے تار پور بکھیر کر رکھ دیئے مگر پھر عیسائیت نے ہندوستان میں اپنے قدم جمالئے اور لاکھوں ہندوستانی عیسائی ہوگئے۔ ہندوستانی عیسائیوں میں بھی کچھ

پڑھے لکھے تھے۔ انہوں نے بھی مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔ اسی طرح ایک پادری نے روڑ کی سے حضرت حکیم الاسلامؒ کو ایک خط لکھا جس میں اس نے اسلام پر کچھ اعتراضات کئے اور اسلام کے اخلاقی نظام کو اپنا نشانہ بنایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام سے عیسائیت کا نظام اخلاق کہیں بہتر اور برتر ہے، اس خط میں سب سے اہم اور بڑا اعتراض حضرت زینبؓ سے حضور اکرم ﷺ کے نکاح پر تھا کہ آپ نے زینب کے حسن سے متاثر ہو کر ایک مسلمہ اصول کو نظر انداز کر دیا اور اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا جب کہ خود عرب میں بھی یہ معیوب تھا لیکن زینبؓ کے حسن نے آپ کے دل میں اپنی جگہ بنا لی تھی اور چاہتے تھے کہ کسی طرح سے زینبؓ سے نکاح کر لیں۔ قرآن نے خود کہا کہ آپ دل میں جو کچھ چھپا کر رکھتے ہیں اللہ ان کو ظاہر کر دینے والا ہے۔ و تخفی فی نفسک ماالله مبدیہ قرآن میں موجود ہے اس خط میں کہا کہ ''قرآنی اخلاقی معیار ایک عجیب چیز نظر آتی ہے جب بیٹے کی بہو پر طبیعت چلی گئی تو پھر آسمانی وحی نے ساری روحانیت، نیکی اور سچائی پر ایسا بھاری پردہ ڈال دیا کہ تمام دینداری چھپ گئی اور اپنے بیٹے کی بہو کو اپنی بیوی بنانے کا حق اللہ میاں سے حاصل ہو گیا۔ آپ کو ماننا پڑے گا کہ زید کی بیوی کو نبی کی جورو بنا دینے کا حکم غلط ہی نہیں بلکہ گناہ اور زنا کاری کو فروغ دینا ہے کیوں کہ خدا ایسی بات نہیں کر سکتا کہ ایک موزوں جوڑے کو توڑ کر ایک نہایت غیر موزوں جوڑا بنا دیا جائے۔''

اس کے بعد پادری نے قرآنی نظام اخلاق کے مقابلہ میں بائبل کے بیان کردہ نظام کے دس اصولوں کو ترجیح دی ہے، بائبل کے ان اصولوں میں سے چوری نہ کرنا، زنا نہ کرنا، خون مت کرنا کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اولاً بائبل کے حوالے سے پیش کردہ دس احکام کو معیارِ اخلاق دینے پر جو گفتگو کی ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ انیسویں صدی میں ہونے والے عیسائیوں سے معرکۃ الاراء مناظروں کی بحثوں سے پوری طرح واقف ہیں جن اسلامی مناظروں کے مستحکم دلائل کی قوت ان کی تاثیر ان کی اثر اندازی نے عیسائی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا اور جس کی وجہ سے ہندوستان سے یورپ تک کے عیسائیوں کے دل و دماغ کو لقوا مار گیا تھا اور میدانِ مناظرہ سے عیسائی مناظرین اس طرح سرپٹ بھاگے کہ قرآن نے باطل کے فرار کی جو محاکات کی ہے اس کا پورا نقشہ سامنے آ گیا۔ جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اصل مسئلہ پر گفتگو سے پہلے موجودہ بائبل کو ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہوئے انہیں ناقابل شکست دلائل سے اس کو محرف ثابت کیا جو ان کے اسلاف نے عیسائی دنیا کے سامنے پیش کئے

تھے جس کے رعد و برق کی طرح کڑکنے اور گرجنے والے عیسائی مناظرین میں شہر خموشاں کا سکوت اور قبرستان کا سناٹا چھا گیا، بائبل کی تحریف کے ثابت کرنے کے باوجود بائبل کے حوالے پیش کردہ ان دسوں احکام کے بارے میں تحریر کیا کہ یہ امور نہ خود معیار اخلاق ہے اور نہ معیار اخلاق بن سکتے ہیں کیوں کہ یہ دس باتیں مثلاً چوری مت کر، زنا مت کر، تو خون مت کر از قسم افعال ہیں جن کا تعلق کرنے نہ کرنے سے ہے، از قسم اخلاق نہیں ہیں جو قلب کے خلقی مادے ہیں۔ اخلاق کی حیثیت بیج کی ہے اور قلب اس کے لئے زمین ہے۔

جب یہ بیج اس کی جڑ کو پکڑ لیتا ہے تو اس بیج سے شاخیں پھوٹتی ہیں، شاخوں سے تخم نہیں بنا کرتا اس لئے افعال سے سرزد ہو سکتے ہیں لیکن افعال سے اخلاق پیدا نہیں ہوتا، آدمی میں خلق وشجاعت ہے تو اس سے حملہ کرنے کا فعل ظاہر ہوگا، آدمی میں جو خلق دوستی ہے اس سے دادودہش کا فعل وجود میں آئے گا۔ اس طرح تمام افعال اخلاق کی بیج سے پیدا ہوتے ہیں قلب میں صبر، شکر، سخاوت، شجاعت، مروت، غیرت، حیا وغنا جن کو اخلاق کہا جاتا ہے اگر انسان میں یہ اخلاق پیدا ہو جائیں تو اس شخص سے انہیں اخلاق کے مطابق افعال سرزد ہوں گے اس لئے آپ کا بیان کردہ چوری نہ کر، زنا نہ کر، خون مت کر معیارِ اخلاق کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص شاخوں کو بیج کے اچھے ہونے کا معیار بتانے لگے، پھر ان جملوں سے ان جڑوں کے حرام ہونے کا تو علم ہوسکتا ہے لیکن ان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان فعلوں کی ممانعت کی بنیاد کیا ہے اور ان افعال کی حرمت کی علت کیا ہے وہ علت ہی درحقیقت معیار حکم بن سکتی ہے پھر یہ علت جہاں جہاں پائی جائے گی وہ چیز حرام ہوتی چلی جائے گی، ان جملوں سے ان کی علتوں کا کوئی پتہ نہیں چلتا اس لئے وہ ایک جزئی حکم بن کر رہ جاتا ہے اور بطور حکم کلی اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا اور جزئیات منفردہ کا نام قانون اور ضابطہ نہیں ہوتا، معیار قانون اگر دیکھنا ہے تو یہ ہے جو انہیں احکام کے بارے میں قرآن عظیم نے بتایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک جزئی حکم کے ساتھ اس کی جامع علت اور علت وحکم کا درمیانی رابطہ دکھلا کر اسے معیاری قانون بنادیتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے قرآن کی متعدد آیتوں سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں ان سے ایسے حکیمانہ نکتے پیدا کئے ہیں، جہاں تک عام اہل علم کی نگاہیں عام طور پر نہیں جاتی ہیں اور ان کے ذہن ونقاد نے جو نتائج نکالے ہیں ان سے قرآن کی جامعیت اور قرآنی الفاظ کی معنوی وسعت، اسلامی قانون کی گیرائی و گہرائی کا یقین ہوتا چلا جاتا ہے اور دل حیرت واستعجاب میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ آیتیں روز پڑھی جاتی ہیں لیکن ان لطیف نکتوں کی طرف ذہن نہیں جاتا ہے جو درحقیقت روحِ کلام اللہ کا درجہ رکھتے ہیں، حکیم الاسلامؒ کی نکتہ شناسی اور دقیقہ رسی کی اسی سلسلہ میں ایک مثال پیش ہے۔

آپ نے بائبل کے جزئی فعل کے مقابلہ میں قرآن کے کلی حکم اور اس کی قانونی وسعت کو سمجھانے کے لئے **لاتقربوالزنا انهٗ کان فاحشةً و ساء سبیلا** کو پیش کیا ہے۔آپ نے بتایا کہ آیت نے زنا سے روکتے ہوئے اس کی بنیادی علت بھی بتادی ہے، اس علت کو لفظ ''فحش'' اور ''سوءِ سبیل'' سے تعبیر کیا ہے، یہی اس کی ممانعت کا معیار ہے۔انہیں دو باتوں کی وجہ سے فعل زنا میں حرمت پیدا ہوتی ہے، اگر قلب میں فحش اور غلط روی کے بجائے عفت و پاکدامنی ہو اور نکاح اور ملک متعہ کی راہ اختیار کرے تو یہی فعل حرام ہونے کی بجائے حلال ہوجاتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ خود یہ فعل اپنی ذات سے برا ہے نہ ممنوع، 'فحش' سوء سبیل، نے اس میں ممانعت کا حکم پہنچایا ہے، اس لئے اس آیت میں حکم زنا کی ممانعت کے ساتھ اس کا معیار بھی ذکر کر دیا ہے کہ وہ فحش اور سوء سبیل ہے یعنی بے حیائی اور بے راہی، اس لئے اس قرآنی حکم کو معیاری حکم کہیں گے نہ کہ انجیل کے حکم کو کہ جس میں صرف ممانعت زنا تو ہے معیار کا کوئی ذکر نہیں اور جب کہ یہ علت ہی معیارِ حکم ہے اور انجیل میں مذکور نہیں تو انجیل کا یہ حکم معیارِ اخلاق تو کیا ہوتا معیارِ حکم بھی نہیں، حکم اور علت دونوں کو ساتھ ساتھ ذکر کر دینے سے یہ معلوم ہوگیا کہ ممانعت میں فعل زنا اصل نہیں بلکہ فحش اور سوء سبیل اصل ہے تو ممانعت فحش اور سوء سبیل کی چوں کہ زنا میں بھی علت ہے اس لئے وہ بھی ممنوع ہوئی۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ فحش ممنوع جس فعل میں پایا جائے گا وہ فعل بھی بضمن فحش درجہ بدرجہ ممنوع ہوتا چلا جائے گا جیسے اجنبی عورت پر نگاہ ڈالنا، اس کی طرف بری نیت سے چل جانا، اسے ہاتھ لگانا، دل میں اس کے خیالات پکانا وغیرہ فحش کے افعال تھے اس لئے یہ سب ممنوع قرار دیئے گئے اسی لئے حدیث میں نگاہ بازی کو آنکھ کا زنا کہا گیا ہے، اجنبی عورت کو چھونے کو ہاتھ کا زنا کہا گیا، بدکاری کی نیت سے چل کر جانے کو پاؤں کا زنا کہا گیا ہے اس لئے فحش کی علت کی بنا پر ایک زنا ہی حرام نہیں ہوا بلکہ وہ سارے افعال بھی ممنوع ہوگئے جس کو فحش اور بے حیائی نے ابھارا ہو جن کو ہماری شریعت میں دواعی زنا کہا گیا ہے بس اس ایک حکم زنا کی ممانعت سے ایک ہی آیت کی بدولت بے حیائی کے ہزاروں افعال حرام ہوگئے جو درحقیت بیان معیار کا اثر ہے۔حضرت حکیم الاسلامؒ نے قرآن کے اس حکم اور بائبل کے حکم کا موازنہ کرتے ہوئے قرآنی حکم کی وسعت پھیلاؤ جامعیت اور اس کے دوررس اثرات کی حقیقت ومعنویت کو اتنا واضح کیا ہے کہ اس کے بعد کسی کلام کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے دعوے میں کہا ہے کہ قرآن میں ننانوے اخلاقی معیار بتائے گئے ہیں اور ان کو خداوند قدوس کے نناوے اسماءِ حسنیٰ سے ثابت کیا ہے، آپ نے سب سے پہلے حدیث سے ننانوے

اسماءِ حسنیٰ کوشمار کرا کے انہیں اسماء سے ننانوے اصول اخلاق ثابت کئے ہیں اور ننانوے اخلاقی قوانین مستنبط کر کے شمار کرائے ہیں، یہ بحث اپنی نوعیت کی منفرد بحث ہے اور حکیم الاسلامؒ کے ذہن کی دقیقہ رسی کا ثمرہ ہے، حیرت یہ ہے کہ جب پوری بحث پڑھئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ حقیقتیں ہیں جو ہماری زندگی میں جاری وساری ہیں لیکن آج تک ان الفاظ کی معنوی گہرائی تک ہماری رسائی نہیں ہوئی اور جب حکیم الاسلامؒ کے قلم نے ہماری لاعلمی کے پردے ہٹادئے تو ہماری جانی پہچانی حقیقتیں ہمارے سامنے آ گئیں اسی لئے بے ساختہ حضرت والاؒ کے لئے ''حکیم الاسلام'' کا خطاب ہماری زبانوں سے نکل جاتا ہے جس کے وہ صحیح طور پر مستحق تھے۔

آیاتِ قرآنی سے ننانوے اسماءِ حسنیٰ شمار کرانے کے بعد آپ نے بتایا کہ یہی حق تعالیٰ کے وہ اصول اخلاق، رحم وکرم، حلم وصبر، عفو ودرگذر، عظمت، قدرت، قوت، محبت، عدل وانصاف، علیمی وخبیری، وسعت و احاطہ یکتائی، غنا، نورانیت، ہدایت، بزرگی، حفظ ونگہبانی، نفع وضرر، انعام، انتقام، سلبِ عطا، ثبات واستقلال، مصدریت، کمالات، تقدس، پاکی، حکومت وملوکیت، لطافت، ستھرائی، علوّ شان، اعزاز، تذلیل وغیرہ وغیرہ ہیں جن کی اصولی تعداد ننانوے تک پہنچتی ہے جنہیں حدیث میں اسماءِ الٰہیہ کے نام سے تعبیر کیا ہے اور قرآن نے اسماء حسنہ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یہی وہ پاکیزہ اخلاقِ خداوندی ہے جنہیں حاصل کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے امت کو حکم **تخلقوا باخلاق الله** سے دیا ہے۔ انہیں اخلاقِ الٰہیہ سے مخلوق کی اخلاقی تکمیل کے لئے نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے، آپ نے فرمایا **بعثت لاتمم مکارم الاخلاق**۔

اسلام کے قوانین اخلاق کو پیش کر کے آپ نے انجیل کے مذکورہ دس احکام کو بچکانہ بات بتایا اور کہا کہ قرآن کے نظام اخلاق کی وسعت کے سامنے یہ چند سطحی باتیں پیش کر کے سورج کو چراغ دکھانا ہے، اس کے باوجود عیسائی کہتے ہیں کہ اسلام کا کوئی نظام اخلاق نہیں ہے اور اگر معیاری اخلاق ہے تو عیسائیوں کی تحریف شدہ انجیل کی تعلیمات میں ہے، جنوں کا نام خرد رکھ لیا خرد کا جنوں!

روڑکی کے پادری نے دوسرا اعتراض حضرت زینبؓ سے حضور ﷺ کے نکاح پر کیا ہے، یہ اعتراض روڑکی کے اس معمولی پادری کے دماغ کی اختراع نہیں ہے بلکہ مشہور مستشرقین کا چبایا ہوا لقمہ ہے، سومویر، درمنجم، واشنٹن ارنج اور کامنس نے اپنی اپنی کتابوں میں بڑے زور وشور سے لکھا ہے جن کا مدلل جواب علماء مصر نے عربی اور انگریزی میں اتنی تفصیل سے دیا ہے کہ اب مزید اس پر اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ مستشرقین کی غلط فہمی نہیں اور نہ تاریخ اسلام سے ناواقفیت کی بنیاد پر یہ اعتراض کیا ہے بلکہ تنگ نظری، عصبیت، اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی سازش کے طور پر کیا گیا ہے، ورنہ معترضین کو خوب معلوم ہے

کہ مشاہیر مبصرین نے ان آیات قرآنی کی جو تفسیریں کی ہیں اور اسلامی تاریخ میں جو تفصیلات مذکور ہیں ان کو پڑھنے کے بعد کسی انصاف پسند اور حقانیت دوست کے لئے اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی، یہ علماء اسلام اور مبصرین کرام آیاتِ قرآنی کے مفہوم و مقصد کو ان مستشرقین سے کہیں زیادہ اور بہتر طور پر سمجھتے ہیں اور مستند اسلامی تاریخوں میں واقعہ کی ساری تفصیل موجود ہے ان کی موجودگی میں اعتراض بے غیرتی اور بے حیائی کے سوا اور کچھ نہیں، اس پاکیزہ واقعہ کو بدمنظر بنانے میں مستشرقین کی بدنیتی کو دخل ہے اس کے باوجود بھی دورِ جدید کے محقق علماء اسلام نے یورپ کو کافی وشافی جوابات دیئے ہیں جس کے بعد اس مسئلہ پر مزید گفتگو عیسائیوں کی بے غیرتی اور بے حیائی ہے اور کچھ نہیں۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے بھی روڑکی کے اس پادری کو تفاسیر اور تاریخِ اسلام کے مستند حوالوں سے جواب دیا ہے وہی اصل حقیقت ہے۔ تفسیر و تاریخ کی تفصیلات کو حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے مخصوص انداز بیان اور حکیمانہ نکتہ رسی اور زیادہ واضح، موثر، باوزن اور باوقار بنا دیا ہے۔

حدیث رسول کا قرآنی معیار

آزادی سے پہلے کے پنجاب سے انکارِ حدیث کا فتنہ اٹھا تھا، اس گروہ کا کہنا تھا کہ احادیث کا یہ انبار غیر یقینی رطب و یابس اور متضاد باتوں پر مشتمل ہے، ان احادیث کی روشنی میں اسلام کی جو تصویر بنتی ہے وہ اسلام سے قطعاً مختلف ہوتی ہے جو قرآنی آیات کے رنگ و روغن سے تیار ہوتی ہے اس لئے اگر اسلام کو اپنی اصل ہیئت پر باقی رکھنا ہے تو صرف قرآن کو معیارِ عمل بنانا ہوگا، احادیث کے اس سارے ذخیرے کو آگ لگانی پڑے گی۔ انہوں نے عوام کے ذہن کو خراب کرنے کے لئے احادیث سے تضادات کو جمع کر کے احادیث پر عمل کرنا ناممکن ثابت کرنے کے لئے کتابیں لکھی تھیں ''دو اسلام'' ان کی مشہور کتاب ہے۔

جب یہ فتنہ شباب پر تھا اور بازار میں ان کی کتابیں آئیں تو اسی دور میں ان کی رد میں بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے، تدوین احادیث کی تاریخ پر محققانہ کلام کیا گیا احادیث کی صحت اور ان کے کلامِ رسول ہونے کو دلائل قطعیہ سے ثابت کیا گیا اور بتایا گیا کہ احادیث کے ذخیرے میں صحیح اور موضوع دونوں طرح کی روایتیں ضرور ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ غلط اور موضوع روایتوں کو روکنے کے ساتھ ساتھ صحیح حدیثوں کو بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے، احادیث رسولؐ کے کلام رسولؐ ہونے کی سند اور دلیل دنیا کے تمام مروجہ معیار تحقیق سے کہیں زیادہ مستند اور محقق ہے اور یہ معیار اتنا اونچا، بلند اور یقینی ہے کہ اس سے

زیادہ کھری کسوٹی پر کوئی واقعہ پرکھا نہیں گیا۔ اگر کوئی شخص احادیث کے معیار اور اس کی تسلیم کردہ کسوٹی کی صحت پر یقین نہیں کرتا تو آج دنیا کی پوری تاریخ جھوٹ کا پوٹ ہو کر رہ جائے گی کیوں کہ ان کا معیار تحقیق حدیث کے معیار تحقیق کے مقابل انتہائی گھٹیا اور غیر یقینی ہے حالاں کہ ہر شخص تاریخ کی صحت پر یقین کرتا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ تاریخ سے کہیں زیادہ سچی کسوٹی پر پرکھی ہوئی احادیث کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا ہے۔ احادیث کی حقیقت کو جانچنے کے لئے فن بیوگرافی کو ایجاد کیا جو اس سے پہلے وجود میں نہیں آیا، چار لاکھ اشخاص کے پوست کنندہ حالات مرتب کر کے لکھے گئے۔ ان کے صدق و کذب کی پوری پوری چھان بین کی گئی جب ان کی صداقت راست بازی کی تحقیق کر لی گئی تو ان کی زبانی سنی ہوئی حدیث کو صحیح قرار دیا گیا ورنہ اس کے منہ پر مار دیا گیا۔ موضوع روایتوں کے وجود سے انکار نہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ صحیح اور غلط احادیث میں تمیز نہ کی جا سکے اور قطعیت کے ساتھ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیا جا سکتا ہے، تضادات، اسرائیلیات، بدمذہبوں اور زندیقوں کی الحاقی باتیں کم علم والوں کے ذہن میں تذبذب اور تشکیک کا باعث بن سکتی ہیں، اہل علم جن کی پورے ذخیرۂ حدیث پر مبصرانہ نگاہ ہے وہ کھرے اور کھوٹے کو اس کسوٹی پر پرکھتے تھے جس سے زیادہ قابلِ اعتبار یقینی سچی کسوٹی آج تک دنیا میں وجود میں نہیں آئی۔ فتنہ انکارِ حدیث نے زیادہ پر و بال نہیں نکالے اور جلد ہی اپنی موت آپ مر گیا، غالباً حکیم الاسلامؒ نے بھی اسی دور میں یہ کتاب تحریر فرمائی ہے اور اپنے بلند علمی معیار سے کلام کیا ہے اور قرآن ہی سے احادیث کے واجب العمل ہونے کو جن جن طریقوں سے ثابت کیا ہے اور احادیث کی ساری قسموں کو آیاتِ قرآنی کی روشنی میں مستنبط کیا ہے اور اس کے درجۂ اعتماد کو متعین کیا ہے حق یہ ہے کہ بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے، احادیث کی حجت کو قرآن کی آیات سے جس باریک بینی اور الفاظِ قرآنی کی معنوی وسعت کو نمایاں کرتے ہوئے جس گہرائی سے ثابت کیا ہے حق یہ ہے کہ یہ کام حکیم الاسلامؒ کا ہی نکتہ آفریں دماغ کر سکتا تھا اور اسی نے کیا بھی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے گفتگو کا آغاز اس دعویٰ سے کیا ہے کہ دین کی دو اصلیں ہیں۔ قرآن اور سنت، ان کے علاوہ اجماع اور قیاس بھی حجت اور واجب العمل ہیں مگر بذات خود اصل نہیں ہیں بلکہ بالواسطہ ہیں کیوں کہ اجماع اور قیاس وہی معتبر ہے جو قرآن و حدیث کی تصریحات کے مطابق ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی اجماع اور قیاس قابلِ اعتبار اور واجب العمل نہیں، پھر اس دعویٰ کو متعدد آیاتِ قرآنی سے ثابت کیا ہے اور دلائل کا مفصل ذکر کیا ہے اور مثالوں سے واضح کیا ہے۔

آپ نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن کے صحیح اور حقیقی معنی ومفہوم کو سمجھنا ممکن ہی نہیں اوراس کی ناقابل تردید دلیلیں بھی دیں اور کہا کہ خدا کی ذات جس طرح لامحدود ہے اسی طرح اس کی صفاتِ کمال بھی لامحدود ہیں اور انسان اس کا ادراک بغیر تحدیدات، تعینات اور تشخیصات کے نہیں کرسکتا اور اس کے لئے کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ وہ محدود رہتے ہوئے لامحدود ذات وصفات تک رسائی پائے یا اس کا ادراک ومعرفت کرلے اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان ایک برزخ اور درمیانی طبقہ پیدا کیا جو ذاتِ حق سے قریب تر اور تعینات کے لحاظ سے بندوں میں شامل اور کمال بشریت کا نمونہ رہتا ہے، انہیں کو ہم انبیاء رسل کہتے ہیں، کمالاتِ ربانی کے نمونے نبی کی ذات قدسی صفات میں ظہور کرتے ہیں تو عام بندوں کے لئے سہل ہو جاتا ہے کہ اس نبی سے وابستہ ہوکر حسب استعداد خدا تک رسائی حاصل کرلیں۔

حق تعالیٰ کی صفاتِ کمالیہ میں ایک صفت صفتِ علم یا صفتِ کلام بھی ہے۔ یہ علوم خداوندی کی ترجمانی اور تعبیر کرنے والی ہے اور صفتِ علم کا مظہر اتم قرآن حکیم ہے جو اپنی اصولیت، وکلیت، کمالِ جامعیت اور شئون الٰہیہ سے بھرپور ہونے کی وجہ سے جن سے یہ کلام وجود میں آیا ہے ذاتِ خداوندی کی طرح لامحدود الحقائق، لامحدود المعارف اور لامحدود المطالب ہے جو ایک نوع نہیں بلکہ ماضی ومستقبل اور حال کی ہزار ہا انواع علوم پر حاوی اور مشتمل ہے، اب ایسے کلام کا سمجھنا بنا خدا کی رہنمائی کے ممکن نہ تھا اور اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے۔ ایسا فردِ کلام اور اس کی تفہیم کا واسطہ بنے جس کا متکلم تو ہم جیسوں میں سے ہو لیکن اپنے قلبِ ثانی اور دماغِ عالی جہت سے عرشیوں میں سے ہو جس طرح ذاتِ خداوندی تک بلا رسول کے واسطے کے ہماری رسائی ناممکن تھی اسی طرح کلامِ خداوندی تک بلا کامِ رسول ہماری فہم کی رسائی ناممکن تھی، ہم اسی کلامِ رسول کو احادیث کہتے ہیں گویا حدیث پر عمل عین قرآن پر عمل اور منشاء خداوندی پر عمل ہے اور اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

آپ نے اپنے دعویٰ کو اور مدلل کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں منجانب اللہ ہیں، حضور ﷺ اس کے ناقل ہیں، نزول الفاظ، جمع الفاظ، اقرار الفاظ سب کچھ ذاتِ باری کی طرف سے ہوا اور بیانِ معانی، شرحِ مطالب اور تعیین مراد بھی خدا ہی کی جانب سے ہوئی، ظاہر ہے کہ جب پیغمبر کو بھی معانی ومرادات کے سمجھنے میں بیانِ حق کے تابع رکھا گیا جن پر خود قرآن اترا تو امت کی کیا مجال ہے کہ اس کہ فہم کو مطالب قرآنی پر حکم بنا کر چھوڑ دیا جائے کہ وہ سلسلۂ معانی میں مدعی یا مجتہد بن جائے، قرآن کی آیتوں سے اپنے اسی دعویٰ کو ثابت کرتے ہوئے آپ نے یہ بات واضح کردی کہ احادیث رسول درحقیقت مراداتِ قرآن ہے، کلامِ رسول آیاتِ قرآنی ہی کی تشریح ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں اب اگر کوئی احادیث کو

ترک کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کو ترک کرتا ہے۔ اگر احادیث پر ایمان نہیں تو اس کا قرآن پر بھی ایمان باقی نہیں رہا۔

آپ نے بعض اذہان کے ان شکوک کو بھی تفصیل سے بیان کر کے ان کا ازالہ کیا ہے جو ایسی احادیث کے موقع پر پیدا ہوتے ہیں کہ ان میں کسی ایسی بات کا حکم ہے جو قرآن میں مذکور نہیں صرف کلامِ رسول ﷺ میں ان کا ذکر ہے مثلاً حمار اہلی کی حرمت، واشمہ پر لعنت وملامت وغیرہ، حکیم الاسلامؒ نے اس کا اصولی جواب دیا ہے کہ قرآن میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ رسول جو لا کر دیں اسے لے لو اور جس سے روک دیں رک جاؤ۔ اب جو احکام آپ نے ایسے دیئے ہیں جو بظاہر قرآن میں مذکور نہیں ہیں وہ بھی اس آیت کی وجہ سے بالواسطہ قرآن ہی کے احکام متصور ہوں گے۔ صحابہ کرامؓ نے اس طرح کے استدلالات کو احادیث کی کتابوں میں پیش کر دیا ہے۔

اس کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ نے احادیث کی قسموں غریب، خبر، عزیز، خبر مشہور، خبر متواتر کو آیاتِ قرآنی سے ثابت کیا ہے اور اس کا صحیح مقام اور درجہ متعین کیا ہے، یہ بحث بڑی لطیف، دلچسپ اور حقیقت آفریں ہے اور بہت تفصیلی ہے، اس حقیقت کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آیاتِ قرآنی سے استخراج نتائج وشواہد اور استنباطِ مسائل پر حضرت حکیم الاسلامؒ کی نگاہ کتنی دقیقہ رس اور نکتہ آفریں تھی یہ متکلمانہ بحث اور اس ناقابل شکست عقلی دلائل انکارِ حدیث کے فتنہ کے لئے آخری کیل سے کم نہیں۔

کلمہ طیبہ

حضرت حکیم الاسلامؒ کی ایک چھوٹی سی کتاب اسی نام سے ہے جو ایک ابھرتے ہوئے فتنہ کے سد باب کے لئے معرض تحریر میں آئی، آزادی سے کچھ دنوں بعد جب کہ مسلمانوں کا مستقبل غیر یقینی اور انتہائی خطروں میں گھرا ہوا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس سرزمین پر مسلمان نام کی کوئی چیز نہیں رہ جائے گی، پھر آہستہ آہستہ زندگی کے سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں نظر آنے لگی تھیں اور یہ آس بن چلی تھی کہ شاید کچھ دن اور یہاں نغمۂ توحید گونجے گا۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا نغمہ لاہوتی فضاؤں میں اپنا نورانی ایمان افروز ترنم بکھیرے گا کہ جنوبی ہند سے کسی بدبخت نے ایک شوشہ چھوڑا کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ جو حریم اسلام کے دروازے کی کنجی سمجھا جاتا ہے یہ صرف اہل عجم کی ذہنی اختراع ہے قرآن وحدیث میں کہیں اس شکل میں اس کلمہ کا وجود نہیں ہے اس پر مستزاد یہ چوں کہ کلمہ طیبہ کی موجودہ شکل عجم کے ذہن کی پیداوار ہے اس لئے

عربی اصول وقواعد کے لحاظ سے بھی اس میں خامی ہے یہی وجہ ہے کہ نہ قرآن میں یہ کلمہ اس شکل میں پایا جاتا ہے اور نہ پورے ذخیرۂ احادیث میں یہاں تک کہ کسی صحابی کے قول سے بھی یہ ثابت نہیں بلکہ اس کلمہ میں نہ عربیت ہے اور نہ شریعت بلکہ ایک ذہنی اختراع اور بدعت ہے جس سے اسلام نے روکا ہے۔

"البدعة ضلالة و کل ضلالةٍ فی النار"

کسی زمانہ میں آریوں نے مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان پر انگریزوں نے قبضہ کے بعد مسلمانوں پر دومحاذ سے آریہ سماجی مسلمانوں پر اعتراضات کے زہریلے تیر برسا رہے تھے، اسی زمانہ میں آریوں کے مسموم ذہن نے یہ اعتراض پیدا کیا تھا لیکن اب کی بار یہ کھلے دشمن کی طرف سے نہیں بلکہ عبداللہ بن ابی کے سلسلۂ نسب کے کسی فرد نے یہ سوال اٹھایا تھا اس لئے یہ اور بھی خطرناک تھا۔

یہ کتاب حضرت حکیم الاسلامؒ نے اسی اعتراض کے جواب میں لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا۔ آپ نے گفتگو اس کلمہ کے مادہ سے شروع کی اور بتایا کہ اس کا اصل ماخذ کیا ہے، آپ نے اس کلمہ کے دونوں جزوں کو قرآن کی متعدد آیتوں سے نکال کر پیش کیا کچھ آیتوں میں جزءِ اول ہے اور کچھ آیتوں میں جزءِ ثانی موجود ہے، اس طرح دونوں اجزا قرآن میں موجود ہیں، اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس کلمہ کی موجودہ ہیئت ترکیبی اور جمع وترتیب اور دو آیتوں کو ملا کر پڑھنے اور انہیں ایک جگہ جمع کر کے ایک کلمہ کہنے کا مسئلہ ہے۔ اس کو قرآن کے اطلاق سے ثابت کیا ہے اور کہا ہے کہ آیاتِ قرآنی کے سلسلہ میں اتصال، انفراد، استقلال، عدم استقلال، اضافہ، عدمِ اضافہ، اجتماع، نوشت وخوانداسی طرح کے اور بہت سے احوال اور تقدیریں جو اس کلمہ کو ادا کرتے وقت اس کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں ان سب کے بارے میں قرآن مطلق ہے یعنی اس نے اس قسم کی صورتوں میں سے کسی نہ کسی صورت کو متعین کر کے دوسری صورتوں کی نفی کی ہے اور نہ ان صورتوں میں سے کسی خاص صورت پر زور دے کر اسے حصر کے ساتھ متعین کیا ہے جس سے دوسری صورتوں پر قید و بند اور پابندی عائد ہو جاتی ہو بلکہ یہ سب صورتیں مساوی طور پر اس کے اطلاق کے تحت آجاتی ہیں اس لئے اصول تفسیر اور عام اصول شرعیہ کی رو سے یہ تمام تقدیریں اور صورتیں اس اطلاع کی وجہ سے نہ صرف جائز ہی رہیں گی بلکہ اس اطلاق قرآنی کا ایک حال اور ایک مصداق بن کر قرآن کی مراد ثابت ہوں گی، جن پر حسب تصریحات اصول قرآن کی دلالت مانی جائے گی اور یہ سب احوال مدلولات قرآن ثابت ہوں گے۔ انہیں احوال میں سے ایک حال ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے کا بھی ہے تو یقیناً وہ بھی مدلول قرآن ہی مانا جائے گا، اسی طرح کلمہ طیبہ کی ہیئت ترکیبی قرآن کی دلالت سے جائز اور

شرعی ثابت ہو جائے گی اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ آیتوں کا ایک مجموعہ بن جائے گا جو کلمہ کے مادہ کے بارے میں قرآنی نص ثابت ہوا ہو اور اس کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں قطعی دلالت کے ساتھ دال ثابت ہو جس کو یا تو نص ہی کہا جائے گا یا ماخذ شمار کیا جائے گا جو ماخذ قریب ہونے کی وجہ سے نص ہی کے قریب قریب ہوگا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اصول بحث کر کے کلمہ کی موجودہ ہیئت ترکیبی کی شریعت کو ثابت کر کے اس کے بہت سے شواہد بھی احادیث سے پیش کئے ہیں پھر آپ نے بدلائل قطعیہ یہ ثابت کیا ہے کہ کلمہ کے دونوں جزوں کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، اس کے لئے بھی آپ نے قرآن ہی سے استدلال کیا ہے، ایک آیت سے اخلاص عبادت اور دوسری آیت سے اتباع سنت کے وجوب کو ثابت کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا کہ دونوں مطلوب قرآنی لازم وملزوم ہیں، اخلاصِ عبادت بغیر اتباع سنت کے اور اتباع سنت بغیر جذبہ اخلاص عبادت کے وجود میں نہیں آ سکتا ہے، اگر عبادت میں اخلاص نہ ہو تو وہیں سے شرک کی سرحد شروع ہو جائے گی اور اگر اتباع سنت کو ترک کر دے تو وہیں سے بدعت کا آغاز ہو جائے گا، شرک و بدعت ہی دو اصلیں ہیں جو دین کی عمارت کو منہدم کرتی ہیں اس لئے اخلاص عبادت اور اتباع سنت کا اقرار واعتراف لازم وملزوم ہو گئے اور جب دو حقیقتوں میں تلازم ہے تو ان کی تعبیروں میں تلازم ضروری ہو جاتا ہے، کیوں کہ معانی کا تلازم تعبیرات کے باہمی تلازم کے بغیر ممکن ہی نہیں، ظاہر ہے کہ اخلاص کی تعبیر جو شرک کی ہر قسم سے مانع ہے وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اور اتباع سنت کی وہ تعبیر جو ہر قسم کی بدعت سے مانع ہو محمد رسول اللہ ہے۔ اب خواہ ان تعبیرات کو شہادت کے الفاظ سے ادا کیا جائے یا قرار وقول وغیرہ سے یا بلا کسی خاص لفظ کے اضافہ کے صرف اصل الفاظ میں ادا کیا جائے۔ بہر حال لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں تلازم باہمی ثابت ہوا اور حاصل تلازم اور حاصل جامع وہی کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ نکلتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کلمہ طیبہ کی وجہ تسمیہ کو آیت قرآن سے نکالا اور متعدد احادیث سے کلمہ کی موجودہ ہیئت ترکیبی کو ثابت کیا ہے جن میں اسی جمع وترتیب کے ساتھ یہ کلمہ مذکور ہے، کلمۂ طیبہ کے شرعی وجود کو ثابت کرنے کے بعد کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت کے عمل استعمال کا صحیح معیار اور فرق مواقع استعمال کی تفصیل بھی پیش کر دی ہے اور بتایا ہے کہ جب اس کلمہ سے عہد و میثاق اور اعلان شہادت مقصود ہوتا ہے تو اس کے دونوں جملوں کو کلمات شہادت 'اُقر، اشھد' وغیرہ سے مزین کر کے استعمال کیا جاتا ہے اور جب کلمہ کا قول محض یا تکلم محض، ذکر خالص، منظور ہوتا ہے تو اسے بغیر ان حروف روابط کے خالص قرآنی الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کسی کو دائرۂ اسلام میں داخل کرتے ہیں چوں کہ

توحید ورسالت کا اقرار وعہد ومیثاق لینا مدنظر ہوتا ہے اس لئے کلمہ کے دونوں جملوں کوشہادت کے ساتھ ادا کر دیا جاتا ہے اور کلمہ شہادت کی تلقین کی جاتی ہے اور جب محض ذکر اللہ یا ذکر وحدانیت ورسالت کے رسوخ کے لئے کلمہ کا تکرار پیش نظر ہوتا ہے تو کلمہ طیبہ کی تلقین کی جاتی ہے جس میں ادوات شہادت کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔

آخر کتاب میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے ان اشکال کو دور کیا ہے جو معترضین نے اس کی عربیت کے خلاف ہونے کی صورت میں پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ عربیت اور اصول نحو کے لحاظ سے غلط ہے۔ دونوں جملوں کا ایک ساتھ موجودہ شکل میں استعمال صحیح نہیں ہے، آپ نے اولاً تو اس اعتراض کی بنیاد ہی منہدم کردی کہ جن قواعد واصول کو پیش نظر رکھ کر یہ اعتراض اٹھایا گیا ہے وہ خود اسی قرآن کی طرزِ ادا اور طرزِ تعبیر سے ماخوذ ہیں، اس لئے ان اصولوں قواعد عربیت قرآن کی آیتوں کو جانچنا کسوٹی پر سونے کو جانچنا نہیں بلکہ سونے کو کسوٹی پر کھنے کی الٹی منطق اور کھلی ہوئی حماقت ہے، یہ کلمہ اپنے اجزا کے لحاظ سے قرآن میں موجود ہے اور قرآن کے اطلاق کی رو سے ان اجزاء کو انہیں کی ہیئت کے ساتھ ترکیب دے کر یا ملا کر پڑھنا جائز ہے اور اپنی ترکیب کے لحاظ سے بعینہٖ احادیث میں موجود ہے اس کے بعد عربیت کی سند کے لئے کسی رسمی حجت کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔

اس کے باوجود حضرت حکیم الاسلامؒ نے کلمہ کی ہیئت کذائی کو درست اور صحیح ثابت کرنے کے لئے فن بلاغت کے قواعد واصول پیش کر کے آپؒ نے ثابت کیا ہے کہ اصول نحو اور قواعد واصول و بلاغت کی رو سے بھی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی ہیئت ترکیبی درست صحیح اور فصیح ہے اور اس پر کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے، کتاب اپنے موضوع اور عالمانہ طرز استدلال کے لحاظ سے منفرد ہے۔

التشبہ فی الاسلام

حضرت حکیم الاسلامؒ کی یہ کتاب اسلامی تہذیب وتمدن اس کی خصوصیات اور اس کی اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے، تہذیب کا ایک لفظ مختصر اپنی پنہائیوں اور معنوی وسعت کے لحاظ سے پوری انسانی زندگی کو گھیرے ہوئے ہے اور صرف مادی اور ظاہری زندگی اس کے دائرے میں نہیں آتی بلکہ اس کا اثر انسان کی داخلی زندگی، خیالات، جذبات اور رجحانات پر پڑتا ہے، تہذیب ایک قوم کو دوسری قوم سے ایک دور کو دوسرے دور سے ممتاز کرتی ہے۔ تہذیب کا درحقیقت قوموں کی حیات وموت سے گہرا ربط وتعلق ہے۔ اگر کوئی تہذیب فنا ہوگئی اور اس کا وجود مٹ گیا تو سمجھ لیجئے کہ ایک قوم مرگئی اس لئے اگر کوئی اپنی تہذیب کی

حفاظت کرتی ہے اور اس کو محفوظ رکھنے کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار رہتی ہے تو کوئی طاقت اس قوم کو نہیں مٹا سکتی، اگر کسی قوم کا حقیقی اور عملی وجود مٹانا ہے تو اس کی تہذیب کا گلا گھونٹ دو وہ قوم ازخود مر جائے گی، اس کی تہذیب کو تہ و بالا کر دو، اس قوم کو بغیر ایک قطرۂ خون بہائے قتل کر وگے اور اس کے وجود کو فنا کے گھاٹ اتار دو گے اگر اس قوم کا مادی وجود باقی بھی رہ گیا تو بحیثیت ایک زندہ قوم کے اس کا کوئی وجود نہیں ہوگا اس کی حیثیت سیلاب میں بہتے ہوئے تنکے کی طرح ہو کر رہ جائے گی اس کی اپنی توانائیوں کا وجود ختم ہو جائے گا، اس کی زندگی ایک بے مقصد زندگی ہی ہوگی جس کی کوئی منزل نہ ہو یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اسلامی تہذیب پر بہت زور دیا ہے۔ اسلامی تہذیب میں کسی دوسری تہذیب کی آمیزش کی سختی سے ممانعت کی ہے۔ تہدید آمیز لفظوں میں کہا گیا ہے کہ **من تشبه بقوم فهو منهم** بانیٔ اسلام نے اس لئے اسلامی تہذیب کی بقا کے اصول و قواعد اور حدود مقرر کئے ہیں اور ان سے سرمو انحراف کو اسلام برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی کتاب التشبہ فی الاسلام اسی اسلامی تہذیب کی خصوصیات اس کی اہمیت اس کے حدود کو روشنی میں لانے کی ایک کامیاب کوشش ہے، مصنف نے اپنی دقیقہ رسی و نکتہ شناسی کی صلاحیتوں کی وجہ سے مسئلہ کو پوری جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے، مانعیت کے پہلو سے اسلامی تہذیب کے گرد ایک آہنی حصار قائم کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے۔

ایک قوم کا دوسری قوم کی تہذیب کو قبول کر لینا اپنی زندگی میں جاری و ساری کر لینا اس قوم کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے؟ حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس کو احادیث و قرآن اور تاریخ کی روشنی میں بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے، آپؒ نے ان حدود کا بھی ذکر کیا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے کسی دوسری قوم سے ارتباط و تعلق رکھنا اسلام میں جائز ہے اور ان حدود سے تجاوز کرنا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں۔

آپ نے متعدد آیاتِ قرآنی و احادیث سے مسلمان قوم کو کسی دوسری قوم کا اثر لینے اور اس کی مخصوص اشکال و افعال میں مشابہت اختیار کرنے کو اسلامی شریعت کے خلاف ثابت کیا ہے۔ آپؒ نے مشہور حدیث میں **من تشبه بقوم فهو منهم** کی معنوی وسعت کو بتاتے ہوئے ان حدود کی نشان دہی کی ہے جس سے آگے بڑھنا ایک مسلمان کے لئے ممنوع ہے۔ مشابہت سے کیا مراد ہے اور کن چیزوں میں مشابہت ممنوع ہے مفصل بیان کیا ہے، آپؒ نے حضور اکرم ﷺ کے دور سے لے کر صحابۂ کرام، تابعین و ائمہ عظام کئے دور تک حوالوں کے ساتھ بتایا ہے کہ کس طرح ہمارے اسلاف دوسری قوموں کی وضع قطع

اختیار کرنے سے اور سختی سے روکتے تھے اور کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت کرتے تھے تاکہ دوسری قوموں سے ادنیٰ تشبہ بھی پیدا نہ ہو۔

آپؒ نے بڑی وضاحت سے یہ بات بتائی ہے کہ غیر مسلموں سے مشابہت کا مطلب یہ نہیں کہ غیر اختیاری امور میں بھی مشابہت ممنوع ہے البتہ اختیاری امور میں تشبہ بھی پیدا نہ ہو۔

آپؒ نے بڑی وضاحت سے یہ بات بتائی ہے کہ غیر مسلموں سے مشابہت کا مطلب یہ نہیں کہ غیر اختیاری امور میں بھی مشابہت ممنوع ہے البتہ اختیاری امور میں تشبہ کی سخت ممانعت ہے مثلاً سر، داڑھی اور مونچھوں کے بالوں کے بارے میں خصوصی احکام ہیں کیوں کہ اس کی وضع قطع میں آدمی کے قصد و اختیار کو دخل ہے اس لئے سر کے بال یورپین طرز کے رکھنا، جدید فیشنوں کے مطابق بنانا، سنوارنا، کٹوانا، یہودیوں کی طرح داڑھی کٹوانا، عام غیر مسلموں کی طرح منڈوانا، یعنی مونچھیں اظہار رعونت کے لئے رکھنا، ان کو بل دینا، داڑھی مونچھ دونوں صاف کرا دینا وغیرہ وغیرہ ان سب باتوں میں اسلامی شریعت کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا اسی طرح عورتوں کو مردوں کی اور مردوں کو عورتوں کی وضع قطع اختیار کرنا، دونوں ممنوع ہیں، ایک مسلمان کا لباس کیسا ہونا چاہئے، اس کی تراش خراش کیسی ہو، اسلام نے اس کے کچھ بنیادی اصول مقرر کئے ہیں، مثلاً ریشمی لباس صرف عورتوں کے لئے ہے۔ مردوں کو اس کا لباس ممنوع، لباس اظہار فخر و مباہات اور تکبر کی غرض سے نہ ہو، پاجامہ ٹخنوں سے نیچے نہ ہو، آستین اتنی لمبی نہ ہو کہ انگلیاں ان میں ڈوب جائیں، عورتوں کا لباس اتنا باریک نہ ہو کہ جس سے جسم کا رنگ جھلکے نہ اتنا چست ہو کہ اس سے بدن کی ساخت معلوم ہو، اسلام میں ایسے کپڑوں کا استعمال کرنا ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے جو خوبصورتی اور گراں قیمت میں مشہور ہوں اسی طرح وہ لباس بھی ممنوع ہے جو اپنی بدہیئتی میں مشہور ہو، ایسے لباس بھی استعمال کرنے سے روکا گیا ہے جو فساق، آوارہ مزاج، بازاری اور بدنام افراد عموماً استعمال کرتے ہیں یا زندیق و بدمذہب لوگ پہنتے ہیں۔

مصنف نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک شخص جس طرح کے لوگوں کا لباس اختیار کر لیتا ہے بتدریج اس کا اندرون بھی اس سے متاثر ہوتا رہتا ہے اور انجام کار اسی ذہن و مزاج کا بن جاتا ہے جس طرح کے لوگوں کا اس نے لباس اور وضع قطع اختیار کی ہے، آپؒ نے مزید بتایا ہے کہ لباس درحقیقت انسانوں میں امتیاز کا بنیادی وسیلہ ہے آپؒ روزمرہ کی زندگی میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں ہر طبقہ کے لوگوں کو آپ صرف اس کا لباس دیکھ کر پہچان جاتے ہیں اور اس کی وضع قطع دیکھ کر اس کی حیثیت، اس کے رجحانات اس کی

شرافت اور رذالت، بدکرداری، نیک کرداری کا اندازہ کر لیتے ہیں، ظاہر کو دیکھ کر باطن کا اندازہ عام طور پر کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ساتھ مشابہت کو اختیار کرنے سے منع کیا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے آیاتِ قرآنی واحادیث سے اپنے ہر دعویٰ کو مدلل کیا ہے اور جو کچھ بیان کیا ہے اس کو کتاب وسنت سے ثابت کیا ہے اور ہر بحث کو بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے اور بڑی باریک بینی سے اس تشبہ کے مسئلہ اور اس کی حدود کو بیان کیا ہے۔ پوری کتاب شواہد ودلائل وبراہین آیات قرآنی واحادیث سے بھری ہوئی ہے۔ اپنے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے۔

فلسفۂ نعمت ومصیبت

یہ کتاب وجودِ باری کے منکرین کے جواب میں لکھی گئی ہے جب انہوں نے حضرت حکیم الاسلامؒ سے کچھ سوالات کئے تھے جن دنوں ہندوستان میں جنگِ آزادی شباب پر تھی اور بچہ بچہ کے دلوں میں آزادی کا سودا سمایا ہوا تھا، اس جنگ میں شریک ہر طرح کے لوگ تھے۔ ہر فرقہ، ہر مذہب اور ہر طبقہ کے افراد اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے اس تحریکِ آزادی سے وابستہ تھے، جنگِ آزادی کے سورماؤں میں وہ طبقہ بھی تھا جو روس کے انقلاب سے متاثر تھا، جو اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ہوا، اس انقلاب نے ان ہندوستانی نوجوانوں کو بے حد متاثر کیا جو ان دنوں یورپ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ روس کا یہ انقلاب درحقیقت کارل مارکس کے نظریۂ حیات کمیونزم کی کامیابی تھی یہ علمی نظریہ حیات عملی وجود کا جامہ پہن چکا تھا، یہ ہندوستانی نوجوان جب یورپ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے آئے تو انہوں نے ہندوستان میں ایک مشنری کی طرح کمیونزم کی تبلیغ شروع کر دی وہ خود عملی طور پر سب کے سب ملحد، دہریئے، دین سے بیزار، خدا دشمن تھے کیوں کہ کمیونزم صرف ایک سیاسی دستور ہی نہیں تھا بلکہ وہ مستقبل طور پر ایک نظریہ حیات کو عملی حیثیت سے پیش کرنے والا کارل مارکس تھا اس نے اپنی کتاب کیپٹل میں لکھا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انقلاب آئے چاہے بادشاہوں، قومی لیڈروں، مذہبی رہنماؤں حتی کہ رسولوں اور پیغمبروں نے وہ انقلاب پیدا کئے سب کی اساس معاشی مسائل پر تھی۔ ابتداء آفرینش سے لے کر آج تک کے سیاسی انقلاب کی تہ میں ''روٹی بیٹی کی جنگ'' کارفرما تھی اس کے علاوہ کچھ نہیں، خدا، رسول، مذہب یہ سب روزی روٹی کا مسئلہ کو حل کرنے کی راہیں تھیں، اس کے سوا کچھ نہیں۔ مذہب کا وجود انسانی زندگی میں افیون کا نشہ ہے جو انسان کی قوت علمی کو سست اور بے کار کر دیتا ہے اس لئے ایک طاقتور کے لئے ضروری ہے کہ مذہب سے بہت دور ہو، اور اپنی حدود ومملکت سے اس کو دیس نکالا

دیدے، اسی نقطہ نگاہ کی وجہ سے ہر کمیونسٹ ہندوستان میں خدا بیزار اور مذہب دشمن رہا اور خود ان کی اپنی زندگی الحاد کا شکار تھی لیکن ہندوستان جیسے مذہبی ملک میں اپنے اس عقیدہ کا برملا اظہار نہیں کر سکتے تھے اور وہ محتاط تھے لیکن اپنی تحریروں میں ڈھکے چھپے لفظوں میں بیان کرتے رہتے تھے، چوں کہ ہندوستانی معاشرہ اتنا مربوط اور مستحکم تھا کہ کسی خاندان کی کسی جوان کو ہندوستان کے مذہبی ماحول میں دین سے بیزاری کے برملا اظہار کی ہمت نہیں تھی اس لئے وہ اپنی بدعقیدگی اور الحاد کو اپنے تک ہی محدود رکھتے تھے، زیادہ سے زیادہ اپنے بے تکلف دوستوں میں اپنا ہم نوا بنانے کے لئے اس کا اظہار کرتے رہتے تھے اور ملک میں کھلم کھلا مذہب بیزاری کی تحریک نہیں چلائی گئی لیکن ذہنوں کو تیار ضرور کیا جاتا رہا اور نوجوان طبقہ اس سے متاثر بھی ہوتا رہا، تاکہ جب وقت آجائے کہ اشتراکی نظام بروئے کار لایا جائے تو آسانی کے ساتھ سمرقند و بخارا اور ایشیاءِ کوچک کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی طرح یک بیک مذہب کے خلاف طبل جنگ بجا دیا جائے اور مذہب کو دیس نکالا دیا جائے۔ روسی انقلاب کی تاریخ ہمارے دعویٰ کی شاہد عادل ہے۔

آزادی سے پہلے ۱۹۳۰ سے ۱۹۴۷ء تک یہ تحریک دہریت بڑے شباب پر تھی اسی زمانہ میں کچھ لوگوں نے خدا کے وجود سے انکار پر مشتمل کچھ سوالات حضرت حکیم الاسلامؒ کو لکھ کر بھیجے تھے جس میں ان سے ایسے جواب کی فرمائش کی گئی تھی جو عقل و روایت کی روشنی میں دیا گیا ہو اور جواب اس کسوٹی پر پورا اترے، قرآن و حدیث سے کسی مسئلہ کو ثابت کرنا ان کے نزدیک کوئی وزن نہیں رکھتا تھا، ان کو یقین تھا کہ کارل مارکس نے جو تھیسس دنیا کے سامنے پیش کی ہے وہ فلسفیانہ ناقابل شکست دلائل سے مسلح ہے، بوسیدہ روایتوں، فرسودہ عقائد اور دقیانوسی نظریہ رکھنے والے مولویوں میں کہاں سے یہ علم پیدا ہوگا کہ اس کا کوئی عقلی جواب دے سکیں اس لئے سوال نامہ میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ جو جواب دیا جائے وہ عقل وخرد کی میزان پر پورا اترے، محض قرآن وحدیث کا حوالہ دینا کافی نہیں ہے کیوں کہ ان کے نزدیک ان دونوں کی کوئی قدر و قیمت اور کوئی حیثیت ہی نہیں تھی وہ سمجھتے تھے کہ پہلے ذہین لوگوں نے اپنے دور میں انقلاب برپا کرنے کے لئے یہ کتابیں لکھی تھیں اور اس کی وجہ سے وہ انقلاب برپا کرنے میں کامیاب بھی ہوئے لیکن ان کا دور اب ختم ہو چکا ہے اور نئے انقلاب کے لئے ایک نئے نظریہ حیات کی ضرورت ہے اور وہ کمیونزم ہے۔

وہ سوالات جو حضرتؒ کو بھیجے گئے تھے اور ان کے رسالہ ''مذہب کے آنسو'' میں بھی شائع ہوئے تھے مختصر طور پر یہ تھے کہ اگر اللہ رحیم وکریم ہے تو اس کے رحم وکرم کا یہ تقاضہ تو نہیں کہ انسان ہمہ وقت درد وغم اور آفات ومصائب میں گرفتار رہے، اگر انسان اپنے اعمال کی وجہ سے گرفتار بلا ہے تو آسمانی بلائیں پیہم اور ہر

دم نازل ہوتی رہتی ہیں۔ یہ رحم وکرم کی نگاہ ہی نہیں کرتا اور اگر یہ آفات ومصائب انسانوں کے گناہوں کے نتیجہ میں آتی ہیں تو بچے اور معصوم افراد نیک اور دیندار لوگ حتی کہ بے قصور جانور تک اس خدائی عذاب کو بھگتنے کے لئے کیوں مجبور کئے جاتے ہیں؟ ان کا کون سا گناہ ہے اور کون سا قصور جس کی پاداش میں وہ مبتلائے درد وغم ہوتے رہتے ہیں اور اگر یہ مصائب انسان کو عبرت وسبق دینے کے لئے آتی ہیں تو خدا کو ایسا ظالمانہ اور بے رحیمانہ طریقہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی کوئی دوسرا آسان طریقہ اختیار کرتا جیسے ڈاکٹر کوئی بڑا آپریشن کرتا ہے تو کلوروفام سنگھا کر پہلے بے ہوش کر دیتا ہے تب آپریشن کرتا ہے تا کہ مریض نشتر کی اذیت نہ محسوس کرے اگر روحانی اسلحہ میں یہ بھی نہیں تو اس کو سوائے بے رحمی اور ظلم کے اور کیا کہا جائے گا؟ اور اس کی کمال قدرت بھی مشتبہ ہو جاتی ہے کہ اس طریقہ کے علاوہ اس کو کسی طریقہ علاج پر قدرت ہی نہیں ہے اس سے زیادہ تو انسان ہی ہے کہ وہ رحم وکرم کا پتلا بن سکتا ہے وہ ایسی دوائیں ایجاد کرتا ہے اور طریقۂ علاج کو کام میں لاتا ہے کہ اس سے اجتماعی وبائیں اور بیماریاں بھی کم ہو جاتی ہیں، کالرا، طاعون، چیچک، ملیریا کی وبائیں، ڈاکٹروں کی محنت کے نتیجہ میں بڑی حد تک کم ہو گئیں اور انسانیت کو ان مصیبتوں سے انہوں نے نجات دلا دی ورنہ خدا تو پہلے مسلسل یہ بلائیں بھیجتا رہتا تھا۔

اور اگر یہ مصائب انسانوں کی آزمائش اور جانچ کے لئے ہیں تو اس کو علیم وخبیر بھی تو کہا جاتا ہے تو کون سا ایسا راز رہ گیا کہ ہزاروں برس کے بعد بھی اس کو معلوم نہیں ہو سکا اور انسانوں کو مسلسل آزمائے چلا جا رہا ہے، اگر انسان خدا کو چھوڑ کر اپنی عقل اور تجربہ کی رہنمائی میں کام کرے تو اس سے زیادہ آرام میں رہ سکتا ہے، جن ملکوں کی سائنس نے ترقی کی ہے آج ان کو دنیا کی ساری آسائشیں اور سہولتیں میسر ہیں وہ ہر طرح پرسکون اور مطمئن زندگی گذارتے ہیں، ان کا معیارِ زندگی، ان کا رہن سہن ساری دنیا کے لئے باعث رشک ہے۔ اگر وہ بھی خدا کے بھروسے پر بیٹھے رہتے تو دانے دانے کے محتاج رہتے، چیتھڑے لپیٹے رہتے، خدا سے دعائیں کرتے رہتے اور خدا ان کو سسک سسک کر مرتے ہوئے دیکھتا رہتا اور ان کو اس سے چھٹکارے کی بات بھی نہیں سوچتا جیسا کہ عام طور سے مذہب کے نام لیوا ملکوں کے باشندوں کا حال ہے۔ ان حالات و اسباب کی بنا پر اگر کوئی خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے تو کیوں قابلِ ملامت ہے اور اس کا کیا قصور ہے؟

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنی کتاب میں دو طرح کے جوابات دیئے ہیں ایک تو الزامی جواب ہے دوسرا اصولی اور تحقیقی، الزامی جواب میں آپ نے انہیں کے انداز پر بات پلٹ کر مسکت جواب دیا ہے بذاتِ خود یہ جواب بھی خاموش کرنے کے لئے کافی ہے۔ آپؒ نے تحریر کیا کہ اگر ایک طرف آفات و

مصائب آتی رہتی ہیں جن کی تم شکایت کرتے ہو تو انہیں کے مقابل بے شمار نعمتیں اور لطف وکرم کے بے پناہ احسانات بھی موجود ہیں! اگر بیماری پھیلانے والے، ایذا دینے والے جانور ہیں تو اس کے بالمقابل ایسے بھی جانور ہیں جو صحت بخش اور قوت آفریں ہیں، اگر زمین پر آفاتِ سماویہ آتی ہیں تو دوسری طرف فضاؤں کی نسیم جانفزا، فرحت بخش ہوائیں، بادلوں کی سخاوت، بارش کی حیات بخشی، دریاؤں کی حیات آفریں روانی، عالم کے لئے صدہا نعمتوں اور زندگیوں کا سہارا بھی موجود ہے، غرض جتنی مصیبتیں آپ شمار کرا سکتے ہیں ان کے مقابل میں ان سے کہیں زیادہ ہم نعمتیں گنوا سکتے ہیں بلکہ ہر ملک میں جہاں مصیبت کا پہلو ہے وہیں اسی میں راحت وسکون کا بھی پہلو موجود ہے اگر زہر جان لیوا ہے تو انہیں زہروں سے بہت سی بیماریوں کا علاج بھی کیا جاتا ہے اس لئے اگر تم ان مصائب کی وجہ سے خدا کا انکار کرتے ہو تو ان نعمتوں پر خدا کے وجود کا اقرار کیوں نہیں کرتے؟ یہ کون سی منطق ہے کہ مصیبت بھیجنے کا فعل تو اس کے انکار کے لئے حجت ہو مگر اس کی نعمتیں نازل کرنے کا فعل اس کے اقرار کی حجت نہ ہو؟ ان آفتوں پر خدا کا شکوہ تو جائز ہو مگر ان کے مقابل اضداد یعنی نعمتوں پر اس کا شکریہ جائز نہ ہو؟ یہ عقل وفہم کا کیسا فیصلہ ہے؟ اور یک طرفہ فیصلہ کیوں ہے؟

الزامی جواب کو حضرت حکیم الاسلامؒ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں بڑی تفصیل سے تحریر فرمایا ہے اس کے بعد جو تحقیقی جواب دیا ہے وہ اردو میں کلامی مباحث کا ایک بے مثال شاہکار ہے یہ جواب چھوٹے سائز کے ڈھائی سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے، ترتیب مقدمات واستخراج نتائج کی ایک طویل بحث پر مشتمل ہیں اور یہ بحث کتاب ہی میں پڑھنے کی چیز ہے، یہ جواب ایسے عقلی مقدمات پر مشتمل ہے اور ہر استدلال اتنا محکم اور ناقابلِ تردید ہے کہ اس کی صداقت کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، وجود باری پر جتنے شبہات بھی وارد ہو سکتے ہیں ان کا مدلل ومبرہن جواب دیا ہے۔ کتاب نوع بنوع مباحث طرز استدلال واستخراج نتائج کے اعتبار سے ایسی ہے کہ عوام کے بجائے اہل علم کے مطالعے کی چیز ہے۔ منکرینِ وجودِ باری تعالیٰ میں اگر ضد کا مادہ نہیں ہے تو یقیناً ان کا دل ان دلائل پر مطمئن ہو جائے گا ورنہ ضد کے سامنے تو سر پر چمکتے ہوئے سورج کا بھی انکار کیا جا سکتا ہے۔

آفتاب نبوت

حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر شیریں زبانی وحلاوت بیانی کے ساتھ الفاظ مرصع مع انداز بیان جچا تلا، احادیث وآیاتِ قرآنی کے ایک ایک لفظ سے نکتہ آفرینی کی خصوصیت کی وجہ سے ہر ایک کے لئے اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتی تھیں، وہ ایک فصیح وبلیغ خطیب کی حیثیت سے پورے ملک میں قابل رشک شہرت رکھتے تھے، یہ شہرت سطحی باتوں کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ان کی تقریروں کی معنوی قدر وقیمت کی بنا پر تھی، ان کی ہر

تقریر اپنے اندر ایسے علمی جواہر پارے رکھتی تھی جہاں تک عام اہلِ علم کی رسائی نہیں تھی۔ کچھ قدرتی طور پر آپ کا ذہن گہرائیوں میں ڈوب کر ایسے نادر و نایاب اور بیش قیمت گوہر نکال لاتا تھا جو دوسروں کی دسترس سے باہر تھا اس لئے اگر ان کی تقریر کو قلم بند کر کے شائع کر دیا جائے تو کم ہی لوگ سمجھ پائیں گے کہ یہ سنبھل سنبھل کر لکھی ہوئی کتاب ہے یا کوئی برجستہ تقریر، مثال میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی یہی کتاب ''آفتابِ نبوت'' پیش کی جاسکتی ہے۔

یہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی سیرت نبوی پر ایک عالمانہ تقریر ہے جو قلم بند کر کے شائع کر دی گئی ہے اور خود حضرت حکیم الاسلامؒ کے قلم سے ہے، حسب دستور ابتداء میں ایک لمبی تمہید، خوبصورت الفاظ کے برمحل استعمال اور اس کی معنویت کے نئے نئے پہلو تراشنا، استعارات، ومجازات کا ایک طویل سلسلہ جو ابتداء کتاب سے آخر تک یکساں پایا جاتا ہے، کتاب پڑھتے جایئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اہل علم مرصع عبارت میں شاندار تقریر سنا رہا ہے، اندازِ تحریر، اندازِ بیان اور لب ولہجہ سے ہم آہنگ ہے، صاف پتہ چلتا ہے لکھا نہیں جارہا بلکہ بولا جارہا ہے، آفتابِ نبوت ذاتِ نبوی کا استعارہ کیا گیا تو آخر کتاب تک اس استعارہ کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور سیرت کے ہر ہر پہلو کو اسی آفتاب، اسی کے نور اور اس سے متعلق اشیاء وکیفیات وخصوصیات کے استعاروں میں گفتگو کی گئی ہے، اگر اس کو تصنیف مان لیا جائے تو کہا جائے گا کہ سیرت کے موضوع پر اپنی نوعیت کی یہ منفرد کتاب ہے جس میں تقریر وتحریر دونوں کی چاشنی موجود ہے۔ اس میں دولذتیں ہیں ایک سے دل محظوظ ہورہا ہے اور دوسری سے قوت سامعہ لطف اندوز ہورہی ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کا شمار ان علماء میں تھا جن کا اپنا ایک علمی مقام تھا اور وہ اپنے دل میں اصلاح وتبلیغ کا پاکیزہ جذبہ رکھتے تھے۔ ان کی تقریر کا مقصد عوام وخواص کو اسلامی تعلیمات وروایات کی اہمیت وغفلت سے آگاہ کرنا، سیرتِ نبوی کے ان گوشوں کو روشنی میں لانا جو دلوں میں سرکارِ دوعالم ﷺ کی قدرومنزلت، علوشان، علوئے مرتبت کو جاگزیں کر دیں وہ اپنے موضوع سے ایک لمحہ کے لئے بھی صرفِ نظر نہیں کرتے تھے، ذخیروں سے واقفیت کی بنیاد پر اپنی طویل ترین تقریروں میں بھی اسے اپنا موضوعِ سخن بنالیا، اس سے سرمو انحراف نہیں کرتے تھے۔ جب تقریر ختم ہوتی تو ہر سننے والا محسوس کرتا کہ اپنے موضوع پر ایک سیر حاصل اور مفید بحث سے استفادہ کا موقع حاصل ہوا، اگر کوئی شخص تقریر کا خلاصہ بتانا چاہے تو دوسرے کو آسانی سے بتا سکتا تھا کیوں کہ وہ ایک مربوط بیان اور علمی شاہکار ہوتا تھا میرے اس بیان کی وہ تمام لوگ شہادت دے سکتے ہیں جنہوں نے کبھی بھی حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر سنی ہے اور ان کے وعظ میں شریک ہوئے ہیں۔

''آفتاب نبوت'' کی تقریر داعیاً الی اللّٰہ باذنہٖ و سراجاً منیرا آیت کی تفسیر وتشریح پر ہے اور حق یہ ہے کہ پوری تقریر ایک مرصع، شاندار اور خوبصورت سیرتِ پاک کا مرقع ہے جو کتابی شکل میں آفتابِ نبوت کے نام سے پیش ہے۔

مضامین کے مجموعے

میرے سامنے حضرت حکیم الاسلامؒ کی جتنی کتابیں بروقت موجود تھیں میں نے ان کا تعارف پیش کر دیا ہے ان کے علاوہ ان کے مضامین کے بہت سے مجموعے میرے سامنے ہیں ان میں اہم مضامین (۱) معجزہ کیا ہے؟ (۲) نسب اور اسلام (۳) میلاد النبی کی حقیقت (۴) تصویر اسلام کے آئینہ میں (۵) اردو کی شرعی حیثیت (۶) سیرتِ قرآنی (۷) اسلام کے دو امتیازی پہلو (۸) فہم قرآن اور تعلیم مذہب کے دو بنیادی اصول (۹) سورہ فیل میں پرویزی تحریف خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ان میں بعض طویل مقالے کی حیثیت رکھتے ہیں جو کامل غور وفکر کے بعد سپردِ قلم کئے گئے ہیں۔ یہ تمام مضامین حکیم الاسلام کے حکیمانہ طرز استدلال، ٹھوس معلومات، مستحکم دلائل، آیاتِ قرآنی سے استنباط مسائل اور استخراج نتائج کے بہترین شاہکار ہیں لیکن فی الحال ان پر تبصرہ میرے موضوع سے خارج ہے اس لئے ان پر گفتگو نہ کر کے اتنی بات کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اگر اہل علم ان مضامین کا مطالعہ کریں تو وہ محسوس کریں گے کہ ان کے علم میں اضافہ ہوا، ان کی معلومات کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا، کیوں کہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے سطحی طرزِ کلام اختیار نہیں کیا ہے، ان میں سے کوئی بھی مقالہ یا مضمون ان کی عالمانہ محققانہ اور حکیمانہ شان سے فروتر نہیں ہے۔

آخری بات

حضرت حکیم الاسلامؒ ایک عظیم المرتبت علمی خانوادے کے فرد فرید ہیں۔ اس خانوادے کا ہر فرد علم وفضل کا آفتاب و ماہتاب ہے اور کہا جائے کہ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' تو اظہارِ واقعہ ہو گا، حکیم الاسلامؒ کے جد امجد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے جس علم کلام کا علماء میں ذوق پیدا کیا تھا حضرت حکیم الاسلامؒ کو اس سے حظ وافر ملا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر کتابوں پر ان کا یہ متکلمانہ رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے، اسی کی وجہ سے تصنیفات مرعوب کن، وقیع اور شاندار ہو جاتی ہیں اور ان کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے، چوں کہ زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے اس لئے دقیق مباحث کو اردو میں سہل بنا کر پیش کرنے میں ان کو کمال حاصل ہے، البتہ زبان بالعموم وہ استعمال کی گئی ہے جو ہمارے عربی مدارس کی درسی تقریروں میں رائج

ہے جس کی وجہ سے زبان بوجھل ہو جاتی ہے، عربی زبان کے ایسے مغلق اور اجنبی الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے اردو داں طبقہ بڑی حد تک نامانوس ہے۔ جب کہ اردو کو سہل اور سادہ بنا کر اس میں علمی مباحث کو ادا کرنے کی جدو جہد کی جا رہی ہے، مولانا شبلی نعمانیؒ نے اس دور میں اپنی کتابیں لکھ کر ایک روشن مثال قائم کردی ہے جب کہ اردو پر ابھی پورے طور پر نکھار بھی نہیں آیا تھا لیکن انہوں نے اپنی معرکۃ الآرا کتابیں لکھ کر ثابت کر دیا کہ دقیق علمی مسائل بھی سلیس اردو میں اس طرح پیش کئے جا سکتے ہیں کہ اظہار و مطالب کو ادنیٰ ٹھیس بھی نہیں لگ سکتی ہے، اردو زباں تو اس کے بعد اور بھی وسیع ہو چکی ہے۔ اب ہر طرح کے مباحث کے لئے اس کے پاس ایک عظیم الشان ذخیرۂ الفاظ ہے کہیں بھی قلم کو اردو کی تنگ دامانی کی شکایت لاحق نہیں ہو سکتی ہے، میں صرف ایک کتاب کے ایک صفحہ سے چند الفاظ بطور مثال پیش کرتا ہوں بعض الفاظ کا تلفظ بھی اردو داں طبقہ کو دشوار محسوس ہوگا، مثلاً متصر نجانہ، مالوفات، زیّ دہیئۃ، تجمل و تزین، فتنہ عمیار، دور التباس، مستقلاً بغتۃً، تدین متشتت، مائدہ، باصرہ اہل نظر، وغیرہ جب اردو تحریر میں ان لفظوں کو استعمال کیا جاتا ہے تو یہ الفاظ اس طرح دہشت زدہ نظر آتے ہیں جیسے کوئی اجنبی بے تکلف دوستوں کی محفل میں گھس آئے۔

حاصل کلام

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ علم و فضل کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ اس سے نیچے اتر کر باتیں کرنا ان کے لئے ممکن ہی نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی تقریر یا تحریر دونوں میں وہ علمی جواہر وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں جو عام کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں کئے جا سکتے ان کی تقریر و تحریر جہاں ان کے وسیع مطالعے و معلومات کا پتہ دیتی ہیں وہیں یہ بھی یقین کرنے پر مجبور کرتی ہیں کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کو قدرت نے علماء متکلمین کا ذہن عطا فرمایا ہے، اسی لئے ایک ایک لفظ سے معارف و حقائق کے اتنے نکتے خود پیدا کر لیتے ہیں جو کتابوں میں آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتے اس لئے اگر اہل علم حضرت حکیم الاسلامؒ کی تصنیفات کو اپنے مطالعے میں رکھیں تو ان کو علمی زندگی میں بڑی روشنی ملے گی، حضرت حکیم الاسلامؒ کی یہ تصانیف درحقیقت اہل علم پر احسانِ عظیم ہیں اور جب تک یہ کتابیں پڑھی جائیں گی ان کا نام نیک زندہ و پائندہ رہے گا اور جن نیک مقاصد و مقدس جذبات کے تحت یہ کتابیں وجود میں آئی ہیں ان کی وجہ سے امید ہے کہ قدرت نے اپنی رحمتوں مغفرتوں اور انعامات سے یقیناً نواز دیا ہوگا اور رحمتِ خداوندی نے استقبال کرتے ہوئے ان کی روح سے کہا ہوگا۔ ادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

............❖............

حکیم الاسلامؒ ایک باکمال شاعر بھی

مولانا عبدالحفیظ رحمانی

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی ہمہ جہت شخصیت، ہر سمت سے پرکشش اور بے نظیر ہے، جولان گاہ علم وفضل میں کوئی گوشہ ایسا نظر نہیں آتا جو اچھوتا ہو اور حضرت حکیم الاسلامؒ کے فکر وفن نے ہر گوشہ کی تزئین کاری میں اپنی جدت طرازی کا لوہا نہ منوایا ہو۔

تصنیف وتالیف کے میدان میں وہ منفرد اسلوب کے مالک ہیں تو خطابت میں بے مثال ہیں، فقہی ژرف نگاہی میں باکمال ہیں تو احادیث کے رمز شناس ہیں، اسرار وحکم میں وہ اپنے دادا کے عکس جمیل ہیں تو تدریس اور افہام وتفہیم میں لاثانی ہیں، انتظام وانصرام میں دارالعلوم کا ساٹھ سالہ اہتمام گواہ ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ حضرت مولانا طیب صاحبؒ بہ یک وقت دیدہ ور مصنف، بے مثال خطیب، ژرف نگاہ فقیہ، ثاقب النظر محدث، وسیع المطالعہ مدرس، فطری شاعر وادیب اور اسرار وحکم کے اداشناس تھے تو حقیقت کی طرف اشارہ ہی ہوگا، اس لئے کہ کتاب زندگی کا ہر عنوان تفصیل طلب ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر عنوان پرکشش ہے اور دامن علم وفضل کا ہر تار نظر وفکر کی دعوت دے رہا ہے۔

کتاب زندگی کے انہی عناوین میں ایک شعروشاعری بھی ہے، اکابر علماء دیوبند کا ایک طرۂ امتیاز یہ بھی رہا ہے کہ وہ واردات قلبی کو شعری قالب میں ڈھالنے میں یدطولیٰ رکھتے تھے، شعروشاعری کو انہوں نے اپنا مشغلہ تو نہیں بنایا لیکن سوز دروں کی آنچ نے جب بے قرار کیا تو خود بخود جذبات نے شعر کا قالب اختیار کر لیا، پڑھنے والے کو محسوس ہوا کہ شاعر تو مشق نہیں کہنہ مشق ہے، محاسن شعری سے خالی نہیں کلام محاسن سے شعری معمور ہے، بلند مضامین، اعلیٰ درجہ کا تخیل، نکتہ آفرینی، روانی وسلامت اور ردیف وقافیہ کی پابندی، نیز واردات قلبی کا شفاف آئینہ ہے۔

اکابر علمائے دیوبند درحقیقت علمار ربانیین تھے۔ گفتار ورفتار، نشست و برخاست، عبادات ومعاملات اور سیاست واصلاح میں اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی ہی پیش نظر تھی، اتباع سنت سے سرموانحراف بھی ان کے تصور سے خارج تھا اس لئے ان کی زبان سے جو موزوں کلام صادر ہوا وہ ان کے عرفان حقیقت کا عکس جمیل ہے، یہی وجہ ہے کہ اکابر علما نے مجال شعر میں قدم رکھا تو اپنی شناخت الگ بنائی۔ غزلیات وقصائد سے وہ نباہ نہیں کر سکے، حقیقت بیانی ان کا شعار رہا اور جو کچھ کہا وہ معبود حقیقی کی ذات وصفات میں گم ہو کر کہا، سچ پوچھئے تو عشق ومحبت کا مرکز ذات باری ہی ہے، تمام محاسن اور اوصاف حمیدہ اسی میں ہیں تو لو لگائیے تو اس سے لگائیے، گن گائیے تو اس کے گائیے، محبت کیجئے تو اس سے کیجئے، ان علماء دیوبند نے یہی کیا اور اسلامی فطرت کے مطابق اسی محبوب حقیقی کی بارگاہ میں عشق ومحبت کے ترانے پیش کئے۔ ذات وحدت کے بعد ذات نبوت سے عقیدت ومحبت کا اظہار ان کا سرمایۂ حیات تھا۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے پیر ومرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے تو متعدد مجموعہائے کلام ہیں۔ مثنویوں میں عشق ومحبت اور فریاد کا وہ رنگ ہے جو ایک صاحب دل کے کلام میں ہونا چاہئے۔ یہ رنگ عام شاعروں کے کلام میں نظر نہیں آتا۔ یہ صاحبان دل ہی ہیں جو عشق ومحبت کے سمندر میں ڈوبے ہوئے محبت کے آبدار موتی نکالتے ہیں اور دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دئے ہیں، مرشد کا اثر مسترشد پر بھی صاف دکھائی دیتا ہے، جذب ومستی نے انگڑائی لی تو قلبی وارادت الفاظ کا جامہ پہن کر منظر عام پر آ گئے، یہ علماء دیوبند بھی کیا گذرے ہیں کہ عربی وفارسی اور اردو پر یکساں قدرت تھی، کبھی عربی کو اظہار جذبات کا ذریعہ بنایا تو کبھی فارسی کو اور کبھی اردو کو۔

حضرت نانوتویؒ نے فارسی اور اردو میں جو کچھ کہا ہے وہ متعدد کتابوں میں نظر آ جاتا ہے۔ کوئی مستقل مجموعۂ کلام نہیں ہے اور اگر کبھی شائع بھی ہوا ہو تو راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔ حضرت نانوتویؒ کا شجرۂ چشتیہ فارسی زبان کے شاہکار شجرات میں منفرد ہے۔ روحانی اور برجستگی ایک ایک شعر کا حسن ہے اور سلاست ایسی کہ قربان جائیے، بطور تبرک شجرہ کے دو چار اشعار آپ بھی سماعت فرمالیجئے۔

الٰہی غرق دریائے گناہم | تو میدانی و خود ہستی گواہم
گناہ بے عدد را بار ستم | ہزاراں بار توبہ ہا شکستم
حجاب مقصدم عصیان من شد | گناہم موجب حرمان من شد
بآں رحمت کہ وقف عام کردی | جہاں را دعوت اسلام کردی

نمی دانم چرا محروم ماندم رہین ایں چنیں مقصود ماندم
گدا خود را ترا سلطان چو دیدم بدرگاہ تو اے رحمان دیدم

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید وشیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ جن کی انگریز دشمنی اور مجاہدانہ کارنامے روز روشن کی طرح واضح ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ شیخ الہند رحمہ اللہ اپنے استاذ گرامی کے عکس جمیل تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ شیخ الہندؒ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا نتیجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا سر بلند ہے اور ہمیشہ جہاد حریت کی تاریخ میں شیخ الہند کے قابل فخر کارناموں کو یاد کیا جاتا رہے گا، حضرت شیخ الہند اپنے بلند قامت اساتذہ کی طرح مجموعۂ کمالات تھے، مفسر ومحدث، فقیہ ومتکلم، خطیب ومصنف، ادیب وشاعر اور مفکر ومجاہد نیز بہت کچھ تھے اور حضرت شیخ الہند کو جس نام سے یاد کیجئے بجا ہے۔

اس موقعہ پر مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ حضرت شیخ الہند ایک باکمال ادیب وشاعر بھی تھے، ''کلّیات شیخ الہند'' کے نام سے حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجموعۂ کلام شائع کیا تھا اور حال ہی میں ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے پاکستان سے شائع کیا ہے، دیوبند کے کتب خانوں میں بھی دستیاب ہے۔

کلّیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الہندؒ دبستان دہلی کے ایک کامیاب اور باکمال شاعر تھے۔ کلّیات میں وہ ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر دکھائی دیتے ہیں لیکن شاعری کا محرک خارجی اثرات نہیں بلکہ قلبی واردات ہی محرک ہیں اور کلام کا بیشتر حصہ قلبی واردات اور جذبات کا ہی آئینہ دار ہے، جو کچھ دل نے محسوس کیا وہ اشعار کے سانچے میں ڈھل گیا، اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وارداتی اشعار سوز دروں کی آنچ سے لفظوں میں ڈھلے ہیں، اکابر علماء دیوبند کی شاعری کا یہی طرۂ امتیاز ہے۔

چوں کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نمونۂ اسلاف اور اُن کے علوم ومعارف کے امین ووارث تھے اس لئے ان کا ادب وشعر بھی اسلاف کے محور پر گھومتا ہے، اسلاف کی روش سے کہیں انحراف نہیں ملتا اور نہ ہی ان کی شاعری میں آورد ہے، کسی شخصیت سے متاثر ہوئے یا واقعات وحوادث نظر سے گذرے اور انہوں نے اظہار جذبات پر مجبور کیا تو خیالات وتاثرات اشعار کے سانچے میں ڈھلتے گئے اور ادبی دنیا میں ایک وقیع اضافہ ہوتا گیا، شعر وشاعری مستقل مشغلہ نہیں تھا اور ایک عالم باعمل اس کو مشغلہ بنائے بھی تو کیسے؟ کتاب وسنت کی اجازت تو محدود ہے، ان حدود سے حکیم الاسلامؒ قدم باہر کیسے نکال سکتے تھے؟ پھر اسلاف کے جو وارث وامین تھے تو نرے شاعر کیسے ہو سکتے تھے؟ ہاں جو کچھ کہا

اور شاعری کے جونمونے منظر عام پر آئے وہ اپنی نظیر آپ ہیں، شاعرانہ محاسن پر تو حیرت ہوتی ہے کہ تمام تر مصروفیات اور علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ اتنی اچھی شاعری کیسے وجود میں آگئی جس کی داد وتحسین صاحب طرز ادیب ونقاد عبدالماجد دریابادی کے قلم حقیقت رقم سے بھی نکلی۔ جی چاہتا ہے کہ مولانا دریابادی کے الفاظ آپ کواسی موقع پر سنا دیئے جائیں تو لیجئے سماعت فرمایئے۔

حضرت محترم، السلام علیکم

’’آنکھ کی کہانی آں محترم کا عطیہ، یہاں آتے ہی پڑھ ڈالی، سبحان اللہ، ماشاء اللہ مجھے علم نہ تھا کہ آپ کوشعر ونظم پر بھی اس درجہ قدرت حاصل ہے، ذلک فضل اللہ، کیا کیا قافئے نکالے ہیں، کیسے کیسے مضمون باندھے ہیں کہ پیشہ ورشاعروں کے بھی چھکے چھوٹ جائیں، نہ کہیں جھول، نہ اتنی طویل نظم میں کہیں آورد، بس آمد ہی آمد، خوش دماغ تو بہ حیثیت ایک سچے قاسم زادہ کے آپ تھے ہی، اب معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ خوش فکر بھی اسی درجہ میں ہیں۔ ماشاء اللہ۔

دعا گوو دعا جو

عبدالماجد

۱۵ر ستمبر ۱۹۶۴ء

اس داد وتحسین کے بعد کسی اور داد کی ضرورت بھی کیا رہ جاتی ہے، لیکن انسانی فطرت اور اختلاف ذوق وفکر کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا، ہر صاحب فکر وفن کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے زاویہ فکر ونظر کے مطابق کلام کا جائزہ لے، چنانچہ بہت سے ارباب فن نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی شعر وشاعری پر بہترین تبصرے کئے اور قادر الکلامی کی بھرپور داد دی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی تمام نظموں میں ’’اسلام کی روانی‘‘ اور ’’آنکھ کی کہانی‘‘ کو امتیاز حاصل ہے، اکبر الٰہ آبادی مرحوم کی نظم ’’پانی کی روانی‘‘ کی زمین میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے اسلامی ذہن وفکر کے جلو میں ’’اسلام کی روانی‘‘ میں جو روانیٔ طبع دکھائی ہے وہ ہر زاویہ سے ’’پانی کی روانی‘‘ سے کم نہیں بلکہ ’’اسلام کی روانی‘‘ کے حُسن کو دوچند کر دیا ہے۔ نظم خاصی طویل ہے لیکن زور بیان، روانی وبرجستگی اور حقیقت بیانی میں کہیں جھول نظر نہیں آتا۔ اس کو قادر الکلامی اور شاعرانہ کمال نہ کہئے تو کیا کہئے؟ چند اشعار آپ بھی سماعت فرمالیں تو ہمنوائی میں ذرا تامل نہ ہوگا۔ لسان العصر اکبر الٰہ آبادی مرحوم ان الفاظ میں اس نظم کی داد دے چکے ہیں۔

مولانا محمد طیب صاحبؒ کی نظم ''روانی اسلام'' نظر سے گذری
ماشاءاللہ، صل علی، جزاک اللہ، نقاش نقش ثانی بہتر
کشد زاولی - خاکسار اکبر۔

ہاں تو مرحوم اکبر الہ آبادی کے اعتراف کمال کے بعد اشعار کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا بھی مشکل، تو لیجئے اشعار سماعت فرمائیے۔

چلا ارض بطحا سے اک بحر ذاخر ۔۔۔ کہ تھا جس کی موجوں کا اول نہ آخر
وہ توحید کی لے بجاتا ہوا ۔۔۔ سرود حجازی میں گاتا ہوا
وہ جنگل میں منگل مناتا ہوا ۔۔۔ وہ شہروں میں شادی رچاتا ہوا
پہاڑوں پہ نعرے لگاتا ہوا ۔۔۔ سمندر میں طوفاں اٹھاتا
محیط زمیں پر وہ چھاتا ہوا ۔۔۔ خباثت کی وسعت گھٹاتا ہوا
صداقت کے جھنڈے اڑاتا ہوا ۔۔۔ وہ باطل کو نیچا دکھاتا ہوا
بتوں سے وہ رشتے تڑاتا ہوا ۔۔۔ خدا سے ہر اک کو ملاتا ہوا

یہ ہے ''اسلام کی روانی''، جس کی روانی پر علماء وحکماء انگشت بدنداں تو ادباء وشعرا محو حیرت، اس میں فنی محاسن کیا ہیں جن کو دیکھ دیکھ اہل فن عش عش کر رہے ہیں، تفصیل میں کیوں جائیے، یہی جو چند اشعار پیش کئے گئے، انہی کا حسن دیکھ لیجئے۔ جنگل میں منگل منانا۔ کون نہیں جانتا کہ مشہور محاورہ ہے اس کو کس خوبصورتی سے مصرع میں موزوں کیا گیا ہے اور محاورہ کو زمین سے اٹھا کر آسمان کی رفعتوں تک پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ بھی نظر میں رہے کہ عرب کی سرزمین کیا تھی اور بروقت بھی کیا ہے؟ اس تناظر میں دیکھئے تو محاورہ محض تخیل کی پرواز حقیقت کا عکاس ہے، اسی طرح لے اور سرود کی مناسبت نے شعری حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔ پہاڑوں پر صدائے توحید بلند کرنا حقیقت ہے، فاران کی چوٹیاں آج بھی نعرۂ توحید کی تاثیر سے رشک آسماں ہیں، بتوں سے رشتے ناتے تڑانا اور خدا سے رشتہ جوڑ دینا تجنیس معنوی کی اچھی مثال ہے، ان اشارات سے مقصود صرف اتنا ہے کہ اشعار میں صرف روانی ہی نہیں محاسن شعری بھی جگمگا رہے ہیں۔

اب آیئے دوسری مشہور ترین نظم ''آنکھ کی کہانی'' پر آنکھیں جما دیں اور دیکھیں کہ بیمار آنکھ نے کیا کیا رنگ دکھائے ہیں۔ روانی و برجستگی کا تو کہنا ہی کیا، اظہار واقعہ میں بھی کہیں جھول نظر نہیں آتا اور جہاں آنکھ کے کارنامے اور محاورے باندھے ہیں ان میں تغزل کا رنگ اتنا چمک گیا ہے کہ آنکھ کام نہیں کرتی اور محسوس

ہوتا ہے کہ شاعر نے گو غزلیں نہیں کہی ہیں لیکن غزل گوئی پر پوری قدرت حاصل تھی۔ چند اشعار آپ بھی سماعت فرمالیں تو دل میں گدگدی اور آنکھوں میں چمک پیدا ہوجائے۔ یوں تو پوری کہانی سننے اور پڑھنے کے لائق، آمد ہی آمد، آورد کا کہیں نام ونشان نہیں۔ ہر شعر میں محاسن شعری کا حسن اور ہر شعر میں واقعیت کی کشش، مبالغہ آرائی کو راہ ہی نہیں مل سکی اور شاعر کا کمال یہی ہے کہ اس نے واقعیت کو پرکشش بنادیا ہے، مبالغہ آرائی وہ شعراء کریں جو اس کے بغیر جولاں گہ شاعری میں نہیں اتر سکتے، حکیم الاسلامؒ نے میدانِ شعروادب کو ایک نئی سمت عطا کی ہے اور نیا رجحان پیش کیا ہے، نظامی گنجوی کا فارمولہ ''احسن اوست اکتب اوست'' سر پٹختا ہوا نظر آرہا ہے اور حکیم الاسلامؒ کی شاعری آنکھ دکھارہی ہے تو لیجئے آنکھ کے چند اشعار پر آنکھ جما ہی دیجئے۔

ہو کھلی آنکھ تو اس سے ہے ظہور عیاں　　اور ہو بند تو ہے زیرِ نظر عالم خواب
آنکھ کھل جائے جو بھرپور ہے بجلی دل پر　　نیم وا ہو تو بھری اس میں ہے مستیٔ شراب
آنکھ نیچی ہو تو ہے نور حیا چشمہ　　اور اٹھ جائے تو ہے نار فروزاں کا عتاب
آنکھ پھر جائے تو ہے شعلۂ نفرت کی بھڑک　　اور بھر آئے تو ہے بارش رحمت کا سحاب
آنکھ ترچھی ہو تو پھٹ جائے فضاء پیشیں　　اور سیدھی ہو تو سیدھا ہے جہان اسباب
آنکھ اگر امن پسند ہے تو ہے دل بھی آزاد　　آنکھ لڑ جائے تو پھر دل ہے گرفتار عذاب
آگئی آنکھ تو کہتے ہیں کہ بیمار ہوئی　　اور نہ آئی تو سمجھتے ہیں صحیح اور صواب
چشم حق بیں ہو تو ہے نافع دین و دنیا　　چشم بد بھی ہو تو دارین کا خسران و عذاب
آنکھیں دو ہیں تو وہ ہیں کاشف الوان جہاں　　چار ہوجائیں تو ہیں سر محبت کا نقاب
کشش و دفع کی نظریں ہیں نہم آنکھوں میں　　ہر کشش تار نظر، تیر نظر وجہ عذاب
تیر اندازی نگاہوں سے ہے آنکھوں کا عمل　　آنکھ کے سارے ہی ایام ہیں یوم الاحزاب
خبر مہر وفا لائے اگر تار نگاہ　　یہی ایام پھر ہوجاتے ہیں یوم حساب
غرض آنکھوں کا کوئی رخ نہیں بے کار وقبیح　　ہو تو دنیا ہے، نہ ہو گر تو نہ رہے یوم حساب

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے وفور علم اور پرواز خیال نے آنکھ کے ایسے نظارے کرائے ہیں جو دیدہ وروں کے بھی خواب وخیال میں نہیں آتے۔ دیکھنا تو درکنار لیکن کہانی کا رنگ یہی ایک نہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کہاں ہفت رنگ اور قوس قزح ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

اس ''آنکھ کی کہانی'' کا آغاز قدیم شعرا کی طرز پر حمد ونعت سے ہوا ہے۔ اس میں بھی شاعر نے خوب

خوب مضمون باندھے ہیں اور طبعِ رسا نے، دیدہ زیب گلکاریاں کی ہیں، حمد کا پہلا شعر ہے۔ سماعت فرمائیے۔

مستحق حمد و ثنا کا ہے خدائے وہاب جس نے دی آنکھ ہمیں آنکھ کو دی نور سے آب

حمد کے بعد نعت پاک کے اشعار ہیں وہ بھی اپنے رنگ میں منفرد اور آنکھ کی رعایت سے پاکیزہ مضامین سے صاف وشفاف کہ آنکھ نہ ٹکے، دو شعر آپ بھی سن لیں، کیا خوب نعت کے اشعار ہیں۔

نعت و توصیف ہے اسی ذات مقدس کیلئے دل کی بند آنکھ کے جس ذات نے کھولے ابواب

ختم جس ذات پہ ہے عین نبوت کا کمال خوشہ چیں جن کے ہیں انسان و ملک اور دواب

حمد و نعت کے بعد حکیم الاسلامؒ نے صحابۂ کرام کی مدح ومنقبت میں چند اشعار کہے ہیں اور قرآنی ترتیب کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اس کو اگر حکیم الاسلامؒ نہ پورا کرتے تو کون کرتا؟ جس درجہ میں جس کی محبت ہونی چاہئے اور جس طرح محبت کا اظہار ہونا چاہئے، حکیم الاسلامؒ کے اشعار میں آداب ومحبت کے وہ سب رموز پائے جاتے ہیں۔ مدح وثنا کا پہلا ہی شعر دل ودماغ کے تاروں کو چھیڑ دیتا ہے اور سامع پر صحابۂ کرام کی عظمت کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔ سماعت فرمائیے۔

مدح اعلیٰ کے ہیں حقدار وہ اصحاب نبی عقل کو آنکھ ملی جن سے بآیاتِ کتاب

اشعار تو ایک سے بڑھ کر ایک، کسی پر نہ انگشت نمائی کی گنجائش اور نہ آنکھ دکھانے کی مجال، ہاں ہر شعر دل میں بسانے کے قابل اور آنکھوں میں کھپ جانے والا۔ دیکھئے کیا شعر کہا ہے۔

جو ہیں امت کے لئے علم وعمل کا معیار راہ بینا کی ہے، ان ہی کے رسوم وآداب

آنکھ ان کی تھی، نظر ان کی، بصیرت ان کی ان کے آثار سے روشن ہیں بیوت وابواب

حمد ونعت اور مدرج صحابہ کے بعد متعدد عنوانات کے تحت بصیرت افروز مضامین کی جھڑی نظر آتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سلسلہ عالم ناسوت سے نہیں کسی اور جہان سے ہے۔ کہاں تک تفصیل بیان کیجئے۔ صرف عنوانات سنا دیئے جائیں تو غواص معانی کی جودت طبع کا اندازہ ہو جائے۔ لیجئے عناوین سن لیجئے اور شاعر کی طبع رسا کی داد دیجئے۔

آنکھ کی اہمیت، آنکھ کی افادیت، آنکھ کی افادیت کے مختلف پہلو، آنکھ کے جامع مقامات، آنکھ کی اصلی اور سابقہ کیفیت، آنکھوں میں تغیر، تلاش علاج معالجہ کا آغاز، معالجہ کی کیفیت، تعمیر نو، انکشاف عالم خواب، نتیجۂ علاج، سپر یئر اور احتیاط کی بندشیں، تسلی اور اطمینان دہانی، معاون کریم، شکریہ اور دعاء نتیجہ اور خاتمۂ کلام، تتمۂ کلام اور چشمۂ صافی۔ یہ عناوین آنکھ کی کہانی حصہ اول کے تھے۔

کہانی کا دوسرا حصہ بھی ہے، اس کا آغاز بھی حسب سابق حمد سے ہوا ہے، اس میں بھی متعدد عناوین ہیں اس حصہ میں بھی رنگ و آہنگ وہی ہے، وہی قافیہ، مضامین کی ندرت، روانی و برجستگی اور بندش کی خوبیاں، کہیں نہ کوئی جھول اور نہ آورد کا شبہ، عنوانات بھی جداگانہ، ذرا سنئے تو سہی، عناوین یہ ہیں۔

حمد الٰہی، ربوبیت کا مقام، ربوبیت مستجمع صفات ہے، ربوبیت اور حمت، ربوبیت اور مالکیت، ربوبیت اور قہر، ربوبیت اور حفظ و نصرت، ربوبیت اور غناء و عطا، ربوبیت اور صمدیت، ربوبیت اور حلم، ربوبیت کا منشاء معرفت ہے۔ ہر انقلاب مال پر رب کا سوال، ربوبیت کی جامعیت، حمد جامع اعتراف ربوبیت ہی سے ممکن ہے۔ حمد ذات وصفات کی ترتیب ربوبیت ہی سے قائم ہے، توحید ربوبیت، ربوبیت مجازی ـــــ اس عنوان کے تحت بارہ عنوانات ہیں۔ اسی طرح ''نعت رسالت پناہی'' کے تحت آٹھ عناوین ہیں۔ نعت کے بعد دوسری آنکھ کے آپریشن کی نوبت آ گئی، اس کی کہانی تمہید سے شروع ہوتی ہے اور ۳۵ عناوین میں کہانی مکمل ہو جاتی ہے۔ دونوں حصوں میں سات سو اشعار ہیں، دائیں آنکھ کے آپریشن کے موقعہ پر جو اشعار موزون ہوئے تھے، کون سوچ سکتا تھا کہ دو سال کے بعد بائیں آنکھ کے آپریشن پر نئے مضامین نئی سج دھج کے ساتھ اتنے ہی اشعار پر مشتمل مزید موزوں ہو جائیں گے۔ اس کی حیرت انگیزی پر کس کو شبہ ہو سکتا ہے، یکساں حالات کے باوجود اشعار بالکل نئے مضامین کے ساتھ اپنی داد لینے کے لئے منظر عام پر، ایک ایک شعر کے محاسن کہاں تک گنائے جائیں، اشعار سے لطف اندوزی کا تعلق تو سننے اور پڑھنے سے ہے، خواہ یہ ''اسلام کی روانی'' کے اشعار ہوں یا ''آنکھ کی کہانی'' کے، جس عنوان کے تحت بھی نظمیں لکھی گئی ہیں وہ اردو ادب و شاعری میں وقیع اضافہ ہیں کیوں کہ ان تمام نظموں کا تعلق تخیلات سے نہیں واردات و تاثرات سے ہے، مجموعۂ کلام میں ستاون عناوین کے تحت نظمیں جمع کی گئی ہیں۔ ان میں قند پارسی کی چاشنی بھی ہے اور عربی کا زور بیان بھی، طویل نعت کے بعد ''بارگاہِ نبوت میں فریاد'' کے جو فریادی اشعار ہیں، اس کا ہر شعر اضطراب قلب اور سوز دروں کا آئینہ دار ہے، محسوس ہوتا ہے کہ امت کا حال زبوں دیکھ کر شاعر کا دل پارہ پارہ ہے اور اس نے جگر لخت لخت کو نظم کے قالب میں ڈھال دیا ہے، فریاد میں شاعر نے پہلے فخر موجودات ﷺ کے اوصاف عالیہ اور رفعت و منزلت کو خطاب کیا ہے اور پھر بند کا یہ شعر اس خطاب کے بعد مدعا کا آئینہ ہے، ملاحظہ فرمائیے۔

بنگر سوئے امت شکستہ جاں باختہ، دل بجاں گستہ

جی چاہتا ہے کہ فریاد کے آخری بند کے چند اشعار جو فریاد کی روح اور قلب حزیں کا مظہر ہیں پیش کر

دیئے جائیں۔ سماعت فرمایئے۔

چشمے بمن گدائے خستہ گوشے بصدائے دل گرفتہ
چشم و جگر و دل و دماغم مام کدۂ بہار رفتہ
آں رشتۂ کہ رشتۂ خدا بود حسرت کہ زدست قوم رستہ
قسمت کہ شد است پارہ پارہ شیرازۂ دیں کہ بود بستہ
سلکے کہ ز درّ آبگوں بود اے آہ کنوں ز سنگ سفتہ
کوشے کہ ز محدثات و بدعات مخلوط کنیم دین شستہ

فریاد کا آخری شعر ہے۔

برخیز کہ خالی انجمن شد بے برگ و ثمر ہمہ چمن شد

کہنا چاہئے کہ شاعر نے اپنا دل وجگر نکال کر رکھ دیا ہے اور بارگاہِ رسالت پناہی میں عقیدت کے پھول ہی نچھاور نہیں کئے ہیں بلکہ امت کی کس مپرسی پیش کر کے سفینۂ ملت کو ساحل سے ہمکنار کرنے کی فریاد کی ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنا دردِ دل ہندی ساز پر چھیڑا ہے تو حضرت حکیم الاسلامؒ نے فارسی کی شیرینی میں اپنا درد گھول دیا ہے۔ دونوں بزرگوں کی فریادیں آمنے سامنے رکھ کر پڑھئے تو قلب وجگر پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔

اے خاصۂ خاصاں رسل وقت دعا ہے امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

یہ دردوغم، سوز وگداز اور دل ربودگی ان مرثیوں میں بھی ہے جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اور دیگر بزرگوں کی وفات پر لکھے گئے ہیں، کہاں تک ایک ایک نظم کا تعارف کرایئے اور اشعار کی داد دیجئے، ہر نظم اس کی متقاضی ہے کہ اس کو پڑھا جائے اور ہر شعر ایسا کہ اس پر سر دھنا جائے، مجموعہ کلام کی ضخامت ۲۸۰ صفحات ہے، آخر میں عربی کلام ہے، ہے تو مختصر لیکن عربی پر عبور وقدرت کا مظہر ہے، پہلی نظم فکاہیہ ہے، پہلا مصرعہ عربی میں ہے اور دوسرے مصرع کا قافیہ اردو ہے، نظم بھی ماشاءاللہ طویل سو اشعار پر مشتمل ہے، خاصی دلچسپ اور حکیمانہ مضامین سے معمور ومرصع، دو ایک شعر ضیافت طبع کے لئے حاضر ہیں، سنئے اور لطف اٹھایئے۔

الا یا صدیقی اترک الدھر کلّہ فان متاع الدھر لعوق و بوکس
و ماھی الا زینة ذاتُ کدرةٍ و قشر بلا لب و قصبٌ بلا رس

دوسری طویل نظم مشاہیر امت کے عنوان سے ہے، اس میں مشاہرات کا مختصر ترین تعارف، نہایت

بلیغ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مشاہیر بالترتیب یہ ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، اخلاق وعلم نبوت اور علم انساب ہیں۔ حضرت عمرؓ شدت دین میں، حضرت عثمانؓ صفتِ حیاء میں، حضرت علیؓ علم وقضا میں، حضرت ابوذر غفاریؓ حق گوئی میں، حضرت ابوعبیدہ امانت داری میں، حضرت خالد بن ولیدؓ شجاعت میں، حضرت ابی بن کعبؓ علم وتجوید وقرأت میں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ علم تفسیر میں حضرت زید بن ثابتؓ علم فرائض میں، حضرت حسن بصریؒ وعظ میں، حضرت وہب بن منبہؒ علم قصص وتاریخ میں، حضرت محمد بن سیرینؒ علم تعبیر رویا میں، حضرت جنید بغدادیؒ علم تصوف میں، حضرت فضیل بن عیاضؒ علم معرفت میں، حضرت نافع مدنیؒ علم قرأت میں، حضرت مقاتل بن سلیمان علم تاویل القرآن میں، محمد بن السائب کلبی علم القصص میں، امام اعظم ابوحنیفہؒ علم الفقہ میں، امام شافعیؒ علم معرفۃ الحدیث میں، امام مالکؒ علم الحدیث میں، امام احمد بن حنبل عمل بالسنۃ میں، حضرت علی بن المدینی علم معرفۃ العلل میں، حضرت محمد بن نصر علم اختلافیات میں، ابوالقاسم علم العوالی میں، ابن اسحاق علم المغازی میں، یحییٰ بن معین علم اسماء الرجال میں، امام بخاری علم نقد حدیث میں، ابن مندہ سیاحت میں، ابن حزم ظاہری فن ظواہر میں، ابوالحسن اشعری علم کلام میں، خطیب بغدادی علم اداء قرآن میں، محمد بن زکریا رازی علم طب میں، ابومحمد حریری فن ادب میں، حبیب الطائی علم الشعر میں، بحتر علم تشبیہ میں، ابوالفرج اصبہانی علم محاضرۃ الادباء میں، قاضی فاضل صنعت انشاء میں، ابن نباتہ فن خطابت میں، اصمعی علم النوادر میں، سیبویہ علم النحو میں، خلیل بن احمد علم الحروض میں، ابومحشر علم نجوم میں، علی بن ہلال صنعت خوش نویسی میں، شیخ بوعلی سینا فن منطق میں، ابوعلی جبائی صنعت اعتزال میں، موصلی اور معبد فن موسیقی میں، ابوالحسن کذاب صفت کذب میں، عطاء سلمی صفت بزدلی میں، اشعب طماع صفت طمع میں مادر صفت بخل میں۔

یہ وہ مشاہیر امت ہیں جن کو امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحریر میں علم وفن کی تعیین کے ساتھ بیان کیا تھا۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب تاریخ الخلفاء میں ان مشاہیر کو بجنسہٖ نقل کر دیا ہے، حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے علامہ سیوطی کے بیان کو نہایت بلیغ انداز میں شعر کا جامہ پہنا دیا ہے۔

مشاہیر امت کے علاوہ دو نظمیں اور اسی مجموعہ میں شامل ہیں، حیرت ہے کہ شاعر گرامی مرتبت نے یہ عربی اشعار زمانۂ طالب علمی میں کہے ہیں جب وہ حماسہ پڑھ رہے تھے، ہاں حماسہ کے استاذ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی تھے جن کے ادب وشعر کا چرچا علمی حلقوں میں تو تھا ہی، عوام میں بھی ادبی مجلسوں کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی تو آپ تینوں زبانوں میں شاعری کا لطف اٹھا چکے ہیں، محاسن شعری بھی آپ کی نظر میں ہوں گے لیکن جی چاہتا ہے کہ چند محاسن شعری کو اجاگر کر دیا جائے اور حسن کی داد دی جائے۔

شاعری کا ایک حسن سہل ممتنع ہے، اس کو کمالِ حسن بھی کہتے ہیں۔ لیجئے ایک شعر زبان پر آ گیا جو بلاغت کی بھی داد چاہتا ہے۔

آ گئی آنکھ تو کہتے ہیں کہ بیمار ہوئی اور نہ آئی تو سمجھتے ہیں صحیح و صواب

ذرا توجہ دیجئے تو استعارہ کی ہر قسم کے جلوے نظر آتے ہیں، استعارہ بالتصریح ہو یا استعارہ بالکنایہ، استعارۂ بلیغ ہو یا استعارۂ تمثیلیہ، استعارۂ عامیہ ہو یا استعارۂ عنادیہ، استعارۂ غریبہ ہو یا استعارہ وفاقیہ، سب کچھ مجموعہ کلام میں موجود۔ دیکھئے استعارہ بالتصریح کا شعر سامنے آیا اس کو کیسے نظر انداز کر دیا جائے۔

آنکھ نافذ ہے کتابوں میں مثال سوزن کیا تعجب ہے، کہیں گر کہ ہے آنکھ اہل کتاب

اسی طرح استخدام، تضاد، حسن تعلیل اور دیگر صنعتوں کے اشعار مجموعۂ کلام میں جا بجا موجود ہیں، اہل فن نے ان کو بہ نظر استحسان دیکھا ہے اور مرور ایام کے ساتھ ان کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

ہاں اس شعری مجموعہ اور حضرت حکیم الاسلامؒ کی شاعری کا ایک اہم گوشہ تو رہا ہی جاتا ہے وہ ہے تصوف اور عرفان حقیقت، کوئی عنوان دیکھئے اس میں تصوف کی چاشنی ضرور ملے گی، حق بھی یہی تھا کہ مجاز کو حقیقت سے آشنا کر دیتے اور وہ حقائق جو پردۂ خفا میں تھے ان کی نقاب الٹ، سب کے رو برو کر دیتے، آخر تھے حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کے خلیفۂ اجل، اس لئے جب تصوف کی جولان گاہ میں قدم رکھا تو گوئے سبقت لے گئے، عشق و محبت کے حدود و آداب کی پاسدار میں اسی تصوف اور عرفان حقیقت کا نتیجہ ہے، منصور نے انا الحق کا نعرہ بلند کیا تو کسی نے سبحانی ما اعظم شانی کہہ کر عشق کو بے حجاب کر دیا، حکیم الاسلامؒ نے اس راز داروں کو افشاء کرنے پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہی تصوف کی روح ہیں، دیکھئے حضرت حکیم الاسلام کے اشعار میں شریعت و تصوف دو جداگانہ راستے نہیں۔ ایک ہی نظر آتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہ کہ تصوف شریعت سے جدا نہیں بلکہ اس کی آب و آبرو ہے، اب ذرا حضرت حکیم الاسلامؒ کے اشعار میں عشق و محبت کے حدود و آداب کی پاسداری ملاحظہ فرمایئے۔

اے نوا سنج انا الحق، ترا کہنا تھا بجا پر نہیں پاس ادب، عشق میں دعوی ہونا
ہے انا عشق میں اک راز درون پردہ پر نہیں راز کا حق، راز کا افشاء ہونا
عشق خود دار ہے خود راز درون عشاق عشق کی خامی و رسوائی ہے لب وا ہونا
شور برپا نہ ہو ہر ایک بلا ہو برسر یاں ہے برسر ہی ہنر، عیب ہے برپا ہونا
اپنے آپے میں خودی ہو تو خودی ہے ورنہ اپنے آپے سے گذرنا ہی ہے رسوا ہونا

انا الحق کے عنوان سے عشق ومحبت کے جو اسرار ورموز اور آداب سامنے آئے ہیں وہ نہ صرف تصوف کا پتہ دیتے ہیں بلکہ عرفان حقیقت کی سراغ رسانی بھی کرتے ہیں، یہ تو ایک نظم کے چند اشعار ہیں ''آنکھ کی کہانی''، میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جن میں تو تصوف کا گہرا رنگ ہے اور شاعر نے اپنا مقصد زندگی نہایت سادگی سے بیان کیا ہے۔

مقصد زندگی ہے طاعت حق نہ کہ فکر جہاں میں پڑنا

یہی ہے وہ تصوف جو حکیم الامتؒ کے فیض صحبت نے حکیم الاسلامؒ کے دامن علم کو آہ سحر گاہی سے آشنا کر دیا اور ہزاروں بندگانِ خدا نے اپنی عاقبت سنوار لی۔

مجموعۂ کلام کے تقاضے تو ابھی بہت ہیں لیکن کہاں تک سمع خراشی کیجئے، اسی پر اکتفا کرتے ہوئے دل مسرت سے لبریز ہے کہ حکیم الاسلامؒ کی صحبت اسی قدر بہت ہے۔

............❖............

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

مولانا محمد حنیف صاحب ملیؒ
معہد ملت، مالیگائوں

یہ عالم آب وگل دنیائے کون وفساد ہے۔ یہاں ہر آنے والا جانے کے لئے آتا ہے، حضرت الاستاذ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا حادثۂ وفات بالکل متوقع تھا۔ اخبارات اور دوستوں کے خطوط کے ذریعہ حضرتؒ کی صحت سے متعلق خبریں آنے لگیں تو دل نے بڑے اندیشے کے ساتھ یہ دھڑکا محسوس کیا بالآخر وہ وقت آ ہی گیا کہ حضرت مہتمم صاحبؒ اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔

فان ما کنا نحذر قد وقع. جس کا ڈر تھا وہ ہو کر رہا۔

حضرت مہتمم صاحبؒ جس عظیم ترین منصب کے مالک اور اسلاف کے نمونۂ کامل تھے، آج نقطۂ نظر کا اختلاف رکھنے والوں کو بھی اس کا شدید اعتراف ہے ان کی جدائی پر صدمہ برداشت کرنے والے دل اور اثر لینے والے ضمیر اس وقت تک اشکبار رہیں گے جب تک یہ حادثہ تازہ رہے گا۔ بلکہ حضرتؒ کی یاد ہر نازک موڑ اور ہر تقریب کے موقع پر خون کے آنسو رلائیگی۔ عمر عزیز کے اخیر حصہ میں جن دوستوں نے حضرت کو حریف بنا کر خوب خوب لکھا آج ان کی پشیمانی کا یہ حال ہے کہ **یالیتنی مت قبل ھذا** کہہ کر غم غلط کر رہے ہیں، لیکن کیا کوئی نوشتۂ تقدیر بھی بدل سکتا ہے۔ ہمیں یقین اور اطمینان ہے کہ مہتمم صاحب نے ملت کی عظمتوں کے لئے جو خطوط عمل اور خدمت دین کے ان مٹ نقوش ثبت کئے ہیں۔ آج بظاہر اس کو نظر انداز کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں، لیکن **اما ما ینفع الناس** کے حتمی فیصلہ کے مطابق ظلم اور ستم گر زمانہ کبھی نہیں مٹا سکتا، بلکہ چشم عالم ایک بار پھر وہ دلکش اور جلوہ افروز منظر دیکھے گا جو حضرت کے دورِ اہتمام کا اہم ترین کارنامہ ہے۔

خوش قسمتی سے اس فرومایہ راقم کو بھی حضرتؒ سے شاگردی کی نسبت حاصل ہے، اس نسبت پر تعزیت کے لئے حضرتؒ کے مکان دیوبند کو حاضری کا موقع بھی ملا۔ افسوس کہ کل تک حضرت کا سادہ مکان جو علوم ومعارف کے ساتھ انوار وتجلیات کا مرکز تھا اب وہاں سکوت سناٹا نظر آتا ہے، تاہم جب باپ کا علم بیٹے کو ازبر ہوتا ہے تو قدرت کے غیبی تصرفات اس امانت کے لئے نہ صرف نمودِ کامل بلکہ کامل حفاظت کا سامان بنتے ہیں، حضرتؒ نے اپنے خانوادہ میں علم ومعرفت کی جس شان سے تخم ریزی کی ہے، انشاء اللہ آئندہ بھی اس کے اثرات باقی رہیں گے، حضرت مولانا محمد سالم صاحب خلفِ اکبر ہیں، جو بلاشبہ اپنے والد کے سچے جانشین ہیں، حضرت مہتمم صاحبؒ کا وصال پوری ملت اسلامیہ کا وہ جانکاہ حادثہ ہے، جس پر ساری کائنات اشکبار رہے، وصال کے وقت موسم خوب گرم تھا، بارش کا نام ونشان بھی نہ تھا، وصال پر فلک ناصبور نے بھی آٹھ آٹھ آنسو بہائے، جسے تمام لوگوں نے محسوس کیا، حقیقت یہ ہے کہ حضرتؒ کے وصال سے علم ومعرفت کا آفتاب، کاروان فضل وکمال امام علم وتقویٰ امت کے مسائل کا گرہ کشا حکیم الاسلام اور ہمہ گیر انسانی اوصاف وکمالات کا پیکر اٹھ گیا، سچ ہے۔

کہاں کہاں دلِ صد چاک اشک خوں روئے
دیا ہے داغ جدائی کا اک مسیحا نے

حضرت مہتمم صاحبؒ اپنے بزرگوں کی آخری نشانی تھے، وہ حکیم الامتؒ کے جانشین، علوم انورشاہ کے امین، امانت ومسلک دارالعلوم کے بیباک نقیب اور مذہب اسلام کے سچے ترجمان تھے۔ انھوں نے اپنی ذات سے نصف صدی تک طلبۂ علم کو فیضیاب کیا، وہ نہ صرف دارالعلوم کے باوقار اور موثر مہتمم تھے، بلکہ علوم شرعیہ کے مایۂ ناز مبلغ اور قابل فخر استاذ بھی تھے، علوم نبوت اور دارالعلوم کی خدمت یہی حضرتؒ کی زندگی کا روشن مشن تھا، مولانا کا صبر وشکیب، صبر ایوبی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ اپنے پرایوں کی بے وفائیاں اور طعن وتشنیع پر عمر کے آخری حصہ میں حضرتؒ نے صبر کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہ دیا، انتقام لینا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے، ان کی زبان ہر خورد وکلاں کی تعریف میں تر تھی۔ ان کی مجلسیں غیبت سے پاک ہوتی تھیں، ہنگامۂ دارالعلوم کے دوران جو کچھ ہوا، اسے حضرت ابتلاء سمجھ کر برداشت کرتے رہے لیکن اللہ رے صبر کہ کبھی کسی کے خلاف اپنی زبان سے کوئی ناشائستہ لفظ بھی استعمال نہیں کیا، مجھے مولانا ازہر شاہ صاحبؒ نے بتایا کہ جو لوگ حضرتؒ کی مخالفت میں سرگرم تھے، جب معافی طلب کرنے آئے تو حضرت نے بلا کسی تامل کے معاف کر دیا۔ مولانا منظور صاحب نعمانی جن کے فکر وقلم نے حضرت کے خلاف محاذ آرائی میں سب سے

نمایاں رول ادا کیا ہے اور سینکڑوں صفحات سیاہ کیئے حضرت کو معافی نامہ لکھا تو اس پر حضرت نے فرمایا کہ مجھے آپکی ذات سے کوئی شکایت نہیں ہے، اس لئے معافی کا کیا سوال؟ حضرت مہتمم صاحبؒ نے مولانا منظور کے معافی نامہ کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا اس سے اہل اللہ اور خاصانِ خدا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مہتمم صاحبؒ لکھتے ہیں ''اس عالم بے چارگی میں آپ کا مکتوب گرامی ملا، جسے میں اپنے لئے اور دارالعلوم کے لئے روحانی صحت مندی کی علامت سمجھتا ہوں، آں محترم نے معافی کے الفاظ لکھے ہیں، آں محترم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میں نے اپنے چھوٹوں کو بھی کبھی خطاوار نہیں سمجھا کہ ان کی زبان پر معافی کی بات آئے، معاملہ ہم میں سے کسی کی ذات کا نہیں، نہ معافی کا ہے بلکہ ہمارے اسلاف کی یادگار دارالعلوم کا ہے، ہم سب اپنی خطاؤں کی معافی اللہ سے مانگیں، دعا مانگیں، ہم سب کو توفیق نصیب ہو اور آخرت کی جوابدہی سے نجات ملے''

دارالعلوم دیوبند کا دورِ اہتمام اور انتہائی فرض شناسی اور چابک دستی کے ساتھ دارالعلوم کی ترقی مولاناؒ کی زندگی کا وہ عظیم کارنامہ ہے جسے وقت کا مورخ نمایاں اور سنہرے حرفوں سے لکھے گا۔ مولاناؒ کی استقامت پسند طبیعت نے یہ بتا دیا کہ صحرا کو چمن اور ویرانے کو مرغزار کس طرح بنایا جاتا ہے، وطن عزیز کا دورِ غلامی خصوصاً خود کفیل مدارس کے لئے ایک چیلنج تھا، انگریز کی شاطرانہ چالوں نے اربابِ فکر ونظر علماء کے ہوش اڑا دیئے تھے، انگریز کی آخری کوشش تھی کہ مسلمانوں کو نہ صرف ان کی تہذیب بلکہ مقامات مقدسہ سے بھی دست بردار کر دیا جائے، چنانچہ آئے دن یہ مدارس حکومت کی ریشہ دوانیوں کا نشانہ بنتے رہے۔ پھر دارالعلوم دیوبند جواُم المدارس ہے وہ انگریزوں کے دست بُرد سے کیسے محفوظ رہتا، اہل نظر جانتے ہیں۔ کہ ۵۶ ؍سالہ دورِ اہتمام میں بڑے حوصلہ شکن حالات آئے، دارالعلوم کی خانہ تلاشی، کبھی پاکستانی طلبہ کی تحقیق، کبھی پاکستانی سراغ رساں مرکز کہہ کر بدنام کرنے کی کوشش اور کبھی مقامی شرپسندوں کی شرارت جیسے متعدد حربے غیروں کی طرف سے دارالعلوم کی عظمت کو تاراج کرنے کے لئے استعمال ہوتے رہے، مگر حضرت مہتمم صاحبؒ کا علم و تدبر ہر موڑ پر رنگ لایا۔ اور کسی حکومت وقت اور جماعتوں کو حضرتؒ نے دخل در معقولات کا کوئی موقعہ نہ دیا۔ ٹھیک اس وقت جب کہ پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف الاؤ دہک رہا تھا، دار و گیر اور قید و بند کے گھرے بادل ملت اسلامیہ پر منڈلا رہے تھے، مہتمم صاحبؒ نے نزاکت کا احساس فرمایا۔ اور دارالعلوم کے نظام تعلیم کو ذرا بھی متاثر نہیں ہونے دیا۔ اکابر علماء اور حضرت مدنیؒ کی مسلسل گرفتاری بھی دارالعلوم کے لئے ایک سخت ابتلاء تھی لیکن حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ

کی دور بینی اور وقت شناسی نے دارالعلوم کی ہر طرح سے حفاظت فرمائی، آزادی مل جانے اور تقسیم ملک کے بعد جو دن آئے، وہ اور بھی زیادہ سنگین تھے، سارا ملک ہنگامۂ کشت وخون میں ڈوبا ہوا تھا، قوم وطن اور ذات کے نام پر جتنا زبردست قتل عام ہوا، اس کی تلخ یادیں آج بھی ذہنوں میں تازہ ہیں۔ لازمی طور پر اس کا سب سے زیادہ نشانہ مسلمان اور اسلامی آثار بنے، دارالعلوم جو ملت کی عظمت کا نشان اور پیام اسلامی کا ترجمان ہے اس کا بھی متاثر ہونا فطری تھا، لیکن خدا کی غیبی مدد نے حکیم الاسلام مولانا طیب صاحبؒ کو وہ حوصلہ بخشا کہ فرقہ پرست اور سپہ زور طاقتوں کے ہر حملے کو پسپا کر کے چھوڑا، دارالعلوم کی عظمت وتحفظ کی خاطر حضرتؒ نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا، جسے تذکرہ نگار حضرتؒ کے ذکر سے کبھی جدا نہیں کر سکتے، اس زمانہ میں پاکستان سے آنے والی امداد بلکہ اوقاف کی آمدنی کا مسئلہ بھی الجھ رہا تھا، وہ حضرتؒ ہی کی حکمت عملی تھی، کہ امداد بحال ہوئی، اور حکومت ہند نے خود اسے ضروری اور ملک کی آبرو سمجھ کر بحال کیا، دارالعلوم خدانخواستہ جب گردش میں آئے گا تو اس ملت کو اس مردِ مجاہد اور پیرو دانا کی یاد خون کے آنسو رلائے گی۔

مولانا مرحوم اسلامی اقدار کے عظیم داعی ملی روایات کے زبردست حامی تھے، انھوں نے ایک سکنڈ کے لئے بھی غیر اسلامی زندگی برداشت نہیں کی، ان کا فکر وقلم اور ان کی ظاہری اور معنوی توانائیاں طاغوتی تحریکات کے لئے آتش فشاں تھیں۔

قادیانیت، بہائیت، مغربیت اور نظریہ دوقرآن، جیسے فتنے پاکستان میں سر اٹھا رہے تھے، تو مولاناؒ نے اپنے قلم گہربار اور زبان فیض ترجمان سے ڈٹ کر مقابلہ کیا، بلکہ پسپا کر کے دم لیا، مولاناؒ کی ذات مسلک اعتدال کے لئے میزان عدل تھی، وہ کتاب وسنت کے خلاف ادنیٰ سی فروگذاشت برداشت نہیں کر سکتے تھے، مزاج انسانیت نواز تھا لیکن گروہِ باطل کے لئے وہ تیر پیکاں اور طوفان بکف تھے، رموز زمانہ کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ہی حضرت نے زبان وقلم کا استعمال فرمایا۔ وہ اس شعر کی عمدہ اور عملی تصویر تھے۔

جس سے جگرلالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

میری طالب علمی کا زمانہ تھا، ۵۷ء میں محمود احمد عباسی نے اپنی کتاب خلافت ویزید کے ذریعہ یزید کو حق پرست ثابت کرتے ہوئے اس کی نسبت علماء دیوبند کی طرف کر دی۔ اور اس طرح مسلک دارالعلوم کو بدنام کرنے کی گھناونی سازش کی، اس فتنہ کو اس وقت کے زمانہ ساز اخبارات نے بھی خوب ہوا دی۔ اس لئے سب سے پہلے دیوبند کی سرزمین سے اس مردحق آگاہ نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور

مدرسہ کی مسجد میں، اساتذہ طلبہ اور معززین شہر کے ایک احتجاجی جلسہ کے ذریعہ اس ناپاک سازش کو بے نقاب فرمایا اور حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ اس کتاب کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر انتشار اور بے چینی پیدا ہونے کا خطرہ ہے، اس لئے کتاب کی رائلٹی اور ناشر سب پر سخت ترین قانونی چارہ جوئی ہونی چاہئے، حکومت نے بروقت کتاب کو ضبط کر کے ملت کو بڑے انتشار سے بچالیا، پھر حضرت مہتمم صاحبؒ نے مسلک حق کی ترجمانی کے لئے انتہائی موثر، شگفتہ اور دلائل وحقائق سے معمور کتاب ''شہید اعظم ویزید'' لکھی جسے نہ صرف علماء بلکہ ارباب نظر نے خوب پسند کیا۔ یہ اقدام حضرت مہتمم صاحبؒ کی زندگی کا زرین کارنامہ ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی عالمی مقبولیت کے ساتھ عالمی اسلامی یونیورسٹی بنانے میں حضرت مہتمم صاحبؒ نے جس بے جگری کے ساتھ جہاں گیر پیمانہ پر مختلف ممالک کا سفر کیا ہے، اسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ حضرتؒ کے اس مخلصانہ کارنامہ کا دنیا کوئی بدل پیش کر سکتی ہے، حضرتؒ کے ان دوروں ہی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں دارالعلوم کا روحانی فیض نہ پہنچا ہو۔ اور جہاں فضلاء دیوبند دین کے مختلف شعبوں میں نہایت اہم اور وقیع خدمت انجام نہ دے رہے ہوں۔ ہندوستان میں دینی مدارس کی تاریخ ایسے آفاقی اور ہمہ گیر طوفانی سفر کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، اپنے اسلاف کی اس مقدس امانت کے لئے حضرت حکیم الاسلامؒ نے جوانی کی توانائی اور عہد پیری کا فکر وتجربہ سب کچھ قربان کر دیا اور دارالعلوم کی ترقی کے لئے ایسا بے لوث اہتمام کیا کہ لفظ مہتمم ان کے نام کا جز بن گیا۔

اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخ زیبا لے کر

حضرت مہتمم صاحبؒ کی سیاسی بصیرت کا رشتہ حضرت شیخ الہندؒ سے ملتا ہے، دارالعلوم جب کسی سیاسی مشکل میں گرفتار ہوا تو حضرتؒ نے اس کے لئے ہر امکانی کوشش فرمائی، حکومت کی طرف سے جب کبھی مسلم مسائل کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی گئی یا مسلمانوں کے پرسنل مسائل میں حق تلفی کی گئی تو مہتمم صاحبؒ خاموش تماشائی نہیں بنے رہے چنانچہ مسلم اوقاف پر جب کبھی حکومت نے مشکوک نظر ڈالی تو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی رفاقت میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے بھی زبان وقلم سے اس کے خلاف جہاد کیا۔ پرسنل لاء بورڈ کا قیام اور اس کی صدارت کے ساتھ مولانا کا قلمی جہاد تو ان کی کتاب زندگی کا عہد آفریں باب ہے۔ ایوان حکومت سے لے کر ایک معمولی عہدہ دار کی زبان پر یہی تھا کہ بس ملک کے باسیوں کا سِول کوڈ یکساں ہونا چاہئے، اس زہر آلود فکر کی پشت پر حکومت کا ہاتھ تھا۔ انتہاء یہ ہے کہ سرکاری مسلمانوں کی

زبان پر بھی بس یہی ورد تھا۔ ایسے نازک موقعہ پر عروس البلاد بمبئی میں ملک گیر پیمانہ پر مولانا نے بڑی جرأت وحکمت سے تمام مکتب فکر کے علماء، دانشور، تعلیم کے ماہر، ماہرین قانون اور سنجیدہ غیر مسلموں کی کانفرنس طلب کی اور بڑی شان بے نیازی کے ساتھ حکومت کو للکار کر فرمایا تھا کہ ''مسلمان اپنی زندگی سے دست بردار ہوسکتا ہے لیکن اپنے پرسنل لاء اور شریعت سے کسی وقت دست بردار نہیں ہوسکتا'' مولاناؒ کی بروقت رہنمائی اور صورِ اسرافیل نے ملت کے افراد میں ایسی گرمی پھونک دی کہ خواب غفلت میں پڑی ہوئی ملت بیدار ہوئی۔ نام نہاد مسلمانوں اور حکومت کو بھی بالآخر یہ کہنا پڑا کہ حکومت مسلم علماء کے بغیر مسلم پرسنل لاء میں ترمیم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ پرسنل لاء بورڈ کا قیام اور اس کی کانفرنس جہادِ زندگانی میں مولانا کا وہ کارنامہ ہے جسے تاریخ بھلا نہیں سکتی، مولانا کی زندگی میں خدمات کا یہ وہ گوشہ ہے جس نے انہیں نہ صرف یہ کہ علماء کا نقیب بلکہ جامع اوصاف شخصیت کا مالک بنا دیا ہے۔

حضرت مہتمم صاحبؒ اپنے علم وتقویٰ کے ساتھ حدیث میں بھی ایک خاص مقام رکھتے تھے انھوں نے برسوں دیوبند میں رہ کر حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا محمد انور شاہؒ کے علوم کی اشاعت کی ہے۔ حدیث کے نکات، رموز واشارات، حقائق وحکم اور نکتہ آفرینی میں دست گاہ رکھتے تھے۔ پھر اندازِ بیان اس حقیقت آفرینی کے ساتھ سونے پر سہاگہ تھا۔ حدیث کی تشریح میں وہ بیک وقت متعدد توجیہ فرماتے تھے، جس سے ان کی بالغ نظری، نکتہ رسی اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ خدا نے ان کی زندگی میں اتنی برکت رکھی تھی کہ بیک وقت علماء کرام کی چھ چھ پشت کے استاذ تھے، ان سطروں کے راقم کو بھی ۱۹۵۹ء میں مسلسل ۳/ماہ حضرتؒ سے حدیث شریف پڑھنے کی سعادت حاصل ہے۔ ان کے فضل وکمال اور تفوقِ علمی کا یہ عالم تھا کہ ایک حدیث پر خوب شرح کے ساتھ گھنٹوں بحث فرماتے تھے، اگر اثناء درس کسی طالب علم نے کچھ دریافت کرلیا تو پھر حضرت کی موزوں اور عبقری اور ہمہ گیری طبیعت کی نکتہ آفرینی نہ پوچھئے، حضرتؒ کی زبان سے ایسے صدف پارے نکلتے تھے کہ بس سنتے رہیے اور سر دھنتے رہیے، موطا امام مالکؒ کے درس میں ''اشتکت النار الی ربھا'' اس حدیث پر حضرتؒ نے تقریباً دو گھنٹہ تقریر فرمائی، رفیق محترم مولانا عبدالحمید صاحب ازہری نے ایک خالص علمی سوال کیا۔ تو حضرتؒ نے پورے شرح وبسط کے ساتھ سائنسی نقطۂ نظر سے حدیث کے ایسے مخفی گوشوں کو بے نقاب کیا جس کا لطف آج بھی غور کرنے کے بعد نہیں جاتا مولاناؒ کی وہ پوری تقریر بعد میں ماہنامہ نقش دیوبند میں شائع ہوئی۔ بلاشبہ حکیم الاسلام اپنے جدّ امجد حجۃ الاسلام مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے علم لدنی کے جانشین تھے جس کی جھلکیاں ان

کے مواعظ حسنہ میں بکثرت دیکھی جاسکتی ہیں۔انھوں نے زبان وقلم سے دین کی سچی اور بے مثال خدمت کی ہے جیسا کہ ان کی سینکڑوں وقیع تصنیفات سے اندازہ ہوتا ہے۔اسی نکتہ آفرینی اور دقیقہ سنجی نے انہیں سارے عالم کے لئے حکیم الاسلام بنادیا۔خطابت ان کا خاص جوہر تھا جس میں ان کا کوئی مقابل نہ تھا۔ان کی زبان میں بلا کی کشش تھی۔حضرتؒ کی تقریر کیا تھی ایک جادو تھا جو دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔ جملوں کی بندش، حکیمانہ اندازِ تفہیم، عربی فارسی اور اردو اشعار کا برمحل اور برجستگی سے استعمال، زبان کی شیرینی، حکایات و امثال کے ساتھ مقصد کی تشریح حضرت حکیم الاسلامؒ ہی کا حصہ تھا۔ پھر دریا کی روانی کی طرح حضرت پہروں تقریر کرتے لیکن کوئی اکتاہٹ نہیں محسوس ہوتی تھی۔ بلاشبہ سحبانِ وائل قُس بن ساعدہ جیسے ممتاز مقررین کا دور حضرت کی تقریر سے تازہ ہوجاتا تھا، حضرت نے مخالفتوں اور دشمنی کے ماحول میں جب تقریر کی تو مخالفتوں کا فسوں اور عداوتوں کا انداز بھی ٹوٹ گیا اور مخالفین نے بہرحال اعتراف کر ہی لیا ایسے نامور افراد اور ممتاز ہستیاں صفحۂ دہر پر ہمیشہ پیدا نہیں ہوتیں۔ حضرت کی جدائی ملت کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

حضرت کی خورد نوازی نے نہ جانے کتنوں کو شہرت کے آسمان ہفتم پر پہنچا دیا۔ان کی شرافت نفس تھی کہ ہم جیسے گمنام فرد مایہ طالب علم کو بھی اپنے قلم گہر بار سے نوازتے رہے۔اور اپنی زریں نصیحتوں سے سرفراز فرماتے رہے۔ان کی عظمت کا بڑا نشان یہ تھا کہ وہ چھوٹوں کو بھی بذریعہ خط مخاطب فرماتے تھے، وصال سے چند ہفتہ پہلے ۹؍رمضان کو حضرتؒ نے مجھے جو خط لکھا ہے اس پر میں اپنے مضمون کو ختم کررہا ہوں۔ ملاحظہ ہو۔

محترم ومکرم جناب مولانا محمد حنیف صاحب زید کرمکم

سلام مسنون۔ نیاز مقرون! مزاج گرامی۔

عرصے سے بیمار ہوں۔ عدم اشتہاء کی وجہ سے غیر معمولی نقاہت وضعف بھی مستقل مرض بن گیا ہے۔ اس عرصہ میں مختلف علاج تبدیل کئے گئے، مگر معتد بہ فائدہ نہیں ہوا۔ بحمد اللہ چند روز سے قدرے افاقہ ہے۔ دعا کا طالب ہوں۔ اس وقت دارالعلوم جامع مسجد کے لئے فراہمی چندہ کے سلسلے میں جناب مولانا محمد یحییٰ صاحب صاحبزادے حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنیؒ آپ کی خدمت میں حاضر ہورہے ہیں۔ موصوف کے لئے مناسب قیام کا انتظام فرمادیں اور اصل مقصد میں مکمل تعاون اور رہنمائی فرمائیں۔ چونکہ بے سروسامانی کے عالم میں یہ نظام قائم کیا گیا ہے ہر ایک ضرورت کی چیز از سرنو مہیا کی جارہی ہے۔ اس

لئے کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے، اور آپ سے خصوصی توجہ اور تعاون کی درخواست ہے۔ امید کہ مزاج سامی بعافیت ہوگا۔ ماہِ مبارک کی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔

والسلام

محمد طیب، ۹ رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ

بہر حال مہتمم صاحبؒ کا وصال پوری ملت کے لئے نا قابل تلافی سانحہ ہے بظاہر آج مولانا ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن وہ اپنی زریں خدمات، روشن کارنامے، والہانہ سرفروشی، اور ناقابل تسخیر اخلاق و عادات کے ساتھ امر ہیں۔ اور قیامت تک رہیں گے۔ ہمارے لئے ان کی زندگی پیغام فکر وعمل اور تاریخ دعوت وعزیمت ہے۔ ہماری دعا ہے کہ مولیٰ کریم حضرتؒ کو ان کی بے لوث خدمات کا عظیم ترین صلہ دے۔ اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

............❖............

الوداع

حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ

مولانا مفتی محمد اشرف سعودی
مہتمم سبیل الرشاد، بنگلور

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، جس نے ہمیں پریشان کن حالات میں اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ کا حکم دیا اور اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ کی بشارت سنا کر ہماری ڈھارس بندھائی۔

درود وسلام ہو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو خاتم النّبیین ہیں۔ رحمۃ اللعالمین بھی اور بالمومنین اور رؤف رحیم بھی کہ آپ نے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کے انتقال پرُ ملال پر اِنَّا بِفِرَاقِکَ یا اِبْرَاھِیْمَ لَمَحْزُوْنُوْنَ (ابراہیم! ہم تمھاری جدائی سے غمگین ہیں) فرمایا کہ ضعفاء امت کو تھاما۔ سہولت وآسانی کی راہ پیدا کی اور تسلی خاطر اور اطمینانِ قلب کا نسخۂ کیمیا عطا فرمایا۔

ہم اس عظیم المناک حادثے پر جو بتاریخ ۶ر شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء بروز یکشنبہ صبح گیارہ بج کر دس منٹ پر حکیم الاسلام حضرت علامہ مولانا محمد طیبؒ کی وفات حسرت آیات کی شکل میں پیش آیا۔ خدائے رحمٰن ورحیم سے توفیق صبر مانگتے ہیں اور اسوۂ حسنہ کا اتباع کرتے ہوئے حضرت حکیم الاسلام ہی سے اپنا صدمۂ فراق بیان کرتے ہیں۔

حضرت والا! کیسے یقین کرلیں کہ آپ نے ہم نیازمندوں سے منھ پھیر لیا۔ نورِ معرفت سے روشن اور تابناک آنکھیں بند فرمالیں، علم وحکمت کے موتی برسانے والی زبان پر مہر سکوت ثبت فرمادی۔ ہمارے سروں پر سے اپنا دستِ شفقت اٹھالیا۔ اپنے الطاف وعنایات کا وسیع دامن سمیٹ لیا۔ ہم سے کنارہ کشی

اختیار فرمالی۔ گوشہ تنہائی آپ کو پسند آ گیا۔ اور بڑی خاموشی کے ساتھ آپ ہماری مشتاق اور بے چین نگاہوں سے مستور ہو گئے۔ اِنَّ لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ. اَنْتُمْ لَنَا سَلَفٌ وَنَحْنُ لَكُمْ خَلَفٌ وَاِنَّا اِنْشَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ.

حکیم الاسلامؒ! آپ علم وحکمت کا چمکتا ہوا چاند تھے، جس کی خنک اور ٹھنڈی چاندنی ہزاروں کے لیے وجہ سکون اور سامانِ قرار تھی۔ کسی بھی محفل میں آپ قدم رنجہ فرماتے تو واقعی ایسا محسوس ہوتا کہ ماہتاب علم وحکمت طلوع کر رہا ہے، چادرِ مہتاب پھیلتی چلی جا رہی ہے اور دل ودماغ سکون وطمانیت کی ایسی لطیف کیفیات سے آسودہ ہوتے چلے جاتے جن کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ آپ حکیم الاسلام تھے، خطیب الاسلام تھے، فخر الاماثل تھے زبدۃ الافاضل تھے۔ عظیم المرتبت تھے، رفیع المنزلت تھے، رئیس المتکلّمین تھے، سلطان الواعظین تھے، میرِ کارواں تھے، پیرِ رہرواں تھے، سالارِ قافلہ تھے، سرخیلِ طائفہ تھے، یادگارِ سلف تھے، تاجدارِ خلف تھے، بزرگوں کی آبرو تھے، خردوں کی آرزو تھے، چشم وچراغِ خاندان قاسمی تھے، گل سرسبدِ چمنستانِ تھانویؒ تھے، ملتِ اسلامیہ کی شان تھے، جماعتِ علماء کی آن تھے۔ اللہ رب العزت نے آپ کو اتنے اوصافِ عالیہ سے نوازا تھا، اور آپ کی ذات بابرکات میں اتنے کمالات ودیعت فرما دیے تھے کہ ہر خطاب آپؒ پر جچتا تھا اور ہر لقب آپ کی کلاہِ افتخار میں نگینے کی طرح جڑ جاتا تھا۔

بطل جلیل: لوگ کہتے ہیں کہ آپؒ بڑے نرم مزاج اور نرم گفتار تھے۔ اس میں کیا شک ہے؟ یہ امر واقعہ ہے کہ آپ خلق ومروت، تواضع وانکساری، حلم وبردباری اور نرم روی ونرم گفتاری کا حسین وجمیل پیکر تھے۔ جو بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ آپ کی خوش اخلاقی وخوش گفتاری کی لطیف شبنم میں ضرور بھیگا۔ لیکن اس نرم دم گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ آپ گرم دم جستجو نہیں تھے۔ آپ کی یک رخی اور غلط تصویر کشی ہوگی۔ بے وقت کا راگ چھیڑنا، بے محل شور مچانا اور خواہ مخواہ کی زور آزمائیوں میں لگنا یقیناً آپ کا وطیرہ اور شیوہ نہیں رہا، لیکن وقت پڑنے پر آپ نے جس جرأت وہمت، بے باکی وبے خوفی، حمیتِ ملی، غیرتِ قومی، جوشِ اسلامی اور جلالِ ایمانی کا اظہار فرمایا وہ اس بات کا بین ثبوت تھا کہ آپ اپنے نرم قالب میں ولولوں اور حوصلوں سے بھرپور اور بڑا مضبوط اور قوی قلب رکھتے تھے اور رزم گاہِ حق وابطال میں بے دریغ نبرد آزما ہو سکتے تھے چناں چہ تحفظِ دین وشریعت کے سلسلہ میں حکومتِ وقت کے خلاف سب سے پہلے آپ ہی نے آواز بلند کی اور پھر آپ ہی کی زیرِ صدارت بمبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کنونشن عظیم الشان پیمانے پر منعقد ہوا کرسی صدارت پر رونق افروز ہو کر آپ نے جو معرکۃ الآراء خطبہ دیا اور اربابِ اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جس

واشگاف انداز میں گفتگو فرمائی وہ بے مثال لازوال اور آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

آپؒ نے کس بلند آہنگی کے ساتھ فرمایا:

''آج پرسنل لاء کے نام پر ان تبدیلیوں کا مواد بنام اصلاح وترمیم پیش کیا جارہا ہے یہ اصلاح اسی قسم کی ہے جسے قرنِ اوّل کے منافقین اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ کے نعرے کے ساتھ لے کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن عالم الغیب والشہادۃ نے کھلا اعلان فرمادیا: اَلَا اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ''۔

مجھے اس وقت ایک سخت لفظ کہنے پر معاف کیجئے کہ وہ سماج کتنا دیوث ہے جو لاکھوں ماؤں بہنوں بیٹیوں کو بازار میں بیٹھنے کی اجازت دیتا ہے اور چار شادیوں کی محض اجازت اور وہ بھی خاص شرائط عدل ودیانت سے مشروط اجازت پر اعتراض کرتا ہے''۔

جس ملک میں راتوں کے کلب ہوں۔ مادرِ وطن کی بیٹیوں کے بدن سے عفت وعصمت کا لباس رات بھر اتار کر تار تار کیا جارہا ہو اور خدا کے غضب سے حکومت اور سماج بے نیاز ہو۔ ایسے ملک کے چند ایسے سر پھرے مصلحین کو مسلم پرسنل لاء کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے سو بار خود شرمانا چاہیے تھا جنھیں بے شرم سماج کو ٹوکنے تک کی بھی ہمت نہیں۔ ان میں اسلام کے فطری اور اعلیٰ وارفع قانون عصمت پر حرف زنی کرنے کی ہمت آخر کہاں سے پیدا ہوئی''۔

بہر حال نعرہ زنوں کا انداز قد ہر لباس میں عریاں ہے، خواہ وہ آئین کا لباس پہن کر آئیں یا سماج اور معاشرہ کی اصلاح کا۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی فرد دینِ خداوندی میں ترمیم وتبدیلی کا نعرہ بزعم خود کوئی اصولی بات سمجھ کر لگا رہا ہے تو میں اس اجتماع کے موقع پر اپنے تمام علماء کرام اور دانشورانِ محترم کی طرف سے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنے اس عقیدے پر اٹل ہیں کہ جس طرح خدائے بزرگ وبرتر نے اپنے نظام خلق کو اپنی سچی فطرت پر قائم کیا ہے جس میں تبدیلی ناممکن ہے کہ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ اسی طرح اس نے اپنے نظامِ امر کو بھی جس کا نام دین ہے، اپنی فطرت کی اساس پر قائم کیا ہے، اس لیے اس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ لَاتَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ' یہ قانونِ فطرت ہے اور فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی، اگر کوئی زمین، آسمان چاند سورج اور کواکب ونجوم کو نہیں بدل سکتا۔ صرف اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے تو دین کے کلیات وجزئیات احکام وآداب، اخلاق وعقائد معاملات ومعاشرت اور اجتماعی قوانین تک کی فطری حدود کو نہیں بدل سکتا۔ وہ صرف فائدہ اٹھانے کے لیے اتارے گئے ہیں۔ بدلنے کے لیے نہیں لائے گئے۔ بدلنے کی جب بھی سعی لاحاصل کی جائے گی تو خدائی حدود تو اپنی جگہ قائم رہیں گی لیکن بدلنے والوں کے حق میں سماج

کا ڈھانچہ بکھر کر غلاظتوں اور گناہوں کا ڈھیر ہو جائے گا۔

علامہ اقبالؒ نے ایسے ہی موقع کے لیے فرمایا تھا ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزم حق وباطل ہوتو فولاد ہے مومن

میر کارواں! آپ سے زیادہ کون اس حقیقت کو جانے گا کہ علم کا راستہ کتنا کٹھن اور دشوار ہوتا ہے، اس میں کیسی خطرناک گھاٹیاں آتی ہیں، کیسے بھیانک موڑ ملتے ہیں اور کیسے خوف ناک مرحلے درپیش ہوتے ہیں۔ قدم قدم مشکلات مصائب سدِراہ بنتے ہیں اور جگہ جگہ عوارض وموانع کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ سفر بڑا صبر آزما اور بہت تھکا دینے والا ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبر نے علم ہی کا راستہ طے کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''اس سفر میں تو ہم بہت تھک گئے'' **لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا ھٰذَا نَصَبًا.** (الکھف)

سفر کی یہی دشواریاں اور راستے کے یہی پیچ وخم ہیں جن سے گھبرا کر بہت سے عازمین سفر پہلے ہی قدم پر ارادۂ سفر ترک کر دیتے ہیں بعض کچھ آگے بڑھتے ہیں لیکن تھوڑا ہی فاصلہ طے کر کے ہمت ہار جاتے ہیں۔ بہت کم ہی جیالے اور سورما ایسے ہوتے ہیں جو مشکلاتِ راہ سے بے پرواہ آگے اور آگے چلے جاتے ہیں۔ لیلائے علم کی دُھن انھیں مسلسل رہ نوردی اور دشت پیمائی پر مجبور کرتی رہتی ہیں۔ اور جب تک وہ عروس علم سے ہم کنار نہیں ہو جاتے، سراپا اضطراب اور مجسم حرکت بنے رہتے ہیں۔

زعیم العلم! آپؒ ان ہی جیالوں اور سورماؤں کے رہبر وقائد تھے، آپؒ نے اپنے لیے اسی دشوار گذار اور صبر آزما راستے کا انتخاب فرمایا اور رَبِّ یَسِّر کہہ کر اس پر قدم رکھا تو پھر رکنے کا نام نہیں لیا۔ میدانِ علم میں بڑھے تو بڑھتے ہی چلے گئے اور کوہِ علم پر چڑھے تو چڑھتے ہی چلے گئے۔ آپؒ زندگی بھر جادۂ علم کے نشیب وفراز کو ہموار کرنے اور اس کے جھاڑ جھنکاڑ کو گل وگلزار بنانے میں لگے رہے۔ آپ نے اسی سنگلاخ راستے پر ایسے لالہ وسوسن اُگائے اور نسرین ونسترن کھلائے جو فردوسِ نظر بنے۔ ایسی دلنواز لے چھیڑی جو جنت گوش بنی اور علم کے متوالوں کو ایسی شرابِ طہور پلائی کہ دل ودماغ کیف وسرور کی ایک نئی دنیا سے آشنا ہوئے اور رہروانِ علم کو پتہ بھی نہ چلا کہ منزل مقصود نے کب ان کے قدم چوم لیے۔

لیکن کیا معلوم تھا کہ جن کے لیے آپ نے یہ سب کچھ کیا جن کے لیے آپ نے اپنے دھن کی بازی لگادی، جنھوں نے آپؒ سے بہت کچھ پایا۔ آپؒ کا نام لے کر اور آپ کی نسبت بتا کر اپنی دینی ودنیوی حیثیت بنائی۔ آپؒ کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کیا۔ آپ کے دستِ مبارک سے اپنے سروں پر دستارِ فضیلت

بندھوائی، اپنی کتابوں پر آپ سے تقریظیں لکھوائیں، آپؒ کی شیریں بیانی سے اپنے جلسوں کی رونق بڑھائی، وہی آپؒ کے خلاف طوفان اٹھائیں گے جاں گداز آوازے اور روح فرسا طعنے کسیں گے مخالفتوں، ایذارسانیوں، دشنام طرازیوں اور الزام تراشیوں کا ایسا شیطانی چکر چلائیں گے کہ چشم فلک حیران، اخلاق وآداب شرمسار اور تہذیب وشائستگی آب آب ہوکر رہ جائیں اور اس طرح گویا حق وفاداری ادا کریں گے۔ شیخ سعدیؒ نے بہت پہلے کہا تھا ؎

یا وفا خود نبود در عالم یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

کس نیا موخت علم تیرا زمن کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

عزیمت پناہ! آپ کے دورِ ضعیفی اور پیرانہ سالی میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا، آپ کے لیے دیدہ ودل فرشِ راہ کیے جاتے۔ آپ کی طویل اور زریں خدمات کا بھرپور اعتراف کیا جاتا۔ عقیدت ومحبت کے پُرخلوص نذرانے پیش کیے جاتے اور اعزاز واکرام کے بلند ترین منصب پر آپ کو فائز کیا جاتا۔ اس کے برخلاف ناشکری، ناسپاسی اور احسان ناشناسی کے ایسے نفرت انگیز نظارے دکھائے گئے اور دنائتِ طبعی اور خستتِ جبلی کے ایسے مکروہ مظاہرے کیے گئے کہ نبض عالم تھم تھم گئی لیکن آفریں ہے آپ کی ہمت مردانہ پر کہ ایک طرف تن تنہا آپ کی نحیف ونزار ذات اور دوسری طرف ہر قسم کے اسلحوں اور ہتھیاروں سے لیس بھیانک لشکر لیکن آپ نے سپر نہیں ڈالی، ہار نہیں مانی، جان سے جانا گوارا فرمالیا لیکن آن نہیں چھوڑی، بلاشبہ آپ نے عین میدانِ جنگ میں جان دی ہے اور علم کے راستے میں آپ نے جام شہادت نوش فرمایا ہے۔

حکیم الاسلام! ہدیۂ مبارک باد قبول فرمائیے۔ آپ شہیدِ علم بنے، بیشک شہیدِ علم! ؎

جان ہی دیدی جگرؔ نے آج پائے یار پر عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دارورسن کہاں

ممکن ہے کہ بعض نافہم بغلیں بجائیں اور ان کی کوتاہ بینی اور کم نگہی اس میں اپنی کامیابی کا سراب دیکھے لیکن دنیا جانتی ہے کہ سنگ ریزوں اور جواہر پاروں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ بے قیمت پتھر سونے کے قیمتی پیالے کو چکنا چور کرسکتا ہے لیکن اس دنیا پر نہ پتھر قیمتی بن سکتا ہے اور نہ سونا بے قیمت اسی جہاں دیدہ اور سرد وگرم چشیدہ سعدی نے کہا تھا ؎

سنگِ بدگوہر کاسۂ زریں شکند قیمت سنگ نیفزائد وزرکم نہ شود

حلیم الطبع! آپ نے ٹھیک ہی کیا۔ آخر آپ کب تک ان حالات میں ہمارے درمیان رہتے۔ صبر وتحمل کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور جذبات، ضبط و برداشت بھی لامتناہی نہیں ہوتے حلم و بُردباری کے پیالے کو ایک دن چھلکنا ہی تھا وہ چھلکا اور آپ نے رختِ سفر باندھ لیا۔

فروغِ بزم! آپ کیا تشریف لے گئے، پوری محفل بے نور اور بے رونق ہوگئی دانش وحکمت کا قصر درخشاں شب گزیدہ ہے اور اندھیروں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ وہ عزت وآبرو داستانِ پارینہ بن گئی۔ جو آپ کی رہین منت تھی۔ عظمت ووقار اور تفوق وبرتری کا وہ شاندار محل زمین بوس ہوگیا جو آپ کے دم قدم سے سرفراز تھا۔ آپ کی شان تو وہ تھی کہ جب آپ کسی علاقے کا سفر فرماتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی فرمانروا اپنی قلم رو کا دورہ کررہا ہے۔ اور آپ کے بعد اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے ع

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں

علوم ومعارف کا لہلہاتا چمن خزاں رسیدہ ہے اور اپنے بوڑھے مالی کو رو رہا ہے خوب صورت روشیں پامال اور دل کش کیاریاں خاک بسر ہیں۔ پتہ پتہ سوگوار اور ڈالی ڈالی بے قرار ہے، ہر غنچہ گریاں اور ہر پھول ماتم کناں ہے۔ گوشے گوشے سے سسکیوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ آہوں کا دھواں اٹھ رہا ہے اور پوری فضا پر غبار الم چھاتا چلا جارہا ہے۔

لطیف المزاج! اب آپ دور پہنچ گئے ناروا گستاخیوں اور بے جا جسارتوں سے بہت دور، ظالمانہ حملوں اور سنگ دلانہ یورشوں سے بہت پرے حاسدوں اور معاندوں کی رسائی اب آپ کے حریمِ ناز تک نہیں ہوسکتی۔ اب آپ اطمینان وسکون کے ساتھ سو رہے ہیں اور دائمی راحت وآرام کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ مبارک ہو آپ کو بسترِ گل اور پھولوں کی سیج۔ مبارک ہو آپ کو نومۃ العروس اور سکھ کی نیند، لیکن خدارا یہ بتائیے کہ آپ کے پسماندگان خصوصاً مولانا محمد سالم، مولانا محمد اسلم، مولانا محمد اعظم اور ہزاروں عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کے سینوں میں آپ کے اس طرح چلے جانے سے حسرت ویاس کا جو گہرا داغ اور کاری زخم لگا وہ کیسے مٹے گا، وہ کیسے مٹے گا، وہ کیسے مٹے گا؟

ارحم الراحمین! حضرت حکیم الاسلامؒ کو پوری ملتِ اسلامیہ کی طرف سے بہترین جزا عطا فرما! ان کے درجات ومراتب کو بلند سے بلند فرما اور انھیں جنت الفردوس کا اعلیٰ مقام نصیب فرما۔ آمین ؎

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی کی حامل بے نظیر شخصیت

مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی
جامعہ عربیہ، امدادیہ، مرادآباد

کیف علم اور سوزِ عشق کی جامعیت، در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق کی مصداقیت، تعلیمی و تدریسی مشاغل اور انتظامی و انصرامی مصروفیات گو یا پنبہ و آتش کو کمال توازن کے ساتھ اکٹھا کرنے اور تا عمر نبھاتے رہنے کی صلاحیت، جمالِ ظاہر اور حسن باطن کا دل کش اجتماع، اخلاق و کردار کی بے نظیر پاکیزگی اور وقار و متانت، خطیبانہ جوہر بے مثال، حکیمانہ شانِ بلند۔

یہ ہیں چند روشن نقوش ہمارے ممدوح حکیم الاسلامؒ مولانا محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی شخصیت گرامی کے، جن کی زندگی کا ہر لمحہ خدمتِ دین علم کے لئے وقف تھا اور جو اپنی وفات کے بعد بھی اس طرح زندۂ جاوید ہیں بقول شاعر ؎

بندۂ آزاد را شانے دگر
مرگ او را می دہد جانے دگر

جامع کمالات ہستی

یہ نا قابل انکار حقیقت ہے کہ جتنی علمی و عرفانی نسبتیں حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ کی شخصیت میں جمع ہوگئی تھیں ایسا اجتماع خال خال ہی ہوتا ہے، حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان بے حد حقیقت پسندانہ ہے کہ:

''اگر حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی جامع الصفات ذات گرامی کو دیکھنے والا قسم کھا کر یہ کہے کہ میں نے حقائق اسلام کی حکمت آفرینیوں کے ساتھ حضرت اقدس شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو، کتاب اللہ کے ظاہر و باطن کئے انسانیت نواز علوم کے ساتھ حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو، حقائق و احکام اسلام پر نا قابل شکست استدلال کے ساتھ حجۃ اللہ فی الارض شیخ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کو، تفقہ اسلام کی مدلل راہ نمائی کے ساتھ فقیہ الاسلام حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو، علم و عرفان کی بہم آمیز جرأت ایمانی کے ساتھ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ دیوبندی کو، عالم بے عدیل حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کو ان کی منفرد قوت حفظ و اتقان کے ساتھ، علم حدیث پر مثالی وسعت نظر کے ساتھ محدث جلیل حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کو، بے مثال طلاقت و فصاحت کے ساتھ شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کو، فراست ایمانی پر تدبر کامل کے ساتھ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو اور علم و عرفان زہد و اتقاء اور فضل و کمال کے پیکر جمال کے ساتھ حکیم الامت حضرت اقدس مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کو دیکھا ہے تو میرا دل اس پر یقین رکھتا ہے کہ انشاء اللہ وہ عنداللہ حانث نہیں ہوگا''۔(۱)

عظمت

تجزیہ نگاروں اور ماہرین نفسیات کی رائے میں انسانی عظمت کے نمایاں اور بنیادی طور پر تین عناصر ہوتے ہیں، پہلا عنصر فطری خصوصیات سے متعلق، دوسرا عنصر خاندانی اور نسبی اقدار و اوصاف سے مربوط اور تیسرا عنصر انسان کی اپنی کاوش و محنت سے جڑا ہوا ہے، گویا تیسرا عنصر اکتسابی اور پہلے دو عناصر وہبی ہیں، ایک دانشور کے بقول

''حضرت حکیم الاسلامؒ اتنے خوش بخت تھے کہ انہیں عظمت کے یہ تینوں عناصر قادر مطلق نے پوری فیاضی سے عطا کر دیئے تھے۔''(۲)

حضرت حکیم الاسلامؒ اس خانوادۂ قاسمی کے گوہر شب چراغ تھے جس نے برصغیر کی تاریخ میں محیر العقول انقلاب برپا کر دیا تھا، وہ اس چمنستان قاسمی کے گل سرسبد تھے جس کا فیض مشرق تا بہ مغرب پھیلا اور جس کا سیل رواں تب سے اب تک اس طرح فیض رسانی کرتا آ رہا ہے، وہ قال اللہ و قال الرسول کی ان صداؤں کے امین تھے جو انہیں اپنے خاندان اور اکابر سے ورثے میں ملی تھیں، پھر ان کی شبانہ روز جدوجہد،

صامت و ناطق سرگرمیاں اور تکبیر مسلسل کے ساتھ تسبیح و مناجات کا حسین و دل کش امتزاج، اساتذہ کی عطا کردہ فکر و نظر کی رعنائیاں اور ان پر مستزاد بے لوثی اور خلوص کی دولت گراں مایہ۔ ان سب نے مل کر ان کی شخصیت کو عظمت کے منارۂ بلند پر پہونچا دیا تھا۔

خطیبانہ مقام بلند

ان کی حیاتِ مبارکہ کے متنوع گوشوں اور پہلوؤں میں ایک نمایاں پہلو ان کا خطیبانہ اور واعظانہ مقامِ بلند ہے، بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پورے برصغیر میں ان جیسا متبحر اور قابو یاب خطیب ان کے زمانے میں نہیں تھا، ان کا خطیبانہ پروقار اور دھیما انداز، ان کے علمی، تمثیلی اور لطیف استدلالات، شریعت کے اسرار و رموز پر ان کی گہری نگاہ، شیریں بیانی، سلاست و فصاحت، وسعتِ معلومات ان کے انفرادی امتیازات ہیں جن میں کوئی ان کا سہیم و شریک نہ ملے گا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ رقم طراز ہیں:

حضرت حکیم الاسلامؒ عوام کی اصلاح اور وعظ و ارشاد میں شیخ وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اسلوب کے متبع تھے، حسن تقریر اور دعوتی و اصلاحی رنگ ان کا امتیاز تھا، جس سے ہزاروں انسانوں کو فائدہ پہونچا، ہزاروں دلوں میں دین کے احترام کا جذبہ اور علماء کے متعلق حسن ظن پیدا ہوا، ایسا خوش بیان مقرر و واعظ، وسیع المعلومات اور نورانی شکل کا مشکل سے دیکھنے کو ملتا تھا، جس پر پہلی نظر پڑتے ہی قلب شہادت دیتا کہ یہ فطرتاً معصوم ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ضرر پہونچانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔'' (۳)

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں:

''جہاں تک وعظ و خطابت کا تعلق ہے، اس میں تو اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو ایسا عجیب و غریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی، بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں، حضرت حکیم الاسلامؒ کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے، نہ جوش و خروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ پر تکلف لسّانی، نہ لہجہ اور ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں، لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر مؤثر، دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ اور مستفید ہوتے تھے، مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ، لیکن اندازِ بیان اتنا سہل کہ سنگلاخ مباحث بھی پانی ہو کر رہ جاتے، جوش و خروش نام کو نہ تھا، لیکن الفاظ و معانی کی ایک نہر سبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی اور قلب و دماغ کو نہال کر دیتی

تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ منھ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں، ان کی تقریروں میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا جو انسان کو زیر وزبر کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے بہا کر لے جاتا تھا"۔(۴)

برِّ صغیر کے ہر گوشے میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی آواز پہونچی اور اس سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا، مخالف فرقوں کا رد کبھی ان کا موضوع نہ رہا لیکن بے شمار گم گشتگانِ راہ کو ان کے مواعظ سے راہِ ہدایت ملی، تذکرہ نویسوں کے بقول یہی رنگ علامہ ابن الجوزی کا تھا جن کے سادہ خطاب و وعظ کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ ایک مجلس میں سینکڑوں لوگ تائب ہو جاتے تھے، کچھ یہی رنگ حضرت حکیم الاسلامؒ کے مواعظ وخطبات کا بھی تھا۔

ایک تذکرہ نگار لکھتا ہے:

"ان سے لاکھوں افراد نے ایمان باللہ کی تب و تاب اور سنت رسول ﷺ کی روشنی حاصل کی، وہ یورپ، افریقہ اور امریکہ کے قریب قریب ہر ہر گوشے میں گئے اور ہر جگہ دین قیم کی شمعیں فروزاں کر آئے، وہ جہاں بھی گئے ان کی تقریریں الحاد و باطل پر بجلیاں گراتی اور ایمان ویقین کے گلاب اگاتی چلی گئیں۔

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں(۵)

شہید اسلام مولانا محمد یوسف لدھیانوی فرماتے ہیں:

"حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کو خطابت کا خاص ذوق، زبان وبیان کا خاص انداز اور افہام وتفہیم کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا: اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بلا تکلف خطاب فرماتے تھے، زبان ایسی صاف اور شستہ، جملے ایسے نپے تلے کہ گویا سامنے کتاب رکھی ہے اور اس کی عبارت پڑھ کر سنا رہے ہیں، حقائق و واقعات کی ایسی منظر کشی فرماتے تھے گویا واقعہ متمثل ہو کر سامعین کے سامنے کھڑا ہے، شریعت کے اسرار وحکم اور طریقت وحقیقت کے رموز ولطائف اس طرح بیان فرماتے تھے گویا دریائے علم ومعرفت وہبیہ کا طوفان امڈ آیا ہے۔(۶)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے بقول:

خطیبانہ امتیازات

یوں تو حکیم الاسلامؒ کے خطیبانہ امتیازات بے شمار ہیں مگر

- مشکل سے مشکل مسائل کو دل کے نہاخانوں میں اتار دینا۔
- بات بات میں نکتہ پیدا کرنے کی صلاحیت۔
- اندازِ تکلم میں جوئے آب رواں نغمگی۔
- موضوع کا مکمل احاطہ۔
- باحوالہ گفتگو۔
- عقلی ونقلی دلائل کا اجتماع۔
- قرآن وسنت سے عالمانہ اور حکیمانہ استدلال۔
- واقعات کے ذریعہ افکار و مضامین کی مکمل تفہیمات۔
- دل نشین انداز واسلوب کے ذریعہ اپنی بات سامعین کے دلوں میں راسخ اور جاگزیں کر دینا۔
- تمثیلات کی فراوانی۔
- حقائق واسرارِ شریعت کی ترجمانی۔
- تخلیق وایجادِ مضامین۔

ان کی خطیبانہ شان کے نمایاں اور روشن پہلو ہیں۔

خطبات حکیم الاسلام پر ایک طائرانہ نظر

اِس وقت ہمارے سامنے خطبات حکیم الاسلامؒ کی دس ضخیم جلدیں ہیں جو کم وبیش ساڑھے چار ہزار صفحات کی ضخامت رکھتی ہیں۔ اِن جلدوں میں سیرتِ رسول ﷺ کے انسانی، اخلاقی، عملی، پہلوؤں، مقامِ نبوت، مقاصد وآثارِ نبوت، قرآن کریم، صحابۂ کرام، حیاتِ طیبہ، فلسفۂ علم، عبادت وخلافت، اخلاص، صحبتِ صالح، راہِ نجات، راہِ اعتدال، مقصد حیات، فلسفۂ موت، اسلام میں تصور آخرت، بیت اللہ الکریم، فضیلت روزِ جمعہ، سنت خلیل، حقیقت نکاح، ذکر اللہ، معرفت باری، رضائے الٰہی، طریق اصلاح، تعارف، اہل حق، تسکین فطرت، ادب اور اختلاف رائے، حقوق مالیہ، خطبہ طیبہ، مقصود بعثت، یادِ حق، نبوت وملوکیت، ثمرات العلم، عمل صالح، انسانی زندگی کا نصب العین، پرسکون زندگی، سیرت اور صورت، شعب الایمان، تعلیم وتبلیغ، تبلیغی جماعت اور اصلاح، جماعت تبلیغ، فضیلت وسنت، پیغام ہدایت، فکر اسلامی تشکیل جدید، اسلامی تمدن، درس ختم بخاری، شان بعثت، عناصر سیرت، اسلام عالمی مذہب، انسانی فضیلت کا راز، مقصد نعمت ومصیبت، افادات بخاری، علمی معجزہ، نجوم ہدایت، تعلیم وتدریس، تاثیر الاعمال، آداب دعا، الہامی

ادارہ اور اس کے فضلاء کی تنظیم، سائنس اور اسلام، اساسِ توحید، حج، اہمیت تزکیہ، جواہر انسانیت، ملت اسلامیہ کا المیہ اور اس کا علاج، تعلیم نسواں، افاداتِ علم وحکمت، مذہب اور سیاست، مسلم پرسنل لا، اسلام اور آزادی، عروج وزوال، تیونس ومراکش کی جدوجہد آزادی، فلسطین کا مسئلہ، آئینۂ خدمت جمعیۃ علماء ہند، نصابِ تعلیم کی تدوین، تصویر سازی کی مذہبی وتمدنی حیثیت، اشتراک مذہب، دنیا وآخرت، عالم اصغر، اساسی عبادات، اہمیت نماز، رمضان اور اس کے مقاصد وبرکات، فضیلت تقویٰ، اسلام میں عید کا تصور، محبت ومعیت، تعلیم جدید، مرکز وسعات، امتیاز دارالعلوم، اکابر دیوبند وآزادئ ہند، امارتِ شرعیہ، جامع مذہب، نبیٔ امی، راہنمائے انقلاب، عظمتِ حفظ، اسلامی آزادی، تکمیل انسانیت، حضرت نانوتوی جیسے موضوعات پر سیر حاصل گفتگو ملتی ہے۔

خطبات حکیم الاسلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی نگاہ کتنی دوررس تھی اور علوم نقلیہ وعقلیہ میں حضرت کو کتنا درک حاصل تھا، خطبات حکیم الاسلام کے مباحث علمی اور فقہی بھی ہیں، ادبی اور فنی بھی ہیں، اصلاحی وتربیتی بھی ہیں، ان میں حکایت وتمثیلات بھی ہیں، ان میں ملی اور سیاسی مسائل کا تجزیہ بھی ہے اور صاحب خطبات کا ملی درد بھی اس کے ہر ہر جملے سے واضح ہوتا ہے، اسی طرح حضرت کی علوم جدیدہ پر گہری نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے اور حکمت ولی اللٰہی ہر ہر سطر سے مترشح ہوتی ہے۔

حکیم الاسلامؒ کے حکیمانہ خطبات کے چند نمونے:

معارف القرآن

قرآن کریم کے ایک تو الفاظ ہیں، ایک معانی ہیں جو الفاظ میں پوشیدہ ہیں، پھر ان معانی کی تہہ میں حقائق ہیں، حقائق کے تحت معارف ہیں اور معارف میں کیفیات ہیں جو قلوب پر طاری ہوتی ہیں، کتاب اللہ کے نزول کا مقصد محض الفاظ ومعانی کی سمجھ بوجھ ہی نہیں بلکہ اس کا مقصد ایسے قلوب واذہان کی تربیت و تزکیہ بھی ہے جو الفاظ ومعانی کی تہہ میں چھپے ہوئے حقائق ومعارف کے ادراک کے قابل بھی ہوں اور ان معارف کی کیفیات کا محل بھی بن سکیں۔(۷)

فلسفۂ موت

موت جیسے فزع اکبر ہے جیسے عظیم مصیبت ہے ویسے ہی عظیم ترین نعمت ہے، عظیم ترین انعام خداوندی بھی ہے، موت کے بارے میں صرف ایک پہلو ہی سامنے نہ رہنا چاہئے۔ ہائے افسوس، ہائے افسوس کا بلکہ

خوشی کا بھی ایک پہلو ہے کہ یہ تحفۂ مؤمن بھی ہے، یہ طریقہ ہے۔ راستہ ہے، اللہ تعالیٰ کو ملنے کا، یہ طریقہ ہے دنیا کی آبادکاری کا، یہ طریقہ ہے نئے نئے علوم پیدا ہونے کا اور نئے مربیوں کے پیدا ہونے کا، اس لئے موت کا ایک پہلو نہیں کہ اس سے ڈریں بلکہ موت میں پہلو خوشی کا بھی ہے کہ اس کا انتظار بھی کرے اس کی تمنا بھی کرے۔(۸)

تعلیم جدید

کالج کے اندر جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ کائناتی اشیاء کو سمجھا جائے وہیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ اس کا آخری نقطہ خدا کی معرفت ہو، اسلام نے ان چیزوں کی طرف توجہ محض عیش وعشرت کرنے کے لئے نہیں دلائی، عیش وعشرت کوئی دوامی چیز نہیں، یہ تو چند روزہ قصہ ہے۔ آدمی دنیا میں آیا ہے، مسافر کی طرح سے، اس کو ایک بڑی منزل تک جانا ہے۔ اگر وہ اصل منزل کو گنوا بیٹھا تو اس نے کائنات کی حقیقت کو نہیں سمجھا، یہ تو راستہ اور رہ گزر ہے مگر چوں کہ راستے کے نشیب وفراز کا جاننا ضروری ہوتا ہے اس کے بغیر آدمی راستہ نہیں چل سکتا اور نہ ہی آدمی منزل تک پہنچ سکتا ہے، اس لئے دنیا کے عجائبات کا دیکھنا اور سمجھنا بھی ضروری ہے کہ ”یہ وہی تو راستہ ہے جس پر چل کر آدمی اپنے خدا کی معرفت تک پہنچتا ہے۔“(۹)

لغزش اور گناہ

ایک گناہ وہ ہے جس کا منشاء کبر ونخوت ہے اور ایک لغزش وہ ہے جس کا منشاء حرص ہے، حرص سے سرزد ہونا تو آدم کی جبلت ہے اور کبر سے سرزد ہونا یہ شیطان کا کام ہے، کبر میں ٹھیک مقابلہ ہوتا ہے، حق تعالیٰ شانہٗ کا آپ بڑے ہیں، میں بھی بڑا ہوں اور باہ سے جو گناہ ہوتا ہے اس میں آدمی خود اپنے کو ہیچ سمجھتا ہے کہ میں حرص میں مبتلا ہوں، اس سے اللہ کی بڑائی میں دل کے اندر کوئی کمی نہیں آتی۔

اب نتیجہ نکالئے کہ آدم علیہ السلام سے جو لغزش ہوئی وہ جاہ سے ہوئی یا باہ سے۔ ہمیں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آدمؑ کے قلب میں عظمت خداوندی بدستور موجود تھی اور دوسرے کی عظمت جب ہی ہوسکتی ہے جب اپنے آپ کو کم سمجھے، لہٰذا حضرت آدمؑ کی لغزش میں کبر کا شائبہ تک بھی نہ تھا، ادھر اس کم بخت کے دل میں حق تعالیٰ کی عظمت تھی ہی نہیں اس لئے وہ ابدالآباد کے لئے ملعون ہوگیا اور ادھر ان کے سر پر خلافت کا تاج رکھا گیا جب کہ توبہ کی اور چالیس برس تک برابر روتے رہے اور بے حد توبہ واستغفار کی، حالاں کہ وہ گناہ نہ تھا بلکہ وہ ایک فکری لغزش تھی، بہرحال میں نے عرض کیا کہ دو ہی قوتیں ہیں ایک جاہ طلبی کی ایک باہ طلبی کی۔(۱۰)

تبلیغی اجتماع

اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ تبلیغ اصلاح کے ان چاروں طریقوں کا ایک مجموعہ مرکب ہے تو یہ تبلیغی جماعت ایک معجون مرکب ہے، گویا یہ نسخہ امرت کا بن گیا جس پر اصلاح نفس کے یہ چاروں طریقے جمع ہو گئے ہیں، الغرض اس میں محنت کرنے سے بہت ہی بڑا فائدہ ہوگا، آپ کہیں گے کہ تبلیغ میں نکالا کیوں جاتا ہے؟

تو تبلیغ میں اس لئے نکالا جاتا ہے کہ اس میں بزرگوں کی صحبت میسر ہوتی ہے، پھر ساتھی اچھے ملتے ہیں جو ایک دوسرے کو برائی سے روکتے ہیں اور پھر جب وہ اپنا خرچ کر کے باہر نکلا ہے تو دینی جذبات بھی ابھریں گے اسے اپنی اصلاح کا خیال پیدا ہوگا، اس لئے کہ وہ جب اپنا گھر چھوڑ کر گیا ہے اور ہر قسم کی مشقت برداشت کر رہا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ اثر لے کر ضرور ہی آئے گا، اس کے بعد بھی اگر یہ اثر لے کر نہ لوٹے تو وہ انسان نہیں ہے بلکہ پتھر ہے، اگر انسان ہے تو ضرور وہ اثر لے کر آئے گا، کیوں کہ وہ نیک لوگوں کی صحبت میں رہا ہے۔(۱۱)

اختصار کے پیش نظر نمونے کے طور پر یہ پانچ پیراگراف پیش کئے گئے ہیں، جن سے بجا طور پر حضرت حکیم الاسلامؒ کی عقلی و فقہی بصیرت، ملی درد، سیاسی بصیرت اور حکمت کے ساتھ اصلاحِ امت کا جذبہ بے پناہ واضح ہوتا ہے اور حضرت کی علمی و عملی عظمت و جلالت کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔

حرف آخر

ہم اس مقالے کا اختتام حضرت مولانا عبدالرشید محمود گنگوہی مرحوم کے ان الفاظ پر کرتے ہیں کہ یہ ایک معاصر کا اپنے ہم عصر کے لئے حقیقت پسندانہ تبصرہ ہے اور جس میں بجا طور پر حضرت حکیم الاسلامؒ کی شخصیت و کمالات کو چند لفظوں میں سمو اور پرو دیا گا ہے، لکھتے ہیں کہ ”ان کی شیریں زبانی، شگفتہ بیانی، صورت نورانی، ہوش مندیٔ فکر، ارجمندیٔ ذہن اور دردمندیٔ دل کو کون بھلا سکتا ہے، دوائر علمیہ میں ان کی جامعیت، علوم و افکار کا تنوع، تبحر، ادبی ذوق، خوبیٔ تعبیر، حسین و بدیع ترجمانی، مجامع میں خطاب، حکمت ربانیہ و ولی اللٰہی بھی ابن جوزی کی سی سحر انگیزی بھی کس صاحبِ ذوق جوہر شناس کو رہ رہ کر یاد نہ آئے گی۔ **عجزت النساء ان یلدن مثل طیب** اب وہ کوہ کن کی بات کوہ کن کے ساتھ، کس کس نادرہ اور خلیفہ پر تعجب کریں، زبان ایسی کہ سب سمجھیں، بیان ایسا کہ دل مانے، عقل کی پاسبانی بھی لیکن کہیں کہیں اسے تنہا

بھی چھوڑ دے کے سے افکار بھی، دلائل عقلی بھی، نقلی بھی، انفسی و آفاقی بھی، حقائق و معرفت آ گئیں بھی۔''(۱۲)

دل سے دعا نکلتی ہے کہ ؎

آسماں اس کی لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

....

(۱) ندائے دار العلوم، ۱۵ر جولائی تا یکم ستمبر ۱۹۹۴ء، ص: ۲

(۲) عبد الرشید ارشد، بیس مردانِ حق، ص: ۷۷۹

(۳) مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ، پرانے چراغ ج ۳، ص: ۱۴۳

(۴) مولانا محمد تقی عثمانی، نقوش رفتگاں، ص: ۱۹۲

(۵) عبد الرشید ارشد، بیس مردانِ حق، ص: ۷۷۹

(۶) ایضاً، ص: ۱۸۸

(۷) مولانا محمد ادریس ہوشیار پوری، خطبات حکیم الاسلام، ج ۲، ص: ۱۷

(۸) ایضاً، ج ۲، ص: ۳۴۰

(۹) ایضاً، ج ۹، ص: ۲۰۵

(۱۰) ایضاً، ج ۹، ص: ۴۰۸

(۱۱) ایضاً، ج ۴، ص: ۳۹۱

(۱۲) حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، ذکر طیب، ص: ۱۹۵

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ! میری نظر میں

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی
ناظم جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی زندگی کے بے شمار پہلو ہیں جن پر واقف کار حضرات اپنے اپنے انداز سے لکھیں گے، راقم الحروف ان سے بہت قریب سے واقف نہیں ہے اس لئے اپنے لئے یہ عنوان اختیار کیا ہے کہ اس میں واقعات سے زیادہ ذاتی مشاہدات اور تاثرات کے اظہار کا موقع ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کے انتقال پر راقم الحروف نے الرشاد میں اداریہ لکھا تھا اس میں بہت سی باتوں کے ساتھ اپنے اس تاثر کا بھی اظہار کیا تھا کہ اپنی نظروں نے طبقۂ علماء میں دو ایسی باوقار دینی شخصیتوں کو دیکھا ہے کہ جو اپنے پُروقاری نورانی اور معصوم چہروں کے ساتھ جس مجمع میں پہونچ جاتے تھے پوری مجلس پر چھا جاتے تھے، اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ رحمت کے فرشتوں کا نزول ہو رہا ہے ایک حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ دوسرے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی نسبت اور مولانا تھانویؒ کی خلافت کی وجہ سے تو قابل احترام تھے ہی مگر ذاتی طور پر بھی اپنے علم وفضل اعتدال وتوازن اور شیریں مقال کی وجہ سے پورے حلقۂ علماء میں ایک ممتاز شخصیت ہی کے مالک نہیں بلکہ اس حلقۂ کے گل سرسبد تھے، انھوں نے دس پانچ سال نہیں بلکہ نصف صدی دارالعلوم دیوبند کی جو بے لوث خدمت انجام دی ہے ممکن ہے کہ وہ موجودہ تاریخ سازی کی نذر ہو جائے مگر ہندوستان کی علمی ودینی تاریخ سے ان کی خدمت کے نقوش تاباں کو مٹایا نہیں جا سکتا، جس وقت ان کو اہتمام کا عہدہ سپرد کیا گیا تھا دارالعلوم کے حلقہ کے اندر اور اس کے حلقہ کے باہر بڑی بڑی شخصیتیں موجود تھیں، مگر سب کی نظر انتخاب اسی ۲۸/۲۹ برس کے نوجوان

پر پڑی اور انھوں نے بزرگوں کے حسن ظن کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ آگے چل کر بذات خود ایک بڑی شخصیت بن گئے، جس وقت انھوں نے اہتمام سنبھالا دارالعلوم دیوبند ایک متوسط درجے کا مدرسہ تھا، جسے انھوں نے اپنے حسن انتظام سے ہندوستان کا جامع ازہر بنادیا ان کی غیر معمولی صلاحیت ہی تھی، حضرت حکیم الاسلامؒ کی ایک خاص خصوصیت عام مدارس اسلامیہ سے ان کا تعلق تھا وہ اگر کسی گاؤں کے کسی مکتب کے جلسہ میں بھی بلائے جاتے تھے تو اس میں بھی اسی اہتمام وانشراح کے ساتھ شریک ہوتے تھے، جس طرح کسی بڑے مدرسہ کے جلسہ میں وہ شریک ہوتے تھے، خواہ جامعۃ الرشاد میں ان کو جب بھی بلایا گیا تو پورے انشراح قلب کے ساتھ شریک ہوئے، خود جامعۃ الرشاد کی ابتداء ۱۹۶۲ء میں ایک کرایہ کی عمارت اور مسجد میں ہوئی مگر ۱۹۶۵ء میں اس کی جدید عمارت کا سنگ بنیاد جن علماء وصلحاء کے ہاتھوں رکھا گیا ان میں خاص طور پر حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اس کی پہلی اینٹ رکھی اس موقع پر انھوں نے مدرسہ کی افادیت پر جو مؤثر تقریر کی اس سے متاثر ہو کر شہر اعظم گڑھ جیسے غریب مقام کے باشندوں نے کئی ہزار روپے کی رسید کٹوائی۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ دوسری بار اس وقت تشریف لائے جب جامعۃ الرشاد کی طرف سے مشرقی اضلاع کے عربی مدارس کے ذمہ داروں کی مجلس بلائی گئی تھی، اس وقت مدرسہ کا ہال جہاں بنا ہوا ہے، وہاں ایک بڑا چھپر پڑا ہوا تھا، اسی چھپر میں مجلس ہوئی حضرت حکیم الاسلامؒ مجلس سے کئی گھنٹہ پہلے تشریف لے آئے اور مجلس کے بعد بھی کئی گھنٹوں اسی چھپر کے نیچے لیٹے رہے اور فرماتے رہے کہ آج اس میں بیٹھ کر بزرگوں کی یاد تازہ ہوگئی، انھوں نے اپنے معائنہ میں لکھا کہ جو کام کسی بڑے مدرسہ کو کرنا چاہئے بحمداللہ وہ جامعۃ الرشاد کر رہا ہے، تیسری بار ۱۹۶۷ء میں دستار بندی کے جلسہ میں تشریف لائے، اسی موقع پر انھوں نے اسلامی ہاسٹل کا بھی معائنہ کیا جو جامعۃ الرشاد کی طرف سے انگریزی طلبہ کی تربیت کے لئے قائم کیا گیا تھا انھوں نے ہر موقع پر اپنا معائنہ بھی تحریر فرمایا جو ان کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے ان کی ہمت افزائی اور اعلیٰ ظرفی جامعۃ الرشاد ہی کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ کسی بھی مدرسہ کی طرف سے جب ان کو مدعو کیا جاتا تھا تو وہ اس انشراح کے ساتھ تشریف لے جاتے تھے کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک اس مدرسہ کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کسی بڑے دارالعلوم کی ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی ایک بڑی خصوصیت ان کی طبعی شرافت، مروت اور نرم خوئی تھی، انھوں نے زندگی میں شاید ہی کسی کے آبگینہ دل کو ٹھیس پہونچائی ہو جن لوگوں نے اس پیرانہ سالی میں ان کے معصوم دماغ کو مجروح کیا اور بے داغ شیشہ دل کو چور چور کر ڈالا ان کے ساتھ بھی انھوں نے کبھی تلخ کلامی نہیں کی۔

ان کی علالت کے آخری زمانے میں مولانا منظور صاحب نعمانی ممبر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند جنھوں نے ان کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا بلکہ بعض ناگفتنی باتیں بھی لکھ ڈالی تھیں معافی کا خط لکھا تو انھوں نے جواب میں انھیں لکھا کہ میرا ذاتی کوئی معاملہ نہیں ہے، اور نہ مجھے کوئی شکایت ہے، دارالعلوم کا معاملہ ہے اس سلسلہ میں آپ اس کے ذمہ داروں ہی سے معافی مانگیں تو بہتر ہے اس جواب میں قدرے ناراضگی کا اظہار ہے مگر انداز کتنا شریفانہ ہے۔

مجلس شوریٰ کے بعض ممبران نے بسا اوقات ان کے خلاف بہت سخت انداز اختیار کئے تھے اور ان کے بہت سے کئے ہوئے اقدامات کو رد کرادیتے تھے مگر وہ کبھی چیں بہ جبیں نہیں ہوتے تھے اور نہ اپنے کارناموں اور شخصیت کی بنا پر ان کی ان باتوں کو بے وزن سمجھتے تھے اور نہ یہ کوشش کرتے تھے، مجلس شوریٰ سے یہ کانٹا نکل جائے، اس کے برخلاف ایک بڑے ادارے کی مجلس انتظامیہ میں لکھنؤ کے ایک مرحوم ممبر صاحب نے کچھ اعتراضات کردیئے تو ادارے کے ذمہ دار صاحب بلڈنگوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ آپ لوگوں کو یہ سب کچھ نظر نہیں آتا صرف اعتراض کرنا آتا ہے۔

بلبلیں تفاوت رہ از کجا تا بکجا، دارالعلوم دیوبند میں اساتذہ کا ایک گروپ ہمیشہ حضرت حکیم الاسلامؒ کا مخالف رہا مگر انھوں نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، ممکن ہے کہ کسی مخصوص وجہ سے کسی کی علیحدگی ہوئی ہو مگر عام طور پر انکا طرز عمل یہی رہا، یہی حال طلبہ کے ایک گروپ کا رہا مگر وہ ہمیشہ ان کو معاف ہی کرتے رہے۔

۱۹۶۴/۶۵ء میں ایک بار دارالعلوم میں کچھ مالی بحران پیدا ہوگیا تو حضرت حکیم الاسلامؒ نے ذاتی طور پر خود جہد کی اور اس کے لئے حضرت مولانا وصی اللہ صاحبؒ اور بعض دوسرے بزرگوں سے دعا کی درخواست کی اس خط سے متاثر ہوکر مولانا وصی اللہ صاحبؒ نے اپنی عام عادات کے خلاف دارالعلوم کے لئے مالی اعانت کی اپیل کی جس سے دارالعلوم میں ہزاروں روپئے پہنچ گئے۔

اوپر عرض کرچکا ہوں کہ وہ اعتدال توازن اور نرم خوئی کا مجسمہ تھے، کسی مسئلہ کے سلسلہ میں وہ شدت کو پسند نہیں کرتے تھے اسی طرح ہندوستان کی مسلم جماعتوں کے سلسلہ میں بھی ان کا طرز عمل ہمیشہ اعتدال کا رہا، یہی وجہ تھی کہ وہ ہر طبقہ میں قبول کرلئے جاتے تھے۔

۱۹۴۰ء میں ندوۃ کے طلبہ کا ایک وفد دارالعلوم دیوبند کے لئے گیا تھا، اس وقت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حیات تھے، انھوں نے اور حضرت حکیم الاسلامؒ نے وفد کا اعزاز کیا اور ان کے استقبال میں مسجد کے اندر ایک جلسہ کیا، جس میں حکیم الاسلامؒ نے تقریر فرمائی، اور اکبر الہ آبادی کا وہ مشہور قطعہ پڑھا جس میں

دارالعلوم دیوبند ندوہ کا اور علی گڑھ کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔

سیاست میں بھی ان کا طرز عمل انتہا پسندی کا کبھی نہیں رہا، وہ دارالعلوم کے مصالح کو پیش نظر رکھتے تھے ایمرجنسی کے زمانہ میں ان کے ایک بیان سے کچھ لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ فیملی پلاننگ کے موافق ہو گئے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں تھا ان کے بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ کسی مسئلہ میں جائز اور ناجائز کا فتویٰ دینا دارالعلوم کے دارالافتاء کا کام ہے اور وہ فتویٰ دے چکا کہ یہ جائز نہیں، البتہ یہ مسئلہ چونکہ نیا ہے اس لئے اس پر علماء کو غور کرنا چاہئے کہ اس کی کچھ صورتیں بعض حالات میں مباح ہوسکتی ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو علمی و دینی حیثیت کے ساتھ دنیاوی وجاہت سے بھی نوازا تھا اسی وجہ سے ان کے گھر اور معاشرتی زندگی میں جو رکھاؤ تھا وہ بھی بہت کم سواد لوگوں کی نظروں میں کھٹکتا اور وہ اس کو ان کا سب سے بڑا عیب بنا کر پیش کرتے تھے۔

کور بختا آرزد خواہند مقبلاں راز وال نعمت وجاہ

بہرحال دارالعلوم میں تعلیم ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی اور نظر وانتظام چل رہا ہے اور چلتا رہے گا مگر ان کی ذات سے جو اس کو دینی و علمی وقار حاصل ہوا تھا وہ آسانی سے پورا نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کو اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے اور ملک کی امانت دارالعلوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور اخلاص وللّٰہیت جو اس ادارہ کی سب سے بڑی خصوصیت تھی اس کے کارکنوں اساتذہ اور طلبہ کے سینوں میں پھر سے جاگزیں کردے۔

............❖............

یادِ ماضی

مولانا خالد حسین بلیاویؒ
سابق استاذ دارالعلوم دیوبند

ہزاروں حمد و سپاس اس خالق بیچون کو کہ جس نے عالم کو بنایا اور اس میں بنی آدم کو رتبۂ اعلیٰ عطا فرمایا اور سو ہزاروں رحمتیں اُن کی جان پاک پر کہ آپ بچے اور اوروں کو بچایا اور بھکے ہوؤں کو سیدھا راستہ دکھایا اب یہ چند سطور پیش خدمت ہیں اور پیش کنندہ ہے ایک ناچیز مسمی خالد حسین بلیاوی عفا اللہ عنہ اوران سطور میں کچھ یادیں ہیں جو عظیم ترین شخصیت حضرت اقدس مہتمم دارالعلوم دیوبند حکیم الاسلام مولانا طیب صاحبؒ برّد اللہ مضجعہ کی ذات بابرکات سے متعلق ہیں یہ ناچیز الہ آباد میں مدرسہ وصیۃ العلوم میں زیر تعلیم تھا مدرسہ کے قریب ہر سال جلسہ ہوتا تھا اسی درمیان میں حضرت حکیم الاسلامؒ بھی تشریف لائے اور بندہ نے پہلی مرتبہ حضرت کو دیکھا اور سنا ایسا محسوس ہوا کہ یوسف گم گشتہ سامنے ہے اور ’’إن ھٰذا من البیان لسحرا‘‘ کا جادو مجمع کو مسحور کئے ہوئے ہے (کنتم خیر امۃ) کی آیت مبارکہ موضوع سخن ہے اور خیریت کے تمام پہلو زیر نظر ہیں اور بلبل شیریں بیان کی شیرینی نے ہر صاحب سماع کو حلاوت العسل المصفی سے ہمکنار کیا ہوا ہے اور اس بندہ نے اس تقریر سے جو سمجھا وہ یہ تھا کہ امت تین اجزاء سے وجود پذیر ہوتی ہے:

(۱) شخصیت سے (۲) کتاب سے (۳) اور مرکز سے اور اس امت کو جو شخصیت ملی وہ خیر الانبیاء ہیں جو کتاب ملی وہ خیر الکتاب ہے اور جو مرکز ملا وہ کعبہ خیر المراکز ہے پھر حضرت نے ہر ایک دعویٰ کو کس طرح مدلل کیا بس اسے تو بحر بیکراں کہئے یہ ہے بندہ کا حضرت سے لقاء اول اس کے بعد بندہ دارالعلوم دیوبند میں حاضر ہوا ہدایہ آخرین اور دوسری کتابیں زیر درس رہیں اور ساتھ ساتھ حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں حضرت سے استفادہ رہا اور خوب رہا ایک موقع پر حضرت نے درس میں فرمایا لغات میں سب سے زیادہ فطرت کے

قریب عربی زبان ہے اور اس کی مثال پیش فرمائی مثلاً نیزہ مارنے کے لئے عربی میں طعن کا لفظ آتا ہے دراصل نیزہ چلانے اور مارنے کے وقت اس کی فطری آواز کا صوتی انداز ہے اس لئے کہ جب نیزہ حرکت کرتا ہے تو طعن طعن کی آواز سنائی دیتی ہے بندہ بعد عصر حضرتؒ کی مجلس میں حاضری دیتا تھا ماشاءاللہ حاضرین کے جانب سے سوالات اور حضرت کے جوابات سننے والے اپنے دامن میں کیسا کیسا موتی سمیٹتے تھے ایک موقع پر بندہ نے سوال پیش کیا کہ امت کا اجماعی مسئلہ ہے کہ روضۂ اطہر عرش سے افضل ہے مگر اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ ایک مشکل سوال ہے حضرتؒ نے فی البدیہ جواب عنایت فرمایا کہ ظاہر ہے کہ عرش پر اللہ کی تجلی ہے مگر وہ تجلی غیر مدرک ہے اور قلب اطہر نبوی پر بھی تجلی ہے اور وہ مدرک ہے اور بلاشبہ مدرک غیر مدرک سے افضل ہے اور وہ جسم جو ایسے قلب کا حامل ہے وہ بھی اس قلب کی طرح افضل اور جو بقعۂ زمین اس جسم افضل سے متصل ہے وہ بھی اتصال کی بناء پر افضل ہے پس ثابت ہو گیا کہ روضۂ اطہر عرش سے افضل ہے لیجئے ایک ایسا مسئلہ جو لانیحل نظر آرہا تھا حضرتؒ نے چٹکی میں حل فرمادیا یہی تو وجہ ہے کہ بندہ جب ایک موقع پر حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں حاضر تھا اور حضرت حکیم الاسلام کا ذکر خیر آیا تو فرمایا کہ حضرت تھانویؒ حکیم الامت تھے تمام امت کے علوم کو پیش فرمایا امت اجابت ہو یا امت دعوت اور مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اسلام کے تمام مسائل علمیہ اور اسرار شرعیہ کو حل فرمایا اس لئے حکیم الاسلام کے لقب سے انھیں یاد رکھا گیا اس طرح بندہ دارالعلوم دیوبند کی جانب سے آگرہ گیا ہوا تھا وہاں الہ آباد سے ایک بزرگ قاری حبیب صاحبؒ جو ڈاکٹر عیسی صاحبؒ (جو کہ حضرت تھانویؒ کے اولین خلفاء میں شمار کئے جاتے ہیں) کے خلیفہ تھے تشریف فرما تھے انھوں نے حضرت حضرت حکیم الاسلامؒ صاحب کے سلسلہ میں ایک واقعہ بیان فرمایا کہ جب حضرت تھانویؒ علاج کے سلسلہ میں لکھنؤ تشریف لے گئے اور حضرت کی قیام گاہ علماء اور مشائخ کا پرکشش بنی ہوئی تھی اور حضرت حکیم الاسلامؒ بھی وہاں موجود تھے تو ایک موقع پر حضرت تھانویؒ کے سامنے جہاں یہ بندہ (قاری حبیبؒ) بھی موجود تھا تمام علماء اور مشائخ نے حضرت تھانویؒ سے یہ کہا کہ ہم سب حضرت حکیم الاسلامؒ سے درخواست کر رہے ہیں کہ تقریر فرمائیں مگر وہ انکار کر رہے ہیں آپ حکم دیدیجئے کہ وہ تقریر کریں تو حضرت تھانویؒ حکیم الاسلامؒ مولانا محمد طیب کے سامنے فرمایا کہ میں بھی درخواست کرتا ہوں کہ تقریر فرمائیں اس جملہ پر حضرت حکیم الاسلامؒ بیٹھے ہوئے پورے طور پر حضرت کی جانب اپنے کو جھکالیا اور اس طرح خلیفۂ شیخ نے شیخ کی اطاعت کا اظہار کیا۔

وزیرے چنیں شہریارے چنیں

پھر جناب قاری حبیب صاحب جو اس واقعہ کے روای ہیں فرماتے ہیں کہ اتنی لاجواب تقریر فرمائی کہ ماشاءاللہ تبارک اللہ۔

صدسالہ کے موقع پر یہ بندہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے ہمراہ مراد آباد گیا بندہ خادم تھا مگر اپنی تمام ضروریات حضرتؒ بلاطلب خدمت کے خود پوری فرماتے احساس بھی نہ ہونے دیتے کہ خدمت کی ضرورت ہے پھر مراد آباد پہنچنے کے بعد حضرتؒ نے جہاں قیام کیا وہاں حضرتؒ کے لئے مسہری کا انتظام تھا جو آٹھ افراد کے لئے کافی تھی بندہ نے حضرت کے سونے کے لئے بسترہ مسہری پر بچھایا اور خود قالین پر مگر حضرتؒ نے فرمایا کہ مولوی خالد آپ یہ کیا کررہے ہیں آپ بھی اپنا بسترہ اوپر ہی بچھائیں بندہ کو تعمیل حکم کرنی پڑی اسی طرح شہر مراد آباد والوں نے حضرتؒ کے اعزاز میں رات کا کھنا رکھا اور بڑے بڑے اہل کمال کو اس میں مدعو کیا مقصد حضرتؒ کی تعظیم وتوقیر تھی مگر حضرتؒ کی طبیعت کچھ موزوں نہ تھی چنانچہ معززین جب حضرت کو لینے آئے تو فرمایا کہ میری نیابت کے لئے مولوی خالد کو لیجایئے جب یہ بندہ مقام دعوت وعزیمت پر پہنچا تو سب دیکھ رہے تھے کہ یہ کون آرہا ہے ایک ذرۂ بے مقدار سراپا صاحب قدرومنزلت صاحب اقتدار کے بجائے؟ اس سفر میں جب لوٹنا ہوا تو سفر کار سے طے پایا پچھلی سیٹ پر حضرتؒ نے ہمیں ساتھ بٹھایا ایک موقع پر میں نے حضرت سے عرض کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے بنارس میں ایک جلسہ رکھا تھا تمام علماء مدارس وہاں جلوہ افروز تھے اور مولانا مدنیؒ شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ کو اپنے ساتھ لے گئے تھے مگر تقریر آپ کی ہوئی تھی میں نے یہ واقعہ سنا ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ مولانا ابوالکلام مرحوم نے درس نظامی پر سخت اعتراض کیا تھا مگر آپ کی تقریر اور ان کے اعتراضات کے جواب سے ان کی گردن جھک گئی میں آج اس واقعہ کی سند متصل اور عالی کرنا چاہتا ہوں اس پر حضرت گویا ہوئے کہ میں تو اس جلسہ میں خصوصی طور پر مدعو بھی نہیں تھا بلکہ کسی اور بنا پر بنارس گزرنا ہوا تو سوچا کہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ یہاں آئے ہوئے ہیں ان سے ملتا چلوں اس طرح وہاں جاناں ہوا مگر جب مولانا ابوالکلام مرحوم کو معلوم ہوا کہ میں آیا ہوا ہوں تو انھوں نے باقاعدہ خصوصی انتظام کرلیا اور جلسہ میں شرکت کے لئے روک لیا اس طرح میں بھی شریک ہوگیا پھر جب اپنے وقت پر جلسہ شروع ہوا تو ابوالکلام صاحب نے درس نظامی کے خلاف خوب خوب رد کرنے کی ناکام کوشش کی اور خطاب کے بعد کہا کہ کسی صاحب کو کچھ کہنا ہے تو تشریف لائیں۔ چنانچہ بڑے بڑے علماء اور مدارس کے ناظم تعلیمات سبھی موجود تھے مگر سب کی نگاہیں مولانا مدنیؒ کی طرف اٹھی کہ اٹھیں اور جواب دیں مگر مولانا مدنیؒ نے ہمیں دیکھا اور اشارہ فرمایا کہ آپ آئیں میں نے کہا

حضرت آپ نے تو مجھے جلسہ کے لئے پوچھا تک نہیں اب آپ جانیں حضرت نے اصرار کیا کہ نہیں آپ ہی کو جواب دینا ہے پھر میں اٹھا اور مولانا ابوالکلام صاحبؒ کی ایک ایک بات کا بحمد اللہ جواب دیا ان کا اعتراض مقامات حریری اور حماسہ پھر ملا حسن قاری مبارک ملا رحمہ اللہ اور اس قسم کی فنی کتابوں پر تھا میں نے بتایا کہ احادیث وقرآن میں جو سہل الفاظ ہیں وہ تو آپ لغات اور ڈکشنری سے حل کر سکتے ہیں مگر چوں کہ بعض ایسے کلمات ہیں جو اہل عرب کی خصوصی بدوی ماحول سے متعلق ہیں ان کے لئے مقامات حریری اور حماسہ جیسی کتابوں کے بغیر آپ ایک قدم نہیں چل سکتے اور آپ کا علم ناقص رہے گا، رہا معقولات کی کتابوں کا مسئلہ تو اب حالات وامزجہ جدل ومناظر کے عادی بن چکے ہیں دو دو چار جیسی بدیہی باتیں بھی لوگ سادہ انداز میں ماننے کو تیار نہیں بلکہ اس کے لئے بھی جنس ونوع وفصل اور عرض عام اور قضایا شرطیہ وغیرہ کے بھاری بھرکم الفاظ ہی سے تسلی پاتے ہیں اور علم کی دھاک بیٹھتی ہے اور چوں کہ درس نظامی کا مقصد ایسے رجال کار اور ماہرین اور جامع منقولات ومعقولات پیدا کرنا ہے جو ہر میدان میں اور ہر ماحول کے لئے نسخۂ شفا پیش کرسکیں اس کے لئے یہی کچھ کتابیں درکار تھیں الخ حضرت کی باتیں وہ حضرت ہی کا حق ہیں یہ جو کچھ بندہ نے پیش کیا یہ ایک ناقص کی انقص ترجمانی ہے اس کے بعد حضرت نے جو بات فرمائی اور خوب فرمائی حضرتؒ نے فرمایا کہ جناب ابوالکلام صاحبؒ آپ ہمیں نصیحت فرما رہے ہیں آپ کو تو چاہئے کہ جدید علوم کی اصلاح کی جانب توجہ فرمائیں جو آپ نے کالج اور یونیورسٹیوں میں نافذ کر رکھا ہے اس لئے کہ یہ نصاب انگریزوں نے آپ کو دیا ہے اور ان کا مقصد اس نصاب سے صرف کلرک پیدا کرنا تھا افسر اور اوپر کے گریڈ والے تو وہ لندن سے لاتے تھے اور اب آپ کو سب اہل کار یہیں تیار کرنے ہیں لہٰذا شدید ضرورت ہے کہ ادھر توجہ کی جائے ہم مدارس والے اس کے محتاج نہیں ہاں آپ سخت خسارے میں ہیں آپ کو یہ زیبا تھا مگر آپ کچھ اور کر بیٹھے اس کے بعد ہمارے حضرت نے فرمایا کہ میری تقریر کے بعد آخری کلمات کیلئے جب مولانا ابوالکلام صاحب کھڑے ہوئے تو صرف اتنا کہا کہ حکیم الاسلام مولانا محمد طیبؒ کی تقریر سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ حضرت قاسم نانوتویؒ کی روح ان میں حلول کرگئی ہے مگر مولانا ابوالکلام صاحب کے پاس ہماری بات کا جواب نہ تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں شش ماہی امتحان کے بعد ہر سال جلسہ ہوتا تھا جس میں گزشتہ سالانہ امتحان کے نتائج کے پیش نظر انعامات تقسیم ہوتے تھے تاکہ آنیوالے سالانہ امتحان میں طلبہ خوب محنت کے ساتھ امتحان دیں صد سالہ سے پہلے اسی قسم کا ایک جلسہ تھا اسٹیج پر میں موجود تھا حضرت تشریف لاچکے تھے اور اساتذہ آرہے تھے بندہ نے ایک خواب دیکھا تھا کہ حکیم الاسلام مولانا

محمد طیبؒ کا سفر آخرت درپیش ہے بندہ نے اس موقع پر حضرت سے خواب کا تذکرہ کیا اور کہا کہ حضرت آپ اپنی زندگی میں مولانا سالم صاحب دامت برکاتہم کو اپنی جگہ متعین فرمادیں تو اچھا ہوگا حضرت کا جواب کیا تھا سنئے مولوی خالد صاحب یہ معاملہ میں نے اللہ کے حوالہ کررکھا ہے وہ جس کو چاہیں یہ اسی کا حق ہے میں نے نہ کبھی ایسا پہلے سوچا نہ اب سوچتا ہوں نہ آگے ایسا ارادہ ہے یہ ہیں وہ الفاظ جس کو میں نے پورے ہوش وحواس کے ساتھ سنا اور محفوظ رکھا اب جو حضرات ہمارے حضرت پر تہمت لگاتے ہیں اور بے سند کی اڑاتے ہیں ایسے فرشتہ صفت انسان کے بارے میں وہ جانیں اوران کا معاملہ اللہ کے حوالہ والی اللہ المشتکیٰ، اسی طرح حضرت اقدس کا معاملہ دارالعلوم دیوبند کے سلسلہ میں کس طرح تفویض وتوکل کا تھا تین واقعات مجھے یاد ہیں پیش کرتا ہوں۔

پہلا واقعہ جو براہ راست حضرت حکیم الاسلامؒ سے میں نے سنا وہ یہ کہ جب پاکستان بنا تو مولانا مدنیؒ حکیم الاسلامؒ کے پاس اہتمام میں تشریف لائے اور حضرت حکیم الاسلامؒ سے فرمایا کہ اب مدرسہ کیسے چلے گا؟ حکیم الاسلامؒ نے کہا کہ حضرت میں نے مطلب نہیں سمجھا فرمایا چندہ دینے والے اکثر امیر حضرات پاکستان چلے گئے اب مدرسہ کا کیا ہوگا؟ حضرت حکیم الاسلامؒ نے کہا کہ حضرت اس مدرسہ کا معاملہ تو پہلے بھی اللہ کے حوالہ اور توکل پر تھا اب بھی ایسا ہی رہے گا اس پر حضرت مولانا مدنیؒ گویا ہوئے وہ سب صحیح مگر اسباب بھی تو چاہئے پھر حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ حضرت آخرکون سے اسباب اختیار کرنے چاہئیں تو مولانا مدنیؒ نے فرمایا کہ حکومت کو درخواست دیجائے کہ وہ مدرسہ کے لئے فنڈ متعین کرے اس پر حضرت حکیم الاسلامؒ نے کہا حکومت سے درخواست کرنا تو کسی بھی درجے میں صحیح معلوم نہیں ہوتا بہرحال حضرت حکیم الاسلامؒ نے حسن حیل سے بات ٹال دی پھر حضرت حکیم الاسلامؒ نے اگلی بات جو کہی وہ یہ تھی کہ اسی درمیان میں میرا سفر پیش آگیا اور چند ماہ کے لئے میں سفر پر چلا گیا جب کئی ماہ بعد مدرسہ کے اہتمام میں حاضر ہوا تو چند دن بعد حکومت کی ایک تحریر سامنے آئی جس میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے الفاظ کے مطابق چھتیس سوالات تھے میں سمجھ گیا کہ میری عدم موجودگی میں چوں کہ مولانا مدنیؒ ہی منصب اہتمام پر ہوتے تھے تو حضرت نے اپنی صوابدید پر حکومت کو درخواست بھیج دی اور امداد بھی مدرسہ میں آگئی اب امداد کے بعد یہ سوالات کی فہرست تھی جو میرے سامنے تھی میں نے کسی ملازم کے ذریعہ حضرت مدنیؒ کو اہتمام میں بلایا اور بلا کے کچھ کہے بغیر وہ سوالات کی پرچی حضرت کے سامنے رکھ دی بس کیا تھا حضرت مدنیؒ حکومت پر خوب چراغ پا ہوئے اور فرمایا کہ فوراً آئی ہوئی رقم اس پرچی کے ساتھ واپس کردی جائے ظاہر ہے کہ رقم تو خرچ

ہو چکی تھی۔ لہٰذا دیو بند کے رئیس اعظم جمیل کو بلایا گیا جن سے مدرسہ بوقت ضرورت قرضہ لیا کرتا تھا چنانچہ اتنی رقم ان سے قرضہ لی گئی اور عطائے تو بلقائے تو وہ رقم اور پر چی حکومت کو واپس کر دی گئی۔

دوسرا واقعہ جو ہمارے سامنے تھا کہ حضرت حضرت حکیم الاسلامؒ کسی سفر میں تشریف لے گئے جب واپس آئے تو نائب مہتمم صاحب مولانا معراج الحق صاحبؒ نے حضرتؒ سے کہا کہ حضرت خزانہ خالی ہو رہا ہے، مدرسہ کا خرچہ کیسے چلے گا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ اسکا مطلب یہ ہے کہ ہم سے کوئی بڑی غلطی ہوئی ہے جس کا یہ نتیجہ ہے۔ آیئے بیٹھ کر سوچتے ہیں اوراس کا تدارک کرتے ہیں اس کے کہنے کے بعد مولانا معراج الحق صاحبؒ نے فوراً کہا حضرت آپ سے نہیں بلکہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے جب آپ سفر میں تشریف لے گئے تو میں نے تعمیر کے مد کی رقم بینک کے سود حاصل ہونے والے شعبہ میں ڈال دی تا کہ اس سودی پیسے سے حمامات وغیرہ طلبہ کے لئے بنا دیئے جائیں تو معاً حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ فوراً سود والے اکاؤنٹ سے رقم نکال لیجئے چنانچہ ماشاءاللہ رقم نکالتے ہی چندہ آنا شروع ہو گیا اور خزانہ اپنی سطح پر پہنچ گیا۔

تیسرا واقعہ جو مجھے حضرتؒ کے خاص لوگوں نے بتایا کہ حضرتؒ احمد آباد سے دلی تشریف لا رہے تھے اور سفر ہوائی جہاز کا تھا راستہ میں پائلٹ نے اعلان کیا کہ جہاز خطرہ میں ہے۔ چنانچہ تمام لوگ پریشان ہو گئے مگر حضرتؒ پر کچھ بھی اثر نہ تھا اسی اثناء میں حضرتؒ کے بڑے پوتے جو کم عمر تھے گھبرا کر کہنے لگے کہ دادا جان اب کیا ہوگا؟ حضرتؒ کا جواب سنئے اور امین خزانہ دار العلوم دیو بند کی امانت کی برکت دیکھئے کہ فرمایا بیٹا کچھ نہیں ہوگا ہم اللہ کی حفاظت میں جہاز سے دہلی پہنچیں گے اس لئے کہ دار العلوم کی رقم میرے پاس ہے اللہ تعالیٰ اس کو ضائع نہیں فرمائیں گے۔ فللّٰہ درہ.

بندہ کا انٹرویو تدریس کے سلسہ میں جب ہوا تو دس حضرات میں سے دو کو مدرس رکھنا تھا بندہ کو حضرت والاؒ نے عارضی طور پر مدرس رکھ لیا تھا اس لئے کہ مہتمم کو اتنا ہی اختیار تھا اصل تقرر تمام شوریٰ والوں پر موقوف تھا چنانچہ انٹرویو کے بعد بندہ کو پورے نمبر ملے جب کہ انٹرویو لینے والوں میں سعید احمد اکبر الہ آبادیؒ، قاری سجاد صاحبؒ، صدر المدرسین مولانا فخر الحسن صاحبؒ، اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ اور جناب حضرت مہتمم صاحبؒ تھے چنانچہ جب دوسرے دن میں حضرت والاؒ کی مجلس میں حاضر ہوا تو حضرت ہمیں دیکھ کر کرسی سے کھڑے ہو گئے اور فرمایا چونکہ مولوی خالد اب دار العلوم دیو بند کے استاذ ہو گئے تو ہمارے بھی استاذ ہو گئے اللہ اللہ دار العلوم دیو بند کی عظمت کو سمجھنے والے اور چار چاند لگانے والیں یہ ہستیاں تھیں اور اگلی بات جو فرمائی وہ تو میرے لئے نعمت بلکہ سامان مغفرت ہے وہ یہ ہے مولوی خالد نے میری لاج رکھ لی۔

اب حضرتؒ کی وفات کے موقع پر بے ساختہ کچھ بے قافیہ اور بے وزن اشعار بن گئے تھے اس کو پیش کررہا ہوں، جو درج ذیل ہیں:

اللہ کو پیارے ہوئے وہ طیب والا صفات جنت الفردوس میں جن کا تھا بے حد انتظار
اشرفؔ ومحمودؔ واحمدؔ قاسمؔ نانوتویؒ سب کے سب بس منتظر تھے انکے باصد اضطرا
کہہ رہے ہیں سب فرشتے آرہا ہے کون یہ اور حوریں منتظر تھیں ہر طرف اور بے قرار
تاریخ چھ شوال کی اور وقت بعد عصر کا کرگئے رحلت جو تھے ماوائے علم بے شمار
سیرت وصورت میں اکمل مظہر علم وعمل کون اب ثانی ہے ان کا بلکہ سب ہیں اشکبار
دین کی خدمت میں گزری عمران کی بے شبہ علم کے نشوونما میں ان کا حصہ صد ہزار
مرکز دین ہے جو شہرت یافتہ دیوبند سے اس کے رأس المال بھی تھے اور تھے اس پر نثار
مہتمم بھی تھے وہ اس کے اور حقیقی سرپرست ہمدرد بھی سچے تھے اس کے اور سچے غمگسار
آہ! اے دیوبند تو صدآہ اے دیوبند تو اٹھ گیا سر سے تیرے وہ تیرا سچا غمگسار
کس طرح توصیف انکی میں کروں کیسے کروں کچھ بھی کہوں جتنا کہوں ان سب کا ہوگا اک شمار
علم کے مورد بھی وہ تھے علم کے منہل بھی تھے اب پیاسے کیا کریں گے لاکھ پائیں جوئے بار
اے خدا تو مغفرت انکی کرے اور بخش دے جنة من تحتها الانهار تجری بے شمار
کرمعیت سرور کونین کی ان کو عطا عرش کے نیچے جگہ دے تاکہ ہو ان کو قرار
جس طرح عثمانؓ ذی النورین بیحد نرم تھے شورشیں لاکھوں ہوئیں لیکن رہے وہ صبر یار
بے شبہ یہ بندۂ طیب ترا بھی نرم تھا شورشیں سہتا رہا وہ صبر سے ہوا ہمکنار
صبر کے بدلے میں انکو اپنی ذات پاک دے رات دن تیری زیارت بس رہے ان کا شعار
اے خدا اس طیّبی کو بھی فلاح دین دے اور دنیا میں غنا دے آخرت میں اپنا پیار

............❖............

حکیم الاسلامؒ کے خانوادۂ فاروقی سے روابط

مولانا عبدالعلی فاروقی
دارالعلوم فاروقیہ، کاکوری، لکھنؤ

رب کائنات کے اس انعام کی شکر گذاری کے لئے زبان وقلم میں سکت نہیں کہ اس نے ایک ایسے خانوادہ کا فرد بنا کر اس عالمِ رنگ و بو میں بھیجا جہاں علمی و دینی شخصیات سے ربط وتعلق کے لئے خاندانی نسبت ہی کافی تھی اور اب آباء واجداد کی نسبت سے اس ''حلال کمائی'' کا کیوں نہ ذکر کروں کہ اس بے سواد راقم الحروف نے گھر بیٹھے ہی وقت کی ایسی ایسی اہم اور جلیل القدر شخصیات کی زیارت اور جوتیاں سیدھی کرنے کی سعادت حاصل کر لی جن کی ایک جھلک پانے کے لئے ''باتوفیق'' لوگوں کو نہ جانے کیسے کیسے پاپڑ بیلنا پڑتے تھے؟ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَاءُ.

ان مقتدر شخصیات میں ایک نمایاں نام حضرت حکیم الاسلامؒ کا بھی ہے، جن کی زیارت اور بار بار زیارت ''حد شعور'' میں داخل ہونے سے کتنا پہلے ہو چکی تھی؟ یہ یاد نہیں! ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ اس وقت بھی ان کا اُجلا اُجلا سراپا، ان کا روشن روشن چہرہ، ان کا نرم نرم لہجہ اور ان کی تبسیم برلب گفتگو اتنی اچھی لگتی تھی کہ بے ساختہ ان جیسا بن جانے کی ''طفلانہ تمنائیں'' مچلنے لگتی تھیں اور پھر سن شعور تک پہنچنے پر ان تمناؤں نے یہ تعبیر اختیار کر لی کہ اگر ''اجالوں کے سفیر'' مذہب اسلام کو عالم مثال میں جسمانیت عطا کی جائے تو وہ مجسم ہو کر وہی ہوگا جسے ہم ''حکیم الاسلام'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔''

بلاشبہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ایک بلند پایہ خطیب تھے۔ بے مثال منتظم تھے، متکلم اسلام تھے، عظیم المرتبت مرشد تھے، سرمایۂ اسلاف کے جامع تھے، مقبول ترین استاذ تھے اور اپنے لب ولہجہ، اثر و نفوذ، اخلاق و کردار اور حسنِ ظاہر و باطن کے لحاظ سے ہماری اس زمین پر حق کی ایک چلتی پھرتی، مسکراتی بولتی

نشانی تھے اوران کی کتاب زندگی کے ان حسین عنوانوں کا اجاگر ہونا اخلاف کے لئے ضروری بھی ہے اور محسن شناسی کا تقاضا بھی، تاہم راقم الحروف نے ان سب سے ہٹ کر جوعنوان اختیار کیا ہے اس کے ذریعہ اپنی تہی مائیگی کے اعتراف کے ساتھ ہی حکیم الاسلام کی نسبتوں کی قدردانی اور انداز خردنوازی کی ایک جھلک دکھانا بھی مقصود ہے۔

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقیؒ اوران کے برادرِخورد جامع العلوم حضرت مولانا محمد عبدالرحیم فاروقیؒ سے حکیم الاسلامؒ کے برادرانہ رشتہ اور ربط باہمی کی تفصیلات پیش کرنے سے تو راقم الحروف عاجز ہے، ہاں حکیم الاسلام کے وہ تعزیتی خطوط پیش نظر ہیں جوان دونوں بزرگوں کی وفات کے موقع پران کے ورثاء کے نام بھیجے گئے۔

دسمبر ۱۹۵۶ء میں جامع العلوم حضرت مولانا محمد عبدالرحیم صاحب فاروقیؒ کی وفات کے موقعہ پران کے برادراکبر امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ کے نام ایک اور صاحب زادۂ گرامی حضرت مولانا عبدالحلیم فاروقیؒ کے نام یکے بعد دیگرے بھیجے گئے۔ دوخطوں میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے نہ صرف اپنے گہرے ربط وتعلق کے ساتھ صدمہ کا اظہار فرمایا ہے بلکہ حضرت مولانا محمد عبدالرحیم صاحبؒ کی جلالتِ علم اوراخلاق وتواضع کا جس والہانہ وغیررسمی انداز میں ذکر فرمایا ہے اس سے ہم خردوں کواپنے جدامجدؒ کے مرتبہ ومقام کوسمجھنے میں بہت کچھ رہنمائی ملی۔ اسی طرح اپریل ۱۹۶۲ء میں امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ کی وفات کے موقع پرحضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے تعزیتی خط میں اور پھر وفات کے بعدان کے قائم فرمودہ ''شہدائے اسلام'' کے سالانہ جلسوں میں پہلی تشریف آوری میں دورانِ تقریر حضرت امام اہل سنتؒ کے سانحۂ وفات پرجس گہرے قلق اورفکرمندی کا اظہار فرمایا، اس کا لفظ لفظ دردو محبت میں ڈوبا اور ہرقسم کے تکلف وتصنع سے پاک تھا اوراس کی تاثیر ''از دل خیزد بردل ریزد'' والی تھی۔

۱۹۶۲ء تک چوں کہ راقم الحروف سن بلوغ کوبھی نہیں پہنچا تھا اس لئے خانوادۂ فاروقی کے ان دونوں بزرگوں کے ساتھ حضرت حکیم الاسلامؒ کے روابط شعوری مشاہدہ وحفظ کے لائق نہ تھے، البتہ ان کے اخلاف اوراپنے بزرگوں سے اس سلسلہ میں جوکچھ سنا اوراس خانوادہ کے سلسلہ میں حکیم الاسلامؒ کی جن مراعات کا مشاہدہ کیا وہ بےغرض اور گہرے دینی رشتہ کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

(۱) امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کے قائم فرمودہ لکھنؤ کے تاریخی پندرہ روزہ جلسہ ہائے ''شہدائے اسلام'' میں ہرسال کسی ایک روز حکیم الاسلامؒ نے شرکت اوراپنی گہربار تقریر کولازمی رکھا،

حتی کہ آخر کے دور ضعف و نقاہت میں جب کہ اطباء کے مشورہ پر رات کے جلسوں میں شرکت موقوف فرمادی تھی، قدیم ربط و تعلق اور وضع داری کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے ناغہ نہ فرما کر تشریف لائے اور باشندگان لکھنؤ کو دن کی ایک پرہجوم خصوصی نشست میں اپنے ارشادات عالیہ سے مستفید فرماتے ہوئے اصلاح عقائد کے سلسلہ میں ان تاریخی جلسوں کے خصوصی کردار، جلسوں کے بانیان اور اس وقت کے منتظمین سے اپنے خصوصی ربط و رشتہ کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا۔

(۲) حج بیت اللہ کے لئے خانوادۂ فاروقی کے متعدد افراد اور حکیم الاسلامؒ ایک ہی بحری جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ دوسری طرف اسی جہاز میں بریلوی مسلک کے مشہور جارح مقرر و مناظر مولوی حشمت علی بھی ہم سفر تھے اور اپنی عادت کے مطابق موقع بہ موقع جراحت پاشی کرتے جا رہے تھے، ان کے لئے یہ منظر ہی کیا کم روح فرسا تھا کہ حضرت امام اہل سنتؒ، حضرت جامع العلومؒ، حضرت حکیم الاسلامؒ اور خانوادۂ فاروقی کے دیگر علماء کے علاوہ متعدد علمائے حق، ایک ساتھ اسی جہاز میں سوار ہو کر زیارت حرمین کے لئے جا رہے تھے جس میں سوار ہو کر سفر کرنا آں موصوف کی بھی مجبوری تھی؟ چنانچہ بحری جہاز کے اس طویل سفر میں آتے جاتے، چلتے پھرتے وہ ہمارے علمائے حق کو دیکھ کر اپنی عادت کے مطابق کوئی نہ کوئی فقرہ کس دیتے اور اپنے لئے نشاط روح کا سامان فراہم کر لیتے، خصوصاً حکیم الاسلامؒ کو دیکھ کر وہ بلند آواز میں یا رسول اللہ کہہ کر اپنے خیال کے مطابق ''فریضۂ حق'' ادا کرنا نہیں بھولتے تھے؟

امام اہل سنتؒ کے فرزند اور حکیم الاسلامؒ کے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد عبدالسلام فاروقیؒ نے کئی مرتبہ یہ چھیڑ چھاڑ دیکھ کر آخر اپنے استاذ محترم سے اصرار کے ساتھ درخواست کی کہ حضرت! یا تو آپ خود ان کی ''زبان بندی'' کا انتظام کیجئے یا پھر مجھے جواب دینے کی اجازت دیجئے؟ حکیم الاسلامؒ اس وقت تو مسکرا کر خاموش ہو گئے، لیکن اگلے موقع پر جہاز کی بالائی منزل سے اترتے ہوئے حکیم الاسلامؒ کو دیکھ کر جب مولوی صاحب موصوف نے یا رسول اللہ کا نعرہ بلند کیا تو حکیم الاسلامؒ نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ برجستہ فرمایا انی لست برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (میں رسول اللہ ﷺ نہیں ہوں) اس برجستہ اور حکیمانہ جواب نے مولوی صاحب کی بولتی بند کر دی اور پھر وہ پورے سفر کے دوران نظریں بچا کر گذر جانے ہی میں عافیت سمجھتے رہے۔

(۳) خانوادۂ فاروقی کے ایک فرد کی حیثیت سے خود راقم الحروف بھی حضرت حکیم الاسلامؒ کی شفقتوں و عنایتوں سے خوب مالا مال ہوا۔ ازہر ہند دارالعلوم دیوبند میں زمانۂ طالب علمی (۹۰-۱۳۸۷ھ) کے قیام

کے دوران ''طیب منزل'' کی عصر بعد کی مجلس میں برابر حاضری ہوتی، اس کے علاوہ دارالعلوم کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے اپنی مادر علمی کے سربراہ اعلیٰ کی خدمت میں اپنی غرض لے کر بھی کبھی کبھی حاضری ہوتی اور اپنے فخر واعزاز کے لئے بس یہی کیا کم تھا کہ ہزاروں طلبہ کے درمیان حضرت حکیم الاسلامؒ مجھے بھی پہچانتے تھے اور اس پہچان سے فائدہ اٹھانے کا ایک واقعہ اس وقت بھی یاد آ رہا ہے کہ اپنے ساتھی کو (جو غریب اور غیر مستطیع تھے اور ایک کتاب میں نمبر کم آنے کی وجہ سے ان کی امداد موقوف ہوگئی تھی) لے کر ایک ''خاص اعتماد وزعم'' کے ساتھ دارالعلوم کے دفتر اہتمام میں حاضر ہوا اور امداد جاری کئے جانے کے سلسلہ میں پہلے سے لکھی ہوئی درخواست حضرت والا کی خدمت میں پیش کردی، حضرت والا نے درخواست دیکھ کر فرمایا، یہ تو ایک کتاب میں فیل ہے۔ ضابطہ کے مطابق ان کا کھانا جاری نہیں رہ سکتا۔ میں ''پہچان کے اسی نشہ'' میں عرض کردیا، لیکن حضرت! آپ کو پچاس طلبہ کا کھانا جاری کرنے کا خصوصی اختیار بھی تو ہے؟ جواب میں حضرت والا نے مسکراتے ہوئے فرمایا: اچھا آپ لوگوں کو اس کا بھی علم ہے اور پھر خانوادۂ فاروقی کے اس ایک ادنیٰ طالب علم کی لاج رکھتے ہوئے درخواست پر کھانا جاری کئے جانے کا حکم تحریر فرما دیا، نہ خوشامد کرائی، نہ سفارش طلب کی، نہ ہی معاملہ کو التوا میں ڈالا تو پھر اسے خانوادۂ فاروقی سے حکیم الاسلام کے خصوصی ربط وتعلق کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟

(۴) ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام وتشکیل کے سلسلہ میں منعقد ہونے والے ''بمبئی کنونشن'' کا دعوت نامہ علمائے دارالمبلغین کے نام بھی آیا، اس وقت کی ''خاص مصلحتوں'' کی وجہ سے اس کنونشن اور مجوزہ بورڈ میں شرکت کا دعوت نامہ علمائے شیعہ کو بھی دیا گیا تھا، علمائے دارالمبلغین کو اس کا علم ہوا تو خانوادۂ فاروقی کے اس وقت کے سربراہ حضرت مولانا عبدالسلام فاروقیؒ نے حکیم الاسلامؒ کو خط لکھ کر اس کنونشن میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی رائے سے معذرت کرلی۔

اس کنونشن میں شرکت کرنے والوں کی اور شرکت کی خواہش رکھنے والوں کی کمی نہیں تھی، نہ ہی چند علمائے مبلغین کے شریک نہ ہونے سے کنونشن کی ناکامی کا کوئی اندیشہ تھا تاہم یہ حکیم الاسلامؒ کی قدر افزائی اور خانوادۂ فاروقی سے خصوصی ربط کی بات ہے کہ حکیم الاسلامؒ دیوبند سے سفر کر کے لکھنؤ تشریف لائے اور اپنے خردوں کے سامنے ان کے موقف کی صحت کا اعتراف کرتے ہوئے ''مصلحت وقت'' کے پیش نظر کنونشن میں ان کی شرکت پر اصرار فرمایا اور یہاں تک فرمایا کہ حضرت امام اہل سنتؒ، ان کے رفقاء اور اخلاف نے مسلمانوں کو ایک ''فکر صالح'' عطا کی ہے، جس کے اعتراف میں آپ حضرات کی اس کنونشن

میں شرکت کو میں ضروری سمجھتا ہوں اور آپ حضرات کی عدم شرکت سے اس کنونشن میں مسلمانوں کے ایک ''صالح مکتب فکر'' کی کمی محسوس کی جائے گی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی اس قدر افزائی اور اس ربط و تعلق کا یہ نتیجہ تو نکلنا ہی تھا کہ پھر خانوادۂ فاروقی سے حضرت مولانا عبدالسلام فاروقی صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالحلیم فاروقی صاحبؒ اور دارالمبلغین کے استاذ حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحبؒ نے اس کنونشن میں شرکت کی۔

(۵) اور خانوادۂ فاروقی کے حکیم الاسلامؒ کے گہرے ربط و رشتہ کا برملا اظہار تو اس وقت ہوا جب ۱۹۳۸ء میں حضرت حکیم الاسلام لکھنؤ کے ایک رئیس کی خصوصی دعوت پر تشریف لائے اور حضرت مولانا عبدالحلیم فاروقی صاحب کی اس درخواست کو شرف قبول بخشا کہ قصبہ کاکوری میں ان کے قائم کئے ہوئے نوخیز مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ تشریف لے جاکر ادارہ کی ترقی و قبولیت کے لئے دعا فرمادیں، بعد نماز عصر کا وقت طے ہوا اور حضرت والا نے از راہِ شفقت اپنے میزبان پر اعتماد کرتے ہوئے مولانا عبدالحلیم صاحب سے فرمایا کہ آپ کاکوری پہنچیں۔ میں انشاء اللہ مقررہ وقت پر پہنچ جاؤں گا اور پھر جب کاکوری سے روانگی کا وقت آیا تو کچھ یارانِ ستم پیشہ نے سواری، ڈرائیور اور راستہ کی خرابی کے حوالوں سے حضرت والا کے خیر سے دارالعلوم فاروقیہ اور قصبہ کاکوری کو محروم کردینے کی تدبیریں کیں۔ حضرت والا نے اس سازش کو بھانپتے ہوئے اپنے ''عمومی مزاج'' کے خلاف سخت رخ اختیار کرتے ہوئے صاف فرمایا کہ ''یہ تو ہوسکتا ہے کہ کسی پروگرام میں شرکت کئے بغیر میں یہیں سے دیوبند واپس چلا جاؤں لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ میں یہاں رہ کر کاکوری نہ جاؤں اور مولانا عبدالحلیم صاحب کی دل شکنی کروں'' اور پھر تمام راہیں آسان ہوگئیں اور حکیم الاسلام اپنے وعدے کے مطابق کاکوری پہنچے اور مدرسہ میں چند منٹ ٹھہرنے اور دعا کرنے کے بعد واپس تشریف لائے۔

یہ چند واقعات وہ مشاہدات ہیں جن سے خانوادۂ فاروقی سے حکیم الاسلامؒ کے اس ربط کا اظہار ہوتا ہے جس کے ذریعہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے ذاتی جواہر، اخلاقی کمالات، دین اور اہل دین سے الفت، مرتبہ شناسی اور خردنوازی کے نمونے بھی سامنے آجاتے ہیں۔

............❖............

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ

اور

خطابت

مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانویؒ

واقعہ یہ ہے کہ فن خطابت (بالخصوص زیر بحث اردو زبان میں فن خطابت) میں علماء کرام کا حصہ بہت ہی نمایاں نظر آتا ہے۔ تفصیلی جائزے کے بغیر قطعیت کے ساتھ تو نہیں کہا جاسکتا لیکن بادی النظر میں مقررین اور خطیبوں کی صف میں علماء دوسروں کے مقابلہ تعداد اور امتیاز دونوں ہی اعتبار سے غالب وفائق نظر آتے ہیں۔

ماضی قریب میں جب ہم صفِ اوّل کے خطیبوں کی تلاش میں حافظہ پر زور ڈالتے ہیں تو سطح ذہن پر جن شخصیات کے اسماء گرامی فوری طور پر ابھر کر آتے ہیں ان میں سے چند حسبِ ذیل ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مولانا محمد طیب صاحبؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔

ان مقررین اور خطیبوں میں سے ہر ایک کا اپنا ایک الگ مرتبہ ومقام ہے، اور ہر ایک کی اپنی خطیبانہ خصوصیات ہیں، یہ وہ خطیب ہیں جنھوں نے خطابت کے دامن کو وسیع بھی کیا ہے اور مزین وآراستہ بھی، اور اس کو نئی جہات وابعاد (Dimension) عطا کر کے فن کی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔

مذاکرۂ علمی کے لائق ومحترم منتظمین کی جانب سے بطور مثال تجویز کردہ عنوان ''فن خطابت میں علماء کا

حصہ'' کو اپنے عموم کے ساتھ جوں کا توں رکھنے کی صورت میں میرے لیے چوں کہ مصروفیات اور کم مائیگی کے باعث نہ موضوع کے ساتھ انصاف ممکن تھا اور نہ ہی اس کی وسعتوں کو سمیٹنا، اس لیے میں نے اپنے عمل کو مختصر اور آسان بنانے کے لیے ضروری سمجھا کہ کسی ایک ہی شخصیت کو موضوع بنایا جائے چناں چہ اس سلسلہ میں تھوڑا غور و فکر کیا گیا اور نتیجہ کے طور پر مذکورہ بالا عنوان کو ترجیح حاصل ہوگئی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت گونا گوں اوصاف و امتیازات کی حامل تھی، انھوں نے اپنے ان اوصاف و امتیازات کو استعمال کرتے ہوئے دین و ملت کی بے مثال خدمات انجام دیں، وہ علمی و عملی دونوں سطحوں پر سرگرم رہے اور دونوں ہی کے تعلق سے اپنی الگ تاریخ بنائی، دارالعلوم دیوبند کے منصب اہتمام و انتظام کی گراں بار ذمہ داریوں اور اس میں شبانہ روز اشتغال اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی سرپرستانہ مصروفیات کے باوجود ان کا اشہب لسان و قلم اپنے معمول کی تیز رفتاری کے ساتھ زندگی بھر دوڑتا رہا۔ جس کے نتیجے میں ڈیڑھ سو سے زائد علمی شہ پارے اسلامی مکتبات کی زینت بنے اور وہ آج تشنگانِ علم کی سیرابی و آسودگی کا ذریعہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ جیسی عبقری اور متنوع الجہات شخصیت پر اب تک بہت کم کام ہوسکا ہے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ کی شخصیت اور آپ کی دینی و ملی خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے دیوبند اور دیوبند سے باہر متعدد علمی اکیڈمیاں قائم کی جاتیں اردو کے علاوہ دوسری اہم زبانوں عربی انگلش وغیرہ میں آپ کی منتخب پُرمغز اور اپنے موضوع پر نادر کتابوں کا ترجمہ کرایا جاتا اور ان کی اشاعت و توسیع کی جاتی۔ یہ دارالعلوم دیوبند سے نسبت اور اس کے اکابر و اسلاف سے عقیدت و محبت رکھنے والے ہر فرد کا فریضہ ہے۔

اس وقت ان سطور میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی پہلو دار شخصیت کے صرف ایک پہلو ''خطابت'' پر کچھ اظہار خیال کرنا ہے۔ حضرت کی شخصیت کے تعلق سے یہ موضوع کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں، ضرورت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس پر قلم اٹھانے سے قبل آپ کے کل یا بیشتر تقریری سرمایے کا مطالعہ کیا جاتا۔ اس پر تجزیاتی نگاہ ڈالی جاتی، اسی کے ساتھ اس قبیل کی دوسری اہم شخصیات اور ان کے مدوّن لسانی کارناموں کو پیش نظر رکھا جاتا، فنی تقاضوں سے بھی بحث کی جاتی اور نتائج پر گفتگو کی جاتی، اس طرح کے محاکمے اور موازنے کے بعد ہی کسی شخصیت کا متعلقہ موضوع کے حوالے سے امتیاز واضح ہو پاتا ہے۔ میں یہ اعتراف ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنی بے بضاعتی کے ساتھ ساتھ کثرتِ مشاغل کی بناء پر مجھے اس کا موقع نہ مل سکا۔

میں نے بنیادی طور پر (کتاب) ''خطبات حکیم الاسلام'' کو پیش نظر رکھا ہے، جس کی اب تک دس جلدیں شائع ہوچکی ہیں اسے حکیم الاسلام اکیڈمی دیوبند کی طرف سے مولانا محمد ادریس ہوشیار پوری نے مرتب

کیا ہے، میرے سامنے دارالکتاب دیوبند کا طبع کردہ نسخہ ہے، ان دس جلدوں میں مجموعی طور پر کل ۱۰۸؍خطبات شامل ہیں، جن میں سے بعض تو خود ان کی زندگی میں تصنیف کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں اور اب ان کی حیثیت باضابطہ اپنے موضوع پر لکھی گئی کتابوں کی ہے۔ ان میں سے ایک اہم تقریر وہ ہے جو آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ''انجمن اسلامی تاریخ وتمدن'' کی دعوت پر ''اسلام اور سائنس'' کے موضوع پر کی تھی۔ زیر نظر خطبات کے مجموعے میں یہ خطبہ یا تقریر چھٹی جلد میں تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس تقریر کو اس وقت بھی کافی شہرت وپذیرائی حاصل ہوئی تھی اور آج بھی علمی حقائق ودقائق رموز ونکات اور بصائر وعبر کے اقتباسات وواقعات سے اس کی سطر سطر پُر اور پڑھنے کے لائق ہے اپنے منصب وشہرت کے اعتبار سے تقریر وخطابت حضرت حکیم الاسلامؒ کی ضرورت تو تھی ہی بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ وہ لوگوں کی توقعات اور اصرار کے باعث ایک مجبوری بھی تھی۔ ملک وبیرون ملک اسفار کا سلسلہ زندگی کے اخیر کے سالوں تک جاری رہا اور شاید ہی کوئی سفر ایسا ہوتا ہو جس میں آپ کی تقریر بلکہ تقریریں نہ کرنی پڑتی ہوں۔ مولانا احمد سعید دہلویؒ نے آپ کے بارے میں کہا تھا کہ اب تک مہتممین دارالعلوم دیوبند ثوابت تھے اور مولانا محمد طیب صاحب سیارہ ہیں۔ اس کے علاوہ ۲۰/۲۲؍سالوں تک جامع مسجد دیوبند میں جمعہ کے دن تقریر آپ کا معمول تھا۔ مسلسل لکھتے اور بولتے رہنے کی وجہ سے کہنا چاہیے کہ آپ کو معلومات ویادداشت آپ کی زبان پر رہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ تقریر کے دوران نہ آپ کو لکنت لگتی اور نہ آپ آدھی ادھوری یا ناقص بات یا حوالہ کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔ کئی کئی گھنٹے کی تقریر میں تکرار کا نام ونشان نہیں ہوتا۔ حقائق ومعارف اور اسرار شریعت کے بند اس طرح کھولتے چلے جاتے جیسے سب کچھ حفظ کر کے آئے ہوں، یہ سب آپ کی قادرالکلامی، قوت گویائی اور جودت طبع کا فیض تھا۔ بات بات میں نکتہ پیدا کرنا آپ کا خاص امتیاز تھا۔ ان کے خطبات کی بعض اور بھی خوبیاں ہیں جیسے وہ اختلافی مسائل کو کبھی نہیں چھیڑتے تھے۔ ایسے کسی مسئلے پر انھوں نے شاید ہی کبھی کوئی تقریر کی ہو۔ گویا وہ ''تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن'' کے داعیانہ نکتے پر پوری طرح عمل پیرا تھے۔ بے سروپا قصوں کے بیان سے پرہیز کرتے اور ہمیشہ مستند روایات کے سہارے اپنی بات کو ثابت یا مدلل کرتے۔ ذیل میں ان کی بعض اہم خوبیوں پر بطورِ نمونہ الگ الگ عنوانات کے ساتھ روشنی ڈالی جارہی ہے۔

جداگانہ طرز

نثر کے تعلق سے مرزا غالب کا ایک اہم ادبی کارنامہ خود ان کے بقول مراسلے کو مکالمہ بنادینا تھا۔ خطوط میں انھوں نے بالالتزام جو اسلوب اختیار کیا وہ روزمرہ کی باہمی گفتگو سے مشابہ تھا۔ اس ندرت

اسلوب سے ادب کا ایک نیا نثری باب وَا ہوا۔ حکیم الاسلامؒ کے تعلق سے بلا مبالغہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے اپنی برجستہ اور فی البدیہہ تقریروں میں تحریر و تصنیف کا علمی رنگ بھر دیا۔ جنھیں صاحب تقریر کی زبان سے سنیئے تو مکمل معنوی میں تقریر اور اگر انھیں زیب قرطاس کر دیا جائے تو مکمل معنوی میں ایک مقالہ اور مضمون۔

یہ وصف اور رنگ اسی وقت اور انہی شخصیات کے یہاں پیدا ہوسکتا ہے جنھیں زبان اور قلم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہو، وہ دونوں کا شہسوار اور دونوں ہی کا رمز شناس ہو، میں نے حضرت حکیم الاسلامؒ کو خود بھی سنا ہے اور ان کو سننے والوں سے بھی آپ کے بارے میں سنا ہے۔ آپ کی زبان شستگی و شائستگی کا نمونہ تھی، ''نرم دم گفتگو'' آپ کا شعار تھا۔ نہایت نپے تلے جملے، ہر قسم کے حشو و زوائد، گنجلک پن سے پاک، فلسفیانہ مضامین کو بھی اسی سادگی اور پرکاری کے ساتھ بیان کرتے۔ بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ لیکن اس اعتدال کے ساتھ کہ نام کو بھی آپ کی زبان اسلوب میں رکاکت اور غیر سنجیدگی نہیں آتی۔ طویل سے طویل تقریروں میں بھی نہ تو تکرار کا گزر ہوتا اور نہ ہی اصل لہجے اور اسلوب میں کوئی فرق پیدا ہوتا۔ بس شروع سے اخیر تک دریا کی سی روانی کے ساتھ آپ بولتے چلے جاتے تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں۔

''گھنٹوں بولتے تھے۔ زبان بڑی شگفتہ اور شائستہ کہیں کہیں ظرافت اور مزاح آمیزی، آواز از اوّل تا آخر یکساں، نہ زیر و بم نہ اتار چڑھاؤ، مگر ساتھ ہی منطقی استدلال اور فلسفیانہ تشقیق اس لیے تقریر عوام و خواص دونوں کے کام کی''۔

عوام کی رعایت

علامہ ابن قیم جوزیؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں عوام کو خطاب کرنے کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ مخاطبین کی ضرورت و مصلحت کے تقاضوں کے مطابق خطاب فرماتے تھے۔ (**وکان یخطب فی کل وقت بما تقتضیہ حاجۃ المخاطبین و مصلحتھم**) بسا اوقات ایک بڑا عالم اور لسان خطیب سامعین پر مطلوبہ اثر قائم نہیں کر پاتا۔ اس کی دیگر وجوہات کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہی ہوتی ہے کہ موضوع تقریر کے مناسب انتخاب اور اس کے مشمولات کی ترسیل و تفہیم میں زبان و اسلوب کے اعتبار سے عام حاضرین کی رعایت نہیں ہو پاتی۔ اس سلسلے میں بہت سی عظیم شخصیات کا نام لیا جاسکتا ہے جو اپنے علم و فن میں نادرۂ روزگار و یکتائے زمانہ تھیں لیکن جہاں تک خطبات کے حوالے سے عوامی سطح پر ان سے استفادہ کا تعلق ہے تو اس کا دائرہ نہایت محدود اور مختصر ہی رہا۔ حضرت علیؓ کا قول: حدثوا

الناس بما یعرفون أتریدون أن یکذب اللہ ورسولہ تنبیہی طور پر اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ اہم سے اہم علمی، دینی اور فکری موضوعات کو سہولت و جامعیت کے ساتھ اس طرح عوام وخواص کے سامنے پیش فرمادیتے کہ استفادے کا معیار دونوں کے لیے کم وبیش یکساں ہوتا، اس کی سب سے بڑی مثال ان کی علی گڑھ کی مذکورہ بالا تقریر ہے دیکھنے کا مقام ہے کہ سائنس اور اسلام کے درمیان تقابل وتجزیہ کے موضوع کو انھوں نے کس خوبی سے نبھایا ہے کتنی آسان اور جامع تعبیرات اور مثالوں کے ذریعہ اس سخت اور سنگلاخ موضوع کو عوام کے لیے قریب الفہم بنادیا ہے لیکن اس حوالہ سے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ آپ کا لہجہ عوامی تھا، عامیانہ نہ تھا جس میں خطیبانہ ادائیں تو ہوتی ہیں، لیکن علمی شوکت و وقار سے خالی اور خوش بیانی اور حسن ادا تو ہوتا ہے لیکن پر تکلف ادب آمیزی کے ساتھ، حضرت حکیم الاسلامؒ فطری ذوق اور وہبی صلاحیتوں کے حامل تھے ان کے اندر تکلف و تصنع کا شائبہ بھی نہ تھا۔ مجمع خواہ بڑوں کا ہو یا چھوٹوں کا اور وہ خود چھوٹا ہو یا بڑا، حضرت حکیم الاسلامؒ کے لب ولہجے اور انداز بیان پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

مولانا تقی عثمانی مدظلہ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے انداز خطابت پر روشنی ڈالتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے:

''بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں، حضرت حکیم الاسلامؒ کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے۔ نہ جوش نہ خروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ پر تکلف لسّانی، نہ لہجہ نہ ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں، لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر مؤثر، دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ و مستفید ہوتے تھے، مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ لیکن بیان اتنا سہل کہ سنگلاخ مباحث بھی پانی ہوکر رہ جاتے۔ جوش وخروش نام کو نہ تھا، لیکن الفاظ ومعانی کی ایک نہر سلسبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی اور قلب ودماغ کو نہال کردیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منھ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں۔ ان کی تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا جو انسان کو زیروزبر کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کرلے جاتا ہے۔

ادبی اور لسانی ذوق

حکیم الاسلامؒ کی تقریروں میں جابہ جا ایسے نمونے ملتے ہیں جن سے ان کے ادبی ذوق ومزاج کا پتہ چلتا ہے۔ ادب صرف خوب صورت الفاظ، نادر تشبیہات واستعارات اور شعری ترکیبوں کے استعمال کا نام نہیں۔ ادب کے ظاہری ڈھانچے کی تشکیل میں یہ ضرور معاون ہوتی ہیں لیکن اصل چیز جس سے ''از دل

خیز د بر دل ریز د' والی کیفیت متکلم کے کلام میں پیدا ہوتی ہے دراصل لفظوں کا موزوں اور برمحل استعمال اور ان کی معنوی تہہ داری ہے جو صرف سامع نواز ہی نہیں بلکہ دل نواز بھی ہوتی ہے، جس میں صرف ''فردوس گوش'' ہونے کا ہی سامان نہیں ہوتا بلکہ قلب کو مہمیز کرنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ غالب کے اس مشہور شعر میں اسی کیفیت کے اظہار کی نقشہ کشی یوں کی گئی ہے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا　　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تاہم اگر لفظوں کے دروبست، جملوں کی ساخت، ترکیبات وتشبیہات کو ادب کی تعریف کے حوالے سے ذہن میں رکھیں تو اس کی مثالیں بھی حضرت حکیم الاسلامؒ کے یہاں کم نہیں ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

''صنائع حرف کے سلسلے میں لوہے لکڑی کے خوش نما اور عجیب وغریب سامان تعمیرات کے نئے نئے ڈیزائن اور نمونے، سیمنٹ اور اس کے ڈھلاؤ کی نئی نئی ترکیبیں اور انجینئروں کی نئی سے نئی اختراعات جب سامنے آئی ہیں تو سائنس کا نظر فریب چہرہ بھی سامنے کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب اسی کے خم ابرو کی کارگزاریاں ہیں۔ ریل کی پٹریوں پر یہ دوطرفہ لاکھوں من پتھروں کے ڈھیر انہی پہاڑی پتھروں کے جگر پارے ہیں لیکن یہی طاقت ور لوہا جس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا بڑے بڑے پہاڑوں نے لوہا مان رکھا ہے، جبھی تک طاقت ور ہے، جب تک کہ پتھروں کے سر پر ہے لیکن اگر اس لوہے کو کہیں آگ چھو جائے تو اس کا رنگ روپ متغیر اور چہرہ فق ہو جاتا ہے۔

''پانیوں کا سب سے بڑا گھر، بلکہ ابوالمیاہ سمندر اعظم کہ جس کی بے پناہ عظمت سے ڈر کر دنیا کا ربع مسکون گویا ایک طرف پڑا ہوا ہے اور جس کی کوہِ پیکر موجوں کا لگاتار سلسلہ خشکی کے کناروں پر اس طرح حملہ آور محسوس ہوتا ہے کہ گویا کرۂ زمین کو نگل جائے۔

''گویا وہ ایک آگ جو سرنیچا ہی نہیں کرتی تھی (دیا سلائی کی شکل میں) انسان کے سامنے تنکے چننے لگی اور اس کی رفعت وتعلّی خاک میں مل گئی۔ گویا برقی رو کی ایک عظیم الشان فوج ایک دبلے پتلے سپاہی (بجلی کے تار) کی قید میں گرفتار ہے''۔

پندرہ اگست ۱۹۵۷ء کو یوم آزادی کے دن اس موضوع پر آغاز تقریر کے یہ جملے کے ملاحظہ فرمائیں اس میں لسان وبیان دونوں کی قوت کس حد تک کارفرما ہے:

''یہ آزادی آسمان سے بارش کی طرح ایک دم برس نہیں گئی بلکہ کتنے ہی صبر آزما دنوں کتنے ہی دار ورسن کے ہنگاموں اور قید وبند کے ہیبت ناک کٹہروں بلکہ کتنی ہی تڑپتی ہوئی لاشوں سے گزر کر یہ آزادی کی

دولت ہم تک پہنچی ہے۔گو آج کی تاریخ میں آزادی کا پارسل ہمیں بیک دم اور پر امن طریق پر اچانک شب کے بارہ بجے موصول ہو گیا لیکن وہ کتنے تاریک سمندروں سے گزرتا ہوا ہندوستان پہنچا، کتنے طوفانوں میں سے نکلا، اور کتنی خطرناک خلیجیں اس کی راہ میں حائل ہوئیں جن کا کتنے ہی آہنی قسم کے انسانوں نے مقابلہ کیا۔‘‘

خطبات حکیم الاسلامؒ کے مرتب لکھتے ہیں کہ: ایک موقع پر یہ مضمون ارشاد فرما رہے تھے کہ مطالب و معانی کو صرف الفاظ سے ہی نہیں ادا کیا جاتا بلکہ لب ولہجہ اور انداز تکلم سے بھی الفاظ میں معنی بھرے جاتے ہیں اور اس کی مثال میں اردو کا ایک فقرہ ’’کیا بات ہے‘‘ پیش کیا کہ یہ انکار کے لیے بھی ہے اور اقرار کے لیے بھی۔ استفہام کے لیے بھی اور اخبار کے لیے بھی۔ داد و تحسین کے لیے بھی ہے اور زجر و توبیخ کے لیے بھی۔ مرتب موصوف لکھتے ہیں کہ ایک گھنٹے تک حضرت حکیم الاسلامؒ ’کیا بات ہے‘‘ کی تشریح کرتے رہے اور مجمع آپ کے بیان سحر سے عش عش کرتا رہا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ اردو کے علاوہ فارسی اور عربی پر بھی اچھی دسترس رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ان دونوں زبانوں میں بھی ضرورت کے وقت تقریر فرماتے۔ بالخصوص فارسی پر ایسے زمانے میں عبور جب کہ ہندوستان سے اس کی طنابیں کب کی اکھڑ چکیں، نیز شعر و شاعری سے فطری شغف اور اس کا ملکہ جس کی مثال ’’عرفانِ عارف‘‘ کے نام سے آپ کا شعری مجموعہ ہے یہی وہ سب صلاحیتیں تھیں جنھوں نے مل کر آپ کے لسانی اور ادبی ذوق میں غیر معمولی نکھار پیدا کر دیا تھا۔

تاثیر کلام

خطبے کی تعریف لغت میں اس طرح کی گئی ہے کہ: ’’وہ ایسے نثری کلام کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ متکلم (خطیب) لوگوں کی جماعت کو خطاب کرکے اسے (اپنی بات کا) قائل بناتا ہے‘‘۔ **(الکلام المنثور يخاطب به متكلم فصيح جمعا من الناس لإقناعهم. المعجم الوسيط)** اقناع (Convincing) کا عمل بغیر کلام کی تاثیر کے ممکن نہیں، تاثیر اقناع کے مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کے خطبات کی انتہائی اہمیت وافادیت ان کی اس خوبیٔ تاثیر میں مضمر ہے۔ یہ تاثیر کیسے اور کیوں کر پیدا ہوتی ہے؟ حضرت حکیم الاسلامؒ خود اپنے لفظوں میں اس پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

متکلم کے قلبی جذبات مخاطب پر اثر انداز ہوتے ہیں، زبان تو محض آلۂ ظہور ہے۔ اس لیے قلب میں خوف و خشیت، تقویٰ و طہارت اور تعلق مع اللہ ہے تو معمولی درجہ کے مضمون سے سامعین متاثر ہوتے ہیں ورنہ اونچے درجے کے علوم و معارف بھی دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں‘‘۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی واعظانہ تاثیر کے بہت سے واقعات مشہور ہیں، پہلی مرتبہ بمبئی ورود کے موقع پر ایک فرقے کے لوگوں نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے خلاف اشتہارات چسپاں کرائے اور عوام الناس کو آپ اور علمائے دیوبند سے متنفر کرنے اور اس جلسے میں شرکت سے دور رکھنے کے سارے حربے اور ہتھکنڈے آزمائے۔ مخالفین کا ایک گروہ وہاں جلسے کو منتشر اور پراگندہ کرنے کے لیے موجود تھا حتی کہ اس میں بعض لوگ مسلح بھی اسٹیج سے کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے۔ لیکن جب آپ کی تقریر ہوئی تو فضا یکسر تبدیل ہوگئی۔ مجالس حکیم الاسلامؒ میں اس اجتماع سے متعلق تحریر ہے کہ اس سے قبل کسی دیوبندی عالم کے دوسرے فرقے کی مسجد میں داخل ہوجانے پر مسجد دھلوا کر پاک کرائی جاتی تھی۔ لیکن اس اجتماع کے بعد نوعیت یہ ہوئی کہ جن لوگوں نے حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ کو پستول دکھا کر مرعوب کرنا چاہا تھا وہی لوگ حضرت حکیم الاسلام کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور ان لغویات سے توبہ کی اور اہل اللہ میں ہونے کی جدوجہد میں مصروف ہوگئے۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری فرماتے ہیں کہ: ''ان کی تقریر سے میری سال بھر کی سینکڑوں تقریریں تیار ہوجاتی ہیں''۔

ایک مرتبہ خیر المدارس کے سالانہ جلسے کے موقع پر حضرت حضرت حکیم الاسلامؒ تقریر فرمارہے تھے۔ جس میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی موجود تھے، کچھ دیر تک تو وہ خاموش ہوکر حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر سنتے رہے پھر ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ بے اختیار نعرۂ تکبیر کہہ کر چند منٹوں کی اجازت لے کر مائک پر آ کھڑے ہوئے اور اپنے دو شعر حضرت حکیم الاسلامؒ کی نذر کرتے ہوئے حضرت حکیم الاسلامؒ کی طرف ہاتھ کے اشارے سے بار بار اشعار کو پڑھتے رہے۔

سامع کے دل کو موہ لینے اور دماغ کو قید کر لینے والی ایسی تاثیر کی مثالیں فی زمانہ کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں کیوں کہ خطابت کا فن عام طور پر پیشہ ورانہ ہاتھوں میں پڑ کر اپنی عظمت کھوتا جارہا ہے۔

بہر حال تقریر وخطابت کے باب میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع اور گوناگوں ہے۔ انھوں نے اس موضوع کو فن کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ وقت کی ضرورت اور اپنی فطری مناسبت کے لحاظ سے اختیار کیا۔ اس لیے فنی میزان پر انھیں پرکھنے کے بجائے ان کے اثرات ونتائج کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ تقریر مجلس کو لوٹ لینے اور اسے زیر وزبر کردینے کا نام نہیں، تقریر تو دراصل ذہن وفکر کی دنیا میں انقلاب برپا کردینے اور اسے لوٹ لینے کا نام ہے۔

............❖............

آہ! حکیم الاسلامؒ

باتیں ان کی یاد رہیں گی!

مولانا بدرالحسن صاحب قاسمی

سابق ایڈیٹر الداعی دارالعلوم دیوبند

عصرِ حاضر کے نامور عالم دین اور مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے انتقال سے برصغیر کی دینی وعلمی تاریخ کا ایک اہم باب ختم ہوگیا ہے وہ اس عہد کی یادگار تھے جس کی خصوصیت علم وفن کی جامعیت تقویٰ ودیانت اور اخلاق وشرافت رہی ہے۔ ۸۸؍سال کی زندگی (۱۲۱۵ھ تا ۷؍شوال ۱۴۰۳ھ) میں انھوں نے بڑے نشیب وفراز دیکھے چنانچہ وہ خود ہی ایک چلتی پھرتی تاریخ بن گئے تھے۔

انھوں نے نصف صدی سے زائد عرصہ ۱۳۴۳ھ تا ۱۴۰۳ھ تک دنیا کے ایک ایسے دینی مرکز کی سربراہی کی جس کا برصغیر کی دینی وسیاسی تاریخ پر بڑا گہرا اثر رہا ہے۔ اور جس سے برصغیر میں برپا ہونے والی تمام دینی علمی، اور سیاسی تحریکات کسی نہ کسی حیثیت سے ضرور متاثر ہوئی ہیں اور لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں آج بھی اس سے ایک والہانہ لگاؤ پایا جاتا ہے یہ مرکز جنگ آزادی کا مرکز بھی رہا ہے اور اس نے مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کو مذہبی قیادت دی ہے۔ چنانچہ موجودہ عہد کا کوئی انصاف پسند مؤرخ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ اور اس کے عوامی اثر کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔

ذاتی طور پر حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی حیثیت ایک عظیم دینی عالم خوش بیان مقرر اور اچھے مذہبی مفکر اور سینکڑوں کتابوں کے مصنف کی تھی، ان کا نسبی تعلق حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند متوفی ۱۲۹۷ھ سے تھا، جنھوں نے انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں

نمایاں حصہ لیا تھا اور شاملی کے جہاد میں بہ نفس نفیس شریک تھے اس کے علاوہ ہندو پنڈتوں اور عیسائیوں پادریوں سے ان کے مناظرے بھی بڑے مشہور ہیں، لیکن ان کی خدمات کا شاہکار دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم دینی ادارے کی تاسیس ہے۔ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ ان کے حقیقی پوتے تھے، ان کے والد بھی بلند پایہ عالم دین اور سلطنت آصفیہ حیدرآباد کے مفتی رہ چکے ہیں، ان کی وفات ۱۳۴۲ھ میں ہوئی اور حیدرآباد کے خطۂ صالحین میں ہی وہ دفن بھی ہوئے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کے اساتذہ میں ریشمی رومال تحریک کے قائد اور جامعہ ملیہ دہلی کے بانی شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، نامور محدث علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور ہندوستان کے عظیم مفتی مولانا عزیز الرحمان عثمانیؒ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے اس کے علاوہ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بھی ان کو خصوصی فیض حاصل تھا۔ اور سیاسی خیالات میں بھی ان کے ہی ہم مسلک تھے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو خدا نے بڑے فضل و کمال سے نوازا تھا، ذہانت و ذکاوت میں تو بچپن ہی سے طاق تھے، لیکن جس وصف میں اپنے ہم عصر علماء پر ان کو امتیاز حاصل تھا وہ دین کے اصول پر ان کی نظر اور شریعت کے اسرار و حکم کے بیان میں غیر معمولی بصیرت ہے، انہیں لوگوں نے حکیم الاسلام کے لقب سے تاعمر یاد کیا اور یہ حقیقت واقعہ ہے کہ حکمت آفرینی میں ان کا ذہن اپنے دادا حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ متوفی ۱۲۹۷ھ اور شاہ ولی اللہ دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ کے مشابہ تھا ان کی ذہنی ساخت ہی گویا حکیمانہ تھی کسی بات کو شرعی دلائل سے ثابت کرنے میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا، ان کی تقریر و تحریر دونوں میں یہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے''۔

''اسلام اور سائنس'' کے موضوع پر جو تقریر انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے یونین ہال میں کی تھی ''فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید'' پر جو مقالہ انھوں نے جامعہ ملیہ دہلی کے سمینار کے لئے لکھا تھا اسی طرح قرآن وسنت کے باہمی تعلق پر جو کتاب انھوں نے لکھی تھی یا جو مقالہ قطر کی سیرت وسنت کانفرنس کے لئے قلمبند کیا تھا وہ ان کی مجتہدانہ بصیرت اور قرآن وسنت اور فقہی اصولوں پر غیر معمولی دسترس کا آئینہ دار ہے۔

برصغیر کے مسلمان عام طور پر ان کو ایک بلند پایہ عالم دین اور خوش بیان مقرر کی حیثیت سے جانتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ طویل اور مربوط عالمانہ تقریر جس سے عوام وخواص یکساں طور پر مستفید ہوسکیں ان کا بڑا کمال تھا اور اس میدان میں ان کا کوئی ہمسر نہیں نظر آتا۔ برصغیر کا چپہ چپہ پون صدی تک ان کی آواز سے گونجتا رہا، کسی اجتماع میں ان کا نام ہی اس کی کامیابی کی ضمانت بن گیا تھا، ہندو پاک کے علاوہ

افریقہ، لندن اور امریکہ تک ان کے تقریری پروگراموں کا سلسلہ تاعمر جاری رہا لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کی چھوٹی بڑی تصنیفات کا سلسلہ بھی ۱۲۰ر سے متجاوز ہے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی ذات علم وحکمت کے ساتھ تواضع اور بردباری کا اعلیٰ نمونہ اور انسانیت وشرافت کا پیکر تھی، طبعیت میں بڑی پاکبازی اور مزاج میں اعتدال تھا اسی لئے ہر جماعت میں عزت ووقار کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی مرنجان مرنج طبیعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے تاعمر انہی لوگوں کی پرورش کی جو ان کے ساتھ سخت بغض رکھتے تھے، دارالعلوم کی سطح میں جب کبھی اُبال آتا اور شورش بڑھتی تو وہ اپنے لوگوں کو بڑی صفائی سے کہتے، بھائی! اگر صلح وصفائی چاہتے ہو تو میں چند منٹ میں کرادیتا ہوں اور اگر جنگ وجدل مطلوب ہو تو یہ بات میری افتادِ طبع کے خلاف ہے۔ اپنا قائد بدل دو۔

............❖............

حکیم الاسلامؒ اور مسلم پرسنل لا بورڈ

مولانا محمد اسلام قاسمی

استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند

ہندوستان میں مغلیہ عہد حکومت کے زوال کے بعد انگریزوں کی ہندوستان آمد اور مغربی تہذیب وعلوم کی اشاعت شروع ہوئی اور سقوط حکومت ۱۸۵۷ء کے بعد تو ملک میں مکمل طور پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا، اور استعماری قوت نے خاص طور پر مسلم معاشرہ اور اسلامی تہذیب وقوانین کو اپنے جور واستبداد کا نشانہ بنایا، علماء دین اور دانشوران ملت پر ظلم وستم ڈھائے، کیونکہ یہی طبقہ انگریزی حکومت سے بغاوت کیلئے عوام کی رہنمائی اور سربراہی کرتا رہا، پھر مغربی علوم وثقافت کو تمام باشندگان ملک پر مسلط کرنیکی پالیسی جاری ہوئی، اسلامی علوم وتہذیب کی بقاء وتحفظ کیلئے ملک کے گوشے گوشے میں علماء ومفکرین نے مسلمانوں کیلئے تعلیمی اداروں کی بنیادیں ڈال دیں، اس وقت تک ملک میں مسلم حکمرانوں کے ذریعہ جاری کردہ ملکی وعائلی قوانین ہی کا نفاذ ہوتا رہا، مسلم امت کے عائلی اور معاشرتی قوانین کی تنسیخ کی کوششیں نہیں ہوئیں، نہ ان میں تبدیلی کی پالیسی حکومت کے زیرِ غور رہی، یہ بھی حکومت وقت کی ہندوستان میں بغاوت اور افراتفری یا بدنظمی سے بچے رہنے کی ایک مصلحت اور ملکی نظم کی ضرورت تھی، البتہ انگریزوں نے اسلامی قانون کو رفتہ رفتہ ختم کرنے کی ابتدا کر دی تھی، سب سے پہلے ۱۸۶۶ء میں حکومت برطانیہ نے فوجداری قانون کو ختم کیا، پھر قانون شہادت اور قانونِ معاہدات منسوخ کئے اور بالآخر مسلمانوں کے ''معاشرتی قوانین'' میں تبدیلی کی راہیں ہموار کی جانے لگیں اور اس کیلئے حکومت نے ''رائل کمیشن'' مقرر کیا، اس کمیشن نے قوانین اور صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد حکومت کو واضح کر دیا کہ ان قوانین کا تعلق مذہب سے بہت گہرا ہے، اس لئے ان میں تبدیلی کا مطلب براہ راست مذہبی امور میں مداخلت اور مذہبی آزادی کو مجروح کرنا ہوگا، چنانچہ حکومت نے اقتدار

کے تحفظ کیلئے مذہبی معاملات میں مداخلت کا ارادہ ترک کردیا اور کسی طرح کی تبدیلی کی بجائے مسلمانوں کیلئے ''قانون شریعت'' اور ہندوؤں کیلئے ''دھرم شاستر'' پر عمل آوری کو جاری کردیا۔ اسی دوران ۱۹۳۶ء میں ایک عدالت نے ہندو رواج کے مطابق وراثت میں بہن کو حصہ دینے سے انکار کردیا، ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ اسلامی قانون کے خلاف تھا اس لئے اس وقت کے علماء کرام نے تحفظ شریعت کے عنوان سے اس فیصلے کے خلاف آواز بلند کی اور زبردست جدوجہد کی، ان کی کوششیں بارآور ہوئیں اور ۱۹۳۷ء میں ''شریعت اپلی کیشن ایکٹ'' بنا جس کے مطابق مسلمانوں کیلئے اس کی گنجائش ہوئی کہ وہ اپنے عائلی قوانین (نکاح، طلاق، خلع، ظہار، فسخ نکاح، حق حضانت، ولایت، میراث، وصیت، ہبہ اور شفعہ) میں شریعت اسلامیہ کے پابند رہیں، عدالت کو پابند کیا گیا تھا کہ فریقین مسلمان ہوں تو شریعت اسلامی کے مطابق فیصلہ ہوگا، خواہ ان کا عرف ورواج کچھ بھی ہو، بہرصورت قانونِ شریعت کو اس پر بالادستی حاصل ہوگی۔

۱۹۴۷ء میں ملک برطانوی غلبے سے آزاد ہوا تو ملک دو حصوں میں منقسم ہوگیا، ہندوستان کا مغربی اور مشرقی حصہ الگ ہوکر ایک نئی مملکت بنا، ہندوستان میں رہنے والوں میں ہر مذہب کے ماننے والے موجود تھے، ہندوؤں کی بڑی اکثریت تھی اور دوسری بڑی اکثریت مسلمانوں کی تھی ان کے علاوہ عیسائی، سکھ، بودھ، جین اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کی بڑی تعداد رہی، اب نہ مسلمانوں کی حکومت باقی رہی، نہ برطانوی استعمار، ملک کو منظم اور متحد رکھنے اور تمام فرقوں کو یکساں حقوق حاصل ہوں ان بنیادوں پر حکومت کی تشکیل ہوئی، نئے ملک کیلئے دستور سازی کا مرحلہ پیش آیا، تو اسکو ایک جمہوری اور عوامی ملک قرار دیا گیا، جسکی تشکیل برطانوی طرز حکومت پر ہوئی۔ عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ایوان قانون ساز ادارہ قرار پایا، آئین اور دستور بنائے گئے۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی سربراہی میں بنیادی اور رہنما اصولوں پر مشتمل دستور بنا، جس میں دفعات کے تحت حقوق، عدل وانصاف اور ملک کیلئے قوانین کی تصریحات موجود ہیں، ان میں سیکولرزم کو بنیادی حیثیت دی گئی، یعنی غیر مذہبی حکومت، دستور ساز کمیٹی نے بنیادی اصولوں میں ملک کے تمام شہریوں کو اپنے مذہب، تہذیب اور عائلی قوانین پر عمل کی آزادی رکھی، چنانچہ دفعہ ۲۹ میں وضاحت ہے کہ تمام شہریوں کو اپنے رسم ورواج اور شریعت کے مطابق عمل کرنے کی آزادی حاصل ہوگی۔ اسی کے ساتھ دستور میں کچھ رہنما اصول بھی طے کئے گئے تھے جن میں ایک دفعہ (۴۴) تھی جس کے مطابق حکومت کو ہدایت یا اجازت دی گئی کہ وہ پورے ملک میں ''یکساں سول کوڈ'' کے نفاذ کی کوشش کرے، اس رہنما اصول میں مسلمانوں کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لاء) میں مداخلت کی گنجائش موجود تھی، اسلئے مسلم ممبران اور

قائدین نے اس پر سخت اعتراضات کئے اور اس میں ترمیمات پیش کیں، مگر ڈاکٹر امبیڈکر نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ کیا کوئی حکومت یہ پسند کرے گی کہ ملک کی ایک بڑی آبادی مسلمان اسکے خلاف ہو جائے، اور کوئی پاگل حکومت ہوگی جو ملک میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی کوششیں کریگی۔

اس رہنما اصول کے علاوہ بھی کچھ رہنما اصول شاملِ دستور کئے گئے جو ملکی مفادات میں تھے، مگر ان اصولوں پر توجہ دینے کی حکومت کی جانب سے کوئی کوشش ہی نہیں ہوئی، البتہ چند سال گذرنے کے بعد ہی حکومت کی بعض ایجنسیوں کی جانب سے یکساں سول کوڈ لاگو کئے جانے کی آوازیں اٹھنے لگیں۔ ۱۹۵۶ء میں جب ہندو پرسنل لاء میں تبدیلی کی گئی تو اس وقت کے وزیر قانون مسٹر پاٹیکر نے اس بات کا اشارہ دیا کہ یہ ترمیم یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی پہلی کڑی ہے، بتدریج اسکو پورے ملک میں نافذ کیا جائے گا۔ اس سے علماء دین و دانشوران ملت چونک اٹھے، پھر جب حکومت کو محسوس ہوا کہ مسلمانان ہند قانون شریعت میں کسی بھی تبدیلی کو ہرگز قبول نہیں کریں گے تو حکمت عملی بدل دی گئی، اور اعلان کر دیا گیا کہ جب تک مسلمان خود مطالبہ نہ کریں ان کے پرسنل لا (عائلی شرعی قوانین) میں تبدیلی نہیں کی جائے گی، مگر کچھ فرقہ پرست جماعتوں اور حکومت میں شامل عناصر کی جانب سے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی آوازیں گاہے بگاہے سنائی دیتی رہیں، پھر درپردہ کچھ ایسے افراد کے ذریعہ سے اس طرح کی باتیں کہی جانے لگیں، یا کہلائی جانے لگیں جو نام کے مسلمان تو تھے مگر ایمان وعمل اور شریعت کی ضرورت واہمیت سے بے گانے تھے، گویا حکومت کیلئے مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے راستے ہموار کئے جانے لگے، اس کا اظہار ۱۹۷۲ء میں "متبنّٰی بل" کی صورت میں ہوا، جو تمام شہریوں (بشمول مسلمان) کیلئے قابل نفاذ ہوتا، اس وقت کے وزیر قانون نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ یہ مسودہ قانون یکساں سول کوڈ کی طرف پہلا مضبوط قدم ہے۔ اس بل کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے متوقع درپیش خطرات کے بادل منڈلانے لگے، علماء دین، قائدین اور دانشوران قوم کے سامنے تحفظ شریعت کے حوالے سے سوالیہ نشانوں کی ایک لمبی لائن کھڑی ہوگئی۔

دارالعلوم دیوبند صرف ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں، بلکہ ایک علمی اور دینی تحریک کا عنوان ہے، ۱۸۶۶ء میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء علماء دین کے ذریعہ بغاوت ۱۸۵۷ء کے بعد کے پرآشوب دور میں ایک علمی اور دینی تحریک کا آغاز ہوا، جسکے مقاصد میں جہاں دینی علوم کی حفاظت و اشاعت تھی، وہیں تحفظ شریعت اور اسلامی تہذیب وتمدن کی بقاء کیلئے جدوجہد کرنا بھی تھا، ہندوستان کی آزادی کے وقت برصغیر ہند کے علاوہ بیرونی دیار میں بھی ایک دینی واسلامی مرکز کی حیثیت سے معروف و

مستند بن چکا تھا، ملک کی آزادی کے بعد مسلمانوں کی پسماندگی، مایوسی اور پریشانی کے حالات میں دین و شریعت کیلئے ایک منارۂ نور تھا، جہاں اس ادارے نے قرآن وسنت اور فقہ حنفی کی تدریس واشاعت کی عظیم الشان خدمات انجام دیں وہیں مسلمانوں کے دین وشریعت اور عائلی قوانین میں ان کی رہنمائی کا فریضہ بھی ادا کیا۔ دین، اسلامی احکام اور شریعت کے دفاع میں بھی دارالعلوم اور اس کے فرزندوں نے قابل قدر کارنامے انجام دیئے، اس حوالے سے ہندوستان کے مسلمانوں کی نگاہیں بھی دارالعلوم دیوبند کی جانب اٹھتی رہی ہیں۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام

دارالعلوم دیوبند میں اکابرامت کی نشست کے بعد حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مؤرخہ ۲۷/۲۸/ دسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئ میں وہ عظیم الشان تاریخ ساز ''مسلم پرسنل لا کنونشن'' منعقد ہوا، جہاں مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی داغ بیل پڑی، یہ اجلاس ہندوستان کی تاریخ میں لاثانی اور بے مثال تھا، اسمیں شرکت کرنیوالوں کی تعداد کے لحاظ سے بھی، اور اسمیں جلوہ افروز ہونے والی مسلم تنظیموں، فرقوں، مختلف مسالک کے اعلیٰ ترین علماء ومشائخ، مسلم قائدین، سیاسی مسلم رہنماؤں اور اہل علم، دانشوروں کی شخصیتوں کے اجتماع کے لحاظ سے بھی، جس میں پہلی بار مسلمانوں کے تمام مسالک اور تنظیموں کے جلیل القدر رہنما موجود تھے، اتحاد امت کا ایسا نظارہ برصغیر ہند نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، مسلمانوں کے اتحاد کا ایسا انوکھا اور نمائندہ اجتماع کہ کسی نے سچ کہا تھا کہ آج ہندوستان کے کسی گوشے میں جاکر دریافت کرو کہ مسلمانوں کے فلاں رہنما، قائدین اور علماء کہاں ہیں تو ایک ہی جواب ملے گا کہ وہ سب آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن میں ہیں، بمبئ کے نامور افراد نے شرعی قوانین کے عنوان پر اس عظیم کنونشن کیلئے انتھک جدوجہد کی، علماء، دانشوران اور دیندار مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس کی کامیابی کیلئے سرگرم رہا، خاص طور پر جناب یوسف پٹیل صاحب جو بعد میں بورڈ کے سکریٹری منتخب ہوئے۔

تحفظ شریعت اور مسلمانوں کے ملّی تشخص کی بقاء کا عنوان تھا اور حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب علیہ الرحمہ کی دعوت تھی، بلاتفریق مسلک ومشرب سب ہی جمع ہوئے، حنفی، شافعی بھی تھے، اور اہل حدیث بھی، سنی بھی اور شیعہ بھی، دیوبندی بھی تھے اور بریلوی بھی، داؤدی بوہرہ بھی اور سلمانی بوہرہ بھی تھے، اور سبھوں کی ایک ہی آواز تھی، ہم شرعی قوانین پر عمل پیرا رہیں گے، اور اسمیں کسی طرح کی کوئی ترمیم اور مداخلت قبول نہیں ہوگی۔ یہ خالق کائنات کے بنائے قوانین ہیں اسمیں ترمیم وتبدیلی کی گنجائش نہیں، پورے

اجلاس کا ایک ہی عنوان تھا "لاتبدیل لکلمات اللہ" (اللہ کے فرمان میں کوئی تبدیلی نہیں)

اس اجلاس کے صدر حکیم الاسلامؒ حضرت مولانا محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خطبہ صدارت میں سب سے پہلے حاضرین اور منتظمین کا شکریہ ادا کیا تھا، پھر بڑی تفصیل کے ساتھ واضح فرمایا کہ اسلامی شریعت کوئی انسان کا وضع کردہ نظام نہیں ہے، جس میں تبدیلی کی گنجائش ہو، یہ خدا کا قانون ہے، قانون فطرت ہے اور فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی، اگر کوئی زمین، آسمان، چاند، سورج اور کواکب و نجوم کو نہیں بدل سکتا، صرف اس سے فائدہ ہی اٹھاسکتا ہے تو دین کے کلیات و جزئیات، احکام وآداب، اخلاق وعقائد، معاملات ومعاشرت اور اجتماعی قوانین سے لے کر عائلی قوانین تک کی فطری حدود کو بھی نہیں بدل سکتا۔

پھر مختصر طور پر عائلی قوانین اور مسلم پرسنل لا کی تبدیلیوں اور امت کے علماء ربانی ومشائخ حقانی کے دفاع کا سرسری تذکرہ کرتے ہوئے اس وقت سرکاری کارروائیوں اور اعلانات کا ذکر کیا اور مسلمانوں کی آواز کے بارے میں فرمایا تھا:

"پرسنل لا کے بارے میں سرکاری طور پر گو یہ بھی اعلان ہے کہ اسمیں مسلمانوں کی مرضی کے بغیر کوئی بھی ترمیم وتبدیلی نہیں ہوگی، لیکن ساتھ ہی بالواسطہ قانون سازی کے ذریعہ تبنیت اور سرکاری ملازمین کے لیے نکاح ثانی کے حق پر پابندی نے جو پرسنل لا میں عمل ترمیم کا آغاز ہے پرسنل لا کے بارے میں مسلمانوں کی تشویش کو حق بجانب بنادیا ہے۔ اس لئے وہ متفقہ آواز اٹھانے پر مجبور ہوئے اور جس کی گونج ان شاء اللہ رائیگاں نہیں جائے گی۔"

اسی کنونشن میں ایک متحدہ پلیٹ فارم کی تشکیل پر تمام افراد متفق ہوئے اور طے پایا کہ اگلے ہی سال حیدرآباد میں ایک اجلاس عام منعقد کرکے "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" کا آغاز ہوجائے، چنانچہ ۱۹۷۳ء میں حیدرآباد میں اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اجلاس منعقد ہوا اور باتفاق آراء حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب رحمۃ اللہ کو بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا۔

خاندان نانوتویؒ کے روشن چراغ اور اکابر دیوبند کے علمی جانشین حکیم الاسلامؒ حضرت مولانا محمد طیبؒ کے اندر مسلمانوں کے مختلف طبقوں، مکاتب فکر اور مسلک ومشرب کے لوگوں کو ساتھ لیکر چلنے کی بے پناہ صلاحیت تھی اور عالمی دینی تعلیمی مرکز دارالعلوم دیوبند کے انتظام وانصرام کا پچاس سالہ تجربہ تھا، دارالعلوم دیوبند کے تعارف اور دعوت کے مقصد سے دنیا کے تمام براعظموں کا سفر ہوچکا تھا، پوری دنیا میں ان کے مواعظ وخطبات کا شہرہ تھا، اور ہندوستان کے تمام علاقوں میں اور ہر مسلک وفرقے میں انھیں مقبولیت

حاصل تھی، اس وقت ان جیسی جامع العلوم، حامل اخلاق فاضلہ اور معروف ومقبول شخصیت انھیں کی تھی اور متحدہ طور پر سب ہی کو اُن پر اعتماد تھا۔

''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کی باضابطہ تشکیل اور ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے اجتماع عظیم کی ساری کارروائی حکومت ہند تک بھی پہنچی، چنانچہ حکومت نے اس ''متبنّٰی بل'' کو سرد خانے میں ڈالدیا اور بالآخر ۱۹۷۸ء میں جنتا حکومت نے اسے واپس لے لیا تھا۔

ابھی اس تنظیم کے تعارف اور اسکے اغراض ومقاصد کو عام مسلمانوں تک پہنچانے کا عمل جاری تھا کہ ۱۹۷۵ء میں وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کردی اور تمام بڑے سیاسی وسماجی رہنماؤں کو جیل میں ڈال دیا گیا، جمہوری نظام معطل ہوگیا اور ہر فیصلہ بزور قوت نافذ کیا جانے لگا، خاص طور پر ''تحدید نسل'' کیلئے جبری نسبندی کا عمل شروع ہوگیا، عمل تولید کے فطری قانون پر رکاوٹیں کھڑی کردی گئیں، اور حکومت کے فیصلوں پر احتجاج کی ساری راہیں جبراً مسدود کردی گئیں، یہ قانون بھی شریعت اسلامیہ کے خلاف تھا، مسلمانوں کے عائلی قوانین پر تنسیخ کا عمل تھا۔

اس لئے حضرت حکیم الاسلامؒ کی قیادت اور جرأت مندانہ اقدام کے تحت اس پر آشوب اور سخت کٹھن مرحلے میں دہلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا اور تمام متوقع خطرات اور قید و بند کی صعوبتوں کے علی الرغم بورڈ نے حکومت کے اس فیصلے کی سخت مخالفت کی اور واضح کیا کہ مسلمانوں کیلئے قانون ضبط ولادت کے لئے جبری نس بندی قطعی قبول نہیں ہے، یہ ایک تاریخی نشست تھی اور تاریخ ساز فیصلہ جسے آج بھی تاریخ، مسلم پرسنل لا بورڈ کے نمایاں ترین خدمات اور کارنامے کے بطور محفوظ کئے ہوئے ہے۔

پھر ۱۹۷۸ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے لکھنؤ بنچ نے مساجد ومقابر کو ایکوائر کرنے کے سلسلے میں ایک ایسا فیصلہ صادر کردیا جو نہایت سنگین نتائج کا حامل تھا، جس کے مطابق حکومت مساجد ومقابر کی ملکیت کبھی بھی سلب کرسکتی تھی، بورڈ نے اسکے خلاف پورے ملک میں تحریک چلائی، اس جدوجہد کے نتیجے میں یوپی اور راجستھان نے ایکوائر کے احکام واپس لے لئے۔

پھر ۱۹۸۰ء کو اوقاف کی جائیدادوں پر حکومت کی جانب سے ٹیکس عائد کرنے کے احکامات جاری ہوئے، مسلم پرسنل لاء بورڈ نے اس کی سخت مخالفت کی اور اوقاف کی جائدادوں کو ٹیکس سے مستثنیٰ کروانے میں بورڈ کامیاب رہا۔

۱۷/جولائی ۱۹۸۳ء کو بورڈ کے بانی ومحرک وقائد اوّل حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب علیہ الرحمہ کا

انتقال ہوا۔ اگست ۸۳ء میں مدراس کے اجلاس عام میں نئے صدر کے بطور مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ منتخب ہوئے، ۲۰۰۰ء میں ان کی وفات کے بعد فقیہ وقت حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صدر بنے، انکی مدت صدارت مختصر رہی، دوسال کے بعد ہی حیدرآباد کے اجلاس عام میں موجودہ صدر حضرت مولانا محمد رابع ندوی زید مجدہم کی سربراہی طے پائی جواب تک جاری ہے۔

عالم ربانی حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی وفات ۱۹۹۱ء کے بعد حضرت مولانا سید نظام الدین (امیر شریعت بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ) بحیثیت جنرل سکریٹری اس متحدہ تنظیم کی قیادت کو اپنے تجربات، دوراندیشیوں اور دیگر عہدے دارانِ بورڈ کے مشوروں سے پوری ذمہ داری سے بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

اس طرح ملک کے مسلمانوں کیلئے ان کے معاشرتی اور عائلی قوانین پر عمل آوری اور کسی طرح کی تبدیلی قبول نہ کرنے کی علامت یہ آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ عمل میں آیا، جس کی تحریک دارالعلوم دیوبند سے شروع ہوئی اور مہتمم دارالعلوم دیوبند حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب قدس سرہٗ کی صدارت میں باضابطہ ایک تنظیم کی شکل اختیار کرگئی۔

اس کی ابتداء کے وقت بمبئی میں جو آل انڈیا کنونشن منعقد ہوا اور جس میں مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر اور مؤقر تنظیموں کے علاوہ ملک کے علماء وفضلاء، ودانشوران شریک ہوئے، حضرت حکیم الاسلامؒ نے اسلامی قوانین کی حقانیت اور اس کی اہمیت وافادات پر مشتمل جو خطبۂ صدارت پیش فرمایا تھا اس کے چند صفحات قارئین کی نذر ہیں جن میں واضح طور پر ''لاتبدیل لکلمٰت اللہ'' کی ابدیت اور اس کی تشریح نمایاں ہے۔

مسلم پرسنل لاء پر حضرت حکیم الاسلامؒ کا پہلا خطبہ

الحمد لله و كفىٰ و سلام علىٰ عباده الذين اصطفىٰ. و بعد:

حضراتِ گرامی قدر!

اس عظیم نمائندہ اجتماع کے لئے جس میں مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر اور مؤقر تنظیموں کے علماء و فضلاء اور ملک کے تمام دانشور جمع ہیں، صدارت کسی ایسی بڑی اور نمایاں شخصیت کے سپرد ہونی چاہئے تھی جو اس عظیم اجتماع کے شایانِ شان اور اس کے لئے مزید عظمتوں کا باعث ہوتی، اس کے برخلاف ایک ایسے شخص کے سپرد کردی گئی جو جسم وروح وظاہر وباطن دونوں کے لحاظ سے کمزور اور قلیل البضاعت ہے اور جتنی بضاعت ہے وہ بھی مزجات ہے۔

دراحالیکہ اس مؤقر مجمع میں ایسے اکابر علم وفضل موجود ہیں جو بسطۃً فی العلم والجسم دونوں لحاظ سے اس ذمہ دارانہ منصب کے لئے حق اور ملک وقوم پر اثر انداز ہونے کی اعلیٰ صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ اس صورت میں مجھ جیسے طالب علم کے لئے اس بڑی ذمہ داری سے بہ ادب معذرت کردینے کا موقع تھا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اَقویا کے مقابلہ میں اس درجہ کا کمزور ہونا بھی بہرحال ایک امتیاز ہے اور بڑے کمال کے مقابلہ میں بڑا نقصان بھی کمال ہی سے نسبت رکھتا ہے، جو درحقیقت اس کمال کے نمایاں اور واضح کردینے کا ایک بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

و بضدها تتبین الاشیاء. ضد ہی سے اصل کا تعارف اور تبین ہوتا ہے، اضداد نہ ہوں تو کمالات کی بہت سی قوتیں چھپی کی چھپی رہ جاتی ہیں، اگر ظلمت نہ ہوتو نور کے پہلو نہیں کھل سکتے، اگر رات نہ ہوتو دن کی قدر و قیمت معلوم نہیں ہوسکتی، اگر جہل نہ ہوتو علم کی عظمت نمایاں نہیں ہوسکتی، اگر ضعف نہ ہوتو قوت کی قدریں نامعلوم رہ جائیں، اگر ناقصین نہ ہوتوں کاملین کے کمالات کے پہلو سامنے نہیں آسکتے۔

اس حقیقت کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ اس ضعیف و ناکارہ کا انتخاب بہت ہی موزوں ومناسب ہوا اور جیسے انتخاب شدہ کو یہ بلا چون و چرا قبول کرلینا چاہئے تھا اسی طرح انتخاب فرمانے والے بزرگ بھی میرے ہی نہیں بلکہ پورے اجتماع کے شکریہ کے مستحق ہیں کی انہوں نے حقیقت شناسی کا پورا ثبوت دیا ہے لیکن اس شکریہ سے بڑھ کر اور سب سے پہلے ہم سب کو اس خداوند بزرگ و برتر کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جس کی عطا کردہ توفیق سے ہم سب یہاں ایک جگہ جمع ہیں اور کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے ہیں، نہ صرف ہمارے اجسام ہی ایک دوسرے سے قریب ہوگئے ہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے دل بھی ایک دوسرے سے قریب اور اخوت اسلامیہ کے جذبہ کے تحت قریب سے قریب تر ہوجانے کا آرزومند ہیں۔

بزرگانِ محترم! ہمیں ملانے والی چیز صرف اللہ کا نام اور اس کا مستند کلام ہے اور ہمارے دین کی واحد اساس کلمہ طیبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہی ہمیشہ کی طرح آج بھی ہمارے اس ملّی اتحاد کا سرچشمہ ہے۔ ہم اللہ کے نام سے زندگی حاصل کرتے ہیں اور اسی کلام کو اپنی زندگی کا قانون سمجھتے ہیں اور اللہ کے سچے رسول خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ قدسی صفات کو کمالاتِ خداوندی کا نمونہ اور اپنی دنیا و آخرت کا کامل ومکمل رہنما اور مربی یقین کرتے ہوئے ان ہی کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کو اپنی زندگی کا آخری مقصد سمجھے ہیں۔

اسی پاک اسوہ سے ہماری زندگی بنی ہے اور اسی سے آئندہ بنے گی اور اسی پر خاتمہ سے ہماری آخرت

کی فلاح و بہبود وابستہ ہے۔

امام مالکؒ کا ارشاد ہے: **لا یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا.**

(اس امت کا آخری حصہ بھی اسی سے صلاح وفلاح پا سکتا ہے، جس سے امت کے اول حصہ نے صلاح وفلاح پائی)

خلافِ پیمبرؐ کسے رہ گزید کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

یہی وہ روشنی اور رہنمائی ہے جس نے صدیوں کے خلاء کو پُر کر کے ہمیں ایمانی عزیمت عطاء کی اور ہم لوگوں کو جو ٹکڑے ٹکڑے تھے، آج کے دن ایک جسم واحد کی طرح ایک جگہ جمع کر دیا اور ایک بار پھر اپنی شریعت اور اس کے مسائل کی حفاظت کے لئے اس مقام پر کھڑا ہونے کی ہمت بخشی۔ بلاشبہ جس طرح آج کا یہ اجتماع عظیم ہے اسی طرح یہ دن بھی ایک عظیم بلکہ عظیم تر دن ہے جس میں بظاہر ایک ناممکن سی بات نہ صرف ممکن بلکہ واقعہ بن کر سامنے آ گئی ہے اور **وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا** کا پاکیزہ منظر آنکھوں سے نظر آ رہا ہے۔

حضرات گرامی! ہر دور میں تاریخ کا ظہور کسی نہ کسی شکل میں ہوتا رہا ہے لیکن اس دور کا تاریخ ظہور یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے مختلف مکاتب فکر کے علماء و دانشور اور رہنما وحدتِ کلمہ کی بنیاد پر ایک نقطۂ وحدت پر جمع ہیں، اس کی روشنی میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق توحید و رسالت اور جذبۂ وحدت کی جو امانت امت کو سپرد کی گئی تھی ہم اس کی حفاظت کے فریضہ کو فرض کی طرح ادا کرنے کے لئے بیٹھے ہیں، بلاشبہ یہ امانت ہمیں جان و مال اور آبرو سے زیادہ عزیز ہے۔ ہم اپنی جانوں سے دستبردار ہو سکتے ہیں مگر اس ازلی اور ابدی امانت سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔

بزرگانِ محترم! آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ اسلام عام مذاہب کی طرح کوئی خاندانی، وطنی یا قومی قسم کی روایات کا مذہب نہیں ہے بلکہ روایت و درایت کے لحاظ سے اس کی ہمہ گیر فطرت کی خود اپنی ہی ایک مستقل اور امتیازی شان ہے۔ مذاہب کی دنیا دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اور مذاہب کی مثال ایک ایسی مملکت کی سی ہے جس کی سرحدیں نہیں، اگر ہیں تو وقت کی دھارے سے ادلتی بدلتی رہیں، لیکن اسلام ایک ایسی مملکت ہے کہ جس کی سرحدیں اٹل ہیں اور وہ سرحدیں خداوندی دستور سے بنی ہوئی ہیں، جو قلعہ بند شہر پناہ کی مانند ہیں۔ زمانہ کی کسی ضرب سے نہ وہ ٹوٹ سکتی ہیں اور نہ ہل سکتی ہیں، یہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان سرحدات سے باہر نکل جائیں مگر یہ ان کی تعدی ہوگی، حدود اپنی ہی جگہ اٹل رہیں گی۔

تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلاَ تَعْتَدُوْھَا وَ مَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ.

اسلام کا قالب جن قانونی دستاویزوں اور فطری اصول سے مشیت خداوندی نے تیار کیا ہے ان میں تمام ہنگامی اور دوامی اصلاحات اور ان کے اصول وقوانین جمع کر کے ان میں سے ان تمام سماجی برائیوں کو نکال دیا ہے جن کا نام جاہلیت تھا۔ اس میں کسی تغیر اور تبدیلی کے معنی اسی جاہلیت کو دوبارہ لے آنے کے سوا دوسرے نہیں ہو سکتے، جس سے مالکِ مطلق نے انسانیت کو پاک کر کے درجۂ کمال پر پہنچایا تھا۔

آج پرسنل لاء کے نام پر ان تبدیلیوں کا مواد بنام اصلاح وترمیم پیش کیا جا رہا ہے۔ کیا حقیقتاً یہ اصلاح اور کوئی اصلاحی تحریک ہے؟ یہ اصلاح اسی قسم کی ہے، جسے قرنِ اوّل کے منافقین اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ کے نعرے کے ساتھ لے کر کھڑے ہوئے تھے، لیکن عالم الغیب والشہادۃ نے کھلا اعلان فرما دیا تھا اَلاَ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ.

ہم اپنے دین و دانش کے لحاظ سے یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی تحریک کوئی اصلاحی تحریک ہے بلکہ دوربین سے دیکھئے یا خوردبین سے، صاف نظر آئے گا کہ یہ ایک سیاسی تحریک ہے جو ہندو کوڈ بل سے پیدا ہوئی ہے، سو یہ آپ کی سیاست ہے، آپ اسے اپنے پاس رکھئے۔

ہندوستان کا دستور، مذہب اور سیاست کو الگ الگ قرار دیتا ہے تو آپ ہمارے مذہب کے معاملہ میں اپنی سیاست ملا کر حکومت اور عوام کو ناراض کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟

آپ کا دعویٰ ہے کہ حکومت ریفارمس چاہتی ہے اور ہم مصلح ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ ملک میں سماجی برائیوں، اخلاقی گراوٹوں اور غلاظتوں کے جو ڈھیر لگے ہوئے ہیں حکومت کے قانون، حکام کی طاقت اور نام نہاد مصلحین کی اصلاحی مہم کا رخ اس طرف کیوں نہیں؟

مجھے اس وقت ایک سخت لفظ کہنے پر معاف کیجئے کہ وہ سماج کتنا دیوّث ہے جو لاکھوں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو بازار میں بیٹھنے کی اجازت دیتا ہے اور چار شادیوں کی محض اجازت اور وہ بھی خاص شرائط عدل و دیانت سے مشروط اجازت پر اعتراض کرتا ہے اور اس غلاظت پر ان مظلوم قسمت کی ماری بازاری گناہگار عورتوں پر کتنے مرد ظلم توڑتے ہیں، نہ کوئی پابندی عائد کرتا ہے اور نہ کوئی دار و گیر کا روادار ہے۔ سماج نے گناہوں کے بازار لگا رکھے ہیں، آج بھی اس ملک میں ایسے فرقے ہیں جو اسّی اسّی بیویاں رکھتے ہیں اور سماج ان کے بارے میں چوں تک نہیں کرتا۔ بقول بابو ابھے چندر اور بابو گریندر ناتھ دت۔

"اس ملک میں ایسے کامن برہمن بھی ہیں جن کی پچاس پچاس اور سوسو بیویاں ہیں، ان میں سے ہر شخص

کے پاس ایک نوٹ بک رہتی ہے جس میں وہ اپنی بیویوں کی ولدیت اور گاؤں کے نام لکھ لیتے ہیں اور (پھر بھی) انہیں پشیمانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ جسے وہ ایک اجنبی سمجھ کر ملتے ہیں وہ ان کی بیوی یا لڑکا ہوتا ہے۔'' (۱)

لیکن اسلام نے سماج کے اس وحشی دستور کے خلاف سوسو بیویاں رکھنے کے قانون کو محدود کر کے اگر چار کی گنجائش دی اور وہ بھی کڑی شرائط کے ساتھ اور اسی بے قید غلاظت سے سماج کو پاک رکھنے کے لئے تو مصلحین کی ٹولیاں قانون کے پشتارے لے کر دوڑ پڑیں، جس سے ملک میں راتوں رات مادر وطن کی بیٹیوں کے بدن سے عصمت وعفت کا لباس رات بھر اتار کر تار تار کیا جاتا رہا ہو اور خدا کے غضب سے حکومت اور سماج بے نیاز ہو، ایسے ملک کے چند ایسے سر پھرے مصلحین کو مسلم پرسنل لاء کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے سو بار خود تو شرمانا چاہئے تھا، جنہیں بے شرم سماج کو ٹوکنے تک کی ہمت نہیں۔ ان میں اسلام کی فطری اور اعلیٰ وارفع قانونِ عصمت پر حرف زنی کرنے کی ہمت آخر کہاں سے پیدا ہوئی؟ بے شمار بچوں کی تعداد پر تو پابندیاں عائد کی جائیں مگر بے شمار غلیظ گناہوں پر پابندیاں عائد کرنے کا کوئی جذبہ نہ ابھرے، خواہ وہ کتنی ہی تعداد میں ہوں، کہیں بھی ہوں اور کتنے ہی شرمناک انداز میں ہوں۔ برائیوں کے بازار کھلے ہوئے ہیں، جن میں ہر برائی اور ہر اخلاقی گندگی بکری کے مال کی طرح بکتی ہے۔ تباہ حال اچھوتوں کا کیا حال ہے، غریب ہندو عورتوں کا کیا حال اور مآل ہے، جوان نسل کے لڑکے اور لڑکیاں کن کن سماجی مصیبتوں میں مبتلا ہیں، جھوپڑیوں میں عورتوں کی عزت وعصمت کیسے دردناک حالات سے دوچار ہے، وہاں کوئی مصلح، کوئی لیڈر اس اصلاحی مہم کو لے کر اٹھنے کی تکلیف گوارہ فرما کر نہیں پہنچتا، اگر وہ اس اصلاحی مہم کو لے کر اٹھیں تو میں اعلان کرتا ہوں کہ ہم سب اسی وقت ان مصلحین کے پروگراموں کا آخر تک ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں۔

شاید ان ہی غلاظتوں کی پردہ پوشی کے لئے پرسنل لاء کے چند مسائل کو ہدف بنا کر ان میں ترمیمات اور اصلاحات کے نعرے لگائے جا رہے ہیں یا ممکن ہے کہ اقلیتوں کو جذباتی ہیجان میں مبتلا رکھنے کی یہ کوئی تدبیر ہو، بہر حال نعرہ زنوں کا انداز قد ہر لباس میں عریاں ہیں، خواہ وہ آئین کا لباس پہن کر آئیں یا سماج اور معاشرہ کی اصلاح کا، لیکن اگر ان میں سے کوئی فرد، دین خداوندی میں ترمیم وتبدیلی کا نعرہ بزعم خود کوئی اصولی بات سمجھ کر لگا رہا ہے تو اس اجتماع کے موقع پر اپنے تمام علماء کرام اور دانشوران محترم کی طرف سے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنے اس عقیدے پر اٹل ہیں کہ جس طرح خدائے بزرگ وبرتر نے اپنے نظام خلق کو اپنی سچی فطرت پر قائم کیا ہے جس میں تبدیلی ناممکن ہے کہ **لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ** اسی طرح اس نے اپنے نظام امر کو بھی جس کا نام دین ہے، اپنی اسی فطرت کے اساس پر قائم کیا ہے، اس لئے اس میں بھی

تبدیلی ممکن نہیں، لَاتَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ.

یہ قانونِ فطرت ہے اور فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی، اگر کوئی زمین، آسمان، چاند، سورج اور کواکب و نجوم کونہیں بدل سکتا، صرف اس سے فائدہ ہی اٹھا سکتا ہے تو دین کے کلیات و جزئیات، احکام و آداب، اخلاق و عقائد، معاملات و معاشرات اور اجتماعی قوانین سے لے کر عائلی قوانین تک کی فطری حدود کو بھی نہیں بدل سکتا، وہ صرف فائدہ اٹھانے کے لئے اتارے گئے ہیں، بدلنے کے لئے نہیں لائے گئے، بدلنے کی جب بھی سعی لاحاصل کی جائے گی تو خدائی حدود تو اپنی ہی جگہ قائم رہیں گی، لیکن بدلنے والوں کے حق میں سماج کا ڈھانچہ بکھر کر غلاظتوں اور گناہوں کا ڈھیر ہو جائے گا، جس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح خدا کی اس کائنات کا نظامِ خلق نہایت ہی مرتب اور فطرت کے اصول میں بندھا ہوا ہے، جس کی کوئی ایک جزئی بھی عرش سے لے کر فرش تک اور ثریا سے لے کر ثریٰ تک بے جوڑ نہیں، اسی طرح اسی خدائے برتر و توانا کا نظام امر یعنی شریعت بھی غیر مرتب یا بے جوڑ نہیں بلکہ اس کی بھی ایک جزئی اپنے ہی فطری اصولوں سے بندھی ہوئی، اپنی فطری تنظیم سے وابستہ ہے اور ایک ہی فطرتِ الٰہی ہے جو ان دونوں نظاموں کو تھامے ہوئے، جو فطرت اس کے کام میں کارفرما ہے، وہی اس کے کلام میں بھی کارفرما ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ.

جس طرح اس نظامِ خلق میں یہ اربوں، کھربوں انفرادی جزئیات، حیوانات کی ہوں یا نباتات کی، جمادات کی ہوں یا مجردات کی، اپنی اپنی انواع سے جڑی ہوئی ہیں، جیسے حیوانات میں مثلاً: شیر، بکری، اونٹ، گھوڑا، گدھا وغیرہ حیوان کی جنس سے وابستہ ہیں، نباتات کے بے شمار افراد، درخت، گھاس، جھاڑ، بیل وغیرہ اپنی اپنی انواع سے جڑے ہوئے ہیں اور جمادات کے اَن گنت افراد اینٹ، پتھر، ریت، چونا، سمینٹ، لوہا، سونا، چاندی، پہاڑ اور دریا وغیرہ اپنی اپنی جمادی انواع سے وابستہ ہیں، اسی طرح یہ ساری انواع، حیوان و نباتات و جماد مل کر ایک اوپر کی کلی جنس کے نیچے جمع ہو جاتی ہیں، جس کا نام جسم ہے، کہ یہ ساری کی ساری نوعیں جسمانی ہی ہیں۔ پھر جسم کے دوش بدوش کچھ غیر جسمانی یا بے حد لطیف الاجسام مفردات کی لطیف انواع ہیں، جو اپنی لطافت کے سبب ان نگاہوں سے دیکھی نہیں جاسکتیں، جیسے ارواح، ملائکہ، جنات وغیرہ۔ یہ سب مل کر ایک نہایت ہی وسیع اور عام تر جنس کے نیچے آجاتی ہیں، جس کا نام جوہر ہے، جو بلا کسی غیر کے سہارے خود سے قائم ہیں، بلکہ دوسرے کے سہارے قائم ہیں۔ جیسے ان جنسوں کے افعال و خواص، رنگ و بو، کیف و کم اور مقدار وغیرہ، پھر یہ سب جوہری اور عرضی موجودات مل کر ایک

نہایت ہی وسیع حاوی اور محیط کائنات جنس کے نیچے آجاتی ہیں، جس کا نام وجود ہے کہ ان کائناتوں میں اس سے بڑا احاطہ کسی کلی کا نہیں، جو ساری موجودات کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے اور ظاہر ہے کہ وجود عین ذاتِ حق سے (جل ذکرہ) اس کی ذات اور وجود الگ الگ نہیں ہیں، کہ وہ اس کا جدا ہو جانا ممکن ہو، اس لئے یہ ساری کائناتیں وجود کے واسطہ سے اس وجودِ مطلق اور موجودِ اصلی سے وابستہ ہو جاتی ہیں، جس سے ان سب کا ایک ہی سرچشمہ ثابت ہوتا ہے اور اسی پر ان کائناتوں کے وجود کی انتہا ہو جاتی ہے جیسے قرآنِ کریم نے دو لفظوں میں کھول دیا ہے " وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَهٰی (بلاشبہ تیرا رب ہی منتہیٰ ہے) جس پر ہر موجودگی کی انتہاء ہوئی ہے، کہیں فرمایا " اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی (بلاشبہ تیرے ہی پروردگار کی طرف ہر چیز کا رجوع ہے) کہ وہ اسے چھوڑ کر ادھر ادھر نہیں جاسکتی، لیکن ساتھ ہی ان موجودات پر کائناتوں کی انتہاء نہیں ہو جاتی، بلکہ موجودات سے کہیں زیادہ ان گنت معدومات بھی ہیں، جنہوں نے ابھی تک وجود کا جامہ نہیں پہنا، مگر ان کا موجود ہونا ممکن نہیں اور وہ کائنات خلق میں شامل ہو سکتی ہیں۔ اس لئے یہ ساری موجودات و معدومات مل کر ایک اور انتہائی حاوی و شامل اور محیط الکل کلی کے نیچے آئی ہوئی ہیں، اس جنس کلی کا نام علم خداوندی ہے، جو موجود و معدوم سب پر حاوی ہے، پس موجودات عینی شکلوں میں موجود ہیں اور معدومات علمی صورتوں میں علم الٰہی میں سمائی ہوئی ہیں۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو ان دو کلموں میں ارشاد فرمایا ہے " وَ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا " (اور اللہ جل ذکرہ ہر چیز پر خواہ وہ موجود ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو) اپنے علم سے محیط ہے۔ بہر حال اس مرتب نظام کائنات کی کائناتوں سے جس کی انتہاء علم الٰہی پر ہے، ہم فائدہ تو ضرور اٹھا سکتے ہیں اور ضرور اٹھانا چاہئے، جبکہ یہ ہمارے لئے بنائی گئی اور مسخر کی گئی ہیں، لیکن انہیں بدل ڈالنے کا تصور جنون اور حماقت سے کم نہیں جبکہ فطرت علمی ہو یا عملی نہ بدلنے کی چیز ہے نہ بدلی جاسکی ہے " لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (اللہ کی خلقت میں تبدیلی ناممکن ہے، یہی اس کا طریقہ اور مستحکم دین ہے، لیکن انسانوں کی اکثریت جہالت میں پھنسی ہوئی ہے) ٹھیک اسی فطرت پر خدا کا نظام امر بھی ایک عجیب حکیمانہ ترکیب اور تنظیم کے ساتھ قائم ہے، جس میں مسائل جزئیہ کے افراد بھی ہیں اور ان پر انواع بھی، پھر انواع کے اوپر اجناس اور اجناس پر جنس الاجناس کا احاطہ بھی، جس سے دینی مسائل کی کثرتیں سمٹ کر وحدتوں کی طرف اور وحدتیں سمٹ کر وحدت الوحدات کی طرف رجوع کئے ہوئے ہیں اور دین مثل حسّی کائنات کے ایک نہایت ہی منظّم اور مرتب روحانی کائنات کی شکل میں جلوہ گر ہے۔

دین کے لاکھوں افراد مسائل کو ان کی انواع سمیٹے ہوئے ہیں، مثلاً نماز ایک نوع ہے، جس کے ہزاروں مسائل ہیں اور ان پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، حج ایک نوع ہے، جس کے ہزاروں مسائل ہیں، جن پر سینکڑوں تصنیفیں ہیں، مالیات ونفقات ایک نوع ہے، جس کے نیچے ہزارہا جزئی مسائل ہیں اور ان پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں، زکوٰۃ، صدقات، خیرات، ہدایا اور قرض وامانت وغیرہ مستقل نوعیں ہیں جن کے نیچے ہزاروں مسائل آئے ہوئے ہیں، تدبیرِ منزل ایک مستقل نوع ہے، جس کے نیچے ولادت، رضاعت، تربیت اور روابط وعلائق کے ہزارہا مسائل ہیں۔ نکاح، طلاق، خلع وغیرہ کی انواع کے نیچے ہزارہا مسائل جمع ہیں، پھر شہری زندگی کے عمومی روابط اور علائق کی انواع ہیں جن کے نیچے طلاق، نکاح وغیرہ کے ہزاروں مسائل ہیں، پھر انتظام مملکت اور تعزیرات ایک نوع ہے، جس کے نیچے ہزاروں سیاسی اور اجتماعی مسائل آئے ہیں، پھر بین الاقوامی معاملات کے لئے خلافت ایک مسقل نوع ہے جس کے نیچے ہزاروں مسائل ہیں اور جن پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور پھر ان تمام انواع کے اوپر اجناس ہیں اور اجناس کو پھر ایک جنس کلی نے اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے۔

بہرحال دینی انواع: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، طلاق، مہر، خلع، ولادت، رضاعت، تربیت، لین دین، بیع وشراء، وقف وہبہ، قرض، امانت، اجارہ، حدود، قصاص، کفارات وغیرہ کے لاکھوں جزئیات مسائل اور ان کی بے شمار عملی صورتیں اور نمونے ہیں جن سے دینی کتابیں اور کتابوں سے دنیا کے لاکھوں کتب خانے بھرے ہوئے ہیں، جن سے امت کی خصوصیت ہی کثرت تصنیف قرار پا گئی، جیسا کہ بعض علماء امت نے دعویٰ کیا ہے۔

پھر ان انواع کے اوپر اجناس کلیہ ہیں، جن کے نیچے یہ تمام نوعیں آئی ہوئی ہیں، جیسے: اخلاق، اعتقادات، عبادات، منزلیات، معاملات، معاشرات، مدنیات، اجتماعیات اور آفاقیات وغیرہ، پھر ان ساری مصالح کلیہ کا تعلق صفاتِ خداوندی سے ہے، جن کے تقاضوں سے یہ علل واسرار اور ان سے یہ احکام نمایاں ہوئے اور پھر ان تمام صفات الٰہی کا تعلق ایک ہی کلی الکلیات ''علم الٰہی'' سے ہے، جس کے واسطہ سے یہ سارا نظام ذاتِ بابرکات الٰہی سے جڑ جاتا ہے اور خلق وامر دونوں میں توحید الٰہی کا عقیدہ فطری طور پر خود بخود ثابت ہو جاتا ہے، جو انبیاء علیہم السلام کا موضوعِ بعثت ہے۔ ''**كَانَ دِيْنُ الْاَنْبِيَاءِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه**'' (سارے انبیاء کا دین لا الٰہ الا اللہ ہے) ہی رہا ہے۔

اس لئے اسلام نے توحید کو محض شرعیات ہی کی حد تک محدود نہیں رکھا، بلکہ عالم خلق میں بھی ایک فعل،

ایک ایک قول اور ایک ایک نیت اور ایک ایک ظاہری ہیئت تک وسیع کر کے توحید عملی کا ایک مستقل نظام قائم کیا ہے تاکہ زندگی کے ہر موڑ پر اور اس کی ایک ایک نقل و حرکت پر بندہ اپنے خدائے واحد کی طرف رجوع رکھے اور شرک کی آلائشوں سے ملوث نہ ہو۔

بہر حال عرض یہ کرنا ہے کہ جیسے کائنات خلق اس کے فطری نظام میں دخل اندازی انسانیت کی تباہی ہے اور جس طرح کائنات خلق اور اس کی اشیاء میں ترمیم و تنسیخ کا تصور، یا عمل شرک اور خلافِ توحید ہے، اسی طرح اس کائنات روحانی اور اس کے کسی جزوی مسئلہ میں بھی انسانی ترمیم و تبدیلی ایک کھلا شرک ہے، جسے مٹانے کے لئے انبیاء معصومین مبعوث ہوئے۔

اس لئے جیسے کائنات خلق سے ہم فائدہ ہی اٹھا سکتے ہیں، اسے بدل نہیں سکتے۔ اسی طرح کائنات امر یعنی شرائع سے بھی، فائدہ ہی اٹھا سکتے ہیں اور اٹھانا چاہئے، اسے بدل نہیں سکتے۔ اگر کسی ایک جزئی میں تغیر و تبدل کا تصور باندھا جائے گا، تو یہ جزوی ترمیم نہ ہوگی، جس کا ایک چھوٹا سا جزو یہ جزئی ہے، بلکہ شریعت کے نظام عمومی کا رشتہ، جبکہ ساری انواع و جزئیات میں پرویا ہوا ہے تو جس دانہ کو بھی اپنی جگہ سے نکال دیا جائے گا، تو صرف وہ جزئی خرابی نہ ہوگی، بلکہ پوری مالا اور ہار کی بدزیبی اور بدنمائی ہوگی، جس سے ہار کی اصلی حسین شکل و صورت باقی نہیں رہ سکتی اور اسی درجہ میں روحانیت کی تباہی سامنے آجائے گی، جس کی صلاح و فلاح کے لئے یہ دین اتارا گیا ہے بلکہ تغیر و تبدل کر ڈالنے کے ناپاک عمل کے مرادف ہوگا، جو ناممکن ہونے کے علاوہ انتہائی خباثت اور خیانت ہوگی کہ آدمی بندگی کی حدود سے نکل کر خدائی حدود میں مداخلت کرنے کی شرارت کا مرتکب ہو، جبکہ پورے نظام دین و دیانت کا خاکہ، بحیثیت مجموعی ایک متصل واحد شئے ہے، اس کے کسی جزو کو چھیڑنا پورے نظا کو چھیڑنا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک حوض کے متصل واحد پانی کی سطح پر اگر ایک سمت میں بھی، ایک ڈھیلا پھینک کر اسے ہلا دیا جائے تو ناممکن ہے کہ یہ ایک سمت کی حرکت لہر بن کر درجہ بدرجہ دوسری طرف نہ پہنچے، اسی طرح یہ تمام اسلامی شعبے اپنے اپنے اصول وکلیات کے تحت اور پھر یہ تمام اصول کلیات اپنے باہمی ربط سے جڑ کر، ایک ہی کلی الکلیات کے تحت، باہم ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے اور گتھے ہوئے اور متصل واحد ہیں کہ دین کے کسی ایک چھوٹے سے گوشے کے حقیر سے حقیر تغیر کا اثر بھی پورے نظام کے ڈھانچہ پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (۲)

اس خطاب میں حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے ملّی اتحاد کی اہمیت کلمۂ طیبہ کی روشنی میں واضح کرتے ہوئے دین اسلام کی حقانیت پر بحث کی، نیز اسے دین فطرت قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ مذہب

خالق کائنات کی مشیت سے تیار ہوا ہے، جس میں ہر زمانے کی تبدیلیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہ شان ودیعت کردی ہے کہ اس میں کسی ترمیم واضافے یا تبدیلی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس کے باوجود جو طبقہ اس میں اصلاح یا تبدیلی کی آواز بلند کرتا ہے، اس کے بارے میں حضرتؒ نے ارشاد فرمایا:

''ہم اپنے دین ودانش کے لحاظ سے یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی تحریک کوئی اصلاحی تحریک ہے بلکہ دوربین سے دیکھئے یا خوردبین سے صاف نظر آئے گا کہ یہ ایک سیاسی تحریک ہے جو ہندوکوڈ بل سے پیدا ہوئی ہے''۔

پھر حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے خطبہ میں مذاہب عالم میں وضعی قوانین میں خرابیوں اور ان کی ناکامیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ''لاتبدیل لکلمات اللّٰہ'' کہ یہ قانون فطرت ہے اور فطرت میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

اس طرح دین اسلام میں عبادات، معاملات، معاشرت اور دیگر موضوعات پر جو جامع احکام اور مضامین ہیں ان کی تشریح بھی فرمادی اور مسلم پرسنل لاء کی حیثیت اور اہمیت کے تمام پہلو روشن کردیئے۔

اس خطبۂ صدارت میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی عبقری صلاحیتوں کے نمونے موجود ہیں۔

---

(۱) پروفیسر کے، ایم کپڑیا، میرج اینڈ فیملی اِن انڈیا، ص: ۱۵، بحوالہ اخبار عزائم لکھنؤ، ۱۴رنومبر ۱۹۷۲ء

(۲) آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام، ص: ۲۴

............❖............

مہتمم کیسا ہو؟

مولانا قاری ابوالحسن صاحب اعظمی
سابق شیخ القراء، دارالعلوم دیوبند

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا اس وقت سے مدارس کی دیکھ بھال اور ان کے نظم وانتظام سے متعلق حضرات کے لیے گوش آشنا لفظ ''ناظم'' تھا۔ لفظ اہتمام کا معنی پیش آمدہ امور کی انجام دہی کے لیے ارادہ اور فکر کرنا مدرسہ کے ناظم کی جگہ ''مہتمم'' کے بھاری بھرکم لفظ سے ۱۹۵۲ء کے قریب آشنائی ہوئی جب مدرسہ بیت العلوم سرائے میر اعظم گڑھ کے جلسہ سالانہ کے اشتہار میں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا اسم گرامی نظر نواز ہوا۔

اللہ اللہ اسم بامسمی ذات ایسی کب آئی ہوگی، جسم وجسامت ہو یا صوت وصورت، لب ولہجہ ہو یا حرکات وسکنات، نام کی پاکیزگی اور طہارت ہر وصف کا جزو اعظم۔

لفظِ اہتمام، کوئی معمولی لفظ نہیں ہے کہ کسی بھی مکتب اور مدرسہ کے ساتھ اسے چسپاں کر دیا جائے، اس کے لیے تو کوئی جامعہ اور کوئی عظیم ادارہ ضروری ہے۔ کسی ابتدائی مدرسہ اور معمولی تعلیم گاہ کے ناظم کو ''مہتمم'' کا لفظ دے دینا خود اس لفظ کی تخفیف ہے۔

کسی مرکزی ادارہ کے مہتمم کے لیے کچھ ضروری اوصاف ہوتے ہیں، اگر مہتمم ان اوصاف سے متصف نہ ہوگا تو ادارہ کی عظمت اور مرکزیت کو خاک میں ملائے گا، اور لفظ مہتمم کی عزت کو بھی داغ لگائے گا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اختصار کے ساتھ چند ضروری اوصاف کی جانب اشارہ کر دیا جائے۔

(۱) مہتمم کے لیے صرف عالم اور کسی درسگاہ کا فاضل ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ نہایت جید الاستعداد اور بھرپور ہمہ جہتی صلاحیتوں کا حامل ہونا ضروری ہے، ایسا کہ میزان سے بخاری تک تمام علوم کی جامع تدریسی

صلاحیت رکھتا ہو، تا کہ بوقت ضرورت اگر کسی بھی جماعت کا استاذ غیر حاضر ہو تو مہتمم اس کی کتاب با سلوب احسن پڑھا سکے، اور استاذ کی غیر حاضری سے تعلیم متاثر نہ ہو، نظم و اہتمام کی یہ بھی ایک اہم ضرورت ہے۔ خوب واضح رہے کہ مدرسہ دراصل نام ہے تعلیم و تعلّم اور تدریس و تدرس کا، تدریسی نظام میں اختلال کے بعد کیا باقی رہ جاتا ہے۔

(۲) اگر طلبہ میں کوئی غلط رَو یا نازیبا رجحان پیدا ہو رہا ہو تو مہتمم اپنے مؤثر خطاب عالمانہ اور حکیمانہ اندازِ بیان کے ذریعے اس غلط رُخ سے انھیں پھیر سکے۔

(۳) ایسی عمدہ فہم و فراست کا مالک ہو کہ بوقتِ ضرورت اساتذہ اور تعلیمی و تدریسی عملہ کو افہام و تفہیم کے ذریعے انتشار و افتراق سے روک کر انھیں باہم متحد رکھ سکے، اپنی اس بدرجۂ اتم صلاحیت کے ذریعہ مدرسہ میں اتفاق و اتحاد کی فضا قائم رکھ سکے، ایسی پرسکون فضا تعلیم و تدریس کے لیے ازبس ضروری ہے۔

(۴) واردین و صادرین جو مدرسہ کی زیارت کے لیے باہر سے آتے جاتے ہوں ان کے سامنے مدرسہ کا ایسا جامع اور دلکش تعارف پیش کر سکے جس سے خارجی دنیا سے ربط و ارتباط مضبوط رہے۔

(۵) وعظ و نصیحت اور تقریر و خطابت کی بھرپور صلاحیت و قابلیت رکھتا ہو تا کہ وقتاً فوقتاً باہر سے آنے والی دعوت کو قبول کر کے اسفار کر سکے اور اپنے اس وصف کے ذریعہ مدرسہ کا کاز اور حلقۂ تعارف وسیع تر ہو سکے۔

(۶) مہتمم کے لیے وصفِ مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کی صلاحیت کا حامل ہونا بھی ضروری ہے، تا کہ بوقتِ ضرورت اس رُخ سے بھی مدرسہ کا تعارف قوم و ملت کے سامنے پیش کر سکے اور اس سے ملت کو فائدہ بھی پہنچے۔

(۷) مہتمم کے لیے وصفِ تدبر سے موصوف ہونا ضروری ہے، تا کہ پیش آمدہ مسائل کا جذبات سے بالاتر ہو کر صحیح رُخ سے جائزہ لے سکے اور مدبرانہ فیصلہ کر سکے۔

(۸) مہتمم کے اندر وصف رافت اور مروّت بھی بے حد ضروری ہے تا کہ تدبر اور تفکر کے ساتھ کئے گئے حاکمانہ فیصلے حکیمانہ انداز میں نافذ کئے جاسکیں جو ظلم و زیادتی سے پاک ہوں۔

(۹) مہتمم کو وصفِ جرأت سے موصوف ہونا بھی ضروری ہے تا کہ اپنے مدبرانہ فیصلہ، بے لاگ اور بے خوف ہو کر نافذ کر سکے، جرأت نہ ہو گی تو بہتر سے بہتر فیصلے۔ فقدانِ ہمت کے باعث ٹھنڈے بستے میں پڑے رہ جائیں گے۔

(۱۰) دورِ حاضر میں ’’سیاست‘‘ جس چیز کا نام ہے وہ بے حد گندی چیز ہے، مدرسہ کے مہتمم کے لیے تمام تر سوجھ بوجھ اور علم وفضل کے ساتھ دورِ حاضر کی بدنام زمانہ سیاست کی گندگی سے خود کو پاک وصاف اور اس سے دور رکھنا بے حد ضروری ہے، ورنہ تحزّب اور گروہ بندی (جو سیاست کا مزاج ہے) سے مدرسہ کو محفوظ نہ رکھ سکے گا۔

خوب سمجھ لینا چاہیے کہ مدرسہ اور تعلیم گاہ کا ماحول کامل طور پر یکسوئی کا طالب ہوتا ہے جب کہ سیاسی زندگی یکسر شورش اور ہلچل کا نام ہے۔ ’’علمی زندگی کی جمعیتیں اور سیاسی زندگی کی شورشیں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں پنبہ وآتش میں آشتی محال ہے‘‘۔

علمی زندگی اور عالمانہ ماحول میں سیاست کی آمیزش گویا متاعِ علم وفکر کو برقِ خرمن سوز کے حوالہ کرنا ہے۔ علمی مزاج کے حامل بابائے سیاست مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے مذکورہ بالا الفاظ میں خود اپنا ماتم کیا ہے۔

(۱۱) ایک دینی مدرسہ اور مرکزی ادارہ کے منصب اہتمام پر فائز شخص کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ نسبتِ احسانی کا حامل ہو۔ یعنی ایک عرصہ دراز تک کسی شیخ باطن کی صحبت میں رہ کر رذائل کے ازالے پر سخت محنت کے ذریعے اپنے باطن کو مزکی اور خصائل حمیدہ سے مجلّی کیے ہوئے ہو، خوب واضح رہے کہ مدارس کے اس نظام اور ساری تعلیم وتعلّم کا مقصد ہی حقیقتاً تربیت کے ذریعے تزکیہ اور نسبتِ احسانی کا حصول ہے، یہ نہیں تو کچھ نہیں، سارا نظامِ تعلیم محض لغو اور بیکار ہے۔

اوپر قدرے اختصار کے ساتھ منصبِ اہتمام کی اہمیت کے پیش نظر گیارہ اوصاف ذکر کیے گئے اب ہم ذیل میں ان گیارہ اوصاف کے حوالے سے حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کی طرف مختصر اشارات کی کوشش کریں گے۔

جن مدارس کو خاص طور پر مرکزی اداروں کو ایسے اوصاف کی حامل شخصیات دستیاب ہوں گی، حقیقتاً وہی ادارے ترقی کرسکیں گے اور خاطر خواہ بہتر نتائج کے حامل ہوں گے۔

ہم جب ان اوصاف کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ کس طرح یہ ساری چیزیں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے مزاج وطبیعت اور سرشت وجبلت میں داخل اور رچی بسی تھیں۔

دارالعلوم دیوبند جسے الہامی مدرسہ کہا جاتا ہے، خاص طور پر ملتِ ہندیہ پر اللہ رب العزت کا فضل وانعام ہے۔ اس مرکزی ادارہ کے انتظام وانصرام کے لیے ایسی ہی ہمہ صفت موصوف شخصیات میسر رہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مہتمم صاحبؒ صحیح معنی میں نمونۂ اسلاف اور یادگارِ اکابر تھے، حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کے علوم نقلیہ وعقلیہ کے حقیقی جامع اور وارث اور حکمتِ قاسمی کے کامل امین تھے۔

(۱) علمی جامعیت

چناں چہ آپ نے علمی جامعیت میں کمال کے ساتھ درس وتدریس سے رابطہ رکھتے ہوئے دارالعلوم دیو بند میں حدیث کے تدریس اور ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے کراماتی درس کو جاری رکھا، اور یہ وہ خصوصی کتاب تھی جس میں آپ کے حکیمانہ ذوق کے اسرار اور جواہر خوب خوب نمایاں ہوئے اور پڑھنے والوں کو بیک درس ایسے ایسے یواقیت اور لآلی ہاتھ آجاتے جن کا میسر آنا مدتوں کی محنتوں کے بعد بھی مشکل ہوتا۔ ابتداء سے انتہاء تک ساری ہی کتابوں کی تدریس کا سلسلہ رہا، دارالعلوم میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا درس تو بہت ہی مشہور اور مقبول تھا۔

۱۳۹۷ھ کے درمیانِ سال میں جب شیخ الحدیث حضرت مولانا شریف الحسن صاحب دیو بندیؒ کا وصال ہوا تو فوری طور پر بخاری شریف جلد اوّل اور ترمذی شریف جلد اوّل کا درس حضرت مہتمم صاحبؒ نے شروع کرا دیا سلسلۂ درس کی برکات کو موقوف ہونے سے بچا لیا اور جب تک متبادل انتظام نہ ہوا آپ نے ان دونوں اہم ترین کتابوں کا درس دیا۔ آپ کے درس حدیث کے نکات اور علمی حقائق اور معارف اس وقت ایک کتاب کی شکل میں طبع بھی کر دیے گئے تھے۔

(۲) مؤثر اور حکیمانہ انداز

آپ کے طویل ترین دورِ اہتمام میں دارالعلوم متعدد بار بڑی ہلچل اور شورش سے گذرا مگر اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صفات وصلاحیتوں سے نہایت ہی مدبرانہ اور حکیمانہ انداز پر ان سب ناپسندیدہ حالات کو بطریق احسن نمٹایا اور دارالعلوم کو زبردست بھونچالوں سے باہر نکالا۔ (دارالعلوم کی تفصیلی تاریخ اس کی گواہی دے گی)

(۳) فہم وفراست

آپ کی فہم وفراست سے دارالعلوم کے مختلف اور متنوع عقدۂ لاینحل بڑی خیر وخوبی سے حل ہوئے اور باوجود مختلف طبائع اور مزاج کے اساتذہ اور کارکنان میں ایک ایسا اتحاد اور ایسی باہمی یکانگت کا نظارہ دیکھنے میں آیا اب جن کے دیکھنے کو نگاہیں ترستی ہیں۔

(۴) دل کش اندازِ بیان وتعارف

حضرت مہتممؒ کے دورِ مسعود میں اہل علم وفضل واردین وصادرین کا جو سلسلہ نظر آتا ہے اور آپ کے دلکش

تعارف کی بدولت ادارہ کی علمی حلقہ میں جو وسعت نظر آتی ہے وہ بس آپ کے دور کی خصوصیت ہو کر رہ گئی۔

۱۳۵۵ھ میں جامعہ ازہر مصر کے مخصوص اساتذہ پر مشتمل وفد کی حاضری ہو، اور امیر وفد شیخ ابراہیم الجبالی کا آپ کے اہتمام میں دارالعلوم کی علمی حیثیت اور کوائف پر مسلسل اظہارِ تعجب ہو، یا ۱۳۵۸ھ میں سلطان ابن سعود کی حکومت کی جانب سے مطبوعہ اہم کتابوں کا گراں قدر ہدیہ ہو، یا اسی سال حضرت مہتمم صاحبؒ کے یادگار سفرِ افغانستان کی برکات بشکل ''باب الظاہر'' ہو۔ یا ۱۳۷۱ھ میں ایک مصری فاضل شیخ محمد ارشاد بن عبدالمطلب کی دارالعلوم میں تشریف آوری اور زیارتِ دارالعلوم کو اپنے لیے باعثِ فخر شمار کرنا ہو۔ یا ۱۳۷۳ھ میں شاہ سعود کا وارد ہند ہو کر دارالعلوم دیوبند کے ساتھ اظہار عقیدت ومحبت کرتے ہوئے پچیس ہزار روپے کا عطیہ ہو، یا اسی سال انور السادات مرحوم صدر متحدہ عرب جمہوریہ مصر کا دارالعلوم میں ورود اور حضرت مہتمم صاحبؒ کی شیریں زبانی سے دارالعلوم کے تعارف پر متاثر ہو کر صمیمِ قلب سے مبارک باد ہو، یا ۱۳۷۷ھ میں محمد ظاہر شاہ افغانستان کا دارالعلوم میں ورود مسعود ہو، یا ۱۳۸۲ھ میں جلیل القدر شامی عالم اور مشہور محقق، استاذ ''جامعہ حلب'' شام۔ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی آمد اور دارالعلوم کے بارے میں عظیم تاثرات ہوں، یا ۱۳۹۳ھ میں سعودی عرب سے آئے ہوئے دو وفود کا خراج تحسین ہو، یا ۱۳۹۵ھ میں شیخ الازہر عبدالحلیم محمود کی تشریف آوری اور دارالعلوم دیوبند کے عظیم کارناموں اور ہمہ جہتی خدمات کی مدحت سرائی ہو، یا ۱۴۰۰ھ میں دارالعلوم کے ''عالمی اجلاس صد سالہ میں عالمی پیمانہ پر حضرت حکیم الاسلامؒ کا اس انداز پر دارالعلوم دیوبند کو متعارف کرانے کا عالمی اعتراف وتصدیق کا بین الاقوامی مظاہرہ، اور جن کے ایک اعلان پر عالم اسلام کے گوشے گوشے سے پچاس لاکھ سے زائد افراد کا بے مثال مجمع، اور اس میں نہ صرف برصغیر بلکہ دنیائے اسلام کے اساطین واراکینِ سلطنت، علماء، مشاہیر اور عامۃ الناس کا دارالعلوم دیوبند کے وقار وجلال اور اس کی عظمت وسطوت اور عروج وکمالؒ کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ'' ہو۔ وغیرہ وغیرہ یہ سب آپ کے اسی حکیمانہ اور پرتاثیر اندازِ تعارف کے عظیم الشان، بے مثال اور تاریخی نتائج ہیں۔

(۵) وعظ ونصیحت اور تقریر وخطابت

حضرت حکیم الاسلامؒ کی حیات کے اہم ترین عناصر میں نہایت پرکشش پہلو یہ بھی ہے کہ آپ ایک بے مثال واعظ اور خطیب تھے، حقیقت یہ ہے کہ وعظ وتقریر میں علماء اور واعظین کی صف میں آپ کا کوئی مثیل اور ثانی نہ تھا، آپ بلاشبہ امتیازی مقام کے حامل تھے۔ اس میں آپ کو ایسا ملکۂ راسخہ حاصل تھا جسے موہبت الٰہی کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

دورانِ تقریر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک چشمہ رواں ہے، اور ایک ایسا آبشار ہے جو اوپر سے نیچے نہایت یکسانیت اور سکون کے ساتھ اپنے جلو میں علوم و معارف اور اسرار و حکم کو لیے بہہ رہا ہے۔

(۶) تصنیف و تالیف

مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ آپ نے زمانۂ طالب علمی سے ہی شروع کر دیا تھا اور یہ مبارک سلسلہ وفات کے قریب تک دراز رہا، آپ کی تصانیف علمی، دینی، تاریخی ادبی، معاشرتی اور تمدنی موضوعات پر ہیں جو سو کے قریب ہیں۔

اس رُخ سے آپ کی خصوصیت یہ تھی کہ موضوع خواہ کیسا ہی خشک ہو علمی وقار عالمانہ انداز، اسرار و حکم اور عارفانہ نکتوں سے خالی نہیں رہ سکتا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے منصبِ اہتمام پر فائز رہتے ہوئے، آپ ملک اور ملک سے باہر دور دراز کے دعوتی اور تبلیغی اسفار بھی کرتے، آپ کے اسفار کا دائرہ ایشیا سے گذر کر امریکہ، افریقہ اور یوروپ کے ممالک تک وسیع تھا۔ دارالعلوم دیوبند اور جماعتِ دیوبند کا عالمی پیمانہ پر اتنا عظیم الشان تعارف آپ ہی کے دورِ مسعود میں ہوا۔

(۷) تدبر اور مدبرانہ فیصلہ

دارالعلوم دیوبند ایک بین الاقوامی ادارہ ہے، آئے دن یہاں مختلف النوع مسائل کا انبار رہتا ہے جن سے مہتمم کو براہِ راست سروکار رہتا ہے اگر مہتمم تدبر و تفکر کے وصف سے خالی رہے گا تو کبھی مسائل کا صحیح تجزیہ اور اس پر مناسب فیصلہ نہیں کر سکے گا۔

حضرت مہتمم صاحبؒ نے مسائل پر کھل کر تجزیہ اور ان پر واضح رائے و مشورہ کے لیے ایک مشاورتی کمیٹی بنائی تھی، پیش آمدہ مسائل، تعلیمی و انتظامی ہوں، یا داخلی اور خارجی ہوں سب پر کھلے طور سے مشورہ فرماتے تھے۔

یہاں اختصاراً دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ایک بار درجۂ علیا کے اساتذہ کی مجلس بلائی، مسئلہ یہ تھا کہ دارالعلوم میں ایک قدیم دور کی خراب پڑی ہوئی کار تھی اور روز بروز زنگ آلود ہو کر مسخ ہوتی جا رہی تھی، حضرت مہتمم صاحبؒ نے اس کے بارے میں مشورہ طلب فرمایا، ایک بڑے استاذ کی زبان سے یہ نکلا کہ ’’حضرت میری حقیر رائے تو یہ ہے کہ یہ اکابر کے زمانے کی یادگار ہے، اسے یونہی (بطورِ تبرک) رہنے دیا جائے‘‘۔

بس پھر کیا تھا یکے بعد دیگرے سارے ہی حضرات نے اسی کو دہرایا اور تائید کردی، حضرت مہتمم صاحبؒ اپنے خاص انداز میں بیٹھے ہوئے خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔ آخر میں حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ (م ۱۹۹۵ء)، آپ اسی سال درجہ عُلیا پر فائز ہوئے تھے اور شاید مجلس میں یہ آپ کی پہلی شرکت تھی) سے استفسار فرمایا، مولانا موصوف نے اوّلاً نہایت تیکھے تیور کے ساتھ عرض کیا۔

''جی ہاں! حضرت بالکل بلکہ میری رائے تو یہ بھی ہے کہ اس کار کو ایک موٹے سے رسے سے باندھ کر دارالتفسیر پر لٹکا دیا جائے اور اس پر موٹے حروف میں لکھ دیا جائے ''یادگارِ اکابر'' پھر پہلو بدل کر عرض کیا ''حضرت! اکابر کی یادگار تو یہ دارالعلوم ہے اس کی تعلیمی و تربیتی پہلو کی جانب زیادہ سے زیادہ توجہ درکار ہے، میری مؤدبانہ گذارش ہے کہ اگر کل اسے یہاں سے ہٹانا ہو تو آج ہی اسے کباڑی کے پاس پہنچا دیا جائے شاید کچھ پیسے مل جائیں''۔

یہ سن کر مجلس پر سناٹا طاری ہو گیا، مگر حضرت مہتمم صاحبؒ کے چہرے پر ایک مسرت آمیز کیفیت نظر آئی اور فرمایا:

''مولانا وحید الزماں صاحب جو فرما رہے ہیں اسے نوٹ کر لیا جائے'' اور اسی کے مطابق فیصلہ صادر فرما دیا، حضرت مہتمم صاحبؒ کا یہ فیصلہ بلاشبہ ساری مجلس کے علی الرغم تنہا فرد واحد کی رائے پر ہوا، مگر چوں کہ صائب تھا اس لیے بغیر کسی توقف کے نافذ فرما دیا۔

ایک مثال انھیں صاحب سے متعلق ۱۴۰۰ھ میں دارالعلوم دیوبند کے عالمی اجلاس صد سالہ کے موقع پر مدرسہ کی تعمیراتی اصلاح کے لیے تمام اراکین کے مشوروں کے علی الرغم مولانا کیرانوی مرحوم کو، پورے اختیارات کے ساتھ تعمیرات کا نگراں مقرر کر دینا اور قدم قدم پر رکاوٹوں کے دوران مولانا کی مکمل حمایت و تائید جسے دنیا نے دیکھا یہ سب اسی تدبر اور مدبرانہ فیصلوں کے نتائج تھے۔

(۸) مروّت و رافت کا مجسمہ

حضرت حکیم الاسلامؒ شرافت اور مروّت کا مجسمہ تھے، اس سلسلے میں آپ کی حیات کے متعدد واقعات میں سے صرف ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت مہتمم صاحبؒ کے دفترِ اہتمام میں تشریف لانے کا ایک مخصوص راستہ تھا، مسجد دارالعلوم سے ہو کر ذیلی راستے سے دفترِ اہتمام میں تشریف لاتے تھے، ایک روز مسجد کا دربان اسٹول پر بیٹھا، پاؤں اس طرح پھیلائے ہوئے کہ راستہ بالکل بند۔ حضرت مہتمم صاحبؒ اپنے وقت پر مکان سے تشریف لائے اور

راستہ بند دیکھ کر بغیر کوئی آہٹ پیدا کئے راستہ بدل کر دفترِ اہتمام آ گئے، حضرت کو اس کا کوئی بھی خیال نہ آیا۔ لیکن ذمہ دار اور نگراں کو معلوم ہو گیا اور پھر اس غفلت کی دربان کو سزا ملی، دربان معافی کی ایک درخواست کے ساتھ حضرت مہتمم صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ پھر حضرت نے کیا کیا؟ ملاحظہ فرمایئے:

حضرت اس کی درخواست پر کچھ اس طرح ارقام فرماتے ہیں:

''مدرسہ کے یہ کارکن یقیناً شب بیدار ہوں گے، اسی شب بیداری کی وجہ سے اس وقت اتفاقاً ان کی آنکھ لگ گئی ہوگی اس لیے درگذر کیا جانا چاہیے'' (ہکذا)

اور پھر حضرت کی اس مروّت کے نتیجے میں وہ دربان بحال ہو گیا۔

(۹) جرأت اور قوتِ فیصلہ

کہا جاتا ہے کہ حضرت مہتمم صاحبؒ میں جرأت کی کمی تھی، راقم الحروف کے نزدیک یہ آپ پر ایک اتہام ہے اگر جرأت اس کا نام ہے کہ بے موقع اور اپنے بڑے اور بزرگ کے فرق مراتب اور ان کا پاس ولحاظ کئے بغیر بلند آواز سے زبان سے اُول فول نکال دیا جائے، تو اس معنی میں یقیناً آپ جری نہیں تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی بے جا جرأت بلکہ ایسی گستاخی اور بے ادبی سے آپ کو اللہ رب العزت نے محفوظ رکھا تھا۔

یہاں جرأت اپنے حقیقی معنی میں تھی یعنی کسی کا حق سلب کئے اور معمولی طور پر بھی کسی کے ساتھ زیادتی کئے بغیر قوت وہمت اور سلیقہ کے ساتھ حق دار کو اس کا حق پہنچانا۔ حضرت مہتمم صاحبؒ کی اس معنی میں جرأت مندی کی صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں آج سے پچیس چھبیس سال پہلے اساتذہ اور کارکنان کی تنخواہیں بے حد قلیل تھیں اور گرانی روز افزوں۔ اساتذہ وکارکنان کی درخواست پر آپ کا دردمند دل متوجہ ہوا، آپ نے ان سب درخواست دہندگان کی درخواست پر کس قدر مناسب انداز میں ایک نہایت ضروری اور صحیح فیصلہ صادر کرتے ہوئے سب کی تنخواہیں دوچند کر دیں اور سلیقہ ملاحظہ فرمایئے۔

ارقام فرماتے ہیں: ''بامید منظوری شوریٰ''

حضرت حکیم الاسلامؒ شب وروز دارالعلوم کے تمام اُمور سے نمٹتے تھے، سب کچھ آپ ہی کو دیکھنا ہوتا تھا ادارہ کی نشیب وفراز اور اس کی دقتوں، نزاکتوں اور ضرورتوں کو آپ کے سوا کون سمجھ سکتا تھا۔ اس وقت کے بعض اراکینِ شوریٰ نے اعتراض کرنے کی جرأت کی تو حضرت نے یہ ارشاد فرما کر ٹھنڈا کر دیا۔

''میں نے اس میں یہ بھی تو لکھا ہے ''بامیدِ منظوری شوریٰ'' آپ کو ناپسند ہو تو اسے رد کر دیں، مگر

بہر حال اس زمانے کے سارے ہی حضرات اراکین حضرت حکیم الاسلامؒ کے مقام ومرتبہ اور آپ کے عظیم الشان اور بے مثال کارناموں کو بچشمِ خود دیکھنے والے تھے، بالآخر منظور کرلیا۔

کوئی ''ضابطہ اور قانون'' کی دہائی دے سکتا ہے، بے شک مدارس اور اداروں کے لیے ضابطے اور قوانین ہوتے ہیں اور ان کی پابندی اور بجا آوری بھی ضروری ہوتی ہے، مگر خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ضابطہ سے بالاتر نہ سہی مگر حالات اور زمانہ کے تقاضے کے پیشِ نظر کبھی کبھی رابطہ بھی ایک لابدی شے بن جاتی ہے، البتہ وہ موقع اور محل کے مطابق ہو حضرت حکیم الاسلامؒ سے زیادہ موقع ومحل اور وقت کا تقاضا اور ضرورت کو کون سمجھنے والا ہوسکتا تھا، ایسے طویل ترین اور عظیم ترین تجربات کس کی حیات کا سرنامہ تھے؟

یہ تو صرف ایک مثال تھی، ایسی جرأت مندانہ اور مدبرانہ تجاویز اور فیصلے نہ جانے کتنے تھے۔

(۱۰) دورِ حاضر کی سیاست سے پاک

جیسا کہ آغاز میں عرض کیا گیا، دورِ حاضر کی بدنام سیاست، محض ایک شورش اور ہلچل کا نام ہے دورِ حاضر کی سیاست کے بارے میں ہوئے ''صاحبانِ فکر ونظر'' کے سیاسی فکر اور فیصلے سے دنیائے علم وفضل کو کیسے کیسے زخم ملے ہیں، ان زخموں کی ٹیس سے ایک دنیا کراہ رہی ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ حضرت حکیم الامتؒ کی بزمِ خیر وبرکت کے ایک درخشندہ ستارے تھے، حضرت حکیم الامتؒ ہی کی طرح، آپ نے بھی علم وفضل کی پرسکون اور سیدھی راہ کو سیاست کی پرشور اور پرپیچ وادیوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہونے دیا۔

دارالعلوم دیوبند کوئی علاقائی، کوئی صوبہ جاتی اور کوئی یک ملکی مدرسہ نہیں ہے اور یہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیم گاہ بھی نہیں ہے بلکہ یہ عالمِ اسلام کا بین الاقوامی ادارہ ہے۔ اس کی بین الاقوامیت کا تقاضا یہی ہے کہ اس ادارے کا سربراہ اور مہتمم موجودہ دور کی گھٹیا اور گھناؤنی سیاست کی تنگنائیوں سے بالاتر ہو، ایسے عالمی ادارے کا مہتمم کوئی ایسا ہی عظیم شخص ہو جو مذکورہ بالا اوصاف میں منفرد مقام رکھتے ہوئے ملتِ مسلمہ میں ہمہ جہت ہو اور ہمہ گیر مقبولیت کا حامل ہو، بلاشبہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے اسلاف کی طرح خود کو کسی سیاست کا اسیر نہ رکھتے ہوئے دارالعلوم کو اسی شانِ عظمت اور تاریخی کردار کے ساتھ ساٹھ سال کے طویل اور تاریخی عرصہ تک ہمہ جہتی ترقیات کی روشن شاہراہوں پر قائم رکھا، جس کا واضح اعتراف واقرار آپ کے مخالفین نے بھی کیا۔

دارالعلوم کی بے پناہ مقبولیت اور محبوبیت اور اس کی عالمگیریت کا محور اگر حکیم الاسلامؒ کا کمالِ علمی، اوصافِ ظاہری و باطنی، زہد وتقویٰ، دیانت وامانت، فہم وفراست میں منفرد مقام کا مالک ہونا تھا تو ٹھیک اسی طرح آپ کا دارالعلوم دیوبند کو ہر طرح کی سیاستوں سے بچا کر اس کو ہمہ جہت اور ہمہ گیر بنانا بھی تھا۔

دارالعلوم دیوبند جیسے عالمی اور بین الاقوامی ادارہ کے منصبِ اہتمام کے لیے جیسے ہمہ صفت موصوف اور جامع کمالات شخصیت کی ضرورت تھی حضرت حکیم الاسلامؒ ایسے ہی جامع کمالات تھے۔

اس عظیم ادارہ کے اس اہم منصب کی بلاشبہ آپ زینت تھے، یوں تو ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی!

لیکن حقیقت یہ ہے ''مہتمم دارالعلوم دیوبند'' کہلانے کی مستحق صرف آپ کی ذاتِ بابرکات تھی۔

فرحمه الله تعالیٰ رحمة واسعة ومغفرة کاملة

واٰخر دعوانا ان الحمدلله رب العلمین

والصلوة والسلام علی خاتم النبیین

............❖............

مقامات مقدسہ اور حکیم الاسلام

ایک حکیمانہ انفرادی اسلوب

مولانا ڈاکٹر عبدالرحمٰن ساجد اعظمی

تین مختلف جغرافیائی خطوں کے مسلمانوں کا دھڑکتا دل، دارالعلوم دیوبند۔ اسی دیوبند کی سرزمین پر دارالعلوم دیوبند کے معمار ثالث حکیم الاسلام محمد طیب صاحب (رحمه الله رحمةً واسعةً) نے دارالعلوم کے جشن صد سالہ میں تقریباً تین ملین فرزندان توحید کو علم کے نورانی سائبان کے فرحت بخش ہواؤں میں جمع فرمایا تھا۔

وہ ذات جو اپنی شیریں گفتگو، ادبی ذوق، علوم وافکار کے تنوع، خوبیٔ تعبیر، پاکیزگی نفس حلم وتواضع، اخلاق وروا داری اور بے شمار محاسن ومکارم کا مجموعہ تھی، جس کے سامنے اہل علم کی گردنیں ادب سے جھک جاتیں اور زبان بے ساختہ پکار اٹھتی۔ ع

اے تماشا گاہ عالم بس تجھے آداب ہے

جس کی زبان وزندگی جعلها كلمةً باقيةً في عقبه کی صورت میں آج آشکارا ہے۔ اس کی تصنیفات وتالیفات میں حل افکار کی بلند پروازی، اسرار وحکم کی فراوانی، اعجاز بیان کی نقش آرائی اور جمالیاتی ادب کا اس قدر ظہور ہے کہ بس! پڑھیئے، دیکھئے اور سوچتے رہیئے کہ کس طرح ایک مرکزی نقطہ سے اسرار وحکم اور فکر وفلسفہ کے چشمے پھوٹ کر سیل رواں بن جاتے ہیں۔ ع

چلا تو چلتا رہا وہ کسی ندی کی طرح

آیئے! چند لمحے کے لئے حکیم الاسلامؒ کی فکر ونظر اور اسلوب کی انفرادیت پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ

''تجلّی'' کے ایک مرکزی نقطہ سے جو ظہور میں نہیں۔ (گویا یہ ایک سسپنس ہے) اس کی عکس ریزی سے مقامات مقدسہ کی تقدیس کا حیران کن فلسفہ جو حکیم الاسلامؒ کی کتاب دل سے ''مقامات مقدسہ'' کی شکل میں منصۂ شہود پر آیا ہے اس میں انداز بیان کی اس ندرت پر غور کیجئے۔

گفتگو ایک مرکزی نقطہ متوازی زاویۂ خطوط پر شروع ہو کر ایک سے تین، تین سے تین، تین سے ایک، تین میں ایک اور پھر ایک سے انفسی، آفاقی، عقلی، حسی، فکری، جدلی، عدلی دلائل اور حقائق و معارف سے گھر بار ہو کر پھی تین کے ہندسے کی طرف لوٹ آتی ہے۔ اس طرح پوری کتاب ''تین'' کے عجیب و غریب فلسفہ کے درمیان دائر رہتی ہے۔ یہ گفتگو ہے ''مقامات مقدسہ'' کی جو ۶۰ے صفحات پر مشتمل ہے۔

گفتگو کا مرکزی سفر

انجیر و زیتون کی چھاؤں، قدس شریف، مرکزی انوارِ موسوی، طور سیناء کے پہاڑ، مرکز انوار محمدیؐ 'بلد امین' سے شروع ہوتا ہے۔ بلحاظ عظمت اور فضیلت و وقعت، انھیں تین کو کیوں منتخب کیا گیا؟ اور پھر انھیں تینوں مقاموں کو انسانی حسن و جمال، فضیلت و برتری اور سیرت کے کمال پر گواہ کیوں بنایا گیا؟ یا یوں کہئے کہ انسانی ہیکل کا حسن و جمال، کمال واعتدال اور جامعیت کا ادعاء ان تینوں مقامات کی گواہی سے کیسے ثابت ہوتا ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے یہ حقیقت سامنے رکھئے کہ ان ہی تین مقامات سے تین مقدس ترین شخصیتیں ابھریں۔ تین و زیتون کی چھاؤں میں آئے ہوئے قدس شریف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات نمایاں ہوئی۔ طور سیناء سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تقدس کا درس دیا۔ بلد امین سے خاتم النبیینؐ کی ذات اقدس کا آفتاب عالم تاب طلوع ہوا۔ مکان سے مکیں اور مکیں سے مکان مراد لیا جانا بقول ابن قیم فصحاء کے کلام میں مروج ہے اور بلاغت کا تسلیم شدہ اصول ہے۔ اس اصول کے مطابق تینوں مقامات سے مراد تینوں مقدس اشخاص ہیں، جو لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کے دعویٰ کی دلیل ہیں۔ یعنی اگر کوئی انسان کے احسن تقویم کے دعویٰ کی دلیل چاہے تو وہ ان تینوں ہستیوں کی ذات بابرکات کو دیکھ لے۔

تین مقامات مقدسہ کی تین شخصیات مقدسہ کے تاثیر و تصرف سے انھیں تین مقامات سے تین بڑی بڑی قومیں ابھریں، یہود و نصاریٰ اور مسلمین جو تین آسمانی ملتوں کی پابند اور ملت ابراہیمی کی شارح قومیں ہیں۔ اور انھیں تینوں کے عروج و زوال سے دنیا کے اس آخری حصہ کی تاریخ وابستہ ہے۔ انھیں اس دنیا میں وقت کتنا دیا گیا۔ اگر ان قوموں کے ظہور سے تا قیام قیامت ایک دن فرض کر لیا جائے تو بصراحتِ حدیث نبوی صحیح سے زوال تک کا وقت یہود کو دیا گیا۔ جس میں دینی اعتبار سے وہ برسر اقتدار رہے۔ زوال سے عصر

تک نصاریٰ کو ملا۔ اور عصر سے مغرب تک امت مسلمہ کے حق میں آیا گویا دنیا کی یہی تین قومیں آخری ہیں اور انھیں سے دنیا کی آخری تاریخ وابستہ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی دائرے کا خاتم ہی اس دائرے کی اصل بھی ہوتا ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے انہی مقامات کو اصل کی حیثیت سے چنا اور ان کی قسم کھا کر انسان کی جامعیت وفضیلت پر استدلال فرمایا۔

رہا یہ کہ دنیا کے آخری حصہ کو تین عالمی مرکزوں کی ضرورت کیوں تھی؟ دنیا کی آخری قوموں کو انھیں تین مقامات سے نشوونما دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور پھر ان تینوں میں امت محمدیہؐ کو فوقیت وفضیلت کیوں دی گئی اس پر مبسوط گفتگو کچھ اس طرح رقم ہوئی۔

تین فرق ہیں بنی اسرائیل اور اہل اسلام میں (۱) بنی اسرائیل میں نبوت وملوکیت عالمی انداز کی نہ تھی۔ (۲) دونوں کے حلقے اور دائرے عام حالات میں الگ الگ تھے۔ (۳) اسلام میں منصبِ اقتدار کو بنی اسرائیل کی طرح کسی خاص خاندان کی وراثت قرار نہیں دیا گیا بلکہ انتخاب اصلح کا اصول رکھا گیا۔ اور اس کی جھلک ''خلافت راشدہ'' کی شکل میں سامنے ہے۔

عالمی دین کے تین بنیادی عناصر

(۱) عبادت ودیانت (۲) سیاست ونظام اجتماعیت (۳) عسکریت وفوجی قوت، عبادت کو مقصد حیات بنا دیا گیا، سیاست وحکومت کو نظام عبادت کے لئے وسیلہ کی حیثیت دی گئی، تا کہ دین داخلی فتنوں پردازوں سے محفوظ رہے، عسکریت وفوجی قوت کو سرحدات کی حفاظت کے لئے رکھا گیا، تا کہ بیرونی دشمن اور دین کے مخالف نظام میں خلل نہ ڈال سکیں۔

ان تینوں عناصر کے لئے تین مراکز کی ضرورت : (۱) عنصر عبادت، امن وسکون، ذہنی یکسوئی خلوت پسندی وغیرہ چاہتی ہے۔ (۲) عنصر سیاست، سیاست وحکمرانی، ہمہ وقت جوڑ توڑ، داروگر، سزا وتعزیر، جنگ پسندی، ہنگامہ آرائی، وغیرہ چاہتی (۳) عنصر عسکریت، فوج کشی، نقل وحرکت، رعب نمائی، دہشت انگیزی، سرحدات پر نظر، آمادگی جنگ وپیکار، وغیرہ چاہتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تینوں متضاد عناصر ایک مرکز میں جمع نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ان کے تین ہی مرکزی مقامات کو عالمگیر انداز سے حسب مناسبتِ مقام پوری دنیا کے لئے وضع فرمائے۔

مرکز دین وعبادت مکہ کو بنایا۔ مرکز سیاست وشوکت، قدس شریف کو قرار دیا، مرکز تحفظ وعسکریت طور سیناء کو رکھا۔ ان تینوں عناصر کی اجتماعیت کے بغیر نظام دنیا کی ویرانی لاریب یقینی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ کی

حکمت ومشیت کا تقاضا ہوا کہ دنیا کی تین بڑی قوموں، یہود ونصاریٰ اور مسلمین کی آثار کو جو انوار موسویؑ، انوار عیسویؑ، انوارِ محمدیؐ کے فیضان سے وجود یافتہ ہیں۔ ان کے ذریعہ ایسی جامع امت کی بنیاد ڈالی جائے جو پوری دنیا کی واحد امت ہو۔ اس لئے ان تینوں مرکزی مقامات مرکز موسویت، طور سینا، مرکز عیسویت، قدس شریف، اور مرکز محمدیت مکہ مکرمہ کی خصوصیات کا تجزیہ کر کے انھیں ایک ہی مرکزی نظام پر لا جوڑا۔ اور ان تینوں خاص خاص مرکزیتوں کو الگ الگ باقی رکھتے ہوئے بھی ایک ہمہ گیر مرکزی نظام خلافت سے وابستہ کر دیا۔ اور ان تینوں مرکزوں کی خصوصیات، ہمہ گیر تقدس وروحانیت پر رکھی۔

ہر سہ مقامات مقدسہ کی تقدیس کی تاریخی حیثیت، شرعی نقشہ، انقلاب احوال۔

بلد امین کی تاریخی حیثیت

حضرت ابراہیمؑ ہاجرہؓ اور اسماعیلؑ تینوں کا سفر حجاز، مقام آب زمزم پر تینوں کا ورود، ہاجرہ اور اسماعیل کی سکونت اور حضرت ابراہیم کا عراق وفلسطین کا سفر، فلسطین سے حجاز کے تیسرے سفر میں بیت اللہ کی تعمیر کا حکم۔

طور سینین کی تاریخی حیثیت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طور پر چالیس روز قیام، کلام ربانی کی گونج، موسیٰ کو شرف کلیمی، قانون الٰہی (تورات) کے الواح کی حوالگی، جنت کے ایک پہاڑ کا نام (طور) قومِ موسیٰؑ کا طور کی جانب قدرتی رجوع۔

قدس کی تاریخی حیثیت : حضرت عیسیٰؑ جیسے الوالعزم پیغمبر کی دعوت وتبلیغ کا مرکز۔

ہر سہ مقامات مقدسہ کی تقدیس کا شرعی نقشہ

مکۃ المکرّمہ

بلد امین کا تذکرہ زبانِ رسالت مآبؐ پر "إن احب البلاد الی الله مكة" (کنز العمال) اور "والله إنک لخير ارض الله" (کنز العمال) کے الفاظ میں آیا۔ اللہ کے لئے مکمل تواضع اور نیاز مندی کے ساتھ مکہ کی حاضری اعلان مغفرت کا سبب فرمایا گیا۔ پورے رمضان مکہ میں قیام وصیام کا بدلہ غیر مکہ کے ایک لاکھ رمضان کے برابر ہے، ہر دن اور ہر رات میں ایک مغفرت اور ایک شفاعت کا اعلان اور ہر دن میں گھوڑے کے دوہرے بوجھ کے برابر صدقہ کرنے کا ثواب، اور ہر دن میں ایک دعاء کی قبولیت (کنز العمال) مکہ میں انتقال سماء دنیا میں انتقال کے ہم معنی اور مکہ میں مرجانے والوں کو حق تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے دن امن والوں میں اٹھائے جانے کی خوش خبری (تفسیر عزیزی) دی گئی ہے۔

قدسِ شریف

بیت المقدس کے نام سے مشہور ہے جو بے شمار تقدیسی خصوصیات کا حامل ہے۔ مکہ میں مرجانے کا جو ثواب احادیث میں مذکور ہے وہی بیت المقدس کے بارے میں بھی مذکور ہے۔ کلی طور پر الحاد و دہریت کے برپا ہونے کی اس مقام سے نفی کی گئی ہے۔ وہاں کے باشندوں میں دینی حرارت اور ملّی غیرت کے ہمیشہ مشتعل رہنے کا اظہار فرمایا گیا۔ مزید برآں قرآن نے اس کی تقدیس پر ارض مقدس کہہ کر اپنی مہر لگا دی۔

طورِ سینین

احادیث میں اس کو جنت کا پہاڑ کہا گیا، روایت گو سنداً ضعیف ہے مگر تین وجہ سے اس میں قوّت ہے۔ (۱) فضائل میں توسّع کی گنجائش ہے۔ (۲) ضعیف حدیث بھی مستند تاریخی روایت سے کم نہیں۔ (۳) طورِ سیناء کی فضیلت پر قرآن کی شہادت موجود ہے۔

طور کی فضیلت یہ بھی ہے کہ وہ محلِّ نداءِ الٰہی مقامِ کلامِ خداوندی، جلوہ گاہِ تجلّی ربانی کے شرف سے مشرف ہے۔ ہر سہ مقامات مقدسہ کا یہ تھا عقلی، تاریخی اور شرعی نقشہ یا طبعی، تاریخی، تاثیری نقشہ، جن کے تقدس کے اثرات، یقیناً انسانوں کی پاکیزہ سیرت وصورت پر پڑیں گے۔ شمع اگر روشن ہے تو صرف خود ہی روشن نہیں بلکہ اپنے ماحول کے لئے روشنی بخش ہوتی ہے۔ اس لئے ہر سہ مقاماتِ مقدسہ کے لئے تین مقدّس ماحول بھی ناگزیر ہوئے۔ مکہ کے ماحول کا وَمَنْ حَوْلَهَا کے کلمہ سے قدس کے کلمہ کا بَارَكْنَا حَوْلَهُ کے کلمہ سے اور طور کے ماحول کا مَنْ فِي النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا کے کلمہ سے تعارف کرایا گیا۔ جن سے ان مقدس مقامات کے تین ماحول بھی ثابت ہوئے۔

تینوں مقامات کے تین ماحول:

مکہ کا ماحول

علمی اور شرعی آیات کی تبلیغ، انداز اور دعوت الی اللہ سے بنا۔ قدس کا موحول، تکوینی آیات سے بنا۔ طور سیناء کا ماحول، شؤنِ الٰہی کی جلوہ افروزی اور خدائی ندا کی برکات سے بنا۔

اِن تینوں ماحول کی جداگانہ برکتیں: (۱) مکہ کے ماحول کو عالمِ امر کی برکتیں دی گئیں، جن کا تعلق منشاء حق اور قانونِ خداوندی سے ہے۔ (۲) قدس کے ماحول کو عالم خلق کی برکتیں دی گئیں جن کا تعلق فعل حق

سے ہے۔ (۳) طورسیناء کے ماحول کو آثار وشئونِ حق کی برکتیں ملیں، جن کا تعلق احوال وکوائف کی نوع کا ہوتا ہے۔ ان تینوں ماحول کے لئے تین ماحول قریب اور تین ماحول بعید۔

مکہ کا ماحول قریب

حدودِ حرم کی سرزمین، جوامنِ عام اور عبادت کی سرزمین ہے، میقاتوں کی سرزمین کو بھی ماحول قریب کہا جاسکتا ہے۔

قدس کا ماحول قریب

بیت المقدس سے لے کر ہر چہار جانب بارہ میل تک ہے جو اس کے اندر مرجائے وہ بمنزلہ اس کے ہے کہ اُسے آسمانِ دنیا میں موت دی گئی ہو۔

طور کا ماحول قریب

وادیٔ طویٰ سے طورسیناء تک ہے، جس کا رقبہ ۲۵ ہزار میل ہے۔

قبول تقدیس کے لحاظ یہ تینوں ماحول خطوطِ متوازیہ کے مانند ہیں، یعنی محض تجلّی کی عکس ریزی کی بنیاد پر ان کی تقدیس کو مثلث متساوی کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ مگر تجلّی کے ایک زاویۂ قائمہ کی تقسیم کی بنیاد پر یا نقطۂ فیض کے فیضان کے لحاظ سے مراتب اور نوعیت برکات کا فرق ہے۔

تینوں مقامات مقدسہ کے لئے تین ماحول بعید : (۱) دارالسکینۃ (۲) دارالرحمت (۳) دارالخیر

جغرافیائی حیثیت سے، ماحول بعید، تین ملک ٹھہرتے ہیں۔ مکۃ المکرّمہ، قدس شریف، طورسیناء یعنی حجاز، شام اور مصر۔ جو برکتیں قریبی ماحول کعبہ، اقصیٰ، طور کو ملیں وہی درجہ بدرجہ تینوں ملک حجاز، شام اور مصر کے حصہ میں آئیں۔

حدیث نبوی ہے **اَلْاِیْمَانُ وَالسَّکِیْنَۃُ فِیْ اَھْلِ الْحِجَازِ**

ایمان اور دلوں کا سکینت ووقار اہلِ حجاز میں ہے، اس سے حجاز کا ماحول بعید ''دارالسکینۃ'' نکلتا ہے۔

اَلْاَرْضَ الْمُقَدَّسَۃَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ کا پورا علاقہ جس کے بارے میں فرمایا گیا **اِنَّ الرَّحْمٰنَ لَبَاسِطٌ رَحْمَۃٌ فِی الشام** اس لحاظ سے شام کا ماحول بعید (شرعی لقب) **دار الرحمة** نکلتا ہے۔

اِنَّ مِصْرَ سَتُفْتَحُ فَانتجعوا الخ مصر عنقریب فتح ہوگا۔ سو اس کی خیر و برکت کو ڈھونڈتے رہو، **فَانْتَجِعُوْا خَیْرَھَا** سے مصر کا ماحول بعید (شرعی لقب) دارالخیر نکلتا ہے۔

اِن تینوں مقامات کے لئے تین نقطۂ فیض

کعبۂ معظّمہ، اقصائے مقدسہ، بقعۂ مبارکہ، مکۃ المکرّمہ کا نقطۂ فیض مسجد اقصیٰ، طور سیناء کا نقطۂ فیض محلِ شجرہ ان تینوں مقامات سے نقاط فیض کا جوسیلِ رواں ماحولِ بعید کے توسط سے دور دراز علاقوں تک پہونچا تو خود اس کی بنیاد کیا ہے؟ یعنی یہ مقامات مقدس کیوں ہیں؟ تو اس کی وجہ تینوں میں ایک ہے۔ یعنی ان تینوں مقامات مقدسہ کی تقدیس کی بنیاد ''تجلیات الٰہیہ'' ہیں۔ تجلیات کی نوعیتیں اور مراتب مقامات کے لحاظ سے) گو مختلف ہیں مگر ان تینوں میں روح ایک ہے یعنی تجلیات خداوندی اور یہ خود وضعی، طبعی اور فطری لحاظ سے تقدیس و مرکزیت کی مقتضی ہیں۔

ان ہر سہ نقطہائے فیض کی وضع ، وضع خداوندی ہے، حسی، وجودی، تعمیری اور تشکیلی نہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے دریافت فرمایا **اَیُّ مَسْجِدٍ وُضِعَ اَوَّلاً قَالَ الْمَسْجِدِ الخ قَال ثُمَّ اَیُّ قَال المسجد الاقصیٰ**۔ معلوم ہوا کہ **اَوَّلَ بیت** سے عمارت عمارت کعبہ مراد نہیں، بلکہ وضع بیت اللہ مراد ہے، اسی طرح وضع اقصیٰ سے بھی عمارت نہیں بلکہ بطنی وضع اقصیٰ مرا ہے۔ وضع طور کے سلسلے میں کوئی خبر معصوم یا اثر محفوظ تو نہیں لیکن طور کے دسیوں فضائل و مناقب دیکھ کر وضعِ طور کو بھی وضعِ خداوندی کہنے کی گنجائش ہے۔

اب یہ مقامات مقدسہ مقدس اور مقدس ساز کیسے بنے؟ تو اس کے لئے ایک اصول سامنے رکھئے۔ عالم کی ہر شئے کی موجودگی اولاً باطن میں ہوتی ہے۔ پھر اسی کے مطابق اپنی نوعی شکل پا کر خارج میں اُن کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ باطن وظاہر کے رابطہ کا ایک فطری اصول ہے، جب ان مقامات مقدسہ کی وضع علمِ الٰہی میں وضعِ تقدیس کے ساتھ ہے اور اسی باطنی وضع کے ساتھ ان کا خارجی ظہور اور ان کے مراحل کا تدریجاً ارتقاء ہے تو انہیں مقدس اور مقدس ساز ہی ہونا ہے۔ کیوں کہ جب ان کی وضع مقدس ہے تو ظہور کے بعد ان کی تقدیس کا اثر ضرور پھیلے گا۔

وضع کے معنی

وضع کے معنی تخلیق کے نہیں بلکہ عملی تعین و تشخص کے ہیں کہ کسی مقام کو علمی طور پر ذہن میں مشخص کر لیا جائے۔ اس لئے وضع کعبہ سے مراد، تعین مقام اور وہ فضائی جہت ہے جو زمین بننے سے ہزاروں برس پہلے متعین ہو کر بیت اللہ کا لقب پا چکی تھی۔ نہ یہ کہ بعد کے علامتی نشانات کہ وہ صرف نشانِ کعبہ ہیں، کعبہ نہیں۔ پس حقیقی کعبہ وہ صنعی کعبہ ہے جو فضا کی ایک منتخب جہت ہے اور وہی حقیقی کعبہ ہے جو ان علامتی صورت میں چھپا ہوا ہے۔

ظہور کعبہ کی تین صورتیں

(۱) صورت کعبہ برنگ گہرائی آب

سب سے اول اس کا ظہور اس اتھاہ سمندر میں ہوا جس کے اوپر عرش عظیم قائم ہے، آثار صحابہ کی روشنی میں کعبہ بصورت جہت اولاً تو اس پانی میں نمایاں کیا گیا، جس کی موجیں بہ نصِ حدیث نبوی آسمان وزمین کے برابر تھیں، ابن عباسؓ کے ارشاد کے مطابق کعبہ کی جہت مشخص ہو کر اولاً پانی میں ظاہر ہوئی فَابْرَزَتْ عَنْ خَسَفَةٍ فِیْ مَوْضِعِ الْبَیْتِ موضع بیت پانی میں ایک گہرے غار کی طرح ظاہر ہوئی۔

(۲) صورت کعبہ بررنگ ابھاری آب

پانی کی گہری جگہوں میں پانی شدت سے ٹکراتا ہے، جس کی وجہ سے موجیں اونچی اٹھتی ہیں اور پانی میں ابھار پیدا ہوتا ہے تو موضع بیت اللہ بھی اس اونچائی کی شکل میں نمودار ہوا جو جھاگ کی صورت تھی اور اس اونچائی نے ایک قبّہ کی صورت اختیار کر لی۔

(۳) صورت کعبہ برنگ سمندر جھاگ

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے هُوَ اَوَّلُ بَیْتٍ ظَهَرَ عَلَى الْمَاءِ عِنْدَ خَلْقِ السَّمَاءِ وَ الْاَرْضِ خَلَقَهُ قَبْلَ الْاَرْضِ بِاَلْفَیْ عَامٍ وَ كَانَ زَبَدَةً بَیْضَاء فَدُحِیَتِ الْاَرْضُ مِنْ تَحْتِهٖ یہ پہلا (عبادت) کا گھر ہے جو پانی پر ظاہر ہوا، جب کہ زمین وآسمان پیدا ہونے والے تھے، اُسے اللہ نے زمین بنانے سے دو ہزار سال قبل ظاہر فرمایا وہ پانی پر سفید مکھن کی طرح جھاگ کی صورت سے ظاہر ہوا اور اس کے نیچے سے زمین بنی شروع ہوئی۔

کعبہ کے ظہور کی تین نوعیں:

(۱) کعبہ مقدسہ کا جہتی ظہور

جس کو حق تعالیٰ نے زمین بنانے سے دو ہزار قبل ظاہر فرمایا اور یہ مسلمہ ہے کہ جہت نہ بدلتی ہے اور نہ ہی ختم ہوتی ہے، اس لئے کعبہ کا وجود دوامی ہے جو ہمیشہ اپنی اسی جگہ پر قائم رہے گا۔

(۲) کعبہ کا اولین حسی ظہور

جہت کعبہ اولاً پانی پر نمودار ہوئی جو زمین کی اصل واساس بنی۔ چوں کہ اس جہت کو مادی نگاہیں نہ دیکھ

سکتی تھیں نہ پہچان سکتی تھیں تو حق تعالیٰ نے اس جہت کے دائرے میں ملائکہ کے ذریعہ اس کی بنیادیں کھدوائیں جو ساتوں زمین کی تہوں تک کھود کر بھری گئیں پھر اس پر کسی عمارت کی تعمیر سے پہلے سرخ یاقوت کا ایک خیمہ آسمان سے لاکر تان دیا گیا۔ یہ کعبہ کا اولین حسی ظہور تھا۔

(۳) تعمیری ظہور

پھر انہیں قواعد یا حدودِ اربعہ پر آدم علیہ السلام نے کرسی بنائی جو بعد میں عمارت بیت اللہ کی بنیاد ثابت ہوئی اور اسی پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی تعمیر فرمائی۔

تعمیر کعبہ کے تین بانی

فضائے بیت اللہ غیر متبدل جہت جو ازلی اور قدیم ہے اور ابد تک رہے گی۔ اس کے اول بانی حق تعالیٰ ہیں۔ (۲) اس کی زمینی کرسی بنانے کے اول بانی آدم علیہ السلام ہیں۔ (۳) اسے عمارت کی صورت دینے کے اول بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

ظہور اقصیٰ وظہور طور کی وہ صورت نہیں ہوئی جو بیت اللہ کے لئے کی گئی کہ اس کے وضعی یا علمی وجود کا ظہور، وجود کے مختلف تنوعات ومراحل کے ساتھ ہوا۔ مثلاً کعبہ کا حسی وجود، آبی وجود، حجری وجود، سطحی وجود، اساسی وجود، تحدیدی وجود، علامتی وجود، ارضی وجود، پھر تعمیری وجود۔ اس آخری وجود پر جو چوکور عمارت کی شکل میں تعمیر ہوئی اس مرحلہ پر پہونچ کر دنیا والوں نے کعبہ مقدسہ دیکھا۔ اس طرح کی صورت اقصیٰ اور طور کی اس لئے نہ ہوئی کہ وہ دونوں وسط کائنات کا مرکزی نقطہ نہ تھے۔

وسطِ کائنات کا مرکزی نقطہ، کعبہ جو مکہ میں ہے، مکہ جو حجاز کی سرزمین میں ہے یہ جغرافیائی لحاظ سے بھی وسط میں ہے۔ تفصیل کے لئے مقامات مقدس ص ۶۲، ملاحظہ فرمائیں۔

ریاضی کے دائرہ اور مرکز کے اصول میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ دائروں میں گردش اور حرکت دَوری اصل ہے اور مرکز میں سکون وقرار اور ثبات وتمکین اصل ہے۔ اگر مرکز اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو دائروں کی حرکت یا تو باقی نہ رہے یا ناہموار ہوجائے۔ اس لئے مرکز کا اپنی جگہ پر ثابت وبرقرار اور ساکن رہنا ہی اس کی زندگی ہے اور دائروں کا اس سے وابستہ رہ کر گردش کرتے رہنا ہی اس نظامِ دَوری کی زندگی کا ضامن ہے۔

لہٰذا کعبہ جو مرکز عالم ہے اور جغرافیائی لحاظ سے وسط میں واقع ہے۔ ریاضی کی بدیہیات کے مطابق بھی اس عالمی مرکز کے لئے امن وسکون کا گہوارہ ہونا ہی فطری امر ہے کیوں کہ وسط میں سکون ہوتا ہے۔ اس طرح تکوینی، شرعی، جغرافیائی لحاظ سے کعبہ اول کائنات، وسط کائنات، اصل کائنات، مرجع کائنات، مفیض کائنات اور امن کائنات ہے۔ گویا کعبہ کا وجود امن کائنات کے لئے ہے جو اسلام کا بنیادی مقصد ہے۔

بندوں کے لئے اسلام کے تین مقاصد

(۱) عالمی عبادت (۲) عالمی سیاست (۲) عالمی مدافعت۔ان تینوں سے انسان کی صلاح وفلاح اور سعادتِ دارین وابستہ ہے۔ان تینوں کو تین مقامات مقدسہ مکہ، قدس، طور سے متعلق کیا گیا۔

مکہ کو اصلِ عالم، مرکزِ عالم، وسط عالم بنایا گیا **یَا اَهْلَ مکّة انکم فِی وَسط مِنَ الاَرض بحِذاء وسط السَّماءِ** (۱)

مکة ام للقریٰ و مرو ام خراسان۔(۲)

قرآن کا ارشاد **لِتُنْذِرَ امّ الْقُریٰ** تا کہ آپ ڈرائیں ام القریٰ (مکہ) کو اور اس کے ماحول کو، ماحول میں ماحول قریب اور ماحول بعید دونوں شامل ہیں۔ماحول بعید پورا ملک حجاز نکلتا ہے جو دار السکینۃ والایمان ہے۔قدس کا ماحول بعید ارض مقدسہ شام وفلسطین ہے۔طور کا ماحول بعید مصر تک کا علاقہ ہے۔ان مرکزی مقامات کی تینوں قوتوں کو باہم ایک دوسرے کے قریب ہونا چاہئے جب کہ بظاہر ایسا نہیں ہے۔مکہ سے قدس کا فاصلہ ۸۰۰ میل۔قدس سے طور کا مزید فاصلہ ۴۲۵ میل۔اس طرح سے مکہ سے طور کا فاصلہ بارہ سو میل ہے لیکن جغرافیائی اصول سے یہ تینوں مقامات قرب میں ہیں۔دنیا میں آباد حصۂ زمین کو ایک کروڑ نوے لاکھ مربع میل بتایا گیا ہے۔پیدل ایک انسان ۱۲ گھنٹے میں طبعی رفتار ۳۶ میل طے کر سکتا ہے۔اس رفتار سے زمین کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہونچنے میں ۲۹ برس لگیں گے اور مکہ مکرمہ جو وسط عالم مرکز عالم ہے وہاں سے قدس تک پہونچنے میں ساڑھے ۲۲ دن لگیں گے۔اس طرح جغرافیائی اصول کے مطابق سوچیں تو ۲۹ برس کے مقابلہ میں ساڑھے ۲۲ دن کو قرب ہی شمار کیا جائے گا۔

مکۃ المکرّمہ جب مرکز عالم، مرکز عبادت اور مرکز امن وسلامتی ہے تو پھر ضروری تھا کہ یہاں بدامنی، قتل وقتال اور جنگ وجدال وغیرہ ممنوع کر دئے جائیں تا کہ اس کی تینوں طرح کی مرکزیت، مرکز علیت، مرکز عبادت اور مرکز امنیت کبھی فتنۂ وفساد سے دوچار نہ ہو اور اس کی تقدیسی عظمت پر کبھی کوئی حرف نہ آنے پائے۔

اس لئے اس مرکز کی سلامتی اور امن کے لئے قدرتی اور غیبی سامان بھی فرمائے گئے، مذہبی تعصّبات سے بدامنی کے سد باب کا ظاہری انتظام یہ کیا گیا کہ تینوں قومیں (مشرکین اور یہود ونصاریٰ) جو حجاز مقدس کے امن کو زیروزبر کر سکتی تھیں ان کے لئے اپنے نبی کی زبان سے اس طرح اعلان کرایا گیا **لایَجْتَمعَانِ دِیْنَانِ فِیْ جزِیْرَةِالْعَرَب**(۳)

دو دین جزیرۃ العرب میں جمع نہیں ہو سکتے۔اسی طرح آپ نے یہ بھی فرمایا کہ **اِنَّ الشَّیْطَانَ قَدْ**

اَئِسَ اَنْ یَّعْبُدَہُ الْمُصَلُّوْنَ فِیْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَب وَلٰکِن فِی التَّحرِیش بَیْنَھُمْ الخ(۴)

بلاشبہ اب شیطان اس سے مایوس ہو چکا کہ جزیرۃ العرب میں مسلمان اس کی پوجا کریں اور بت پرستی کی نجاست سے آلودہ ہوں اِلَّا یہ کہ کبھی کبھار آپس میں کچھ باہمی چھیڑ چھاڑ ہو جائے۔

اس لئے حجاز کو پہلے شرک ومشرکین سے پاک کیا گیا۔ پھر اس کے بعد یہود ونصاریٰ جو ہمہ گیر بدامنی اور شرانگیزی کی علامت تھے، ان کے فتنے سے تحفظ کے لئے حدیث عمرؓ میں لسان نبوت سے یہ واضح اعلان موجود ہے لَاُخْرِجَنَّ الْیَھُوْدَ وَالنَّصارٰیٰ مِنْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ حَتّٰی لاَ اَدَعَ فِیھا اِلَّا فیھا مسلمًا وفی روایۃٍ ”لَئِنْ عِشْتُ اِنْشَاءَ اللّٰہ لَاُخْرِجَنَّ الخ ضرور نکالے جائیں گے یہود ونصاریٰ جزیرۂ عرب سے تا آں کہ یہاں مسلمانوں کے سوا کوئی دوسری قوم باقی نہ رہے اور ایک روایت میں ہے کہ میں اگر زندہ رہا تو جزیرۂ عرب سے انشاءاللہ اُن کو ضرور نکال کر رہوں گا۔“

یہ فرمان اس لئے جاری کرایا گیا تا کہ تعصّباتی لڑائیوں سے اس مرکز امن کا امن خطرہ میں نہ پڑے۔ اس کے علاوہ بھی غیبی طاقتوں سے جس کو حزب اللہ بھی کہہ سکتے ہیں حرم کی حفاظت کے انتظام فرمائے گئے۔

مرکز امن وعبادت کی حفاظت کے ظاہری انتظام کے بعد اسلام کے اجتماعی نظام اور ہمہ گیر دین کی حفاظت کے لئے ضروری تھا کہ ہمہ گیر نظامِ سیاست بھی قائم ہوتا کہ مادی قوت وطاقت، جنگ وجہاد اور سطوت وشوکتِ دین کی رعب انگیزی ہو۔ اس محکم عمل کا مرکز شام کو بنایا گیا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے شام کو خطاب کر کے فرمایا یاشام انت سَیْف نقمَتِی وَ سَوْطَ عَذَابِیْ اَنْت الاَنْدَرَ وَاِلَیْکَ الْمَحْشَر(۵)

اے شام تو میرے غصہ کی تلوار ہے، تو میرے عذاب کا کوڑا ہے، تو ہی سب سے بڑا دفاعی محاذ ہے اور تیری ہی طرف محشر اور اجتماعِ کُل ہوگا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اَھْلُ الشامِ سَوْط اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ ینتقِمُ بِہٖ مِمَّنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَ حَرَام عَلیٰ مُنَافِقِیْھِمْ اَنْ یَّظْھَرُوْا عَلٰی مومنیھِمْ الخ(۶)

اہل شام اللہ کا کوڑا ہیں، جن کے ذریعہ اللہ جس سے چاہے انتقام لے گا اور شام کے منافقوں پر حرام ہے کہ وہ اس کے مخلصین پر غالب آئیں۔

اس کے علاوہ شام اور اہل شام کے بارے میں بہت سی روایتیں مقامات مقدسہ میں مذکور ہیں، من شاء فلیطالع، اس کے علاوہ مرکز امن وسلامتی مکہ اور مرکز قوت وسیاست مرکز شام، ان دونوں مرکزوں کی حفاظت کے لئے ناگزیر تھا کہ عالمی دفاعی نظام بھی قائم اور مستحکم ہو۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مصر کو اسلامی عسکریت کی چھاؤنی اور لشکرگاہ بنایا گیا تا کہ وہ اسلامی سرحدوں کے لئے محافظ بھی ہو اور رباط اسلام بھی۔

چنانچہ حدیث پاک سے مصر کی اس خاص مرکزیت پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ رُباط اسلام اور سرحدوں کا محافظ ہے۔ عَنْ عُمر بن الخطابؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِذَا فَتَحَ اللّٰہُ عَلیکم مِصرًا فَاتَّخِذُوْا فِیْھَا جُنْدًا کَثِیْرًا فذالک الْجُنْدُ خَیْرَ اَجْنَادِ الْاَرْضِ فقال لَہٗ اَبُوْبَکرؓ وَلِمَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ لِاَنَّھُمْ وَ اَزْوَاجَھُمْ فِیْ رِبَاطٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ (۷)

عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا فرماتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ تم پر مصر کو فتح فرمائے تو اس میں بھاری لشکر رکھنا۔ یہ لشکر روئے زمین کے تمام لشکروں سے زیادہ باخبر اور بہتر ہوگا۔ ابوبکرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا اس لئے کہ مصر والے اور ان کی عورتیں قیامت تک سرحدِ اسلام پر رہیں گی، اس لئے ہر وقت انہیں دشمنانِ اسلام کا سامنا رہنے کی وجہ سے سرحد کی حفاظت میں سرگرم و مستعد رہنا پڑے گا۔

حدیث نبوی میں مسلمانوں بلکہ عربوں کو زور دے کر توجہ دلائی گئی کہ وہ کسی وقت بھی مصر کو اپنی غیر معمولی عسکری قوت سے خالی نہ چھوڑیں بلکہ فوجی حیثیت سے اس ملک کو خوب مضبوط رکھیں، ورنہ پورا عالم اسلام خطرہ میں پڑ جائے گا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ مصر یورپ کے لئے ایشیا کا دہانہ اور ایشیا کے لئے یورپ کا دروازہ ہے اور جب اس دروازہ پر مضبوط عسکری قوت نہ ہوگی تو پورا عالم عرب خطرہ میں پڑ جائے گا۔ چنانچہ جب سے مصر اسلامی شوکت سے الگ ہوا، اغیار مطمئن ہوگئے اور اب پورا ایشیاء اُن کا ہے۔ یہ صورت آج مشاہد اور سب کے سامنے ہے۔

یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ ہم نے ان مقامات مقدسہ کو منشاء نبوت کے مطابق نہ سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ہی اپنے دینی مرکز سے رشتہ استوار رکھا۔ جب تک ہمارے پیش نظر یہ حقیقتیں رہیں کہ حجاز مَعْقَل الدّین، دین کا ٹھکانہ ہے اور شام عُقْرُ دار الاسلام، دارالاسلام کی عمدہ جگہ (اور جنگی مراکز) ہے اور مصر رِباط الاسلام، اسلامی سرحد ہے اور انہی وجوہات کی بنیاد پر حجاز قبلۂ امن کا محل ہونے کی وجہ سے مرکز دین و عبادت بنا۔ شام دار جنگ ہونے کی وجہ سے مرکز حفظ و عسکریت قرار پایا۔

مقامات مقدسہ کی شرعی حیثیت، اہمیت اور فضیلت کا اظہار زبان فیض سے جس طرح ہوا صحابہؓ نے اس کی روح اور منشاء کو سمجھ کر اس پر عمل فرمایا اور جب تک اس رہنما خطوط پر عمل ہوتا رہا اسلامی شوکت اور قوت و سطوط سب کچھ ہمارے پاس رہی۔ ع

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی

تو اس کی بدولت آج صرف عالمِ اسلام ہی نہیں بلکہ پوری دنیا فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن چکی ہے۔

مقامات مقدسہ کی اہمیت وفضیلت، ان کے کوائف وحالات اور شرعی، سیاسی اور جغرافیائی حیثیت پر بسط وتفصیل کے ساتھ حکیم الاسلامؒ کی حکیمانہ گفتگو کا مقصد۔ مسلمانوں اور ہر سہ مقدس ممالک کے باشندوں، عرب قوموں، بالخصوص عرب سربراہوں کو اس بات کا احساس دلانا ہے کہ آپ اپنی اور اپنے خطے کی غیر معمولی اہمیت کو سمجھیں اور عرب قوم ہونے کی حیثیت سے اپنے اس فریضہ کو بھی جانیں کہ ان مقدس ممالک کی تقدیسی حفاظت وصیانت کا اولین شرعی فریضہ آپ پر عائد ہوتا ہے پھر دنیا کے مسلمانوں پر۔

اس حقیقت کو ذہن میں رکھیے کہ دنیا کے مسلمانوں کا عالمی اتحاد ان ہی تین مراکز سے وابستہ ہے اور انہی تین مقامات سے دنیائے اسلام میں عالمی وحدت اور آفاقی اتحاد کی صحیح اسپرٹ دوڑائی جاسکتی ہے۔ اگر عرب ان مقدس مرکزوں کو جغرافیائی وطن کی حیثیت سے دیکھتے رہے تو وہ نہ ان مقامات کی تقدیس کا حق ادا کرسکیں گے اور نہ ہی ملی انتشار کا مداوا کرسکیں گے۔ اس لئے عرب بھائیوں کی خدمت میں اخوت کی بنیاد پر میں نے یہ شکایت بصد نیاز مندی پیش کردی ہے کہ وہ جغرافیائی، وطنی، معاشرتی، لسانی، سیاسی حد بندیوں کو توڑ کر باہر آئیں اور تینوں مراکز حجاز وشام اور مصر کی مرکزیت کو سمجھیں اور مغربی شاطروں کے دجل وفریب اور ان کی چال بازیوں اور گیدڑ بھبکیوں کو پہچانیں اور آزادی رائے اور اصلاحِ قومیت کے ڈھنگ اور ڈھونگ کی حقیقت کو سامنے رکھیں۔ ورنہ خود ان کی زندگی لاعلاج خطروں میں گھر جائے گی اور پہلے سے کہیں زیادہ بھیانک صورت حال سامنے آسکتی ہے جو عالم عرب اور پوری ملت اسلامیہ کے لئے ناقابل تلافی نقصان کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ اللہ ہر طرح سے حفاظت فرمائے۔

اس تناظر میں مقامات مقدسہ صرف ایک کتاب ہی نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کے لئے خصوصاً عرب اقوام اور سربراہوں کے لئے فکری دعوت اور عظیم پیغام ہے۔

....

(۱) شیخ ہندیؒ، کنز العمال، ج ۶، ص: ۴۴۲

(۲) ایضاً، ج ۶، ص: ۲۳۹

(۳) ایضاً، ج ۶ ص: ۲۶۵

(۴) خطیب التبریزیؒ، مشکوٰۃ شریف، ص: ۱۹

(۵) شیخ ہندیؒ، کنز العمال، ج ۷، ص: ۱۵۹

(۶) ایضاً، ج ۶، ص: ۲۵۷

(۷) ایضاً، ج ۷، ص: ۱۶۳

............❖............

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ

مولانا خورشید انور صاحب
جامعہ مظہر العلوم، بنارس

ہر دور کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے، جس سے اس دور کا تقریباً ہر فرد کم وبیش ضرور متاثر ہوتا ہے، انسان کے افکار، نظریات پر اس کی گہری چھاپ ہوتی ہے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے احساسات کی دنیا اپنے گرد وپیش کی فضا کے زیر اثر آباد ہوتی ہے، اس لئے اس دور کو مخاطب بنانے، اپنی جانب متوجہ کرنے اور اس کے افکار وخیالات پر اثر انداز ہونے کے لئے اس مزاج کا بھرپور لحاظ کرنا ازبس ضروری ہوتا ہے، اس کے بغیر اس دور کے ذہن وفکر کے رخ کا موڑنا اور اسے صحیح سمت عطا کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ''اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ'' کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اگر بنی آدم کے مزاجوں اور ذہنیتوں کی رعایت ملحوظ خاطر نہ ہوتی تو صرف احکام الٰہی کا پہنچا دیا جانا کافی سمجھا جاتا، استدلال کی راہ اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی، چہ جائے کہ استدلال کی انواع واقسام پر روشنی ڈالی جاتی، پس جب کہ انسانوں کے داعی اول حق جل مجدہٗ نے اپنے مخاطبوں کی رعایت فرمائی تو اس آیت کا منشاء صاف واضح ہوا کہ تمام مدعیان دین کا فرض ہے کہ وہ رعایت طبائع کے ماتحت مخاطب کی ذہنیتوں کا اندازہ کرکے تبلیغ کا آغاز کریں ورنہ بلا رعایت طبائع ان کی دعوت وتبلیغ مؤثر نہیں ہوگی۔'' (۱)

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے ماحول کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ آج لوگوں میں عقلیت کا رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے اور عمومی طور پر ہر شخص نقل وعقل کے آئینے میں دیکھنے کے خواہاں ہے تو انہیں اس سیلاب بلاخیز کے سد باب کی فکر دامن گیر ہوئی اور ضروری سمجھا گیا کہ

لوگوں کے سامنے شریعت مطہرہ کے اسرار وحکم واضح ہو جائیں اور ایسے قواعد مرتب کئے جائیں جس سے اس طرح کے ذہن ومزاج کا بروقت علاج ممکن ہو سکے اور تعقل پسند طبیعتوں کو مطمئن کیا جا سکے، چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں:

لاسبیل ای دفع هذه المفسدة ای بأن تبین المصالح و تؤسس لها القواعد کما فعل نحو من ذلک فی مخاصمات الیهود والنصاریٰ والدهریة و أمثالهم(۲)

اس مفسدہ کے دفعیہ کی بس ایک صورت ہے کہ مصالح شریعت بتائی جائیں اور ان کے لئے قواعد وضع کئے جائیں جیسا کہ یہود ونصاریٰ اور دہریہ وغیرہ کے مقابلہ میں ایسا کیا جاتا ہے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کے الفاظ میں اس امر کی تفصیل کچھ اس طرح ہے لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ صاحبؒ نے بالہام خداوندی بھانپ لیا تھا کہ اب دین کو محض نقل وروایت سے عقیدت مندانہ سمجھنے کا زمانہ نہیں رہا، عقلی مطالبوں اور حجت طلبیوں کا دور شروع ہو گیا ہے، حقیقت شناسی، حق طلبی اور اعتقادی روایات پر ایمانی پختگی سست پڑ گئی ہے اور عقل پرستی غالب آتی جارہی ہے، تا آں کہ لوگ مغیبات کو عقل کی ترازو میں تولنے کی فکر میں لگ گئے ہیں، اس لئے جب تک منقول دین کو معقول لباس پہنا کر پیش نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک اس دور کی عقل پرست طبیعتیں مطمئن نہ ہوں گی اور اسے اِنْ هٰذَا اِلَّا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کہہ کر ناقابل التفات ٹھہرا دیں گے اور دین سے محروم ہو جائیں گی، اس لئے شاہ صاحب نے بالہام خداوندی اس جامع منقول ومعقول مکتب فکر کے ذریعے دین پہنچانے کا فیصلہ فرمایا تا کہ پورا دین جیسے نقل وروایت کے لحاظ سے کامل ہے اسی طرح عقل وروایت کی رو سے بھی کامل ہی نمایاں ہو اور کسی بھی عقل پرست یا درایت درست انسان کے لئے ناقابل التفات نہ ہونے پائے اس لئے یہ نادر روزگار کتاب حجۃ اللہ البالغہ خاص اس موضوع پر تصنیف فرمائی۔''(۳)

اس کے بعد جب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا زمانہ آیا تو اس وقت معیار غور وفکر میں تبدیلی آچکی تھی اور تعقل پسند طبیعتیں مسائل کے سمجھنے میں صرف عقلی دلائل پر اکتفا نہ کریں بلکہ مشاہدات و حسیات کی روشنی میں کسی بھی مسئلے کے سمجھنے کا مزاج پیدا ہو چلا تھا، اس صورت حال کے پیش نظر حضرت نانوتویؒ نے اسلامی افکار ونظریات کو پیش کرنے کے لئے عقلی دلائل کے ساتھ مشاہداتی اسلوب اختیار کیا، جس سے عقل وخرد کے پرستاروں کو خاموش کرنے، مطمئن کرنے اور حقیقت مسئلہ سے روشناس کرانے میں بھرپور مدد ملی۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''حکمت قاسمیہ کے تمام اجزاء نے (جو حضرت والا کی تصانیف میں موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں) جہاں اسلامی حقائق پر گہری ملّیاتی اور خالص عقلی دلائل کی روشنی ڈالی وہیں پورے زور اور قوت کے ساتھ ان حقائق کو آج کے محسوسات اور دور حاضر کے حسی شواہد و نظائر سے بھی مدلل کر کے اس طرح پیش کیا کہ اسلام کے غیبی امور، شریعت کے بنیادی مقاصد اور دین فطرت کے مبانی و اصول اس حسیاتی رنگ استدلال سے بالکل طبعی اور محسوس و مشاہد نظر آنے لگے۔ (۴)

حضرت حکیم الاسلامؒ نے ایک دوسری جگہ اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''اس ولی اللّٰہی خاندان کی پانچویں علمی پشت میں ایک فرد اٹھا جس نے اس مذکورہ نہج پر دین و مذہب، دینی عقائد اور دینی اصول و کلیات کو اسی الہام ربانی کی تحریک سے ابتداءً ہی قرآن و حدیث یا مذہب و ملت کا نام لئے بغیر حقائق قرآن و حدیث کو ایسے استدلالی اور منطقی طرز بیان سے زمانہ کے سامنے پیش کیا، جیسے وہ اس زمانہ کے حسب حال ایک مضبوط اور مستحکم ازم پیش کر رہا ہے۔ جس کا ظاہری عنوان ابتداءً نہ اعلانِ مذہب سے نہ اطلاع غیب مگر انتہاءً وہی مذہب اور عقیدۂ غیب ہے، مگر اس ڈھنگ سے کہ جیسے وہ خالص ایک فلسفیانہ ازم کی تلقین ہے کہ اس کے مانے بغیر نہ اس دور کی معاشرت صحیح اسلوب سے چل سکتی ہے نہ سیاست و مدنیت اور نہ ہی مابعد الموت کی زندگی استوار اور کامیاب ہوسکتی ہے، اس لئے اس نے ایک حسیاتی فلسفہ و حکمت کی بنیاد ڈالی ہم اسی شخصیت کو حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحبؒ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ (۵)

حضرت نانوتویؒ کے بعد آپ کے تلامذہ نے اس حکمت قاسمی کو فروغ بخشا بالخصوص شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ نے حضرت نانوتویؒ کی مشکل ترین کتابوں کو خود انہی سے سبقاً سبقاً پڑھ کر خوب سمجھا اور ان علوم و معارف کو اپنے تلامذہ تک منتقل کیا، پھر آپ کے مخصوص تلامذہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ اور حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اس حکمت قاسمی کو تحریر و تقریر، درس و تصنیف کے ذریعہ عام کیا، حضرت مولانا سندھیؒ نے تو حکمت ولی اللّٰہی اور حکمت قاسمی کو اپنا موضع زندگی ٹھہرا لیا تھا، ان کا نظریہ یہ تھا کہ شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں کا کماحقہٗ فہم و شعور تصانیف قاسمیہ کے مطالعہ کے بغیر میسر ہی نہیں آسکتا۔ (۶)

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو علم و معرفت اور حکمت قاسمی کے انہیں سر چشموں سے فیضیاب ہونے کا سنہرا موقع ملا، جن سے انہوں نے خوب خوب اپنی علمی پیاس بجھائی اور شریعت کے اسرار و رموز سیکھے، بطور

خاص اپنے والد محترم حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سے بھرپور استفادہ کیا، حضرت حکیم الاسلامؒ نے خود ایک جگہ اس کی وضاحت فرمائی ہے:

''راقم الحروف کو جو تھوڑی بہت مناسبت حکمت قاسمیہ سے پیدا ہوئی وہ انہیں کے درس کا طفیل ہے جب کہ مشکوٰۃ شریف و مسلم شریف احقر نے انہی سے پڑھی ہیں اور ان میں حضرت مرحوم آیات وحدیث کے مضامین کے اثبات میں اسی حکمت کے اجزاء سے کام لیتے تھے جس کا اثر شرح صدر کی صورت سے سینوں پر پڑتا ہے۔(۷)

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کو اسرار و شریعت کے موضوع سے فطری مناسبت تھی اس لئے انہوں نے اس فن میں مزید استحکام کے لئے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے بطور خاص حجۃ اللہ البالغہ پڑھی اور ان سے حکمت ولی اللہی اور حکمت قاسمی کے رموز ونکات کو بہت ہی اہتمام سے سمجھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ رقم طراز ہیں:

''مولانا ممدوح نے احقر کی اس عرض داشت پر دارالعلوم میں اس ناکارہ کو حجۃ اللہ البالغہ پڑھانی شروع کی اور مختلف اوقات میں احقر کے سوالات پر حکمت قاسمی اور حکمت ولی اللہی کے اصول وحقائق تشریح کے ساتھ نقل فرماتے۔(۸)

مذکورہ تفصیل سے اس ماحول پر بخوبی روشنی پڑتی ہے جس میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی علمی نشو ونما ہوئی اور اس کے زیر اثر آپ کے اندر ایسا ذوق پیدا ہوا کہ اسرار شریعت سے واقفیت کی راہیں ہموار ہوتی چلی گئیں اور رفتہ رفتہ یہی چیز آپ کی طبیعت ثانیہ بن گئی۔ جس کے اثرات آپ کی تصانیف ومقالات اور خطبات و مجالس میں پورے طور پر نمایاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے جس موضوع پر بھی زبان کھولی یا قلم اٹھایا، اس کے تمام گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالی اور اس کے اسرار وحکم کو اس موثر اور دلچسپ انداز سے بیان فرمایا کہ بالغ نظر قارئین وسامعین اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی کتابوں سے چند اقتباسات ہدیہ ناظرین ہیں جن سے مذکورہ بالا باتوں کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، مثلاً نماز کے اسرار وحکم واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''سب سے پہلے نماز نے جو اسوہ پیش کیا ہے وہ ہے کہ فرض نماز گھر میں ادا نہ کی جائیں بلکہ مساجد میں حاضر ہو کر یعنی ادائیگی نماز کے لئے سب سے پہلی چیز گھروں کی چہار دیواری سے باہر ہو جانا ہے، گویا نماز نے سب سے پہلے خانگی خلوت توڑ کر ایک انسان کو میدان میں نکالا اور جلوتوں کے ہجوموں میں دیکھنا

چاہا، جس کا راز یہ ہے کہ گھر کی چہار دیواری میں محدود رہ کر انسان کی نگاہ اس کا تخیل، اس کی سعی اور اس کا علم سب محدود اور تنگ رہتے ہیں، ان کی نگاہ گھر میں رہ کر خانگی امور تک محدود رہ سکتی ہے، اسے تمام شہر یا قوم سے کوئی واسطہ نہیں ہوسکتا اس لئے نماز نے گھروں سے مساجد کی طرف سفر کرایا تاکہ انسان کے باطن وظاہر میں وسعتیں نمایاں ہوں اور کوئی ایک مسلم بھی تنگ دل، تنگ ظرف اور تنگ حوصلہ باقی نہ رہے کہ جس کے سامنے صرف اس کا نفس اور اس کا گھر ہو بلکہ اس کے ظرف میں گھر سے باہر نکل کر مسلمانوں کے پورے جتھوں اور جمگھٹوں کی گنجائش ہو۔(۹)

اسی طرح اوقات نماز کی تعیین کے فوائد پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''نماز وقت کی عبادت ہے جس کے لئے زمانہ بھی متعین ہے اور مکان بھی یعنی مسجد جب ایک شخص کے مہم اوقات جو درحقیقت رات دن میں صرف اوقات نماز ہی ہیں جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، نماز میں مصروف ہوگئے تو علاوہ اس کے کہ اسے پابندی اوقات کی عادت پڑے گی قدرتی طور پر نمازوں کے درمیانی اوقات کے کام بھی خود بخود متعین اور منضبط ہوجائیں گے اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ یہ درمیانی کام نیکیوں ہی کے متعین ہوں گے، بدیوں کے نہیں کیوں کہ دو نمازیں نمازی کے قلب کو اس درمیانی فاصلہ کے لئے اتنا منور اور متاثر کردیتی ہیں کہ اس کی اندرونی رہنمائی عموماً نیک ہی کام کرسکتی ہے، اس سے واضح ہوا کہ توقیت نماز سے عین نمازوں ہی کے اوقات نہیں بلکہ نمازوں کے درمیانی اوقات میں بھی انضباط پیدا ہوجانا ضروری ہے۔(۱۰)

حضرت حکیم الاسلامؒ نے ایک جگہ معجزہ پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اس سے متعلق اعتراضات کا آج کی نو بہ نو ایجادات اور اکتشافات کی روشنی میں کافی وشافی جواب دیا ہے، اس ضمن میں منکرین معراج کو لاجواب کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''آج کم سے کم معراج سے انکار کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہا، کیوں کہ چاند میں جانے کا جب ارادہ کرلیا تو پہنچنا نہ پہنچنا تو بعد کی بات ہے صرف ارادہ کرنے ہی سے امکان تو ثابت ہوگیا، وقوع جب بھی ہو وہ ہوتا رہے گا تو کل تک جو لوگ معراج کے سفر کو ناممکن کہتے تھے کم سے کم ان کے منہ پر مہر لگ گئی اور وہ اب نہیں بول سکتے۔ اس واسطے کہ وہ امکان کے قائل ہوگئے کیوں کہ سب سے بڑی چیز تو امکان ہی ہے واقعہ ہونا تو امکان کے آثار میں ہے وہ جب بھی ہوجائے۔(۱۱)

اس سلسلے کا ایک اور اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں اور حضرت حکیم الاسلامؒ کی نکتہ سنجیوں سے محظوظ ہوں، تحریر فرماتے ہیں:

''اگر آپ کہتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ کے معراج پر جانے کے وقت اللہ تعالیٰ نے شق صدر فرمایا یعنی سینہ کھول کر آپ کے قلب مبارک کو چاک کیا گیا اور اس میں حکمت و ایمان زیادہ سے زیادہ بھر دیا گیا، جتنا پہلے تھا اس سے بھی زیادہ اور پھر فرشتے نے برابر کر دیا، تو لوگ ہنستے تھے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، دل کے اوپر زندگی کا مدار ہے، جب دل کھل گیا تو آدمی زندہ لاش نہیں رہ سکتا، لیکن آج کی ایجادات میں ایسے ایسے نازک آپریشن ہوتے ہیں کہ دل کو کھول کر اس میں کچھ بھر دیتے ہیں اور پھر سی دیتے ہیں لیکن انسان زندہ رہتا ہے، اس کی حرکت کو مشینوں کے ذریعہ قائم رکھ کر آپریشن کر دیا جاتا ہے تو جب مادی اسباب سے قلب کو شق رکھ کر آپریشن کر دیا جاتا ہے تو جب مادی اسباب سے قلب کو شق کرنا ممکن ہے تو روحانی قوتیں مادی قوتوں سے زیادہ ہیں۔ (۱۲)

حضرت حکیم الاسلامؒ کی مجالس کا رنگ بھی خالص حکیمانہ ہوا کرتا تھا، ایک مجلس میں عصمت انبیاء اور عصمت اطفال کے درمیان فرق واضح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''بچوں میں جو معصومیت ہے وہ اس لئے ہے کہ ان میں گناہ کرنے کی قوت بیدار نہیں ہوتی، صرف مادہ موجود ہوتا ہے اور انبیاء میں وہ ساری قوتیں موجود ہیں پھر بھی وہ معصوم ہیں، ارادے، اختیار سے تو عصمت دونوں میں موجود ہے، مگر فرق اتنا ہے کہ انبیاء اختیاری معصوم ہیں اور بچوں میں غیر اختیاری عصمت ہے۔ یہ علم کے ساتھ معصوم اور بچے لاعلمی کے ساتھ معصوم، ایک کی عصمت کمال میں داخل ہے، ایک کمال میں داخل نہیں، اگر دو برس کا بچہ گناہ نہ کرے تو اسے کامل نہیں کہتے، اس لئے کہ نہ اس میں ارادہ ہے اور نہ قوت ہے۔ لہٰذا اس کے معصوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اسے مجبوراً گناہ کرنے سے روک دیا ہے، وہ طاقت اس میں خدا نے ابھاری نہیں اس لئے وہ بے چارا اپنے ارادہ سے کچھ نہیں کر سکتا اور انبیاء میں ساری قوتیں موجود ہیں اور پھر بھی بچتے ہیں، یہ ہے کمال اور اصول بھی یہی ہے کہ رکاوٹیں اور مواقع بہت ہوں اور پھر نیکی کرے تو وہ زیادہ قابل قدر ہے اور ایک یہ ہے کہ کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے اور نیکی کرنے کے لئے داعی ہی دواعی موجود ہیں تو ہے تو وہ بھی نیکی ہی مگر زیادہ عجیب و غریب نہیں زیادہ قابل قدر نہیں۔ (۱۳)

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی یہ اور اس طرح کی جملہ تحریروں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کے ذہن و مزاج میں حکمت قاسمی پورے طور پر رچی بسی تھی، جو زبان و قلم سے حسب موقع بلا تکلف ظاہر ہوا کرتی اور اس جامعیت اور باریک بینی کے ساتھ کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہنے پاتا، غرض کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ حکمت قاسمی کے وارث و امین تھے، جنہوں نے تاحیات اس کی تشریح و ترجمانی اور اس کی روشنی کو عام کیا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

....

(۱) حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ، اصول دعوت اسلام، ص:۴۶

(۲) حضرت شاہ ولی اللہؒ، حجۃ اللہ البالغہ، ص:۷

(۳) سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج۱، ص:۱۴

(۴) حضرت مولانا محمد طیب قاسیؒ، حکمت قاسمیہ، ص:۱۸

(۵) تاریخ دارالعلوم دیوبند، سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج۱، ص:۱۰۷

(۶) حضرت مولانا محمد طیب قاسیؒ، حکمت قاسمیہ، ص:۳۱

(۷) ایضاً

(۸) ایضاً، ص:۳۲

(۹) حضرت مولانا محمد طیب قاسیؒ، فلسفۂ نماز، ص:۲۷

(۱۰) ایضاً، ص:۱۱۸

(۱۱) حضرت مولانا محمد طیب قاسیؒ، معجزہ کیا ہے؟ ص:۴۵

(۱۲) حضرت مولانا محمد طیب قاسیؒ، معجزہ کیا ہے؟ ص:۸۲

(۱۳) مولانا حبیب اللہ قاسمی، مجالس حکیم الاسلام، ص:۵۴۸

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ

ایک عہد آفریں شخصیت

مولانا غلام قادر صاحب
جامعہ ضیاء العلوم، پونچھ، کشمیر

حضرات گرامی قدر! حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہٗ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند ان رجال علم، اصحاب فضل اور ارباب کمال اکابر میں سے تھے جو برصغیر کی اسلامی تاریخ کا ایک روشن وتابناک باب کہلاتے ہیں جن کے مبارک تذکروں سے آج بھی ایمان کو تازگی اور روح کو سکون میسر آتا ہے۔ جن کے ذکر خیر سے نیکیوں کے چمن میں بہار اور قلب وروح کی گہرائیوں میں شرافت وکرامت کے آبشار پھوٹتے ہیں جن کی قابل قدر دینی وعلمی خدمات ملت اسلامیہ کی متاع گراں مایہ اور جن کے زندہ وتابندہ کارنامے ہمارے لئے نشانِ راہ اور چراغِ منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کی ایک قابل قدر شخصیت تھے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی عظمت وشہرت کی کلاہِ زریں پر علم وفن کے جوہر ٹانکے اور مسلک دیوبند کی نمائندگی اور موقف دارالعلوم کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔ ان کا لب ولہجہ ابریشم سے نرم، زبانِ حقیقت، ترجمان حکمت سے لبریز، بیان شہد سے زیادہ پُر حلاوت، گفتگو سحر انگیز، مزاج میں لینت، طبیعت میں بردباری، علم میں گہرائی وگیرائی، قلم میں جان، تحریر اثر آفرینی، چال ڈھال متواضعانہ، کردار قابل تقلید، عمل لائق تاسی، سیرت سنت نبوی کا عکس جمیل، صورت نورانی، شخصیت پُر وقار، ذہن علوم معارف کا بحر زخار، دماغ حکمت وروشن کا شجر پُر بہار، اہتمام وانصرام ہو کہ تدریس وتعلیم، تصنیف وتالیف ہو کہ وعظ وتقریر، روحانیت وخانقاہیت ہو کہ ملی قیادت، دینی سیادت ہو کہ عوامی روابط ہر میدان میں یکساں صلاحیت کے مالک اور یکساں کمالات کے حامل تھے۔

زمانہ طالب علمی میں راقم الحروف کے ساتھ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی جو شفقتیں اور محبتیں

رہیں سچ یہ ہے کہ بیگانگی کے اس دور میں نگاہیں ان کو ڈھونڈتی ہیں مگر دور دور تک کہیں نظر نہیں آتیں۔ طلبہ کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ اور اپنے ملنے جلنے اور جاننے پہچاننے والوں کے ساتھ ان کا سلوک آج کے دور میں ایک خواب وخیال نظر آتا ہے۔

۱۹۷۴ء کی بات ہے۔ راقم الحروف نے اپنے ادارہ جامعہ ضیاء العلوم پونچھ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کو تشریف آوری کی دعوت دی۔ ادارہ کا ابتدائی دور تھا۔ علاقہ انتہائی پس ماندہ، جہالت عروج پر اور شرک، بدعات کا شباب۔ خیال یہ تھا کہ ایسی بے سروسامانی اور ایسے نامساعد احوال وظروف میں تشریف آوری کی دعوت شرف قبولیت سے باریاب نہ ہوگی۔ مگر حکیم الاسلامؒ کی شفقتیں اور محبتیں کہ بلاتامل دعوت منظور فرمالی گئی۔ مگر ادھر حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے شایانِ شان پذیرائی نہ ہوسکنے کا اندیشہ دامن گیر مستزاد برآن جموں سے پونچھ تک راستے کی ناہمواریاں اور کٹھنائیاں، مسافت طویل، پُر صعوبت اور پُر پیچ، کڑکتی ہوئی سردی کا موسم، دھول اور دھند سے آسمان ڈھکا ہوا، گرد وغبار کی دبیز چادر، فضا کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے اور کار کا سفر، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کو اس سفر میں کس قدر دشواریوں کا سامنا ہوا ہوگا مگر بایں ہمہ پوری بشاشت کے ساتھ پونچھ تک کی یہ طویل مسافت طے فرمائی اور ایک جملہ بھی زبان مبارک سے دریافت کرنے کے باوجود۔ شکوہ یا شکایت کا نہیں آیا۔ پونچھ پہنچنے پر عوام الناس نے جس ایمانی جوش وجذبہ کے ساتھ آپ کا استقبال کیا وہ پونچھ کی تاریخ کا ایک بے مثال واقعہ ہے۔ بعدِ عشاء آپ کا خطاب شروع ہوا۔ عالم یہ تھا کہ جیسے ساون کی رم جھم بارش ہورہی ہو اور خشک کھیتیاں لہلہا اٹھی ہوں۔ رات گئے تک نہایت اطمینان کے ساتھ خطاب کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران نہ پہلو بدلا، نہ لب ولہجہ میں کوئی تبدیلی آئی۔ مجمع کیا تھا۔ ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، مختلف المسالک، مختلف الخیال، مسلم، غیر مسلم سبھی ہمہ تن گوش برآواز، نہ نیند کا احساس، نہ تکان، گویا آب حیات کا بند ٹوٹ گیا اور ہر شخص بقدر ظرف جام کے جام اتار رہا ہے۔

اس سفر میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے ایک منظوم سفر نامہ بھی تحریر فرمایا جس کو جامعہ ضیاء العلوم نے ''سفر نامہ پونچھ'' کے نام سے باضابطہ کتابچہ کی صورت میں شائع کرچکا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ پر جو کچھ کہنا اور لکھنا چاہئے تھا ہمارے قابل قدر قلم کار اور فاضل مقالہ نگار کافی حد تک کہہ بھی چکے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

حق تعالیٰ شانہٗ حضرت حکیم الاسلامؒ کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کی خدمات وکارناموں کو اسلام کی اشاعت اور مسلکِ دیوبند کے استحکام کا ذریعہ بنائے۔ آمین یارب العالمین

حکیم الاسلامؒ اور نصابِ تعلیم

مولانا مفتی جمیل احمد نذیری، اعظم گڑھ

نصابِ تعلیم کیا ہے؟

کسی بھی ادارہ کے لئے، خواہ دینی ہو یا دنیاوی، نصاب تعلیم بنیادی حیثیت رکھتا ہے، نصاب تعلیم کے ذریعے ہم ادارے کے مقاصد کو متعین کر سکتے ہیں کیوں کہ ادارہ کے مقاصد، نصاب تعلیم کے گرد گھومتے ہیں اور اسی کی فکر کی غمازی کرتے ہیں، نصابِ تعلیم، تعلیم کے اصل مقاصد کے حصول کا سب سے اہم ذریعہ ہوتا ہے۔

نصاب تعلیم، مختلف فنون کی چند مخصوص کتابوں ان کے نوٹس، لیکچر اور معلومات کو مناسب درجہ بندی اور منظّم طریقہ سے طلبہ کو فراہم کر دینے کا نام ہے یا بقول بعض مفکرین نصاب تعلیم، تعلیمی اداروں کے ذریعہ متعین تجربوں کے توسط سے طلبہ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا نام ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نصابِ تعلیم صرف کتابوں کا نام نہیں بلکہ طلبہ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لئے اداروں میں جو جو چیزیں بروئے کار لائی جاتی ہیں وہ سب نصاب تعلیم کا حصہ ہیں۔

نصاب تعلیم دو طرح کا ہوتا ہے۔ایک لازمی، دوسرا اختیاری۔ مدارس کا عام ماحول اور مزاج یہ ہے کہ جو چیزیں باقاعدہ گھنٹوں میں تقسیم ہوتی ہیں یا جن کے اوقات مقرر ہوتے ہیں، خواہ تعلیمی اوقات میں یا خارج اوقات میں وہی چیزیں نصابی کہلاتی ہیں اور اختیاری مضامین وموضوعات، نصابِ تعلیم کا حصہ نہیں ہوتے۔

دینی مدارس کا نصابِ تعلیم

دینی مدارس کا نصاب تعلیم کیا ہو؟ کیسا ہو؟ یہ عنوان ہمیشہ ہی مفکرین اور اہل نظر کی بحث و گفتگو کا

موضوع رہا ہے۔ اس عنوان پر مختلف انداز میں دادِ تحقیق دی جاتی رہی ہے۔ مختلف نظریات، مختلف جہتیں پیش کی جاتی رہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

نصاب تعلیم سے متعلق حضرت حکیم الاسلامؒ کا نقطۂ نظر

ایک جلیل القدر عالمِ دین، بلند پایہ خطیب وانشاء پرداز و مفکر، دینی مصالح وحکمتوں کے رمز شناس اور ایک طویل عرصہ تک ازہرِ ہند دارالعلوم دیوبند کے فعال مہتمم کی حیثیت سے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس اہم اور حساس موضوع سے الگ کیسے رہ سکتے تھے جب کہ ام المدارس دارالعلوم دیوبند سمیت سارے مدارس دینیہ کے لئے یہی چیز جڑ، بنیاد اور ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی سے مدارس کے اُن مقاصد کا حصول ہوتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے اور تحفظ ایمان وعقیدہ کی صورتیں پیدا ہوئیں۔

حضرت علیہ الرحمہ نے دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس دینیہ کے نصاب تعلیم کے تعلق سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی کسی ماہر تعلیم سے گفتگو کے ضمن میں ہے، کبھی کسی تعلیمی کانفرنس کے اندر ہے، کبھی کسی تعلیمی ادارہ کا جائزہ لیتے اور معائنہ کرتے ہوئے بیان ہوئے ہیں۔

نصابِ تعلیم سے متعلق حکیم الاسلامؒ کی گفتگو یا خیالات صرف عربی مدارس تک محدود نہیں بلکہ عصری درسگاہوں، جامعات اور یونیورسٹیوں کو بھی اس دائرے میں رکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ مکاتب کے نصاب میں اظہار خیال ہوا ہے۔

ہماری آئندہ کی سطور سبھی سے متعلق اس اجمال کی تفصیل ہے۔

قوم کی برتری اور بقاء، صرف صحیح تعلیم کے ذریعے

حضرت حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ کسی قوم کی ترقی، برتری بلکہ بقاء صرف صحیح تعلیم پر منحصر ہے لیکن تعلیم، صحیح کب ہوگی، اس کے عناصر اور اسباب وعوامل کیا ہیں، انہیں جاننے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔

یہ باتیں حضرت حکیم الاسلامؒ نے اِس موقع پر فرمائیں۔ جب ۲۲ رفروری ۱۹۴۷ء کو مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اسمبلی ہال لکھنؤ میں ایک ''تعلیمی کانفرنس'' بلائی تھی جس کا موضوع ہی عربی وفارسی کا نصاب تعلیم تھا۔ اس کانفرنس میں ملک کی نامور علمی شخصیات شریک ہوئیں اور حاصل کانفرنس جو تقریر مقرر پائی وہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر تھی، خود داعی کانفرنس حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریر

کے جملہ جملہ کو لے کر اپنے الفاظ و انداز میں نہایت شاندار اور وقیع شرح فرمائی۔ یہ تقریر ''خطبات حکیم الاسلامؒ'' حضرت حکیم الاسلامؒ جلد ۸ میں ''نصاب تعلیم کی تدوین'' کے عنوان سے مع مذکورہ بالا تفصیلات کے موجود ہے۔

حکیم الاسلامؒ اپنی تقریر میں ''صحیح تعلیم'' کی تشریح یوں فرماتے ہیں۔

''صحیح تعلیم سے میری غرض یہ ہے کہ نصابِ تعلیم موزوں ہو، طریقِ تعلیم مؤثر ہو، ذریعۂ تعلیم فطری ہو، اساتذہ کا انتخاب صحیح ہو، نظامِ تعلیم درست ہو۔

اگر کسی قوم میں تعلیم ہی نہ ہو تو ایک بنیادی روگ ہے جس سے کوئی قوم پنپ نہیں سکتی۔ نصاب تعلیم اگر غلط ہو تو ذہن کا سانچہ درست نہیں ہو سکتا، طریقۂ تعلیم اگر غلط ہو تو تعلیم کا پورا اثر ظاہر نہیں ہو سکتا۔''

استاذ قابل نہ ہو تو قابلیت کا دروازہ ہی نہیں کھل سکتا، سب کچھ ہو اور نظم تعلیم درست نہ ہو تو نتائج متوقع نہیں نکل سکتے۔ غرض تعلیم کی صحت کے لئے ان اجزا کا ہونا ازبس ضروری اور یہ امور تعلیم کے حق میں بنیادی ہیں۔''

صحیح تعلیم کی بنیاد، نصب العین کا تعین

صحیح تعلیم کے یہ عناصر ترکیبی، اسی وقت نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں جب اس کی اصل بنیاد صحیح ہو، تعلیمی عمارت کی صحت و استواری، بنیاد کی صحت و استواری، درستگی و مستقیمی پر منحصر ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں:

''لیکن اگر آپ غور فرمائیں تو ان سب بنیادوں کی ایک اور گہری بنیاد ہے کہ اس کی صحت و سقم پر اِن سب امور کی صحت و سقم موقوف ہے اور وہ ہے ''تعلیم کا نصب العین اور مقصد'' اِس نصب العین کی خوبی و خرابی سے اُن بنیادوں میں خوبی و خرابی پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ نصب العین تعلیمی اداروں اور اداروں سے فیض حاصل کرنے والوں کی کامیابی اور ناکامی کی کسوٹی ہے، اسی نصب العین کے لحاظ سے اس ادارہ کے کمال و نقصان کا فیصلہ کیا جائے گا۔''

نصاب تعلیم کا نصب العین سے تعلق

جس ادارہ کا جیسا نصب العین معین ہوگا اس کا نصاب بھی، اُسی کے مطابق ہوگا کیوں کہ نصب العین اور مقصد کو سامنے رکھا جائے گا تو سرکاری اداروں اور دینی مدارس کے درمیان فرق خود بخود ظاہر ہو جائے گا۔ سرکاری تعلیم گاہوں کا مقصد، عام طور پر ملازمت کا حصول ہے تاکہ اس تعلیم کے ذریعہ کلرک، محرر، دفتری کارکن یا سرکاری محکموں کے کل پرزے تیار ہو جائیں۔

اس کے بالمقابل دینی درسگاہوں کا مقصد، دینی اداروں کا نصب العین نہ روٹی ہے نہ کرسی بلکہ نفوسِ انسانی کی تہذیب وتربیت ہے۔

حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں:

''دینی درسگاہوں کا نصب العین اس دینی تعلیم سے نہ روٹی نہ کرسی، بلکہ تہذیب نفس ہے کہ اس تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو انسانیت کے سچے خدمت گذار ہوں اور عالم بشریت کی بہی خواہی میں اپنی جان، مال اور آبرو کی کوئی پرواہ نہ کریں۔''

پھر حکیم الاسلامؒ بہت ہی نکتہ کی بات کہتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ دینی اداروں کی کامیابی اور ناکامی جانچنے کا معیار کیا ہے؟

''ظاہر ہے کہ ہمیں اُن افراد کی کامیابی اور ناکامی اور اُن اداروں کے کمال ونقصان کو اسی معیار اور نصب العین سے جانچنا ہوگا جس کو لے کر یہ ادارے کھڑے ہوئے ہیں، بلا شبہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہیں، ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم ان کو سرکاری معیار سے جانچیں اور پھر ان کی تنقیص کریں۔''

آخر میں پھر فرماتے ہیں:

''بنیادی چیز نصب العین ہے، اس سے ادارے پنپتے ہیں اور اس کے بگڑ جانے سے بگڑ جاتے ہیں۔''

اسی ضمن میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے ایک حکیمانہ بات یہ فرمائی ہے:

''میرے خیال میں دینی، عربی مدارس کے رویہ میں تبدیلی پیدا کرنے سے زیادہ ضروری اور اہم یہ ہے کہ سرکاری اداروں میں نصب العین کی تبدیلی کی جائے۔''

نصاب تعلیم میں کوئی مرکز علوم ہونا چاہئے

''حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ آپ علم کوئی حاصل کریں، کسی فن کی تحصیل میں لگیں خواہ مدارس میں پڑھتے ہوئے یا کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہوئے، ہر علم وفن کا ایک مرکز ہونا چاہئے جو سارے علوم وفنون کا محور ہو، سارے علوم وفنون اسی کے گرد گھومیں اور اپنے مرکز سے لاتعلق نہ رہیں، علوم وفنون کے نصاب میں اِس مرکز علوم کو ہمیشہ مقدم رکھنا چاہئے۔

''میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ دوسرے علوم وفنون کی تعلیم چھوڑ دیں، تمام علوم وفنون آپ حاصل کریں۔ آپ سائنس، فلسفہ، ہندسہ، ریاضی اور علوم طبعیہ وعقلیہ بھی حاصل کریں لیکن ہر علم کا کوئی معیار اور مرکز بھی ہونا چاہئے جس کے ارد گرد وہ علوم گھومیں۔

سارے علوم کا اگر مرکز آپ دین کو بنالیں گے کہ ہم اس کی ترویج وتبلیغ اور فروغ کے لئے یہ تمام چیزیں حاصل کررہے ہیں، یہ سب چیزیں آپ کے حق میں دین بنتی چلی جائیں گی، دنیا ہی کارآمد نہیں ہوگی بلکہ دنیا کے ساتھ آخرت کا اجروثواب مرتب ہونا شروع ہو جائے گا۔

اگر دین اور کتاب وسنت کو مرکز بنایا جائے اور تمام علوم وفنون اس کے اردگرد گھمائے جائیں جن کا مقصد یہ ہو کہ اس علم کو آگے بڑھانا ہے، اس کے ذریعہ سے لوگوں کی اصلاح کرنی ہے اور اس کے ذریعہ سے لوگوں کو صالح بنانا ہے تو ہر علم وفن کام دے گا اور ہر علم وفن باعث اجر اور باعث صلاح وتقویٰ بنے گا۔

مدارسِ دینیہ کے نصاب میں تبدیلی کا معاملہ

مدارسِ دینیہ کے نصاب میں تبدیلی کی آوازیں، دانشورانِ ملت اور خود مدارس کے فیض یافتگان کی طرف سے بھی بارہا اٹھتی رہتی ہیں، مولانا ابوالکلام آزادؒ کی جس تعلیمی کانفرنس کا ذکر پچھلے اوراق میں آچکا ہے، اس میں بھی صدر کانفرنس کی حیثیت سے مولانا آزادؒ نے اپنی صدارتی تقریر میں مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم پر سخت تنقید فرمائی تھی اور کہا تھا کہ اِس طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم کے بہت سے گوشے وقت کے تقاضوں اور ضرورت کو پورا کرنے سے عاری اور یکسر خالی ہیں جنہیں بہت جلد پورا کردینے کی ضرورت ہے۔

۱۳۵۸ھ میں حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمہ نے افغانستان کا جو سفر کیا تھا، اس میں یہ ساری باتیں زیر غور تھیں، سفر افغانستان کی روداد کا یہ حصہ خود حکیم الاسلامؒ کی زبانی سنئے۔ افغانستان کے وزیر تعلیم سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پہلی ملاقات میں وزیر صاحب معارف نے جو ایک نوجوان قابل اور پیرس کے تعلیم یافتہ ہیں، مذہبی طبقہ کی روش پر مخلصانہ تنقید اور مذہبی مدارس کے نصاب پر چند برمحل شکوک کا اظہار فرمایا اور اس کا شکوہ شدومد سے کیا تھا کہ علماء اسلام دولتی اور سلطنتی امور پر دسترس نہیں رکھتے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تربیت ایسے انداز پر مبنی ہوتی ہے کہ وہ ملکی ادارہ میں حصہ لے سکیں۔

اس سلسلے میں ان شکوک کے جوابات عرض کئے گئے نیز موجودہ اور نصابِ دینیات کو ایک بنیادی نصاب ثابت کرتے ہوئے اس سے بھی انکار نہیں کیا گیا کہ ضروریات زمانہ کی رعایت کے ماتحت اس نصاب میں کمی بیشی کا امکان ہے اور دارالعلوم نے اس طرح کے وقتی مقتضیات اور ان کے ماتحت نصابی

تفرادت سے کبھی گریز نہیں کیا ہے اور نہ اب کرنا چاہتا ہے۔

چنانچہ اسی سلسلے میں وزیر صاحب معارف کے سامنے میں نے ایک تحریری پیش کی جس کا عنوان ''معارف امروز وفکر فردا'' تھا۔ جس میں تعلیم وتربیت سے متعلق دارالعلوم کے آئندہ تصورات کا کچھ تذکرہ کیا گیا تھا تاکہ ایک ضرورت واقعی کے اظہار کے ساتھ ہم حکومتِ کامل کی توجہات کو ادھر ملتفت کرسکیں کہ دارالعلوم قومی ضروریات سے نہ کبھی غافل رہا ہے اور نہ اب ہے اور اس طرح ایک عرفانی رابطہ کی بسہولت بنیاد پڑ سکے جو سفر کا حقیقی مقصد تھا۔ یہ تحریر درج سفر نامہ ہے جس کا اس روداد کے صفحات میں لایا جانا طول سے بھی خالی نہ تھا اور ساتھ ہی اس سے پہلے اسی کا اعلان موزوں بھی نہ تھا کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ اس کے متعلق اظہارِ رائے کردے۔ اس تحریر کو پڑھتے ہی وزیر صاحب معارف کا رویہ ایک دم بدلا اور شکوہ سے شکریہ کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ بسیار مبارک، بسیار اعلیٰ، بسیار بلند وغیرہ کے کلمات سے جناب ممدوح نے بندہ کی حوصلہ افزائی فرمائی اور فرمایا کہ اگر یہ پروگرام دارالعلوم میں عملاً شروع ہوجائے تو پھر افغانستان کا بھی ایک اہم مقصد ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے مولانا آزادؒ کی تعلیمی کانفرنس میں اپنے سفر افغانستان اور نصاب تعلیم میں تبدیلی سے متعلق اپنی تحریر کا تذکرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''میں نے خود ۱۳۵۸ھ میں سفر افغانستان سے واپسی میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں اس سلسلے میں ایک مفصل رپورٹ پیش کی تھی جس میں تبدیلئ نصاب کے متعلق اپنے خیالات، تفصیلات کے ساتھ ظاہر کئے تھے۔''

راقم سطور نے یہ رپورٹ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند سے حاصل کرنے کی کوشش کی اور حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے پاس خط بھیجا، جس کا جواب حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب مدظلہ العالی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے بڑی شفقت ومحبت سے روانہ فرمایا، اس میں انہوں نے لکھا کہ:

''آپ نے گرامی نامہ میں ''سفر کابل'' کی رپورٹ سن ۵۸ء کی طلب فرمائی ہے۔ یہ قدیم ریکارڈ نکلوا کر دیکھا گیا، کاغذات بڑے بوسیدہ ہوگئے ہیں، ان کے ساتھ زیادہ چھیڑ چھاڑ نقصان کا سبب ہوسکتا ہے۔ البتہ مکمل روداد سفر کابل طبع شدہ نسخہ کی فوٹو کرا کر بھیجی جارہی ہے، امید کہ اس سے ضرورت پوری ہوجائے گی، اگرچہ فوٹو کرانے میں یہ نسخہ بھی خراب ہونے جارہا ہے، اسی لئے دو کاپی کرالی گئی ہیں تاکہ ایک کو مجلد کرا کے محفوظ کرلیا جائے۔''

طبع شدہ نسخہ میں ''تبدیلئ نصاب'' سے متعلق حضرت مہتمم صاحب علیہ الرحمہ کی تحریر پہلے نقل کی جاچکی ہے۔ مزید اس نسخہ میں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ البتہ حضرتؒ نے جس مفصل رپورٹ کے مجلس شوریٰ میں پیش کرنے کا تذکرہ کیا ہے وہ ضرور اس سلسلے میں بے حد اہم تھی اور حکیم الاسلامؒ کے خیالات حکیم

الاسلامؒ کی تحریر سامنے آئے، اب اس کے بارے میں جانکاری کا احقر کی معلومات میں ایک ہی ذریعہ رہ گیا ہے اور وہ ہے حضرتؒ کی وہ تقریر جو آپ نے مولانا آزاد کی بلائی ہوئی تعلیمی کانفرنس میں فرمائی تھی۔ لہٰذا اس تقریر کی روشنی میں تبدیلیٔ نصاب کے متعلق حضرت حکیم الاسلامؒ کا نقطۂ نظر پیش کیا جاتا ہے۔

تبدیلی کا تعلق کن امور سے ہے اور کن امور سے نہیں؟

حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ:

''اب رہا مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کا قضیہ سو مجھے اس اصول سے انکار نہیں اور نہ کسی کو ہوسکتا ہے، جن تعلیمات کا وحیِ الٰہی سے تعلق ہے اس کی تبدیلی پر نہ ہم قادر ہیں نہ ہمیں حق ہے، باقی جو فنون یا کتابیں، قرآن کے خادم کی حیثیت سے زیر تعلیم آتی ہیں وہ زمانہ اور احوال کے لحاظ سے بدل سکتی ہیں۔

قرآن ہر زمانہ میں ایک رہا لیکن اس کی تفہیمات کا انداز بدلتا رہا، جس دور میں مثلاً فلسفہ کا زور ہوا تو قرآن کو فلسفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا، جس دور میں تصوف کا زور ہوا تو قرآن کو صوفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا، آج سائنس کا دور ہے تو وہ سائنسی رنگ میں تجلی کرے گا۔ اس ساری حقیقت کو میں بطور خلاصہ اِن الفاظ میں لاسکتا ہوں کہ مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں''

ہم ان ہی ٹھیٹ فطری مسائل کو جدید آلات سے مسلح کر کے میدان میں لائیں گے، بس تبدیلیٔ نصاب کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے مخاطبوں کی زبان میں اپنے گھر کی چیز ان کے سامنے پیش کردیں۔ نہ وحی کی کتابیں اور مسائل بدلے جاسکتے ہیں اور نہ ہمیں اس کا حق ہے۔ اس لئے وقت کے تقاضوں کے ماتحت یہ تعبیراتی فنون اور کتب بدلتی سدلتی رہی ہیں اور برابر بدلتی رہیں گی کہ خود درس نظامی کی تدوین میں تبدیلیٔ نصاب کی سب سے بڑی دلیل ہے کیوں کہ بہر حال یہ نصاب قرنِ اول کا نہیں ہے، وقت کے تقاضوں سے بنایا گیا ہے جب اس کے آغاز کے وقت تغیر وتبدل ممکن تھا تو آج بھی ممکن ہے مگر ان ہی حدود کے ماتحت جو عرض کی گئیں۔ نصاب کا مسئلہ بہر حال علماء میں زیر غور ہے اور وقتاً فوقتاً اس نصاب میں بہت سے تغیرات ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

بہر حال نصاب تعلیم میں یہ تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوگا لیکن یہ ضرور ہے کہ ذمہ دار علماء اسے از خود ہی کریں گے جیسا کہ اب تک کرتے چلے آئے ہیں، ہاں جو کچھ بھی ہو وہ اپنی بصیرت سے تغیر کریں۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنی اس تقریر میں ''نصاب تعلیم'' کی جن چیزوں کو قابل تبدیل قرار دیا اُن کے متعلق درج ذیل جملے نہایت ہی اہم اور قابل غور ہیں۔

۱- مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں۔

۲- تبدیلئ نصاب کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے مخاطبوں کی زبان میں اپنے گھر کی چیز اُن کے سامنے پیش کر دیں۔

۳- وقت کے تقاضوں کے تحت تعبیراتی فنون اور کتب بدلتی رہی ہیں اور بدلتی رہیں گی۔

ان میں اول الذکر جملہ اتنا جامع ہے کانفرنس مذکور کے ہر آنے والے مقرر نے اسی کی جامعیت اور معقولیت کو سراہا، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے فرمایا کہ ''اس سے زیادہ جامع جملہ کوئی نہیں ہے جو تغیر نصاب پر جامع روشنی ڈال سکے۔''

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے فرمایا:

''مسائل قدیم ہوں اور دلائل جدید ہوں'' ہمارے اُن تمام تعلیمی مقاصد کا آئینہ دار اور لب لباب ہے جو ہمارے پیش نظر ہیں، یہ اس قدر جامع تعبیر ہے کہ آپ کتنی شرحیں کرتے چلے جائیں تفاصیل کے دفتر تیار کر دیں لیکن کوئی مقصد بھی اس جملہ سے باہر نہ ہوگا۔''

اس جملہ کا تحلیل و تجزیہ کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے پرانے مسائل کیا ہیں؟ وہ تو ہمیں معلوم ہی نہیں، اُن مسائل کے نئے دلائل کیا ہیں اور کس زبان میں ہیں، انہیں معلوم کرنے کی ضرورت ہے

آج ہر صاحب علم اس بات سے واقف ہے کہ آج کے علمی میدان کے دلائل یا آلات جنگ سائنس، ریاضی، جدید علم ہیئت وغیرہ ہیں، انہیں سیکھنے کی ضرورت ہے اور مدارس دینیہ کے نصاب اور مدارس دینیہ کے طریقِ تعلیم میں کچھ تبدیلی کر کے ان علوم کے لئے کسی نہ کسی درجہ میں گنجائش پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اسی کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ اگر اس طرح کی کتابیں جو مدارس میں چل سکیں دستیاب نہ ہوں تو دیندار ماہرین فن سے تیار کرانے کی ضرورت ہے۔

اس کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ جو دلائل پرانے ہیں، جن کی اب کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور زمانہ کے تغیر و تبدل سے از کار رفتہ ہو چکے ہیں انہیں چھوڑ دینے کی ضرورت ہے مثلاً فلسفۂ قدیم۔

اسی طرح ہر کوئی جانتا ہے کہ مذکورہ نئے دلائل کی ایک زبان ہے اور وہ ہے انگریزی، لہٰذا نئے دلائل کو اصل ماخذ سے سیکھنے اور سمجھنے کے لئے ہمارے مدارس دینیہ کے طلبہ کو انگریزی جاننا اور سیکھنا بھی ضروری ہے اور اس حد تک ضروری ہے جس سے وہ نئے دلائل کو اصل ماخذ سے لے سکیں یعنی صرف اتنی انگریزی جاننے سے کام چلنے والا نہیں ہے کہ تار پڑھ لیں، منی آرڈر فارم بھر لیں، ریزرویشن کرا لیں اور خطوط پر پتہ لکھ لیں۔

اگر تم اپنے گھر کی چیز اپنے مخاطبوں کی زبان میں، مخاطبوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے مخاطبوں کی زبان بھی سیکھنی پڑے گی۔ اس لحاظ سے مدارس دینیہ کے طلبہ کو ملکی سطح پر ہندی اور بین الاقوامی سطح پر انگریزی سے بھی واقف کرایا جانا ضروری ہے۔

پھر یہ کہ آج کے دور میں کسی کو مخاطب کرنے اور کسی کے سامنے اپنی بات پیش کرنے کا ایک مخصوص انداز ہے جو پچھلے انداز سے کافی بدل چکا ہے، لہٰذا ہم صحافت اور تصنیف و تالیف سے بھی دامن کش نہیں ہو سکتے۔

اسی کے ساتھ ہمیں وہ اصطلاحات اور وہ چیزیں بھی معلوم ہونی چاہئیں جن کی راہ سے ہمارے مسائل پر رد و قدح ہوتی ہے، اشکالات و اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں، تا کہ ہم صحیح تجزیہ کر کے اپنے پرانے مسائل، نئے دلائل کے ساتھ پیش کر سکیں، اس اعتبار سے ہمیں کمیونزم، سوشلزم، صہونیت، عیسائیت، ہندوتو سے بھی واقف ہونا چاہئے۔

مدارسِ دینیہ کے طریقِ تعلیم پر غور کر کے مذکورہ بالا ساری چیزیں نصاب تعلیم میں لائی جانی چاہئیں۔

نئے دلائل کا چوں کہ طریقِ تعلیم میں بدلا ہوا ہے، اس لئے ہمیں اس پہلو پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

احقر کے خیال میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے جملے ''مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں۔'' اور اپنے گھر کی چیز مخاطبوں کی زبان میں پیش کرنے'' میں وہ سری باتیں شامل و داخل ہیں جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا۔

عصری تعلیم گاہوں کا نصاب تعلیم

عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ ہماری عصری درس گاہوں کے تعلیم یافتہ حضرات مدارسِ دینیہ کے نصاب تعلیم کے متعلق، خواہی نخواہی، ہدایات و مشورے برابر دیتے رہتے ہیں لیکن خود مسلمانوں کی قائم کردہ، مسلمانوں کی شناخت و پہچان رکھنے والی عصری درس گاہوں، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دینی تعلیم اور ملی تشخصات کی پابندی کا کیا حال ہے، اس کی طرف توجہ نہیں دیتے جب کہ بہت سی عصری درس گاہوں میں دینیات، اسلامیات، شخصیات کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں، ان کا نصاب تعلیم، طریقِ تعلیم اور نظامِ تعلیم اِس فکر سے بے نیازی اختیار کئے ہوئے ہے جب کہ مسلمانوں کی گاڑھی کمائی، مسلمانوں کے خون و پسینہ اور مسلمانوں کی محنت و کوشش سے وہ وجود میں آئیں اور فخر کے ساتھ انہیں مسلمانوں کی قائم کردہ درس گاہ کہا جاتا ہے۔

حکیم الاسلامؒ نے ان عصری درس گاہوں کے ذمے داروں کو بھی ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے، روداد سفر افغانستان میں لکھتے ہیں:

''اس دوران وزارتِ معارف نے کابل کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے معائنہ کے لئے مجھ سے فرمایا اور پروگرام بنا کر باصرار کہا گیا کہ میں اِن حکومتی اداروں اور مدارس کا معائنہ کر کے اپنی مفصل رائے بھی حکومت کے سامنے پیش کروں۔ چنانچہ سرکاری طور پر پروگرام تیار ہوا اور ادارت کے معائنوں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ حبیبیہ کالج سے ابتداء کی جو کہ انگریزی کا کالج ہے، پھر استقلال کالج جو فرانسیسی کا ہے، پھر نجات کالج جو جرمنی کا ہے اور ناکوئشہ کالج طب برائے بنات۔ اس کے بعد ناکلوتہ حقوق یعنی لا کالج جس میں قانون پڑھایا جاتا ہے اور مکتب صنائع اور میخانے کی جس میں صنعت وحرفت کی تعلیم دی جاتی ہے پھر مطبع حکومی جو سیکڑوں اعلی اور ترقی یافتہ مشینوں پر مشتمل ہے جس میں حروف کی ڈھلائی، ٹائپ، عکاسی اور نقاشی وغیرہ کا کام موجودہ دور کی اعلیٰ ترقی یافتہ صورتوں میں ہوتا ہے۔ معائنہ کے بعد احقر نے ان کالجوں پر ایک تفصیلی تبصرہ لکھ کر وزارت معارف کے سپرد کیا جس میں روادوں کی واقعی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے بعض ضروری تنقیدات واصلاحات اور بعض مفید تجاویزیں پیش کی تھیں۔

معائنہ کی تنقیدات کا خیر مقدم کیا

اس معائنہ میں عمود بحث یہ تھا کہ غیر رستہ کی تعلیم کسی ایسے مستقل اور متوازی عنوان سے نہ دی جائے جو دینیات کے ساتھ ٹکرا جائے اور قوم ہی مختلف المذاق جیسے پیدا ہو کر قومی تشتت کا باعث بن جائیں بلکہ دینی و دنیوی تعلیم مشترک طریق پر ہونی چاہئے تا کہ پیدا شدہ تفریق بھی مٹ جائے۔ نیز دینیات کے سلسلے میں دارالعلوم کا نصاب پیش کیا گیا جس کو حکومت نے قبول فرمالیا جیسا کہ بعد کے اخبارات کی خبروں سے معلوم ہوا۔''

مکاتب کا نصاب تعلیم

حضرت حکیم الاسلامؒ کا خیال تھا کہ مکاتب دینیہ میں اردو نصاب کے ساتھ مختصر عربی نصاب بھی داخل درس ہونا چاہئے۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کے جاری کردہ نصاب تعلیم پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''ضرورت ہے کہ اردو نصاب اور اردو لٹریچر کے ساتھ اب مختصر عربی نصاب بھی مسلمانوں میں رائج کیا جائے جو انہیں عربیت سے بیگانہ نہ رکھے۔''

اس سلسلے میں حکیم الاسلامؒ کا مشورہ یہ تھا کہ مولانا محفوظ الرحمٰن نامیؒ کی مفتاح العربیہ (پانچ حصے) کو جمعیۃ علماء ہند کے تیار کردہ اردو نصاب کا جزء بتا دیا جائے۔ اس کتاب کے ذریعے بچوں میں بہت آسانی کے ساتھ قلیل مدت میں قرآنی محاورات سے لگاؤ پیدا ہو کر عربیت کا ذوق پیدا ہو جائے گا۔''

اردو ذریعۂ تعلیم، اردو کی اشاعت کا ذریعہ

تقریباً سبھی مدارس دینیہ نے عربی نصاب تعلیم ہونے کے باوجود، ذریعۂ تعلیم اردو زبان کو بنایا ہے، اس سے اردو زبان کو پھلنے پھولنے کا زیادہ موقع ملا اور مدارس دینیہ کی بدولت ہندوستان ہی نہیں دنیا کا ایک بڑا علاقہ اردو داں بن گیا اردو بولنے اور سمجھنے والا بن گیا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ مکاتب دینیہ پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس ابتدائی اور بنیادی تعلیم کے لئے ذریعہ تعلیم اردو کے اور دوسرا نہیں ہونا چاہئے جیسا کہ اس کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

قدیم مدارس دینیہ نے بھی اس ضرورت کو نظرانداز نہیں کیا ہے۔ انہوں نے تعلیم عربی رکھی اور تفہیم اردو کی۔ اس سے اردو زبان صرف ہندوستان میں ہی نہیں پھلی پھولی بلکہ دنیائے اسلام کے ہزار ہا افراد اِن مدارس کی بدولت اردو داں ہوگئے اور آج افغانستان، ایران، چین، ترکستان، روسی ترکستان، حجاز، افریقہ، عراق، جاوا، سماٹرا وغیرہ دور دراز ممالک میں اردو زبان سے بیگانے اور بے تعلق نہیں۔''

............❖............

حکیم الاسلامؒ اور ان کی شانِ تواضع

مولانا ارشد اعظمی قاسمی، بنارس

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی ذات اقدس ایک بین الاقوامی معروف ومقبول شخصیت ہے۔ اللہ رب العزت نے حضرت حکیم الاسلامؒ کو گونا گوں کمالات سے نوازا تھا، ساتھ ہی جاذبیت اور کشش کی دولت سے بھی مالا مال فرمایا تھا، اور واقعتاً ''حکیم الاسلام'' کا خطاب جس نے بھی آپ کو دیا ہے۔ بجاطور پر صحیح دیا ہے اور ''حق بحق دار رسید'' کا علی وجہ البصیرت ثبوت دیا ہے، کیونکہ ''خطبات حکیم الاسلام'' کا مطالعہ اور اس کا فیض، عنداللہ اس کی مقبولیت برملا اعتراف کرنے پر مجبور کرتی ہے، حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اپنے اعتبار سے علوم ومعارف، اسرار وحکم کے ایک بحر بیکراں تھے، رشد وہدایت اور علمی فیضان کے جو عظیم الشان نقوش عالم اسلام کو موصوفؒ عطا کر گئے ہیں۔ وہ بے مثال اور لازوال تحفہ وعطیہ ہے، اور ایسی شخصیتیں بعد مدت دراز کہیں پیدا ہوتی ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے، چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت حکیم الاسلامؒ کی پہلی زیارت آج سے تقریباً چالیس سال قبل مدرسہ دارالعلوم مئو میں ہوئی تھی اور جلسہ میں موصوف نے سورۃ الرحمٰن کی تلاوت فرمائی تھی، میرا بالکل بچپن کا زمانہ تھا۔ لیکن وہ انداز، جمال، آواز، ابھی تک بحمداللہ ذہن میں مرتسم ہے، اس وقت کے حضرت عارف باللہ مصلح الامت مرشدنا مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی خانقاہ میں جو میری تعلیم وتربیت کا زمانہ تھا۔ حضرت حکیم الاسلامؒ حضرت مصلح الامتؒ سے متعدد بار ملاقات کے لئے تشریف لائے، تو وہاں زیارت سے مشرف ہونے کی توفیق

میسّر ہوئی، حضرت مصلح الامتؒ اور ان کے در سے وابستہ ہونے کے طفیل دارالعلوم دیوبند اور ہندوستان کے دیگر علماء کرام کو قریب سے دیکھنے اور ملاقات کرنے کے مواقع نصیب ہوئے، یہ حضرت مصلح الامتؒ کی برکت تھی جسے اللہ رب العزت نے اپنے اس بندے کو عطا فرمائی، ایک بہت خاص بات یہاں ناظرین و قارئین کے توجہ فرمانے کی ہے کہ الہ آباد نور اللہ روڈ پر ایک عظیم الشان سیرت کا جلسہ تھا۔ جس میں حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ خصوصی مقرر کی حیثیت سے یاد فرمائے گئے تھے، راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ سیکڑوں کا مجمع تھا اور الہ آباد و اطراف کے علماء کرام بھی جلسہ گاہ میں حاضر تھے۔ مولانا قاری فیاض احمد صاحب دلدارنگری نے آپ کا تعارف کرایا تھا، تو اس تعارف میں حقیقت کے اعتبار سے احترام و آداب اور تعظیم کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کو اُجاگر کیا تھا، لیکن حضرت حکیم الاسلام نے بعد خطبہ اس طویل تعارف پر نکیر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ مولانا موصوف نے جو کچھ بتلایا وہ ان کے حسن عقیدت وسعادت مندی کا ثبوت ہے مگر اس سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ یہ فرماتے کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک طالب علم حاضر خدمت ہے، اس متواضعانہ انداز پر مجمع پر ایک خاص تأثر پیدا ہو گیا تھا۔

راقم نے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی زندگی کا مطالعہ کیا تو بایں کمالات و بلندیٔ درجات ان کی ''تواضع'' بہت ہی نمایاں نظر آتی ہے اور حقیقتاً اسی تواضع نے آپ کو بڑی بلندی عطا کر دی تھی۔ اسی سلسلہ میں ایک واقعہ زینت قرطاس کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے، جسے پڑھ کر مجھ جیسے ادنیٰ طالب علم کو حضرت حکیم الاسلامؒ کے مقام بلند کا تصور نہیں ہو سکا۔ اللہ تعالیٰ ان کے مزار کو پُر انوار بنائے۔

حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھیؒ جو ابھی قریبی دور کے بلند پایہ بزرگ گذرے ہیں۔ انھوں نے اس واقعہ کو بڑے تأثر کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ اور اس میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے سفر بیت المقدس کا واقعہ مربوط ہے لہٰذا مضمون نگار اپنے الفاظ میں نہیں بلکہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھی کے ہی انداز بیان کو نقل کرے گا اور پورا بیان پڑھنے کے بعد ہی صحیح طور پر اندازہ لگ سکے گا۔ لہٰذا حضرت مولاناؒ کے الفاظ میں پہلے حضرت عمر فاروق اعظمؓ کا واقعہ ملاحظہ کیجئے اس کے بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا۔

چنانچہ مولانا پرتاپ گڈھیؒ فرماتے ہیں کہ:

''حضرت عمرؓ کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ آپ کے دور خلافت میں، مسلمانوں کے لشکر نے جب بیت المقدس کا محاصرہ کیا تو اہل شہر نے کہا کہ تم اپنے خلیفہ کو بلاؤ، ہماری کتاب میں ان کا حلیہ لکھا ہوا ہے، اگر

مطابق ہو جائے گا تو ہم بغیر جنگ کئے ہی قلعہ کا دروازہ کھول دیں گے، چنانچہ مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت عبیدہ ابن الجراح نے خلیفۃ المسلمین حضرت عمر ابن خطابؓ کے پاس یہ اطلاع بھیجی، تو آپ بیت المقدس کے لئے روانہ ہوگئے، بوقت روانگی آپ کا یہ حال تھا کہ پیوند لگے ہوئے معمولی کپڑے زیب تن فرمائے ہوئے اور اونٹ پر سوار تھے، یہ دیکھ کر اسلامی سپہ سالاروں نے آپ سے درخواست کی اور عرض کیا کہ آپ مسلمانوں کے خلیفہ ہیں۔ لہٰذا اچھے اور صاف کپڑے پہن لیں۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لے چلیں۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کی اس درخواست پر کپڑے بدل لئے اور اونٹ سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوگئے۔ مگر ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ فرمانے لگے کہ: میرا نفس ان چیزوں کی وجہ سے متغیر ہو رہا ہے۔ لاؤ میرے پرانے کپڑے اور میرا اونٹ میں اسی پر چلوں گا۔ اور یہ فرمایا کہ: نَحْنُ قَوْمٌ اَعَزَّنَا اللّٰہ بِالْاِسْلَامَ. یعنی ہم وہ قوم ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ عزت دی ہے۔ وہی ہمارے لئے کافی ہے۔ یہ فرمایا اور پھر وہی پیوند دار کپڑے پہن لئے اور اونٹ پر سوار ہو کر تشریف لے گئے آپ کے ہمراہ ایک غلام تھا اس سے یہ طے فرمایا کہ ایک منزل تک میں سوار ہو کر چلوں گا اور تم اونٹ کی نکیل پکڑ کے چلو گے، اور ایک منزل تم سوار ہو کر چلو گے اور میں نکیل پکڑ کر چلوں گا۔ چنانچہ اسی کے مطابق منزل بہ منزل سفر طے ہوتا رہا، جب آخری منزل آئی تو اس وقت غلام کے اونٹ پر بیٹھنے اور حضرت عمرؓ کے پیدل چلنے کی باری تھی، غلام نے عرض کیا کہ حضرت اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ سوار ہو جائیں اور میں پیدل چلوں مگر آپ نے فرمایا کہ نہیں، ایسا نہ کرونگا، کیوں کہ یہ خلاف عدل ہے۔ الخ''

الغرض اسی طرح سے آپ قلعہ کے سامنے پہنچے کہ غلام اونٹ پر سوار تھا اور آپ اس اونٹ کی نکیل پکڑے پیدل چل رہے تھے۔

مخالفین نے قلعہ کے اوپر سے آپ کا حلیہ کتاب سے منطبق کرنا شروع کیا چنانچہ طابق النعل بالنعل یہی حلیہ ان کی کتابوں میں لکھا تھا کہ ایسے ایسے کپڑے ہونگے اور ان کا غلام اونٹ پر سوار ہوگا اور خود اس کی نکیل پکڑے ہوئے پیدل چل رہے ہونگے، بس اہل شہر نے اس کو دیکھتے ہی قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ اور شہر مسلمانوں کے سپرد کر دیا۔ الخ

یہ واقعہ سیرت اور تاریخ اسلام کی کتابوں میں مذکور ہے۔ اور تمام مشائخ اور علماء حضرات اس کو بیان فرماتے ہیں۔ اور وہ یہاں بھی بقول حضرت مولانا پرتا پگڈھیؒ کے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے یہی بیان فرمایا ہے اور یہی واقعہ اگلے واقعہ کی اساس ہے جو ایک عارف باللہ نے دوسرے

عارف باللہ کے بارے میں سنایا ہے۔ لہٰذا لیجئے سنئے اور پڑھئے اور ضرور پڑھئے، سنئے اور اس بے مثال تواضع پر سر دھنئے اور آخر میں بیان کا حوالہ بھی دیکھ لیجئے گا تاکہ ناظرین میں سے جس کا جی چاہے مراجعت کر سکے!

ہاں تو کیا فرماتے ہیں حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتا پگڈھی:

اب سے تقریباً چالیس سال (بلکہ پچاس سال) قبل کا واقعہ ہے۔ کہ قصبہ مئو آئمہ ضلع الہ آباد میں ایک بہت بڑا جلسہ ''احناف کانفرنس'' کے نام سے منعقد ہوا تھا، جس میں ہندوستان کے مشہور چوٹی کے علماء تشریف لائے تھے۔ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ، مولانا ابوالوفاء صاحب شاہجہانپوریؒ، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ، اور دوسرے بہت سے علماء تشریف لائے تھے۔ جمعہ کا دن تھا۔ نماز جمعہ کی امامت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے فرمائی اور جلسہ کا صدر بھی انہی کو مقرر کیا گیا۔ پہلے معذرت فرمائی اس کے بعد تشریف لائے اور کرسیٔ صدارت پر بیٹھنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس وقت اکابر کی موجودگی میں کرسیٔ صدارت پر بیٹھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی مگر امتثالاً للامر بیٹھ گیا اور پھر ایک واقعہ یاد آیا جس سے مجھے تسلی ہوگئی۔

حضرت مولانا پرتا پگڈھیؒ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

اس کے بعد حضرت مہتمم صاحبؒ نے حضرت عمرؓ کا مندرجہ بالا واقعہ ذکر فرمایا، پھر ارشاد فرمایا کہ آپ انصاف سے بتلائیں؟

جس وقت ان کا غلام اونٹ پر سوار ہوتا اور خود وہ نکیل پکڑ کر پیدل چلتے تھے اس وقت کیا اس غلام کے دل میں اس کا وسوسہ بھی آتا ہوگا کہ میں حضرت عمرؓ سے افضل ہوں؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ میری مثال اس وقت بالکل اسی غلام جیسی ہے اور جن اکابر نے مجھے یہاں بیٹھنے کا حکم فرمایا ان کی حیثیت فاروق اعظمؓ جیسی ہے۔

اللہ اکبر! کس عظمت کی حامل تھی وہ شخصیت! اور اس گہری تواضع میں اللہ تعالیٰ نے حکیم الاسلامؒ کی ذاتِ والا کو کتنی بلندی اور رفعت بخشی تھی کہ ان کی نورانی ذات اور جگمگاتی زندگی عظمت کردار کا مظہر بن گئی تھی تذکرہ نگار کو یاد ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ ایک مرتبہ دورانِ سفر مغل سرائے (بنارس) میں مختصر وقفے کے لئے پلیٹ فارم پر جلوہ افروز ہوئے اور اہل محبت نے پروانوں کی طرح شمع فروزاں کو گھیر رکھا تھا تو ابرار و اخیار نہیں بلکہ ''اغیار کی زبانوں پر بے ساختہ یہ جملہ آیا کہ: ارے ای دیوتا ہیں'' بہرحال بات کہاں پہنچ گئی؟ وہ واقعہ تو ضرور پورا ہوا مگر بات نہیں پوری ہوئی کیوں کہ حضرت مولانا پرتا پگڈھیؒ کا بیان ہنوز باقی ہے۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

سبحان اللہ! کیسی عمدہ تمثیل پیش فرمائی، اس کو سن کر تمام علماء عش عش کرنے لگے مجھے بھی بہت پسند آئی اور اس کو برابر بیان کرتا ہوں، ان حضرات کی عجب شان تھی ان کو دیکھ کر اسلاف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ واقعی ان حضرات کے پیش نظر محض اللہ ورسول کی رضا وخوشنودی ہوتی تھی اور ان کو آخرت کا ایسا یقین حاصل تھا کہ کسی وقت ان سے غفلت اور ذہول نہ ہوتا تھا۔(۱)

بدست خود و بقلم خود اپنے ہی کو حقیر وفقیر و نا کارہ لکھنا و کہنا ایک دوسری بات ہے لیکن علماء حقانی ومشائخ ربانی کے مجمع میں اور پھر کسی جامع کمالات ہستی کا اور وہ بھی حضرات صحابۂ کرامؓ کے حالات زندگی سے اس طرح استشہاد اور پورا پورا انطباق اور اعتراف یقیناً بے مثال ہے۔ اسی اسوۂ حسنہ کی وجہ سے حضرت حکیم الاسلامؒ کو اللہ تعالیٰ نے مقبولیت عامہ عطا فرمائی تھی بین الاقوامی شہرت عامہ بخشی تھی اور طبقۂ خواص میں پذیرائی کا خاص امتیاز حاصل تھا۔ یہی نہیں بلکہ جس خصوصیت وخوبی کی طرف نگاہ اٹھائیے تو ''دامن دل می کشد کہ جا اینجاست'' کا مصداق ہے۔

تذکرہ نگار نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قصبہ مؤ کی عظیم درسگاہ ''دارالعلوم میں طلبہ کی ایک کثیر تعداد کو بخاری شریف ختم کرائی، اس میں علوم ومعارف کے بیان کے ساتھ اپنا سلسلۂ سند مختلف جہات سے بیان فرمایا تو عجیب شان نمایاں تھی اور یہ درس بعد ظہر شروع فرمایا تو اذان عصر تک جاری رہا اور پوری تقریر ایک ہیئت ونشست پر پوری فرمائی۔ اللہ اکبر! اللہ رب العزت نے کتنا افاضہ فرمایا تھا اور کتنا پر انوار بنایا تھا کہ جس سے ایک عالم مستنیر تھا کہ جس کی ذات والا تبار میں علمی وقار بھی تھا اور اسلاف کے علوم ومعارف کا تذکار بھی اکابر دارالعلوم کی وراثت کا امانت دار بھی۔ حضرات صحابۂ کرامؓ کی یادگار بھی۔ اقوال زریں کا گلشن سدا بہار بھی تھا اور انوار معرفت الٰہی سے ضیاء بار بھی، شاہ ولی اللہؒ کے پیغام کا علمبردار بھی تھا۔ اور از ہر ایشیاء دارالعلوم دیوبند کا تاجدار بھی، تھانویؒ رشد و ہدایت کا راز دار بھی، اور علوم کے سمندر کو ایسا سمویا وسمیٹا تھا کہ اس سے جو نکھار آیا تو سب ہی نے دیدہ ودل فرش راہ کر دیا تھا۔ ایسی ہستی کو یاد کرتے ہیں تو ماضی کے زندہ جاوید نقوش ابھر آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی آپ پر رحمتیں ہوں اور لازوال انعامات کی بارش ہو۔

---

(۱) حضرت مولانا احمد صاحب پرتاپ گڈھیؒ، روح البیان، ج ۳، ص: ۶۱ تا ۶۴

❖

حکیم الاسلامؒ کے معصوم سراپا کے دل آویز خطوط!

مولانا شاہین جمالی صاحب

امداد الاسلام، میرٹھ

بیس برس پہلے مظفر نگر میں میں نے ایک ایسے بزرگ کا جلوہ دیکھا تھا جو اخلاق و کردار سے لیکر رفتار وگفتار تک ''فرشتوں کی دنیا کا انساں'' یا انسانوں کی دنیا کا فرشتہ'' معلوم ہوتا تھا، حضرت اقدس مولانا مفتی عبدالرحیم صاحبؒ تلمیذ رشید حضرت شیخ الہندؒ کے پاس مہنے دو مہینے میں وہ ضرور رونق افروز ہوتے تھے اور جب بھی تشریف لاتے انجانے طور پر دل مسرتوں سے لبریز ہو جاتا، آنکھوں میں جیسے کچھ چمک سی آجاتی اور طالب علمانہ حرکات وسکنات میں شوخی وشرارت کی جگہ متانت وسنجیدگی پیدا ہو جاتی اور دل چاہنے لگتا کہ انھیں چپکے چپکے پہروں دیکھتا رہوں اور حقیقت یہ ہے کہ گھنٹوں ان کا شرف دیدار حاصل رہتا پھر بھی دل و نظر کے سیر ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا، یہاں تک کہ وہ واپس تشریف لے جاتے اور میں جگر کے اس شعر کی صداقت آزمانے کے لئے تنہا رہ جاتا۔

وہ کب کے آئے اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

ملکوتی جمال کا یہ پیکر اتنا دلکش اتنا پاکیزہ اور اتنا زیب نظر تھا کہ بعد وصال بھی اس کے بزرگانہ خدوخال کا قلمی خاکہ اور اس معصوم سراپا کا عکس جمیل کاغذ کے صفحہ پر نکہت ونور اور قوس قزح بن کر بکھر جانا چاہتا ہے۔

گداز دودھیا بدن حسن یوسفؑ کی طرح جلوہ فگن، متوسط قد وقامت جسمانی وروحانی ودانش کی دو گہری جھلیں آنکھوں کے حلقوں پر سیاہ سفید بھوؤں کی کمان، تیرگی شام میں نمود وسحر کا اعلان جوڑی تابناک پیشانی خدا کے حضور سربسجود رہنے کی نشانی روشن چہرہ بدر وہلال نہیں آفتاب وماہتاب، چہرے کے دائرے پر

مشرع سفید داڑھی آئینۂ جمال پر بزرگانہ جلال کی مینا کاری، سر پر عالمانہ ہیئت کے کٹے ہوئے سفید بال اور اس پر اونچی دیوار کی دوپلی طیب کیپ گویا: وله الجوار المنشئت فی البحر کا الا علام بدن پر موسم کے مطابق سرد وگرم فسٹ کلر کی شیروانی، نزاکت ونفاست کی کہانی، بیش قیمت کپڑے کا لمبا کرتہ اور گول موری کا پاجامہ، تراش وخراش اور لباس میں بزرگی کا خبر نامہ، اس قلمی خاکے کی عظیم شخصیت کو دیوبند کے عوام وخواص مہتمم صاحب اور باہر کی دنیا میں لوگ ''حکیم الاسلام'' کے بلند لقب سے پکارتے تھے وہ منھ کھولے تو لب گل سے پھول جھڑتے اور جب وہ نہیں بولتے تو صدف میں موتی پلتے تھے، ان کے لہجے کا تر نم، شملہ کی پہاڑی ندیوں کا جلترنگ اور کشمیر کے آبشاروں کی موسیقی تھی، اور بول بول کی مٹھاس قند وشکر جیسی تھی، ان کی تقریر علم وفن کی خشک زمین کے لئے برسات اور تحریر قاری کے دل پژمردہ کے واسطے آب حیات تھی، لفظ لفظ میں علم وحکمت کا گہر اور جملے جملے میں معرفت کا سمندر پوشیدہ ہوتا تھا، دوتین گھنٹے کی تقریر دلپذیر اسرار شریعت کی حکیمانہ تعبیر وتفسیر اور کمال یہ کہ ہر ایک کے لئے پراثر و بے نظیر ہوتی تھی، ہر بات میں حکمت اور ہر حکمت میں کوئی بات پیدا کر لینے کی گرانمایہ دولت وحست ہے، پنڈت دیانند سرسوتی نے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی تقریر سنکر کہا تھا کہ ان کی زبان پر سرسوتی (علم کی دیوی) بولتی ہے اور اگر وہ ان کے پوتے حکیم الاسلام کی بات سنتے تو ضرور یہ کہتے کہ ان کے شبد شبد میں سرسوتی رس گھولتی ہے۔

حکیم الاسلامؒ جسمانی روگ کے طبیب نہیں بلکہ لا علاج روحانی مرضوں کے خاندانی حکیم تھے، آپ کے حکیمانہ کلمات نے سینکڑوں دلوں میں ایمان ویقین کا بیج بویا اور ایمان واسلام کے ہزاروں نازک پودوں کو آب حکمت سے سیراب کر کے آپ نے تناور درخت بنایا، عقلی ونقلی شکوک وشبہات کی ہزاروں گرہیں آپ کے ناخن علم وحکمت نے آن کی آن میں کھول دی تھیں، حکمت قاسمی کی بلندیوں تک آپ کی رسائی اور ان کے علوم ومعارف پر آپ کو عبور اور دسترس حاصل تھی، سننے والے جب آپ کی بات سنتے تو سر دھنتے اور مجلس سے اپنی تنگ دامانی کا گلہ لے کر اٹھتے تھے اس لئے کہ:

دامانِ نگہ تنگ وگل، حسنِ تو بسیار گل چیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ماڈرن ماحول میں آپ کی ''سائنس اور اسلام'' اور ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی جگہ انسانی عظمت کا مسئلہ اور نئی تہذیب وتمدن کی چکاچوند میں ''آفتاب اسلام'' کا جلوہ بالکل ہمیشہ نمایاں دکھائی دیتا رہے گا۔

مجھے کچھ معتمد اہل علم نے بتلایا کہ ۲۵/۳۰ برس پہلے میرٹھ شہر کے اندر حکیم الاسلامؒ کی ایک ہفتے کی تقریر سے

عوام میں اتنا شدید اسلامی تاثر پیدا ہو گیا کہ ان کی تقریر امتناعی حکم لاگو کرنا پڑا۔

حکیم الاسلامؒ کے اندازِ خطاب ان کے اسلوب بیان، اور تقریر کے لب ولہجہ کو نہ الفاظ مین بیان کیا جا سکتا ہے، نہ دوسرے کی زبان میں نقل کیا جا سکتا ہے، وہ تمام عالم مین اپنے طرز کے منفرد خطیب اور شرعی اسرار و حکم بیان کرنے میں حکیم لبیب تھے۔

مذہبی گروپ اور جماعتی عصبیت سے ان کا مزاج بالکل جوڑ نہیں کھاتا تھا، وہ سیاسی پلیٹ فارم پر کسی زمانے میں مسلم لیگ کے حامی ضرور رہے، لیکن اس میدان میں بھی تعصب سے دان بچالینا ان کی زندہ کرامت ہے، اسلامی فرقوں کے درمیان ان کی ذات اتنی معتدل، اتنی متوازن اور اتنی غیر جانب دار رہی کہ دوست دشمن سے انکی عظمت و بلندی کے معترف تھے۔ جماعت اسلامی پر علماء دیو بند کی نکیر بلکہ سیاسی محاذ آرائی کی وجہ سے شدید تنقید وتحریر کے طویل دور مین حضرت مہتمم صاحبؒ کی شخصیت افراط وتفریط سے کبھی آلودہ نہیں رہی اور یکساں طور پر ہر حلقے میں قابل احترام بزرگ کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے رہے۔

سیاسی ذہن وشعور کو خدا ہدایت دے کہ اسنے انسانوں کو اتنے مختلف خانوں میں بانٹ دیا ہے کہ ان کا ایک انسانی شرافت اور صالح قدروں کے پیکر میں سمٹ آنا ایک مشکل اور دشوار کام بن گیا ہے، تاہم حضرت مہتمم صاحبؒ کی شخصیت مستثنیات میں سے ہے کہ سیاسی دائرہ بندیوں میں بھی آپ اپنی علیحدہ شان اپنا منفرد وقار قائم رکھنے میں کامیاب رہے اور کسی سیاسی جماعت کو آپ کے قول وفعل سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

جون ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۷ء ایمر جنسی کے تاریک دور میں فیملی پلاننگ کے مسئلے نے جہاں عوام کو جھنجھوڑ رکھا تھا، وہیں علماء اس کے جواز وعدم جواز میں دو انتہائی رخ پہ جا رہے تھے، عین اس وقت آپ نے اس مسئلہ کو اجتہادی مسئلہ قرار دیکر اہل علم و دانش کے لئے غور وفکر کی راہ کھول دی تھی، اور اب آئندہ جب بھی اس مسئلہ پر قطعی فیصلہ ہوگا اس میں مہتمم صاحبؒ کے فکر وخیال کی روشنی ضرور پائی جائیگی۔

حضرت مہتمم صاحبؒ کے گنگا جمنی مزاج نے دارالعلوم دیو بند کے مسلک اعتدال اور ساری دنیا میں اسکے بزرگوں کی قابل تقلید مثال کو استحکام بخشا ہے اور دلوں کی گہرائیوں میں اسکے واسطے جگہ بنائی ہے اب آپ ہی کی شخصیت پندرہویں صدی کے آغاز اور چودھویں صدی کے خاتمہ پر عالمِ اسلام کے لئے فکری قیادت فراہم کر رہی تھی، کاش اس تاریخ ساز شخصیت کو سارے عالمِ انسانی کی عمریں لگ جاتیں، اور وہ صدی در صدی رہنمائی کے ہر موڑ پر روشنی بکھیرنے کے لئے موجود رہتے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ دارالعلوم دیو بند کے صرف مہتمم ہی نہیں بلکہ فتنوں کے سیلاب میں

ایک ایسی مضبوط چٹان تھے جس سے ٹکرا کر تمام دھارے خود ہی اپنا رخ پھیر لینے پر مجبور تھے لیکن جس دن سے یہ پہاڑ ہل گیا ہے سیلاب کا زور تصورات کے بہت سے محلوں کو تنکوں کی طرح بہائے لئے جا رہا ہے۔

ہمیں اردو ادب کی تاریخ سے شکایت ہے کہ کم و بیش ڈیڑھ سو کتابوں کا یہ عظیم مصنف آج بھی ادب کی دنیا میں غیر معروف اور تاریخ ادب کے صفحات میں گمنام ہے، حالانکہ اس عظیم صاحب قلم اور صاحب طرز ادیب کو اس کی خدمات پر اردو ادب کا بلند مقام ملنا چاہئے تھا، ہم یہ تو مان سکتے ہیں کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے قلم میں شبلی کا زور بیان اور ابوالکلام آزاد کی شوکت الفاظ یا عبدالماجد دریا آبادی کی زبان نہیں مگر ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ اردو ادب کے لئے ان کی خدمات کسی دوسرے مصنف سے کسی درجہ میں کم ہیں ان کی آنکھ کی کہانی خود ان کی زبانی اردو شعر و ادب کا نقش لاثانی ہے۔

میرے نزدیک دارالعلوم دیوبند اور حضرت مہتمم صاحبؒ ایک دوسرے کا صحیح تعارف ہیں، اگر کوئی مہتمم صاحبؒ کو جاننا چاہے تو بس اس کے سامنے دارالعلوم کا آئینہ رکھ دیجئے، مہتمم صاحبؒ کی علمی، سیاسی، فکری اور اخلاقی زندگی کا ہر ہر گوشہ چمک اٹھے گا اور اگر کسی کو دارالعلوم کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہوں تو اسے مہتمم صاحب کا آئینہ دکھایئے کہ اس میں دارالعلوم کے علوم و فن کی پوری کائنات تابناک نظر آئے گی۔

مہتمم صاحبؒ اپنی نرم پالیسی اور شان صدیقی کی بناء پر دارالعلوم کے دل کی دھڑکن تھے، عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انھوں نے آج تک اپنے قلم سے کسی ادنیٰ ملازم کو بھی برخاست نہیں کیا، ان کی اسی ادا پر طلبہ، اساتذہ اور عملہ سب فریفتہ و گرویدہ تھے، اور یہی چیز پوری دنیا میں دارالعلوم کو بحیثیت ادارہ ایک مثالی مہتمم کی ناقابل فراموش خدمات سے ممتاز کرتی ہے جس کی دوسری کوئی مثال مشکل ہی سے کہیں مل پائے گی۔

میں نے حضرت مہتمم صاحبؒ سے مشکوٰۃ شریف پڑھی ہے اور مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہے کہ مہتمم صاحبؒ چھوٹوں پر شفقت اور ہر ایک کے لئے رافت و رحمت کا مجسمہ تھے ابھی کوئی چار سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے اپنے لڑکے محمود الرحمٰن سلمہٗ کی پیدائش کی ایک تقریب میں حضرت کی شرکت کو ضروری سمجھ کر خدمت میں حاضری دی، مدعا عرض کیا منظوری عطا ہو گئی پھر کسی ضروری سفر کی مجبوری سے شرکت غیر یقینی ہو گئی تو آپ نے مدرسہ اصغریہ میں مجھے اس کی اطلاع کرائی پھر سفر سے واپسی پر مجھے طلب فرمایا اور خود ایک تاریخ دے کر پچھلے وعدے کی مکمل تلافی فرمادی۔

حضرت مولانا عبدالرحیمؒ کے ساتھ میں دارالعلوم میں داخل ہونے سے پہلے بارہا حاضر ہوا، اور طیب منزل

کے ملاقاتی کمرے میں جس کی چاروں دیواروں پر آویزاں ملکی وغیر ملکی سیکڑوں سپاس ناموں کے فریم حضرت مہتمم صاحبؒ کی عالمی مقبولیت کا پتہ دیتے تھے۔ گھنٹوں ان سے شرف ملاقات حاصل رہا، پھر بھی نگاہ کبھی آسودہ نہیں ہوئی اور دل اندر سے یہی کہتا رہا یہ حضرت مہتمم صاحبؒ کی شخصیت سپاس ناموں کے فریم میں نہیں دل کے آئینہ خانے میں سجانے کے لائق ہے۔

حضرت مہتمم صاحبؒ حیات کی ۸۸ر منزلیں طے کر چکے تھے، لیکن ضعف پیری اور نقاہت جسمانی کے باوجود تسلسل سفر کا یہ عالم تھا کہ دیوبند میں قیام کا وقفہ ہمیشہ سفر سے مختصر ہی رہتا تھا۔

زندگی خود ایک سفر ہے لیکن ان کی منزل اسلام اور دارالعلوم کے عشق کی معراج تھی اور یقین ہے کہ اس کے صلے میں ان کو جو زندگی ملی ہے وہ موت کے ہاتھوں محفوظ ہے، عارف شیرازی نے سچ کہا ہے:

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

............❖............

حکیم الاسلامؒ کا سلسلۂ بیعت وارشاد

مولانا عبدالرؤف صاحب عالیؒ
سابق پیشکار دارالعلوم وقف دیوبند

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب کی شخصیت برصغیر میں ملت اسلامیہ کی کم از کم چھ دہائیوں پر محیط ہے اس لیے بیسویں صدی میں دنیائے اسلام کی نامور شخصیتوں کی فہرست حکیم الاسلامؒ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی لیکن ایک اور ہی زاویئے سے دیکھئے تو اتنی متنوع، ہمہ جہت، اعلیٰ اخلاق اور جامع صفات شخصیت کی مثال ماضیٔ قریب میں دور دور تک نہیں پیش کی جاسکتی۔

رفتید و لے نہ از دلِ ما

حضرت حکیم الاسلامؒ کی ذات والا صفات کو دنیا نے پہلے پہل نبیرۂ قاسم علیہ الرحمہ کی حیثیت سے جانا۔ پھر وہ اک فاضل دیوبند اور اک عالم کی حیثیت میں سامنے آئے، پھر وہ اک مدرس کے منصب پر فائز ہوئے پھر انھیں مہتمم کا اعزاز ملا۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ اک مقرر اور اک خطیب کی شخصیت کی حیثیت سے ملک بھر میں علمی اور دینی حلقوں میں ابھرے، اس طرح اک عالم، اک معلم، اک مقرر، اک خطیب، اک ادیب، اک مصنف، اک منتظم، اک مدبر، اک مصلح، اک صوفی اور اک مرشد کی شان اس اک ذات میں اکٹھی ہوگئیں، غرض علم وفضل اور دین وملت کا کونسا افق ایسا باقی رہ گیا تھا جہاں وہ سدا بہار شخصیت موجود نہ رہی ہو، بلاشبہ وہ اک دبستان علم، اک بزم ہدایت، اک چشمۂ اخلاق، اک گلدستۂ فضائل سبھی کچھ تھے، تاریخ کے جس سنگِ میل پر ان کی ذات کھڑی تھی اس لحاظ سے وہ خود اک عہد بھی تھے اور اک عہد کا آخری دروازہ بھی، وہ خود اک تاریخ تھے اور اک تاریخ کا آخری باب بھی، وہ خود اک انجمن بھی تھے اور اک انجمن کی آخری یادگار بھی، وہ نقوش اسلاف کے نقیب، پچھلی اک صدی کی زندہ جاوید اسلامی شخصیتوں کا عکس جمیل اور امت اسلامیہ

کے اک فرد فرید تھے۔ اس ایک صدی میں برصغیر میں دینی، علمی اور ملی خدمات کے اعتبار سے جو قد آور شخصیتیں گذری ہیں حکیم الاسلامؒ اسی صفت کی عظیم شخصیت تھی اور وہ جتنی عظیم تھی اتنی منکسر المزاج اور حلیم الطبع تھی۔

حسب ونسب، علم وفضل اور خدمت دین کے اعتبار سے حکیم الاسلامؒ کا مقام جماعت دیوبند کی اس تیسری پشت میں سب سے اونچا تھا وہ ان ساری تابناک روایات کے امین تھے جو دیوبندی مکتبِ فکر کے مؤسس حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ قدس سرہ العزیز نے قائم کی تھیں وہ ان تمام اقدار کے پاسبان اور محافظ تھے جو دیوبندیت سے وابستہ ہیں ''سخن دلنواز اور جاں پُرسوز'' کاروانِ دیوبند کے اس امیر کا طرۂ امتیاز تھے، اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ قافلۂ دیوبند کی سربراہی کے منصب پر ایک سے ایک بے بدل شخصیت فائز رہی ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ حکیم الاسلامؒ کی ذات جن گوناگوں صفات کی حامل اور مختلف خوبیوں کی جامع تھی اس کی مثال تاریخ دیوبند کے نہ ماضی میں موجود ہے نہ مستقبل میں متوقع۔

ان کی تعلیم وتربیت اسی بزرگانہ ماحول اور قدیم فضا میں ہوئی تھی جو بزرگان دیوبند کی پروردہ تھی۔ علوم عصری کے کسی استاد کے سامنے انھوں نے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا تھا۔ ان کی ساخت وپرداخت میں جدید تعلیم وتربیت کا کوئی ادنیٰ دخل نہ تھا لیکن اپنی فکری پختگی، علمی برتری اور ذہنی بلندی کے دوش بدوش قلبی وسعت، قاسمی نسبت اور شخصی عظمت کی بنا پر وہ ہر حلقے میں مقبول ومحبوب تھے۔ خواہ وہ علماءِ قدیم کی انجمن ہو یا دانشوران وقت کا اجتماع ہو، خصوصی مسائل پر کوئی مجلس ہو یا عوامی انداز کا کوئی جلسہ ہو، خالص دینی اور دعوتی موضوع پر کوئی اجلاس ہو یا معاشرتی اور ملّی مسائل پر کوئی سیمنار ہو۔

ان کی خوش گفتاری اور شیریں بیانی، لہجے کی دلربائی اور نکتہ آفرینی، مضمون کی فراوانی اور موضوع کی رعنائی مجمع کو لوٹ لیتی تھی، ان کا اپنا حلقہ سچ پوچھئے تو وادیٔ گنگا وجمنا اور کاویری سے برہمپتر کے ڈیلٹا تک یا پنجاب وسندھ کے میدانوں سے کابل وکاشغر تک محدود نہ تھا۔ جماعت دیوبند کے وہ پہلے صدر نشیں تھے جس کی زلفوں کے اسیر دنیا کے ہر براعظم میں موجود ہیں، دنیا کے جس قابل ذکر حصّے میں بھی اردو داں مسلم آبادی موجود ہے وہاں انھوں نے مؤثر اور دل نشیں مواعظ سے بے شمار دلوں کی روحانی بستیاں آباد کیں۔ ہر اہم ملک میں انھوں نے جا جا کر خطاب فرمایا وہاں ان کے دلآویز خطابات کے ٹیپ لوگوں کے پاس موجود ہیں جو انھیں جان ودل کی طرح عزیز ہیں۔

برصغیر کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا باقی رہ گیا ہو جہاں حضرت حکیم الاسلامؒ کے قدم نہ پہنچے ہوں، وہ ہر مجلس کے چراغ اور ہر انجمن کے صدر رہتے تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی ہمہ جہت شخصیت ان کی شیوہ بیانی اور منصبی

ذمے داریوں کے پردے میں چھپی ہوئی تھی، بالخصوص ان کی شخصیت کا باطنی اور عرفانی رخ ان کے دوسرے اوصاف میں مستور ہو کر رہ گیا تھا۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ علم ظاہر و باطن کی یک رنگی اور شریعت و طریقت کی ہم آہنگی ہی علماء دیوبند کا خاص وصف ہے اور دیوبند کے ہر فرد میں اس خوشگوار امتزاج کا اثر موجود ہے، البتہ ذوقی اور طبعی فرق کے لحاظ سے کسی فرد پر طریقت کا رنگ غالب ہو جاتا ہے اور کسی پر شریعت کی چھاپ نمایاں ہوتی ہے۔ چناں چہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے دوآبہ کے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ کئی پشت سے علم وحکمت اور معرفت وسلوک کا شہسوار تھا، اس کے گرد وپیش کی فضا علم ظاہر سے مزین اور سوز باطن سے روشن تھی یہ ہی وہ ماحول تھا جہاں حضرت سید احمد شہیدؒ کو مریدان با صفا اور مجاہدین جانفروش کی کھیپ کی کھیپ ملی تھی، اسی علاقے میں ان بزرگانِ وقت کی خانقاہیں قائم تھیں جن کے نفس گرم کی تائید سے جماعت دیوبند وجود پذیر ہوئی جو علوم ظاہر و باطن کے لیے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاح وتبلیغ کے تقاضوں کی تکمیل اور ملکی وملی حقوق کی ادائیگی میں ہمیشہ پیش پیش رہی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ پر اپنے بچپن سے بزرگوں اور اکابر کی خصوصی توجہات تھیں۔ ان کے اساتذہ شروع سے اہل دل اور صاحب باطن حضرات رہے نسبتِ قاسمی کی رعایت سے ان بزرگوں نے موصوف کی علمی اور ظاہری تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ تزکیہ واصلاح قلب کا بھی پورا پورا خیال رکھا۔

دیوبندیت کی عملی تشکیل کے بانی اعظم مولانا قاسم نانوتویؒ کے نسبی تعلق نے حضرت حکیم الاسلامؒ کو تمام اکابرِ دیوبند اور فیض یافتگان قاسمی کا مطمح نظر اور مرجع محبت بنا دیا تھا، ان کی تعلیم وتربیت کا نظم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند نے جس شفقت واہتمام کے ساتھ کیا وہ بزرگانہ تربیت کی بہترین مثال ہے اور اس کے طبعی اور لازمی نتیجے کے طور پر نبیرۂ حضرت حکیم الاسلامؒ کو تاریخ دیوبند میں وہ مقام ملا جو منصب اہتمام دارالعلوم پر فائز ہونے والی کسی دوسری شخصیت کو نہ میسر آیا اور نہ آئے گا۔

تدریس، تالیف، تقریر اور منصبی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ حضرت حکیم الاسلامؒ کا اصلاحی تعلق حضرت شیخ الہندؒ سے قائم ہوا جو آپ کے استاد بھی تھے۔ تربیتِ سلوک کے ابتدائی منازل اپنے مشفق استاذ اور مرشد اول کے زیر سایہ طے کیے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی رحلت کے بعد مجدد ملت حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی طرف رجوع کیا جو درحقیقت دیوبند کے سرخیل بھی تھے اور اپنے مخصوص انداز تربیت کے لحاظ سے شریعت وطریقت کے بہترین جامع بھی۔

تھانہ بھون کی خانقاہ ظاہر و باطن کے معقول امتزاج اور علم وعمل کے دلآویز سنگم کا بہترین نمونہ

تھی، مرشد تھانوی حکیم الامت کا سر مدرسہ کی دستار فضیلت اور جسم خانقاہ کے خرقۂ مشیخیت سے اس طرح آراستہ تھا کہ خرقہ ودستار ایک دوسرے کا جز محسوس ہوتے تھے، غالبًا انہی دونوں کی وابستگی اور لزوم نے مرشد تھانوی کو صحیح معنیٰ میں حکیم الامت بنایا تھا۔

شریعت وطریقت کی جامعیت کے جس دیوبندی طرز فکر کو مرشد تھانوی نے اپنے مخصوص و مستحکم پیمانے میں ڈھالا تھا۔ اور تربیت سلوک کا جو منفرد انداز اپنایا تھا، حضرت حکیم الاسلامؒ کو اس سے طبعی مناسبت تھی۔ وہ سیاست کے خارزار ہنگاموں کی دنیا سے طبعًا بیزار تھے۔ اور یہ ہی تھانوی طریق تربیت کا بنیادی جز تھا۔ استفاضہ اور استفادہ کا یہ سفر انھوں نے اپنے ہمدرس وہم جماعت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ مفتی اعظم پاکستان کی معیت ورفاقت میں شروع کیا، یہ انہی دونوں حضرات کی خصوصیت ہے کہ یہ مکتب سے لیکر مرشد کے آستانہ تک ایک دوسرے کے شریک ورفیق رہے، دونوں ہی نے یکے بعد دیگرے سلوک کی منزلیں طے کرنی شروع کیں تو باہم ایک دوسرے کے لیے باعث رشک بنے، حتیٰ کہ دونوں کو مرشد تھانوی نے خلافت سے سرفراز کیا۔ اور دونوں ہی علم وہدایت کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے، ایک کی تابانی سے مطلع پاکستان چمکا اور دوسرے کے انوارِ قلب ونظر سے برصغیر افق تا افق جگمگایا۔

رشد وہدایت کا یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء کے بعد زیادہ فروغ پذیر ہوا۔ منصب اہتمام کی گوناگوں مصرفیتوں کی بناپر مستقل خانقاہی نظم قائم نہ ہونے کے باوجود حضرت حکیم الاسلامؒ کی طرف لوگوں کا رجوع ہوا۔

چہرہ کی دل کشی، نگاہوں کی پاکیزگی اور پیشانی کا نور دیکھنے والے کو پہلی ہی نظر میں عقیدت واحترام کی آنکھیں بچھانے پر مجبور کر دیتا تھا، ان کی مجلس ولیوں کی مجلس کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی اس میں کسی کی غیبت والزام تراشی کا گذر نہ تھا، علم کے نادر نکات بیان ہوتے، شریعت کے لطیف دقائق اور تصوف کے دلپذیر حقائق کی تشریح ہوتی۔ سلف کے مؤثر اور عبرت انگیز تذکرے چھڑتے اور بصائر ومعارف کا اک دریا موجزن ہوتا۔

حکیم الاسلامؒ کی زبان سے موتی جھڑتے، یوں معلوم ہوتا کہ ایک آبشار علم ہے جو فکر ونظر کو سیراب اور قلب وذہن کو شاداب کر رہا ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کے متوسلین میں دیہات کے سیدھے سادھے کسانوں سے لیکر یونیورسٹیوں کے لیکچرار اور وزراء حکومت تک شامل ہیں۔

بیعت کرنے والوں کو نہایت خاموشی اور سادگی سے اپنے مرشد کے طریق پر بیعت فرماتے اس کے بعد دوازدہ تسبیحات کی تلقین، فرائض کی پابندی اوامر پر لزوم اور نواہی سے احتراز کی تاکید فرماتے، اختلافات سے بچنے، ہر معاملے میں اعتدال برتنے، متعلقہ ذمہ داریوں کو حتی الامکان ادا کرنے کی ہدایت فرماتے، دوسروں کے ساتھ حسن ظن سے کام لینے، طبقاتی اور مسلکی نزاعات سے بچنے، امت مسلمہ کے

اتحاد واتفاق کو ترجیح اور امت کی فلاح و بہبودی میں دلچسپی لینے کی ترغیب دیتے۔ بیعت وارشاد کے رسمی طریق کو بھی لازمی قرار نہیں دیتے تھے، بیشمار لوگ جو بیعت کے لیے زیارت کی خواہش اور بالمشافہ ملاقات کی آرزو رکھنے کے باوجود حاضری کی سکت اور وقت کی گنجائش نہیں رکھتے تھے ان کو بذریعہ مراسلت بیعت فرمالیتے مریدین اپنے احوال بذریعہ مکاتبت پیش کر کے اصلاح سے مستفیض ہوتے۔

نرم خوئی اور نرم گوئی ایک وصف تھا جو حضرت حکیم الاسلامؒ کی رفتار گفتار اور کردار کا جز ولاینفک تھا۔ گھر سے لے کر باہر تک اور نظم وانصرام سے لے کر بیعت وارشاد تک اس وصف کی چھاپ ہر چیز میں نمایاں تھی۔

حلم وبردباری اور اکرام مسلم واحترام آدمیت کے وعظ بہت کہے سنے جارہے ہیں اور اکرام مسلم کی اصطلاح تو اس دور کی اک مسلمہ دینی اصطلاح قرار پا گئی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اسی اصطلاح کا انطباق بھی اک خاص دائرہ کی حد تک ہی کیا جاسکتا ہے۔ اکرام مسلم پر عمل کی صحیح مثال حضرت حکیم الاسلامؒ کے زبان وقلم کے سوا کسی بڑے سے بڑی دینی شخصیت کے یہاں بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔

ماضیٔ قریب کے گزشتہ چند سال جو دیوبند اور شاید برصغیر کے علماء کی تاریخ کا سب سے المناک باب کہے جاسکتے ہیں اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ اس جاں گسل اور صبر آزما دور میں بھی آپؒ ہی علمائے دیوبند کے ''منصور وقت'' نکلے، زندگی کے اس آخری دور میں جب خانقاہوں نے دہشت زدگی کے عالم میں ہونٹ سی لیے تھے اور علمائے روزگار عاجزی، خاکساری، اور خداترسی کی قبائیں پہن کر اپنے زبان وقلم سے آپؒ کے بے داغ سینے پر پتھر برسا رہے تھے اس وقت بھی آپؒ نے کوئی سقیم لفظ قلم سے لکھا نہ زبان سے نکالا۔ اور ارادتمندوں کے اس اصرار بے حد پر کہ '' کچھ تو کہئے کہ لوگ کہتے ہیں، زبان سے صرف یہ فقرہ ادا کیا جسے تصوف کا مغز، ولایت کا حاصل اور انسانیت کا جوہر کہا جاسکتا ہے کہ:

''میں نے اپنے لیے صبر، سکوت اور استغناء کو پسند کر لیا ہے''

بلاشبہ یہ جملہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اور اسے قطبیت کا سرمایہ کہا جاسکتا ہے۔

آپ کا حلقۂ ارشاد وبیعت ہند وپاک، بنگلہ دیش، ایران، برما، ممالک عربیہ، یورپ، افریقہ اور امریکہ تک پھیلا ہوا ہے۔

یہ تأثرات محبّ مکرم جناب سید ازہر شاہ قیصر کی فرمائش پر سپرد قلم ہیں، ورنہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے روحانی اور عرفانی مقام کی تشریح اور اس کا تعارف کسی صاحبِ دل اور معارف آگاہ اہل قلم ہی کا حق ہے جو امید ہے کہ کسی وقت کسی باتوفیق قلم سے ضرور منصۂ شہود پر آئے گا۔ وباللہ التوفیق۔

............❖............

دینی دعوت کے قرآنی اصول

ایک شاہکار تصنیف

مولانا محمد طاہر مدنی
جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کی شخصیت جامع کمالات تھی۔علم وفضل، زہد و تقویٰ، تحقیق وتصنیف، نظم وانتظام، تدریس وتربیت اور دعوت وارشاد، گوناں گوخصوصیات آپ کی ذات گرامی میں مجتمع تھیں۔دارالعلوم جیسے عالمگیر شہرت کے حامل ادارہ اہتمام کی ذمہ داری اور کثرت اسفار کے باوجود دلائل قوت، استدلال کی باریکی، اسلوب کی دلکشی اور مربوط انداز بیان آپ کی تصنیفات کا امتیازی وصف ہے۔

اس مقالہ میں آپ کی کتاب ''دینی دعوت کے قرآنی اصول'' کا تعارف پیش نظر ہے۔یہ کتاب دعوت اسلامی کی اہمیت اور اس کے اصول وآداب پر ایک بے نظیر اور شاہکار تصنیف ہے جس میں صحیح معنوں میں سمندر کو کوزے میں سمیٹ دیا گیا ہے۔یہ کتاب ابتداء میں ایک مقالہ کی شکل میں تھی اور بعد میں مصنف نے نظر ثانی کے بعد کافی اضافہ کر دیا۔

ایڈیشن

میرے پیش نظر جو ایڈیشن ہے اسے ''کتب خانہ رحیمہ، دیوبند'' نے ۲۰۰۴ء میں بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔۱۳۶ صفحات پر یہ ایڈیشن مشتمل ہے۔آغاز میں حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم، مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کی تقریظ ہے جس میں بجا طور پر انہوں نے اس کتاب کے بارے میں یہ لکھا ہے:

''یہ کتاب ایسا متن ہے جو حسب ظروف واحوال دنیا کے تمام ملکوں، تمام قوموں اور تمام ادیان وملل

کے سامنے موثر ترین اسالیب پر مشتمل ابلاغ دین کی انشاء اللہ ایک مکمل راہ ثابت ہوگی۔

مباحث

تمہید کے علاوہ کتاب میں نظام دعوت کے چار ارکان دعوت، داعی، مدعو اور مدعوالیہ پر مبسوط گفتگو ہے۔ مصنف علیہ الرحمہ نے آیت کریمہ اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡھُمۡ بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ کو کتاب کی بنیاد بنایا ہے اور اس آیت کریمہ سے اپنی دقت استدلال، ژرف نگاہی اور علوم شریعت پر دسترس کی بدولت دعوت و تبلیغ کا ایک مکمل پروگرام اور بنیادی دستور العمل مرتب فرما دیا ہے جو ہر دور میں داعیان اسلام کے لئے راہ نمائی کرتا رہے گا۔ حکیم الاسلامؒ کی علمی بصیرت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس آیت کریمہ کی روشنی میں ۲۷ اصول وضوابط دعوت کا استنباط کیا ہے۔

تصنیف کا محرک

مصنف علیہ الرحمہ نے اپنا مقصد تصنیف ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ: ''اس تصنیف یا دعوتی فکر کے خاکہ کا مقصد محض علمی حد تک ہی نظام دعوت پیش کر دینا نہیں جو کاغذ اور قلم یا زبان ذہنی سطح سے آگے نہ بڑھ سکے بلکہ حقیقی جذبہ یہ ہے کہ ان اصول پر داعیوں کی ایک جماعت تیار ہو جو قرن اول کے اندر سے غیروں کو اسلام کی دعوت دی اور علمی بصیرت کے ساتھ اقوام عالم کو قرآنی مقاصد سے روشناس کرائے جسے افسوس ہے کہ امت نے تقریباً اس طرح بہلا دیا ہے کہ گویا وہ اسلامی زندگی کا کوئی موضوع ہی نہیں ہے اور اس طرح آج اسلامی امت اپنے فکر وعمل میں بجائے اقدام وہجوم کے محض دفاعی قوم بن کر رہ گئی ہے۔ دراں حالیکہ اس امت کا تمام تر آغاز وانجام اقدامی دعوت اور ہجوم کے ساتھ آگے بڑھ کر دنیا کو اسلام سے روشناس کرانا تھا تاکہ اسلامی برادری ہر دور اور ہر قرن میں وسیع سے وسیع تر ہوتی رہے اور امر بالمعروف کا نظام عالمگیر ہو جائے۔(۱)

تبلیغ اسلام کا مفہوم

تبلیغ اسلام کا مفہوم مصنف علیہ الرحمہ نے بہت واضح الفاظ میں یہ بیان فرمایا ہے کہ اقوام عالم تک اسلام کا پیغام پہونچانا اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینا تبلیغ اسلام ہے۔ امت کی اندرونی اصلاح کی

کوشش تذکیر واصلاح ہے۔ چنانچہ رقم طراز ہیں:

''تبلیغ اسلام کے معنی پشتینی مسلمانوں کو عباداتی رنگ کے کچھ احکام پہنچا دینے اور انہیں وابستہ کر لینے کے نہیں ہیں کہ جس کے بعد یہ سمجھ لیا جائے کہ فریضۂ تبلیغ ادا ہو گیا یا ارباب تبلیغ فرائض دعوت سے سبکدوش ہو گئے۔ مجھے اس انداز کی کسی دعوت خاص کی ضرورت سے اگر چہ انکار نہیں لیکن اسے فریضہ تبلیغ سے سبکدوشی سمجھ لیا جانا قرآن کے اصول وتبلیغ کی روشنی میں یقیناً صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا۔ یہ جزوی تبلیغ، تذکیر واصلاح وغیرہ کے عنوانات سے یاد کی جاسکتی ہے مگر عرف شریعت کے لحاظ سے اسے تبلیغ نہیں کہا جاسکتا اور توسعاً اگر کہا بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ تبلیغ احکام کہا جاسکتا ہے (بشرطیکہ احکام رسائل پہنچائے جائیں) تبلیغ اسلام نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ عرفِ شریعت میں تبلیغ (درحقیقت اسلام پہونچانے اور اسلامی برادری کے وسیع کرنے کو کہا گیا ہے۔ اس لئے تبلیغ اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے اسلام کا پیغام پہونچانے کا نام ہے۔ (۲)

انسانی سعادت کی بنیاد

قرآن واحادیث کی روشنی میں مصنف علیہ الرحمہ سے انسانی سعادت وکامیابی کی بنیاد دو چیزوں، صلاح واصلاح کو قرار دیا ہے یعنی انسان خود صالح بنے اور دوسروں کو صالح بنانے کی سعی و جہد کرے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے انسانی سعادت کا دارومدار دو چیزوں پر ہے۔ صلاح اور اصلاح یعنی خود صالح بننا اور دوسروں کو صالح بنانا یا خود کمال پیدا کر کے دوسروں کو باکمال کر دینا جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات محض لازمی اور ذاتی نفع پر قناعت نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کو شعری بنایا گیا ہے کہ ایک سے دوسرے تک پہونچے۔ (۳)

دعوتی پروگرام کی اجمالی تعیین قرآن سے

دعوت کی اہمیت اور آداب اور اس کے مقامات کی تعیین مصنف نے آیت کریمہ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل) سے کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس آیت میں دعوتی پروگرام پھر دعوت الی اللہ کے انواع واقسام اور ان کے رنگ ڈھنگ اور پھر دعوت دہندوں کے مخصوص احوال اور اوصاف پر خصوصی اور گہری روشنی ڈالی ہے اور ضمنی طور پر مدعوین کے خاص اوصاف کی طرف بھی کچھ ارشاد فرمایا ہے جس کا اجمالی خاکہ یہ ہے کہ:

ا۔ دعوتی پروگرام کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مدعوین تک پہونچنے کی صلاحیت ہو۔

۲- دعوت کی خوبی یہ ہے کہ وہ مدعو اور مخاطب کے مناسب حال ہو۔
۳- داعی کی خوبی یہ ہے کہ اس کا علمی اور اخلاقی معیار بلند ہو۔
۴- مدعو کی خوبی یہ ہے کہ اس میں قبول کا جذبہ موج زن ہو۔
انہی چہار گانہ مقاصد کی تفصیلات پورے مالہ و ماعلیہ کے ساتھ اس آیت دعوت میں بیان فرمائی گئی۔'' (۴)

مدعوالیہ یعنی دعوتی پروگرام

مدعوالیہ کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف نے یہ ثابت کیا کہ قابل تبلیغ چیز صرف علمِ شرعی ہے جو اللہ کی جانب سے نازل کردہ ہے اور جسے آیت کریمہ میں ''سبیل رب'' سے تعبیر کیا ہے۔ اسے خالص شکل میں پیش کرنا لازم ہے۔ اختراعات و محدثات اور بدعات کی تبلیغ جائز نہیں ہے۔ اسی طرح تبلیغ میں یک گونہ سادگی اور بے تکلفی ہونی ہے چاہئے اور تکلف کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

قُلْ مَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِيْنَ.

ترجمہ: اے رسول آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس قرآن کی تبلیغ پر نہ کچھ معاوضہ چاہتا ہوں اور نہ بناوٹ کرنے والوں میں سے ہوں۔ یہ (قرآن) تو سارے عالم کے لئے ایک ذکر ہے۔

مصنف نے دعوتی نقطہ نظر سے دیگر مذاہب کا جائزہ لیا اور یہ ثابت کیا ہے کہ وہ تبلیغی مذاہب نہیں ہو سکتے۔ صرف اسلام ہی تبلیغی مذہب ہے کیوں کہ وہ محفوظ ہے اور آفاقی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ اسلامی دعوت عالمیت کی شان رکھتی ہے۔

انواع دعوت

آیت دعوت کی روشنی میں مصنف نے انواع دعوت کی تعیین کی ہے اور حکمت، موعظت اور مجادلت پر بڑی عالمانہ گفتگو فرمائی ہے پھر حکمت علمی و حکمت عملی، موعظت علمی و موعظت عملی اور مجادلت علمی و مجادلت عملی کی تشریح مثالوں کے ساتھ کی ہے پھر دعوت میں مخاطب کے مزاج و ذہنیت کی رعایت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حق تعالیٰ کو محض تبلیغ ہی مطلوب نہیں بلکہ اس کے ساتھ مخاطبوں کے احوال اور طبائع کی رعایت بھی منظور ہے جس کا منشا شفقت ہے۔'' (۵)

اس کے بعد متنوع مضامین دعوت، تجدد دعوت، ترک غلظت وشدت، تاخیر دعوت، اغماض ومسامحت اور مخاطبوں کے ساتھ شفقت ورحمت کے متنوع عناوین کے تحت دعوتی کلام کی وضاحت و بلاغت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی اہمیت واضح کی ہے۔

دعوت کو مؤثر بنانے کی تدابیر

دعوت کو مؤثر بنانے کے لئے کارگر تدابیر کو اختیار کرنے کی بڑی اہمیت ہے اس لئے مصنف علیہ الرحمہ نے ان تمام مؤثر تدابیر کو اختیار کرنے کی تاکید کی ہے جن سے تبلیغ کا عمل موثر تدابیر کو اختیار کرنے کی تاکید کی ہے جن سے تبلیغ کا عمل موثر ہو اور مخاطبین کے دل کھنچ جائیں۔ مثلاً فراہمی قوت وشوکت جامعیت و اجتماعیت اور تنظیم ومرکزیت۔

مدعوین اور ان کی قسمیں

اس عنوان کے تحت مدعوین کی تین اقسام کا تذکرہ ہے۔ اذکیاء (حمیت پسند) اغبیاء، (منازعت پسند) اور صلحاء یعنی (سلامت پسند) ان کے لئے آیت کریمہ میں حکمت، موعظت اور مجادلت کا طریقہ اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ حکمت عقلاء کو چاہتی ہے۔ مجادلت اغبیاء کو کھینچتی ہے اور موعظت صلحاء کا تقاضہ کرتی ہے۔ مصنف نے سماع دعوت کے مختلف انداز کا تذکرہ بھی فرمایا ہے اور سماع قبول سوء سماع اور قلب اعراض، شغب اور استہزاء کا ذکر کیا۔

داعی اور اس کے اوصاف

دعوتی کام میں داعی کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ دعوت کی کامیابی اور اس کی اثر پذیری بڑی حد تک داعی کی ذات پر منحصر ہے اس لئے ان اوصاف کا بیان ضروری ہے جن سے داعی کو متصف ہونا چاہئے۔ مصنف علیہ الرحمہ نے ان اوصاف کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک کا تعلق مبلغ کی ذات سے اور دوسرے کا تعلق فعل تبلیغ سے ہے۔

ذاتی اوصاف میں علم وبصیرت

فہم وفراست، دانش وخلق، سیرت وکردار، خوف وخشیت، غنا واستغناء، صبر وتحمل، عفو ودرگذر، رحمت و رافت اور اغماض ومسامحت کا ذکر فرمایا ہے۔

اضافی اوصاف کے سلسلے میں شان تربیت، ترک شدت، عزم واستقلال، رعایت طبائع اور انمول صحت ومعیت وغیرہ کا بیان ہے۔

دستور العمل

کتاب کے آخر میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے تبلیغ کے لئے ایک پروگرام اور دستور العمل بھی مرتب فرما دیا ہے جو انتہائی جامع ہے اور دس نکات پر مشتمل ہے۔

۱-مبلغین اسلام اپنا ایک امیر اور مرکز بنائیں جس کی ہدایت پر کام انجام دیں۔

۲-حسب ضرورت ذیل مراکز کا قیام ہو۔ان مراکز کے ذریعہ رہنمائی اور جائزہ کا کام ہوتا رہے۔

۳-اس دعوت کے مدعو غیر مسلم ہوں جن کے سامنے دین رکھا جائے۔داخلی صلاح کے لئے دوسری جماعتیں ہوں جو مسلمانوں کی اصلاح وارشاد کو اپنا نصب العین بنائیں۔

۴-ان داعیوں کے پاس ایک مختصر کتب خانہ اور دار المطالعہ ہو جس میں اسلامی کتب کے علاوہ ان مذاہب کی کتابیں ہوں جن کے ماننے والوں کے درمیان کام کرنا ہے تا کہ ان کی نفسیات کو سامنے رکھا جا سکے۔

۵-تبلیغی دورے جماعتی طور پر ہوں اور جماعتیں اہل علم کی قیادت میں نکلیں۔پروپیگنڈہ اور تشہیر سے گریز ہو۔

۶-جماعتوں میں با اثر افراد کو شامل کیا جائے تا کہ دعوت کے اثرات وسیع اور پائیدار ہوں۔

۷-مقام دعوت کے با اثر اور سرآوردلوگوں سے پہلے رابطہ قائم کیا جائے اور ان کو ہم چناں بنانے کی کوشش ہو۔

۸-کلمہ حق قبول کرنے والوں کی خصوصی تربیت کا نظم ہو۔

۹-وقفہ وقفہ سے تبلیغی مقامات کا بار بار دورہ ہو اور اثرات کا جائزہ لیا جاتا رہے۔

۱۰-اصحاب تبلیغ یادداشتیں مرکز بھیجتے رہیں۔

اس دستور العمل کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں کتنی جامعیت ہے اور اگر اسے ٹھیک طور سے اپنایا جائے تو امت کو شاہراہ ترقی پر گامزن کرنے کے لئے یہ کافی ہے۔

حالات حاضرہ کے پیش نظر جب کہ امت داخلی افتراق وانتشار اور اغیار کی سازشوں کی وجہ سے کمزوری کی شکار ہے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ امت کے سامنے دعوت کے کام کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے اور قرآن وسنت کی روشنی میں اجتماعی طور پر اس مشن پر امت کو لگا دیا جائے کہ یہی ہماری قوت کا

سرچشمہ اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی راہ ہے۔اس سے امت کے اندر مضبوط اجتماعیت پیدا ہوگی اور اس کا دائرہ کار وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔اس جذبے کی آبیاری اور امت کے اندر دعوتی اسپرٹ پیدا کرنے کے لئے حضرت حکیم الاسلامؒ کی یہ تصنیف ایک مؤثر ذریعہ ہے۔اس کو زبان سے زیادہ عام کرنے اور مختلف زبانوں میں اس کی اشاعت وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے۔

''صد حیف! آج یہ منصوبہ مسلمانوں سے تقریباً ختم ہو چکا ہے اور اسی لئے اقوام غیر کی نسبت سے ان کی برتری اور تولیت جس نے انہیں خیر امت بنایا تھا افسانۂ ماضی ہو کر رہ گئی ہے نیز اسی لئے یہ امت اقدامی امت ہونے کے بجائے جو اس کی اصلی شان تھی محض دفاعی بن کر رہ گئی ہے اور ظاہر ہے کہ دماغ محض نہ صرف یہ کہ ارتقاء کا راستہ بند کر دیتا ہے بلکہ زوال وخفا کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے''(۶)

---

(۱) حضرت مولانا محمد طیب قاسمی، دینی دعوت کے قرآنی اصول، ص:۱۰-۱۱

(۲) ایضاً، ص:۱۱-۱۲

(۳) ایضاً، ص:۲۰

(۴) ایضاً، ص:۲۸

(۵) ایضاً، ص:۶۷

(۶) ایضاً، ص:۱۲

............❖............

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ

اکابر دیو بند کی آخری یادگار

مولانا شمس تبریز ندوی

عالم اسلام خصوصاً ہندوستانی مسلمان ایک عرصے سے قحط الرجال کی ایسی آزمائش سے دوچار ہیں کہ ہر سال ان کے دینی وثقافتی، علمی وسیاسی صفوں میں کوئی نہ کوئی کمی محسوس ہوتی ہے اور نمایاں خلا پیدا ہو جاتا ہے جو عرصے تک پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔ خصوصاً کسی ممتاز عالم اور ربانی شخصیت کا اٹھ جانا ہماری ملت کو داغِ یتیمی ومحرومی دے جاتا ہے۔ رسولِ اعظم ﷺ نے علماء کو انبیاء علیہم السلام کا وارث وجانشین بتایا ہے اور ان کی موت کو علمِ دین کا ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا ہے۔

عن عبداللّٰہ بن عمر بن العاص رضی اللّٰہ عنهم قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول انّ اللہ لایقبض العلم انتزاعا ینتزعهٗ من العباد ولکن یقبض العلم یقبض العلماء حتّٰی اذا لم یبق عالماً اتخذ الناس رؤساء جهالاً فافتوا بغیر علم فضّلو و اضلّو

(صحیح بخاری کتاب العلم)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ علم کو یک بارگی نہیں اٹھالے گا کہ اسے لوگوں کے دلوں سے نکال لے بلکہ علم کو علماء کی موت کے ذریعے اٹھائے گا یہاں تک کہ جب کوئی عالم نہیں رہ جائے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے۔ چنانچہ ان سے سوال کئے جائیں گے تو وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے اس طرح خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔

گذشتہ شوال ۱۴۰۳ھ (جولائی ۱۹۸۳ء) کو بھی ایک ایسا ہی حادثہ پیش آیا جب اکابرِ دیو بند کی آخری

یادگار حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ نے اس دارِ فانی کو الوداع کہی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

حضرت مولانا مرحوم کی ہشت پہلو شخصیت کا نمایاں وصف ان کی جامعیت و ہمہ گیری، علم و ثقافت کے مختلف پہلوؤں میں ان کی عالمانہ نظر کی گہرائی اور فکر کی وسعت و گیرائی تھی جو دارالعلوم دیوبند کے اکابر کا فیضان تھی۔

علومِ اسلامیہ کی تقریباً تمام ہی شاخوں پر ان کی نظر تھی، منقولات کے ساتھ معقولات، بنیادی اسلامی علوم (فقہ و حدیث و تفسیر) کے پہلو بہ پہلو تصوف و کلام و مناظرہ اور ان کے ساتھ شعر و ادب بھی آپ کے گلشنِ فضل و کمال کے غنچہ و گل تھے جن کے رنگ و بو سے ان کی دل کش و دلنواز شخصیت عبارت تھی۔

بہارِ عالمِ حنش و دل و جاں تازہ می دارد

برنگ اصحابِ صورت را بہ بوار بابِ معنی را

اسی جامعیت کے ساتھ انہوں نے علوم اسلامیہ کی دیرینہ روایت کا تسلسل قائم رکھا اور اس ثقافتی امانت و سرمایہ کو جو حضرت شاہ ولی اللہ تک پہنچی تھی اسے اپنے اکابر کے ہاتھوں سے لے کر نئی نسلوں کے حوالے کیا اور عصرِ حاضر میں اس کی معنویت و اہمیت کو مزید اجاگر کیا اور نئے مسائل و حالات کے پیش نظر اسلامی تعلیمات کے استحکام و بقاء اور نشو و نما کا ماحول پیدا کرنے والے اور اسلام اور مسلمانوں کے حق میں علمی و معاشرتی فضا کو سازگار بنانے اور عوام و خواص کو اسلامی پیغام و احکام کی حکمت و مصلحت سے آگاہ کرنے کا فرض بخوبی انجام دیا۔

اپنی اسی جامعیت کے سبب انہوں نے اسلاف و اکابرِ دیوبند کے طرز پر تمام علومِ اسلامیہ کی طرف توجہ مرکوز رکھی اور برصغیر کے مسلمانوں اور ان کے علمی و ثقافتی مرکزوں کو اپنی تقریر دل پذیر اور عالمانہ تحریر سے فیضیاب کیا۔ آپؒ کی تقریروں میں شاید اللہ تعالیٰ نے وہی تاثیر و دل کشی رکھ دی تھی جو کبھی ان کے نامور دادا حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تقریروں میں ہوتی تھی جس کے ذریعہ انہوں نے مباحثۂ شاہ جہاں پور اور میلہ خدا شناسی کے معرکے سر کئے اور آریہ سماجی پنڈتوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

عالمانہ، حکیمانہ اور متکلمانہ تقریروں میں شاید ان کا کوئی دوسرا معاصر ان کا ہم سر و ہم چشم نہ تھا، کتاب و سنت اور علماء امت کے علمی ذخیرے سے برجستہ و برمحل استفادہ، منطقی استدلال، داعیانہ جذبہ، مجاہدانہ نظر، حکیمانہ اُسلوب اور خطیبانہ حاضر دماغی، نفسیات شناسی اور شستہ زبانی و شگفتہ بیانی نے مل جل کر ان کی تقریروں کو ایسا حسنِ قبول بخشا تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی توفیق و مقبولیت سے نوازا تھا کہ وہ موافق و

مخالف سب کے دل موہ لیتے اور اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے، ان کی تقریروں کی یہی کشش تھی جس کے سبب وہ ہمیشہ ہندو بیرونِ ہند کے سفر پر رہتے تھے اور وہ ہندوستان کا شاید ہی کوئی شہر ان کی تقریر سے محروم رہا ہو۔

تقریروں کی طرح ان کی تحریریں اور کتابیں بھی (جن کی تعداد قریب ڈیڑھ سو ہے) ان کے رنگ و تقریر کی حامل ہیں اور ان کے اندر علمیت وروحانیت اور موادِ اسلوب کی بہت سی خوبیاں موجود ہیں اور ان میں اکثر کتابیں بہت اہم موضوعات پر ہیں اور انہوں نے عصرِ حاضر میں اسلام کی تفہیم وترجمانی میں اپنا خاص کردار ادا کیا ہے اور عوام وخواص کی دینی تربیت و رہنمائی میں بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ ادارہ (تاج المعارف) دیوبند کے ذریعہ ان کی بہت سی کتابیں پابندی کے ساتھ شائع ہوئیں اور انہوں نے اسلامیات کے اردو ذخیرے میں مقدار ومعیار کے لحاظ سے بیش قیمت اضافہ کیا۔

ان کی سب سے بڑی قابلِ قدر اور لائقِ تقلید خصوصیات میں مسلک اہل سنت والجماعت میں ان کی وفاداری ووابستگی، علماء سلف میں قدردانی اور ان کے لئے عذر خواہی، اکابرِ امت سے استناد اور ان پر اعتماد اور مشاہیرِ اسلام کے علمی وعملی کارناموں کی روشنی میں اجتہاد اور ان کے علمی وثقافتی ورثہ سے فراخ دلی اور وسیع النظری کے ساتھ استفادہ، اسلام کے ماضی سے خوش گمانی اور حال و مستقبل کی طرف سے امید پروری کے ساتھ فکرمندی، فکرِ ولی اللہی اور اس کے حامل وامین اکابرِ دیوبند خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے گہرے اسلامی افکار پر عبور اور ان سے عقیدت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اس دور میں (مولانا سندھیؒ کے بعد) وہ مسلک دیوبند اور مولانا نانوتویؒ کے متکلمانہ ومجتہدانہ سلسلے کے سب سے بڑے مفکر حکیم اور شارح وترجمان اور اپنے طرز پر حکمت قاسمیہ کے آخری حامل وامین اور علمِ کلام کے دیوبندی دبستان کے عقائد ومقاصد کے سب سے بڑے نمائندہ تھے۔

میں کہ میری نوا میں ہے آتشِ رفتاں کا سراغ
میری تمام زندگی کھوئے ہوؤں کی جستجو

اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے دوسرے مکاتبِ خیال کی خدمات کی قدروتحسین اور ان کے بارے میں ہمدردانہ رویہ اور معتدل ومتوازن رائے رکھنا، تلخ کلامی، بہتان طرازی اور افترا پردازی وعدم رواداری سے اجتناب، اپنے مخالفوں کے ساتھ عفووتحمل، نرم وخوش مزاجی کا برتاؤ، ان کی فکر وشخصیت دونوں کا امتیاز خاص تھا اور وہ حافظ کے اس شعر کے بہترین مصداق تھے۔

آسائشِ دوگیتی تفسیرِ ایں دوحرف است
بادوستاں تلطف با دشمناں مدارا

ان کی یہی وسیع النظری، بلند نظری اور خوش اخلاقی تھی جس کے سبب سے دیوبندی مسلک کے مخالفین یا غیر جانبدار حلقے بھی ان پر اعتماد کرتے تھے اور ان کی رائے اور مشورہ سے مستفید ہوتے تھے اس طرح وہ ہندوستانی مسلمانوں کے ان چند اکابر کی صف میں شامل تھے جن پر مسلمانوں کی اکثریت کو اعتماد واطمینان تھا اور ان کو وہ اپنا متفق علیہ عالم سمجھتے تھے، اسی وجہ سے جب ان کی ایماء پر ''مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کا قیام عمل میں آیا اور دیوبند میں اس کا اجتماع ہوا تو علمائے ہند کی اس اہم مجلس کے وہ صدر بنائے گئے اور اس معزز عہدے پر تاحیات فائز رہے، ہندوستانی مسلمانوں کے اہم علمی وثقافتی اداروں ندوۃ العلماء، مظاہر العلوم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ میں بھی وہ یکساں احترام کے ساتھ مدعو کئے جاتے تھے۔

وہ ایک بلند پایہ عالم اور ممتاز خطیب اور فاضلِ اہل قلم ہی نہ تھے بلکہ اسلافِ دیوبند کے طرز پر احسان وعرفان اور اخلاص وایقان کی دولت سے بھی مالا مال تھے، وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ تھے اور ہندو پاک میں ان کے مریدوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے یہی گہری روحانیت ان کی زندگی کے ہر دور میں نمایاں رہی۔

اخیر میں چند ذاتی تاثرات وواقعات کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۵۵ء کے بعد اپنے وطن بھوج پور کے مدرسہ اشرفیہ کے سالانہ جلسوں میں آپ کی زیارت کا شرف اور آپؒ کے وعظِ حسنہ کی سماعت کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۱۹۶۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں اپنی طالب علمی کے بعد سے ان کی مجلسوں میں اکثر حاضری کی عزت حاصل ہوئی بہت سے ملفوظات میرے پاس قلم بند ہیں، ان مجلسوں میں سوالات کی پرچی بڑھا دیتا اور حضرت مولاناؒ ان کے شافی جواب عنایت کرتے۔

رئیس احمد جعفری ندویؒ کی فرمائش پر میں نے مولانا مرحوم سے مولانا محمد علی جوہرؒ اور علماء دیوبند کے تعلق پر کچھ لکھنے کی درخواست کی تو مولانا مرحوم نے ایک مختصر مضمون سپردِ قلم کر کے میرے سپرد کیا وہ مضمون جعفری صاحب کی مرتبہ ''علی برادران'' میں لاہور سے اور ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے ۱۹۶۴ء کے کسی شمارہ میں شائع ہوا، دیوبند کے ایام طالب علمی کی ایک خوش قسمتی حضرت حکیم الاسلامؒ کے ہفتہ وار درس ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں شرکت بھی ہے جس کا سلسلہ حضرت کے اسفار کے سبب قائم نہیں رہا انہیں ایام طلب میں مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ (مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند) کے ساتھ حضرت مولانا کے قیمتی کتب خانہ کی ترتیب جدید میں شرکت کا موقع بھی ملا جس میں مولانا گیلانیؒ کے ذاتی ذخیرے سے بہت اضافہ ہو گیا تھا۔

۱۹۶۴ء ہی کے آس پاس محدث جلیل شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ اپنے تبلیغی دورے میں دیوبند بھی تشریف

لائے اور دارالعلوم کی زیارت سے بہت مسرور ہوئے۔ دارالحدیث کی تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ ہندوستانی اہل علم اور علماء دیوبند کی اہم تصنیفات کا عربی میں ترجمہ ہوتو بڑی علمی خدمت ہوگی اور اس سے عالمِ اسلام میں استفادے کی راہ کھلے گی اس سلسلہ میں انہوں نے مولانا گیلانی کی ''تدوینِ حدیث'' وغیرہ کا خصوصی تذکرہ کیا تھا، طلبۂ دارالعلوم سے شیخ ابوغدہ کے خطاب کے اکثر جملے مرصع ومقفیٰ تھے۔ان کا ایک جملہ اب تک کانوں میں گونج رہا ہے ''**نقد الجاهل فی الكيس و نقد العالم فی الكراريس**''

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء کے جشنِ تعلیمی ۱۹۷۵ء میں آپ کی زیارت ہوئی اور تقریر بھی سنی، پھر مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس رانچی ۷۸ یا ۱۹۷۹ء میں پھر آپ کی زیارت ہوئی اور یک جائی کا موقع ملا، رانچی ہوائی اڈہ پر حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اور حضرت حکیم الاسلامؒ کو رخصت کرنے حاضر ہوا تو اس موقع پر مولانا علی میاں صاحبؒ نے حضرت حکیم الاسلامؒ سے میری طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ ''یہ آپ کے مولوی شمس صاحب عرصہ سے میرے ساتھ ہیں'' اس میں اس طرف اشارہ تھا کہ سبھی اکابرِ دیوبند ''حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے وابستہ یا اس کے ہوا خوار ہیں''۔

اس کے بعد مارچ ۱۹۸۰ء میں اجلاسِ صد سالہ کے موقع پر دیوبند کے اس عظیم یادگار اجتماع میں آپ کی زیارت اور خطاب سے مشرف ہونے کا موقع ملا اور آپ کی اقتدا میں اس نمازِ جمعہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی جس کے نمازیوں کی تعداد میدانِ عرفات کے حاضرین کے غالباً برابر تھی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی یادگار شخصیت اور فقید المثال ہستی پر یہ مختصر مضمون لکھ کر اس کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا، اس کے لئے ان کی مفصل سوانح عمری کی ضرورت ہے، خصوصاً ان کی علمی خدمات پر مفصل تبصرے کی بھی ضرورت ہے کیوں کہ وہ اپنے طور پر اکابرِ دیوبند کی آخری یادگار اور اپنی مثال آپ تھے، ان کے دم سے حکمتِ قاسمیہ اور دبستانِ دیوبند کی دیرینہ روایت قائم تھی اور تسلسل کسی نہ کسی طرح برقرار تھا، اس دور قحط الرجال میں دور دور تک آپ کا ثانی تو در کنار آپ کا بدل بھی نظر نہیں آتا جس کی شخصیت کے آئینہ میں اکابر و اسلاف کی کچھ جھلکیاں دیکھی جاسکیں۔افسوس صد افسوس کہ

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

............❖............

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ
اور
مسلم پرسنل لاء بورڈ

مولانا شمس الدین آفریدی
دارالعلوم زکریا، بھوپال

نمونۂ اسلاف، پاکیزہ صفات، طیب اخلاق سے بھرپور شخصیت کے حامل انسان تھے، حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک دارالعلوم دیوبند کے مسند اہتمام پر فائز رہے اور مسلک دیوبند کی ترجمانی کرتے رہے، دارالعلوم کا تعارف ایک چھوٹے سے قصبے سے نکل کر پورے عالم میں کرایا۔ اللہ تعالیٰ نے ظاہری خوبصورتی کے ساتھ باطنی خوبیوں سے بھی آراستہ فرمایا تھا۔ خوش نما صورت، پاکیزہ سیرت، نرم گفتار، تحریر وتقریر میں روانی کے ساتھ علم وحکمت کے دریا بہاتے تھے، بدعات کے خلاف مناظرانہ انداز کے بجائے مشفقانہ وہمدردانہ طریقہ اختیار فرماتے تھے، تقریر میں اتنی سادگی وشگفتگی ہوتی تھی کہ سامعین مسحور ہوجاتے تھے۔ پچاس سال قبل ممبئی جیسے شہر میں علماء دیوبند کے لئے مساجد کا داخلہ ممنوع تھا۔ وہاں حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے بیانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کے مواعظ حسنہ نے مخالفین پر ایسا اثر پیدا کیا کہ جو مساجد میں علماء دیوبند کو داخل نہیں ہونے دیتے تھے وہی حضرات حکیم الاسلامؒ کو مساجد میں لے کر گئے اور محراب وممبر پر بٹھایا اور بیانات سننے کے لئے بڑی تعداد میں جمع ہونے لگے۔

اسی زمانہ میں مولانا محمد پالن حقانی صاحبؒ کے بیانات بھی ممبئی میں زور وشور کے ساتھ جاری تھے، حقانی صاحب حضرت حکیم الاسلامؒ کے ایک جملہ کو بڑے مزے لے کر ذکر فرمایا کرتے تھے۔

کہ ایک دفعہ بریلوی علماء کے بعض حضرات نے شکایتاً حضرت محمد مولانا محمد طیب صاحبؒ سے عرض کیا

کہ حضرت آپ کے اس جاہل مولوی (حقانی صاحب) پر روک لگادو یہ ہمارے علماء کو برا بھلا کہتا ہے۔ جواباً حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا بھائی ہم تمہارے بے شمار جاہلوں کو برداشت کرتے رہتے ہیں تم بھی ہمارے ایک جاہل کو برداشت کرلو۔

ایک مرتبہ ایک میزبان صاحب نے مزید کھانا کھانے پر اصرار کیا تو حضرت نے جواب دیا بھائی کھانے کا تعلق رغبت سے ہے ترغیب سے نہیں۔ اس طرح حضرت حکیم الاسلامؒ بڑے بچے تلے الفاظ کا استعمال کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اپنے زمانہ کے تمام اکابر علماء کرام کی نظروں میں منظور نظر اور ہر دلعزیز تھے، حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے خلافت سے نوازا تھا۔ حضرت شیخ زکریا صاحبؒ کے یہاں خاص مقام تھا۔ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحبؒ کے یہاں جلال آباد پہنچے تو مسجد نئی تعمیر ہوئی تھی دیکھ کر فرمایا مسجد بہت وسیع ہے، بانی مسجد بھی مسیح ہے۔

اس طرح ملی جماعتوں اور تنظیموں میں بھی بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ان جماعتوں کو اپنے اکابر کا ورثہ شمار کرتے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ندوۃ العلماء لکھنؤ، مظاہر العلوم سہارنپور سے خصوصی لگاؤ تھا۔ وہاں کے پروگرام میں شرکت فرماتے اور اپنے حکیمانہ خطبات سے فیضیاب کرتے تھے۔

ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے دور میں اسلامی قوانین کے مطابق فیصلے ہوا کرتے تھے۔ غیر مسلموں کو ان کے مذہبی طور وطریق کے مطابق عمل کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔ ہندوستان پر مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد جب انگریزوں کا تسلط قائم ہوا تو انہوں نے مسلمانوں کے لئے مسلم پرسنل لاء کے عنوان پر ایک محدود قانونی حیثیت دے کر مسلمانوں کا پرسنل قانون کا درجہ دے دیا۔ جواَب مسلم پرسنل لاء کہلاتا ہے۔ مسلم پرسنل کا اِطلاق نکاح، وراثت، حضانت، وصیت، ہبہ وغیرہ معاملات تک محدود ہے۔ لیکن بعض مرتبہ معاملات تک محدود ہے۔ عدالتیں مسلمانوں کے عائلی معاملات میں اسی قانون کے مطابق فیصلہ کرتی ہیں۔ لیکن بعض مرتبہ ان عائلی مسائل سے ناواقفیت کی وجہ سے جج صاحبان غیر شرعی فیصلہ صادر کر دیتے ہیں اور بعض وقت اسلامی قانون کی بے جا تشریح کر دیتے ہیں۔ جس سے مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ غیر شرعی فیصلہ مسلمان قبول کرنے کو تیار نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس کا لازماً نتیجہ احتجاج کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

جیسا کہ ماضی میں شاہ بانو کیس کی غلط تشریح، یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی کوشش، تعدد ازدواج کا شوشہ، متبنیٰ (لے پالک بل) وغیرہ غرضیکہ مختلف موضوع پر مسلم پرسنل لا میں تبدیلی لانے اور اسلامی قانون میں مداخلت کی کوشش کی گئی۔ مسلم پرسنل لاء میں بیجا مداخلت کو دیکھتے ہوئے ہندوستانی علماء کرام ودانشوران نے محسوس کیا کہ اگر ان حساس مسائل وواقعات پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا تو یہ واقعات ایک دن نہایت

خطرناک صورت اختیار کر سکتے ہیں۔

چنانچہ ان حساس مسائل پر غور وفکر کے لئے مسلمانانِ ہند کی دینی و دنیوی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے والی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی صدارت میں دارالعلوم دیوبند میں ایک نمائندہ اجتماع طلب کیا گیا۔ اجلاس میں شرکت کرنے والے حضرات میں سے قابل ذکر تھے مولانا محمد سالم قاسمی صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحبؒ، حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب، جناب ڈاکٹر طاہر محمود صاحب، جناب قاضی مجاہدالاسلام صاحب، حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب، مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب، مولانا عامر عثمانی صاحب ایڈیٹر ماہنامہ تجلّی، دیوبند وغیرہ۔

اس نمائندہ اجتماع میں فیصلہ کیا گیا چوں کہ مسلم پرسنل لا کا معاملہ پوری امت کا مسئلہ ہے۔ خصوصاً متبنیٰ بل لایا جا رہا ہے جو اسلامی قانون میں صریح مداخلت ہے۔ اس لئے ملکی سطح پر پوری ملت کے مختلف مکاتب فکر کے حضرات کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے اس کے لئے ایک بڑا اجلاس بلایا جائے۔ فیصلہ کے مطابق ایک اجلاس تیاری کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے کنوینر حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی بنائے گئے۔ دیوبند میں یہ اجتماع حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی زیر صدارت بتاریخ ۱۳/۱۴/ مارچ ۱۹۷۲ء کو منعقد کیا گیا تھا۔

اجلاس کی تیاری کمیٹی نے طے کیا متبنیٰ بل کا قضیہ چوں کہ مہاراشٹر اسمبلی سے اٹھایا جا رہا ہے اس لئے فتنے کے سد باب کے لئے مہاراشٹر کی راجدھانی عروس البلاد ممبئی سے زیادہ موضوع اور کون سا مقام مناسب ہوسکتا ہے اس لئے اجلاس عام اسی شہر میں بلایا جائے۔

چنانچہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا پہلا تاسیسی اجلاس عام ۲۷/۲۸/۳/ ۱۹۷ء دسمبر کو زیر صدارت حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ممبئی شہر میں منعقد کیا گیا۔ جس میں شریک ہونے والے مسلم عوام الناس کے علاوہ تمام ہندوستانی مسلم تنظیموں کے ذمہ دار شریک اجلاس تھے، مختلف مکاتب فکر کے نمائندہ حضرات پر مشتمل یہ عظیم الشان اجلاس اپنی نوعیت کا مثالی اجلاس تھا، جس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل ہوئی اور صدارت کے عہدہ جلیلہ کے لئے بالاتفاق رائے حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کا انتخاب کیا گیا۔ جنرل سکریٹری کی حیثیت سے حضرت مولانا منت اللہ رحانی صاحب منتخب کئے گئے۔ آپ کے صدر منتخب ہونے کی وجہ سے مسلم پرسنل لاء بورڈ بھی ایک باوقار ادارہ کی حیثیت سے متعارف ہوا۔ ۱۷/ جولائی ۱۹۸۳ء کو علم وحکمت کا یہ باوقار تاجدار شیریں گفتار، نرم رو، گرم جستجو اور اسلام کا آخری نمونہ اٹھاسی سالہ دنیوی زندگی پا کر دائمی حیات کی طرف منتقل ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

............❖............

حکیم الاسلامؒ کے علم و فضل کو خراجِ عقیدت

مولانا عبدالقدوس حماد قاسمی

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ظاہری طور پر عالم اسباب سے ۶؍شوال ۱۴۰۲ھ کو عالم برزخ کی جانب منتقل ہو گئے، لیکن آپ کی حیات طیبہ کا اثاثہ اور باقیات صالحات کا جو سرمایہ ہے وہ انشاء اللہ بطور صدقہ جاریہ قائم و دائم رہ کر آپ کی روح گرامی کو نفع دیتا رہے گا۔ آپ کے دینی لٹریچر مختلف اسلامی ادارے اور علمی سلسلے سے امت مسلمہ مستفیض ہوتی رہے گی۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم و استاذ اور اس کی دینی تحریک و دعوت کے سربراہ کے منصب پر سرفراز ہو کر آپ نے اسلامی تاریخ و ثقافت کے اقدار و قیم کی مبسوط اور حکیمانہ ترجمانی کی اور اسلام کے بین الاقوامی نظام اور آفاقی طرز حیات کی تفہیم و تشریح کے فرائض کو سرانجام دیا۔

نسبی خصوصیت

شرافت و نجابت کا اصل معیار تو علم و تقویٰ ہے جس کے اندر علم و دین کا جس قدر کامل رسوخ ہوگا اسی قدر خشیت الٰہی کا رنگ غالب ہوگا۔ یہ صفت و خصوصیت حضرت مرحوم کے اندر بدرجہ کمال موجود تھی، ارشاد قرآنی ہے۔

قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لايعلمون. یعنی اے نبیؐ آپ اعلان کر دیجئے کہ کیا عالم اور غیر عالم برابر ہیں۔ آیت مذکورہ میں علم سے مراد علم دین ہے کیوں کہ اس کی تفسیر دوسری آیت یوں کر رہی ہے **يعلمون ظاهرا من الحيٰوة الدنيا وهم عن الاخرة غافلون.** یعنی دنیا کا ظاہر تو جانتے ہیں مگر زندگی کے مغز و روح سے بے خبر ہیں۔ تو دنیا کے علم کو علم نہیں کہا جا سکتا پھر ظاہری علم کے باوجود خدا نے **لايعلمون** کہہ کر بتلا دیا کہ اللہ کی نظر میں علم کا مفہوم متعین ہے کہ دین ہی کی حقیقت کا علم اللہ کی نظر میں علم ہے

حضرت مرحوم کے اندر علم دین کے رسوخ کی جو کیفیت تھی وہ مقام کے درجہ تک پہنچ چکی تھی، جسے احسان کہتے ہیں۔ یہی فضیلت کیا کم ہے اگر اسکے ساتھ نسبی عزت و کرامت بھی حاصل ہو جائے تو سبحان اللہ سونے پر سہاگہ ہے۔ چنانچہ آپ کریم ابن کریم کے طغرائے امتیاز کے حامل تھے، یعنی بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے فرزند گرامی تھے، جنھوں نے چالیس برس تک دارالعلوم دیوبند کے منصب اہتمام پر فائز ہوکر دین وملت کی خدمت سرانجام دی ہے اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے نبیرہ تھے، جو دارالعلوم کے بانی اور اس کے نظام تعلیم وتربیت اور اصول ہشتگانہ کے مؤسس تھے۔ اور ملی اتحاد و یک جہتی اور اسلامی اجتماعیت و تنظیم کی تشکیل اور شرعی نظام کی تنفیذ اور حریت وطن کے نصب العین کی حامل تحریک جہاد کے روح رواں تھے۔ ۱۸۵۷ھ کے جہاد آزادی کے میر کارواں آپ ہی تھے، اس نسبی خصوصیت سے آپ کے تعارف میں چار چاند لگ گیا۔ یوں آپ کی بلند پایہ علمی وروحانی شخصیت تعارف وتعریف سے بے نیاز ہے، دنیا کے گوشے گوشے میں آپ کی دینی قیادت اور علمی سیادت کے کارناموں کا چرچا ہے۔

اکابر دارالعلوم کے رنگوں کی جامعیت

حضرت مرحوم کے شمائل وخصائص کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی اکابر دارالعلوم کے تمام متوارث ذوق اور جملہ رنگوں کی جامع تھی، یہ صفت اسلاف میں کمیاب اور اخلاف میں نایاب ہے۔ بقیۃ السلف مولانا محمد احمد صاحبؒ کے واسطہ سے آپ کے اندر حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی فکر وحکمت اور بالواسطہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ، فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی دعوت وارشاد کا رنگ غالب تھا۔ یعنی حضرت گنگوہی نے سنت وبدعت کے درمیان جو حد فاصل کھینچ کران کے امتیازات کو نمایاں کیا ہے ان کی تشریح وتوضیح آپ نے حضرت نانوتوی کی فکر وحکمت کے اصول پر فرمائی اور اس دین حنیف کی دعوت اس کی اصل فطرت کے مطابق دی جو قرون اولیٰ یعنی عہد نبوت وزمانہ خلافت راشدہ اور قرن صحابہ وتابعین سے تاریخی تواتر اور صحیح سندوں کے ساتھ اخذ وانتقال کے مراحل طے کرتا چلا آرہا ہے تجدیدات واصلاحات کے فرائض کو امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے انجام دیا اور ان تجدیدات واصلاحات کو علمی وتحقیقی اور فنی اعتبار سے امام انقلاب حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مرتب ومنتظم کیا اور ان کی تالیف وتدوین میں بے حد دماغ سوزی کی، چنانچہ اسلامی نظام کی تنقید کے سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ کا لٹریچر مشعل راہ بن سکتا ہے۔ جس نے

اسلامی تاریخ وثقافت اور نظام خیر القرون کی تفصیلات وحقائق کو مدلل اور مستند طریقہ سے واضح کیا ہے یہی مدلل اور مستند طریقہ فکر ولی اللّٰہی ہے جس کے ترجمان حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ تھے، یہی ترجمانی جملہ اکابر دارالعلوم کا شعار تھا، جس کے رنگ وانداز الگ الگ تھے اور حضرت تمام رنگوں کے جامع تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن کے مرید باصفا اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ ارشد تھے، اسی طرح آپ حضرت مولانا الحافظ محمد احمدؒ کے بھی خلیفہ تھے، جو قطب الارشاد امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفہ ارشد تھے، پس آپ کی خلافت دوآتشہ تھی، ایک میں بالواسطہ حضرت امام الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی نسبت خاصہ اور معرفت کاملہ منتقل ہوئی اور دوسری خلافت بالواسطہ حضرت قطب الارشاد مولانا گنگوہیؒ کے مقام احسان واستقامت سے مستنیر تھی۔

علوم وتحقیقات میں امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذ رشید اور درسیات میں امام المنطق والحدیث حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ کے مایہ ناز شاگرد تھے، دارالعلوم کے نظم ونسق اور اہتمام کی ذمہ داریوں میں فخر الاسلام حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کی تربیت وسرپرستی اور رہنمائی حاصل تھی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپؒ کے والد نے چالیس برس تک اہتمام کی خدمت انجام دی، تو آپؒ نے تقریباً چھپن برس تک مسلسل اپنے فرائض منصبی کو انجام دیا۔ اور تقریر وخطابت میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی رہنمائی کا شرف حاصل تھا، اکابر دارالعلوم میں حضرت علامہ عثمانیؒ کے طرز وانداز میں آپ ہی کو خطابت وتقریر کا شرف حاصل تھا اور یہ طرز وانداز بالکل منفرد اور مجتہدانہ تھا، سامعین پر سکوت طاری ہوجاتا اور قلوب کے اندر سمع وطاعت کا جذبہ بیدار رہوتا، کٹرے کٹرے مخالفین اور اکابر دارالعلوم کے اعداء ومنکرین بھی آپؒ کے خطاب سے محظوظ ہوتے۔ آپ کے خطاب میں شیخ جیلانیؒ کے ناصحانہ وقار اور ابن جوزی کے خطیبانہ کردار کی جواہر ریزی ہوتی اور مجدد سرہندی کی تجدید واصلاح اور ان کی دعوت وعزیمت کی چاشنی ہوتی اور شاہ ولی اللہ کے افکار واقدار کی روشنی ہوتی۔

آپ کے اندر سب سے بڑا وصف تواضع وانکسار تھا جو حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی رفاقت صادقہ کے اثرات تھے اکابر کا احترام اور اصاغر سے محبت اور ان کی حوصلہ افزائی پر آپ کا خصوصی رنگ تھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ اسلاف کی آخری نشانی

حضرت حکیم الاسلامؒ کی تعلیم وتربیت اور ذہنی وفکری نشو ونما ایسی مقدس ہستیوں کے زیر سایہ ہوئیں جو اخیار امت اور شریعت وطریقت کے حقیقۃً جامع اور سلف صالحین کے سچے پیرو تھے اور علم وعمل میں

اصول صحابہ کے پابند تھے، زہد وتقویٰ اور اتباع احکام میں ان کے قدم بقدم تھے اسی بابرکت صحبت و تربیت کا اثر تھا کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی مقدس ہستی تواضع وانکسار کی پیکر تھی اور اخلاق حسنہ علوم الٰہیہ کی خزینہ تھی، مصائب پر صبر وسماحت اور انعامات پر شکر وامتنان کا جذبہ آپ کی فطرت میں داخل تھا اور آپ کے اندر فکر وعقیدہ اور اسلامیت کی روح پورے طور پر حلول کر گئی تھی اور ایمان وعمل میں کیفیت احسان درجہ مقام تک پہونچ گئی جو سلوک ومعرفت کا آخری مقام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اسلاف کی آخری نشانی تھے اور اسلاف کے علوم ومعارف کے امین تھے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی جبین سعادت عہد طالب علمی ہی سے چمک دمک رہی تھی اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک قلمی تبرک بطور شہادت کے شریک مضمون کر دیا جائے، جس میں خاندان قاسمی کا مختصر تذکرہ بھی ہے اور حکیم الاسلامؒ کے متعلق شہادت بھی مل جائے گی کہ وہ صغرسنی ہی میں علم وفضل کی سندیں حاصل کر چکے تھے۔

جس کا منظر یہ ہے کہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمدؒ کی اولاد باحیات نہ ہونے سے اکابر دارالعلوم کو بڑی فکر دامن گیر ہوگئی تھی کہ نسل قاسمی منقطع نہ ہو جائے لیکن الہامی طور پر حضرت شیخ الہند نے ایک مستجاب الدعوات بزرگ سے دعا کرانے کے لئے نمائندہ ارسال فرمایا تھا اسی طرح حکیم الاسلامؒ کی کوئی نرینہ اولاد ابھی نہیں ہوئی تھی آپ کی صرف دو لڑکیاں تھیں، اکابر دارالعلوم کی دیرینہ خواہش تھی کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کو بھی فرزند پیدا ہو، چنانچہ حضرت الاستاذ مولانا محمد سالم صاحب مدظلہٗ العالی کی پیدائش ہوئی تو اکابر دارالعلوم کے حلقہ میں زبردست خوشی محسوس کی گئی اور ہدیہ تبریک پیش کرنے کے لئے ایک وفد حضرت مولانا محمد احمدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا جسے القاسم میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے مژدہ جانفزا کے عنوان سے تحریر فرمایا جواب ایک یادگار رہ گئی جو مندرجہ ذیل پیش ہے:

مژدۂ جانفزا!

”ہندوستان میں اہل سنت والجماعت کا بڑا طبقہ جس کو صحیح معنیٰ میں شریعت مصطفویہ علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ وتحیہ کا حامی اور ہادی کہا جا سکتا ہے، دیوبندی جماعت ہے اس جماعت کے قائد رئیس الاتقیاء حجۃ الاسلام حضرت مولانا الحاج المولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ بانیٔ دارالعلوم دیوبند تھے۔ اس فقیرانہ زندگی بسر کرنے والے نے اگر ایک طرف جنید وشبلی (ادخلہما فی رحمۃ الواسعہ) کے تصوف کی طرف رہنمائی کی تو

دوسری طرف ابوحنیفہؒ کی فقہ کو فرمان الٰہی و ارشادات نبویہ کا مظہر بتایا۔ اپنے بندوں کے حالات، ان کی فقیری، ان کے قلوب سے علامۃ الغیوب ہی خوب واقف ہے۔ وہی جانتا ہے کہ اس کے مخلص قلب پر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اخلاص کا اثر کس طرح پڑ گیا کہ دارالعلوم نے جو کہ اس کے ہاتھوں قائم کیا گیا تھا، تھوڑے عرصہ میں اپنے فیض یافتہ حضرات سے مشارق و مغارب کو بھر دیا فی الحقیقت اس میں بہت کم مبالغہ ہے کہ منتسبین دارالعلوم دنیا کے ہر ہر گوشہ میں موجود ہیں۔

مجھ کو اس وقت شمس ارض کے صفات و مناقب بیان کرنے مقصود نہیں ہیں اور فی الحقیقت میری وسعت و ہمت سے خارج ہیں، مجھ کو صرف ایک خبر سنا کر ان صاحبوں کو مسرور کرنا ہے جو دیوبند اور دارالعلوم دیوبند کی مسرت افزا خبر کو سنکر خوش ہوتے ہیں۔ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے صاحب زادے اور میرے محسن و شفیق استاد حضرت مولانا محمد احمد صاحب حال مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ سابق مفتی عدالتِ عالیہ عثمانیہ اپنے والد (قدس سرہٗ) کی اس دینی ودیعت کی حفاظت فرما رہے ہیں۔ آپ کے دو صاحبزادے اور ایک صاحب زادی ہیں۔ بڑے صاحبزادے حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب اور چھوٹے صاحبزادے مولانا قاری محمد طاہر صاحب ہیں۔ اگر کوئی شخص ان دونوں کو اس وقت دیکھتا جب کہ یہ دونوں اپنی صغر سنی کی حالت میں دارالعلوم سے اپنے فضل و کمال کی سند حاصل کر چکے تھے تو یقیناً متعجب ہوتا لیکن جن لوگوں نے ان کے علمی شغف کو دیکھا ہے یا اس سے واقف ہیں کہ یہ قاسم الخیرات کے جگر گوشہ ہیں ان کے نزدیک ان کا اس قدر جلد ترقی پر پہنچ جانا نہ لائق تعجب نہ لائق حیرت۔

ان دونوں نونہالوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ چھوٹے صاحب زادے کا ایک دل بند ہے جو اپنے فضائل و عادات میں زائد از حد اشبہ بالا ہے۔ بڑے صاحبزادے کی دو لڑکیاں ہیں۔ منتسبین دارالعلوم دیوبند عموماً اور خدام دارالعلوم خصوصاً اور اکابرِ دارالعلوم فطری طور پر متمنی تھے کہ اس نونہال کو خداوند عالم فرزند عطا فرمائے۔

خدا کا شکر ہے کہ بتاریخ ۲۳ / جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ صبح صادق یہ تمنا پوری ہوئی۔ جمعہ کا دن تھا۔ یہ خبر دارالعلوم میں پہنچی اسی وقت ملازمین و مدرسین کا ایک وفد حضرت مہتمم صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کاتب سطور بھی اس وفد میں شریک تھا۔

حضرت ممدوح عرصہ سے علیل ہیں اور حد سے زیادہ ضعیف ہو گئے ہیں جب آپ کو اطلاع پہنچی کہ وفد بغرض مبارکباد حاضر ہوا ہے تو آپ بنفس نفیس خود تشریف لائے آپ کے چہرہ پر آثار خوشی ظاہر تھے

آپ نے اپنی اسی موروثی خندہ پیشانی اور انبساط کے ساتھ کلمات مسرت سے وفد کو مشرف فرمایا جو آپ کو حضرت قاسم الخیرات قدس سرہٗ سے بطور ارث ملی ہے۔ دارالعلوم کے تمام طلبہ اور مدرسین و ملازمین میں اس خبر سے چہل پہل رہی اور ہر شخص کی زبان سے دعائے درازعمری اور حصول شرفِ دارین نکل رہی تھی۔

کاتب سطور اپنی اور تمام خدامِ دارالعلوم کی طرف سے حضرت استاد مولانا محمد احمد صاحب کی مبارکباد اور منتسبان دارالعلوم کی خدمت میں بشارت مسرت افزا پیش کرتا ہے۔

فقط (محمد اعزاز علی) منتقل از القاسم رجب ۱۳۴۴ھ

متذکرہ بالا نقل کردہ مضمون سے خاندانِ قاسمی کی عظمت و اہمیت کے نقوش و آثار کی ترجمانی ہورہی ہے اور تاریخی تسلسل کا ثبوت بھی فراہم ہورہا ہے وہ یہ کہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے علمی و روحانی جانشین آپ کے صاحبزادے بقیۃ السلف مولانا محمد احمدؒ تھے، اور آپ کے صاحب زادے حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے بعد آپ کے صاحبزادہ مفکر اسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہٗ علمی و روحانی نیابت کے منصب پر فائز المرام ہوئے حکیم الاسلامؒ ہی سے بیعت ہیں اور قدوۃ الصلحاء حضرت مولانا عبدالقادر نوراللہ مرقدہٗ کے الہامی اشارے سے حضرت حکیم الاسلامؒ نے آپ کو بیعت وارشاد کا مجاز کیا۔ اللہ عزوجل آپ کو حضرت حکیم الاسلامؒ کے علوم و معارف اور سلوک و تصوف کے نشر و اشاعت اور تعمیر و تربیت کے مستند ذریعہ کے طور پر قبول فرمائے۔ آمین۔

............❖............

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ

حیات وخدمات کا ایک جائزہ

مولانا شیر محمد امینی

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ ہندوستان کے مشہور ومعروف عالمِ دین، حکیم الاسلام، شیخ العرب والعجم، عظیم خطیب، اکابر دیوبند کے علوم اور خاص طور سے علوم قاسمی، علوم شیخ الہند، علوم تھانوی، علوم عثمانی کے ایک عظیم شارح، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے پوتے، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند کے صاحب زادے، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر، دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ تھے۔

آپ کی ولادت باسعادت محرم الحرام ۱۳۱۵ھ مطابق جون ۱۸۹۷ء بروز اتوار دیوبند میں ہوئی، آپ کا نام نامی محمد طیب تجویز کیا گیا اور تاریخی نام مظفر الدین رکھا گیا، پہلے نام سے آپ نے شہرت پائی۔

سات سال کی عمر میں آپ دارالعلوم دیوبند میں داخل کئے گئے جہاں آپ نے دوسال کی قلیل مدت میں پورا قرآن مجید مع صحت وتجوید مکمل فرمایا، حفظ قرآن سے فراغت کے بعد درجہ فارسی میں آپ کو داخل کیا گیا اور وہاں سے پانچ سال میں پورا نصاب مکمل کر کے ۱۳۳۷ھ میں آپ فارغ ہوئے، آپ کے اساتذہ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الہندؒ، حکیم الامت حضرت تھانویؒ، مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ جیسے نامور علماء شامل ہیں۔

فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند ہی میں درس وتدریس کا آغاز کیا اور درس نظامی کی مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھائیں، تدریسی زمانہ ۱۳۳۷ھ سے ۱۳۴۳ھ تک رہا، ۱۳۴۳ھ میں اکابر ومشائخ کے مشورہ پر نائب مہتمم کا عہدہ سنبھالا اور ۱۳۴۸ھ میں مستقل مہتمم بنادئے گئے اور ۱۴۰۱ھ تک مسند اہتمام پر فائز رہے۔

۱۳۳۹ھ میں حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے، شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد ۱۳۵۰ھ میں حضرت تھانویؒ سے اجازت وخلافت سے سرفراز فرمائی گئے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی شخصیت زمانی رقبہ کے لحاظ سے بھی بہت وسیع اور جامع تھی اور معنوی لحاظ سے بھی، زمانی رقبہ تو ۸۸ سال کا ہے جس میں ابتدائی زمانہ نکال دیا جائے تو بھی ستر سال کے قریب ہوتے ہیں، معنوی رقبہ اس لئے وسیع ہے کہ علم وفضیلت، بصیرت، وسعت علم اور علم کی پختگی اور رسوخ، خدمت دین اور اس کے ساتھ اصلاح ووعظ اور شاد، عوام سے رابطہ، تربیت ودعوت، بیعت وارشاد، ان سب پہلوؤں اور گوشوں پر ان کی زندگی محیط تھی، واقعہ یہ ہے کہ شاید کم سے کم ہندوستان میں کسی علمی و دینی شخصیت کو کم ایسی ہر دلعزیزی، عام شہرت ومقبولیت اور مختلف دینی اداروں اور جماعتوں کا اعتماد حاصل ہوا ہوگا، جو ان کو حاصل تھا۔ اس کے ساتھ ان کو طویل عرصہ تک دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم وجلیل اور بین الاقوامی شہرت کے ادارہ کی خدمت اور ترقی کا موقع ملا، ان کی اس عام مقبولیت اور جامعیت اور ان کی ذات کا اختلافات سے بالاتر ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے لئے روز اول سے ان کی وفات کے دن تک ان سے زیادہ موزوں اور متفق علیہ صدر نظر نہیں آیا اور وہ اس عہدہ پر باتفاق آراء اس کی تاسیس اور قیام کے پہلے دن سے وفات کے دن تک رہے۔

حکیم الاسلامؒ کی ذات گرامی دارالعلوم دیوبند کی اس بابرکت دور کی دل کش یادگار تھی جس نے حضرت شیخ الہندؒ، حضرت تھانویؒ، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری اور شیخ الاسلام حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی کا جلوہ جہاں آراء دیکھا تھا، جس ہستی کی تعلیم میں علم وعمل کے ان مجسم پیکروں نے حصہ لیا ہو، ان کے اوصاف وکمالات کا ٹھیک ٹھیک ادارک بھی ہم جیسوں کے لئے مشکل ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے پیکر میں معصومیت، حسن اخلاق اور علم وعمل کے جو نمونے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں ان کے نقوش دل ودماسے محو نہیں ہوسکتے۔

حکمت دین کی جو معرفت اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کو عطا فرمائی تھی، حضرت حکیم الاسلامؒ اس کے تنہا وارث تھے، اہل علم اس وقت بھی تھے اور اب بھی ہیں لیکن یہ امتیاز جو حضرتؒ کو حاصل تھا، وہ ان کے دور میں دوسرے علماء کو حاصل نہیں تھا، انہوں نے علومِ قاسمی کو اپنے انداز میں اتنا آسان بنا کر پیش کیا کہ ان کی تحریر وتقریر اور ان کی زندگی حکمت قاسمیہ کی تفسیر بن گئی۔

خطابت وتقریر کی صلاحیت حضرت مولانا میں بدرجۂ کمال موجود تھی۔ ہر موضوع پر ہر طرح کے مجمع میں اس طرح خطاب کرنا کہ ان کی بات دلوں کو چھوتی ہوئی چلی جائے، ان کی تقریر کی قوت تاثیر، مخالف

سے مخالف کو بھی سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

لاہور کا ایک واقعہ ہے کہ ایک صاحب علماء دیوبند کے خلاف پروپیگنڈے سے بڑے متاثر تھے، علماء دیوبند سے برگشتہ اور طرح طرح کی بدعتوں میں مبتلا تھے، اتفاق سے مولانا لاہور گئے اور وہاں ایک اہم مقام پر آپ کے وعظ کا اعلان ہوا، یہ صاحب خود سناتے ہیں کہ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ ان کے وعظ میں اس نیت سے پہنچا کہ انہیں اعتراضات کا نشانہ بناؤں گا اور موقع ملا تو اس مجلس کو خراب کرنے کی کوشش کروں گا، ابھی تقریر شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اول تو حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کا معصوم اور پُرنور چہرہ دیکھ کر ان کے ارادوں میں زلزلہ سا آ گیا، دل نے گواہی دی کہ یہ چہرہ کسی گمراہ کا نہیں ہو سکتا، پھر جب وعظ شروع ہوا اور اس میں دین کے حقائق و معارف سامنے آئے تو پہلی بار اندازہ ہوا کہ علم دین کسے کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ تقریر کے ختم ہونے تک میں حضرت مولانا کے آگے موہوم ہو چکا تھا۔ اپنے پچھلے خیالات سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے بزرگان دین کے بارے میں بدگمانیوں سے نجات عطا فرمادی۔(۱)

برصغیر کا تو شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو، جہاں حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی آواز نہ پہنچی ہو، اس کے علاوہ افریقہ، یوروپ اور امریکہ تک آپ کے وعظ وارشاد کے فیوض پھیلے اور ان سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ ''ان کو نبیرہ بانی دارالعلوم دیوبند، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی نسبت گرامی کا شرف حاصل تھا اور وہ نصف صدی تک مسلسل اس مؤقر اور عظیم ادارہ دارالعلوم دیوبند کے منصب اہتمام پر رہے، ان کے اہتمام میں اس ادارہ نے ایسی ترقی کی جو اس کے ابتدائی دور دیکھنے والوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی، انہوں نے بڑے بحرانی موقعوں پر اس ادارہ کی حفاظت اور رہنمائی کی، انہوں نے اپنا نام اور زندگی اس ادارہ کے نام اور زندگی سے وابستہ کر دی تھ کہ ان میں ایک کا تصور دوسرے کے ساتھ آتا تھا۔

انسان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے خلاف سننے کی صلاحیت رکھتا ہو اور سخت سے سخت بات برداشت کرے، راقم نے حضرت مولانا صاحب کو اس معاملہ میں بہت عالی ظرف اور قوی الارادہ پایا، واقفیت رکھنے والے پورے حلقہ میں یہ بات مسلمانوں میں سے ہے کہ حکیم الاسلامؒ نہایت کریم النفس، بڑے شیریں اخلاق، نرم خو، نرم رو اور نرم گفتگو تھے۔ اقبال نے جو کہا ہے:

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو

یہ تعریف حکیم الاسلامؒ پر صادق آتی ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دارالعلوم دیوبند کو ایک ہر دل عزیز ادارہ بنایا اور دارالعلوم کو بغیر کسی اختلاف کے عوام سے متعارف کرایا اور اس کا اس سے تعلق پیدا کیا، تقسیم سے پہلے کئی براعظم کے دورے کئے، تقسم کے بعد پاکستان بار بار گئے، جنوبی افریقہ کا دورہ کیا، انگلستان گئے اور آخر میں امریکہ گئے۔

حضرت مولانا عوام کی اصلاح و وعظ وارشاد میں شیخ وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے متبع تھے، حسن تقریر اور دعوتی و اصلاحی رنگ ان کا امتیاز تھا، جس سے ہزاروں انسانوں کو فائدہ پہنچا، ہزاروں دلوں میں دین کے احترام کا جذبہ اور علماء کے متعلق حسن ظن پیدا ہو، ایسا خوش بیان مقرر اور واعظ، وسیع المعلومات اور نورانی شکل کا عالم مشکل سے دیکھنے کو ملتا ہے جس پر پہلی نظر پڑتے ہی قلب شہادت دیتا کہ یہ فطرتاً معصوم ہیں، ایسا معلوم ہوا کہ اس کے صدمہ سے ان کو بخار آ گیا۔ (پرانے چراغ)

حضرت مولانا صاحبؒ نے انتظامی مصروفیات کے باوجود مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ بعض کتابیں مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہیں اور بعض کتابیں ایسی ہیں جو ان کی تقریر کو مرتب کر کے کتاب کی صورت میں چھاپی گئی ہیں، ذیل میں ان کی تصانیف کی ایک فہرست پیش کی جا رہی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ آپ کی تصانیف کا اچھا خاصا ذخیرہ مطبوعہ کتابوں کی صورت میں موجود ہے۔

(۱) تعلیمات اسلام اور مسیحی اقدام
(۲) اسلام کا اخلاقی نظام
(۳) التشبہ فی الاسلام
(۴) اسرائیل کتاب وسنت کی روشنی میں
(۵) اصول دعوت اسلام
(۶) انسانیت کا امتیاز
(۷) ایک قرآن
(۸) حدیث رسول کا قرآنی معیار
(۹) خاتم النبیین
(۱۰) روایات الطیب
(۱۱) سائنس اور اسلام
(۱۲) شان رسالت
(۱۳) شہید کربلا و یزید
(۱۴) علم غیب
(۱۵) علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج
(۱۶) مسلک علمائے دیوبند
(۱۷) فلسفہ نماز
(۱۸) کلمہ طیبہ
(۱۹) مقالات طیبہ
(۲۰) اسلامی آزادی

(۲۱) عالمی مذہب (۲۲) مقامات مقدسہ

(۲۳) خطبات حکیم الاسلام (۲۴) نونیۃ الآحاد

(۲۵) فلسفہ نعمت و مصیبت (۲۶) دارالعلوم کا فتویٰ اور اس کی حقیقت

(۲۷) اسلام اور فرقہ واریت (۲۸) سفر نامہ افغانستان

(۲۹) عرفان عارف (شعری مجموعہ)

ان میں سے ہر کتاب علم و حکمت سے لبریز ہے۔

غرض حضرتؒ کی زندگی اپنے کمالات معنوی و ظاہری کے ساتھ بے حد وسیع اور ہمہ گیر ہے، ان کے اخلاق و اعمال، ان کی تدریس، ان کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف، افریقہ، امریکہ، لندن اور غیر ممالک عرب تک ان کے اصلاحی مواعظ، دارالعلوم میں ان کی ساٹھ سالہ خدمات، دارالعلوم کی علمی اور عملی زندگی کو منظّم کرنے کے لئے ان کی خصوصیات، ان کی دیانت، حلم و بردباری، شرافت طبعی اور شرافت نسبی، جمعیۃ العلماء ہند کے تعمیری دور سے ان کی وابستگی اور اس کے بہت سے اجتماعات میں ان کے معرکۃ الاراء خطبات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مذہبی شعور کے احیا کے لئے ان کی خدمات، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے پلیٹ فارم پر مسلمانوں کے شخصی اور قومی حقوق کے تحفظ کے لئے ان کے قائدانہ کردار، دارالعلوم کا بے مثال صد سالہ اجتماع، جو اس کا نقطہ عروج تھا اور جسے دیکھ کر مسلمانوں کے شاندار مستقبل کا اندازہ کر کے مخالفین نے وہیں سے دارالعلوم کے زوال کے لئے حالات پیدا کئے، اپنے اساتذہ کا احترام اور ان کی اولاد سے ان کا مشفقانہ طرز عمل، طلبہ علوم دینیہ پر ان کی لگاتار شفقت، اپنے مخالفین و معاندین سے چشم پوشی کی عادت، ان کے لاتعداد ملکی و غیر ملکی سفر، مسلم لیگ اور کانگریس کے سیاسی نزاعات کے تحریکی دور میں دارالعلوم کے مفاد کی خاطر ان کا محتاط طرز عمل، دارالعلوم کے معاملات میں ان کے بے نظیر تدبر اور مدبرانہ حکمت عملی کے صدہا واقعات، نرمی اور شفقت کے ساتھ دارالعلوم کے سینکڑوں افراد پر مشتمل عملہ سے ان کی درسی اور انتظامی خدمات کی تکمیل کرا لینے کا مخصوص طریقہ، یہ سب عنوانات حضرت والا کی سدا بہار زندگی کے پھیلے ہوئے گوشے ہیں، جن میں سے ہر ایک پر تفصیلی مضمون لکھا جا سکتا ہے۔

لاکھ ستارے ہر طرف، ظلمت شب جہاں جہاں ایک طلوع آفتاب، دشت و چمن سحر سحر

رحمه الله رحمة واسعة واسكنه فسيح جناته

....

(۱) مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ، ص: ۴۱

............❖............

حکیم الاسلامؒ کی سیرت طیبہ کے چند نقوش

مولانا مفتی محمد فاروق صاحب
جامعہ محمودیہ، میرٹھ

نحمدهٗ و نصلی علی رسوله الکریم امابعد

ولادت

آپ کی ولادت باسعادت محرم الحرام ۱۳۱۵ھ مطابق جون ۱۸۹۷ء بروز اتوار دیوبند میں ہوئی۔ آپ کا نام محمد طیب تجویز کیا گیا اور تاریخی نام مظفر الدین رکھا گیا، اول نام سے آپ کی شہرت ہوئی۔

تعلیم و تربیت

حضرت حکیم الاسلامؒ جب اس عمر کو پہونچے جس میں عموماً بچوں کو بسم اللہ کرائی جاتی ہے، تو اکابر کے مجمع میں آپ کی بسم اللہ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ والد ماجد حضرت شیخ الہندؒ کے ہاتھ پر ہوئی جو اس وقت دیوبند ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں علم و فضل، دین و تقویٰ کے اعتبار سے ممتاز تھے، بسم اللہ کی اس مجلس میں حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ کے علاوہ حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، مولانا محمد احمد صاحبؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ جیسے پائے کے بزرگ اور عالم تھے، بسم اللہ کے بعد اکابر نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی، بزرگوں کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی اللہ نے لاج رکھی اور حضرت حکیم الاسلامؒ علم و فضل اور کمال شہرت کے اس مقام پر پہونچے کہ ہندوستان کی بہت کم علمی، دینی شخصیتوں کو یہ مقام نصیب ہوا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کو قرآن حفظ کے لئے حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے مشورہ سے قاری عبدالوحید

صاحبؒ الٰہ آبادی کو الٰہ آباد سے بلوایا گیا، جب وہ دیوبند آ گئے تو حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت مولانا احمد صاحبؒ سے گزارش کی کہ ان کو دارالعلوم میں رکھ لیا جائے تا کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے ساتھ دوسرے طلبہ بھی مستفید ہو سکیں، اس طرح دارالعلوم میں شعبۂ تجوید کا اجراء ہوا گویا یہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی برکت کا پہلا ظہور ہوا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ فرماتے تھے کہ دارالعلوم میں شعبۂ تجوید قائم ہونے کا سبب میں ہی ہوں اور میں ہی اس شعبہ کا پہلا شاگرد ہوں، ۱۳۲۶ھ میں جب آپ کی عمر ۱۱/سال ہوئی آپ نے حفظ قرآن تجوید کے ساتھ مکمل فرما لیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو جہاں جمال صورت وسیرت سے نوازا تھا وہیں آپ کی آواز بلند تھی اور اس میں لحن داؤدی بھی تھا، جس مجلس میں آپ قرآن کی تلاوت فرماتے، ایک سماں بندھ جاتا، اکابر آپ سے قرآن سنتے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوتے تو حضرت جہری نماز کے لئے آپ ہی کو آگے بڑھاتے، یہ صرف حضرت حکیم الاسلامؒ کی خصوصیت تھی، ورنہ خانقاہ تھانہ بھون کی مسجد میں حضرت تھانویؒ کی موجودگی میں دوسرا امام نہیں ہوتا تھا۔

حفظ قرآن کی تکمیل کے بعد آپ نے فارسی، ریاضی وغیرہ کی تکمیل کی ۱۳۳۰ھ میں عربی میں داخل ہوئے اور آپ کی ابتدائی کتابیں بھی انہیں کے پاس ہوئیں جو علوم اسلامیہ میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، جیسے حضرت شیخ الہندؒ، حکیم الامت حضرت تھانویؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ وغیرہم انہیں حضرات اساتذہ سے علوم عقلیہ ونقلیہ کی تکمیل کی اور ۱۳۳۷ھ میں آپ فارغ ہوئے۔

جامع الصفات ہستی

آپ کو اللہ تعالیٰ نے تمام تر خوبیوں سے نوازا تھا اور مجمع کمالات بنایا تھا، اسلاف صالحین کی تمام خصوصیات وکمالات آپ میں موجود تھیں، حضرت مولانا اشرف علی سعودی صاحب دامت برکاتہم مدیر مدرسہ ماہی سبیل بنگلور رقم طراز ہیں:

''حکیم الاسلامؒ! آپ علم وحکمت کا چمکتا ہوا چاند تھے جس کی خنک اور ٹھنڈی چاندنی ہزاروں کے لئے وجہ سکون اور سامان قرار تھی کسی بھی محفل میں آپ قدم رنجہ فرماتے تو واقعی محسوس ہوتا کہ ماہتاب علم وحکمت طلوع ہو رہا ہے، چادر مہتاب پھیلتی جا رہی ہے اور وہ دماغ سکون وطمانینت کی ایسی لطیف کیفیات سے

آسودہ ہوتے چلے جاتے ہیں جن کو بیان نہیں کیا جاسکتا، اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ آپ حکیم الاسلام تھے، خطیب الاسلام تھے، فخر الاماثل تھے، زبدۃ الافاضل تھے، عظیم المرتبت تھے، رفیع المرتبت تھے، رفیع المنزلت تھے، رئیس المتکلمین تھے، سلطان الواعظین تھے، پیر رہرواں تھے، سالار قافلہ تھے، سرخیل طائفہ تھے، یادگار اسلاف تھے، تاج دار خلف تھے، بزروں کی آبرو تھے، خردوں کی آرزو تھے، چشم و چراغ تھے، گل سرسبد چمنستان قاسمی تھے، ملت اسلامیہ کی شان تھے، جماعت علماء کی آن تھے''۔

اللہ رب العزت نے آپ کو اتنے اوصاف عالیہ سے نوازا تھا اور آپ کی ذات بابرکات میں اتنے کمالات ودیعت فرمادیئے تھے کہ ہر خطاب آپ پر جچتا تھا اور ہر لقب آپ کی کلاہ افتخار میں نگینے کی طرح جڑتا تھا۔

کہتے تھے:

بخت اگر رسا شود دست دہد سبوئے خوش — از نگہ سمن بری لالہ رخ، نکوئے خوش
باغ و بہار ماندید یعنی کہ جنت النعیم — روئے خوش است وخوئے خوش وبوئے خوش وگلوئے خوش

درس وتدریس

فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کا آغاز کیا اور درس نظامی کی مختلف کتابیں پڑھائیں، تدریسی زمانہ ۱۳۲۷ھ سے ۱۳۴۳ھ تک رہا، مشکوٰۃ شریف عرصہ تک پڑھائی، اس کے علاوہ احادیث کی دوسری کتابیں بھی گاہے بگاہے آپ کے ذمہ رہیں، حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک آپ نے بخاری شریف کا درس دیا مگر ضعف و پیری کثرت مشاغل اور کثرت اسفار کی وجہ سے مستقل اس کا درس دینا آپ کے لئے دشوار تھا، جس کی وجہ سے آپ نے بخاری شریف کی تدریس سے سبک دوشی کرلی، حجۃ اللہ البالغہ سے آپ کو خصوصی شغف تھا، اس کتاب کو آپ نے ہمیشہ پڑھایا اور اخیر میں بھی اس کا درس دیتے رہے۔

بیعت وخلافت

۱۳۳۹ھ میں حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے، شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی طرف رجوع کیا اور تربیت حاصل کی اور ۱۳۵۰ھ میں حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے اجازت وخلافت سے سرفراز کئے گئے، تاریخ وسلوک وتصوف میں یہ منفرد سعادت کبریٰ حضرت حکیم الاسلامؒ کو مشیت ربانی نے عطا فرمائی کہ ان کے مرشد حضرت حکیم الامتؒ نے مرض

وفات میں ایک مرتبہ حاضری کے موقعہ پر آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بوسہ دیا اور اپنے قلب مبارک پر رکھ کر فرمایا کہ: ''اس ہاتھ سے ایک عجیب وغریب سکون وسکینت اپنے قلب میں محسوس کرتا ہوں اور اس کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ کے علمی و روحانی فیضان اور عمر وصحت وسلامتی میں برکت کے لئے مستجاب دعائیں دے کر رخصت فرمایا۔

شعروشاعری

بلند پایہ مصنف اور خطیب ہونے کے ساتھ آپ قادر الکلام شاعر بھی تھے اور جب کبھی کہنے پر آتے تو چار چار پانچ پانچ سو اشعار پر مشتمل نظمیں کہہ ڈالتے تھے، جس پر آپ کے شعری مجموعے (۱) جنون شباب (۲) عرفان عارف (۳) آنکھ کی کہانی (۴) ارمغان دار العلوم شاہد ہیں۔

اہتمام دار العلوم دیوبند

دار العلوم کا منصب اہتمام ہمیشہ بڑا باوقار رہا ہے، اس منصب پر جو حضرات رہے ہیں، وہ اپنے وقت کی یادگار و نابغہ روزگار شخصیتوں میں سے تھے، دار العلوم کے مہتممین کی فہرست میں حضرت حاجی عابد حسین صاحبؒ، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ رحمہم اللہ جیسے لوگ ہیں۔ ان میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ دار العلوم کے مہتمم رہے اور نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ تھے۔ ۱۳۴۳ھ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کو آپ کے والد ماجد صاحب کا قائم مقام کر دیا گیا۔ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے انتقال کے بعد حضرت عثمانیؒ مہتمم ہوگئے اور آپ نیابت اہتمام پر رہے، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کے انتقال ک بعد ۱۳۴۸ھ میں آپ نے منصب اہتمام کو سنبھالا اور تاحیات اس عہدہ کو زینت بخشی۔

اس طرح دار العلوم دیوبند کے ابتدائی انسٹھ سال میں پانچ مہتممین نے اپنی مخلصانہ عظیم خدمات کے ذریعہ اس مدرسہ عربی کو ملک گیر دار العلوم کے مقام رفیع تک پہونچایا اور اس کی عمر کے مابعد ساٹھ سال میں تن تنہا حضرت حکیم الاسلامؒ نے بلاشرکت غیرے اس دار العلوم کو ''عالمی مرکزی اسلامی یونیورسٹی'' کے بام عروج تک پہونچایا۔

آپ کے دور میں دار العلوم میں ہر اعتبار سے ترقی ہوئی، عمارات کا طویل سلسلہ قائم ہوا، طبیہ کالج کا قیام عمل میں آیا، مدرسین کا اضافہ ہوا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کا مفتاح العلوم جلال آباد سے تعلق

حضرت حکیم الاسلامؒ کو مفتاح العلوم سے خاص تعلق تھا، بعض دفعہ بلا دعوت اور بلا اطلاع بھی اچانک تشریف آوری ہو جایا کرتی تھی۔

ایک دفعہ اچانک تشریف آوری ہوئی، تمام طلبہ واساتذہ دارالحدیث میں جمع ہوگئے، حضرت حکیم الاسلامؒ کے ہمراہ باہر کے (غیر ملکی) مہمان بھی تھے، حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنی تشریف آوری کی وجہ بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ان مہمانوں کو، دارالعلوم دکھانے کے لئے آیا ہوں کہ یہ بھی دارالعلوم ہے، جہاں جہاں دارالعلوم کے فضلاء کام کر رہے ہیں، وہ سب دارالعلوم ہی ہے کہ وہ دارالعلوم کا ہی فیض ہے۔

بے نفسی وتواضع کا عجیب واقعہ

ایک واقعہ حضرت علامہ رفیق احمد صاحب قدس سرہٗ نے مفتاح العلوم کے ابتدائی ایام کا سنایا جس سے حضرت حکیم الاسلامؒ کے بہت سے کمالات پر روشنی پڑتی ہے۔

فرمایا: مفتاح العلوم جلال آباد کے سالانہ جلسہ میں حضرت مدنی قدس سرہٗ کی تشریف آوری تجویز تھی، حضرت مدنی قدس سرہٗ کو لینے کے لئے میں دارالعلوم دیوبند حاضر ہوا، وہاں دیکھا کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ سخت علیل ہیں، سفر دشوار ہے جس کی بنا پر حضرت مدنی نے معذرت فرمادی، حضرت مدنی قدس سرہٗ کے معذرت فرمانے کے بعد میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت حکیم الاسلامؒ دارالاہتمام میں کام میں مشغول تھے، ان کے سامنے صورت حال رکھی کہ اس طرح جلال آباد میں جلسہ ہے، حضرت مدنی قدس سرہٗ کی تاریخ ہے مگر حضرت مدنیؒ شدت علالت کی بنا پر تشریف لے جانے سے معذور ہیں اس لئے آپ تشریف لے چلیں، حضرت حکیم الاسلامؒ نے یہ سن کر قلم جس سے لکھ رہے تھے، اٹھا کر رکھ دیا اور فرمایا: ذرا اتنی مہلت دیجئے کہ میں گھر تک ہو آؤں، گھر تشریف لے گئے اور ایک جوڑا کپڑے لنگی میں لپیٹ کر ہاتھ میں لئے ہوئے تشریف لائے کہ چلئے، اس وقت نہ موٹر کی سہولت تھی نہ بسوں کا انتظام صحیح تھا، جلال آباد جانے کے لئے دیوبند سے پہلے سہارنپور جانا ہوتا تھا اور وہاں سے بذریعہ ٹرین جلال آباد پہنچتے تھے۔ چنانچہ دیوبند سے سہارنپور پہونچے، ٹرین صبح کے وقت تھی، شام کو سہارنپور پہونچے، شب میں ایک چھوٹی سی مسجد میں قیام فرمایا اس وقت نہ بجلی تھی نہ پنکھوں کا دور شروع ہوا تھا، مچھروں کی خوب کثرت تھی، اس حالت میں مسجد میں قیام کیا اور صبح ٹرین میں سوار ہو کر جلال آباد پہونچے۔ جلال آباد اسٹیشن پر مفتاح العلوم کے اساتذہ

اور طلبہ حضرت مدنی قدس سرہٗ کے استقبال کے لئے کھڑے ہوئے تھے، انہیں حضرت مدنیؒ کی علالت اور معذوری کا علم نہیں تھا، سب نے یہی سمجھا کہ حضرت مدنیؒ قدس سرہٗ تشریف لے آئے ہیں، سب نے حضرت مدنی زندہ آباد، شیخ الاسلام زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کردئے اور مدرسہ تک اسی طرح نعرے لگاتے رہے اور حضرت حکیم الاسلامؒ پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا، بخوشی سفر پورا کیا اور جلسہ سے فارغ ہو کر پھر سہارنپور کے راستہ سے ہی واپسی ہوئی، اس واقعہ سے حضرت حکیم الاسلامؒ کی خوردنوازی، رواداری، تواضع و انکساری، صبر وتحمل، دینی خدمت کا جذبہ اور اس کے لئے قربانی ومجاہدہ جیسی متعدد صفات کا علم ہو جاتا ہے۔

دوسرا واقعہ

حضرت حکیم الاسلامؒ کے تحمل و بردباری کا ایک عجیب واقعہ بندہ کے علم میں بھی ہے، بڑوت کے قریب ایک بستی (کشن پور برال) میں جلسہ کی تاریخ حضرت حکیم الاسلامؒ نے طے فرمائی تھی، حضرت کو اس بستی کا نام یاد نہیں رہا، بڑوت تشریف لائے اور وہاں پھونس والی مسجد میں دریافت فرمایا کہ یہاں قریب میں کسی بستی میں جلسہ ہے، بتایا گیا کشن پور برال میں آج جلسہ ہے، کشن پور برال پہونچے معلوم ہوا کہ شام سے جلسہ شروع ہوگا، حضرت حکیم الاسلامؒ دوپہر کو ہی پہنچ گئے تھے، استنجے کا تقاضہ ہوا، کسی نے پیشاب خانہ کی طرف رہنمائی کی، دیکھا کہ اینٹیں اوپر نیچے کر کے رکھ دی گئی ہیں اور اینٹیں جمی ہوئی بھی نہیں ہیں، قدم رکھنے سے ان کے گر جانے کا خطرہ ہے اور پیشاب خانہ سے نکلنے کی نالی بھی صاف نہیں جس کی وجہ سے پیشاب اور پانی وغیرہ جمع ہو رہا ہے، انتہائی ضعف ونقاہت کی حالت میں بمشکل پیشاب سے فراغت ہوسکی مگر زبان سے صرف اتنا فرمایا۔

یہاں پیشاب کرنا بھی بڑا مجاہدہ ہے، اس کے علاوہ نہ ڈانٹ نہ ڈپٹ نہ اظہار ناراضگی، البتہ شام کو کھانا تناول نہیں فرمایا کہ یہاں بڑے استنجے کا تقاضہ ہوا تو کیا ہوگا اور چائے وغیرہ بھی بہت معمولی برائے نام ہی لی اصرار کرنے پر فرمایا، خواہش نہیں۔

ہنسی خوشی رہے، ادنیٰ درجہ ناراضگی کا بھی اظہار نہیں ہوا، اہل مدرسہ نے مزید مہربانی یہ فرمائی کہ شام کی نشست میں تقریر نہیں کرائی، حضرت حکیم الاسلامؒ نے تقاضہ بھی فرمایا تو مدرسہ والوں نے کہا کہ حضرت کا بیان تو صبح کی نشست میں تجویز ہے، لوگوں کو اسی کی اطلاع کی گئی ہے، حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس کو بھی منظور فرمالیا اور رات بھر اسی طرح بلا کچھ کھائے پیئے قیام فرمایا۔

صبح کی نشست میں نو بجے حضرت حکیم الاسلامؒ کا بیان کرایا، انتہائی بشاشت اور خوش دلی اور انتہائی اطمینان کے ساتھ بیان فرمایا، بیان سے فارغ ہوکر انتہائی بشاشت کے ساتھ واپسی ہوئی، حضرت حکیم الاسلامؒ کا تحمل دیکھنے کے قابل تھا، وہاں سے واپس ہوکر ہی کسی جگہ استنجے وغیرہ سے فراغت فرمائی ہوگی اور کمال یہ کہ مدرسہ والوں پر یہ ظاہر بھی نہیں ہونے دیا کہ اس وجہ سے کھانا نہیں کھایا، یا یہ پریشانی ہے۔

یہ تو کئی دفعہ دیہات کے جلسوں میں دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ دیہاتیوں کو موٹا جھوٹا کھانا، بھینس کا گوشت، مرچیں زیادہ، سالن ٹھنڈا، روٹی سخت اور حضرت قدس سرہٗ نے انتہائی رغبت کے ساتھ اس کو تناول فرمایا، چھوٹے چھوٹے لقمے بہت آہستہ آہستہ (چوں کہ دانت بنے ہوئے تھے اس وقت بہت آہستہ کھایا جاتا تھا) کھانے کے دوران لطائف بھی ہوتے رہے۔

تواضع وعبدیت کا تیسرا واقعہ

ایک دفعہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں حضرت حکیم الاسلامؒ تشریف لائے اور حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے سامنے دوزانو بیٹھ گئے، حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کسی فتوے کے لکھنے میں مشغول تھے، جب حضرت مفتی صاحبؒ نے دیکھا تو فوراً کھڑے ہوگئے اور حضرت حکیم الاسلامؒ سے درخواست کی اوپر مسند پر تشریف رکھیں، حضرت حکیم الاسلامؒ نے عرض کیا اس وقت آپ مہمان ہیں اور مہمان کو میزبان جس جگہ بٹھائے اس کو اس جگہ بیٹھنا چاہئے، جب سائل بن کر تشریف لائیں گے اس وقت آپ وہیں بیٹھیں گے چنانچہ حضرت مفتی صاحبؒ کے اصرار پر حضرت حکیم الاسلامؒ مسند پر تشریف فرما ہوئے، ایک ایسی عظیم شخصیت مہتمم صاحبؒ کی کہ اپنے ماتحت ملازم کے ساتھ یہ معاملہ کس درجہ تواضع و عبدیت کو ظاہر کررہا ہے اس لئے کہ فقیہ الامت حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ باوجود عظیم شخصیت ہونے کے حضرت مہتمم صاحب قدس سرہٗ کے ماتحت اور ملازم تھے۔

کمالِ احتیاط

دارالعلوم دیوبند میں شوریٰ واہتمام کا ہنگامہ شباب پر تھا اسی موقعہ پر میرٹھ میں تشریف آوری ہوئی، شہر والوں کو خیال تھا کہ حضرت مہتمم صاحب قدس سرہٗ وعظ میں دارالعلوم کے اس اختلاف سے متعلق تفصیلات بیان فرمائیں گے، اہل شہر نے بڑی تعداد میں بیان میں شرکت کی اور بہت سے حضرات اسی نیت سے حاضر ہوئے کہ دارالعلوم کے اختلاف کے متعلق تفصیلات سنیں گے مگر سب حاضرین کو انتہائی تعجب ہوا کہ دو ڈھائی

گھنٹہ تفصیلی بیان میں دارالعلوم کے اختلاف سے متعلق ایک لفظ بھی بیان نہیں فرمایا گویا کہ کچھ ہوا ہی نہیں اس سے زیادہ کمال احتیاط اور کیا ہوگی۔

دارالعلوم سے عشق

حضرت حکیم الاسلامؒ کو دارالعلوم سے عشق کے درجہ کا تعلق تھا رات دن دارالعلوم کی ہی فکر میں رہتے حتی کہ کوئی بھی وعظ اور کوئی بھی بیان ہوتا، کسی بھی موضوع پر ہوتا مگر عموماً بیان میں کسی بھی ادنیٰ مناسبت سے دارالعلوم کی خدمات کا تذکرہ آ ہی جاتا اور دارالعلوم کا تذکرہ فرماتے ہوئے دارالعلوم کے ساتھ غیر معمولی تعلق کا اندازہ ہوتا جس کو تمام سامعین محسوس فرماتے۔

ایک دفعہ شہر میرٹھ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی تشریف آوری ہوئی، مرکز تبلیغ خیر المساجد، خیر نگر میں ہفتہ واری تبلیغی اجتماع میں حضرت حکیم الاسلامؒ کا بیان شروع ہوا، شروع میں دعوت و تبلیغ کی اہمیت وضرورت سے متعلق بیان فرمایا پھر اس دعوت و تبلیغ کی مناسبت سے دارالعلوم کی خدمات کا تذکرہ شروع فرمایا اور پورا بیان اسی پر ختم فرمایا۔

ایک عجیب خواب

اسی دوران ایک دوسرے نیک صالح شخص نے خواب دیکھا کہ ایک مکان میں چند بزرگ حضرات تشریف فرما ہیں، ایک حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ ہیں اور ایک حضرت مولانا مدنی نوراللہ مرقدہٗ اور تیسرے بزرگ حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب قدس سرہٗ ہیں۔ یہ تینوں اکابر تشریف فرما ہیں، اتنے میں باہر سے حضرت حکیم الاسلامؒ دروازے سے اندر داخل ہوئے اور ان حضرات کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے وعظ فرمایا جس میں خطبہ کے بعد تین آیات تلاوت فرمائیں اور انہیں آیات سے متعلق بیان شروع فرمایا، وہ تین آیات یہ ہیں۔

”وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَO فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَ کُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَO وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُO

اہل علم حضرات جانتے ہیں کہ یہ آیات آنحضرت ﷺ کی تسلی کے لئے نازل ہوئی ہیں، یہود اور کفار آنحضرت ﷺ برا کہتے تھے جس سے آنحضرت ﷺ کو تکلیف ہوتی تھی، اس موقع پر آنحضرت ﷺ کی تسلی کے لئے یہ آیات نازل ہوئیں۔

وعظ کی مقبولیت

حق تعالیٰ شانہ، حضرت حکیم الاسلامؒ کو شانِ مقبولیت عطا فرمائی تھی آپ کی ایک ایک ادا سے مقبولیت کی شان ٹپکتی محسوس ہوتی تھی، آپ کا وعظ بھی انتہائی مقبول ہوتا تھا جس بستی یا جس شہر میں وعظ تجویز ہوتا لوگ اطراف و جوانب سے کھنچ کھنچ کر چلے آتے تھے اور وعظ حالاں کہ انتہائی سادگی کے ساتھ ہوتا تھا مگر انتہائی پُر مغز اور پُر حکمت ہوتا تھا اور بیان میں انتہائی کشش ہوتی تھی اور سامعین پر ایک محویت طاری ہو جاتی تھی کہ وعظ ختم ہونے سے پہلے کوئی اٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

بندہ کو سب سے پہلے حضرت قدس سرہٗ کا وعظ میرٹھ میں سننے کی سعادت میسر آئی، محلّہ لال کرتی، شہر میرٹھ میں وعظ کا اعلان تھا، بندہ کا بچپن تھا، آٹھ دس سال کی عمر ہوگی، وعظ میں شرکت کے لئے ہمارے یہاں زین پور سے بس بھر کر آئی تھی جس میں بندہ بھی شریک تھا "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَ يَدِهٖ" اور "اَلْمُؤْمِنُ منْ امنه النَّاس علي دِمائِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ" یہ دو حدیثیں پڑھیں اور انہیں دو حدیثوں پر مفصل بیان ہوا، سامعین کا بہت بڑا مجمع تھا اور سب انتہائی ساکت وصامت اہل محلّہ کی اکثریت اگر چہ فرقہ بریلویت سے تعلق رکھتی ہے مگر سب انتہائی متأثر تھے۔

حکمت و بصیرت

حکمت و بصیرت کا حق تعالیٰ شانہ، نے وافر حصہ آپ کو عطا فرمایا تھا، جہاں تشریف لے جاتے اس حکمت و بصیرت کا معاملہ فرماتے اس وجہ سے ہر طبقہ اور مکتب فکر کے لوگ آپ سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔

گردوارہ میں بیان

سکھوں نے اپنے خاص گردوارہ میں مدعو کر کے بیان کرایا، حضرت قدس سرہٗ نے گرونانک کی سیرت پر مبسوط بیان فرمایا جس سے سکھ لوگ بہت متاثر ہوئے اور ان کے بڑے لوگوں نے بیان کیا کہ گرونانک سے متعلق اتنی معلومات تو ہم کو بھی نہیں تھی۔

ایک مناظرہ میں شرکت

حضرت والا قدس سرہٗ کا مزاج مناظرانہ نہیں تھا، مگر ایک جگہ مناظرہ تجویز تھا اور اس میں حضرت حکیم الاسلامؒ کو مدعو کیا تھا، فریق مخالف نے نقض امن کا اندیشہ ظاہر کر کے وہاں کے تھانہ والوں سے یہ طے کرا لیا کہ کوئی

فریق دوسرے فریق کے بانی یا ذمہ دار کا نام لے کر کچھ بیان نہیں کرے گا، حضرت حکیم الاسلامؒ نے مبسوط بیان فرمایا اور فریق مخالف کے تمام عقائد باطلہ کا رد انتہائی خوبصورتی کے ساتھ فرما دیا کہ حکام کو یا فریق مخالف کے ذمہ داروں کو کچھ کہنے کی گنجائش نہیں مل سکی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کا انداز یہ تھا کہ چوں کہ قانونی طور پر یہ پابندی لگا دی گئی ہے کہ کوئی کسی قائد یا شخصیت کا نام لے کر بیان نہیں کرے گا اس لئے ہم کسی کا نام نہیں لیتے قانون کا احترام کرتے ہیں۔ اگر قانونی پابندی نہ ہوتی میں یہ کہتا کہ فلاں صاحب نے یہ لکھا ہے یہ لکھا ہے اور فلاں جگہ یہ بیان کیا ہے جس کا حکم یہ ہے لیکن چوں کہ قانونی پابندی ہے اس لئے میں یہ نہیں کہتا، اسی طرح فریق مخالف کی ایک ایک چیز بیان فرما کر پوری تردید فرمادی۔

حکیم الاسلام کا لقب

اسی حکمت و دانائی کی وجہ سے امت نے آپ کو حکیم الاسلام کا لقب دیا تھا جس کے آپ بجا طور پر مستحق تھے۔

مجمع الکمالات والمحاسن

غرض کہ حق تعالیٰ شانہ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کو ان اوصاف و کمالات سے نوازا تھا کہ حضرت والا قدس سرہٗ بجا طور پر مجمع الکمالات والمحاسن تھے اور آپ کی ذات ستودہ صفات گلدستۂ محاسن و کمالات تھی، جس کی تصویر کشی بھی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

گر مصور صورت آن دل ستاں خواہد کشید لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

............❖............

حکیم الاسلامؒ بحیثیت شاگرد
امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر
استاذ وقف دارالعلوم دیوبند

انسانی زندگی رشتوں کے درمیان بٹی ہوئی ہے، ماں باپ اور اولاد کا رشتہ، بھائی بہن کا رشتہ، شوہر بیوی کا رشتہ یہ تمام رشتے محترم بھی ہیں اور قابل عزت بھی ان رشتوں کے سرے انسان کو ڈھونڈنے اور تلاش کرنے سے مل جاتے ہیں، مگر دنیا کا ایک رشتہ ایسا بھی ہے جس کا چلن عام ہے اور جس کو استاد اور شاگردوں کا رشتہ کہا جاتا ہے، لیکن تلاش بسیار کے بعد بھی اس کا سرا ہاتھ نہیں آتا دنیا کے اس کونے سے لیکر اس کونے تک زندگی کے ہر شعبے اور ہر میدان میں استاد اور شاگرد کا یہ تعلق قائم ہے اور جب سے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا اسی وقت سے اس رشتے کی ابتدا ہوئی اور دنیا کے اختتام تک اسی کا سلسلہ چلتا رہے گا، ہم بہت تلاش کرنے اور تحقیق کی وادیوں میں کچھ حاصل کرنے کے لئے نکلتے ہیں، تو کتاب برحق قرآن کریم میں انسان کے اول استاد کی حیثیت سے ہمیں یہ نام ملتا ہے، قرآن کا ارشاد ہے کہ **وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا**۔

اور سکھلا دیئے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے۔

قرآن کے اس اعلان کے بعد خالق کائنات کی ذات اقدس انسان کے اول استاد کی حیثیت سے سامنے آتی ہے تخلیق آدم کے مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد رب العالمین نے فرشتوں کی موجودگی میں آدم کی خلافت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ان سب کو ایک امتحان سے گذارا اور اسی کے درمیان آدم کو نام سکھلانے کا اعلان فرمایا اس طرح حضرت حق جل مجدہٗ کی ذات اقدس کے ذریعہ یہ مرحلہ تکمیل کو پہنچا پھر خلافت انسانی کا دور شروع ہوا تو استادی اور شاگردی کا یہ تعلق اس قدر مضبوط و مستحکم

اور وسیع ہوتا چلا گیا کہ آج زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں یہ عمل کارفرما نہ ہو ایک ڈاکٹر ایک وکیل ایک جج ایک آفیسر سے لیکر ایک چپراسی ایک بڑھئی ایک معمار تک سب اس رشتے کی مضبوط زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں، ایسا نہیں ہوا کہ کوئی آدمی ماں کے پیٹ سے تعمیر کا فن سکھا سکھایا ہوا ہو یا کوئی بچہ وکالت پر مکمل عبور کے ساتھ اس دنیا میں آیا ہو بلکہ ایک ماہر معمار کی سرپرستی سے ہی اس بچے کی تعمیری صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں اور وہ کچھ سیکھ سکا ایک ماہر اور کامیاب وکیل کی نگرانی اور توجہ سے ہی ایک کم عقل اور کم فہم بچہ وکالت کی باریکیوں اور نزاکتوں کو مرحلہ وار سمجھنے کے قابل ہو سکا، اگر خود کسی شخص کو آپ کسی میدان اور کسی فن پر خود بخود کچھ کرتے اور بناتے دیکھتے ہیں تو لازمی طور پر اس شخص کی کاوشوں میں کوئی نقص، کوئی جھول، ضرور ہوگا، جس پر ممکن ہے اس کے ہمعصروں کی نظر نہ پڑے لیکن اس کے بعد آنے والی نسلیں اس کی خرابیوں اور نقائص پر ضرور مطلع ہو جائیں گی ثابت ہوا، کہ صدیوں سے انسانی سانسوں کے ساتھ ساتھ قدم سے قدم ملا کر استاد اور شاگرد کا یہ سلسلہ چل رہا ہے۔

اب آیئے ایک دوسری دنیا کی طرف نظر ڈالیں جسے علم کی دنیا کہا جاتا ہے اس دنیا میں استاد اور شاگرد کا جو رشتہ ہے اس کی اپنی ایک شان ہے ایک عظمت ہے اور اپنا جداگانہ انداز ہے دنیا کے کسی فن کو سیکھنے یا جاننے کے لئے رات دن شدید محنت، خلوص، استاد کا احترام اور دشواریاں اور پیچیدگیاں اس راہ کا اصل سامان ہیں، جو ان پر قابو پالیتا ہے، کامیاب ہو جاتا ہے، علم دین کی طلب اور اس کے حصول کی خواہش جن دلوں میں پیدا ہوتی ہے، ان کے جذبات دوسرے ہوتے ہیں، ان کے خیالات میں فرق ہوتا ہے، اور ان کے فرائض کا دائرہ یکسر مختلف ہو جاتا ہے، اس میدان میں عقیدت و محبت احترام و ادب اور تقدس و پاکیزگی کا وہ شدید جذبہ درکار ہوتا ہے، جس سے واقعی کچھ پایا اور حاصل کیا جا سکے، یہاں لاپرواہی سے اجتناب اور استاد کی عظمت کو ہر وقت سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے، اگر ایسا نہیں ہوتا یا کچھ لوگ اپنے آپ کو اس قابل نہیں بنا پاتے تو وہ علم سے یکسر محروم رہ جاتے ہیں، اور ہمارے اور آپ کے درمیان پھیلے ہوئے ہزاروں انسانوں میں ایسے لوگوں کا مل جانا مشکل نہیں ہے۔

علم کی عظمت کا اندازہ آپ حضرت امام اعظمؒ کے اس مشہور واقعہ سے لگا سکتے ہیں کہ ایک بار کسی مسئلہ کے سلسلہ میں آپ نے کسی بھنگی سے کچھ دریافت فرمایا بھنگی کے جواب پر آپ ہمیشہ اس کی عزت کرتے رہے وہ اس لئے کہ ایک مسئلہ کو حل کرنے اور سلجھانے میں آپ کو اس کا تعاون حاصل ہوا تھا۔

پھر تاریخ انسانی میں ایسے شاگردوں کی بھی کمی نہیں، جنھوں نے عمر بھر اس جانب اپنے پاؤں نہیں

کئے جدھران کے استاد کا مکان یا رہائش گاہ تھی۔ عقیدت واحترام کے ان ہی پاکیزہ جذبات کی بناپر اسلامی تاریخ میں ایسی نادرہ روزگار شخصیتیں ملتی ہیں جن کا بدل یہ دنیا پیش کرنے سے عاجز ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد حضرت امام محمدؒ اور حضرت امام یوسفؒ کا جواب کون پیش کرسکتا ہے یا ابن تیمیہؒ کے شاگرد ابن قیم کا بدل کون لاسکتا ہے، خود ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے شاگرد مولانا عاشق علی شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مثال کہاں مل سکتی ہے یا ماضی قریب میں بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگرد مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا عبدالرب صاحبؒ بانی مدرسہ عبدالرب، کشمیری گیٹ، دہلی کے علوم وکمالات کو چیلنج کرنے کی ہمت کس میں ہے غرض کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایسی صاحب کمال اور صاحب علم ہستیاں موجود ہیں جو خود بھی بلند مراتب پر فائز تھیں اور جن کے شاگردوں نے بھی علم کے میدان میں نمایاں اور گرانقدر خدمات انجام دیں۔

دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں گذشتہ ایک صدی زائد سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا فریضہ انجام دے رہا ہے، اس ادارے نے اپنی زندگی میں جو عظیم افراد پیدا کئے ہندوستان کی تاریخ میں اس کی مثال کسی دور میں نہیں ملتی، ایک سے ایک بڑھ کر عظیم ہستی اور صاحب علم یہاں ملتا اور نظر آتا ہے، لیکن اس عظیم علمی مجلس میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ دارالعلوم دیوبند نے اپنے دور کی ایک ایسی شخصیت کو جنم دیا کہ جس پر وہ اپنی زندگی کے آخری سانسوں تک بجا طور پر فخر کرسکتا ہے، امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی شخصیت کمالات علمی اور خدمات کا ہر طبقہ معترف ہے آپ اپنی علمی عظمت کی بناء پر جو مقام رکھتے ہیں وہ تو ظاہر ہے مگر ایک وصف آپ کو اکابر دارالعلوم دیوبند میں بہت ممتاز اور نمایاں کرتا ہے کہ آپ کے حلقۂ درس اور آغوش علم سے ایسے افراد اور شاگرد سامنے آئے جنھوں نے دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ کر علم کے چھوٹے بڑے ہزاروں چراغ روشن کئے بلاشبہ گذشتہ ۴۰/۳۵ سال کے عرصہ میں علماء کا جو طبقہ ہندوستان اور دیگر ممالک میں نمایاں اور ممتاز رہا اس کو حضرت کشمیریؒ کی شاگردی کا فخر حاصل ہے، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، مولانا محمد شفیع دیوبندیؒ، مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا منظور نعمانی، مولانا محمد میاں دیوبندیؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا سید احمد رضا، مولانا محمد انوری فیصل آباد، مولانا غلام اللہ خانؒ، مفسر القرآن مولانا محمد چراغ گوجرانوالہ، مولانا قاضی شمس الدین، مولانا قاضی زین العابدین، مولانا شمس الحق افغانی، علامہ محمد

شریف کشمیری اور حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد محمد طیب صاحب قاسمیؒ وغیرہم ایسے آفتاب و ماہتاب ہیں، جن کو حضرت امام العصرؒ کے شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب نور اللہ مرقدہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند بلاشبہ ان عرفانی اور آفاقی شخصیات میں سے تھے، جو چرخ کی ہزاروں گردشوں کے بعد جنم لیتی ہیں اور چشم فلک جن کا صدیوں اور سالوں انتظار کرتی ہے وقت قدم قدم پر رک کر اور سنبھل کر ایسے افراد کو بناتا ہے، سنوارتا ہے اور تراشتا ہے، تب کہیں جا کر ایک گوہر نایاب، ایک ولی کامل ایک مرد باصفا کا جنم ہو پاتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کے گو مختلف پہلو ہیں اور ہر پہلو کا تقاضا ہے کہ اس پر لکھا جائے ارباب علم کا یہ مجمع یقینی طور پر اچھے انداز میں روشنی ڈال سکے گا۔

حضرت علامہ کشمیریؒ اور حضرت حکیم الاسلامؒ کے ایک استاد اور ایک شاگرد کی حیثیت سے تعلقات کو جاننے کے لئے ہمیں بہت دور تک جانا ہوگا۔

حضرت کشمیریؒ اپنے بچپن میں دیوبند آئے تو سب سے پہلا واسطہ ان کا خاندان قاسمی سے پڑا خاندان قاسمی کے سربراہ مولانا محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور ان کی والدہ ماجدہ یعنی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی اہلیہ محترمہ نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش کا بہتر سے بہتر انتظام کیا۔

اس پر مسرت ماحول میں حضرت علامہؒ کو اپنی ذہانت و ذکاوت کے جوہر دکھانے اور مختلف علوم و فنون پر کامل دسترس حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت مشاہیر علم و ادب کا ایک گروہ تھا، جس میں مولانا حافظ محمد احمدؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ، مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ یہ سب اہل علم ایک جگہ جمع تھے، اپنے فکر و نظر سے قومی اور علمی مسائل کی گتھیاں سلجھا رہے تھے، یہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیبؒ کی تعلیم کا زمانہ تھا، انھوں نے حضرت علامہ کشمیریؒ سے بیحد علمی استفادہ کیا، ان کی رہنمائی میں بڑے بڑے علمی مسائل کی تہہ تک پہنچے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمیؒ نے صرف خارج میں حضرت کشمیریؒ سے علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں بلکہ دو سال ان کے سامنے دورۂ حدیث کی سماعت کی سفر و حضر میں حضرت کشمیریؒ کے ساتھ رہے اپنی تحریر و تقریر پر حضرت علامہ کشمیریؒ سے اصلاح لیتے رہے چنانچہ حضرت علامہؒ کی سوانح عمری ''حیات انور'' میں جابجا حکیم الاسلامؒ نے اپنے استفادات کا ذکر کیا ہے، حضرت علامہ کشمیریؒ بلامبالغہ دس سال حضرت

مولانا محمد احمد صاحبؒ کے مکان پر مقیم رہے۔ ان کے دستر خوان پر کھانا کھایا اور علمی منزلیں طے کیں۔

علامہ کشمیریؒ کے حکیم الاسلامؒ کے بزرگوں اور بڑوں سے جو تعلقات رہے اور جس محبت وخلوص کا خاندان قاسمی کے سرپرستوں نے آپ کے ساتھ معاملہ فرمایا اس کا اثر فطری طور پر حضرت حکیم الاسلامؒ اور حضرت کشمیریؒ کے دلوں پر بھی پڑا اور استاد وشاگرد کا رشتہ جو آگے چل کر قائم ہوا، اس میں ایک خلوص اور قدیم تعلق بھی شامل ہو گیا اور اس طرح حضرت حکیم الاسلامؒ حضرت علامہ کشمیریؒ کے قابل فخر شاگرد بنے اور آپ نے علمی مسائل اور علمی گتھیوں کو سمجھنے اور سلجھانے میں علامہ کشمیریؒ سے کافی رہنمائی حاصل کی، حضرت حکیم الاسلامؒ نے دورانِ تعلیم علامہ کشمیریؒ کی تقریر ودرس کو ضبط قلم کرنے کا بھی اہتمام فرمایا اور اس پر کافی محنت کی خود تحریر فرماتے ہیں کہ:

میں نے ان مختلف الانواع کو دیکھ کر ایک املا کی کاپی تیار کی جس کے لمبے چوڑے اوراق میں چھ سات کالم بنائے اور ہر کالم کے اوپر والے سرے پر فنون کے عنوان ڈال دیئے یعنی مباحث حدیث مباحث تفسیر، مباحث عربیت (نحو وصرف)

مباحث فلسفہ ومنطق، مباحث ادبیات، مباحث تاریخ وغیرہ۔

پھر علوم عصریہ کے لئے ایک کالم رکھا کیوں کہ موجودہ دور کے فنون جیسے سائنس، فلسفہ، جدید، ہیئت، جدید وغیرہ کے مباحث بھی بذیل بحث حدیث درس میں آتے تھے، میں کالم واران مباحث کو املا کرتا جاتا تھا۔

ان فنی مباحث کے کالموں کے بعد کاپی کے کنارے کالم پر حضرت ممدوح کی رائے اور محاکمہ کا تھا جس کے سرنامہ پر عنوان تھا، ''مآل الاستاذ'' اس میں وہ فیصلے درج کر لیا کرتا تھا، جو مسائل کی تدقیق و تنقیح کے بعد بطور آخر نتیجہ کے حضرتؒ یہ کہہ کر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں کہتا ہوں۔

افسوس یہ بیاض جو تقریباً چار پانچ صد صفحات پر مشتمل تھی ایک کرم فرما طالب علم نے مستعار مانگی اور میں نے اپنی طالب علمانہ ناتجربہ کاری سے چند روز کے لئے ان کے حوالے کر دی انھوں نے وہی کیا جو کتاب کو عاریۃً مانگنے والے طلباء کرتے ہیں، چند دن بعد میرے مطالبہ پر فرمایا کہ میں تو دے چکا ہوں آپ کو یاد نہیں رہا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان مغالطوں سے عاجز آ کر میں نے اس ذخیرے سے صبر کر لیا۔

جس کو کافی عرق ریزی اور محنت سے تیار کیا تھا، حیات انور ص ۲۱۵ رحضرت علامہ کشمیریؒ کا یہ علمی ذخیرہ جو حضرت حکیم الاسلامؒ نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے جمع کیا تھا اگر محفوظ رہ جاتا اور چھپ کر سامنے آ جاتا تو اندازہ ہوتا کہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے کس جانفشانی کا مظاہرہ کیا تھا اور ان کو اپنے استاذ کے علوم سے کس

درجہ مناسبت تھی، حضرت حکیم الاسلامؒ نے بحیثیت شاگرد علامہ کشمیریؒ دوران درس علمی مجلسوں نجی ملاقاتوں سے بہت کچھ حاصل کیا، جہاں کہیں الجھے شبہ ہوا یا مسائل کی گہرائی تک نہیں۔ پہنچ پائے وہاں حضرت علامہؒ سے رجوع کیا۔ جس زمانے میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے ''نونیۃ الآحاذ'' نامی تصنیف فرمائی اس زمانے میں آپ کو اپنی کتاب کے سلسلہ میں ابوالحسن کذّاب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی تو آپ علامہ کشمیریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اپنی اس ملاقات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

میں نے عرض کیا حضرت ابوالحسن کذّاب کا ترجمہ نہیں ملتا اس کے بارے میں نشان معلوم کرنے حاضر ہوا ہوں؟ فرمایا ادب و تاریخ کی کتابوں میں فلاں فلاں مواقع کا مطالعہ کیجئے تقریباً آٹھ دس کتابوں کے نام دے دیئے میں نے عرض کیا حضرت مجھے اس شخص کی پوری تاریخ نہیں معلوم کرنی صرف اس کی صفت کذب و دروغ گوئی کے حالات معلوم کرنے ہیں مگر ان کا کوئی عنوان کسی کتاب میں نہیں ملتا کہ اس کے نیچے ان خاص واقعات کا مطالعہ کرلوں، فرمایا مولوی صاحب آپنے بھی کمال کیا صفت کذب کون سی روح ہے کہ لوگ اس پر عنوانات قائم کر کے اس کے واقعات دکھلائیں، کسی مذموم صفات وافعال کا تذکرہ ضمناً اور اضطراراً آ جاتا ہے، عنوانات ہمیشہ کمالات پر قائم کئے جاتے ہیں، نہ کہ نقائص و عیوب پر ان کتابوں میں فلاں فلاں مقام دیکھ لیجئے ضمناً اس کیفیت کذب کا بھی تذکرہ کہیں نہ کہیں مل جائے گا میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے تو کتابوں کے اتنے اسماء بھی یاد نہ رہیں گے چہ جائیکہ ان کے یہ مضامین اور مواقع محفوظ رہیں، نیز انتظامی مہمات کے بکھیڑوں میں اتنی فرصت بھی نہیں کہ چند جزوی مثالوں کے لئے اتنا طویل و عریض مطالعہ کروں بس آپ ہی اس شخص کے کذبات اور دروغ گوئی سے متعلق واقعات کی دو چار مثالیں بیان فرما دیں، میں ان ہی کو آپ کے حوالے سے جز و کتاب بنا دوں گا اس پر مسکرا کر ابوالحسن کذاب کی تاریخ اس کی سن ولادت سے بیان فرمانی شروع کر دی جس میں اس کے جھوٹ کے عجیب و غریب واقعات بیان فرماتے رہے، آخر میں سن وفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شخص مرتے مرتے بھی جھوٹ بول گیا اور پھر اس جھوٹ کی تفصیل بتائی۔

حیرانی یہ تھی کہ یہ بیان ایسے طرز سے ہو رہا تھا کہ گویا حضرت ممدوح نے آج کی شب میں مستقلاً اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے جو اس بسط سے سن وار واقعات بیان فرما رہے ہیں۔(۱)

غرض کہ حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے استاذ حضرت علامہ کشمیریؒ سے کافی علمی استفادہ کیا وہ صحیح معنی میں حضرت کشمیریؒ کے قابل فخر شاگرد تھے، حضرت حکیم الاسلامؒ کو اپنے استاد سے بے پناہ محبت و تعلق رہا، جس کا بارہا

اظہار بھی ہوا، اور ہزار ہا تقریروں اور تحریروں میں آپ نے اپنے استاذ کے تذکرے سے اپنے اس تعلق کو مضبوط اور مستحکم بنایا جہاں کہیں تذکرہ آتا جب کبھی دارالعلوم کی بات چلتی اکابر کی یادیں تازہ کی جاتیں تو کیا مجال کہ حضرت حکیم الاسلامؒ حضرت کشمیریؒ کے طویل تذکرے کے بغیر بات مکمل کر دیتے اپنے استاد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے، آپ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

اگر کسی شخص نے کسی کی برائی یا فضول بات شروع کی تو معاً فرماتے کہ بھائی ہمیں اس کی فرصت نہیں ہے کوئی مسئلہ ہو تو پوچھو ہمارا وقت ایسی باتوں کے لئے فارغ نہیں۔(۲)

اور علامہ کشمیریؒ کی اس حددرجہ احتیاط اور عادت کریمہ کا مشاہدہ خود ہم نے اپنی آنکھوں سے حضرت حکیم الاسلامؒ کی مجلسوں اور نشستوں میں دیکھا جب کبھی حضرتؒ کی مجلس میں اس قسم کی بات کی جاتی جس سے کسی کی تحقیر یا جھوٹا ظاہر کرنا مقصود ہوتا تو حضرتؒ ایسی بات کے لئے منع فرما دیتے، زندگی کے آخری دو تین سال جو شدید ابتلا و آزمائش کے تھے، ان میں بھی حضرتؒ نے جھوٹی باتوں سے اپنی مجلس کو پاک رکھا جو اس بات کی علامت ہے کہ حکیم الاسلامؒ حضرت کشمیریؒ کے نہ صرف علمی جانشین اور قابل فخر شاگرد ہی تھے، بلکہ ان کی اداؤں اور عادات کو بھی اپنے اندر سمو لیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ کشمیریؒ جیسی نادرۂ روزگار شخصیت روز جنم نہیں لیتی اور نہ حضرت حکیم الاسلامؒ جیسا شاگرد روز پیدا ہوتا ہے، اب تو ان نورانی شخصیتوں کے واقعات ہی ہیں، جن میں ہمارے لئے ایک سبق عمل موجود ہے خدا ان دونوں عظیم ہستیوں کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔ آمین!!

---

(۱) مولانا ازہر شاہ قیصر، حیات انور، ص: ۲۲۷، ۲۲۸

(۲) ایضاً، ص: ۲۲۳

............❖............

حکیم الاسلامؒ
کا
اسلوبِ بیان اور بلندیٔ فکر

مولانا غلام نبی قاسمی
استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند

حکیم الاسلامؒ کو اللہ تعالیٰ نے جن علمی کمالات سے نوازا تھا ان میں زبان و بیان اور تحریر و تقریر کا ایک خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، جس موضوع پر لکھتے یا بولتے اس کے بنیادی عناصر کا اہتمام سیاق وسباق کی رعایت موضوع کے قریب و بعید کے مناسبات اور لوازمات کی پابندی، قصص و امثال سے وضاحت، خوبصورت محاورات کا استعمال، الفاظ کے انتخاب اور مناسب تعبیرات کی رعایت، جب بات شروع کرتے تو دھیمی رفتار سے کچھ آگے بڑھتے تو میدانی دریاؤں کی طرح سے مست خرام جوں جوں دور ہوتے چلے جاتے رفتار بڑھتی چلی جاتی۔ جس میں جھرنوں کا حسن، قوس وقزح کا جمال، بجلی کی چمک، موسم بہاراں کی دلکشی، مرغ زاروں کی دلفریبی، شبنم کی ٹھنڈک اور نسیم سحری کی جاں نوازی، سب کچھ ہوتا موضوع کے ہر پہلو کو اپنے انداز میں سوچتے اپنے انداز میں برتتے ایک خاص ترتیب سے ہر ہر جزء کا احاطہ کرتے، مدعا کو ثابت کرنے کے لئے عقلی،، نقلی، لمی، فلسفی، سائنسی ہر قسم کے دلائل ہر قسم کے نظائر اور ہر قسم کے شواہد، بات سے بات نکتہ سے نکتہ تسلسل جیسے مرارید کی لڑی، زبان سے الفاظ کیا موتی جھڑتے، فقرے کیا نکلتے جیسے شاخوں سے کلیاں ٹوٹ رہی ہوں، مطالعہ وسیع، معلومات بے انتہاء، حافظہ بے پناہ، جیسے شخص واحد کئی زرخیز دماغوں کا مجموعہ، کئی شخصیتوں کا جامع، کئی کئی کتب خانوں کا مجمع اور علم وآگہی کی ایک چلتی پھرتی کائنات۔

انداز مثبت اور تعمیری، جس میں تحقیق بھی، تدقیق بھی، تنقید بھی، تنقیح بھی، تفسیر بھی، تشریح بھی، تحلیل بھی، تجزیہ بھی، ارشاد و اصلاح بھی، افہام و تفہیم بھی، تنبیہ و نصیحت بھی، اور جدید سائنسی انکشافات بھی، زبان کی حلاوت، بیان کی ملاحت، لب ولہجہ کی جاذبیت، حکمت آفرینیوں کی طراوش اور دقیقہ سنجیوں کی بارش مزید برآں! گویا شاعر مشرق کی اس آرزو اور دعا کا حرف بہ حرف مصداق ۔

دیکھے تو زمانے کو اپنی نظر سے ۔۔۔ افلاک منور ہوں ترے نور سحر سے
خورشید کرے کسب ضیاء تیرے شرر سے ۔۔۔ ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موج گہر سے ۔۔۔ شرمندہ ہو فطرت ترے اعجاز ہنر سے

جن موضوعات کو آپ کے خامہ عنبر شامہ نے چھولیا، علم و تحقیق سے مالا مال اور فکر و بصیرت سے نہال کر دیا، پاکیزہ تشریحات، نفیس تمبیہات، لطیف توجیہات، اور عمیق اشارات سچ ہے کہ جو پاکیزگی، نفاست، لطافت آپ کے نام میں تھی وہ آپ کے کام میں بھی تھی، جو سنجیدگی، متانت اور شرافت، مزاج میں تھی، وہ تحریر و تقریر، اور ہر جنبش قلم میں بھی تھی، جو حکمت، بصیرت اور دقیقہ آفرینی ذہن میں تھی وہ ایک ایک لفظ میں بھی جو ذخیرہ معلومات، اور علوم و فنون کا خزانہ دماغ میں تھا وہ تحریر خطاب اور تصنیف و کتاب میں بھی، جو سوز و گداز دل میں تھا، وہ الفاظ میں بھی، ایمان و یقین کی جو حرارت سینۂ بے کینہ میں تھی وہ اظہار و بیان میں بھی، جو خلوص، للٰہیت اور خاکساری طبیعت میں تھی اس کا عکس اظہار خیال میں بھی ۔

یہ آبجو کی روانی یہ ہمکناریٔ خاک ۔۔۔ مری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ
اُدھر نہ دیکھ ادھر دیکھ اے جوان عزیز ۔۔۔ کہ بلند زورِ دروں سے ہوا ہے فوّارہ

اس دیدہ ور شخصیت جس کی آنکھوں میں صدیوں کے علوم کمال ایک چمن، صد رنگ، دانش و آگہی کی ایک کائنات، اور تجربات و مشاہدات کی ایک دنیا آباد تھی ۔

ہم لئے پھرتے ہیں آنکھوں میں چمن اے باغباں
جس طرف اٹھی نگاہِ شوق گلشن ہوگیا

بالفاظ دیگر یوں بھی ۔

نہ بصحرا سرے دارم نہ باگلزار سودائے
نہ ہر جا می روم از خویش می جوشد تماشائے

کبھی سپاٹ و سنگلاخ موضوعات کی زمین سے موتی برآمد کیے اور کبھی کانٹوں ہی سے گلدستے تیار

کیے بچوں کی معصوم مسکراہٹ کی طرح بناوٹ، تصنع، ٹھونس ٹھانس اور اغلاق سے خالی۔

جو کچھ آپ سن چکے اس سے کہیں زیادہ وہ ہے جو حکیم الاسلامؒ کی بہار آفریں تحریر کی زبانی آپ سنیں گے، سو لیجئے سنیئے آپ کی نگاہ کے علاوہ تحریر اور آپ کے درمیان اب کوئی حائل نہیں۔

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

''انسان حقیقت جامعہ ہے'' اس میں ساری کائنات کے نمونے بھی جمع ہیں اور ساری کائنات کے ذرہ ذرہ کے احوال وافعال بھی جمع ہیں یہ جامع العناصر بھی ہے جامع الموالید بھی ہے، جامع المجر دات بھی ہے، جامع الارواح بھی ہے، جامع الاجسام بھی ہے، جامع الاغذیہ بھی ہے، جامع الامراض بھی ہے، جامع الانواع الحوت بھی ہے اور جامع انواع الحیات بھی ہے، مادیات میں دیکھو تو ہر جانور کی غذاء مخصوص ہے، چرندے گھاس کھاتے ہیں، درندے گوشت کھاتے ہیں، بعض جانور ہوا کھاتے ہیں، لیکن انسان سب غذائیں کھاتا ہے اور اگر شرائع نہ روکیں تو یہ حرام وحلال میں تمیز نہ کرے اور ظاہر ہے کہ ہر چیز منفعت کے ساتھ مضرت کا پہلو بھی رکھتی ہے اس لیے اس پر امراض بھی انواع واقسام کے آتے ہیں جو کسی جانور پر نہیں آتے جانور طبعی انداز میں موت کے وقت مر جاتے ہیں پھر موت بھی اس کی جامع یہ گرمی سردی خشکی تری سب سے مرتا ہے یہ جامع انواع موت ہے لباس اس کے متنوع غرض جو احوال الگ الگ سارے عالم پر تن پوشی کے بارے میں آسکتے ہیں وہ سب اس پر آتے ہیں پھر غذاؤں کے معنوں اثرات جو اخلاق پر پڑتے ہیں اور مختلف جانداروں میں ہیں وہ سب اس پر آتے ہیں غرض غذاء دواء شراب لباس وغیرہ میں یہ جامع ہے مکان کے لحاظ سے دیکھو تو جامع الامکنہ بھی ہے غرض جس لحاظ سے نگاہ ڈالو یہ جامع ہی جامع ہے غرض جامع الغذاء غرض جامع اشراب، جامع انواع امراض، جامع انواع صحت، جامع انواع موت، جامع انواع احوال مادی، صرف یہ انسان ہے پھر مادیات لطیفہ میں جنات ان عرضی احوال سے بری ہیں ملائکہ ان سب احوال سے بری ہیں یہ انسان اتنا لطیف ہو جاتا ہے کہ کوئی برائی اس تک نہیں پہنچتی کیوں کہ نفس ہی بوجہ ریاضت برائی سے بری ہو جاتا ہے تو جیسے نور نجاست پر گرے یا نجاست دھوپ پر ڈالی جائے دھوپ تک وہ پہنچ ہی نہیں سکتی اسی طرح انسان بھی جب انواع عبادت سے ملکیت پر آجاتا ہے تو ہر برائی سے بری ہو جاتا ہے نہ اس میں خود میں برائی آتی ہے نہ دوسروں کی برائی اس تک آتی ہے اور جب فساد آتا ہے تو جامع الفساد بھی ہے کہ اس سے زیادہ مفسد کوئی شیطان اور جن بھی نہیں ہو سکتا فساد کی عقلی صورتیں وہ نکالتا ہے کہ شیاطین کو

بھی نہیں معلوم اس لیے عالم میں گمراہیاں صرف اس کی لائی ہوئی ہیں اللہ ورسول سے ہٹنے سیدھے راستہ سے بھٹکنے کے نئے نئے طریقے سوچ کر نکالتا ہے فساد اور خوں ریزی کے نئی نئی تدبیریں نکالتا ہے جس سے زمانہ میں انقلابات رونما ہوتے ہیں لیکن جس طرح تمدن میں ارتقاء اور قاعدہ سے آخری قوم کا تمدن جامع اور کامل ہوسکتا ہے کہ پچھلوں کے تجربات اور علوم طبعیہ سب اس کے سامنے ہوتے ہیں ایسے ہی ادیان میں بھی ارتقاء ہے جو آخری امت ہوگی وہی جامع الدین ہوگی کیوں کہ اگلوں کے تمام علوم ومعارف اس کے دماغ میں ہوں گے اور اس کی استعداد کی تشریعی جامعیت بھی ملی ہوئی ہے اب اسی نوع میں امت مرحومہ کو دین بھی جامع دے دیا گیا تو یہ امت نہ صرف جامع احوال عالم ہوئی بلکہ جامع اقوام عالم بھی ہوئی یعنی اس نے ہدایت پائی تو جامع الہدایہ ہوگئی اور فساد اٹھائے گی تو جامع المفاسد کی بھی انتہائی ہوگئی، اسلام جامع دین ہے ''**الیوم اکملت لکم**'' چناں چہ اس امت کو نبی بھی جامع کمالات دیا گیا جو علوم اولین اور آخرین کے جامع اعمال واخلاق ہیں اور اخلاق انبیاء کا جامع بلکہ سرچشمۂ جامعیت اس لیے دین بھی جامع ہونا چاہیے تھا کیوں کہ نبی کی طبیعت پر شریعت اترتی ہے سو وہ جامع ترین ہے ایسے ہی فرمایا: ''**وجعلنا کم امة وسطا**'' چناں چہ اس امت کے ہر دور میں جس نوع کے طبقات آئے اسی نوع کی قرآن کی تجلی نمایاں ہوئی یعنی کتاب کے بھی جامع دین وملک دونوں میں حاوی، دیانت وسیادت دونوں کی جامع ہوتی پھر احکام کی جامع، شقوق وجوانب وحکم کی، جامع تو امت بھی جامع ہوئی تو اس امت کو امت وسط کہتے ہیں اس لیے کہ یہ جانبین کی خوبیوں کی جامع ہے چناں چہ جمال وجلال دونوں کو جمع کرنا کمال ہے اس لیے اس امت کو قیراطین عطا ہوئے دوسری امتوں کو قیراط واحد دیا گیا اس امت کو ہر عمل پر دوگنا اجر دیا گیا کہ یہ جامع الہدایت بن کر عمل پیدا ہوتی ہے تو ثواب بھی جامع الثوابات ملنا چاہیے تھا اور ایک طرف اس امت کو ''**لتتبعن سنن من قبلکم شبرا بشبر**'' بھی فرمایا گیا کہ یہی امت جامع الضلالات بھی بن گئی جو ان میں سے مہدی بنے گا اس کی ہدایت بھی اعلی ترین ہوگی اور جو ضال بنے گا تو اس کی ضلالت بھی اکمل ترین ہوگی۔(۱)

دلچسپ پیرائے میں کیسی کیسی حکمت آفرینیاں اور دقیقہ سنجیاں! خوش دماغ ہونے کے ساتھ خوش فکر بھی کمال کے۔

اب اسی مضمون کا ایک دوسرا رخ یوں سامنے آتا ہے:

''انسان محاسن جمال کا جامع ہے، صورت زیبا کسی حیوان کی وہ نہیں جو اس میں ہے، بدن میں نمونہ

خالق کے کمالات کا موجود ہے، باطن روح میں چار عالم جمع ہیں، عالم خیال عالم وہم عالم شہوت عالم غضب ان پر حکمراں عالم عقل، اس کا رہنما عالم شرع ووحی، خیال و وہم کی صلاح ایمان سے ہے، اور شہوت وغضب کی اصلاح عمل صالح سے ہے، یہی ہے احسن تقویم، یہ اشارہ ہے جامعیت کی طرف اس لیے سورۂ تین میں قسم کھائی گئی جامع اشیاء کی اور ہر اگلے مقسم بہ میں جامعیت کی ترقی ہے ماقبل سے، تین جامع و نافع نباتات ہے، زیتون میں جامعیت نباتیت کے ساتھ نورانیت عنصری بھی ہے، طور سیناء میں جامعیت کے ساتھ مہبط نور ربانی ہونے کی شان بھی ہے جو نور عنصری سے کہیں بالاتر ہے، بلد امین میں جامعیت ولایت و نبوت کے ساتھ نورانیت خاتمیت بھی ہے، چوں کہ یہ چاروں مقامات محل ہیں چار نوع کے انوارات کے اس لیے ان سے اشارہ ان قدسی صفات ذوات کی طرف ہوتا ہے جو ان انوار کی جامع ہیں، یعنی اصحاب کہف، عیسی، موسی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔(۲)

جس طرح انسانی جسم عناصر اربعہ سے مرکب ہے اسی طرح انسانی روح کی ترکیب بھی عناصر اربعہ سے ہوئی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ روح کے وہ عناصر اربعہ کون کون ہیں حکیم الاسلامؒ اس کی وضاحت کچھ اس طرح فرماتے ہیں:

''علم عمل اخلاص فکر فیہ حدیث: ''**الناس کلھم ھالکون**'' علم کا اثر خشیت اللہ ہے ''**انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء**'' عمل کا اثر تہذیب نفس ہے اخلاص کا اثر تنویر قلب ہے فکر کا اثر ضیاء عقول ہے اور مجموعہ کا اثر اخلاق فاضلہ ہیں جیسا کہ مادیت کے عناصر اربعہ کا اثر اخلاق ذمیمہ میں نتیجہ یہ نکلا کہ مادی اخلاق مہلک ہیں اور روحانی اخلاق منجی ہیں کیوں کہ مادی اخلاق سے عالم میں بدامنی پھیلتی ہے اور روحانی اخلاق سے امن اور جب کہ روحانی اخلاق کی تکمیل مذہب کرتا ہے تو مذہب ہی ان کا ضامن ٹھہرا، اب آگے مذہب کے اخلاق کے درجات ہیں مذہب توراۃ نے اخلاق حسنہ سکھلائے جن کا حاصل عدل و وفاء ہے انجیلی مذہب نے اخلاق کریمانہ سکھلائے جن کا اثر ایثار اور ترجیح ہے اسلام نے اخلاق عظیمانہ سکھلائے جن کا اثر احسان واکرام ہے اس لیے سب سے زیادہ اس کا ضامن اسلام نکلتا ہے۔(۳)

''ادب'' کسے کہتے ہیں؟ مختلف حضرات مختلف تعریفیں ص کرتے ہیں، ذیل کے اقتباس پر نگاہ ڈالئے اور پھر انصاف سے بتایئے کہ اس سے لطیف تعریف اور تشریح کبھی سننے یا پڑھنے میں آئی ہے؟

''ادب نام ہے نشست و برخاست حرکت وسکون وغیرہ میں بہترین احوال کو اختیار کرنے اور بہترین اخلاق پر عمل کرنے کا نہ کہ خود نشت و برخاست کا اس لیے کہ نشست و برخاست افعال میں سے ہیں احوال

میں سے نہیں ہیں تو حال شریعت کے تقاضوں کے مطابق اخلاق سے متعلق ہوتا ہے جیسے ایک آدمی کو اگر پانی لانے کا حکم دیا جائے تو اگر وہ ہتھیلی میں پانی لائے اور اپنے ہاتھ کو آمر کے منھ سے لگا دے تو اس کو بے ادب کہا جائے گا اس لیے کہ اس قسم کا فعل براحال قرار دیا جاتا ہے اور اگر ایک پاک صاف ظرف میں پانی لائے اور اس کو دوسرے ظرف میں رکھ دے پھر تواضع کے ساتھ وہ پانی آمر کو پیش کرے تو اسے باادب کہا جائے گا تو پانی پیش کرنا ایک فعل ہے اور اس کو پیش کرنے کا طریقہ اگر اچھا ہے تو وہ ادب ہے اور اگر برا ہے تو بے ادبی ہے تو ادب حال سے متعلق ہوتا ہے افعال سے متعلق نہیں ہوتا۔ (۴)

''طالب علم یا معلم کے اوصاف'' اس عنوان کے مالہٗ وما علیہ، سیاق وسباق اور مناسبات کا اہتمام تو معنون میں آپ دیکھ ہی لیں گے، خاصہ کی چیز وہی حکمت آفرینی ہے جس کے لئے ذیل کا اقتباس آپ کے سامنے رکھا جارہا ہے، تحریر حکیم الاسلام کی ہے، اس لئے معنون کی طوالت ایک لذت اور لطف ہی محسوس کریں گے، اور ہر پہلا فقرہ دوسرے فقرے کے لئے ''ھل من مزید'' کا سامان ہی بنے گا، چناں چہ فرماتے ہیں:

''ن والقلم'' ان سے مراد دوات بھی ہوسکتی ہے جو کہ قلم کے مناسب ہے، حق تعالیٰ نے دوات کو شاہد اور گواہ اور برہان بنا کر حضور کی نفی جنون پر حجت قائم فرمائی ہے قلم کی متعلقہ صفات وافعال پر غور کیا جائے تو نہ صرف اس سے نفی جنون ہی کا اثبات ہوتا ہے بلکہ مقامات نبوت کی افادی حیثیت اور اس کے مبادی واسباب پر بھی روشنی پڑتی ہے سب سے پہلے قلم کی یہ صفت سامنے رکھی جائے کہ وہ اپنی ذات میں علم سے خالی ہے محض واسطہ ظہور علم ہے یعنی قلم واسطہ اظہار علم ہے اور واسطہ افادۂ علم ہے خود قلم کی ذات کوری ہے اس لیے آپ کو قلم سے تشبیہ دی گئی کہ آپ خود کچھ نہیں فرماتے وحی الٰہی سے بولتے ہیں سب سے اونچا مقام علم کا ہے کہ اس کے بغیر نہ عبادت ممکن ہے علم معبود علم صفات معبود علم افعال معبود علم حق ذاتی ہے بقیہ سب کا عطائی ہے یعنی ذات کوری رکھی گئی ہے پس جو بھی عالم ہے وہ ناقل علم ہے۔

قلم سے افادہ کی شرط یہ ہے کہ قلم کو پہلے اس ہیئت پر لایا جائے کہ وہ محض لکڑی نہ رہے اس کی صورت افادہ کی بن جائے سو قلم کی لکڑی کو سب سے پہلے چھیل کر صاف کرتے ہیں اور اوپر کا سرا کاٹتے ہیں جو اوپر گرہ وغیرہ کی شکل میں ہوتا ہے تاکہ وہ صاف ہوکر لاقلمی سے قلم بننے کے مقام پر آجائے اور اسے قلم کی صورت دی جاسکے یہ گویا ابتدائی مجاہدہ ہے قلم کے لیے اس کی مثال انبیاء میں ابتدائی خلوت گزینی اور علائق سے بے تعلقی ہے جیسے غار حراء کے مجاہدات، گو نبوت کسبی نہیں کہ کسب پر نبوت مرتب ہو بلکہ نبوت کے آثار میں سے ہے جو نبوت کی استعداد پر مرتب ہوتے ہیں یہ مثال اس کی ہے کہ جب تک استفادہ کنندہ میں سے

خودسری نکال کراس میں رغبت علم اور طلب علم کی شان نہ پیدا کی جائے یعنی لہو ولعب اور علم بیزاری نہ نکال دی جائے وہ طلب علم کے مقام پر ہی نہیں ہوتا اس سے اصول نکلا کہ ہر دائرہ اور بالخصوص دینی تربیت کے دائرہ میں متعلم ابتدائی کیفیت علم بیزاری اور لہو دوستی اور اس سے خودسری نہ نکال دی جائے، وہ طالب علمی کا نام ہی نہیں پاسکتا ہے جیسے بغیر سرتراشے لاقلمی سے نہیں نکل سکتی سرتر شوانے میں اب اس کا نام نہیں رہتا گویا انتساب قلم کی طرف ہوگیا اور مادۂ قلمیت اس میں آگیا تو طالب علم کو غرور ختم کردینا چاہیے کیوں کہ سر اور دماغ محل فکر ہے اس لیے دوسرے لفظوں میں اولا اس کے فہم وشعور اور فکر وتفکر کا رخ صحیح کردیتے ہیں تاکہ بےفکری اور بےتوجہی یا علم سے لاتعلقی نکل جائے اور طالب علمی کا ذوق پیدا ہوجائے یہ تخلیہ ہے، قلم تراشی کا مقصد رہوتا کہ قلم کا رخ صحیح ہوجائے اور وہ قلم ہونے کی طلب پر آجائے یہ مثال ہے اس شخص کی جو علم سے اور طلب سے دور طلب علم سے بیزار ہو تو اسے ابتداء جاہلیت اور جہالت کی رسموں سے بیزار بناتے ہیں اور طلب علم کی طرف مائل کرتے ہیں تاکہ اس کے سر میں جہالت کا جو سودا سمایا ہو اس سے وہ نکل کر طلب علم پیدا ہوجائے اور وہ طالب علمی کے مقام پر آجائے یہ اس کے رخ کو صحیح کرتا ہے وہاں چاقو سے نے کا سر قلم کرتے ہیں یہاں نصیحت وعظ یا بچہ ہو تو سرزنش کی چھری سے لہو ولعب آوارگی اور رسوم دوستی کا سر قلم کرکے اسے طلب علم کے مقام پر آنے کی رغبت پیدا کردیتے ہیں جو طلب علم کا ابتدائی مقام ہے یا طالب علمی کا ابتدائی نام ہے اس پر اگر کجی یا زیغ ہوگیا تو طلب علم کی شان نہیں آسکتی خواہ مخواہ لائی جائے گی تو کج اور معکوس ہوگی جس سے نتیجہ بھی معکوس نکلے گا تو سر پھیرنے کی اصلاح حقیقتاً فہم وفکر کے رخ پھیرنے کا عمل ہے جو قلم کا ہی ابتدائی مقام ہے اس سے نکل آیا کہ طالب علم کا سر جب خودی اور ہوائے غرور سے پاک نہ کیا جائے وہ افادہ کے قابل نہیں ہوتا تیسرا درجہ قلم کے سر اور چہرہ بنانے کا ہے کہ قلم کی صورت بن جائے محض صاف شدہ لکڑی نہ رہ جائے ورنہ کتابت کیسے ہو جو صورت افادہ ہے، گویا اس کا خط بنایا جائے اس کی صورت ڈھالی جائے اس سے واضح ہے کہ مربی کے لیے وضع بھی مربیوں جیسی ہی ہونی چاہیے جو اس دائرہ کی معروف ہو وضع قطع درست نہ ہوگی تو اس کا اثر مربیوں پر نہیں پڑے گا اس سے شائستگی ظاہر کا حکم نکلا، تو قلم کو شگاف دینا جسے قط لگانا کہتے ہیں کہ اس کے بغیر دو حروف نہیں لکھ سکتا جو ذریعۂ افادۂ علوم ہے یہ درحقیقت قلم کے قلب کی اصلاح ہے جو محل علم ہے اور شائستگی ظواہر بدنی ہیئت لباس ہیئت حتی کہ معاشرتی ہیئت جیسے رہن سہن پر حاوی ہے۔

بہر حال لکڑی کی استقامت اس کی تراشی اور پھر نب بنانے سے قامت طرازی اور پھر قط زنی سے

ذہن سازی یعنی قلب و دماغ اور ظواہر کی شائستگی ناگزیر ہے اس سے طالب علم کے بارے میں دماغ اور قلب کی اصلاح اور وضع ظاہر کی طرف اشارہ ہے فرق اتنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تربیتی مقامات براہ راست حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہوتے ہیں جن میں اسباب عادیہ کو دخل نہیں ہوتا اس لیے سارے امور بحق انبیاء وہبی ہوتے ہیں نہ کہ کسبی اور غیر نبی میں یہی امور کسبی اور اکتسابی ہوتے ہیں جن میں ظاہری اسباب اور اپنی محبت کا دخل ہوتا ہے جس سے وہ نبوت کے کمالات سے مستفید ہوتے ہیں لیکن نبوت کسی درجہ میں بھی کسبی نہیں ہے وہ موہبت الٰہی ہے اور اس کے لیے انتخاب افراد بھی من اللہ ہے ''**اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ**'' اور اب وہ ختم نبوت کے بعد ختم بھی ہے کہ نہ انتخاب ہوگا اور نہ کوئی نیا نبی آئے گا، تو اب چوتھا مقام یہ ہے کہ قلم کو دوات میں ڈالا جائے اور وہ روشنائی حاصل کرے جس سے بالآخر حروف بننے کا مقام آجائے اور علم کی صورت کے لیے راہ ہموار ہو اس سے واضح ہے کہ افادۂ علم میں قلم کی محض صورت قلم کافی نہیں ہے جب وہ دریائے روشنائی میں سر ڈوب نہ جائے اس لیے روشنائی اس کے حق میں بمنزلہ دریائے علم کے ہے یعنی جب تک اس میں انغماس بلکہ استغراق نہیں ہوگا اور قلم بھرپور روشنائی نہ لے گا صاف اور روشن حروف اس سے نکل کر مرتسم نہ ہوں گے اور افادہ مشکوک ہو جائے گا، اس سے واضح ہے کہ طالب علم اگر محض اپنی ذاتی رائے یا عقل دور اندیش سے یا مصلحت بینی سے از خود کچھ کہے گا تو محض قلم کی آواز اور صریف اقلام ہوگی جو بے معنی ہے اس لیے طالب علم کو علم میں ہمہ وقت استغراق رکھا جائے گا کہ ''**العلم لا یعطیک بعضہ حتی تعطیہ کلک**'' اس سے آگے کا مقام یہ ہے کہ وہ سرنگوں ہو کر روشنائی میں غوطہ لگائے ورنہ وہ افادہ نہیں کر سکتا یعنی اگر قلم کا منہ اوپر ہو جائے اور نیچے نہ جھکے تو وہ بھر بھی نہیں سکتا کیوں کہ بھراؤ جب ہی ہوتا ہے جب اس میں جھکاؤ ہو اور وہ ڈوب کر اس سے نکلے تو طالب علم بھی جب تک سرنگوں نہ ہو یعنی ''**تواضع للعلم و لاھل العلم و لمکان العلم و بقراطیس العلم**'' نہ ہو وہ علم کا وعاء نہیں بھر سکتا کبر و نخوت اور ترفع و تعالیٰ سے علم کبھی نہیں آسکتا بے ادبی اور جسارت کے ساتھ علوم نبوت کبھی حاصل نہیں ہو سکتے جس سے ''**لایمسہ الا المطھرون**'' کا مقام پیدا ہوتا ہے جب انبیاء علیہم السلام بھی بحر علم میں مستغرق ہوتے ہیں اور اس کی طرف جھک کر اپنے کو علم سے بھرتے ہیں جن میں ادب و تواضع کی انتہا ہوتی ہے تو دوسروں کی تو حقیقت ہی کیا ہے بہرحال اس سے قلم کے دو مقام ثابت ہوئے ایک روشنائی میں مستغرق ہو اور ایک سرنگونی کے ساتھ مستغرق ہونا یعنی ایک علم کی دھن اور ایک تأدب بالعلم جو تحصیل علم کے موقوف علیہ مقامات ہیں پھر جب علم روشنائی سے بھر جانے کے بعد جب کاغذ پر نقوش بناتا

ہے یعنی افادہ کرتا ہے تو ضروری ہے کہ کاتب کے ہاتھ میں ہواز خود حرکت نہیں کرسکتا بلکہ اس کی حرکت کے تابع ہوکر اس کی حرکت سے حرکت میں آتا ہے، اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ جب تک طالب علم اپنے مربی اور معلم کے ہاتھ میں ہوکر اس کے تابع محض نہ بن جائے اور علم میں اگلوں کی نقل نہ کرے ان سے استغنا نہ کرے تب تک اس کی افادی حیثیت کھل ہی نہیں سکتی پس طوطبقہ آزاد محض ہوکر اور اپنے مربیوں سے مستغنی بن کر یا ان کے مقابل آکر یا بے سند واستناد چاہتے ہیں کہ علم کی دولت کا افادہ کریں تو یہ ناممکن ہے اگر آزاد ہوکر کریں گے تو وہ ان کے اوہام کا افادہ ہوگا علم کا نہ ہوگا علم تو وہی ہے جو مستند اور منقول ہو انبیاء کی شان یہ ہے کہ "وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی" پس جیسے نبی قلم کی طرح حق تعالیٰ کے ید قدرت میں ہوتا ہے کہ جو وہ کہیں وہی کہتا ہے خود اپنی بات نہیں کہتا بلکہ اپنے خدا کی بات کہتا ہے اور اسی کی سند لاتا ہے بے سند نہیں کہتا اسی طرح طالب علم بھی جب تک اپنے سکھلانے والے کے تابع ہوکر سند سے اس کی بات نقل نہ کرے علم کی حداثت اس تک نہیں پہنچ سکتی، اس اتباع کے ساتھ استناد نکلا اس لیے سند کی طلبہ کو ضرورت پڑتی ہے، پھر قلم جب حروف بناتا ہے تو اسے کاغذ پر سرنگوں ہونا پڑتا ہے کاغذ پر اس کا سر ہوتا ہے روشنائی گرتی رہتی ہے حروف بنتے رہتے ہیں اس میں پہلا اشارہ تو اس طرف ہے کہ جس کاغذ پر حرف بنائے جائیں اس پر پوری توجہ معطوف کی جائے یعنی معلم میں لاپرواہی یا سفلی اغراض نہ ہوں بلکہ ہمہ تن تعلیم ہو اور ساتھ ہی متعلم پر انتہائی توجہ ہو گویا اس پر اوندھا ہوجائے کہ اس کے بغیر فیضان نہیں ہوتا اس سے تیسرا اشارہ اس طرف ہے کہ قلم افادہ کے وقت جب تک کاغذ کی زمین پر سر نہ ٹیک دے گویا سر بسجود ہوجائے اور روئے یعنی بصورت روشنائی اس کے آنسو ٹپکیں گویا سجدے کرتا جاتا ہے اور روتا جاتا ہے تب علم اس سے نکلتا ہے اور افادی شان اس سے کھلتی ہے اور دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے اگر معلم ہی سر پھرا ہو نہ وہ علم کی طرف شوق سے متوجہ ہے نہ طالب علم کی طرف بلکہ بندہ اغراض ہے استغراق سے خالی ہے تو اس سے افادہ کیا ہوسکتا ہے تو اس سے نکل آیا کہ افادہ کنندہ کا عبادت گذار ہونا ضروری ہے جو اس سے قلب کے رقت اور لین کی علامت ہے کہ اس کے بغیر افادہ نہیں ہوتا ساتھ ہی اس سے یہ بھی واشگاف ہوا کہ قلم کا کاغذ پر جھکنا اور سر رکھ دینا گویا افادہ میں ہمہ تن لگ جانا ہے پھر قلم جس چیز پر سر ٹیکے اس میں ارتسام حروف کی قابلیت ہونی چاہیے اگر قلم زمین پر سر رگڑے جائے یا سیاہ لوہے پر حرکت کئے جائے تو ارتسام حروف نہ ہوگا اس سے واضح ہوا کہ قلم کی فاعلیت کے ساتھ محل ارتسام میں قابلیت انجذاب کی اہلیت نہیں رکھتے غافل ہیں یا ان کی سطح قلب درست نہیں ہے تو ان پر محنت رائیگاں چلی جاتی ہے ان کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ دین کی

ضروری معلومات لے کر دیندار بن جائیں عالم ہونا ان کے بس کی بات نہیں غرض مربی اور مربوب دونوں کی اصلاح ظاہر و باطن استقامت قلب و دماغ تسویہ فکر و اخلاق انہاک فی العلم اور استغراق اور حرص علم تواضع و فروتنی اتباع و ادب عدم انحراف سرکشی سے بچاؤ عبادت و طاعت تقرب الٰہی اور پھر انتخاب قابل و منفعل وغیرہ امور رہیں جن کے بغیر نہ مربی تربیت کر سکتا ہے نہ مربوب تربیت پا سکتا ہے اور یہ سب اور قلم کی خصوصیات سے نمایاں ہیں اس لیے حق تعالیٰ نے اپنے نبی پاک پر سے جنون کی تہمت اور نافہمی کے الزام اٹھائے جن کے ہوتے ہوئے افادہ بھی ناممکن ہے اس سے حضور کا افادہ کاملہ واضح فرمایا گیا ہے جس سے عقل و فہم علم و عشق اور تمام ستودہ اخلاق و مقامات کا اثبات خود بخود ہو جاتا ہے جس سے ''**ماانت بنعمة ربک بمجنون** کا مقام واضح ہوتا ہے جو کمال دماغ و فکر کی علامت ہے اور ''**انک لعلی خلق عظیم**'' کا مقام نمایاں ہو جاتا ہے جو کمال قلب کا مقام اور عقل و قلب اعلی ہیں تو ہر چیز اعلیٰ ثابت ہوگی اس لیے یہاں قلم کو گواہ بنا کر یہ دو دعوے کئے گئے ایک نفی جنون جو کمال عقل اور ایک اثبات اخلاق جو کمال عشق ہے اسے قوت علمی کے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہے اور ایک سے قوت علمی کے مضبوط تر ہونے کی طرف ایماء فرمایا گیا ہے اور یہی دو قوتیں ہیں قوت علمی اور قوت عملی جو سارے کمالات کی اساس ہیں۔(۵)

حکیمانہ طرز بیان کے ساتھ محققانہ و عارفانہ اسلوب کی بھی ایک جھلک دیکھ لی جائے:

''اخلاق کی بنیادیں تین ہیں استیفاء حق بالمثل، ترک حق احسان بالحق، یعنی اخلاق کی بنیاد ہے ضبط و تحمل اور صبر و برداشت جس درجہ میں یہ صبر و ضبط زیادہ ہے وہی درجہ اکمل و احسن ہے مثلاً اگر کوئی بداخلاقی سے پیش آئے تو ابتدائی درجہ اخلاق کا استیفاء حق بالعدل ہے یعنی معاملہ میں حدود کی رعایت اور وہ یہ کہ انتقام لینے میں مماثلت سے کام لیا جائے تعدی نہ کی جائے تورات کا حکم ہے وکتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس والعین بالعین الی قولہ والجروح قصاص یہ اخلاق فاضلہ کی بات ہے کہ تعدی نہ ہو ظلم نہ ہو عدل قائم رہے مگر یہ درجہ اولیٰ ہے دوسرا درجہ اس سے اونچا ہے کہ قصاص نہ لے معاف کر دے'' **نحن تصدق به فھو کفارة له فمن عفا و اصلح فاجره علی اللہ**'' یہ خلق حسن ہے تیسرا درجہ اس سے اونچا ہے کہ ایثار کرے اور نہ صرف اپنا حق ہی چھوڑ دے بلکہ اوپر سے احسان بھی کرے اور برائی کا بدلہ بھلائی سے دے یہ خلق عظیم ہے موسوی شریعت میں اخلاق کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انتقام لینا ضروری تھا مگر عدل کے ساتھ عیسوی شریعت میں خلق حسن تھا کہ معاف کرنا ضروری تھا جسے حق چھوڑنا کہتے ہیں یہ خلق حسن ہے، محمدیؐ شریعت میں خلق عظیم ہے کہ اوپر سے احسان بھی کرو اور ایثار سے پیش آؤ'' **خذ العفو و أمر بالعرف و**

اعرض عن الجاھلین، فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم الی قولہ فاعف عنھم و استغفر لھم وشاورھم فی الامر، صل من قطعک و اعف عمن ظلمک و احسن الی من اساء الیک ’’خلق حسن عدم تعدی ہے خلق کریم صفح جمیل اور عفو ہے اور خلق عظیم احسان وایثار ہے پس خلق عظیم میں خلق حسن اور کریم سب داخل ہیں اس لیے خلق حسن مراتب صلحاء میں سے ہے اور خلق کریم مراتب انبیاء میں سے ہے اور خلق عظیم مرتبہ ختم نبوت میں سے ہے خلاصہ یہ ہے کہ خلق کے سلسلہ میں ابتدائی مرتبہ ہے حسن اخلاق کا جس کا سوال حدیث میں فرمایا گیا: ’’**اللھم انی اسئلک الصحۃ والعفۃ و الانابۃ و حسن الخلق والرضا بالقدر**‘‘ اس سے اوپر کا مرتبہ ہے کرامت اخلاق کا جس کو حدیث میں فرمایا گیا: ’’**بعثت لاتمم مکارم الاخلاق**‘‘ اور تیسرا مرتبہ اس سے اوپر کا ہے خلق عظیم کا جو ایثار مطلق اور احسان کامل ہے وہ خلق نبوی ہے جس کی قرآن نے شہادت دی ’’**وانک لعلی خلق عظیم**(۶)

اب قرآنی تفسیر کا ایک حکیمانہ اسلوب ملاحظہ کیجئے:

’’علم یقین، اور حیاء اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’’**یا بنی آدم قد انزلنا علیکم لباس یواری سوأتکم و ریشا و لباس التقویٰ ذلک خیر ذلک من آیات اللہ، لعلھم یتذکرون** مفسرین نے فرمایا لباساً سے مراد علم ہے اور ریشاً سے مراد تقوی ہے اور لباس تقویٰ کے معنی حیاء ہیں تو حیاء عمل کا پہلا مبداء ہے اور علم خشیت کا پہلا مبداء ہے اور خشیت ایمان کا پہلا مبدا ہے اور ایمان وہ معرفت ہے اور میں نے نہیں پیدا کیا جن اور انسان کو مگر تا کہ وہ عبادت کریں میری یعنی تا کہ میری معرفت حاصل کریں۔(۷)

یہ اقتباس کچھ بغیر تمہید وتبصرہ کے بھی پڑھ ڈالیے، بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادی: چمن کی سیر خود بھی تو ایک چیز ہے، یہ کیا کہ ہر جگہ مالی سے پوچھ تاچھ کی جائے:

’’حق تعالیٰ نے دنیا کی ہر قوم کو تین مرکز عطا کئے اور ان تین مرکزوں کے بغیر کسی قوم کی قومیت قائم نہیں ہوسکتی ایک علمی مرکز جس کی طرف علم صحیح کے لیے رجوع کیا جائے ایک عملی مرکز جس کی طرف عمل کی ہیئت اور اسے درست رکھنے میں رجوع کیا جائے اور ایک اجتماعی مرکز جس کی طرف دینی جماعتی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے رجوع کیا جائے علمی مرکز خدا کی کتاب ہوتی ہے عملی مرکز رسول کی ذات ہوتی ہے اور اجتماعی مرکز قبلہ ہوتا ہے یہود ونصاریٰ کے عمل مرکز تورات وانجیل ہیں عمل مرکز حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور اجتماعی مرکز بیت المقدس ہے کتنی بڑی نعمت اور فضل کی بات ہے کہ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان تینوں مرکزوں میں امتیازی شان کے مرکز دئے جو اپنی نوعیت میں دنیا کی تمام اقوام کے مراکز سے فائق تر ہیں۔(۸)

سو انسان مجموعہ اضداد تھا بہائم شہوت محض ہیں ملائکہ عقل محض ہیں شیطان شر محض ہے اس لیے ان میں ترقی نہیں لیکن انسان میں شہوت عقل طبع بہیمیت شیطنت ملکیت سب جمع کردی گئیں اس میں سب سے زیادہ ترقی کے امکانات پیدا ہوئے اگر بہیمیت کو عقل سامنے لائے گا تو عفت پیدا ہوگی اور تقویٰ کے شعبے پیدا ہوں گے جو بہیمیت کو اعتدال پر لائیں گے اور اگر عقل کو بہیمیت کے ساتھ جمع کرے گا تو انتہاء پسندی پیدا ہوگی اگر عقل کو بہیمیت شیطنت سے ٹکرائے گا تو تدبر و فراست کے شعبے پیدا ہوں گے اور شیطانی اعمال تدبیر وخرد کا لقب پائیں گی جو فرشتہ کہ جو عقل محض تھا نہیں کر سکتا تھا غرض اس تصادم میں خیر کی ترقی بھی مضمر ہے اور شر کی بھی اور صلاحیت صرف انسان میں تھی اس لیے حق تعالیٰ نے اپنا خطاب تکلیفی براہ راست صرف اسی کو فرمایا اور مورد نبوت والہام صرف اسی کو بتایا ہے۔(۹)

انسان باشعور ہو تو ممکن نہیں ہے کہ جذبات وتأثرات سے الگ رہ سکے، محبت بھی ایک جذبہ اور تأثر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس جذبہ اور تأثر کا سبب کیا ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب حکیم الاسلامؒ کی زبان سے سنئے:

''جمال، کمال، نوال، اتصال، اطاعت کے چار اسباب کمال عقل کمال علم کمال اخلاق اور کمال عمل، حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اسباب محبت سب کے سب جمع ہی نہیں بلکہ انتہائی کمال پر پہنچے ہوئے ہیں، اس لیے آپ سے قدرتاً محبت وہی ہونی چاہیے کہ کسی سے بھی نہ ہو، کیوں کہ یہ اسباب کسی بھی انتہائی کمال کے ساتھ جمع نہیں ہیں اور ایسے ہی اطاعت کاملہ بھی آپ کے سوال دوسرے کی نہیں ہونی چاہیے کہ اسباب اطاعت آپ سے زیادہ عالم میں کسی میں نہیں۔

کمال محبت کا ثمرہ کمال ذکر ہے اور کمال اطاعت کا ثمرہ کمال فکر ہے جب ذکر وفکر کامل ہو جاتا ہے تو محبت واطاعت بھی کامل ہو جاتی ہے اور اس کا ثمرہ یہ ہے کہ آدمی محبّ سے محبوب بن جاتا ہے'' **قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ**'' اور اطاعت سے پھر محل اطاعت بن جاتا ہے ''**دار الحق معہ حیث دار**'' اور ''**ان ربک یسرعک فی ھواک، لولا یزال یتقرب عبدی بالنوافل حتی سلنمعہ الذی یسمع بی وبصرہ الذی یبصر بی ویدہ التی یبطش بھا**'' تو اس شان سے محبوب الٰہی اور مرجع نظر الٰہی ہو جاتا ہے گویا مظہر کمالات ربانی بن جاتا ہے۔(۱۰)

مثبت تعمیری فکر اور اصول کی روشنی میں گفتگو کرنا حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کا سنگ بنیاد ہے، اس کا بھی ایک نمونہ دیکھئے:

''میرا اصول یہ ہے کہ لوگوں کو اصول سے پکڑا جائے جزئیات سے نہیں، جزئیات اختلاف کی جڑ

ہیں اور اصول اتحاد وحدت کی بنیاد ہے اس کا قدرتی تقاضہ ہے کہ جب ہر جماعت کو اصول کی ترازوں میں تولا جائے گا اور اصول قابل قبول ہوتے ہیں خواہ کوئی جماعت پیش کرے تو ہر جماعت کی خوبیاں سامنے آئیں گی اور جب اصول کو سمجھایا جائے گا تو غیر معقول جزئیات کو خود آپ کو رد کرنا نہیں پڑے گا بلکہ یہ مبتلا خود ہی انہیں چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا پس بجائے اس کے کہ آپ جزئیاتی رد وقدح اور بحث ومناظرہ میں پڑیں جس اختلافی صورت پیدا ہو اور جماعت ان ناکارہ جزئیات میں اور زیادہ مضبوط بنے یہ بہتر ہے کہ آپ کے کہنے کے بجائے وہ خود ہی اپنی برائیوں کو سمجھے اور ان کی ممنون ہو یہ کہ آپ نے اس کی بہت سی خرابیاں چھڑا دیں۔(۱۱)

حکیم الاسلامؒ کے اچھوتے اسلوب بیان اور فکری معنویت کے یہ چند گوشے بطور مثال آپ کے سامنے آئے ورنہ آپ کی گراں قدر تصنیفات اور خطبات کی ایک ایک سطر اس باب میں آپ کی انفرادیت کا ثبوت پیش کرتی ہے۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہوجانا

....

(۱) مولانا فاروق قاسمی، معارف حکیم الاسلام، ص:۳۳۱-۳۳۳

(۲) ایضاً، ص:۴۵۶

(۳) ایضاً، ص:۴۹۵

(۴) ایضاً، ص:۵۱۱

(۵) ایضاً، ص:۸۶

(۶) ایضاً، ص:۳۲۹

(۷) ایضاً، ص:۵۱۲

(۸) ایضاً، ص:۲۵۲

(۹) ایضاً، ص:۳۰۵

(۱۰) ایضاً، ص:۵۲۳

(۱۱) ایضاً، ص:۵۴۵

❖

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ
اوران کی تصانیف کا عکس جمیل

مفتی محمد احسان قاسمی

استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند

دیوبند کا نام جب ذہن میں آتا ہے اور قلم کی نوک صفحۂ قرطاس پر مرقوم ہوتا ہے تو تاریخ کا ایک طویل ترین کہکشانی سلسلہ خود بخود ذہن کے زاویہ میں ابھرنے لگتا ہے۔ علم وعمل کے کوہِ گراں، رشد و ہدایت کے روشن مینار، فکر وتدبر کی ہزار ہا قندیلیں یہاں روشن ہیں۔ انہیں قدسی صفحات شخصیات میں سے خانوادۂ قاسمی نیر تاباں، سحرالبیان مقرر، حسن عمل، حسن کردار کی حامل ذاتِ بابرکات، زہد وتقویٰ کے امام وکامل اور علم وفن کے صحیح العقیدہ وسلیم الفکر عالم عارف باللہ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب مظفر الدین قدس سرہٗ کی ذات والا صفات بھی ہے۔ جو نہ صرف اپنے ذاتی اوصاف جمیلہ، علم وفضل، زہد وتقویٰ، اخلاق و دیانت جیسی وقیع ترین صفات کی بنا پر آسٹریلیا سے لے کر امریکہ تک اور نیل سے لے کر تابہ خاک کاشغر، مثل آفتاب و ماہتاب نمایاں تھے۔

بالفاظ دیگر حضرت حکیم الاسلامؒ اپنی اعلیٰ علمی وخوانگی نسبتوں کی وجہ سے نہ صرف دیوبند ہی کے قابل فخر سرمایہ تھے بلکہ آپ اپنی خوش طبعی اور فکر بصیرت کے باعث ملک وبیرون ملک تقریباً تمام مکاتبِ فکر اسلامی کے حلقوں میں قول ومقبول ومتعارف تھے۔

مخلوق خدا کی ظاہری وباطنی اصلاح کو مقصدِ حیات دے کر خالصۃً ولوجہ اللہ لوجہ الاسلام اخلاص نیت کے ساتھ دنیا کی ہر ضلالت وگمراہی میں ہدایت کے فانوس جلانا ایک مصلح ورہنما کی عنداللہ معراج ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اہل اللہ کے یہاں تین طریقے رائج ہیں، کوئی تصوف کی راہ سے گم کردہ

راہ کو حق کی ہدایت کے راستہ پر لاتا ہے، کوئی اپنے قلم کی سحر طرازیوں عوام کی اصلاح کرتا ہے اور کوئی دعوت و تبلیغ کے ذریعہ تقریر کا راستہ اختیار کرتا ہے لیکن اگر حق تعالیٰ کی جانب سے یہ تینوں ملکات کسی ایک شخصیت میں ودیعت کردیئے جائیں تو اس کی جامعیت اور اکملیت تو مسلم ہے ہی لیکن دعوت و تبلیغ جیسے عظیم ترین مقصد میں کامیابی اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ لاریب کہ حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ مسندِ رشد و ہدایت کے اسی اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے آپؒ پاک باطن، پاکیزہ روح، روشن ضمیر اور چودہویں صدی میں نقشبندیت کے بدر میر تھے۔ ان کی شخصیت مختلف گوشوں اور مختلف علمی و دینی پہلوؤں پر محیط ہے۔ نیز شخصیت کا ہر پہلو قابل رشک اور قابل فخر و مباہات ہے، ہر جہت آپ کی فکری و علمی صلاحیتوں کی روشنی کا نور دکھائی دیتا ہے۔ آپ چلتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بشکل انسان کوئی قدسی زمین پر قدم رنجا ہے۔ قدموں کی چاپ اتنی دھیمی کہ احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔

حکیم الاسلامؒ کے علمی رشتوں کا ایک سلسلہ اگر امام العصر سیدنا محمد انور شاہ کشمیریؒ سے جڑا ہوا تھا تو دوسرے کا تعلق مفسر قرآن اور شان قاسمیت کے عکس جمیل حضرت اقدس علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور علامہ ابراہیم بلیاویؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ سے مربوط تھا۔

پہلے آپ کا سلسلۂ بیعت ۱۳۳۹ھ میں حضرت الامام شیخ الہندؒ سے قائم ہوا، ان کے بعد آپ نے اپنے زمانہ کے سب سے بڑے قطب العالم حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف رجوع کیا اور ان کی نگرانی میں راہ معرفت و طریقت کے اعلیٰ مدارج طے کئے۔ آخرکار جب شیخ کی حقیقت آشنا نگاہوں نے مرید کے جواہر استعداد کا اعتراف کرلیا تو ۱۳۰۵ھ میں آپ کو اپنا مجاز بنا کر خلافت کے خلعت فاخرہ سے مشرف فرمایا۔

اس کے بعد حکیم الاسلامؒ اپنے چشمۂ ہدایت سے تشنگانِ قلب و روح کو سیراب فرمانے لگے اور راہ حق کے طلب گار اپنی آرزوؤں اور امیدوں کی جھلی اس خزینۂ معرفت سے بھرتے رہے اور فیض حاصل کرتے رہے۔ ملک و بیرون ملک حضرت حکیم الاسلامؒ کے مریدین و مسترشدین کی تعداد لاکھوں سے متجاوز تھے۔ جنہوں نے براہِ راست آپ کے دست حق پر بیعت ہوکر آپ کی روحانی تربیت اور ہدایت و اصلاح سے اپنی زندگی کو منور کیا اس کے علاوہ ایک بڑا طبقہ ایسا رہتا تھا جو راہ حق کے طلب گار ہوتے اور بذریعۂ مراسلت آپ کی روحانی اور عرفانی تعلیمات سے ہدایت یاب ہوتے رہتے نیز رشد و ہدایت کے سلسلہ سے اللہ رب العزت نے خطابت کی خصوصی انفرادیت سے انہیں نوازا تھا۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کی تبلیغی و دعوتی خطبات و

تقاریر آپ کی زندگی ما بہ الامتیاز مقام تھا۔ وعظ وخطاب کا یہ ملکۂ راسخہ اور قوت بیان حضرت حق جل مجدہٗ کی عطا و وہبت خاص تھی۔ جس سے آپ کو سرفراز فرمایا گیا تھا۔ آپ صرف شعلہ بیان مقرر اور پر جوش خطیب ہی نہ تھے بلکہ آپ کے لب ولہجہ میں شہد کا سا مٹھاس، شبنم کی سی نمی، پھولوں کی سی خوشبو کا حسین سنگم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسمانی اور روحانی نسبت قاسمی آپ کے اندر متصرف تھی۔ تقریر میں بے ساختگی اور روانی و بے تکلفی اور تسلسل انتہائی درجہ درآمد تھی۔ ایسا لگتا تھا گویا ایک رواں سیلاب ہے جو فراز سے نشیب کی طرف یکسانیت وسکون کے ساتھ بہہ رہا ہے اور مجمع پر سحر انگیزی کی یہ حالت کہ آواز تو کیا معمولی حرکت بھی نہیں ہوتی تھی۔ گویا سامنے کھلی ہوئی کتاب ہے اور آپ اس کو پڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ ایک ایسا دلچسپ ودل آویز اور دلکش وروح پرور ماحول پیدا ہو جاتا تھا کہ پیچیدہ اور الجھے ہوئے مسائل بھی سامعین کے قلب و دماغ میں بآسانی موجزن ہو جایا کرتے۔ خداوند قدوس نے آپ کو اعلیٰ علمی وانتظامی اور فکری صلاحیتیں مرحمت فرمائی تھیں۔ علماء ہند کی امانت ووراثت ام المدارس دارالعلوم دیوبند کے مسند اہتمام پر ساٹھ سال کے عرصۂ دراز تک فائز رہ کر جس شان وشوکت وعزمت کے ساتھ چلایا اور مقبولیت وشہرت کے جس مقام رفیع سے سرفراز فرمایا اس میں آپ کی انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ تحمل وتواضع اور تدبر کو بڑا دخل ہے، دارالعلوم کو اپنی معنوی اولاد کی طرح لے کر چلے تو اساتذہ وکارکنان کے عملہ کو انہوں نے اپنے خاندان کا فرد سمجھا، نہ کوئی ان سے دور تھا اور نہ کسی کو ان کی ذات سے کوئی خوف تھا۔ دیکھنے کو تو وہ ایک منحنی اور نحیف ونزار سے انسان تھے مگر عزم وحوصلہ اور ارادے وہمت کی ایک ایسی چٹان تھے جس سے سمندر کی بپھری اور بے قابو موجیں بار بار ٹکرائیں اور مایوس ہو کر لوٹ گئیں۔ الحاصل مفادات دارالعلوم کا تحفظ ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ کوئی شخص ان کی زندگی کا کتنے ہی مخالفانہ ارادے سے مطالعہ کرے لیکن ان کی آپ بیتی کے چند لرزہ خیز واقعات اس درجہ واضح اور قطعی ہیں کہ ممکن نہیں ان سے انکار کیا جا سکے۔ ازاں جملہ یہ کہ جو جماعتیں ان کی مخالف تھیں حکیم الاسلامؒ نے ان کے ایک ایک فعل کا جواب صبر وتحمل، راستی ودیانت اور عفو وبخشش کے اعلیٰ نمونہ سے دیا۔

مظلومی میں صبر، مقابلے میں عزم، معاملہ میں راست بازی، طاقت واختیار میں درگذر، تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں جو کسی ایک زندگی کے اندر اس طرح عموماً جمع نہیں ہوتے۔

خیر! میری چند شکستہ سطور کا مقصود تو حضرت حکیم الاسلامؒ کی تصنیفی وتالیفی خدمات کا عکس کھینچنے کی کوشش کی، اپنی سی کوشش ہے، حضرت کی زندگی کا یہ قابل رشک پہلو جس کی مختصر مگر جامع ترین اور مبسوط ترجمانی علمائے دیوبند کے اویسی النسبت مسلم بزرگ حضرت اقدس مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب علیہ الرحمۃ اور

اکابر جماعت اہل حق کی تمام معنوی اور روحانی نسبتوں اور تمام علمی امتیازات وخصوصیات کو حق تعالیٰ شانہٗ نے ماشاءاللہ مولانا محمد طیب صاحبؒ کی ذات ستودہ صفات میں جمع فرمادیا ہے۔

چنانچہ اپنی تصانیف کے ذریعہ جزیرہ نمائے ہند میں بالخصوص اور کل عالم میں بالعموم جماعت اہل حق یعنی قدسی صفات علمائے دیوبند کی کی ترجمانی کرتے ہوئے وہ اپنی مشہور ترین کتاب ''مسلکِ علمائے دیوبند'' میں علمائے دیوبند کے مسلک کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مسلکِ علمائے اہل سنت والجماعت کی پوری تاریخ بیان کرتے ہیں۔ نیز ثابت کرتے ہیں کہ یہی علمائے دیوبند کا معتصم مسلک ہے۔

اس کتاب کے افتتاحی صفحہ پر ہی وہ مسلک علمائے دیوبند کا تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''علمائے دیوبند اپنے مسلک اور دینی رخ کے لحاظ کلیۃً اہل سنت والجماعت ہیں اور اہل سنت کا بھی اصل حصہ ہیں (جس سے وقتاً فوقتاً مختلف شاخیں کٹ کٹ کر الگ ہوتی رہی ہیں) ہندوستان میں یہ سلسلہ قوت کے ساتھ اجتماعی رنگ میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ سے زیادہ پھیلا اور چمکا اس سلسلہ کی وہ کڑی آج ہندوستان میں اہل سنت والجماعت کے مسلک کی ترجمان اور رواں دواں علمائے دیوبند ہیں جنہوں نے تعلیم وتربیت کے ذریعہ اس سلسلہ کو مشرق سے مغرب تک پہنچایا اور پھیلایا''۔

علمائے دیوبند صرف اہل سنت والجماعت اصول وقوانین ہی کے از اول تا آخر پابند رہے ہیں بلکہ ان کے متوارث، ذوق کو بھی انہوں نے تھاما اور محفوظ رکھا ہے پھر وہ خودرو قسم کے اہل سنت نہیں بلکہ ان کا استناد اور سندی سلسلہ ملا ہوا ہے۔ اس لئے مسلک کے لحاظ سے نہ وہ کوئی جدید فرقہ ہیں اور بعد کی پیداوار ہیں بلکہ وہی قدیم اہل سنت والجماعت کا مسلسل سلسلہ ہے جو اوپر سے تسلسل اور استمرار وسند متصل کے ساتھ اکابراً عن کابرٍ چلا آرہا ہے۔ وقت کے عوامل اور افراط وتفریط نے چوں کہ اہل سنت سے مختلف شاخیں پیدا کردیں اور ہر نئی شاخ نے جو اصل ہونے کا دعویٰ کیا جو دعویٰ ہی کی حد تک نہیں رہا بلکہ اپنے وجود وبقاء کے لئے ہر شاخ نے اصل طبقہ کے خلاف محاذ بنا کر اسے غیر اصل اور اپنے کو اصل ثابت کرنے کی جدوجہد کا آغاز بھی کردیا۔

اس افتتاحیہ کی تشریح وہ اس طرح فرماتے ہیں ''سو اہل سنت والجماعت کے اس اصل طبقہ یا علمائے دیوبند کے اس جامع اور معتدل ترین مسلک کو سمجھنے کے لئے جس میں افراط ہے نہ تفریط، نہ غلو ہے نہ مبالغہ بلکہ کمال اعتدال اور جامعیت کا جوہر پیوست ہے۔ سب سے پہلے اس کے لقب اور لقب کے مآخذ پر غور کر لیا جائے تو اسی سے اس کی بنیادیں واضح ہوجائیں گی اور معیار بھی مشخص ہوکر سامنے آجائے گا اور وہ یہ کہ اہل سنت والجماعت کا یہ مرکب اور مسلکی لقب دو اجزاء سے مرکب ہے ایک ''السنۃ'' اور ایک ''الجماعت''

ان دونوں کے مجموعے ہی سے علمائے دیوبند کا مسلک بنتا ہے تنہا ایک کلم سے ہیں۔ السنۃ کے لفظ سے اصول قانون اور طریق نمایاں ہیں اور الجماعت کے لفظ سے ذوات وشخصیات اور رفقائے طریق نمایاں ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس مسلک میں اصول وقوانین بغیر ذوات کے اور ذوات بغیر قوانین کے معتبر نہیں جب کہ قوانین ان ذوات ہی کے راستہ سے آئے ہیں اور ذوات ان قوانین ہی سے پہچانی گئی ہیں۔ اس ماخوذ کو لے لیا جانا اور مآخذ کو چھوڑ دینا کوئی معقول مسلک نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس امت کو قرآن کریم ہی نہیں دیا بلکہ پیغمبر ﷺ کی ذات بھی عطا فرمائی جنہوں نے قرآن کریم کو پڑھ کر سنایا، سمجھایا، اس کے عمل کا نمونہ دکھلایا اور اس کے لئے ذہنوں کو بنایا ایسے ہی نبی کریم ﷺ نے امت کو صرف قرآنی قوانین ہی نہیں بخشا بلکہ قانون داں، ذوات وشخصیات بھی دیں جنہوں نے نے اس سے متاثر ہو کر اپنے اپنے وقت میں دور نبوت کی طرح قانون دین سنایا، سمجھایا، عمل کر کے دکھلایا اور ذہنوں کو اپنی تربیت سے اس کے صحیح صحیح سمجھنے کے لئے مستعد کیا۔

اس سنت اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے واضح ہے کہ دین اور دینی ہدایت وتربیت کے لئے تنہا کتاب اور تنہا شخصیت ہی کافی نہیں بلکہ قانون کے ساتھ معلمین قانون اور لٹریچر کے ساتھ مربیان دستور کی معیت بھی ناگزیر ہے تاکہ صرف قانون ہی علم میں نہ آئے جو کتاب اور نوشتوں سے بھی فی الجملہ آسکتا تھا بلکہ اس کا رنگ بھی دلوں پر چڑھ جائے اور اس کی حقیقی ومعنوی کیفیتیں بھی قلوب میں راسخ ہوں جو ذوات سے وابستگی کے بعد ہی ممکن تھا اس لئے مسلک علمائے دیوبند یا بالفاظ دیگر مسلک اہل سنت والجماعت حسب روش پیغمبری یہی دو بنیادی باتیں ذوات اور قانون بطور رکن اختیار کی گئیں حتی کہ اس فرقہ کا لقب وہ اختیار کیا گیا جس کے عنوان ہی سے یہ دونوں بنیادیں نمایاں نظر آئیں یعنی **اهل السنة والجماعت**.

شاید اسی لئے حدیث میں **ماأنا عليه و اصحابی** میں بہتر (۷۲) فرقوں میں سے فرقہ حقہ کی نشان دہی فرماتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے معیار حق ان دونوں چیزوں کے مجموعہ کو ظاہر فرمایا اور انہیں **ما** اور **أنا** سے تعبیر فرمایا۔ **ما** سے اشارہ ہی اسی السنۃ یعنی روش نبوی علیہ السلام یا قانون دین کی طرف ہے جس سے ملت حقہ پیدا ہوئی اور جس سے پھر مختلف دینی شعبے بنے اور **أنا و أصحابی** سے اشارہ **الجماعة** یعنی برگزیدہ شخصیتوں کی طرف ہے جو پیغمبر ﷺ سے شروع ہوئیں اور بعد میں کسی نہ کسی شعبہ میں حذاقت و مہارت سے بنتی رہیں جن سے فرقۂ حقہ پیدا ہوا اس لئے اہل سنت والجماعت نے اپنے مسلک کی جامع حقیقت جس جامع لقب سے ظاہر کی ہے وہ حقیقت اور یہ لقب غالباً اسی حدیث پاک سے اخذ کیا گیا ہے

بلکہ امام احمد بن حنبلؒ اور ابوداؤد کی اسی مضمون کی روایت میں تو أنا أصحابی کی جگہ الجماعة کا صریح لفظ موجود ہے جس سے أنا و أصحابی کی وہ مراد جو ہم نے بطور ماخوذ اور مستنبط ظاہر کی تھی اس حدیث کے صریح اور منصوص ہو جاتی ہے اس میں حضور ﷺ نے بہتر (۷۲) فرقوں کو ناری اور ایک کو ناجی فرمایا تو خود ہی جنتی فرقے کو ھی الجماعة کے لفظ سے تعبیر فرمایا اس لئے اہل سنت والجماعت کے لقب کا ایک جزو تو منصوص بھی ہو گیا اور ما سے چوں کہ ہر وہ راہ مراد ہے واولاً حضور ﷺ کی راہ ہو اور پھر آپؐ کی تبعیت میں بعد والی جماعت کی راہ ہو اور ظاہر ہے کہ راہ نبوی ﷺ ہی کا نام سنت ہے جو لفظ ما کا مصداق ہے اور جب ما کا مدلول ہی یہاں سنت ہوا تو اس فرقہ کے لقب کا دوسرا جزو بھی تقریباً منصوص ہی نکلتا ہے اور اس طرح اس فرقہ کے حقانی ہونے کی یہ بھی ایک بڑی دلیل ہے کہ اس کا لقب حضور ﷺ نے تجویز فرمایا ہے و کفی به فخراً جس کا حاصل یہ نکلا کہ حق فرقہ وہی ہوگا جس میں یہ دونوں بنیادی اجزاء موجود ہوں۔ غور کیا جائے تو یہی لقب اس جامع حقیقت کو ظاہر بھی کر سکتا ہے جو اس فرقۂ حقہ میں ما اور أنا کے امتزاج سے نمایاں ہوئیں مثلاً اس فرقہ کا لقب اہل قرآن یا اہل حدیث یا اہل فقہ یا اہل تصوف یا اہل کلام یا اہل اصول ہوتا تو اس سے ما کا مصداق یعنی شخصیتوں کا تصور نہ آ سکتا اس لئے یہ لقب اکہرا اور نا تمام ہوتا اور اگر مثلاً اس کا لقب اہل جماعت یا متبعین صحابہؓ یا اصحاب محدثین ومجتہدین یا اتباع فقہا یا محسبین اہل بیت وغیرہ رکھ لیا جاتا تو اس سے بلاشبہ أنا کے مفہوم پر تو روشنی پڑ جاتی لیکن أنا کے کلمہ کا حق نہ ادا ہو سکتا اور یہ سمجھ میں آتا کہ یہ فرقہ شخصیت پرست یا طبقہ پرست ہے جس کے پاس شخصیتوں کے سوا کوئی اصول نہیں ہے کہ جس کی یہ پیروی کرلے پس یہ لقب بھی نا تمام، اکہرا اور تقریباً خلاف واقعہ ہوتا اور بیک وقت اس کے ذوق اصول پسندی، نیاز مندی کو ظاہر نہ کر سکتا۔ اس لئے لقب اہل سنت والجماعت رکھا گیا تا کہ اس کے مسلک کی یہ دونوں بنیادیں اصولیت اور شخصیت باوّل وہلہ سے ہی ظاہر ہو جائیں۔ لكل من اسم نصيبٌ.

اندریں صورت جب کہ یہ مسلک کلام نبویؐ کی صریح عبارت ہے اور اس کے واضح منشاء سے ماخوذ ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ مسلک اور اس کا یہ نام اور عنوان عین منشاء نبوت اور مرضیٔ خداوندی ہے جسے الحمد للہ اہل سنت والجماعت نے اپنایا اور اسے اپنا دستور حیات بنایا اس لئے علمائے دیوبند کے مسلک کا خلاصہ حسب منشاء حدیث نبوی ﷺ مختصر الفاظ میں اتباع سنت بتوسط شخصیات نکل آتا ہے۔

اسی کتاب میں عارف باللہ حکیم الاسلام محمد طیب صاحب قدس سرہ العزیز نے مسلک علمائے دیوبند کے مزاج کی ترجمانی سے صفحات کو یوں مزین فرمایا ہے ’’پس مسلک علمائے دیوبند محض اصول پسندی کا نام

ہے نہ شخصیت پرستی کا اور نہ ان کے یہاں دین اور دینی تربیت کے تنہا لٹریچر کافی ہے نہ تنہا شخصیتوں کے اقوال وافعال پر اتکال وبھروسہ ہے بلکہ اصول وقانون اور ذوات وشخصیات اور بالفاظ دیگر مختصر لٹریچر بشرط معیت وملازمت صدیقین سے اس مسلک کا مزاج بنا جس میں کسی ایک کے احترام سے قطع نظر جائز نہیں اور جامعیت واعتدال اور احتیاط ومیانہ روی ہی مسلک کا جوہر ہے تو دین کے ان تمام شعبوں اور علمی اصول میں قرآن وحدیث سے لے کر فقہ وکلام اور تصوف واصول وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی جزئی پر جمنا اور حکمت و اعتدال کے ساتھ اسے مشعل راہ بنانا ہی اس مسلک کا امتیاز ہے۔

اور ادھر ذوات اور شخصیات کی لائن میں حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے لے کر ائمہ، اولیاء، صلحاء وعلماء، مشائخ وصوفیہ اور حکماء کی ذوات قدسیہ تک کے بارے میں افراط وتفریط سے الگ رہ کر ان کی عظمت ومتابعت پر قائم رہنا ہی اس مسلک کی امتیازی شان ہے پھر ان تمام دینی شعبوں کے اصول وقوانین اور علم وفن کا خلاصہ دو ہی چیزیں ہیں عقیدہ اور عمل، جس کے لئے شریعت آئی اور ان شعبوں کو وضع کیا باقی امور یا تو ان کے مبادی ولوازم ہیں یا آثار ونتائج جس سے ان فنون میں بحث ہوتی ہے۔

نیز حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں علمائے دیوبند کے مسلک کی مختصر مگر جامع اور مبسوط ترجمانی حضرت علیہ الرحمۃ نے یوں رقم فرمائی ہے کہ اس سلسلہ میں اولاً ذوات ہی کا معاملہ لیجئے تو عالم کی ساری برگزیدگیوں اور برگزیدہ ہستیوں کا مخزن حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذوات قدسیہ ہیں جن کی عظمت اور محبت اور عقیدت ومتابعت ہی اصل ایمان ہے لیکن اس میں بھی علمائے دیوبند میں حسب طریقۂ اہل سنت والجماعت اپنے مسلک کی رو سے غلو اور افراط وتفریط سے بچ کر نقطۂ اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں نہ تو ان کا مسلک غلو زدہ اور بے بصیرت طبقوں کی طرح ہے کہ خدا اور انبیاء میں کوئی فرق نہیں صرف ذاتی اور عرضی کا فرق ہے معاذ اللہ یا خدا ان میں حلول کئے ہوئے ہے اور وہ محض ایک پردۂ مجاز ہیں جن میں ربانی حقیقت سمائی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ محض افراط وتفریط ہے جو محض جہالت کے شعبہ ہیں حالاں کہ دین و مذہب علم کا شعبہ ہے نہ کہ جہالت کا بلکہ علم وادراک کا بھی اصل ہے ادھر یہ غلو ظلم کا شعبہ ہے نہ کہ عدل کا اور مذہب کا بنیادی نقطۂ اعتدال ہے نہ کہ افراط وتفریط اور غلو ومبالغہ۔ بنا بریں حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں علماء دیوبند کا مسلک ان دونوں خلاؤں کے درمیان نقطۂ اعتدال ہے یہ مقدسین جہاں پیغامِ الٰہی کے امین ہیں جنہوں نے کمال دیانت اور جزم واحتیاط کے ساتھ پیغام الٰہی مخلوقِ خدا تک پہنچایا ہے جو کہ عالم

بشریت کا سب سے بلند ترین مقام ہے وہیں وہ اس کے رمز شناس معلم اور اس کی روشنی میں مخلوق الٰہی کے مربی و محسن ہیں۔ اس لئے جہاں وہ خدا کے سچے پیغامبر ہے جس سے ان کی امانت اور راست بازی کھلتی ہے وہیں وہ عالم کے مربی و معلم بھی ہیں جن سے ان کا محبوب عالم ہونا بھی نمایاں ہوتا ہے اس لئے وہ ہر تعظیم و عظمت کے مستحق اور ہر ادب و احترام کے مستوجب ہیں مگر ساتھ ہی اس مسلک کا یہ بھی اہم جزو ہے کہ وہ بشر بھی ہیں نوع بشر سے الگ ان کی کوئی نوع نہیں اس لئے جہاں ان کی بے ادبی کفر اور عظمت عین ایمان ہے وہیں اس عظمت میں شرک کی آمیزش بھی کفر سے بڑھ کر کفر ہے۔

آنحضرت ﷺ کے بارے میں علمائے دیوبند کے مسلک کی ترجمانی انہوں نے یوں فرمائی:

پھر اس مقدس طبقہ کی آخری اور سب سے زیادہ برگزیدہ ہستی نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات ہے جن کی عظمت و سربلندی وہر بلندی و برتر ہستی سے بمراتب بے شمار زیادہ اور بڑھ کر ہے اس لئے ان کی تعظیم و توقیر کے درجات اور حقوق بھی اوروں سے زیادہ ہیں لیکن حضور ﷺ کے بارے میں بھی علمائے دیوبند کا مسلک وہی نقطۂ اعتدال ہے اور میانہ رویہ ہے جو خود حضور ﷺ کی پیدا کردہ ہے۔ چنانچہ علمائے دیوبند بصدق قلب سید الکونین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو افضل الکائنات، افضل البشر اور افضل الانبیاء یقین کرتے ہیں مگر ساتھ ہی آپ کی بشریت کا بھی اقرار کرتے ہیں، غلو عقیدت و محبت میں نفیٔ بشریت یا ادعاء او تاریت یا پردۂ مجاز وغیرہ کہنے کی جرأت نہیں کرتے وہ آپ کی ذات بابرکات کو تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تمام کمالاتی خصوصیات، خلت اصطفائیت، کلیمیت، روحیت، صادقیت، مخلصیت، صدیقیت وغیرہا کا جامع بلکہ مبدۂ نبوت انبیاء پر اور منشاء ولایت اولیاء کو سمجھتے ہیں اور آپ ہی پر تمام مختارات خداوندی کی ریاست کی انتہا مانتے ہیں لیکن پھر بھی آپ کا سب سے بڑا کمال عبدیت یقین کرتے ہیں اور وہ کمالات نبوی و علو درجات کو انتہائی ثابت کرنے کے لئے آپ کی حدود و عبدیت کو توڑ کر حدود معبودیت میں پہنچا دینے سے مدد نہیں لیتے اور نہ ہی اسے جائز سمجھتے ہیں۔ وہ آپ کی اطاعت مطلقہ کو فرض عین جانتے ہیں لیکن آپ کی عبادت کو جائز نہیں سمجھتے، وہ آپ کو ساری کائنات میں فرد اکمل اور بے نظیر جانتے ہیں لیکن خصوصیات الوہیت تسلیم نہیں کرتے اور اس میں ذاتی اور عرضی کا فرق بھی نہیں سمجھتے۔

وہ آپ کے ذکر مبارک اور مدح و ثناء کو عین عبادت سمجھتے ہیں لیکن اس میں عیسائیوں کے سے مبالغہ کو جائز نہیں سمجھتے کہ حدود بشریت کو حدود الوہیت سے جا ملائیں وہ برزخ میں آپ کی جسمانی حیات کے قائل ہیں لیکن وہاں معاشرت دنیویہ کے قائل نہیں۔ وہ اس کے اقراری ہیں کہ آج بھی امت کے ایمان کا تحفظ

گنبد خضرا ہی کے منبع یمانی سے ہو رہا ہے لیکن پھر بھی وہ آپ کو حاضر و ناظر نہیں جانتے جو کہ خصوصیت الوہیت میں سے ہے وہ آپ کے علم عظیم و ساری کائنات کے علم سے خواہ ملائکہ ہوں یا انبیاء و اولیاء بمراتب بے شمار زیادہ اور بڑھ کر جانتے ہیں لیکن پھر بھی اس کے ذاتی اور محیط ہونے کے قائل نہیں۔

غرض ساری کائنات میں تمام ظاہری و باطنی کمالات میں آپ کو ساری مخلوق میں بلحاظ کمال و جمال یکتا بے نظیر اور بے مثال یقین کرتے ہیں لیکن خالق کے کمالات سے ان کے کمالات کی وہی نسبت مانتے ہیں جو مخلوق کو خالق سے ہوسکتی ہے کہ خالق کی ذات وصفات سب لامحدود ہیں اور مخلوق کی محدود وہ ذاتی ہیں یہ عرضی ہو کر بھی محدود، وہ خانہ زاد ہیں اور یہ عطا کا ثمرہ پس یہ حدود کی رعایت وہی نقطۂ اعتدال ہے جو اس مسلک اعتدال کی اساس ہے۔

اسی طرح اولیاء کرام وصوفیاء عظام کے طبقہ کے متعلق علمائے دیوبند کے نظریہ کو انہوں نے یوں قلم بند کیا کہ:

اولیاء صوفیاء عظام کا طبقہ مسلک علمائے دیوبند کی رو سے امت مسلمہ کے لئے روح رواں کی حیثیت رکھتا ہے جس سے اس امت کی باطنی حیات وابستہ ہے جو اصل حیات ہے اس لئے علمائے دیوبند ان کی محبت وعظمت کو ایمان کے تحفظ کے لئے ضروری سمجھتے ہیں مگر غلو کے ساتھ محبت وعقیدت نے انہیں ربوبیت کا مقام نہیں دیتے ان کی تعظیم شرعاً ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کے معنی عبادت کے نہیں لیتے۔

الحاصل حضرت حکیم الاسلامؒ کی یہ تصنیف لطیف اگرچہ ایک مختصر سے رسالہ اور مضمون کی شکل میں ہے لیکن جامعیت کے لحاظ سے مسلک علماء دیوبند کی ترجمانی کرنے والا ایک کافی وشافی ومکمل دستاویز ہے۔

حکیم الاسلامؒ نے علم حدیث کی اہمیت وعظمت اور حدیث کی اقسام کا قرآن کریم سے محققانہ ثبوت پیش کیا چنانچہ وہ پہلی کتاب ''حدیث رسول کا قرآنی معیار'' میں فہم حدیث کے بغیر فہم قرآنی کے غیر ممکن ہونے کو انہوں نے یوں واضح کیا کہ پیغمبر کی زبان سے ہر کلام کلام ہدایت کسی نہ کسی کیفیت سے صادر ہوتا ہے۔ یہ کیفیات ظاہر ہے کہ نفسانی نہیں ہوتیں جو ہر کس وناکس پر طاری ہوسکتی ہیں بلکہ روحانی ورحمانی ہوتی ہیں اس لئے وہ کلام درحقیقت اسی متعلقہ کیفیت میں ڈوب ہوا ہوتا ہے اور اسی سے سرزد ہوتا ہے اور اسی کا ہوتا ہے گویا وہ کیفیت ہی الفاظ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ پھر اس کیفیت سے یہ کلام چل کر اسی کیفیت کی طرف لوٹتا ہے جس سے یہ کیفیت قلب میں اور زیادہ مستحکم ہو کر جڑیں پکڑتی ہے گویا اس کلام کے اول وآخر رحمانی و روحانی کیفیت چھائی رہتی ہے۔ غور کیا جائے تو اس کلام کی مراد درحقیقت اسی کیفیت میں چھپی رہتی ہے کیوں کہ کلام کسی نہ کسی مقصد کے لئے کیا جاتا ہے اور مقصد کسی نہ کسی کیفیت کا مقتضاء ہوتا ہے اسی لئے

قدرتی طور پر کلام کی صحیح مراد کو وہی پا سکتا ہے جو کسی نہ کسی حد تک انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی کیفیات اوران کے اسوۂ حسنہ آشنا اور ہم آہنگ ہو، عاشق کی مراد کو عشق آشنا ہی پوری طرح جان سکتا ہے، عالم کی مراد کو علم آشنا کسی نہ کسی حد تک پا سکتا ہے اس لئے کلام رب کو رب آشنا ہی کسی نہ کسی حد تک پا سکتا ہے اس لئے جو ربانی کیفیات سے کسی نہ کسی حد تک مانوس نہ ہو ورنہ بے کیفیت اور نا آشنا ممکن ہے کہ کلام کے لغوی مفہوم اور معنی اول تک پہنچ جائے لیکن متکلم کے صحیح منشاء و مراد تک اس کیفیت سے مانوس اوران میں غرق ہوں تو وہ عادۃً مراد کو سمجھانے سے بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے ہیں جس سے ادراک مراد حق پوری طرح ادا و مطلع ہو جائے اور اگر اتفاقاً وہ الفاظ کی مدد سے کسی حد تک مراد حق پر مطلع بھی ہو جائیں تو اس کیفیت کے بغیر اس میں مبصر نہیں بن سکتے جس سے اس کی مخفی حقیقتیں ان پر کھل سکیں۔

اوران حقائق میں مضمر شدہ احوال ان پر طاری ہو سکیں جن سے حقیقی معرفت کا دروازہ کھل جاتا ہے اور آدمی مبصر بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی صفات اور اس میں بھی بالخصوص صفت علم اور اخص خصوص صفت کلام جو اس کے علوم کی ترجمان اور معبر ہے اور اس کا مظہر اتم ہے قرآن کریم اپنی اصولیت، کلیت، کمال جامعیت اوران شئون الٰہیہ سے بھرپور ہونے کی وجہ سے جن سے یہ کلام سرزد ہوا ہے ذات ہی کی طرح لامحدود الحقائق، لامحدود المعارف اور لامحدود المطالب ہے جو یک نوع نہیں بلکہ ماضی اور مستقبل اور حال کی ہزار ہا انوار علوم پر حاوی و شامل ہے۔

فیه نبأ ما قبلکم و خبر ما بعدکم و کم مابینکم هو الفصل لیس بالهزل من ترکه من جبار قصمه الله و من ابتغی الهدی فی غیره اضله اللّٰه و هوه حبل اللّٰه المتین وهو الذکر الحکیم وهو الصراط المستقیم وهو الذی لا تزیغ به الأهواء ولا تلبس به الا لسنة ولا تشبع به العلماء ولا تخلق عن کثرة الرد ولا تنقض عجائبه وهو الذی لم تنته الجن اذا سمعته حتی قالوا انا سمعنا قرآناً عجبا یهدی الی الرش فاٰمنا به. من قال به صدق و من عمل به أجر و هن حکم به عدل و من دعا اِلی هدی اِلی الصراط المستقیم خذها اِلیک یا أعور

ترجمہ: اس میں تم سے پہلوں کی باتیں ہیں اور پچھلوں کی خبریں ہیں اور حال کے احکام اور وہ یقینی چیز ہے مذاق نہیں جس متکبر نے اسے چھوڑا اس کی گردن خدا نے توڑ دی اور جس نے ہدایت اس کے سوا میں ڈھونڈی اسے خدا نے گمراہ کر دیا وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے، وہ حکیمانہ یادداشت ہے، وہ سیدھا راستہ ہے، وہ

وہ چیز ہے جس سے دلوں کے میلانات ٹیڑھے نہیں ہوتے اور زبانیں مشتبہ نہیں ہوتیں اور اس سے علماء کبھی سیر نہیں ہوتے وہ کثرت تلاوت سے پرانا نہیں ہوتا اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ وہی ہے کہ جب جناب جیسی سرکش قوت نے جب اسے سنا تو سرکشی سے ایک دم رک گئے اور یہی کہتے جب ہم نے عجیب کلام کو سنا ہے جو بزرگی کی طرف لے جاتا ہے ہم تو اس پر ایمان لے آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اسے زبان پر لائے اس نے سچ کہا جس نے اس پر عمل کیا اسے اجر ملا، جس نے اس کے ساتھ حکم کیا اسے انصاف کیا، جس نے اس کی طرف بلایا اسے سیدھے سچے راستے کی ہدایت ہوئی، سوائے اور اسے مضبوطی سے تھام لے۔

حجیت حدیث کے مستقل اور معقول ہونے کو قطعیت کے ساتھ حضرت علیہ الرحمہ نے اس طرح قلم بند فرمایا کہ: بہر حال جس قدر بھی حدیثی احکام ہیں وہ درحقیقت قرآن ہی سے ماخوذ ہیں اور اسی کا بیان ہیں البتہ ان کی خاص نوعیت کی وجہ سے دو جہتیں ہیں۔ ایک جہت تابع قرآن ہونے کی ہیں سو اس جہت سے اس کا نام بیان قرآن ہوگا گو اس بیان اور قرآن کا درمیانی واسطہ دقیق ہو اور عمیق ہونے کی وجہ سے ہر ایک پر نہ کھلے، دوسری جہت اس کی تشریعی احکام کی ہیں کہ اس کی رو سے حدیث ایک مستقل مصدر تشریع اور شریعت کی جہت مستقلہ ثابت ہوگی، اس لئے جن نصوص سے حدیث کا بیان ہونا واضح ہوتا ہے، ان سے تو حدیث کی تابعیت اور فرعیت کی شان نمایاں ہوتی ہیں اور جن نصوص سے حدیث مصدر تشریع ثابت ہوتی ہے، ان سے ان کے احکام کو مثل احکام قرآن بتلا کر حدیث کا قرآن کے مماثل حجت شرعیہ ہونا واضح کیا گیا ہے جیسے حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا ''الا انی اوتیت القرآن و مثله معه'' خبردار ہو مجھے قرآن کے ساتھ اس کا مثل بھی دیا گیا ہے اور فرمایا گیا و انما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ اور تحقیق رسو اللہ نے بعض چیزیں حرام کی ہیں جیسے اللہ نے حرام کیں اس سے تشریعی طور پر حدیث کی استقلالی شان واضح کی گئی ہیں۔ رہا یہ پہلو کہ بعضے وہ احکام جو احادیث میں ہیں اور قرآن میں نہیں جیسے مقدام بن معدیکرب کی حدیث میں آپ نے حجیت حدیث اور اس کی مستقل تشریعی شان کو نمایاں کرتے ہوئے فرمایا کہ حمار اہلی کی حرمت قرآن میں نہیں اسے رسول اللہ نے حرام کیا ہے یا درندوں کے گوشت کی حرمت کلام اللہ میں نہیں کلام رسول میں ہے وغیرہ وغیرہ جن سے حدیث کی نہ صرف شان تشریعی ہی قرآن سے الگ ہو کر ثابت ہوتی ہے بلکہ بظاہر بعض احکام کا قرآن سے علاقہ بھی ثابت نہیں ہوتا جو بظاہر حدیث کے بیان قرآن ہونے کے منافی اور سابقہ دعوے کے خلاف معلوم ہوتا ہے جس میں تمام احادیث کے بیان قرآن ہونے کا ادعاء کیا گیا ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ حدیث اور احکام حدیث بھی بیان قرآن ہونے سے نہیں نکل سکتے کیوں کہ

اس قسم کی روایات کے احکام گو جزوی طور پر کسی خاص آیت پر نظر نہ پڑی مگر وہ کلی طور پر آیت کے ذیل کے بیان میں ثابت ہوں گے جسے قرآن نے ایک مستقل اصول کی حیثیت سے بیان فرما دیا ہے۔

ما اٰتاکم الرسول فخذوہ و ما نھاکم عنه فانتھوا پس اس قسم کے تمام احکام جن کو اللہ کے رسولؐ نے مشروع فرمایا ہے۔ درحقیقت اس مذکرہ آیت کا بیان واقع ہو رہے ہیں جس میں رسول کو خود احکام دینے کی ہدایت دی گئی ہے اور تشریع رسول کو تشریع الٰہی کے متوازی قرار دیا گیا ہے۔ گویا اوپر کی دو ذکر کردہ حدیثیں اس آیت کا بیان واقع ہو رہی ہیں اور اس طرح حدیث نبویؐ کے دئے احکام سب اسی آیت کی رو سے قرآنی احکام اور بیان قرآن کہتے ہیں۔ سیدنا حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے ایک بڑھیا نے کہا کہ آپ گودھنے والی عورت پر لعنت کرتے ہیں حالاں کہ قرآن میں گودھنے کی ممانعت کہیں بھی نہیں ہے تو آپ نے فرمایا کاش تو قرآن پڑھی ہوئی ہوتی کیا قرآن میں یہ آیت نہیں ہے کہ جو رسولؐ لا کر دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ کہاں ہاں یہ تو ہے فرمایا کہ بس اسی کی رو سے حضورؐ نے واشمہ یعنی گودھنے والی پر لعنت کی اور فعل قبیح سے روکا تو یہ حکم رسولؐ اس آیت کا بیان ہو کر قرآنی حکم ہو گیا یا جیسے امام شافعیؒ نے ایک بار حرم مکہ میں بیٹھ کر علمی جوش میں فرمایا کہ آج میں ہر سوال کا جواب قرآن سے دوں گا تو کسی نے حرم میں زنبور یعنی تتیہ مارنے کا حکم پوچھا کہ قرآن میں کہاں ہے؟ جو امام شافعیؒ کا مذہب ہے فرمایا آیت **مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ** سے حکم رسول کا ماننا واجب نکلا اور حدیث **اقتداو بالذین من بعدی ابی بکر و عمر** سے سیدنا حضرت سیدنا ابوبکرؓ و عمرؓ کے حکم کا ماننا واجب نکلا اور سیدنا ابوبکرؓ و عمرؓ نے فرمایا **یقتل الزنبور فی الحرم** حرم میں تتیہ بھرنڈی ماری جاسکتی ہے اس لئے یہ قتل زنبور کا حکم بیک واسطۂ آیت **مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ** کا بیان ثابت ہو کر قرآنی حکم ثابت ہوا۔

بہر حال حدیث کی دو جہتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک بیان قرآن ہونے کی جو اس کے تفریعی ہونے کی دلیل ہے اور ایک اس کے مستقل حجت ہونے کی جو مخفی رشتہ سے وہ بیان قرآن بھی ہو مگر جلی طور پر وہ حکم رسول اور حکم حدیث ہے جو حجیت میں اس کے مماثل قرآن ہونے کی جہت ہے اس لئے حدیث میں ان دو پہلوؤں کے لحاظ سے دو شاخیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک اصل ہونے کی اور ایک فروع ہونے کی، سو وہ قرآن کے لحاظ سے تو فرع مانی جائے گی۔ فروع اس کا بیان ہے اور تابع اصل ہوتا ہے اور اجتہادی فقہوں کے لحاظ سے اصل مانی جاوے گی کہ احکام اس سے ماخوذ بھی ہیں اور اس سے شرح شدہ بھی ہیں۔ اس طرح حدیث ایک برزخ کبریٰ ثابت ہوئی جو قرآن سے علم لیتی ہے اور فقہ کو دیتی ہے۔ اگر حدیث درمیان میں نہ ہو تو فقہ

کا کوئی جوڑہ براہِ راست قرآن سے نہیں لگ سکتا اور مفہوم بھی نہیں ہوسکتا۔

نیز اسی کتاب میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے شریعت اسلامیہ میں نقب لگانے والے وضاعین حدیث سے متنبہ کرنے کی سعیٔ کامل کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں حدیث نبوی میں مختلف قسم کے منکرین حدیث کی خبر دی گئی ہے کہ وہ مختلف صورتوں اور مختلف اندازوں سے حدیث رسولﷺ کا اعتبار ختم کرنے کی ناپاک سعی کریں گے۔ ایک طبقہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ وضاعین حدیث کی صورت میں نمایاں ہوگا جو حدیث کے پیرائے میں حدیث کو بے اعتبار ثابت کر کے گویا اس سے انکار کی دعوت دے گا۔

عن ابی هريرةؓ قال قال رسول اللّٰه ﷺ يكون فى آخر الزمان دجالون كذابون ياتونكم من الاحاديث مالم تسمعوا انتم ولا آباؤكم فاياكم و اياهم لايضلونكم ولا يفتنونكم.

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اخیر زمانہ میں جھوٹے دجال تمہارے پاس آئیں گے جو ایسی احادیث بیان کریں گے جس کو تم نے نہیں سنا ہوگا اور نہ ہی تمہارے آباء واجداد نے سنا ہوگا خبردار ان سے بچ کر رہئے گا، وہ تمہیں گمراہ نہ کردیں اور نہ تمہیں کسی فتنہ میں مبتلا کر پائیں۔ پس یہ تو انہوں نے ان لوگوں کی اطلاع دی جنہوں نے حدیث اور بیان قرآن کو معتبر کہہ کر بلکہ اس سے عقیدت کا اظہار کر کے عیاری سے جعلی حدیثیں گھڑی اور اصلی حدیثوں میں رلا ملا کر بیان کیا۔ اسی طرح حضرت علیہ الرحمہ میں اپنی تصنیف لطیف میں منکرین حدیث سے بھی آگاہ کیا اور اسے مدلل کیا۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں، پھر ایسے لوگوں کی وجود کی بھی حضور اقدس ﷺ نے خبر دی جو کھلے بندوں حدیث کا انکار کر کے اسے بے اعتبار بنانا اور اسے مٹا دینا چاہیں گے اور اس عیاری کے ساتھ کہ قرآن کا نام لے کر قرآن کی روش سے اس بیانِ قرآن کو ختم کر دینا چاہیں گے۔

عن المقدام بن معديكرب قال قال رسول اللّٰه ﷺ ألا انى اوتيت القرآن و مثله معه الا يوشک رجل شعبان على أريكته يقول عليكم بهذا القرآن فما وجدتم فيه من حلال فاحلوه و ما وجدتم فيه من حرام فحرموه و ان حرم رسول اللّٰه كما حرم اللّٰه لا يحل لكم الحمارالاهلى ولا كل ذى ناب من السباع ولا لقطة معاهد الا ان يستغنى عنها صاحبهاالخ.

حضرت مقدام بن معدیکرب سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خبردار میں

قرآن دے کر بھیجا گیا ہوں اور قرآن کا مثل بھی دے کر بھیجا یا ہوں۔ خبردار عنقریب شکم سیر جو اپنے تکیہ پر ٹیک لگائے ہوئے ہوگا وہ تمہارے اوپر قرآن کریم کو بیان کرے گا چنانچہ جو تم اس میں حلال پاؤ گے تو اس کو حلال رکھنا اور جو تم اس میں حرام پاؤ گے تو اس کو حرام رکھنا اور بے شک اللہ کے رسولؐ نے بھی ایسے ہی کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے جیسے اللہ نے حرام کیا ہے تمہارے لئے حمار اہلی حلال نہیں ہے اور نہ پنجوں سے پکڑ کر کھانے والے درندے اور نہ راستوں میں کسی کی پڑی ہوئی چیز مگر یہ کہ تمہارا رب المال سے معاہدہ ہوجائے جو تمہیں اس کے ضمان سے بری کردے۔

اس حدیث کے ذریعہ مصنفؒ نے فتنۂ انکار حدیث کا منشاء بھی بتلا دیا کہ وہ منکروں کی شکم سیری اور پیٹ بھرے ہونے کا کرشمہ ہوگا دنیا کی طرف سے بے فکری ہوگی تو دین پر ہاتھ صاف کرنے کی سوجھے گی۔

غرض یہ کہ یہ کتاب جہاں احادیث رسولؐ کا معیار بتلاتی ہے وہیں اس کے محقق بالقرآن اور مؤید بالقرآن ہونے کو بھی ثابت کرتی ہے۔ چنانچہ مصنفؒ نے اس کتاب میں حدیث اور اقسام حدیث کو قرآنی معیار کے ترازو میں تولا ہے وہیں اس کو ادلۂ قرآن سے بھی ثابت و محقق کر دیا ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کے تصنیفی سلسلہ کی ایک اہم ترین کڑی ان کی کتاب بشکل مضمون ''الکلم الطیب'' بھی تحقیق کا ایک شاہکار ہے۔ دراصل یہ مقالہ پرویز صاحب کی قرآنی تحریفات کی ایک کڑی یعنی ''سورۂ فیل میں پرویزی تحریف'' موصوف کی تحریف کا جواب ہے اور یہ اس وقت کے پرویز کی تحریف کا جواب ہے جب وہ تحریف کا قاعدہ بغدادی ختم کر کے پارۂ عم شروع کر چکے تھے لیکن مصنفؒ کا قلم اسلام کا حکیمانہ اور متکلمانہ ترجمان ہے اس لئے اس مقالہ کی جامعیت اور پرویزی فکر و ذہن کا حقیقی تجزیہ آج سے برسہا برس پہلے جس گہرائی کے ساتھ کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ بجائے خود ایک مستقل رہبر و رہنما کی حیثیت رکھتا ہے اور پرویز صاحب کی باطل پسندی اپنے آپ سامنے آجاتی ہے تاہم یہ رسالہ بھی کسی حد تک اہم وضاحت ہے۔

نسب اور اسلام کے بارے میں اسلام نے اپنی اصل اور اساس کو برقرار رکھتے ہوئے اس کو انسانی فکر و ذہن کے سپرد نہیں کیا بلکہ اپنی ہمہ گیری کے تحت فکر و ذہن کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور انسانی عظمتوں کی بھی پوری پاس داری فرمائی ہے۔ مسئلہ کفائت میں معاشرے کی ستودہ روایات کو باقی رکھنے میں فکر و ذہن کو اگر اس کا حق دیا ہے تو انسانی تکریم و عظمت کی اصل بنیاد صالح کردار اور خوف خدا کو قرار دے کر پستی و بلندی کے انسانوں کے خودساختہ معیار کو بھی توڑا یا ہے۔ اسلام نے نسب کو تفاخر کا وسیلہ نہیں قرار دیا گیا بلکہ تعارف کا ذریعہ بنایا گیا ہے پھر پیشوں کے ذریعہ نسبوں کا تعین نہ عربی مزاج ہے اور نہ اسلامی اساس بلکہ یہ خصوصیات عجم میں سے ہے اور

جیسا کہ مرز و بوم کی خصوصیات سے غیر شعوری تأثر پذیری کی وجہ سے عجمی مسلمانوں میں بہت سی چیزیں غیر اسلامی ہونے کے باوجود رواج پذیر ہوگئیں انہیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان میں بھی پیشوں کی وجہ سے نسب بننے لگے اور نہ صرف یہ بلکہ ان مفروضہ انساب میں برتری اور کمتری کے جراثیم بھی پرورش پانے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس اندازِ فکر و نظر کو اسلام سے کوئی قرب نہیں ہوسکتا جو اپنے ماننے والے ہی کے درمیان نہیں بلکہ رشتۂ اخوت کے ذریعہ پورے عالم انسانی کے ایک ہوجانے کا داعی بن کر آیا ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے اسی عنوان کی ترجمانی کے مقصد سے ایک بیش قیمتی مقالہ ''نسب اور اسلام'' تحریر کر چھوڑا ہے جو مسلمانان عجم کو بالخصوص اور عرب کو بالعموم اس سلسلہ کی اسلامی تعلیمات کی ہدایات عنایت کرتا ہے۔

چنانچہ مساوات اور فرق مراتب کے عنوان سے وہ رقم طراز ہیں کہ بہر حال اگر اسلامی مساوات کے یہ معنی ہیں کہ اسلامی قانون میں تمام انسانی طبقہ برابر سمجھے جائیں تو یہ مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہوسکتا بلکہ قابل ذکر شئے نہیں ہوسکتی جب تک انسانوں میں مشترکہ انسانیت کے ساتھ فرق مراتب اور درجات کا تفاوت، کمتر و برتر کا وجود، اعلیٰ وادنیٰ کا تفاضل، امیر وغریب کی تفریق اور شریف و وضیع کی تخصیص نہ ہوں کیوں کہ مساوات کے معنی دو چیزوں کے ساتھ یکساں اور مساویانہ برتاؤ کرنے اور انہیں کسی خاص دائرے میں ایک درجہ پر لے آنے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک درجہ پر انہیں دو کو لانے کی سعی کی جاتی ہے جو ایک مرتبہ پر نہ ہوں اور اس لئے کی جاتی ہے کہ کمتروں کی دل شکنی و شکستگی نہ ہو اور برتروں کو ناز بیجا نہ ہو، کمتر تو یہ سمجھ کر مسرور و بشاش رہ سکیں کہ ان کی ہستی بھی اس دائرے میں بڑے حلقوں میں شمار ہوسکتی ہے اور برتر یہ سمجھ کر اترا نہ جائیں کہ وہ بہمہ وجوہ تحتانی طبقوں سے بالاتر اور فوق الفطرت ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ فوقانی طبقات سے انحراف و اعراض نہ لاحق ہوگا پس مساوات احکام کی رو سے ایک طبقہ کا غرور ٹوٹتا ہے اور ایک حلقہ کی شکستگی، ایک تکبر سے محفوظ رہتا ہے اور ایک تدبر سے۔

مگر یہ مساوات کا اجرا اور اس کا قابل مدح ہونا جب ہی پورا ہوسکتا ہے جب کہ کمتر و برتر اور فوق و تحت کے درجات انسانوں میں ہوں تا کہ اسلامی قانون کو اس دعوے کا موقع ہاتھ آسکے کہ اس نے اعلیٰ وادنیٰ، امیر و غریب اور کمتر و برتر سب کو احکام کی ایک صف میں لا بٹھایا ہے۔

لیکن افسوس! کہ قوم نے اسلام کے اس خوبصورت و جامع ترین فلسفہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا اور نہ تقریباً دینی حلقوں نے اس طرف توجہ فرمائی خیر حضرت حکیم الاسلامؒ تو اس فریضہ کو ادا کر گئے اور فلسفۂ کو مکمل واضح اور ہدایات کا جامہ پہنا کر چلے گئے اب ہماری باری ہے کہ۔

ہواؤں میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں
مرے دوستو دیپ بجھنے نہ پائے

جناب غلام جیلانی برقؔ نے اسلام کا منشاء تسخیر کائنات قرار دیا ہے چنانچہ موصوف نے ایک قرآن تو وحیِ متلو قرار دیا ہے جس کا نام علمی قرآن رکھا ہے اور دوسرا قرآن صحیفۂ کائنات کو قرار دیا ہے جسے عملی قرآن کے نام سے موسوم کیا ہے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہٗ نے اپنی کتاب ''ایک قرآن'' میں برق صاحب کے نظریۂ اصولی پر تبصرہ فرمایا ہے چنانچہ مولانا موصوفؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ جزئیات کے حسن وقبح کا مدار ان کلیات پر ہوتا ہے جن کے ماتحت وہ جزئیات ہوتی ہیں اور ادراک کلیات تابع ہے ذوق اور ذہنیت کے اس لئے اگر ذوق وذہنیت سلیم اور مستقیم ہے تو اس ذہنیت سے ابھرنے والے کلیات کے ادراک بھی صحیح ہوں گے اور ان کلیات سے نکلنے والی جزئیات بھی اور اگر ذوق کجی لئے ہوئے ہے تو اس سے نکلنے والے کلیات اور ان کلیات کے تحت میں آنے والی جزئیات دونوں کے ادراک میں غلطی ہوگی یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ذوق و ذہنیت کی اصلاح وتقویم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور اصلاح وتقویم کا نام تزکیہ رکھ کر اسے نبوت کے فرائض چارگانہ میں سے ایک اساسی فریضہ قرار دیا ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں تعلیم سے پہلے بھی آیا ہے اور تعلیم کے بعد بھی **يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ الآية.**

برق صاحب نے اسلام کا منشاء تسخیر کائنات قرار دیا تھا جس کے نتیجہ میں انسان مادیات کا محتاج بن کر رہ جاتا ہے اور نمونہ محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک زندگی ہے ''**لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ**'' یہ عنوان عین قرآن کے مطابق ہے جو انسانوں کو سفلیات وفلکیات سے اٹھا کر الٰہیات کی لامحدود وسعتوں میں پہنچا دیتا ہے جہاں سے وہ تمام کائنات پر حکومت کرتا ہے اور کائنات کا ہر ہر جز اس کے اشارۂ ابرو کی تعمیر کرتا ہے۔

''**لا یَزَالُ عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی اجبته فاذا اجبته فکنت سمعه الذی یسمعه به و بصره الذی یبصر به و یده التی یبطش به و رجله التی یمشی بها**''

برق صاحب نے قرآن کی تقسیم ثنویت کی ذہنی ماتحت کی جس کے نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن دو ہو گئے مگر ان دونوں میں کوئی ربط باقی نہ رہا اور سب سے بڑی کوتاہی یہ ہوئی کہ اس تقسیم میں آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کے لئے جو حسب تصریح اثر صحیح **کان خلقه القرآن** عملی قرآن ہے کہیں گنجائش نہیں رکھی گئی۔

اس کے مقابلہ میں حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اول تو تعدد قرآن ہی کی مخالفت فرمائی پھر فرمایا کہ اگر بطور تفنن طبع تعدد قرآن نظریہ کو مانا بھی جائے تو تین عنوان کے ساتھ تا کہ کتاب اللہ علمی قرآن،

کائنات الٰی برہانی اور تمثیلی قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی ذات عملی قرآن قرار پائے اور اس طرح علمی قرآن احکام کا مجموعہ تمثیلی کائناتی قرآن دلائل و امارات کا مجموعہ اور عملی قرآن یعنی ذات محمد ﷺ نمونۂ عمل ہے۔ اس عنوان میں کسی قدم پر قرآن و سنت کی مخالفت بھی لازم نہیں آتی اور تینوں میں کمال ربط بھی قائم رہتا ہے۔ برق صاحب کے نظریہ کے مطابق کسی نبی کی بعثت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور حضرت حکیم الاسلام محمد طیب صاحبؒ کے پیش کردہ نظریہ کے مطابق نبی کی بعثت ضروری ہوجاتی ہے تاکہ نمونۂ عمل انسانوں کے لئے ان کے سامنے آجائے۔ بہر حال حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہ العزیز نے بہت مکمل اور مدلل بحث فرمائی ہے اور کسی گوشہ کو تشنہ نہیں چھوڑا۔

ڈاڑھی رکھنے نہ رکھنے کا مسئلہ اسلامی نقطۂ نظر سے جس قدر واضح اور بدیہی، سادہ اور سہل العمل تھا آج کے دور ہوا و ہوس نے اسے اتنا ہی مشکل، پیچیدہ اور معرکۃ الآراء بنا دیا ہے، عقل سلیم اور نقل صحیح کی قوت اس کی پشت پر تھی تعامل سلف کی طاقت اس کے دائیں بائیں تھی ان قوتوں کی وجہ سے یہ مسئلہ ایک مضبوط اور محکم قانون اور مستند رواج یا سنت حسنہ کی صورت سے قرون امت پر چھایا ہوا تھا۔ اگر اس مسئلہ کو انہیں میزانوں میں تول تول کر رکھا جاتا رہتا تو اس میں کوئی پیچیدگی رونما نہ ہوتی لیکن جب کہ خارجی اثرات اور ایک فاسقانہ تمدن کے ماحول میں رائے خالص اور ہوائے نفس سے اس کا جائزہ لے جانے لگا تو قدرۃً مسئلہ کی شرعی حیثیت مشتبہ اور بے بصیرت قلوب سے اوجھل ہوگئی جس کا طبعی نتیجہ وہی پیچیدگی تھی جو پیدا ہوئی اور لوگ جہل و حیرت اور کج راہی کا شکار ہوگئے۔

اسی عنوان و تمہید کی حکمت زیر کتاب ''ڈاڑھی کی شرعی حیثیت'' حضرت حکیم الاسلامؒ کے گوہر بار قلم سے منصۂ شہود پر آئی جس میں فاضل مصنفؒ نے ڈاڑھی کی اہمیت و فضیلت اور قطعیت و سنیت پر محققانہ بحث فرمائی ہے جو نیک بختوں کے لئے ایک مشعل راہ بھی ہے اور مغرب پسند نوجوانوں کے غفلت زدہ ذہن و دماغ کے لئے ضرب کاری بھی، نیز حضرتؒ نے اس کے نہ ہونے کے مفاسد بھی واضح کئے اور اس کے ہونے کی صورت میں سعادت دارین کی یقین دہانی بھی کرائی ہے۔

''سبحان من زین الرجال باللحی''۔

فنا کے بعد زندہ ہے شان رہبری تیری
ہزاروں رحمتیں ہوں اے میر کارواں تجھ پر

نیز عارف باللہ حضرت حکیم الاسلام محمد طیب علیہ الرحمۃ نے ''آفتاب نبوت'' ایک کتاب تحریر فرمائی جس

میں قرآن کریم کی صرف ایک آیات ''وَ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا'' کی قرآنی تمثیل سے نبوت محمدیہ ﷺ کی تمام شانوں کا حکیمانہ استنباط کیا۔

اسی طرح اسلامی تہذیب وتمدن یعنی ''التشبه فی الاسلام'' اس کتاب میں غیر مسلم اقوام کے ساتھ مسلمانوں کی مشابہت کی اصل حیثیت اور اسلامی تہذیب وتمدن کی حفاظت اور اس کی بقاء قرآن حدیث، آثار صحابہؓ اور فقہائے امت کے عقلی ونقلی دلائل کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔ نیز اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی ابتداء میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ، مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ اور شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ جیسے اکابر علماء کی تقاریظ ثبت ہیں۔

اسی طرح ''شہید کربلا و یزید'' محمود احمد عباس کی کتاب ''خلافت معاویہ یزید'' کا مفصل مدلل اور مسکت جواب حادثۂ کربلا کے اسباب ونتائج سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے موقف کی وضاحت، آپ کے مو قف پر کئے گئے اعتراضات کا تحقیقی جواب نیز افراط وتفریط سے ہٹ کر علمائے اہل سنت والجماعت کے مسلک اعتدال کی تشریح فرمائی ہے۔

''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' دارالعلوم کی سوسالہ زندگی، اس کی تاسیس، وجہ تاسیس تعلیمی، تبلیغی اور انتظامی اور عام افادی کوائف واحوال اور مشاہیر دارالعلوم کے حالات زندگی کا مختصر جامع ترین مرقع ہے۔

''خاتم النبیین'' اس کتاب میں سابقہ انبیاء کے مخصوص کمالات، حضور پاک ﷺ کی ذات میں جمع ہونے کی بے مثال تفصیلات حکیم الاسلامؒ نے پیش فرمائی ہیں۔

''اسلام کا اخلاقی نظام'' یہ کتاب اسلام کی بے مثال اخلاقی نظام کی ایک جھلک اور مسیحیت کی جانب سے اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کا حکیمانہ جواب ہے۔

''اصول دعوتِ اسلام'' قرآن پاک کی آیت ''اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَ جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ'' کی روشنی میں اسلام کے تبلیغی نظام کی وضاحت نیز دعوت و مدعووین کی اقسام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

''جذبات الم'' اہلیہ محترمہ کی وفات پر دکھ بھرے جذبات سے لبریز ازدواجی زندگی کی کہانی رقم فرمائی۔

''مسلک علمائے دیوبند'' ہی اصل اہل سنت والجماعت اور مسلک اعتدال پر قائم ہے۔

''کلمۂ طیبہ'' (مع رسالہ کلمات طیبات) پہلے رسالہ میں کلمہ طیبہ کا قرآن، حدیث اور اجماع سے ثبوت

اوراس کے دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرے رسالہ میں ذکر اللہ کے دس اسلامی کلمات کے فضائل اور ان کے پڑھنے کا طریقہ مع شجرۂ منظومہ ذکر فرمایا ہے۔

''مسئلہ تقدیر'' یہ کتاب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے مقدمہ کے ساتھ تین محقق علمائے کرام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا محمد طیب صاحبؒ کے مقالات پر مشتمل ہیں۔

''مقالات طیبہ'' اس کتاب میں تین مقالات اور تقریر شامل ہے۔ (۱) اسلام عالمی مذہب ہے (۲) دارالعلوم دیوبند کے اساسی اصول اور جنگ آزادی میں اس کا کردار (۳) دو علمی سوال اور ان کے جواب (۴) تقریر علم وحکمت ''مشاہیر امت'' (نونیۃ الاحاد (عربی) مع ترجمہ وتشریح اردو) اس کتاب میں حکیم الاسلامؒ نے چند مشاہیر کو جو علوم وفنون میں یکتا اور فرد تسلیم کئے گئے ہیں عربی قصیدہ میں منظوم کیا ہے۔ ۶۸/اشعر پر یہ منظومہ مشتمل ہے۔

''علم غیب'' مع رسالہ مسئلہ علم غیب از مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، علم غیب کے مسئلہ پر بے مثل تحقیق۔

''عرفان عارف'' (اردو، فارسی اور عربی کا مجموعہ) مرتبہ حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی مدظلہ، صاحبزادہ حضرت حکیم الاسلامؒ استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند۔

''شرعی پردہ'' اسلام کے نظام عفت وعصمت کا حسین مرقع پردہ کی ضرورت واہمیت کا قرآن وحدیث سے ثبوت اور پردہ پر کئے جانے والے اعتراضات کا شافی جواب۔

درس وتدریس میں ان کا اپنا ایک مقام تھا، بخاری شریف، حجۃ اللہ البالغہ، مشکوٰۃ شریف، ترمذی کئی کتابیں مختلف اوقات میں ان کی زیر درس رہیں، مسند تدریس پر بھی ان کی انفرادیت مسلم ہے۔ ایک کامیاب اور اعلیٰ مدرس کی تمام صفات ان کے اندر موجود تھیں، کتاب کی اہمیت، مصنف کے حالات موضوع کا احاطہ افہام وتفہیم کا خصوصی ملکہ، لغات کی رعایت، حاشیہ ومتن پر غائر نظر، مسائل ومرادات کا کامل استحضار، بیان پر قدرت، طلبہ کی طلب اور درس کے تقاضں کا بھرپور علم تھا ان کی انتظامی مصروفیات نے تدریس کے لئے زیادہ وقت تو انہیں نہیں دیا مگر جتنا وقت بھی انہوں نے اس کام پر لگایا وہ کارآمد، مفید اور نفع بخش وقت رہا، طلبہ نے ان سے خوب خوب استفادہ کیا۔

چاہا بھی اگر ہم نے تیری بزم سے اٹھنا
محسوس ہوا پاؤں میں زنجیر پڑی ہے

شعروادب سے بھی حضرتؒ کا گہرا تعلق تھا، خاص طور پر نعت اور حمد آپ کی محبوب صنفِ سخن تھیں، دیگر اصنافِ سخن پر بھی آپ نے طبع آزمائی کی ان کے تمام تر شعری سرمایہ کی بنیاد اصلاح وتربیت پر ہے۔اکابر کی طرح حمد ونعت کو ہی انہوں نے اپنی فکری پرواز کا محور بنایا، مرشدِ کامل حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے لے کر حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تک اور اس کے بعد اکثر بزرگوں نے حمد ونعت کا سلسلہ جاری رکھا، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی شاعری تو اپنا خاص رنگ اور کیفیت رکھتی ہے اور ان کے یہاں بعض ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو شعروفکری دنیا سے تعلق رکھنے والے نامور افراد کے اشعار کے مقابلے میں بآسانی رکھے جاسکتے ہیں، حکیم الاسلامؒ کی شعری اور فکری صلاحیتوں کا ذکر وقت کی معروف صاحب قلم اور صاحب کمال شخصیت مولانا عبدالماجد دریابادی نے جس وقیع انداز میں کیا ہے اس سے حکیم الاسلامؒ کی پختہ گوئی، برجستگی، سلاست اور روانی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

الحاصل حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دنیاوی دولت کی طرف کبھی توجہ نہیں فرمائی، سفر وحضر میں حضرت کا پورا وقت رضائے الٰہی واخروی تیاریوں یعنی تبلیغ وارشاد اور تالیف وتصنیف وغیرہ ہی میں صرف ہوتا رہا، زبان حال سے گویا یہ صدا تھی ؎

سیم وزر کیا شئے ہے یہ لعل وگہر کیا چیز ہیں
آنکھ بینا ہو تو علم وفن کا سرمایہ بہت

ان کی نورانی، پاکیزہ اور قابل تقلید زندگی کے بہت سے دیگر خوش نما اور حسین عنوانات ہیں جن کو ایک سوانحی مضمون میں سمیٹنا ناممکن ہے۔حکیم الاسلامؒ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ۲۰ر سال ہو رہے ہیں، ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو یہ صاحب علم وفضل انسان، جماعت شیخ الہند کا نورِ نظر، اکابر واسلاف کی نشانی، ہندوستانی مسلمانوں کی دینی اور مذہبی رہنمائی کا ایک نمونۂ کامل، تقریر وخطابت کا نام ورشہ سوار، تحریر وقلم کی باعظمت ہستی عالم فانی سے عالم باقی کی طرف کوچ کرگئی۔

برد اللّٰہ مضجعه و سقی اللّٰہ ثراہ و جعل اللّٰہ مثواہ.

............❖............

حکیم الاسلامؒ حکمت قاسمیہ کی نمائندہ شخصیت
ایک نادر تحریر کے تناظر میں

مولانا محمد شکیب قاسمی
استاذ دارالعلوم وقف دیوبند و ناظم حجۃ الاسلام اکیڈمی

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ دارالعلوم دیوبند ہی کے نہیں ''فکر دیوبند'' کے بھی بانی ہیں اور ''فکرِ دیوبند'' دراصل عبارت ہے حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کی اس علمی عبقریت سے جو اسلامی عقائد و اعمال اور اخلاق و اقدار کی تفہیم و تشریح میں عقل و نقل کا ایک دلنشیں اسلوب اور دلکش فطری منہج اختیار کئے ہوئے ہے۔ تعریف و امتیاز کے لئے آپ اسے ''حکمت قاسمیہ'' کا نام دے سکتے ہیں۔

''حکمت قاسمیہ'' فکر دیوبند کا وہ امتیاز ہے جس کی وجہ سے دیوبندی مکتبہ فکر دیگر مکاتب فکر کے درمیان اپنی ایک خاص پہچان اور علمی دنیا میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اپنے عہد میں ''حکمتِ قاسمیہ'' کے ترجمان اور شارح تھے، انہوں نے جد امجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم و معارف کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، قدرت نے انہیں زبان و بیان اور تحریر کا جو سلیقہ عطا فرمایا تھا اس پر جب ''حکمت قاسمیہ'' شامل ہوگئی تو کتاب و سنت کی تفہیم و تشریح میں وہ حکیمانہ رنگ پیدا ہوگیا جو حجۃ الاسلام، امام غزالیؒ، حجۃ اللہ فی الارض اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے یہاں موجود تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ موثر، جاذب نظر اور عقل و فہم کو اپیل کرنے والا۔ حکیم الاسلامؒ کی تحریر، تقریر، تصنیف، گفتگو، مجلس، مکاتب اور منظوم کلام ہر جگہ حکمت قاسمیہ بولتی ہے اور مخاطب پوری طرح محظوظ ہوتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''حکمت قاسمیہ'' کے اس ترجمانِ عالی شان ہی کی زبان سے سنئے کہ ''حکمت قاسمیہ کے پس منظر اور ان احوال کو سمجھنے کی کوشش

کریں جو حجۃ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے اس منفرد استدلالی اسلوب کے لئے محرک ثابت ہوئے:

''بحر اور بر اور خلاء وفضاء سب ہی مشینوں کی زد میں آگئے پھر ساتھ ہی سائنس نے مادہ کے ہزار ہا سربستہ راز دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دیئے جس سے دنیا مخفی اور پنہاں چیزوں کا مشاہدہ کرنے کی عادی ہوگئی، بالفاظِ دیگر فلسفۂ جدید اور سائنس کے نئے نئے انکشافات سے جن کی بنیاد مشاہدات پر تھی، دنیا عقلی نظریات اور معقولات سے گذر کر محسوسات کی گرفت میں آگئی تو قدرتی طور پر پرانے نظریات میں انقلاب رونما ہوا۔

اس لیے اب وہی عقل پرست طبقہ حس پرستی کا شکار ہوا اور اس دور کی دنیا نظریاتی استدلال سے زیادہ حسیاتی اور مشاہداتی استدلال کی لائنوں پر آگئی، اب اس کے یہاں کوئی شرعی دعویٰ اس وقت تک قابلِ سماعت نہیں رہا جب تک کہ وہ معقولات کے ساتھ محسوس شواہد سے محسوس کر کے نہ پیش کیا جائے اور روحانی معتقدات کی پشت پر مشاہداتی حجتیں نہ ہوں۔

بنا بریں اسی خوگر محسوس طبقہ نے اسلامی حصار پر عقلی نظریات کے بجائے حسی مشاہدات اور طبعیاتی افکار سے حملے کرنے شروع کر دیئے، اس لیے ضرورت تھی کہ اب اسلامی مسائل کو نظریاتی لباس سے ملبوس کرنے سے زیادہ طبعیاتی رنگ کی قمیصوں میں ملبوس کر کے پیش کیا جائے اور طبعیاتی شکوک وشبہات کا جواب انہی طبعیاتی انکشافات کے اصول سے دیا جائے۔'' (۱)

عقلیاتی رنگ میں حقائق کو پیش کرنے کے احوال تھے، محض شرعیاتی نصوص سے استدلال پر اکتفاء وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر رہا تھا، اسی طرح مغیبات کو محسوسات کے پیرائے میں سمجھنے کا مزاج بھی پیدا ہو چکا تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ اس صورت حال کو سامنے رکھ کر ہی تفہیم دین اور عقلی رنگ میں پیش کئے جانے والے اعتراضات کا مسکت جواب دینے کے لئے کوئی موثر اسلوب اختیار کیا جاتا۔ آگے اس کی وضاحت فرماتے ہیں:

''اس صدی کے اوائل میں حق تعالیٰ کی فیاض قدرت نے شمس الاسلام حجۃ اللہ فی الارض حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کو اس دور کے طبعیاتی رنگ کے امراض اور جراثیم کے معالجہ کے لیے بطور طبیب اور مصلح امۃ کے نمایاں فرمایا اور آپ نے اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعہ ان بندگانِ سائنس ومشاہدات کے دماغوں کو انہی کے مسلمات سے جھنجھوڑا اور ان کے دماغوں کا تنقیہ شروع فرمایا۔

حکمتِ قاسمیہ کے تمام اجزاء نے (جو حضرتِ والا کی تصانیف میں موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں) جہاں اسلامی حقائق پر گہری لِمّیاتی اور خالص عقلی دلائل کی روشنی ڈالی وہیں وہ پورے زور اور قوت کے

ساتھ ان حقائق کو آج کے محسوسات اور دور حاضر کے حسی شواہد و نظائر سے بھی مدلل کر کے اس طرح پیش کیا کہ اسلام کے غیبی امور، شریعت کے بنیادی مقاصد اور دینِ فطرت کے مبانی و اصول اس حسّیاتی رنگِ استدلال سے بالکل طبعی اور محسوس و مشاہد نظر آنے لگے، ذات و صفاتِ خداوندی، مبداء و معاد، توحید و رسالت، عقائد و شرائع، برزخ اور قیامت، سزا و جزاء، حشر و نشر، وزن اعمال، میزانِ عمل، جنت و نار، ملائکہ و جنات، عرش و کرسی، لوح و قلم وغیرہ ان عقائد اور ان سے متعلقہ اعمال کا صفاتِ خداوندی سے ربط و علاقہ کلیاتِ دین کے ساتھ فرعیات کا ارتباط پھر شرائع و عقائد کی عقلی اور طبعی مصالح اس طبعیاتی طرزِ استدلال سے کچھ اس طرح واشگاف فرمائے کہ یہ سب امور فطرت اور طبیعت کا مقتضا محسوس ہونے لگ گئے جس سے اور اندازہ ہوتا ہے کہ حضرتِ والا ان حقائق کو محض نظری دلائل کے زور سے جبری طور پر دل میں ٹھوسنا نہیں چاہتے بل کہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ دین کے یہ تمام عقائد و احکام فطرۃ اور طبیعت کا تقاضا ہیں جن کا وجود اسی طرح قابلِ تسلیم ہے جیسے چمکتے ہوئے سورج کا وجود جس سے ایک فہیم انسان جبری انداز سے نہیں بل کہ طبعی تقاضوں سے انھیں ماننے اور تسلیم کرنے کے لیے بطوع و رغبت جھکنے کے لیے تیار ہو جائے، حضرتِ والا کے اس نئے طرز اثبات سے اس پورے دین کا محض دینِ عقلی ہونا ہی نہیں بل کہ دینِ فطرت ہونا نمایاں ہو جاتا ہے جیسا کہ حضرتِ والا کی کتابوں میں ان کی تقریراتِ استدلال سے واضح ہوگا۔'' (۲)

حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ نے شرعی مستدلات کو عقلیات کے رنگ میں پیش کرنے کا جو طریقہ اپنایا وہ اپنے آپ میں اتنا منفرد اور بے نظیر تھا کہ سینکڑوں کتابیں پڑھ جائیے، علوم و فنون کے قدیم و جدید دفاتر کو کنگھال ڈالیے، اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا، ایسی صورت میں اس اسلوب کے ماخذ کے بارے میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ بس آپ کا الہامی اور وجدانی اسلوب تھا، جو اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے آپ کے قلب پر القاء فرمایا تھا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں:

''ساتھ ہی حیرت ناک بات یہ ہے کہ حضرتِ والا کا یہ علم بلا شبہ لدنی ہے درسی یا کتابی نہیں، الہامی اور وجدانی ہے جس کا بظاہر دوسروں کے وجدان کے لیے حجۃ ہونا ضروری نہیں تھا، لیکن آپ کا طرزِ بیان خالص استدلالی اور منطقی ہوتا ہے جو مطیع و منکر دونوں کے لیے یکساں حجت ہو۔'' (۳)

حضرت حکیم الاسلامؒ کے بیان سے معلوم ہوا کہ حجۃ الاسلامؒ کا طرزِ بیان استدلالی اور منطقی ہوتا تھا مگر اپنے رنگ میں اور انداز میں خالص لدنی، وجدانی اور الہامی، شاید یہی وجہ ہے کہ آپ کی تحریرات میں

کتابوں کے حوالوں کا التزام نہیں، اس کی مزید وضاحت فرماتے ہیں کہ:

''حقائق سب کی سب منقول لیکن پیرایۂ بیان بلا حوالہ نقل خالص معقول اور اس کے ساتھ فلسفیانہ اور سائنٹفک گویا عقل وطبع دونوں کو صحیح معنی میں حضرت نے دین کا ایک خدمت گار بنا کر دکھلا دیا ہے کہ فلسفہ اور سائنس کا کان پکڑا اور دین کے جون سے گوشے کی چاہی ان سے خدمت لے لی، جس سے دین کی نسبت سے عقل وطبع دونوں کا موقف بھی خود بخود کھل کر سامنے آجاتا ہے۔'' (۴)

یہاں قدرتی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت نانوتویؒ کا یہ طرز عام ذہنوں کے لئے کچھ پیچیدہ اور مشکل معلوم ہوتا ہے اور بسا اوقات مخصوص اصطلاحات اور نادر علمی تعبیرات کے باعث طرز بیان کی چاشنی اور شگفتگی بھی ایسے احوال میں متاثر ہوجایا کرتی ہے۔ کہیں حجۃ الاسلامؒ کی عبارتوں میں یہ صورت حال تو نہیں؟ حکیم الاسلامؒ اس کی وضاحت فرماتے ہیں:

''اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ مضامین نہایت بلند پایہ، بہت گہرے اور علوم نہایت دقیق اور غامض ہیں لیکن طرزِ بیان نہایت شگفتہ اور سہل ہی نہیں بل کہ سہلِ ممتنع۔ مقدمات کی ترتیبِ طبع کہ اہم سے اہم نتائج گویا خود بخود نکلنے کے لیے ابھر رہے ہیں تقریر استدلالی نہایت مرتب جو ذہن کو اپیل کرتی ہوئی اس کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور ساتھ ہی حضرتِ والا کا شاخ درشاخ بیان مسئلہ کے تمام شقوق وجوانب پر اتنا حاوی اور اس کے تمام گوشوں کا اس درجہ واشگاف کنندہ ہوتا ہے کہ اس سے صرف وہی ایک زیر بحث مسئلہ حل نہیں ہوتا بل کہ اس کے سیکڑوں امثال جو اس کی زد میں آجائیں، خواہ وہ کسی دوسرے ہی باب کے ہوں اس اصولی طرزِ بیان سے حل ہوتے چلے جاتے ہیں بل کہ قلوب پر کتنے ہی علوم ومعارف کے دروازے کھلتے جاتے ہیں جن سے نئے نئے مسائل کا راستہ بھی ہموار ہوتا چلا جاتا ہے، اس صورتِ حال سے آدمی یہ ماننے پر مجبور ہوتا ہے کہ شریعت کے اس جزیہ کی پشت پر عقلی کلیات کی کس قدر کمک موجود ہے اور کتنے کلیئے اور عقلی اصول اس ایک جزیہ میں اپنا عمل کر رہے ہیں جس سے وہ عقلی ہی نہیں طبعی نظر آنے لگتا ہے، بقول حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اولین صدر مدرس دارالعلوم دیو بند کہ:

''حضرتِ والا کے دماغ کی ساخت ہی خلقی طور پر حکیمانہ واقع ہوئی تھی، اس لیے بلا اختیار ان کے دماغ میں حکمت ہی کی باتیں آسکتی تھیں جس سے ان کے یہاں جزوی مسائل کا کلام بھی کلیاتی رنگ اختیار کر کے ایک کلیہ بن جاتا تھا اور اس سے وہی ایک جزیہ نہیں بل کہ اس جیسے سیکڑوں جزیئے حل ہوجاتے تھے اور اوپر سے ان کا وہ کلی اصول کھل جاتا تھا جس سے اس جزیہ کا نشو ونما ہوا ہے''۔

بعض ایسے جزوی مسائل جنھیں فقہاءِ امت خلافِ قیاس امرِ تعبدی کہہ کر گذر گئے ہیں حضرت والا کے یہاں وہ بھی قیاسِ جلی سے پیدا شدہ عقلیاتی ہیں چوں کہ آپ کے نزدیک شریعت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور جزوی سے جزوی مسئلہ بھی غیر قیاسی یا مخالفِ عقل تسلیم نہیں کیا گیا ہے مثلاً قہقہہ کا ناقضِ وضوء ہونا تمام فقہاء کے نزدیک ایک خلافِ قیاس اور بالفاظِ دیگر غیر عقلی ہے اس لیے وہ اس کی کوئی عقلی دلیل نہ پا کر اسے تعبدی کہتے گئے ہیں جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ عقل کے خلاف محض ایک امر شرعی ہے جسے صرف بوجہ ایمان تسلیم کیا جائے گا لیکن حضرت والا نے اسے بھی عقلی قرار دے کر اس پر عقلی دلائل پیش فرمائے ہیں اور بتلایا ہے کہ جس کلیہ سے یہ جزیہ پیدا ہوا ہے جب وہ عقلی ہے تو جزیہ کے غیر معقول ہونے کے کوئی معنیٰ نہیں ہوسکتے۔'' (۵)

حجۃ الاسلامؒ کی ایک اور خصوصیت یہ سامنے آتی ہے کہ وہ نصوص کی طرح اخبار و واقعات سے بھی استنباط فرماتے ہیں اور ان کے نزدیک شرعی واقعات بھی اصولِ عقلیہ سے باہر نہیں ہے۔ یہ اپنے آپ میں ایک حیرت انگیز فکر اور بصیرت کی دلیل ہے جیسا کہ حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں:

''اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت ناک یہ ہے کہ عامۃ قیاس واستنباط کا تعلق احکام سے ہوتا ہے نہ کہ اخبار اور واقعات سے، عقلی طور پر یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ حکم معقول ہے لیکن عقلی استدلال سے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ واقعہ معقول اور عقلی ہے اور اسے عقلاً بھی یوں ہی ہونا چاہیے تھا، لیکن حضرت والا کے یہاں شرعی واقعات بھی اصول عقلیہ سے باہر نہیں ہیں اور آپ کا خداداد علم اور فراست اخبار اور واقعات کی عقلی لمیات میں بھی اسی طرح کام کرتا ہے جس طرح وہ احکام اور اوامر ونواہی کی حقائق بیانی میں کارفرما ہے۔

ظاہر ہے کہ واقعات اور حوادث کو کسی عقلی اصول سے جوڑ کر یہ دعویٰ کرنا کہ یہ واقعہ عقلاً بھی یوں ہی پیش آنا چاہیے تھا جس طرح کہ وہ واقعہ پیش آیا، بلاشبہ علم وفراست اور قلبی ذکاوت کی ایک نادر مثال ہے۔

دنیا میں کعبۂ معظّمہ (بیت اللہ) کا وجود ان کے یہاں محض تکوینی نہیں بل کہ عقلی بھی ہے یعنی بیت اللہ عقلاً بھی اسی محل میں ہونا چاہیے تھا جس میں وہ واقع ہے پھر بیت اللہ کا اول بیت ہونا جو قرآنی دعویٰ ہے ان کے یہاں محض تاریخی نہیں بل کہ عقلی بھی ہے کہ اسے عقلا بھی اول بیت ہی ہونا چاہیے تھا جیسا کہ وہ ہے حتی کہ بیت اللہ کے چالیس سال بعد مسجدِ اقصیٰ بنیاد رکھے جانے کی یہ اربعینی مدت بھی عقلی ہے کہ اقصیٰ تک کی تاسیس عقلاً بھی کعبہ کے چالیس ہی سال بعد ہونی چاہیے تھی۔

اس سے بھی عجیب تر یہ کہ کعبۂ محترمہ اور مسجدِ اقصیٰ کا درمیانی فاصلہ جو تقریباً ڈھائی تین سو میل ہے یہ بھی ان کے اصول پر عقلی ہے محض تاریخی یا جغرافیائی نہیں صرف اس لیے کہ وہ شرعی دعویٰ ہے اور ان کے اصول حکمت

میں شریعت کا کوئی دعویٰ مخالف عقل وقیاس نہیں ہوسکتا چناں چہ قبلہ نما میں اس کی تفاصیل دیکھی جاسکتی ہیں۔‘‘ (۶)

حجۃ الاسلامؒ کے عقلیاتی ومشاہداتی طرزِ استدلال سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ محض سائنسی اور منطقی طرز ہے، جس کی شریعت مطہرہ میں کوئی نظیر نہیں یا اس طرز کے جواب کی سرے سے کوئی دلیل ہی نہیں بلکہ یہ طرز کائنات میں پھیلی ہوئی قدرت کی بے شمار نشانیوں اور آفاق وانفس کی بے شمار آیات بینات میں تدبر اور تفکر اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت وخالقیت پر استدلال ہی کا ایک اچھوتا طرز ہے۔ چنانچہ حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ:

’’قرآن حکیم نے کائنات کے مشاہدات زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، دریا، پہاڑ، جمادات، نباتات اور ہواؤں کی شمالی، جنوبی رفتاروں سے بہت سے غیبی حقائق پر استدلال کیا ہے جو بلاشبہ فطری اور طبعی طرزِ استدلال ہے، حضرت نے ان مکونات کے اندرونی مکونات کی گہرائیاں طبعی انداز میں کھول کران استدلالات کو عقلی سے زیادہ طبعی بنا دیا ہے اس اصول پر کہ یہ خدا کے افعال ہیں اور اس کے افعال سے زیادہ اور کس کے افعال فطری ہوسکتے ہیں، آپ نے بدلائل واضح کیا ہے کہ قرآن کے یہ استدلالی مقدمات کن کن گہری اور فطری حقائق کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں جن سے یہ مسائل ثابت ہورہے ہیں، اس لیے قرآن کے یہ سب مسائل محض عقلی ہی نہیں بل کہ سائنٹفک بھی ہیں، مثلاً قرآن حکیم نے عالم کے جزئیاتی تغیرات سے قیامت کے ثبوت پر استدلال کیا ہے جو اس کا مخصوص شرعی انداز ہے، حضرت نے اسے کھولتے ہوئے کہا ہے کہ جب عالم کے یہ جزئیاتی تغیرات طبعی اور سائنٹفک ہیں جو سائنس کا دعویٰ ہے تو عالم کا کلی تغیر یعنی مجموعۂ عالم کی موت بھی طبعی ہے جسے قیامت کہتے ہیں پس قیامت کو عقلی دلائل سے الگ ثابت کیا ہے جو فلسفہ کا موضوع ہے اور طبعی اور مادی شواہد سے الگ نمایاں کردیا ہے جو سائنس کا موضوع ہے۔

اس طرزِ استدلال سے جہاں تکوین وتشریع کے مسائل طبعی انداز میں ثابت ہوتے ہیں وہیں ان حقائق اور دقائق سے قرآن حکیم کا معجزہ ہونا بھی نمایاں ہوتا ہے کہ خدا ہی کے کلام میں ایسی گہرائیاں ہوسکتی ہیں اور ظاہر ہے کہ اس سے بلاشبہ مؤمن کا قرآن حکیم پر ایمان نہ صرف تازہ بتازہ بل کہ علی وجہ البصیرت ہو جاتا ہے جو مقصودِ اصلی ہے، اور ان عقلی اور طبعی حقائق کے کھولنے سے ہی ممکن ہے۔

اس سے واضح ہے کہ قرآنی حقائق جب اس عقلی اور طبعی انداز سے سامنے آئیں اور جب کہ وہ کسی دور میں بھی خلافِ واقعہ نہیں ثابت ہوں گے اور نہ ہوسکتے ہین تو یہ محض اعجازِ قرآن ہی کی بین دلیل نہ ہوگی بلکہ اس پر لائے ہوئے ایمان کی مضبوطی کی بھی ایک مستقل حجت ہوگی جو حقائق بیانی کا ایک زبردست اور عظیم مفاد ہے کہ ایمان علی وجہ البصیرۃ ہوجائے جو حقیقتاً ایمان کے تحقیقی ہوجانے کی صورت ہے اب اگر یہی

حقائق اغیار کے سامنے آجائیں تو عقلاً کوئی وجہ نہیں رہتی کہ وہ ایمان لانے کی طرف نہ جھکیں البتہ تعصب و عناد دوسری بات ہے جو زیر بحث نہیں ہے۔

بہر حال حکمتِ قاسمیہ میں بیک وقت عقلی اور طبعی دلائل ساتھ ساتھ چلتے ہیں تا کہ ایک طرف اگر دینی مقاصد کا اثبات فطری طور پر عقلی رنگ میں ہو تو دوسری طرف ان کا ثبوت حسی اور مشاہداتی طور پر طبعی رنگ میں بھی ہو اور اس طرح آپ نے دین کے اثبات میں نظریاتی اور حسیاتی دونوں طریقے اختیار فرمائے ہیں، بالفاظِ دیگر مبانئ فلسفہ اور مبادئ سائنس دونوں ہی سے خدمت لی ہے تا کہ ایک طرف تفلسف مزاج لوگوں کے شبہات اور اشکالات فلسفیانہ انداز سے حل ہوں اور دوسری طرف مادہ پرستوں کے سائنسی شکوک وشبہات حسیاتی انداز سے مرتفع ہوں کہ اس کے بغیر اس دور کے مادہ پرستوں اور عقل پرستوں کی اصلاح کا دوسرا راستہ نہیں تھا، اس لیے بے جھجک کہا جا سکتا ہے کہ اس قرن کے یہ عرفاء اور حکماء اور بالخصوص حضرتِ والا اس دور کے مجدد تھے جنھوں نے اپنے اپنے وقت پر اپنے اپنے دائروں میں وقت کے تقاضوں کے مطابق تجدید دین اور اصلاح امت کے فرائض انجام دیئے۔'' (۷)

حجۃ الاسلامؒ کی تحریریں زیادہ تر اردو میں اور اس دور کی اردو میں آج کی بہ نسبت یقیناً فرق ہے، خواہ اس طرح کے زیادہ شگفتہ اور بلیغ نہیں ہوتی تھی یا اس معنی کر کہ ترقی یافتہ اردو کی طرح بامحارہ سلیس نہیں تھی، مگر حکیم الاسلامؒ کے بیان کے مطابق حضرت نانوتویؒ کی تحریروں میں جو اردو استعمال ہوئی ہے وہ انتہائی فصیح و بلیغ اور معیاری ادب کا نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم سبھی حضرت نانوتویؒ کے بیانات اور استدلالات کو نہ صرف سمجھتے تھے بلکہ ان پر دادِ تحسین بھی دیتے تھے، اس سلسلہ میں حکیم الاسلامؒ کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے:

''اس پر بیان کی بلاغت وفصاحت کا یہ عالم ہے کہ آج سے سو برس پہلے کی اردو کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے حضرتِ والا کے حکیمانہ بیانات کی اردو آج سو برس بعد کی اردو سے دور نہیں محسوس ہوتی، محاورات کا فرق جداگانہ چیز ہے جو حسب تقاضائے وقت بدلتے رہتے ہیں لیکن طرزِ ادا اور اسلوب بیان آج کے معیار ادب کے لحاظ سے بھی اونچے درجہ کی فصاحت اور بلاغت سے گرا ہوا نہیں جس سے آج کا ادیب بھی نہیں اکتا سکتا۔

مضمون کی بلندی اور حقائق کی گہرائیوں کی وجہ سے اگر کسی قلیل المناسبت یا کم استعداد کو ان عالی مضامین کے سمجھنے میں دشواری پیش آئے تو وہ بیان حکمت کا قصور نہیں ہے بل کہ ناظر و مستمع کی علمی استعداد کا قصور ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس دور کے مسلم اور غیر مسلم ادباء اور اردو داں حضرات کے سامنے حکمت قاسمیہ کے ادیبانہ اور بلیغ بیانات نفس بیان وتقریر کے لحاظ سے بھی اک مثالی درجہ رکھتے تھے، جس کا اپنوں اور پرایوں بل کہ دشمنوں کو بھی اعتراف تھا۔

چناں چہ مباحثۂ شاہ جہاں پور میں جو عیسائی پادری عیسائیت کے عمومی فروغ کے منصوبے لے کر شریک مباحثہ ہوئے، یا جو ہندو اپنے مذہب کی ترویج عام کے جذبات لے کر مجلسِ بحث میں حاضر تھے انھیں حضرتِ والا کے یہ اعجازی بیانات اور فلسفیانہ اور حکیمانہ تقریرات استدلال سن کر سکوتِ عجز کے ساتھ ان بیانات کی تاثیر و تصرف کا لوہا بھی ماننا پڑا، انقیاد وطاعت جداگانہ بات ہے جو توفیق الٰہی پر موقوف ہے۔

پادری اینک نے کہا جو مباحثہ شاہ جہاں پور میں شریک اجلاس تھے:

''کیا پوچھتے ہو، ہم کو بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا اور بہت سے علماء اسلام سے اتفاق گفتگو ہوا، پر نہ یہ تقریریں سنیں، نہ ایسا عالم دیکھا، ایک دبلا پتلا سا آدمی، میلے سے کپڑے، یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ عالم ہیں، ہم جی میں کہتے تھے کہ یہ کیا بیان کریں گے؟ یہ تو ہم نہیں کہتے کہ وہ حق کہتے تھے (گو اس حق کا جواب دینے اور اپنا مفروضہ حق واضح کرنے سے عاجز بھی رہے جیسا کہ انھیں خود بھی دوسرے مواقع پر اس کا اعتراف کرنا پڑا) پر اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے۔'' (۸)

اسی پادری اینک نے مباحثہ کے آغاز میں علماء اسلام کو پہلو تہی کا طعنہ دیا تھا، لیکن حضرتِ والا کی تقریر سن کر اس طعنہ کے خلاف رطب اللسان تھے۔

مولوی عبدالوہاب صاحب بریلوی نے حضرتِ والا سے عرض کیا کہ یہ پادری (اینک) بعد اختتام مباحثہ ملنے آیا تھا اور حضرت کی تقریروں کی تعریفیں کرتا تھا جیسا کہ میلۂ خداشناسی، ص ۴۰/ پر یہ تفصیل مرقوم ہے۔

ماسٹر جوئل نے (جو شاہ جہاں پور کالج میں مدرس (پروفیسر) تھے کہا:

''مسلمانوں میں ایک ہی عالم دیکھا۔'' (۹)

ایک اور پادری سے سید ظہور الدین صاحب شاہ جہاں پوری نے پوچھا، تم اس دن (یومِ مباحثہ) میں کچھ نہ بولے، انھوں نے کہا کہ:

''ہم کیا کہتے، مولوی صاحب (حضرت نانوتویؒ) نے کوئی بات چھوڑ دی تھی جو ہم بولتے، ہمارے پادری نولس (جو یوم مباحثہ میں پادریوں کے سربراہ اور قائد تھے) ہی کو جواب نہ آیا'' (۱۰)

جانکی داس جوگی نے (جو اس مباحثہ میں شریکِ جلسہ تھا) خود حضرتِ والا سے کہا:

''جب تم نے بولی ماری (تقریر کی) تو ہم نے دیکھا کہ اس کا (پادری نولس کا) اتنا سر یرسوکھ گیا تھا (یعنی روح ہوا ہو گئی تھی)'' (۱۱)

اسی طرح دوسرے ہندوؤں کے مقولے بھی اس کتاب میں اسی قسم کے نقل کیے گئے ہیں، کہا گیا کہ:

''جب میلہ برخاست ہونے لگا اور سب اہلِ اسلام وہاں سے روانہ ہوئے تو میلہ کے ہندو وغیرہ (ان) مناظرانِ اسلام (میں سے حضرتِ والا) کی طرف اشارہ کر کے اوروں کو بتلاتے تھے کہ یہ ہیں یعنی یہ (حضرت والا) ہیں جنھوں نے پادریوں کو عاجز کیا اور شکست دی''۔ (۱۲)

جانکی داس جوگی نے کہا:

''جے ہی مولی (یہی حضرت والا) ہیں جنھوں نے آج سب سے اپنا لوہا منوالیا''۔ (۱۳)

ختم مباحثہ پر حضرت والا نولس کے خیمہ میں خود ملنے تشریف لے گئے اور نصائح فرمائیں، فرمایا کہ دینِ عیسوی سے توبہ کیجئے اور دینِ محمدی اختیار کیجئے دنیا چند روزہ، عذاب آخرت بہت سخت ہے، پادری صاحب نے کہا بے شک اور چپ ہو رہے اور آخر میں پادری نولس نے کہا کہ:

''میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرے حق میں اتنی فکر کیا اور میں آپ کی اس بات کو یاد رکھوں گا''۔ (۱۴)

بہر حال حضرتِ والا کی صداقت کمال لیاقت اور بیان کی بلاغت غیر مسلموں پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتی تھی، حکیمانہ دلائل اور فلسفیانہ براہین جداگانہ چیز ہے، یہی تقریر و بیان کے تأثرات تھے کہ اگر یہ سننے والے غیر مسلم اگر اسلام نہیں بھی قبول کرتے تھے تو معترفِ حق ضرور ہو جاتے تھے اور اس طرح ان پر خدا کی حجت قائم ہو جاتی تھی۔

یہ تو اغیار کا قصہ ہے جو عرض کیا گیا، لیکن خود مسلمان کہلانے والے ایسے فضلاء بھی جن کی آنکھوں کو فلسفۂ جدید اور سائنس نے خیرہ کر دیا تھا وہ بھی جب یہ بیانات سنتے تھے یا آج علماء دیوبند سے ان کی ترجمانی کو سنتے ہیں تو وہ نہ صرف مرعوب ہی ہوتے ہیں بل کہ ان کے خیالات کی دنیا میں انقلاب بپا ہو جاتا ہے اور وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ ان دلائلِ قاہرہ کے بعد عقائد و افکارِ دین کے بارے میں آخر وہ کس طرح اپنے اس طبعیاتی یا سائنسی موقف کو قائم رکھیں؟ اور کیوں کر نہ اعترافِ حق کریں۔'' (۱۵)

اس وضاحت کے بعد حکمت قاسمیہ کی خصوصیت کو خود اپنا تجربہ کی روشنی میں واضح فرماتے ہیں کہ:

''اس حقیر ناکارہ کو خود بھی بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ اس قسم کی جس مجلس میں بھی قابل گریجویٹوں سے خطاب ہوا اور مناسبِ موقع حضرت والا کے علوم کی ترجمانی کی نوبت آئی تو بارہا یہی اعتراف و اقرار کا منظر دیکھنے میں آیا، اس سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ آج کے دور کے انکار والحاد اور دہریت و زندقہ کا قرار واقعی استیصال یا دفاع اگر ممکن ہے تو اسی حکمت قاسمیہ کی علمی روشنی سے ممکن ہے جو آج کے فلسفۂ و سائنس

کے مسلمات اور نئے نئے انکشافات ہی کے اصول سامنے لاکر اسلام کی صداقت کا لوہا منوا سکتی ہے اور جس میں حقیقی طور پر اتمامِ حجت کی شان موجود ہے۔" (۱۶)

آگے نہایت وضاحت کے ساتھ چند ہی سطروں میں حکمت قاسمیہ کی خصوصیات اور امتیازات پر روشنی ڈالتے ہیں:

"یہ حکمت گو اپنی معقولیت اور شیوہ بیانی کے لحاظ سے واضح سلیس اور دلوں میں اتر جانے والی حقیقت ہے اور اس کی تاثیرات وتصرفات گو آفتاب سے زیادہ روشن اور اغیار اور اغیار نما اپنوں تک پر اثر انداز ثابت ہوئی لیکن پھر بھی مضامین کی دقت اور مستفیدین کی استعدادوں کی قلت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہو کچھ علمی حلقے اس سے دہشت زدہ نظر آتے ہیں بل کہ ان بلند پایہ اور گہری حقائق کی نسبت سے بعض قلیل المناسبت علماء بھی اس سے بھاگتے ہوئے محسوس ہوئے لیکن حکمت بہر حال حکمت ہے اور مسائل کی نسبت سے گو دلائل مشکل بھی ہوتے ہیں بالخصوص جب کہ وہ فلسفیانہ اور گہرے حقائق پر مشتمل ہوں لیکن سطح پسند لوگوں کی وحشت سے اہلِ فہم نہ کبھی متاثر ہوئے نہ ہوں گے اور نہ ہی ان کی طلب حکمت کی دوڑ کسی دور میں بھی ختم ہوگی، کلام کی دقت یا رفعت کا تقاضہ اسے حل کرنا ہے نہ کہ اس سے بھاگنا۔

دنیا جانتی ہے کہ اس دقت کے باوجود اس سے کامیاب ہونے والے کامیاب ہوئے اور انھوں نے ہزاروں کو کامیابی کی منزل تک پہونچایا۔" (۱۷)

جیسا کہ ابتدائی سطور میں عرض کیا گیا کہ دیو بندی مکتبۂ فکر کا امتیاز یہی حکمت قاسمیہ ہے، اکابرِ دیو بند نے اسی سے کام لے کر کتاب وسنت کی تفہیم وتشریح کا کام لیا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت حکیم اسلامؒ فرماتے ہیں:

"جماعتِ دار العلوم اور علماء میں ہزاروں ہزار نکلیں گے جنھوں نے اس حکمت سے سبق لیا لیکن خصوصیت سے جن حضرات کو اس حکمت سے خاص مناسبت اور گرویدگی تھی ان میں پہلے طبقہ میں حضرت اقدس مرشدی ومرشد عالم شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کے درسِ حدیث کا طغرائے امتیاز ہی یہ علومِ قاسمیہ تھے، آپ اس حکمت کا ایک نہایت گہرا ظرف اور اس کے اولین ترجمان تھے، انھیں ان علوم ومعارف کے لحاظ سے قاسمِ ثانی کہا جانا ایک واقعی حقیقت ہے، حسبِ روایت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ آپ نے حضرتِ والا کی بعض ادق کتابیں جیسے آبِ حیات وغیرہ حضرت والا سے درساً درساً پڑھی تھیں اس لیے ان بدیہیات قاسمیہ کی جو ترجمانی آپ فرما سکتے تھے وہ اوروں سے ممکن نہ تھی، دوسرے ترجمانِ حکمت اس طبقہ کے ایک فردِ کامل حضرت اقدس مولانا سید احمد حسن امروہی رحمہ اللہ تھے جن کی درسی

اور غیر درسی تقریریں اسی حکمت سے مملو ہوتی تھیں پھر اسی طبقہ میں تیسرے ترجمان میرے والد ماجد فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جنھیں اس حکمت کے مضامین پر اس درجہ عبور حاصل تھا کہ وہ حضرتِ والا کی کتب کے صفحہ اور سطر تک کے حوالہ سے یہ مضامین ارشاد فرمایا کرتے تھے، جلالین شریف، مشکوۃ شریف اور مسلم شریف میں جو آخر میں ان کے درس کی خاص کتابیں تھیں اکثر و بیشتر موقعہ بموقعہ ان علوم کی ترجمانی فرماتے رہتے تھے، راقم الحروف کو جو تھوڑی بہت مناسبت حکمتِ قاسمیہ سے پیدا ہوئی وہ انھیں کے درس کا طفیل ہے جب کہ مشکوٰۃ و مسلم احقر نے انہی سے پڑھی ہیں اور ان میں حضرت مرحوم آیات واحادیث کے مضامین کے اثبات میں اسی حکمت کے اجزاء سے کام لیتے تھے جس کا اثر شرح صدر کی صورت سے سینوں پر پڑتا تھا، ان کے بعد دوسرے طبقہ میں حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ چوتھے ترجمان تھے جنھیں اس حکمت پر پورا عبور حاصل تھا اور انھوں نے یہ علم اول کے دو بزرگوں کے درس سے حاصل کر کے اپنے دل کی گہرائیوں تک پہونچایا اور پھر تصانیفِ قاسمیہ کا گہرا مطالعہ فرمایا، ان کا مقولہ تھا کہ جس کے سننے والوں میں یہ حقیر راقم الحروف بھی شامل ہے کہ اگر میری نظر ان کتابوں پر نہ ہوتی تو نہ معلوم میں اعتزال کے کس گڈھے میں پڑا ہوا ہوتا، حضرت ممدوح کے درسِ حدیث و تفسیر کا طغرائے امتیاز یہی علومِ قاسمیہ تھے جنھیں وہ احادیث کے سلسلہ سے درسی تقریروں، نیز اپنے مواعظ و خطبات میں بیان فرمایا کرتے تھے اور یہی ان کی تقریروں میں جاذبیت کا اِک بنیادی سبب تھا، آپ نے اپنی شرح مسلم فتح الملہم میں بالخصوص کتاب الایمان میں اپنی تقریراتِ استدلال کو انہی علوم سے آراستہ کیا اور ان علوم کو خاص طور پر اس کتاب میں سمویا ہے اور جگہ جگہ حضرتِ والا کے حوالے دیئے ہیں۔

آخر میں حضرت الاستاذ الاکبر حضرت علامہ انور شاہ قدس سرہ سابق صدر المدرسین دار العلوم دیوبند بھی اس حکمت کی طرف متوجہ ہوئے اور ان حقائق کی ترجمانی شروع فرمائی حتی کہ آپ نے طلبہ کی ایک مخصوص جماعت کو خارج اوقات میں شفاء شروع کرائی جس میں یہ ناکارہ بھی شامل تھا، اس میں جگہ جگہ کلامی مسائل کے ضمن میں حضرتِ والا کی تقریریں نقل فرماتے تھے اور انہی کے اصول سے فلاسفہ کا رد بھی کرتے جاتے تھے اسی دوران میں حضرت ممدوح نے ایک کلامی قصیدہ بنام حزب الخاتم فی حدوث العالم بھی موزوں فرمایا جس کے حاشیہ میں جابجا حضرتِ والا کی تصانیف کے حوالوں سے حضرت کے یہ کلامی علوم نقل فرمائے ہیں۔

اس طبقہ ثانی میں خصوصیت سے حضرت علامہ مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے تو حکمتِ ولی اللہی اور حکمتِ قاسمی کو اپنا موضوع زندگی ٹھہرا لیا تھا ان کا نظریہ یہ تھا کہ شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا کما حقہ فہم اور شعور

تصانیفِ قاسمیہ کے مطالعہ کے بغیر میسر ہی نہیں آسکتا اور اسی بناء پر انھوں نے لاہور میں محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کے ذریعہ انھوں نے ان علوم کی اشاعت وترویج میں پوری ہمت صرف فرمادی، مولانا ممدوح نے احقر کی عرضداشت پر دارالعلوم میں اس ناکارہ کو حجۃ اللہ البالغہ بھی پڑھانی شروع کی اور مختلف اوقات میں احقر کے سوالات پر حکمتِ قاسمی اور حکمت ولی اللہی کے اصول وحقائق تشریح کے ساتھ نقل فرماتے تھے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دارالعلوم میں پہونچ کر اپنے اوائل ایام میں حضرت والا کی تصانیف میں سے تقریر دلپذیر کا درس شروع کرایا تھا لیکن سیاسی مشاغل کے غلبہ کے سبب وہ نبھ نہیں سکا اور چند ہی اسباق کے بعد ختم ہوگیا، آج دارالعلوم کے قدیم اساتذہ میں استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ اس حکمت کے امین ہیں جو حکمتِ قاسمیہ پر کافی نظر رکھتے ہیں اور درسِ حدیث میں موقعہ بموقعہ ان علوم کو طلبہ کے ذہنوں تک پہونچاتے رہتے ہیں جس سے دارالعلوم کے علمی حلقہ میں اک حد تک یہ ذوق موجود ہے۔'' (۱۸)

بے شک حکمتِ قاسمیہ ایک تفہیمی اسلوب اور تشریحی منہج ہے، مگر اعتقادیات میں عام اسالیب اور مناہج سے کئی پہلوؤں میں یکسر مختلف ہے اور خالص علمی اور فکری ہے، جس کو سمجھنے اور برتنے کے لئے ایک خاص علمی مذاق مطلوب اور فکری صلاحیت درکار ہے۔ چنانچہ حکیم الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ:

''حاصل یہ ہے کہ حکمتِ قاسمیہ کتنی ہی دقیق سہی مگر آج کے دورِ الحاد کے گہرے شبہات کا علمی حل بھی اس کے سوا دوسرا نہیں اس لیے اس کے دقیق ہونے کا ثمرہ یہ نہیں ہوسکتا کہ ان جواہر ریزوں سے رو گردانی یا بے توجہی برتی جائے ورنہ یہ ذکر کردہ طبقہ جو اس حکمت کا حامل تھا پیدا ہی نہ ہوتا بل کہ یہ ہے کہ ان غامض اور نادر علوم سے آج کے دور کی سطحیت اور سطح پسندی کا علاج کیا جائے جس کی وجہ سے ذہن اس غامض حکمت سے بعید ہوتے چلے جارہے ہیں۔'' (۱۹)

دین کی تفہیم وتشریح کے لئے حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ جیسا حکیمانہ اسلوب اپنانے کی ضرورت کیوں ہے؟ اور کیا یہ کوئی نئی چیز ہے کہ جس کی علمائے متقدمین میں کوئی نظیر نہیں ملتی؟ اس سلسلہ میں حکیم الاسلامؒ وضاحت فرماتے ہیں:

''پس جس طرح علماءِ حق نے نقل وروایت کے میدان میں وضاعین حدیث تلبیس کنندگانِ روایات کی روایتی دسیسہ کاریوں کے پردے چاک کرکے رکھ دیئے تھے اسی طرح اس درایتی میدان میں ان مدعیانِ عقل کی معنوی تحریفات جاہلانہ تاویلات اور دروغ بازیوں کی قلعی بھی کھول کر رکھ دی اور ان ناساز

عقلوں کے وہمیات کو عقل مصفا کی حقیقی روشنی سے شکست دی جس سے ایک طرف اگر یہ تخریبی جماعتیں تھک کر مایوس ہوگئیں تو دوسری طرف عقائد و مسائل کے ان حکیمانہ عقلی دلائل سے ایمان والوں کے ایمانوں کی بصیرت میں ترقی اور اضافہ ہوتا گیا لیکن فتنۂ شبہات کی جڑیں بہر حال قائم ہوچکی تھیں جو قائم رہیں، مختلف فرقوں اور پارٹیوں کی زیر سرپرستی ان فتنوں نے اصلیت کی صورت پیدا کرلی اور یہ مختلف مکاتیب خیال نئے روپ کے مکاتب و مدارس میں مستقلاً زیرِ بحث لائے جانے لگے، اس لیے فلسفہ مزاج پارٹیوں نے یہ سوچ کر کہ اب وہ اہلِ حق کے مقابلہ میں کون سا حربہ استعمال کریں خالص اصولی عقائد کا میدان چھوڑ کر اسلام کے عمومی مسائل میں ان فتنوں کا گدلا پانی پھیلانا شروع کردیا یعنی عام دینی مسائل میں اس عقلی تگ وتاز سے انکار و تشکیک کے فتنہ کا آغاز ہوگیا تاکہ اہلِ حق کو نفسِ دین ہی سے بدظن بنا دیا جائے اور وہ بالآخر ان ہی نوخیز پارٹیوں کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوجائیں تو اربابِ حکمت و معرفت اور مفکر قسم کے اربابِ فضل و کمال آگے آئے اور انھوں نے اسلام کے تمام امہات مسائل پر حکیمانہ اسلوب اور عاقلانہ انداز سے کلام کیا، عام اسلامی مسائل کے اسرار و نکات پر عقلی دلائل سے بحث کی اور مسائل کی حقیقت کھول کر فلسفہ کا تار و پود بکھیر دیا، امام رازیؒ، امام غزالیؒ، امام خطابیؒ، ملک العلماء شیخ عزالدین ابن عبدالسلامؒ اور ابن عربیؒ جیسے عرفاء اور دانشورانِ حکمتِ دین کھڑے ہوئے اور انھوں نے دین کی حقائق و مصالح کو عقلی براہین سے پیش کر کے نہ صرف دین کی حدود ہی کو مضبوط کیا اور نہ صرف دین کے ہزار ہا مخفی اسرار اور مستور گوشے ہی اپنی دوربین عقلوں سے کھول کر دنیا کے سامنے رکھ دیئے بل کہ عقلی مباحث کے لیے مستقل بنیادیں ہموار کردیں، امام رازیؒ نے اپنی مستقل تفسیر کا موضوع ہی تفسیر بالدرایۃ اور تفسیر بالمعقول رکھا اور قرآنی آیات کے عقلی پہلوؤں کو واشگاف کرنا قرار دیا، امام غزالیؒ نے تہافت الفلاسفہ لکھ کر اصولی طور پر سرے سے فلسفہ ہی کی بنیادوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا جس سے شک اندازوں کے گروہ پر کاری ضرب پڑی اور اسے سوچ پیدا ہوئی کہ وہ اب اہل حق کے مقابلہ میں کون سا حربہ اختیار کرے، انھیں حیرانی تھی کہ امہات عقائد، مہمات مسائل آیاتِ قرآن اور روایاتِ حدیث کے تمام دائروں میں تو عقل معاد عقل معاش کو شکستِ فاش دے چکی ہے تو آخر اب ان مایوسانِ عقلِ و دین کے بقاء کی کیا تدبیر ہے؟

اس لیے آخر کار انھوں نے امہات مسائل کا میدان چھوڑ کر فروعی مسائل میں اپنے وہم و شک کا گدلا پانی بہانا شروع کردیا جس سے مسائل فقہیہ میں انکار و تشکیک کے لیے فتنہ کا آغاز ہوگیا، مسائل فرعیہ کی غیر معقولیت، انفرادی استبداد یا ائمہ تفقہ کے فروعی اختلافات کے تخریب دین دکھلانے کے اتہامات سے اسلامی

فقہ کے بے اعتبار بنانے کی مہم شروع کر دی تا کہ اہلِ حق اگر اصول سے نہیں ہٹے تو کم از کم اس حیلہ سے عملی فروعات ہی پر سے ہٹ جائیں حتی کہ فقہی مسالک کے اختلافات کو بصورتِ نزاعات اجاگر کر کے جدال و قتال کے فتنے کھڑے کیئے تا کہ امت کمزور پڑ جائے اور اہل حق مغلوب ہو جائیں، بنیاد وہی ایک تھی کہ انھوں نے عقل کو نقل پر حاکم مان کر مسائل کا فیصلہ اپنی جزوی عقلوں کے تحت رکھا تا کہ اگر اصول کو مضمحل کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہوئے تو کم از کم فروعات فقہیہ ہی کو نا قابلِ التفات بنا دیں تا کہ اہلِ حق پر یہ الزام عائد کیا جا سکے کہ وہ خلاف عقل اور خلافِ قیاس راہوں پر چل رہے ہیں اور ان کا پورا دین معاذ اللہ غیر معقول اور نا قابلِ قبول ہے لیکن انھیں اس کا پتہ نہیں تھا کہ اس پورے دین فطرت میں عقلِ کلی بطور روح کے دوڑی ہوئی ہے اور جیسے وہ بے ریب طریقہ پر نقلِ صحیح کے ساتھ دنیا میں آیا ہے ایسے ہی عقلِ سلیم کی روشنی بھی ساتھ لے کر آیا ہے اور اس میں فہم و بصیرت اور عقل و فراست کے ایسے جوہر فرد موجود رہتے آرہے ہیں جو اس دین کی معقولیت سے نمائشی عقلوں اور فرضی دینوں کی قلعی کھول سکتے ہیں چناں چہ فقہی مسائل پر زد پڑتے دیکھ کر اربابِ فقہ آگے بڑھے اور انھوں نے فقہی فروعات اور استنباطی مسائل میں جہاں نقول کے مآخذ پیش کیے وہیں عقلی دلائل کو بھی ان کے دوش بدوش لا کر کھڑا کر دیا، ہدایہ اور بدائع الصنائع جیسی لطیف کتابیں معرض وجود میں آئیں جن میں ہر ہر فقہی مسئلہ کے لیے دلائل نقلیہ کے ساتھ دلائلِ عقلیہ کا عظیم ذخیرہ بھی فراہم کر دیا گیا جس سے فقہی فروعات اور استنباطی مسائل میں بھی نصوصِ فقہیہ کے ساتھ عقلی براہین کی تدوین کا آغاز ہو گیا اور بابِ دین میں علی الاطلاق نقول کے ساتھ عقلی استدلال کی راہیں ہموار ہو گئیں حتی کی رفتہ رفتہ دین میں عقلی مصالح اور اسرار دین نے ایک مستقل موضوع کی شکل اختیار کر لی، جس سے معاندین دین اور فرقِ باطلہ کا یہ خیال کلیۃً غلط ثابت ہو گیا کہ دین عقلی مصالح سے خالی یا عقلی استدلال سے عاری ہے، ساتھ ہی وہ اس سے بھی مایوس ہو گئے کہ محض اپنی عقلی وسوسہ اندازیوں سے وہ بابصیرت ایمان داروں کے ایمانوں پر کوئی ڈاکہ ڈال سکیں گے جس سے وہ تردد میں پڑ کر اپنے ایمانی موقف سے ہٹ جائیں لیکن یہ تمام عقلی براہین ابھی تک اپنے اپنے مسائل کے ضمن میں منتشر تھے اور جس فن کا جو مسئلہ بھی مدعیانِ عقل کے یہاں ہدف بنا اسی فن میں اربابِ فن نے اس مسئلہ کو دلائلِ عقلیہ کے ساتھ ثابت کرتے ہوئے مخالف اتہامات کو رد کر دیا جس سے یہ معقول دلائل مختلف فنون میں بذیل مسائل بکھرے ہوئے تھے اور اپنے اپنے متعلقہ مسائل کے سلسلہ سے مختلف فنون میں جمع ہوتے رہے خود ان کا اپنا کوئی مستقل فن نہ تھا کہ اس میں اپنے اصول وقواعد کے ساتھ مرتب طریق پر جمع ہوں اور ایک منظّم فن کی صورت اختیار کر کے انضباط کے ساتھ مدافعت یا حملہ کر سکیں، جس

کی وجہ یہ تھی کہ وسوسہ اندازوں نے بھی وسوسہ اندازی کو کسی مستقل فن کی حیثیت نہیں دی تھی وہ صرف اپنے مزعومات کے ضمن میں اپنے مفہوم کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اہلِ حق کے مفہوم کو غیر معقول ثابت کرنے ہی پر اپنی ہمت صرف کرتے رہے جو مختلف فنون میں بذیل مسائل جمع ہوتے رہے اور انھوں نے اسرارِ دین یا حکمتِ اسلام کو کسی مستقل فن کی صورت میں لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی، اس لیے اسرارِ دین موضوعِ دین تو بن گیا مگر فن نہیں بنا۔'' (۲۰)

مزید وضاحت فرماتے ہیں:

''آخر کار متأخر طبقہ میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ کا ظہور ہوا جب کہ یورپ اپنے الحادی ہتھکنڈوں کے ساتھ ابھرنے کے مقام پر آ رہا تھا، ہندوستان کے لیل ونہار بدل رہے تھے، دینی لائنوں میں خود رائی اور عقل پرستی کی گھٹائیں دلوں پر چھا رہی تھیں اور وقت آ رہا تھا کہ یہ سیاہ بادل برس پڑیں اور دنیا کو سیلِ الحاد و دہریت میں بہا لے جائیں تو آپ نے اپنی فراستِ باطنی سے ان مقدمات کو سامنے رکھ کر آخری نتیجہ سمجھ لیا اور دیکھا کہ فلسفیت کی داغ بیل پڑ چکی ہے نہ صرف یہی کہ اس ملک کی دنیا دین کی استدلال لائنوں میں نقلی دلائل پر قناعت کرنے کے لیے تیار نہیں بل کہ اسلام پر شکوک وشبہات کا وار کرنے کے لیے یہ عقلی سفسطے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں جن کے آثار کم وبیش نمایاں بھی ہو چکے ہیں اس لیے انھوں نے اپنے قلب صافی کی مخفی آواز بلند کرتے ہوئے فرمایا کہ:

و ان الشريعة المصطفوية اشرقت فی هذا الزمان علی ان تبرز فی قمص سابغة من البرهان. (۲۱)

اور شریعت مصطفوی اس زمانہ میں اس پر ابھر رہی ہے کہ وہ (عقلی) حجت وبرہان کی مکمل اور مطابق بدن قمیصوں میں نمایاں ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مسلمانوں میں ایک طبقہ معتزلہ کا خلف رشید بن کر سامنے آ رہا ہے جو وحی پر عقل کی حکمرانی کا قائل ہے اور نصوص شرعیہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر ماننے کے لیے تیار نہیں اور نہ ان پر ایمان لانا ہی ضروری سمجھتا ہے بالخصوص دین کے ان غیبی حقائق پر جو عقول سے بالاتر اور مشاہدہ سے ماورا بھی ہیں اس لیے آپ نے اس فتنہ کے دفعیہ اور استیصال کے طریقوں پر غور کرتے ہوئے فرمایا:

ولا سبيل الی دفع هذه المفسدة إلا بان تبين المصالح و تؤسس لها القواعد كما فعل نحو من ذلک فی مخاصمات لليهود و النصاریٰ والدهرية و أمثا لهم (۲۲)

اور (اب) اس مفسدہ کے دفعیہ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ دین کے (عقائد واعمال) کی (عقلی) مصلحتیں بیان کی جائیں اور ان کے لیے (بطور فن کے) قواعد وضع کیے جائیں جیسا کہ یہود و نصاریٰ دہریت اور ان جیسے دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں ایسا ہی کچھ کیا جا چکا ہے۔

اس لیے آپ نے دین کے سلسلہ میں عقلی دلائل و براہین کو ایک فن کی صورت سے مدون فرمایا، اس کے اصول و مقاصد وضع فرمائے اور اسے فن کی صورت دیتے ہوئے اس فن میں جلیل القدر کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' تصنیف فرمائی جس میں ابواب وفصول کے تحت فن اسرار کے قواعد وضوابط اور اصول وقوانین وضع فرما کر ہر باب میں اس کے مناسب عقلی دلائل و براہین کا ایک عظیم ذخیرہ مہیا فرمایا۔

اس مقدس کتاب نے حقیقت یہ ہے کہ بندگانِ عقل کی کمر توڑ دی اور ان کے لیے بندگانِ عقل بننے کے بجائے بندگانِ خدا بننے کا راستہ ایسے مؤثر انداز سے کھول دیا کہ یا وہ اس پر چلیں یا سکوتِ عجز کے ساتھ اپنے غم وغصہ کو دبائے بیٹھے رہیں اور ختم ہو جائیں، آپ نے فنی طور پر ابواب دین میں عقل ونقل کا صحیح مقام واضح فرماتے ہوئے ان دونوں کی باہمی نسبت اور حقیقی توازن کی صورت واضح فرمائی، آپ نے عقل سے کسی عقیدہ کا استفادہ کرنے کے بجائے اسے عقائد واحکام شرعیہ کے لیے مؤید مثبت اور دشمنانِ حق پر الزام قائم کرنے کا ایک وسیلہ قرار دیا جس سے نقل کی عظمت وحکومت اور عقل کی اس کے حق میں خدمت گاری پوری طرح واشگاف ہوگئی، انھوں نے مدعیان عقل کو یہ تاثر دیا کہ جو چیز ان کے یہاں خدائی کا درجہ رکھتی ہے یعنی عقل وہ ان کے یہاں بحق دین محض ایک خدمت گار اور چاکر کی حیثیت رکھتی ہے اور پھر اس کے تحت مسائل میں اس کے نمونے ظاہر فرمائے جس سے بہت سی جزوی عقلوں کو ندامت کے ساتھ پیچھے ہٹنا پڑا لیکن اس کے بعد تیرہویں صدی میں جب کہ یورپین قومیں ہندوستان میں برسرِ اقتدار آ گئیں اور اپنی ساتھ فلسفۂ جدید اور سائنس کی ترقیات لے کر نمایاں ہوئیں، مشینی دور کا آغاز ہوا، مشینری نے دنیا کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا، کھانا پینا، دینا، لینا، لباس اور وسائل معاش، سفر اور حضر، سواری اور مراکب، تجارت و زراعت صنعت وحرفت، جنگ وصلح حتی کہ مکانوں کی ہوا اور پانی، دوا اور غذا، آوازوں کا سننا اور سنانا، تقریر اور خطابت، غرض ساری زندگی اور وسائل زندگی مشینی لائنوں پر رواں دواں ہونے لگی، تار اور فون پر خبریں دوڑنے لگیں، ریل، موٹر اور اسٹیمر میں بحر وبر کی مسافتیں طے ہونے لگیں، وسائل حیات فیکٹریوں اور ملوں میں ڈھلنے لگے، دور دراز کے انسان ٹیلی ویژن کے برقی پردوں پر نمایاں نظر آنے لگے، ہزار ہا میل کی مسافت کے باوجود ایک ملک دوسرے ملک کے آمنے سامنے آ کھڑا ہوا۔'' (۲۳)

حکمت قاسمیہ کے عنوان سے اپنی گراں قدر تحریر کے آخر میں فرزندانِ دیوبند کو حکمتِ قاسمیہ کے

عصری اسلوب میں ڈھالنے اوراس کی ترویج واشاعت کی جانب توجہ مبذول فرماتے ہوئے اپنی پوری گفتگو کا خلاصہ کچھ اس طرح فرماتے ہیں:

''آج اس کی ضرورت ہے کہ اس حکمت کو نہ صرف یہ کہ اچھے اسلوب سے مرتب اور منضبط کر کے محفوظ ہی کر دیا جائے بل کہ ضروری حد تک تشریح وتوضیح اور امکانی حد تک تسہیل وتیسیر سے اسے دنیا کے ذہنوں سے قریب کرنے کی بھی سعی کی جائے تا کہ یہ دقت وغموض وغیرہ کے عذراتِ باردہ لوگوں کے لیے اس سے ترکِ استفادہ کا حیلہ نہ بن سکیں، پھر بھی اگر کوئی اس فطری دین دین سے اپنا یا دوسروں کا علاج نہ چاہے تو یہ اس کی قسمت کی بات ہوگی، قاسمی حکمت کی بات نہ ہوگی۔'' (۲۴)

ضرورت ہے کہ اربابِ علم وفضل اور بالخصوص فرزندانِ دارالعلوم دیوبندان جواہر ریزوں سے خود بھی فائدہ اٹھائیں اور اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر میں ان نادر علوم کی اشاعت کریں کہ اس دور کے فلسفیانہ الحاد کا زہر اسی تریاق سے دفع ہوسکتا ہے۔

اس لیے ان علوم کی اشاعت نہ صرف ان کے لیے نافع ہی ہے بل کہ بتقاضائے وقت ان کا فریضہ بھی ہے کیوں کہ دارالعلوم دیوبند محض ایک درسگاہ ہی نہیں بل کہ ایک مستقل مکتبِ فکر بھی ہے اور وہ فکر یہی ہے جو ان سفینوں اور ساتھ ہی مستفیض سینوں میں متوارث طریق پر منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔'' (۲۵)

حکیم الاسلامؒ نے حکمت قاسمیہ کی عصری اسلوب میں ترویج اور ان کے نادر علوم کی اشاعت کو طبقۂ دیوبند کا فریضہ قرار دیا ہے۔ دارالعلوم وقف دیوبند (جو عصرِ حاضر میں عالمی سطح پر حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم وافکار کا امین اور حکیم الاسلامؒ کے خوابوں کی تعبیر ہے) نے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے سالِ رواں حجۃ الاسلام اکیڈمی قائم کر کے حضرت نانوتویؒ کے علوم وافکار کی جدید اسلوب میں ترویج وتحقیق کا کام شروع کر دیا۔

چنانچہ حکیم الاسلامؒ کی یہ مفصل سوانح ''حیاتِ طیب'' کی اشاعت بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس پیش رفت سے حکمتِ قاسمیہ کے بہت سے گوشے خود حضرت حکیم الاسلامؒ کے حالاتِ زندگی اور علوم و کمالات سے الم نشرح ہوں گے۔

حکمتِ قاسمیہ کیا ہے؟ اس کا تعارف وتعریف اور دلنشیں تشریح حکیم الاسلامؒ کی اس معرکۃ الآراء تحریر کی روشنی میں آپ کے سامنے آئی، جس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکیم الاسلامؒ کو اپنے جد امجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم وافکار سے کیسی مناسبت اور حکمتِ قاسمیہ میں کتنی مہارت عطا کی تھی، آپ کی تحریرات، تصنیفات، خطبات میں نہ صرف اس کی مثالیں ملتی ہیں بلکہ سطر سطر سے

حکمتِ قاسمیہ مترشح ہوتی ہے اور پھر اتنے سہل اور سادہ انداز میں کہ بڑے سے بڑے علمی نکتہ کو ایک واجبی صلاحیت رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے اور اس پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

شعر میرے ہیں سب خواص پسند پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

واللّٰہ الموفق و علیہ التکلان وھو نعم المولٰی و نعم النصیر

....

(۱) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، حکمت قاسمیہ، ص:۱۷
(۲) ایضاً، ص:۱۸
(۳) ایضاً، ص:۲۰
(۴) ایضاً
(۵) ایضاً، ص:۲۱
(۶) ایضاً، ص:۲۳
(۷) ایضاً، ص:۲۳ تا ۲۵
(۸) امام محمد قاسم النانوتویؒ، میلۂ خداشناسی، ص:۴۰
(۹) ایضاً
(۱۰) ایضاً
(۱۱) ایضاً، ص:۳۹
(۱۲) ایضاً
(۱۳) ایضاً
(۱۴) ایضاً ۳۸ تا ۳۹
(۱۵) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، حکمت قاسمیہ، ص:۲۸
(۱۶) ایضاً، ص:۲۹
(۱۷) ایضاً
(۱۸) ایضاً، ص:۳۰ تا ۳۳
(۱۹) ایضاً، ص:۳۳
(۲۰) ایضاً، ص:۱۱ تا ۱۴
(۲۱) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حجۃ اللہ البالغہ، ص:۳۰
(۲۲) ایضاً، ص:۷
(۲۳) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، حکمت قاسمیہ، ص:۱۵
(۲۴) ایضاً، ص:۲۷

............❖............

مقامات مقدسہ کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر عبید اقبال عاصم
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تقدس کے دلائل کی بنیاد پر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی پیغمبرانہ علوان کی مناسبت سے ہر سہ مقامات مقدسہ سے ان کے تعلق پر رکھی گئی ہے مثلاً آیت **ان اتبع ملة ابراهيم حنيفا** پیش کرنے کے بعد اس سے مصنف مرحوم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ''اس ملت میں عالمیت اور ہمہ گیری کی شان ابتداء ہی سے ودیعت کی گئی تھی جو دنیا کے سارے انسانوں اور ساری قوموں کے لئے پیغام تھی۔ اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمانِ خداوندی میں امام الناس فرمایا گیا کہ ''**انی جاعلک للناس اماما**'' چنانچہ آپ کو عرب وعجم کی تمام اقوام اور تمام ملکوں کا امام مقرر فرما دیا گیا تاکہ دنیا اس ملت میں آپ کی مقتدی بنے اور زندگی کے عام گوشے انہیں کے اقتدار میں حرکت کرے گا۔(۱)

سورۂ تین میں مقاماتِ مقدسہ کی قسم کھانے کی وجوہات دنیا کی تین بڑی قومیں اور تینوں کے مراتب کو تفصیلی طور پر ذکر کرنے کے بعد مختلف آیات اُن کی مستند تفاسیر، احادیثِ صحیحہ اور کتبِ تواریخ سے استدلال کرتے ہوئے ان مقامات مقدسہ کے ماحول اور اس ماحول سے مرتب ہونے والے اثرات کا خلاصہ صاحبِ کتاب نے اس طرح کیا ہے۔

''خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے تین مقامات مقدسہ مکہ، قدس اور طورِ سینا کی قسم کھا کر ان کی آثارِ تقدیس نمایاں کر دئے۔ مکہ کا قریبی ماحول حرم محترم، قدس کا دروازہ اور طورِ سینا کی قسم کھا کر ان کی آثارِ تقدیس بیان کی۔ پھر ان کے تقدس کے تین قریب و بعید ماحول کی نشان دہی کی جس سے ان میں خطہ اور طور کا صحرائے سینا ہیں۔ پھر ان کے ماحول بعید کو واضح کیا کہ وہ حجاز، شام اور مصر ہیں جن میں ان کے مقدس آثار پھیلے اور

دنیا کے لئے ان میں مرکزیت کی شان پیدا ہوئی۔

حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمہ نے ماحول کی کیفیت سے پیدا شدہ اثرات کو انسانی سعی و عمل پر منطبق کرنے کے بعد سعی و عمل کے دو پیرایوں کی تفصیل خوب صورت پیرائے میں فرمائی ہے۔

پھر روحانیت کا سرچشمہ نبوت جس سے دین کا وجود ہوتا ہے اور مادیت کا سرچشمہ سلطنت واقتدار اور جس سے ملک اور تمدن قائم ہوتا ہے کو قرار دیتے ہوئے بنی اسرائیل کو حاصل شدہ ان دونوں نعمتوں کو قرآنی آیت ”**واذ قال موسیٰ لقومہٖ یقوم اذکروا نعمۃ اللّٰہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء**“ (الیٰ آخرہٖ) سے مستدل کیا ہے۔

اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان دونوں کی قرآنی اصطلاحات ”نعمتِ ملک“ کو ”تمکین فی الارض“ یعنی زمینی حکومت کا استحکام کے اصطلاحی کتب ”استخلاف فی الارض“ اور ”نعمت دین“ کو ”تمکین فی الارض“ دلوں میں دین کے جڑ پکڑ جانے کے اصطلاحی لقب ”استقامت فی القلب“ کی تعبیرات سے مزین کر کے ان کے قرآنی آیات سورۂ حج آیت ۴۱، سورۂ نور آیت نمبر ۵۵، سورۂ حٰم السجدہ، آیت نمبر ۳۰ اور سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۵، کے جزو ”**واستقم کما امرت**“، جیسی آیات سے مدلّل کرتے ہوئے یہ نتیجہ فراہم کیا ہے کہ:

”ان آیات سے صاف واضح ہے کہ بنی آدم کے لئے بنیادی طور پر نعمتیں دو ہی ہیں ”تمکین فی الارض“ یعنی زمین کی سلطنت اور ”تمکین فی الدین“ یعنی روحانی عظمت، قلوب کی دینی استقامت اور دلوں میں ایمان اور روحانیت کا رسوخ واستحکام، جس کا حاصل اصطلاحی الفاظ میں وہی استخلاف اور استقامت نکل آتا ہے۔(۲)

اس کے بعد آپ نے امت مسلمہ پر یہ عظیم انعام کی خبر کے لئے آخری وحی ”**الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی**“ سے استشہاد کر کے جو نکتہ پیش کیا ہے وہ بہرطور قابل داد ہے۔ فرماتے ہیں کہ ”اس آیت کریمہ میں دین کو کامل کر دینے اور نعمت کو تام کر دینے کی اطلاع دی گئی ہے۔ غور کیا جائے تو یہ وہی دین اور ملک کی دو نعمتوں کی تکمیل ہے اور ساتھ ہی مسلمانوں کو ان دونوں تکمیل شدہ نعمتوں کے عطا کر دیئے جانے کی اطلاع ہے کیوں کہ ”اکمالِ دین“ کے کلمہ سے تو نعمتِ دین کی تکمیل کھلے طور پر نمایاں کی گئی ہے اور ”اتمامِ نعمت“ کے کلمہ سے خصوصیت کے ساتھ تکمیل ملک کی نعمت کی طرف واضح اشارہ فرما دیا گیا ہے۔(۲)

علاوہ ازیں اس موضوع کے اہم نکات میں بنی اسرائیل اور اہل اسلام، عالم دنیا کے تین بنیادی عناصر، ان عناصر کے تین مراکز، ان تینوں مقامات کی تقدیس کی تاریخی حیثیت، تینوں مقامات کی ظاہری و باطنی

برکات، وضعِ کعبہ، وضعِ اقصیٰ و وضعِ طور وغیرہ کی بحیثیت ہیں جن کے بنیادی دلائل قرآن وحدیث اور تاریخی طور پر مستند اہم کتب سے فراہم کئے گئے ہیں۔

دوسرا موضوع ان مقاماتِ مقدسہ کے مظاہر اور ظواہر نیز ان کی صلاحیت کے مراحل پر مشتمل ہے۔ اس کے ضمن میں ''مقاماتِ مقدسہ پر اصولِ فطرت کا نفاذ، مختلف آبی وارضی مشکلوں صورتِ کعبہ کو بیان کرتے ہوئے کعبۂ مقدسہ کی آبی شکل اس طرح ذکر فرمائی ہے۔

''سب سے اول اس کا ظہور اس اتھاہ سمند میں ہوا ہے جس کے اوپر عرشِ عظیم قائم ہے چنانچہ آثارِ صحابہ سے یہ عقدہ حل ہوکر سامنے آتا ہے کہ کعبۂ مقدسہ کو بصورتِ جہت اولاً اس پانی میں نمایاں کیا گیا جس کی موجیں بنص حدیث نبوی ﷺ آسمان وزمین کے برابر تھیں۔

فرماتے ہیں کہ:

''قدرتی بات ہے کہ پانی کی گہری جگہوں میں پانی بشدت ٹکراتا ہے جس کی ٹکروں سے موجیں اونچی اٹھتی ہیں اور پانی میں ابھار پیدا ہوتا ہے تو موضع بیت اللہ بھی اس گہرائی کی صورت سے نکل کر ابھار اور اونچائی کی شکل میں نمودار ہوا جو جھاگ کی صورت تھی اور اس اونچائی نے ایک قبہ کی سی صورت اختیار کرلی۔ چنانچہ ابن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں: **هو اول بيت ظهر على الماء عند خلق النهار والارض خلقة قبل الارض بالفی عام و كان زبدة بيضاء فخلت الارض من تحته.**

یہ پہلا (عبادت کا) گھر ہوا جب کہ زمین وآسمان پیدا ہونے والے تھے اسے اللہ نے زمین بنانے سے دو ہزار سال پہلے ظاہر فرمایا اور وہ پانی پر سفید مسکہ مکھن کی طرح جھاگ کی صورت سے ظاہر ہوا اور اس کے نیچے سے زمین بننی شروع ہوگئی۔

اس دعوے کی مزید پختگی نیز کعبہ کی آبی شکل کے ارضی شکل میں بدل جانے کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ: ''جب زمین بننے کا وقت آیا تو پانی کے اس جھاگ سے ابھرے ہوئے قبہ نما حصہ پر جو مقام بیت اللہ تھا، شدید ہوا چھوڑی گئی جس سے اس حصۂ آب میں پانی کی موجیں اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ ٹکرائیں اور پانی کے اس تصادم سے اور اس کے ٹکراؤ سے یہ جھاگ اور سخت ہوتے گئے۔ ان میں گاڑھا پن بڑھتا گیا اور انہوں نے پتھریلا پن اختیار کرلیا جیسا کہ عادتاً پانی کے ٹکراؤ سے سمندر میں جھاگ اٹھ اٹھ کر اور جم جم کر پتھریلی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ اس طرح پانی کے اس حصۂ خاص میں انجماد پیدا ہوا اور زمین کی چھوٹی سی سطح نمودار ہوئی جس سے زمین بننے کا آغاز ہوا۔

مصنف علیہ الرحمہ نے خلقت کعبہ کو زمین کی ابتدائی شکل نیز اس کی خلقت کو آسمانوں سے مقدم قرار دیتے ہوئے قرآنی دلائل سے ثابت کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ''غرض کعبۂ مقدسہ کی فضا کی وضع کا جو غیر جسمانی اور نادیدہ تھی اولاً پانی پر ظہور ہوا جو مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا پھر زمینی ظہور ہوا اور اس کے بھی مختلف اطوار ہو کے بہر حال پانی کا یہ انجماد بالشت بھر سے بڑھتے بڑھتے اولاً اس لمبائی چوڑائی تک آج جو بیت اللہ کا عمارتی رقبہ ہے پھر رفتہ رفتہ پوری زمین کے رقبہ تک پہنچ کر ختم ہو گیا اور کرۂ زمیں پر ایسی صورت سے نمایاں ہو گیا جس کی اصل کعبہ مقدسہ نکلی جس سے زمین کی خلقت کا آغاز ہوا اور کعبہ وسطِ زمین رہا۔''

اس کے بعد آپ نے کعبہ کے علمی، حسی، آبی، سطحی، اساسی، حجری، تحدیدی، علاقی، ارضی و تعمیری وجود کو قرآن و حدیث سے ثابت کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ نے ظہورِ اقصیٰ و ظہورِ طور کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے اس پر بھی قرآن و احادیث مبارکہ سے دلائل فراہم کئے ہیں۔

تیسرے موضوع میں تینوں مقامات کی حقیقت میں تجلی کے فلسفیانہ نکات پیش کئے گئے ہیں۔ اس ضمن میں تجلی کا مفہوم اس طرح پیش کیا ہے جس میں حقیقت کعبہ کے ادراک کے ساتھ ساتھ وحدت و اسلامی اتحاد کا منشاء بھی پورا ہو جاتا ہے اور مقصدِ عبادت بھی واضح ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''عبادت کا مقصد قربِ معبود اور آخر کار دیدارِ معبود ہے پھر اسی کے ساتھ اس مرکز عبادت (کعبۂ مقدسہ) سے سارے مراکز عبادت کو جوڑ کر اور سب کا رخ اسی طرف کر کے انسانوں میں وحدت و اتحاد پیدا کرنا بھی مقصود ہے کہ سب کا رخ اجتماعی طور پر اسی کعبۂ پاک کی طرف رہے کہ اس کے بغیر انسانوں میں یک جہتی، یک رخی، عالمی اتحاد اور عالمی امن وسکون کا قائم ہونا بھی ممکن نہ تھا۔ جیسے آج کل کی اصطلاح میں بقاءِ باہم کا عنوان دیا گیا ہے۔ شریعت نے اسی کا شرعی نام ''استقبالِ قبلہ'' رکھا ہے۔

تجلی کی دلچسپ تفصیلی بحث کا خلاصہ حکیم الاسلام علیہ الرحمہ نے درج ذیل الفاظ میں اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔

''خانۂ کعبہ میں خدا تو نہیں مگر خدا کا جلوہ ضرور موجود ہے اور اس جلوہ نمائی یا عکس ریزی کا نام ہی شریعت کی زبان میں تجلی ہے۔ اس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ کعبہ کی حقیقت درحقیقت اس ملکِ قدوس کی تجلی اور اس کا عکس پاک ہے جو اس قضائے خاص میں اترا ہوا ہے نہ کہ عین ذات اتری ہوئی ہے جس سے عقل بھی منکر نہیں ہو سکتی۔ پس خانۂ کعبہ میں خدا کے قیام کے معنی تجلی خداوندی کا قیام ہے نہ کہ عین ذات کا قیام کہ جس سے عقل نہ صرف یہ کہ انکار نہیں کرتی بلکہ اور اسے معقول کہتی ہے۔''

علاوہ ازیں اس بحث میں آپ نے تجلی کا عرفانی، قرآنی، برہانی وعیانی ثبوت، عناصر اربعہ میں تجلیات کی کارفرمائی، تجلی خلقت، تجلی ہدایت کے ساتھ تجلی، وحدانی ثبوت، تجلیات کی رنگارنگی، عرش، کرسی، آسمان، زمین، لوح محفوظ، قمر، میزان، جنت، جہنم، یوم زندگی، فلکی، انسانی، انبیائی، موسوی، عیسوی تجلیات، ساقی، صورت، کوکھ وقدم کی تجلیات کے علاوہ نزول کی تجلی کی سورتیں اوران کے نام جیسے وقوف ظہور، صدور، صرور، نور وغیرہ سے استدلال کرکے تینوں مقاماتِ مقدسہ کی تجلیاتِ خاصہ اوران کی خصوصی نوعیّتوں پر فلسفیانہ انداز سے تفصیلی کلام کیا ہے جو بہر طور قابل ملاحظہ ہے۔

چوتھے موضوع میں تجلی کعبہ کے عقلی دلائل، اس کی جامعیت، صفات وجودی نیز اس کی دوشکلوں، پھر ان صفات کا اقتضاء بہ شکل حج بیت اللہ ونماز، قبلۂ حج وقبلۂ نماز پھران عبادات کی کیفیات غلامانہ وعاشقانہ پھر عشق عاقلانہ وعشقِ والہانہ، عاشقانہ کیفیت مسجود حقیقی کے ثابت ہونے کے بعد صفاتِ جلالی وصفاتِ جمالی کو بھی تفصیلی طور پر بیان کیا ہے اور پھران تمام مشمولاتِ بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تجلی کعبہ ہی ایسی تجلی ہے جس میں ہر شر کا علاج ہے۔ ملاحظہ ہو:

''اس (شرک) کے سدِّ باب کے لئے اسلام نے کعبۂ مقدسہ میں جامع شئون وجودی تجلی کا جلوہ بکھیر کر ہمہ نوع عبادتوں کا ایک ہی وحدانی مرکز اور نقطۂ توحید سامنے کردیا ہے جس کے سامنے بیک دم شوق و رغبت، رعب وہیبت، ناز ونیاز اور خندہ دگرے کی ساری کیفیات کی ملی جلی عبادت ادا کی جاتی ہے جو تخیل کی نہیں بلکہ حقیقی تجلی کی عبادت ہے جس کے بیت اللہ میں جلوہ گر ہونے کا عقل و دانش، فہم وفراست، فقہ و معرفت، عقیدہ وجذبہ اور کشف وشہود کے ذریعہ یقین دلا کر قلوب کو مطمئن کردیا گیا ہے جس میں نہ شرک ہے نہ تشقت، نہ پراگندگی ہے نہ تذبذب وتردد، اس لئے کعبہ مقدسہ اور اس پر اتری ہوئی تجلی کی یہی جامعیت سب سے بڑی خصوصیت ہے جو زمان ومکان اور فضا وخلا کے کسی مقام کو میسر نہیں اس لئے کعبۂ مقدسہ ہی صحیح معنی میں مرکز توحید اور میدانِ عبادت ہے۔''

پانچواں موضوع تجلی اقصیٰ کے ثبوت اوراس کی نوعیت کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی قرآن و حدیث سے دلائل فراہم کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ قبلۂ اعزاز کا اول تجلی کا ہی مرہون منت ہے اس کے ذیل میں اقصیٰ کا تقدس، اس کی نوعیت، تجلی کعبہ کا اقصیٰ پر ورود اور قدس وکعبہ میں ثواب کے فرق کو عقلی ونقلی دلائل سے مدلل کیا گیا ہے۔

چھٹے موضوع میں تجلی طور کا ثبوت اوراس کی نوعیت، شانِ جلالی وعظمت، تجلی طور کی دفاعی شان، شریعت

موسوی کا قہری رنگ، دفاعی نوعیت کے آثار، اسلام کا مرکز دفاع، طور سینا کے ساتھ تینوں مقاماتِ کے نقطہ ہائے فیض کے فرق، حقیقت کے لحاظ سے ان کی تجلیات، باہمی تفاوت اور فرق مراتب میں موازنہ کرتے ہوئے کعبہ و اقصیٰ کی طور پر فضیلت کے چودہ دلائل پیش کیئے گئے ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

۱- کعبہ و اقصیٰ کا قبلہ ہونے میں شریک رہنا۔

۲- کعبہ و اقصیٰ کا وضعِ الٰہی ہونا۔

۳- کعبہ و اقصیٰ دونوں کا عبادت گاہ ہونا۔

۴- دونوں کی بنیادوں کا ملائکہ علیہم السلام کے ذریعہ بھرا جانا۔

۵- دونوں کا سارے عالم کی عبادت گاہوں میں اولیت کا شرف رکھنا۔

۶- دونوں مقامات کا طوفان نوح میں بیت اللہ سے چھوکر آ گے

۷- دونوں مقامات کے بانیوں کی نوعیت کا ایک ہونا مثلاً خانہ کعبہ حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ذریعہ اور مسجدِ اقصیٰ کو حضرت سلیمان اور ان کے بیٹے حضرت داؤد علیہما السلام کے ذریعہ بنایا جانا۔

۸- دونوں مقامات کی بناء پیغمبروں کی ذاتی رائے سے نہیں بلکہ امرِ خداوندی سے رکھا جانا۔

۹- کعبہ و اقصیٰ کو ایک ہی انداز سے برکت و ہدایت کا گھر بتلایا جانا۔

۱۰- کعبہ و اقصیٰ اور ان کے شہروں کا اسلامی قلم رو میں ایک ہی انداز سے آنا۔

۱۱- دونوں مقامات کی فتح کے بعد دونوں کی تطہیر اور صفائی کے طریقہ میں یکسانیت۔

۱۲- دونوں مقامات کی تطہیر کے بعد دونوں مقدس گھروں کا جشنِ فتح میں یکساں ہونا۔

۱۳- کعبہ و اقصیٰ کی حتمی تعمیر کی تکمیل کے بعد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سلیمانؑ کا بہ اذن اللہ دعائیں مانگنا اور ان کی قبولیت۔

۱۴- کعبہ و اقصیٰ دونوں کا معراجِ نبویؐ کی ابتدائی منزلیں بننا۔

ساتواں موضوع انسان میں فطرت اللہ کے آثار کے تعلق سے ہے۔ اس کے متعلقات میں حقیقتِ باری کے دلائل، فطرت کی یکسانیت، صورتِ انسانی کا صورتِ الٰہی سے عقلی رابطہ، مخلوق کے کلی اور نوعی نمونے، عقل کلی، تجلی و شعوری، حیاتِ کلی و تجلی الٰہی، موتِ تجلی و تجلی المیت، صلہ رحمی و امانت جیسے انسان کے فطری اوصاف کو کرنے کے بعد ان سب کو اس تجلی کا پرتو ثابت کیا گیا ہے جو تجلی باری تعالیٰ سے انسان میں

ودیعت ہوتی ہے۔ اس تجلی کو زمانی شکل میں دیکھا جائے تو ''یوم جمعہ'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے جو سید الایام ہے اور امت مسلمہ کا منتخبہ ہے۔ یوم جمعہ کو سید الایام اور اس میں رونما آثارِ تجلی کی زبانی کیفیات کو مصنف نے قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا اختصار بایں طور ہے۔ ''یوم جمعہ کی مثال بھی اس کے تحت آتی ہے جسے قیامت کے دن ایک ممتاز، نورانی اور چمک دار صورت دی جائے گی اور وہ جمعہ کے پابند لوگوں کی شفاعت کرے گا۔ اس لئے اسے سید الایام کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حق تعالیٰ کے علم ازلی میں پہلے سے موجود تھی کیوں کہ امت مسلمہ سے ہزاروں سال پہلے اسی کو معیار بنا کر حق تعالیٰ نے تین امتوں، یہود، نصاریٰ اور امت مسلمہ کا امتحان لیا کہ وہ عبادت کے لئے یومِ عید کی طرح ایک دن منتخب کریں جو ہمارے علم میں پہلے سے متعین ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم میں سے کون ہمارے انتخاب دن تک پہنچتا ہے اور اسے ہی یومِ عبادت قرار دیتا ہے۔ یہود نے یومِ سبت (شنبہ کا دن) منتخب کیا۔ نصاریٰ نے یوم الاحد (اتوار کا دن) منتخب کیا اور امت مسلمہ نے یومِ جمعہ منتخب کیا جو حق تعالیٰ کا انتخاب فرمودہ وقت تھا۔ جس سے امتِ مسلمہ اس امتحان میں کامیاب ہوگئی اور اس کی رائے وحی الٰہی کے مطابق ہوگئی۔

اس موضوع کے دوسرے مباحث میں خاص تجلی انسانیت سے تجلی کعبۂ مقدسہ تک، اصل سے فرع کے رشتے کے لوازمات میں محبت وطن کو قدرتی مانتے ہوئے اس کا اس حصۂ زمین کی کشش چوں کہ انسان کی فطرت میں داخل ہے اس لئے اس حصۂ زمین کی طرف جس میں کعبۂ مقدسہ قائم ہے انان کا چلا جانا اُس کی فطرت کا حصہ ہے کیوں کہ وہ اس ساری زمینی مخلوق کی مادی اصل ہے۔

خانۂ کعبہ کی دوسری امتیازی خصوصیات کے ساتھ ساتھ درج بالا امور پر بھی فقہی وشرعی اصولوں کی روش میں پیش کرنے کے بعد قارئین کی توجہ بطور خاص اس حقیقت پر مبذول کرائی ہے۔

''خلاصہ یہ ہے کہ اس قضاء وخلا میں سے کعبۂ مقدسہ کی فضاءِ خاص اور جہتِ مخصوصہ، اللہ نے خود ہی منتخب فرمائی اور پھر اس میں وضعِ خاص کو خود ہی کعبہ کا نام دیا پھر اس کی ساخت پرداخت کر کے خود ہی اس کی اطلاع فرمائی پھر خود ہی اس پر اپنا جلوۂ تجلی اتارا اور اسے اپنے کمالات کی نمائش گاہ بنا کر خود ہی مخلوق کو اس کی خبر دی اور پھر خود ہی اس قضاءِ خاص پر بطور علامتی نشان کے عمارتِ کعبہ تعمیر کرنے کا ارادہ فرمایا۔ پھر تعمیر سے پہلے خود ہی اس کی بنیادیں اپنے ملائکہ سے بھروائیں پھر آدم وابراہیم علیہما السلام کو انہی بنیادوں پر تعمیر کا امر فرمایا جس سے وہ تعمیر عمل میں آئی۔ پھر تیاریٔ تعمیر کے بعد خود ہی ان دونوں مقدسین کو یہ حکم بھی کہ وہ نشانِ کعبہ تیار ہو جانے کا دنیا میں اعلانِ عام بھی کر دیں کہ لوگ اس میں حاضر ہو کر یا اس کی طرف رُخ کر کے حج

ونماز کے فرائض ادا کریں۔غرض تعینِ کعبہ، وضعِ کعبہ، صورتِ کعبہ، بنائے کعبہ اور حقیقت کعبہ میں سے کسی ایک چیز میں بھی انسانی اختراع یا ایجاد کا دخل نہیں رکھا۔“

پیش نظر مضمون کے تعلق سے حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمہ کی علمی وفنی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ خلاصۂ بحث بذاتِ خود اتنے مباحث پر مشتمل ہے کہ اسے کتاب کا آٹھواں موضوع قرار دیا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔اس موضوع میں تینوں مقاماتِ مقدسہ میں ظاہر تجلیات کے مواقع ونزول کی تخصیص پر بحث کے علاوہ کعبۂ مقدسہ کو دنیا کا مرکز دائرہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔پھر دائرہ کی جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ جس طرح وجود میں آتا ہے اُس کے درج ذیل چھ دلائل پیش کر کے فی الحقیقت کعبۂ مقدسہ کو دنیا کا مرکز ثابت کیا ہے۔

۱-دائرہ میں مرکز کا وجود سب سے پہلے ہونا۔

۲-مرکز کا دائرے کا وسطِ حقیقی ہونا۔

۳-مرکز کا دائرے کا اصل ہونا۔

۴-مرکز میں افادیت کی شان ہونا۔

۵-دائرے کی کسی بھی حرکت کا مرکز سے باہر ہونا۔

۶-فطری طور پر مرکز میں سکوت ہونا۔

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں مصنف نے کعبہ کو مرکزِ عالم، جمع کائنات، وسط عالم، زمینی مخلوقات کی اصل اور پھر مرجعیتِ کعبہ کو بھی ثابت کیا ہے۔اس سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کعبہ قبلۂ عبادت ہے اور بیت اللہ ہی عالمی قبلہ ہے۔“

نواں موضوع کعبۂ مقدسہ کی افادیت پر مشتمل ہے۔اس کے مشتملات میں کعبہ میں پایا جانے والا امن وسکون اور اس کے عقلی اصول فراہم کر کے اقصیٰ اور طور کو بھی وسطِ عالم میں شمار کیا ہے اور پھر ان تینوں مقامات کے حامل ممالک مصر، شام وحجاز کی جغرافیائی، تاریخی، تہذیبی، مذہبی وشرعی خصوصیات کی وضاحت کی گئی ہے۔

دسواں موضوع تینوں مراکزی نوعیّتوں کے خلاصے اور مسلمانوں کے ان پر استحقاق کے تعلق سے ہے۔اس کے ضمن میں مصر کی ملکیت وقومیت مقاماتِ مقدسہ کے حسبِ حال شرعی ہدایات، مقاماتِ مقدسہ کے سلسلے میں مسلمانوں کی فریب خوردگی نیز اس کے دور رس اور مہلک نتائج پر بحث کرتے ہوئے حجاز، شام، فلسطین ومصر کے تعلق سے مقاصد عشرہ کو گنا کر اپنی ذمہ داریوں کو بتایا گیا ہے۔علاوہ ازیں ان مقدس مقامات کے تعلق سے خلاصہ مقاصد میں اپنی تشویش کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

''تشویش یہ ہے کہ ان مخصوص مقدس خطوں کی آزادی اور ان کی حفاظت وصیانت کے بارے میں اندازِ فکر کیا ہوگا اور وسائل کار کیا اختیار کئے جاتے ہیں۔ سو جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے اب تک اس سلسلے میں جتنے بھی افکار اور جتنے بھی دعوے یا نعرے سامنے آئے ہیں وہ اکثر و بیشتر وطن اور جغرافیائی یا رائج الوقت سیاسی انداز ہی کے محسوس ہوئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ حقیقی نقطہ اس بارے میں آج کے مروجہ سیاست کا ہے نہ کہ آج کے وطنی ڈھنگ کا بلکہ خالص مذہبی اور شرعی انداز کا ہونا چاہئے۔ محض پارٹی سیاست یا وطنی حد بندیوں اور قومی اقتدار کے نام پر اگر یہ جذبات ابھریں گے تو ان سے ان مرکزیتوں کے تحفظ اور استحکام کا مقصد کبھی پورا نہیں ہوسکتا جس سے یہ مقامات بالاتر کو دینی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے کسی سیاسی منصوبے کے انداز سے نہیں۔ ممکن ہے کہ اس دورِ وطنیت پرستی میں اسے رجعت پسندی یا تنگ خیالی کا طعنہ دے کر اس کی اہمیت گھٹا کی جائے لیکن میرے خیال میں اس سے بجائے مرعوب یا خجل ہونے کے ہمیں اس رجعت پسندی کا خیر مقدم کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ شرعیات کی بناء عقلی اختراعات نہیں بلکہ نقلی روایات پر ہے، اندریں صورت جب کہ ان مقامات کی تقدیس کی بنیاد ہی نقولِ مذہب پر ہے۔ عقلی اختراعات پر نہیں تو اُن کی حفات بھی علانیہ شرعی منصوبوں اور مذہبی دعووں کے ساتھ ہی ہوسکتی ہے۔

درج بالا سطور میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ انتہائی اختصار کے ساتھ اس کتاب کے موضوع کی تجزیہ کی طالب علمانہ کوشش ہے جہاں تک حضرت حکیم الاسلامؒ کی سخن سنجی ونکتہ آفرینیوں کا تعلق ہے اس کی اہمیت بھی مسلمات میں سے ہے۔ سینکڑوں قرآنی آیات اور متعدد احادیث مبارکہ کے استشہاد، اس کتاب کا اندازِ تحریر فلسفہ اور جدید سائنسی توضیحات کی روشنی میں بات کرنے والے ترقی پذیر دانشوران کے لئے بھی نسخۂ سعادت سے کم نہیں۔ حضرت والا نے حالات وواقعات سے جس طرح نتائج اخذ کئے ہیں وہ ان کے انتہائی عمیق و وسیع مطالعہ کی دلیل ہونے کے علاوہ اردو نثر کا بہترین شاہکار ہیں۔ بطورِ مثال درج ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

''کعبۂ مقدس کی مرکزیت کے سلسلے میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے دعوت ابراہیمی کو عالمی انداز میں پھیلانے کی جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ قدس اقصیٰ یعنی فلسطین اور شام سے نہ تھیں کیوں کہ مؤخر الذکر علاقہ زرخیز، باغ دراغ، میووں، پھلوں کا مخزن، نہروں اور میٹھے پانیوں کا چرچشمہ تھا جب کہ ارضِ حجاز بے آب و گیاہ ملک تھا جس میں نہ باغ دراغ تھا نہ گلشن وچمن نہ پھول پھول تھے اور نہ میوے اور نہریں، نہ ندیاں تھیں، نہ کھیتی باڑیاں، نہ صنعت وحرفت نہ دستکاری، اسی لئے سادگی، جفاکشی اور قناعت ان کا منقار تھا۔ تصنع اور بناو سے کوسوں دور ایسے مقام پر تھے کہ گر ان نفوس کو صحیح تربیت سے درست کردیا جائے تو آفاقی اور بیرونی کوئی سبب ایسا تھا ہی نہیں کہ ان کے ترقی پذیر عزائم میں حارج ہو۔'' (۴)

آ گے فرماتے ہیں کہ ''حضرت ابراہیمؑ نے بیت اللہ کی تعمیر کرتے ہوئے بالہام خداوندی حق تعالیٰ سے جو دعا مانگی تھی اس میں پہلی التجا تو یہ تھی کہ اے پروردگار اولادِ ابراہیم و اسماعیلؑ میں ایک عظیم رسول مبعوث فرمایا اور اسے وہ قانون عطا فرمایا جس کے الفاظ میں وحی ہوں کہ ان کی تلاوت کی جائے اور ان میں ایک امت مسلمہ برپا کر اور اسے اس عالمی مرکز کعبۂ مقدسہ کے حقوق و مناسک (حج بیت اللہ) عالمی انداز سے کرنے کی توفیق عطا فرما کہ لوگ اطراف عالم سے اس کی طرف رجوع کریں اور اس مرکز سے توحید و اتحاد کا سبق لے کر اسے عالمی کر دکھلائیں۔(۵)

اس کے بعد آپ نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ مومنانہ فراست کا حامل ہے۔فرماتے ہیں:

''پس اس طرح دنیا کے انسان امام الناس خلیل رب العالمین کی امامت کے مقتدی بن گئے اور جس مسجد مقدس سے اس امامت و اقتداء کا ظہور ہوا وہ کعبۂ مقدس تھا جس سے اس بیت کریم کی عالمی مرکزیت باندازۂ خلیلی، بہ منشادِ خداوندی روزِ روشن سے زیادہ واضح ہوگئی اور ساتھ ہی اس امتِ مسلمہ کی عالمیت اور اس کے مقاصد کی آفاقیت و ہمہ گیری کے اس عالمی مرکز سے وابستگی بھی نمایاں کر دی گئی۔

''اسی طریقہ پر مقاماتِ مقدسہ کے معیار سے عالمی تعمیر دفاع کی شرعی صورتوں کو جس انداز سے بیان کیا ہے اُس کا حق میں حکیم الاسلامؒ کو ہی پہونچتا ہے۔آپ نے اس موقع پر دین و سیاست کو جمع ہی نہیں کیا بلکہ سیاست کو دین میں سمو کر ہر ایک کو مستقل ایک ایک بنیادی اور مرکزی حیثیت دی ہے۔عبادت کو ہم اور اولین مقصد قرار دے کر حجاز مقدس کو اس کا مرکز بتایا ہے سیاست و شوکت کو دین میں بنیادی حیثیت دے کر اس کا مرکز شام کو بتلایا اور عسکریت اور فوجی قوت کو اہم مقصد بتلا کر مصر کو اس کا مرکز قرار دیا اور پھر ان تینوں مرکزیتوں کو اپنی اپنی مرکزیتوں پر رکھنے کے لئے ایک مرکز المراکز عالمی نظام اجتماعیت قائم کر کے اس کا نام خلافت رکھا تا کہ اس بین الاقوامی و بین الاوطانی نظام سے جہاں ان تینوں مرکزوں کی مرکزی برکات عالم میں پھیلی رہیں۔دنیا کی ساری طاقتیں اور ساری اقوام بھی ایک نظام میں منسلک ہو کر حقیقی انسانیت کو نمایاں کر سکیں۔''

اسلام میں سیاست سے کیا مراد ہے؟ اس کی تشریح بھی آپ نے اس انداز سے فرما دی ہے

''حقیقی سیاست وہی ہوسکتی ہے جس میں عقل و تدبر اور اخلاص کے ساتھ دنیا کو باہم ملانے اور خلوص کے ساتھ اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی فطری صلاحیت موجود ہو اس لئے اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو وہ دینی اور دیانتی سیاست صرف اسلامی ہی ہے جس کا نمونہ اسلام نے دنیا کے سامنے نہ صرف نظری طور پر رکھا بلکہ اس دار دنیا کی کتنی ہی متضاد انواع کی قوموں کو نظام کی ایک لڑی میں پرو کر دکھلا دیا جس سے کسی قوم کو انحراف نہیں ہوا۔''

اسلام کا مقصد مسلمانوں کو مصنوعی معیاروں خواہ وہ قوم و وطن کی شکل میں ہوں یا رنگ و نسل کی صورت میں، ان سب چھوٹے اور داغدار معیاروں سے نکال کر انہیں عالمیت اور اجتماعیت کبریٰ کی طرف لے جانا ہے۔ اُن کا داعیانہ کردار ہی انہیں عزت وشوکت اور آفاقی عطا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے انہیں نہ صرف اس کردار کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا ہے بلکہ انہیں اُن طاغوتی اور صیہونی سازشوں سے بھی باخبر رہنا ہے جو اُن کے خلاف عالمی پیمانے پر جاری ہیں۔ اسی صیہونی سازش سے کم وبیش نصف صدی پہلے حکیم الاسلامؒ نے عالمِ اسلام کو باخبر کیا تھا۔ اُن کی حیات کے آخری حصہ میں یہود و نصاریٰ نے قبلہ اول پر قبضہ کر کے عالم اسلام کی جس انداز سے دل آزاری کی اُس نے حکیم الاسلامؒ کی بصیرت اور معاملہ فہمی کو پوری طرح ثابت کر دیا۔ حکیم الاسلامؒ نے صیہونی سازش سے عالمِ اسلام کو اس انداز سے خبردار کیا تھا۔

''اندیشہ ہے کہ یہ تین وزیتون کا مقدس شہر خاکم بدہن صیہونیوں کے دست برد کے نیچے نہ آجائے جس کے لئے سازشوں کا جال بچھا ہوا ہے اور مسلمانوں کی عالمی سیاست ایک خواب وخیال ہو کر نہ رہ جائے اور پھر اس بے دست و پائی کے نتیجہ میں طور سینا کی وادیاں بھی کہیں خطرہ میں نہ پڑ جائیں جن کا کچھ حصہ غزہ سے آگے کا ہاتھوں سے نکل بھی چکا ہے اور دشمن عین غزہ کے سر پر بیٹھا ہوا ہے۔ اسے تاک رہا ہے۔ اگر مصر نے اس طرف دھیان نہیں دیا اور اس مقام کی دینی نوعیت کو سامنے رکھ کر جو اسلام نے اسے بخشی ہے محفوظ نہ رکھا تو اندیشہ ہے کہ صیہونی دسترس میں اس پر کی نہ رہے گی جس پر آج رکی ہوئی ہے۔''

حکیم الاسلام علیہ الرحمہ نے یہ تحریری پیشین گوئی آج سے کم وبیش چالیس سال پہلے کی تھی جو حکمرانوں کی بے حسی، امریکہ کے تسلط اور عرب ممالک کے عدم اتحاد کے سبب آج بہت حد تک پوری ہو چکی ہے۔ اس سے مصنف کی دور بینی و دور اندیشی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ موجودہ حالات اور ان کے اسباب نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ میں پائی جانے والی بے چینی وتشویش کو سامنے رکھ کر کتاب کا درج ذیل پارۂ عبارت بھی ملاحظہ فرمائیے۔

''صیہونی جغرافیہ میں مدینہ اور خیبر کو بھی دشمن نے شامل کر رکھا ہے۔ گویا بیت اللہ مقدس پر بھی دشمنوں کی کڑی نظر ہے جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ شام، اقصیٰ اور مصر، غزہ کے کنارے تک دشمن کے ہاتھ میں اور حجاز مدینہ وخیبر تک دشمن کی نظر میں ہے تو کیا یہ مسلمانوں کی غیرت ملی کے لئے مہمیز نہیں ہے اور کیا اس کے بعد بھی اس مہلک بیماریوں کے علاج کی ضرورت نہیں ہے۔''

حکیم الاسلام علیہ الرحمہ نے صرف اس مہلک بیماری کی ہی نشان دہی نہیں کی ہے بلکہ اس کا علاج بھی

تجویز کیا ہے۔ایک ''معجون مرکب'' پر مشتمل ہے جس کے درج ذیل سات اجزا ہیں۔

۱-دین و سیاست کی وحدت ۲-عالمی سیاست بصورت خلافت ۳-عالمی دعوت ۴-عالمی اخوت ۵-عالمی مساوات ۶-عالمی امن واتحاد ۷-عالمی عبادت وشوکت اور عسکریت کی سہ مرکزی قوت۔

اس معجون کے طریقہ استعمال سے جو فوائد ہونے کی امید ہے انہیں بھی ''حکیم'' نے پوری طرح بتا دیا ہے تا کہ ''مریض'' کو شفاءِ کاملہ حاصل ہو سکے۔حکیم الاسلامؒ کے الفاظ میں یہ ''مریض'' کے لئے ''نسخۂ شفاء'' بھی ہے اور مرض کا مکمل خاتمہ بھی اس کے استعمال سے ہی ہوسکتا ہے۔

عالم عرب کا مرض اگر چہ انتہائی شدت اختیار کر چکا ہے اور اُس نے پوری ملت اسلامیہ کو' مریض' بنا دیا تاہم آج بھی درج بالا ''معجون مرکب'' کا استعمال نہ صرف ''مریض'' کے لئے شافی ہوسکتا ہے بلکہ عالم انسانیت کو بھی قوت وتوانائی بہم پہنچا سکتا ہے۔علامہ اقبال کی زبان میں ؎

آج بھی ہو جو ابراہیم سا ایماں پیدا آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

الغرض پیش نظر کتاب ''اسلام اور مقامات مقدسہ اور اسلام کا اجتماعی نظام' جہاں ایک طرف خلافت کی تبحر علمی، فکری وسعت اور گہرائی خیال کی عکاس ہے وہیں ملت اسلامیہ کے قلبی جذبات کی حقیقی ترجمان بھی۔ مجھے احساس ہے کہ صفحات کی محدودیت، اپنی کم علمی اور مدانی کے باعث عنوان کے مطابق اس کے تجزیاتی مطالعہ کا کماحقہٗ ادا نہیں کرسکا تاہم قارئین کے سامنے کچھ نمونے پیش کر کے یہ کوشش ضرور کی گئی ہے کہ وہ اس اہم کتاب کے مطالعہ کی طرف توجہ فرما کر اس میں غوطہ زن ہوں اور اس بحرِ ذخار سے بیش قیمت موتی نکال کر دنیا کی فیض رسانی کا باعث ہوں۔راقم اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوسکتا اس کا فیصلہ قارئین ہی فرمائیں گے۔

---

(۱) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، مقاماتِ مقدسہ، ص: ۶۰

(۲) ایضاً، ص: ۴۳

(۳) ایضاً، ص: ۴۳

(۴) ایضاً، ص: ۴۷

(۵) ایضاً، ص: ۶۷

حکیم الاسلامؒ کی حکیمانہ باتیں!

مولانا عبدالعزیز قاسمی

مدرسہ نورالاسلام، میرٹھ

ملت اسلام کا تھا تو درخشاں آفتاب غیر ممکن ہے کہ اب پیدا ہو تیرا پھر جواب

فخر الاماثل، حکیم السلام، شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ علم وعمل، اخلاق وصداقت کے ایک بہترین اور نادر نمونہ تھے۔ حضرت سلطان الاولیاء خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر قطب العالم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نوراللہ مرقدہ کی ذاتِ اقدس تک جو سلسلہ چلا آرہا تھا جس کو فقیہ زماں، حکیم الامت مولانا تھانوی صاحب برد اللہ مضجعہ نے جوں کا توں لے کر کتاب وسنت کی روشنی میں منشاء الٰہی کے مطابق اس کو ایک حسین وجمیل صورت عطا فرمائی اور اس کا صحیح مجسمہ حضرت اقدس حکیم الاسلامؒ کی ذاتِ اقدس تھی۔

اس فقدان الرجال کے دور میں صبر وضبط اور علم وعمل کا یہ عالم تھا کہ اپنے تو اپنے اغیار بھی معاملہ پیش آنے کے بعد معترف ومعتقد ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور یہی وجہ تھی کہ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی ان کی شرافت نفس کے قائل تھے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار ورسن کہاں

استاذ المحترم حضرت حکیم الاسلامؒ نے شرافت ورافت قسام ازل سے غایت درجہ پائی تھی نظریاتی اختلاف کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے۔ دل میں اپنے حریف کی جانب سے ذرا بھی میل نہ لاتے بلکہ اپنے معاند یا سب وشتم کرنے والوں کی طرف سے بھی کبھی دل تنگ نہ ہوتا اور موقعہ میسر آئے تو ہمدردی اور مروت، رواداری برابر اس کے ساتھ کرتے رہتے۔ اس قدر عالی ظرفی اور تحمل کا مادہ ہر ایک انسان کے بس کا کام نہیں۔ ’’ان ذلک لمن عزم الامور‘‘.

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ''دیوبند'' کے ایک مقامی اخبار نے کچھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف لکھ دیا اخبار کا اڈیٹر اغیار کے ہاتھوں بری طرح بک گیا تھا اور کچھ وہ اپنی عادت سے بھی مجبور تھا ''جبل گردد وجبلت نہ گردد'' اس کا اثر یہ ہوا کہ دیوبند کی عوام بگڑ گئی اور عمائدین شہر اور علماء کی ایک خاص جماعت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اجازت چاہی کہ اخبار کے ایڈیٹر کو کوئی ایذا پہنچائی جائے یا اس کے پریس کو خردو برد کیا جائے تو حضرت نے بڑی سنجیدگی اور متانت کے لہجہ میں فرمایا ''مجھے برا بھلا کہنے سے یا لکھ دینے سے اگر کسی کی روٹیاں سیدھی ہو رہی ہوں تو تمہارا کیا حرج ہے۔

حاضرین آپ کا یہ جملہ سن کر انگشت بدنداں رہ گئے اور آگے کچھ کہنے کی جرأت بھی نہ ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے یہاں غیبت اور بغض وعناد نام کا بھی نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے متوسلین بھی صالح اور راسخ العقیدہ نظر آتے ہیں اور آپ کا یہ ولی اللہی رنگ آپ کے خلفاء اور معتقدین میں بھی ملتا ہے اور اس کی مثال میرے کرم فرما سیدی حضرت مولانا حکیم محمد اسلام صاحبؒ جو حضرت کے خلیفہ اور جامعہ عربیہ نورالاسلام میرٹھ کے سربراہ اور مہتمم تھے۔ ان کی عالی ظرفی اور حلم وبردباری سے کون انکار کرے گا جن لوگوں نے حکیم الاسلامؒ صاحب کو دیکھا ہے وہ میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس دور میں حکیم صاحب اسلاف کی نشانی، تواضع عجز وانکساری اور رافتِ قلبی کا ایک بہترین نمونہ تھے کبھی کبھی اپنی مجالس میں فرماتے تھے:

''کہ اپنے پاس کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے وہ حضرت مہتمم صاحبؒ کی جوتیوں کا صدقہ ہے''۔

کون نہیں جانتا کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہ کی علمی وروحانی شعائیں عرب وعجم اور ہندو پاک کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی پھیلی ہوئی ہیں اور آپ کے مستفیضین کی تعداد شمار وحساب سے خارج ہے یہ اگر آپ کی زندہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟

وہ جنیدِ دورِ حاضر وہ طریقت کا امام وہ زمانہ کا غزالی فخرِ رازی، نیک نام

آپ کے یہاں آیات کتاب اللہ واحادیث نبویہ کی تشریحات دلائل اور دلنشیں انداز میں اور شرعی مسائل واحکام کی علّتیں بکثرت ملتی ہیں۔

ایک بار حضرتؒ میرٹھ تشریف لائے ''خیر نگر'' میں حکیم محمد ادریس صاحب کے یہاں قیام تھا معلوم ہونے پر یہ راقم بھی حاضر خدمت ہوا۔ حضرت ایک رسالہ کے مطالعہ میں مشغول تھے۔ سلام ومصافحہ کے بعد برابر کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور یہ فکر سوار ہوا کہ آغازِ سخن کس طرح کروں تا کہ کچھ استفادہ ہو سکے۔ تھوڑی دیر کے وقفہ کے بعد میں نے حضرت کی جانب پان بڑھایا تو حضرت نے پان قبول کرتے ہوئے فرمایا:

''پان مفرح قلب ہے اور حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے تو اس کو کھانے کی مسواک کہا ہے۔ اور مجھے تو پان بھی کھانا نہیں آتا تھا حضرت مدنیؒ نے سکھا دیا''۔

اس پر سلسلہ سخن دراز کرتے ہوئے میں نے دبے الفاظ میں عرض کیا کہ سنا گیا ہے کہ مدنی رحمۃ اللہ علیہ تو آپ کا بیحد احترام فرماتے تھے۔ جواباً ارشاد فرمایا:

''جی ہاں بظاہر تو کوئی خوبی اس وقت نہ تھی اور نہ اب ہے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ علامہ انور شاہ کشمیری اور حضرت مولانا مدنیؒ کی تربیت میری والدہ نے کی ہے اور یہی وجہ تھی کہ یہ دونوں بزرگ میرے اہل خانہ کا بہت احترام کرتے اور حضرت مدنیؒ نے تو بارہا عجز وانکساری کے لہجہ میں ارشاد فرمایا کہ میں اس در کا کتّا ہوں اور وہ مجھ سے بہت محبت وشفقت کا معاملہ کرتے چناں چہ پاکستان سے جب میں دوبارہ دارالعلوم میں حاضر ہوا تو مولانا مدنیؒ نے بے ساختہ مجھ سے فرمایا'' کہ آپ دارالعلوم کے محتاج نہیں ہیں دارالعلوم آپ کا محتاج ہے۔

تو ظاہر ہے یہ سب ان کی شفقت اور رحمت ہی تھیں۔

تبدیل موضوع اختیار کرتے ہوئے دوسرا میرا سوال یہ تھا کہ حضرت کافرین کو دنیا میں راحت وآرام اور مؤمنین کے لیے سوائے مصائب وآلام کے کچھ نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

تو آپ مسکراتے ہوئے فرمانے لگے اس میں کیا حرج ہے۔ بظاہر تو اس میں کوئی نقصان ہے نہیں۔ حق تعالیٰ کی حکمت اسی میں ہے اور اسی میں بندہ کو راضی رہنا چاہئے۔ پھر اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں فرمایا۔

''کہ دراصل صورت ایسی ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ نے دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک کافر، دوسرے مومن اور زندگی بھی حق تعالیٰ نے دو ہی رکھی ہیں ایک دنیا کی اور دوسرے آخرت کی۔ تو دنیا کی راحتیں کافر کو عطا کیں اور آخرت کی مومنین کو اگر کافر کو دنیا کی نعمتیں نہ دی جاتیں تو وہ بے چارہ محروم رہتا آخر کار وہ بھی تو اللہ کی مخلوق ہے اور آخرت کی نعمتوں سے اس کو محروم رکھا جائے گا بخلاف مومنین کے کہ ان کو آخرت سے سرفراز کیا جائے گا''

حضرت حکیم الاسلامؒ دہلی کے ''پنتھ ہسپتال'' میں زیر علاج تھے۔ میرٹھ سے ایک وفد حضرت حکیم محمد اسلام صاحبؒ کی قیادت میں دہلی پہنچا جس میں حکیم محمد الیاس صاحب کٹھوڑوی کے علاوہ مولانا عبد الستار صاحب مدرس مدرسہ نور الاسلام اور دیگر احباب بھی شریک تھے اور یہ بندہ بھی۔ آپ کافی لاغر اور کمزور

ہو چکے تھے۔ ڈاکٹروں نے بولنے پر پابندی عائد کردی تھی۔ ڈاکٹروں کے حکم سے آپ کے کمرے کے دروازہ پر بھی ہسپتال کی جانب سے لکھ دیا گیا تھا ''گفتگو کرنا منع ہے''۔

بہرحال اس وفد نے حضرت کی عیادت فرمائی۔ حکیم صاحب سے کچھ مختصر گفتگو بھی ہوئی۔ اسی اثناء میں آپ کی پوتی اور حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہ آ گئے، تو حضرت ان سے گفتگو کرنے لگے کہ اتنے میں ایک ''نرس'' آئی اور اس کا منشا یہ تھا ''کہ آپ گفتگو نہ کریں'' اور حضرت کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''کہ آپ کے روم پر بھی لکھا ہوا ہے کہ بات کرنا منع ہے''۔

اس پر حضرت مہتمم صاحبؒ نے برجستہ کہا

''کہ وہ میرے لیے نہیں بلکہ آنے والے کے لیے ہے''۔

آپ شادی میں ہوتے یا غمی میں تکلیف میں ہوتے یا راحت میں مگر زائرین کو کبھی احساس نہ ہونے دیتے بلکہ اپنی طویل گفتگو اور حکیمانہ باتوں سے ان کی دلجوئی فرماتے۔ تفکرات کا آپ پر کتنا ہی ہجوم ہوتا۔ ہموم وغموم کی کتنی ہی یورش ہوتی مگر عالم یہ تھا کہ تبسم زیرلب۔ غالباً اردو کے کسی شاعر نے آپ ہی کے بارے میں کہا تھا۔

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

سَن تو مجھے یاد نہیں ہاں البتہ مادر علمی دیوبند میں زمانہ طالب علمی تھا کہ حضرت حکیم الاسلامؒ حج بیت اللہ سے تشریف لائے۔ آپ کی زیر صدارت تحتانی دارالحدیث میں ''جمعیۃ الطلبہ'' کی جانب سے ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں آپ نے تقریر فرمائی اور اپنے سفر حج کے حالات بتلائے۔ منجملہ ان واقعات کے آپ نے فرمایا:

''کہ ایک روز میں مسجد حرام میں بیٹھا ہوا اپنے معمولات میں مشغول تھا اور کثیر تعداد میں زائرین حج تشریف فرما تھے کہ اچانک ایک سائل آیا اور عاجزی وانکساری کے لہجہ میں سوال کرنے لگا اور پھر وہ غائب ہو گیا تو میں نے عرض کیا ہم سب کو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہئے حق تعالیٰ نے اس شخص کو بھیج کر ہم کو متنبہ کیا ہے کہ یہاں جس قدر بھی عاجزی وانکساری اختیار کرو گے اسی قدر ملے گا، خاموش رہنے سے کوئی اپنی مراد کو نہیں پہنچتا ہے سائل جب تک سوال نہیں کرتا تو اس وقت تک اس کی جھولی میں بھیک نہیں ڈالی جاتی تو ظاہر ہے ایسے ہی جب تک اللہ کے سامنے عاجزی وانکساری کا اظہار نہیں ہوگا اس سے مانگا نہ جائے

گا تو عنایات ربانی کا نزول کیسے ہوگا۔

اللہ اکبر کیا شان تھی اس ذات ستودہ کی جس کے قدم قدم میں عبرت ہر لمحہ غور فکر سے معمور ہر بات حکمت ومعرفت سے منور ۱۴۰۲ھ اوائل شعبان میں حضرت حکیم محمد اسلام صاحب مہتمم جامعہ عربیہ نور الاسلام میرٹھ کی دعوت پر ختم بخاری شریف کے جلسہ میں آپ تشریف لائے اور بخاری شریف کی آخری حدیث ''**کلمتان حبیبتان**'' پر محققانہ کلام فرمایا، ابتدا میں بیٹھتے ہی خطبہ مسنونہ کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا:

''کہ آج تو میں ہی بخاری ہوں''

سامعین حیران کہ یہ جملہ کیسے استعمال فرمایا۔ لیکن پھر ارشاد فرمایا کہ اس میں ''یا'' نسبتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ میں دو تین یوم سے بخار میں مبتلا ہوں صرف وعدہ کی بنا پر حاضری ہوگئی ہے اور چوں کہ میں بخار میں ہوں۔

''لہٰذا بخاری آج میں ہی ہوں''

اس کے بعد **خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان** کو حسی مثال دے کر سمجھایا کہ دو کلمے زبان پر ہلکے پھلکے لیکن میزان عمل کے اندر وزنی اور بھاری ہوں گے جیسے ''ہاپوڑ کے پاپڑ'' یہ دیکھنے میں انتہائی درجہ کے خفیف اور ہلکے ہیں لیکن معدہ میں جا کر یہ ثقیل اور غیر معمولی وزنی اور بھاری ہو جاتے ہیں۔

آپ کی عارفانہ اور حکیمانہ باتوں میں آپ کے جد امجد حضرت نانوتویؒ و حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا رنگ غالب تھا یہ آپ کے اس خاص پہلو کی مختصر روئیداد تھی ؎

کہ نہ نتواں کرد کہ ایں قصہ دراز ست

کل تک ہم جس ذاتِ گرامی سے آیات قرآنی کی تفسیر واحادیث نبویہ کی تشریح حکیمانہ انداز میں سنتے تھے افسوس کہ آج وہ زیر زمیں محو خواب ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے جن بزرگان دین کی امانت کو اور حضرت علامہ کشمیریؒ نے جس خزانہ علم کو اور حضرت تھانویؒ جس مرشد کامل کو ہمارے سپرد کر گئے تھے ہم نے اپنے ہاتھوں اُسے زیر زمیں دفن کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللھم اغفرہ وارحمہ واسکنہ فی اعلی الجنان

آمین یا رب العٰلین

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ اور تحفظ ختم نبوت

مولانا شاہ عالم گورکھپوری
تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند

اپنے قارئین کو یہ بات پہلے ہی بتا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ راقم سطور نے حضرت حکیم الاسلام محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی ان ظاہری آنکھوں سے تو نہیں لیکن خود ان کے کارناموں کی روشنی میں ضرور دیکھا اور خوب خوب دیکھا ہے۔ اس کے لئے ظاہر سی بات ہے کہ حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی سیرت وسوانح کے تعلق سے ہمیں جو کچھ لکھنا، کہنا ہوگا اس میں بھی مصدقہ تاریخی اوراق ہی کا سہارا لینا ہوگا۔ اسی لئے حضرت حکیم الاسلامؒ کو بندۂ ناچیز نے جن آنکھوں سے دیکھنے کا اعتراف کیا ہے۔ اس سے اگر کسی کو اختلاف ہو تو ہوا کرے لیکن تاریخ کے ان پوشیدہ اوراق سے امید ہے کہ کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔

عقیدہ ختم نبوت اور اس کا تحفظ چوں کہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے اس لئے بحیثیت مسلمان ہونے کے اس سے وابستگی ہر خاص وعوام کو ہوتی ہی ہے لیکن تاریخ کے اوراق میں وہ لوگ انتہائی خوش بخت شمار ہوتے ہیں جن کا تعلق، تحفظ ختم نبوت اور اس کے مقتضیات سے وابستگی، وارفتگی کی حد تک ہوتی ہے۔ موجودہ صدی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو فخر رسل سید الکونین حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس کے ساتھ آپ ﷺ کی تاج ختم نبوت سے عشق اور ہر جعل وتصرف اور عقیدۂ ختم نبوت سے محفوظ کرنے کا پاکیزہ جذبہ جن جن خوش نصیبوں کو ملا ان کی طویل فہرست میں حضرت حکیم الاسلامؒ محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت بھی نمایاں نظر آتی ہے اور تاریخ کے اوراق میں جا بجا عاشقان تحفظ ختم نبوت کی پاکیزہ جماعت میں حضرت حکیم الاسلامؒ کو پڑھا اور دیکھا جا سکتا ہے۔ بطور دلیل اس دعوی پر حضرت حکیم الاسلام کی تصنیفات کا جائزہ لیا جائے تو تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر آپ کی خدمات کا ایک

وسیع باب ملے گا۔ حضرت کے خطبات، مواعظ و مقالات کا ذخیرہ بھی یہ باور کرائے گا کہ عقیدہ ختم نبوت کے خلاف اٹھنے والے مختلف طرح کے فتنوں کا مقابلہ کرنا حضرت حکیم الاسلام کے کارناموں میں سے ایک اہم کارنامہ ہے۔

قادیانی تحریک اور اس کے تعاقب کی تیاری

انیسویں صدی کے آغاز میں ضلع گورداسپور، پنجاب میں واقع ''قادیان'' نامی ایک گاؤں سے قادیانیت کا فتنہ رونما ہوا۔ چوں کہ اس فتنہ کو وقت کی انگریزی سرکار کی بھرپور پشت پناہی حاصل تھی اور شاید قدرت کو ہم جیسے کمزور ایمان والوں کے ایمان کی آزمائش بھی مقصود تھی کہ قادیانی تحریک کی فتنے پروری میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا رہا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ علماء اسلام بالخصوص علماءِ دارالعلوم دیوبند نے قادیانیت کو اپنے زمانہ کا سب سے خطرناک فتنہ قرار دیتے ہوئے اس کے تردید و تعاقب میں نہ صرف علمی اور تصنیفی جدو جہد فرمائی بلکہ فتنہ کو کچلنے کے لئے سربکف میدان عمل میں اتر آئے۔

مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کی پیدائش ۱۸۴۹ء میں اور ۱۸۸۰ء سے اس نے بتدریج اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کئے اور تقریباً ایک دھائی گذرتے گذرتے بلّی تھیلے سے باہر آ گئی۔ ۱۸۹۰ء سے عوام وخواص سبھی نے قادیانیت کی زہرناکیوں اور خطرناکیوں کو خوب بھانپ لیا۔ یہ وہ دور ہے کہ ۱۸۷۹ء میں حضرت حکیم الاسلام کے جد امجد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوتا ہے لیکن مشیّت خداوندی دیکھئے کہ انتقال سے قبل تحفظ ختم نبوت اور آئندہ زمانہ میں پیدا ہونے والے جھوٹے مدعیان نبوت کا ہمہ جہت دروازہ بند کر کے تحفظ ختم نبوت کے میدان میں آپ نے وہ گراں قدر خدمات انجام دیں کہ آج بھی علم و فضل کی دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ شان ختم نبوت کو بلند و بالا مقام دینے کے لئے جگہ، زمانہ اور مقام و مرتبہ تینوں اعتبار سے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف ''تحذیر الناس'' میں عقیدہ ختم نبوت کی گرہ کشائی اور اس کی وہ توضیح و تشریح فرمائی ہے کہ جس نے عقیدہ ختم نبوت کو ہمہ جہت حصار اور مضبوط تحفظ فراہم کیا۔ اگر بصیرت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو فتنۂ قادیانیت کے ظہور سے پہلے ہی حضرت نانوتویؒ کا تحفظ ختم نبوت کے میدان میں یہ پہلا اور سنہرے حرفوں سے لکھا جانے والا کارنامہ ہے۔

قادیانی فتنہ ۱۹۰۱ء میں جب اپنے شباب کو پہنچا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت نانوتویؒ کی جسمانی یا روحانی اولادیں تحفظ ختم نبوت کے میدان میں کسی سے پیچھے رہتیں۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ حضرات علماء دیوبند

اور منتسبینِ دیوبند کے ساتھ ساتھ حضرت نانوتویؒ کے خلف الصدق صاحب زادے حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے بھی اپنے دورِ اہتمام میں خاندانی ورثہ کا حق ادا کرتے ہوئے قادیانی فتنہ کا حتی المقدور تعاقب فرمایا اور علماء کی کھیپ کی کھیپ کو اس میدان میں اتار کر قادیانیت کو قادیان میں شکست و ہزیمت سے دوچار کیا۔ حضرت مولانا صاحبؒ کا دورِ اہتمام چالیس سال کے عرصہ پر مشتمل ہے۔ اس دور میں تحفظ ختم نبوت کے سرخیل اور تکوینی طور پر خدا کی جانب سے منتخب تحفظ ختم نبوت کے انچارج حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین تھے، اس دور کا ایک تاریخی اور دلچسپ واقعہ بطور ثبوت ملاحظہ فرمائیے۔

قادیان میں علماء دارالعلوم دیوبند کی حق وصداقت کی آواز

انگریزوں نے بڑی چابک دستی سے قادیانی فتنہ کو جنم دے کر پورے ملک میں پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ ان کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر سے جذبہ حریت سرد کر کے جلد سے جلد ملک پر قابو پایا جا سکے۔ مرزا قادیانی نے ۱۹۰۱ء میں جب کھل کر دعویٰ نبوت کر ڈالا تو اس جھوٹے مدعی نبوت کے تردید و تعاقب میں پنجاب اور لاہور وغیرہ میں مختلف انجمنیں اور کمیٹیاں قائم ہوئیں۔ انہیں میں سے ایک انجمن ''انجمن اسلامیہ قادیان'' کے نام سے قادیان کے مسلمانوں نے قائم کی تھی۔ ۱۹/ مارچ ۱۹۲۱ء میں اس انجمن کی جانب سے ایک بڑا اجلاس ہونا طے پایا جو انجمن کا سہ روزہ دوسرا اجلاس عام تھا۔ اس اجلاس عام میں علماء دارالعلوم دیوبند کو بطور خاص دعوت دی گئی اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی زیر صدارت یہ تاریخ ساز اجلاس ہوا۔ اجلاس میں شرکت کرنے والے علماء کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی، نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، برادرِ بزرگ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۲) حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

(۳) حضرت مولانا سراج احمد صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند

(۴) حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ فرزند حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند

(۵) حضرت مولانا محمد طاہر صاحبؒ فرزند حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

(۶) حضرت مولانا حاجی نور احمد صاحب پسروری امرتسریؒ

(۷) حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ فاضل دیوبند (ایڈیٹر اخبار اہل حدیث)

(۸) حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری رحمۃ اللہ علیہ

(۹) امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۰) حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ

ان اکابر کے علاوہ اور بھی علاقہ کے بڑے بڑے علماء اس تاریخی اجلاس میں شریک ہوئے۔ اجلاس سے قبل ۱۸/مارچ ۱۹۲۱ء میں قصبہ بٹالہ میں حضرت مولانا سراج احمد صاحب، حکیم مولوی ابوتراب عبدالحق صاحب اور حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمہم اللہ اجمعین کی عالمانہ اور محققانہ ایسی تقریریں ہوئیں کہ مرزائی اس کی تاب نہ لا سکے اور بوکھلا کر سطحی قسم کے اعتراضات کرنے لگے۔ اسی قسم کے ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے حضرت حکیم الاسلام کی تقریر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ واضح رہے کہ تقریر کی اصل رپورٹ اسی زمانہ میں انجمن کی جانب سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا اختصار کرتے ہوئے مولانا ازہر شاہ قیصر رحمۃ اللہ علیہ نے ماہنامہ دارالعلوم کے شمارہ نمبر (۴۸) ج ۴، جنوری ۱۹۷۵ء میں حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ اہتمام میں شائع فرمائی تھی چوں کہ یہ تحریر خود حضرت حکیم الاسلام کی نظر سے بھی گذر چکی ہے اس لئے اس کی معتربیت میں اور اضافہ ہوجاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کرنے سے پہلے یہ پس منظر ذہن میں رکھنا چاہئے کہ قادیانیوں نے چوں کہ تحریک خلافت میں انگریزوں اور غیر مسلموں کا ساتھ دے کر عملی طور پر یہ ثبوت دیا تھا کہ قادیانی نہ مسلمان ہیں اور نہ ہی وہ مسلمانوں کے ساتھ کسی اجتماعی وانفرادی معاملہ میں شریک رہنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ خلافت عثمانیہ کے سقوط پر انہوں نے قادیان میں گھی کا چراغ جلا کر انگریزوں کے ساتھ جشن منایا اور اپنے اسلام دشمنی کی خوب خوب داد انگریزوں سے وصول کی۔ اس اجلاس میں کسی مقرر نے ان کو ان کے کردار کا عملی آئینہ دکھایا تو انھوں نے اعتراض کیا۔ ملاحظہ فرمائیے وہ اعتراض اور اس کا حکیمانہ ومسکت جواب: بقلم ازشاہ قیصر:

تاریخی اجلاس میں حضرت حکیم الاسلامؒ کا خطاب

''حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اثنائے تقریر میں فرمایا'' یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اب جو خلافت کے متعلق رونا رویا جاتا ہے یہ پہلے کیوں نہ رویا جاتا تھا''۔

اس کے متعلق ایک مثال دیتا ہوں تاکہ جواب جلدی سمجھ میں آجائے مثلاً ایک شخص کے پاس چالیس

روپۓ تھے اس نے دس روپۓ کا تو بازار سے سودا خریدا اور تیس روپۓ کسی چور نے چرا لئے۔ اب وہ اپنے نقصان پر روتا چلاتا ہے تو اسے یہ کہے جانا کہاں تک حق بجانب ہے کہ تیس روپیوں کے لئے پہلے تو نہ روتا تھا اب کیوں روتا ہے؟ ارے بھائی پہلے تو روپۓ اس کے پاس تھے تو رونے چلانے کی ضرورت نہ تھی۔ اب جب غریب کی چوری ہوگئی تو رونے چلانے اور تلاش کی ضرورت لاحق ہوئی۔

فاضل مقرر نے ایسے ہی اور ایک مثال دی کہ کسی کا لڑکا مکان کی چھت سے گر کر بیہوش ہوگیا، تھوڑی دیر غشی میں رہا، بولا نہیں، لیکن جب ذرا رویا تو اس کے والدین یہ معلوم کر کے خوش ہوئے کہ غنیمت ہے کہ مرا تو نہیں، اگرچہ اس کو چوٹیں آئی ہیں پر مرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ اس رونے سے اس کی زندگی کا تو ثبوت ملتا ہے۔

ہمارے رونے کا بھی یہی نتیجہ سمجھو اور غنیمت جانو کہ ہم رو چلا کر اپنی زندگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

علیٰ ہٰذا ایک تیسری مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ: جھاڑو گھر صاف کرنے کو ہوتی ہے بشرطیکہ قوی رسی سے خوب باندھا گیا ہو، ورنہ کھلی تلیاں چاہے کتنی زیادہ ہوں بے کار ہیں۔ لہٰذا خلیفہ بجائے رسی کے ہے جس سے مسلمان بندھے رہتے ہیں اور ان کی قوت یک جا ہو کر جھاڑو کی تلیوں کی طرح مفید پڑتی ہے۔

اجلاس عام کی پہلی نشست ۱۹؍ مارچ میں بعد نماز ظہر منعقد ہوئی۔ اجلاس عام کا نقشہ اور مولانا محمد طاہر صاحبؒ فرزند اصغر حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تلاوت اور صدر جلسہ کی تقریر کا خلاصہ نقل کرتے ہوئے مولانا ازہر شاہ قیصر تحریر فرماتے ہیں: ''کھانا کھانے اور نماز ظہر سے فارغ ہونے کے بعد علماء کرام جلسہ گاہ میں تشریف لائے، ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے بمشکل اسٹیج تک رسائی ہوئی۔ قاری عبدالکریم صاحب امرتسری نے قرآن کریم کا رکوع نہایت موزوں لہجے میں پڑھا اس کے بعد بہ تجویز قاضی ظفر الحق صاحب امام جامع مسجد بٹالہ اور بتائید جمیع حاضرین حضرت مولانا حبیب الرحمٰن نائب مہتمم مدرسہ دارالعلوم دیوبند صدر قرار پائے۔ بعد تقرر صدر جناب قاری محمد طاہر صاحب دیوبندی نے رکوع ''وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' بہترین لہجہ میں پڑھا، ان کے بعد صدر نے حمد وصلوٰۃ پڑھ کر فرمایا: یہ پہلا موقع ہے کہ میں ان متبرک صورتوں کے سامنے اللہ اور رسول کے احکام سنانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ لہٰذا اس نعمت خداوندی کا میں جس قدر بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ میں خود کچھ بھی نہیں مگر ایک ایسی جگہ ''دیوبند'' کی طرف منسوب ہوں جسے دنیا بھر کا مرکز علم تسلیم کیا گیا ہے، میں خود کوئی کمال نہیں رکھتا مگر اس جگہ سے آیا ہوں جس نے فیض علمی

کو دنیا میں پھیلا دیا ہے۔اسی کے طفیل آپ نے مجھے صدر بنایا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان تین روز میں انشاء اللہ آپ بڑے بڑے وعظ سنیں گے، تعارف کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہے اور یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ یہاں کسی پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔البتہ مخالفوں کی تردید کی جائے گی۔امید ہے کہ تمام امور نیک نیتی پر محمول کئے جائیں گے۔(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ص ۲۹، جنوری ۱۹۷۵ء)

اجلاس کی دوسری نشست میں بعد نماز مغرب حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی کا بیان تھا۔ اس اجلاس کا آغاز حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا، اسی طرح ۲۰ مارچ کے اجلاس کی پہلی نشست میں بابو پیر بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ سکریٹری انجمن تائید الاسلام لاہور کا بیان پہلے سے طے تھا اور آپ کا خصوصی مضمون تھا ''اثبات حیات مسیح علیہ السلام'' اس نشست کا آغاز حضرت مولوی محمد طاہر صاحب دیوبندی کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔اس نشست میں بابو پیر بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے بعد حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ کا بیان ہوا۔اس کے بعد پھر حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت مقرر کرسی پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔اس خطبہ کا اختصار ملاحظہ فرمایئے از ہرشاہ قیصرؒ کے قلم سے تاکہ اس تاریخی خطاب کی تاریخیت وافادیت ومعتبریت قلم بدلنے سے مجروح نہ ہو۔

''آپ نے خطبہ متضمن برحمد وصلوٰۃ کے بعد یہ حدیث شریف باتمام پڑھی بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَھَادَۃُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الخ۔اور فرمایا حضرات! میں مقرر کی صورت میں نہیں بلکہ ایک معمار کی حیثیت سے کھڑا ہوا ہوں اور غالباً کہا جائے گا کہ اس جلسہ میں تو مرزا غلام احمد کے عقائد پر کھے جارہے ہیں تو کوئی عمارتی جلسہ نہیں۔

ہاں، میں دین الٰہی (ایمان واسلام) کا ایک زبردست قلعہ بناؤں گا جس کی پناہ میں قرآن وحدیث پر کوئی حملہ نہ کرسکے، نہ کہ مرزاجی کا منارۃ المسیح یا مسجدِ نور۔

جب کوئی عمارت بنائی جاتی ہے تو اس کی بنیادیں حتی الامکان مضبوط کی جاتی ہیں، اگر بنیادیں مضبوط نہ ہوں تو عمارت پائیدار نہیں ہوتی۔ایسا ہی ایمان واسلام کا ایک عظیم الشان محل ہے اور وہ یوں بنایا گیا ہے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه سے شروع کیا گیا ہے۔یہ اس وقت بنایا گیا ہے جب کہ ظلمت وکفر کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔کہا گیا ہے کہ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ اور وہ کلمہ کیا تھا اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِکَ بِهٖ شَیْئًا جب حضورؐ کی ذات پاک مبعوث ہوئی تب خدا کو تو لوگ خالق مانتے ہی تھے البتہ شرک فی العبادات

کرتے تھے کیوں کہ جب ان سے پوچھا جاتا کہ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰہُ لہٰذا آپؐ نے سب سے اول جو دیوار اٹھائی وہ نماز ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُوَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پھر شرک فی الاستعانت کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اب چاہتے کہ ہم سب مل کر ستون دین کو استوار کریں۔ اَلصَّلوٰۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ۔

دوسری دیوار زکوٰۃ اور تیسری صوم اور چوتھی حج بیت اللہ شریف، گویا چاروں دیواریں قائم کر دیں، ہاں وہ دن آنے والا ہے کہ ہم کو یہ قلعہ جس کی نہ اس وقت بنیاد نہ دیوار نظر آتی ہے سب کچھ نظر آنے لگے گا۔ اس کے بعد حدیث بیان فرمائی کہ قیامت میں کوئی محلات نہیں بلکہ جو کچھ خود کرو گے وہی تم کو ملے گا۔ آپ اپنے لئے خود محلات یہاں تعمیر کر سکتے ہیں میں یہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نقل کرتا ہوں۔ شرح الصدور میں ہے اِنَّمَا النَّاسُ نِیَامٌ اِذَا مَاتُوْا اِنْتَھَبُوْا یعنی لوگ سوئے پڑے ہیں جب مریں گے تو متنبہ ہوں گے۔ دنیا کے اموال، مکانات وغیرہ جو دکھائی دیتے ہیں سب خواب کی مثال ہیں، جیسے کوئی خواب دیکھتا ہے لیکن ایسے شخص کو اگر ہتھکڑی ڈال کر جیل بھیج دیا جائے تو اس خواب کا کیا اسے کچھ لطف آ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! لہٰذا جس عمارت کا نقشہ میں آپ کے سامنے کھینچ رہا ہوں اس کا انتظام کر لیں اور حسنِ عمل سے مدد کریں گو ایسا کرنے سے تکالیف اور مصائب کا آنا لازمی ہے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کہا جائے گا سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْھَا خٰلِدِیْنَ سو یہ چند منٹ کی بات ہوتی ہے اس کے بعد سب کچھ نظر آجاتا ہے یعنی بعد موت کے۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ جنت کی بابت کہا جاتا ہے بہشت اتنا بڑا کیسے ہوسکتا ہے؟ اسے عام فہم بنانے کے لئے ایک بچے کی مثال بیان کی جو رحم مادر میں ہے اور اسی کی وسعت اور خوبی کی تعریف کرتا ہے، باوجودیکہ اس کی غذا خون ہے مگر جب دنیا میں آکر اپنے ہی مکانات کو دیکھ پاتا ہے تو ان سے زیادہ وسیع اور بہتر دوسری جگہ کو نہیں سمجھتا، فاضل مقرر نے اس وقت مولانا جامیؒ کا ایک شعر پڑھ کر بتایا کہ وہ اس شخص کو اپنے گھر سے باہر جانے کی ترغیب دیتے ہیں کہ قادیان، بٹالہ گورداس پور، لاہور، امرتسر وغیرہ وغیرہ شہروں میں جاکر دیکھیں کہ دنیا کی کیا حالت ہے؟ جب وہ گھر سے نکل کر دوسرے شہروں کی سیر کرتا ہے تب اس کی آنکھ کھلتی ہے اور معلوم کرتا ہے کہ دنیا اس سے بہت بڑی ہے جو کچھ میں سمجھا ہوا تھا، اس کے بعد اس سے کہا جاتا ہے کہ ایک عالم اس سے بھی بڑا ہے اور وہ مَالَا عَیْنٌ رَأَتْ وَ لَا اُذُنٌ سَمِعَتْ تب اس کو کہا جاتا ہے کہ پہلے تم ہمارا کہا نہ مانتے تھے جواب ماننا پڑا۔ لہٰذا اب تم کو حضرت رحمۃ للعالمین کا فرمان بھی ماننا چاہئے یعنی یہ کہ بہشت ایک بہت بڑا وسیع عالم ہے۔

۲۰ مارچ میں اجلاس کی دوسری نشست بعد نماز ظہر رکھی گئی تھی جس میں مناظر اسلام حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہوا، پھر حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی کا بیان ہوا اور اخیر میں تحفظ ختم نبوت کے سرخیل سرتاج، ختم نبوت کے عاشق زار، استاذ العلماء، دارالعلوم کے صدر المدرسین حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا عالمانہ خطاب ہوا۔

۲۰ مارچ کی بعد نماز ظہر کی نشست میں حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی ثم مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا خطاب ہونا تھا۔ حضرت کے خطاب سے پہلے اس نشست میں پہلے حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اور پھر اس کے بعد آپ کے برخوردار حضرت مولانا محمد طاہر صاحب، حضرت قاسم العلوم کے دونوں نبیروں نے یکے بعد دیگر تلاوت قرآن کریم فرمائی، اس کے بعد حضرت مولانا بدر عالمؒ کا تفصیلی خطاب ہوا، پھر تیسرے دن کے اختتامی اجلاس میں صدر جلسہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کا صدارتی خطاب ہوا۔

قادیان میں بہت سے قادیانی تائب ہوئے

الحمد للہ اس اجلاس میں علماء دیوبند کے بیانات سے بہت سارے قادیانی قادیانیت سے تائب ہوکر حلقہ بگوش اسلام ہوئے جن میں چودھری سلطان علی صاحب گورداسپور، چودھری برکت علی صاحب داروغہ ضلع گورداسپور، چودھری برکت علی کے بھائی اور حکیم غلام محمد صاحب وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ بڑے پرانے قادیانی تھے۔ عرصہ دراز سے مرزائی ہونے کی وجہ سے رشتے ناطے بھی قادیانیوں سے خوب تھے لیکن الحمد للہ حق وصداقت کی آواز سن کر بلاخوف لومۃ لائم علماء دارالعلوم دیوبند کے ہاتھوں مرزائیت سے تائب ہوکر دین اسلام میں داخل ہوگئے۔

ناظرین کرام! دارالعلوم دیوبند کے بانیین میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا نمایاں نام آتا ہے۔ یقیناً اس کی بنیاد میں اس کے بانیوں کا اثر ہمہ وقت کارفرما ہے، اس عظیم درس گاہ کی تربیت زندگی کو ایک ایسے رخ پر ڈالنے کی ضامن ہے کہ اس کا فاضل کبھی محدث، کبھی مفسر، کبھی مناظر، گاہے میر کارواں اور گاہے مبلغ دین۔ الغرض دینی خدمات کے لئے ہمہ جہت کوششوں کا امین ہوتا ہے۔ اس درس گاہ سے تربیت یافتہ کوسلیہ پنجاب اور اس کے ہمراہیوں کے مقابل میں فریضہ حق وصداقت ادا کرتے ہوئے میدان میں شمشیر بدست بھی دیکھا جاسکتا ہے اور خانقاہوں کے گوشوں میں بھی مصروف وہ تبلیغ دین کے لئے کمر بستہ نظر آئے گا۔

ان روایات پارینہ کی امین حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی بھی تھی۔

اس تاریخی واقعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تحفظ ختم نبوت کی کوئی نشست حکیم الاسلامؒ اور ان کے برادر خوردار کی تلاوت یا تقریر سے خالی نہیں جاتی۔ ختم نبوت کے تحفظ کی ہمہ جہت خدمت میں دونوں برادران پیش پیش ہوتے ہیں۔ جو اس موضوع سے ان کی دلچسپی کی ایک بین دلیل ہے۔

تحفظ ختم نبوت کے میدان میں خاص اس نام سے تو نہیں لیکن دیگر موضوعات پر تصنیفات و مضامین کی شکل میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمات منظر عام پر داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ آپ کی تحریر عشق نبویؐ سے سرشار اور طرز تحریر کس قدر دل کش ہوتی اور اپنے اندر جاذبیت و معنویت رکھتی ہے کہ فاتح رِبُوۂ، سفیر ختم نبوت، استاذ محترم حضرت مولانا منظور احمد صاحب چنیوٹی نور اللہ مرقدہٗ نے جب ''مرزائیت کے زریں اصول'' پر نظر ثانی فرمائی تو مسئلہ ختم نبوت کی وضاحت میں ایک موقع پر حضرت حکیم الاسلام کی ایک مقبول عام تصنیف ''آفتاب عالم'' کا ایک پورا اقتباس حضرت حکیم الاسلامؒ کے ہی حوالہ سے اپنی کتاب میں شامل فرما دیا جس کا ایک ایک لفظ اور ہر ہر جملہ کی ترتیب جہاں عشق نبوی ﷺ کی خوشبو ٹپکتی ہے وہیں عدم اجراء نبوت کی دلیل بن کر مرزائیوں کے سینہ پر برق تپاں کی طرح گرتی اور مرزائیوں کے مکر و فریب کے سارے تانے بانے خاکستر کرتی نظر آتی ہے۔ ایک طرح حضرت چنیوٹی نے اپنی مسلمہ تاریخی کتاب میں شامل کر کے اس اقتباس کو بھی تاریخی حیثیت کا حامل بنا دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ''تشبیہ کی وجوہات'' عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

''حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہٗ نے تشبیہ کی چند وجوہات ذکر کی ہیں۔ وہ ہدیۂ قارئین ہیں۔

(۱) جس طرح دنیا کی مادی زندگی، کون و مکان کی روشنی، حرارت، زندگی کے لوازمات، نباتات کی نشو و نما، سورج کے وجود کے ساتھ مشروط ہے اسی طرح روح کی نشو و نما، حرارت ایمانی، علم، اخلاق، معرفت الٰہی، قلبی واردات کی گرم بازاری بھی صرف آنحضرت ﷺ کی وجہ سے ہے۔

(۲) جس طرح مادی آفتاب کے لئے ایک محور کی ضروری ہے جس پر وہ حرکت کرے اور وہ فلک ہے اسی طرح روحانی آفتاب کے لئے بھی نبوت کا آسمان مرکز اور محور ہے۔

(۳) جب سورج نہیں رہتا تو اندھیرا چھا جاتا ہے۔ مصنوعی روشنیاں اندھیرا دور نہیں کر سکتیں۔ جب تاریکی بہت ہو جائے تو ستارے نکلتے ہیں۔ پورا آسمان جگمگا اٹھتا ہے۔ پوری کائنات میں ہلکی روشنی آ جاتی ہے پھر سورج نکلتا ہے تو اندھیرا مکمل طور پر بھاگ جاتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جب کائنات میں ظلم، شرک،

جہالت، نفسانی خواہشات اور شبہات کے اندھیرے چھا گئے تھے تو حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک لاکھوں پیغمبر آسمان نبوت پر ستاروں کی طرح طلوع ہوئے لیکن لاکھوں ستارے مل کر بھی رات کو دن نہیں بنا سکتے۔ رات کی تاریکی دور کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ آسمان نبوت پر نمودار ہوئے۔ تاریکیاں چھٹ گئیں، خزاں بہار سے بدل گئی۔

(۴) جس طرح سورج طلوع ہونے کے بعد ستاروں کے ظلی اور فروعی نور کی کوئی حاجت نہیں رہتی، ایسے ہی خاتم النبیین ﷺ کے آجانے کے بعد کسی بھی نجم ہدایت (پیغمبر) کے نور کی حاجت نہیں رہتی۔

(۵) جس طرح سورج تمام ستاروں کے بعد آخر میں نکلتا ہے تا کہ نورانیت کی ہر پچھلی کمی پوری کر دے ایسے ہی حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کو آخر الانبیاء بھی بنایا گیا تا کہ آپ کا زمانہ بھی سب نبیوں کے آخر میں رہے تا کہ آخری عدالت کا فیصلہ، ہر ابتدائی عدالت کے فیصلوں کے لئے حرف آخر اور ان کے حق میں ناسخ ثابت ہو۔

............❖............

حکیم الاسلامؒ مولانا محمد طیب صاحبؒ اور مسئلہ اجتہاد

پروفیسر الطاف احمد اعظمی

ہمدرد یونیورسٹی، دھلی

اجتہاد کا مسئلہ تقریباً ہر دور میں امت کے اربابِ فکر ونظر کے درمیان بحث وتحقیق کا موضوع رہا ہے۔ اس باب میں اب دو مختلف مکتبِ فکر وجود میں آچکے ہیں۔ ایک مکتب فکر اس بات کا قائل ہے کہ اجتہاد ہر دور میں ضروری ہے۔ اجتہاد سے اس کی مراد اجتہادِ مطلق مستقل ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی اور اس کے مختلف ادارات کے احوال ومسائل برابر بدلتے رہے ہیں اور آئندہ بھی بدلتے رہیں گے اس لئے کسی ایک دور کا اجتہاد اور اس پر اس دور کے علماء وفقہاء کا اجماع کافی نہیں ہے۔ اس مکتب فکر کے سب سے بڑے حامی علامہ ابن حزمؒ اور امام ابن تیمیہؒ تھے۔ موخر الذکر نے، جو حنبلی مسلک رکھتے تھے، تیرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں اسلامی قانون سازی میں حرفِ آخر (Finalily) کے تصور کی مخالفت کی اور علامہ ابن حزمؒ کی طرح فقہ حنفی کے اصولِ قیاس واجماع (analogy and consensus) کو رد کر دیا۔(۱)

اس کے برخلاف دوسرے مکتب فکر کا خیال ہے کہ چوتھی صدی یعنی فقہ کے دبستانِ اربعہ کی تشکیل و تدوین کے بعد اجتہادِ مطلق مستقل کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ہاں، اگر اشد ضرورت داعی ہو تو اس سے کم تر درجے کے اجتہاد کو ائمۂ فقہ کے مقرر کردہ اصول وقواعد کی روشنی میں روبہ عمل لایا جا سکتا ہے۔ اس اجتہاد کا مطلب ائمہ فقہ کے مستخرجہ جزئیات میں ترجیح انتخاب ہے نہ کہ ان جزئیات سے صرف نظر کر کے بالکل نئے

سرے سے نصوصِ قرآن وسنت کے مطابق نئے عملی جزئیات کا استخراج۔ اس نوع کے اجتہاد کا نام فقہ کی اصطلاح میں اجتہاد فی الفتویٰ ہے (۲)۔

یہ سوال بہت اہم ہے اور برابر اٹھایا گیا ہے کہ آخر چوتھی صدی کے بعد اجتہاد مطلق مستقل کی اجازت کیوں نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب بالعموم یہ دیا جاتا ہے کہ بعد کے ادوار میں ایسے افراد اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور تھے جو ائمہ سلف کی سی دقّت نظر اور علمی رسوخ رکھتے ہوں۔ ان حالات میں اجتہادِ مطلق کی اجازت دینے کا مطلب دین میں بدعت وضلالت اور تحریف والحاد کا دروازہ کھولنا تھا۔ امت کی جماعتی اور مذہبی زندگی کی شیرازہ بندی اور اس کو مذہبی اختلاف وتشتّت سے محفوظ رکھنے کے لئے نہایت ضروری تھا کہ اجتہادِ مطلق پر روک لگائی جائے۔ عالمانِ کوتاہ نظر کے اجتہادات کی پیروی سے زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ ائمہ سلف کے اجتہادات کی تقلید کی جائے، جن کے علم وعمل دونوں معتبر تھے۔ علامہ اقبال نے اپنی مشہور شعری تالیف ''جاوید نامہ'' میں اس طرزِ فکر کی حمایت کی ہے (۳)۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مضمحل گردد چو تقویمِ حیات ملت از تقلید می گیرد ثبات
راہِ آبا رَو کہ ایں جمعیت است معنیٔ تقلید ضبطِ ملّت است
درخزاں ای بے نصیب از برگ و بار از شجر مگسل بامیدِ بہار
پیکرت دارد اگر جانِ بصیر عبرت از احوالِ اسرائیل گیر
نقش بردل معنیٔ توحید کن چارہ می کارِ خود از تقلید کن
اجتہاد اندر زمانِ انحطاط قوم را برہم ہمی پیچد بساط
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر اقتدا بر رفتگانِ محفوظ تر

اس اختلاف کے پس منظر میں دیکھنا ہے کہ اس مسئلے میں حکیم الاسلام کا نقطۂ نظر کیا تھا اور مذکورہ بالا مکاتبِ فکر میں سے کس مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں راقمِ سطور نے ان کی متفرق تحریروں کو دیکھا تو جس تحریر نے دامنِ نظر کو شدت کے ساتھ اپنی طرف کھینچا وہ ان کا خطبۂ صدارت ہے جو انھوں نے ۲۶ / دسمبر ۱۹۷۶ء کو ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں منعقدہ سیمینار میں پیش فرمایا تھا۔ اس سیمینار کا موضوع تھا ''فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ''۔ میری نظر میں اس خطبے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس میں فکر ودانش کے موتی جا بہ جا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اس کی ایک ایک سطر سے عیاں ہے کہ وہ مسئلہ

اجتہاد کے ہر پہلو سے کامل واقفیت رکھتے تھے۔ان کی نگاہ بڑی باریک بیں اور نکتہ رس تھی۔

اصولی طور پر حکیم الاسلامؒ عصر جدید کے پیچیدہ احوال و مسائل کے پیش نظر اجتہاد کے قائل تو تھے لیکن اس بارے میں بہت حساس اور محتاط واقع ہوئے تھے۔ان کے نزدیک اجتہاد کا تعلق عقائد و عبادات سے نہیں، صرف معاشرتی و سیاسی اور اجتماعی معاملات سے ہے۔فرماتے ہیں:

''قواعدِ کلیہ میں جو ضوابط عبادات اور عقائد کے بارے میں ہیں ان کی عملی جزئیات بھی شریعت نے خود متعین کر دی ہیں، اس لئے اس میں تغیر، تبدل یا کسی جدید تشکیل کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔البتہ معاملاتی، معاشرتی اور سیاسی و اجتماعی امور میں چوں کہ زمانے کے تغیرات سے نقشے ادلتے بدلتے رہتے ہیں اس لئے شریعت نے ان کے بارے میں کلیات زیادہ بیان کی ہیں اور ان کی جزئیات کی تشخیص کو وقت کے تقاضوں پر چھوڑ دیا ہے، جن میں اصول و قواعد کے تحت توسّعات ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے'' (۴)

اس سلسلے میں انہوں نے دو بنیادی امور کی طرف اصحابِ تعلیم کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ایک یہ کہ اللہ نے انسان کو فکر کی قوت عطا فرمائی ہے اور یہ اس کی ایک بڑی نعمت ہے۔یہی جوہرِ گراں مایہ انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتا ہے اور اس کو ایجاد و اختراع کی طرف مائل کرتا ہے۔مولانا کی یہ بحث بڑی جامع اور فکر انگیز ہے۔دوسرے یہ کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو بعض پابندیوں کے ساتھ آزادئ ضمیر اور حریت رائے عطا کی ہے اس خصوصیت میں کوئی دوسرا مذہب اس کا حریف نہیں ہے۔

دین کے اس امتیازی وصف کے اثبات میں انہوں نے اقامتِ صلوٰۃ (امامتِ صغریٰ) اور قیامِ خلافت (امامتِ کبریٰ) کو پیش فرمایا ہے۔دین کے ان دو مختلف ادارات کے ترکیبی عناصر اور ان کی تنظیمی ہیئت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اپنے پیروؤں کی جن میں ان کے حاکم بھی شامل ہیں، تعلیم و تربیت کس طرح کرتا ہے اور ان کو کس نوع کا دینی و ملی مزاج عطا کرتا ہے اور کس درجہ حکیمانہ طریقے سے انہیں قیدو آزادی کے حدود سے آشنا کرتا ہے۔اس دلچسپ بحث کو خود انہی کے لفظوں میں ملاحظہ کیجئے۔

''امامتِ صغریٰ (جماعت صلوٰۃ) کے جو طور طریقے رکھے گئے ہیں وہی نوعی طور پر امامت کبریٰ اور اسٹیٹ میں بھی ہیں۔اس میں صورت حال کے تحت دیکھا جائے تو نماز کے مقتدیوں کو امام کا بھی پابند انتہائی طور پر کیا گیا ہے مقتدی اس سے ذرا بھی منحرف ہو تو اس کی نماز صحیح نہیں ہو سکتی۔چنانچہ اس مسجد کی امارت اور اسٹیٹ مقتدیوں پر فرض ہے کہ جب امام نیت باندھے تو مقتدی بھی ساتھ ساتھ نیت کر کے ہاتھ باندھیں، وہ قیام میں ہو تو یہ بھی قیام کریں، وہ رکوع کرے تو یہ بھی رکوع کریں، وہ قیام میں جائے تو یہ بھی

قیام کریں، سجدے میں جائے تو یہ بھی سر بسجود ہو جائیں، وہ "ولا الضالّین" کہے تو یہ آمین کہیں، حتی کہ اگر امام سے سہواً کوئی جزئی غلطی بھی سرزد ہو جائے اور وہ سجدۂ سہو کرے تو مقتدی بھی اس کی خطا میں ساتھ دیں اور سجدۂ سہو کریں۔ لیکن حریت و آزادی یہ ہے کہ اگر امام قرأت یا افعال صلوٰۃ میں کوئی ادنیٰ سی بھی غلطی کر جائے تو ہر مقتدی کو نہ صرف ٹوک دینے کا حق ہے بلکہ مقتدی اس وقت تک امام کو چلنے نہیں دے سکتے جب تک وہ اپنی غلطی کی اصلاح نہ کرے، بعینہٖ یہی صورت امامت کبریٰ یعنی اسٹیٹ اور ریاست کی بھی ہے کہ امیر المؤمنین کی سمع وطاعت تو ہر معاملے میں واجب ہے ورنہ تعزیر وسزا کا مستحق ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی خود امیر کی کسی خطا ولغزش پر ایک عامی سے عامی آدمی بھی برملا روک ٹوک کرنے کا حق رکھتا ہے جب تک کہ امیر اس فعل کی اصلاح نہ کرلے یا اس کا کوئی صحیح عذر سامنے نہ رکھے (۵)۔"

بطور مثال انہوں نے اس مشہور واقعے کا ذکر کیا جس کا تعلق خلیفۂ ثانی سے ہے کہ ایکبار وہ منبر پر کھڑے ہوئے اور کہا: **اسمعوا و اطیعوا** "سنو اور اطاعت کرو" یہ سن کر ایک بدّو کھڑا ہو گیا اور کہا "ہرگز نہیں، پہلے یہ بتاؤ کہ یہ چادر جو تم نے اوڑھ رکھی ہے کس طرح تیار ہوئی؟ جب ان کے بیٹے (عبداللہ بن عمرؓ) نے معاملے کی وضاحت کی تو بدو مطمئن ہو گیا اور پھر بولا "اب ہم سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے"۔ (۶)

اس بحث سے ان کا مقصود جیسا کہ راقم نے سمجھا ہے، یہ نکتہ ذہن نشین کرانا ہے کہ اسلام میں نہ مطلق پابندی ہے اور نہ ہی مطلق آزادی، یہ دونوں کا مرکب ہے۔ اس میں اگر تقلید ضروری ہے تو حریت رائے کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جب دین اسلام کا یہ مزاج ہے کہ امام نماز اور خلیفۂ وقت کو کسی غلطی کے ارتکاب کی صورت میں ٹوکا جا سکتا ہے تو پھر کسی مجتہد سے، اگر وہ کسی فکری خطا کا مرتکب ہو یا اس کی فکر زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو، اختلاف بالکل جائز ہوگا لیکن جس طرح امام نماز اور خلیفہ کو ٹوکنے کا مجاز صرف وہ شخص ہے جو صلوٰۃ اور کارِ خلافت میں شریک ہو، اسی طرح کسی مجتہد عالم کی رائے اور فکر سے اختلاف اور اس کی اصلاح کا حق ہر کس و ناکس کو نہیں بلکہ صرف ان اشخاص کو حاصل ہے جو قرآن وسنت کے فہم و درک میں رسوخ رکھتے ہوں۔

حکیم الاسلامؒ نے مسئلہ اجتہاد کے جس دوسرے پہلو پر بتکرار روشنی ڈالی ہے وہ اسلامی شریعت کے اصول اور اس سے مستنبط جزئیات میں باعتبار تغیر فرق کی نوعیت ہے۔ اصول وکلیات ناقابل تغیر ہیں اور اس پر جملہ علماء وفقہاء کا اتفاق ہے لیکن کیا جزئیات بھی جن کا تعلق معاملات سے ہو، حالات وظروف کی تبدیلی

کے باوجود قابل تبدّل ہیں؟ حکیم الامتؒ کا رجحان نفی کی طرف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''احوال ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔ حال کے معنی ہی ماحال فقد زال کے ہیں (یعنی جو حال آیا وہ زائل بھی ہوگا) پس حال تو بدلنے ہی کے لئے بنایا گیا ہے۔ لیکن اصولِ فطرت بدلنے کے لئے نہیں لائے گئے ہیں، وہ اپنی جگہ اٹل ہی رہیں گے، البتہ ان شرعی اصولوں میں ایسی وسعتیں رکھی گئی ہیں کہ وہ ہر بدلتی ہوئی حالت میں وقت کے مناسب رہنمائی کرسکیں۔ (۷)

ایک دوسری جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ ''ان اصولوں کی وسعتوں میں ایسی گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ ان سے ہر دور کے مفکر اور اہل علم وفضل نے استخراجِ مسائل کی حد تک کام بھی لیا ہے اور آج بھی لے سکتے ہیں، جن میں ہر دور کے حوادث کے لئے سامان ہدایت موجود ہے۔ اس لئے تمدن و معاشرت کی مشخص عملی جزئیات اور سننِ زائدہ پر اس قانون فطرت نے زیادہ زور نہیں دیا بلکہ اسے وقت اور زمانے کے حوالے کر دیا ہے جو ہر زمانے میں نئی نئی صورتیں بدلتی رہتی ہیں، انہیں اہل علم ان کے اصولوں سے وابستہ کر کے ان کے احکام نکال سکتے ہیں۔'' (۸)

لیکن اس عبارت سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حکیم الاسلامؒ اجتہادِ مطلق کے حامی تھے۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ دیگر حنفی فقہاء وعلماء کی طرح اس نوع کے اجتہاد کے منکر تھے۔ انہوں نے جس طرح کے اجتہاد کی تائید کی ہے اس کا تعلق ائمہ فقہ کے مستخرجہ جزئیات میں ترجیح وانتخاب ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ائمہ سلف نے قرآن وسنت کے نصوص کی روشنی میں خوب غور وفکر کر کے عملی جزئیات مقرر کر دئیے ہیں حتی کہ بعید سے بعید تر محتملات کے بھی جزئیات کا تعین کر دیا ہے اس لئے فکر ونظر کی سلامتی اس میں ہے کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔ لکھتے ہیں:

''ہر دور کے حوادث میں نوعی طور پر یکسانی ہوتی ہے گو حادثوں کی شکلیں حسب زماں ومکاں کچھ جدا جدا بھی ہوں، اس لئے وہی جزئیات (جو پہلے نکالی جاچکی ہیں) آج کے حوادث میں بھی بے کار ثابت نہیں ہوسکتیں اور کچھ نہیں تو آج کی جزئیات کو کم از کم ان پر قیاس تو ضرور ہی کیا جاسکتا ہے، بلکہ بہت ممکن ہے کہ فقہیات میں ایسی جزئیات بکثرت مل جائیں جو آج کے دور میں بھی سابق دور کی طرح کارآمد ثابت ہوں اور حالات کا مقابلہ کرسکیں۔ ضرورت اگر ہوگی تو باب وار تلاش وجستجو کی ہوگی۔ یہ جزئیات چوں کہ فقیہانہ ذہنوں سے نکلی ہوئی ہیں اس لئے بہ نسبت ہماری استخراج کردہ جزئیات کے منہاجِ نبوت سے زیادہ قریب ہوں گی۔ اس لئے بجائے اس کے کہ ہم ازسرِ نو قواعدِ کلیہ سے جزئیات کا استنباط کرنے کی مشقت میں پڑیں

یہ زیادہ سہل ہوگا کہ استخراج شدہ جزئیات کی تلاش وتربیت میں وہ محنت ومشقت استعمال کریں''(۹)

یہ کام یقیناً بہت اہم ہے کہ اورارباب فقہ کو یہ کام کرنا چاہئے کہ جس کی طرف اب تک توجہ نہیں ہوئی ہے یا بہت کم ہوئی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جدید تہذیب وتمدن نے بہت سے ایسے مسائل وحوادث جنم دیئے ہیں جن کا وجود ماضی میں نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے سماجی واجتماعی مسائل سے بھی امت دوچار ہے جو نئے تو نہیں لیکن ان کی شکل وصورت کافی تبدیل ہوگئی ہے اور ان کے لئے ایک نیا اطلاقی قالب درکار ہے۔ ان مسائل سے پہلوتہی کرنے یا اجتہاد فی الفتویٰ میں ان کا حل ڈھونڈنے کے معنی یہ ہوں گے کہ اسلامی فکر جامد ہے اور اسلام کے قوانین میں حرکت پزیری کی صلاحیت کا فقدان ہے، جیسا کہ اس کے مخالفین کہتے ہیں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ بڑا کام کون کرے؟ علماءِ سلف نے ایک مجتہد کے لئے جو شرطیں رکھی ہیں جن کے بغیر اجتہاد کے کوچے میں قدم رکھنے سختی کے ساتھ ممانعت ہے، وہ بڑی کڑی شرطیں ہیں اور ان کا کسی ایک فرد میں جمع ہونا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ بعض علماء نے ان میں کچھ تخفیف بھی کی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی معروف کتاب ''عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید'' میں علامہ بغوی کے حوالے سے لکھا ہے:

''ولا بأس ان یورد کلام البغوی فی هذا الموضع. قال البغوی والمجتهد من جمع خمسة انواع من العلم: علم کتاب الله و علم سنة رسول الله و علم اقاویل علماء السلف من اجماعهم واختلافهم وعلم اللغة وعلم القیاس وهو طریق استنباط الحکم عن الکتاب والسنّة اذا لم یَجِدْه صریحا فی نصِّ کتاب او سنة او اجماع الخ. (۱۰)

''کچھ مضائقہ نہیں کہ اس جگہ (شرط اجتہاد کے بیان میں) بغوی کا قول ذکر کیا جائے۔ بغوی نے کہا ہے کہ مجتہد وہ عالم ہے جو پانچ شرطوں کا جامع ہو۔ اول کتاب اللہ کا علم، دوم رسول اللہ کی سنت کا علم، سوم علماء سلف کے اقوال کا علم کہ ان کا اتفاق کس قول پر ہے اور کس قول میں اختلاف ہے، چہارم علم لغت، پنجم علمِ قیاس اور یہ ایک طریقہ ہے قرآن وسنت اور اجماع میں حکم مذکور صریحاً نہ پائے''۔ الخ

امت کی موجودہ ذہنی وفکری حالت کے پیش نظر اب ایک ہی صورت ہے کہ اجتہاد کا کام انفرادی کے بجائے اجتماعی طور پر انجام دیا جائے، یعنی علماء وفقہاء کی ایک ایسی جماعت یہ کام کرے جو مذکورہ شرطوں کو بدرجۂ اتم پورا کرتی ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس جماعت میں ایسے افراد شامل ہوں جو جدید

علوم وفنون میں مہارت رکھتے ہوں کیوں کہ عصر جدید کے بعض مسائل کی تفہیم کے لئے جدید علوم کی طرف مراجعت کے بغیر چارہ نہیں۔

حکیم الاسلامؒ اس عصری ضرورت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''اس سلسلے میں کٹھن مرحلہ ایسی جامع شخصیتوں کی فراہمی ہے جو شرعیات اور عصریات میں یکساں حذاقت و مہارت کی حامل ہوں۔ عموماً اور اکثر و بیشتر ماہرین شرعیات، عصریات سے کچھ نابلد اور موجودہ دنیا کی ذہنی رفتار اور اس کے گوناگوں نظریات سے بے خبر ہیں اور ماہرینِ عصریات اکثر و بیشتر شرعیات سے ناآشنا ہیں، ان حالات میں درمیانی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ فکر اسلامی کی تشکیل کے لئے دونوں طبقوں کے مفکرین کی مختصر اور جامع کمیٹی بنائی جائے، جس میں یہ دونوں طبقے اسلام کے تمدّنی، معاشرتی اور سیاسی مسائل میں اپنے اپنے علوم کے دائروں میں غور و فکر اور باہمی بحث و تمحیص سے کسی فکر واحد پر پہنچنے کی سعی فرمائیں (۱۱)۔''

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ جو جماعت یہ کام کرے اس کے تمام افراد ایسے ہوں جو علم و فنون میں جامعیت کے ساتھ ایمانی مزاج اور اسلامی طرز فکر کے حامل ہوں ورنہ تشریع میں نفس غیر پاکیزہ کی فتنہ انگیزی سے مامون ہونا نہایت مشکل ہوگا۔ وہ خود بھی گم راہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی زیغ و ضلالت میں مبتلا کریں گے۔ انہوں نے کسی لاگ کے بغیر موجودہ صورتِ حال کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ ایک حقیقت ہے کہ مربی اور معلم یا مصلحِ فکر اگر خود صحیح المنہاج ہوگا تو وہی قلوب کی صحیح رہنمائی کر سکے گا ورنہ خود اگر اس منہاج کا فکر لئے ہوئے نہ ہو یا قلب کا کوئی زیغ اور کجی لئے ہوئے ہو تو کتاب و سنت سے بھی وہ اسی زیغ ہی کو سامنے لا کر دوسرے قلوب میں بھر دے گا۔ آخر مسلمانوں میں آج کتنے متضاد فرقے ہیں جو قرآن کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں اور اسی کا نام لے کر اپنی اپنی فکر دنیا کے سامنے رکھتے ہیں۔ در آں حالیکہ ان متضاد فرقوں میں کوئی ایک ہی حق و صواب پر ہوسکتا ہے، سب کے سب اس تضادِ فکر کے ساتھ محقق نہیں کہلائے جاسکتے (۱۲)''

متذکرہ بالا بنیادی امور کے ذکر کے بعد حکیم الاسلامؒ نے ان اساسی اصولوں کی ایک اجمالی فہرست پیش کی ہے جو اسلامی تشریع کا ماخذ و مصدر ہیں۔ انہی اصولوں کی رہنمائی میں علماءِ سلف اور مفکرینِ ملت نے ہر دور کے متفرق مسائل اور معاملات کا حل تلاش کیا اور شریعت کے عملی جزئیات مستنبط کئے۔ آئندہ بھی یہی اصول ہر طرح کے انفرادی و اجتماعی مسائل کی گرہ کشائی میں اطمینان بخش طور پر کلیدی کردار ادا کریں بشرطیکہ ان اصول و کلیات کی تفہیم میں کوئی غلطی واقع نہ ہو۔ اس مختصر مقالے میں اِن تمام اصولوں کا ذکر ممکن

نہیں ہے۔ یہاں صرف ایک اصول کا ذکر کروں گا، جس سے اسلام میں تشریع کی روح اور اس کے کلّی مزاج کا واضح طور پر اظہار ہوتا ہے۔ یہ اصول قرآن کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (سورہ حج:۷۸)

''اس نے دین میں تمہارے لئے کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔''

مولاناؒ نے اس قرآنی اصول کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اسلام کا مزاج دین کے بارے میں ضیق اور تنگی کا نہیں بلکہ فراخی کا ہے۔ معذوروں کو مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے مناسب حال راہ نکالی جاتی ہے۔'' (۱۳)

مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصول وکلّیات سے مستخرجہ وہی جزئیات (ذیلی قوانین) معتبر ہوں گے جو مقاصدِ شریعت سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ ان میں رحمت ہو، زحمت نہ ہو، آسانی ہو، تنگی نہ ہو، نفع بخشی ہو، ضرر رسانی نہ ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عقلِ سلیم اور فطرت کے موافق ہوں، مخالف نہ ہوں۔ اگر کسی اجتہاد میں خواہ وہ قدیم اجتہاد ہو یا جدید، یہ خصوصیت نہ ہو تو اس پر حقیقی معنی میں اسلامی قانون کا اطلاق نہ ہوگا۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں اجتہاد کے بارے میں حکیم الاسلامؒ کے خیالات کا جو اجمالی جائزہ لیا ہے اس سے واضح ہو گیا کہ وہ اس باب میں بعض میں ذہنی تحفظات کے باوجود کھلا ہوا ذہن رکھتے تھے اور اس مسئلے کو وسیع تناظر میں دیکھنے کے قائل تھے۔ ان کے الفاظِ ذیل بڑے بصیرت افروز اور اس بحث کا خلاصہ ہیں:

''فکر ہی انسان کی امتیازی صفت ہے، فکر ہی انسانی حقیقت کی فصلِ ممیّز ہے، فکر ہی سے علم ومعرفت کے دروازے کھلتے ہیں، فکر ہی انسان کی ظاہری اور باطنی قوتوں کا امام اور سربراہ ہے۔ اگر فکر اسلام میں مطلوب نہ ہوتا تو اجتہاد کا دروازہ کلّیۃً مسدود ہو جاتا اور شرائعِ فرعیہ امت کے سامنے نہ آسکتیں۔ یہ بحث الگ ہے کہ کس درجہ کا اجتہاد باقی ہے اور کس درجہ کا ختم ہو چکا ہے، مگر اجتہاد کی جنس بہرحال امت میں قائم رکھی گئی ہے جو برابر قائم رہے گی۔'' (۱۴)

....

(1) The Reconstruction of Religious Thought in Islam, by Allama Iqbal P. 152

مزید دیکھیں: الطاف احمد اعظمی، اقبال کا تصوّرِ اجتہاد، سرسید فاؤنڈیشن، ۲۵، ص:۱۲

(۲) شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، عقد الجیّد فی احکام الاجتہاد والتقلید، ص:۶

(۳)اقبال نے اپنی نثری تصنیف The Reconstruction of Religious Thought in Islam میں اس خیال سے رجوع کرلیا ہے۔انہوں نے لکھا ''مزید سماجی انتشار کے خوف سے جو سیاسی زوال کے زمانے میں ایک فطری امر ہے، اسلام کے تقلید پرست علماء نے اپنی ساری توجہ صرف اس بات پر مرکوز کردی کہ کس طرح مسلمانوں کی سماجی زندگی کی وحدت کو انتشار سے محفوظ رکھا جائے۔اس غرض کے لئے انہوں نے ضروری سمجھا کہ فقہاء سلف نے اسلامی شریعت کی جو تشریح کردی ہے اس سے سرموانحراف نہ کیا جائے اور نئے خیالات سے پرہیز کیا جائے۔لیکن وہ یہ بات نہ سمجھ سکے اور عہد حاضر کے علماء بھی اس کو نہیں سمجھتے کہ کسی قوم کی تقدیر کا فیصلہ سماج کی تنظیم سے کہیں زیادہ افراد کی لیاقت اوران کی فکری قوت پر منحصر ہے۔(دیکھیں کتاب مذکور، ص ۱۵۱،مزید دیکھیں،اقبال کا تصورِاجتہاد،ص:۴۴)

(۴)ضیاءالحسن فاروقی رمشیرالحق،فکراسلامی کی تشکیل جدید (مجموعۂ مقالات)ص:۴۳،۴۴

(۵)ایضاً،ص:۴۸،۴۹

(۶)ایضاً،ص:۹۴

(۷)ایضاً،ص:۵۳

(۸)ایضاً،ص:۵۰

(۹)ایضاً،ص:۴۶

(۱۰)شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ،عقدالجیّد فی احکام الاجتہاد والتقلید،ص:۴،۵

(۱۱)ضیاءالحسن فارقی رمشیرالحق،فکراسلامی کی تشکیل جدید،ص:۵۲

(۱۲)ایضاً ص:۶۱

(۱۳)ایضاً،ص:۵۷

(۱۴)ایضاً،ص:۳۹

............❖............

مقاماتِ مقدسہ
تصنیف حضرت حکیم الاسلامؒ: ایک تاریخی جائزہ

پروفیسر محمد عزیز الدین حسین
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دھلی

تمام مذاہب سے متعلق لوگوں کو اپنے مذہب کے مقاماتِ مقدسہ سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہی دلچسپی مولانا محمد طیب صاحبؒ کو تھی جب کہ مولانا محمد اسلم صاحب کے بیان سے ظاہر ہے ''۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے احقر کے ساتھ آخری کچھ مزید تفصیلات ذہن میں آرہی ہیں اس لئے وہ مسودہ ذرا مجھے لادو۔ مجھے تامل ہوا کیوں کہ ضعف ونقاہت اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ خود سے لیٹنا بیٹھنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنے تامل کا اظہار بھی کر دیا مگر فرمایا نہیں ایسے کاموں سے کوئی تعب نہیں ہوگا، مسودہ اور قلم مجھے لادو مگر گیارہ بج کر دس منٹ پر حضرت حکیم الاسلامؒ جان، جان آفرین کے سپرد کر چکے تھے''۔(۱)

مقاماتِ مقدسہ سے دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ زندگی کے آخری لمحات میں مقاماتِ مقدسہ ذہن وفکر کا حصہ تھے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں مسلمانوں کے قیام کے بعد علماء ومشائخ کی دلچسپی کا مرکز مقاماتِ مقدسہ رہے اور یہ روایت رہی کہ علماء ومشائخ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے جاتے۔ بعض نے اپنے سفرنامے بھی لکھے۔ مشائخ ہند میں حضرت سید مخدوم جہانیانِ جہاں گشت سید جلال الدین کئی مرتبہ حج وزیارت مقاماتِ مقدسہ کے لئے گئے اور اپنا ''سفرنامہ'' بھی لکھا جس میں مکہ، مدینہ، شام اور کربلا کا تذکرہ موجود ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے دل میں اسلام کے مقاماتِ مقدسہ کی عظمت تو تھی ہی لیکن انہوں نے ملتان کو ایک مرکز بنایا اور اس کا نام قبۃ الاسلام رکھا۔ دہلی کو انہوں نے حضرت دہلی کا نام دیا اور جو جامع مسجد مہرولی

میں تعمیر کی اس کا نام قوت الاسلام رکھا۔ اجمیر جو چشتی سلسلہ کا مرکز بنا اس کا نام دار الخیر رکھا۔ چودہویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں تو مقامات مقدسہ کا ذکر ہندوستانی علماء ومشائخ کے تذکروں اور سفرناموں میں ملتا ہے۔ لیکن بعد میں اس طرف توجہ بہت کم ہوگئی۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کا بڑا اہم کارنامہ مساجد، مدارس اور خانقاہوں کا قیام تھا جہاں سے انہوں نے اسلام کی تبلیغ کی اور اس لحاظ سے ہندوستان کے یہ اہم مقدس مقامات کہلائے۔ ہندوستان میں برٹش راج کے قیام کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے ان آثار میں دلچسپی لینا شروع کی اور میجر ولیم فرینکلس کی خواہش پر شیام پرشاد نے کیفیات ومکانات گوڑ اور لکھنوتی ۱۸۱۰ میں قلم بند کیئے (۲)۔ جس میں اسٹیفن لوشنگٹن نے ۱۸۲۵ میں کالج کے طلبہ سے دو کتابیں آثارِ آگرہ پر لکھوائیں۔ تاریخ آگرہ (۳) اور تفریح العمارات (۴) آگرہ کے آثار سے متعلق لکھوائیں پھر چارلس تھیوفلس مٹکاف اور ولیم فریزر نے مرزا سنگین بیگ کو مشورہ دیا کہ وہ دہلی کے آثار پر کتاب لکھیں جس کے نتیجے میں سنگین بیگ نے ۱۸۲۷ سیر المنازل (۵) لکھی پھر سرسید نے دہلی کے آثار قدیمہ پر آثار الصنادید ۱۸۴۷ میں لکھی ان کو کسی انگریز نے مشورہ نہیں دیا بلکہ ان کا محرک یہ شعر تھا

از نقش و نگار در دیوار شکستہ آثار پدیدست صنادید عجم را

اردو زبان میں تاریخ نگاری کی صحت مند روایت سرسید نے ڈالی اور آثار الصنادید لکھ کر ان مساجد، مدارس، خانقاہوں، درگاہوں کو محفوظ کر دیا۔ مولانا محمد طیب صاحبؒ کی ''مقاماتِ مقدسہ'' اردو زبان میں اسی روایت کی کڑی ہے کہ جس کی بنیاد سرسید احمد خاں نے ڈالی تھی۔ ''مقاماتِ مقدسہ'' کو میں مولانا محمد طیب صاحبؒ کا ایک اہم کارنامہ سمجھتا ہوں اس لئے کہ ہمارے علماء نے اس موضوع پر توجہ بہت کم دی ہے جب کہ ہر لحاظ سے یہ موضوع بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ میں محمد ہشام قاسمی کی رائے سے متفق ہوں۔ ''مضمون بے حد اہم و علمی ہے۔ (۷)

مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی لکھتے ہیں ''العلماء ورثة الانبيا'' علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی میراث مال و دنیا نہیں علم ہوتا ہے (۸) لیکن صرف وہی علماء وارث ہوں گے جو آنے والی نسلوں کے لئے اپنے علمی کارنامے میراث میں چھوڑ کر اس دنیا سے جائیں گے۔ مقامات مقدسہ اسی میراث کی ایک کڑی ہے۔

مقدمہ میں لکھتے ہیں ''مقاماتِ مقدسہ'' کا لفظ آپ نے بارہا سنا ہوگا۔ بالخصوص ۱۹۲۰ء کے ہندوستان کی تحریکاتی زندگی نے تو مقاماتِ مقدسہ کے لفظ کو مسلمانوں کے لئے روزمرہ کا ایک محاورہ بنا دیا تھا جو آج تک

زبان زد ہے۔ اس سے پہلے بھی مسلمان جب حج کے لئے روانہ ہوتے تھے تو یہ کہہ کر جاتے تھے کہ ہم مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے جا رہے ہیں (۹)۔ ۱۹۸۳ء تک مقامات مقدسہ کی اصطلاح عام فہم تھی اب نہ توجہ کرنے جانے والے استعمال کرتے ہیں اور نہ ہی عام مسلمانوں کی سمجھ کا حصہ رہی۔ ''اب نئی نسل کو مقامات مقدسہ کو ڈکشنری سے حل کرنا ہوگا تو ۱۹۸۳ء سے ۲۰۰۶ء تک یہ فرق آ گیا۔ آپ لکھتے ہیں ''ترکی کی خلافت ختم ہو جانے کے بعد اسلامی ممالک میں انتشار پھیلا اور ان کی بقا خطرہ میں پڑ گئی تو ہندوستان کے مسلمانوں نے ''انجمن خدام کعبہ'' قائم کر کے اس کا نصب العین ہی مقامات مقدسہ کی حفاظت و صیانت قرار دیا۔ خلافت کمیٹی قائم ہوئی تو اس کا ابتدائی منصوبہ بھی مقامات مقدسہ کی حفاظت تھا (۱۰)۔ مسلمانوں میں انتشار تو خلافت کے خاتمہ اور ملوکیت کے ۶۶۱ء کے عروج سے ہی پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور ترکی کی نام نہاد خلافت اسی ملوکیت کی نشانیوں میں سے ہی تھی۔ تحفظ مقامات مقدسہ کے لئے جو کام ہندوستانی مسلمانوں نے کیا وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ ''تقسیم فلسطین کی منحوس ساعتوں میں جب ہندوستان بھر میں اجتماعی جلسے ہوئے تو ان کی اساسی روح بھی مقامات مقدسہ کی حفاظت اور ان کے لئے آواز اٹھانا تھی'' (۱۱)۔ مغربی طاقتوں نے اس سلسلے میں جو کام کیا وہ تو ہے ہی لیکن تقسیم فلسطین کی بنیاد بھی مسلمانوں میں ملوکیت کا قیام ہی ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے جس اسلامی ریاست کی بنیاد ڈالی تھی وہ اسلامی جمہوریہ کی بنیاد تھی اگر مسلمان اس بات پر قائم رہتے تو کامیاب رہتے لیکن مسلمانوں نے ساتویں صدی عیسوی سے موروثی ملوکیت کو اپنا لیا اور وہی مسلمانوں کے زوال و تباہی و بربادی کا سبب بنی اور ہے۔ ایک موقعہ مسلمانوں کو ۱۹۷۹ء میں ملوکیت چھوڑ کر اسلامی جمہوری نظام کی طرف جانے کا ملا تھا۔ ایران میں تو موروثی آریا مہری شہنشاہیت کی روایت کافی قدیم تھی انہوں نے تو موروثی ملوکیت کو چھوڑ کر اسلامی جمہوری نظام اپنا لیا لیکن اس کے پڑوسی عرب ممالک جب کہ ان کے یہاں قبل از اسلام بھی جمہوری سیاسی نظام تھا اور عرب مسلمانوں نے تو ملوکیت کو ساتویں صدی عیسوی میں اختیار کیا تھا لیکن وہ آج تک موروثی ملوکیت اپنائے ہوئے ہیں۔ لیکن بجائے اس کے کہ اسلامی جمہوری نظام کو اپناتے، اس کی مخالفت کی جس کے نتیجے میں وہ ملک تباہ و برباد ہو گیا اور دوسرے ممالک کی آزادی سلب ہو کر رہ گئی اور اب اس حالت میں نہیں کہ مغربی طاقتوں کے سامنے مسجد اقصیٰ کی بات بھی کر سکیں۔ مسلمان ان حالات کے وجوہات دوسری جگہ تلاش کرتے ہیں اس کے وجوہات خود ان کے اندر ہیں۔ آج جو مسلمانوں کی حالت ہے تاریخ شاہد ہے کہ اتنی خراب حالت کبھی نہیں رہی۔

آپ لکھتے ہیں کہ ''مقامات مقدسہ'' کا لفظ آپ کے کانوں میں بارہا پڑتا رہا ہے جس سے آپ نا آشنا نہیں ہیں لیکن یہ مقامات کہاں ہیں؟ کون سے ہیں؟ کتنے ہیں؟ ان کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور ان کی حفاظت و آزادی کے کیا معنی ہیں؟ اور ان میں سے کسی کی آزادی سلب ہوجانے کی صورت میں مسلمانوں کے فرائض کیا ہیں؟ شاید ان تفصیلات سے اکثر و بیشتر نعرہ زن حضرات بھی واقف نہیں (۱۲)۔ مقدمہ میں ان سوالات کو اٹھایا ہے اور آپ کی کتاب انہیں سوالات کا جواب ہے۔

آپ نے اپنے اس موضوع کا ماخذ قرآن مجید کی ''سورہ والتین والزیتون'' کی پہلی آیت کے الفاظ اور ان کے حسن سیاق وسباق کو قرار دیا ہے (۱۲)۔

ظاہر ہے کہ مورخ بغیر ماخذ کے بات نہیں کرتا۔ آپ لکھتے ہیں ''اس مسئلہ میں جس حد تک بھی شرعی اور عقلی مواد یکجا کیا جانا ممکن تھا اس سے دریغ نہیں کیا گیا (۱۴)۔ ایک اور اچھے مورخ کی پہچان مولانا محمد طیب صاحبؒ کے اس جملے سے ہوتی ہے'' اس میں میرا مفہوم کس حد تک صحیح ہے اور کتنا غلط ہے (۱۵)۔

''حق تعالیٰ نے ان تین مقامات قدس کے شہر، طورِ سینا کے پہاڑ اور بلد امین یعنی مکہ مکرمہ کی قسم کھا کر بھی نوع انسان کی پاکیزہ صورت وسیرت پر استدلال فرمایا (۱۶)۔ آپ فرماتے ہیں ''ان ہی تین مقامات سے دنیا کی تین وہ بڑی بڑی قومیں ابھریں، یعنی یہود، نصاریٰ اور مسلمین (۱۷)۔ اس کے بعد آپ رقم طراز ہیں کہ ''اسلام کے جامع دین کو تین مرکزوں کی عقلاً اور شرعاً ضرورت تھی اور وہ تین مرکز باشارہ قرآنی مکہ، قدس اور طور سینا ہیں۔ جب حضرت خلیل اللہ تیسری بار حجاز تشریف لے گئے تو حق تعالیٰ کی طرف سے بیت اللہ کی تعمیر کا حکم ملا اور دونوں مقدس باپ بیٹوں حضرت خلیل اللہ اور حضرت ذبیح اللہ نے مل کر مسجد حرام کی تعمیر فرمائی۔ اس سے فارغ ہوکر حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے پھر فلسطین ہی کا قصد فرمایا (۱۸) پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر انہیں کوہِ طور پر جانے کا حکم ہوا۔ وہاں کلامِ ربانی سنا اور شرف کلیمی سے مشرف ہوئے، تورات عطا ہوئی (۱۹)۔ آپ فرماتے ہیں کہ ''ظاہر ہے کہ جس پہاڑ پر کلام ربانی کی آواز گونجی اور جس پہاڑ کے خطے پر جلیل القدر پیغمبر نے چلہ کشی کی اور جس کے ایک مبارک حصے میں قانونِ الٰہی کی الواح سپرد کی گئیں، اس پہاڑ کے مقدس بن جانے میں کلام ہی کیا ہوسکتا ہے (۲۰)۔ پھر فرماتے ہیں ''ان کے بعد بنی اسرائیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم جلیل القدر پیغمبر حق تعالیٰ نے بھیجا (۲۱)'' مسجد اقصیٰ کی بنیاد ڈالی تاکہ بنی اسرائیل ملت ابراہیمی سے ہٹنے نہ پائیں (۲۲)۔ اس طرح سے یہ تین مراکز اہمیت کے حامل ہوئے اور یہی زندگی کا محور قرار پائے۔ یہی علم ویقین کا مرکز بن کر ابھرے۔''

پھر انقلاب احوال سے متعلق فرماتے ہیں کہ ''صد حیف وحسرۃ کہ وہ اس عالمی مرکز کے بارے میں اس

سے زیادہ کچھ نہیں جانتی کہ وہ حج ونماز کا قبلہ ہے۔ نمازیں اس کی طرف رخ کر کے پڑھ لی جائیں اور حج اس میں حاضری دے کر ادا کر لیا جائے (۲۳) اور اس کے آگے فرماتے ہیں کہ ''ان سے کیا کیا اسلامی مقاصد وابستہ ہیں؟ نہ ان کو اس کا علم رہ گیا ہے اور نہ اس علم کی طلب ہی ذہنوں میں کچھ باقی ہے۔ امت کی لاعلمی اپنے انتہا تک پہونچ چکی ہے لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آخر یہ انقلاب کیسے آیا اور امت اس قدر غافل کیوں ہوگئی؟ میری اپنی رائے میں اس کی وجہ مسلمانوں میں موروثی ملوکیت کا قیام تھا۔ ملوکیت یا بادشاہت، چاہے اس کے سربراہ عیسائی، ہندو یا مسلمان ہوں ان کا بنیادی نظریہ عوام کو تقسیم کرنا اور علم سے دور کرنا ہوتا ہے۔ اسلام سماجی برابری میں یقین رکھتا ہے لیکن ساتویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی میں ملوکیت کے قیام کے بعد مسلمانوں کو تقسیم کر دیا گیا۔ عرب، غیر عرب، موالی وغیرہ اور تاریخ کے ساتھ ساتھ اس تقسیم میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ سید، شیخ پٹھان، بڑھئی، لوہار، جولاہا نہ معلوم کس حد تک مسلمان تقسیم ہو گیا۔

ہندوستان میں تیرہویں صدی عیسوی کے مورخ اور سیاسی مفکر ضیاء الدین برنی صاحب تاریخ فیروز شاہی (۲۵) وفتاویٰ جہانداری (۲۶) علم کے سلسلے میں رائے رکھتے ہیں کہ عام مسلمانوں کو صرف نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی تعلیم دینی چاہئے۔ اس سے زیادہ انہیں تعلیم دینے کا مطلب ہوگا کہ کل وہ حکومت میں عہدوں کے دعوی دار ہوں گے اور انہیں تعلیم دینا ایسا ہی ہوگا جیسے کتے کے گلے میں سونے کی زنجیر ڈالنا (۲۷) اور اسی بیان کے سلسلے میں ایک فارسی شعر لکھتے ہیں۔

بدست دوں مدہ خامہ کہ گردوں را مجال افتد　　　سیہ سنگی کہ در کعبہ است سازد سنگ استنجا

عام لوگوں کو قلم مت دو اس لئے کہ اگر ان کے ہاتھ میں قلم آ گیا تو وہ سنگ اسود کو استنجا کے ڈھیلے کے طور پر استعمال کر لیں گے۔'' اور نہ صرف برنی بلکہ اسی صدی کے مسلم فرماں روا سلطان شمس الدین التمش اور سلطان غیاث الدین بلبن جن کو مسلم علماء و مورخین نے امیر المومنین اور ظل اللہ کے القاب سے نوازا ان کے دور میں اگر غلطی سے کسی چھوٹی ذات سے تعلق رکھنے والے مسلمان کو حکومت میں عہدہ مل بھی جاتا تو اس حقیقت کے آشکار ہونے پر کہ اس کا تعلق کسی چھوٹی ذات سے ہے۔ اس عہدے سے برطرف کر دیا جاتا۔ سلطان محمد بن تغلق جو مسلمانوں میں بہت بدنام ہے جب اس نے چھوٹی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو حکومت میں عہدوں سے نوازا تو برنی اور دوسرے علماء اور امراء نے محمد بن تغلق کی اس پالیسی کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ اس طرح کی پالیسی سے اشراف کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی میں انہیں حالات کے تحت مسلمان تعلیم میں یوروپ، انگلینڈ اور امریکہ سے کافی پیچھے ہیں۔ خود ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کی شرح فی صد صرف بیس فی صد ہے جس کا مطلب ہوا کہ اسّی فی صد

ہندوستانی مسلمان علم سے دور ہیں۔ مولانا محمد طیب صاحبؒ کے اس سوال کہ ''اس عالمی مرکز کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی کہ وہ حج ونماز کا قبلہ ہے (۲۸) وجہ مندرجہ بالا ہے۔ ہم کو سب سے زیادہ نقصان پہونچا ملوکانہ، جاگیردارانہ اور زمین دارانہ ذہنیت سے اور پہونچ رہا ہے۔ میں مولانا سے پورے طور پر متفق ہوں کہ جب آپ یہ فرماتے ہیں کہ ''اس لئے ضرورت تھی کہ اسلام کے اس اجتماعی مرکز (بیت اللہ) کو اس وضع اول سے لے کر اس کی صورت، اس کی خلقت، اس کی غرض وغایت، اس کی حقیقت اور اس سے پیدا شدہ دوسری مرکزیتوں اور ان کے تقاضوں سے امت عرب وعجم اور خصوصیت سے عرب کو تفصیل کے ساتھ ایک مہم کے طور پر آگاہ کیا جائے اور ان سے امت کے جو اجتماعی مقاصد متعلق کئے گئے تھے، یاد دلا کر انہیں پھر سے ذہنوں میں مستحضر کرایا جائے تا کہ امت کا یہ ذہنی اور خارجی جمود اور اس سے پیدا شدہ انتشار ختم یا کم ہو جس میں امت پھنس کر پھڑ پھڑا رہی ہے'' (۳۰) لیکن ایک درخواست کے ساتھ کہ اب ہمیں عرب وعجم کی اصطلاح کا استعمال کرنا بند کر دینا چاہیئے اس لئے کہ سب مسلمان ہیں اور ہمیں کسی مسلمان کو عجمی کہنے کا حق نہیں ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ ''حق تعالیٰ نے اپنے عالمگیر قبلہ کے لئے اس مقدس شہر (مکہ) کا انتخاب کر کے اسے بلد امین قرار دیا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور ﷺ مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تو آپ تشریف لے جاتے ہوئے مکہ کے شہر کو خطاب فرماتے ہوئے حسرت سے فرماتے جا رہے تھے کہ ''میں جانتا ہوں کہ خدا کا محبوب ترین شہر مکہ ہے اور اگر میری قوم مجھے مکہ سے نکال دیتی تو میں کبھی مکہ نہ چھوڑتا۔ اے اللہ ہمارے دلوں میں مکہ کی محبت پیدا فرمادے۔'' (۳۱) لیکن اسی کے ساتھ دوسری حقیقت یہ بھی ہے کہ ۶۲۸ھ میں فتح مکہ کے بعد پھر رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے اسلامی ریاست میں شامل ہونے کے باوجود نہ تو اپنے گھر یا اس شہر میں سکونت اختیار کی۔ پوپ بینی ڈکٹ کے یونیورسٹی آف رتجنس برگ میں اپنے لیکچر میں منیول دویم۔ چودھویں صدی عیسوی کے بائزین ٹائس کے بادشاہ کے بیان کو دیتے ہوئے کہا کہ ''محمد نے کون سے نئی چیز کی (۳۲) پوپ بینی ڈکٹ سولہویں حیات محمد کی تاریخ پڑھیں اور دنیا کی کوئی مثال ایسی پیش کریں کہ جہاں سے ایک شخص کو نکال دیا گیا ہو اور وہ پھر اس پر طاقت کے ذریعہ قبضہ کر لے اور پھر وہاں نہ رہے۔ کیا یوروپ، انگلینڈ اور امریکہ اپنی تاریخ میں ایسی مثال پیش کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر منیول دوم ہوتا تو دیکھتا اور پوپ بینی ڈکٹ سولہویں صدی عیسوی کی انگلینڈ کی تاریخ پڑھیں کہ جب ہنری ہشتم نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کے معاملے میں روم سے رشتہ توڑا جس سے پوپ کا تعلق ہے تو تمام انگلینڈ کے کیتھولک فرقہ کی تمام موناسٹریز کو مسمار کر کے زمین سے ملا دیا تھا۔ محمد مکہ

نے فتح کرلیا۔ جن لوگوں نے محمد کو مکہ سے نکالا تھا انہیں معاف کردیا اور مکہ میں رہائش اختیار نہیں کی۔ پوپ کوئی ایسی مثال یوروپ، انگلینڈ اور امریکہ کی ایسے دے سکتے ہیں

آپ فرماتے ہیں کہ ''مکہ کے مقدس ہونے کے لئے آیات وروایات کی روشنی میں یہ خلاصہ کافی ہوگیا کہ وہ اللہ کا محبوب ترین شہر ہے۔ (۳۳)

قدس کے بارے میں لکھتے ہیں ''اسی طرح قدس کا شہر جو بیت المقدس کے نام سے معروف ہے بے شمار تقدیسی خصوصیات کا حامل ہے جن سے احادیث نبوی بھری ہوئی ہیں (۳۴)۔ اسی طرح طور سینا بھی اپنی خصوصی برکات کے لحاظ سے ایک پُرعظمت مقدس مقام ہے (۳۵)۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں بھی عہد وسطیٰ میں جو مساجد تعمیر ہوئیں ان کی بھی تاریخ مندرجہ ذیل مصرعوں سے نکالی۔ اورنگ زیب کے امیر خلیل اللہ خاں نے ایک مسجد اجمیری گیٹ، دہلی کے نزدیک تعمیر کی اس کی تاریخ مندرجہ ذیل مصرعہ سے نکلتی ہے:

''کرد کعبہ بنا خلیل اللہ''

ایک مسجد شاہ جہاں آباد کے باہر تعمیر ہوئی وہ دائی والی مسجد کہلاتی ہے اس کا قطعہ تاریخ ہے:

''گشہ آباد کعبہ دیگر''

شاہ جہاں آباد میں سہ راہہ بیرم خاں میں حکیم بوعلی خاں نے ایک مسجد تعمیر کرائی اس کا قطعہ تاریخ ہے:

''بنا شد مسجد اقصیٰ ثانی''

شاہ جہاں آباد میں سعید الدولہ ایک مسجد تعمیر کرائی اس کا قطعہ تاریخ ہے:

''مثنہ کعبہ عالی بنا شد''

نواب سعادت خاں جو نواب صفدر جنگ کے چچا تھے انہوں نے حویلی نواب وزیر احمد شاہ کے عقب میں ایک مسجد تعمیر کرائی اس کا مصرعہ تاریخ ہے:

''کعبہ ثانی بنامی بوسید بنا کرم''

متھرا روڈ پر ایک مسجد تعمیر ہوئی اس کا مصرعہ تاریخ ہے:

''خانہ کعبہ قبلۂ اقدس''

حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں جو مسجد تعمیر ہوئی اس کے کتبہ پر یہ تحریر ہے:

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی.

راہ سید حسن رسول نما پر ایک مسجد تعمیر ہوئی اس کا مصرعہ تاریخ ہے:

''مسجد اقصیٰ است ہا کعبہ کرم''

ہندوستان میں عہد وسطیٰ میں تعمیر شدہ مساجد کے یہ مصرعے ان حضرات کے کعبہ اور مسجد اقصیٰ سے قلبی لگاؤ کی نشانی ہیں اور دوسری طرف غیر رسمی طور پر دن میں پانچ مرتبہ جب نمازیوں کی نگاہ ان کتبات اور خاص کر ان مصرعوں پر پڑے گی تو یاددہانی کا ذریعہ ہے۔ مولانا محمد طیب صاحبؒ نے جن باتوں کی طرف مقدمہ میں اشارہ کیا ہے اور خاص کر ''شاید ان تفصیلات سے اکثر و بیشتر حضرات بھی واقف نہیں شاید عہد وسطیٰ میں لاعلمی کی یہ حد نہ رہی ہو اس لئے کہ یہ مصرعے ان کی اہمیت و مرکزیت کی یاددہانی کرا رہے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ہندوستان و پاکستان کا مسلمان اس زبان سے ناواقف ہوتا جارہا ہے کہ جس زبان میں اسلامی تہذیب وثقافتی سرمایہ موجود ہے۔ مخطوطات، دستاویزات اور کتبات زیادہ تر فارسی وعربی زبان میں ہیں لیکن اب نئی نسل اس زبان سے واقف نہیں۔ مدارس میں عربی تو پڑھائی جاتی ہے لیکن فارسی نہیں پڑھائی جاتی جب کہ ہندوستان میں اسلام پر زیادہ تر سرمایہ فارسی زبان ہی میں کتابوں کی شکل میں موجود ہے۔

خلاصہ مقالہ کے تحت مولانا فرماتے ہیں ''حجاز مرکز امن وعبادت ہے شام مرکز سیاست وشوکت ہے اور مصر مرکز عسکریت وقوت ہے اور پھر ان تینوں پر ایک عالمی اجتماعی نظام بنام ''خلافت'' قائم کردیا ہے تا کہ ان سب کا اجتماعی نقطہ فکر اور مرکز عمل ایک رہے (۳۶)''۔ لیکن ہم نے غلطی یہ کہ اس خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کردیا۔ لہٰذا ہماری پہلی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ موروثی ملوکیت کو جن جن مسلم ممالک میں ہے اسلامی جمہوریہ میں تبدیل کیا جائے تب ہی ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

میں مولانا کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ ''اگر مسلمانوں اور بالخصوص عربوں نے اب بھی حجاز و شام اور مصر کی دینی مرکزیت کو نہ سمجھا اور ان کی دینی حیثیت کو لے کر کھڑے نہ ہوئے بلکہ بدستور مغربی شاطروں کی سیاسی چالوں اور لفظی فریب بازیوں یا گیدڑ بھبکیوں میں آتے رہے تو ان مقامات کا انجام تو جو بھی کچھ ہوگا وہ ہو رہے گا لیکن خود عربوں کی پوری زندگی لاعلاج خطروں میں گھر جائے گی (۳۷)۔ لیکن میری ناقص رائے میں پہلے ہمیں ملوکانہ، جاگیردارانہ اور زمین دارانہ نظام چھوڑنا ہوگا اور اس کی جگہ اسلامی جمہوری نظام کو اپنانا ہوگا تب ہی ہم اپنے سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوسکیں گے۔

....

(۱) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، مقامات مقدسہ، ص: ۷
(۲) کیفیات ومکافات گوڑ اور لکھنوتی، مخطوطہ خدابخش لائبریری، پٹنہ
(۳) تاریخ آگرہ، مخطوطہ خدابخش لائبریری، پٹنہ
(۴) تفریح العمارات، آگرہ۔ مخطوطہ خدابخش لائبریری، پٹنہ
(۵) سیر المنازل مخطوطہ، نیشنل آرکاؤز آف انڈیا، نئی دہلی

(۶) آثار الصنادید، شعبہ مخطوطات، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
(۷) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، مقامات مقدسہ ص:۳
(۸) ایضاً ص:۵
(۹) ایضاً ص:۱
(۱۰) ایضاً ص:۱۰
(۱۱) ایضاً ص:۱۰
(۱۲) ایضاً ص:۱۰
(۱۳) ایضاً ص:۱۹
(۱۴) ایضاً ص:۲۰
(۱۵) ایضاً ص:۲۱
(۱۶) ایضاً ص:۲۵
(۱۷) ایضاً ص:۳۱
(۱۸) ایضاً ص:۶۷
(۱۹) ایضاً ص:۷۰
(۲۰) ایضاً
(۲۱) ایضاً ص:۷۱
(۲۲) ایضاً ص:۷۳
(۲۳) ایضاً ص:۸۳
(۲۴) ایضاً ص:۸۴
(۲۵) ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص:۳۴
(۲۶) ایضاً فتاویٰ جہانداری
(۲۷) ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص:۴۱
(۲۸) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، مقامات مقدسہ ص:۸۴
(۲۹) ایضاً ص:۸۴
(۳۰) ایضاً ص:۸۵
(۳۱) ایضاً ص:۸۶
(۳۲) دی ٹائمس آف انڈیا، دہلی ۱۴ ستمبر ۲۰۰۶ء، ص:۱
(۳۳) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، مقامات مقدسہ ص:۸۹
(۳۴) ایضاً ص:۸۹-۹۰
(۳۵) ایضاً ص:۹۰
(۳۶) ایضاً ص:۱۰
(۳۷) ایضاً ص:۶۹۸

حضرت حکیم الاسلامؒ، عہد ساز شخصیت
ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر افضل حسین قاسمی

بیسویں صدی کے اواخر تک برصغیر ہندو پاک کے افق پر علم وفضل کے بڑے بڑے آفتاب و ماہتاب رونما ہوئے اور انھوں نے اپنی شفاف علمی وعرفانی ضوفشانی سے ملک و بیرون ملک کے طول وعرض میں خوب خوب روشنی پھیلائی۔ آج اکیسویں صدی میں انہی اصحاب علم وفضل کے محمدی افکار ونظریات کا نور ہے جو برصغیر کی امت مسلمہ کے جبین ورخسار پہ ہویدا ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن، حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہم اللہ تعالیٰ، یہ وہ یکتائے روزگار شخصیات رہی ہیں جن کی دینی وملی خدمات آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں تاہم ان میں حضرت حکیم الاسلام محمد طیب صاحبؒ گل رسبد کی حیثیت رکھتے ہیں اور کیوں نہ رکھیں، کہ بقول حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحبؒ (سابق استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند) ''بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی علیہ الرحمہ اور اکابر جماعت اہل حق کی تمام معنوی اور روحانی نسبتوں اور تمام اعلیٰ امتیازات وخصوصیات کو حق تعالیٰ شانہٗ نے ماشاء اللہ مولانا محمد طیب صاحبؒ کی ذات ستودہ صفات میں جمع فرمادیا''۔ چنانچہ آپ کی تحریر میں جہاں سوز وگداز ہے وہیں محبت وعقیدت میں ڈوبی ہوئی چاشنی بھی ملتی ہے اور آپ کی تقریر کے کیا کہنے، فن خطابت کے آپ شہنشاہ تھے، تقریر فرماتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ نسیم صبح گاہی محو خرام ہو، انداز گفتگو میں آب رواں کی نغمگی تھی، لب ولہجہ میں حُدی خوانوں کا سوز اور

طرز تکلم میں نو دمیدہ غنچوں کی مہک جو دماغوں کو معطر کر دیتی تھی۔

کچھ تو بات تھی جو امیر شریعت پاکستان، سید عطاء اللہ بخاریؒ پر حضرت حکیم الاسلامؒ کے خطاب لاجواب سے وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی اور کبھی نعرۂ تکبیر بلند فرما دیتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے عظیم خطیب جو اپنے وقت میں فن خطابت میں یکتائے زمانہ سمجھے جاتے تھے، حضرت حکیم الاسلامؒ کا خطاب سن کر جھوم اٹھتے۔ جدید تعلیم سے متاثر طبقہ آپ کے علم و حکمت سے بھرپور خطابات کو بڑی وقت و اہمیت کے ساتھ سنتا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو ہندوستان میں جدید علوم کا مرکز ہے اور دارالعلوم دیوبند سے اس کو نظریاتی تقابل بھی رہا، وہاں جب ''اسلام اور سائنس'' کے دقیق موضوع پر آپ نے خطاب فرمایا تو آپ کے اسلوبِ بیان اور تبحر علمی سے بڑے بڑے پروفیسر اور عصری علوم کے محققین انگشت بدنداں رہ گئے اور ان میں یہ احساس اجاگر ہوا کہ حقیقی علم کیا ہے اور جسے ہم علم کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟

اس سلسلہ میں میرا ذاتی نقطۂ نظر یہ ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے افکار و نظریات سے پوری طرح ہم آہنگ تھے اور اس کی بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ حضرت والا ایک عرصہ تک دارالعلوم دیوبند میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' جیسی حکمت و افکار کی کتاب ولی اللٰہی لب و لہجے میں پڑھاتے رہے۔ خطاب، بیان اور تدریس میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی انفرادیت دراصل ان کے امتیازات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت والا صفات انبیائی وراثت کا چلتا پھرتا نمونہ اور ہماری عظمت رفتہ کی حسین و جمیل یادگار تھے۔ فکر و نظر میں اعتدال، فکر ولی اللٰہی کے امین، صوفی، عصری تعلیم میں رواداری کے قائل متکلم اسلام، قرآن و حدیث نبویؐ کے خدمت گار، فقہی بصیرت کے حامل، اسرار شریعت سے باخبر، مسائل کی عقلی تفہیم میں ید طولیٰ کے حامل، نظام تعلیم و تربیت میں یکتائے زمانہ، قابل و مشفق مدرس، حجۃ اللہ البالغہ کی تدریس میں امتیازی شان رکھنے والے، اردو اور فارسی زبان میں نظم و نثر پر قادر الکلام، اسلوب تحریر میں سلامت بے ساختگی و شگفتگی، طرز استدلال سادہ مگر مبرہن، اصلاح نفس اور اصلاح عقیدہ کے علم بردار، سیاسی بصیرت کے ساتھ جرأت مندی، تبلیغی جماعت کے بہی خواہ، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے پسندیدہ اور آئیڈیل مقرر، اپنے عہد کے مردم ساز محقق عالم دین، دارالعلوم دیوبند کے لاجواب مہتمم، مسلک دارالعلوم کے ترجمان، کراماتی اجلاس صد سالہ کے روح رواں، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے معمار، اتحاد ملت کے داعی اور خانوادۂ قاسمی کے ایسے سفیر کہ جن کی عظمتوں کے اعتراف میں تقریباً سارا عالم اسلام ہم آہنگ ہوا اور عرب و افغان سربراہان مملکت نے حضرت حکیم الاسلام کے لئے اپنی پلکوں کو فرش راہ کیا۔

یہ ہیں وہ خصوصیات واوصاف جو حضرت حکیم الاسلامؒ کو ان کے دیگر ہم عصروں سے ممتاز بناتے ہوئے آپ کو ایک عہد ساز شخصیت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ میرا اپنا یقین یہ ہے کہ نصف صدی سے زیادہ مدت کو محیط، حضرت حکیم الاسلام محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کے منصب اہتمام کا اختتام، دارالعلوم دیوبند کے کار اہتمام کا اختتام ہرگز نہیں تھا بلکہ عہد سازی کی ایک خوش گوار میعاد کی تکمیل تھی۔ یہ الگ شئے ہے کہ بدقسمتی سے ناگفتہ بہ احوال وکوائف کے سائے میں یہ تکمیل امت مسلمہ کے سامنے آئی۔

اور جب حضرت حکیم الاسلامؒ مذکورہ اوصاف وامتیازات کے حامل تھے اور یقیناً تھے، اور آپ کا ساٹھ سالہ دور اہتمام جو بظاہر دارالعلوم دیوبند کے انتظام وانصرام کا زمانہ ہے، دراصل یہی دور بالخصوص برا عظم ہندو پاک میں دینی شعور کے حوالے سے قوم وملت کی نشاۃ ثانیہ کا دور ہے جس کا معمار بجا طور پر مظفر الدین، خورشید قاسم، حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کو قرار دیا جانا چاہئے۔

اس وقت جب کہ ہندوستان میں شخصی تقلید کے لئے ’’گاندھی گری‘‘ کے نام سے تشکیلی مہم زووں پر ہے اور جس کو ہندوستانی قوم میں صلاح وفلاح کی خوشبو پیدا کرنے کی ایک کوشش کے طور پر دیکھا جارہا ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کی سیرت وسوانح کو سامنے رکھ کر برصغیر میں امت مسلمہ کی نئی نسل میں اصلاحی و ارتقائی انقلاب برپا کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جانی چاہئے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کے حالاتِ زندگی میں نئی نسل حالات حاضرہ کے تناظر میں اتباع قرآن وسنت اور فکر ونظر میں اعتدال کی روشن قندیلیں ڈھونڈ کر ان قندیلوں سے قوم وملت کی پیشانی کو مزین کرنے کی کوشش کرے تاکہ اتحاد باہمی، امن وامان اور مطلوبہ رواداری کی فضا بنے اور پھر پورا براعظم ہندو پاک یہ پکار اٹھے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے آفاقی کارناموں کے طفیل مردم سازی کا مشن آج بھی زندہ ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

............❖............

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کا اسلوبِ نثر

جناب شریف مبارک پوری

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ ایک عالم دین، مفکرِ اسلام، حافظِ قرآن، مصنف، شاعر، بلند پایہ خطیب اور اردو زبان و ادب کے رمز شناس تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مشکل اور پیچیدہ مسائل کو انتہائی آسان پیرایہ میں بیان کر دیتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر ان کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

''آنحضرت ﷺ کا سیرت و اخلاق یہ قرآن ہے۔ جو اس میں لکھا ہوا ہے وہی آپ کی ذات میں عمل اور سیرت و کردار کی صورت میں موجود ہے۔ اس قرآن کی اور بالفاظ دیگر سیرت نبوی کی سند و روایت کا تو یہ مقام ہے کہ دو چار، دس پانچ راویوں کے واسطے سے نہیں بلکہ پیغمبر سے لے کر آج کے دور تک جنہیں ایک ایک زیر زبر تک محفوظ پھر اس کا ایک ایک کلمہ اور ایک ایک حرف گنا ہوا اور شمار میں آیا ہوا منضبط ہے۔ حتیٰ کہ اس کی روایت کے ساتھ اس کی درایت طرز ادا، لب ولہجہ، طرز کتابت اور رسم الخط تک کے تحفظ کے لئے ہر دور میں ہزاروں ہزار مبصر افراد کی جماعتیں اور گروہ سرگرم عمل رہتے آرہے ہیں۔ پھر اس قول و فعل رسول کے لئے خود صاحبِ رسالت کا اپنا کلام جسے حدیث کہتے ہیں۔ اس حد تک منضبط محفوظ اور اس درجہ اس کی روایت مسلسل بیچ میں انقطاع کا نشان تک نہیں بلکہ اس کے لاکھوں راویوں کی سوانح عمریاں محفوظ اور اوراقِ تاریخ میں منضبط۔ حتیٰ کہ اس کے فن کی روایت کے وہ اصول تک بھی مرتب شدہ موجود کہ اس کی تاریخ ہی ایک مستقل فن بن گئی''۔(۱)

ان کی تحریروں میں ان کے اسلوب بیان کی جھلک اور ان کی شخصیت کا انعکاس صاف نظر آتا ہے جس پر فارسی کا یہ محاورہ موزوں معلوم ہوتا ہے کہ ''از کوزہ ہماں ترا کہ درونی است'' اور مولانا نے بھی اپنے خطبات میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ جس سے ان باتوں کی تائید ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

’’ہماری زبان کا محاورہ ہے’’آنکھ سے آنکھ لڑ جانا‘‘ یہ محبت ہو جانے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، کسی کو کسی سے محبت ہو جائے تو کہتے ہیں کہ آنکھ سے آنکھ ٹکرائی، یعنی محبت قائم ہوگئی۔تو استاذ ذوق نے جو مانا ہوا شاعر ہے اس نے اس محاورہ کو ایک شعر میں نظم کیا ہے۔ کہتا ہے کہ ؎

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی، مجھے ڈر ہے دل کا
کہیں یہ جائے نہ اس جنگ وجدل میں مارا

تو بڑی خوبصورتی سے آنکھ لڑنے کے محاورے کو اس نے نظم کر دیا اور اس شعر کو لوگ واقعی ضرب المثل کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اسی مضمون کو ایک ہندو شاعر نے ادا کیا ہے۔مکند درم اس کا نام ہے۔اس نے اس مضمون کو بڑھا دیا اور بہت نازک خیالی دکھلائی۔ وہ کہتا ہے کہ ؎

دل کی نہیں تقصیر مکند، آنکھیں ہیں ظالم
یہ جا کے نہ لڑتیں، وہ گرفتار نہ ہوتا(۲)

خیر القرون میں بھی زبان وادب کا پاس ولحاظ کیا گیا ہے۔خود رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک بہت ہی فصیح و بلیغ تھی اور صحابہ کرام بھی آپ کے نقشِ قدم پر چل کر زبان و بیان کو سیکھتے تھے۔مجلسیں منعقد ہوتیں اور اہل زبان فصیح و بلیغ انداز میں اپنی زبان دانی کا مظاہرہ کرتے۔جس کی صدائے بازگشت آج بھی سنی جاسکتی ہے۔مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ اس بارے میں رقم طراز ہیں:

’’مجلس نبوی میں زبان وادب کی مجلسیں بھی منعقد ہوتی تھیں اور شعراء، ادباء، فصحاء کے کلام سے اربابِ ذوق محظوظ ہوتے تھے۔اس بارے میں آلِ زبیر مشہور تھے۔ان میں حضرت ثابت بن عبداللہ بن زبیر سخاوت، شجاعت، خطابت، فصاحت و بلاغت میں گویا قریش کے ترجمان تھے اور مسجد نبوی میں بیٹھ کر فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے تھے۔اہل مدینہ خاص طور سے ان کی مجلس میں ان کا کلام سننے کے لئے آتے تھے۔مسور بن عبدالملک کا بیان ہے’’ہم لوگ مسجد نبوی میں حاضر ہوتے تھے۔صرف حضرت ثابت بن عبداللہ کے کلمات والفاظ سننے کی کشش ہم کو وہاں لے جاتی تھی۔(۳)

یہی صحابہ کرام جب اشاعت دین کی خاطر اقصائے عالم میں پھیل گئے تو اپنی فصیح و بلیغ زبان میں دین اسلام کی تبلیغ کی جس کی اثر پذیری کا یہ عالم تھا کہ دنیا کی ظلمت وتاریکی کافور ہونے لگی اور اسلام مہر عالم تاب کی مانند درخشاں نظر آنے لگا،جس کی شعاعیں بلا امتیاز دنیا کے ہر گوشے میں پہنچیں۔ ہمارے ملک ہندوستان کو بھی اس سے وافر حصہ ملا۔ اسلامی اور عربی علوم کی بے شمار درس گاہیں وجود میں آئیں اور دارالعلوم دیوبند کے

درودیوار بھی علم وادب کی روشنی سے جگمگا اٹھے اوراس نورانی ماحول سے حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی وافر حصہ ملا۔انہوں نے دینی احکام عوام الناس تک پہنچانے کے لئے تصنیف وتالیف اور خطابت کا سلسلہ شروع کیا ان کے قلم سے بہت سی کتابیں منظر عام پر آئیں ان میں خطبات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کا اسلوب وطرزِ نگارش اپنی تمام ترقیات کے درجۂ کمال اور نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔

عصری تناظر میں دیکھا جائے تو مسلمانوں کے اندر تعلیم وتربیت میں تغیر پیدا ہو رہا ہے۔روحانیت کے بجائے مادیت پر نگاہیں مرکوز ہیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم کو فخر ومباہات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔مولانا کو اس بات پر اصرار ہے کہ ''عصری تعلیم گاہوں کے ماحول میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔'' ان کا ایک اقتباس جس میں جدت وندرت، بلاغت ونفاست اور زبان نہایت شستہ اور رواں ہے۔نمونہ کے طور پر ملاحظہ فرمائیں:

''آج دنیا میں اخلاقی قدریں اگر مفقود ہیں تو صرف اس لئے کہ وہ علم جس کا نام علمِ الٰہی ہے ختم کیا جا رہا ہے۔جو اخلاقی قدروں کا سرچشمہ ہے اور اگر بداخلاقیاں دنیا میں وبا کی طرح پھیل رہی ہیں تو صرف اس لئے کہ ان رسمیات اور صورتوں کے علم کو باستقلال موضوع زندگی بنا کر فروغ دیا جا رہا ہے جس میں سوائے ظاہرداری کے کسی قلبی حقیقت کی سمائی نہیں ہوتی۔چنانچہ آج بہتات ہے تو کالجوں کی اور افراط ہے تو یونیورسٹیوں کی جن میں انہی مادی لذات ومنافع کے لئے حرام وحلال سے قطع نظر کر لینے کی تعلیم دی جارہی ہے۔خدائی اخلاق اور خدائی احکام کو پس پشت ڈال دینے کے طریقے تعلیم کئے جارہے ہیں۔جن سے آدمی حیوانیت کی طرف بڑھ رہا ہے اور انسانیت کا چولہ اتار پھینکنے ہی کو سب سے بڑی معراجِ ترقی سمجھ چکا ہے۔پھر بھی اگر ان میں کچھ اخلاق دوست اور دین پسند افراد نظر آئیں تو یہ ان کی اپنی سلامتی فطرت یا گھریلو ماحول یا دین داری ماں، باپ کی تربیت کا اثر ہوسکتا ہے۔نہ کہ خالص اس مادّی تعلیم کا''۔(۴)

جس طرح ہر بڑے ادیب کا ایک مطمحِ نظر ہوتا ہے اسی کے تحت اس کی تصنیف وتالیف عمل میں آتی ہے اور اپنے مقصد کی تکمیل کی خاطر شب وروز کوشاں رہتا ہے۔مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی کا مقصد متعین کرلیا تھا کہ اللہ کا دین ہر کس وناکس تک پہنچ جائے۔اس میں اگر کوئی چیز بیچ میں حائل ہوجاتی تھی تو بڑی پامردی سے مقابلہ کرتے تھے۔جب کبھی مغرب سے ابرسیہ اٹھ کر فضائے اسلام کو کثیف کرنا چاہتا تھا تو آپ کی جنبش قلم براہِ راست یا بالواسطہ اس کا سدِّ باب کرتی تھی۔مثلاً مغرب کا مثالی مذہبی کردار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ گرامی ہے۔نتیجہ یہ کہ ان کے یہاں عظمتِ کردار، بے کسی، مسکنت، ترکِ دنیا، خود آزاری اور قربانی میں ہے۔ ٹوئن بی (Toynbee) ذہنی تیقن کے باعث کردارِ نبوی ﷺ کے بارے میں (نعوذ باللہ) تحریر کرتا ہے۔

Instead of seuling his prophetic message with his blood by becoming casar's victim It was Mohammed's ironic destinyto compromise and debase. His prophetic message be becoming on Arabian Caesarhimself.

ترجمہ: ''بجائے قیصر کا مقہور بن کر اپنی پیغمبرانہ تعلیمات پر اپنے خون سے مہر ثبت کرنے کے یہ محمد کی بدنصیبی ہی تھی کہ انہوں نے مفاہمت کی اور خود عرب کے قیصر بن کر اپنی تعلیمات کو گراوٹ سے ہمکنار کیا۔''(۵)

یہ ٹوئن بی (Toynbee) کی ہرزہ سرائی ہے کہ دیکھتا ہوں کہ سب کچھ لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں ورنہ تاریخ گواہ ہے کہ محمد ﷺ کی ذاتِ گرامی دنیا کے لئے رحمۃ للعالمین بن کر آئی تھی اوران کی سیرتِ مبارکہ اب تک دنیا کی مختلف زبانوں میں دولاکھ سے زائد لکھی جا چکی ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔

حضرت مولانا حکیم الاسلامؒ نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اوراس کا اندازِ بیان بڑا اچھوتا ہے۔ استعارہ اور کنایہ کے پیرایہ میں باتیں کہی گئی ہیں جس کی وجہ سے عبارت میں سلاست پیدا ہوگئی ہے۔ان کی تحریروں سے خود بخود ایسے لوگوں کا استیصال ہو جاتا ہے۔ جو اسلام کے دامن کو داغ دار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی مشہور و معروف کتاب ''مقاماتِ سیرت میں تحریر فرماتے ہیں۔

''جس طرح مادی سورج کا مطلع مشرقی افق کا بلند ترین حصہ رکھا گیا ہے تا کہ وہاں سے اس کی روشنی پورے عالم میں پھیل سکے۔اسی طرح آفتاب نبوت کے لئے مرکزِ طلوع کعبۂ مقدسہ کو تجویز کیا گیا جو ناف عالم اور وسط زمین تھا اور اسے دنیا کی ہر چہار سمت نسبتِ مساوی تھی۔ جیسا کہ مرکز کو اپنے دائرہ سے ہوتی ہے تا کہ اس کی کرنیں اگر ایک طرف بحیرۂ روم کے کناروں سے ٹکرائیں۔جس سے اس کی روشنی مغرب کی وادیوں میں پھیلے تو دوسری طرف بحر ہند کی لہروں سے جا لڑیں جس سے مشرقی ممالک ہندوسندھ ایران و خراسان اور چین و جاپان روشن ہو جائیں اور ایک سمت خلیج فارس کے ساحلوں پر اپنا نورانی سایہ ڈالیں جس سے شمال کے علاقے منور ہوں تو دوسری طرف خشکی میں براعظم مصر و سوڈان کے علاقے چمک اٹھیں۔اس لئے اس آفتاب کو افق مکہ سے بلند کیا گیا اور آپ نے اس ناف عالم سے آواز دی تو آپ کی صدائے ایمان

جگہ جگہ پھیلی۔ سلاطینِ عالم اور اقوام وملل کو آوازۂ حق سے روشناس کیا۔(۶)

مولانا حکیم الاسلامؒ قلم کے ساتھ ساتھ زبان کا بھی استعمال کرتے تھے اور اس کے لئے دور دراز کا سفر کر کے اپنا تقریری سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمن اسلامی تاریخ وتمدن کی طرف سے اسٹریچی ہال میں ''سائنس اور اسلام'' کے موضوع پر تقریر فرمائی جو بہت مقبول ہوئی اور اپنی اہمیت وافادیت کی وجہ سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔ پچھلے زمانہ میں مسلمانوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی کہ سائنس کی تعلیم سے مسلمان اپنے مذہب سے بیزار ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہستی سے انکار کردیتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں میں سائنسی علوم کا فقدان رہا لیکن ان کا یہ نظریہ درست نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سائنس کے مطالعے سے قرآنی آیات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے اور مظاہر قدرت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی صنّاعی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن پہلے قرآن وحدیث کی تعلیمات سے واقفیت حاصل کرے۔ سائنس اور اسلام کے تعلق سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عالمانہ تقریر میں بڑے فصیح وبلیغ اور تمثیلی انداز میں کہا ہے۔

''جس طرح جسم اور مادہ روح کے لئے وسیلۂ عمل ہیں۔ خود مقصود واصل نہیں۔ اسی طرح مادی تصرفات جن کا نام سائنس ہے، روحانی تصرفات کے لئے۔ جن کا نام اسلام ہے۔ اصولاً محض وسیلہ اور ذریعہ کا درجہ پیدا کرسکتے ہیں۔ خود مقصدیت کی شان کبھی نہیں پیدا کرسکیں گے اور ظاہر ہے کہ جب سائنس وسائل میں سے ہوئی تو پھر یہ ایک عقلی اصول ہے کہ وسیلۂ مقصود کی ضرورت سے اختیار کیا جاتا ہے اور اسی حد تک مقصود میں معین ہو۔ یعنی بقدر ضرورت ورنہ بالاصالہ اس میں انہماک رکھنا اس میں مقصودیت کی شان قائم کرنا جو قلبِ موضوع اور خلاف عقل ہے۔ اس لئے عقلاً ہی یہ بھی واضح ہوا کہ مقصود اصلی یعنی دین سے جدا رہ کر سائنس محض میں انہماک پیدا کرنا کوئی عاقلانہ فعل نہیں قرار پاسکتا۔ بلکہ اسے وسیلہ کی حد تک اور بمقدار ضرورت ہی اختیار کرنا دانائی ہوگی''۔(۷)

اگرچہ مولانا کی کوئی ادبی تصنیف منصۂ شہود پر نہیں آئی لیکن ان کی ایک منظوم کتاب ''آنکھ کی کہانی'' کے نام سے دو جلدوں میں چھپ کر علمی اور ادبی دنیا میں مقبول ہوچکی ہے۔ لیکن ان کی جتنی کتابیں میری نظروں سے گزری ہیں، ان میں استعارہ، کنایہ، تمثیل، جدت وندرت، سہل ممتنع کا اتنا برمحل استعمال ہے کہ ان کی تحریروں میں ادبی شان پیدا ہوگئی ہے جو ان کی خلّاقانہ ذہن کا پتہ دیتی ہیں اور ان کے طرزِ نگارش میں ادبی اور علمی آمیزش سے زبان میں نیا رنگ وآہنگ پیدا ہوگیا ہے جو اپنی معنویت اور افادیت کے لحاظ

سے ہر ادب شناس کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ آنے والے وقتوں میں مصنفین اس گوشے کو بھی اجاگر کریں گے۔ انشاء اللہ جس سے ان کی شخصیت کا یہ گوشہ بھی منظرِ عام پر آ جائے گا۔

....

(۱) مولانا محمد اسلم قاسمی، سیرت حلبیہ اردو، ص: ۳۷

(۲) خطبات حکیم الامت، ج ۱، ص: ۱۲۸

(۳) مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ، خیر القرون کی درس گاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت، ص: ۳۷۵

(۴) خطبات حکیم الامت، ج ۳، ص: ۴۱۶

(۵) اسلام پیغمبرِ اسلام ﷺ اور مستشرقینِ مغرب کا اندازِ فکر، ص: ۲۶۵

(۶) حضرت تھانویؒ، مقامِ سیرت ص: ٦٦

(۷) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، سائنس اور اسلام، ص: ۵۷۵

............❖............

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اور دعوتِ دین

ابوالبشر اصلاحی
سب ایڈیٹر روزنامہ "سازِ دکن" حیدرآباد

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَ یَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ.
نَحْمَدُهٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ.

حمد وستائش ہے اس ذات برتر کے لئے جس نے اس کائنات کی تخلیق کی۔ شکر وسپاس ہے اس ذاتِ بے ہمتا کے لئے جس نے ہمیں انسان بنایا، وصفِ انسانیت سے ہمکنار کر کے اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا۔ بعدہٗ اس ذات اقدس نے ہمیں ایمان کی نعمت سے نوازا کہ جس کے توسط سے ہمیں دنیا کی امامت و سیادت کی عظیم ذمے داری عطا کی گئی۔ مستحق حمد وستائش ہے وہ ذاتِ منعم جس نے ہمیں نطق کی نعمت سے نوازا، گویائی کی صلاحیت وقوت بہم پہنچائی۔ عقل وخرد اور علم و ہدایت سے روشناس کرایا، اسی نعمت نطق و معرفت کی بناء پر ہم اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کرتے ہیں۔ اسی بنیاد پر امت مسلمہ کو دعوتِ دین کا فریضہ سونپا گیا اور اعلاءِ کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین اس امت کا فرضِ منصبی ٹھہرا۔

درود وسلام ہو نبی آخر رحمۃ للعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جنھوں نے بھٹکے ہوئے انسانوں کو انسانیت سے ہمکنار کیا۔ اللہ ارحم الراحمین نے رسول اکرمؐ کو دین حق اور راہِ ہدایت کے ساتھ اسی معمورۂ عالم میں مبعوث کیا۔ آپؐ کے ذریعہ دین اسلام تمام ادیان وملل پر غالب ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دعوتِ دین اعلاء کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین کے لئے علم (وحی) وقلم کی جامعیت عطا کی اور اسی راہ میں نصرت وتمکین کے لئے رعب اور تلوار

عطا کی۔ اسی طرح اللہ پاک کی رحمتِ واسعہ اور رسول اللہ ﷺ کی محنت شاقہ کا ثمرہ ہے کہ اللہ کا دین آج ہم تک پہنچ کا ہے۔ فلھٰذا اَشکروا اللّٰہ و صلّوا علیٰ رسولہ الکریم صلی اللہ علیہ وسلم۔

حکیم الاسلامؒ کا اجمالی تعارف

چودھویں صدی ہجری میں عالم اسلام کے افق پر جو عظیم المرتبت شخصیات منصۂ شہود آئی ہیں انہیں میں سے ایک مایۂ ناز، موثر اور عہد آفریں شخصیت کا نام نامی مولانا محمد طیب صاحبؒ ہے جو خلقِ خدا میں حکیم الاسلام کے لقب سے ملقب ہوئے۔ یہ وہ عظیم شخصیت ہے جس کے تذکرہ کے بغیر چودھویں صدی کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ آپ علم وفضل کے بحر بیکراں تھے۔ بیانِ حق وصدق میں تیغ برّاں تھے۔ آپ ورع وتقویٰ کے پیکر، امراض نفس کے حکیم حاذق، علوم جدید سے واقف، محی السنۃ اور ماحی ضلالت و بدعت تھے۔ حکیم الاسلامؒ ان عظیم شخصیتوں میں سے ایک ہیں جو غلبۂ دین اور اشاعت اسلام کے لئے بے قرار رہتے ہیں۔ آپ نے حریت افکار اور دمکتے ہوئے کردار کے ذریعہ علم وعمل کا ایسا حسین وجمیل عہد تعمیر کیا، جس کی تابندہ کرنیں آج بھی گمراہ دلوں میں اجالا کردیتی ہیں۔ آپ کا عظیم کردار اور عظیم خدمات اس کے حد درجہ لائق ستائش ہیں۔ آپ کی حیات وخدمات دراصل ان عظیم شخصیتوں کے سلسلۃ الذہب کی ایک سنہری کڑی ہے جو دعوت دین اور غلبۂ دین کے لئے اتباع سنت، جرأت مندی اور حق گوئی کا ایسا مرقع تھے جن کے سامنے باطل قوتیں حواس باختہ ہوگئیں۔ دشمنانِ اسلام کی سطوت سرنگوں ہوکر رہی اور بدعت وخرافات اور گمراہی وباطل نظریات کا خرمن خاکستر ہوگیا۔ نتیجتاً حق وصداقت کے گلشن پر بہاریں عود کرآئیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حکیم الاسلام مولانا طیب صاحبؒ کے متعلق مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے بڑی مبنی برحقیقت بیان کی ہے۔ مفتی صاحب رقم طراز ہیں:

”یہ بات بلاخوف تردید لکھنے کے لائق ہے کہ اگر امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ سیاسی جھمیلوں اور بکھیڑوں میں نہ پڑتے اور حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اہتمام دارالعلوم کی ذمے داریوں اور الجھنوں میں نہ الجھائے گئے ہوتے تو یہ دونوں فخر روزگار اور شانِ ہندوستان شخصیتیں اپنے اپنے وقت کے امام غزالی، علامہ ابن تیمیہؒ کی ہم رتبہ ہوتیں۔ (۱)

نام نہاد سیاست سے اجتناب

حکیم الاسلامؒ کی خوبیوں میں سے ایک عظیم خوبی جو میرے لئے لائق اعتناء ٹھہری ہے وہ یہ کہ آپ نے نام نہاد سیاست اور باطل اقتدار سے بالکلیہ اجتناب کو اپنے لئے شانِ استغناء بنائے رکھا۔اس طرح آپ تاعمر حکم خداوندی ''فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ'' کی عملی تفسیر بنے رہتے نیز ''اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءَ'' کا حقیقی حق ادا کیا بایں وجہ کہ انبیاء کرام کا عظیم ورثہ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ہی ہے۔ مولانا محمد طیب صاحبؒ کے نام نہاد سیاست سے اجتناب پر محمد اکبر شاہ بخاری لکھتے ہیں ''کہ آپ سیاست سے الگ رہ کر علم دنیا کے سیاح اور عمل کی وادیوں میں تھے۔''

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی صاحب رقم طراز ہیں ''حکیم الاسلامؒ سیاسی ہنگاموں اور انتخابی نعرہ بازیوں کے لئے موزوں نہ تھے، جب کبھی حالات کے دباؤ یا کسی بزرگ کے سیاسی تصرف کی وجہ سے اس علمی دائرہ سے باہر قدم نکالنے کی کوشش کی تو فوراً ان کو محسوس ہوا کہ یہ ان کا میدان نہیں ہے۔'' (۲)

حکیم الامت مولانا تھانویؒ کی اس تلقین کا آپ نے عمر بھر لحاظ رکھا۔تھانویؒ نے فرمایا تھا: ''میں نے قرآن وسنت اور عمر بھر کے تجربہ سے مدرسہ کے بارے میں جو کچھ اصلح سمجھا وہ یہ کہ مدارس اور ان کے متعلقین کو سیاست حاضرہ سے بالکل مجتنب رہنا چاہئے۔

حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کا یہ پہلو دور حاضر کے علماء کرام اور اہلِ مدارس کے لئے ایک واضح آئینہ ہے جو اقتدار وقت کے کل پرزے بننے اور طاغوت کی کاسہ لیسی کرنے کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔حالاں کہ حکیم الاسلامؒ اپنی خداداد صلاحیت، زور آواز انداز، خطابت اور مثالی حسن انتظام کی صلاحیت کی بناء پر اگر چاہتے تو وقت کے عظیم سیاسی قائد اور ممبر پارلیمنٹ بہ آسانی بن سکتے تھے لیکن آپ کی فطری خدا ترسی اور بصیرت نے آپ کو سیاست حاضرہ کی گندگی سے بچالیا۔

مسلکی انتشار، مذہبی گروہ بندی اور عصبیت باطلہ سے مبرّا

حکیم الاسلامؒ کی عظیم شخصیت کا ایک عظیم پہلو یہ بھی ہے کہ مسلکی انتشار، مذہبی گروہ بندی اور ہر طرح کی عصبیت باطلہ سے اپنے کو پاک رکھا، آپ کی اس عظیم خوبی کا اعتراف مفتی فضیل الرحمٰن اس طرح کرتے ہیں ''حکیم الاسلامؒ مذہبی گروہ بندی اور جماعتی عصبیت کی مریضانہ ذہنیت سے بالکل پاک تھے، آپ کی مقناطیسی اور برگزیدہ شخصیت ۱۸ کروڑ مسلمانوں کے ان گنت فرقوں اور جماعتوں کے درمیان ایسی معتدل

اور متوازن اور غیر جانب دار رہی کہ ہر مکتب فکر کے افراد نے آپ کی سر بلند ظرفی وسیع القلبی کی وجہ سے آپ پر پورا بھروسہ اور اعتماد کیا اور اپنے لئے غیر مضر سمجھا۔ بایں وجہ ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا تاریخی اجلاس ہوا تو باتفاق آراء آپ ہی علماء اور دانشوران ہند کی اس عظیم تنظیم کے صدر اول بنائے گئے اور تاحیات اس منصب جلیل پر فائز رہے۔ (۳)

حکیم الاسلامؒ کا یہ عظیم اسوہ ہمارے لئے لائق اتباع ہے کہ ہم مذہبی گروہ بندی اور مسلکی تعصب سے اوپر اٹھ کر هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً کی عملی تفسیر بنیں۔ اسی دور میں جب کہ امت مسلمہ بحیثیت امت ہر جگہ دشمنانِ اسلام کے لئے ظلم وستم کا ہدف بنی ہوئی ہے۔ ضروری ہے کہ ہم متحد ہو کر دشمنانِ اسلام کی یلغار کا مقابلہ کریں اور اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا کے حکم آفریں کو اپنے لئے حرزِ جاں بنالیں اور دل کو بڑا کرلیں۔ ہر کلمہ گو بھائی کو اپنے دل میں جگہ دیں اور ان کی مخالفت میں زبان دراز نہ کریں۔ اس وقت جب کہ عالم کفر اسلام کے خلاف پوری طرح کمر بستہ ہے اور دشمنانِ اسلام اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ کی عملی تفسیر بنے ہوئے ہیں۔ ضروری ہے کہ ہم وطنی سرحدوں، مسلکی حد بندیوں کو توڑ کر هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً کی عملی تفسیر بن جائیں۔

دینی دعوت کے قرآنی اصول حکیم الاسلامؒ کی عظیم تصنیف

اصول دعوت کے عظیم فن پر حکیم الاسلام مولانا طیب صاحبؒ نے ایک عظیم کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام ''دینی دعوت کے قرآنی اصول'' ہے۔ حکیم الاسلامؒ کی اس معرکۃ الآراء تصنیف میں سورۂ نحل کی آیت اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ سے دینی اصول پر بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ عظیم کتاب اعلاء کلمۃ اللہ کے راہیوں اور داعیانِ اسلام کے لئے ایک بہترین گائڈ کی حیثیت رکھتی ہے جو ان کے لئے دعوت دین کی راہ میں ہر جگہ ہادی ورہنما ثابت ہوگی۔ حضرت مولانا سالم صاحب قاسمی مدظلہٗ کے بقول یہ عظیم کتاب ایک ایسا متن ہے جو ابلاغ دین کے لئے مکمل رہنما کتاب ثابت ہوگی۔ مولانا محمد سالم صاحب قاسمی اس عظیم کتاب کے متعلق رقم طراز ہیں:

''پیش نظر کتاب ''دینی دعوت کے قرآنی اصول'' حکیم الاسلامؒ کی اسلام کے مزاجِ اجتماعیت ودعوت پر اس عمیق ترین نگاہِ بصیرت کی غماز ہے کہ جس نے ان کو جماعت علماء کرام میں ایک منفرد اور مسلم مقام عظمت پر فائز فرمایا۔ اس لئے دعوتِ دین کے لئے موفق علماء کام کے لئے یہ کتاب ایسا متن ہے کہ جو

حسب ظروف واحوال دنیا کے تمام ملکوں، تمام قوموں اور تمام ادیان وملل کے سامنے موثر ترین اسالیب پر مشتمل ابلاغ دین کی انشاء اللہ ایک مکمل راہنما کتاب ثابت ہوگی''۔(۴)

دعوت دین کی اہمیت وضرورت

امت محمد یہ نبی آخر حضرت محمدؐ کی جانشین ہے۔لہٰذا دعوت دین اور شہادت حق کا وہی فریضہ اس امت کو بھی انجام دینا ہے جو خدا کے انبیاء کرام انجام دیتے رہے ہیں۔ اللہ پاک نے دعوت دین کی اہمیت وفرضیت کے لئے قرآن مجید میں جگہ جگہ تلقین کی ہے اور دعوت دین وشہادت علی الناس کے لئے امت مسلمہ کو اللہ نے منتخب کرلیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (سورۂ بقرہ)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دعوت کی فضیلت اس طرح بیان کی ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ.(حم سجدہ)

آیت کریمہ میں دعوت دین کو عملِ دین پر بھی فضیلت دی گئی ہے اور استفہام بقصد نفی کی تعبیر نے دعوت دین کی اہمیت کو فرید آشکارا کردیا ہے۔

دعوتِ دین کی اہمیت کے متعلق مولانا محمد طیب صاحبؒ اپنی مایہ ناز تصنیف میں رقم طراز ہیں:

''اسلامی نقطۂ نظر سے انسانی سعادت کا دارومدار دو چیزوں پر ہے۔صلاح اور اصلاح یعنی خود صالح بننا اور دوسروں کو صالح بنانا یا خود کمال پیدا کرکے دوسروں کو باکمال کردینا، جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں محض لازمی اور ذاتی نفع پر قناعت نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کو متعدی بنایا گیا ہے کہ ایک سے دوسرے تک پہونچے۔''(۵)

دعوت دین کی ضرورت

عالمِ انسانیت کی شومئی قسمت رہی ہے کہ یہ عقل وادراک کی بے پناہ قوتوں کے باوجود تاریخ کے ہر دور میں کائنات کی دوسری مخلوقات کی بنسبت بے عقلی اور فریب کی زنجیروں میں افسوس ناک حد تک گرفتار رہی ہے۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ جس حقائق اور متعلقات سے اسی کا زیادہ واسطہ رہا اسی کو سمجھنے میں اس نے زیادہ غلطی کی ہے۔ مثلاً خود انسان کا خالق اور خالق کائنات ''اللہ'' جس سے انسان کا تعلق ابتدائے آفرینش سے ہے۔ اس کے متعلق ان لوگوں میں بھی جو اللہ کے عقل ونگاہ سے پرے ہونے کے باوجود اسے تسلیم

کرنے پر مجبور ہیں نہ یہ کہ اتفاق نہیں پایا جاتا بلکہ اس بارے میں کوئی معتدل اور متوسط نقطۂ نظر قائم کرنے میں بھی یہ لوگ ہمیشہ ناکام رہے ہیں۔ اللہ کو چھوڑ کر بے شمار قوتوں کو اپنا حکمراں بنائے ہوئے ہیں۔ اس طرح دوسرے مواقع جہاں انسانیت کی فلاح و بہبود اور اس کا مقصدِ وجود وابستہ ہے وہاں بھی انسان غچے کھاتا پھرتا ہے۔ روح، جزا و سزا وغیرہ ماورا موضوعات کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی سے وابستہ چیزوں کے معاملہ میں بھی انسان ہر دور میں فریب خوردہ دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح عقل خود مطالبہ کرتی ہے کہ بھٹکی انسانیت کے لئے کوئی راہنما کوئی ایسا داعی ہونا چاہئے جو راہ راست کی دعوت دے سکے۔ لہٰذا فریب خوردہ عقل وادراک دین کی دعوت دینا اور اسے قرآن وسنت کی میزان دے دینا عین انسانیت کی پکار ہے۔ اسی ضرورت کی برآوری کے لئے دین کی دعوت ہر دور میں ناگزیر رہی ہے۔

دعوت دین امت مسلمہ پر عائد ایک اہم ترین فریضہ ہے تاکہ جہالت، گمراہی، شرک اور باطل نظریات میں لت پت انسانیت کو ہدایت کی راہ پر لایا جا سکے۔ اسی فریضہ سے عدم توجہی نے ایک طرف کفر و شرک میں مبتلا عامۃ الناس کے لئے ہدایت کی راہیں مسدود کر کے انہیں خدا کے غضب کی طرف جانے کی خاموش اجازت دی جو فی الواقع کنبۂ آدم کے لئے انتہائی المناک ہے۔ دوسری طرف اس فریضہ سے غفلت نے کفر وشرک کے علم برداروں کو ہم پر اتنا جری کر دیا کہ خود مسلمانوں کو کفر وشرک کی طرف دعوت دی جانے لگی۔ نتیجتاً مسلمان دعوت واقدام کے بجائے مدعو بننے اور محض دفاع کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ شدھی تحریک، بہائی دھرم، عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں اور کمیونزم سرمایہ داری ڈیوکریسی سیکولرزم جیسے نظریات کے ذریعہ امت کے جدید ذہنوں پر حملے دراصل ہماری اسی غفلت کا آئینہ دار ہیں۔ اس فریضے سے غفلت اور عدم توجہی نے ہی عملاً مسلمانوں کو اقدار اور ارتقاء سے دفاع وتنزل کی طرف گامزن کر دیا ہے۔ اسی تعلق سے حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ لکھتے ہیں:

''صد حیف کہ آج یہ منصوبہ مسلمانوں سے تقریباً ختم ہو چکا ہے اور اسی لئے اقوام غیر کی نسبت سے ان کی برتری اور فوقیت جس نے انہیں خیر امت بنایا تھا۔ فسانۂ ماضی ہو کر رہ گئی ہے۔ نیز اسی لئے یہ امت اقدامی ہونے کے بجائے جو اس کی اصل شان تھی محض دفاعی بن کر رہ گئی ہے اور ظاہر ہے کہ دفاع محض نہ یہ کہ ارتقاء کا راستہ بند کر دیتا ہے بلکہ زوال وفنا کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتا ہے چنانچہ امت پر محض اقدامی صورت حال کے ختم ہو جانے سے اقوام کی یلغار ہے۔ امتیں اس پر ٹوٹی پڑ رہی ہیں اور امت مرحومہ ان یلغاروں کا دفاع کرتے کرتے نہ یہ کہ صرف تھک چکی ہے بلکہ تقریباً مایوسی کا شکار ہے۔'' (۶)

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اور ان سے قبل کے علماء کرام نے دعوت دین کی اہمیت اور اس سے غفلت کے نتائج سے واقف ہیں۔ بانی تبلیغی جماعت مولانا محمد الیاس صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ’’اگر تم داعی نہیں بنو گے تو دوسروں کے مدعو بن جاؤ گے۔‘‘ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ آیت کریمہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ’’وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاءَ‘‘ مسلمانوں کو تو ان سے ملتے ہوئے اسی کا خیال نہیں ہوتا کہ ان کو مسلمان بنائیں اور وہ ہر وقت دل میں یہی خیال رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بنائیں۔(۷)

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ رقم طراز ہیں:

’’دعوت دین کی اہمیت کے باوجود امت مسلمہ کی اکثریت اس سے غافل نظر آتی ہے جس کی عدم ادائیگی کی وجہ سے متعدد ملکوں اور علاقوں سے اپنا وقار و اعتماد، حکومت و اقتدار کھونا پڑا اور جس کا خمیازہ وہ آج بھی بھگت رہی ہے۔ خصوصاً غیر مسلموں میں دعوتی کام نہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ غیر مسلم دولت اسلام سے بے بہرہ اور صحیح طرز زندگی سے نا آشنا ہیں بلکہ وہ اپنے اخلاق سوز و ایمان دشمن نظریات و تحریکات اور باطل نظام حیات کو امت مسلمہ اور خیر امت کے سروں پر تھوپ رہے ہیں۔ مجموعی طور پر سارا عالم اسلام دین حق کا داعی بننے کے بجائے باطل افکار و نظریات کا مدعو بلکہ طفیلی بنا ہوا ہے۔‘‘

دعوت دین کے متعلق غلط فہمیاں

دعوت دین ’’تبلیغ اسلام اور To Preachs of Islam کے متعلق ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ تبلیغ اسلام اور دعوت دین دراصل مسلمانوں کی اصلاح کر دینے ان کو عبادت کے رنگ میں رنگ دینے کا نام ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ پہلے مسلمانوں پر تبلیغ کی جائے۔ غیر مسلم انہیں دیکھ کر مسلمان ہو جائیں گے۔‘‘ دعوت و تبلیغ کا یہ غلط مفہوم اور اس کے لئے بھونڈی دلیل دراصل ایک خطرناک غلطی ہے۔ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اس غلط فہمی کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

’’تبلیغ اسلام کے معنی پشتینی مسلمانوں کو عباداتی رنگ کے کچھ احکام پہنچا دینے اور انہیں وابستہ کر دینے کے لئے نہیں کہ جس کے بعد یہ سمجھ لیا جائے کہ فریضۂ تبلیغ ادا ہو گیا یا ارباب تبلیغ فرائضِ دعوت سے سبکدوش ہو گئے۔ مجھے اسی انداز کی کسی دعوت خاص کی ضرورت اور افادیت سے اگر چہ انکار نہیں لیکن اسے فریضۂ تبلیغ سے سبکدوشی سمجھ لیا جانا قرآن کے اصول تبلیغ کی روشنی میں یقیناً صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ جزو تبلیغ

وتذکیر واصلاح وغیرہ کے عنوانات سے یاد کی جاسکتی ہے مگر عرف شریعت کے لحاظ سے اسے تبلیغ نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ عرف شریعت میں تبلیغ درحقیقت اسلام پہنچانے اور اسلام برادری کے وسیع کرنے کو کہا گیا ہے۔اسی لئے تبلیغ اپنے حقیقی معنی میں (غیر مسلموں کو) اسلام کا پیغام پہنچانے کا نام ہے۔(۸)

اسی طرح ایک اور غلط فہمی ذہنوں میں رچی بسی ہوئی ہے کہ کسی مسلمان یا کسی انسان کو نیکی کی کوئی بات ہدایت وخیر کا کوئی وظیفہ بتا دیا جائے یہ بھی تبلیغ دین اور دعوت دین ہے۔ چنانچہ اسی غلط فہمی کی بناء پر غیر مسلموں کو اصل دعوت نہ دے کر محض کچھ معروضات خیر خوبی کی باتیں اور اصلاح معاشرہ کی نوعیت کی احادیث وآیات سنائی جاتی ہیں پھر اس کا موازنہ غیر مسلموں کی مذہبی کتابوں سے بھی کیا جاتا ہے نتیجتاً ہر کوئی اپنے مذہب کو خیر وصلاح کا مذہب قرار دے کر مطمئن ہوجاتا ہے۔افسوس اس عجیب وغریب طریقہ کو بھی دعوت وتبلیغ کا نام دیا جاتا ہے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

’’پھر اسی سبیل رب کے کلمہ سے فعل دعوت کی نوعیت بھی خود ہی متعین اور مشخص ہوجاتی ہے کہ شریعت پہنچانے اور تبلیغ دین کرنے کا نام فعل دعوت ہے۔مطلقاً کسی نہ کسی بات کے پہنچا دینے یا کسی نہ کسی معقول یا بھلی بات کے کہہ دینے کا نام دعوت نہیں ہے ورنہ اُدْعُ کے بعد سبیل رب کا کلمہ نہ لایا جاتا بلکہ اُدع پر قناعت کرلی جاتی تو اس میں عموم رہتا کہ جو چاہو پہنچادو وہی فعل دعوت اور اُدْعُ کی تکمیل ہوگئی مگر جب اس فعل کو سَبِیْلِ رَبِّ سے مقید کردیا گیا تو واضح ہوگیا کہ محض کسی نہ کسی چیز کے پہنچانے ہی کے فعل کو فعلِ دعوت کہا جائے گا۔‘‘(۹)

حکیم الاسلامؒ کے مذکورہ بالا دو غلط فہمیوں کے ازالہ میں اجمالاً ایک اور حقیقت واضح ہوتی ہے کہ دینِ دعوت اور دین کی تبلیغ میں دعوت وتبلیغ دین کی ہونی چاہئے جس کو آپ نے شریعت اور سبیل رب کی معنویت سے واضح کیا ہے۔لہٰذا ان غلط فہمیوں کا ازالہ کے لئے دین کے مفہوم کو سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔

دین کا مفہوم

دین کے معنی عربی زبان میں اس طرح ہیں و کلمة الدین معناها (۱)القهر والغلبة (۲)التعبد والطاعة (۳)الشریعة ای الحدود والقوانین التی تتبع (۴)المحاسبه والجزاء والاقارب(۱۰)

اس دین کے معنی تسلط وغلبہ بندگی واطاعت شریعت اسلامی قوانین اسلامی محاسبہ جزاء وسزا ہے۔

اس طرح دین کی دعوت کا مطلب یہ ہوا کہ اس بات کی دعوت دی جائے کہ اللہ کی زمین پر تسلط وغلبہ اللہ کی شرعی حاکمیت ہی کی ہو۔ ادیان باطلہ کو زیر نگیں ہو کر رہنا چاہئے۔ بندگی واطاعت صرف اللہ کی کی جائے۔ غیر اللہ کی بندگی سے باز آیا جائے اور شریعت مطہرہ ہی کی فرماں روائی ہو۔ اس سے روگردانی کی صورت میں محاسبہ گرفت اور جزاء وسزاء کا نظم قائم ہوجائے۔ دعوت دین کا مفہوم ان سارے امور پر محیط ہے۔ لہٰذا مولانا محمد طیب صاحبؒ کا اشارہ اسی جانب ہے کہ فریضۂ دعوت وتبلیغ کو اسی کے تمام مطلوبات کے ساتھ ادا کیا جائے۔

دعوت دین واعلاء کلمۃ اللہ امت کی شوکت کا ضامن

غلبہ وحکمرانی امت مسلمہ کا وطیرہ ہے۔ عزت وسربلندی مسلمانوں کی میراث ہے لیکن مسلمانوں کی عظمت وسربلندی اس دین کی سربلندی سے وابستہ ہے۔ امت مسلمہ کو اسی وقت عزت و وقار کی زندگی حاصل ہوسکتی ہے جب دین تمام ادیان باطلہ پر غالب ہو۔ رسول اکرم ﷺ اسی مقصد عظیم کی خاطر مبعوث ہوئے تھے۔ **هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ** اسلام آیا ہی غالب اور سربلند ہونے کے لئے **الاسلام یعلوا ولا یعلیٰ** (حدیث) لہٰذا امت مسلمہ کو اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے اور عظمت رفتہ کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ وہ دعوت دین، اظہارِ دین اور غلبۂ اسلام کے لئے اٹھ کھڑی ہو ورنہ غلط راہوں پر چل کر کبھی بھی اسے عزت وشوکت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ دعوت دین اور غلبہ اسلام کا مقصود ومطلوب بھی غلط راہوں اور غلط طریقہ کار سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا دعوت دین اور غلبہ اسلام اور مسلمانوں کی عزت وسطوت یہ دونوں مطلوب ومقصو قرآن کی متعین کردہ راہ پر چل کر ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مولانا محمد طیب صاحبؒ ان دونوں حقائق کو بڑے لطیف پیرایہ میں سمودیا ہے۔ آپ لکھتے ہے:

''اور یہ دینی وایمانی ملکات جن میں علم ومعرفت کی حدود اور عمل کی معتدل بنیادیں استوار ہوں وہی دین ہے جو مستند علم اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ اس لئے حدیث نبوی کا صاف مطلب ومنشاء یہ نکلا کہ تم اقوام پر دین سے غالب آسکتے ہو، دنیوی عہدوں، منصبوں، رسمی شوکتوں کے منصوبوں اور دولت کے ذخیروں سے غلبہ نہیں پاسکتے۔'' (۱۱)

اس پیرایہ میں ایک واضح حقیقت یہ آشکارا ہوئی ہے کہ دعوت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ ہی کے ذریعہ امت مسلمہ عزت وشوکت سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ دوسری ایک حقیقت بڑے لطیف اور مضمر انداز میں بیان کی گئی ہے کہ دعوت دین اور غلبۂ دین کی ذمے داری ادا کرنے کے لئے کسی غلط راہ اور خارجی شرائط کی قطعاً ضرورت نہیں ہے بلکہ دینی وایمانی ملکات اور علم ومعرفت کی حدود ہی داعی کے لئے اصل مشعل راہ ہیں۔ اس کے لئے شیروں کا دل اور چیتے کے جگر کی ضرورت ہے۔ عیش نہیں اور عافیت کوشی ترک کر دینے اور دعوت کا انبیائی انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ دعوت دین کی راہ میں بوڑھے ہو کر مرنے کے بجائے جوانی ہی میں شہید ہو جانے کی تمنا کی ضرورت ہے تاکہ خون شہادت خود ایک دعوت بن جائے۔ افسوس ہم اس غلط گمانی میں خوش گمان ہیں کہ باطل کی راہ سے بھی حق غالب ہوگا۔ اخلاقیات کے نعرے، جمہوریت کی دل رُبا فریبی راہیں، حقوقِ انسانی کی چیخیں یہ سب شیطان کے وہ سنہرے جال ہیں جس میں وہ داعیانِ حق کو پھانسی دے کر انہیں ان کے فرضِ منصبی سے دور کرنا چاہتا ہے۔''

بدعات و باطل نظریات کی تبلیغ جائز نہیں

حکیم الاسلامؒ نے اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ کو اچھی طرح واضح کرتے ہوئے صاف طور پر وضاحت کر دی ہے کہ تبلیغ اور دعوت صرف ''سبیل رب'' ہی کی ہونی چاہئے۔ تبلیغ ودعوت اللہ کا عطا کردہ فریضہ ہے اور اللہ نے خود حکم دیا ہے کہ صرف میرے راستے کی طرف لوگوں کو بلاؤ۔ اب اس حکم قطعی کے بعد کسی اور طرح کی دعوت کسی اور چیز کی تبلیغ بالکل جائز نہیں۔ بدعات وخرافات جو دین کے نام پر گڑھ لی گئی ہیں دین کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا بدعات کی دعوت وتبلیغ بھی ناجائز ہوگی۔ اسی طرح نام نہاد حکمت کے تحت لوگ باطل نظریات کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ مثلاً کمیونزم، سیکولرزم، ڈیموکریسی وغیرہ کی تبلیغ قرآن کی رو سے نہ یہ کہ صرف ناجائز ہے بلکہ لوگوں کو ظلم وعدوان کی تبلیغ کرنے کے مترادف ہے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ رقم طراز ہیں:

''نیز جب کہ عبارت آیت میں منطوقاً امر کیا گیا ہے کہ تبلیغ خدا کے راستہ کی گرد اور خدا کا راستہ وہی شریعت یا شریعاتی پروگرام ہے جو اخلاق ربانی اور علم الٰہی پر مشتمل ہے، اس سے واضح ہوا کہ دین کے نام پر اختراعات ومحدثات اور بدعات کی تبلیغ جائز نہیں کہ وہ خدا کے راستہ کا پروگرام ہی نہیں وہ سبیل رب ہونے کے بجائے سبیل نفس یا سبیل خلق ہے جو عموماً مذہبی لوگوں کے غلو تعمقِ نظر اور تکلف سے پیدا ہوتا ہے۔'' (۱۲)

حکیم الاسلامؒ بالکل واضح طور پر فرماتے ہیں کہ دعوت کا مطلوب سبیل رب یعنی توحید وشریعت اسلامی ہے۔ یہ وہ واضح مطلب ہے جو ہر دور میں ایک رہی ہے۔ تمام انبیاء کرام کی دعوت کا ایک ہی موضوع رہا ہے۔ وہ یہ کہ انسانوں کو ان کے حقیقی پروردگار خدائے واحد سے آشنا کرایا جائے۔ انہیں عرفانِ الٰہی دے کر رب الٰہی کی غلامی میں داخل کیا جائے اور دنیا میں انسانوں کی حاکمیت وربوبیت کی بساط لپیٹ دی جائے۔ تاریخ انسانی کی ہر دور میں انسانی حقیقی رب کی معرفت میں غلطاں و پیچاں رہا ہے۔ اللہ کے ساتھ الوہیت میں دوسروں کو شریک ٹھہراتا رہا ہے۔ کبھی عقیدہ وعبادت میں کبھی حاکمیت غیر اللہ کی اتباع کی صورت میں یہ دونوں صورتیں انسانوں کو اللہ کے دین سے دور لے جانے والی تھیں۔ چنانچہ انسانیت کی رہنمائی کے لئے ہر دور میں انبیاء کرام آتے رہے ہیں اور انسانوں کو عرفانِ الٰہی کے ذریعہ حاکمیت الٰہی میں داخل کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح ہر نبی نے ایک ہی دعوت دی ہے کہ بالکلیہ اللہ کی بندگی کرو، طاغوت سے اجتناب کرو، انبیاء کرام کی دعوت کی یکسانیت کے لئے ملاحظہ ہو۔ (سورہ ہود، سورہ شعراء، ۱۰۵-۱۱۰، شعراء-۱۴۱، بقرہ ۲۵۶، نحل، اعراف، طٰہٰ-۵۰ مریم-۳۶)

دعوت دین جاہلی عصبیتوں اور حد بندیوں سے آزاد ہے۔ دین اسلام کسی شخصیت، جگہ، قبیلہ سے موسوم و منسوب نہیں ہے اور نہ ہی کسی عصبیت جاہلیہ کی مظہر ہے۔ لہٰذا دوسرے مذاہب کی طرح دین اسلام میں شخصیت پرستی، مقام وقبیلہ پر مفاخرت وغیرہ کا کوئی تصور پایا نہیں جاتا بلکہ اسلام دوسرے مذاہب کے برعکس اللہ واحد کی بندگی اور ہر طرح کے خیر کا نام ہے۔ اس طرح دین اسلام وطنیت، قومیت، شخصیت اور کمیونزم و رہبانیت جیسی عصبیتوں کی حد بندیوں سے بالکل آزاد و مبرا ہے۔ لہٰذا دعوت دین کا مطلب ان تمام حد بندیوں کو توڑنا ان عصبیتوں کا قطع کرنا ہے اور اللہ کے اس پسندیدہ دین کو پوری دنیا پر غالب کر دینا ہے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اس حقیقت کو اجمالاً تحریر کرتے ہیں:

”بہر حال یہ رہبانیت خیز اور گوشہ گیر مذاہب عموماً یا وطنی حد بندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں یا قومی بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں حتی کہ ان کے اسماء ہی سے یہ وطنی، قومی اور شخصیتوں کی حد بندیاں اور تنگیاں نمایاں ہیں۔ ہندو مذہب ملک کی طرف، یہودی مذہب قوم کی طرف اور بدھ مذہب یا عیسائیت شخصیتوں کی طرف منسوب ہے اس لئے ان کے اسماء ہی ان کی عمومیت اور ہمہ گیری سے انکاری ہیں۔

اسی حقیقت کو نبی کریمؐ نے اس حکیمانہ اور بلیغ انداز تعبیر سے ظاہر فرمایا ہے کہ:

”کان النبی یبعث الیٰ قومہٖ خاصۃً و بعثت الیٰ الناس کافۃ“

نبی اپنی ہی مخصوص قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا اور میں دنیا کے تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔'' (۱۳)

دعوت دین اور نیشنلزم (وطنیت)

اسلام وطنیت کے بت کو پاش پاش کرتا ہے۔ یہ عالمگیر دین نیشنلزم کے تصور اور نظریہ کو ایک خطرناک جہالت متصور کرتا ہے۔ علامہ اقبال نے وطنیت کی باطل خدائی کو مذہب کا کفن قرار دیا ہے اور اس بت کو پیوند خاک کرنے کی تلقین کی ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے — اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

''وطن کی محبت اسلام کا جز ہے'' یہ ایک گڑھی ہوئی حدیث ہے۔ اس کی کوئی سند نہیں۔ عبداللہ عزام نے علامہ ابن حزم کے حوالہ سے اسے لغو اور گڑھی ہوئی حدیث قرار دیا ہے۔ (دیکھنا قافلہ چھوٹ نہ جائے)

اسلام کا نعرہ ہے **لاشرقیة ولاغربیة الاسلامیة** اسی طرح دین کی دعوت وطنی سرحدوں اور حد بندیوں سے آزاد دنیا کے ہر خطے اور علاقے کے لئے ہے۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اس حقیقت کو بڑے مدلل انداز میں تحریر کرتے ہیں:

''اسلام نے ان تعلیمات کا خاص اہتمام کیا ہے جو اسے پھیل جانے اور ہمہ گیر بن جانے میں خاص اثر رکھتی ہوں اور اس کی عالمگیر تبلیغ کے لئے متقاضی ثابت ہوں۔ مثلاً وہ وطن حد بندیوں سے آزاد ہو اور ساری دنیا اس کا وطن ہو تو حضرت داعی اسلام ﷺ نے فرمایا: **جُعِلتُ لِیَ الارض مسجداً و طھوراً** (ابن ماجہ) میرے لئے ساری زمین کو مسجد اور ذریعہ پاکی بنایا گیا ہے۔''

دوسری جگہ حلقہ بگوشان اسلام کو سارے عالم کی فتوحات کی بشارت اور ترغیب دیتے ہوئے فرمایا جس کا مقصد ساری دنیا کو ان کا وطن باور کراتا ہے: **ستفتح علیکم ارضون و یکفیکم اللہ فلا یعجز احدکم ان یلھو باسھمہٖ.**

عنقریب تم پر زمینیں فتح ہوں گی اور خدا تمہارے لئے کافی ہے مگر پھر بھی تم میں سے کوئی شخص تیر اندازی (فنونِ جنگ) سے عاجز نہ ہو جائے۔

ایک جگہ مغرب و مشرق کی فتوحات کی بشارت دیتے ہیں:

ستفتح مشارق الارض و مغاربها علیٰ امتی و عمّا لها فی النار الا من اتقی الله و ادی امانة (ابو نعیم فی حلیة) ''عنقریب مشرق ومغرب میری امت پر فتح ہوں گے۔

ایک جگہ ساری زمین کے خزانوں پر اسلام کا قبضہ دکھاتے ہوئے فرمایا:

أوتیت بمفاتیح خزائن الارض فؤضعت فی یدی

مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں اور خزانے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے گئے ہیں۔'' (۱۴)

اسلام اور داعیان اسلام عالمی ہیں

جب اسلام عالمی مذہب ہے۔ اسلام کی دعوت عالمی ہے تو امت مسلمہ بھی عالمگیر امت ہے۔ اہل اسلام کو کسی خاص وطن میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ دشمنان اسلام کی بنائی ہوئی لائنیں انہیں پابند نہیں کر سکتی۔ پوری دنیا ان کا وطن ہے۔ اس لئے کہ مسلم قوم وہ قوم ہے جن کا مذہب عالمی ہے، جس کا خدا پوری دنیا، پوری کائنات کا خدا ہے۔ لہٰذا اللہ پاک نے پوری دنیا کو مسلمانوں کی میراث بنا دیا ہے: **یرثها عبادی الصالحون.**

لہٰذا دنیا کا ہر خطہ اور ہر ملک مسلمانوں کا ہے۔ ہندوستان، پاکستان، عرب، امریکہ، افریقہ سب مسلمانوں کی واجبی میراث ہیں۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن سارا جہاں ہمارا

اسی طرح مسلمانوں کی شناخت ان کی قومیت محض یہ ہے کہ وہ توحید کے علم بردار ہیں، مومن اور مصطفوی ہیں اور ان کا وطن ان کا دیس اسلام ہے۔

بازو تیرا توحید کی قوت ہے اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اس حقیقت کو بڑے واضح طور پر تحریر کرتے ہیں۔ آپ رقم طراز ہیں:

''مسلم قوم جس کے ساتھ اسلام وابستہ ہے کسی خاص وطن کی پابند نہیں۔ ساری دنیا اس کا وطن ہے اور کوئی ایک وطن اسے دوسرے وطن سے روک نہیں سکتا۔ بلکہ سارے عالم میں مسلم قوم کے پھیل جانے اور آخر کار اس کے ہمہ گیر اقتدار اور عالمی قبضہ کی خبر دی گئی ہے۔ اس لئے دنیا میں اس کے پھیل جانے کی خبر دراصل اسلام کے پھیل جانے اور عالمی بن جانے کی اطلاع جو اس کی قوم کے راستہ سے واقعہ بنے گی۔ هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ و دین الحق لیظهرهٗ علی الدین کله پس اسلام کو

عالمی بنا کر مسلم قوم کا عالی ہونا نمایاں ہوگیا اور مسلم قوم کی علمیت ظاہر کر کے اسلام کی علمیت واضح کی گئی ہے۔(۱۵)

دعوت دین کا طریقۂ کار

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ نے دعوت دین کے طریقۂ کار پر تقریباً ۳۵ صفحات پر مشتمل سیر حاصل بحث کی ہے اور قرآن سے اخذ کردہ اصول وضوابط مرتب کیا۔ ص ۵۸ سے ۸۷ تک آپ نے دعوت دین کے طریقہ کار کے ان پہلوؤں کا واضح طور پر جائزہ لیا ہے جو ہر داعی دین کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ مثلاً آپ دعوت عملی کی تین صورتوں موعظتِ عمل، مجادلت عمل، اور حکمت عملی کی درجہ بندی کرتے ہیں۔ آپ طریقہ دعوت موعظت عملی کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

آپؒ ایک حکایت لکھتے ہیں۔

''عملی موعظت سے مدعو کے دل میں ایقان واطمینان پیدا ہوتا ہے۔''

''ایک داعی دین نے اپنے متوسل کے دل سے حسن صورت کی محبت مٹانے اور حسنِ سیرت کی محبت قائم کرنے کے لئے اپنی اس چھوری کو جو اُن کے ایک متوسل کی منظور نظر ہوگئی تھی مسہلہ دوائیں کھلا کر زرد رنگ، بدہیئت اور بے انتہا لاغر بنا دیا۔ پھر اس متوسل کے پاس امتحاناً بھیجا۔ متوسل نے خلاف سابق بجائے میلان کے اعراض وتنفر کیا اور نگاہ بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔(۱۶)

مجادلہ عملی کے متعلق ذکر کرتے ہوئے آپ نے بطور مثال علامہ شبلی کے دور کے اس واقعہ کو پیش کیا جس میں **قل الروح من امر ربی** کا دہریوں نے انکار کیا ہے اور روح کو خون کی حرارت اور بخار لطیف کا نام دیا ہے اور **عن امر ربی** کا منکر ہوگئے۔ حضرت نے اپنی شہ رگ کٹا کر سارا خون باہر نکلوا دیا اور ثابت کیا کہ زندگی محض امر الٰہی سے قائم ہے نہ کہ خون وحرارت سے۔

افسوس حکیم الاسلامؒ نے اس واقعہ کے لئے کوئی حوالہ پیش نہیں کیا تا کہ یہ عجیب وغریب واقعہ مستند ہو کر اطمینانِ قلبی عطا کرتا۔

حکیم الاسلامؒ حجت بیانی کا طریقہ حکمت عملی کی مثال میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں آپ لکھتے ہیں کہ:

''بعض مشائخ کے سامنے چند فلسفی مزاج کے لوگوں نے دعا کے موثر ہونے کا انکار کیا۔ شیخ نے بجائے قولی تفہیم کے انہیں تیز کلامی کے ساتھ چند تہذیب سے گرے ہوئے جملے کہہ ڈالے۔ جس سے یہ فلسفی نہایت غیض

وغضب اور انتہائی جوش میں آ گئے اور خون کھول جانے سے چہرے تمتما اٹھے۔ پھر شیخ کے کچھ توقف کے بعد ان کی تعریف میں کچھ غیر معمولی اور مبالغہ آمیز جملے کہہ دیئے جن سے وہ پہلا اثر زائل ہو کر ایک نیا انبساط و نشاط پیدا ہو گیا۔ اس پر شیخ نے فرمایا کہ تم سمجھے میں نے کیا کہا؟ یہ میں نے تمہیں عملی جواب دیا ہے۔ تم غور کرو کہ میرے چند کلمات نے جو در حقیقت واقعیت لئے ہوئے بھی نہ تھے تم میں اس قدر ہیجان اور انقلاب پیدا کر دیا کہ تمہارے چہرے سفید سے سرخ اور سرخ سے سفید ہو گئے۔ تو کیا خدا کا پاک کلام جو حقیقتاً روح حیات ہے بدن اور روح میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکتا کہ آدمی صحت سے مرض اور مرض سے صحت کی طرف لوٹ جائے؟ پس یہ حکمت ہے مگر عملی جو حکمت فطری سے زیادہ موثر ہے"۔ (۱۷)

دعوت کے لئے مخاطب کے ساتھ شفقت و رحمت کی ضرورت و اہمیت ثابت کرتے ہوئے حکیم الاسلامؒ رقم طراز ہیں:

"واضح ہو گیا کہ جب تک مبلغ کو اپنے مخاطبوں کے ساتھ شفقت نہ ہو اس کی تبلیغ دلوں میں گھر نہیں کر سکتی اس کا مقتضا یہ ہے کہ مبلغ کی تمام تر ہمت صرف یہی نہیں ہونی چاہئے کہ وہ اپنا فریضہ تبلیغ ادا کر کے بری الذمہ ہو جائے۔ بلکہ اس کے دل میں باپ کی سی شفقت ہونی چاہئے۔ آنحضرتؐ نے اس تبلیغی رحمت و شفقت کو انتہائی حدود تک پہونچا دیا تھا حتی کہ ذات ارحم الراحمین کو یہ کہہ کر روکنے کی نوبت آئی کہ **لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَنْ لَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ.**

شاید آپ اپنے نفس کو ہلاک کر ڈالیں گے اس غم میں کہ یہ ایمان کیوں نہیں لائے۔ **مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغ.**

رسول پر احکام ہدیٰ دینے کے سوا اور کچھ واجب نہیں۔ (۱۸)

اسی طرح حکیم الاسلامؒ دعوت دین کے لئے نرمی و رافت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شفقت لسانی میں قول کی نرمی آتی ہے جو در حقیقت مبلغ کی تبلیغ کا زیور ہے جس سے تبلیغ آراستہ ہو کر محبوب قلوب بن جاتی ہے اور قلوب کو اپنی طرف جذب کر لیتی ہے جیسا کہ اس کے بالمقابل آواز کی کرختگی زبان کی تیزی اور اخلاق کی شدت و غلاظت دلوں کو چھیل ڈالتی ہے اور تبلیغ و مبلغ سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر کر دیتی ہے۔ اس پر رسول اکرمؐ کی رحمت و شفقت خصوصی ارشاد تھا۔

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنهم واستغفر لهم.

اذھبا الٰی فرعون انه طغٰی فقولا له قولاً لیناً لعله یتذکر او یخشیٰ

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی ہے اس سے نرم باتیں کہو شاید وہ یاد کرے اور اللہ سے ڈرے۔(۱۹)

حکیم الاسلامؒ تجدد دعوت کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں کہ دعوت مسلسل بلا ناغہ نہ دی جائے بایں وجہ کہ مخاطب اکتا جائیں گے۔

آپؒ لکھتے ہیں:

''دعوت وتبلیغ ہر روز اور ہر وقت بلا ناغہ نہ کی جائے ورنہ مخاطب اکتا جائیں گے اور آثار باطل ہو جائیں گے بلکہ درمیان میں وقفے اور ناغے دے کر تبلیغ کی جائے تاکہ ان کا شوق ہر روز تازہ بتازہ باقی رہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہفتہ میں ہر جمعرات کو وعظ وتذکیر فرمایا کرتے تھے۔ ایک شخص نے عرض کیا اے ابو عبدالرحمٰن کاش آپ ہمیں ہر روز وعظ سنایا کرتے تو حضرت ابن مسعود نے فرمایا:

خبردار! مجھ کو ہر روز وعظ کہنے میں مانع یہ ہے کہ میں تم کو اکتا دینا نہیں چاہتا۔ میں اسی طرح وعظ میں وقفے کرتا ہوں جس طرح آں حضرت ﷺ ہمارے اکتانے کے ڈر سے وقفے فرمایا کرتے تھے۔

حکیم الاسلامؒ امر اُدع کی عربیت اور فعل کے خواص کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی دعوت تجدد ثابت کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں ''دعوت وتذکیر کا امر اُدع کے صیغہ سے فرمایا گیا ہے جو فعل ہے اور عربیت کے قاعدہ سے فعل تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا جو گہ وبے گہ ہو نہ کہ دوام واستمرار پر جو مسلسل اور ہمہ وقت ہو۔''(۲۰)

اس طرح مختلف عنوانات قائم کر کے حکیم الاسلامؒ دعوت کے طریقۂ کار کے مختلف اصولوں کو بڑی تفصیل سے واضح کیا ہے جسے یہاں رقم کرنا کافی طول طویل کام ہے۔ البتہ حکیم الاسلامؒ نے ان اصول وضوابط کو بیان نہیں کیا جن کے تئیں اکثر داعیانِ کرام غلطیاں کرتے ہیں مثلاً حکمت کے نام پر بے حکمتی، دعوت کو مکمل نہ دے کر کانٹ چھانٹ کر دعوت دینا، غلط راہوں سے غلبہ اسلام اور دعوت دین کا کام کرنا، مداہنت دعوت دین بن کر آزمائش کا تصور وغیرہ۔ یہ ایسے موضوعات ہیں جن کی وضاحت ناگزیر ہے۔ اس کمی کے باعث یہ کتاب کچھ نامکمل سی لگتی ہے بایں وجہ یہ کتاب داعیان دین اور مبلغین کے لئے مکمل گائڈ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اگر یہ حقیقت ہے تو حضرت کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کو کام کرنا چاہئے بہت زیادہ ممکن ہے کہ حکیم الاسلامؒ کے نزدیک ایسا کوئی خاکہ رہا ہو لیکن اپنی مصروفیت کے باعث وہ یہ کام نہ کر سکے ہوں۔

البتہ آپ نے کہیں کہیں اجمالاً اشارہ ضرور کیا ہے مثلاً دعوت دین کی راہ میں حکمت اور حکمت کسی کے لئے کارگر ہوسکتی ہے۔

اسی طرح بیان کرتے ہیں۔

(ایک وہ کامل الاستعداد (طلب ہدایت کی استعداد) طبقہ ہے جن کے قلوب روشن ہوں علم کی صادق طلب اور معرفتِ حق کی سچی تڑپ ان میں بدرجہ اتم موجود ہو اور وہ ہر مدعا میں ایسی پختہ دلیلوں اور حجتوں کے طلب گار رہے ہوں جو یقینی ہوں اور دلوں میں نور یقین پیدا کرسکیں۔ ظاہر ہے ایسے افراد سے خطاب کی صورت بجز دلائل قطعیہ کے دوسری نہیں ہوسکتی اور اسی کا نام قرآن کی زبان میں حکمت ہے جو آیت **ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ** میں مذکور ہے۔'' (۲۱)

حکیم الاسلامؒ نے یہاں دو باتیں واضح طور پر بیان کی ہیں اولاً حکمت دلائل قطعیہ اور حجۃ ایقانی کو کہتے ہیں جو دلوں میں نور یقین پیدا کرسکے اور مخاطب کو قلبی طور پر قائل کرسکے۔ دوم یہ کہ حکمت کا یہ طریقہ انہیں پر کارگر ہوسکتا ہے جن کے دلوں میں معرفت حق کی سچی تڑپ بدرجہ اتم پائی جائے اور جن کے قلوب روشن ہوں۔ واقعتاً حکمت کا طریقہ ایسے ہی لوگوں پر موثر ہوسکتا ہے یہ اور قرآن وسنت میں حکمت کا یہی مفہوم متعین کیا گیا ہے مگر افسوس مختلف حلقوں اور ارباب دانش کے یہاں حکمت کا الگ مفہوم متعین کرلیا گیا ہے پھر اس پر ستم یہ کہ حکمت کا طریقہ ان دشمنانِ اسلام کے ساتھ اختیار کیا جاتا جو محض طاقت کی زبان سمجھتے ہیں جو **الناس علی دین ملوکھم** کے مصداق ہیں۔ آج دعوت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا کام کچھ اس طرح سے بھی کیا جارہا ہے کہ دین کے کچھ حصے کو پیش کیا جارہا ہے کچھ چھپالیا جاتا ہے۔ وہ معرفات جو مخاطب کے مذہب میں بھی معروف ہو اس کو پیش کرکے دعوت کا حق ادا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مشرکین کے سامنے ایسی باتیں کہنے سے اجتناب کیا جاتا ہے جس سے ان کے عقیدہ شرک پر ضرب پڑے۔ یہ کوشش کچھ زیادہ ہی کی جاتی ہے کہ کلمہ دعوت کچھ اس طرح سے کانٹ چھانٹ کر پیش کیا جائے جس سے امن و امان باقی رہے۔ آزمائشوں سے گذرنا نہ پڑے۔ دشمن کے مظالم کا سامنا نہ کرے۔ اس طرح کی مانیتا پراپت سیکولر دعوت کو افسوس صد افسوس حکمت کا نام دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ ہمیں دین کی دعوت مکمل طور پر دینا چاہئے۔ داعی کو ہرگز یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ اپنی صواب دید کے مطابق کچھ اجزا پیش کرے اور کچھ چھپالے۔ حالات خواہ کیسے ناسازگار ہوں داعی کو اصل دین مکمل شکل میں پیش کرنا چاہئے۔ اللہ کے دین میں کمی بیشی حالات کے تقاضوں کے تحت اس میں تغیر وتبدل بہت بڑا ظلم ہے۔ ایسے لوگوں کی دنیا وآخرت دونوں تباہ ہوتی ہے۔

رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: راس الحکمة مخافة الله
حکمت کی جڑ اللہ کا خوف ہے۔

لیکن ہم نے جو حکمت کا مطلب گھڑ لیا ہے۔ اس کی بنیاد کا منشا یہ ہے کہ پہلے اللہ کا خوف دل میں رکھ لیا جائے پھر اس کے بعد حکمت کی راہیں متعین کی جائیں جب کہ ہم حکومت، دشمنان اسلام کی قوت اور آزمائشوں کے خوف کو دل میں پال پال کر پھر پالیسیاں طے کرتے ہیں کہ اسی طرح دعوت دی جائے اُس طرح دعوت اِلاّ اللّٰہ پیش کیا جائے لا الہ غائب کر دیا جائے۔ دعوت اور تحریک ایسی ہو جس سے دشمنان کے مظالم اور راہ حق کی آزمائشوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ بے جا رواداری کا نام لے کر حکمت کی پٹیاں پڑھا کر مصلحت کی لوریاں دے دے کر ارباب حل وعقد اور ارباب دانش ایک طویل عرصہ سے امت کو خواب غفلت میں ڈالے ہوئے ہیں اور انسانیت کو ضلالت وگمراہی میں بھٹکنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم خواب غفلت سے بیدار ہوں، تمہارے علی الناس اقامت دین کی کماحقہٗ ادائیگی کریں۔

مداہنت

دعوت دین کی راہ میں ایک خطرناک مداہنت سے سابقہ پڑتا ہے۔ جب دعوت کی مقبولیت اور غلبہ دین کی سطوت کو روک نہیں پاتے تو وہ مداہنت کا شیطانی جال پھینکتے ہیں۔ کچھ دے دلا کر جاہ واقتدار، دولت وغیرہ دے کر داعیٔ کا منہ بند کرنا اور مداہنت ومفاہمت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے قدموں میں سرداران قریش عرب کی بادشاہت، دولت اور ہستی کو لا کر ڈال دیا اور آپ سے مطالبہ کیا کہ صرف ہمارے بتوں کو برا بھلا نہ کہو۔ آپ نے پوری جرأت کے ساتھ اس مطالبہ کو ٹھکراتے ہوئے کہا کہ اگر میرے ایک ہاتھ میں چاند، دوسرے میں سورج دے دیا جائے تب بھی میں اس کام سے باز نہیں آؤں گا۔ رسول اللہؐ کے پاس اس اسوہ کو سامنے رکھ کر ہی داعیان کرام اپنا جائزہ لیں کہ کس طرح سے بغیر کسی پیشکش کے ہی ہم باطل اقتدار کی خوشنودی ان کی پارلیمنٹوں کے ممبر بننے کے لئے کتنا تگ ودو کرتے ہیں۔ طرہ یہ کہ اس طرح دعوت وتبلیغ کا کام آسان ہوجائے گا۔ یہ تو عقلی دیوالیہ پن کی علامت ہے اور غلامانہ ذہنیت کی عکاسی ہے۔ سچ کہا ہے علامہ اقبال نے

سو غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

بے جا رواداری، مداہنت اور اصولوں کی قربانی، دعوت دین کے لئے سم قاتل ہے۔ دین کا مزاج کسی

بھی طرح مداہنت اور مصلحت کوشی کو برداشت نہیں کرتا۔ اللہ نے تو حکم دیا ہے۔ **فلذلک فادع و استقم کما امرت و لا تتبع اھوائھم**

پس آپ اس دین کی طرف دعوت دیجئے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اسی پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیے اور لوگوں کی خواہشات پر نہ چلئے۔ (الشوریٰ-۱۵)

دین کے معاملے میں مداہنت وہ خطرناک بیماری ہے جسے قرآن مجید کے مفاد پرست، دنیا پرست علماء کی صفت بنایا ہے۔

کچھ اہم نکات

کتاب ہٰذا ''اپنی دعوت کے قرآنی اصول'' میں دعوت کے طریقۂ کار کے باب میں کچھ اہم موضوعات شامل ہونا ضروری ہیں جسے کہیں کہیں اجمالاً آپ نے ارشاد بھی فرمایا ہے پھر تفصیل طلب ہیں۔ وہ اہم نکات نہیں ہیں۔ دعوت دین کا انداز دوٹوک ہو جس سے حق و باطل واضح ہو جائے۔ مشرکین پر شرک کی شناعت ظاہر ہو جائے اور توحید کی دعوت مکمل طور پر پیش ہو جائے۔ اس طریقۂ انداز میں خواہ کتنی آزمائشیں آئیں یہ کام اور یہ انداز بہرحال برقرار رہنا چاہیے۔

جو لوگ اس کام کو لے کر اٹھیں انہیں بہرحال مصلحتوں کے دھوکہ سے بچنا چاہیے۔ مصلحتیں دین کے کام کو غلط سمت میں ڈال دیتی ہیں۔ اس لئے دعوت بلا احمد بھی پوری قوت کے ساتھ دی جائے۔ بلا سے داعی کی پوزیشن خراب ہو، اس کی شخصیت بے حیثیت ہو جائے۔ اسے ساحر و مجنوں کہا جائے۔

داعی دین کو اس یقین کے ساتھ اٹھنا چاہیے کہ حالات خواہ کیسے ہی خراب ہوں باطل خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔ وسائل و افراد کی قلت ہو پھر بھی اللہ کی نصرت اہل حق کے شاملِ حال رہے گی۔

رواداری دعوت کے لئے زہر ہے۔ ایک فریب اور شیطان کی چال ہے ؎

آہ یہ رواداری یہ انداز تجدید
پتھر نہیں کہلائی اب دعوتِ توحید

✪ دعوت دین اور غلبہ اسلام کے لئے صحیح راہ درست طریقہ پر اختیار کرنا چاہیے۔ غلط راہوں سے حق کو غالب کرنے کے فریب میں پڑنا گمراہی اور لاحاصل ہے۔ جمہوریت اور سیکولرزم کے راستے دین کی دعوت بے وقوفی ہے اور سنت نبوی کی خلاف ورزی ہے۔

✪ دین کی دعوت متضاد ادیان کے درمیان تصادم ہے۔ لہٰذا اسی راہ کو پرامن طریقے سے سر کر لینا ناممکن ہے۔ حق کی دعوت پر باطل کا بحیثیت مجموعی چڑنا لازمی ہے۔ واضح رہے کہ یہ راہ پھولوں کی راہ نہیں۔ یہ میدان کانٹوں بھرا ہے۔ یہ پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا بستر ہے۔

✪ کامیابی و ناکامی اللہ کے ہاتھ ہے ہمارا کام صرف جدو جہد اور کوشش ہے۔ ایک داعی کا کام یہ نہیں کہ وہ مایوس ہو کر بیٹھ رہے یا کامیابی کے لئے غلط راہوں پر چل پڑے۔ کامیابی کے لئے جانفشانی صبر و ثبات اور تقویٰ کی ضرورت ہے۔

دعوت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کی ضرورت

حکیم الاسلامؒ نے دعوت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کی ضرورت کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

آپ رقم طراز ہیں:

''پھر اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر جنگی سفروں کا حکم دیا گیا اور کسی ایک خطبہ کا نہیں بلکہ جہاں بھی ضرورت محسوس ہو اور ارباب مہیا ہو جائیں پھر جہاد میں مزید سہولت کرنے کے لئے نماز آدھی فرما دی گئی۔ سفر جہاد کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کے اختیار نہ کرنے پر ملامت فرمائی گئی ہے۔

یٰایھا الذین اٰمنوا مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللّٰہ اثاقلتم الی الارض ارضیتم بالحیوۃ الدنیا من الآخرۃ فما متاع الحیوۃ الدنیا فی الآخرۃ الا قلیل

(اے ایمان والو تم کو کیا ہو گیا جب تم سے کہا جاتا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں سفر کرو تو تم بھاری بھرکم بن جاتے ہو کیا تم دنیا کی زندگی سے راضی ہو گئے ہو تو یاد رکھو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کچھ بھی نہیں مگر کم۔ (۲۲)

اگرچہ مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اسلام کی عالمیت کو واضح کرنے کے لئے اعلاء کلمۃ اللہ کی راہ میں جہاد کی ضرورت کو پیش کیا ہے لیکن محض یہی پیش کرنا ان کا مقصود نہیں ہے بلکہ آپ نے واضح طور پر اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کی ضرورت کو بیان کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاد غلبہ اسلام اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ناگزیر ہے۔ دعوتِ دین کی پشت پر جہاد کی قوت دعوت کو موثر بناتی ہے بایں مکی دور کی نسبت مدنی دور میں اسلام کی خوب اشاعت ہوئی۔ جوق در جوق لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ محض اخلاق کی قوت، موعظۃ حسنہ اور حکمت عملی کی وجہ سے دعوت دین اور اشاعت اسلام کا کام موثر نہیں ہو سکتا۔ مکی دور میں ان تمام روحانی

ہتھیاروں کے ساتھ آپ نے دعوت دین کا کام کیا لیکن دعوت اس قدر موثر نہ ہوسکی۔ لیکن مدینہ میں اگر جنگ بدر کے بعد ہی سے دعوت پھلنے پھولنے لگی۔ پھر اس امت کو دعوت دین کے ساتھ ساتھ اقامت دین کا فریضہ ادا کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ رسول اکرمؐ اور انبیاء کرام کی بعثت اسی لئے ہوئی تھی کہ وہ اللہ کے دین کو تمام ادیان باطلہ پر غالب کردیں۔ **لیظھرہ علی الدین کلہ** اسلام غالب ہونے کے لئے آیا ہے مغلوب ہونے کے لئے نہیں **الاسلام یعلوا ولا یعلیٰ** اسلام کو غالب کرنے کا کام امت محمدیہؐ ہی کے سپرد ہے۔ پھر فتنہ کو ختم کرنے اور دعوت کے پھلنے پھولنے اور اسے انسانی قلوب کو بلا روک ٹوک قبول کرنے کے لئے ماحول سازگار کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس کام کے لئے بھی جہاد کی ضرورت ہے۔ **وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للّٰہ.**

دعوت دین کے لئے تلوار کی اہمیت وضرورت کو بیان کرتے ہوئے علامہ ابن تیمیہؒ رقم طراز ہیں:

''پس دین کا قیام کتاب ہادی اور حدید ناصر یعنی تلوار کے بغیر ممکن نہیں جیسا کہ رب قدیر نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے:

''پس ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ رب قدیر کی رضا جوئی کے لئے قرآن اور تلوار دونوں کو باہم مجتمع کرنے کی جدوجہد کرے اور اس جدوجہد میں اللہ سے مدد مانگے۔ اس طرح قرآن اور تلوار کو باہم مجتمع کرنا دعوت دین کے لئے ضروری قرار پاتا ہے۔ (۲۳)

دعوت دین کی راہ میں آزمائش ناگزیر ہے

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ دعوت دین کی راہ میں آزمائش کا اجمالی تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مکی زندگی میں ابتلاء وآزمائش بزدلی اور کم ہمتی نہ تھی بلکہ ایک بلند نصب العین اور اعلیٰ دین کا ثبوت اپنی ثابت قدمی سے پیش کرتا ہے۔

آپؒ لکھتے ہیں:

''اعلیٰ ترین نصب العین کی خاطر ماریں کھانا، پیٹا جانا، مصائب وآلام کا پہاڑ اسر پر لے کر اف نہ کرنا اور جان ومال کی قربانی دینا بلاشبہ ہجوم واقدام اور حملہ تھا جو تیغ وسناں کے حملوں سے کہیں زیادہ سخت اور شدید تھا۔ تیغ وتفنگ کے حملوں میں یا حملہ آور ایک دم ختم ہوجاتا ہے یا مدمقابل کو ختم کر ڈالتا ہے یا دونوں ختم ہوجاتے ہیں لیکن اس معنوی حملہ میں خون اور زخم کا سوال نہیں بلکہ روحوں اور دلوں کے انقلاب کا سوال

ہے۔جس میں بیک دفعہ کارحرب وضرب تمام نہیں ہوجاتا بلکہ حملہ آور کو ہمہ وقت اور مسلسل مقابل افراد کی سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں جو روح اور بدن دونوں کو مسلسل گھائل بناتی رہتی ہیں۔اسی دعوت الی اللہ کی روحانی جنگ ونتائج زمانی ہوتے ہیں جن کا تسلسل قائم رہتا ہے۔''(۲۴)

حکیم الاسلامؒ مکہ کی ابتلاء وآزمائش کی زندگی اقدامی زندگی اور''جہاد کبیر'' بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پس مکہ کی زندگی باوجود بے سروسامانی کی زندگی ہونے کے دفاعی یا مدافعت یا محض پٹتے رہنے اور ماریں کھانے کی زندگی نہ تھی بلکہ''جہاد کبیر''اور حملہ آوری کی زندگی تھی جس میں ایک بلند اور مضبوط نصب العین کے لئے جان ومال کی قربانیاں پیش کی گئی تھیں۔''(۲۵)

حکیم الاسلامؒ لطیف پیرایہ میں بڑے اچھے انداز میں ابتلاء وآزمائش کو ذات ومجبوری اور دفاع کا نام دے کر اقدام وثابت قدمی، جرأت وحوصلہ کا نام دیتے ہیں۔یہ حقیقت واضح رہنے سے داعیان اسلام کے حوصلہ بلند ہوں گے وہ اپنے مشن میں پوری دل جمعی سے جمے رہیں گے۔

حکیم الاسلامؒ نے اپنی اس کتاب میں اجمالاً ہی مگر یہ واضح کردیا ہے کہ دعوت دین کی راہ میں آزمائش ناگزیر ہے۔ایسا کیوں نہ ہو جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مومنین کی آزمائش کو لازمی قرار دیا ہے۔

ولنبلونکم بشئ. الخ

اور اللہ پاک نے اسی وجہ اور مقصد کو بتایا ہے کہ **ولیمحص اللّٰہ الذین اٰمنوا منکم ویمحق الکافرین** تاکہ اللہ اہل ایمان کو چھانٹ لے، راہ حق میں آزمائش ومشکلات ناگزیر ہیں۔آزمائشی منزلوں سے گذر کر ہی اندرون میں قوت آتی ہے۔اخلاق وکردار میں پختگی آتی ہے۔آزمائش کی بھٹی میں تپ کر ہی مومن کندہ بنتا ہے۔اسی لئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ضرور آزماتا ہے۔

ولنبلونکم بشئ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس رسول اکرمؐ نے فرمایا مجھے اللہ کی راہ میں اتنا ستایا گیا کہ کبھی کوئی انسان اس قدر نہ ستایا گیا۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: جو شخص آزمائش پر ثابت قدم رہے گا اللہ اس کے قدموں کو جمادے گا۔

رسول اللہؐ نے آگے فرمایا: **من یرد اللّٰہ بہٖ خیراً یصب منہ.**

اللہ تعالیٰ جس کے لئے خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے مصائب میں مبتلا کرتا ہے۔

اسی طرح رسول اللہؐ نے فرمایا: **ان اللّٰہ عز وجل اذا احب قوماً ابتلاھم.**

درحقیقت اللہ عزوجل جب کسی گروہ سے محبت کرتا ہے تو اسے آزمائش میں مبتلا کرتا ہے۔

داعیان دین اور علمبرداران اسلام کی آزمائش ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔جب مکہ میں دشمنانِ اسلام

نے صحابہ کرام کا جینا دوبھر کر دیا تو ایک صحابی رسول آپؐ کے پاس شکایت لے کر آئے ''اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ ہمارے لئے خدا سے مدد کیوں نہیں طلب کرتے اور ظلم کے خاتمہ کے لئے دعا کیوں نہیں کرتے؟ آپؐ یہ سن کر غصہ ہو گئے اور فرمایا: تم سے پہلے ایسے لوگ گذرے ہیں کہ ان میں بعض کے لئے گڑھا کھودا جاتا تھا اور اس کے جسم کو چیرا جاتا یہاں تک کہ اس کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے جاتے بعض کے جسم میں لوہے کے کنگھے چبھوئے جاتے جو گوشت سے گذر کر ہڈیوں اور پٹھوں تک پہنچ جاتا۔ مگر وہ خدا کا بندہ حق سے نہ پھرتا۔ واللہ یہ دین غالب ہو کر رہے گا۔

آزمائش داعیان دین کو مہمیز کرنے اور انہیں قوت بہم پہنچانے کے لئے لازمی ذریعہ ہیں۔ وہ دین جو عالم انسانی میں ہمہ گیر انقلاب کی دعوت دیتا ہے اور پوری انسانی زندگی کو نئی بنیادوں پر تعمیر کرنے کا منصوبہ رکھتا ہے اس دین کو علمبرداروں کے لئے ان آزمائشی مراحل سے گذرنا امر فطرت بھی ہے۔

کوئی بھی باطل نظام خواہ وہ سیکولر ہو یا غیر سیکولر اپنی ماتحتی میں رہنے والے مسلمانوں کو صرف اسی حد تک جینے کا حق دے سکتا ہے جب تک وہ خود ان کے وجود کے لئے خطرہ نہ بنیں۔ لیکن اگر حق نظام کے علمبردار غیر حق نظام کے لئے خطرہ نہیں ہیں تو انہیں اپنا الگ وجود رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ لہٰذا باطل اگر آج ہماری دعوت پر تلملا نہیں رہا ہے اور ہمیں دعوت دین کی کھلی اجازت دے رہا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم اس کے بطلان کے خلاف دعوت نہیں دے رہے ہیں جس سے اس کے عقائد ونظریات پر چوٹ پڑے اور باطل اپنے وجود کے لئے دعوت حق کو خطرناک سمجھ سکے۔ لہٰذا ایسی دعوت میں کھوٹ ہے۔ انبیائی انداز نہیں اختیار کر رہے ہیں بایں وجہ آج ہماری دعوت غیر موثر ہو رہی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ دنیا کے کسی معمولی نام کے لئے بھی بڑی جاں فشانی اور بلاکشی کرنا پڑتی ہے تو کیا دین کی دعوت جیسا عظیم کام بغیر آزمائش ومصائب کو انگیز کئے پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ انبیاء کرام اللہ کے سب سے زیادہ برگزیدہ بندے تھے۔ دین کی راہ میں ان کی سب سے زیادہ آزمائش ہوئی اور نبی آخر محمدؐ کی دعوت دین کی راہ میں سب سے زیادہ آزمائش ہوئی۔ لہٰذا ان کے نقش قدم پر چلنے والے داعیان کرام کو بھی آزمائشی مراحل سے گذرنا پڑے گا۔ اگر معاملہ خلاف واقعہ ہے تو وہ دین کی صحیح دعوت نہیں یا کم از کم انبیائی طریقہ کار اور قرآن کا مطلوبہ انداز نہیں۔

''مانیتا پراپت دعوت'' جمہوری اور پرامن طریقۂ دعوت تعلیم کے فقدان کا شور، حقوق انسانی کی دعوت، اسلامی تشخص کے تحفظ کے نام پر غیر اللہ کی حاکمیت کی دعوت یہ تمام تر دعوت اور طریقۂ دعوت فتنوں اور گمراہیوں کے گرداب میں ہے اور شیطنت کا شکار ہو کر انبیائی نہج سے ہٹے ہوئے ہیں۔ نیز اللہ کی اس سنت متواترہ سے بچ نکلنے کی ناکام کوشش ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل حق کی آزمائش ضرور کرتا ہے۔

داعی کے اوصاف

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اپنی اس تصنیف میں مبلغین کے چند اہم اوصاف کا تذکرہ کیا ہے جو ہر داعی کی شان اور عادت ثانیہ ہونی چاہئے کیوں کہ داعی کے ذاتی اوصاف پر تبلیغ کے اثرات موقوف ہیں آپ نے داعی کے لئے ایک اہم وصف خوف انہیں اور عدم خوف خلائق قرار دیا ہے۔ آپ اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''مبلغ کے لئے سب سے اہم اور بڑا وصف مخلوق سے نڈر رہنا ہے اور اللہ سے ڈرنا ہے بعنوان دیگر حق کے معاملہ میں جرأت و بے باکی کا ہونا اور مرعوبیت و مداہنت کا نہ ہونا ہے۔ گویا مبلغ کے لئے ضروری ہے کہ حق اور احکام حق کی عظمت کے مقابلہ میں کسی کی عظمت کا خطرہ اس کے قلب میں نہ ہو جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ مخلوق کا کوئی خوف تو تبلیغ حق میں مانع نہ ہو اور خالق کا خوف تبلیغ حق کے لئے داعی ہو۔

ارشاد ربانی ہے:

الذین یبلغون رسالات اللّٰہ ویخشونہٗ وَلایخشون احداً اِلا اللہ و کفیٰ باللہ حسیباً.

ترجمہ : جولوگ اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں وہ اللہ ہی سے ڈرتے ہیں اور سوائے اللہ کے کسی اور سے خوف نہیں کرتے۔

ظاہر ہے جب داعی کے دل میں صرف اللہ کا خوف ہوگا اور غیر اللہ کا خوف نہ ہوگا تو وہ داعی اپنی دعوت کو بے لاگ و لپیٹ کے مدعو کے سامنے پیش کرے گا۔ حق کو پوری طرح واضح کرنے میں اسے یہ خوف لاحق نہیں رہے گا کہ مدعو اس سے غضبناک ہوگا۔ نتیجتاً حق پاداش میں ظلم وستم انگیز کرنا پڑے گا۔ اس خوف خدا کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اس اندیشہ میں مبتلا نہیں رہے گا کہ آیا ہماری دعوت موثر ہوتی ہے یا نہیں۔ کوئی اسے قبول کرے یا نہ کرے۔ یہ اللہ کا حکم تھا میں نے پہنچادیا۔

استغناء

استغناء داعی دین کا اہم وطیرہ ہے۔ دعوت کے بدلہ میں کسی لالچ اور طمع کا ہونا، دعوت کو موثر بناتا ہے۔ بایں وجہ اللہ پاک انبیاء کرام کے متعلق جگہ جگہ قرآن میں یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ تو دعوت کے بدلے میں تم سے کچھ لیتے نہیں ہیں،

لہٰذا یہ ایک ایسا وصف جوہری ہے جو داعی کو خود دار بناتا ہے اور مدعو کے طور پر یہ اثر چھوڑ جاتا ہے کہ یہ کتنا اچھا آدمی ہے جو بغیر کسی ذاتی مفاد کے دوسرں کے مفاد کے لئے کام کرتا ہے

کہ پایا ہم نے استغناء میں اندازِ مسلمانی

مولانا محمد طیب صاحبؒ رقم طراز ہیں:

''استغناء کے بغیر تبلیغ کا وقار اور احترام قائم نہیں۔ ہوسکتا لالچی اور خودغرض انسان کبھی میدانِ تبلیغ کا مرد نہیں بن سکتا اور نہ کبھی بے باکانہ تبلیغ کرسکتا ہے۔ مبلغ کے قلب میں جب اپنے مستفیدوں سے طمع پیدا ہوگئی تو یقیناً وہ ان کا محتاج ہوگیا اور محتاج انسان کمزور ہوتا ہے اور جب معلم کمزور و ذلیل ہو اور متعلم قوی و حاوی ہو تو معلم و مبلغ میں تبلیغ حق کی حقیقی جرأت پیدا ہی نہیں ہوسکتی اور نہ وہ مخاطبوں پر اپنا اثر قائم کرسکتا ہے۔

از بگذار و بادشاہی کن

چنانچہ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب علیہم الصلوٰۃ والسلام کے تبلیغی مواعظ کے سلسلہ میں قرآن نے ایک ہی قول نقل کیا ہے:

وما اسئلکم علیه من اجرٍ ان اجری الا علی رب العالمین فاتقوا اللّٰہ واطیعون (۱۰۴)

استغناء کا ایک اور مقصد بتاتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

''مبلغ کو تبلیغ کے ثمرات سے بھی مستغنی رہنا چاہئے۔ جب مبلغ اپنی مساعی کے معنوی ثمرات کا خطرہ بھی دل میں نہ لائے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اسی مبلغ کو کارتبلیغ کے کسی مادی ثمرہ کی فکر میں غلطاں و پیچاں چھوڑ دیا جاتا۔''(۲۶)

غناء واستغناء کے قومی ثمرات اور عدم استغناء کی مذمت کرتے ہوئے آپ رقم طراز ہیں:

''جو قومیں کسی سے عزت و جاہ کی بھیک مانگ کر زندہ رہنا چاہتی ہیں وہ کبھی عزت سے ہمکنار نہیں ہوسکتیں اور جو غنا و استغناء اور غیرت مندی کے ساتھ اپنی اور اپنے ہی مزاج کی بنیادوں پر اٹھتی ہیں وہ کبھی ذلت کا منہ نہیں دیکھ سکتیں۔ حیرت اس پر ہے کہ غناء و استغناء کے خزانوں کے ہوتے ہوئے بھی مسلم قوم دریوزہ گری کو اپنا نشان بلکہ فخر بنائے ہوئے ہیں اور اقوام کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے۔(۲۷)

غلامی کی زندگی گذارہی امت مسلمہ کی ایک بہت بڑی خامی یہ بھی ہے کہ عزت و دولت کی بھیک اپنے ظالم حکمرانوں سے مانگنے پر مجبور ہوگئی ہے۔ ریزرویشن کی بھیک، ریکوگنائزیشن کی بھیک، روٹی کپڑا، گھر کی بھیک، باطل اقتدار کے دم چھلہ بننے کی بھیک، دشمنان اسلام کی خوشنودی کی بھیک۔ امت کی یہ صورت حال اسی حقیقت کی غماز ہے کہ جسے علامہ اقبال نے کہا تھا کہ:

سو غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

سیرت وکردار

مبلغ اور داعی دین کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی سیرت و کردار، اس کے قول کا مظہر ہو **لم تقولون مالا تفعلون** کے مصداق داعی دین کی تقریریں اور وعظ و نصیحت موثر نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا مبلغین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے کردار کو بھی بنائیں اور اپنی سیرت کو بھی سنواریں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مومن کا کردارِ غیبی دعوت بن جاتا ہے

آدمی کی بات سنتا نہیں پیکر عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

مولانا محمد طیب صاحبؒ اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

عمل صالح اور تقویٰ وطہارت کے بغیر تبلیغ کا کوئی اثر نمایاں نہیں ہوسکتا۔ دلائل و براہین اور پرجوش تقریریں وہ اثر نہیں دکھلاسکتیں جوان مبلغ کی ذاتی سیرت اور عملی زندگی ان کے سادہ کلام میں پیدا کردیتی ہے۔ نیک عمل مبلغ حقیقتاً اللہ کی حجت اور اس کی آیات میں سے ایک آیت ہوتا ہے جسے دیکھ کر خود بخود ہزاروں دلائل سامنے آجاتے ہیں۔

اے بقاءِ تو جواب ہر سوال مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

ارشاد حق **اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم** کیا تم لوگوں کو نیکی کا امر کرتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ (۲۸)

صبر وتحمل

دوران تبلیغ تبلیغ کو محکم و موثر بنانے اور داعی کی ذات میں جاذبیت پیدا کرنے کے لئے صبر وتحمل کی صفت کا ہونا کافی ضروری ہے۔ رسول اکرمؐ جب مکہ میں کوہ صفا پر چڑھ کر اول دین کی دعوت دیتے ہیں **قُولُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا**. فوراً آپؐ کو ابوجہل پتھر مارتا ہے۔ پھر وہیں سے تکالیف ومصائب کا ایک طوفان کھڑا ہو جاتا حتی کہ آپؐ اور ان کے صحابہ کرام کی پوری زندگی ان مصائب اور ایذاء رسانیوں پر صبر وتحمل کی اعلیٰ شاہکار ہے۔ وادی طائف کی خشت باریاں، شعب ابی طالب کی سختیاں، راہوں میں کانٹیاں، طرح طرح سے رسول اللہ ﷺ کو ستایا گیا لیکن اس ذات کریم نے ہر مرحلہ میں تحمل و بردباری کا ثبوت دیا۔

حکیم الاسلامؒ لکھتے ہیں کہ:

''ظاہر ہے کہ سلسلۂ دعوت وتبلیغ میں مخلوق کی اڑی کڑی جھیلنا اور ان کے معاملات میں ایثار سے کام

لینا یعنی صبر، حلم، ضبط اور تحمل وغیرہ جو سلسلۂ تبلیغ میں عموماً جاہلوں، ناعاقبت اندیشوں یا بدنیتوں کی طرف تلخیٔ حق کا جواب ایذا رسانی اور سخت کلامی سے دیا جاتا ہے۔ اگر مبلغ میں صبر وضبط ہو تو اس کے لئے تبلیغ کا میدان کبھی بھی ہموار نہیں ہوسکتا۔ آنحضرتؐ کو صبر و تحمل کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

لتبلون فی اموالکم و انفسکم ولتسمعن من الذین اوتوالکتاب من قبلکم و من الذین اشرکوا اذًی کثیرا و ان تصبروا و تتقوا فان ذلک من عزم الامو(۲۹)

اسی سلسلہ کی ایک کڑی عفو درگذر ہے یعنی دشمن کی ایذا رسانی کے باوجود ان کو معاف کردینا یہ داعی کی بڑائی ہے۔

حکیم الاسلامؒ لکھتے ہیں:

’’پھر اس راستہ میں ایک صبر ہی درکار نہیں کہ مبلغ ان ایذا رسانیوں کا تحمل کر کے چپکا رہے بلکہ اسے ایک قدم آگے بڑھ کر ان شرارتوں کو معاف بھی کردینا چاہیئے کہ اسی سے مخاطب انجام کار ہموار ہوجائیں گے اور انہیں کے آثار سے اس کی شفقت پہنچائی جائے گی۔ اسی لئے حضورؐ کو حکم دیا گیا تھا۔

فاعف عنهم واستغفر لهم– فاصفح الصفح الجميل.

آپ ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لئے استغفار کیجئے۔ آپؐ ان سے اچھے طریقہ پر درگذر فرمایئے۔

مبلغ کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ان برائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی کرے اور احسان سے پیش آئے۔

صل من قطعک واعف عمن ظلمک واحسن الیٰ من اساء الیک

جو لوگ تم سے بدمعاملگی کریں تم ان کے ساتھ بھی صلہ رحمی کا برتاؤ کرو اور جو تم سے برا سلوک کریں تم ان سے اچھا سلوک کرو۔ (۳۰)

معیت وملازمت

داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مخاطبوں بطور خاص مستفیدوں کی تربیت بھی کرے انہیں بتدریج دین سکھائے۔ احکام پر چلنا سکھائے نیز اس کام کے لئے ایک مدت درکار ہے۔ لہٰذا ناگزیر ہے وہ اپنے مستفیدوں کو اپنی معیت میں رکھے۔ حکیم الاسلامؒ نے خاص طور پر معیت و ملازمت کے طریقہ کو ان لوگوں کے لئے خاص کیا ہے۔ جو نو مسلم ہوں جو مذہب اسلام میں نو وارد ہوں جب کہ آج صورت حال ایں جا رسید کہ غیر مسلموں کو دعوت دینے، نو مسلموں کی تربیت کے بجائے خود مسلمانوں پر یہ کوشش قدرے زیادہ

کی جارہی ہے۔ دورحاضر میں خانقاہوں کا تقریباً ایسا ہی معاملہ ہے۔

حکیم الاسلامؒ رقم طراز ہیں:

''مبلغ مخاطبوں کو اپنے ساتھ زمانۂ طویل تک وابستہ اور کثیر الملازمت رکھے تا کہ ان میں تبلیغ وتربیت سے کوئی خاص رنگ قائم ہوجائے۔ جسے شرعی اصطلاح میں صحبت ومعیت کہتے ہیں حق تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ جو اصحابؓ آپ کے زیر تربیت ہیں اور بالخصوص فقراء، مسلمین آپ اُن کو صبح و شام اپنی صحبت میں رکھئے اور ان میں رہیئے۔

واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغدٰة والعشی یریدون وجھه ولا تعد عیناک عنھم ترید زینة الحیٰوة الدنیا ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذکرنا واتبع ھواہ و کان امرہ فرطاً.

اورآپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جمائے رکھیں جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور وہ اس کی رضا کے طالب ہیں اور آپ بہر حال ان سے اپنی نگاہیں نہ ہٹائیں دراں حالیکہ آپ دنیوی زندگی کی زینت کے خواہاں ہیں اور آپ ان لوگوں کی اطاعت نہ کریں جن کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کی اتباع کرتے ہیں اور جن کا معاملہ زیادتی کا ہے۔(۳۱)

قیام حکومت الٰہیہ اور دعوت وتبلیغ

حکیم الاسلامؒ قیام حکومت الٰہیہ کے لئے دعوت وارشاد کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ یعنی جب دعوت و تبلیغ کے ذریعہ ماحول سازگار ہوجائے اور امت مسلمہ بالخصوص اور غیر مسلم بالعموم اس لائق ہوجائیں گے تو اسلامی نظام خود قائم ہوجائے گا۔

حکیم الاسلامؒ لکھتے ہیں:

''اسلامی قانون اور شرعی سیاست اپنی ذات سے معقول ودل پذیر امن خیز اور مظالم شکن سہی لیکن اس کے لئے اس کے مناسب فضا اور ماحول کی بھی تو ضرورت ہے جو اسے دلچسپ اور دل پذیر بنائے اور وہ ماحول بغیر اس حقانی تبلیغ اور دعوت وارشاد کے پیدا نہیں ہوسکتا جو عرض کردہ قرآنی اصول پر مبنی ہے۔ اس لئے اسلامی فضا پیدا کرنے والے اس نظام تبلیغ کو چھوڑ کر اسلامی دیانت اور اسلامی سیاست دونوں کے لئے زمین ہموار کر لینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اگر بغیر اس ارشادی نظام کے اسلامی نظام کا کوئی ڈھانچہ قائم بھی کر لیا جائے تو وہ محض اسمی ورسمی ہوگا''۔(۳۲)

حکیم الاسلامؒ کی یہ بات اس حد تک درست ہے کہ حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے دعوت وارشاد کے ذریعہ ماحول سازگار کرنا چاہئے۔ لیکن اس بات پر اس قدر زور دینا درست نہیں ہے کہ دعوت ارشاد کا فریضہ قیام خلافت کے فریضہ کی شرط محسوس ہونے لگے۔ خلافت کو قائم کرنے کی کوشش کرنا اور دعوت وتبلیغ کرنا دونوں الگ الگ فرائض ہیں جس طرح کسی بے نمازی کو رمضان کے روزے رکھنے سے منع نہیں کیا جاسکتا کہ تو نماز پڑھتا نہیں تھا اب روزہ کیوں رکھے کیوں کہ نماز اور روزہ دونوں علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں۔ کسی کی فرضیت کو کسی کی فرضیت کے ساتھ مشروط نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس میں تدریج اور فوقیت کی شرط ہے بلکہ خلافت کے قیام کی جدوجہد اور تبلیغ دین کی جدوجہد دونوں ہر وقت ہر مسلمان پر واجب ہے۔

حکیم الاسلامؒ نے کتاب ہٰذا کے شروع میں لکھا ہے کہ یہ دین، دعوتِ دین اور اہل دین سب عالمی ہیں۔ اس کا کوئی خاص وطن نہیں بلکہ پوری دنیا اس کا وطن ہے۔ اس حقیقت کے واضح ہونے کے بعد قیام حکومت الٰہیہ کی اہمیت وضرورت میں کمی کرنا یا اسے مشروط کرنا بالکل خلاف عقل بات ہے۔ عقل خود کہتی ہے کہ ایسا کیوں سیاسی نظام بھی ضرور ہونا چاہئے جو عالمی ہو۔ خلافت علی منہاج النبوۃ اسی سیاسی نظام کا نام ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت حکومت الٰہیہ کے قیام کی ضرورت دعوت دین سے زیادہ ہے بایں وجہ کہ ہم جس دین کی دعوت دیتے ہیں اس دین کے احکام پر مکمل طور پر ہم خود عمل نہ کر پانے کے لئے مجبور ہیں۔ غیر اسلامی حکومتوں میں اسلام کا نظام زکوٰۃ، نظام دیوانی، نظام فوج، حدود، انسداد، ظلم وجرائم، نکاح وطلاق جیسے اجتماعی معاملات کے احکام کی تعمیل خلافت کے بغیر ناممکن ہے۔ پھر دعوت دین کے موثر ہونے کے لئے ماحول کی سازگاری بھی ضروری ہے۔ ایسا ماحول جس میں اسلام اپنی شکل وصورت کے ساتھ ہو، پھر قبول اسلام کی راہیں بھی مسدود نہ ہوں ایسا اسی وقت ہوسکتا ہے جب اسلام بحیثیت نظام کے غالب ہو۔ علاوہ ازیں یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جو مسلمان ارتداد کا شکار ہورہے ہیں ہندو دھرم، بہائی، قادیانیت وغیرہ کو قبول کررہے ہیں ان کے لئے کی جانے والی کوششیں کارگر نہیں ہو پارہی ہیں۔ لہٰذا دعوت دین کے ساتھ ساتھ قیام حکومت الٰہیہ کے لئے بھی ہماری جدوجہد ہونی چاہئے۔ یہ وہ اہم فریضہ ہے جس کے لئے انسانوں کو پیدا کیا گیا انہیں اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا۔ ساری دنیا اللہ پاک نے ان کی خدمت میں لگادی۔ اتنے اعزازات اور اتنی نوازشیں اسی لئے تو ہیں کہ اللہ نے انسانوں کو اور امت محمدیہ کو بالخصوص اس دنیا پر احکام الٰہی نافذ کرنے کی ذمے داری دی۔ انی جاعلک فی الارض خلیفۃ اتنا مہتم بالشان اور اہم فریضہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اکرمؐ کی نعش مبارک کو دفن کرنے سے پہلے اپنے خلیفہ کا انتخاب کیا۔

لہٰذا اس فریضہ کی اہمیت کو کسی طرح کم نہیں سمجھا جا سکتا۔

سبق پھر پڑھ شجاعت کا صداقت کا عدالت کا　　لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

....

(۱) مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، قاری طیبؒ ایک شخصیت، ص:۵۸
(۲) ایضاً، ص:۶۲
(۳) ایضاً، ص:۶۳)
(۴) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، دینی دعوت کے قرآنی اصول، ص:۴
(۵) ایضاً، ص:۲۰
(۶) ایضاً، ص:۱۲
(۷) حضرت مولانا الیاس صاحبؒ، ضرورت تبلیغ ص:۳۰۸
(۸) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، دینی دعوت کے قرآنی اصول، ص:۱۱۰
(۹) ایضاً، ص:۲۶
(۱۰) حسن ہیضمی، دعاۃ للقضاء، ص:۱۲
(۱۱) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، دینی دعوت کے قرآنی اصول، ص:۱۶
(۱۲) ایضاً، ص:۳۴
(۱۳) ایضاً، ص:۴۴
(۱۴) ایضاً، ص:۴۶-۴۷
(۱۵) ایضاً، ص:۴۸
(۱۶) ایضاً، ص:۶۴
(۱۷) ایضاً، ص:۶۶
(۱۸) ایضاً، ص:۷۷
(۱۹) ایضاً، ص:۸۷-۸۹
(۲۰) ایضاً، ص:۲۷
(۲۱) ایضاً، ص:۸۴
(۲۲) ایضاً: ص۵۱
(۲۳) امام ابن تیمیہؒ، السیاسۃ الشریعۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ، ص:۵
(۲۴) حضرت مولانا محمد طیب قاسمیؒ، دینی دعوت کے قرآنی اصول، ص:۱۳
(۲۵) ایضاً، ص:۱۴
(۲۶) ایضاً، ص:۱۰۵
(۲۷) ایضاً، ص:۱۶
(۲۸) ایضاً، ص:۹۸
(۲۹) ایضاً، ص:۱۰۶
(۳۰) ایضاً، ص:۱۰۷
(۳۱) ایضاً، ص:۱۱۹
(۳۲) ایضاً، ص:۱۲۶

............❖............

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ

عادل صدیقی
شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند

اشاعت دین اور دعوت الی اللہ کے داعی، امت مسلمہ کے تمام طبقوں کے رہبر، دین اسلام کی دعوتی اور احتسابی تاریخ کو نئے سرے سے مرتب کرنے والے، پراگندہ قوم مسلم کو راستہ دکھانے والے، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانے کی ممتاز ترین شخصیت ہونے کے باوجود عجز وانکساری کا لباس پہننے والے، حفاظت دین کے خدائی اعلان کی تصدیق وتطبیق سے خود کو جوڑنے والے، اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے والے، فتنوں اور سازشوں سے دین کی حفاظت کرنے والے، باطل افکار وعقائد پھیلانے والے کی ملمع کاریوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرنے والے، حق و باطل میں امتیاز کی روشن دلیلوں سے وضاحت کرنے والے، نعمت ایمان وقرآن سے لطف اندوز ہونے والے، پروردگار کی بزرگی اور کبریائی کا ہر لمحہ اعلان کرنے والے، رشد وہدایت کی کیفیات کو عام کرنے والے، عام مسلمانوں کی زندگی میں تغیر وانحطاط پر افسردہ رہنے والے، صراط مستقیم کو زندگی کا لائحہ عمل اور دستور العمل بنانے والے، علم وعمل کو ایک ہی رنگ دینے والے، مسائل زمانہ کے تقاضوں کو پہچاننے والے، مغربی دنیا کی متنوع معاشرتی اور ثقافتی پیچیدگیوں سے خبردار کرنے والے، خونی، خاندانی اور قریبی رشتوں کا احترام کرنے والے، مسلم معاشرہ کو درپیش سماجی، اقتصادی اور سیاسی مسائل کے حل کے سلسلے میں دانشورانہ رہنمائی کرنے والے، کتب فقہ اسلامی کی جانب مراجعت کی زندگی کو بیش قیمت اثاثہ سمجھنے والے، اکابر علماء کی نگرانی میں علوم دینیہ، تفسیر، حدیث اور فقہ میں مہارت تامہ پیدا کرنے والے یگانۂ روزگار طلباء کی جماعت تیار کرنے والے، ہر قدم پھونک کر رکھنے والے، تدین، تفقہ اور شریعت کی پاسداری کو کمال عروج تک پہنچانے والے، قریب رکھنے والوں کی پوشیدہ

اور مخفی حرکات وسکنات سے درگزر کرنے والے، ناگزیر رنجشوں پر حکمت عملی سے قابو پانے والے، غیر دانشمندانہ اقدامات اور انتہائی ناعاقبت اندیشانہ فکر سے دور رہنے کی تلقین فرمانے والے، مسلمانوں کے اجتماعی وجود کو نئی سمت دینے والے، صرف قرآن وحدیث پر مبنی اسلام کو رواج دینے والے کون؟ جنہیں مخلوق اور عوام الناس حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے نام نامی اور اسم گرامی سے پکارتی آرہی ہے۔

زبان پہ بارِ خدا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لئے

عارف باللہ حکیم الاسلام حضرت اقدس، عزت مآب، مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہٗ سابق مہتمم دارالعلوم کا اسم گرامی سامنے آتے ہی دل ودماغ پر کمالِ اخلاق، حکمت ومعرفت، فہم وفراست، لطافت ونفاست اور پاکیزگی وتقدس کا ایک جامع نقشہ آنکھوں میں تیرنے لگتا ہے۔ بلاشبہ آپ کی ذات اقدس مسلک دیوبند کی شارح، مکتب قاسمیہ کی ترجمان اور سلف صالحین کا نقش جمیل تھی آپ نے ساٹھ سال سے بھی زیادہ مدت تک عالم اسلام کی شہرت یافتہ یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند کو اپنی خدمات جلیلہ سے چار چاند لگائے۔ مشرق سے مغرب تک سفر کی صعوبتیں اٹھائیں، اہتمام کے عروج وزوال کی کہانی تحریر کی۔ تحریر وتقریر سے نوع انسانی کو بلالحاظ مذہب وملت فائدہ پہنچایا۔ اہم تحقیقی مسائل کو چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے۔ سمجھانے کا اسلوب عام فہم تھا۔ طالب علموں میں ان کی صلاحیت کے بموجب، عورتوں میں ان کی گھریلو زندگی اور محاوروں کے سہارے، سائنس دانوں میں ان کی علمیت کے مطابق اسلام کے اعلیٰ مقاصد اور اس کی بیش قیمت تعلیم کو ان کے ذہنوں میں اتارنے میں کمال حاصل تھا، آپ کی تقریر دل کش اور دل چسپ ہوتی تھی کہ سامعین بڑے شوق سے سنتے۔ خوردنوازی، مروت، شفقت کی آپ کی سرشت میں حد درجہ داخل تھی۔ محاسب آپ سرزنش حاکمانہ طمطراقیت آپ کی ذات میں مطلق بھی شامل نہ تھی۔ انتقام، ایذارسانی، دل آزاری، طنز وتنقید سے آپ قطعی دور تھے۔ آپ مسلمانوں کو حقیقی آزادی اور اسلامی طرز حیات سے متصف دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ اس بات کے حامی تھے کہ مسلمانوں کے لئے ایسی حکمت عملی تیار کی جائے جس کے ذریعہ وہ اپنے اپنے علاقہ میں اجتماعی وجود کی شناخت برقرار رکھ سکیں اور بدی کے عالمی محور یعنی امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل کے احکامات کی پابندی اور ان کی روش پر چلنے کے لئے مجبور نہ ہوں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مسلمانوں کے درمیان مصنوعی دیواروں کو کھڑا کرنے کے خلاف تھے۔ وہ حجاز، یمن، وسط ایشیا کے مسلمانوں کو ہندوستانی مسلمانوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے

تھے، اس طرح ہم اگر آپ کو ایک عالمی شخصیت کہیں تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ آپؒ نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ آزادی کی لڑائی سب کو مل جل کر لڑنی ہے، یہ لڑائی محض اسلام کی بنیاد پر نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کو اس بات پر افسوس تھا کہ مسلمان اپنی ہی سرزمین پر بے تکے طور پر آپس میں بانٹ دئے گئے۔ آپ سیاسی اختلافات کو آپسی سماجی، معاشرتی، اقتصادی اور علمی رابطوں کی راہ میں حائل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ آپ نے ہمیشہ ہندوستان کی آزادی میں ہندو مسلم اتحاد کو ضروری سمجھا۔ ہندوستان آزاد ہونے کے بعد کن جہات میں ممتاز ہوگا؟ ہندوستان کے نظم ونسق میں مسلمانوں کا کردار کیا ہوگا؟ آئین ہند کیسا ہوگا؟ یہاں کے شہریوں کی فکر اور سوچ کیا ہوگی؟ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اقتصادی، سائنسی اور ٹکنالوجی کے فرق سے پیدا ہونے والے خطرناک مسائل کیسے حل ہو جائیں گے؟ اس طرح کے متعدد سوالات آپ کے ذہن وفکر کو جھنجھوڑتے رہتے تھے اس طرح کا واضح اظہار آپ کی تحریروں اور تقریروں میں بخوبی ہوتا ہے۔ حج کے ذریعے سے آپ نے علمی تحقیقات کا راستہ وسیع سے وسیع تر کیا۔ عالم اسلام کے موجودہ حالات اور تقاضے، آزادی کی بازیافت کی کوشش، اسلامی نظام کے نفاذ کے طریقے جیسے سوالات آپ کے ذہن رسا میں گشت کرتے رہتے تھے۔ آپ نے بڑی دانشمندی اور گہرے مطالعے کے بعد مجتہدین اور ان کے اختیارات کو واضح فرمایا۔ آپ نے اپنی تحریروں سے مشائخ زمانہ اور صوفیہ عصر کو جگانے کی کوشش کی۔ آپ نے فروعی اختلافات کو کبھی اہمیت نہ دی، بلاشبہ علمائے دیوبند عشقِ رسول میں دیوانہ ہیں اور نبی اکرم ﷺ کے تذکرہ کی بزم سجانے کو دونوں حیات کی سعادت مانتے ہیں۔ اس ذیل میں نام گنوائے جائیں تو ایک دفتر درکار ہوگا، موٹے طور پر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مفتی محمد شفیع عثمانیؒ، مولانا محمد میاںؒ، قاضی زین العابدین میرٹھیؒ کے نوادرات کے ساتھ ساتھ خاتم النبیین از حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اور آفتاب نبوت، یہ دو ایسی لاجواب کتابیں ہیں جو فی الواقع نبی اکرم ﷺ سے محبت کرنے والوں اور عاشقانِ رسول کے لئے سکون قلب کا ذریعہ ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم کو لے کر ایک عرصے سے سوالات اٹھائے جا رہے ہیں اور دور حاضر کے تقاضوں کا حوالہ دے کر اس میں تبدیلی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں جب دارالعلوم کا صد سالہ اجلاس منعقد کیا تو راقم الحروف وزارت اطلاعات ونشریات کی طرف سے اس کی خبروں کو حاصل کرنے کے لئے دہلی سے دیوبند حاضر ہوا تھا اور اس موقع پر حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ سے ایک انٹرویو لیا تھا، اس میں من جملہ دیگر سوالوں کے ایک سوال یہ تھا کہ کیا آپ نصاب تعلیم میں کوئی تبدیلی لانا چاہیں گے؟ آپ نے ایک مخصوص لہجے میں فرمایا کہ بھائی ہم تو

قرآن اور حدیث پڑھاتے ہیں، تم کیا چاہو؟ کیا ہم قرآن اور حدیث کو بدل دیں؟ احقر خاموش ہوگیا۔

بہر کیف! جب ہم مدارس کی تاریخ پر نظر دوڑاتے ہیں اور ان کے قیام کے پس منظر کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے قیام کا بنیادی مقصد مسلمانوں کے ایمان و عقیدے کی حفاظت، اسلامی شعائر کا تحفظ، علوم اسلامیہ کی ترویج و اشاعت، اردو، فارسی اور عربی زبانوں کی بقا اور مادیت کی روح فرسا فضا میں روحانیت کے چراغ کو روشن کرنا سادہ اور قناعت کی زندگی کو اپنا کر دین اسلام کی سربلندی کے لئے خود کو وقف کرنا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ روشن خیالی کے ساتھ طریق زندگی کو اپنانا بھی ضروری ہے۔ ان سب امور کو حکیم الاسلامؒ نے سامنے رکھ کر ان کی ترویج و اشاعت کے لئے ہر ممکن تدبیر اور کوشش کی۔ یہی کوشش دارالعلوم کی تاریخ بن گئی اور آج یہ ادارہ پوری دنیا میں اپنا نمایاں مقام رکھتا ہے۔

حکیم الاسلامؒ مولانا محمد طیب صاحبؒ کی رہنمائی کا دائرہ محض ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش تک ہی محدود نہ تھا بلکہ وسط ایشیا سے لے کر روس، افریقہ، شمالی امریکہ وغیرہ تک پھیلا ہوا تھا۔ تقسیم وطن کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۱۸ کروڑ تک ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی متعدبہ تعداد یونان، تبت، نیپال، سری لنکا، برما، تھائی لینڈ، انڈونیشیا وغیرہ میں رہتی ہے جہاں کے طلباء دارالعلوم سے فارغ ہو کر اپنے اپنے وطن جا کر بالواسطہ طور پر حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کی اسلامی خدمات کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہیں۔ اس طرح آپ کی عنایت کردہ دینی تعلیم اور روشن خیالی کا ذکر پوری دنیا میں ہے۔ آپؒ نے قرآنی تعلیمات کے ذریعہ سے حقوق انسانی اور مردوں و عورتوں کی ذمہ داریوں پر بطور خاص توجہ دی اور آپ نے ان باتوں کا ذکر اپنی اکثر تقاریر میں کیا۔ آپ کی اکثر تقاریر دل پذیر میں اس بات پر زور ہوتا تھا کہ انسانوں کے اوپر خدائے بزرگ و برتر نے کچھ ذمہ داریاں عائد کی ہیں تاہم ان کی ذمہ داریوں کو سمجھنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ انسان ہونے سے کیا مراد ہے؟ آج کے دور میں ہر شخص حقوق کا مطالبہ کرتا ہے اور انسانی زندگی کو پاک و صاف دیکھنا چاہتا ہے۔ سیکولر بننے کے دعوے دار خود کو حقوق انسانی کا نقیب مانتے ہیں اور مذہبی اقدار کے محافظ دقیانوسی کہلاتے ہیں مگر یہی سیکولر بننے والے دانشور انسانوں کے بارے میں یہ سوچتے ہیں کہ یہ کسی زمانے میں بندر تھے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ حقوق انسانی کا تصور ابھی حال میں پنپا ہے۔ حقوق انسانی کے حوالے اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے قرآن کریم کی تعلیمات جس طرح ہماری رہنمائی کرتی ہیں، وہ بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ قرآنی تعلیمات بتاتی ہیں کہ اللہ بزرگ و برتر خالق ہے اور وہی کائنات کا مالک ہے۔ اس تصور کو عام کرنے سے ان لوگوں کا اقتدار

باطل ہو جاتا ہے جو اس نشے میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ہر طرف ظلم وستم پھیلا رہے ہیں۔قرآن کریم میں بتایا گیا ہے کہ موت وحیات خدا کے ہاتھ میں ہے۔اس تصور کو عام کرنے سے انسان اپنے طور پر دوسرے کی جان لینے کے خیال سے باز آسکتا ہے۔قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ باری تعالیٰ دو جہاں کا مالک ہے۔اس تصور کو پھیلانے سے دنیا میں غلامی کا رواج ختم کیا جاسکتا ہے۔مختصراً یہ کہ حقوق انسانی جس طرح قانون کے تحت زندگی گزرنے پر زور دیتے ہیں اور انصاف ومساوات کا ڈنکا پیٹتے ہیں، وہ سب کا سب پہلے ہی قرآنی تعلیمات میں شامل ہے اور یہی وہ تعلیمات ہیں جنہیں مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اپنی تحریر وتقاریر کے ذریعہ سے دن رات واضح کیا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس طرح کے موضوعات کو لے کر تفصیل سے الگ الگ عنوانات کے تحت آپ کے افکار وخیالات کو قلم بند کیا جائے۔یہی صحیح معنوں میں آپ کو خراج عقیدت ہوگا۔حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے اپنے دور میں جو ماحول دیکھا وہ کچھ اس طرح تھا، علماء اس دور میں مذہبی اور تہذیبی اصلاح سے زیادہ سیاست پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔عوام میں قومی آزادی کا جذبہ، فرقہ وارانہ مفاد کی کشش اور مذہبی مقصد کی لگن۔ یہ وہ محرکات تھے جنہوں نے مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے اور مذہبی طبقے کے ذہن میں ایک کشمکش پیدا کردی تھی۔عوام الناس مشہور شاعر اور مفکر اقبال اور سیاست داں محمد علی جناح سے متاثر نظر آتے تھے۔ان مشکل حالات میں حکیم الاسلامؒ کی اعتدال پسندانہ فکر اور مذہب کے تئیں خلوص نے آپ کی رہنمائی کی۔قومی آزادی کی جو لہر علمائے دیوبند اور ان کے ہم خیال مسلمانوں کے دلوں سے انگریزی حکومت اور مغربی تہذیب کے چیلنج کے جواب میں اٹھی، اس کا اصل محرک یہی مذہبی جذبہ تھا جو مذہبی قوم پروری کے نام سے ایک تحریک بن کر ابھرا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی چند خاص خاص کتابیں درج ذیل ہیں:

آفتاب نبوت، اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام، جذبات الم، دارالعلوم دیوبند ایک نظر میں، سائنس اور مذہب کی حقیقت، ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کے نام، اسلام کا پیغام، اسرائیل کتاب وسنت کی روشنی میں، حکمت قاسمیہ، فلسفہ نعمت ومصیبت اول وثانی، عرفان عارف، معجزہ کیا ہے؟، دینی دعوت کے قرآنی اصول، دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی، غلط فہمیوں کا ازالہ، دارالعلوم کی ۷۶ سالہ زندگی کی ایک اجمالی نظر، اسلام اور فرقہ واریت، دارالعلوم کا ایک فتویٰ اور اس کی حقیقت، تقریر علم وحکمت، عالم برزخ، آزاد ہندوستان کا خاموش رہنما دارالعلوم دیوبند، خاتم النبیین، وسیلہ تقریر، تعلیمات اسلام اور مسیحی اقدام، رودادِ سفر افغانستان۔ان کے علاوہ بھی آپ کی متعدد تقاریر، خطبات اور فتاویٰ اور کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن کی

تفصیل الگ سے ایک مبسوط کتاب کی متقاضی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ العلماء صوبہ بمبئی کے اجلاس میں 'اسلامی آزادی' کے عنوان سے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا کہ:

''ہندوستان کے مسلمانوں کی داخلی حالت تو علم دین، دیانت، منصب، دولت کے لحاظ سے اس طرح برباد کی گئی مگر خارجی پالیسی اس سے بھی زیادہ بربادکن رہی کیوں کہ یہ ممکن تھا کہ مسلمانوں کے بیرونی تعلقات اس داخلی پالیسی پر کسی وقت اثر انداز ہوتے کیوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق بیرونی دنیائے اسلام سے بھی تھا۔ افغانستان سے لے کر ترکی تک مسلمانوں کی حکومت کا ایک مستقل سلسلہ قائم تھا۔ احتمال تھا کہ وہ باہر ان کے لئے کوئی وزن دار آواز اٹھائے یا کسی قسم کی اخلاقی یا مادی مدد دیتے۔ اس لئے پوری دنیائے اسلام کو کمزور کرنے کے لئے تمام ممکن ذرائع استعمال کئے گئے اور ان کے لئے بہت سے ایسے تخم مہیا کئے گئے جن میں وہ مبتلا رہیں۔ چنانچہ اختلافات وغیرہ کی جو خلیج ملک میں حائل کی گئی وہی پوری دنیائے اسلام کے لئے بھی رائج کی گئی۔ کہیں ایران و افغانستان کا مسئلہ، کہیں ایران و ترکی کا مسئلہ، کہیں ترکی اور عربستان کا مسئلہ، کہیں شام و فلسطین کا مسئلہ، کہیں خلافت اسلامیہ کا مسئلہ۔

اس طرح حکیم الاسلامؒ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کے ارشادات عالیہ آپ کی وسیع النظری اور اسلامی سیاست کی زبوں حالی سے واقفیت پر دلالت کرتے ہیں۔

حکیم الاسلامؒ کی ایک کتاب سائنس اور اسلام دور حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس میں مادہ اور روح کی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور دل نشیں پیرائے میں اسلام کی حقانیت کو جدید سائنسی ماحول میں ثابت کیا گیا ہے۔ اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی کتابیں جدید نسل کو اپیل کرتی ہیں۔

............❖............

علم کا بحرِ ذخّار

ناز انصاری

سابق ایڈیٹر روزنامہ الجمعیۃ، دھلی

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

آج حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ ہمارے درمیان نہیں ہیں کہ ہمیں حکمت و دانائی کی باتیں بتائیں لیکن ان کی خوبیاں ان کی سیرت و کردار اسلام اور امت مسلمہ کے لئے ان کی خدمات جلیلہ ہمارا سرمایہ اور ہماری ملی زندگی کا گراں قدر اثاثہ ہیں، ان کی زندگی ان اقدار سے عبارت تھی جو ان کے بعد حد نظر اور فکر و خیال کی پرواز و رسائی تک ہمیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ یقیناً یہ ہماری ملی زندگی کا بہت بڑا المیہ ہوگا کہ ہم ان کے لئے رنج و افسوس تو کریں مگر ان کی زندگی کو آدرش مان کر ان سے کچھ سیکھنے کی کوشش اور عزم نہ کریں۔ حکیم الاسلامؒ حیات تھے تو ہم ان کی محافل وعظ و نصیحت میں شرکت تو کرتے مگر ہم نے یہ کبھی سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ ان کی عظیم المرتبت شخصیت ہمارے لئے کس درجہ اہمیت کی حامل ہے، مگر آج جب کہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ یہ ہمارا ملی فریضہ ہے کہ انھوں نے زندگی کی جن شاہراہوں کی نشان دہی کی تھی ان پر چل کر ہم ان منازل کو طے کریں جو اسلام نے انسانی زندگی انسانی سماج ملک وقوم کی عظمت و سربلندی حاصل کرنے کے لئے متعین کی ہیں۔ آج وہ بے شک نہیں ہیں لیکن ملک کا کون سا گوشہ کون سا قریہ ہوگا جہاں ان کی آوازیں، ان کے پند و نصائح کانوں میں نہ گونج رہے ہوں اور انسانی ضمیر پر دستک نہ دے رہے ہوں۔

حکیم الاسلامؒ علم کا سرچشمہ تھے جس سے ایک نہیں ہزاروں دریا بلکہ دریائے فیض رواں ہوئے ہیں۔ وہ دینی علمی دنیا کی ایک ایسی قد آور شخصیت تھے، جسکے سایہ میں سینکڑوں نہیں ہزاروں شخصیتیں دینی اور علمی مطلع پر ابھریں وہ ایک ایسا چراغ تھے جس سے ہزاروں قندیلیں روشن ہوئیں۔ وہ علم کا ایک بحرِ ذخار تھے جس کے

سینے پر سے ہزاروں علمی قافلے گذرے اور انھوں نے جابجا علم کے سنگ میل قائم کیے۔ آہ اب ع
ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

وہ اٹھاون برس سے زیادہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے تھے اور انھوں نے اس دوران دارالعلوم کی جو خدمت کی، جو ترقی دارالعلوم نے ان کی رہنمائی میں کی، اس کی وجہ سے حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ اور دارالعلوم دیوبند ایک ہی چیز کے دو نام، دو روپ اور دو نشان بن گئے تھے۔ اور ان کی شخصیت کو آج دارالعلوم سے الگ کر کے یا دارالعلوم کو ان کی شخصیت سے جدا کر کے دیکھنا اور جائزہ لینا مشکل ہوگا۔ انھوں نے دارالعلوم کو وہ سب کچھ دیا جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی اولاد اور ان کی روایات اور سیرت کے وارث وامین سے توقع کی جاسکتی تھی، سچ اور صحیح بات یہ ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کی تعمیر کی، دونوں نے ایک دوسرے کو عزت وعظمت بخشی، دونوں نے اسلام اور ملت اسلامیہ کا نام روشن کیا ہے۔

حق تعالیٰ ان کو آخرت کی زندگی میں اس کا اجر وثواب دے اور اس چمنستان قاسمی کو سرسبز وشاداب رکھے، جس کی خدمت کو حکیم الاسلامؒ نے اپنا نصاب زندگی اور وظیفۂ حیات بنالیا تھا۔

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے ساتویں مہتمم تھے، ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے، تاریخی نام مظفر الدین تھا۔ وہ حافظ تھے، قاری تھے، عالم تھے، خطیب تھے، صاحب قلم اور صاحب کردار تھے، ان کا پرنور چہرہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی عظمت وکردار کا آئینہ دار تھا۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں مہر ومحبت، اخوت ورواداری کی قندیلیں تھیں۔ ان میں وہ مقناطیسی قوتیں تھیں جس نے ہر مخاطب کو اپنا گرویدہ بنایا۔ ان کی کشادہ پیشانی اسلام کی چودہ سو سالہ عظمت کا روشن مطلع تھی، زبان میں حلاوت، گفتار میں شیرینی، رفتار میں عظمت وجلال، سر پر اونچی باڑھ کی دو پلی ٹوپی، لمبا کرتہ، مغلئی، پاجامہ، کبھی کبھی شیروانی، ہاتھ میں عصائے علم وعمل اس حلیۂ مبارک میں میں نے انھیں دیکھا ہے۔

آپ نے قرآن مجید حفظ کیا۔ تجوید کا فن حاصل کیا۔ پھر فارسی، ریاضی سے اور عربی علوم سے دارالعلوم سے فراغت پائی، علم حدیث میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے خلافت حاصل کی۔ اس کے بعد دارالعلوم میں استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں نائب مہتمم اور ۱۹۲۹ء میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کے انتقال کے بعد مہتمم بنائے گئے۔ جب آپ مہتمم مقرر ہوئے تو دارالعلوم کے شعبۂ اہتمام میں آٹھ شعبے تھے۔ اب ان کی تعداد ۲۴ رہوگئی تھی۔ اور بجٹ

۵۰۲۶۲ر سے بڑھ کر ایک کروڑ سے اوپر پہنچ گیا تھا۔

دار العلوم کا عملہ ۴۵ر سے بڑھ کر دو سو کے قریب ہو گیا۔ اساتذہ اور طلبہ میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ تعمیرات کا سلسلہ بھی برابر جاری۔ دار التفسیر، دار الافتاء، دار القرآن، جامعہ طبیہ جدید، دو منزلہ دار الاقامہ، مہمان خانہ، کتب خانہ کا جدید ہال اور باب الظاہر وغیرہ کی تعمیر عمل میں آئی۔ دار العلوم کے علاوہ آپ کا تعلق جمعیۃ علماء ہند سے بھی رہا۔ اور ان کی متعدد صوبائی اور ضلعی کانفرنسوں کی صدارت فرمائی۔ اس وقت آپ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے چیرمین بھی تھے۔

خطابت کے ساتھ ساتھ تحریر و تصنیف کے میدان میں بھی آپ گامزن رہے۔ التشبہ فی الاسلام، مشاہیر امت، کلمات طیبات، سائنس اور اسلام اور مسیحی اقوام، مسئلہ زبان اور ہندوستان، دین و سیاست، اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام، اسباب عروج و زوال اقوام، اصول دعوت اسلام، اسلامی مساوات، تفسیر سورۂ فیل، فطری حکومت، الاجتہاد والتقلید آپ کی قابل ذکر تصانیف ہیں۔

اس صدی میں ہندوستان میں جن لوگوں نے خطابت میں نام پیدا کیا حکیم الاسلامؒ ان میں سے ایک تھے ان کی تقاریر نے نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون دنیا میں بھی مسلمانوں کی نئی نسل کو بے حد متاثر کیا۔ اور بڑا نام پیدا کیا۔ ان کی تقریروں میں چٹکلے اور واعظانہ پھبتیاں نہیں ہوتی تھیں علم کا دریا موجیں بھرتا نظر آتا تھا۔ ان کی زبان و دہن علم کا ایک جھرنا معلوم ہوتی تھی، جس سے ہزاروں کا مجمع ہو یا لاکھوں کا، سیراب و سرشار ہوتا تھا۔ ہر بار تقریر میں ایک نیا کیف، ایک نیا ولولہ اور ایک نیا پیغام ہوتا تھا۔ آج کی مسلمان نسل جس کے ارد گرد دہریت کے طوفان اٹھ رہے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ آج اس کو مخاطب کرنے والا اور اسلام سمجھانے والا کوئی دور دور تک نظر نہیں آتا۔

افسوس کہ حکیم الاسلامؒ کو زندگی کے آخری ایام میں اپنی زندگی کے سب سے بڑے المیہ سے دو چار ہونا پڑا۔ یہ بزرگوں کا اختلاف تھا۔ اس میں ہمارا کچھ نہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اور پھر میں تو خود بھی اس میں فریق رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائیں اور حکیم الاسلامؒ کی قبر پر تا قیامت رحمتوں کی بارش فرمائے اور آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ و ارفع مقام عطا فرمائے۔

............❖............

حضرت حکیم الاسلامؒ اور اعتدال فکر و نظر

مولانا مفتی یاسر ندیم

وہ اقلیم خلوص کے شہریار، کاروان خطاب و موعظت کے سالار، قلزم حکمت کے منارہ ضوبار اور علم و تقویٰ ورشد و ہدایت کی سنہری لڑی کے ایسے گوہر آب دار تھے جو اس کرۂ ارض پر صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور اپنی زندگی میں منارۂ نور بن جاتے ہیں؛ لیکن اپنے جانے کے بعد ایسا عمیق خلا چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کے بعد کی نسلیں اس کو پُر کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ وہ اپنی تحریر کی شوکت، خاندان کی وجاہت، اپنے دل کی آفاقی وسعت، اپنے مزاج کی بے نظیر شرافت اور اپنی نظر و فکر کے بے مثال اعتدال کے حوالے سے ایک ایسی عظیم شخصیت تھے کہ جن کو بجا طور پر، مدینۂ علم دیوبند کی طاق زریں کے ہزاروں بجھے ہوئے چراغوں کی قطار میں ایک ایسا آخری اور تنہا چراغ کہا جاسکتا ہے کہ جس کے گل ہوجانے سے تمام وابستگان دیوبند کے دلوں پر مہیب اندھیرا محیط ہوکر رہ گیا تھا۔ حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ ہی کی ذات گرامی ہے کہ جس نے قرآن وسنت کی دلنشیں تفہیم کی، شریعت وطریقت کے حسین امتزاج سے پردہ کشائی کی، اسلام کی فکری تاریخ کے تسلسل سے امت کو روشناس کرایا، علوم ولی اللہی کی حسین تشریح کی، حکمت قاسمیہ کی ترجمانی کی کہ جس کے آپ واحد وارث وامین تھے اور ان سب پر مستزاد یہ کہ آپؒ نے علمائے دیوبند کے فکری ونظری اعتدال کو وہ عروج بخشا کہ تمام وابستگانِ ''قاسمیت ودیوبندیت'' کو اپنے اہل سنت والجماعت ہونے کا یقین محکم ہوگیا۔ آپ نے اپنی زبان وقلم سے مسلک دیوبند کے اعتدال اور جامعیت کو جس طرح واضح کیا وہ ہم پر ایک عظیم احسان ہے۔ کتنے ہی چلتے پھرتے ذی نفس ایسے ہیں جنہوں نے اپنے شوق کے کانوں سے اس موسیقی آمیز آواز کو سنا ہے جو اپنے اندر اسرار شریعت اور حکمت قاسمیہ کے بے پناہ لطائف لیے گھنٹوں گونجتی رہتی تھی اور اپنے سامعین کو سحر میں جکڑ لیتی تھی۔ وہ اپنے کرانگیز تکلّم سے اعتدال وجامعیت کا اس انداز سے درس دیتے کہ سامعین بے اختیار

اپنے دلوں میں ایک عجیب تبدیلی محسوس کرتے اور حکیم الاسلام کی حکمت سے لبریز تقریر دِل پذیر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ پاتے۔ انہوں نے اپنے رشحات قلم سے اعتدال نظر وفکر کی سنہری لڑی میں جس طرح موتی پروئے ہیں، ان کی چمک حکیم الاسلام کی تحریریں پڑھنے والے کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے اور وہ افراط وتفریط اور غلو وتقصیر کے درمیان اعتدال ومیانہ روی کی حدّ فاصل کی نشاندہی کر دیتی ہے۔ غرض یہ کہ آپؒ نے علوم ولی اللہی جس کے آپ امین تھے حکمت قاسمیہ جس کے آپ وارث تھے، معارف انوریہ جس کے آپ حامل تھے اور طریقت تھانویہ جس کے آپ نائب تھے کے امتزاج سے ایک ایسا آمیختہ آنے والی نسلوں کو پیش کیا ہے کہ جس کو اعتدال فکر ونظر کے علاوہ کوئی دوسرا عنوان نہیں دیا جاسکتا۔

اعتدال قرآن وسنت کی نظر میں

اعتدال کے لفظی معنی ہیں برابر ہونا، متوازن ہونا اسی کے ہم معنی لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا** اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا) وَسَطْ کے معنی ائمہ لغت نے ''**الخيار والأعتدال من كل شيء**'' بیان کیے ہیں۔ علامہ زمخشریؒ نے بھی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ''وَسَطاً'' کے معنی یوں لکھے ہیں وسطاًأي **أعدلها وأخيرها**. اعتدال کے ایک معنی ہیں ''کسی چیز کا بہترین حصہ یا پہلو' جیسا کہ بعض اصحاب معاجم نے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: **هو الخيار والأعلى من كل شئ** وہیں اس کے ایک دوسرے مشہور معنی بھی ہیں کہ اعتدال اور وسطیت کہتے ہیں دو متضاد یا مقابل پہلوؤں اور نظریوں کے بیچ کا راستہ بایں طور کہ ایک پہلو دوسرے پر غالب نہ آئے، بلکہ دونوں پہلوؤں کے درمیان توازن قائم رکھتے ہوئے اس طرح عمل کیا جائے کہ نہ افراط کا احساس ہو اور نہ تفریط کا، نہ غلو کی آمیزش ہو اور نہ تقصیر کی۔

ربانیت وانسانیت، روحانیت ومادیت، اخرویت ودینویت، انفرادیت واجتماعیت اور وحی وعقل کے درمیان انسان اس طرح توازن قائم کرے کہ نہ رہبانیت کا اس پر الزام آئے اور نہ مادہ پرستی کی بو۔ وصف اعتدال کی اسی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اللہ عزوجل نے بہ طور انعام واحسان مذکورہ آیت میں امت مسلمہ کو معتدل امت کا لقب دیا اور اعتدال کو انسانی شرف وفضیلت کا معیار قرار دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے مواقع پر اعتدال اور میانہ روی کی دعا مانگی ہے۔ ایک روایت میں آپؐ نے اعتدال کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: **القصدَ القصدَ تبلُغوا** ''اعتدال اختیار کرو منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے۔'' ابن عباسؓ روایت

کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا **إن الهدي والسمت والقصد جزء من ستة وعشرين جزء امن النبوة.** رسول کا طریقہ وسیرت اور میانہ روی نبوت کا چھبیسواں جزء ہیں۔

غرض یہ کہ اعتدال ومیانہ روی اس امت کا امتیازی وصف ہے۔ اسلام کی فکری تاریخ میں جو نظریہ بھی وصف اعتدال سے محروم ہوا وہ جادۂ مستقیم سے منحرف کہلایا اور جس نظریہ نے اعتدال کا دامن تھاما وہ راہ حق پر گامزن نظر آیا۔

اعتدال فکر ونظر کا تسلسل

قرآن کریم کے مطابق ''اعتدال'' چوں کہ اس امت کا امتیازی وصف ہے، اس لیے ابتدا سے لے کر آج تک سطح زمین پر ایسے نفوس ہمیشہ اپنی موجودگی درج کراتے رہے ہیں کہ جن کی زندگی کے ہر ہر پہلو میں اعتدال کی واضح جھلک نظر آئی۔ ان کا پیش کردہ ہر ایک نظریہ اور ان کے ذریعہ متعارف شدہ ہر ایک موقف وصف اعتدال سے متصف رہا ہے اور اس طرح اسلام کی ان عظیم شخصیات نے امت مسلمہ کی فکری تاریخ میں اعتدال فکر ونظر کا ایسا تسلسل قائم رکھا ہے جو کبھی کسی بھی طرح کے خلا سے آشنا نہیں ہوا۔ بلکہ اعتدال فکر ونظر کا یہ تسلسل بھی اس امت کی ایک امتیازی صفت ہے کہ جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں کچھ اس طرح بیان فرمایا: **يحمل هذا العلم من كل خلف عُدولُه ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين، وتأويل الجاهلين.** ''اس علم دین کو ہر آنے والی نسل میں سے ارباب عدل لیں گے جو اس سے، حد سے گذر جانے والوں کی تحریف، باطل پرست لوگوں کے کذب اور جاہلوں کی تاویل دور کریں گے۔''

خوارج نے جب افراط وتفریط سے کام لیا تو صحابہ وتابعین نے وصف اعتدال سے ان کا مقابلہ کیا۔ معتزلہ ومرجیۂ نے جب غلو وتقصیر کا دامن تھاما تو اشاعرہ وماتریدیہ نے اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہوئے اہل سنت والجماعت کے موقف کو واضح کردیا غرض یہ کہ خلفائے راشدین وصحابہ کرامؓ کے عہد سے لے کر دور حاضر تک کی تاریخ ہر زمانے میں ایک ایسے طبقے یا ایسی شخصیات کی موجودگی پر شاہد عدل رہی ہے جنھوں نے اپنے فکر ونظر کے اعتدال سے باطل نظریات کا مقابلہ کیا اور حق کو حق پرستوں کے سامنے عیاں کردیا۔ اتنا ضرور ہے کہ اعتدال کی صورت ہر دور میں کچھ مختلف رہی ہے؛ لیکن اس کے حقیقی معنی ''**الخيار والأعلى من كل شئى**'' ہمیشہ باقی رہے ہیں۔

دورِ صحابہ اور اعتدال نظر وفکر

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کبھی اعتدال ومیانہ روی سے روگردانی نہیں کی انھوں نے ہمیشہ افراط وتفریط سے بچتے ہوئے درمیانی راہ پر چلنے کو ترجیح دی۔ انھوں نے فکری اعتدال کی ایسی ایسی مثالیں پیش کی ہیں، جو صحابۂ کرام کے مقدس نفوس کی طرح خود بھی قدُوہ اور لائق اتباع بن گئیں۔ کبھی وہ اعتدال وتوازن قائم رکھتے ہوئے اپنے ذاتی اجتہادات کو حدیث نبوی کے سامنے یکسر مسترد کر دیتے تو کبھی کسی کی بیان کردہ روایت کو کسی علت کی بناء پر ناقابل عمل قرار دیتے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''الانصاف في بیان أسباب الاختلاف'' میں حضرات صحابہؓ کے طرزِ عمل کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اگر ان کو کسی مسئلے کے بارے میں حکم شرعی معلوم نہ ہوتا تو دوسرے صحابہ سے دریافت فرماتے کہ تم میں سے کسی نے اس امر کے متعلق پیغمبرؐ کا کوئی فرمان سنا ہے؟ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے جب دادی کی وراثت کا مسئلہ پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ''میں نے اس کے حصے کے بارے میں رسول اللہؐ سے کوئی ارشاد نہیں سنا ہے اس لیے میں اس کے متعلق اوروں سے پوچھتا ہوں'' جب نماز ظہر آپؓ نے ادا کر لی تو لوگوں سے پوچھا کہ ''کیا تم میں سے کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دادی کے حق میں وراثت کے بارے میں کچھ فرماتے سنا ہے؟'' مغیرہ ابن شعبہؓ نے فرمایا کہ ''ہاں میں نے سنا ہے'' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو میت کے مال کا چھٹا حصہ دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے دریافت فرمایا کہ ''یہ بات تمہارے سوا کسی اور کو بھی معلوم ہے'' محمد بن مسلمہؓ نے جواب دیا کہ ''مغیرہ صحیح کہتے ہیں'' یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے اس عورت کو چھٹا حصہ دینے کا فیصلہ فرمایا''۔

وہیں دوسری طرف ہمیں ایسی بھی مثال ملتی ہے کہ صحابہ نے روایت پر عمل کرنے کے بجائے اجتہاد کو ترجیح دی اور یوں منشائے نبوی کو پا گئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں: ''اس کی مثال فاطمہ بنت قیس کی اس حدیث سے ملتی ہے جس کو اصحاب اصول نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے کہ فاطمہؓ نے حضرت عمرؓ کے روبرو آ کر عرض کیا کہ ''مجھ کو تین طلاقیں دی گئی تھیں، آپ ﷺ نہ تو مجھ کو زمانۂ عدت کا نفقہ دلایا اور نہ مکان'' حضرت عمرؓ نے ان کی گواہی ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ہم ایک عورت کے قول کی بنا پر کتاب الٰہی کو نہیں چھوڑ سکتے، جس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہے یا غلط۔ فاطمہ بنت قیسؓ کے قول کو سن کر حضرت عائشہؓ نے بھی فرمایا کہ ''فاطمہ کو کیا ہو گیا کہ وہ اللہ کا خوف نہیں کرتی''۔

ایک مثال میں بیان کردہ روایت کو فوراً قبول کرلیا گیا اور فیصلے کی بنیاد بنا دیا گیا، وہیں دوسری مثال میں روایت کو ناقابلِ عمل سمجھا گیا۔ یہ دونوں مثالیں صحابہ کرامؓ کے فکری ونظری اعتدال کی واضح دلیلیں ہیں کہ انہوں نے افراط وتفریط کو چھوڑ کر مرادِ نبوی کو پانے کے لیے کبھی اپنے فیصلوں کی بنیاد بیان کردہ روایت پر رکھی تو کبھی اپنے اجتہاد پر۔

ائمہ فقہ اور اعتدال

اسلامی تاریخ میں ائمہ فقہ خصوصاً ائمہ اربعہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی فقہی خدمات نے ہماری تاریخ کو ایک نیا رخ اور نئی جہت عطا کی ہے۔ان کے اپنائے ہوئے طریقوں، بیان کردہ اصولوں اور ان صولوں سے اخذ کردہ فروعات نے امت مسلمہ کی فکری قوت کو جلا بخشی ہے اور اس کے بہتے ہوئے سوتوں میں مزید جوش پیدا کیا ہے۔اسلام کی فکری تاریخ ان ائمہ کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہے۔لیکن ان عظیم ائمہ کی خدمات کو یہ اعلیٰ مقام محض اس لیے ملا کیوں کہ ائمہ فقہ کا ہر ایک اجتہاد ''اعتدال اور وسطیّت'' کا حسین پرتو تھا۔ان کی فکری عمارت میں ایک اینٹ بھی جان بوجھ کر بے موقع وضع نہیں کی گئی تھی، بلکہ ان کی تعمیر کردہ پوری عمارت ان ائمہ عظام کے مزاج میں ''اعتدال'' کا پتہ دیتی ہے۔

حنفی مذہب کی جامعیت اور اعتدال کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اپنے مذہب کی بنیاد شورائی نظام پر رکھی۔آپ کی فقہی کونسل میں ہر علم وفن کے ماہرین جمع تھے۔ایسے فقہا بھی تھے جن کا طبعی رجحان علم حدیث کی طرف تھا۔ایسے علماء بھی تھے جو علم لغت کی طرف طبعی میلان رکھتے تھے۔اس طرح فقہ حنفی نے اجتماعی طور پر نظر وفکر کے اعتدال کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا۔انفرادی طور پر بھی علماء احناف نے نظریۂ ''اعتدال'' کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ: امام محمد بن حسن نے پہلے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی پھر مدینہ جا کر امام مالکؒ کی موطاّ سے مقابلہ کر کے دیکھا۔اگر حنفی نقطۂ نظر اس کے مطابق نظر آیا تو خیر، ورنہ اختلاف کی صورت میں صحابہ اور تابعین کے مختلف مذاہب واقوال جستجو کی، اگر کسی کے یہاں اپنے مذہب کے موافق قول مل گیا تو اس صورت میں بھی وہ اپنے مذہب حنفی پر قائم رہے؛ لیکن اگر کوئی مسئلہ ایسا نکلا جس کی بنیاد کسی کمزور قیاس یا بے جان استنباط پر تھی اور اکثر علما کے عمل سے یا کسی ایسی حدیث صحیح سے اس کی مخالفت ہو رہی تھی، جس پر فقہا نے عام طور سے عمل کیا ہے، تو ایسی حالت میں

انہوں نے اپنی رائے بدل دی اور امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے مذہب سے ہٹ کر مذاہب سلف میں سے کسی ایسے مذہب کو اختیار کرلیا، جوان کی نگاہ میں سب سے زیادہ لائق اور راجح نظر آیا۔ اس طرح امام محمد بن حسنؒ نے ''اعتدال فکر'' کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا جو آگے چل کر ارباب فقہ وفتاویٰ کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا۔

امام دارالہجرۃ مالک بن انسؒ نے اسی فکری اعتدال کو ایک دوسرے انداز سے پیش فرمایا۔ خلیفۂ منصور نے جب امام مالک سے یہ عرض کیا کہ میں آپ کی تصانیف کے متعدد نسخے نقل کرا کے ہر ہر شہر میں بھیجنا چاہتا ہوں تا کہ سب لوگ آپ ہی کی کتابوں کے مطابق عمل کریں تو امام مالکؒ نے جو جواب دیا وہ سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ''ایسا نہ کیجئے۔ کیوں کہ لوگوں میں سلف کے مختلف اقوال پھیل چکے ہیں اور مختلف اقسام کی احادیث ان تک پہنچ چکی ہیں۔ اب ان مختلف اقوال واحادیث میں سے ہر گروہ ان چیزوں پر عمل پیرا ہے جو ان کے کانوں میں پہلے پڑ گئیں۔ لہٰذا لوگوں کو آزاد چھوڑ دیجئے اور ہر بستی کے مسلمانوں کو اسی مسلک پر عمل کرنے دیجئے جو انھوں نے احادیث رسول اور اقوال صحابہ کی روشنی میں اپنے لیے اختیار کیا ہے۔

امام مالکؒ اگر اس وقت راہِ اعتدال سے انحراف کر لیتے، تو امت مسلمہ کم از کم خلافت عباسیہ کے خاتمے تک اعتدال پر قائم نہ رہتی اور نظریۂ تقلید کو لے کر افراط کا شکار ہو جاتی، احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ اور صحابہ کرامؓ کے بے شمار فتاویٰ معطل ہو کر رہ جاتے اور یوں اس امت کی فکری ترقی فوراً زوال میں بدل جاتی۔

امام شافعیؒ بھی اس بزم فقہ واجتہاد میں تشریف لائے اور اسی اعتدال کے ساتھ جلوہ گر ہوئے جو انھیں اپنے پیش رؤوں سے وراثت میں ملا تھا۔ انھوں نے متقدمین کے فکر واستنباط کا گہرائی سے جائزہ لیا اور ''اعتدال'' کی عمارت مزید مضبوط کرنے کی غرض سے طریقۂ فکر ونظر میں از سر نو غور کیا۔ انھوں نے مذہب کی اساس جن امور پر رکھی ہے، ان کا تذکرہ امام موصوف نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الأم'' کے ابتدائی اوراق میں فرمایا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

(۱) یہ لوگ مرسل اور منقطع احادیث کو بھی لے لیتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے اقوال میں لغزشیں راہ پالتیں ہیں۔ کیوں کہ جب حدیث کے تمام طریقوں کو جمع کیا جاتا ہے اور محدثانہ چھان بین کی جاتی ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ کتنی ہی مرسل حدیثیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں اور کتنی ہی ایسی ہیں جو مسند اور مرفوع احادیث کے خلاف پڑتی ہیں، اس لیے ہم مرسل روایات کو اس وقت تک قبول نہ کریں گے جب تک ان میں چند خاص شرطیں نہ پائی جائیں۔ (ان شرائط کی تفصیل کتب اصول میں موجود ہے۔)

حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ''امام شافعیؒ سے پہلے مختلف نصوص میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے قواعد منضبط نہیں تھے، جس کے باعث فقہا کے اجتہادات غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکتے تھے۔ اس لیے امام شافعیؒ نے پہلے یہ اصول وقواعد وضع کیے اور ان کو باقاعدہ ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا، اصول فقہ کی یہ پہلی کتاب ہے جو عالم وجود میں آئی۔''

امام شافعیؒ کے اس نظریے سے خواہ دیگر ائمہ فقہ نے اتفاق نہ کیا ہو، لیکن اس میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ ان کا مقصد فقہ کے باب میں نظر وفکر کے اُس اعتدال کو مزید تقویت پہنچانا تھا جو کابراً عن کابرٍ ان تک پہنچا تھا۔ بہر حال ائمہ فقہ نے جہاں امت کی فکری تاریخ کو ایک نیا رخ عطا کیا وہیں اعتدال کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس طرح آیندہ نسلوں کو انھوں نے یہ پیغام دیا کہ کوئی بھی نظریہ وصف اعتدال کے بغیر بار آور نہیں ہوسکتا۔

شاہ ولی اللہؒ اور اعتدال

یقیناً تسلسل اعتدال کا یہ تذکرہ امام بخاریؒ، امام غزالیؒ اور امام رازیؒ جیسے مفکرین ومصلحین کے ذکر کے بغیر ادھورا ہے؛ لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ پوری امت کی فکری تاریخ میں جو حیثیت ائمہ اربعہ کو حاصل ہے، وہی حیثیت برصغیر کی اسلامی تاریخ میں اپنے وقت کے مجدد اور عظیم مصلح، مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو حاصل ہے، ہم نے ائمہ فقہ کے تذکرے کے بعد شاہ صاحبؒ کا ذکر مناسب سمجھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے جو تجدیدی کارنامہ انجام دیا ہے اس کو ''فکر ونظر کے اعتدال'' کے علاوہ کوئی دوسرا عنوان نہیں دیا جاسکتا۔ آپ نے شریعت وطریقت، فقہ واجتہاد اور احسان وتصوف کے میدانوں میں اپنی بیش بہا تصانیف کے ذریعہ جو نقطۂ اعتدال پیش کیا، وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے آنے والی نسلوں کے سامنے نقش راہ بن گیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''اس میں شک نہیں کہ پچھلی صدیوں میں بعض حالات ایسے پیش آئے خصوصاً اسلام کے اصل سرچشموں یعنی قرآن وحدیث کی تعلیم سے اسلامی مدارس بہت حد تک بیگانے ہوتے چلے گئے، بتدریج یہ اختلافات بہت غلط صورت اختیار کرتے چلے گئے خصوصاً ماوراء النہر (ترکستان وخراسان) کے حنفی فقہا کا غلو اس باب میں آہستہ آہستہ بہت آگے بڑھ گیا تھا اور ہندوستان میں وطن بنانے کے لیے اسلام جس راستے

سے آیا، چوں کہ وہ انہی ممالک کا راستہ تھا اس لیے قدرتاً ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت انہی ممالک کے علما کی ذہنیت سے متاثر تھی، پھر نادری اور ابدالی حملوں نے جب اس ملک میں روہیلو کے جدید عنصر کا اضافہ کر دیا تو تشدد وتصلب کی یہ شرارت دو آتشہ ہوگئی۔ شاہ صاحبؒ نے بڑی دانشمندی اور گہرے مطالعے کے بعد فقہ اور اصول فقہ کی بنیادوں سے پردہ ہٹایا، ائمہ مجتہدین اور ان کے اجتہادات کا جو صحیح مقام تھا اسے واضح فرمایا''۔

آپ ہی نے اُس جمود وتعطّل کے ماحول میں اپنے آپ کو ''**الحنفي عملاً، والحنفي والشافعي درساً**'' کہہ کر حنفیت اور شافعیت کے درمیان اس خلیج کو پاٹ دیا جو گہری ہوتی جارہی تھی۔ شاہ صاحبؒ نے ائمہ مجتہدین کے قیاسی نتائج کے متعلق بجائے اس نظریے کے کہ ''حق ان میں سے ایک ہی ہوسکتا ہے'' اس خیال کو ترجیح دی ہے کہ ''سب ہی حق پر ہیں'' اس طرح انہوں نے فروعی اختلافات کی اہمیت کے سارے قصے کو ہی ختم فرمادیا۔ اس طرح آپ نے تقلید اور مذاہب اربعہ کے بارے میں ایک نہایت معتدل نظریہ پیش کر کے ماوراء النہر کے راستے سے ہندوستان میں داخل ہونے والے منفی اثرات کا ازالہ کر دیا۔ اسی فکری اعتدال کی وجہ سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں ایک نہایت اہم جملہ تحریر فرماتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ: ''ہم شاہ ولی اللہ کو حنفی اور شافعی ہر دو فقہ میں مجتہد منتسب مانتے ہیں''۔ آپ نے ''**المسوی**''، ''**المصفی**''، ''**الانصاف في بيان أسباب الاختلاف**'' اور ''**عقد الجيد في أحكام الاجتهاد والتقليد**'' جیسی کتابیں تصنیف فرما کر مسلکی تعصب اور فقہی جمود کو دور کر کے ذہنوں میں وسعت پیدا کی اور علمائے دین کو اجتہاد وبصیرت سے کام لینے پر ابھارا۔ اس طرح شاہ صاحبؒ نے مسلکی تعصب اور افراط کے شکار ذہنوں اور عدم تقلید کا رجحان رکھنے والے تفریط زدہ خیالات کے بیچ کی راہ نکال کر، مسلمانانِ ہند کی فکری تاریخ کو ہمیشہ کے لیے ایک جہت عطا کر دی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ فکری اعتدال کے باب میں آیندہ کی جانے والی تمام کوششیں، شاہ صاحبؒ کے پیش کردہ ''نظریہ اعتدال'' کو بنیاد بنائے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتیں۔

حضرت نانوتویؒ اور اعتدال

فکرِ ولی اللّٰہی کے حقیقی وارث ''علمائے دیوبند'' نے اپنے افکار ونظریات میں اسی اعتدال کو باقی رکھا جو وراثتاً انہیں ولی اللّٰہی خانوادے سے ملا تھا۔ حضرت الامام النانوتویؒ کے علمی مقام کا اندازا حضرت حکیم الاسلامؒ کے

اس جملے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''علمائے دیو بند فروع میں حضرت گنگوہیؒ کے تابع ہیں اور اصول میں حضرت نانوتویؒ کے'' حضرت الامام النانوتویؒ جہاں دارالعلوم دیو بند، اور تحریک مدارس کے بانی ہیں وہیں علمائے دیو بند کے نظریاتی قائد بھی ہیں۔ آپ ہی کے فکر و فلسفے نے جس کو ''حکمت قاسمیہ'' سے اچھے اسلوب میں تعبیر نہیں کیا جاسکتا، دیو بندیت کو ایک مکتبۂ فکر بنایا۔ اسی ''حکمت قاسمیہ'' کا نتیجہ ہے کہ آج دیو بند محض ایک مدرسہ نہیں بلکہ ایک جامع تحریک کا نام ہے جس نے اپنے بانی اور قائد کے نظری و فکری اعتدال سے سر مو انحراف نہیں کیا۔ ''حکمت قاسمیہ'' نے فکر ولی اللّٰہی سے جو وصف اعتدال اخذ کیا تھا حضرت الامام نانوتویؒ نے ہمیشہ اس کی آب یاری کی اور اعتدالِ فکر و نظر کے تسلسل کی حسین لڑی میں اپنے نام نامی کا اضافہ کیا۔

حضرت نانوتویؒ کی تصانیف کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی تحریروں میں خالص معروضی انداز اختیار کیا ہے، آپ کسی مسئلے میں اپنے جذبات و محسوسات سے الگ رہ کر خالص عقلی و فکری اور منطقی انداز سے بحث کرتے ہیں اور غیر جانبدارانہ طور سے کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں، اسی وجہ سے نفس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے وہ خالص منطقی اور عقلی مباحث سے استدلال کرنے لگتے ہیں اور حکمت و فلسفہ کی اصطلاحوں سے کام لینے لگتے ہیں۔ آپ کی وہ تصانیف جن میں آپ نے ہندوؤں اور عیسائیوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے، آپ کی غیر جانبداری پر شاہد عدل ہیں، مسلمانوں کے مختلف فرقوں: اہل بدعت، اہل حدیث اور اہل تشیع کے خلاف آپ مناظرانہ و مخاصمانہ طرز بحث کے بجائے روادارانہ و مصالحانہ طرز گفتگو اپناتے ہیں، جن سے ان کے اس رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ملی وحدت اور اجتماعیت کو ترجیح دیتے ہیں اور امت کے شیرازہ کو حتی الامکان منتشر ہونے سے بچانا چاہتے ہیں۔ وہیں دوسری طرف وہ ''ملی اتحاد'' کا نام نہاد نعرہ لگا کر اعتقادی مسائل کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اس طرح ''حکمت قاسمیہ'' بے جا مناظرانہ اسلوب سے مبرّا ہونے کی بنا پر جہاں افراط سے محفوظ ہے وہیں اعتقادی مسائل کو مصالحانہ انداز میں بیان کرنے کی بنا پر تفریط سے بھی پاک ہے۔ حضرت نانوتویؒ کے سوانح نگار مولانا مناظر احسن گیلانی، امام نانوتویؒ کی کتاب ہدیۃ الشیعۃ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''تصنیفی سلسلے میں تو، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سید الامام الکبیر کی کتابوں میں سب سے زیادہ ضخیم کتاب آپ کی وہی ہے جس میں انتہائی دل سوزیوں کے ساتھ شیعوں کی غلط فہمیوں کو مٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔''

اہل بدعت کے خلاف بھی آپ ''نقطۂ اعتدال'' سے تجاوز نہیں کرتے بلکہ نہایت معتدل رویہ اپناتے ہوئے ہر نئی بات کو بدعت اور ہر بدعتی کو کافر و مشرک قرار دینے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ آپ فرماتے ہیں: ''عقائد کے تغیر

وتبدل کوہم رئیس البدعات کہتے ہیں اور قواعد کلیہ کے تغیر وتبدل کوہم بدعت کبری قرار دیتے ہیں، اعمال جزئیہ کی کمی بیشی کو ہم بدعت صغری کہتے ہیں، بالجملہ ہم تغیر وتبدل عقائد کو جیسے شیعہ، خوارج ومعتزلہ نے کیا ''رئیس البدعات'' اور قواعد کلیہ کومثل ایجاد تعزیہ وماتم داری کو بدعت کبریٰ اور کمی بیشی جزئیات کو بدعت صغریٰ کہتے ہیں''۔

حکمت قاسمیہ کا یہی ''فکری اعتدال'' ہے جس نے امام نانوتویؒ کو علمائے دیوبند کا نظریاتی قائد بنایا ہے۔اس طرح آپ نے ''فکر ولی اللہی'' کے سرچشمۂ اعتدال سے فیض یابی کے بعد ''اعتدالِ نظر وفکر'' کے تسلسل میں جو کردار ادا کیا ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

علامہ انور کشمیریؒ اور اعتدال

امام العصر محدث جلیل علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ بھی ''سلسلہ اعتدال'' کی ایک اہم کڑی ہیں۔ آپ کی وسعتِ فکر ونظر اور عمیق مطالعہ بے نظیر ہے۔آپ نے حنفیت اور شافعیت سے اوپر اٹھ کر حدیث کو سمجھا ہے اور اسی طرز پر حدیث فہمی کی اپنے تلامذہ کو تلقین کی ہے۔آپ کے تلامذہ نے بھی آپ کے اس وصف اعتدال کو پوری مضبوطی سے تھاما اور اس کی ترویج واشاعت کی۔ چنانچہ علامہ کشمیریؒ کے تلمذ رشید حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ اپنے طلبہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ''تم خود حنفی بن جاؤ اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن حدیث نبوی کو حنفی مت بنایا کرو''۔

علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ''فکر ولی اللّٰہی'' کے طرز پر حدیث فہمی کا ایسا معیار قائم کیا جو مسلکی تعصب اور فقہی جمود سے مکمل طور پر مبرّا ہے۔آپ عملاً یقیناً حنفی تھے، لیکن فقہی بحثوں میں اگر دیگر ائمہ کے نقطۂ نظر کو مضبوط دیکھتے تو اس کا برملا اعتراف کرتے اور اس کو ترجیح دیتے۔آپ کے نابغہ روزگار شاگرد علامہ یوسف بنوریؒ اپنے استاذ امام کشمیریؒ کے حدیث فہمی میں وصف اعتدال کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''ایسی نصوص کے بارے میں کہ جن سے فقہائے مذاہب اربعہ اپنے اپنے مذہب کے حق میں استدلال کرتے ہیں، علامہ کشمیریؒ کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ شارع کی مراد اور ان نصوص کا مقصد واضح ہو جائے۔آپ ان نصوص میں مناط کی تحقیق، تنقیح اور تخریج کرتے اور اس بات کی قطعاً پرواہ نہ کرتے کہ نص حنفی مذہب کے موافق ہے یا مخالف۔آپ کا طرز عمل عام علما کے طرز عمل سے یکسر مختلف تھا جو اپنی تمام تر کوششیں نص کو اپنے مذہب کے موافق بنانے میں صرف کر دیتے ہیں اور دور کی تاویل کرنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے''۔ گزشتہ چند صدیوں میں، فقہ وحدیث کے حوالے سے یہ جرأتمندانہ اعتدال یا تو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنایا

ہے یا پھر حضرت الامام کشمیریؒ نے۔ انھی حضرات کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ مسلکی تعصب اور فقہی جمود کو ہماری صفوں میں راہ نہیں مل سکی ہے۔

علامہ کشمیریؒ کے ''اعتدال فکر ونظر'' کی واضح مثال آپ کا یہ موقف ہے کہ اگر امام ومقتدی کے فقہی مذاہب مختلف ہوں تو نماز مطلقاً جائز ہے۔ ایک مقام پر اس مسئلے کے سلسلے میں فرماتے ہیں: ''وَالذي تحقّق عندي أنّهٔ صحيح مطلقاً، سواء كان الإمام محتاطاً أم لا. وسواء شاهد منه تلك الأمور أم لا، فإني لا أجد من السلف أحداً، إذا دخل فِي المسجد أنه تفقه أحوال إلا مام أو تسائل عنه، بيدأنهم كانوا يقتدون وينصرفون إلى بيوتهم بلاسؤال ولاجواب''.

(میرے نزدیک تحقیقی بات یہ ہے کہ ایسی اقتداء مطلقاً صحیح ہے خواہ امام محتاط ہو یا غیر محتاط۔ پھر خواہ مقتدی نے امام کو (مقتدی کے مذہب کے مطابق نواقض وضوء کا ارتکاب کرتے ہوئے) دیکھا ہو یا نہیں۔ اس لیے کہ میں نے سلف میں کسی کو اس کے بارے میں نہیں سنا کہ وہ مسجد میں داخل ہونے کے بعد امام کے احوال جانچتے ہوں یا اس کے بارے میں دوسروں سے دریافت کرتے ہوں، بلکہ وہ امام کے پیچھے نماز پڑھ کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے، نہ کوئی سوال ہوتا نہ کوئی جواب۔)

علامہ کشمیریؒ کی وسعت نظر اور آپ کے وصف اعتدال کا اس سے بھی انداز لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کسی مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ کی دو روایتیں ہوں یا مشائخ حنفیہ کے ایک سے زائد اقوال ہوں تو آپؒ اس قول کو اختیار کرتے جو صریح وصحیح حدیث کے مطابق ہو البتہ اگر اس مسئلے کے تعلق سے کوئی ایسی حدیث نہ ملتی، تو احناف کے اس قول کو ترجیح دیتے جو دیگر فقہی مذاہب سے قریب ہوتا۔ اس تقریب بین المذاہب میں بھی امام شافعیؒ کی رائے مقدم ہوتی پھر امام مالکؒ کی۔

غرض یہ کہ علامہ کشمیریؒ نے حدیث وفقہ کے باب میں جو تجدیدی کارنامے انجام دیے ہیں وہ آپ کے ''اعتدال فکر ونظر'' کا پتہ دیتے ہیں۔ یقیناً آپ ہی کے جرأت مندانہ اعتدال کا نتیجہ ہے کہ ''فکر ولی اللٰہی اپنی اسی آب وتاب کے ساتھ باقی رہی اور فقہی جمود اور مسلکی تعصب ہماری صفوں سے دور رہے۔

حضرت تھانویؒ اور اعتدال

حکیم الامت حضرت تھانویؒ ''علمائے دیوبند'' میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ جہاں وہ علوم ظاہرہ میں امامت کے درجہ پر فائز ہیں، وہیں علوم باطنہ میں وہ قدوہ ہیں آپ ایک طرف بے شمار علمی وعملی

کمالات کے جامع اور فقہ وفتاویٰ میں آپ کی آراء حجت ہیں، وہیں دوسری طرف تصنیف وتالیف اور تحریر وتقریر کی راہ سے ہدایت خلق، ردّ بدعات، دفع شبہات اور ابطال رسوم کے سلسلے میں آپ کی خدمات بے نظیر ہیں۔ آپ نے اپنے محبین ومعتقدین کے درمیان، اپنے انفاس قدسیہ سے باطنی فیوض کا ایسا سلسلہ جاری فرمایا جو آنے والی نسلوں کے لیے منارۂ نور رہے، آپ نے اسلامی عقائد اور اعمال کو زمانہ کی تہ بہ تہ ظلمات کے گرد وغبار سے پاک وصاف کیا اور یوں آپ وقت کے عظیم مجدد کہلائے۔ حضرت تھانویؒ کا ''اعتدال فکر ونظر'' بے نظیر ہے، آپ نے ہر ہر مسئلے میں امت کو افراط وتفریط سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ آپ کا سب سے اہم تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے مروجہ تصوّف کی اصلاح فرمائی اور غلو وتقصیر سے بچاتے ہوئے ایک ایسی ''معتدل طریقت'' کو رواج بخشا کہ جس کے سوتے وہیں سے پھوٹتے ہیں جہاں سے شریعت کے چشمے ابل رہے ہیں۔

تصوّف کے بے شمار مسائل میں آپ نے میانہ روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ''معتدل حل'' پیش فرمایا کہیں آپ نے تصوف میں رائج تعبیرات کو بدل کر مسئلے کی ایسی قابل قبول صورت پیش فرمائی کہ نام نہاد ''توحید پرستوں'' کے لیے بھی دل سوزی کی کوئی گنجائش نہیں رہی، تو کہیں مسائل تصوف کی ایسی دلنشیں تشریح کی کہ ظاہر پرست بھی اگر انصاف کا دامن تھام لیں تو انہیں بدعت کی بو بھی محسوس نہ ہو۔

حضرت تھانویؒ نے مسئلہ وحدۃ الوجود کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بنیادی طور پر ایک اہم بات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مسئلہ چوں کہ بہرحال قطعیات میں نہیں، بلکہ کیفیت ثبوت الوجود للحوادث کے اعتبار سے سب کے نزدیک ظنی ہے، اس لیے بطلان مسئلے کا حکم جزئی یا ضلالِ اصحاب مسئلہ کا حکم قطعی یہ تو یقیناً غلو اور معاداۃ اولیاء ہوگا، جس میں ''إیذان بحرب اللّٰہ'' کی وعید وارد ہے، اور فریقین کے محتاطین اس مسئلے پر عامل ہیں کہ ''أبھموا ما آبھم اللّٰہ'' یعنی جس چیز میں اللہ تعالیٰ نے ابہام رکھا اس میں تم بھی ابہام ہی رہنے دو۔''

مسئلہ وحدت الوجود کے بارے میں حضرت حکیم الامت کے نقطۂ اعتدال کو واضح کرتے ہوئے، مولانا عبدالباری ندویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ: حضرت تھانویؒ کا اس مسئلے میں اصل تجدیدی مسلک یہ ہے کہ نہ اس کا جزم وقطعیت کے ساتھ انکار ہو، نہ اثبات، دونوں کو احتمال کے درجے میں رکھا جائے۔ لیکن انتہا پسندوں نے جہاں ایک طرف اس کا قطعی انکار اور اس کے قائلین کی تکفیر وتضلیل تک میں تأمل نہیں کیا، وہاں دوسری طرف اپنوں اور پرایوں دونوں میں بہتوں نے بڑی غلطی یہ دکھائی کہ اس کو تصوف کا جزو لاینفک سمجھ لیا۔

حضرت تھانویؒ ہی کا یہ تجدیدی کارنامہ ہے آج تصوف محض رسوم ورواج کا نام نہیں ہے، بلکہ درجۂ ''احسان'' تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ آپ ہی کے ''اعتدال فکرونظر'' کے نتیجے میں ایسے ایسے عقلیت پسند مرتبۂ احسان پر فائز ہوئے ہیں، کہ جن کو اعتدال کے علاوہ کوئی دوسری چیز متاثر نہیں کرسکتی تھی۔

حکیم الاسلام اور اعتدال

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس عالم وجود میں آنے کے ساتھ ہی تسلسل اعتدال کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ آپ جہاں علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے، وہیں ''فکرولی اللّٰہی'' اور ''حکمت قاسمیہ'' کے امین بھی تھے، ایک طرف آپ علوم شریعت میں محدّث عصر علامہ انورشاہ کشمیریؒ کے نابغۂ روزگار شاگرد تھے، تو دوسری طرف راہِ طریقت میں مجددعصر حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ مجاز۔ قرآن وسنت سے ابلنے والے چشموں نے ''فکرولی اللّٰہی'' اور ''حکمت قاسمیہ'' کی آمیزش کے ساتھ جب اس شخصیت کو سیراب کیا، تو جامعیت واعتدال کا ایسا نمونہ امت کے سامنے آیا، جو آیت قرآنی ''**وکذلک جعلناکم أمّة وسطاً لتکونوا شهداء علی الناس**'' کی عملی تفسیر تھا، بلکہ اس عظیم شخصیت نے اپنی تحریر وتقریر کو، اپنی زبان وقلم کو، اپنے ذہن وفکر کو، غرض یہ کہ اپنی پوری زندگی کو اس آیت کی تفسیر کے لیے وقف کردیا۔ یہ آپ ہی کی ذات گرامی کا حق تھا کہ آپ جامعیت واعتدال سے اس طرح پردہ کشائی کریں کہ ''مسلک دیوبند'' اپنے تمام اصول وفروع سمیت ایک جامع اور معتدل ''مکتب فکر'' بن کر سامنے آئے۔ یہ آپ ہی کا طرّہ امتیاز تھا کہ آپ نے علمائے دیوبند کے دینی رخ اور ان کے مسلکی مزاج کو اس اعتدال وجامعیت کے ساتھ بیان فرمایا کہ امت کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ دیوبندی مکتب فکر ''**ما أنا علیه وأصحابي**'' کا حسین پرتو ہے۔ حکمت سے لبریز آپ کے خطبات کو سننے اور پڑھنے والے اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ آپ جب قرآن وسنت پر گفتگو فرماتے تو اپنے استاذ علامہ کشمیریؒ کا عکس نظر آتے، اسرار شریعت پر بولتے تو ایسا لگتا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی روح گویا ہے۔ حضرت نانوتویؒ کے علوم ومعارف کے تو آپ وارث وامین تھے جب کہ حضرت تھانویؒ کے تزکیہ وتربیت نے آپ کو سلوک واحسان کے بلند مرتبے پر فائز کردیا تھا۔ آپ کی شخصیت سازی میں یہ عناصر اربعہ برابر کے شریک تھے، اور انھی عناصر اربعہ کے امتزاج نے آپ کے مزاج میں اعتدال وجامعیت پیدا کردی اور افراط وتفریط سے گویا آپ کو طبعی طور پر نفرت ہوگئی۔ غلو وتقصیر سے اظہار بیزاری کرتے ہوئے آپ تحریر فرماتے ہیں کہ: افراط وتفریط

محض جہالت کے شعبے ہیں، درحالیکہ دین و مذہب علم الٰہی کے چشمۂ صافی سے نکلا ہوا علم حقیقی کا شعبہ ہے نہ کہ جہالت کا، بلکہ علم وادراک کی بھی اصل ہے۔ ادھر یہ افراطی اور تفریطی، غلو اور مبالغہ ظلم و سفاہت کا شعبہ ہے نہ کہ علم و عقل کا۔ اور کون نہیں جانتا کہ مذہب کی بنیاد عیاذ اباللہ ظلم و جہل نہیں بلکہ علم و عدل ہے، افراط و تفریط نہیں بلکہ اعتدال و قسط ہے۔

''علمائے دیو بند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج'' حضرت حکیم الاسلامؒ کی ایک ایسی معرکۃ الآراء تصنیف ہے جس میں انھوں نے بہ ظاہر ''دیو بندی'' مکتب فکر کے بنیادی اصولوں سے پردہ کشائی کی ہے، لیکن درحقیقت پوری کتاب حکیم الاسلامؒ کے ''اعتدال فکر ونظر'' پر شاہد عدل ہے۔ ہر ہر باب میں آپ نے علمائے دیو بند کے جامع اور معتدل مسلک کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ آپ ہی کی ذات کا حق تھا کہ جس میں ''اعتدال'' رچ بس چکا تھا۔

تعارف اہل سنت

حضرت حکیم الاسلامؒ جامعیت اور اعتدال کی روشنی میں ''اہل سنت والجماعت'' کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اب اگر ضمیر کی صداقت سے نظر ڈالی جائے تو کتاب و معلّم کتاب میں سے کسی ایک سے انقطاع اور دوسرے سے غالبانہ جوڑ، اور یہود و نصاریٰ کی افراط و تفریط سے بچ کر اگر کوئی طبقہ ان دونوں عنصروں سے پوری عقیدت و عظمت اور کمال اعتدال کے ساتھ پیروی کا تعلق قائم کیے ہوے ہے تو وہ صرف اہل سنت والجماعت کا طبقہ ہے، جو نہ کتاب اللہ کو معلمین کتاب اور مربیان نقوش کی تعلیم و تربیت کے بغیر سمجھنے کی بلا میں گرفتار ہے کہ خدائی قانون کو اپنی رایوں اور نظریات کا کھلونا بنالے اور نہ مربیوں کی غلو زدہ عقیدت و محبت کا شکار ہے کہ ان کے ہر شخصی حال و قال اور کردار و گفتار کو قانون کی حیثیت دیتا ہو۔''

آج کل سلف کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے کچھ نام نہاد متسلفوں نے تصوف اور احسان و سلوک کو شجرۂ ممنوعہ سمجھ لیا ہے، وہ تزکیۂ نفس کے اس طریقے کو بدعت بلکہ شرک کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اولیاء اللہ کی توہین کے باوجود بھی ان کے دعوائے سلفیت میں کمی نہیں آتی، وہیں دوسری طرف ایسے غالی محبین و معتقدین بھی ہیں جو قرآن وسنت کو بالائے طاق رکھ کر اکابر صوفیاء کے احوال واقوال سے حجت پکڑتے ہیں اور ان کی اس درجہ تعظیم و توقیر کرتے ہیں کہ عیاذ اباللہ گویا وہی مشکل کشا اور دست گیر ہوں۔ حکیم الاسلامؒ نے اپنے فکری اعتدال کی راہ نمائی میں اس سلسلے میں بھی ''علمائے دیو بند'' کے مسلکی مزاج کو بیان فرمایا، آپ تحریر فرماتے

ہیں کہ: علمائے دیوبند نے یہ راہِ اعتدال اختیار کی کہ نہ تو اس فنِّ احسان (تصوف) سے قطع نظر کر لینا ہی جائز سمجھتے ہیں کہ اسے دماغوں کو ماؤف کر دینے والا افیون سمجھ لیں اور نہ ان باطنی احوال کو اسٹیج کی رونق بناتے ہیں کہ اس کے ذریعے اپنی درویشی یا عرفان پناہی کی نمایش کریں۔ بلکہ شریعت ہی کا ایک باطنی حصہ سمجھ کر باطنی ہی انداز سے باطن کی اصلاح کے لیے صرف کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی ان اہل باطن اہل اللہ کی حد درجہ عزت وعظمت دلوں میں لیے ہوئے ہیں۔ البتہ متصوّفہ اور بناوٹی صوفیوں کو نا قابل التفات سمجھتے ہیں جن کے یہاں تصوف کے معنی گیروے کپڑوں یا چند بندھی جڑی رسموں کی نقالی یا نمائشی اچھل کود کے سوا کوئی باطنی کیفیت یا وجد کا نشان نہ ہو" الا ماشاء اللہ"۔

غیر مقلدیت نے گذشتہ چند سالوں سے جس طرح سلفیت کا لبادہ اوڑھ کر امت کا رشتہ اسلاف سے منقطع کرنے کی کوشش کی ہے، وہ "اعتدال فکر ونظر" رکھنے والے علماء کو سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ وہ امت کے سامنے اجتہاد وتقلید کے سلسلے میں صحیح موقف اس انداز سے بیان کریں کہ نہ امت افتراق وانتشار کا شکار ہو اور نہ ہی اس کا رشتہ ائمہ دین اور علمائے راسخین سے منقطع ہو۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس سلسلے میں بھی اپنے فکری اعتدال کی روشنی میں علمائے دیوبند کے موقف کو واضح فرمایا ہے اور ان پر لگائے جانے والے "کورانہ تقلید" کے الزام کا مسکت جواب دیا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ: پس وہ بلا شبہ مقلد اور فقہ معین کے پابند ہیں مگر اس تقلید میں بھی محقق ہیں جامد نہیں۔ تقلید ضرور ہے مگر کورانہ نہیں۔ لیکن اس شان تحقیق کے باوجود بھی وہ اور ان کی پوری علمی ذریت اپنے کو اجتہاد مطلق کا اہل نہیں سمجھتی۔ البتہ فقہ معین کے دائرہ میں رہ کر مسائل کی ترجیح اور ایک ہی دائرہ کی متماثل یا متخالف جزئیات میں سے حسب موقع ومحل اور حسب تقاضائے ظروفِ زمان ومکان، کسی خاص جزئی کے اخذ وترک یا ترجیح وانتخاب کی حد تک وہ اجتہاد کو منقطع بھی نہیں سمجھتے۔ اس لیے ان کا مسلک کورانہ تقلید اور اجتہاد مطلق کے درمیان ہے۔"

عقل ونقل

حضرت حکیم الاسلامؒ کی حیات کا ایک روشن پہلو "مسائل کی عقلی تفہیم" ہے، یہ ملکہ آپ کو اپنے جدامجد حضرت نانوتویؒ کی "حکمت قاسمیہ" سے ورثے میں ملا ہے۔ آپ نے جس انداز سے حضرت نانوتویؒ کے علوم ومعارف کی ترجمانی کی، اسرار شریعت سے پردہ کشائی کی اور مسائل کی عقلی تشریح کی وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ لیکن یہاں بھی آپ نے فکری اعتدال کو جانے نہیں دیا۔ افراط وتفریط سے بچتے ہوئے آپ نے

مضامین شریعت کی عقلی وجوہات بھی بیان کیں اور عقلی استدلال سے بھی کام لیا۔ لیکن نقل کو عقل کی میزان میں تولنے کی سخت مخالفت کی۔ آپ نے عقل کو نقل کی صحت کا معیار نہیں بنایا، بلکہ اس طریقۂ کار کو اختلاف امت اور گمراہی کا سبب قرار دیا۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ: ”خوارج نے عقائد کا استفادہ نقل صحیح کے بجائے عقل سلیم سے کرنا شروع کر دیا اور وحی خداوندی کو اپنی عقلوں کے تابع بنالیا حتی کہ متشابہات تک میں بھی عقلی گھوڑے دوڑائے اور ان کے من مانے معنی خود سے متعین کیے، جس سے بلحاظ عقائد ان کے نقش قدم پر بعد کے آنے والوں میں بھی عقل خام کی امامت میں کتنے ہی فرقے ابھر گئے، جو متضاد قسم کے عقائد وافکار کے دلدل میں پھنسے اور پھنس کر رہ گئے۔“

حضرت حکیم الاسلامؒ نے جہاں دیگر بے شمار مسائل میں نقطۂ اعتدال واضح کیا ہے، وہیں ”تشریح دین“ کے حوالے سے عقل ونقل کے درمیان بھی وصف اعتدال کو ملحوظ رکھا۔ آپ نے اہل حق کا تعارف کراتے ہوئے ایک موقع پر تقریر میں فرمایا کہ: اگر آپ عقل سے یہ چاہیں کہ غیب کی چیزیں معلوم کروں تو عقل کی دوڑ صرف محسوسات تک ہے۔ وہ مغیبات تک نہیں پہنچ سکتی، وہ علم کی موجد وایجاد کنندہ نہیں ہے، وہ دریافت کنندہ ہے کہ علم سامنے آئے تو اس سے کچھ اصول نکال لے، کچھ جزئیات سامنے آئیں تو کلیات نکال لے، لیکن خود اصول وجزئیات بنالے یا واقعہ بنا دے، تو عقل موجد نہیں جو واقعات ایجاد کرے پیدا شدہ واقعات میں غور کر سکتی ہے۔“

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ”سائنس اور اسلام“ کے موضوع پر ہوئی آپ کی تقریر، اسلام کی حقیقت، اس کی غرض وغایت، مادّیت پرستی اور عقلیت پسندی جیسے موضوعات پر ایک عظیم دستاویز ہے۔ آپ نے سائنس (کہ جس کی بنیاد مادیت اور عقلیت ہے) اور اسلام کے درمیان نسبت کو اس تقریر کا موضوع بنایا اور موضوع کا حق ادا کر دیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ: اس سے سائنس اور اسلام کی باہمی نسبت بھی واضح ہوگئی کہ ان میں وسیلہ ومقصود کی نسبت ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب تک سائنس کے کارنامے مذہب کے لیے خادم اور ذریعۂ تحصیل نہ بنیں گے، ان کا انجام خوش کن نہ ہوگا اور اسی کے ساتھ بطور ثمرہ یہ مقصود بھی حل ہوگیا کہ جب اسلام مقصود ہے اور سائنس اس کا وسیلہ تو اسلام کی مقصودیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ترقی کا میدان اسلام کو بنایا جائے نہ کہ سائنس کو کہ ترقی ہمیشہ مقاصد میں کی جاتی ہے نہ کہ ذرائع ووسائل میں۔ یعنی سائنس کے معمولات اس حد تک اختیار کیے جائیں، جس حد تک اسلام کو ان کی ضرورت ہے۔“

بریلویت اور حضرت حکیم الاسلامؒ

علمائے دیوبند اور علمائے بریلی کے درمیان اختلافات نے عوام الناس کو دو فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ردّ و نکیر اور جواب و جواب الجواب نے اس دوری کو مزید بڑھا دیا۔ مناظروں اور مباحثوں نے اس اختلاف میں شدت پیدا کر دی۔ اس سے قطع نظر کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر، دونوں ہی طرف کے علماء کی جانب سے اختلاف امت کو اتحاد میں بدلنے کے لیے سنجیدہ کوششیں نہیں ہوئیں۔ اس بات پر شاید ہی کبھی غور ہوا ہو کہ یہ اختلافات حقیقی ہیں یا غلط فہمیوں کا نتیجہ۔ لیکن حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس نازک اور حسّاس مسئلے میں بھی نقطۂ اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ آپ نے اختلافات کو غلط فہمیوں سے تعبیر کر کے پورے قضیے کی روح ہی نکال دی، پھر جس خوش اسلوبی، عمدہ بیانی اور مصالحانہ انداز سے ان غلط فہمیوں کا ازالہ فرمایا ہے وہ ''راہِ اعتدال'' میں آپ کی کوششوں پر شاہد عدل ہے۔ آپ کی مندرجہ ذیل عبارت ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ مناظروں اور مجادلوں سے بچتے ہوئے اتحاد و اتفاق کی خاطر کی جانے والی تمام کوششوں میں علمائے دیوبند اپنے موروثی ''فکری اعتدال'' کے ساتھ حصہ دار ہوں اور اختلاف کی اس لعنت سے امت کو نجات دلائیں۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''ہر جماعت میں کچھ نہ کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور کم و بیش مخلصین بھی ہوتے ہیں لیکن افتراق کی نحوست سے ہر ایک کی خوبی سے دوسرا محروم ہے ساتھ ہی اس بناء پر بھی ہے کہ بریلوی ہوں یا دیوبندی تمام بنیادی باتوں، اقرارِ توحید، عظمتِ نبوت، عظمتِ صحابہؓ، حنفیت، طریقت، سلاسل طریقت، اولیاء اللہ سے انسلاک سلسلۂ بیعت و ارشاد، عقیدت و محبتِ اہل اللہ وغیرہ میں اشتراک کے باوجود اس قسم کے مزعومہ، بلکہ بتکلف آوردہ جزئیات کے ذریعہ افتراق بلکہ عناد آمیز فرقت اور بکرّات و مرّات اس کا احیاء و تجدید جہاں پوری قوم کا ضعف اور آزار ہے وہیں وہ اعداء اللہ اور اعداءِ دین کے لیے سبب تضحیک و استہزاء بھی بنا ہوا ہے جس سے پوری قوم کے وقار اور عزت پر اثر پڑ رہا ہے۔

آج عوامی مناظروں کے چیلنج تو دیئے جاتے ہیں اور دوسرے لفظوں میں عوام کو خواص پر مسلط تو کیا جا رہا ہے جس سے عوامی سطح پر فتنہ ابھرتا اور نکھرتا جا رہا ہے، اور نتیجہ میں عوام دین سے بیزار ہی ہوتے چلے جا رہے ہیں جنہیں اہلِ وطن کے خلاف اشتعال دلا کر اکسا دیا جاتا ہے، لیکن یہ نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے تھا کہ قوم کی مجموعی عزت و آبرو کی خاطر چند سنجیدہ علماء ان لوگوں کو بلائیں جن پر انہیں اعتراضات ہیں اور خود انہیں

سے پوچھیں کہ وہ کس حد تک ان سے الگ ہیں اور کس حد تک شریکِ عقیدہ وعمل ہیں۔ مشترک حصے کو ''اساس'' قرار دے کر بقیہ کے لیے اگر اس میں کسی حجت کے سبب توافق نہ ہوسکے حدود متعین کی جائیں جس سے کم سے کم منافرتِ باہمی اور تعصّبات کی آگ دھیمی پڑجائے اور عوامی سطح کی اشتعال انگیزیاں کسی حد تک اعتدال پر آجائیں اور ایک دوسرے سے قریب ہوکر کسی باحجت گفت وشنید کا راستہ پڑجائے۔''

اعتدال کی ضرورت

حضرت حکیم الاسلامؒ نے پوری زندگی اپنی تقریر وتحریر کے ذریعہ جس فکری اعتدال کی تعلیم دی ہے، آج اس کے تجدید واحیاء کی ضرورت ہے۔ اختلاف وانتشار کے اس دور میں آج امت مسلمہ کئی کئی پرسنل لاؤں، جمعیتوں، مشاورتوں اور تنظیموں میں تقسیم ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم یہ کوشش کریں کہ اگر ہمارا کسی جماعت کے ساتھ فروعی مسائل میں اختلاف ہے تو اس کو دور کیا جائے، ہم جو ایک ہی مکتب فکر سے وابستہ ہیں، ایک ہی جماعت کی طرف اپنا انتساب کرتے ہیں، حدیث وفقہ کے باب میں ایک ہی سند سے روایت کرتے ہیں اور ایک ہی درسگاہ یا اس کے زیر سایہ پروان چڑھے دیگر اداروں کے فیض یافتہ ہیں، افراط وتفریط کا شکار ہیں اور اختلاف انتشار ہماری صفوں میں سرایت کر چکا ہے۔ آج سرزمین دیوبند نے جو کبھی ہماری وحدت کی علم برداری تھی ہمیں اس شخصیت کو یاد کرنے کی دعوت دی ہے جس نے اس اتحاد کو جلا بخشی تھی، جو اس اتحاد ہی کی خاطر قربان ہوا تھا اور جس نے اپنے فکری اعتدال کی بدولت ''جماعت دیوبند'' کو افراط وتفریط سے محفوظ رکھا۔ آج اس عظیم شخصیت کے احسان کا تھوڑا سا بدلہ صرف اسی صورت میں ادا ہوسکتا ہے کہ وہ ''اعتدال فکر ونظر'' جو قرآن وسنت سے نکل کر اسلاف امت سے ہوتا ہوا، ''فکر ولی اللہی'' کی تعبیر، ''حکمت قاسمیہ'' کی تشریح، ''علوم انوریہ'' کی تفہیم اور ''طریقت تھانویہ'' کے تزکیہ وتربیت کے اضافے کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ کی زبانی ہم تک پہنچا ہے، اس کا احیاء وتجدید ہو اور ہم اپنے تمام مسائل اسی ''فکری اعتدال'' کی روشنی میں طے کریں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

............❖............

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ کی زندگی علم وفضلیات، بصیرت، وسعت علم اور علم کی پختگی ورسوخ، خدمت دین اور اس کے ساتھ اصلاح ووعظ وارشاد عوام سے رابطہ تربیت ودعوت و بیعت وارشاد، ان سب پہلوؤں اور گوشوں پر محیط تھی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

حضرت حکیم الاسلامؒ کو خدا تعالیٰ نے قرآن وحدیث پر گہری نظر دی تھی، وہ اسلام کے اصول واساس، فلسفہ وحکمت کے رمز شناس تھے، اور انہیں علم وحکمت کی تشریح وتفصیل، اظہار وبیان کی بے پناہ صلاحیت دی گئی تھی، مشکل سے مشکل موضوع پر وہ گھنٹوں اتنے آسان اور دل نشین انداز میں اظہار خیال فرماتے تھے کہ سننے والے کے دل میں بات اترتی چلی جاتی تھی، اپنی اس صلاحیت اور خصوصیت کے لحاظ سے وہ منفرد شخصیت کے مالک تھے۔

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحبؒ

ہندوستان کی سرحدوں کو توڑ کر دارالعلوم دیوبند کا تعارف، بزرگوں کی معرفت ان کے معمول کا دل آویز ثمرہ ہے، بہت سے گمنام متعارف ہو گئے، بہت سے نامور جاوید بن گئے، کاش کہ وہ اپنی سوانح جس کے لیے میں نے بہت اصرار کیا تصنیف فرماتے تو ایک صدی کی داستان علم وعمل مرتب شکل میں ملتی۔

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحبؒ

حکیم الاسلامؒ کی دسیوں تصانیف آپ کے بلند علمی مقام کی شاہد ہیں اور ان کے مطالعہ سے دین کی عظمت ومحبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جہاں تک وعظ وخطابت کا تعلق ہے اس میں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت کو ایسا عجیب وغریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

ISBN 81-92994612-3

Ḥujjat al-Islām Academy

Al-jamia al-Islamia Darululoom Waqf, Deoband

Eidgah Road, P.O. Deoband-247554, Distt: Saharanpur U.P. India
Tel : + 91-1336 222352, Mob: + 91-9897076726
Website: www.dud.edu.in, www.darululoomwaqf.com
Email: hujjatulislamacademy@dud.edu.in, hujjatulislamacademy2013@gmail.com